BOX 21
شاہ ولی اللہ اکیڈمی
الرحیم
ماہنامہ
شعبہ نشر و اشاعت شاہ ولی اللہ اکیڈمی ○ صدر حیدر آباد
BOX No 21
Mahnamah- ar- Rahim
Muhammad Sarvar
2

قیمت سالانہ :۔ آٹھ روپے
فی پرچہ :۔ پچھتر پیسے

جلد ۱ محرم ۱۳۸۳ھ مطابق جون ۱۹۶۳ء نمبر ۱

فہرستِ مضامین

شذرات

سرزمینِ سندھ کا تاریخی شہر ٹھٹھہ صدیوں تک اسلامی علوم و فنون کا مرکز رہا ہے۔ اس کے نواح میں سجاول نام کا ایک قصبہ ہے، جہاں مٹیاری سادات کا ایک مشہور خاندان آباد ہے۔ اس معزز خاندان کے ایک بزرگ سید عبدالرحیم شاہ تھے، جن کا ۱۹۴۷ء میں انتقال ہوا ہے۔ ان کی زندگی ہی میں ان کی زوجہ محترمہ بی بی زیب النساء صاحبہ نے اپنے حصے کی زرعی زمین، جس کا رقبہ ۱۱۳۵ ایکڑ ہے، "وقف محمد رحیم شاہ" کی صورت میں منتقل کردی۔ اور وقف کی ایک شرط یہ رکھی کہ اس کی آمدنی میں سے شاہ ولی اللہ کے اسلامی فلسفہ کی نشر و اشاعت کی جائے۔ سید محمد رحیم شاہ جن کے نام سے یہ وقف معنون کیا گیا، سید عبدالرحیم شاہ کے والد بزرگوار اور محترمہ بی بی زیب النساء کے خسر تھے۔ سجاول کے اس نامور فیاض خاندان کے مفصل حالات اس شمارے میں ایک مستقل مضمون کی شکل میں شائع کئے جارہے ہیں۔

"وقف محمد رحیم شاہ" کی اس مقرر کردہ شرط کو، کہ اس کی آمدنی میں سے شاہ ولی اللہ کے اسلامی فلسفہ کی نشر و اشاعت ہو، عملی صورت دینے کے لئے محکمہ اوقاف مغربی پاکستان کی منظوری سے "شاہ ولی اللہ اکیڈمی" کا قیام عمل میں آیا ہے۔ اور اس نے سال رواں کے اوائل سے کام شروع کردیا ہے۔ شاہ ولی اللہ کے فلسفہ کی نشر و اشاعت کی غرض سے اکیڈمی مذکور کے قیام کے اصل محرک سندھ کے وہ اہل علم حضرات ہیں۔ جو ایک عرصے سے اپنے طور پر شاہ صاحب کی تعلیمات و حکمت کی نشر و اشاعت کا کام کر رہے تھے۔ انہیں کی رائے پر "شاہ ولی اللہ اکیڈمی"

کا مسئلہ زیر بحث آیا۔ اُن کے مشورے سے اس کی جملہ تفصیلات طے ہوئیں۔ انہوں نے جو سفارشات پیش کی تھیں، ان پر مشتمل اکیڈمی کے بنیادی قواعد بنائے گئے۔ اور آخر میں انہی کی عملی شرکت اور تعاون سے "شاہ ولی اللہ اکیڈمی" وجود میں آئی ہے۔ یہ اکیڈمی ایک خود مختار علمی ادارہ ہے۔ اس کا نو ڈائرکٹروں کا ایک بورڈ ہے۔ جو اکیڈمی کے تمام کاموں کا ذمہ دار ہے۔ یہ بورڈ اپنے لئے خود قواعد و ضوابط بنائے گا۔ اس سلسلہ میں محکمہ اوقاف مغربی پاکستان کی حیثیت ایک انتظامی نگراں کی ہے۔

"شاہ ولی اللہ اکیڈمی" کے "مقاصد و نظام کار" کے متعلق اکیڈمی کے شعبہ نشر و اشاعت نے ایک ٹریکٹ شائع کیا ہے، جو اس سے دلچسپی رکھنے والے حضرات طلب فرما سکتے ہیں۔

شاہ ولی اللہ کے اسلامی فلسفہ کی نشر و اشاعت کے ضمن میں، ظاہر ہے اکیڈمی کے پیش نظر سب سے بڑا مقصد تو یہ ہے کہ شاہ ولی اللہ صاحب کی تصانیف کو ان کی اصلی زبانوں، اور ان کے تراجم کو دوسری زبانوں میں شائع کیا جائے۔ نیز شاہ صاحب کی تعلیمات اور ان کے فلسفہ و حکمت کے مختلف پہلوؤں پر مفید اور عام فہم کتابیں لکھوائی جائیں اور ان کی عام اشاعت کی جائے۔ تاکہ حکمت ولی اللہی کے اصول و مبادی ملت کے دینی ذہن میں اپنی پوری وسعت اور گہرائی کے ساتھ رچ سکیں۔ اور ہمارے ہاں دین اسلام، اس کی تاریخ، اس کے علوم۔ تفسیر، حدیث، فقہ، کلام اور تصوف۔ اور مذہبی، فقہی اور متصوفانہ فرقوں اور گروہوں کے ارتقاء کو حکمتِ ولی اللہی کے نقطۂ نظر سے مطالعہ کرنے اور اس سے مستفید ہونے کا علمی رجحان پیدا ہو سکے۔ کیونکہ محققین کے نزدیک علمائے متاخرین میں سے حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ ہی وہ بزرگ ہیں، جو عالِم کے ساتھ ساتھ عارف بھی تھے۔ اور حکیم بھی جن کی اسلام اور اس کے تمام علوم پر بڑی عمیق، ہمہ گیر، جامع اور حقیقت رس نظر تھی —— دینِ اسلام کے احیاء اور علوم اسلامیہ کی تجدید کے سلسلے میں ان کی کوششیں بڑی بار آور ثابت ہوئیں۔ اور ان کے چشمۂ رشد و ہدایت سے کم و بیش سب سیراب ہوئے۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ کی تصنیفات کا مطالعہ اور ان کی حکیمانہ تعلیمات کی عام اشاعت امت اسلامیہ کے لئے ان مقاصد کی تکمیل میں بہت حد تک ممد و معاون ہو سکتی ہے۔ جو آج پاکستان کے مسلمانوں کے علاوہ باقی دنیا کے بسنے والے مسلمانوں کے دلوں میں بھی جاگزیں ہیں۔ اور وہ انہیں ایک ٹھوس حقیقت کی شکل میں دیکھنے کے لئے بے تاب ہیں۔

قلباً و ذہناً اور عملاً مسلمان رہتے ہوئے دنیوی اور مادی ترقی میں وہ کیسے دنیا کی دوسری ترقی یافتہ قوموں سے پیچھے نہ رہیں، جیسے کہ وہ اِس وقت ہیں، ان مقاصد کا مختصراً لب لباب یہ ہے۔

"شاہ ولی اللہ اکیڈمی" کی مطبوعات، اس کا درس و تدریس اور تحقیق اور ریسرچ کا شعبہ اور اس کا مجلہ علمی ماہنامہ "الرحیم" اس علمی رجحان کو بروئے کار لانے اور اس کو فروغ دینے میں پوری طرح ساعی ہوگا۔

ہماری دلی آرزو ہے کہ حکمتِ ولی اللہی کے نقطۂ نظر سے دین اسلام اور علوم اسلامیہ کے مطالعہ کرنے اور ان سے مستفید ہونے کا یہ علمی رجحان ایک مستقل مکتب فکر کی حیثیت اختیار کرے اور نشو و ارتقاء کے قدرتی اور تاریخی مراحل طے کرتا ہوا یہ زمانے کے ساتھ ساتھ آگے بڑھے۔ اس کے نئے تقاضوں کو اپنے اندر سموئے۔ انہیں متاثر کرے اور ان کا اثر قبول بھی کرے۔ زمانے کو کچھ دے اور اس سے کچھ لے بھی اور اس طرح وہ ایک نمو پذیر ترقی خواہ زندہ اور زندگی بخش مکتبِ فکر بنے۔

اس آرزو کو عملی شکل دینے کے لئے ضروری ہے کہ شاہ ولی اللہ اور ان کے بعد اُن کے علمی خانوادہ کے اہل قلم حضرات نے جو کچھ لکھا ہے، اس کا استقصا ہو۔ فکر ولی اللہی سے متاثر ہو کر اِس تمام عرصے میں جو علمی، تعلیمی، سیاسی اور جماعتی تحریکیں وجود میں آئیں، ان کا تاریخی جائزہ لیا جائے۔ ان پر تنقید ہو۔ ان کا محاسبہ کیا جائے تاکہ ان کا صواب و ناصواب واضح ہو، اور فکرِ ولی اللہی کی عملی تعبیرات میں وقتاً فوقتاً جو کوتاہیاں ہوئیں وہ سامنے آجائیں، ماضی کے تنقیدی جائزے ہی سے مستقبل کی صحیح راہ نکلتی ہے، فکر کو سلامت روی نصیب ہوتی ہے اور صحت مند عملِ ارتقاء جاری رہ سکتا ہے۔ اس سلسلے میں اکیڈمی نہ صرف شاہ ولی اللہ کے علمی جانشینوں اور ان کے بعد ان کے نقش قدم پر چلنے والے اہل علم کی تصنیفات شائع کرے گی، بلکہ وہ اِن پر اور اِن کے اِس تمام تاریخی دور پر دوسرے مصنفین سے بھی کتابیں لکھوا کر شائع کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ اسی طرح حضرت شاہ ولی اللہ سے لے کر اب تک تحریک ولی اللہی جن مختلف صورتوں میں بروئے کار رہی، اور اسے جن جن منازل سے گزرنا پڑا۔ ان کا تنقیدی جائزہ لیا جا سکے گا۔ امید ہے اس سے ایک مستقل ولی اللہی مکتب فکر کی تشکیل و توسیع میں بڑی مدد ملے گی۔

ولی اللہی مکتب فکر کی تشکیل کی ان تجاویز سے کہیں یہ غلط فہمی نہ ہو ان کے پس پردہ خدانخواستہ اسلام کی تعبیر و تشریح میں کسی قسم کی اجارہ داری یا مسلمانوں کے دوسرے مکاتبِ فکر کی نفی کا جذبہ کارفرما ہے۔ فکرِ ولی اللہی کی تو بنیادی اہمیت ہی یہ ہے کہ اس میں جامعیت اور ہمہ گیریت ہے۔ وہ کثرت میں ایک ہی وحدت کو جلوہ فرما دیکھتا ہے اور ادیان و ملل کے تضادات کو "تطبیق" کے ذریعہ اور فرقوں اور گروہوں کے اختلافات کو تاریخی تجزیہ کی مدد سے دُور کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ چنانچہ شاہ صاحب کا ارشاد ہے۔ مجھے روحانی طور سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے القاء ہوا ہے کہ تمہارے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارادہ یہ ہے کہ وہ تمہارے ذریعہ امت مرحومہ کے منتشر اجزا کو جمع کرے، اور ان کی تعلیمات کا تمامتر رجحان اسی طرف ہے۔

فکرِ ولی اللہی اگر ان خطوط پر جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے، ایک مستقل مکتبِ فکر کی حیثیت اختیار کرے تو یہ ایک ذریعہ ہو سکتا ہے مسلمانوں کے فرقوں کو ایک دوسرے سے قریب لانے اور فروعات میں اختلافات رکھتے ہوئے ان کے اسلام کے بنیادی امور میں باہم متفق اور ہم آہنگ ہونے کا۔ اور آج مسلمانوں اور بالخصوص اِس ملک کے مسلمانوں کی سب سے اہم ضرورت یہی ہے۔

مسلمانوں کے آپس کے مذہبی و نظریاتی اختلافات کی اپنی ایک تاریخ ہے۔ جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا اور ان کے مخصوص اسباب ہیں، جن کی اپنی جگہ اہمیت ہے، لیکن آج کے دور میں اس تاریخ اور ان اختلافات کی وہ حیثیت نہیں رہی جو ایک زمانے میں کبھی تھی۔ یا وہ سمجھی جاتی تھی اب اسلام محض عقائد اور نظریات کا نام نہیں رہا۔ جن میں کہ اہل علم و فکر بے تکان بحثیں کیا کرتے تھے۔ یہ اُس دور کی باتیں ہیں جب کہ اقتدار کے مالک یا تو مطلق العنان مسلمان بادشاہ اور ان کے امرا ہوتے تھے، یا غیر مسلم اجنبی حکمراں۔ اُس وقت عوام مسلمانوں کا اقتدار میں کوئی حصہ نہ ہوتا تھا۔ اور نہ کاروبار حکومت میں ان کا کوئی دخل تھا۔ اُس دور میں عوام کا کام تھا حکمرانوں کی اطاعت کرنا اور بس۔ اپنے مسلمان فرمانرواؤں کو وہ "ظل اللہ" سمجھتے تھے۔ اور غیر مسلم حکمراں اپنے سیاسی غلبے کی وجہ سے ان کے لئے واجب الاطاعت ہوتے۔ بے شک عوام مسلمانوں کو مساجد میں سجدوں کی اور علماء کو مدرسوں اور کتابوں میں نظری بحثوں کی اجازت تھی۔ اور ان کی علمی و عملی سرگرمیاں اکثر یہیں تک محدود بھی رہتیں۔ البتہ جہاں تک اقتدار

اور نظم و نسقِ حکومت کا تعلق تھا، اس کے بارے میں یہ قاعدہ کلیہ مان لیا گیا تھا کہ "رموزِ مملکتِ خویش خسرواں دانند" لیکن اب یہ حالت نہیں رہی - ایک ایک کر کے تمام مسلمان ممالک آزاد ہو گئے ہیں اور ان میں پہلے کی طرح کسی خاندان شاہی کے بجائے عوام اور صرف عوام کی حاکمیت تسلیم کی گئی ہے - اب مسلمان عوام کی یہ سیاسی و قانونی حاکمیت بتدریج بروئے کار آ رہی ہے۔ اور وقت کے ساتھ ساتھ اور جیسے جیسے زمانہ گزرے گا، اس کا عمل دخل اور دائرہ اثر و نفوذ بڑھے گا۔ چنانچہ اب یہی عوام اپنے اپنے ملکوں میں اقتدارِ اعلیٰ کے مالک ہوں گے۔ ان کے ملکوں کے آئین و قوانین اُن کی رائے سے بنیں گے - آئین و قانون ساز بھی وہی ہوں گے۔ نظم و نسق حکومت بھی ان کی مرضی کے مطابق چلے گا اور اربابِ حکومت کے تقرر اور ان کی باز پرس کا حق بھی انہی کو ہوگا۔ الغرض مملکت کی شکل اور اس کا نظام مظہر ہوگا عوام کی مرضی کا جو اس میں رہتے ہیں۔ یہ حالات اگر آج نہیں، تو کل ہو کر رہیں گے، کیونکہ تاریخ کا یہی رخ ہے - اور زمانہ اسی کا تقاضا کر رہا ہے - ان حالات میں ضروری ہے کہ اسلام، جو مسلمان عوام کا محض نظری عقیدہ نہیں، بلکہ ان کی مجموعی زندگی کا سب سے حسّاس، موثر اور فعّال جذبہ ہے، اور ان کا تاریخی، ثقافتی، جماعتی اور ملّی وجود سب اسی کا رہینِ منت ہے، مسلمان ملکوں کی سیاسی و اجتماعی زندگی میں زیادہ سے زیادہ منعکس ہو۔ اس کا دائرہ محض نظری و کتابی مباحث تک محدود نہ رہے، بلکہ یہ مسلمانوں کا نظریۂ حیات کے ساتھ ساتھ نظامِ حیات بھی بنے اور ان کی مملکتیں کاروبارِ حکومت میں اس کے اصول و مبادی سے رہنمائی حاصل کریں اور ان کے آئین و قوانین کی تشکیل میں یہ مشعلِ راہ کا کام دیں۔

آزاد مسلمان ملکوں میں جہاں بھی حاکمیتِ عوام بروئے کار ہوگی، اسلام کو بہر حال اپنا یہ فریضہ انجام دینا ہے، ورنہ خدا کا یہ دین محض نظریہ بنکر رہ جائے گا اور عملی زندگی میں اس کی کوئی حیثیت نہیں ہوگی۔

خوش قسمتی سے مفکرینِ اسلام میں شاہ ولی اللہ نے سب سے زیادہ زور اس بات پر دیا ہے کہ قرآن مجید کا اعجاز صرف اس کی فصاحت و بلاغت ہی نہیں۔ بلکہ وہ نظامِ حیات بھی ہے، جو وہ پیش کرتا ہے۔ شاہ صاحب نے اس نظامِ حیات کے مختلف پہلوؤں پر اپنی کتابوں میں مفصل بحث کی ہے۔ اور بتایا ہے کہ اسلام کی بدولت دنیا میں کیا انقلاب رونما ہوا۔ اس کے نتیجے میں وہ کون سا نظام تھا۔ جو معرضِ وجود میں آیا اور اسے کن کن مراحل سے

گزرنا پڑا۔ شاہ صاحب نے پوری انسانیت اور اس کی تاریخ کے پس منظر میں اسلام کے اس نظام حیات کے اصول و مبادی متعین فرمائے ہیں اور واضح کیا ہے کہ ان کی اساس پر جو نظام بنے گا، وہ فلاح دینوی و اخروی کا کفیل ہوگا۔ اسی سلسلے میں آپ نے انسانی زندگی میں اقتصادیات کو جو اہمیت حاصل ہے، اسے بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ معاشرے کی اکثر خرابیاں اقتصادی ناہمواری کا نتیجہ ہوتی ہیں یہاں تک کہ روحانی ترقی کے لئے بھی معاشی اطمینان ضروری ہے۔ اور ایک صحت مند اور با اخلاق معاشرہ متوازن اقتصادی نظام کے بغیر ممکن ہی نہیں۔

شاہ صاحب نے انسانی زندگی کے اس اقتصادی پہلو پر خاص طور سے زور دیا ہے۔ اتفاق سے اس زمانے میں اقتصادیات کی اہمیت اور بڑھ گئی ہے۔ اور اسے آج انفرادی و اجتماعی اور قومی اور بین الاقوامی زندگی کا سب سے بڑا محور سمجھا جاتا ہے۔ شاہ صاحب نے اسلام کے نظام حیات میں اقتصادیات کو اس کا صحیح مقام دے کر اور روحانی ترقی اور اخلاقی تزکیہ کے لئے اسے ضروری قرار دے کر ہمارے سامنے فکر و عمل کی نئی راہیں کھول دی ہیں۔

اکیڈمی کی کوشش ہوگی کہ وہ فکر ولی اللہی کے ان عملی پہلوؤں پر مستقل کتابیں شائع کرے کیونکہ مسلمانوں کے عملی اتحاد اور ان کی دینی و دنیوی فلاح کا سیدھا اور قریب ترین راستہ یہی ہے۔ اسی پر چل کر وہ اپنی پس ماندگی دُور کر سکتے ہیں، جو آج ان کی زندگی کے ہر شعبے پر حاوی ہے۔ ان کا ذہنی جمود ٹوٹ سکتا ہے۔ اور وہ رزم گاہِ حیات میں دنیا کی دوسری قوموں کے مقابلے میں اپنا وجود قائم رکھ سکتے ہیں۔ اہل مغرب کے جمہوری معاشرے، اور کمیونسٹ قوموں کے اشتراکی معاشرے میں اگر ہمیں کلیتہً مدغم نہیں ہونا، اور ہم اپنے دینی ثقافتی اور تاریخی وجود کا تسلسل برقرار رکھتے ہوئے آگے بڑھنا چاہتے ہیں، تو اس کے لئے ضروری ہے کہ اِس وقت ہمیں جن عملی مسائل سے دو چار ہونا پڑ رہا ہے، اسلام اور اس کی تاریخ سے ہمیں ان کا حل ملے ہم اس کے مطابق اپنے معاشرے کی تشکیلِ نو کریں اور اس طرح دنیا کے سامنے محض نظری اعتبار سے نہیں بلکہ عملی شکل میں ہم ایک بہتر نظامِ حیات پیش کر سکیں۔ فکر ولی اللہی میں اسلام کا یہ عملی پہلو، جسے اُس زمانے میں "حکمت عملی" کا نام دیا جاتا تھا، خاص طور سے نمایاں ہے۔ شاہ صاحب صرف معاشی زندگی ہی نہیں۔ بلکہ اجتماعی، سیاسی، اور اخلاقی زندگی تک میں اسے زیادہ سے زیادہ بروئے کار دیکھنا چاہتے تھے

شاہ صاحب کا ۱۷۶۲ء میں انتقال ہوا - یعنی آپ کا دور آج سے دو سو سال پہلے کا ہے - اس دوران میں دنیا اتنی بدلی ہے کہ انسانی تاریخ کے کسی حصّہ میں اس مدت میں نہیں بدلی - یہ محض مادی اعتبار سے نہیں بلکہ ذہنی و علمی لحاظ سے بھی - بے شک جیسا کہ شاہ صاحب بار بار فرماتے ہیں - اصل حقیقت ایک ہی ہوتی ہے، جو زمان و مکان کی تبدیلیوں کی وجہ سے مختلف جاموں میں جلوہ افروز ہوا کرتی ہے اور مظاہر کا یہ اختلاف اہل بصیرت کے لئے اصل حقیقت تک پہنچنے میں مانع نہیں ہونا چاہیئے - شاہ صاحب نے اپنے دور میں اسی حقیقت کی ترجمانی کی ہے لازمی تھا کہ وہ انہی تعبیرات و مصطلحات میں ہوتی، جو اُن کے دور میں مروج تھیں - اور اہل علم انہیں سمجھتے تھے -

اَب اِس زمانے میں، فکرِ ولی اللہی کو عام فہم بنانے کے لئے ضروری ہے کہ اسے اِس زمانے کے علمی جامے میں پیش کیا جائے اور اس کی وضاحت آج کی تعبیرات میں ہو - اس کے لئے یہ اہتمام کیا گیا ہے کہ اکیڈمی کے شعبہ تحقیق میں عربی مدارس کے ایسے عالم ہوں، جو انگریزی جانتے ہوں اور جدید مدارس کے وہ فارغ التحصیل آئیں، جنہوں نے ایم اے عربی میں کیا ہو - اس سے یقیناً شاہ صاحب کے علوم، اور ان کی حکمت کے مطالعہ و تحقیق میں آسانی ہوگی اور انہیں آج کے علمی اسلوب میں پیش کرنا ممکن ہو سکے گا -

یہ ہیں اکیڈمی کے مقاصد و عزائم - خدا تعالیٰ اسے توفیق دے کہ وہ انہیں عملی شکل دینے میں کامیاب ہو اور اس طرح یہ ملک و ملت کی کچھ خدمت کر سکے -

---

آخر میں "تحدیث نعمت" کے طور پر جہاں یہ ضروری ہے کہ "وقف محمد رحیم شاہ" کے معطیوں کا ذکر ہو، اور اس اکیڈمی کے ضمن میں یہ ذکر ہمیشہ ہوتا رہے گا - وہاں ہم اپنا یہ فرض سمجھتے ہیں کہ اکیڈمی کے قیام اور اسے کم سے کم مدت میں باقاعدہ کام شروع کرنے کے قابل بنانے میں حکومت مغربی پاکستان کے محکمۂ اوقاف کے سیکرٹری اور ناظم اعلیٰ جناب شیخ محمد اکرام صاحب نے جس طرح عملی دلچسپی لی - اور ہر مرحلے میں اس میں رہنمائی فرمائی اور ہر ممکن مدد دی، اس کا بھی یہاں ذکر کریں - اگر یہ اکیڈمی اسلام اور مسلمانوں کی کوئی خدمت کر سکی، تو اس سلسلے میں وقف کے معطیوں کے ساتھ ساتھ شیخ محمد اکرام صاحب کی ان کوششوں کا بھی ضرور ذکر آئے گا - جن کی بدولت شاہ ولی اللہ اکیڈمی کا وجود آج ممکن ہوا -

---

مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم

امام شاہ ولی اللہ - ایک اجمالی تعارف[1]

امام شاہ ولی اللہ کی ولادت بروز چہارشنبہ ۱۱۱۴ھ اور وفات ۱۱۷۶ھ میں ہوئی اور سلطان محمد عالمگیر کی وفات بروز جمعہ ۲۸ ذی قعدہ ۱۱۱۸ھ میں ہوئی۔ اس حساب سے شاہ صاحب کی ولادت سلطان عالمگیر کی وفات سے چار سال پہلے ہوئی۔ اور شاہ عالم ثانی نابینا مکحول بادشاہ کے عہد میں آپ کا انتقال ہوا۔ چنانچہ امام شاہ ولی اللہ کو دہلی کے اِن دس مغل سلاطین دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اورنگ زیب عالمگیر، بہادر شاہ اوّل معز الدین جہاں دار شاہ، فرخ سیر، رفیع الدرجات، رفیع الدولہ، محمد شاہ، عالمگیر ثانی اور شاہ عالم ثانی، آخر الذکر بادشاہ نے جسے غلام قادر رہیلے نے اندھا کر کے برطرف کر دیا تھا۔ اور پھر مرہٹوں نے اسے دوبارہ بادشاہ بنایا تھا۔ شاہ ولی اللہ کی وفات سے تقریباً دو سال بعد الہ آباد کے مقام پر بنگالہ بہار اور اڑیسہ کی دیوانی کلائیو کے ذریعہ ایسٹ

---

[1] یہ مضمون مولانا سندھی مرحوم کے خود اپنے مرتب کرائے ہوئے دو رسالوں سے ماخوذ ہے ان میں سے ایک رسالہ "امام ولی اللہ کی حکمت کا اجمالی تعارف" کے نام سے ماہنامہ "الفرقان" میں چھپا تھا۔ جو اس وقت بریلی سے نکلتا تھا۔ اسکے بارے میں مدیر "الفرقان" نے لکھا تھا۔ "چند مقامات میں تعبیر کی غرابت و نکارت اور ایک آدھ جگہ مولانا کی منفردانہ رائے سے قطع نظر، مقالہ شاہ صاحب کی حکمت کا اجمالی تعارف ہی نہیں فی الحقیقت آپ کے علمی کام (تجدید فی العلوم الشرعیہ) سے واقفیت اور علی وجہ البصیرت واقفیت کے لئے اس میں کافی سامان ہے اور ولی اللہی علوم و معارف کے لئے بجا طور پر اس مقالے کو بنیادی لٹریچر قرار دیا جاسکتا ہے نیز اس کے مطالعہ کے بعد ہی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ولی اللہی حکمت پر مولانا کی نظر کس قدر گہری ہے اور شاہ صاحب کے علوم و معارف کا انہوں نے کس قدر عمیق مطالعہ فرمایا ہے"۔ مولانا سید سلیمان ندوی (مرحوم) نے مولانا سندھی کے اس مقالے کو پڑھ کر مدیر الفرقان کو لکھا تھا۔ "مولانا سندھی کے مضمون کو میں نے بغور پڑھا۔ اور اس یقین کے ساتھ ختم کیا کہ بیشک مولانا کی نظر حضرت شاہ صاحب کے فلسفہ الٰہی نظریات پر نہایت وسیع اور عمیق ہے"
(مدیر)

انڈیا کمپنی کے دورے کر رہی تھی۔

ہندوستان کو مذکورہ بالا سلاطین کے عہد میں کن کن لرزہ خیز واقعات و حوادث سے گزرنا پڑا۔ تاریخ ہند کا ہر طالب علم جانتا ہے سادات بارہ کا تسلط فرخ سیر کا انکی قید میں بصد بے کسی مرنا۔ تورانی امراء کے ہاتھوں سادات بارہ کا زوال مرہٹوں کی بغاوت اور ان کا عروج، سکھوں کی بغاوت، نادر شاہ کی یلغار اُسکے حکم سے دہلی میں قتل عام، احمد شاہ ابدالی اور معرکہ پانی پت سیاست ہند میں روہیلوں کی شرکت، ایرانی اور تورانی امراء کی باہمی چپقلش، ہندوستان پر یورپین اقوام کی للچائی ہوئی نظریں پھر بنگال اور بہار وغیرہ میں انگریزوں کا عمل دخل یہ اور اس قسم کے اور حوادث شاہ ولی اللہ نے اس تمام عرصے میں اپنی آنکھوں سے دیکھے۔

ہندوستان کی مغل سلطنت جس اضطراب سے گزر رہی تھی، ظاہر ہے شاہ صاحب اسے اچھی طرح جانتے تھے۔ بعد میں جب آپ حجاز تشریف لے گئے اور تقریباً دو سال وہاں رہے تو اس اثنا میں وہ ترکوں کی عثمانی سلطنت اور دوسری اسلامی حکومتوں کے حالات کا بھی مطالعہ کرتے رہے چنانچہ آپ ایک خط میں لکھتے ہیں "ہندوستان کے احوال ہم پر مخفی نہیں ہیں کہ وہ فقیر کا مولد و منشاء ہے ہم نے بلادِ عرب بھی دیکھے ہیں۔ اور ولایت کے لوگوں کے احوال وہاں کے ثقہ افراد سے سنے ہیں" ان واقعات و حوادث سے شاہ صاحب کا متاثر ہونا لازمی تھا۔ یہ تو ہوا سیاسی ماحول جس میں شاہ صاحب پیدا ہوئے جس میں انکی عمر گزری اور اس میں ہونیوالے واقعات و حوادث سے متاثر ہوئے۔

امام ولی اللہ کے افکار دینی اور فنونِ حکمت سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ سیاسی ماحول کے ساتھ ساتھ ان کا علمی پس منظر بھی ہمارے سامنے ہو نیز تعلیم و مطالعہ کے ذریعہ شاہ صاحب نے جو تحصیلی ملکات بہم کئے تھے، ان سے ہم واقف ہوں اور جن مشائخ اور اساتذہ کے فیض صحبت سے انکے ذہن کو جلا بخشی ان کا ہمیں اجمالی طور سے علم ہو۔

شاہ صاحب اپنی کتاب "جزو لطیف" میں اپنے زمانہ طالب علمی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

جب میری عمر پانچ سال کی ہوئی تو فقیر مکتب میں داخل ہوا۔ ساتویں برس والد بزرگوار نے نماز پڑھوائی اور روزہ رکھنے کی تلقین فرمائی۔ اسی سال ختنہ کی رسم بھی ادا ہوئی مجھے یاد پڑتا ہے کہ اسی سال کے آخر میں میں نے قرآن عظیم ختم

کیا۔ دس سال کی عمر میں شرح ملّا جامی پڑھی۔ اور عام مطالعہ کی راہ میسر کرنے کھُل گئی۔ چودھویں برس میری شادی کردی گئی۔ اور اس معاملے میں والد بزرگوار نے بڑی عجلت سے کام لیا۔ پندرہ سال کا تھا کہ میں نے اپنے والد کے دست مبارک پر بیعت کی اور تصوف کے اشغال میں لگ گیا اور اس میں خاص طور پر نقشبندی مشائخ کے طریق کو اپنا مقصود بنایا۔ اسی سال تفسیر بیضاوی کا ایک حصہ پڑھا۔ اس سال والد بزرگوار نے وسیع پیمانے پر کھانے کا انتظام کیا اور خواص اور عوام کو دعوت دی۔ اور اسی موقع پر مجھے درس دینے کی اجازت دی گئی۔ الغرض اپنی عمر کے پندرھویں سال اپنے ملک کے دستور کے مطابق جو ضروری علوم و فنون تھے میں ان سے فارغ ہوگیا۔ سترہ سال کا تھا کہ حضرت والد رحمتِ حق سے جا ملاقی ہوئے انکی وفات کے بعد فقیر بارہ سال تک علوم دینیہ و عقلیہ کی کتابیں پڑھاتا رہا اور ہر علم میں فکر و غور جاری رکھا۔

امام ولی اللہ کی تربیت کرنے والوں میں سب سے پہلے آپ کے والد شاہ عبدالرحیم متوفی ۱۱۳۱ھ ہیں آپ نے اپنے والد اور انکے رفقاء سے جو علوم و معارف حاصل کئے ان میں قرآن مجید کا ترجمہ، حکمت علی اور اشراق کے ذریعہ علمی حقائق کا انکشاف خاص طور سے انکی توجہ کا مرکز بنے رہے۔

قرآن عظیم کے ترجمے کے سلسلہ میں امام ولی اللہ لکھتے ہیں۔ اس فقیر پر بڑی نعمتوں میں سے ایک نعمت یہ بھی ہے کہ مجھے متعدد بار اپنے والد بزرگوار کے درس قرآن میں حاضر ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ آپ قرآن کے معنی بڑے غور و تدبر سے بیان فرماتے تھے۔ آیات کی شان نزول کی وضاحت کرتے اور حل طلب امور کے لئے تفسیروں کی طرف رجوع کیا جاتا۔ اسکی وجہ سے میرے سامنے فتح و کامیابی کا ایک میدان کھُل گیا۔ والد بزرگوار کا یہ دستور تھا کہ اپنے رفقاء کے حلقے میں ہر روز تین رکوع سے کم تعداد میں قرآن کی تلاوت کرتے اور اسکے معنی پر غور و خوض فرماتے۔ شاہ عبدالرحیم قدس سرہٗ حکمت علی سکھانے پر خاص طور سے زور دیتے تھے۔ امام ولی اللہ اپنے والد بزرگوار کے اس رجحان فکر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"حضرت شجاعت، فراست، کفایت، غیرت وغیرہ اخلاق سلیمہ میں درجۂ کمال پر تھے۔ نیز دینی اور مابعد الطبیعاتی علوم میں درک کامل رکھنے کے ساتھ ساتھ آپ عقل معاشی سے بھی جو انسانی زندگی کی معاشی اور اجتماعی ضرورتوں کا ذریعہ ہے پورے طور سے بہرہ ور تھے۔ آپ اپنی مجلس میں اکثر حکمت علی اور کاروبارِ زندگی کے معاملات

کے آداب کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ شاہ عبدالرحیم کے ایک استاد میر محمد زاہد ہروی تھے۔ آپ کا حکمت عملی کی طرف رجحان غالباً انہیں کا فیضان ہے۔ میرزاہد شاہ جہاں اور عالمگیر کے عہد میں سلطنت کے بڑے بڑے عہدوں پر رہے تھے۔ موصوف کا سلسلۂ تلمذ محقق جلال الدین دوانی متوفی ۹۲۸ھ پر ختم ہوتا ہے۔ ترک سلطان محمد خاں فاتح نے قسطنطنیہ پر قبضہ کرنے کے بعد جب یورپین اقوام کو اسلام سے آشنا کرنا ضروری سمجھا تو اس نے جن معاصر علماء کو شریعت اسلام اور حکمت، و فلسفہ کی تطبیق پر متوجہ کیا۔ ان میں سے ایک محقق دوانی تھے اس زمانے میں اکثر افاضل حکمت عملی کی طرف زیادہ توجہ نہیں کرتے تھے مگر جلال الدین دوانی نے محقق نصیر الدین طوسی متوفی ۶۷۲ھ کے بعد اخلاق جلالی نام کی کتاب لکھ کر اس فن کو زندہ کر دیا۔

شاہ عبدالرحیم کے اس رجحان فکر کے برعکس علم متکلمین نے ارسطو کی نظری حکمت کو اپنا مطمح نظر بنا رکھا تھا۔ اور ان کا سارا زور قیاس آرائیوں اور استدلالی بحثوں پر صرف ہوتا تھا۔ وہ عملی زندگی کی ضرورتوں سے بے خبر تھے اور حکمت عملی سے کوئی سروکار نہ رکھتے تھے لازمی طور سے اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ "علم کلام" میں دلچسپی لینے والے فقہا اور متکلمین قومی زندگی کی ضروریات میں تدبر اور تفکر سے محروم ہو گئے۔

یہ تھی فکری بنیاد جو شاہ ولی اللہ کو اپنے والد سے اس ضمن میں ورثے میں ملی، اور اس پر انہوں نے ایک عظیم الشان عمارت کھڑی کر دی۔ شاہ عبدالرحیم جس حکمت عملی کی تعلیم دیتے تھے اس سے مراد مطلق حکمت عملی ہے۔ قرآن عظیم کی حکمت عملی، یہ شاہ ولی اللہ کا اپنا استخراج ہے۔ شاہ صاحب سے بہت پہلے اکبر اعظم کے دور میں ہندوستان کی اسلامی سوسائٹی میں حکمت عملی کی طرف خاص توجہ کی جانے لگی تھی۔ ابوالفضل نے اسی حکمت عملی کی اساس پر اکبری نظام کی بنا رکھی تھی اور محمد شاہ کے عہد تک سلطنت کے کاروبار کا مرکزی فکر یہی رہا۔ شاہ ولی اللہ اسی حکمت عملی کو قرآن کے تعارف کا ذریعہ بناتے ہیں۔ اور اسے قرآن کے علمی تصورات کے تابع کرتے ہیں۔

شاہ ولی اللہ کی شہرۂ آفاق تصنیف "حجتہ اللہ البالغہ" کو اگر غور سے پڑھا جائے تو اس میں ایک امتیازی وصف یہ نظر آتا ہے کہ جہاں وہ رفاہ عامہ کے اداروں یعنی ارتفاقات کا ذکر کرتے ہیں وہاں حکمت عملی کو پیش نظر رکھتے ہوئے تمام احادیث کو انہیں ابواب پر تقسیم کر دیتے ہیں اور پھر خاص خاص موقعوں پر حدیث کے ذیل میں حکمت عملی کا کوئی نہ کوئی نکتہ ذکر کرتے جاتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ اپنے حالات میں جہاں دوسرے انعامات الہیہ

کا ذکر کرتے ہیں، وہاں یہ بھی لکھتے ہیں۔

"حکمت عملی جس پر اس عہد میں خیر و برکت کا انحصار ہے کارساز قدرت نے مجھے اس کا وافر حصہ عطا فرمایا اور اس امر کی توفیق دی کہ میں کتاب و سنت اور صحابہ کے آثار کی روشنی میں حکمت عملی کے اصول و ضوابط کو مدوّن کروں"

قرآن مجید کے ترجمے اور حکمت عملی کے بعد علم کا تیسرا شعبہ جو شاہ ولی اللہ کی خصوصی توجہ کا مرکز رہا وہ اشراق تھا۔ متاخرین صوفیار میں سے شیخ اکبر محی الدین ابن عربی متوفی ۶۳۸ھ اس صنف علم کے امام تھے اور شاہ عبدالرحیم ابن عربی کے اس فلسفہ کے ایک ماہر استاد تھے۔ موصوف اپنے بھائی شاہ ابوالرضاء محمد کے شاگرد ہیں اور دونوں بھائی خواجہ باقی اللہ کے صاحبزادے خواجہ عبداللہ المعروف بہ خواجہ خورد کے صحبت یافتہ تھے۔ خواجہ باقی باللہ دہلوی نظریہ وحدت الوجود کے بہت بڑے امام تھے انکی امامت اشراقی طرز کی تھی۔ وحدت الوجود کے مقابلے میں امام ربّانی مجدد الف ثانی نے جو حضرت خواجہ باقی باللہ کے مرید تھے وحدت الشہود کا نظریہ پیش کیا تھا۔ خواجہ خورد اور شاہ عبدالرحیم اور شاہ ابوالرضا محمد امام ربّانی سے پوری طرح مستفید ہوئے لیکن ان کا میلانِ فکر وحدت الوجود ہی کی طرف رہا۔

اس سلسلے میں امام ولی اللہ نے اپنی کتاب "انفاس العارفین" میں والد اور چچا کے مقالات اور مقامات کا اس طرح ذکر کیا ہے کہ ان سے شرائع الہی اور نظریہ وحدت الوجود میں پوری تطبیق ہو جاتی ہے۔ ان دونوں بھائیوں کے مخصوص افکار اور نظریات کا ماحصل اور لب لباب یہ تھا کہ ایک ایسی شاہراہ فکر کی طرح ڈالی جائے جس پر صوفیار و متکلمین نیز فقہا ساتھ ساتھ چل سکیں۔ کشف یعنی وجدان، اور عقل و نقل کو الگ الگ اپنے اپنے لئے مشعل راہ بنانے اور صرف ایک ایک میں خصوصی مہارت پیدا کرنے سے اہل علم جدا جدا فرقوں میں بٹ گئے تھے۔ شاہ صاحب کے والد اور چچا کی کوشش یہ تھی کہ ان فرقوں کا آپس کا افتراق اور اختلاف مٹ جائے اور ان گروہ بندیوں سے اسلامی ذہنیت جو زنگ آلود ہو رہی تھی وہ پھر نکھر کر اپنے جوہر دکھا سکے۔

امام ولی اللہ اپنے زمانے کی تین چیزوں کا خصوصیت سے ذکر کرتے ہوئے "تفہیمات" میں لکھتے ہیں ان میں سے ایک برہان یعنی عقل ہے۔ حکمت عملی اس کا ایک شعبہ ہے اسکی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ مسلمانوں میں یونانی علوم فلسفہ و منطق کا رواج ہو چکا ہے اور وہ علم کلام سے دلچسپی لیتے ہیں دوسرا وجدان اشراق یا کشف ہے۔ فرماتے ہیں اس زمانے میں لوگ شرفاء غربا صوفیہ کے علوم قبول کرنے پر متفق ہیں یہاں تک کہ ان کے اقوال اور حالات

لوگوں کے لئے کتاب اور سنت سے بھی زیادہ مرغوب خاطر ہیں۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اس بنا پر وجدان اشراق یا کشف اس زمانے میں ایک ضروری موضوعِ علم بن گیا ہے تیسری چیز ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول علوم، اور ان میں قرآن عظیم خاص طور سے قابل ذکر ہے اسکے ساتھ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اہل عصر فقہ کے مختلف اصناف میں بھی اختلاف کر رہے ہیں خصوصاً حنفی اور شافعی اور ان میں سے ہر فرقہ اپنے اساتذہ کی ہیچ کرتا ہے۔ ان حالات میں طبعی طور سے امام ولی اللہ کو اپنی دعوتِ تجدید کے ضمن میں ان تین امور کی اصلاح کی طرف خاص توجہ کرنی پڑی۔

شاہ ولی اللہ اور انکے والد کے زمانے میں فقہا، اور مفسرین نے عوام مسلمانوں کی روزمرہ کی زندگی سے قرآنی تعلیمات کو بحیثیت مجموعی خارج کر دیا۔ لہٰذا ضرورت تھی کہ قرآن مجید کو عامۃ المسلمین کے ذہنوں کے قریب لایا جاتا تاکہ انکی تربیت قرآن کے اصولوں پر ہو سکتی، شاہ صاحب کے زمانے میں ہندوستانی مسلمانوں کی رسمی زبان فارسی تھی۔ آپ نے قرآن کو ہندوستانی مسلمانوں کے لئے قابل فہم بنانے کی خاطر اس کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا۔ اور اس پر تشریحی فوائد لکھے۔

قرآن مجید کی آیات محکمات و متشابہات کے متعلق ایک عرصہ دراز سے جو ذہنی الجھاؤ آرہا تھا شاہ صاحب نے اسے دور فرمایا۔ یہ واقعہ ہے کہ قرآن حکیم نے اپنی آیات کو محکمات اور متشابہات میں تقسیم کیا ہے اور عام طور سے اہل علم متشابہات میں بحث کرنا ناممکن سمجھتے ہیں لیکن اس ضمن میں دقت یہ ہے کہ آیات متشابہات کی کوئی ایسی متفقہ علیہ واضح تعریف نہیں جسکی بنا پر یہ فیصلہ کیا جاسکے کہ فلاں فلاں آیات محکمات ہیں اور فلاں فلاں متشابہات ہیں جن میں کہ گفت گو نہیں کی جاسکتی متشابہات کے غیر معین ہونے اور ان میں بحث کو ناممکن سمجھنے کا یہ اثر ہوا کہ ایک تو سارے کا سارا قرآن قابل فہم نہ رہا دوسرے متشابہات میں غور نہ کرنا ایک اصول اور عقیدہ بن گیا۔ ایک کتاب کی نسبت جب یہ عقیدہ ہو جائے کہ اسکے بعض حصے اور طرفہ بات یہ ہے کہ ان بعض حصوں کا تعین بھی نہ ہو فہم سے بالاتر ہیں تو متوسط عقل رکھنے والوں کے لئے ساری کی ساری کتاب مشتبہ ہو جاتی ہے اور اسکی تعلیمات اور احکام کے بارے میں وہ عزم و یقین پیدا نہیں ہو سکتا جو عمل کے لئے ضروری ہوتا ہے۔

شاہ صاحب نے اس غلط فکر کی اصلاح کی طرف توجہ فرمائی اور راسخین فی العلم کے لئے آیات متشابہات کے معنی کا تعین ممکن ثابت کیا۔

قرآن کی آیات ہی کے ضمن میں ایک اور مسئلہ ناسخ و منسوخ کا ہے علماء کے نزدیک قرآن کی بعض آیات ہیں

جو دوسری آیات کو منسوخ کرتی ہیں اس مسئلے میں مزید الجھن اس بات سے بھی ہوئی کہ اہل علم متفقہ طور پر یہ فیصلہ نہیں کر سکے کہ قرآن مجید کی فلاں فلاں آیت منسوخ ہے - ایک عالم ایک آیت کو منسوخ قرار دیتا ہے اور دوسرا ہے کہ اسکی تنسیخ کا قائل نہیں۔

شاہ صاحب نے ناسخ و منسوخ کے اس مسئلہ کو اطمینان بخش طریقے سے حل کیا انہوں نے صرف پانچ آیات کو منسوخ مانا ہے لیکن اس میں بھی انکی حکمت ہے تاکہ معتزلی ہونے کا الزام نہ لگے ورنہ ان پانچ آیات کا بھی منسوخ نہ ہونا ثابت کیا جا سکتا ہے ہمارے خیال میں شاہ صاحب کا اصل مقصود یہ ہے کہ قرآن مجید میں سرے سے کوئی آیت منسوخ نہیں۔

قرآن مجید کا خطاب ساری انسانیت کو ہے اور اسکی دعوت میں پوری عمومیت ہے۔ اور گو ائمہ فقہا نے اصول فقہ میں بالاتفاق اس امر کی صراحت کی ہے کہ اگر قرآن عظیم کی کوئی آیت بلفظ عموم نازل ہوئی ہو۔ اور مفسرین اسکی شان نزول کے متعلق کوئی خاص واقعہ ذکر کرتے ہوں، لیکن قرآنی مطالب کی تشریح میں بہر حال عمومیت ہی مد نظر رہے گی اور کسی خاص شخص یا واقعہ سے اس آیت کو مخصوص کر دینا محل اعتبار نہ ہوگا۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس قاعدے پر سب کا اتفاق ہے لیکن عملاً قرآن کی آیات کو مخصوص اشخاص اور واقعات سے مختص کر دینے کا دستور ہو گیا جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ آپ عام اساتذہ اور طلبا کو انہیں جزئی چیزوں میں غور کرتا ہوا پائیں گے۔ قرآن عظیم کو عملاً آیات احکام تک محدود کر دینے نیز اسکی آیات کو عمومی مطالب کے بجائے جزئی واقعات سے مختص کرنے کے اثر یہ ہوا کہ قرآن بحیثیت مجموعی مسلمانوں کی زندگی میں موثر نہ رہا چاہیئے تو یہ تھا کہ وہ ہماری تمام علمی سرگرمیوں میں شعل راہ بنتا لیکن ہوا یہ کہ وہ محض پڑھنے پڑھانے تک محدود ہو کر رہ گیا۔

شاہ ولی اللہ نے اپنی کتاب "الفوز الکبیر" کی ابتدا میں اس غلطی کو نہایت وضاحت سے بیان کیا ہے۔ چنانچہ آیات احکام کے سلسلہ میں وہ فرماتے ہیں کہ اجتماعی طور پر عام بنی نوع انسان میں جو بداخلاقیاں اور بداعمالیاں ظہور پذیر ہوتی رہی ہیں ان آیات کا سبب نزول انکو سمجھنا چاہیئے یہاں کسی زمانے اور قوم کی تخصیص نہیں عرب ہوں یا عجم، آج کا زمانہ ہو یا کوئی پہلے کا گزرا ہوا دور، جہاں بھی یہ خرابیاں پیدا ہونگی قرآن کی ان آیات کا انطباق ان پر ہوگا اس ضمن میں "الفوز الکبیر" کی عبارت ملاحظہ ہو۔

"تحقیق شدہ امر یہ ہے کہ جہاں بھی برُے اعمال اور ظلم کا وجود ہوگا۔ وہ ان آیات کا سبب نزول سمجھا جائے گا۔"

قرآن مجید کے مطالب کے احصار اور انکی تشریح میں شاہ صاحب کی کتاب "الفوز الکبیر" ایک غیر معمولی کتاب ہے اسکے مقدمہ میں آپ نے قرآن مجید کے جملہ مطالب اور معانی کو پانچ علوم میں تقسیم کیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں۔

"تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ قرآن کے جملہ مطالب و معانی ان پانچ علوم سے باہر نہیں ہیں ان میں سے ایک علم احکام ہے اس

علم سے اس امر کا تعین ہوتا ہے کہ عبادات عام معاملات گھر کے نظم و نسق اور شہروں کی سیاست اور کارگزاری میں کون سی چیز واجب ہے کون سی مندوب اور مباح ہے اور کون سی مکروہ اور حرام ہے اس علم کی تفصیلات پر بحث کرنا فقیہہ کا کام ہے۔

علوم پنجگانہ قرآن میں سے دوسرا علم بحث و مناظرہ کا ہے۔ اس میں چار گمراہ فرقوں کے ساتھ استدلال کیا گیا ہے۔ یہ چار فرقے یہود۔ نصاریٰ۔ مشرکین اور منافقین کے ہیں اس علم پر بحث کرنا علم کلام سے متعلق ہے تیسرا علم تذکیر بآلاء اللہ ہے۔ الآء اللہ کے تحت آسمان و زمین کی تخلیق، بندوں کو انکی ضروریات کا الہام کرنا، اور اللہ تعالیٰ کی صفات کاملہ کا بیان آتا ہے۔ چوتھا علم تذکیر بایام اللہ کا ہے۔ "ایام اللہ" کا مقصد یہ ہے کہ اب تک جو واقعات ہو چکے ہیں اور اللہ نے اپنے نیکو کار بندوں کو جن نعمتوں سے نوازا ہے اور نافرمانوں پر جو عتاب ہوئے ہیں۔ تذکیر بایام اللہ میں انکو بیان کیا گیا ہے۔ علوم پنجگانہ میں سے آخری علم تذکیر بالموت و مابعدہ' ہے۔ اس علم کے ذیل میں حشر، نشر، حساب، میزان جنت دوزخ کا بیان آتا ہے۔ ان امور کی تفصیلات پر نگاہ رکھنا اور انکے مطابق احادیث و آثار کو قلم بند کرنا واعظ اور نصیحت کرنیوالے مذکر کا کام ہے۔

علم احکام کے سلسلہ میں رائج الوقت غلطیوں کی شاہ صاحب نے جس طرح اصلاح کی اسکی طرف اوپر اشارہ ہو چکا ہے آپنے دوسرے علوم قرآنی۔ تذکیر بآلاء اللہ، تذکیر بایام اللہ اور تذکیر بالموت و مابعدہ کے اصول مرتب فرمائے تاکہ مسلمان قرآن سے کما حقہ' استفادہ کر سکیں۔

قرآن مجید ہی کے سلسلے میں شاہ صاحب کا ایک بہت بڑا علمی کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اس سوسائٹی کو جس کے لئے بلاغت کے ذریعہ قرآن کا سمجھنا اور سمجھانا ممکن نہ رہا تھا۔ بتایا کہ قرآن کا معجزہ ہونا صرف اسکی فصاحت اور بلاغت کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ جو نظام حیات وہ پیش کرتا ہے وہ اس کا اعجاز ہے۔ شاہ صاحب نے قرآن مجید کی علمی افادیت کو اس کا معجزہ ہونا ثابت کیا۔ چنانچہ اب قرآن کے اس نظام حیات سے ہر شخص خواہ وہ عربی ہو یا عجمی، عامی ہو یا عالم، فلسفی ہو یا سادہ مزاج مستفید ہو سکتا ہے اور اسکے اعجاز کو سمجھ سکتا ہے لیکن اگر قرآن کا اعجاز محض عربی زبان کی فصاحت و بلاغت کا پابند ہو جاتا تو اس صورت میں معدودے چند افراد کے سوا دوسرے لوگ اسکی اعجازی خوبیوں سے محروم رہتے۔

امام ولی اللہ نے قرآن عظیم کے مطالب کو اس شکل میں پیش کرنے پر صرف اکتفا ہی نہیں کیا بلکہ انہوں نے اپنے صحبت یافتہ لوگوں میں سے اس طریقے پر سوچنے والی ایک جماعت پیدا کر دی۔

حدیث و فقہ میں تطبیق۔ شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ اہل عصر فقہ کے مختلف اصناف میں اختلاف کر رہے ہیں، خصوصاً حنفی اور شافعی۔ اور ہر فرقہ اپنے اساتذہ کی پیچ کرتا ہے اور اسی وجہ سے ہر فقہی مذہب میں استخراجی مسائل کی کثرت ہو گئی ہے اور حق کا پتہ لگانا مشکل ہو گیا ہے۔ اب امام ولی اللہ نے ایک طرف تو حنفی اور شافعی فقہ میں ہم آہنگی پیدا کی دوسری طرف حدیث و فقہ میں تطبیق دی اور اسکے ساتھ ساتھ وحدت الوجود اور وحدت الشہود میں جو تضاد بتایا جاتا تھا آپ نے اسے رفع کیا اس ضمن میں شاہ صاحب کو دوران قیام حجاز میں شیخ ابو طاہر مدنی سے علمی استفادہ سے خاص طور پر بڑی مدد ملی۔ شاہ صاحب نے ۱۱۴۳ھ میں حرمین شریفین کا سفر کیا۔ حجاز تشریف لے جانے سے پہلے وہ بارہ سال تک ہندستان میں اپنے والد کی وفات کے بعد دینی اور فلسفی علوم پڑھاتے رہے۔ اس کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں والد بزرگوار کی وفات کے بعد کم و بیش بارہ سال تک دینی اور عقلی علوم کا درس دیتا رہا۔ اس اثنا میں ہر علم میں درک پیدا کیا اور والد مرحوم کے مسلک پر تصوف اور طریقت کی منزلیں طے کیں۔ اس زمانے پر مجھ پر توحید اور وحدت کے عقدے کھلے میرے سامنے جذب و کیف کی راہیں وا ہوئیں سلوک و معرفت کی متاع گراں مایہ سے ایک بڑا حصہ نصیب ہوا اور مجھ پر وجدانی علوم پے بہ پے بڑی مقدار میں نازل ہوئے۔"

شاہ ولی اللہ حجاز میں پورے دو برس رہے زمانہ قیام حجاز میں سب سے بڑے استاد جن سے شاہ صاحب کو معنوی مناسبت پیدا ہوئی شیخ ابو طاہر مدنی متوفی ۱۱۴۵ تھے موصوف زیادہ تر اپنے والد شیخ ابراہیم کردی متوفی ۱۱۰۱ کے تابع اور انہیں کے علوم و معارف کے حامل تھے۔ "ابجد العلوم" میں لکھا ہے کہ شیخ ابراہیم کردی علوم فقہ و حدیث ادب عربی اصول فقہ اور اصول حدیث میں معرفت تامہ رکھتے تھے۔ شیخ عبداللہ عباسی کا قول ہے کہ شیخ ابراہیم کردی کی مجلس باغ بہشت کا ایک نمونہ تھی۔ موصوف فلسفیانہ حقائق کے مقابلے میں صوفیاء کے کلام کو مقدم جانتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اہل فلسفہ کے گرد اصل حقیقت کے قرب و جوار تک پہنچ جاتا ہے لیکن حقیقت کے اصل منبع تک انکی رسائی نہیں ہو سکتی

امام ولی اللہ کی خوش قسمتی تھی کہ شاہ عبدالرحیم اور شیخ ابراہیم کردی دونوں میں کوئی ذہنی بعد نہ تھا اور اپنے اپنے فکری رجحانات میں دونوں ایک دوسرے سے قریب تھے کیونکہ دونوں کا سلسلہ تلمذ محقق جلال الدین دوانی تک پہنچتا تھا۔ ہم نے

شیخ ابراہیم کے بہت سے رسالے دیکھے ہیں موصوف شریعت اسلامیہ کو ابن عربی کے فلسفہ سے حل کرتے ہیں۔
شیخ ابراہیم کے اس رجحان فکر کا اثر انکے صاحبزادے شیخ ابو طاہر کے ہر قول و فعل میں نمایاں نظر آتا ہے۔ شیخ ابراہیم کردی اور شیخ ابُو طاہر مدنی فقہ میں شافعی مذہب رکھتے تھے۔ اور وحدت الوجود کو مانتے تھے دوسری طرف شاہ ولی اللہ کے والد اور چچا حنفی تھے اور اسکے ساتھ ہی وحدت الوجود کو بھی مانتے تھے اس سے شاہ صاحب پر یہ حقیقت واضح ہوئی کہ جہاں تک حقیقت شناسی کا تعلق ہے فقہ حنفی اور فقہ شافعی میں کوئی فرق نہیں ہونا چاہیئے۔ بے شک شاہ صاحب اپنے ملک اور اپنی سوسائٹی کے مزاج اور اسکی عام افتاد کے پیش نظر فقہ حنفی کے پابند تھے، مگر انکی عقلیت فقہ شافعی کی توہین بھی برداشت نہیں کرتی تھی، جیساکہ عام طور پر فقہ کے باہمی جھگڑے اس طرح کی شکل اختیار کرلیتے ہیں۔

حنفی اور شافعی فقہ کی اس ہم آہنگی کو شاہ صاحب اور آگے بڑھاتے ہیں وہ حنفی فقہ کو امام ابو حنیفہ کے شاگرد امام محمدؒ متوفی ۱۸۹ھ کی کتابوں سے اخذ کرتے ہیں اور شافعی فقہ کو براہ راست امام شافعی کی تصانیف سے لیتے ہیں۔ اب امام محمدؒ اور امام شافعی دونوں کے دونوں امام مالکؒ کے شاگرد ہیں اس بنا پر شاہ ولی اللہ یہ قاعدہ تجویز کرتے ہیں کہ فقہ کا اصل الاصول درحقیقت امام مالک کی مؤطا ہے، اور اسی سے مالکی، حنفی اور شافعی مذاہبِ فقہ پیدا ہوئے اس قاعدہ کلیہ کے بعد وہ ایک قدم اور آگے بڑھتے ہیں، چنانچہ وہ دیکھتے ہیں کہ موطا امام مالک تمام تر اہل مدینہ کی فقہ پر مشتمل ہے اور اہل علم مدینہ کی فقہ کا مرکز حضرت عمر فاروق کو قرار دیتے ہیں یعنی نتیجہ یہ نکلا مالکی حنفی اور شافعی فقہ کے مذاہب سارے کے سارے شاہ صاحب کے نزدیک حضرت عمر فاروق کے مذہبِ فقہ کی تشریحیں ہیں۔

مختصراً حضرت عمرؓ کی فقہ اور اہل سنت کے دوسرے مجتہدین کی فقہ میں آپس میں وہی نسبت ہے جو ایک کتاب کے متن اور بعد میں جو اسکی شرحیں کی جاتی ہیں ان میں ہوتی ہے۔ اگر ہم فقہ اسلامی کو اس نقطۂ نظر سے دیکھیں تو مسلمانوں کے لئے اس بات کو سمجھنے میں دقت نہیں ہوتی کہ اصل شریعت تو ایک ہی ہے اور فقہ کے یہ حنفی، شافعی اور مالکی مذاہب اسکے مختلف شعبے ہیں اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ عوام ہر فقہی مذہب کو ایک مستقل دین اور ایک جداگانہ ملت سمجھنے کی گمراہی میں مبتلا نہ ہونگے اس طرح ملت اسلامیہ کے مجموعی احکام کے بارے میں انکے ذہنوں میں شک و شبہ نہ پیدا ہوسکے گا۔ اور باہمی اختلافِ فقہ انتشارِ فکر اور تشویش ذہنی کے باعث نہ ہوگا۔

یہ مسائل اس رنگ میں متقدمین کی کتابوں میں ہمیں کہیں نظر نہیں آئے اور ہماری رائے میں شاہ ولی اللہ کا یہ طرز فکر

اور علمی کمال نتیجہ ہے اس تربیت کا، جو انہیں اپنے والد اور چچا کے افکار و تعلیمات سے ہندوستان میں ملی اور بعد میں حجاز میں شیخ ابوطاہر مدنی کے فیضِ صحبت سے انکی اس ذہنی تربیت کو اکمال نصیب ہوئی۔

وحدت الوجود اور وحدت الشہود میں تطبیق - شیخ اکبر نے وحدت الوجود کا تصور پیش کیا تھا اور امام ربانی نے وحدت الشہود کی دعوت دی۔ شاہ صاحب کے نزدیک اگر ارباب فکر و عمل کا کوئی گروہ بنیادی طور سے متحد الخیال ہو تو وہ انکی تعبیرات کے اختلاف میں نہیں جاتے۔ بلکہ انکے اقوال کو جمع کر کے ان میں باہم مطابقت پیدا کر دیتے ہیں۔ شاہ صاحب کے اس علمی کمال کی ایک مثال وحدت الوجود اور وحدت الشہود کی تطبیق ہے۔ انہوں نے شیخ اکبر اور امام ربانی دونوں کے ان تصوراتِ توحید میں بظاہر جو تضاد نظر آتا تھا، اسے رفع کیا اور دونوں کو اصلاً ایک ثابت کیا۔ تطبیق کے اس عمل میں وہ تعبیرات کے اختلاف کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ شاہ صاحب نے "مکتوب مدنی" میں اس مسئلے کو بڑی وضاحت سے پیش کیا ہے۔

"مکتوب مدنی" کے شروع میں وہ لکھتے ہیں :- "اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہمیں اس زمانے میں یہ سعادت نصیب ہوئی ہے کہ ہمارے سینے میں اس امت کے علماء کے سب علوم جمع ہو گئے ہیں کیا معقولات، کیا منقولات اور کیا کشف و وجدان کے علوم ہمیں خدا نے یہ توفیق دی ہے کہ ایک علم کو دوسرے پر تطبیق دے سکتے ہیں اس طرح بظاہر ان میں جو اختلافات ہوتے ہیں، وہ ختم ہو جاتے ہیں اور ہر بات اپنی حد پر ٹھیک بیٹھ جاتی ہے اور ان میں کوئی تناقض نہیں رہتا۔

مختلف اور متعارض اقوال میں ہمارا تطبیق کا یہ اصول علم کے تمام فنون پر حاوی ہے اسکے تحت فقہ بھی آتی ہے علم کلام بھی آتا ہے اور تصوف کے مسائل بھی" شاہ صاحب اسی اصول کے تحت فقہا کے مختلف مذاہب میں تطبیق دیتے ہیں اور پھر صحیح حدیثوں اور فقہاء کے اقوال میں مطابقت ثابت کرتے ہیں اسکے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو قرآن مجید سے مستنبط قرار دیتے ہیں۔ پھر ادیان اور ملتوں میں جو اختلافات ہیں انکو وہ ایک قاعدے میں لاتے ہیں اسی طرح تصوف میں توحید ذات خداوندی کے متعلق وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے جو طرز خیال ہیں "مکتوب مدنی" میں وہ ان کے باہمی اختلاف کو رفع کر کے ان کو ایک نقطہ پر جمع کر دیتے ہیں۔

امام ولی اللہ نے اپنے ان افکار و خیالات کی اشاعت کی غرض سے بیسیوں کتابیں لکھیں وہ سب دہلی کی علمی زبان عربی اور عام پڑھے لکھوں کی زبان فارسی میں تھیں ان کتابوں میں انہوں نے اپنی دعوتِ تجدید کے اصول و مسائل منضبط کر دیئے۔ اور صرف اسی پر اکتفا نہیں فرمایا۔ بلکہ اس دعوت کو عملی شکل دینے کے لئے پروگرام بھی وضع کیا۔

دعوت کی عمومیت۔ شاہ صاحب کے پروگرام کی صحیح نوعیت سمجھنے کے لئے یہ حقیقت پیش نظر رہنی چاہیئے کہ ان کی حیثیت امت محمدیہ میں ایک عظیم الشان صدیق اور حکیم کی ہے اس طرز فکر کے ارباب کمال انبیاء کی تمام انسانیت کو اپنا مخاطب بناتے ہیں گو بظاہر انکی دعوت اپنی قوم کے لئے ہوتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ امام ولی اللہ کا روئے سخن دراصل تمام انسانیت کی طرف تھا۔ چنانچہ وہ اپنی کتاب "بدور بازغہ" میں ارتفاقات کے ذیل میں لکھتے ہیں :- "ہم نے یہاں ان ارتفاقات (اجتماعی اداروں) کے احکام اور ان سے متعلقہ علوم کے بیان میں بڑی تفصیل سے کام لیا ہے لیکن اس ضمن میں دو باتیں ضرور پیش نظر رہنی چاہئیں ایک تو یہ کہ ہم ارتفاقات کی وضاحت کے سلسلہ میں عموماً ایک معین مثال کا ذکر کرتے ہیں لیکن اس سے ہمارا مقصد صرف یہی مثال نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ یا اس جیسی کوئی اور یا اسی کے لگ بھگ کوئی دوسری صورت بھی ہو سکتی ہے ہمارا اصل مقصود تو یہ ہے کہ وہ عمومی قواعد جن کو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں ان پر ارتفاقات (اجتماعی ادارے) پورے اتریں۔ ظاہر ہے یہ ادارے ہر قوم اور ہر ملک میں ایک سے نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ ہر قوم کی اپنی خاص عادتیں اور اپنے مخصوص علوم ہوتے ہیں۔ لیکن ضرورت اس امر کی ہوتی ہے کہ یہ ادارے عمومی قواعد کیمطابق ہوں۔ خواہ ظاہری شکل و صورت میں ایک دوسرے سے جدا جدا ہی ہوں۔"

اس امر خاص کی اس سے زیادہ تفصیل "بدور بازغہ" کے تیسرے مقالے کے شروع میں ہے۔ چنانچہ شاہ صاحب فرماتے ہیں :- "تمہیں جاننا چاہیئے کہ یہ تمام ارتفاقات (اجتماعی ادارے) جن پر انسانی نظام تمدن کی عمارت کھڑی ہے اور کل کے کل اقترابات (قرب الہی کے وسائل) جو انسانوں کی فطرت میں ودیعت کئے گئے ہیں مثلاً احسان، عبادت، اور برائیوں سے اجتناب وغیرہ وغیرہ یہ ایسے امور ہیں، جو مختلف شکلوں میں ہمارے سامنے آتے ہیں انکے قاعدے کلیئے تو ایک ہیں لیکن انکی صورتیں الگ الگ ہوتی ہیں (شاہ صاحب نے یہاں نکاح کی مثال دی ہے)، یہی حال تقرب الی اللہ کا ہے۔ کبھی تو اس منزل تک انسان یوں پہنچتا ہے کہ وہ انسانی خواص کا جا انکار کر خدا کی ذات میں اپنے آپ کو گم کر دے۔ اور تقرب الی اللہ کا ایک راستہ یہ ہے کہ اپنے اعضا جوارح کی صحیح تربیت کی جائے۔ اور انسانی خواص کے دائرہ میں رہتے ہوئے اللہ سے تقرب چاہا جائے۔ اسی پر ان تمام بڑے بڑے مسائل کا قیاس کر لو، جو ارتفاقات اور اقترابات کے سلسلہ میں ہم نے بیان کئے ہیں اور بتایا ہے کہ انکی شکلیں اور صورتیں مختلف ہو سکتی ہیں"

قدرتی بات تھی کہ اپنے قواعد کلیہ کی تشریح کے ذیل میں شاہ صاحب ملّت حنیفی ہی کے نقطۂ نظر سے ارتفاقات اور اقترابات کی مثالیں دیتے چنانچہ اسکی وضاحت میں وہ فرماتے ہیں: ”اس سے پہلے ملّت حنیفی کے نقطۂ نظر سے ہم ارتفاقات اور اقترابات کی بہت سی شکلیں پیش کر آئے ہیں تم کہیں اسکی وجہ سے غلطی میں نہ پڑ جانا۔ ان کا ذکر محض مثال کے طور پر تھا اس سے زیادہ اس ذکر سے ہمارا اور کوئی مقصد نہ تھا اور پھر یہ بھی نہ سمجھ لینا کہ اصل حقیقت صرف ارتفاقات اور اقترابات کی ان بیان کردہ شکلوں تک محدود ہے بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ جہاں تک اس معاملے میں اصل حقیقت کا تعلق ہے، کوئی ملّت یا مذہبی گروہ ایسا نہیں جو اصل حقیقت کا اعتراف نہ کرے۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ وہ اسکے احکام کو بجا نہ لائے۔ جھگڑا اصل حقیقت کے معاملے میں نہیں ہوتا۔ نزاع اور اختلافات اس حقیقت کو مختلف شکلوں میں پیش کرنے پر ہوتے ہیں“

ان اقتباسات سے صاف ظاہر ہے کہ امام ولی اللہ کی تصانیف میں جس قدر قواعد کلیہ مذکور ہیں وہ دراصل ان کے فلسفہ وحکمت کے اساسی اصول ہیں فی الحقیقت انسانیت عامہ کو اسی کی دعوت دی گئی ہے اور اس ضمن میں جس قدر شریعت کے مسائل بیان کئے گئے ہیں وہ ان قواعد کی مثالیں ہیں ان عمومی قواعد کو ان مخصوص مثالوں میں منحصر نہیں سمجھنا چاہیئے انسانیت کی اس اساس فکر پر جسکی دعوت شاہ صاحب دیتے ہیں متدین اقوام کے عقلمند افراد ایک بین الاقوامی نقطۂ وحدت پر جمع ہو سکتے ہیں اور قرآن عظیم کے خصوصی قانون نے اس بین الاقوامی سپرٹ کو صحیح اصول پر محفوظ کر دیا ہے۔

شاہ ولی اللہ جیسے عظیم حکیم اور صدیق دعوت وتبلیغ میں اپنی قوم کی تخصیص محض اس لئے کرتے ہیں کہ اس طرح وہ اپنی قوم کے تعلیم یافتہ حصے کو دنیا کے سامنے علمی نمونہ بنا سکیں۔ شاہ صاحب کی کتابیں زیادہ غور سے پڑھی جائیں تو یہ محسوس ہوگا کہ وہ اپنی قوم کے ہر فرد کو انسانیت عامہ کی تعلیم کے لئے تیار کر رہے ہیں۔

اصلاحی پروگرام — امام ولی اللہ نے اپنے اصلاحی پروگرام کے دو اصول معین کئے۔

۱۔ قرآن عظیم کی حکمت عملی یعنی انسانوں کی عملی زندگی کے متعلق قرآنی تصورات ہی حقیقت میں ایک معجزہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ اساس علمی اصلاح کے لئے تجویز ہوا۔

۲۔ معاشرت، اجتماع، حکومت اور ملت میں تمام اخلاقی اور عملی خرابیوں کا باعث دراصل معاشی اور اقتصادی عدم توازن ہے۔

عام طور سے تصوف فلسفۂ اخلاق سے شروع ہوتا ہے گو حیوانی زندگی کے لئے اقتصادی ضروریات کا اعتراف کیا جاتا ہے لیکن انسانیت کے ساتھ اقتصادیات کا جو تعلق ہے اس پر کسی نے توجہ نہیں کی اسکی وجہ سے ہماری سیاست کھوکھلی ہو گئی ہمارے بڑے بڑے عقلمند اور زیادہ با اخلاق صوفیا رسکے سب اجتماعی سیاست سے دُور رہنا اپنا کمال سمجھتے رہے۔ اسکے برعکس شاہ صاحب نے زندگی کی اس حقیقت کو اسکی صحیح شکل میں پہچانا اور بار بار اپنی کتابوں میں اسکی طرف توجہ دلائی حجۃ اللہ البالغہ میں ارشاد ہوتا ہے — اگر کسی قوم میں تمدن کی مسلسل ترقی جاری رہے تو اسکی صنعت و حرفت اعلیٰ کمال پر پہنچ جاتی ہے اسکے بعد اگر حکمراں جماعت آرام و آسائش اور زینت و تفاخر کی زندگی کو اپنا شعار بنالے تو اس کا بوجھ قوم کے کاریگر طبقات پر اتنا بڑھ جائے گا کہ سوسائٹی کا اکثر حصہ حیوانوں جیسی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوگا انسانیت کے اجتماعی اخلاق اس وقت برباد ہو جاتے ہیں جب کسی جبر سے انکو اقتصادی تنگی پر مجبور کر دیا جائے اس وقت وہ گدہوں اور بیلوں کی طرح روٹی کمانے کے لئے کام کرینگے۔ جب انسانیت پر ایسی مصیبت نازل ہوتی ہے تو خدا تعالیٰ اسے اس سے نجات دلانے کے لئے کوئی راستہ ضرور الہام کرتا ہے یعنی ضروری ہے کہ قدرت الہیہ انقلاب کے سامان پیدا کر کے قوم کے سر سے ناجائز حکومت کا بوجھ اُتار دے چنانچہ قیصر و کسریٰ کی حکومت نے یہی وطیرہ اختیار کر رکھا تھا اس مرض کے ازالے کے لئے امیین (عربوں) میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پیدا کیا گیا فرعون کی ہلاکت اور قیصر و کسریٰ کی تباہی اسی اصول پر لوازم نبوت سے شمار ہوتی ہے۔

اس ضمن میں شاہ صاحب نے دہلی کے بادشاہوں اور امیروں کی مثالیں بھی دی ہیں۔ اور بتایا ہے کہ انکی حالت بھی قیصر و کسریٰ کے لگ بھگ جا پہنچتی ہے۔

شاہ صاحب کے نزدیک انسانوں کی اجتماعی زندگی کے لئے اقتصادی توازن ایک ضروری امر ہے اور ہر انسانی جماعت کو ایک ایسے اقتصادی نظام کی ضرورت ہے جو اس کی ضروریات زندگی کا کفیل ہو جب قوموں کو اقتصادی ضرورتوں سے اطمینان نصیب ہوتا ہے تو پھر کہیں وہ اپنے خالی وقت میں جو انکے پاس کسب معاش کے بعد بچ رہتا ہے زندگی کے ان شعبوں کی ترقی اور تہذیب کی طرف متوجہ ہو سکتے ہیں جو انسانیت کا اصل جوہر ہیں لیکن اگر ان کی اقتصادی ضروریات ہی فراہم نہ ہوں، اور انکی وجہ سے حیوانی زندگی ٹھٹھر کر رہ جائے تو انسانیت کے اعلیٰ مقامات کا کسے ہوش رہے گا۔ اقتصادی نظام کے درست اور متوازن ہونے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس زندگی میں انسانی اجتماع کے

اخلاق تکمیل پذیر ہو سکتے ہیں جب انسان کے اخلاق اس دنیا میں سُدھر گئے۔ اور تہذیب نفس کے ذریعہ اس نے اپنے اخلاق کی تکمیل کرلی، تولازمی طور سے موت کے بعد دوسری زندگی میں اسکے لئے قبراور حشر کی مصیبتیں آسان ہوجائیں گی۔ اخلاق کی یہ تکمیل ہی اسے جنت کا حق دار بنائے گی اور اسکی آخری ارتقائی منزل یہ ہے کہ انسان اپنے رب کی رویت سے بہرہ ور ہو۔

اگرانسانی اجتماع کو ترقی کی اس راہ پر چلانا نبوت کا اصل مقصد سمجھ لیا جائے تو نبوت انسانی زندگی کے لئے ایک فطری چیز بن جاتی ہے۔ نیز جہاں نبوت نہ ہو وہاں انبیاء کے اتباع یعنی صدیق اور حکیم یہ کام کریں۔ تو اسطرح انسانیت کا مجموعی مسئلہ حل ہو جاتا ہے شاہ صاحب کے نزدیک اقتصادی توازن کے یہ معنی ہیں۔

۲۱ رذی قعدہ ۱۱۴۴ھ کو جمعہ کی رات تھی۔ امام ولی اللہ نے مکہ معظمہ میں ایک الہامی خواب دیکھا جس کا حاصل ہمارے الفاظ میں یہ ہے۔

۱۔ انہیں یقین دلایا گیا کہ ان کے ذریعہ موجودہ مفاسد کا تدارک ہوگا۔ یعنی وہ ان خرابیوں کو دور کرنے میں ایک مستقل ذمہ دارحیثیت کے مالک ہوں گے۔

۲۔ انہیں بتایا گیا کہ پہلا نظام توڑ کر اسکی جگہ وہ نیا نظام قائم کرنے کے ذریعہ بنیں گے۔

گویا برسوں کے مطالعہ، مشاہدہ، غور وفکر اور پھر خاص طور سے حرمین شریفین کے فیوض کے بعد شاہ صاحب کی ذات انقلابی قوت عمل کو اپنے اندر پورے کمال پر بیدار اور متحرک پاتی ہے اور جو کچھ انہیں مستقبل میں پیش آنیوالا ہے، شاہ صاحب اسے خواب میں دیکھتے ہیں۔

یہ عزم لیکر شاہ صاحب واپس دہلی آئے اور اجمالی طور سے اپنے پروگرام کی ترویج شروع کردی۔ محمد شاہ کے دور حکومت میں وہ اپنے مدرسہ کو پرانی دہلی کے ایک چھوٹے سے احاطے سے شاہ جہاں آباد (مغلوں کی نئی دہلی) کے ایک پورے محلے میں منتقل کرتے ہیں اور یہی مدرسہ آگے چل کر ولی اللہی تحریک کا مرکز بنتا ہے۔ امام ولی اللہؒ ان کے بعد امام عبدالعزیز اور پھر امام محمد اسحاق نے اسی مدرسہ میں بیٹھکر اس تحریک کی رہنمائی کی جس کے پیش نظر ہندوستانی مسلمانوں کی دینی وفکری اور سیاسی و اجتماعی ہمہ گیر نشاۃ ثانیہ تھی۔

فضل حمید[1]

شاہ ولی اللہ کا تصور ذات وصفات

حضرت شاہ صاحب فلسفہ الٰہیات میں شیخ اکبر محی الدین ابن عربی سے تصوف میں جہاں تک شریعت اور طریقت کے مابین تطبیق کا تعلق ہے امام غزالی سے اور اصول شریعت اور اتباع سنت اور ایک حد تک اجتہاد و تقلید کے معاملات میں امام ابن تیمیہ سے متاثر معلوم ہوتے ہیں اسلئے شاہ صاحب کی تعلیمات وارشادات کو کما حقہٗ سمجھنے کے لئے ان بزرگوں کے معتقدات وافکار کو پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ بایں ہمہ یہ بھی ملحوظ خاطر رہے کہ شاہ صاحب کا طریقہ فکر بالکل منفرد رہا ہے ان کا مجتہدانہ مسلک اور ملہمانہ مزاج کسی زمانے کے امام اور حکیم کی کورانہ تقلید کا پابند نہیں در یافت حقیقت میں ان کا مسلک فیض ایجاد سے بہرہ ور ہے۔

ذات بحت

ذات خداوندی یا تصوف وحکمت کی زبان میں ذات بحت کی حقیقت کس نے بیان کی ہے اور کون اسے بیان کر سکتا ہے ؟۔ غالب نے اسی عجز و درماندگی کا اظہار اپنے بدیع انداز میں یوں کیا ہے۔

اپنا نہیں یہ شیوا کہ آرام سے بیٹھیں — دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے!

ہاں اہل خرد کون سنے طعنۂ نایافت — اس در پہ نہیں بار تو کعبہ ہی کو ہو آئے

اس راہ میں شیخ اکبر محی الدین عربی کا قدم تحقیق ذات بحت کے بارے میں "وجود" کی تعریف سے آگے نہ بڑھ سکا اور وہ بھی محض اس قدر کہہ کر رہ گئے کہ وجود وجود ہے جس کے لئے این وآں نہیں یعنی اس کا تصور سلبی

---

[1] سردار فضل حمید قومی تعمیر نو مغربی پاکستان کے ڈپٹی ڈائریکٹر

تعریف کے ذریعہ کیا جاسکتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ جب ذاتِ بحت کے کُنہ کے ادراک میں عقل کے عجز و درماندگی کی یہ صورت ہے تو پھر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس بارے میں ذات بحت کے تنزلات اور تعینات کی جو عقلی بھول بھلیاں پیش کی گئی ہیں ان سے کیا حاصل ؟ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب ذات بحت کے لئے ذات حق، واجب الوجود، ذاتِ واجب اور وحدت حقہ کی اصطلاحات استعمال فرماتے ہیں مگر اس میں وہ لیس کمثلہ شیٔ، کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ یعنی سب کچھ کہنے کے باوجود یہی کہتے ہیں کہ "بر تجھ سی تو کوئی شے نہیں ہے" اس سلسلے میں ان کے لئے یہ حقیقت بھی بار بار دامن کش ہوتی ہے کہ وہ "ہو الاول والآخر ہو الظاہر والباطن" ہے۔ اور سب کچھ اسی سے ہے۔ گویا ایک طرف اس جیسا کوئی نہیں، اور دوسری طرف جو کچھ ہے، اسی کا ظہور ہے۔

ذاتِ بحت ذاتِ حق کا وہ مرتبہ ہے، جس میں وہ ہر قسم کے اسم و رسم اور نعت و وصف سے منزہ ہے۔ خود اس ذات کی مرتبہِ تنزیہی میں حقیقت کیا ہے؟ اس کی تشریح شاہ صاحب نے نہیں فرمائی۔ غالباً ان کے مدنظر یہ حدیث ہو گی کہ تفکروا فی الاء اللہ ولا تتفکروا فی ذاتہ (اللہ کی نعمتوں میں غور و فکر کرو، لیکن اس ذات کو موضوع تفکر نہ بناؤ) اور اگر آپ کے پیش نظر یہ حدیث نہ بھی ہوتی تو پھر بھی اس ذات بحت کی حقیقت کی مساعی تشریح کا حاصل معلوم۔!

غالب دیدہ ور ایک نکتہ میں بڑے پتہ کی بات کہہ گئے ہیں

یگانہ ہے وہ یکتا اسے کون دیکھ سکتا   جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دو چار ہوتا

الغرض اصل حقیقت یہی ہے کہ ماہیتِ ذات یا کُنہِ ذات کے بارے میں انسان کچھ نہیں جانتا یہاں پہنچکر اسکی عقل دنگ رہ جاتی ہے اور زبانِ تفکر گم اور اگر اس معاملہ میں کچھ جان بھی سکتا ہے تو اسے کہہ نہیں سکتا۔ اصل بات یہ ہے کہ

آں را کہ خبر شد خبرش باز نیامد!

حکیم سنائی کو آخری وقت میں یہی احساس نارسائی تھا اور اپنا لکھا ہوا یہ شعر بار بار انکی زبان پر تھا۔

باز گشتم زانچہ گفتم زانکہ نیست   در سخن معنی و در معنی سخن

ذات حق سبحانہ' و تعالیٰ کی تشریح و بیان میں عقل و فکر کی اس نارسائی کو دیکھتے ہوئے واقعہ یہ ہے کہ امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی کے اس عقیدہ ماورائیت کی داد دینی پڑتی ہے کہ ذات حق ادراک سے "ماوراء ثم وراء الوراء ثم وراء الوراء" ہے اور جسے ذات کا عرفان کامل ہوا۔ وہ بھی یہی کہتا ہے کہ العجز عن درک الادراک ادراک "عجز ادراک کا اعتراف ہی اسکی کنہِ ذات کا ادراک ہے اور بس۔ باقی سب قیل و قال اور وہم و گمان ہے۔

اے بروں از وہم و قال و قیلِ من	خاک بر فرقِ من و تمثیلِ من

البتہ اس کارگہہ تکوین اور کارخانہ تخلیق سے اس ذات حقہ کے جمال جہاں آرا اور کمالِ حیرت افزا کی ایک جھلک ضرور نظر آجاتی ہے۔ اور یہ ایک لحاظ سے اسکی معرفت کی دلیل بنتی ہے لیکن اس بارے میں بھی اگر ذرا اور آگے جائیں تو نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خامہ انگشت بدنداں اور ناطقہ سر بگریباں ہو کر رہ جاتا ہے۔ بایں ہمہ اس سلسلے میں غالب کے اس قول پر عمل پیرا ہونا سلوک کی ایک مہتم بالشان منزل طے کر لینے کے مترادف ہے۔

بر حسب نشۂ پیمانۂ صفات
عارف ہمیشہ مست مئے ذات چاہیئے

کائنات علت و معلول کے جس شیرازۂ ہمہ گیر میں مربوط ہے اسکی تعلیلی حکمتوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا لازماً کوئی خالق صانع اور رب ہے جس میں رحمت حکمت اور ربوبیت کے جملہ مقتضیات اور محرکاتِ ذاتی اپنے کمال میں موجود ہیں۔

آیت کریمہ "ولہ الاسماء الحسنیٰ" میں اسی طرف اشارہ ہے حضرت شاہ صاحب نے اسی تعلیلی حکمت اور تخلیقی مصلحت پر جو کائنات میں کارفرما ہے، زیادہ زور دیا ہے اور انکے نزدیک ذات حق سبحانہٗ و تعالیٰ کے متعلق حصول معرفت اور علم الیقین کا یہ ذریعہ بہت معتبر ہے۔ جہاں تک کہ ذات بحت کی ہویت کا تعلق ہے اس کا ادراک ہم نہیں کر سکتے "وہ ہے ھُوَ ھُوَ والان کما کان" وہ اسی طرح ہے جس طرح وہ ہے اور اب بھی اسی طرح ہے جس طرح کہ تھا۔ حضرت مجدد الف ثانی حضرت بایزید بسطامی کے اس قول کے بارے میں کہ "سبحانی ما اعظم شانی" پر بحث کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ "از مقام ظلال بیروں نہ شتافتند" یعنی ابھی وہ ظلال (ظل بمعنی سایہ کی جمع) کے مقام سے نہیں نکلے۔

ذاتِ حق کے ادراک کے معاملے میں ہمارے اس تمام عجز و درماندگی کے باوجود کیا یہ حقیقت نہیں کہ قرآن مجید ذات حق کے بارے میں یہ فرماتا ہے۔ نحن اقرب الیه من حبل الورید ہم اس (انسان) سے شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں نیز ارشاد ہوا ہے۔ فاینما تولوا فثم وجه الله جس طرف بھی تم منہ کرو ادھر ہی اللہ کا منہ ہے۔ ثم الینا ترجعون پھر تم ہماری طرف ہی لوٹائے جاؤ گے۔ غرضیکہ ایک طرف تو یہ قربت ہے اور دوسری طرف اتنی دوری ہے کہ جس کی کوئی حد نہیں۔

اب حقیقت یہ ہے کہ ذاتِ حق کی بے چونی اور بے چگونگی سے قطع نظر خود انسانی ادراک ماحولی اضافتوں اور گردوپیش کی مادیات اور زمان و مکان کی قیود و حدود میں مقید و محصور ہے اور اس کی ناتوانی اور نارسائی کا یہ عالم ہے کہ وہ اپنی بصارت سے تمام موجوداتِ خارجی کا ادراک تو کرتا ہے لیکن وہ خود اپنی قوت باصرہ کو دیکھ نہیں سکتا۔

چوں جاں اندر تن و تن جاں ندیدہ

یہ تو محض نفخت فیہ من روحی کا یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان میں اپنی روح پھونکی ہے فیضانِ وجوب ہے کہ بقول مولانا روم۔ سِرّ پنہاں است اندر زیر و بم! مگر اسکے ساتھ ما للتراب و لرب الارباب" مٹی مٹی ہے اور ذات رب الارباب ہے۔ کی تنبیہہ بھی موجود ہے چنانچہ اضافتوں کی گیر و دار اور کثرت کی ہنگامہ آرائی میں فرق مدارج اور حفظ مراتب شرائطِ فلاح و نجات قرار دیئے گئے ہیں اس لئے

فاش گر گویم جہاں برھم زنم

کا مصرع ثانی ہی اس تنگ نائے ہستی کے ردیف و قافیہ کے لئے موزوں ہو سکتا ہے۔

وحدت الوجود

ذاتِ حق کے بارے میں شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کی تشریح یہ ہے کہ فی الحقیقت وجود کا اطلاق محض اُسی کی ذات پر ہو سکتا ہے۔ لاموجود الا اللہ صرف اسی کی ذات وجود کے وصف اور نعوت و صفات سے متصف ہے۔ وجود نہ جوہر ہے نہ عرض، نہ مادہ ہے نہ روح۔ وہ ایک ماہیت ہے جسکے مراتب و تنزلات عالم کثرت اور ظہور تفصیلی میں مادہ اور روح، قوت و فعل، زمان و مکان، نور و ظلمت، عقول و مجردات، اسماء و صفات، ظلال و اشباح، اثبات و نفی، سلب و ایجاب، ممکن و عدم، صور و معانی متقابلہ، کیفیات و کمیات کائنات میں ظاہر ہوئے اور بروئے کار آئے ہیں۔ ظہور سے قبل یہ سب اسکی ذات میں مضمر و مندرج تھے۔ یہ کائنات (اور ما فیہا و ما علیہا) پہلے اسکے باطن میں موجود تھی۔ اب یہ اس کا ظاہر ہے اور وہ اس کا باطن اور اس لئے

کفر و اسلام در رہش پویاں
وحدہٗ لاشریک لہٗ گویاں

انسان کا لطیفۂ قلب ذاتِ حق کا احساس کرتا ہے۔ مگر عقل اُسکے ادراک سے عاجز ہے الخلق معقول و

والحق محسوس ہے۔ خلق عقل میں آسکتی ہے، لیکن حق صرف محسوس کیا جاسکتا ہے۔ غالب نے اسی خیال کو شعر میں ادا کیا ہے۔

ہمہ محسوس بود ایزد و عالم محسوس
غالب این زمزمہ آوازہ نہ خواہد خاموش

جو بُود و نمود عالم شہادت میں مشہود یا عالم کثرت میں موجود ہے، اسکی موجودیت ذاتِ حق سے ہے۔ بہ الفاظ دیگر ملکوتی، مثالی اور ناسوتی عالموں میں جو کہ نور و نار، مستی و صوت، رنگ و بو اور سوز و ساز کا ہنگامہ برپا ہے، وہ وجود حقیقی کے مظاہر اور شیئون ہیں۔ آہنگ و نغمہ اور رقص و وجد یعنی جنت نگاہ اور فردوس گوش۔ کی جو کیفیات پیدا ہیں، اسی کے تنزلات اور تجلیات ہیں گو بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ

ساقی بہ جلوہ دشمن ایمان و آگہی
مطرب بہ نغمہ رہزن تمکین و ہوش ہے

مگر حقیقت کے اعتبار سے ساقی بھی وہی ہے اور مطرب بھی وہی، بلکہ

خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گلِ کوزہ

اس تصور کے مطابق کائنات اور موجوداتِ خارجی بشمولیت انسان و حیوان، وجود کے ہی مختلف مراتب ہیں ایک مرتبے میں وہ خالق ہے تو دوسرے مرتبے میں مخلوق ایک مرتبے میں معبود ہے تو دوسرے میں عابد ایک مرتبے میں رب ہے تو دوسرے میں مربوب، ایک مرتبے میں آمر ہے تو دوسرے میں مامور۔ اس نظریہ سے وحدت الوجود کا وہ تصور پیدا ہوا ہے، جسے وجودیت کا نام دیا گیا ہے اور اہل شریعت کے نزدیک جس میں گوناگوں مفاسد ہیں۔ مولانا جامیؒ وحدت الوجود کے قائل تھے مگر لوائح میں وہ تنبیہ فرماتے ہیں۔

ہر مرتبہ از وجود حکمے دارد
گر فرق مراتب نہ کنی زندیقی

اسی لئے حضرت شاہ ولی اللہ نے وحدتِ وجود اور وحدت شہود میں تطبیق و تعدیل کی ہے وہ وحدت وجود کے اس معنیٰ میں قائل ہیں کہ تمام اشیاء ذات حق ہی میں مندرج تھیں لیکن انکے ہاں وحدت وجود کی شرح اور کیفیت وہ نہیں

جسے وجودی مانتے ہیں شاہ صاحب کے نزدیک کائنات وجودِ حق کا انبساط نہیں ہے اور نہ فنا عبارت ہے اس کے انقباض سے کیونکہ اس میں تقسیم و تجزیہ، ترکیب و تحلیل، جمع و تفریق کا امکانِ علمی پایا جاتا ہے جیساکہ دریا و قطرہ، بخارات و باراں، آتش و دخان اور آب و یخ وغیرہ کی تمثیلوں سے مترشح ہوتا ہے اور یقیناً ذاتِ حق ان عوارض و حوادث سے کلی طور پر پاک ہے پھر دوسری بات یہ ہے کہ وجودیوں کے اس تصورِ ذات میں تکلیفاتِ شرعیہ اور مکافاتِ آخرت کے مرتفع ہونے کا احتمال بھی ہے۔

وحدت شہود

اسکے برعکس توحید شہودی کے قائل عالم و مافیہ کو اسماء اور صفات الہیہ کے عکوس و ظلال مانتے ہیں اس اعتبار سے عالم صُورِ وہمیہ کا مجموعہ قرار پاتا ہے اور اس طرح تیر کی ہم نوائی میں ہمیں کہنا پڑتا ہے۔

یہ توہم کا کارخانہ ہے
یاں وہی ہے جو اعتبار کیا

یعنی عکس و ظل کا وجود موہوم ہے وہ تو محض اپنے اصل کی عکاسی کرتا ہے اب اگر آئینے میں صورت اچھی نظر نہ آئے تو آئینے کا کیا قصور؟ اس بناء پر آئینہ دار کی تعزیر اور عقوبت عدلِ الٰہی کے منافی ہے گویا مطلب یہ ہوا کہ رفعِ تکلیفاتِ شرعیہ اور بطلانِ مکافاتِ اُخرویہ کا جو الزام وحدت الوجود کے ماننے والوں پر عائد کیا جاتا ہے اس سے وحدتِ شہود کے داعیوں کو بھی مفر نہیں۔

شاہ ولی اللہ صاحب کا مسلکِ تطبیق و تعدیل عقلی اعتبار سے شہودیوں کے "صورِ وہمیہ" کی معقولی کمزوری اور وجودیوں کی "ہمہ اوستی" کی آفت سے اپنا دامن بچا کر صاف نکل جاتا ہے ان کا مسلک کسی لحاظ سے بھی شہودی نہیں بلکہ ان کا رجحان نسبتاً وحدت وجود کی طرف زیادہ ہے صرف اسکی تعبیر ان کے ہاں اوروں سے مختلف ہے شاہ صاحب کا عقیدہ ہے کہ عالم کا وجود حقیقی ہے اور علت و معلول کا سلسلہ اسکی فطرت ہے۔ آیت ربنا ما خلقت ھذا باطلاً اس پر دال ہے اور انواع و افرادِ عالم کے معاملات اور حرکات سلسلِ علت و معلول فعل و انفعال اور تفاعل و تعامل کے زیر اثر ہیں۔ اور انکے آثار و مظاہر اپنے نتائج کے اعتبار سے باقی رہنے والے اور علت و معلول والے اور تعلیلی حکمتوں سے مستحکم ہیں۔ فیضانِ وجوب وجود ہر لحظہ و ہر لمحہ جاری ہے الیٰ غیر نہایت۔ ہستی کی ایک منزل دوسری منزل کے لئے پیش خیمہ ہے۔ اور

ایک عالم کی سیر دوسرے عالم کی سیر کی طرف لیجاتی ہے حیاتِ حقیقی کا عالم لامحدود ہے تمثالی اور ملکوتی عالموں اور ملاء اعلیٰ سے ماوراء بھی اور عالم ہیں الغرض۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

اسماء وصفات اور شیئون الٰہیہ کے مصادر و مظاہر ایک محکم تدبیر اور ایک باضابطہ ترتیب کیساتھ اس عالم شہادت یعنی دنیا عالم مثال و برزخ، عالم ملکوت اور عالم معنی و کیفیات میں برابر جاری وساری رہتے ہیں انسان کا روحانی ارتقا لامحدود اور لانہایت ہے چونکہ معنی کا ظہور بغیر صورت کے ممکن نہیں اور ذات حق اپنے جمال و کمال کے ظہور کا اقتضائے ذاتی رکھتی ہے اس لئے اسکے لامحدود شیئون وصفات کے مظاھر بھی لازمی طور پر لامحدود اور لانہایت ہونگے۔

ذاتِ حق میں اشیاء اس اعتبار سے گم نہیں ہوتیں کہ وہ ذات حق کا جزو بن جاتی ہیں بلکہ اس اعتبار سے گم ہوتی ہیں کہ فیضانِ تخلیق و ربوبیت کے مدارج بدلتے رہتے ہیں اور ایک شکل کے بجائے دوسری شکل میں لانہایت حد تک یہ فیضان ظاہر ہوتا رہتا ہے۔ کیونکہ پہلی شکل قائم نہیں رہتی اسلئے عارف کو مقام شہود میں یہ نظر آتا ہے کہ اشیاء (مظاہر شیون واسماء حق تعالیٰ) وحدت حقہ میں گم ہوگئی ہیں۔ اسی طرح اشیاء کا صدور بھی ذات حق سے اس معنیٰ میں نہیں ہے کہ کوئی جزو اس کی کلیتِ ذات کے باطن سے الگ ہوکر عالم کثرت وشہادت میں ظاہر ہوگیا ہے بلکہ اس سے صدور کے معنی یہ ہیں کہ اسکے کمال ذاتی کے اقتضاء سے اس کا تخلیقی ارادہ ان ممکناتِ وجود کو، جو اسکے علم اجمالی میں مضمر تھے، جنہیں صوفیاء کی اصطلاح میں صور علمیہ، اعیان ثابتہ، ماہیاتِ اشیاء اور حقائق اشیاء کہتے ہیں (معرضِ ظہور میں لے آیا ہے۔ یعنی یہ ممکناتِ وجود علم الٰہی کے باطن سے نکل کر خارج میں متحقق ہوگئے ہیں۔ یہ صور علمیہ یا ماہیات الماہیات (جنھیں کیفیات سے تعبیر کیا جائے تو مضائقہ نہیں) ذات حق میں بالقوۃ و بالاستعداد موجود تھیں یا یوں سمجھئے کہ وجود حقیقی کے کمال ذاتی کے مقتضیات وقابلیات میں خوابیدہ تھیں کیونکہ ابھی اظہار جمال و کمال کے اقتضائے ذاتی کے تحت ارادۂ الٰہی نے ان اعیان کو متحرک یا فعال حیثیت نہیں دی تھی۔

اسماء وصفات

ذاتِ حق سے اشیاء کے صدور کے متعلق جو تصور شاہ ولی اللہ صاحب نے پیش کیا ہے اسکی رو سے اسماء وصفات ازل الآزال سے یعنی قبل از تخلیق ذات بحت میں مضمر اور بالقوۃ یا بالاستعداد موجود تھیں۔

اسماء وصفات کی ذاتِ حق میں یہ خوابیدگی ایک مبہم سی کیفیت ہے، جسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ ذات بحت

جب اپنے مرتبہ ہُویّت میں تھی یعنی اسکے کمال و جمال کا اقتضاء ارادہ فعلی کے ساتھ ملتفتِ اظہار نہ ہوا تھا تو ان صفات کا علم بھی اسے بالفعل نہ تھا بلکہ بالذات تھا۔ اس سلسلے میں شاہ صاحب فرماتے ہیں۔ "ذات حق خود اس امر کی متقاضی تھی کہ وہ استعدادیں جو اسکے اندر مضمر ہیں، ان کا ظہور عمل میں آئے۔ چنانچہ سب سے پہلے ذات حق کا جو مرتبۂ وجود ہے، اس مرتبے میں ذات حق کی ان استعداد کا عقلی ظہور ہوا اس ظہور سے وہاں اشیائے ممکنات کے "اعیان" اور ذات بحت کے ظہور کی ہر صورت اور اسکی تدلی کے ہر مظہر کے "شیون" متمثل ہوئے۔ مرتبۂ وجوب میں ذات حق کا تقاضا یہ ہوا کہ وہ ان ظہورات کو عدم، مادہ اور خارج سے متصف کرے۔ چنانچہ اس ضمن میں اس نے جو کچھ کہ اعیان اور پہنائیوں میں مضمر تھا اُسے ظاہر کر دیا، اور اس سلسلے میں سب سے پہلے جو چیز ظہور پذیر ہوئی وہ اللہ تعالیٰ کا نور تھا۔ اس نور نے عدم اور مادّہ کا پوری طرح سے احاطہ کر لیا۔ اور اس پر یہ مسلط ہو گیا اور یہ نور قائم مقام بن گیا ذات حق کا اور یہ نور قائم الزمان ہے بات یہ ہے کہ ہمارے نزدیک زمان، مکان اور مادہ ایک ہی چیز ہے اور یہی وہ استعداد ہے جس کو ہم نے عدم اور خارج کا نام دیا ہے۔" حضرت شاہ صاحب نے اللہ نور السماوات والارض کی جو یہ شرح کی ہے وہ ابن عربیؒ کی شرح سے مختلف ہے۔

مرتبۂ قیومیت میں جلوۂ ذات میں تلوینِ صفات کے تیور کچھ اور ہی ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں شاہ صاحب ارشاد فرماتے ہیں۔ "اس عالم میں مخلوقات کے ظہور کی جو بھی علتیں ہیں، ان کا سلسلۂ ارتقاء آخر میں جا کر ارادۂ الٰہی پر ختم ہوتا ہے۔ لیکن خود اس ارادۂ الٰہی کی بھی ایک علت ہے جس سے اس کا صدور ہوتا ہے اور وہ علت ہے ذات الٰہی کا خود اپنا اقتضاء ارادے کیلئے اور ارادے کا لازم ہونا ذات الٰہی کے واسطے۔ واقعہ یہ ہے کہ ذات واجب الوجود سے ارادے کا تعلق ایسا ہی ہے، جیسے ان تاثیر کرنے والی استعدادوں کا، جنہیں 'اعیان' کہا جاتا ہے۔ ذات واجب سے تعلق ہے یعنی جس طرح ان "اسماء" اور "اعیان" کے ظہور کے لئے ذات واجب کا اقتضا ہوتا ہے اور ذات واجب کے لئے ان "اسماء" اور "اعیان" کا ہونا لزوم میں سے ہے۔ اسی طرح ذاتِ واجب کے ساتھ اسکے ارادے کا تعلق ہے اور یہ جو دو تاثیر کرنیوالی استعدادیں یعنی "اسماء" اور "اعیان" ہیں۔ ان کے ظہور کی ایک حد مقرر ہے، جو خود ذات واجب کی طرف سے ظاہر ہوتی ہے کہ اس میں نہ زیادتی ہو سکتی ہے اور نہ کمی۔"

شہودیوں کے نزدیک عدم وجود کے بالمقابل ہے اور عدم کے آئینوں پر اسماء و صفات اور شیون الٰہیہ کے عکس پڑ رہے ہیں اس تصور میں دو علمی مغالطے ہیں۔

اوّل چونکہ ذات حق بالذّات موجود ہے اور کوئی چیز اسکے بالمقابل نہ خارجی طور پر موجود ہے نہ علمی اور معنوی

طور پذیر رہا یہ الموجودیت محض اُسی کی ذات ہے۔ اگر عدم کو ذات کی ضد تصور کیا جائے تو ذات کے مثیل یا عدیل کا تصور لازم آتا ہے۔ ضد کہتے ہیں کسی شئے کی نفی کو اس اعتبار سے کہ شئے کی کوئی صفت اس میں موجود نہ ہو اور جس کی وہ ضد ہے اس کے تضمنِ صفاتی کی کُلّی نفی اس ضد سے ہو جائے۔ بلکہ اسکے مضمنات کا نقیض اس میں موجود ہو اب ایک ایسی ذات کی ضد نہیں ہو سکتی جسکے بغیر کوئی شے موجود نہ ہو اور اس کے ساتھ اور موجود نہ ہو سکتی ہو۔ ثانیاً یہ کہ حقیقت کے اعتبار سے ذات حق کا کوئی غیر موجود نہیں غالب نے کہا ہے۔

اتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بُعد ہے
جتنا کہ وہمِ غیر سے ہوں پیچ و تاب میں

صفات عینِ ذات ہیں اور ذات عینِ صفات، بہر کیف صفات زائد بر ذات نہیں کیونکہ ذات حق میں نہ انفعال ہے اور نہ اکتساب، اسلئے اسماء و شیون یا مرتبۂ وحدت کو تجلّی ذات بر ذات سے تعبیر کیا گیا ہے۔ چونکہ تنزلات یعنی تخلیقی و تکوینی تاثرات کی منزل میں ارادہ الٰہی سے اسماء و صفات میں حرکت یا قابلیتِ ظہور پیدا ہوتی ہے اس لئے تقدم ذات پر صفات کا تصوّر زمانی پیدا ہو گیا ورنہ ذات میں صفات ہمیشہ سے مضمر و مندرج تھیں اگر اسماء و صفات کے سائے (عکوس و ظلال) عدم کے آئینوں میں جلوہ گر ہیں تو تخلیق کی تعلیلی حکمت، ترتیب، تدریجی ظہور اور تدریجی ترقی کے تصورات کی نفی ہو جاتی ہے اور یہی ایک حقیقت واقعی ہے کہ کونیات یعنی علت و معلول کا سلسلہ عالم میں قائم ہے۔ غالب نے کیا خوب کہا ہے۔

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

اس لئے تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ "صورِ علمیہ الٰہیہ" اور "حقیقت الحقائق" کی مثالی اور معنوی حقیقتیں تجلیات الٰہی کے ذریعہ کائنات کی ہر شے میں بالقوۃ موجود تھیں اور تدریجی طور پر مختلف استعدادوں اور قابلیتوں کے اعتبار اور زمان و مکان کی مناسبتوں کے لحاظ سے ظاہر ہو رہی ہیں الغرض ذاتِ حق کے فیضان نے جو صورِ علمیہ و اعیان ثابتہ کو معرضِ وجود و شہود میں لانے کا باعث بنا ہے، ان اعیان (جن کے بارے میں صوفیاء کا خیال ہے کہ ماشمت رائحۃ الوجود ان میں وجود کی بو تک نہ تھی) کو ہستی کا پیرایہ بخشتا ہے۔ ذات حق کا یہ فیضانِ سماوی یعنی اسماء و شیون کا نور منبسط کبھی منقطع نہیں ہوتا۔ اور یہ ہر لحظہ حیات علم ارادہ اور دیگر صفات) ذات سے علیٰ قدرِ ظرف و استعداد کائنات کے افراد کو مستفید اور متصف کرتا رہتا ہے۔ چونکہ یہ ذات حق کا ایسا اقتضا ہے جو

ذات حق کے لئے بمنزلہ وجوب کے ہے اس لئے اسکے فیضان کا منقطع ہونا از قبیل محالات ہے اس میں ارتقائی عمل کی کارپردازی بھی ہے اور فیضان ربوبیت سے تخریب کے ساتھ ساتھ تعمیر کا عمل بھی ہوتا رہتا ہے اور اس طرح اس عالم کی کہنگی و فرسودگی تجدید کے عمل سے برابر نشاۃ ثانیہ حاصل کرتی رہتی ہے۔ خود شاہ صاحب نے انہی معنوں میں کل یوم ھو فی شان کی طرف توجہ دلائی ہے بقول غالب۔

در ہر مژہ برہم زدن این خلق جدید است
نظارہ سگالد کہ ہماں است وہماں نیست

اور اقبال کہتے ہیں۔

گماں مبر کہ بہ پایاں رسید کارِ مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

اگرچہ حضرت شاہ صاحب کے نزدیک اشیاء اور مکوّنات کا وجودِ معنوی خارج میں ظاہر ہونے سے پہلے عالم باطن اور ملاء اعلیٰ میں موجود تھا۔ اور اب بھی ان کا مثالی وجود وہاں موجود ہے۔ مگر فیضان وجوب وجود حق تعالیٰ سے کائنات کی تعلیلی فطرت یعنی طبیعتِ کلیہ تحسین و تزئین کی طرف ہر دم متوجہ ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ عالم رنگ و بو کی بوقلمونیت اور کیف و کم کی دل آویزیوں سے خالی رہتا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ عالم میں باغ و بہار، سبزہ و کہسار، وادی و گلزار، جوئے آب اور ابر گوہر بار کی لطافتیں اور رنگارنگ حسن افروزیاں جلوہ نما ہیں۔ خود انسان کی فطرت کا جمالیاتی ذوق تحسین و تزئین میں مصروف و مشغول ہے۔ شاہ ولی اللہ کے اس تصور کے مطابق تخلیق اور تعمیر و تحسین کا عمل محض حقیقت الحقائق کے باطنی عالم میں کارفرما نہیں بلکہ کائنات کے اس ظاہری عالم میں بھی جسے صوفیا عالم شہادت اور حکما عالم کون و فساد کا نام دیتے ہیں، ذوق و شوق، حقائق و لطائف، ارتفاقات و انتظامات، مقاصد و مطامع حیات کی لاتعداد و لامتناہی صورتوں میں ظاہر ہو رہا ہے الغرض شاہ صاحب کا تصور ذات و صفات حق سبحانہٗ تعالیٰ جامع شریعت و طریقت ہے اور یہ بات کم ہی کسی عالم و مفکر کو نصیب ہوتی ہے۔

در کفے جام شریعت در کفے سندانِ عشق
ہر ہوسناکے چہ داند جام و سنداں باختن

عمر فاروق خان

مولانا عبدالرحیم پوپلزئی

حضرت شاہ ولی اللہ کے مکتبِ فکر کے ایک عالم

مولانا عبدالرحیم پوپلزئی کے جدِ امجد فرمانروائے پشاور امیر محمد عظیم خاں کے عہدِ حکومت میں عہدۂ قضا پر مامور تھے۔
آپ نے متعدد کتابیں اپنے والد محترم مولانا عبدالحکیم پوپلزئی سے پڑھیں ۱۹۰۹ء کے قریب تکمیل علوم کی خاطر مولانا عبدالرحیم پوپلزئی نے ہندوستان کی دینی درس گاہوں کا قصد کیا اور رامپور اور دہلی کے مدارس میں تحصیل علم کے بعد موصوف دیوبند پہنچے۔ وہاں آپکو حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن سے شرفِ تلمذ حاصل ہوا۔ اور ان سے مولانا عبدالرحیم نے حدیث کی سند لی حضرت شیخ الہند نے آپ کو اپنی خصوصی محبت سے نوازا۔ اور اسی کا فیض تھا کہ مولانا عبدالرحیم فکرِ ولی اللہی سے متعارف ہوئے اور اپنے کو انہوں نے حضرت شاہ ولی اللہ کی تحریک سے وابستہ کر لیا۔
دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہونے کے بعد آپ واپس پشاور تشریف لائے اور شیخ الہند کے ارشاد کے مطابق درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔ مولانا عبدالرحیم کا علماء کا مشہور خاندان تھا۔ اس لئے جلد ہی دور دراز سے طالبان علم آپکی خدمت میں پہنچنے لگے۔ آپ پشاور کی مشہور و معروف مسجد قاسم علی خاں میں درس دیا کرتے تھے پشاور اور اسکے قرب و جوار کے علاقوں کے علاوہ افغانستان اور ترکستان تک کے طلبہ آپ سے استفادہ کرنے اس تاریخی مسجد میں حاضر ہوا کرتے تھے۔

لہ آپ ضلع ہزارہ کی تحصیل مانسہرہ کے رہنے والے ہیں۔ اسلامیہ کالج پشاور میں آپ نے تعلیم پائی سیاسی جدوجہد کے سلسلہ میں مولانا عبدالرحیم پوپلزئی سے تعلق پیدا ہوا جس نے بعد میں استاد اور شاگرد بلکہ مرشد و مرید کی شکل اختیار کر لی۔

مولانا عبدالرحیم فرمایا کرتے تھے کہ میں نے علوم دینیہ شیخ الہند اور مولانا محمد احسن سے حاصل کئے فلسفہ و منطق اور دوسرے علوم مولانا فضل حق خیر آبادی کے ایک شاگرد سے پڑھے۔ ضلع ہزارہ کے رہنے والے مولانا غلام رسول سے بھی علوم عقلیہ کی تحصیل کی، آپ شیخ الہند کے تربیت یافتہ تھے اور تصوف سے آپ کو خصوصی شغف تھا۔ آپ کی وفات پر شیخ الہند اور مولانا محمد احسن نے مرثیہ لکھا تھا۔ شیخ الہند کے ساتھ ساتھ روحانی طور سے میں مشہور مجاہد حضرت بڑے صاحب سے بھی وابستہ ہوں۔ مولانا عبدالرحیم نے ایک دفعہ فرمایا کہ بارہا جب مجھے سخت مقامات کا سامنا کرنا پڑا اور میں نے اپنے آپ کو بڑی پریشانی میں پایا تو حضرت بڑے صاحب کی طرف رجوع کرنے پر مجھے ان کے فیض روحانی سے راہنمائی ملی جس کی بدولت مجھے استقامت نصیب ہوئی۔ یہ رہنمائی اکثر رویائے صالحہ کی شکل میں ملتی تھی۔ سچ پوچھئے تو میری استقامت اسی فیض روحانی کا عطیہ ہے

۱۹۱۹ء میں جب تحریک خلافت شروع ہوئی تو مولانا عبدالرحیم نے اپنے استاد حضرت شیخ الہند کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اس میں شرکت کی اور بحالیِ خلافت اور آزادیِ وطن کی اس جدوجہد میں بڑا کام کیا۔ لیکن جلد ہی انکی ذہین اور حقیقت رس شخصیت نے دیکھ لیا کہ یہ راہ اس منزل تک نہیں پہنچائے گی جس میں اس سرزمین کے مسلمان عوام کی فلاح اور بہبود ہے۔

مولانا عبدالرحیم کی اس عملی جدوجہد سے جسے اجمالی طور پر انکی سیاسی جدوجہد کہا جا سکتا ہے ہمیں یہاں سروکار نہیں۔ میں مختصراً مولانا کے ان افکار کو پیش کروں گا جنہیں فکر ولی اللہی کے سلسلہ کی ایک کڑی کہنا چاہیئے۔

دارالعلوم دیوبند کے زمانہ قیام میں مولانا عبدالرحیم کو شیخ الہند مولانا محمود حسن کی خصوصی صحبت میسر آئی تھی چنانچہ مولانا کہتے تھے کہ حضرت شیخ نے انسانی زندگی کی عظمت اور ذلت دونوں پہلوؤں سے ہمیں متعارف کیا اور ہمیشہ اس بات پر زور دیا کہ محض رسمی علوم پر قناعت کرنا کافی نہیں حضرت شیخ ہمیں اکثر تفکر و تدبر کی دعوت دیا کرتے تھے مولانا عبدالرحیم نے اپنے استاد کی اس نصیحت کو کہ تفکر و تدبر کیا کرو۔ آخر وقت تک حرز جاں بنائے رکھا۔ چنانچہ عملی زندگی کے جملہ دوائر میں، اور اسی طرح اپنی علمی و ذہنی زندگی میں بھی وہ ہمیشہ تفکر و تدبر سے کام لیتے رہے اور اس فن میں انکی ذات نئے مسالک عمل اور نئے افکار و خیالات کا سرچشمہ بنی۔ مولانا فرمایا کرتے تھے کہ انسان کے لئے کامل معرفت حاصل کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ استقرائی اور استخراجی طریقے استعمال کرنے کے بعد بھی علوم کے بعض پہلو مخفی رہتے ہیں، اسی لئے اکثر اوقات ہم مسائل کی اصل حقیقت تک نہیں پہنچ سکتے۔

مولانا عبدالرحیم ایک مذہبی عالم تھے۔ وہ "مفتی حسن" کے لقب سے مشہور تھے۔ کئی ایک رشتوں سے ان کا تعلق شاہ ولی اللہ کے مکتب فکر سے تھا۔ چنانچہ وہ بنیادی طور سے ولی اللہی طرز فکر کے حامل تھے اور انکی برابر یہ کوشش تھی کہ اس دور میں جب کہ برصغیر میں صنعتیں فروغ پارہی ہیں اور تاریخ انسانی میں صنعتی انقلاب برپا ہوچکا ہے، فکر ولی اللہی کی ایسی تعبیر ہو کہ اس سے مسلمانوں کو صحیح رہنمائی مل سکے۔

۱۹۳۴ء میں مولانا عبدالرحیم حج کے لئے حجاز تشریف لے گئے اور وہاں آپ کا دو سال تک قیام رہا۔ اس تمام عرصہ میں آپ کی مولانا عبیداللہ سندھی سے برابر ملاقاتیں ہوتی رہیں جو فکر ولی اللہی کے ایک صاحب معرفت بزرگ تھے۔ ولی اللہی تحریک کے بعض علمی پہلوؤں کے متعلق ان دونوں بزرگوں میں اختلاف تھا۔ مولانا عبیداللہ سندھی کی طرح مولانا عبدالرحیم کا بھی یہ خیال تھا کہ پہلی جنگ عظیم میں ترکوں کی عثمانی سلطنت کی شکست اور اتاترک کے ہاتھوں عثمانی خلافت کی تنسیخ کے بعد اب واقعتہً مسلمانوں کی کوئی بین الاقوامی موثر طاقت نہیں رہی اسلئے اب برصغیر کے مسلمانوں کے لئے سوائے اسکے اور کوئی چارہ نہیں رہا کہ وہ اس برصغیر کی آزادی کے لئے کام کریں۔ اس اتفاق رائے کے بعد دونوں میں انڈین کانگریس کی نوعیت اور اسی کی ہیئت ترکیبی کے بارے میں اختلاف تھا۔ مولانا عبدالرحیم کا کہنا یہ تھا کہ بے شک کانگریس کے پیش نظر آزادئ وطن اور انگریز کا اس سرزمین سے اخراج تھا۔ لیکن ہندو اور پارسی سرمائے کے اتحاد اور برطانوی سرمائے سے اسکے اشتراک عمل نے اس تحریک کی نوعیت بدل دی اب اگر ایک طرف یہ سامراج دشمن ہے تو دوسری طرف اسکے بطن میں نئی قسم کے سامراجی عزائم پرورش پا رہے ہیں اس بارے میں مولانا کی مکہ معظمہ میں مولانا عبیداللہ سندھی سے طویل بحثیں ہوئیں لیکن دونوں حضرات میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کو قائل نہ کرسکا۔ مولانا سندھی کا خیال تھا کہ وہ واپس وطن پہنچکر کانگریس کے اندر اپنا ایک مقام پیدا کرلیں گے۔ اور اس طرح کانگریس میں تبدیلیاں لاسکیں گے لیکن مولانا عبدالرحیم کا کہنا تھا کہ اب کانگریس کے اندر کسی عوامی نقطہ نظر کی گنجائش نہیں وہ زبان سے خواہ کچھ دعوے کرے وہ عملاً ہندو سرمایہ داری کی علم بردار ہے۔

ولی اللہی تحریک اب تک جن ادوار سے گزر چکی ہے اور جس طرح پہلے اس نے ماورائے دریائے سندھ میں اپنا آزاد مرکز بنا کر اور پھر عثمانی خلافت کی تائید کر کے مسلمانان ہند کا مقدر بدلنا چاہا، ان کا ذکر کرتے ہوئے مولانا عبدالرحیم فرماتے تھے۔ اب ولی اللہی تحریک کو برصغیر کی عوامی تحریکوں میں اپنا مقام پیدا کرنا چاہیئے اور عوامی طاقتوں کے توسط سے جو آگے آرہی ہیں، اس سرزمین میں دین اسلام کو اپنا مشن پورا کرنا چاہیئے۔ مولانا عبدالرحیم فرمایا کرتے تھے کہ اگر دین کو بچانا چاہتے ہو،

تو یہ جو انقلاب عوام کے ذریعہ آرہا ہے اسے دینی رنگ دو اور اس کے عوامی اصول و مبادی کو دین کی ضد نہ سمجھو۔ جب کوئی دین اپنی انقلابی صلاحیتیں کھو بیٹھے تو نہ وہ خود زندہ رہتا ہے، اور نہ وہ لوگوں کو زندگی بخش سکتا ہے اگر تم مانتے ہو کہ ہمارا دین قیامت تک رہے گا تو زمانے کے ساتھ ساتھ انسانی زندگی کے آپس کے اقتصادی رشتوں میں جو تضادات پیدا ہوتے رہیں گے، ان کے حل دین سے ڈھونڈو اور اس کی مدد سے عوام کی مشکلات کا علاج کرو۔ ہمارا دین جاگیرداری یا سرمایہ داری نظام کے تحفظ کے لئے وجود میں نہیں آیا تھا۔ آپ فرماتے تھے کہ آج سے چودہ سو سال قبل جہاں ہمارے دین نے عرب کے اس سماج کی مخالفت کی جس میں غلاموں کا وجود ایک ضروری عنصر تھا، وہاں اس نے تجارت کے فروغ کے لئے راہ ہموار کی۔ لیکن اس میں ایک ضروری شرط یہ رکھی کہ نفع کو جائز قرار دیا اور ربٰو کو حرام بتایا اور اس کا کاروبار کرنے والوں کو تنبیہ دی گئی۔

مولانا عبدالرحیم کے نزدیک ہمارا دین سرمائے کو فی نفسہ برا نہیں سمجھتا اس کی نظر میں وہ انسانوں کے لئے حصول معاش کا ایک ذریعہ ہے انسانی زندگی کا مقصد نہیں اور نہ سرمایہ داری نظام کو ہمارا دین سوسائٹی کا آخری حل سمجھتا ہے وہ حکومتِ وقت کو عامۃ المسلمین کے مفاد کی خاطر سرمائے پر زیادہ سے زیادہ کنٹرول کا حق دیتا ہے۔ دین اسلام کے نزدیک تخلیق کائنات کا اصل منشا و مقصد خالق کائنات کی عبادت اور بندگی ہے کہ انسان دنیوی زندگی میں اس پر عمل پیرا ہو کر آخر میں وصال باری تعالیٰ کا مستحق بن سکے۔ دین انسانوں کے لئے اس دنیا میں عبادت اور بندگی کی راہ معین کرتا ہے۔ مولانا عبدالرحیم فرماتے تھے کہ ہم تمام ادیان میں خیر کو علتِ مشترک مانتے ہیں اور قرآن مجید نے بار بار جو پہلے صحیفوں کا ذکر کیا ہے کہ جو کچھ قرآن میں ہے، وہ انبیاء کے ان صحیفوں میں بھی تھا، اس میں اسکی طرف اشارہ ہے ان تمام ادیان میں سوائے خیر کے آخر اور کیا اشتراک ہے۔ یہی خیر اساس دین ہے اسکے مقابلے میں شر اساس کفر ہے، اور یہ جو ارشاد ہوا ہے کہ کفر ایک ملت واحدہ ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جہاں بھی دین حق کے خلاف لوگ ہوں گے خواہ وہ کوئی بھی ہوں اور کسی زمانے میں بھی ہوں، انکی اساس شر ہے اور اسی لحاظ سے انکی ایک ملت واحدہ ہو گی۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر سب ادیان کی علت مشترکہ ایک ہے، اور ان سب کی خیر ہی اساس ہے۔ تو پھر ان میں یہ باہمی اختلاف کیوں؟ مولانا فرماتے تھے کہ خیر کا خارج میں تعین یا دوسرے الفاظ میں خیر کے عملی مظاہر کا انحصار اپنے ماحول کے مطابق ہوتا ہے۔ اسے حضرت شاہ ولی اللہ نے "شعائر" کا نام دیا ہے اسی بنا پر تمام ادیان اصلاً اور اساساً ایک ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے "شعائر" کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں لیکن یہ اختلاف مظاہر کا ہے،

اصل دین کا نہیں اصل دین تو ایک ہے اور وہ ہے خیر کا حصول اور اسکے لئے جدوجہد کرنا اسی طرح کفر اسکی ضد ہے اور اور وہ ہے شر کا اقرار اور اسے برسر کار لانے کی کوشش کرنا۔

مولانا عبدالرحیم پوپلزئی اپنے شیوخ کبار کے نظریۂ وحدت الوجود کے حامل تھے اور فکر ولی اللہی کی اس اساس کو بدل وجان مانتے تھے۔ لیکن اس نظریے کی تحقیق اور اسکی تطبیق میں وہ اپنے وجدان اور تجربے کی روشنی میں برابر توسیع فرماتے رہتے اس نظریے کا وہ اپنے گردوپیش کے حالات اور ان سے پیدا ہونے والے مسائل پر اپنی عقل و فہم کے مطابق اطلاق کرتے۔

وہ ادیان کی بنیادی وحدت اور انکے شعائر کے اختلاف کی تشریح یوں فرماتے ہیں۔

بے شک ادیان کی اصل ایک ہے اور وہ ہے خیر کی تلاش وجستجو اور اس کا حصول لیکن ادیان کی ظاہری شکل، یا ان کے شعائر کا اختلاف نتیجہ ہوتا ہے زمان اور مکان کی تبدیلی کا۔ یہی تبدیلی باعث بنتی ہے ادیان کی مختلف شکلوں میں ظاہر ہونے کا ایک دین کی پیروامت کا جب کوئی اجتماع ایک خاص ماحول یا ایک خاص زمانے میں اپنے لئے تفصیلی ضابطۂ اخلاق بناتا ہے، جس کے پیش نظر اصل دین یعنی حصول خیر ہوتا ہے تو وہ ضابطۂ اخلاق اس وقت کے اس گروہ کی فقہ کہلاتی ہے اسی ضابطۂ اخلاق یا فقہ میں انسانی فرائض وحقوق کا بیان ہوتا ہے۔ باہمی انسانی رشتوں کا تعین کیا جاتا ہے۔ مباحات، محرمات اور منکرات کی تفصیل ہوتی ہے اور بتایا جاتا ہے کہ اس شاہراہ پر چل کر سوسائٹی خیر کا یوں حصول کرسکتی ہے حصول خیر کا مشترک مقصد رکھنے کے باوجود اخلاق کے ان ضابطوں کے آپس میں مختلف ہونیکی وجہ زمان ومکان کا اختلاف ہے اور بس اس سے ادیان یا دین کی اصل وحدت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔

اپنے اس نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا عبدالرحیم عموماً حسب ذیل مثال دیتے۔

وہ علاقے جن کا زیادہ تر انحصار زراعت پر ہوتا ہے۔ وہاں زرعی رشتوں کی بڑی تقدیس ہوتی ہے اور جب وہاں تجارت زراعت کی جگہ لے لیتی ہے تو پھر وہی تقدیس تجارتی رشتوں کو حاصل ہو جاتی ہے اور جب ان علاقوں میں صنعت پھیلتی ہے اور وہاں صنعتی نظام بروئے کار آتا ہے تو ان تجارتی رشتوں کی باہمی نوعیت بھی بدل جاتی ہے اور انسانی حقوق وفرائض کا ایک نیا ضابطہ وجود میں آجاتا ہے الغرض اصل دین ایک ہے اور وہ ہے خیر کا حصول اور شر کا انکار اور استیصال۔ اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے مختلف زمان ومکان میں مختلف تفصیلی ضابطے بنتے ہیں ضابطوں میں اختلاف

اور اصل دین کی وحدت، یہ ہے وہ نظامِ عالم، جو ازل سے چلا آرہا ہے اور ابد تک اسی طرح رواں دواں رہے گا چمن کی زینت
مختلف گلہائے رنگ و بو سے ہوتی ہے ہم رنگی اسکے حسن و جمال کی نہیں بلکہ نقص و کوتاہی کی دلیل ہے مولانا فرماتے تھے کہ
نظام عالم کا ایک وجہ سے یہ اختلاف اور ایک وجہ سے اس کا اشتراک اسی میں اس کا تمام حسن و کمال ہے اور یہ بیک وقت
اختلاف و اشتراک زندگی کے ہر پہلو میں ہے اسے تضاد کہو یا وحدت فی الکثرت یا اسے کوئی اور نام دو۔ نظریۂ وحدت الوجود
اسی پیچیدہ مسئلے کا حل پیش کرتا ہے۔

مولانا عبدالرحیم فرماتے تھے کہ خیر اور جسے تم شر کہتے ہو یہ دونوں ایک ہی ظہور کے دو پہلو ہیں جنہیں الگ
الگ نہیں کیا جا سکتا ہے ان کا خارج میں حرکت زمانی اور تغیر مکانی سے وقتاً فوقتاً تعین ہوتا رہتا ہے اور اسی سے
ان کے مظاہر مختلف زمان و مکان میں مختلف اشکال میں وجود پذیر ہوتے ہیں آپ خیر و شر کے ان تعینات کو انسانی
معاشرے کے نشو و ارتقاء کے عملِ مسلسل کے مقامات سے تعبیر کیا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ اس بارے میں نظام معتزلی نے
اپنے وقت میں فکر اسلامی کی صحیح رہنمائی کی تھی لیکن افسوس کہ وہ اپنے خیالات کو منضبط شکل میں پیش نہ کر سکا یہی حال نظام
معتزلی کے دوسرے معاصر اہل فکر کا تھا۔ نظام۔ نے "طُفرہ" کا جو نظریہ پیش کیا تھا۔ باوجود اس سے اختلاف رائے کے
یہ ماننا پڑے گا کہ مظاہر قدرت کو سمجھنے اور انکی عقلی توجیہہ کے لیے "طُفرہ" کا نظریہ مشعل راہ بن سکتا تھا۔ اور مولانا
اخوان الصفا کے فلسفے کے زیادہ قائل نہ تھے فرماتے تھے کہ اخوان الصفا کے گروہ نے ویسی ہی ہوائی قسم کی باتیں کیں جیسے
کارل مارکس سے پہلے یورپ کے اشتراکی خیالات کے اہل علم کیا کرتے تھے بیشک کارل مارکس نے اشتراکی فلسفے کو ایک منضبط شکل
میں پیش کیا ہے لیکن اسکی جدلی مادیت کو حرف آخر سمجھنا غلط ہوگا اور اس سے رازِ زندگی کی عقدہ کشائی نہیں ہوتی۔

مولانا عبدالرحیم کے نزدیک حرکت میں بے شک تسلسل موجود ہے — لیکن یہ تسلسل ہموار نہیں ہوتا اسی وجہ سے مختلف
قوموں کی ارتقائی صورت حال ایک سی نہیں اور خود ایک قوم کے افراد کی ترقی کے مدارج مختلف ہوتے ہیں جسکے نتیجہ میں ایسی مختلف
طبقات وجود میں آتے ہیں مولانا فرماتے تھے کہ مارکس اسکی تشریح ذرائع پیداوار کی تبدیلی کے اصول پر کرتا ہے لیکن یہ صحیح نہیں ذرائع
پیداوار کی تبدیلی اختلافِ مدارج کے بہت سی وجوہ میں سے ایک وجہ ہو سکتی ہے لیکن صرف اسے ہی "علت تامہ" ماننا غلط ہے۔ ان
اختلافات میں حرکت زمانی اور تغیر مکانی کا بھی کافی دخل ہے اور ہم ارتقائے انسانی کی تشریح میں مثال کے طور پر جغرافیہ اور
تاریخ کے موثرات کی نفی نہیں کر سکتے۔

اسی سلسلے میں ایک سوال زندگی کی ابتدا یا آفرینش حیات کا ہے مولانا فرماتے تھے کہ اگر ہم بنی نوع انسان کے اس دنیا میں ظہور پذیر ہونے کو ارتقائی نظریے کا نتیجہ مانیں یا تخلیقی تصور کا، آخر میں ہر دو صورت میں ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ایک ہی آدم سے تمام جنس آدم کا ظہور ہوا ہے۔ یہ کہاں ہوا ہے، اور کیسے ہوا؟ ساری تاریخی چھان بین اس سوال کا اب تک کوئی قطعی جواب نہیں دے سکی آفرینشِ جہان کا یہ راز اب تک راز ہے، اور اس سے ہنوز پردہ نہیں اُٹھایا جا سکا۔

مولانا عبدالرحیم شاہ ولی اللہ اور ان کے خانوادۂ علمی کی حکمت اور مسلکِ علمی کے پیرو تھے لیکن اس ضمن میں ان کا ارشاد یہ تھا کہ یہ بزرگ اپنے اپنے وقت میں یہ دعوت دیکر اپنے رب کو پیارے ہو گئے اب ہمارا کام یہ ہے کہ آج کے حالات اور اس زمانے کے مقتضیات کے مطابق اس دعوت کی تجدید کریں اور حضرت شاہ صاحب کی حکمت کی روشنی میں اپنے لئے نئی راہ عمل بنائیں۔ شاہ صاحب کا دور اور تھا انہوں نے اُس دور میں مسلمانان ہند کی فلاح و بہبود کا ایک راستہ تجویز کیا۔ اب زمانہ دوسرا ہے۔ ہمیں شاہ صاحب کی اساس فکر اور ان کے علمی نمونے کو سامنے رکھ کر اس زمانے کے لئے مسلمانوں کی فلاح و بہبود کی راہ بنانی چاہیئے یوں سمجھئے کہ مولانا عبدالرحیم شاہ ولی اللہ کے مکتبِ فکر کے گویا ایک مجتہد تھے انہیں ہم اصطلاحی زبان میں مجتہد منتسب کہہ سکتے ہیں۔

مادی اور اخلاقی ہر دو فلسفوں کا ذکر کرتے ہوئے مولانا فرماتے تھے کہ یہ ہر دو آخر کار "کلام الناس" ہی تو ہیں۔ بے شک دونوں میں سچائی کا ایک نہ ایک پہلو ضرور ہے لیکن یہ دونوں مل کر بھی مکمل نہیں ہوتے۔ جب تک کہ نور نبوت سے استفادہ نہ ہو مولانا اخلاقی فلسفے کے ضمن میں کشف کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ لیکن ان کا کہنا تھا کہ وحدت الوجود ہو یا وحدت الشہود، دونوں کے دونوں ہی مظاہر عالم کے متعلق کشفی حقائق بیان کرتے ہیں اب ان کشفی حقائق کا ادراک ظاہر ہے نفس انسانی کرتا ہے اور وہ حادث محدود ہے چنانچہ نفسِ انسانی حادث و محدود اور ذات الٰہی قدیم اور غیر محدود، ان میں ارتباط یقیناً محال ہے اس لئے کشف خواہ علمی ہو یا وجدانی اور اس کا حاصل نظریہ وحدت الوجود ہے یا وحدت الشہود، نور نبوت کے بغیر نامکمل ہے۔ رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے کہ میں تکمیل اخلاق کے لئے مبعوث ہوا ہوں، اب نور نبوت کا مقصد انسانیت میں مکارم اخلاق کی تکمیل کرنا ہے اگر ہمیں انسانیت کو تباہی سے بچانا ہے تو لازمی ہے کہ اسکے۔ لئے مکارم اخلاق کی تکمیل کا سامان کیا جائے ورنہ انسانوں کو سکون قلب نصیب ہوگا نہ انکی باہمی آمیزش ختم ہوگی۔ انسانی تہذیب کے سر پر ہر وقت تباہی کا مہیب خطرہ منڈلاتا رہے گا مولانا عبدالرحیم فرماتے تھے کہ اسی لئے میں علم (سائنٹفک علم) اور کشف (باطنی و وجدانی علم) دونوں کے مجموعے کو نامکمل سمجھتا ہوں اور ان کا نورِ نبوت سے مستنیر اور مستفید ہونا لازمی قرار دیتا ہوں۔

چند الفاظ میں یہ تھا مولانا عبدالرحیم کا فلسفہ مذہبی، جو بعینہ شاہ ولی اللہ کے فکر کا عکس ہے شاہ صاحب سائینٹفک علم کے دونوں طریقوں استقرار اور استخراج پر عامل تھے نیز کشف وجدانی تو ان کا اپنا مسلک تھا ہی لیکن انکے ساتھ ساتھ وہ تکمیل علم کے لئے نورِ نبوت کو بھی ضروری سمجھتے تھے۔

مولانا عبدالرحیم شاہ ولی اللہ کے فلسفۂ عمرانی کی تشریح اس طرح فرماتے تھے۔ کائنات میں بقائے باہمی اور فنائے باہمی کا عمل بیک وقت جاری ہے بعض اشیاء آپس میں ملتی ہیں اور ان سے نئی اشیاء وجود میں آتی ہیں اور بعض اشیار کا آپس میں تصادم ہوتا ہے اور وہ ایک دوسرے کو ختم کرتی ہیں اب اگر غور سے دیکھا جائے تو جن دو یا دو سے زیادہ اشیار کی اغراض مشترک ہوتی ہیں، وہ بقائے باہمی کے اصول کے تحت اپنی اور ایک دوسرے کی حفاظت میں کوشاں رہتی ہیں اور جن دو یا دو سے زیادہ اشیار کے مفاد باہم متصادم ہوتے ہیں، وہ ایک دوسرے کو فنا کرنے کے درپے رہتی ہیں اس بقا اور فنا کے تضاد سے ہماری زندگی عبارت ہے اور یہی رازِ حیاتِ کائنات ہے چنانچہ دو برابر کی طاقتیں اور قوتیں باہم صلح اور موافقت میں کوشاں رہتی ہیں کیونکہ ان میں سے ہر ایک کو باہمی تصادم میں اپنی تباہی نظر آتی ہے۔ لیکن اگر ایک قوت کمزور ہے اور دوسری طاقتور، تو آخر الذکر کمزور کو ہضم کرنے کے لئے ہمہ وقت تیار رہتی ہے یہ عمرانی اصول جسطرح انسانی افراد اور اجتماع میں کام کرتا ہے اسی طرح عالم طبعی میں بھی اسی کی کارفرمائی ہے مولانا فرماتے تھے کہ جب تک ایک خاندان کے مقاصد مشترک نہ ہوں اس کے ارکان میں اتفاق نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح ایک سوسائٹی میں اتفاق و اتحاد قائم رکھنے کے لئے اس کے افراد میں مقاصد کی بنیادی یکجہتی ہونی چاہیئے گذشتہ صدیوں میں ہم مسلمانوں کا معاشرہ اس لئے تہ و بالا ہوا کہ جاگیرداری دور میں اسکے افراد میں کسی قسم کا اشتراکِ مقاصد نہ رہا اور اُن کے مفاد آپس میں ٹکراتے تھے، جب معاشرے کے افراد کے لئے ترقی اور اظہارِ ذات کے کم و بیش ایک سے مواقع ہوں، تو وہ معاشرہ صحت مند رہتا ہے اور اسے داخلی تضاد سے دوچار ہونا نہیں پڑتا۔ مولانا مادّی لادینی فلسفے کے قائل نہ تھے اسکے بجائے وہ اپنے آپ کو مادی، دینی فلسفہ کا پیرو سمجھتے تھے ان کا کہنا تھا کہ شاہ ولی اللہ کا ایک مادّی دینی فلسفہ ہے اور میں اسکو مانتا ہوں۔ مولانا اس مذہبی فلسفے کے جو جامد ہے اور کائنات اور اسکی موجودات کی زندگی بخش تشریح کرنے سے عاری ہے مخالف تھے اس لئے نہ انکے ہم عصر علمار انہیں سمجھ سکے۔ بلکہ ان کو وہ ہدفِ ملامت بناتے رہے اور نہ دوسرے سیاسی گروہ ان کے دینی فلسفے کی وجہ سے انہیں اپنا سکے گویا وہ علامہ اقبال کی زبان میں یہ کہتے ہوئے دُنیا سے رخصت ہوئے۔

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

شاہ ولی اللہ کے مکتب فکر کا ایک خصوصی امتیاز جہاد فی سبیل اللہ پر اعتقاد رکھنا اور اس پر عمل کرنا ہے اس معاملے میں بھی مولانا عبدالرحیم پکے ولی اللہی تھے مولانا کے نزدیک خیر پر یقین رکھنے کے کوئی معنی نہیں ہوتے اگر انسان اسے حیطۂ عمل میں لانے کی جدوجہد نہ کرے۔ یہ انکے نزدیک جہاد فی سبیل اللہ تھا۔ انکی رائے میں جہاد فرض عین بھی ہے اور فرض کفایہ بھی، مولانا کی خود اپنی زندگی جہاد فی سبیل اللہ پر انکے اس یقین و اذعان کا ایک عملی پیکر تھی وہ ساری عمر باطل کی بیخ کنی اور خیر کو بروئے کار لانے کے لئے جدوجہد کرتے رہے اور ولی اللہی فکر کے اس مسلک کو انہوں نے دل و جان سے اپنایا۔

مولانا عبدالرحیم ایک انقلابی شخصیت کے مالک تھے اور ملک کے اُس وقت کے حالات میں وہ انقلاب کو ضروری سمجھتے تھے لیکن وہ فرمایا کرتے کہ وہ عمل اضطراری ہوتا ہے جو شعور اور علم کے بغیر ہو۔ اور انقلاب اضطراری عمل سے نہیں ہوا کرتے۔ ان کے لئے اجتماعی شعور اور مثبت فکر ضروری ہے آپ کا کہنا تھا کہ ہر صحت مند تبدیلی کے لئے علم صحیح اور عمل صحیح کا اتحاد لازمی ہے صحیح علم کے بغیر صحیح عمل ممکن نہیں اور اگر صحیح عمل نہ ہو تو صحیح علم بے کار ہے۔ بے شک ہر انقلاب کے لئے ایک فلسفہ کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ فلسفہ انسانوں کو ایک خاص ماحول اور ایک خاص وقت میں انقلابی عمل پر آمادہ کرتا ہے۔ لیکن مولانا فرماتے تھے کہ انسانی زندگی کی بعض قدریں غیر متبدل ہیں اور ہمیں ہر انقلاب کا جائزہ انہی قدروں کی روشنی میں لینا چاہیئے کیونکہ اگر ہم غیر متبدل اخلاقی قدروں کو نہ مانیں تو اس صورت میں انسانیت کے تسلسل کو برقرار رکھنا مشکل ہو جاتا ہے اور دوسرا انسانوں کے کسی اجتماعی عمل کو پرکھنے اور اُسکے اچھے اور برے میں تمیز کرنے کا ہمارے پاس کوئی معیار نہیں رہتا۔

اس سلسلے میں مولانا حصول خیر کی جدوجہد کی اخلاقی قدر کو تمام اقوام اور ادیان میں مشترک مانتے تھے اسی طرح وہ تصور خیر کو بھی ملل اور اُمم کی مشترکہ خصلت قرار دیتے تھے۔ وہ فرماتے تھے کہ نیکی اور بدی کا تصور بذات خود ایک اخلاقی قدر ہے اگرچہ اس کا مفہوم اضافی ہوتا ہے اور وقت کی تبدیلی کی وجہ سے اس میں فرق پیدا ہوتا رہتا ہے۔ لیکن جب تک عوام شعوری طور پر کسی قدر کو اپنا نہیں لیتے اور وہ ان کے دلوں کی گہرائی میں نہ اتر جائے عوام کسی انقلابی عمل کے لئے تیار نہیں ہوتے عوام جب کسی قدر کو اس طرح اپنا لیتے ہیں تو وہ انکے لئے ایک نیکی کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے یہ حقیقتاً نیکی ہوتی ہے یا نہیں یہ الگ بحث ہے بہر حال انقلاب کے لئے اس طرح کے عمومی شعور کا ہونا لازمی ہے۔

مولانا عبدالرحیم نے ایک دفعہ فرمایا کہ سارے علومِ انسانی پر جرح کی جاسکتی ہے۔ کیونکہ وہ خبرِ انسانی کا نتیجہ ہیں اور خبرِ انسانی میں کذب اور صدق دونوں کا احتمال ہوتا ہے۔ چنانچہ ان کا کہنا تھا کہ انسان کو چاہیئے کہ انسانی علوم کو اسی نگاہ سے دیکھے اور انکو تجربے اور عمل کی کسوٹی پر برابر پرکھتا رہے۔ آپ نے فرمایا کہ تاریخ اسلام میں بعض چیزوں کا وجود بطور رخصت تسلیم کر لیا گیا لیکن بعد میں اسے امت نے اصل اسلام سمجھ لیا اور اس طرح وہ صراطِ مستقیم سے منحرف ہو گئی اب امت کو بالکل نئے حالات سے عہدہ برآ ہونا پڑ رہا ہے اس لئے اُسے ان تمام امور کا ازسرِ نو جائزہ لینا ہوگا۔ مولانا نے فرمایا کہ خدا تعالےٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اٹھارھویں صدی کے نصف اول ہی اس نے اس سرزمین میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کو مامور فرمایا، جنہوں نے دین اسلام اور اسکے علوم کا تحقیقی جائزہ لیا۔ اور اس سلسلے میں ہمارے لئے ایک واضح راہ متعین فرما دی۔ اب ہمارے علماء اور اہل فکر کا فرض ہے کہ وہ فکر ولی اللہی کی روشنی میں گردوپیش کو دیکھیں اور معاشرے کے غیر صحت عناصر کی اصلاح کریں اور نئے معاشرے کی طرح ڈالیں۔

اس سلسلے میں مولانا فرماتے تھے کہ تبدیلی تخلیقی نہیں تکوینی ہوتی ہے اور لا تبدیل لخلق اللہ کا یہی مطلب ہے اگر افراد اور معاشرے میں تبدیلی ممکن نہ ہوتی، تو انبیاء کو مبعوث کرنے اور مُصلحین کو مامور فرمانے کے لئے کوئی معنی نہ تھے۔ اور اگر تبدیلی محض تخلیقی ہوتی تو قدرت کا یہ سارا کارخانہ اسباب بے کار جاتا۔ اسی لئے حکمت و مصلحتِ خداوندی اسی میں تھی کہ تبدیلی تکوینی و اضافی ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد خیارکم فی الجاهلیه خیارکم فی الاسلام اسی پر دلالت کرتا ہے یہ تبدیلی تخلیقِ خیر میں نہیں ہوئی تھی۔ اضافتِ خیر میں ہوئی تھی پہلے یہ خیر کفر کے حق میں استعمال ہوتی تھی وہ اب اسلام کے حق میں جو نسلی قبائلی اور قومی عصبیت کے خلاف تھا۔ بروئے کار ہونے لگی۔ اور یہی اسلام کا انقلاب تھا۔ مولانا کے نزدیک آج بھی اسی قسم کے انقلاب کی ضرورت ہے اسی کو ہم جہاد فی سبیل اللہ کہتے ہیں اور صالحینِ امت اسی مقصد کی تکمیل کے لئے مامور ہوتے ہیں۔ وہ نئی قوتوں کو وجود میں نہیں لاتے بلکہ پہلے سے جو قوتیں موجود ہوتی ہیں ان کا رخ بدل دیتے ہیں اور انہیں خیر یا فلاح انسانی میں لگا دیتے ہیں۔

ایک دفعہ مولانا عبدالرحیم نے فرمایا کہ مجھے کئی سال تک اس امر میں بڑا تردد رہا کہ جب بنی اسرائیل کُفر و طغیان میں حد سے بڑھ گئے تھے تو اللہ نے ان کی سرکوبی کے لئے بخت نصر کو بھیجا تھا لیکن باوجود اسکے کہ بخت نصر کافر تھا قرآن مجید نے اسے اور اس کے لشکر کو عباداً لنا سے تعبیر کیا ہے فرماتے تھے کہ قیامِ حرم کے دوران میں مجھ پہ یہ نکتہ کھلا کہ جب فساد فی الارض کو دُور کرنے کی خدمت کفار سے بھی لی جائے تو اللہ تعالیٰ انہیں بھی اپنی عبودیت کی نسبت سے یاد کرتا ہے۔

اب میں مولانا عبدالرحیم کا وحدت الوجود کا جو تصور تھا، مختصراً پیش کر کے اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

مولانا عبدالرحیم وحدت الوجود کو یا اسے آپ وحدت الشہود کہہ لیجئے اپنی فکری دعوت کی اساس مانتے تھے۔ ابن عربی وحدت الوجود کے داعی تھے اور امام ربانی مجدد الف ثانی نے اسکے خلاف وحدت الشہود کا تصور پیش فرمایا تھا۔ شاہ ولی اللہ نے ان دونوں نظریوں میں تطابق ثابت کیا اور فرمایا کہ ان میں اصلاً کوئی فرق نہیں محض تعبیر کا فرق ہے۔ مولانا کا وحدۃ الوجود کا تصور حضرت شاہ ولی اللہ سے ماخوذ تھا، البتہ وہ اس کا اطلاق آج کے حالات پر کرتے تھے۔ فرماتے تھے کہ وحدت الوجود کی اصل یہ ہے کہ اصل وجود ذات باری تعالیٰ ہے جو مقدس ہے منزہ ہے اور ہر تبدیلی و انقلاب سے بری ہے لیکن ہر تبدیلی اور انقلاب اسی کی اضافت سے متعین ہوتی ہے۔

مولانا عبدالرحیم کا کہنا تھا کہ ہمارے آئمہ کا اس بارے میں مسلک یہ ہے، کہ تمام اقوام عالم میں ایک قدر مشترک ہے اور وہ ہے ذات باری تعالیٰ کا اقرار، لیکن اس ذات باری تعالیٰ سے جو اضافتیں منسوب کی جاتی ہیں، ان میں فرق ہے۔ اب اگر وحدت الوجود کے نظریے کے مطابق اس بات پر اتفاق ہو جائے کہ سب اقوام عالم ذات باری کے اقرار میں متفق ہیں اور اختلاف صرف اضافتوں کا ہے، جو غیر متبدل نہیں، چنانچہ انہیں تبدیل کیا جا سکتا ہے تو اس صورت میں انسانیت کو حق پر، جو خیر ہے جمع کرنا، نسبتاً زیادہ مشکل نہیں رہتا۔ مولانا کے نزدیک جسطرح ہر اضافت قابل تغیر و تبدیلی تھی، اسی طرح وہ انسانوں کے سماجی رشتوں کو بھی قابل تغیر و تبدیلی سمجھتے تھے۔ فرماتے تھے ہر سماجی رشتہ جو حق سے یا خیر سے متصادم ہو، اُسے تبدیل کرنا چاہیئے۔ البتہ ایک وجود ایسا ہے، جو ہر اضافت سے پاک اور منزہ ہے۔ اور اس میں کسی تبدیلی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ وجود ذاتِ باری تعالیٰ ہے، جو خیر ہے۔ تمام خیر اسی سے پیدا ہوتی ہے اور وہ ہر تبدیلی سے پاک و منزہ ہے۔ مولانا عبدالرحیم صاحب فرمایا کرتے تھے کہ اس نظریے پر تمام اقوام عالم کو جمع کر کے انہیں خیر کے حصول کی جدوجہد کے لئے ہمنوا کیا جا سکتا ہے اور ہم پوری انسانیت کو اسی کی دعوت دے سکتے ہیں۔ فکر ولی اللہی اسی دعوت کا ترجمان ہے اور میں بھی اسی کا ایک نقیب ہوں

مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی (۱)

شاہ ولی اللہ اور اُن کا فلسفہ

بارہویں صدی ہجری میں جب مسلمانوں کی قوت کمزور ہوگئی اور ان کی فوجی طاقت کو زوال آگیا تو اللہ سبحانہٗ تعالیٰ کی اس اُمت پر نظر کرم ہوئی اور اُس نے برصغیر پاک و ہند میں امام ولی اللہ دہلوی (۱۱۱۴ھ - ۱۱۷۶ھ) پیدا فرمائے جو صحیح معنوں میں اس دنیا میں "اللہ کی حجت" تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں فقہ کا وہ راستہ دکھایا جو اُسکے ہاں پسندیدہ تھا اور ان کو علم حدیث میں تجدید کرنے کی توفیق دی، نیز اللہ تعالیٰ نے انہیں سُنن و شرائع اور مصالح اور جو کچھ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب کی طرف سے لائے تھے، ان سب کے اسرار و حکم الہام فرمائے۔ گویہ ایک بڑا جلیل القدر فن ہے لیکن اسکے باوجود شاہ ولی اللہ سے پہلے کسی نے اس پر اتنے سلیقہ اور پختگی سے بحث نہیں کی اگر کسی کو اس میں کچھ شک و شبہ ہو۔ تو وہ شیخ ابن عبدالسلام کی کتاب "القواعد۔ الکبریٰ" دیکھئے جس پر اگرچہ مصنف نے بڑی محنت کی ہے۔ لیکن پھر بھی وہ اس فن کا حق ادا نہیں کر سکے۔

شاہ ولی اللہ کو اللہ تعالیٰ نے تصوف و سلوک کے اس طریقے کا بھی الہام کیا، جو اس زمانے میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول تھا اور اس کی کامیابی مقدر ہو چکی تھی۔ اس طریقے کو شاہ صاحب نے اپنے دو رسالوں "لمحات" اور "الطاف القدس" میں مدون فرمایا اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے انہیں توفیق دی کہ واضح دلائل اور قطعی حجتوں کے ساتھ سلف صالح کے عقائد کا اثبات کریں۔ اہل معقول نے ان میں جو شبہات پیدا کر رکھے تھے، ان سے انہیں پاک کریں اور سلف صالح کے ان عقائد کو اس محکم طریقے سے پیش فرمائیں کہ پھر ان میں بحث و نزاع کی گنجائش نہ رہے مزید براں اللہ تعالیٰ نے شاہ صاحب کو ان چار کمالات

---

(۱) پروفیسر اسلامیات سندھ مسلم کالج کراچی۔ اور ڈائریکٹر شاہ ولی اللہ اکیڈمی

"ابداع" "خلق" "تدبیر" اور "تدلی" کا علم تفصیل سے عطا فرمایا۔ اسی طرح انہیں تمام انسانی نفوس کی استعداد اور ان کے حصولِ کمال کے طریقوں کے علم سے بھی بہرہ ور کیا یہ خدا کردہ جلیل القدر علم ہیں کہ ان کے ارد گرد امام ولی اللہ سے پہلے کوئی گھوما بھی نہیں تھا۔"[1]

شیخ محسن المحدث لکھتے ہیں: "وہ علوم جو اللہ تعالےٰ نے صرف آپ (شاہ ولی اللہ) کے لئے مخصوص فرمائے۔ اور وہ جن میں دوسرے ائمہ کو بھی آپ کے ساتھ شریک کیا اُن کا احاطہ کرنے سے زبان عاجز ہے لیکن کوئی حرج نہیں اگر میں ان قابلِ فخر چیزوں کا ایک حصہ بیان کر دوں تاکہ معلوم ہو سکے کہ پہلے بعد میں آنے والوں کے لئے کیا کچھ چھوڑ گئے ہیں۔ اور اس میں تعجب کی کوئی بات بھی نہیں قسمت آسمان ہی سے اُترتی ہے اور فضل و کمال اللہ کے ہاتھ میں ہے وہ جسے چاہتا ہے، عطا کرتا ہے۔"

یہ لکھنے کے بعد شیخ محسن بہت سے علوم اور عظیم نعمتوں کا ذکر کرتے ہیں جن سے شاہ صاحب کو سرفراز کیا گیا ان میں سے چند ایک یہ ہیں۔ آداب سلوک۔ علم الحقائق جسکے ضمن میں اُن پر امور حقہ کا انکشاف اور انوار ملکوتی کا انعکاس ہوا۔ نیز اللہ تعالیٰ نے انہیں پاک و زکی نفس اور قوت قدسی سے نوازا چنانچہ شاہ صاحب نے ان کو جنہوں نے آپ کی باتوں پر کان دھرے، اصل احوال سے آگاہ کیا اور اپنی معرفتوں کے ذخیرے آن پر جو انہیں سمجھنے کی اہلیت رکھتے تھے موسلا دھار بارش برسائی۔ الغرض حقائق کے بیان میں شاہ صاحب کی زبان سے بڑھ کر ناطق کوئی زبان نہیں اور معرفتوں کے سکوں کو، پرکھنے والی ان کی کسوٹی سے بہتر اور صحیح کوئی کسوٹی نہیں ...."[2]

امام ولی اللہ کا فلسفہ بعض امور میں تو فلسفہ یونان سے مطابقت رکھتا ہے بعض باتوں میں وہ فلاسفۂ اسلام شیخ اکبر محی الدین ابن عربی اور امام ربانی مجدد الف ثانی سے متفق ہے اور بعض امور میں اسکی اپنی منفرد اور مستقل حیثیت ہے دراصل فلسفۂ ولی اللہی انبیائے کرام کی شریعتوں کو عقل کے مطابق ثابت کرتا ہے اور اسی طرح وہ حکمت اور شریعت میں مطابقت پیدا کرتا ہے۔ جو شخص بھی دنیا کی مختلف قوموں کی تاریخ پڑھتا ہے اور ان کے نشیب و فراز پر غور کرتا ہے اس سے یہ بات مخفی نہیں رہ سکتی کہ یہودیت، عیسائیت اور اسلام جیسے حنیفی مذاہب ماننے والوں کے علاوہ جو دوسری غیر حنفی قومیں ہیں، وہ خاص طور سے حکمت اور فلسفہ سے دلچسپی رکھتی ہیں۔ اب ضروری تھا کہ اس حکمت و فلسفہ اور دین حنیفی کو

---

[1] ۔ شاہ ولی اللہ کی فارسی تصنیف "الجزء اللطیف" سے ماخوذ۔ [2] الیانع الجنی، مصنفہ شیخ محسن

باہم ہم آہنگ و مطابق کرنے کی کوشش ہوتی تاکہ اس حکمت و فلسفہ میں جو غلطیاں پائی جاتی ہیں، وہ عیاں ہو سکتیں۔ اور اس طرح غیر حنیفی قوموں کے لئے دین حنیفی کو سمجھنے کی راہ نکل آتی۔ تاریخ اسلامی میں یہ خدمت صوفیاء و مشائخ کرام جنہیں "فلاسفۂ اسلام" کا نام دیا گیا ہے، سرانجام دیتے رہے ہیں۔ اور ان کے اس فلسفہ میں تصوف بھی شامل رہا ہے۔

ان فلاسفۂ اسلام یا اصفیائے اسلام کے اپنے الگ الگ مشرب اور جُدا جُدا طریقے تھے، اس لئے ضرورت تھی کہ اُن کے ان مختلف طریقوں میں تطبیق دی جائے، تاکہ وہ لوگ جو عارفوں کے کلام سے پوری طرح باخبر نہیں، وہ غلطیوں میں نہ پڑیں۔ اور ایک عبارت سے جو معنی نکلتے ہیں، وہ اس سے اُس کے مخالف معنی نہ لے لیں۔ اس خاص معاملے میں بھی شاہ ولی اللہ ایک امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہاں ان کے "مکتوب مدنی" کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

"میرے عزیز بھائیو۔ تم پر اللہ کی رحمت ہو! تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ ہر زمانے اور ہر دور میں علماء ہوئے ہیں۔ اور انہیں اللہ عزّوجل کی رحمت سے حصّہ ملا ہے۔ اور اگر تم اس امت مرحومہ کی ابتدائے عہد کے احوال پر غور کرو کہ جب کہ نہ علوم شرع اور نہ فنون ادب مدّون ہوئے تھے اور نہ ان علوم میں بحث و مباحثہ کا دروازہ کُھلا تھا۔ اس وقت الہام، الٰہی ہی ان علماء کے سینوں میں علمی طور سے نمایاں تھا جیسا کہ ہر دور میں اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا ہوتا ہے اور یہ حقیقت تم سے مخفی نہیں ہونی چاہیئے اب اس دور میں اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ہمارے حصّے میں یہ آیا ہے کہ ہمارے سینہ میں اس وقت کے علماء کے علوم "معقول"۔ "منقول" اور "مکشوف" سب جمع ہوں۔ اور ان میں باہم تطبیق ہو تاکہ ان میں جو اختلافات ہیں، وہ ختم ہو جائیں۔ اور ہر قول اپنی جگہ پر ٹھیک بیٹھ جائے۔ خدا کے فضل و کرم اور اُسکی توفیق سے یہ فقہ میں بھی ہوا، کلام میں بھی ہوا۔ اور اسی طرح تصوف اور دوسرے علوم میں بھی۔

"اور تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ اللہ کی معرفت جیسا کہ خضر علیہ السلام نے کہا ہے ایک سمندر کی طرح ہے کہ جس کی نہ ابتدا ہے نہ انتہا، اور جو اسکے بارے میں گفتگو کرتے ہیں اُنکی مثال سوئیوں کی طرح ہے کہ اس میں ڈوبی ہوئی ہیں اور انکی وجہ سے اس سمندر میں کسی قسم کی کوئی کمی واقع نہیں ہوتی یا انکی مثال اُن چڑیوں کی سی ہے۔ جو اس سے اپنی حاجت کے مطابق پانی پیتی ہیں اور وہاں سے لوٹ جاتی ہیں۔ پھر ان میں سے ہر ایک اسکے کمال اور جمال کی ایک دوسرے سے بڑھ کر خبر دیتی اور تعریف کرتی ہے۔

اسکی تعریف خواہ کتنے بھی مختلف تعریف کرنے والے کرتے رہیں۔ زمانہ ختم ہو جائیگا لیکن اس میں

جو کچھ ہے، اس کی تعریف نہیں ہو سکے گی۔

"اس قسم کے موقعوں پر سننے والوں کے مختلف گروہ ہو جاتے ہیں۔ جو شخص ہر بات کا اصل مقام جان لے اور جس موقع و محل کے متعلق خبر دی گئی ہے۔ اس سے واقف ہو، تو وہ ہر بات کو جو کہی گئی ہے اسکی اصل جگہ پر رکھے گا، اور اس طرح وہ سب کی تصدیق کرے گا۔ جو عبارتوں کے اختلافات اور اشارات کے تنوع سے گھبرا جائے اور وہ اختلافات کی الجھن سے خلاصی پانے کی قدرت نہ رکھتا ہو، وہ پریشان کُن حیرت میں رہتا ہے اور اُسکی مثال اُن اندھوں کی ہے جنہوں نے ایک درخت کو گھیر رکھا ہے، اور وہ اسے چھوتے اور ٹٹولتے ہیں۔ اب اِن اندھوں میں سے ایک کا ہاتھ اسکے پتوں پر پڑا، دوسرے کا اسکی شاخوں پر، کسی کا اسکے پھولوں پر، اور کسی کا اسکے پھل پر۔ اسکے بعد وہ اکٹھے بیٹھ کر اس درخت کے متعلق آپس میں باتیں کرنے لگے۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ درخت کے نرم نرم اجسام ہیں۔ دوسرا بولا۔ وہ تو لکڑیاں ہیں۔ کسی نے کہا وہ بے حد نرم اور ملائم ہے۔ کسی نے اسے حد سے زیادہ سخت بتایا۔ ایک نے کہا کہ وہ بہت ہی میٹھا ہے۔ دوسرا بولا، اس سے زیادہ تلخ اور کڑوی کیا چیز ہوگی۔ تیسرے نے کہا کہ اس کا تو کوئی اپنا مزا ہی نہیں۔ اس طرح ان میں کسی نے اسکی بڑی اچھی خوشبو بتائی اور دوسرے نے کہا کہ اُسکی تو کوئی خوشبو ہی نہیں۔

"جب اس درخت کے بارے میں انکے بیانات میں یوں اختلاف ہوا، تو ان میں سے ہر ایک دوسرے کو جھٹلانے لگا یہاں تک کہ اُن میں گالی گلوچ تک نوبت پہنچ گئی۔ ایسے وقت میں انکے پاس ایک ایسا آدمی آتا ہے جو بصارت رکھتا ہے اور اگرچہ وہ بہت سے دوسرے اوصاف ہیں جنکی بنا پر لوگ عام طور سے ایک دوسرے کی تعریف کرتے ہیں، جیسے کہ آواز کا اچھا ہونا۔ مضبوط گرفت والا ہونا اور سننے، چکھنے اور چھونے کی قوتوں میں باکمال ہوئے ان اندھوں سے کم تر ہے وہ آدمی ان سے یوں گویا ہوتا ہے "بے شک تم سب کی باتیں اصل میں تو صحیح ہیں لیکن تم میں سے ہر ایک نے حقیقت کو صرف اپنے تک جو محصور کر لیا ہے غلطی فی الواقع اس میں ہوئی ہے" اسکے بعد اس بصارت رکھنے والے شخص نے ان اندھوں میں سے ہر ایک کی بات کو اسکے اصل مقام پر رکھا۔ اور بتایا کہ فلاں بات جو کہی گئی ہے اس کا کیا مقصد ہے اور اس کا اشارہ کس طرف ہے"۔[1]

فلسفہ ولی اللہی کی پیچیدگی

امام ولی اللہ نے اپنے ان افکار کی وضاحت کے لئے گو متعدد کتابیں لکھی ہیں جن میں سے السطعات، لمحات، الہمعات، الخیر الکثیر اور بدور البازغہ وغیرہ ہیں۔ لیکن ان کتابوں کے سمجھنے میں وقت یہ پیش آتی ہے کہ وہ اکثر ایک ہی

---

[1] کلمات طیبات صفحہ ۱۷۹ - ۱۸۰ مطبوعہ مجتبائی پریس

بات کو اپنی متعدد کتابوں میں مختلف طریقے سے بیان کرتے ہیں، ایک جگہ وہ اسکے لئے ایک اصطلاح استعمال کرتے ہیں اور دوسری جگہ اسی کے لئے دوسری اصطلاح استعمال میں لاتے ہیں۔ مثال کے طور سے "حقائق امکانیہ" کے لئے "القیوم" کی اصطلاح کو لیجئے۔ اب فلاسفہ اسلام میں سے تمام عارفین اسے مانتے ہیں۔ اور ان کا کہنا ہے کہ وہ ایک "واحد شخصی" ہے۔ اور اپنے "ظلال" (سایوں) کے ساتھ تو اُسکی "قیومیت" کی نسبت ہے اور "حقائق" سے اسکی نسبت "مبدائے تعین" کی ہے اور ان دونوں یعنی "ظلال" اور "حقائق" سے اس واحد شخصی "القیوم" کی نسبت، بلحاظ اس کے کہ وہ ان دونوں کے لئے بمنزلہ وجود کے ہے یعنی جو کچھ موجود ہے، اسی سے ہے؛ "ہوبات" کی نسبت ہے اور اسی نسبت کو "مطلق" کی مقیدات کے ساتھ نسبت سمجھئے۔

امام ولی اللہ اپنی بعض کتابوں میں جیسے کہ "سطعات" ہے "القیوم" کو "نفس رحمانی" سے تعبیر کرتے ہیں۔ "لمحات" میں اُسکو "نفس کلیہ" کہتے ہیں۔ اور "الخیر الکثیر" میں اسی کا نام "خاتم الاسماء الٰھیۃ" ہے۔ نیز "الخیر الکثیر" ہی میں ایک جگہ اسے "المرید" کہا ہے۔ اور اپنی کتاب "البدور البازغہ" میں اُسکو وہ "اسم الرحمٰن" سے معنون کرتے ہیں۔ اب عام اہل علم امام ولی اللہ کی ان اصطلاحات کو نہیں سمجھتے اور اسکی وجہ سے ان کے لئے امام ولی اللہ کا فلسفہ پیچیدہ اور دقیق ہو جاتا ہے لیکن مکتب ولی اللہی کے وہ فارغ التحصیل جنہوں نے ابتداء میں امام ولی اللہ کے علوم کی اشاعت کی، اور اُسے جیسے سمجھنا چاہیئے تھا، سمجھا، وہ اُنکے صاحبزادے شاہ عبدالعزیز، شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین قدس اسرارہم ہیں، اسکے بعد ان حضرات کی کوششوں سے علماء کی ایک جماعت تیار ہوئی جنہوں نے فلسفہ یونان کے ساتھ ساتھ فلسفہ اسلام خود پڑھا اور دوسروں کو بھی پڑھایا۔ انہی فارغ التحصیل حضرات میں سے ایک بزرگ شاہ محمد اسمٰعیل شہید امام ولی اللہ کے پوتے ہیں، جنہوں نے کہ اس موضوع پر "عبقات" کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی "علم حقائق" میں بہترین کتاب ہے۔ اس کتاب میں شاہ محمد اسمٰعیل شہید نے ان اصطلاحات کی جو امام ولی اللہ نے اپنی کتابوں میں وقتاً فوقتاً استعمال کی ہیں، شرح کی تاکہ اس کی مدد سے اہل علم امام ولی اللہ کی تمام کتابوں کا سوچ سمجھکر مطالعہ کر سکیں۔

مسئلہ وجود

امام ولی اللہ کے فلسفہ میں ایک مسئلہ وحدت الوجود اور اسکی جسطرح شیخ اکبر محی الدین ابن عربی قدس سرہ تعبیر کرتے

ہیں یعنی یہ کہ وجودِ حق تعالیٰ کی اشیاء سے "عینیت" کی نسبت ہے، اس کا بھی ہے اور یہ مسئلہ اتنا دقیق ہے کہ متکلمین اور فلسفیوں میں سے اکثر بڑے بڑے علماء تک کے لئے اس کا سمجھنا مشکل ہے اس ضمن میں ان کوتاہ عقل والوں کا تو ذکر ہی کیا جنہوں نے امام ولی اللہ کی کتابوں کو سمجھے بغیر اُنکے خلاف فیصلہ دے دیا۔ وحدت الوجود کا مسئلہ ایک ایسی مقدس حقیقت ہے کہ اسکے انوار صرف اسی پر ضو فگن ہوتے ہیں جسے فہم کامل اور علم معرفت میں بصیرت وافی عطا ہوئی ہو۔ یہاں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مسئلہ وجود کے متعلق امام ولی اللہ نے جو کچھ لکھا ہے، اس پر کچھ گفتگو کی جائے تاکہ وحدت الوجود کے بارے میں اہل عرفان کے مسلکوں کے درمیان جو اشتباہ ہے، وہ دُور ہو سکے، اور اس ضمن میں جن صاحب نے شیخ اکبر ابن عربی اور امام ولی اللہ کے مسلکوں کے ایک ہونے کا دعویٰ کیا ہے، ان کے اس دعوے کی تردید ہو جائے۔[۱]

وحدت الوجود کے بارے میں امام ولی اللہ "مکتوب مدنی" میں فرماتے ہیں۔

"آپ لوگوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ وحدت الوجود اور وحدت الشہود دو لفظ ہیں، جو دو جگہوں پر استعمال ہوتے ہیں، کبھی ان کا استعمال "سیر الی اللہ" کے سلسلے میں ہوتا ہے، چنانچہ کہا جاتا ہے کہ اس سالک کا مقام وحدت الوجود کا ہے اور دوسرے کا مقام وحدت الشہود ہے۔ اب وحدت الوجود سے یہاں مراد سالک کے اس استغراق سے ہے جو اسے اس جامع حقیقت" کی معرفت میں ہو، جس میں عالم کا اسطرح تعین ہوتا ہے کہ اس سے "تفرقہ و تمیز"[۲] کے احکام ساقط ہو جاتے ہیں لیکن اسی "تفرقہ و تمیز" پر تو خیر و شر کی معرفت کا دار و مدار ہے۔ اور شریعت اور عقل بہت واضح الفاظ میں اسے بیان کرتے ہیں۔ "سیر الی اللہ" کی راہ میں بعض سالکوں کو یہ مقام پیش آتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ اس سے اُنہیں نجات دے دیتا ہے۔

وحدت الشہود کے معنی ہیں "جمع اور تفرقہ" کے احکام کو جمع کرنا۔ اس سلسلے میں یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ ایک لحاظ اور وجہ سے تو تمام اشیاء ایک ہیں، اور دوسرے لحاظ اور وجہ سے بہ کثرت ہیں۔ اور ایک دوسرے سے مختلف ہیں غرض کہ "سیر الی اللہ" کے ضمن میں وحدت الشہود کا مقام وحدت الوجود کے مقام سے کامل تر اور ارفع ہے۔ میں نے یہ اصطلاح شیخ آدم بنوری قدس سرہٗ کے بعض پیروؤں سے اخذ کی ہے۔

"بسا اوقات وحدت الوجود اور وحدت الشہود کی یہ اصطلاحیں "حقائق اشیا" کی، جیسی کہ وہ ہیں، معرفت

---

[۱] جیسے کہ کتاب "حسن التقاضی" کے مصنف علامہ کوثری سابق شیخ الاسلام دولتِ عثمانیہ ترکیہ

[۲] یعنی وجود بحت اور موجودات میں یا دوسرے الفاظ میں خالق و مخلوق میں۔ مترجم

کے ضمن میں استعمال ہوتی ہیں۔ جب اہل معرفت نے "حادث" کا "قدیم" سے ارتباط دیکھا، تو ان میں سے بعض اس نتیجہ پر پہنچے کہ "عالم نام ہے "اعراض" کا، جو ایک "حقیقت واحدہ" میں جمع ہیں، جیسے کہ مثال کے طور پر موم سے انسان گھوڑے اور گدھے کی مجسم صورتیں بنائی جائیں، اب موم کے ان مختلف مجسموں کے باوجود وہ موم جس سے کہ یہ مجسمے بنے ہیں اس کی اپنی "طبیعت" تو ایک ہی رہے گی، ہم موم کو مجسم صورتوں کا نام اسی وقت دیتے ہیں، جب اس میں یہ صورتیں وجود پذیر ہوں، لیکن یہ صورتیں فی الحقیقت تو مومی مجسمے ہیں اور ان کا اُس وقت تک اپنا کوئی وجود نہیں ہوتا، جب تک کہ موم ان صورتوں کے ساتھ ضم نہ ہو۔ دوسرے اہل معرفت اس نتیجے پر پہنچے کہ عالم عکس ہے "اسماء اور صفات" کا، اور ان اسماء و صفات" کے مقابل "عدم" کے آئینے ہیں، جن میں یہ اسماء و صفات جلوہ گر ہوتی ہیں۔ جیسا کہ "قدرت" کے مقابلے میں "عجز" ہو، اور "عدم" نام ہی ہے "عجز" کا۔ اب جب "قدرت" کی روشنی "عجز" کے آئینے میں عکس ریز ہوئی تو یہ "قدرت حکمنہ" بن گئی۔ اسی طرح اب دوسری صفات کو لے لیجئے، اب "وجود" کی بھی یہی مثال ہے۔ پہلے مسلک کو وحدت الوجود کا نام دیا جاتا ہے اور دوسرے کو وحدت الشہود کہتے ہیں[1]۔ یہ کہنا کہ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی نے ان معنوں میں وحدت الشہود کا ذکر نہیں کیا بھول اور سہو ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ شیخ موصوف، انکے پیرووں، بلکہ اہل حکمت نے بھی ان معنوں میں وحدت الشہود کا ذکر کیا ہے۔ چنانچہ اس بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے اگر اسکو تمام مجازی اقوال اور استعارات سے الگ کر کے، جن کی وجہ سے سمجھنے میں دقتیں پیدا ہو گئی ہیں دیکھیں، تو اس کا حاصل مراد یہ ہے کہ "حقائق امکانیہ" انتہے ضعیف تر اور ناقص تر ہیں، اور "حقیقت وجود" اس قدر کامل تر اور قوی تر ہے کہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ "حقائق امکانیہ" "اعدام" ہیں (عدم کی جمع) جن میں کہ موجودات کی خوبیاں ظہور پذیر ہوئی ہیں۔ اور اس میں کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں کہ یہ بات متفق علیہ ہے۔"

اگرچہ امام ولی اللہ کے نزدیک وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے متعلق اوپر کے دونوں مکاشفے صحیح ہیں، لیکن جہاں تک اس بارے میں انکے خود اپنے عقیدے کا تعلق ہے، وہ نہ تو وحدت وجود کا مسلک رکھتے ہیں، جیسے کہ شیخ اکبر ابن عربی اور نہ وحدت الشہود پر شاہ صاحب ایسا اعتقاد رکھتے ہیں، جیسا امام ربانی مجدد الف ثانی کا تھا۔ امام ولی اللہ کا مسلک ان دونوں طریقوں کے درمیان ہے۔

امام ولی اللہ کے پوتے صدر شہید شاہ اسمٰعیل اپنی کتاب "عبقات" کے بیسویں "عبقہ" میں دوسرے مذاہب پر بحث کرنے کے بعد اہل توحید کے مذاہب کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔ "ان میں سے کسی نے "لاہوت" اور "کثرتوں" کے

---

[1] پہلا مسلک:۔ عالم نام ہے، اعراض کا، جو حقیقت واحدہ میں جمع ہیں۔ دوسرا مسلک:۔ عالم عکس ہے "اسماء و صفات" کا جو "عدم" کے آئینوں میں جلوہ گر ہیں۔

درمیان "عینیت" کے تعلق کو "ابداع" کے طریقے پر خوب اچھی طرح سے سمجھ لیا۔ اور اسے اس امر کا آخری حد تک تنبہ ہو گیا کہ یہ "کثرت" فی الواقع "لاہوت" میں مضمحل اور گم ہو رہی ہے۔ "لاہوت" کے وجود کے مقابلے میں اس "کثرت" کے وجود کی رکاکت اور خامی کا باوجود اسکے کہ اس "کثرت" کا وجود خود اپنے مواطن و مقامات میں مضبوط ہے، آگاہ ہوا اور اسکے کمالِ ذاتی اور جمال وصفی پر ایمان لایا مع اُسکے جو کچھ ان دونوں سے عالم کثرت میں، جسے "اعدام" احاطہ کئے ہوئے ہیں۔ ظاہر ہوا چنانچہ ان نے جان لیا کہ "کثرت" کے تجلی آئینوں میں "لاہوت" کے کمال اور جمال کی ایک عظیم شان اور بڑا ظہور ہے اور اس سے اس کا نفس "لاہوت" کی عظمت، اسکے تقدس اور اس کے کمالِ ثبات و استحکام سے بھر گیا۔ اور اس کو یہ یقین ہو گیا کہ "نفس لاہوت" پرے سے اور پرے (وراء وراء) ثم "وراء الوراء) ہے"۔

اسکے بعد شاہ اسمٰعیل شہید لکھتے ہیں "چنانچہ اُسکی نظر دونوں فریقوں کے مسلک کے اصولوں تک جا پہنچی۔ اس نے دونوں طریقوں کے خلاصے اور لب لباب کو اختیار کیا۔ اور دونوں مقاموں کا جو حق ہے، وہ ادا کیا۔ یہی لوگ حکمائے ربانی ہیں، جو تشبیہ اور تنزیہ دونوں پر جامع ہیں، اور یہی تمام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے خلفاء اور جانشین ہیں۔ اور یہی طریقہ افضل محققین کا ہے" جس سے شاہ محمد اسمٰعیل کی مراد امام ولی اللہ ہیں۔

میرے نزدیک اس مسئلے میں امام ولی اللہ نے جو مسلک اختیار کیا ہے، اس کا دار و مدار تجلی پر ہے کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ اس ضمن میں ان پر جو حقیقت منکشف ہوئی، وہ تجلی کی تھی، اور ان سے پہلے کسی پر اس کا انکشاف نہیں ہوا۔ چنانچہ تجلی سے شیخ اکبر ابن عربی اور امام ربانی کے مذکورہ بالا دونوں طریقوں میں تطبیق ہو سکتی ہے اور وہ یوں کہ "لاہوت" اور "کثرات" کے درمیان عینیت" کی جو نسبت ہے، وہ تجلی کے ذریعے ہے، ورنہ جہاں تک "ذات" کا تعلق ہے، دونوں ایک دوسرے کے "غیر" ہیں۔ "لاہوت" اور "کثرات" میں "عینیت" کو اس طرح ماننے سے حلول کا اعتراض وارد نہیں ہو سکتا۔ ان دونوں میں من وجہٍ "عینیت" کے ساتھ "غیریت" بھی قائم رہتی ہے۔

چند اعتراضات

کتاب "حسن التقاضی" کے مصنف علامہ کوثری سابق شیخ الاسلام دولت عثمانیہ ترکیہ نے امام ولی اللہ پر اعتراض

کیا ہے کہ وہ حجاز میں شیخ ابو طاہر مدنی کے زیر اثر آئے اور جب وہ وہاں سے لوٹے تو تصوف، فقہ اور معتقدات میں اپنے اہل بیت اور خاندان کے مسلک سے انحراف کر چکے تھے اور "توحید شہودی" کے بجائے "توحید وجودی" کے قائل ہو گئے تھے۔ اس کے جواب میں میں یہ کہوں گا کہ امام ولی اللہ اوّل سے لیکر آخر تک حنفی رہے۔ لیکن ان کے طریقہ فقہی میں جمود نہ تھا، جیسا کہ بدقسمتی سے معترض کے ہاں ہے۔ اور نہ امام ولی اللہ یہ سمجھتے تھے کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہو گیا ہے۔ چنانچہ ان کا طریقہ کار وہی تھا، جو مجتہدین فی المذہب، حنفی اکابر کا رہا ہے کہ انہوں نے جمہور احناف کے بعض متفقہ مسائل سے اختلاف کیا ہے شاید "حسن التقاضی" کے مصنف امام ولی اللہ کی اس بات سے خفا ہوں گے۔

جہاں تک وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے متعلق، امام ولی اللہ کے اپنے مسلک کا تعلق ہے وہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔ اس ضمن میں یہ ملحوظ رہے کہ امام ربانی مجدد الف ثانی نے وحدت وجود کا جس کا کہ اثبات شیخ اکبر ابن عربی نے کیا اس طرح انکار نہیں کیا، جیسے عام طور سے علمائے ظاہر انکار کرتے ہیں بلکہ انہوں نے وحدت الشہود کا وحدت الوجود سے اس کا اقرار کرنے کے بعد، اوپر ایک اور اعلیٰ مقام ثابت کیا ہے۔ اس بارے میں عارف باللہ مرزا مظہر جانجاناں مجددی متوفی ۱۱۹۵ھ کا ارشاد ملاحظہ ہو۔ "انکار حضرت مجدد بر توحید وجودی نہ مثل انکار علمائے ظاہر است بلکہ از مقامیکہ وجود بہ تکلم می کنند تصدیق و تسلیم می نمایند۔ این قدر ہست کہ مقصود اصلی را فوق این مقام می فرمایند و غیریتہ فی الجملہ بین الخلق والحق بہ نہجے کہ مخل وحدت وجود حقیقی کہ متحقق در خارج حقیقی است نگردد ثابت می کنند[1]"

علامہ کوثری نے امام ولی اللہ پر ایک اعتراض یہ بھی کیا ہے کہ وہ موصوف کے الفاظ میں "عالم مثال کے قائل ہیں" اور بقول علامہ کوثری کے یہ ایک ایسا خیال ہے، جس کے وجود کا ثبوت نہ شرع میں ہے، نہ عقل میں معلوم ہوتا ہے مصنف موصوف کی نظر سے "حجۃ اللہ البالغۃ" کا وہ باب نہیں گزرا جس میں امام ولی اللہ نے "عالم مثال" پر بحث کی ہے اور پھر امام ولی اللہ "عالم مثال" کے قائل ہونے میں منفرد نہیں۔ بلکہ اہل معرفت اور اصحاب مکاشفہ کی ایک بڑی جماعت اسے مانتی آئی ہے۔

"حسن التقاضی" کے مصنف نے امام ولی اللہ پر "شق القمر" کی تاویل کرنے کا بھی الزام لگایا ہے موصوف کے الفاظ یہ ہیں

---

[1] کلمات طیبات صفحہ ۱۸

"ان (امام ولی اللہ) کی عجیب باتوں میں سے یہ بھی ہے کہ "شق القمر" کا واقعہ اس سے عبارت ہے کہ چاند نظروں کو یوں دکھائی دیتا تھا اور یہ کہ نظروں کو مسحور کرنا انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے شایانِ شان نہیں۔"

اب جہاں تک مسئلہ "شق القمر" کا تعلق ہے، امام ولی اللہ نے اس سے انکار نہیں کیا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے ایک قصیدے میں اسے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک اعجاز بتایا ہے۔ البتہ "شق القمر" کے ضمن میں انہوں نے اس واقعہ کی چند امکانی صورتیں پیش کی ہیں۔ اور آخر اس طرح امکانی صورتیں پیش کرنے میں کیا حرج ہے اس بارے میں امام ولی اللہ لکھتے ہیں:۔

"اور یہ جو کچھ میں نے ذکر کیا ہے صرف اس مسئلے کے امکانی پہلو ہیں، ورنہ اللہ کی قدرت میں تو سب کچھ ہے اور وہ سب کچھ جانتا بھی ہے۔ تم سے یہ مخفی نہ رہے کہ ایسے اور اس جیسے دوسرے مسئلوں میں جیسا کہ اللہ کے لئے ہاتھ پاؤں اور دوسری چیزوں کا ذکر ہوا ہے، سیدھا راستہ یہ ہے کہ انسان ان کے ظواہر سے گزر جائے اور ان کے وجود کی کیفیت کی ٹوہ میں نہ پڑے۔ اور بالجملہ یہ اعتقاد رکھے کہ اللہ اور اسکے رسول نے ان چیزوں سے جو کچھ مراد لی ہے، وہ حق ہے۔"[1]

علامہ کوثری کا امام ولی اللہ پر یہ اعتراض بھی ہے کہ وہ عالم کو قدیم مانتے ہیں۔ اس ضمن میں میرا کہنا یہ ہے کہ میں نے امام موصوف کی تصانیف میں اس قسم کا کوئی بیان نہیں دیکھا، جس کا ذکر مصنف "حسن التقاضی" نے کیا ہے۔ اس بارے میں میں نے اگر کوئی چیز انکی کتابوں میں پائی ہے، تو وہ یہ ہے:۔ امام ولی اللہ اپنی کتاب "الخیر الکثیر" میں لکھتے ہیں۔

"ہمارا کہنا یہ ہے کہ عالم تمام کا تمام اپنے زمان و مکان اور ہیولیٰ سمیت حادث ہے۔ ان معنوں میں کہ وہ معلول ہے "ارادہ" کا اور معلول ہونے کی وجہ سے اس میں کدورتیں آگئی ہیں ...."

اسی سلسلہ میں وہ "تفہیمات الٰہیہ" میں ایک طویل بحث کے بعد فرماتے ہیں:۔ "عماء"[2] کا قدیم ہونا، اسے ملتوں کے اس اتفاق سے کوئی گزند نہیں پہنچتا کہ عالم جس سے مراد "ما سوی اللہ" حادث ہے اور وہ اس لئے کہ (ذاتِ الٰہی کی) "انیّت اُولیٰ" کی "عماء" میں تجلی ہوئی، اور وہاں اس تجلی کے احکام کا ظہور ہوا، جنہیں "احکامِ وجوب" کا نام دیا گیا۔۔۔ ملتوں کی زبان میں یہ حقیقت ظاہرہ اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات میں سے ہے اور یہ نہ "من کل وجہ عین ذات" ہے اور "نہ من کل وجہ غیر ذات"۔ یہ زمانی لحاظ سے قدیم ہے، اور ایک جہت سے حادث ۔ یہ ذاتِ الٰہی میں

---

[1] تاویل الاحادیث [2] تفہیمات الٰہیہ حصہ اوّل صفحہ ۱۵۸

موجود ہے پس اس بیان سے یہ ظاہر ہوا کہ انکے ہاں عالم کا اطلاق نفسِ "عماء" پر نہیں تھا بلکہ "عماء" کی اس حالت پر ہوتا ہے جب اس میں "حقائقِ امکانیہ" ظاہر ہو جاتی ہیں اس پر غور کرو۔"

معلوم ہوتا ہے کہ علامہ کوثری نے اسی عبارت سے امام ولی اللہ پر قدمِ عالم کے قائل ہونے کا حکم لگایا ہے حالانکہ یہ عبارت عالم کے حادث ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ کیونکہ "عماء" اور چیز ہے اور اس سے عالم مراد نہیں، ہمارے شیخ المشائخ مولانا محمد قاسم نے اس پر ایک رسالہ لکھا ہے، جس میں اس سلسلہ میں حدیث ابن رزین کی شرح کی گئی ہے۔

بہر حال واقعہ یہ ہے زمانے کے قدیم، عالم کے حادث ہونے میں کوئی نزاع نہیں آخر میں اس بحث کو میں عارف باللہ، حامل اسرار طریقت و شریعت، دقائق سیرّ حقیقت کے شارح پیر و امام ربانی مرزا مظہر جانجاناں شہید کے ان الفاظ کے ساتھ جو انہوں نے امام ولی اللہ کے حق جو اُن کے ہم عصر تھے، فرمائے تھے۔ ختم کرتا ہوں [۱]

"حضرت شاہ ولی اللہ محدث رحمۃ اللہ علیہ طریقہ جدیدہ بیان نمودہ اند در تحقیق اسرار معرفت دغوامض علوم طرز خاص دارند۔ با ایں ہمہ علوم و کمالات از علمائے ربانی اند مثل ایشاں در محققانِ صوفیہ کہ جامع اند در علم ظاہر و باطن و علم نو بیان کردہ اند چند کس گزشتہ باشند"

---

[۱] مولانا غلام مصطفےٰ قاسمی نے امام ولی اللہ کی عربی کتاب "لمحات" جو نایاب تھی اس کا ایک نسخہ حاصل کیا اس کی تصحیح کی، اس میں ضروری حواشی کا اضافہ کیا اور اس کے شروع میں مقدمہ لکھا۔ یہ کتاب شاہ ولی اللہ اکیڈمی کی طرف سے شائع ہو گئی ہے۔ یہ مضمون مولانا موصوف کے عربی مقدمہ کا ترجمہ ہے۔ (مدیر)

ڈاکٹر عبدالواحد ھالے پوتا[1]

شاہ ولی اللہؒ کے اصولِ حکمت

شاہ ولی اللہ کی فلسفیانہ تعلیمات کے بنیادی اصول حسب ذیل ہیں۔

۱۔ اِس کائنات کی ہر چیز قانون کے تابع ہے۔ اور اس کے مطابق اس کا نظام چل رہا ہے شاہ صاحب نے اپنی سب سے مشہور اور اہم کتاب "حجتہ اللہ البالغہ" کے پہلے ہی باب میں اِس کائنات میں یہ قانون جن چند متعدد طریقوں میں عمل پیرا ہے، ان کی قسمیں بیان کی ہیں۔ شاہ صاحب کے نزدیک اس قانون کے طریقۂ ہائے عمل یہ چار ہیں، جنہیں انہوں نے حسبِ ذیل نام دیئے ہیں۔

ا۔ اِبداع۔ عدم سے کسی چیز کو وجود میں لانا۔

ب۔ خلق۔ مادے سے کسی چیز کو وجود میں لانا۔

ج۔ تدبیر۔ وسائل اور ذرائع سے انتظام کرنا

د۔ تدلّی۔ نفسیاتی یا غیر مرئی ذرائع سے موثر ہونا

مطلب یہ ہے کہ کائنات کا ایک نظام ہے، جس کے مطابق اُس کا سارا کارخانہ چل رہا ہے۔ اِس میں جو کچھ ہوتا ہے، اُس کا اپنا ایک قانون اور قاعدہ ہے، اور یہاں کوئی چیز یوں ہی نہیں ہو جاتی۔ ساری کائنات ایک سر رشتۂ قانون میں مربوط ہے، اور اس حکمت بالغہ پر اس کا نظام چلتا ہے۔ یہ قانون جو اس کائنات

---

[1] صدر شعبۂ تقابل ادیان و ثقافت اسلامیہ سندھ یونیورسٹی حیدرآباد۔ ڈائرکٹر شاہ ولی اللہ اکیڈمی

برسرِ کار ہے، "قانونِ فطرت" ہے۔

شاہ ولی اللہ کے نزدیک مذہب اور اس کی تعلیمات بھی اسی "قانونِ فطرت" کا ایک حصہ ہیں، یہ قانون خود ان کا تقاضا کرتا ہے۔ اور اس کو پورا کرنے کے لئے مذہب کا وجود ہوتا ہے۔

۲۔ اس کائنات میں جو بھی موجودات ہیں، ضروری نہیں کہ وہ سب کی سب مادی صورت میں ہوں۔ بہت سی چیزیں اس کائنات میں ایسی بھی ہیں، جو مادی صورت کے بغیر موجود ہیں، جیسے کہ تصورات وغیرہ۔ مثال کے طور سے ایک صناع پہلے اپنے دماغ میں ایک عمارت کا نقشہ بناتا ہے، اور پھر اس نقشہ کے مطابق وہ عمارت تعمیر کرتا ہے۔ یہ نقشہ اس صناع کے دماغ میں ہوتا ہے۔ اور اس کی خارج میں کوئی مادی صورت نہیں ہوتی۔ لیکن اس کے بعد وہ اس نقشے کو مادی صورت دیتا ہے، اور اُس کے مطابق وہ عمارت بناتا ہے۔ اسی طرح شاہ صاحب کے نزدیک اس کائنات کی ہر مادی چیز کی ایک خیالی صورت ہے، جس کا اپنا ایک مستقل وجود ہے۔ ہر چیز کی اس غیر مادی خیالی صورت کا وجود اس کے مادی وجود سے مقدم ہوتا ہے۔ یہ مادی وجود دراصل خارج یعنی اِس کائنات میں پَرتو اور مظہر ہوتا ہے اُس کے خیالی وجود کا۔ چنانچہ شاہ صاحب کا کہنا ہے کہ اس کائنات کی تمام چیزوں کی ایک دوسرے عالم میں خیالی صورتیں ہیں، یہاں تک کہ وہ کیفیات جو یہاں ہمیں نظر نہیں آتیں، اُس عالم میں انکی خیالی صورتیں موجود ہیں ان خیالی صورتوں کو وہ "امثال" کا نام دیتے ہیں، اور جہاں وہ ہیں، اسے "عالمِ مثال" کہتے ہیں۔ اس "عالمِ مثال" کے مقابلے میں یہ جو مادی کائنات ہے، وہ "عالمِ شہادت" ہے۔ شاہ صاحب "عالمِ مثال" کو اس "عالمِ شہادت" سے وسیع تر، عظیم تر اور برتر و اعلیٰ سمجھتے ہیں۔ الغرض شاہ ولی اللہ اس محدود مادی کائنات کو تخلیق کا حرفِ آخر نہیں سمجھتے، ان کے نزدیک اس سے ماوراء "عالمِ مثال" ہے، اور "عالمِ مثال" سے ماوراء دوسرے عالم ہیں، ان سب کو وہ "عالمِ غیب" کا نام دیتے ہیں۔ چنانچہ "عالمِ شہادت" سے بالاتر "عالمِ مثال" ہے۔ اس سے بالاتر "عالمِ ارواح" ہے۔ اور اس سے وراء اور وراء الوراء اور عالم ہیں۔

۳۔ شاہ صاحب کی حکمت جہاں "عالمِ شہادت" کے مطالعہ و مشاہدے میں ہماری رہنمائی کرتی ہے، وہاں وہ اس بات پر بھی زور دیتی ہے کہ اس "عالمِ شہادت" سے ماوراء جو "عالم" ہیں، ان کے بارے میں بھی غور و خوض کیا جائے۔ اُن کے نزدیک یہ سب عالم ایک دوسرے سے مربوط ہیں، اور یہ سارے ایک ہی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ نیز اس "عالمِ شہادت" کا مطالعہ و مشاہدہ صرف اس کے مادی مظاہر تک محدود نہیں ہونا چاہیئے۔ اس عالم کے جو نفسیاتی، مابعد الطبیعاتی اور فکری اُفق ہیں، وہ بھی پیشِ نظر رہنے چاہئیں۔ شاہ صاحب بار بار اس بات کی طرف توجہ دلاتے ہیں کہ جیسے جیسے انسان "عالمِ شہادت" کا مطالعہ

کرتاہے، اس پر یہ حقیقت واشگاف ہوتی جاتی ہے کہ اس عالم میں جو کچھ ہو رہا ہے، وہ ایک نظام اور قانون کے تحت ہو رہا ہے، اور یہاں کی ہر چیز کا اپنا ایک نظام قانون ہے، جس کے وہ خلاف نہیں جا سکتی۔ یہ قانون فطرت ہے، اور اسی کو وہ "فطرۃ اللّٰہ" کہتے ہیں۔

اب مذہب ان کے نزدیک چونکہ اسی قانون فطرت کا ایک تقاضا ہے۔ جو کہ ساری کائنات پر حاوی ہے اس لئے جس طرح ہر چیز اس قاعدے اور نظام کی پابند ہے، جو قانون فطرت نے اس کے لئے مقرر کیا ہے، اسی طرح انسان کو بھی مذہب کی پابندی کرنی چاہئے۔ یہ مذہب، جو قانون فطرت کا تقاضا ہے، شاہ صاحب کے نزدیک اسلام ہے، اسلام کے معنی ہی ہیں اللّٰہ کے قانون کے سامنے سر جھکانے کے۔ اسلام نے جن کاموں کو کرنے کا حکم دیا ہے۔ ان کے کرنے سے انسانیت کی جو اصل فطرت ہے اسے جلا ملتی ہے، اور جن کاموں سے روکا ہے ان کے ارتکاب سے یہ فطرت مسخ ہوتی ہے۔ مذہب انسان کی پوری زندگی پر محیط ہے۔ وہ اسکی مادی ضرورتوں کا بھی کفیل ہے اور روحانی ضرورتوں کا بھی، وہ اس دنیا میں اس کی رہنمائی کرتا ہے۔ اور اس کے اتباع کا اجر موت کے بعد کی زندگی میں ملتا ہے۔ شاہ صاحب کا مذہب کا تصور عالم گیر بلکہ ہمہ گیر ہے۔ اور اس میں اتنی ہی عمومیت ہے، جتنی خود انسانیت میں ہے۔

۴۔ شاہ صاحب زندگی میں ارتقا کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک ایک عمل سے ردّ عمل کے طور پر ایک نتیجہ نکلتا ہے، جو سبب بنتا ہے دوسرے عمل کا اور اس دوسرے عمل سے ردِّ عمل کے طور پر ایک اور عمل مترتب ہوتا ہے اور اس طرح زندگی اپنے قدم آگے بڑھاتی چلی جاتی ہے۔ اور کائنات میں ارتقائی مدارج طے ہوتے ہیں۔ چنانچہ وہ "عقل"۔ "قلب" اور "طبیعت" کو انسان اور حیوان دونوں میں مشترک مانتے ہیں، لیکن جہاں حیوان میں یہ جبلتیں ایک مقام پر رک گئی ہیں، وہاں انسان میں یہ ترقی یافتہ شکل میں موجود ہیں، اور برابر ترقی کرتی رہتی ہیں۔ انسان کی انہی ترقی یافتہ جبلتوں کا اظہار آگے چل کر "ست اخلاق فاضلہ[۱]" میں ہوتا ہے۔

حیوان سے انسان کو جو چیز ممتاز کرتی ہے، اس کی وضاحت شاہ صاحب یوں کرتے ہیں:۔

حیوان چونکہ اپنے طبعی و حیاتیاتی تقاضوں سے مغلوب ہوتا ہے، اس لئے اس کے افعال ہمیشہ اس کی حیاتیاتی

---

[۱] حکمت، شجاعت، عفت، سماحت، فصاحت، دیانت اور سمت صالح

ضرورتوں اور طبعی جبلتوں کی تسکین کے لئے ہوتے ہیں[1] تسکین کے اِس انفرادی عمل کو شاہ صاحب "رائے جزوی" کا نام دیتے ہیں، اور اسکے مقابلے میں "رائے کلی" ہے، جس سے انسان کو بہرہ ور کیا گیا ہے۔

شاہ صاحب کے نزدیک ارتقاء کے دوران میں "توہم" "تصرف" اور اس طرح کے جو دوسرے عقلی اوصاف انسان اور حیوان میں مشترک ہیں، وہ انسان میں ترقی کر کے عمومیت اور وسعت کی خصوصیت حاصل کر لیتے ہیں، اور اس کا اظہار "رائے کلی" کی شکل میں ہوتا ہے۔ یہی "رائے کلی" انسانی اخلاق میں سب سے اہم کردار ادا کرتی ہے، اور یہی باعث بنتی ہے "تجمل" (خود کو بہتر بنانے) "ظرافت" (زینت و تجمل) اور ذوق حسن و زیبائی کو نفس انسانی میں وجود میں لانے کا۔ انسانی طبیعت کے یہ تین خصوصی وصف ان بنیادی جبلتوں سے ظہور ہوتے ہیں، جو انسان کی طرح حیوان میں بھی پائی جاتی ہیں اور پھر ان کے باہمی عمل و ردّعمل اور ایک دوسرے کو موثر کرنے اور متاثر ہونے کے ارتقائی مراحل طے کر کے وہ نفسیاتی کیفیات یا جذبات و عواطف وجود میں آتے ہیں، جو انسانی طبیعت کے خصوصی امتیازات ہیں۔ الغرض مسلسل تبدیلی اور ترقی وارتقاء کا تصور ان تمام مباحث میں شاہ ولی اللہ صاحب کے فکر کی بنیاد ہے اس سے جہاں ہمیں ان جبلتوں کا پتہ چلتا ہے، جو انسان کی طرح حیوان میں بھی موجود ہیں، وہاں انسان میں جس ترقی یافتہ اور پیچیدہ شکل میں پائی جاتی ہیں، ہم انہیں حیوانی جبلتوں سے ممتاز حیثیت میں جان سکتے ہیں۔ اسی سے ہمیں "سات اخلاق فاضلہ" کے متعلق شاہ صاحب کا تصور سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے، اور ہم دیکھ سکتے ہیں کہ یہ سارے اخلاق ان اوصاف کی ترقی یافتہ اور پیچیدہ شکلیں ہیں جن کا مصدر و منبع طبع حیوانی کی متعدد جبلتیں ہیں۔ شاہ صاحب ان اخلاق فاضلہ میں سے ایک ایک خلق کا سراغ ان جبلتوں میں سے کسی نہ کسی جبلت تک لگاتے ہیں، اور وہ جبلت اس خلق میں جس طرح موثر ہوتی ہے، اس کی نشان دہی کرتے ہیں۔ مثال کے طور سے سوچ بچار کا ملکہ جو عقل کا حاصل ہے۔ حیوان اور انسان دونوں میں مشترک ہے، لیکن انسان میں یہ ملکہ ترقی یافتہ شکل میں ہے۔ جس کا اظہار اعلیٰ سطح پر "حکمت" کی صورت میں ہوتا ہے، جو "سات اخلاقِ فاضلہ" میں سے ایک ہے۔

۵۔ شاہ ولی اللہ "INTERACIONIST" یعنی عمل و ردّ عمل یا فعل و انفعال بلکہ

---

[1] جیسے کھانا پینا، اور جنسی افعال وغیرہ ۔ حجتہ اللہ البالغہ

زیادہ صحیح الفاظ میں "تفاعل" کے مسلک کو ماننے والے ہیں۔ ان کے نزدیک نفیاتی طبیعاتی اور طبعی کیفیات میں ایک رشتہ ہے، اور ذہنی یا نفسی رجحان، اعمال وافعال کی جو خارجی صورتیں ہیں، ان پر اسی رشتے کے ذریعے موثر ہوتا ہے۔ چنانچہ آدمیوں اور حیوانوں کے جسمانی مظاہر سے ان کی نفسی کیفیات کو معلوم کیا جاسکتا ہے۔

اپنے اس تصورِ "تفاعل" کی مدد سے شاہ صاحب عام طبائع و رجحانات کے ارتقاء کی وضاحت کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ہر باشعور اور سوچا سمجھا ہوا عمل یا سرگرمی ذہن کو متاثر کر کے اس کی نئی تشکیل کرتی ہے۔ اور یہ نہیں کہ صرف محرک جذبہ ہی عمل کا سبب ہوتا ہے؛ بلکہ ہر عمل بعد میں ہونے والے عمل کے محرک جذبے کو تقویت دیتا ہے۔ مضبوط محرکاتِ عمل نمائندہ ہوتے ہیں مضبوط نفسی کیفیات کے، جو اُن سے متعلق ہوتی ہیں۔ اور ان سے نئے ذہنی شعور ترتیب پاتا ہے، جو قوی تر عمل اور مزید آگے جانے والے شعور کو پیدا کرتا ہے۔ اس سے جہاں طبیعت و رجحان اور ترقی کرتا اور مضبوط ہوتا ہے وہاں اسکے ساتھ ہی زیادہ مضبوط طبیعت و رجحانِ عمل کی قوت اور فعالیت کو بڑھاتا ہے۔ عمل کے تکرار اور اس کی مشق سے طبیعت و رجحان میں تقویت پیدا ہوتی ہے، اور طبیعت و رجحان کی تقویت سے عمل کی فعالیت و قوت بڑھتی ہے۔ اسی طرح ذہنی شعور کی قوت کی ہر کمزوری اسی نسبت سے ارادے کی فعّالیت کو کمزور کر دیتی ہے، اور عمل جاری نہ رہنے سے شعور اور ارادے کی فعّالیت کی کمزوری میں اور اضافہ ہوتا ہے۔

شاہ صاحب نفس انسانی کی پوشیدہ صلاحیتوں کو ترقی دینے کے لئے باشعور اور سوچی سمجھی عملی سرگرمیاں ضروری قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک ان سے اُن قوتوں کا ظہور ہوتا ہے، جن سے ایک اچھی ترقی یافتہ شخصیت، جسے شاہ صاحب "صورہ شخصیہ" کہتے ہیں، ترتیب پاتی ہے۔ نفسیاتی کیفیات اور اعمال خارجی ایک دوسرے سے جس طرح متاثر ہوتے اور ایک دوسرے کو جس طرح موثر کرتے ہیں، شاہ صاحب اس کو سمجھنے پر بہت زور دیتے ہیں، اور اسے تعمیرِ اخلاق کے لئے اہم سمجھتے ہیں۔

۶۔ شاہ صاحب کے نزدیک انسان مجموعہ ہے دو قسم کی طبیعتوں کا، ایک کا نام وہ ملکیت بتاتے ہیں، اور دوسری کا "بہیمیت"۔ انسانوں میں یہ دونوں طبیعتیں مختلف درجوں میں پائی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر کہیں "ملکیت" مضبوط ہوگی، یا متوسط درجے کی ہوگی، یا وہ کمزور ہوگی۔ یا اِس کی کوئی اور نوعیت ہوگی۔ اور کہیں "بہیمیت" اس طرح سے گی۔ پھر کہیں ان دونوں طبیعتوں میں، باہم کھچاؤ ہوگا، اور کہیں ان میں ہم آہنگی ہوگی۔ شاہ صاحب کا کہنا ہے کہ یہ

جو ہم انسانوں کے طبائع میں اختلاف دیکھتے ہیں، تو اس کی وجہ اُن میں اِن دو طبیعتوں کا مختلف درجوں میں پایا جانا اور پھر ان کی آپس میں کھچاؤ، جسے وہ "تجاذب" کہتے ہیں، یا ہم آہنگی کی صورت ہے جس کے لئے وہ "اصطلاح" کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں شاہ صاحب اس بات پر زور دیتے ہیں کہ انسان کے اندر "بہیمیت" اور "ملکیت" کی جو دو طبیعتیں ہیں، ان پر نگاہ رکھنا اور ان کا اندازہ کرنا بہت ضروری ہے۔ کیونکہ ان کی صحیح پہچان اور اصلاح و تزکیہ ہی پر انسان کی نفسی اور روحانی ترقی کا تمام تر دار و مدار ہوتا ہے، اور انسان میں یہ طبیعتیں جس جس درجے کی ہوتی ہیں، اور ان کی آپس میں "تجاذب" یا "اصطلاح" کی جو نوعیت ہوتی ہے، ان باتوں کو پیش نظر رکھ کر آپ اس سے اخلاقی بلندی یا عملی کارکردگی اور مستعدی کی توقع کر سکتے ہیں۔

اس ضمن میں اُن کا یہ کہنا بھی ہے کہ زبردست و موثر اور بڑے بڑے کارنامے اُن افراد سے سرانجام پاتے ہیں، جن میں "ملکیت" بھی مضبوط ہوتی ہے، اور "بہیمیت" بھی۔ اور ان میں آپس میں "تجاذب" نہیں، ہم آہنگی یعنی "اصطلاح" ہوتی ہے۔

۵۔ اخلاق انفرادی بھی ہیں اور اجتماعی بھی۔ اور انسان کے جہاں حقوق ہیں، وہاں اسکی ذمہ داریاں بھی ہیں۔ شاہ صاحب بحیثیت ایک عالمِ اجتماعیات کے اس بات پر خاص زور دیتے ہیں۔ اجتماعیات پر بحث کرتے وقت بھی یہ بات ان کے ذہن میں برابر رہتی ہے کہ انسانی خصلتوں کا سرا آگے چل کر حیوان تک جا ملتا ہے۔ اور اس معاملے میں بھی ان کے سامنے حیوانوں کی، جو انسان کے "ابنائے جنس" ہیں طرز زندگی رہتی ہے۔ شاہ صاحب کے نزدیک انسان کو اپنی اجتماعی زندگی میں بھی وہ تمام جبلّتیں بطور وراثت کے ملتی ہیں، جو اس میں اور حیوان میں مشترک ہیں۔ البتہ ان کے علاوہ وہ ان خصوصیات سے بھی بہرہ ور ہوتا ہے، جو انسان کے لئے مخصوص ہیں، جیسے مثال کے طور سے "رائے کلی"۔ "تکمل و ترقی" کا جذبہ اور ذوق حسن و زیبائی وغیرہ۔ الغرض اجتماعیات میں بھی شاہ صاحب کے ہاں ارتقاء اور عمل اور ردّ عمل کا اصول کارفرما ہے۔ ان کے نزدیک معاشرہ بعینہٖ اسی طرح ترقی پذیر ہے، جیسے ایک نمو پذیر فرد ہوتا ہے۔ وہ انسانی معاشرہ کو مختلف افراد کا مجموعہ نہیں سمجھتے کہ انہیں کسی مصنوعی طریقے یا کسی "معاہدہ عمرانی" کے ذریعہ اکٹھا کر دیا گیا ہو۔ وہ معاشرے کو ایک جاندار نمو پذیر وجود قرار دیتے ہیں۔ جس کے ارتقار کے خود اپنے قاعدے و ضابطے ہیں۔ اس کے سامنے ایک منزل ہے، اور اس کا اپنا ایک مقصد بھی ہوتا ہے معاشرہ کی زندگی ایک فرد کی سی زندگی ہوتی ہے

وہ چھوٹا ہوتا ہے۔ پھر بڑھتا ہے) بیمار ہوتا ہے، اور تندرست ہو جاتا ہے۔ اور آخر میں اسے زوال آگھیرتا ہے۔
شاہ صاحب کے نزدیک معاشرے کے چار ارتقائی منازل ہیں۔ اور اس کی آخری منزل یہ ہے کہ وہ ایک وسیع ترین الاقوامی وحدت کی شکل اختیار کرلے، جس کے تحت بہت سی چھوٹی وحدتیں ہوں۔ ان کے نزدیک دنیا میں امن بحال رکھنے کے لئے یہ ضروری ہے۔

۶- شاہ ولی اللہ کے ہاں "رسوم"۔ "شعائر اور مقرر شدہ آداب و شرائط INSTITUTIONS کی بڑی اہمیت ہے، اور وہ معاشرے کے قیام، بقا اور استحکام کے لئے ان کا وجود ضروری سمجھتے ہیں، لیکن ان کے نزدیک یہ سب چیزیں وسائل ہیں اصل مقصد کے حصول کے لئے ان کی ہر حال میں ثانوی حیثیت ہے ان کا کہنا ہے۔ کہ "رسوم" اس وقت تک ہی اچھی رہتی ہیں، جب تک وہ اس مقصد کو پورا کریں، جن کے لئے وہ وجود میں آئی ہیں، لیکن بعض دفعہ حالات کی تبدیلی یا دوسری وجوہ کی بنا پر وہ اپنا اصل مقصد پورا کرنے سے قاصر ہوتی ہیں۔ یا ان سے افراد یا پورے معاشرے کے مفادات میں خلل پڑتا ہے، تو اس صورت میں وہی صالح رسوم "طالح رسوم" بن جاتی ہیں، اور ان کی اصلاح لازمی ہو جاتی ہے۔ ایک معاشرے میں ایک ہی "رسم" تاریخ کے مختلف ادوار میں حالات کی تبدیلی کی وجہ سے مختلف شکلیں اختیار کر لیتی ہے، اور یہ اس لئے کہ "رسم" کو ایک خاص شکل دینے کا دارومدار حالات پر ہوتا ہے، اور جب حالات بدلتے ہیں، تو "رسم" کی شکل کا بدلنا ضروری ہو جاتا ہے۔ اسی قاعدے کا اطلاق ان معاشروں پر بھی ہوتا ہے، جو ایک ہی وقت میں ہونے کے باوجود آپس میں مختلف ہوتے ہیں، اس لئے ان میں ایک سی "رسوم" نہیں ہوتیں اور ان میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ دنیا کے مختلف حصوں میں اور مختلف ماحول اور مختلف حالات میں رہنے والے معاشرے ایک ہی شکل کی "رسم" کبھی اپنا نہیں سکتے۔

(۷) شاہ ولی اللہ کے نزدیک سب سے پہلی اور مقدم چیز، جس پر وہ بار بار زور دیتے ہیں، اور جو ہمیشہ ان کی نظروں کے سامنے رہتی ہے، وہ یہ ہے کہ پوری انسانیت ایک وحدت ہے، جسے انہوں نے "انسان کبیر" کا نام دیا ہے۔ لیکن شاہ صاحب اس مقام پر رک نہیں جاتے۔ وہ اس سے اور آگے بڑھتے ہیں۔ ان کا یہ "انسان کبیر" ایک اور بڑی وحدت کا ایک حصہ ہے، جسے ہم کائنات (UNIVERSE) کہہ سکتے ہیں، شاہ صاحب نے اس کا نام "شخص اکبر" رکھا ہے۔ اس سے اُن کی مراد صرف مادی کائنات نہیں، بلکہ اس کے علاوہ غیر مادی

کائناتیں بھی ہیں، جنہیں "عالم غیب" کہا جاتا ہے۔ اس سے شاہ صاحب کے نظام فکر کی وسعت کا کچھ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ہمیں صرف ایک اچھے شہری کی زندگی گزارنے کے قواعد و ضوابط بتانے تک ہی اکتفا نہیں کرتا، بلکہ اُس کے سامنے اس سے ماوراء بھی بلند تر مقاصد ہیں۔ ان کے نظام فکر کے مطابق صالح زندگی کا مقصد محض یہ نہیں کہ ایک فرد اپنے معاشرے کے ساتھ ہم آہنگ ہو، اور وہ فرد اور اس کا معاشرہ پوری انسانیت سے یا دوسرے بہت سے انسانی معاشروں سے ہم آہنگ ہوں اور ان کے اچھے اور مفید اجزا بنیں، بلکہ ایک فرد ترقی کرتا کرتا اس مقام پر پہنچ جائے کہ وہ اعلیٰ تر عالم سے جسے شاہ ولی اللہ "ملاء اعلیٰ" کہتے ہیں، ہم آہنگ ہو جائے۔

اس کے ساتھ ساتھ شاہ صاحب برابر اس حقیقت کے معترف نظر آتے ہیں کہ تمام کائناتوں میں ہر لمحہ ارتقاء کا عمل جاری و ساری ہے۔ ہر چیز مختلف مراحل سے گزر رہی ہے۔ اس میں تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ اور اس "قانون فطرت" کا اطلاق سب پر ہوتا ہے۔ افراد اور ان کا معاشرہ اسی طرح پوری کی پوری انسانیت نیز اس کے ادارے اور شعائر اور رسوم ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے ہیں۔ الغرض شاہ صاحب کا نظام فکر لوگوں کے ایک مخصوص گروہ کے ساتھ جو خاص حالات و ماحول میں رہ رہے ہیں، مختص نہیں، بلکہ ساری انسانیت کو اس کے تمام ارتقائی منازل میں اپنا موضوع بحث بناتا ہے۔ اس ضمن میں وہ سارا زور "فطرت" پر دیتے ہیں، جسے انسان اپنے نوع کی ضرورتوں اور حالات و ماحول کے تقاضوں کے مطابق ڈھال لیتے ہیں۔

۸- شاہ ولی اللہ وحدت الوجود کے ماننے والے ہیں۔ شاہ صاحب کے خیالات ان لوگوں سے ملتے ہیں جن کا عقیدہ ہے کہ اس ساری کائنات (شخص اکبر) کا ایک حقیقت سے جو آخری حقیقت ہے، بمراتب صدور ہوا ہے اور اس ساری کائنات (شخص اکبر) پر جیسی کہ وہ ہے، ایک کائناتی تدبیر یا ایک کائناتی قانون کی، جسے شاہ صاحب "مصلحت کلیہ" کا نام دیتے ہیں، فرماں روائی ہے۔ یہ "مصلحت کلیہ" اللہ تعالیٰ کے ارادے اور علم میں پہلے سے متعین ہے۔ اب اس پوری کائنات میں جو چھوٹے چھوٹے عالم یا کائناتیں ہیں ان کے اپنے اپنے خاص قانون ہیں۔ جو "شخص اکبر" کے بڑے قانون یعنی "مصلحت کلیہ" کا حصہ ہیں۔ غرضیکہ اس طرح پوری کائنات میں جو کچھ ہوتا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے ارادے اور علم میں پہلے سے متعین ہے، اور اگر ہم "شخص اکبر" کی جہت سے ان مختلف قوانین کو برسرکار دیکھیں، تو ان سب میں ایک وحدت ہے۔

شاہ صاحب کے نزدیک بنی نوع انسان کے دماغوں میں ذات باری تعالیٰ کا شعور فطری طور پر موجود ہے، اور اس شعور کی ابتدائی شکل یہ احساس ہے کہ چیزیں خود بخود وجود میں نہیں آتیں اور یہ احساس کسی حد تک حیوانوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ شاہ صاحب اپنی کتاب "حجتہ اللہ البالغہ" میں لکھتے ہیں کہ ذات باری کے متعلق اس شعور کی اصل وہ فطری احساس ہے، جسے ہم "محبت ذاتیہ" کہتے ہیں۔ ان کے نزدیک اس کا منبع و مصدر حقیقت قصویٰ ہے۔ یہ تصور عقیدہ وحدت الوجود کا لازمی نتیجہ ہے، شاہ صاحب کا کہنا ہے کہ اگر صحت مند انسانی طبیعت کو صحیح خطوط پر ترقی کرنے دیا جائے، اور اس کی راہ میں رکاوٹیں حائل نہ ہوں، تو وہ اپنے فطری رجحانات کی وجہ سے جو خود اس کے اندر موجود ہیں۔ لازمی طور سے خدا تعالیٰ کے متعلق ایک صحت مند اور ٹھیک شعور حاصل کرے گی۔ چنانچہ ان کے نزدیک حقیقی مسرت جسے وہ "سعادت" کا نام دیتے ہیں، فطری ترقی، ارتقائے طبیعت اور خدا تعالیٰ کے متعلق صحت مند اور ٹھیک شعور، سب آپس میں لازم و ملزوم ہیں۔

۹۔ مابعد الطبیعات اور اس میں خاص طور سے موت کے بعد انسان کو جو کچھ پیش آنے والا ہے، شاہ صاحب کے فلسفے کا ایک ضروری جزو ہے۔ ان کے نزدیک موت کے بعد دوسری دنیا میں زندگی کے بقا و تسلسل پر عقیدہ رکھنا دین و مذہب ایک اہم حصہ ہے۔ اس سلسلے میں جزا، سزا، ثواب، عقاب، غضب الٰہی اور رضائے الٰہی وغیرہ کے جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں، ان کے بارے میں شاہ ولی اللہ کے تصورات کو صرف اسی طرح صحیح طور پر سمجھا جا سکتا ہے کہ انہیں شاہ صاحب کے فلسفیانہ فکر کے عمومی پس منظر میں دیکھا جائے، جس میں لوگوں کی زبان اور جس طریقے سے پیغمبر اور اولیائے اس سے کام لیتے ہیں، اس کے بارے میں شاہ صاحب کے نظریات بھی شامل ہیں۔ لیکن اس ضمن میں موت کے بعد کی زندگی کے علم اور اس پر عقیدہ رکھنے کی جو اہمیت ہے، اس کا یہاں ذکر ضروری ہے۔ یہ عقیدہ انسان کو زندگی کا ایک معین مقصد دیتا ہے، اور اسے اس قابل کرتا ہے کہ وہ اس دنیوی زندگی کو بہتر بنانے کی تگ و دو کرے، اور اس کے ساتھ ساتھ موت کے بعد دوسری دنیا میں اچھی زندگی کی امید رکھے[۱]

علاوہ ازیں موت کے بعد کی زندگی کے متعلق جو تفصیلات دی گئی ہیں، ان سے انسان کی صرف ذہنی جستجو ہی کی

---

[۱]۔ بدور بازغہ صفحہ ۱۵۲

تسکین نہیں ہوتی اور زندگی کے بارے میں بالعموم اس کا نقطہ نظر راہ راست پر نہیں آتا۔ نیز اسے وہ طبعی توازن حاصل نہیں ہوتا، جسے شاہ صاحب "اعتدالِ نوع" کہتے ہیں بلکہ اس پر مستزاد یہ کہ موت کے بعد کی زندگی پر یہ عقیدہ انسانی ذہن کو نیک اور مفید کاموں پر اُبھارتا ہے، اور ہر بُرے اور نقصان دہ کاموں سے روکتا ہے۔

ہمارے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں، جس سے اس قسم کے احوال اور مشاہدات کی تحقیق علمی نہج پر کی جائے، جیسے مثلاً حلّاج کو پیش آئے، اور جو اگر علم کا ایک سرچشمہ ہیں بھی، تو ہم ان سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ بعینہٖ الٰہیات کے وہ تصورات بھی جن کو اب ایک ایسی مابعد الطبیعات کے الفاظ و مصطلحات میں پیش کیا جاتا ہے، جو مدت ہوئی عملاً مردہ ہو چکی ہے، ان لوگوں کی نظر میں بے کار ہیں، جن کا ذہنی پس منظر یکسر مختلف ہے۔ لہٰذا ہم مسلمانوں کو ایک بہت بڑا کام درپیش ہے۔ ہمارا فرض ہے ماضی سے اپنا رشتہ منقطع کئے بغیر اسلام پر بحیثیت ایک نظام فکر از سرِ نو غور کریں۔ یہ غالباً شاہ ولی اللہ دہلوی تھے جنہوں نے سب سے پہلے ایک نئی روح کی بیداری محسوس کی۔ لیکن اس عظیم الشان فریضے کی حقیقی اہمیت اور وسعت کا پورا پورا اندازہ تھا، تو سید جمال الدین افغانی کو جو اسلام کی حیات ملی اور حیات ذہنی کی تاریخ میں بڑی گہری بصیرت کے ساتھ ساتھ طرح طرح کے انسانوں اور ان کی عادات و خصائل کا خوب تجربہ رکھتے تھے، ان کا مطمح نظر بڑا وسیع تھا۔ اور اس لئے یہ کوئی مشکل بات نہیں تھی کہ ان کی ذات گرامی ماضی اور مستقبل کے درمیان ایک جیتا جاگتا رشتہ بن جاتی۔ ان کی ان تھک کوششیں اگر صرف اسی امر پر مرکوز رہتیں کہ اسلام نے نوعِ انسانی کو جس طرح کے عمل اور ایمان کی تلقین کی ہے، اس کی نوعیت کیا ہے، تو آج ہم مسلمان اپنے پاؤں پر کہیں زیادہ مضبوطی کے ساتھ کھڑے ہوتے۔ (صفحہ ۱۴۵-۱۴۶

تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ۔ از علامہ اقبال

سید باقر شاہ ایڈوکیٹ[1]

وقف سیّد محمد رحیم

شاہ ولی اللہ اکیڈمی کا قیام "وقف سید محمد رحیم" کا رہینِ منت ہے جسے نومبر ۱۹۶۳ء میں محترمہ بی بی زیب النساء صاحبہ نے قائم کیا تھا۔ آپ ٹھٹھہ کے مشہور سادات بخاری خاندان سے تھیں۔ آپ کے والد ماجد سید تاج محمد شاہ صاحب تھے بی بی زیب النساء کی صغر سنی ہی میں آپ کے والدِ محترم کا انتقال ہوگیا۔ اور آپ یتیم ہوگئیں۔

محترمہ بی بی زیب النساء ٹھٹھہ شہر کے جنوب میں چند میل دُور دریائے سندھ کی دوسری طرف واقع سجاول میں مٹیاری خاندان کے سادات میں بیاہی گئیں۔ آپ کے خاوند سید عبدالرحیم شاہ صاحب تھے جن کے والد بزرگوار کا نام نامی سید محمد رحیم شاہ صاحب تھا۔ یہ وقف جو شاہ ولی اللہ اکیڈمی کے قیام کا باعث بنا ہے، انہیں سے منسوب ہے۔ اور ان کے نام پر اس کا نام "وقف سید محمد رحیم" رکھا گیا۔

سید محمد رحیم شاہ صاحب نے اپنے پیچھے تین صاحبزادے اور ایک صاحب زادی چھوڑی۔ سب سے بڑے صاحبزادے کا نام سیّد محمد ہاشم شاہ صاحب تھا۔ ان سے چھوٹے سید عبدالرحیم شاہ صاحب تھے جن سے محترمہ بی بی زیب النساء بیاہی گئیں۔ اور سب سے چھوٹے سید نواز علی شاہ صاحب تھے۔ والد کے انتقال کے بعد زمینداری کا انتظام بڑے بھائی

---

[1] ۔ سیّد باقر شاہ ایل۔ ایل۔ بی ایڈوکیٹ کراچی شاہ ولی اللہ اکیڈمی کے قیام کی کوششوں میں آپ پیش پیش تھے۔ موصوف اکیڈمی کے ڈائرکٹر ہیں۔ مجلسِ ادارت "الرحیم" کی درخواست پر آپ نے یہ مضمون لکھا ہے اس میں مختصراً اس معزز خاندان کے حالات بیان کئے گئے ہیں جس کے کارِ خیر کا نتیجہ "شاہ ولی اللہ اکیڈمی" ہے۔ (مدیر)

سید محمد ہاشم صاحب کے ہاتھوں میں رہا۔ اور انہوں نے اپنے چھوٹے بھائیوں اور بہن کی پرورش اور تربیت کا خاص خیال رکھا۔ سید عبدالرحیم شاہ صاحب ابھی زیادہ عمر کے نہیں تھے کہ ان کے بڑے بھائی نے موصوف کی شادی ٹھٹھ کے سادات بخاری میں کر دی۔ سید عبدالرحیم شاہ صاحب نے چار درجے تک سندھی کی تعلیم حاصل کی تھی اور اس کے علاوہ فارسی بھی پڑھی تھی۔ بعد میں آپ نے علوم دینی کی تحصیل کی۔

سید عبدالرحیم شاہ شیخ الہند مولانا محمود الحسن کی اسلامی و وطنی تحریک سے بڑے متاثر تھے اور حضرت شیخ الہند کے شاگردوں مولانا عبیداللہ سندھی اور مولانا محمد صادق بانی مدرسہ مظہر العلوم کراچی سے اکثر انکی صحبت رہتی تھی۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران ۱۹۱۵ء میں جب مولانا عبیداللہ سندھی حضرت شیخ الہند کے فرمان کے مطابق ایک سیاسی مشن پر کابل تشریف لے گئے، تو مولانا سندھی کے شاگرد مولانا محمد اکرم سید عبدالرحیم شاہ ہی کے ہاں آ گئے، سید صاحب نے ان سے حدیث پڑھی، اور دونوں بزرگوں کا کافی عرصہ ساتھ رہا۔

سید عبدالرحیم شاہ صاحب ضلع لوکل بورڈ کراچی کے منتخب ممبر تھے، اور اگر چاہتے تو بڑی آسانی سے بورڈ مذکور کے پریذیڈنٹ منتخب ہو سکتے تھے۔ لیکن چونکہ انہیں سرکار دربار کا تقرب طبعاً ناپسند تھا۔ اور لوکل بورڈ کے پریذیڈنٹ کے لئے یہ ضروری ہوتا ہے، اس لئے آپ نے کبھی بورڈ کا پریذیڈنٹ بننا منظور نہ کیا۔ وہ ایک آزاد منتخب ممبر کی حیثیت سے بورڈ میں اپنے علاقے کی نمائندگی کرتے رہے اور اس منصب پر فائز رہتے ہوئے رفاہ عام کے جو بھی کام ہو سکتے تھے، وہ آپ سرانجام دیتے رہے۔ سید صاحب کی ذات صحیح معنوں میں مرجع عوام تھی، اور "افضل الاشغال خدمۃ الناس" آپ کا شعار تھا۔ باوجود اس کے آپ فطرتاً تنہائی پسند تھے، اور عموماً جلوت پر خلوت کو ترجیح دیتے تھے، لیکن جب خدمت خلق کا سوال ہوتا تو آپ کسی چیز سے دریغ نہ کرتے، اور جو کچھ آپ سے ممکن ہوتا، کرتے، اس معاملے میں ان کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے۔

سید صاحب کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی تھی کہ ان کے علاقہ کا کوئی مقدمہ عدالت تک نہ جائے تاکہ مقدمہ بازی میں فریقین مالی لحاظ سے تباہ نہ ہوں۔ اور نہ ان میں باہمی رنجشیں بڑھیں۔ چنانچہ ان کے علاقے کے لوگ اکثر اپنے جھگڑے انہی کے پاس لے جاتے، اور ان سے فیصلہ کراتے۔ سجاول کے مسلمانوں کے علاوہ وہاں کے غیر مسلم بھی ایسے معاملات میں سید صاحب کی طرف رجوع کرتے۔ اور ان کے سامنے اپنے قضیئے پیش کر کے ان سے انصاف چاہتے۔ غرضیکہ

سیّد عبدالرحیم شاہ صاحب کی ان کوششوں کا نتیجہ تھا کہ سجاول کے بہت کم جھگڑے قابل دخل اندازی پولیس ہوا کرتے اور ان سے بھی کم جھگڑے عدالتوں تک جاتے۔ اس لحاظ سے سید صاحب کی ذات گرامی سب کے لئے ایک رحمت تھی۔ ان اوصاف حمیدہ کی وجہ سے علاقے بھر میں سید صاحب کی بڑی عزت کی جاتی تھی۔ اور ان سے عوام کی عقیدت کا یہ حال تھا کہ وہ ان کے سامنے جھوٹ بولنے کی ہمت نہیں کر سکتے تھے، چنانچہ جو واقعہ ہوتا وہ سچ سچ آپ کے سامنے بیان کر دیتے۔ اور اس طرح جھگڑے بآسانی نمٹ جاتے۔

ان اسلامی، قومی اور عوامی خوبیوں کے ساتھ ساتھ سید صاحب ذاتی طور سے بڑے فیاض اور بڑے مہمان نواز تھے۔ اور ہر حاجت مند کی مدد کرنے میں وہ ہمیشہ پیش پیش رہتے تھے۔ گھر کو سنبھالنے کے علاوہ ان کاموں میں بی بی صاحبہ سید صاحب کی سب سے بڑی مدد و معاون تھیں وہ مہمان نوازی کے انتظامات کی بہ نفسِ نفیس نگرانی فرماتیں اور اس بات کا خاص طور سے خیال رکھتیں کہ ان کے گھر سے کوئی شخص نامراد اور مایوس نہ جائے خود بی بی صاحبہ کی اپنی زندگی بڑی سادہ تھی، اور اپنی ضروریات کے معاملے میں وہ بڑی کفایت شعاری برتتی تھیں لیکن دوسروں کے معاملے میں وہ بڑی فیاض تھیں۔ یہ اوصاف تھے، جن کی بدولت سادات کا یہ گھرانا خیر و برکت کا منبع بن گیا اور دور و نزدیک کے لوگ اس کے گرویدہ ہو گئے۔ خانہ داری اور مہمان داری کی تمام مصروفیتوں کے باوجود محترمہ بی بی زیب النساء صاحبہ تہجد کی برابر پابندی فرماتیں اور شب خیزی ان کی عادت میں داخل تھی اس کے علاوہ سید صاحب کی خدمت میں بھی کوئی کسر نہ رہنے دیتیں، اور آپ کی خوشنودی ان کے ہمیشہ پیش نظر رہتی

سیّد عبدالرحیم شاہ صاحب اور محترمہ بی بی صاحبہ کے ہاں ایک لڑکا اور ایک لڑکی پیدا ہوئی، لیکن بقضائے الٰہی وہ زیادہ دن نہ جئے، اور بچپن ہی میں اپنے رب کو پیارے ہو گئے۔ سید صاحب کے بڑے بھائی سید ہاشم شاہ صاحب کو بھی اللہ تعالیٰ نے ایک لڑکا دیا، لیکن وہ بھی انتقال کر گیا۔ انہوں نے دوسری شادی کی۔ لیکن اس سے کوئی اولاد نہ ہوئی۔ اسی طرح تیسرے بھائی سیّد نواز علی شاہ صاحب کے ایک لڑکا ہوا، اور وہ بھی فوت ہو گیا چنانچہ تینوں بھائیوں کی کوئی اولاد زندہ نہ رہی۔ اور سب صغر سنی میں وفات پا گئے۔

جب سیّد محمد ہاشم شاہ صاحب کا انتقال ہوا، تو ان سے جو حصّہ وراثت سید عبدالرحیم شاہ صاحب کو ملا، آپ نے اسے وقف کر دیا۔ سجاول کا مشہور مدرسہ دارالفیوض ہاشمیہ اسی وقف سے چل رہا ہے۔ جب

مولانا محمد صادق بانی مظہر اسلام کراچی حیات تھے تو وہ اس مدرسہ کے امتحانات لینے سجاول آیا کرتے تھے۔ سید صاحب ان کے آنے پر بڑا اہتمام فرماتے، اور بی بی صاحبہ تو ان دنوں کو عید کی طرح مناتیں۔ اس سلسلے میں مولانا مرحوم کی خاطر مدارات تو ہوتی ہی، لیکن اس کے ساتھ ساتھ مدرسے کے طالب علموں کی دعوتیں ہوتیں، اور ان کے لئے خورد و نوش کے خاص طور سے انتظام کیا جاتا۔ اس موقع پر گرد و پیش سے بکثرتِ مہمان آتے، جن کے لئے سید صاحب کے دسترخوان کھلے تھے۔

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، سید عبدالرحیم شاہ صاحب اسلامی تحریکات سے گہری دلچسپی رکھتے تھے اور مولانا عبیداللہ سندھی اور مولانا محمد صادق کے واسطے سے حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن کی جماعت سے منسلک تھے۔ چنانچہ جب ۱۹۱۹ء۔۱۹۲۰ میں تحریک خلافت شروع ہوئی، اور حکومت برطانیہ سے عدم تعاون کرنے کا پروگرام منظور کیا گیا تو سید صاحب نے فرنگی حکومت کی تمام مراعات واپس کر دیں، جو انہیں ملی ہوئی تھیں۔ قومی تحریک کے جواب میں اور اس کے اثر کو کمزور کرنے کے لئے اس زمانے میں انگریزی حکومت نے شہروں اور دیہات میں اپنے کارندوں کے ذریعہ "امن سبھائیں" کے نام سے انجمنیں بنوائی تھیں، جن کا مقصد انگریزی حکومت کی تائید کرنا تھا۔ سید عبدالرحیم شاہ صاحب کی وجہ سے سجاول میں اس طرح کی انجمنیں نہ بن سکیں۔ اور انگریزی حکومت کے کارندے ان اطراف میں ناکام رہے۔

مولانا عبیداللہ سندھی کی ہجرتِ کابل کے بعد ان کے شاگرد مولانا محمد اکرم سید صاحب کے ساتھ سجاول میں رہتے تھے۔ جب موصوف اپنے گاؤں چلے گئے تو سید صاحب نے مکہ معظمہ میں مولانا عبیداللہ سندھی کے پاس جانے کا ارادہ کیا۔ اس سے پہلے گو سید صاحب فریضۂ حج ادا کر چکے تھے لیکن اس دفعہ ان کے ساتھ بی بی صاحبہ بھی حجاز تشریف لے گئیں۔ فرائض حج ادا کرنے کے بعد سید صاحب اور بی بی صاحبہ جلد ہی واپس آ گئیں، کیونکہ ان کی غیر موجودگی میں زمینداری اور دوسرے امور کی دیکھ بھال کا کوئی خاطر خواہ انتظام نہیں تھا۔ واپسی پر بی بی صاحبہ کے بھانجے سید مہر علی شاہ کو ان کاموں کا منتظم بنایا گیا اور پھر سید صاحب اور بی بی صاحبہ دونوں دوبارہ ارض مقدس روانہ ہو گئے۔ جہاں انہوں نے ایک سال سے زیادہ عرصہ قیام کیا، اور دو مرتبہ حج کر کے واپس وطن آئے۔ مولانا سندھی ان دنوں حجاز میں تھے۔

سید عبدالرحیم شاہ صاحب نے اپنی زندگی ہی میں اپنی جائداد کا نصف حصہ بی بی صاحبہ کے نام منتقل کر دیا گیا۔ محترمہ بی بی صاحبہ اکثر یہ سوچا کرتیں کہ ان کی یہ جائداد جو سید صاحب نے ان کے نام کر دی ہے، کسی ایسے نیک کام میں صرف ہو جو سید صاحب کو بھی پسند ہو، اور اس سے لوگوں کو فیض بھی پہنچے۔ چنانچہ کافی سوچ بچار کے بعد اس زرعی جائداد کو جس کا کل رقبہ تقریباً گیارہ سو

ایک طرح "وقف سید محمد رحیم" میں منتقل کیا گیا، اور شرائط وقف کا جو مسودہ مرتب ہوا، اسے سید صاحب نے پسند فرمایا، چنانچہ اس طرح محترمہ بی بی صاحبہ کی تحریک پر اور جناب سید عبدالرحیم شاہ کی تائید اور رضامندی سے یہ وقف قائم کیا گیا جس کی آمدنی میں سے ایک سو روپیہ سالانہ مکہ معظمہ کے مدرسہ صولتیہ کو بھیجے جانے کا فیصلہ ہوا، اور اس کے بعد یہ شرط رکھی گئی کہ وقف کی آمدنی میں سے شاہ ولی اللہ رح کی اسلامی حکمت و فلسفہ کی تعلیم و ترویج کا انتظام کیا جائے، "وقف سید محمد رحیم شاہ" کے ابتدائی متولی بی بی صاحبہ اور سید صاحب دونوں تھے۔ سید صاحب کا ۱۹۴۷ء میں انتقال ہوا، ان کے بعد صرف بی بی صاحبہ اس وقف کی متولی تھیں ۱۹۵۷ء میں محترمہ بی بی زیب النساء بھی دار البقاء کو سدھاریں۔ اب ان کے اس وقف کی آمدنی سے شاہ ولی اللہ اکیڈمی کا قیام عمل میں آیا ہے جو شرائط وقف کے مطابق حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ کی حکمت و فلسفہ اور ان کی تعلیمات کی نشر و اشاعت کرے گی

خدا کرے جن نیک ارادوں اور بابرکت عزائم کے ساتھ محترمہ بی بی زیب النساء صاحبہ اور سید عبدالرحیم شاہ صاحب نے یہ وقف قائم کیا ہے یہ اکیڈمی ان کی اہل ثابت ہو۔ اور اس کے ذریعہ جہاں حضرت شاہ ولی اللہ کی تعلیمات کو فروغ ملے، اور دنیا اس مفکر اسلام کے ارشادات سے مستفید ہو سکے، وہاں اس وقف کو قائم کرنے والوں کے نام صفحہ روزگار پر ثبت رہیں، اور ان کے اس فیض کا سلسلہ برابر جاری رہے۔

سید عبدالرحیم شاہ صاحب اور ان کی زوجہ محترمہ بی بی زیب النسا صاحبہ نے کل پانچ وقف چھوڑے ہیں۔ ان میں سے ایک وقف کی واقف تو بی بی صاحبہ ہیں، جس سے شاہ ولی اللہ اکیڈمی قائم کی گئی ہے۔ اور باقی کے چار وقف خود سید عبدالرحیم شاہ صاحب نے قائم کئے، جن کی آمدنی مختلف خیراتی کاموں میں صرف ہوتی ہے۔

افکار و آراء

اس عنوان کے تحت وہ خطوط شائع کئے جایئں گے، جو کسی علمی مسئلے کے بارے میں ادارہ کو موصول ہوا کریں گے۔ قارئین کے لئے صلائے عام ہے کہ وہ ان صفحات میں اپنی آراء کا آزادی سے اظہار کریں۔ (ادارہ)

کیا شاہ ولی اللہ اکیڈمی یہ کرے گی؟

شاہ ولی اللہ اکیڈمی کے قیام کی خبر پڑھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ اس قسم کے علمی و تحقیقی اسلامی ادارے اس ملک میں جتنے بھی ہوں کم ہیں۔ ہمارا ایک اسلامی ملک ہے۔ اس کی بنا اسلام کے نام سے رکھی گئی ہے۔ ملک کی غالب اکثریت مسلمان ہے اور اس کی ذہنی، اخلاقی، تاریخی اور ثقافتی زندگی کا تمام تر انحصار اسلام پر ہے اس لئے ضرورت ہے کہ اسلام اپنی صحیح شکل میں اہل ملک کے سامنے پیش ہو، اور وہ اسے سمجھیں، اپنائیں اور اس سے ہدایت حاصل کریں۔ اگر اکیڈمی اس سلسلے میں کچھ کر سکی، تو وہ اس ملک کی بہت بڑی خدمت ہوگی۔

میں نے حضرت شاہ ولی اللہ کا بالاستیعاب مطالعہ تو نہیں کیا لیکن ان کے بعد ان پر جو کچھ لکھا گیا ہے۔ وہ اکثر میری نظر سے گزرا ہے بیشک شاہ صاحب کی علمی عظمت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے دین اسلام، اس کی تاریخ اور اس کے جملہ علوم کا جس وسیع اور گہری نظر سے مطالعہ کیا اور ان سب کو پوری انسانیت کے پس منظر میں دیکھا، میرے نزدیک وہ ان کا سب سے بڑا علمی کارنامہ ہے۔ اسلام کو دین فطرت اور اسلامی شریعت کو انسانیت کے تزکیہ اور دنیوی فلاح کا ذریعہ ثابت کرنے میں انہوں نے خاص طور سے زور دیا تاکہ اسلام میں از سر نو ہمہ گیریت اور عمومیت آ جائے جو شروع میں اس میں تھی اور بجائے ایک خاص گروہ اور ایک مخصوص قوم کا مذہب ہونے کے کل انسانیت کا دین بن سکے، جیسا کہ وہ دین فطرت ہونے کی حیثیت سے ہے اور ایک زمانے میں وہ تھا۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے بہت کچھ لکھا ہے اور ان کے اس لکھے ہوئے پر چلنے والوں کی بھی اس برصغیر میں کمی نہیں۔ ان کے نام لیوا اور علمی جانشینوں نے بڑی بڑی سیاسی تحریکیں چلائیں، اور ہندوستان کی تقدیر کو بدلنا چاہا۔ انہوں نے دار العلوم بنائے، مذہبی تنظیمیں قائم کیں، اور علمی و فکری شمعیں روشن کیں۔ اور میرا یہ کہنا مبالغہ نہیں ہوگا کہ اس سرزمین میں جتنا نام اور ذکر اس وقت شاہ ولی اللہ صاحب کا ہے، اور ہر دور میں رہا ہے، شاید ہی کسی اور مذہبی عالم اور دینی مصلح کا رہا ہو۔ مجھے اس کے ماننے میں قطعاً کوئی تامل نہیں جیسا کہ بعض اہل قلم کا خیال ہے کہ شاہ ولی اللہ کی وہ ذات گرامی ہے جسے ہم امام الہند یا آج کے حالات میں اسلامی برصغیر کا امام کہہ سکتے ہیں۔ بیشک یہ ایک حقیقت ہے کہ شاہ صاحب نے تفسیر، حدیث، فقہ، علم کلام اور تصوف میں تجدید فرمائی ہے۔ اور ان اسلامی علوم کو ایسی بنیادوں پر کھڑا کر دیا ہے کہ وہ سائنٹفک (علمی) بھی ہیں حقیقت پسندانہ بھی، اور اس کے ساتھ ساتھ جدید (ماڈرن) بھی، اور ہم ان بنیادوں پر اسلامی علوم کی بلند سے بلند تر اور وسیع سے وسیع تر عمارت تعمیر کر سکتے ہیں۔ جو آج کے مذہبی فکری اور ثقافتی تقاضوں کی کفیل ہو سکتی ہے۔

واقعی شاہ ولی اللہ کے فکر میں اس کی گنجائش ہے اور اس میں اتنی وسعت، گہرائی اور بلندی بھی ہے۔ میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ شاہ صاحب دین اسلام کو انسانیت کے مرادف سمجھتے ہیں اور انہوں نے اسلام کی ایسی تعبیر فرمائی ہے جس میں اتنی ہی ہمہ گیریت اور عمومیت ہے، جتنی کہ خود انسانیت میں ہے۔ گویا اس لحاظ سے وہ مفکر اسلام

بھی ہیں، اور مفکرِ انسانیت بھی۔ وہ اسلام کو انسانیت کی عمومی سطح سے دیکھتے اور اسکے علوم کو انسانیت ہی کے معیار سے پرکھتے ہیں۔ اور ان کی افادیت کو تمام انسانوں کیلئے یکساں ثابت کرتے ہیں۔ شاہ ولی اللہؒ کے فکرِ اسلامی کی یہی ہمہ گیریت اور عمومیت میرے نزدیک ان کا سب سے بڑا امتیاز ہے، اور اُسے عام کرنے کی اس میں شک نہیں کہ آج سب سے زیادہ ضرورت ہے، لیکن اس زمانے میں بھی جب شاہ ولی اللہ صاحب نے یہ دعوت دی اسکی کچھ کم ضرورت نہ تھی یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ اور اسی کی طرف توجہ دلانے کے لئے میں یہ خط لکھ رہا ہوں۔ آخر یہ کیا بات ہے کہ شاہ ولی اللہؒ کے علمی جانشینوں اور تحریک ولی اللہی کے حامیوں کے ہاں ہمیں شاہ صاحب کی تجدیدِ اسلامی کے بہت سے پہلو ملتے ہیں (میں یہاں ان مکاتبِ فکر کا ذکر کرنا نہیں چاہتا، جو شاہ صاحب کے نقشِ علمی پر چل رہے ہیں) لیکن جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا فکرِ ولی اللہی کے مختلف مکاتب میں جمود، تنگی اور محدود قسم کی تقلید پرستی آتی گئی اور شاہ ولی اللہ صاحب نے اسلامی فکر کو جو وسعت، ہمہ گیریت اور عمومیت عطا کی تھی۔ اس کا اثر بتدریج کم ہوتا گیا۔ میں اس سلسلے میں بعض تعلیمی تحریکوں، مذہبی جماعتوں اور علمی و فکر اداروں کا نام لے سکتا ہوں، لیکن چونکہ میں کسی بحث میں الجھنا نہیں چاہتا اور ان سب جماعتوں اور درسگاہوں کی عزت کرتا ہوں جن کی بدولت تحریک ولی اللہی کا نام زندہ ہے اس لئے اس امر سے قطع نظر کرتا ہوں، اور اصل سوال کی طرف آتا ہوں۔ میں صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں، شاہ ولی اللہؒ کے بعد ان کے اسلامی فکر کی اس ہمہ گیریت اور عمومیت کو جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے، فروغ کیوں نہ ہو سکا، اور ان کے علمی جانشینوں نے ان کے مسلک پر چلتے ہوئے علم حدیث کو بیشک ترویج دی، اور اس کے ساتھ ساتھ فقہ حنفی کی اشاعت کی، لیکن شاہ صاحب کے ہاں جو انسانیت گیر وسعت فکری ہے، اس کا سراغ ان کے علمی وارثوں اور نام لیواؤں میں کیوں نہیں ملتا۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ وہ فکر جس کی پہنائیوں میں نہ صرف پوری انسانیت مع اپنے تمام مذاہب و ملل و اقوام کے سما سکتی تھی بلکہ یہ ساری کی ساری کائنات اور اس سے ماورا جو ادوار بنائیں ہیں، ان پر وہ فکر محیط ہو سکتا تھا۔ آخر میں اسی فکر کے علمبرداروں نے اُسے اتنا محدود کر دیا کہ اس میں سارے مسلمانوں کی بھی سمائی نہیں ہو سکتی تھی۔ اور یہ فکر پوری انسانیت پر محیط ہونے کے بجائے ملّت اسلامیہ کو بھی اپنی پہنائیوں میں لینے سے قاصر رہا۔ اور آخر میں یہ ایک فرقے کا مسلک بن کر رہ گیا۔ کیا "شاہ ولی اللہ اکیڈمی" شاہ صاحب اور ان کے علمی جانشینوں کی تصنیفات اور ان کے تراجم شائع کرنے کے ساتھ ساتھ ایسے امور پر بھی تحقیقات کا کام کرے گی؟ میرے خیال میں آخرالذکر کام اول الذکر کام سے کچھ کم اہم نہیں۔ اگر اکیڈمی کو ان افراد اور طبقوں کے لئے مفید ہونا ہے، جو معاشرے میں اثر انداز ہو سکتے ہیں، اور جن کے ہاتھ میں قوم کی فکری و عملی قیادت آتی ہے۔ اور وہ چاہتی ہے کہ فکر ولی اللہی قوم کے لئے مشعل ہدایت بنے، اور اس سے عوام و خواص میں اسلام کے لئے نیا ولولہ اور ملت کی اصلاح و ترقی کے لئے نیا جوش پیدا ہو، تو اسے ان سوالوں کو بھی آگے لانا چاہیئے۔ پرانی لکیریں پیٹنے سے کبھی نئی زندگی پیدا نہیں ہوا کرتی البتہ جس جذبہ تخلیق و اقدام نے پرانی لکیروں کو وجود بخشا تھا اسی کو نئے سرے سے اپنے اندر پیدا کر کے ہم پرانی لکیروں کو آگے بڑھا کر انہیں نیا بنا سکتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے اپنے وقت میں اسلام، اس کے علوم اور اس کی روایات کو انسانیت کی بلند سطح اور اس کے ہمہ گیر تقاضوں کی نظر سے دیکھا اور اس لئے ان کے اسلامی فکر میں اتنی ہمہ گیریت اور عمومیت ہے۔ بدقسمتی سے بعد والوں کی آنکھوں سے یہ باقی نہ رہ

تبصرات

علمِ اصولِ فقہِ اسلام ISLAMIC JURISPRUDENCE

کمال اے فاروقی صاحب نے اس کتاب پر بڑی محنت کی! اور واقعی تحقیق کا حق ادا کیا ہے۔ اور پھر اسے چھاپا بڑے اہتمام اور سلیقے سے گیا ہے۔ کتاب کے آخر میں "گلاسری" اور بڑا مفصل انڈکس ہے۔ اور کاغذ طباعت اور جلد بڑی اچھی ہے۔

مصنف کے نزدیک اسلامی نظریہ حیات (آئیڈیالوجی) کو عملی شکل دینے کیلئے ضروری ہے کہ مسلمانوں کے معاشرے کی بنیاد اسلامی شریعت پر ہو۔ اور جہاں تک شریعت کا تعلق ہے، مصنف کا کہنا ہے کہ وہ قرآنِ مجید میں خالص شکل میں موجود ہے اور اس چودہ سو سال کے عرصہ میں اس میں کوئی ملاوٹ نہیں ہوئی۔ لیکن جب مسلمانوں نے اس شریعت کو سمجھنا چاہا، اور اسے اپنی زندگی کا لائحہ عمل بنانے کی کوشش کی۔ تو خاص حالات، اور خاص زمانے میں انہوں نے اس شریعت کی جس طرح تعبیر کی، اس کا نام فقہ ہے۔ گویا شریعت اللہ کی ہے جو اس نے قرآن کے ذریعہ نازل کی ہے۔ اور فقہ پیداوار ہے انسانی ذہن کی مصنف کے الفاظ میں "شریعت کا انسانی ذہن نے جو مفہوم لیا، وہ ان تمام صدیوں میں برابر بدلتا پھیلتا اور ترقی کرتا اور وسیع، گہرا اور بلند ہوتا رہا، اور اسی طرح اللہ کے احکام سمجھنے والوں کے ذہنوں میں قدرتی طور سے قرآن کی اہمیت بھی بدلتی رہی"

فاروقی صاحب نے زیرِ نظر کتاب میں ایک تو مسلمانوں نے شریعت کو جس طرح سمجھا اور اسکی روشنی میں فقہ مرتب کی اُس کی تاریخِ ارتقاء بیان کی ہے، اور دوسرے اِس زمانے میں اور مستقبل میں وہ جس طرح شریعت سے استفادہ کر سکتے اور اسے اپنی زندگی کا لائحہ عمل بنا سکتے ہیں، اس کے بارے میں اپنی تجاویز پیش کی ہیں۔

اس تمہید کے بعد مصنف نے فقہ کی مختصر تاریخ بیان کی ہے، اور جس طرح مذاہبِ اربعہ وجود میں آئے، اس کا جائزہ لیا ہے۔ یہ سب تفصیلات بتلاتے ہوئے وہ ایک جگہ لکھتے ہیں :- "آپ نے دیکھا کہ کس طرح اس دور میں شریعت کی متابعت براہِ راست اسلام کی اطاعت تھی۔ اور شریعت کی انسانی تعبیر فقہ سمجھی جاتی تھی۔ چنانچہ فقہ پر عمل کرنے سے گریز کے معنی اسلام سے نافرمانی کے ہوتے تھے" مصنف دنیائے اسلام

میں پھر اسی رجحان کا احیا چاہتے ہیں، اور ان کے نزدیک یہ صرف اسی طرح ممکن ہے کہ جہاں صدیوں پہلے ہمارے سلف کا کلاسیکی فکر فقہی رکا تھا وہیں سے ہم اپنے آج کے فکرِ فقہی کی ابتدا کریں! اسکے لئے بقول مصنف کے ضروری ہے کہ ہم اس عہد کے فکر فقہی کی تشکیل اور اس کے پیچھے جو فلسفہ تھا اسے سمجھنے کے لئے اس کا تنقیدی جائزہ لیں کتاب کے اگلے چند ابواب میں مصنف نے ان امور پر بحث کی ہے! اور اسلامی فقہ کو جن مراحل سے گزرنا پڑا اور آج وہ عملاً اجتہاد کا دروازہ بند کرکے جس جمود کا شکار ہے اس کا اجمالی ذکر کیا ہے۔ فاروقی صاحب کے خیال میں اگر مسلمان اس وقت اس فقہی جمود کو نہیں توڑتے تو اسکے دو نتیجے نکلیں گے۔ یا تو وہ اس جمود پر رہتے ہوئے بالکل ختم ہو جائیں گے، یا وہ دوسروں کی اندھی تقلید کرکے "سیکولرزم" کو اپنا کر جو ایک طرح کا شرک ہے، روحانی موت مر جائیں گے۔

ہم اپنی فقہ کا موجودہ جمود، جو جعت پرستی نیز اسلامی فقہ اور بالخصوص عام ذہنی ترقی کے راستے میں رکاوٹ بنا ہوا ہے کس طرح توڑ سکتے ہیں۔ فاروقی صاحب نے بڑی تفصیل سے اس پر بحث کی ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے انہوں نے فقہ کے جو اہم اصول ہیں ان کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ کسی حکم کے منزّہ عن الخطا (معصوم) ہونے کیا معنی ہیں، اس سے وہ اپنی اس بحث کا آغاز کرتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ بے شک قرآن مجید اللہ کے احکام ہیں، اور اسی لحاظ سے وہ منزہ عن الخطا ہیں۔ لیکن ہم جب زمان و مکان کی مخصوص حدود میں ان احکام کی تعبیر کرتے ہیں۔ تو وہ منزہ عن الخطا نہیں سمجھے جا سکتے۔ چنانچہ خود ان کے الفاظ میں "ان اسباب کی بنا پر ضروری ہے کہ منزّہ عن الخطا قرآن کو انسانی ذہن جو خطا سے یقیناً منزہ نہیں، بدلتے ہوئے زمان و مکان کے مطابق برابر سمجھتا رہے، اور دنیاوی مسائل سے عہدہ برآ ہونے کے لئے اس سے ہدایت حاصل کرتا رہے۔" اسی طرح سنت اور حدیث سے ہم جو احکام اخذ کرتے ہیں مصنف کے نزدیک وہ بھی منزّہ عن الخطا نہیں ہو سکتے، اور یہی صورت قیاس اور اجماع کے ذریعہ اخذ کردہ احکام کی ہے کہ ان کے بارے میں بھی قرآن میں مندرج احکام کی طرح منزہ عن الخطا ہونے کا حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ لیکن ایک زمانے میں قرآن، سنت، قیاس و اجماع سے جو حکم اخذ ہوتا ہے اور اس پر امت کا اجماع ہو جاتا ہے، مصنف کا کہنا ہے کہ عملاً وہ حکم اس دور میں منزہ عن الخطا سمجھا جاتا ہے۔ فقہ اسلامی کے ارتقاء میں قرآن و سنت کے ساتھ ساتھ قیاس کا جو اجتہاد کا نتیجہ ہوتا ہے بڑا ہاتھ رہا ہے اور اس طرح جو احکام اخذ ہوتے تھے، ان پر اجماع کی طرف سے بعد میں مہر قبولیت لگ جایا کرتی۔ اور مسلمانوں کے لئے اسلامی لائحہ عمل مرتب ہوتا تھا۔ فاروقی صاحب کے خیال میں اب اجماع کو خدا تعالیٰ کی طرح منزہ عن الخطا سمجھنا بھی شرک ہے، چنانچہ جس طرح پہلوؤں نے اجتہاد کرکے قرآن و سنت اور قیاس سے اپنے نئے احکام اخذ کئے اور ان پر اجماع ہوا، اسی طرح یہی سلسلہ فکر و عمل اب جاری ہونا چاہیئے یعنی اجتہاد کا دروازہ کھلے آج کے حالات اور ضرورتوں کے لئے قرآن سنت اور اب تک جو اجماع ہو چکے ہیں ان سے قیاس کے ذریعہ احکام اخذ کئے جائیں اور ان پر اجماع ہو۔ فاروقی صاحب کے نزدیک اس طرح فقہ کا موجودہ جمود ٹوٹ سکتا ہے۔ اور مسلمان اللہ کی شریعت کو اپنی انفرادی، اجتماعی، سیاسی اور معاشی زندگی کا روحانی منبع اور قانونی اساس بنا کر "قانونی مسلمان" کے بجائے صحیح معنوں میں حقیقی مسلمان بن سکتے ہیں۔ اس کے لئے مصنف خود قرآن مجید میں نئے سرے سے غور و فکر کرنے

(اجتہاد) کی دعوت دیتے ہیں تاکہ اس سے موجودہ زمانے کے مسائل کے لئے احکام اخذ کئے جائیں۔ اس اجتہاد کے کیا اسالیب ہوں، مصنف نے ان کی بھی نشان دہی کی ہے۔ اس ضمن میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ "قرآن اور اسی طرح یقیناً اسلام صرف ایک سمت معین کرنے والے رہنما اور ایک آرزو اور امنگ (ASPIRATION) کی حیثیت سے نہ کہ غیر مربوط جامد احوال و مقامات کے مجموعہ کے طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔ اور اسلامی معاشرے کا نصب العین "معروف" یعنی عمومی طور سے تسلیم شدہ نیکیوں کا حصول اور "منکر" یعنی جسے انسان جبلی طور سے بُرا سمجھتا ہے اس کو ترک کرنا ہے۔" قرآن مجید کی طرح وہ سنت، قیاس اور اجماع میں بھی ایسے ہی اجتہاد کرنے کی تلقین کرتے ہیں، اور ان سے نئے احکام اخذ کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ اسی سلسلہ میں "اجتہاد اور قیاس" کے باب میں ایک جگہ مصنف لکھتے ہیں:-

"مزید برآں "قیاس" کو اب تک صرف فروعی احکام کے معاملات میں بنیادی طور سے استعمال کیا جاتا ہے لیکن ضرورت ہے کہ اب فکرِ اسلامی کی تمام شاخوں میں اس کا استعمال ہو۔" اور اس استعمال کی ایک مثال وہ یہ دیتے ہیں کہ جس طرح قرآن میں بتوں کی پرستش کو شرک کہا گیا ہے، اسے سامنے رکھتے ہوئے اسی طرح موجودہ "نیشنلزم" کو شرک کی ایک شکل ثابت کیا جائے۔"

اس میں شک نہیں کہ جہاں تک اسلامی فقہ کے تاریخی ارتقاء اور اس کے تنقیدی جائزہ لینے کا تعلق ہے، مصنف نے اس میں بڑی غائر نظر اور اعتدال و توازن سے کام لیا ہے اور اس پر قدیم اور جدید دونوں طبقوں کی غالب اکثریت صاد کرے گی اور واقعہ یہ ہے کہ ان امور میں موصوف کا مطالعہ بڑا وسیع ہے اور ان کا اندازِ بحث بھی علمی و قانونی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان مباحث پر انگریزی یا دوسری یورپی زبانوں میں جو کچھ لکھا گیا ہے اور ظاہر ہے، وہ بہت کچھ لکھا گیا ہے، مصنف کی اُس پر نظر ہے اور انہوں نے اسے پیش نظر رکھتے ہوئے ایک عام قاری کے لئے فقہ اسلامی کے متعلق بڑا اچھا، مفید اور فکر انگیز مواد فراہم کر دیا ہے۔ جس سے علوم اسلامیہ کا ایک طالب علم بہت فائدہ اٹھا سکتا ہے اس لحاظ سے کمال اے فاروقی صاحب کی یہ کتاب بہت قابلِ تعریف ہے اور ان کی اس کوشش کی جتنی بھی تعریف کی جائے، وہ اسکے بجا طور سے مستحق ہیں۔

یہ تو فقہ اسلامی کا تاریخی و تنقیدی جائزہ ہوا لیکن اس زمانے میں یا اس کے بعد جو زمانہ آئے گا اس میں ہم کس طرح فقہ کو اسلامی معاشرے کی روحانی و قانونی اساس بنا سکتے ہیں، اس ضمن میں مصنف نے جو تجاویز بتائی ہیں، ان سے پتہ چلتا ہے پاکستان اور دوسرے مسلمان ملکوں کے مسلمان عوام و خواص کی مذہبی زندگی اور موجودہ مذہبی سرگرمیوں کے متعلق موصوف کا علم بہت محدود ہے۔ اور اس بارے میں جو کچھ انہوں نے لکھا ہے وہ نا قابلِ عمل ہی نہیں، بلکہ خیالی بھی ہے۔ بے شک اجتہاد کا دروازہ کھلنا چاہیئے - یہ بات آج ہر صاحب شعور مسلمان کہہ رہا ہے۔ اور قرآن، سنت اور قیاس سب میں اجتہاد ہو، اور ان سے آج کے مسائل کے متعلق اخذِ احکام کیا جائے اس سے بھی کسی کو انکار نہیں۔ مسلمانوں کا فکری و نقلی جمود اس وقت ہماری معنوی اور مادی ترقی کے لئے سب سے بڑا سنگ گراں ہے، اسے بھی تقریباً

سب مانتے ہیں، لیکن اجتہاد کس طرح ہو، اس کے کیا قواعد و ضوابط ہوں، اور اجتہاد سے اخذ کردہ احکام کے مقبول و نامقبول یا صحیح اور غیر صحیح ہونے کی کیا کسوٹی ہونی چاہیئے، ساری بحث اور تمام نزاع اس پر ہے۔

اس بارے میں علامہ اقبال کی رائے تھی کہ مسلمان ملکوں کی قانون ساز اسمبلیوں کو اجتہاد کا حق ہو، اور ان کے اتفاق رائے یا کثرت رائے کو اجماع کا درجہ دیا جائے اس طرح ایک مسلمان ملک میں جو قوانین بنیں گے وہ اس کے لئے اسلامی قانون کی حیثیت رکھیں گے بعد میں یہ ملکی اجماع بین الاسلامی اجماع کی صورت اختیار کر سکتے ہیں۔ فاروقی صاحب اس سے متفق نظر نہیں آتے۔ وہ اسکے بجائے مسجد کو اجماع کا ابتدائی "یونٹ" بنانے کے حق میں ہیں اور اس طرح مسجدوں یعنی مسجدوں میں نمازیوں کی تنظیم کر کے وہ اجماع کے اس اصول کو عملاً نافذ دیکھنا چاہتے ہیں اس میں شک نہیں کہ عہد نبوی اور خلافت راشدہ میں حضرت عثمان کے زمانے تک یہی ہوتا تھا، لیکن اسلامی سلطنت کی توسیع اور مسلمانوں میں ہر طرح کے اختلافات پیدا ہونے کے بعد یہ طریقہ کار جاری نہ رہ سکا نظری طور سے فاروقی صاحب کی یہ تجویز ممکن ہے زیادہ غیر مناسب نہ ہو، لیکن اگر آج وہ مسجدوں میں جائیں اور وہاں نماز ادا کرنے والے مسلمان بالعموم کن مسائل کے متعلق تردد کرتے ہیں۔ اور کن بحثوں میں وہ دلچسپی لیتے ہیں، ان کا موصوف کو کچھ اندازہ ہو، تو وہ نئی فقہ کی تشکیل کے سلسلے میں مسجد کے ان اجتماعات کو کبھی اجماع کا بنیادی "یونٹ" بنانے کا خیال دماغ میں نہ لاتے۔ اور اسمبلیوں پر انہیں ترجیح نہ دیتے۔

مختصراً اجتہاد کی ضرورت، اہمیت اور افادیت مسلّم، اور یہ بھی بجا کہ اجتہاد کے ذریعہ اخذ کردہ اسلامی احکام کی آخری اور واحد کسوٹی اجماع ہے، لیکن اجماع کس کا ہو، کس طرح ہو، اور اسے مسلمانوں سے منوانے کی کیا صورت ہو۔ سب سے زیادہ ضرورت اس امر کو واضح کرنے اور ایک لائحہ عمل کی شکل دینے کی ہے اور اسی پر مصنف نے زیادہ روشنی نہیں ڈالی اور "نیشنلزم" اور "سیکولرزم" کو "شرک" بنا کر خود "مومن" بننے پر اکتفا کر لیا ہے۔ مصنف کا یوں "مفتی" بننا کچھ عجیب معلوم ہوتا ہے۔

مصنف نے دوران بحث میں بار بار اس امر کو تسلیم کیا ہے کہ تاریخ فقہ میں احکام کے اسلامی اور غیر اسلامی ہونے کی خواہ وہ ایک محدود مدت ہی کے لئے صحیح سہی، سب سے بڑی کسوٹی اجماع رہا ہے۔ فرض کیا اگر اب فرداً فرداً اور اجتماعی طور سے مسلمان ملکوں کا اس سیاسی و آئینی تصور پر اجماع ہو جاتا ہے جسے مصنف "نیشنلزم" اور "سیکولرزم" کا نام دیتے ہیں، تو کیا اس صورت میں بھی یہ تصور "شرک" رہے گا، اور اس پر وہی حکم عائد ہوگا جو موصوف قبل از اسلام کی بت پرستی کی مثال دیکر عائد کرنا چاہتے ہیں۔ کیا یہ نظام سیاست اسی طرح "اسلامی" نہیں سمجھا جائے گا، جیسے گذشتہ تیرہ سو سال سے بادشاہت کو مسلمان سمجھتے آئے ہیں۔

فقہ اسلامی کی گزشتہ تاریخ بیان کرتے اور اس کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے مصنف نے جو علمی و تحقیقی انداز اختیار کیا افسوس ہے

وہ ہیں فقہ کے حال و مستقبل پر بحث کے دوران اس کتاب میں نظر نہیں آیا، اور یہی اس کتاب کی ایک خامی ہے۔ یہاں مصنف بالکل جذباتی ہو گئے ہیں، اور محض خیال آرائی پر اتر آئے ہیں اور چونکہ ان کی جذباتیت اور خیال آرائی کا حقائق اور اپنے گرد و پیش کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ اس لئے کتاب کا یہ حصہ "نعرہ بازی" سا نظر آتا ہے، جس میں ہم سے اکثر آج کل مبتلا ہیں۔

ہمارے ہاں شریعت اسلامی کا نفاذ ہو۔ اور ہم غیر مسلم اجنبی فرمانرداؤں کے بنائے ہوئے مروجہ قانونی ضابطوں کو بدلیں، اس کا مطالبہ ہر طرف سے ہو رہا ہے، لیکن اس کا کیا عملی طریقہ ہے؟ یہ سوال دراصل بحث طلب ہے، اور اس کا جواب محض جذباتیت سے نہیں دیا جا سکتا۔

مجموعہ رسائل

از حضرت مولانا شاہ رفیع الدین محدث دھلوی

تفسیر آیت النور

مدرسہ نصرت العلوم گوجرانوالہ نے شاہ رفیع الدین صاحب کی ان کتابوں کو شائع کیا ہے، مدرسہ مذکور کے استاد مولانا عبد الحمید سواتی صاحب نے ان کی تصحیح کی ہے، ان پر ضروری حاشیے لکھے ہیں اور ان کے شروع میں مصنف اور ان کے شہرۂ آفاق والد حضرت شاہ ولی اللہ محدث دھلوی کے حالات و افکار پر مختصراً تبصرہ کیا ہے۔

مدرسہ نصرت الاسلام کے منتظمین اور مولانا عبد الحمید سواتی کا یہ اقدام مستحق مبارکباد ہے کہ انہوں نے خدمت اسلام و مسلمین کے سلسلے میں خاص طور سے ولی اللّٰہی خانوادۂ علم کے خیالات و افکار کی اشاعت کا کام اپنے ذمے لیا۔ یہ کام بے حد مفید ہے، نہایت ہی اہم ہے۔ اور آج اس کی سخت ضرورت ہے کہ تعلیم یافتہ طبقوں میں ان خیالات و افکار کی زیادہ سے زیادہ اشاعت ہو، تاکہ اسلام کا وہ جامع تصور ان طبقوں کے سامنے آئے جو قرآن اور سنت اور سلف صالح کی روایات کے بھی مطابق ہے، آج کی عقلیت بھی اس سے مطمئن ہو سکتی ہے، اور وجدان و باطن کی پیاس بھی اس سے بجھائی جا سکتی ہے، مدرسہ نصرت العلوم نے شاہ رفیع الدین کی یہ دو کتابیں چھاپ دی ہیں اور ان کی دو کتابیں تکمیل الاذہان اور اسرار المحبت اس کی طرف سے چھپ رہی ہیں مدرسہ اس سلسلے کو اور آگے بڑھانا چاہتا ہے۔ اللّٰھُمَّ زِدْ فَزِدْ

"مجموعہ رسائل" میں حضرت شاہ رفیع الدین کے یہ دس مختصر رسالے ہیں:۔ اذان نماز، فوائد نماز، حملۃ العرش، شرح رباعیات بیدل، شرح چہل کاف، شرح برہان العاشقین یا حل معما، نذور بزرگان۔ جوابات سوالات اثنا عشر اور

اور تیسرے شاہ رفیع الدین۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت شاہ ولی اللہ کو چار فرزند دیئے۔ مولانا عبیداللہ سندھی کے الفاظ میں ان میں سے شاہ عبدالعزیز علوم منقول کی تعلیم دیتے رہے۔ کشفی مسائل میں شاہ عبدالقادر کو امتیاز حاصل تھا۔ اور عقلی مسائل پر شاہ رفیع الدین کی تحقیقات ہیں، چوتھے فرزند شاہ عبدالغنی تھے، جن کے فرزند شاہ محمد اسماعیل نے علوم عقلیہ و نقلیہ دونوں میں تحقیقات کیں۔ شاہ عبدالقادر کی طرح شاہ رفیع الدین نے بھی قرآن مجید کا اردو ترجمہ کیا تھا۔

"مجموعہ رسائل" میں مندرج رسالے عرصہ ہوا، کبھی چھپے تھے، ان میں ایک تو کافی غلطیاں تھیں اور دوسرے اب وہ نایاب بھی تھے۔ مولانا عبدالحمید سواتی نے بڑی محنت سے ان کی تصحیح کی ہے۔ اور جہاں تک ہو سکا ہے قابلِ وضاحت مقامات پر مبسوط حاشیے لکھے ہیں۔

"تفسیر آیت النور" میں شاہ رفیع الدین نے اللہ نور السموات والارض اور اس سے بعد کی آیات میں اللہ کے نور کی جو مثال دی گئی ہے، اس کی حکیمانہ شرح کی ہے۔ اس موضوع پر شاہ ولی اللہ نے بھی لکھا ہے شاہ رفیع الدین نے گویا اپنے نامور والد کے اس بیان کی مزید وضاحت کی ہے اس رسالے کو حاصل کرنے میں مولانا عبدالحمید سواتی نے کافی تگ و دو کی، اس کا ایک نسخہ مولانا سندھی کے تلمیذ مولانا محمد عبداللہ عمر پوری کے پاس بہاولپور میں تھا۔ وہاں سے انہوں نے اسے نقل کیا۔ مجلس علمی کراچی کے ناظم مولانا محمد طاسین کے پاس اس کا ایک اور قلمی نسخہ تھا۔ مولانا عبدالحمید نے اس نسخے سے اپنے منقولہ رسالے کا مقابلہ کیا۔ اور تصحیح کرنے کے بعد پھر اسے شائع کیا ہے۔ شروع میں انہوں نے پیش لفظ کا مفید اضافہ کیا ہے، اور اس بارے میں شاہ ولی اللہ نے جو کچھ لکھا تھا، اس کے اقتباسات بھی دیئے ہیں۔

مدرسہ نصرت الاسلام کے اس اقدام خیر کی جس قدر بھی تعریف کی جائے، کم ہے، یقیناً اس کے منتظمین اور ارکان اس پر عنداللہ ماجور ہوں گے، اور اللہ تعالیٰ ان کی اس خدمت کو قبول فرمائے گا۔ اس سلسلے میں چند ایک گزارشات پیش کی جاتی ہیں، جنہیں توقع ہے ارباب مدرسہ مبنی بر خلوص سمجھ کر خندہ پیشانی سے قبول فرمائیں گے۔

دونوں کتابوں پر جو مقدمے لکھے گئے ہیں، ان کا لہجہ بڑا صلح جویانہ اور وسیع مشربی کا ہے اور کوشش یہ کی گئی ہے کہ مسلمانوں کے فرقوں کے آپس کے اختلافات کم ہوں اس ضمن میں شاہ ولی اللہ اور شاہ رفیع الدین کے ذکر میں تقلید اور عدم تقلید کی بحث کو چھیڑنا کچھ بے محل سا محسوس ہوتا ہے۔ پھر ان بزرگوں کے افکار پر بحث کرتے ہوئے مدرسہ دیوبند کا تذکرہ بھی چنداں ضروری نظر نہیں آتا۔ شاہ رفیع الدین کے یہ رسالے خالص حکیمانہ ہیں۔ اور ان کے مندرجات اس قسم کی بحثوں سے بالاتر ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ

شاہ ولی اللہ دہلوی کے مکتب فکر کی حکمت کو اتنا ہی عمومی اور ہمہ گیر رکھا جائے جتنی کہ وہ فی الحقیقت ہے۔ تاکہ نہ صرف ہر مسلمان فرقہ، بلکہ تمام بنی نوع انسان کو ہر سعادت مند فرد اسے اپنا سکے بے شک اس سلسلے میں تقلید اور عدم تقلید اور دیوبندیت اور غیر دیوبندیت کے سوال بھی آئیں گے۔ لیکن ان کا مقام اور ہے اور ان پر دوسرے موقعوں پر بحث کی جا سکتی ہے۔

اسی ضمن میں ہم ایک بات یہ بھی عرض کریں گے کہ "تفسیر آیت النور" کے عربی متن کو نستعلیق رسم الخط میں چھاپنا پڑھنے والوں کے لئے دقت طلب رہتا ہے۔ کیا ہی اچھا ہو اگر ناشرین عربی متن کو نسخ ٹائپ میں چھاپنے کا انتظام کریں۔

"مجموعہ رسائل" کی قیمت دو روپے، اور "تفسیر آیت النور" کی ایک روپیہ پچاس پیسے ہے۔

ناشر ادارہ نشر و اشاعت، مدرسہ نصرۃ الاسلام، نزد گھنٹہ گھر، گوجرانوالہ مغربی پاکستان

معارف النفس (رموز تصوف)

از (لیفٹننٹ کرنل) خواجہ عبدالرشید

ناشر مجلس اخوان الصفا۔ کراچی۔ قیمت سات روپے

زیر نظر کتاب کے مصنف میڈیکل ڈاکٹر ہیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ جیسا کہ "تعارف" میں بتایا گیا ہے "......... وہ بہت پڑھتے ہیں اور اس سے بھی زیادہ لکھتے ہیں" اس کے علاوہ انہیں فنون لطیفہ سے بھی شغف ہے۔ علوم میں فلسفہ، نفسیات، تصوف، تاریخ، مذہب اور آثار قدیمہ ان کے زیر مطالعہ رہتے ہیں اور تفریحی مشاغل میں بھی ان کی دلچسپیوں کا دائرہ کافی وسیع ہے۔ اور جناب "تعارف" نگار کے الفاظ میں "ایٹم" کی ساخت سے "نظام شمسی" تک، "انسان" سے "حقیقت مطلق" تک، "خودی" سے "وحدت الوجود" تک، شعبدہ بازی سے "معجزے" تک، توہمات "سے سائنس کی جدید ترین تحقیقات" تک، فلسفہ سے "تصوف" تک اور "نفس شناسی" سے "تحلیل نفسی" تک ان کے دلچسپ اور رنگا رنگ موضوعات کا دائرہ پھیلتا جاتا ہے

اتفاق سے مصنف نے "معارف النفس" میں ان سب موضوعات پر بحث کی ہے اور ان سب کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان دقیق حقائق کو بیان کرتے ہوئے مصنف کہیں کہیں تو اتنے گہرے چلے جاتے ہیں کہ پڑھنے والا مجبور ہوتا ہے کہ ان کے لکھے ہوئے کو دوبارہ سہ بارہ پڑھے، اور اس پر غور کرے، لیکن اس کے فوراً ہی بعد ان کا انداز تحریر اتنا سطحی ہو جاتا ہے کہ اسے پڑھ کر ان کے پہلے لکھے ہوئے کا تمام اثر زائل ہو جاتا ہے اور قاری کی نظر میں مجموعی طور سے کتاب کی اہمیت کم ہو جاتی ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے جیسا کہ "تعارف" بتایا گیا ہے کہ لکھنے میں بھی مصنف کا وہی گفتگو کا انداز ہے، جس میں تکرار ہے، پھیلاؤ ہے اور تیز رفتاری ہے، اور پھر وہ قلم برداشتہ بے تکان لکھے چلے جاتے ہیں اور ہمیشہ

یہ شکایت کرتے ہیں کہ مجھے اپنے لکھے ہوئے کو دوبارہ دیکھنے کی فرصت نہیں ملتی۔

"معارف نفس" جیسے موضوع پر لکھنا اور یوں رواروی میں لکھتے جانا اور اس سے کتاب مرتب کر دینا مصنف کی بڑی زیادتی ہے۔ اس طرح نہ وہ نفس موضوع کا حق ادا کر پاتے ہیں نہ وہ اپنے ساتھ انصاف کرتے ہیں اور کتاب پڑھنے والوں پر تو ان کی یہ کھلی زیادتی ہے ہی۔ تصوف انسان کی باطنی زندگی سے بحث کرتا ہے اور اس میں تو پہلے ہی الجھاؤ ہی الجھاؤ ہیں اور اگر بحث کرنے والا اس پر یوں سرسری طور سے بحث کرے گا، تو پھر تو یہ الجھاؤ یقیناً اور بھی بڑھیں گے۔ ایک صاحب قلم جو اتنے علوم پڑھا ہے اور سائنٹفک تربیت پا چکا ہے اس سے ہم "معارف نفس" کے موضوع پر اس سے بہتر کتاب کی توقع رکھتے ہیں۔

مصنف نے ایک جگہ فارسی کے مشہور عارف شاعر مرزا بیدل کا ایک قول نقل کیا ہے، جس میں موصوف فرماتے ہیں کہ ریاضتیں وغیرہ کرنے سے بعض دفعہ آدمی کو ایسی شکلیں نظر آتی ہیں، جن کا حقائق سے تعلق نہیں ہوتا بلکہ وہ نتیجہ ہوتی ہیں اس آدمی کے اپنے مخصوص نفسی حالات کا۔ باطنی امور میں انہماک رکھنے والوں کے لئے مرزا بیدل کا یہ قول بہت بڑا انتباہ ہے۔ اور جیسا کہ شاہ ولی اللہ کا مسلک تھا۔ اس معاملے میں "عقل معاشی" کا بھی ساتھ رہنا ضروری ہے۔ دل کے ساتھ پاسبان عقل کا ہونا اچھا ہوتا ہے، اسے ہمیشہ تنہا چھوڑ دینا آدمی کو کہیں کا نہیں رہنے دیتا۔

کتاب کے شروع میں کتاب اور صاحب کتاب" کے متعلق جناب حفیظ ہوشیار پوری کا "تعارف" ہے اس میں صاحب کتاب کے تعارف کے ساتھ ساتھ نہایت اختصار سے تصوف کا بھی تعارف کرایا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تعارف نگار صاحب کی اس موضوع پر بڑی گہری نظر ہے، ہم توقع کرتے ہیں کہ حفیظ صاحب اس موضوع پر کوئی مستقل کتاب لکھیں۔ (م۔ س)

بقیہ افکار و آراء

شاہ صاحب کی یہ حیثیت اوجھل ہو گئی، اب ضرورت ہے کہ ہم سب سے زیادہ زور شاہ ولی اللہ صاحب کی اس حیثیت کو دیں، کیونکہ آج ہم اس کے سب سے زیادہ محتاج ہیں۔ شاہ ولی اللہ کی حکمت، ان کے افکار اور ان کے علوم کی اس ہمہ گیریت اور عمومیت کو آگے لایئے، اور علمی و فکری لحاظ سے آج دنیا جہاں پہنچ چکی ہے، اس کے پس منظر میں ان کا جائزہ لیجئے اور اس کا حاصل مقصود قوم کے سامنے پیش کیجئے۔ یہ ہے اس زمانے میں کرنے کا کام۔ کیا شاہ ولی اللہ اکیڈمی یہ کرے گی؟

چودھری سردار خان ایڈووکیٹ، لاہور

مطبوعات شاہ ولی اللہ اکیڈمی

★

لمحات (عربی)

شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے فلسفہ تصوف کی یہ بنیادی کتاب عرصے سے نایاب تھی - مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی کو اُس کا ایک پرانا نسخہ ، جو اغلاط سے پُر تھا ، ملا - موصوف نے بڑی محنت سے اس کی تصحیح کی ، اور شاہ صاحب کی دوسری کتابوں کی عبارات سے اُس کا مقابلہ کیا - اور وضاحت طلب اُمور پر تشریحی حواشی لکھے - کتاب کے شروع میں مولانا کا ایک مبسوط مقدمہ ہے -

شاہ صاحب نے اس کتاب میں "وجود" اور اُس سے کائنات کا جس طرح صدور ہوا ہے ، اُس پر بحث کی ہے ، اور اپنی الہیاتی حکمت کے دوسرے مسائل بھی بیان کئے ہیں - قیمت دو روپے

—— : o : ——

شاہ ولی اللہ کی تعلیم

از پروفیسر غلام حسین جلبانی سندھ یونیورسٹی

پروفیسر جلبانی ایم اے صدر شعبہ عربی سندھ یونیورسٹی کے برسوں کے مطالعہ و تحقیق کا حاصل یہ کتاب ہے ، اس میں مصنف نے حضرت شاہ ولی اللہ کی پوری تعلیم کا احصاء کیا ہے ، اور اُس کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل بحثیں کی ہیں - اُردو میں شاہ صاحب کی تعلیم پر یہ پہلی جامع کتاب ہے -

کتاب مجلد ہے - قیمت ۷٫۵۰ روپے ہے

شاہ ولی اللہ اکیڈمی - صدر - حیدر آباد - پاکستان

شاہ ولی اللہ اکیڈمی

اغراض و مقاصد

۱۔ شاہ ولی اللہ کی تصنیفات اُن کی اصلی زبانوں میں اور اُن کے تراجم مختلف زبانوں میں شائع کرنا۔

۲۔ شاہ ولی اللہ کی تعلیمات اور ان کے فلسفہ و حکمت کے مختلف پہلوؤں پر عام فہم کتابیں لکھوانا اور اُن کی طباعت و اشاعت کا انتظام کرنا۔

۳۔ اسلامی علوم اور بالخصوص وہ اسلامی علوم جن کا شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتب فکر سے تعلق ہے، اُن پر جو کتابیں دستیاب ہو سکتی ہیں اُنہیں جمع کرنا، تاکہ شاہ صاحب اور اُن کی فکری و اجتماعی تحریک پر کام کرنے کے لئے اکیڈمی ایک علمی مرکز بن سکے۔

۴۔ تحریک ولی اللہی سے منسلک مشہور اصحاب علم کی تصنیفات شائع کرنا، اور اُن پر دوسرے اہلِ قلم سے کتابیں لکھوانا اور اُن کی اشاعت کا انتظام کرنا۔

۵۔ شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتب فکر کی تصنیفات پر تحقیقی کام کرنے کے لئے علمی مرکز قائم کرنا۔

۶۔ حکمت ولی اللہی اور اُس کے اصول و مقاصد کی نشر و اشاعت کے لئے مختلف زبانوں میں رسائل کا اجراء

۷۔ شاہ ولی اللہ کے فلسفہ و حکمت کی نشر و اشاعت اور اُن کے سامنے جو مقاصد تھے۔ اُنہیں فروغ دینے کی غرض سے ایسے موضوعات پر جن سے شاہ ولی اللہ کا خصوصی تعلق ہے، دوسرے مُصنّفوں کی کتابیں شائع کرنا

محمد سرور پرنٹر پبلشر نے سعید آرٹ پریس حیدرآباد سے چھپوا کر شایع کیا۔

شاہ ولی اللہ اکیڈمی کا علمی مجلہ
الرحیم
ماہنامہ
شعبہ نشر و اشاعت شاہ ولی اللہ اکیڈمی ○ صدر حیدرآباد

مجلسِ ادارت:

ڈاکٹر عبدالواحد ہالے پوتا،
مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی،
مخدوم امیر احمد،

مُدیر:

محمد سرور،

قیمت سالانہ : آٹھ روپے   قیمت فی پرچہ پچھتر پیسے

الرحیم

جلد ۱ ماہ صفر سنہ ۱۳۸۳ھ مطابق ماہ جولائی سنہ ۱۹۶۳ء نمبر ۲

فہرستِ مضامین

مکتبہ

عبدالمجید یوسف زئی

آزادی کے بعد مسلمانان پاکستان کی مذہبی سرگرمیاں بہت بڑھ گئی ہیں۔ اور اس کا اظہار اُن کی انفرادی و اجتماعی زندگی میں برابر ہوتا رہتا ہے۔ چنانچہ گزشتہ سالوں میں پاکستان کے ہر حصے میں کافی تعداد میں بڑی بڑی عالی شان اور خوبصورت مساجد تعمیر ہوئی ہیں۔ اعلیٰ پیمانے پر متعدد عربی و دینی مدارس قائم کیے گئے ہیں۔ مذہبی جماعتوں کا اثر و رسوخ روز افزوں ہے۔ اور ان کے ماننے والے کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے، اسی حساب سے ان جماعتوں کی مالی حالت بھی بہتر ہو گئی ہے اور ان میں سے اکثر بڑے بڑے دار العلوم بنا رہی ہیں۔ جمعے کے دن مساجد میں نمازیوں کی اتنی کثرت ہوتی ہے کہ مساجد کے باہر دور دور تک جگہیں بھر جاتی ہیں۔ علمائے کرام کی طرف لوگوں کا عام رجوع ہے، اور ان کے جلسوں میں وہ بڑی کثرت سے جاتے ہیں۔ مذہبی کتابیں خوب چھپتی ہیں، اور ان کی مانگ برابر بڑھ رہی ہے۔ الغرض ملک میں صنعتوں کے فروغ اور اس کے نتیجے میں شہروں کی زندگی میں تمام غیر مستحسن تبدیلیوں کے باوجود عام مسلمانوں کا شغف مذہب سے کم نہیں ہوا اور نہ کسی حلقے سے مذہبی سرگرمیوں کے لئے سرمائے کی کمی کی شکایت سننے میں آتی ہے۔ ملک کے صنعت کار، تاجر اور دوسرے آسودہ حال طبقے بالعموم مذہب میں عملی دلچسپی لیتے ہیں۔ اور مذہبی سرگرمیوں کے لئے حتی الوسع مالی امداد دینے میں تامل نہیں کرتے۔

مسلمانان پاکستان کی مذہبی سرگرمیوں کا ایک رُخ ہے۔ اس کا دوسرا رُخ یہ ہے کہ وہ سکول، کالج اور یونیورسٹیاں جنہیں عام طور سے سرکاری کہا جاتا ہے، اور جن کی اب تک یہ خصوصیت تھی کہ ان کی چار دیواری کے اندر کسی مذہب کی تعلیم نہیں ہو سکتی تھی، ان کے نصاب میں مذہب اسلام اور اسلامیات ایک مستقل مضمون کی شکل میں داخل کر دیئے گئے ہیں۔ اور ان کی باقاعدہ تعلیم ہو رہی ہے۔ اب جب ان تعلیم گاہوں کے طالب علم شروع سے لے کر آخر تک ادب، ریاضی، سائنس اور معاشی و عمرانی علوم کے ساتھ ساتھ مذہب اسلام اور اسلامیات کی تعلیم حاصل کریں گے، تو ان کی زندگیوں اور پاکستان کی پوری قومی زندگی میں اس کے کتنے دُور رس اثرات ہوں گے۔ اور اس سے یہاں کے مسلمان عوام کی ذہنی و عملی دنیا میں کیا نتائج مرتب ہوں گے، اس کا ابھی سے صحیح اندازہ کرنا مشکل ہے بہرحال یہ واقعہ ہے کہ حکومت پاکستان اور اس کے محکمہ تعلیمات کا یہ اقدام ذہنی و علمی لحاظ سے ایک نئے دور کا دروازہ کھولنے کا باعث ہوگا۔ اور اس سے پاکستان کی مذہبی اور اس کے علاوہ عام زندگی میں بھی ایک بہت بڑی تبدیلی آئے گی۔

یہ اثرات اور نتائج تو اپنی واضح اور مثبت شکل میں کہیں دس پندرہ سال کے بعد سامنے آئیں گے۔ لیکن سرکاری تعلیم گاہوں میں اسلامیات کے مضمون کو نصاب تعلیم میں داخل کرنے کا فی الحال ایک نتیجہ یہ نکلا ہے کہ سکولوں اور کالجوں میں اس مضمون کو پڑھانے کے لئے اساتذہ کی ایک بڑی کافی تعداد کی ضرورت پیدا ہو گئی ہے، چنانچہ یونیورسٹیوں کے گریجوایٹ جوق در جوق اسلامیات اور اس سے متعلق مضامین میں ایم اے کرنے لگ گئے ہیں۔ اس کا جہاں ایک فائدہ یہ ہوا ہے کہ جدید علوم کے فارغ التحصیل اسلامی علوم پڑھنے لگے ہیں، وہاں اس سے یہ فائدہ بھی ہوا ہے کہ اسلامیات اور اس سے متعلق مضامین کے بارے میں سرکاری تعلیم گاہوں میں حقارت اور پستی کا جو احساس پایا جاتا تھا، وہ کم و بیش دُور ہو گیا ہے۔ اور ان مضامین کو بھی اسی قدر و منزلت کی نظر سے دیکھا جانے لگا ہے، جیسے دوسرے مضامین کو دیکھا جاتا تھا۔ نیز یونیورسٹی کے مرحلے میں ان مضامین

کا دائرہ تعلیم کافی وسیع کر دیا گیا ہے، اس سلسلے میں اسلام کے ساتھ ساتھ دوسرے مذاہب کا مطالعہ بھی نصاب میں داخل ہے۔ اور مذہب اسلام کے ساتھ ساتھ اسلامی تہذیب و ثقافت بھی شامل درس ہے

عہد حاضر میں ہم مسلمانوں کی علمی و فکری زندگی میں سب سے بڑا خلا یہ تھا کہ وہ لوگ جو جدید علوم پر عبور رکھتے تھے، وہ بالعموم اسلامی علوم سے نابلد ہوتے تھے۔ اور جن لوگوں کو اسلامی علوم میں درک ہوتا تھا، وہ جدید علوم سے بے بہرہ رہتے تھے، اور اس طرح تعلیم یافتہ مسلمان دو گروہوں میں بٹ گئے تھے اور ان میں ایک دوسرے سے مغائرت بلکہ منافرت تک پائی جاتی تھی، جس کا ہماری قومی زندگی پر بہت برا اثر پڑ رہا تھا۔ سرکاری تعلیم گاہوں میں اسلامیات کے بحیثیت ایک مضمون کے داخل ہونے سے اس خلا کا پُر ہونا ممکن ہو گیا ہے۔ اب ہماری یونیورسٹیوں سے ایسے اصحاب فارغ التحصیل ہونے لگے ہیں، جنہوں نے اسلامیات اور اس سے متعلق مضامین میں ایم اے کیا ہو۔ چونکہ ان مضامین کو پڑھانے والے اساتذہ کی ضرورت سرکاری تعلیم گاہوں میں روز بروز زیادہ ہوتی جائے گی۔ اس لئے یونیورسٹیوں سے ایسے فارغ التحصیل ہونیوالے اصحاب کی تعداد میں بھی بتدریج اضافہ ہوگا۔ اور زیادہ سے زیادہ لوگ ان مضامین کی طرف توجہ کریں گے۔

خوشی کی بات یہ ہے کہ اس خلاء کو صرف ایک طرف سے ہی پُر کرنے کی کوششیں نہیں ہو رہیں۔ اب عربی و دینی مدارس کے بھی بہت سے ایسے فارغ التحصیل ملتے ہیں، جنہوں نے ان مدارس میں درس نظامی کی تکمیل کے بعد انگریزی پڑھی، اس کے امتحان دیئے۔ اب ان میں سے کئی بی اے اور ایم اے ہیں۔ اور سرکاری درس گاہوں میں اسلامیات کی تعلیم دے رہے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ خوش آیند بات یہ ہے کہ وہ عربی و دینی مدارس جو زیادہ تر عام چندوں سے چلتے ہیں اور ان کے مہتمم و کارپرداز اکثر علماء ہیں، ان کی یہ کوشش ہے کہ وہ عربی و دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ جدید علوم کی تعلیم کا بھی انتظام کریں اور ان کے ہاں سے صرف دینی علوم جاننے والے علماء ہی نہ نکلیں، بلکہ میٹریکولیٹ اور گریجویٹ بھی فارغ التحصیل ہوں۔ چنانچہ عربی و دینی مدارس کے یہ مہتمم علمائے کرام ان مدارس کے ساتھ ساتھ ہائی اسکول اور

کالج بھی قائم کر رہے ہیں۔ اور ایک ہی "تعلیمی بستی" یا "بلدۃ العلم" میں عربی و دینی تعلیم بھی دی جا رہی ہے۔ اور نئی تعلیم بھی۔ اور اس کے منصرم و مہتمم علماء کرام ہیں۔ یہ رجحان اب برابر بڑھ رہا ہے اور علماء میں جدید تعلیم کی ضرورت اور اہمیت کا احساس بہت زیادہ ہو گیا ہے اور کئی جگہوں میں عربی و دینی مدارس کے پہلو بہ پہلو ہائی سکول اور کالج کھل رہے ہیں۔

یہ کتنا بڑا انقلاب ہے، اس کا اندازہ صرف وہی لوگ لگا سکتے ہیں، جنہیں معلوم ہے کہ ایک زمانے میں عربی و دینی مدارس میں نئی تعلیم کے بارے میں کیا جذبات ہوتے تھے، اور علماء نئی تعلیم پائے ہوؤں کو کس نظر سے دیکھتے تھے۔ اب ان سالوں میں قدیم و جدید کا بُعد جس طرح آہستہ آہستہ ختم ہو رہا ہے۔ اور عربی و دینی تعلیم اور نئی تعلیم جیسے بتدریج ایک دوسرے کے قریب آ رہی ہیں، وہ ہمارے مستقبل کے لئے ایک بڑی اچھی فال ہے، اور اس سے یقیناً قومی زندگی کی فلاح و بہبود کے لئے بڑی توقعات ہو سکتی ہیں

یہ تو ہماری وہ مذہبی سرگرمیاں ہوئیں، جنہیں ہر شخص خواہ وہ کسی عقیدے اور خیال کا ہو مستحسن کہے گا۔ اور ان کا دل سے خیر مقدم کرے گا، لیکن بدقسمتی سے ان کے ساتھ ساتھ ان سالوں میں پاکستان میں ایسی سرگرمیاں بھی زور پکڑ گئی ہیں۔ جنہیں مذہبی کہا جاتا ہے۔ حالانکہ وہ حقیقت میں مذہبی نہیں ہیں۔ اور وہ سرگرمیاں ہر اعتبار سے غیر مستحسن ہیں ان سے اسلام کے مقدس نام پر بھی حرف آتا ہے۔ پاکستان کو بھی ضعف پہنچتا ہے۔ اور ہم مسلمانوں کی جگ ہنسائی بھی ہوتی ہے، پھر یہ فرقہ وارانہ سرگرمیاں خود ان فرقوں کے لئے بھی نقصان دہ ہیں۔ جن کے بعض افراد ان کا ارتکاب کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کی وجہ سے ملک کے سمجھ دار طبقے ان سے بدظن ہو رہے ہیں۔ اس ضمن میں ہمارے سامنے اس وقت سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ آزادی کے بعد اس ملک میں مذہب اسلام کی تجدید اور نشاۃ ثانیہ کی جو زبردست لہر اٹھتی ہے اور جس کا اظہار جیسے کہ اوپر ذکر ہوا مختلف صورتوں میں ہو رہا ہے اسے کس طرح فرقہ وارانہ کشمکش کے غیر مستحسن عناصر سے پاک رکھا جائے۔ تاکہ اسلام اس ملک کی قوت و استحکام کی اساس اور اس ملک میں بسنے والے

عوام کی اخلاقی و روحانی زندگی کا سہارا بن سکے واقعہ یہ ہے کہ اس مملکت کا وجود مسلمانان پاک و ہند کے شعور اسلامی کا رہینِ منت ہے اور اس کی سالمیت و وحدت کا تمام تر انحصار اس کے عوام میں اسی شعور کے نشوونما و بقا پر ہے۔ اب اگر یہی شعور خدانخواستہ مسلمانوں میں تفرقہ و منافرت کا باعث بنتا ہے، اور اس کے عملی مظاہر فرقہ وارانہ فسادات کی شکل اختیار کرتے ہیں، تو پھر اس ملک کا اور ہم مسلمانوں کا خدا ہی حافظ ہے۔

اِسلام ایک مخصوص فرقے کا مذہب نہ ہو کہ وہ اس فرقے تک ہی محدود ہو کر رہ جائے۔ وہ کُل مسلمانوں کا مشترکہ مذہب ہو۔ بلکہ دین اسلام میں جو عمومیت اور عالمگیریت ہے، اور جو اُسے صحیح معنوں میں دینِ انسانیت کا مصداق بناتی ہے۔ اس کا بھی اثبات ہو، نظری اعتبار سے بھی اور عملاً بھی، آج اس کی ضرورت ہے اور بڑی اشد ضرورت ہے۔ بے شک یہ تین مراحل اپنی اپنی جگہ ایک حقیقت ہیں۔ اور ان میں سے کسی ایک کا اقرار باقی دو کے انکار کا مستلزم نہیں ہونا چاہیئے۔ ہمارا اگر ایک مذہبی فرقے یا فقہی مذہب سے تعلق ہے، تو اس میں کوئی حرج نہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہم اپنے آپ کو امت اسلامیہ کا ایک حصہ بھی سمجھیں۔ اور پھر ہمارے سامنے یہ حقیقت بھی رہے کہ ہم بنی نوع انسان کا ایک گروہ ہیں۔ یہ تینوں چیزیں ایک دوسرے کی ضد نہ ہوں۔ اور ہم ان کو اپنے اسلامی شعور کے اندر سمو ئیں۔

اسلامی تاریخ کے اس ساڑھے تیرہ سو سال کے عرصے میں مسلمانوں میں مختلف مذہبی فرقوں اور فقہی مذاہب کا پیدا ہو جانا کوئی ایسی اَن ہونی بات نہیں۔ جس پر بہت زیادہ ماتم کیا جائے، ہر مذہب، ہر فلسفے اور ہر نظریے کو انسانوں نے وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ ایک سے کئی شعبوں اور شاخوں میں تقسیم کر دیا ہے، یہ تاریخ کا ایک فطری عمل ہے اور وحدت اسی طرح کثرت میں منقسم ہوتی رہتی ہے۔ اسلام کو بھی قدرتاً ان مراحل سے گزرنا پڑا۔ اور اس کی تاریخ کے مختلف ادوار میں متعدد مذہبی فرقے اور فقہی مذاہب وجود میں آئے جن میں آپس میں

کافی آویزش بھی رہی اور اس کی وجہ سے خود انہیں اور بحیثیت مجموعی تمام مسلمانوں کو ناقابل نقصان پہنچا یہ ملّی تاریخ کا ایک رنجدہ باب ہے اور اس پر جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہے۔

ان مذہبی فرقوں اور فقہی مذاہب کا وجود اب ایک حقیقت ہے، اور ان کے بروئے کار آنے کے اپنے تاریخی اسباب تھے۔ اور جیسا کہ حجۃ اللہ البالغہ میں شاہ ولی اللہ نے لکھا ہے۔۔۔۔ "عالم میں وہی چیز موجود ہوتی ہے اور وہی چیز وجود میں آتی ہے جو وجود میں آنے کے زیادہ مستحق ہوتی ہے" اس ضمن میں ایک تو یہ بات ہمارے سامنے رہنی چاہیئے، اور دوسری یہ کہ ہماری پوری تاریخ اس کی شاہد ہے کہ کسی فرقے یا فقہی مذہب کو تشدد سے مٹایا نہیں جا سکا۔ اور تمام سختیوں کے باوجود وہ کسی نہ کسی شکل میں موجود رہا بلکہ تشدد کا اثر الٹا نکلا۔ لا اکراہ فی الدین کی اسی لئے تلقین کی گئی ہے اور آج CO-EXISTENCE - پُرامن بقائے باہمی پر اسی ضرورت کے ماتحت اس قدر زور دیا جا رہا ہے۔ اس معاملے میں اصل چیز کسی مذہبی فرقے یا فقہی مذہب کے وجود کا سرے سے انکار نہیں بلکہ اس کی صحیح حیثیت کا تعین کرنا ہے۔ یعنی ایک مسلمان کا کسی فرقے سے تعلق رکھنا بعد میں آتا ہے۔ پہلے وہ مسلمان ہے اور ایسا مسلمان جو اسلام کی عمومیت اور عالمگیریت کو سب سے مقدم سمجھتا ہے آج اس فرق مراتب کی ضرورت ہے اور اسی کی اساس پر اس دور میں اسلام کی صحت مند تجدید اور نشاۃ ثانیہ ہو سکتی ہے۔

یہ اکیڈمی جس بزرگ کے نام نامی سے منسوب ہے، ہمارے نزدیک اس دور آخر میں اسی فکر کے حامل اور اسی دعوت کے علم بردار تھے۔ وہ اپنی تعلیمات میں سب سے زیادہ اہمیت ہمہ گیر انسانیت کے عمومی اصول و مبادی کو دیتے ہیں اور پھر ان پر اسلام کے نظام کی تطبیق کرتے ہیں۔ وہ مسلمانوں کے مذہبی فرقوں اور فقہی مذاہب کے وجود کا انکار نہیں کرتے بلکہ جس ماحول اور تاریخی پس منظر میں ان کا وجود ناگزیر ہوا۔ اس پر وہ روشنی ڈالتے ہیں انہیں

اس نقطہ نظر سے سمجھنے کی دعوت دیتے ہیں۔ اور ساتھ ساتھ یہ بھی بتاتے جاتے ہیں کہ اصل چیز اسلام کے عمومی اصول ہیں، جن کی بنیاد پوری انسانیت کے مصالح عامہ ہیں۔ اور یہ فرقے اور فقہی مذاہب مختلف احوال و ادوار میں ان کی عملی تعبیریں ہیں۔ اب ایک طرف ان عمومی اصولوں کی عالمگیریت اور ہمہ گیریت ہے، اور دوسری طرف مختلف احوال و ادوار میں ان کی گئی عملی تعبیروں کی محدودیت ہے ہمیں ان دونوں کو پیش نظر رکھنا چاہیئے اور دونوں میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے

شاہ ولی اللہ صاحب نے اگرچہ ایک جگہ ارباب تصوف کے متعلق لکھا ہے لیکن وہی بات ان مذہبی فرقوں اور فقہی مذاہب پر بھی صادق ہوتی ہے۔ اور وہ یہ کہ "اُن بزرگوں کے ہر طبقے کے اقوال اور احوال کو ان کے زمانے کے ذوق کے مطابق جانچنا چاہیئے" آج ہم اسے تاریخی تجزیہ کہتے ہیں۔ ضرورت اِس وقت اس انداز فکر کو پیدا کرنے کی ہے، جس کی شاہ صاحب نے اپنے دور میں نشان دہی کی تھی۔ اس انداز فکر کو اب اور آگے بڑھانا چاہیئے اور اسے اِس زمانے کے معیاروں کے مطابق جو کہ آج پوری انسانیت کے مصالح عمومی کے متقاضی ہیں، بنانا چاہیئے۔

مسلمان فرقوں میں باہم محبت و مودّت اور اِس ملک میں اسلام کے مستقبل کا تمام تر دارو مدار ہمارے نزدیک اسی پر ہے۔

"الرحیم" کے پہلے شمارے کو ملاحظہ فرمانے کے بعد متعدد کرم فرماؤں نے رسالے کے متعلق اپنے تاثرات بھیجے ہیں اس سلسلے میں ہم ان حضرات کی خدمت میں یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ "الرحیم" کا مقصد فکر ولی اللہی کو ایک نامی فکر کی حیثیت سے پیش کرنا ہے۔ اور ہر عظیم فکر کی طرح اس فکر میں بھی لازمانی اور ہمہ گیر حصے کے ساتھ ساتھ ایک زمانی و زمینی حصہ بھی ہے، ایک زندہ و نمو پذیر فکر زمانے کے ساتھ ساتھ تجدید و ارتقاء کی منازل طے کرتا ہے۔ "الرحیم" میں شاہ صاحب کی تعلیمات کو اس طرح پیش کرنے کی انشاء اللہ پوری کوشش ہو گی۔

ہمیں رجسٹرڈ نمبر مل گیا ہے۔ اگست سے پرچہ ہر ماہ کی سات تاریخ کو پوسٹ ہو جایا کرے گا

علوم عقلیہ اور خانوادۂ ولی اللّٰہی

مولانا محمد عبد اللہ عمرپوری[1]

علوم عالیہ کو تین شعبوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ منقولات، معقولات اور مکشوفات۔ منقولات میں وہ علوم شمار ہوتے ہیں، جو کہ نقل و روایت سے ہم تک پہنچتے ہیں۔ ان میں علوم شرائع و ادیان اور علوم تاریخ و آثار شامل ہیں۔ معقولات وہ علوم ہیں، جن کے تعلق عقل و ذہن سے ہے۔ اور علوم مکشوفات کا تعلق وجدانی کیفیات سے ہے، جو بدنی ریاضیاتِ شاقہ اور روحانیت میں حصولِ کمال کے بعد وارد ہوتی ہیں۔ ان تمام شعبہ ہائے علوم میں وافی درک رکھنے والوں کو کاملین اور محققین کہا جاتا ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے ان مدعیان علم کو جو علوم منقولہ میں صحیح مقاصدِ علمی اور اغراضِ دینی سے دُور رہتے ہیں، "وراقین" کہا ہے (الانتباہ غیر مطبوعہ) یعنی اوراق اور الفاظ کے چکر میں گرفتار۔ فارسی کے مشہور شاعر عرفی کا یہ مصرعہ انہیں پر صادق آتا ہے۔

ع۔ فقیہاں دفتکے را می پرستند

اسی طرح علوم عقلیہ کے وہ مدعیان کمال جو خود کو ہمہ داں سمجھتے ہیں، اور علوم کشف و نقل سے انہیں انکار ہے، شاہ صاحب ان کو "گھر دزدانِ حکمت" کا خطاب دیتے ہیں، "تفہیمات الٰہیہ" میں شاہ صاحب کی ایک طویل نظم ہے، جس کا مطلع ہے۔

علی من می شناسم ایں گہر دزدانِ حکمت را فلاطوں آہ گرمی دید یونانے کہ من دارم

---

[1] خطیب جامع مسجد بیکانیری دروازہ بہاولپور و سابق استاد حدیث جامعہ عباسیہ بہاولپور

شاہ ولی اللہ کسی بڑے سے بڑے فلسفی اور حکیم کا یہ حق تسلیم نہیں کرتے کہ وہ علوم عقلیہ میں بزعمِ خویش اپنی مہارت وکمال کی بنا پر دین حق میں "حکَم" بنے، جو کہ جامع ہے تینوں علوم عالیہ کا۔ چنانچہ وہ اپنی کتاب "انسان العین" میں اپنے عارف استاذ الاستاذ حضرت شیخ ابراہیم کردی مدنی کا یہ قول نقل کرتے ہیں۔

هولاء الفلاسفة قاربوا على الحقِ عثورًا وَلَمْ يَهْتدوا — یہ فلسفی لوگ تحقیق حق کی دھن میں کوشش کرتے ہوئے حق کے قریب تو پہنچ گئے، لیکن وہ اس تک ہدایت نہ پا سکے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ہدایت صرف نبوت حقہ کی رہبری میں ملتی ہے، جسے قرآن مجید نے "نُور" سے تعبیر فرمایا ہے، ارشاد ہوتا ہے۔" اللہ مددگار ہے ایمان والوں کا، نکالتا ہے ان کو اندھیروں سے روشنی کی طرف (پ ۳ ع ۲)

مدعیان علوم عقلیہ کے حق کے ادراک میں ناکام وخاسر رہنے کا ذکر مولانا روم نے اپنی مثنوی میں باربار کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

پائے استدلالیاں چوبیں بود
پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود

آپ ہی کا ایک اور شعر ہے۔

تا بکے ایں حکمتِ یونانیاں
حکمتِ ایمانیاں را ہم بخواں

حضرت شاہ ولی اللہ نے ایسے معقولیوں کو "گھر دزدانِ حکمت" کا لقب دے کر اگرچہ اُن کے محقق وکامل ہونے کا انکار کیا ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ ان کے پاس علم کے جواہر موجود ہیں۔ اب حضرات انبیاء علیہم السّلام کے علوم کے ناقلین اور ادیان حقہ کے اتباع کو چاہیئے کہ وہ اِن جواہر کو حاصل کریں، بے شک علوم حقہ یقینیہ کے ساتھ ساتھ تحقیقات علمیہ کی مدد سے علم وعرفان کی عمارت کو آسمان تک بلند کیا جا سکتا ہے۔ اسی لئے محققینِ اسلام علوم عقلیہ جیسے کہ منطق، فلسفہ، ریاضی،

ہئیت سیاسیات، صنائع، اخلاق، طب اور طبیعات وغیرہ ہیں، حاصل کرنا ضروری سمجھتے تھے۔

اس سلسلے میں حضرت شاہ صاحب کا امتیازی کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے عہد کے مروجہ طریق تعلیم میں اصلاح فرمائی اور اس میں حکمتِ عملیہ (سیاست اور علمی اخلاق) کو داخل کیا۔ اور اس کے لئے ضروری اصول بھی وضع کئے، جن کا ذکر انہوں نے اپنے رسالے "دانشمندی" میں کیا ہے شاہ صاحب نے اپنی بعض دوسری کتابوں میں بھی اس طرف اشارہ فرمائے ہیں، چنانچہ تفہیمات الٰہیہ، بدور بازغہ، اور خیر کثیر میں علوم عقلیہ کا ذکر ہے۔ ازالۃ الخفا، قرۃ العینین اور بدور بازغہ میں سیاست اور تاریخ اسلام پر بحث کی ہے۔ المسوّی، المصفّی اور الانصاف اور عقد الجید وغیرہ میں علوم نقلیہ کے شعبہ حدیث و فقہ کا بیان ہے لمحات، الطاف القدس، ہمعات اور القول الجمیل وغیرہ کا موضوع علوم کشف ہیں اور اپنی شہرۂ آفاق کتاب "حجۃ اللہ البالغہ" میں ان تینوں علوم عالیہ یعنی علوم نقلیہ، عقلیہ اور کشفیہ کو جمع کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔ اور ان میں مطابقت پیدا کی ہے۔ شاہ ولی اللہ کے بعد ان کے صاحب زادوں اور ان کی اولاد نے یہ سلسلۂ بحث و تحقیق جاری رکھا اور ان علوم پر تصنیفات کیں۔

شاہ ولی اللہ نے علوم عقلیہ کی تحصیل اپنے والد بزرگوار شاہ عبدالرحیم سے کی، جو علامہ میر زاہد ہروی مصنف کتب مشہور در فلسفہ و معقولات کے شاگرد رشید ہیں، جیسا کہ شاہ ولی اللہ نے اپنے سلسلۂ اساتذہ کا ذکر کرتے ہوئے رسالہ دانشمندی میں لکھا ہے۔ علامہ میر زاہد کا سلسلۂ تلمذ مرزا جان قرا باغی کے واسطے سے محقق جلال الدین دوانی تک پہنچتا ہے یہ سارا سلسلۂ اساتذہ محققین مصنفین کا ہے میر زاہد سلطان عالمگیر کے دور حکومت میں اعلیٰ مناصب پر رہے اور اسی ضمن میں وہ اکبر آباد (آگرہ) اور دہلی میں بھی رونق افروز ہوئے، جہاں شاہ عبدالرحیم کو آپ کا شرفِ تلمذ حاصل ہوا۔

سنا گیا ہے (بروایت حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری و حضرت مولانا عبیداللہ سندھی ؒ) کہ میر زاہد صاحب نے علوم معقولات میں اپنی تین کتابیں جو کہ زواہد ثلاثہ کے نام سے موسوم ہیں، شاہ عبدالرحیم کی تعلیم کے لئے تصنیف کیں۔ اسی سلسلے میں ایک اور روایت ہے کہ جب قاضی محمد مبارک نے جو شاہ ولی اللہ کے ہم زمان تھے، سُلّم العلوم کی شرح مکمل کی، تو حضرت شاہ صاحب نے اپنے صاحبزادے شاہ عبدالعزیز کو پڑھانے

کے لئے موصوف سے اس کا ایک نسخہ طلب فرمایا۔ اس پر قاضی صاحب نے بڑے متکبرانہ انداز میں کہا کہ آپ کے صاحبزادے اسے نہیں سمجھ سکیں گے۔ حضرت مولانا محمد انور شاہؒ نے یہ روایت بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ اگر حضرت شاہ ولی اللہ ارادہ فرماتے، تو وہ قاضی مبارک صاحب سے بہتر سُلّم العلوم کی شرح لکھ سکتے تھے۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ شاہ صاحب نے تفہیمات الٰہیہ کے مختلف مقامات میں اکابرِ فلاسفہ یونان اور مناطقہ مشہورین کے اکثر مسائل پر مدلل جرح کی ہے۔ نیز شاہ عبدالعزیز محقق نصیر طوسی کے بعض مسائل کا رد کیا کرتے تھے اور اس سلسلے میں اپنے دوست مولانا عبدالعلی کو آمادہ کیا کرتے تھے کہ وہ قاضی محمد مبارک کی شرح سُلّم العلوم کے مقابلے میں شرح لکھیں جو قاضی صاحب کی شرح سے بہتر ہو۔ شاہ عبدالعزیزؒ نے مولانا عبدالعلی کو "بحر العلوم" کا لقب عطا کیا تھا۔ اور یہ اسی لقب کی برکت تھی کہ مولانا عبدالعلی کو مثنوی مولانا روم کی شرح لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ اور انہوں نے مثنوی کی ایسی شرح لکھی کہ بعض روایات کی رو سے خود مولانا رومؒ نے اس کی پیش گوئی فرمائی تھی۔ مولانا عبدالعلی نے اس کے علاوہ علوم نقلیہ میں حدیث پر رسائل الارکان کے نام سے ایک بے نظیر کتاب تالیف کی۔ اور اصول فقہ میں فواتح الرحموت شرح مسلّم الثبوت، جو امام غزالیؒ کی کتاب المستصفی سے کسی اعتبار سے کم نہیں، لکھی۔

الغرض اس بابرکت خاندان رحیمی و ولی اللّٰہی کا علم و معرفت، تصنیف و تالیف اور تحقیق و اجتہاد کا دائرہ علوم عالیہ (منقولات، معقولات اور مکشوفات) کسی ایک صنف تک محدود نہ تھا۔ بلکہ ان سب علوم میں اس خاندان کے اکابر کو معرفتِ تامہ حاصل تھی۔ اور انہوں نے ان میں معرکہ آرا تصانیف چھوڑیں۔ مثال کے طور سے شاہ ولی اللہ کے حفید شاہ محمد اسماعیل شہیدؒ نے مولانا فضل حق خیرآبادی جیسے علوم معقولات کے فاضل و محقق کے اعتراضات کا جواب، اور پھر ان کے جواب کا جواب لکھا، جس میں واقعی تحقیق کا حق ادا کیا گیا ہے۔ شاہ اسمٰعیل کا یہ رسالہ ایضاح الحق الصریح کے ساتھ بطور ضمیمہ شائع ہوا۔ اسی طرح شاہ ولی اللہ کے صاحبزادے شاہ رفیع الدین نے علامہ میر محمدؒ زاہد ہروی کی تصنیف زواہد ثلثہ پر بڑی تحقیق سے حواشی لکھے۔

خود شاہ ولی اللہ صاحب کی مشہور ترین کتاب "حجۃ اللہ البالغہ" میں جہاں وراثت کا ذکر ہے، وہاں وراثت کے حصص کی موزونیت پر بحث کرتے ہوئے شاہ صاحب نے حسابی نقطۂ نظر سے جو کچھ لکھا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ امور حسابیہ میں بھی ان کے کتنا قدم راسخ تھا۔ اور وہ علوم عقلیہ کی اس صنف میں

ماہر تھے۔ شاہ رفیع الدین نے اپنے رسالہ تکمیل الاذہان میں سات زمینوں کے موجود ہونے پر بصیرت افروز بحث فرمائی اور اس کے علاوہ علم ہیئت میں تعدیلات الکواکب، تعدیلات الخمسہ المتحیرہ، سمت القبلہ اور علم حساب میں عقد انامل جیسے رسائل لکھے۔ شاہ عبدالعزیز نے اپنی تفسیر فتح العزیز میں خلق سموات وارض اور اختلاف لیل ونہار پر بڑی بیش بہا معلومات بہم فرمائیں، جن کا تعلق علوم عقلیہ سے ہے۔

میرے اس مختصر سے بیان سے یہ بات واضح طور سے ذہن نشین ہو چکی ہوگی کہ خانوادہ ولی اللہی کا خاص علوم عقلیہ میں کتنا بلند مقام تھا۔ اور اس صنفِ علمی میں اس کے اکابر کے کیا تحقیقی کارنامے ہیں۔

علوم عقلیہ ہی کی ایک صنف (کاملاً نہیں بلکہ جزواً) علم عقائد کی ہے۔ یہ علم ان اصولوں سے بحث کرتا ہے، جن پر کسی مذہب کے ماننے والوں کے افکار کی بنیاد ہوتی ہے۔ اسلام میں علم عقائد کے دو شعبے ہیں۔

۱۔ معقولات

۲۔ مسموعات یعنی سمعیات

معقولات عقائد اسلام کا وہ حصہ ہے، جس کا ثبوت تو سمعی یعنی شارع علیہ الصلوۃ والسلام کے ارشادات مبارک پر ہوتا ہے، لیکن اس پر عقلی دلائل قائم کئے جا سکتے ہیں، جیسے توحید، نبوت، ملائکہ، کتب الٰہی، تقدیر ربانی اور قیامت اجمالی طور سے۔ سمعیات عقائد اسلام کا وہ حصہ ہے، جو ارشادات نبوی سے ثابت ہے۔ اور اس پر عام طور سے عقلی دلائل قائم نہیں ہو سکتے، یعنی وہ عقل کی حدِ وسعت سے باہر ہے، جیسے موت کے بعد کے احوال و کوائف۔ اور بعث بعد الموت کی تفصیلات تمانایہ حصۂ عقائد اسلام عقلی دلائل کا محتاج نہیں، لیکن اہل کشف و شہود کے نزدیک صفائے ذہن اور جلائے قلب کی بدولت یہ سب حقائق یقینی اور مکشوف ہوتے ہیں۔ اور ان کا ادراک روحانی کیا جا سکتا ہے۔

اس ضمن میں یہ بات واضح رہنے کہ ذات وصفاتِ الٰہی کی کنہہ اور ان کی اصل حقیقت دریافت کرنے کا بے کار کا خبط اور سمعیات کے متعلق الٹی سیدھی بحثیں چھیڑنا اور خواہ مخواہ لوگوں کی طبیعتوں میں شکوک و شبہات پیدا کرنا ایک غیر مستحسن حرکت ہے اور اس سے بچنا لازمی ہے۔ شیخ سعدی فرماتے ہیں۔

توت نیکی نداری بد مکن　　بر وجودِ خود ستم بے حد مکن

شاہ ولی اللہ صاحب نے علم عقائد پر بھی کافی لکھا ہے۔ ان کا رسالہ حسن العقیدہ خاص اسی موضوع پر ہے اگرچہ یہ رسالہ مختصر ہے، لیکن اس میں بہت سی مشکلات کو حل کر دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ آپ کی اکثر تصانیف میں اس موضوع پر موقع بہ موقع مبسوط بحثیں ملتی ہیں۔ علی الخصوص الفوز الکبیر، ازالۃ الخفا، قرۃ العینین حجۃ اللہ البالغہ، الرسالہ الوصیتہ، اور فیوض الحرمین ہیں۔ نیز ذات وصفات الٰہی، اسمائے الٰہیہ و شیونات ربانیہ کا تفہیمات الٰہیہ، خیر کثیر اور بدور بازغہ میں اس طرح تفصیلی تذکرہ فرمایا ہے کہ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کی کتاب فتوحات مکیہ اور شیخ عبدالکریم جیلی کی کتاب انسان کامل کا نقشہ سامنے آجاتا ہے، حق یہ ہے کہ حضرت شاہ صاحب نے مختصر اشارات میں ان جلیل القدر محققینِ معارف الٰہیہ کے کلام کے متعلق جو اشتباہات و شکوک پیدا کئے گئے تھے، ان کو رفع کر دیا۔ اسی صنف میں حضرت شاہ عبدالعزیز کی تالیفات مختصر رسالہ میزان العقائد اور تحفۂ اثنا عشریہ ہیں۔ اور شاہ محمد اسمٰعیل کی کتاب ردّ الاشراک وغیرہ ہے۔

انتسابِ علمی و عملی و عرفانی جملہ علوم عالیہ (علوم نقلیہ، کشفیہ اور عقلیہ) میں شاہ ولی اللہ کی نسبت اس دور کے دو بڑے مراکزِ علمیہ و دینیہ دھلی اور حجاز مقدس سے تھی۔

۱۔ مرکز دھلی - علوم نقلیہ کا سلسلہ تلمذ :- شاہ عبدالرحیم (والد بزرگوار) اور شیخ ابوالرضا محمدؒ (آپ کے چچا)، جن کا سلسلہ حاجی محمدؒ افضل سیالکوٹی پر منتہی ہوتا ہے۔

علوم عقلیہ میں بھی اپنے والد اور چچا سے استفادہ کیا۔ جن کا سلسلہ محقق جلال الدین دوّانی تک پہنچتا ہے۔ علوم کشفیہ میں بھی آپ کے استاد شاہ عبدالرحیم تھے، جو اپنے بھائی شیخ ابوالرضا محمد کے شاگرد ہیں۔ ان کا سلسلہ خواجہ باقی باللہ کے صاحبزادے خواجہ خورد کے توسط سے شیخ اکبر محی الدین ابن عربی اور امام ربّانی مجدد الف ثانی دونوں تک منتہی ہوتا ہے۔

۲۔ مرکز حجاز مقدس - علوم نقلیہ شیخ ابوالطاہر کردی مدنی سے حاصل کئے۔ جن کا سلسلہ شیخ الاسلام زین الدین زکریا استاد الکلّ تک پہنچتا ہے۔

علوم کشفیہ بھی شیخ ابوالطاہر کردی مدنی سے حاصل کئے، جن کا سلسلہ شیخ ابراہیم کردی (والد شیخ ابوالطاہر) شیخ اکبر محی الدین ابن عربی تک پہنچتا ہے۔

اس کے علاوہ شاہ ولی اللہ صاحب علوم کشفیہ میں حضرت شیخ اکبر اور حضرت شیخ مجدد کے ساتھ ساتھ امام ابو حامد محمد غزالی، شیخ صدرالدین قونوی اور شیخ عبدالکریم جیلی (مصنف انسان کامل) کی تحقیقات پر بھی اعتماد کرتے ہیں، لیکن تقلید کے درجے میں نہیں۔ بلکہ وہ اِن کبار عارفین کی طرح ان امور میں محققانہ نظر رکھتے ہیں۔ چنانچہ آپ کے معارف انہی حضرات سے مطابقت بھی رکھتے ہیں اور کبھی کبھی آپ میں انفرادی واستقلالی شان نمایاں ہوتی ہے۔ بہرحال جو بھی معارفِ نادرہ زبان و قلم سے بیان ہوتے ہیں، پورے اطمینان اور شرح صدر کے ساتھ اصول راسخہ کی بنا پر ہوتے ہیں، اور اس میں استقامت علی الدین القویم ملحوظ خاطر رہتا ہے۔

علومِ عالیہ میں علوم عقلیہ کا درجہ باقی دونوں علوم سے بالعموم کم تر سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ ان میں وسائطِ علم (مقدمات صغریٰ وکبریٰ وحدِّ اوسط) کی تحقیق کے بعد تلازم نتیجہ کی تحقیق کوہ کندن وکاہ برآوردن کے مصداق ہے۔ اس لئے حضرات محققین ومتبحرین اس سطح سے بالاتر ہو کر کلام کرتے ہیں۔ اور اگر متوسط یا عام طبقے کو انہی خطاب کرنا ہو، تو پھر بحدِّ ضرورت وہ عقلیات کا اسلوب بیان اختیار کرتے ہیں۔ لیکن یاد رہے کہ عقلیات میں بھی وہ اپنے طریقے کے خود موجد ہوتے ہیں اور کسی کی تقلید یا اتباع وہ اپنے لئے ضروری نہیں سمجھتے۔

الغرض حضرات محققین ومتبحرین میں سے بعض حضرات عقلیات کے ماہر ہوتے ہیں جیسے کہ علامہ جلال الدین دوّانی۔ بعض کشفیات میں کامل جیسے حضرت امام ربّانی، اور بعض نقلیات کے متبحر ومحقق جیسے کہ امام بخاری تھے۔ اسی طرح بعض کاملین عقلیات اور کشفیات کے محقق ہوئے ہیں، جیسے حضرت امام غزالی۔ بعض نقلیات، وکشفیات میں متخصص جیسے شیخ اکبر اور بعض نقلیات وعقلیات کے محقق تھے، جیسے صاحب ہدایہ برہان الدین مرغینانی اور امام فخرالدین رازی صاحب تفسیر کبیر۔ لیکن یہ شرف اور کمال حضرت شاہ ولی اللہ کو حاصل ہے، کہ ان سب علوم میں

کامل مہارت رکھتے ہیں۔ اور ان کی ذات میں عنایات ربّانیہ اور عطیات رحمانیہ کا پورا ظہور ہوا۔

این سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

ہندوستان میں یہ قرآن فہمی کا چرچا آج جو کچھ نظر آتا ہے، اور یہ اردو انگریزی اور دوسری زبانوں میں جو بیسیوں ترجمے شائع ہو چکے ہیں، شائع ہو رہے ہیں، یا آیندہ شائع ہوں گے۔ ان سب کے اجر کا جزو اعظم یقیناً حضرت شاہ صاحب کے حسنات میں لکھا جائیگا۔ یہ سارے چراغ اسی چراغ سے روشن ہوئے ہیں اگر اس کی ابتدا آپ اپنے مبارک ہاتھوں سے نہ کر جاتے، تو نہ شاہ رفیع الدینؒ کا اردو ترجمہ وجود میں آتا، نہ شاہ عبدالقادر کا، اور متاخرین کا تو ذکر ہی کیا۔ جو شخص امت کی بے شمار نسلوں کے لئے اتنی بڑی رحمت کا دروازہ کھول گیا، اس کے اجرِ بے حساب کا حساب اور مزدِ بے نہایت کا اندازہ ہی کون کر سکتا ہے؟ — جسے تصنیف، تالیف و ترجمہ کا ادنیٰ سا تجربہ بھی ہے، وہ جانتا ہے کہ ایک موجود نمونہ کو ترقی دینے، اسے بڑھانے چڑھانے، اس میں گُل بوٹے پیدا کرنے اور خود ایک نمونہ قائم کرنے کے درمیان کیا زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ شاہ صاحب کا ترجمہ بالفرض بالکل ناقص ہوتا، جب بھی فضلِ تقدم اور شرفِ اوّلیت کے لحاظ سے بے مثال ہوتا۔ چہ جائیکہ جب صحت و تحقیق کے لحاظ سے بھی اعلیٰ سے اعلیٰ معیار پر ہو۔ اور فتح الرحمٰن کے وہ ننھے ننھے چھوٹے چھوٹے اشارے اور حاشیہ ایجاز و جامعیت میں اپنی نظیر آپ۔ حالات نے مساعدت کی ہوتی تو ایک مستقل مقالہ شاہ صاحب کے ترجمۃ القرآن کی خصوصیات پر ناظرین الفرقان کی نذر کیا جاتا۔

اولادِ صلبی نے جو کچھ خدمتِ قرآن کی، وہ تو ظاہر ہی ہے۔ باقی اس وقت سے اب تک بڑے چھوٹے جتنے بھی خادمانِ قرآن پیدا ہو چکے ہیں، یہ سب اگر حضرت کی اولادِ معنوی نہیں تو اور کیا ہیں۔؟

فقیر عبدالماجد عفی عنہٗ

(مولانا عبدالماجد دریابادی کا مکتوب بنام مدیر الفرقان)

ماخوذ از الفرقان ولی اللہ نمبر مطبوعہ ۱۳۵۹ھ

ساتَ اخلاقِ فاضِلہ

ڈاکٹر عبدالواحد ہالے پوتا

شاہ ولی اللہ صاحب کے نزدیک بنی نوعِ حیوان سے انسان کو جو چیزیں ممتاز کرتی ہیں ان میں سے ایک "رائے کُلی" ہے اور اس کی مثال وہ یہ دیتے ہیں کہ ایک حیوان بھی دفعِ مضرت اور جلبِ منفعت کے لئے غصہ میں آتا ہے، لیکن اس کا یہ غصہ ایک محسوس اور متوہم غرض کے لئے ہوتا ہے۔ لیکن انسان اس لئے بھی غصے میں آتا ہے کہ وہ اپنے غصے سے ایک شہر میں کامل نظام بروئے کار لاسکے۔ نیز حیوان اپنی غرض کے حصول کیلئے جدوجہد کرتا اور اپنے آپ کو تھکاتا ہے، لیکن اس غرض کے محرکات بھوک، پیاس، جنسی خواہش یا ایسی چیزیں ہوتی ہیں، اور انسان ایسی اغراض کے لئے جدوجہد کرتا اور اپنے آپ کو تھکاتا ہے، جن کے محرکات اس وقت اس کے جسم میں نہیں ہوتے۔ چنانچہ وہ ایسے کام کے لئے محنت کرتا ہے، جس سے وہ کوئی اُخروی غرض یا ایسا دنیوی فائدہ حاصل کرنا چاہتا ہے، جو بعد میں حاصل ہونیوالا ہوتا ہے۔

انسان کو بنی نوعِ حیوان سے ممتاز کرنے والی دوسری چیز "ظرافت" ہے۔ ایک حیوان اپنی خوراک اور اپنی رہائش کا اسی قدر انتظام کرتا ہے، جس سے اسکی بھوک کا مداوا ہو اور وہ اپنے آپ کو سردی سے بچا سکے۔ لیکن انسان اس سلسلے میں اس پر یہ اضافہ کرتا ہے کہ وہ خوراک اور رہائش میں حسن و خوبی پیدا کرتا ہے۔ تاکہ اس سے اس کی آنکھوں کو سرور اور اس کے نفس کو لذت ملے۔

اور تیسری چیز جو انسان کو بنی نوعِ حیوان سے ممتاز کرتی ہے، وہ یہ ہے کہ حیوان کے علوم دہی ذرائع و وسائل ہیں، جن سے وہ اپنی معاش کی ضرورتیں پوری کرتا ہے۔ اور وہ ان سے صرف ضرورت کے وقت ہی کام

لیتا ہے۔ لیکن انسان کے پاس مستقل علم بھی ہے۔ اور وہ اس علم سے اپنے نفس کی تکمیل کرتا ہے۔ شاہ صاحب کے الفاظ میں یہ تین چیزیں ہیں، جن پر ہم انسان کی ان تمام خصوصیات کی بنیاد رکھتے ہیں، جو اسے اس کے ابنائے جنس یعنی نوع حیوان سے ممتاز کرتی ہیں[۱]

انسانی طبائع، جو حیوانی طبائع سے ایک جداگانہ حیثیت بھی رکھتی ہیں، ان کی ترقی یافتہ اور صحت مند حالت کی علامات سات نیکیاں ہیں، جنہیں شاہ ولی اللہ سات "اخلاق فاضلہ" کا نام دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک نفسانی کیفیت جسے ملکہ کہتے ہیں، جب طبیعت میں راسخ ہو جائے، تو وہ خلق ہے، جس کی جمع اخلاق ہے۔ انہیں "اخلاق فاضلہ" اس لئے کہا گیا ہے کہ ان خصوصیات کی وجہ سے انسانی طبائع کو حیوانی طبائع پر امتیاز اور برتری حاصل ہوتی ہے۔

آگے چل کر شاہ صاحب "بدور بازغہ" میں اس کی مزید وضاحت یوں کرتے ہیں:۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ جس طرح انواع حیوان میں "اتصال" "صلابت" اور "صفا" کی بنا پر آپس میں امتیاز پایا جاتا ہے، اسی طرح ان اوصاف کے لحاظ سے افراد انسانی میں بھی امتیاز ہوتا ہے۔ بعض اشخاص میں دوسروں سے زیادہ "صلابت"۔ "صفا" اور "اتصال" ہوتا ہے، اور اسی وجہ سے وہ ان سے ممتاز ہوتے ہیں۔ اور ان میں اکمل وہ انسان ہے، جس میں یہ تینوں اوصاف درجہ کمال میں ہوں اور ان کے آثار اس کی تینوں قوتوں۔ قلبی۔ طبیعی اور نفسانی میں ظاہر ہوں اور یہ تینوں قوتیں باہم ملی ہوئی ہوں۔

اب ایک تو انسانی طبائع اور حیوانی طبائع میں آپس میں امتیاز پایا جاتا ہے۔ اور پھر خود افراد انسانی میں بھی اپنے ان طبائع کی بنا پر امتیازات پائے جاتے ہیں چنانچہ ایک انسان کی طبیعت، اُس حیوانی طبیعت سے جو اس کے مقابلے میں نوع حیوان میں موجود ہے۔ جتنی اعلیٰ ہوگی اسی قدر اس انسان میں فضیلت یعنی خُلق فاضل (جمع اخلاق فاضلہ) پایا جائیگا۔ اور وہ دوسروں سے ممتاز ہوگا۔

شاہ صاحب نے ان اخلاق فاضلہ کی تعداد سات بتائی ہے۔ اور ان کا ظہور جس طرح ہوتا ہے، اس کی کیفیت

---

[۱] بُدور بازغہ صفحہ ۲۸

حسب ذیل ہے۔

انسان اور حیوان ہر دو میں عقل، قلب اور نفس کی قوتیں ہیں، جنہیں نوعِ حیوان کی بنیادی قوتیں کہنا چاہیئے۔ انسان میں ان سے اوپر تین قوتیں اور بھی ہیں، جن کو شاہ صاحب "رائے کلی" "ظرافت" اور "تکمل" سے تعبیر کرتے ہیں۔ اب عام انسانی طبیعت جب ان مذکورہ بالا قوتوں کے باہمی تعامل اور ایک دوسرے سے متاثر ہونے کی وجہ سے بنی نوع حیوان کی بنیادی قوتوں سے ارتقا کرتی ہے، تو اس میں طرح طرح کی خصوصی صفات پیدا ہو جاتی ہیں، جو چند در چند ملے جلے عواطف وجذبات پر مشتمل ہوتی ہیں۔ ان پیچیدہ نفسیاتی صفات کو شاہ ولی اللہ نے سات حصّوں میں تقسیم کیا ہے جنہیں وہ سات اخلاق فاضلہ کہتے ہیں۔ جیسا کہ ابھی بتایا گیا ہے، نوع حیوان کے طبائع پر، جو انسان اور حیوانوں دونوں میں مشترک ہیں، جب انسان کے خصوصی طبائع یعنی رائے کلی، ظرافت اور تکمل اثرانداز ہوتے ہیں، تو ان دونوں کے تعامل سے اوپر کے اخلاق فاضلہ وجود میں آتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ ان اخلاق فاضلہ کا منبع و مصدر اور سرچشمہ یہی طبائع حیوانی ہیں، جو حیوانوں کی طرح انسان میں بھی موجود ہیں غرضیکہ پوری نوع حیوان میں عقل، قلب اور نفس کی طبائع میں جو جبلتیں ہیں، وہی دراصل ان سات اخلاق فاضلہ کا بڑا منبع ہیں۔ ان جبلتوں کو رائے کلی، ظرافت اور تکمل کی خصوصی انسانی طبائع اخلاق فاضلہ کی شکل میں بدل دیتی ہیں اب اگر انسان میں یہ جبلتیں نہ ہوں اور اس کے باطن میں عقل، قلب اور طبیعت کی پوری نوع حیوان کی بنیادی قوتوں اور رائے کلی، ظرافت اور تکمل کی انسانی قوتوں میں عمل و تعامل نہ ہو۔ اور یہ ایک دوسرے کو متاثر نہ کریں، تو انسان کا اندر اخلاق فاضلہ وجود میں نہ آئیں

اس مختصر سی تمہید کے بعد اب ہم ان سات اخلاق فاضلہ کا فرداً فرداً ذکر کرتے ہیں۔

حکمت۔ یہ عقل کا وصف ہے اس کا اظہار جو علوم انسان حواس کے ذریعہ بدیہی طور پر، اور فکر و نظر کے ذریعہ یا نور الٰہی کے ذریعہ، جسے اس دنیا میں شریعت کہا جاتا ہے، حاصل کرتا ہے۔ اُنہیں محفوظ کرنے، ان پر سوچ بچار کرنے اور ان کے بارے میں فیصلے کرنے جیسے امور میں ذہن کی تیزی و مہارت میں ہوتا ہے۔ حکمت سے بہرہ ور آدمی میں "فطانت"۔ "بصارت"۔ "تفہّم"۔ "احصاء"۔ "ادراک"۔ "ذکاوت" اور "حدس" (آئندہ آنے والے واقعات کا اندازہ کر لینا) کی صفات ہونی چاہیئے۔ "بدور بازغہ" میں حکمت کی مزید تشریح شاہ صاحب ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"ہم جس حکمت کو بیان کرنا چاہتے ہیں، ہمارے نزدیک اس سے مراد وہ "دقتِ نظر" نہیں، جو اصحاب فلسفہ اور ان سے ملتے جلتے لوگوں کے ساتھ مخصوص ہے - اور نہ وہ "عمیق وجدان" مرادہے، جو نفوس میں تجلی کی طرف سے وارد ہوتا ہے - اور صوفیہ اور ان سے ملتے جلتے لوگوں کی خصوصیت ہے - بلکہ حکمت وہ ہے، جس کے ذریعہ سلیم المزاج لوگ اپنی معاشی سرگرمیوں اور ان علوم کی طرف جو ان کے نسمہ[1] سے تعلق رکھتے ہیں، ہدایت پاتے ہیں - بسا اوقات تم ایک ایسے اعرابی (دیہاتی اور بدّو عرب) کو دیکھو گے کہ وہ اہل حضر (شہر والوں) کے احوال و معاملات کے علوم سے ناواقف ہے، لیکن وہ "حکمت بالغہ" سے بہرہ ور ہے - بات یہ ہے کہ "حکمت" کسی ایک خاص مسئلے سے مختص نہیں ہے - بلکہ وہ علم کی ایک قسم ہے، جو بہت سی چیزوں کا مجموعہ ہے - اور اس سے اطمینان حاصل ہوتا ہے - حکمت احوال یعنی کیفیات میں سے ایک کیفیت ہے کہ دل اس کے رنگ میں رنگا جاتا ہے - حکمت سے مراد صرف علمی صُوَر واشکال کا ذہن میں مرتسم ہونا نہیں اور نہ دور دراز کے احتمالات اور بے کار کی دقیقہ سنجیوں کو پیدا کرنا حکمت ہے۔"[2]

شاہ صاحب نے حکمت کا جو تجزیہ کیا ہے اور اس کی جو خصوصیات بیان کی ہیں، ان سے یہ صاف واضح ہوتا ہے کہ اگرچہ حکمت کا زیادہ تر تعلق عقل، قلب اور طبیعت کے جو تین اوصاف ہیں، ان میں سے عقل کے وصف سے ہے، لیکن اپنے موثر اظہار اور فاعلانہ قوت کے لئے وہ ایک حد تک اوپر کے بنیادی طبائع انسانی کے باقی دو ارکان - قلب اور طبیعت - پر بھی انحصار رکھتی ہے - کیونکہ اگر انسانی جسم میں کوئی بھی نقص ہوگا تو یہ لازماً عقل کے ارتقا میں حارج ہوگا - جس کا اثر کسی نہ کسی شکل میں حکمت پر پڑے گا - اسی طرح ارادے کی مضبوطی اور کمزوری بھی حکمت پر اثر انداز ہوتی ہے -

شجاعت - نوعِ حیوان میں جسم، عقل اور قلب کے جو اوصاف سریع الغضب، جسری، کینہ در صاحبِ غیرت ہونا، پائے جاتے ہیں، جیسے سینے کا کشادہ ہونا، قوی المزاج ہونا، مضبوط اعضا رکھنا -

---

[1] - "وہ لطیف بدن جو نفس سے متصل اور انسانی جسم میں جاری وساری ہے اور قُوٰی اور افعال کا حامل ہے" بدور بازغہ صفحہ ۳۳ - [2] بدور بازغہ صفحہ ۴۰

بلند آواز، سخت گیر اور عظیم الجثت وغیرہ ہونا، ان کا ذکر کرنے کے بعد شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ سب صفات بعینہٖ انسان میں پائے جاتے ہیں۔ اور اس سے پہلے ہم یہ جو اصول بیان کر آئے ہیں، وہ تمہیں ملحوظ رہیں کہ انسان میں رائے کلّی، ظرافت اور اخلاق اور علوم کے ذریعہ تکمیل حاصل کرنے کی خصوصیات ان کے علاوہ ہوتی ہیں۔ پوری نوع حیوان میں غضب و غصہ پایا جاتا ہے۔ اسی طرح یہ انسان میں بھی ہے۔ اب جب اس میں رائے کلّی کا دخل ہوتا ہے، تو یہ شجاعت کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور وہ یوں کہ انسان کو جب غصہ آتا ہے تو وہ یہ سوچتا ہے کہ اگر اس نے فوراً بدلہ لیا، تو اس سے فتنہ و فساد بڑھے گا، چنانچہ وہ بعد کے نفع و نقصان کو پیش نظر رکھ کر اپنے لئے طریقۂ کار اختیار کرتا ہے۔ اس خُلق کو شجاعت کہتے ہیں۔ اس کا محرک وہ علم ہوتا ہے، جس کے مطابق اس کا دل اوپر کا فیصلہ کرتا ہے۔ شاہ صاحب کے نزدیک" ان سب علوم میں جب رائے کلّی اور تکمیل اخلاق کا جذبہ اثر انداز ہوتا ہے، تو یہ حکمت ہے، اور جب "ظرافت" کا ان میں عمل دخل ہوتا ہے، تو طرح طرح کے علوم وجود میں آتے ہیں"۔[۱]

مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے غصے اور سختی کے جذبات کو عقل کے تابع رکھے۔ اور اس کے فیصلوں کے مطابق انہیں بروئے کار آنے دے۔ اس ضمن میں وہ ذاتی انتقام سے بھی درگزر ے، اس سلسلے میں شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ اگر رائے کلّی اور مصلحتِ بالغہ (کاملہ) اس امر کی مقتضی ہو کہ مصائب و خطرات کا مقابلہ کیا جائے، تو مقابلہ کرتے وقت دل کو مضبوط رکھنا شجاعت ہے۔ اور انسان اس قسم کا مقابلہ اسی وقت اچھی طرح سے کرتا ہے، جب اسے معلوم ہو کہ بعد میں اس کے نتائج اچھے ہوں گے۔ شاہ صاحب کے نزدیک مرنے پر ہر وقت تیار رہنا اور اس کے لئے اقدام کرنا ہی ہمیشہ شجاعت نہیں ہے۔ خود اُن کے الفاظ میں بعض موقعوں پر میدان جنگ سے فرار بھی شجاعت ہے، اور کسی کمزوری کی وجہ سے ایسا نہ کرنا بزدلی ہوتی ہے نیز ہمارے نزدیک شجاعت یہ نہیں کہ آدمی سخت اور بدمزاج ہو، وہ ہر ایک سے بحث میں الجھے اور لڑے، نہ یہ کہ وہ بغیر کسی بڑے مقصد کے اپنی جان ہر جگہ خطرے میں ڈالتا پھرے اور نہ یہ کہ وہ حریص ہو، اور کسی لذت کو نہ چھوڑ سکے۔

---

[۱] - بدور بازغہ صفحہ ۳۰

ایسا آدمی کبھی بھی بہادروں کے مقابلے میں نہیں آسکتا۔ اور وہ خود اپنے نفس کا اسیر رہتا ہے، جیسے مکھی شہد سے چمٹ کر اس کی اسیر ہو جاتی ہے۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں:۔ یہ ہے شجاعت کی حقیقت۔ اس کا اطلاق نفسانی خواہشات کا مقابلہ کرنے، انہیں دبانے اور ان سے عہدہ برآ ہونے پر بھی ہوتا ہے۔ جیسے کہ مثال کے طور سے آدمی کوئی عزم کرے اور اسے پورا کرنے پر تُل جائے، خواہ اس کے ساتھی اور اہل زمانہ اس کے مخالف ہی کیوں نہ ہوں [۱]

عفت ۔ انسان کے اندر نوع حیوان کے جو بنیادی طبائع ہیں، ان میں سے ایک کی جبلت پر جب عقل یعنی رائے کلّی کا اصلاح کن اور تہذیب بخش اثر و نفوذ کارفرما ہوتا ہے، اور وہ اس کے تابع ہوتی ہے، تو اس کا اظہار عفت اور پاک دامنی کی شکل میں ہوتا ہے۔ اس جبلّت کا تعلق جنس اور جنسی افعال سے ہے۔

انسان کی "روح بصری" صنف لطیف کے حسن و جمال کی طرف میلان رکھتی ہے۔ اس کی "روحِ سمعی" اس کی رقّت بھری آوازوں کو سننا چاہتی ہے۔ اس کی "روح شمی" (سونگھنے والی روح) صنف لطیف کی خوشبو سونگھنے کا میلان رکھتی ہے۔ انسان کی "روح لمسی" (چھونے کی روح) اُس صنف کا لمس چاہتی ہے اور یہ سب میلانات انسان کے حواس میں جاری و ساری ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ انسان میں مادہ منویہ ہے، جو اپنی تسکین چاہتا ہے۔

خاندانی زندگی کی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ تم اپنے اہل خانہ اور ساتھیوں کے ساتھ زندگی گزارتے ہوئے "اخلاق فاضلہ" "تجربیاتی علوم" اور "رائے کلی" کو پیش نظر رکھو تاکہ تمہاری زندگی اچھی طرح گزرے اور ان سے تمہارے تعلقات ٹھیک رہیں۔ اللہ تعالیٰ کی عنایات میں سے ہے کہ اس نے انسان کو طے شدہ طریقے پر نکاح کے ذریعہ زن و شوئی کے تعلقات قائم کرنے کا الہام فرمایا۔ [۲]

مردوں میں سے صاحب عفت یا عفیف وہ ہے، جو جنسی قوٰی اور صنف لطیف سے میلان رکھتے ہوئے اپنی اس جبلّت کی تسکین اپنی منکوحات سے کرتا ہے۔ اور اس جبلّت کو مکمل طور سے رائے کلی کے تحت

---

[۱] بدور بازغہ صفحہ ۴۴ - ۴۵ - [۲] بدور بازغہ صفحہ ۶۰

رکھتا ہے۔ اور عورتوں میں سے عفیفہ اور پاک دامن وہ ہے، جو اپنی اولاد سے شفقت اور اپنے خاوند سے محبت رکھتی ہے [۱]

سماحت ۔ سماحت کے معنی فیاضی کے ہیں۔ اصول ارتقاء کے مطابق نوع حیوان میں "عُجب" (فخر و غرور اور شیخی) اظہار ذات اور دوسرے سے بڑا بننے کے جو جذبات ہیں، وہ ترقی کر کے سماحت میں رونما ہوتے ہیں۔ یہ جذبات اصل میں تو جبلتیں ہی ہیں، جنہیں انسان حیوانوں یا قدیم وحشی انسان کی طرح انفرادی اغراض اور ذاتی تسکین کے بجائے اعلیٰ مقاصد اور عمومی اغراض کے لئے استعمال کرتا ہے، جو اس کی ذات کا نعم البدل بن جاتی ہیں۔

سماحت کا بیان کرتے ہوئے شاہ صاحب لکھتے ہیں۔ "سماحت کا تعلق نیتِ قلبی سے ہے، اور انسان کا ہر تنگی اور جلد بازی سے بلند تر ہونا سماحت ہے۔ وہ انسان کو ہر چھوٹی اور ذلیل غرض سے محفوظ رکھتی ہے" یہ بات بالکل واضح ہے کہ ذہنی تنگی اور اخلاق کی کمینگی ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور ان کا رجحان عمومیت اور وسعت قلبی کے بجائے عموماً انفرادی و ذاتی اغراض کی طرف ہوتا ہے جو کہ حیوانوں کا خاصہ ہے چنانچہ نچلے درجے کی خود غرضی کا تعلق ذلیل اور کم درجے کے مقاصد سے ہوتا ہے

صاحبِ سماحت آدمی پُر وقار ہوتا ہے، اس میں تحمل ہوتا ہے۔ وہ غصے کو پی لیتا ہے۔ وہ اچھی امیدیں رکھتا ہے۔ ثابت قدم اور ارادے کا دھنی ہوتا ہے وہ پیش آمدہ امور سے پریشان نہیں ہوتا معاف کرنے میں وسعت قلب رکھتا ہے۔ اسے شیخی سے نفرت ہوتی ہے اور تواضع کو پسند کرتا ہے۔ وہ نرم طبیعت ہوتا ہے اور ذاتی انتقام کو حقیر سمجھتا ہے۔ اور وہ اسی وقت انتقام لیتا ہے، جب مصلحت عمومی اس کی مقتضی ہوتی ہے۔ اور یہ اس لئے نہیں کہ اس میں کوئی کمزوری ہوتی ہے بلکہ وہ انتقام کو اپنے لئے ایک ادنیٰ چیز سمجھتا ہے۔ اسی طرح وہ اس لئے سخی نہیں ہوتا کہ وہ مال و دولت کو سنبھال نہیں سکتا یا وہ طبعاً فضول خرچ ہے، بلکہ وہ مال و دولت کو اپنا حقیر غلام سمجھتا ہے اور اپنے آپ کو اس کا مالک آقا۔ اور ایک آقا کی حیثیت سے اس میں عمل درآمد کرتا ہے۔

---

[۱] ۔ بدور بازغہ صفحہ ۳۰

فصاحت۔ اوپر کے چار اخلاق فاضلہ کے بعد دو اخلاق فاضلہ اور ہیں، جن کی وجہ سے انسان کو حیوانوں پر برتری حاصل ہے۔ اور ان دونوں کا تعلق انسان کے اپنے تصورات، افکار اور جذبات کو بڑی وضاحت اور موثر طریقے سے اظہار کرنے کی شکل اور اس کے طریقہ کار سے ہے۔ ان میں سے زبان کے ذریعہ اظہار ما فی الضمیر کو شاہ صاحب "فصاحت" کا نام دیتے ہیں اور دوسرے ذرائع سے اظہار کو وہ "دیانت" کہتے ہیں حیوانوں میں بھی یہ قدرتی صلاحیت موجود ہے کہ وہ اپنے جذبات کا زبان اور گلے کے ذریعہ مختلف آوازوں میں اظہار کرسکتے ہیں۔ فصاحت کی فضیلت کی یہ ابتدائی بنیاد ہے۔ جب ان آوازوں پر انسانی عقل کے وصفِ "ظرافت" کا عمل دخل ہوتا ہے۔ تو وہ آوازیں کلام واضح اور قابل فہم نطق کی صورت اختیار کرلیتی ہیں، اور جب وہ عقل کے دوسرے دو اوصاف "رائے کلی" اور "متکمل بالا خلاق" کے تابع آئیں تو یہ فصاحت ہے۔

اللہ تعالیٰ نے آواز کی قوتوں اور ذہن کی علم و ادراک کی قوتوں میں ایک ارتباط پیدا کیا ہے اور یہ ارتباط حیوانوں میں بھی ہوتا ہے۔ لیکن انسان کے ہاں ایک تو ان دونوں قوتوں میں ارتباط زیادہ ہوتا ہے۔ اور دوسرے انسان آواز کو ٹکڑوں میں تقسیم کرسکتا ہے۔ چنانچہ علم و ادراک کی قوتوں سے جو کچھ زبان پر آتا ہے۔ جب زبان اسے صحیح طرح ادا کرتی اور اس میں تنظیم پیدا کرتی ہے، تو یہ فصاحت ہے اور اگر انسان کا دل "ظرافت" کے عقلی وصف سے متصف ہو، وہ معانی کے مطابق الفاظ کا انتخاب کرے، مقتضائے مقام کا لحاظ رکھے اور علم و ادراک کی قوتوں کی باریکیوں کی رعایت اس کے پیش نظر رہے، تو یہ بلاغت ہے۔

اہل حضر (شہری) اور اہل بدو (صحرائی) اور عجم و عرب میں سے ہر قوم کی بلاغت اپنے مزاجوں اور علوم کی بنا پر مختلف ہوتی ہے، لیکن ہر قوم کی بلاغت کا معیار وہ شخص ہوتا ہے، جس کی اصل فطرت میں یہ صلاحیت ہو کہ وہ الفاظ میں وہ لفظ انتخاب کرے، جو نہ تو غیر مانوس ہو اور نہ کانوں پر بار ہو۔ ترکیبوں میں سے اس ترکیب کا انتخاب کرے، جس میں ضعف نہ ہو، اور اسلوب وہ اختیار کرے، جس سے دل پر عظمت چھا جائے اور وہ دل کو اپنے حسن و جمال سے موہ لے۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ ہمارے نزدیک فصاحت یہ نہیں، تمہیں بہت سے اشعار اور مسجع عبارتیں یاد ہوں اور تم انہیں برابر اپنے کلام میں گھسیڑتے رہو۔ یا تم فارسی میں عربی الفاظ گھسیڑو اور عربی میں

فارسی الفاظ یا خواہ مخواہ سجع اور تجنیس تمہارے دل کو لبھائے۔ لیکن اگر ان میں سے ہر چیز سلیقے سے ہو، تو ہم بے شک اس کی تعریف کریں گے [۱]

دیانت - اِس خُلق فاضل یا فضیلت کا بھی وہی مصدر و منبع ہے جو فصاحت کا ہے، لیکن فصاحت کا تعلق زبان کے ذریعہ اظہار مافی الضمیر سے ہے۔ اور جسم کی حرکات و سکنات اور چہرے کی علامات کے ذریعہ مافی الضمیر کی صحیح صحیح تعبیر "دیانت" ہے۔ اس کی تشریح شاہ صاحب یوں فرماتے ہیں۔

حیوان کی بالعموم اور انسان کی بالخصوص یہ جبلت ہے کہ ان ہر دو کے ذہن میں جو خیالات آتے ہیں، ان کے اعضاء و جوارح ان کی نقل کرتے ہیں۔ ایک حیوان کا سینہ جب فخر و غرور سے بھر جاتا ہے تو وہ اپنی گردن اونچی کرتا ہے۔ اور جب وہ بُجھا ہوتا ہے اور اپنے آپ کو ذلیل محسوس کرتا ہے، تو اس کا سر جُھک جاتا ہے۔ اور دُم لٹک جاتی ہے۔ اور ایسے ہی حیوان اور انسان جبلّی طور سے ان افعال سے رُک جاتے ہیں، جن کے بارے میں ان کے دلوں میں نفرت اور بیزاری پیدا ہو جائے۔ الغرض اعضاء و جوارح دل کے لئے ایک آئینہ ہوتے ہیں، جیسے کہ زبان اس کے لئے آئینہ ہے۔ دل پر جو کچھ گزرے، اس کا جوارح کے ذریعہ صحیح اظہار "دیانت" ہے۔ [۲]

ایک شخص ہے، جس کا سینہ خدا تعالیٰ کی تعظیم و عظمت سے بھر پور ہے، اب اس کے اعضاء و جوارح اس کا اظہار انہی صورتوں اور شکلوں میں کریں گے، جو اس کی قوم میں رائج ہیں۔ شاہ صاحب کے نزدیک "ورع" (پرہیزگاری) "عبادت" اور "اخلاق" اسی دیانت کے شعبے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں :- جن لوگوں میں دیانت کی فضیلت ہو، وہ اس کے ان شعبوں۔ ورع، عبادت اور اخلاق کو ان طریقہ ہائے کار اور رسوم کے ذریعہ ترقی دے سکتے ہیں، جو ان کی قوم میں رائج ہوتے ہیں۔ اور انہیں بجا لاتے لاتے ان لوگوں کے لئے ورع، عبادت اور اخلاق کے خلاف جانا مشکل ہو جاتا ہے۔

---

[۱] - بدور بازغہ صفحہ ۷۶

[۲] - بدور بازغہ صفحہ ۷۴

سمت صالح - سمت صالح کی فضیلت کا منبع و مصدر فی ترقی یافتہ متوازن طبیعت ہے، جس میں ایک طرف باطنی ہم آہنگی ہو، اور دوسری طرف اسکے مختلف حصے اور اجزا باہم متناسب ہوں، اس کی وجہ سے ذہن میں ایسا ملکہ پیدا ہو جاتا ہے، جو ہمیشہ اپنے عمل و کردار میں استقامت اور ہم آہنگی کا ثبوت دیتا ہے۔ اس ذہن کا مالک یقیناً ایک سلجھے ہوئے، متوازن اور ہم آہنگ کردار کا ہوگا اور وہ عارضی حالات اور وقتی تہیجات سے متاثر نہیں ہوگا۔

وہ لوگ جن کے طبائع میں یہ ہم آہنگی نہیں ہوتی، وہ اپنے عمل و کردار میں زیادہ دیر تک استقامت اور پختگی کا ثبوت نہیں دے سکتے۔ اور ان سے متضاد قسم کے افعال سرزد ہوتے رہتے ہیں مثال کے طور سے ایک وقت میں ان سے بڑے اچھے اور اعلیٰ کام ہوتے ہیں۔ اور پھر انہی لوگوں کو بہت چھوٹے اور ذلیل کام کرتے پایا جاتا ہے۔ اور یہ سب نتیجہ ہوتا ہے ان کی طبیعت میں ہم آہنگی یعنی "سمت صالح" کے نہ ہونے کا۔ سمت صالح کی تعریف یہ ہے "قوائے عاملہ اور عاقلہ پر حکم لگانے میں قلب کا صحیح المزاج ہونا تاکہ ایک طرف اسے کوئی وہم، خیال، وسوسہ اور تہیج اس معمول کے بارے میں جس کا وہ عادی ہو چکا ہے۔ تشویش میں نہ ڈال دے۔ اور دوسری طرف اس کے بعض افعال دوسرے افعال سے متضاد نہ ہوں کہ بعض سے تو عظمت اور بڑائی کا اظہار ہو رہا ہو۔ اور بعض کمینگی، ذلت اور چھوٹا پن کا مظاہرہ کر رہے ہوں" [۱]

یہ ہم آہنگی اور تناسب (سمت صالح) انسان کے اخلاق، اعمال اور لباس میں بھی ہونا چاہیئے۔ اور اس کے ایک فعل کی مختلف جزئیات میں بھی۔ یہ نہ ہو کہ ایک وقت میں وہ عظمت و جبروت کے مظہر میں نظر آئے۔ اور اس کا وقار، سماحت اور شجاعت کا پیراہن ہو، اور دوسرے وقت میں وہ فقیر، بخیل، تنگ دل اور بزدل کے صورت میں ہمارے سامنے آئے، یہ سب باتیں اِس کا پتہ دیتی ہیں کہ اس کے ہاں سمت صالح کا فقدان ہے اور وہ طبیعت کی ہم آہنگی سے محروم ہے۔

آخر میں مجھے یہاں صرف اس بات کا اضافہ کرنا ہے، کہ شاہ ولی اللہ کا اخلاقیات کے بارے میں

---

[۱] - بدور بازغہ ۷۴

جو نقطۂ نظر ہے، وہ پوری انسانی زندگی پر حاوی ہے، اس بنا پر وہ جو نظام اخلاقیات پیش کرتے ہیں، وہ مشتمل ہے اخلاقی عمل و کردار کے ان اصولوں پر جو نفس انسانی کے اندر نیکی اور فضیلت کی کیفیات باطنی پیدا کرنے میں بھی ممد ہوتے ہیں، اور فرد، معاشرے اور انسانیت عامہ کی عمومی فلاح و بہبود بھی ان کے پیش نظر رہتی ہے۔ چنانچہ ان کے اخلاقی اصولوں کا نفسیات اور عمرانیات یا اجتماعیات دونوں سے گہرا تعلق ہے اس لئے شاہ صاحب نے نیکی یا فضیلت اور خاص طور سے سات اخلاق فاضلہ کا جو تصور پیش کیا ہے اسے سمجھنے کے لئے شاہ صاحب نے نفسیات اور عمرانیات کے جو اصول وضع فرمائے ہیں، ان کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔

مختصر الفاظ میں شاہ صاحب کے نزدیک اخلاق فاضلہ صرف عقل و قلب و طبیعت کے باطنی کوائف و احوال نہیں، بلکہ خارج میں اور اس مادی زندگی میں اور انفرادی و اجتماعی دونوں حیثیتوں میں بھی ان کا عملی اظہار ہونا چاہیئے۔ وہ اخلاق فاضلہ کی بحث کا آغاز نوع حیوان کی ان طبائع سے کرتے ہیں، جو تمام حیوانوں میں بشمول انسان مشترک ہیں۔ یہ طبائع اصل سرچشمہ ہیں ان اخلاق کا جو مسلسل ترقی اور ارتقاء کے ذریعہ درجات کمال حاصل کرتے ہیں۔ اور آخر کار انسان اس منزل پر پہنچتا ہے جسے ایک لفظ میں "سعادت" کا نام دیا جا سکتا ہے۔

انسان کے اندر اخلاق و اطوار کی جو نفسی کیفیات پیدا ہوتی ہیں، ان میں سے ہر نفسی کیفیت کا خارج میں کوئی نہ کوئی عملی مظہر ہوتا ہے۔ اور یہ عملی مظہر ہی اس عالم محسوس میں اس خلق کی نفسی کیفیت کا مادی قائم مقام بن جاتا ہے۔ اب اخلاق انسانی کے یہ عملی مظاہر ذریعہ بن جاتے ہیں نفس میں ان اخلاق کی باطنی کیفیات کی تربیت کا۔ چنانچہ اگر تعریف ہوتی ہے تو ان عملی مظاہر کی اور مذمت کی جاتی ہے تو ان کی۔ اور ذکر ہوتا ہے تو ان عملی مظاہر کا۔ اگرچہ اصل مقصود یہ عملی مظاہر نہیں، بلکہ وہ نفسی کیفیات ہوتی ہیں، جن کے یہ اعمال خارج میں مظہر بنتے ہیں۔

(فیوض الحرمین)

سرزمینِ سندھ میں علمِ حدیث

مخدوم امیر احمد[1]

سرزمینِ سندھ وہ خوش نصیب خطہ ہے، جو برِّصغیر ہند و پاکستان میں سب سے اول دین اسلام کے نور سے منور ہوا۔ بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پانچ صحابیوں کے ہمراہ ایک مکتوبِ گرامی باشندگان سندھ کی طرف روانہ کیا تھا۔ اہل سندھ میں سے بعض سعید ارواح اس خط سے متاثر ہو کر دائرۂ اسلام میں داخل ہوئیں۔ پانچ صحابیوں میں سے دو صحابی سندھیوں کا ایک وفد ساتھ لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے لئے گئے باقی تین صحابی سندھ میں ہی رہ گئے۔ وہ سندھ میں اسلام کی تبلیغ کرتے رہے اور اس خطہ میں اسلام پھیلتا رہا۔[2]

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مسلمانوں نے خلیفۂ ثالث کے دورِ خلافت میں اس ملک کی طرف رخ کیا تھا اور دونوں ملکوں میں سرحدی جھڑپیں بھی ہوئی تھیں۔ آخر ۹۳ھ میں ایک پُرجوش نوجوان مجاہد محمد بن قاسم نے اس سرزمین کو فتح کر کے مقبوضات اسلامی میں شامل کر دیا۔

---

[1] پرنسپل سندھ اورینٹل کالج حیدرآباد۔ مخدوم صاحب نے یہ مضمون کُل پاکستان تعلیمات اسلامی کانفرنس حیدرآباد منعقدہ جنوری ۶۳ء میں پڑھا تھا۔ موصوف شاہ ولی اللہ اکیڈمی کے ڈائرکٹر ہیں۔

[2] جمع الجوامع بحوالہ مخدوم محمد جعفر بوبکائی سندھی

یہ بھی ایک حقیقت ثابتہ ہے کہ مسلمان جہاں بھی جاتے تھے وہاں عِلم کا عَلَم بلند کرتے تھے۔ اور بلاتمیز رنگ ونسل مقامی باشندوں کو علم کی دولت سے مالا مال کرتے رہتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات بلغوا عنی ولو آیۃ اُلحکمۃ ضالۃ المؤمن ان کے ذہن میں محفوظ تھے اور حضورِ اکرم ہادی اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر قول وفعل اور دنیا کی ہر نیکی اور علم کو اپنے یہاں ایک مقدس امانت تصور کرکے اس کا دوسروں تک پہنچانا اپنا فرض سمجھتے تھے۔

سندھ کی مٹی علم وحکمت کی کاشت کے لئے بڑی موزوں ثابت ہوئی اور یہاں سے وہ وہ علمی پھول پھوٹے جن کی مہک سے پورا عالم اسلامی معطر ہوا اور تا قیامت معطر رہے گا۔ انشاءاللہ تعالیٰ۔

سردست ہماری بحث صرف علم حدیث سے ہے۔ عام طور پر یہی کہا جاتا ہے کہ ہندوستان میں علم حدیث کی اشاعت شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے سہرا اور ان کے بعد شاہ ولی اللہ دہلوی کے سر پر ہے لیکن حقیقت اس کے خلاف ہے۔ سندھی علماء ان دونوں بزرگوں سے پہلے اور بہت پہلے علم حدیث کی طرف متوجہ ہو چکے تھے اور وہ اس کی تعلیم وتربیت کا سلسلہ شروع کر چکے تھے۔

تاریخی حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے ہم سندھی محدثین کے چار درجے مقرر کر سکتے ہیں۔

۱- وہ محدثین جو نسلاً سندھی تھے لیکن ان کی ولادت ان کی نشوونما اور ان کی تعلیم وتربیت عرب میں ہوئی وہ عرب میں رہے اور عرب میں فوت ہوئے۔

۲- وہ جو نسلاً عرب تھے، ان کی ولادت، نشوونما، تعلیم وتربیت سب عرب میں ہوئی لیکن وہ ہجرت کرکے سندھ میں آئے اور سندھ کے ہو رہے۔

۳- وہ جو سندھ میں پیدا ہوئے اور سندھ میں تعلیم پاکر بعد میں دیارِ عرب کو ہجرت کر گئے۔ اور وہاں وفات پائی۔

۴- وہ جو سندھ میں پیدا ہوئے۔ ان کی تعلیم وتربیت سندھ میں ہوئی اور سندھ میں فوت ہوئے۔

(۱) امام ابوحنیفہ

پہلے درجے میں ہم سب سے اول حنفی مسلک کے بانی امام اعظم امام ابوحنیفہ کے نام نامی کو پیش

کرتے ہیں۔ آپ نسلاً سندھی ہیں۔ ؎۱

آپ کے اجداد یہاں سے ایران گئے اور ایران سے عراق آئے امام ابوحنیفہ عراق میں پیدا ہوئے اور وہاں وفات پائی۔

۲۔ امام اوزاعی۔ انہیں امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے ہمعصر شیخ الاسلام عبدالرحمٰن بن عمرو معروف یہ امام اوزاعی بھی سندھی تھے۔ ان کی جلالتِ قدر کو اہل علم بخوبی جانتے ہیں۔ آپ کا شمار مجتہدین میں ہوتا ہے۔ ایک فقہی مذہب کے بانی ہیں اور اندلس میں آپ کے مقلدین عرصۂ دراز تک موجود تھے۔

آپ نے عطا بن ابی رباح، قتادہ، شداد، نافع مولیٰ ابن عمرؓ، امام زہری، اور محمد ابن سیرین جیسے بزرگوں سے علم حاصل کیا اور امام مالک، سفیان ثوری، شعبہ، عبداللہ بن مبارک اور یحییٰ بن سعید قطان جیسے جلیل القدر ان کے شاگردوں میں شمار ہوتے ہیں۔

آپ کی راست بازی اور حق گوئی کے قصے اسماء الرجال کی کتابوں میں محفوظ ہیں اور آپ کے فضل و علم کی نسبت ائمہ حدیث سے بہت ساری روایتیں مشہور ہیں۔ مثلاً ابن مہدی کہتا ہے کہ :۔

"حدیث میں چار امام ہیں :۔ اوزاعی، مالک، ثوری اور حماد بن زید۔ شام میں اوزاعی کے بغیر حدیث کے سمجھنے والا کوئی نہیں تھا"

امام احمد بن حنبل سے روایت ہے کہ

ایک دفعہ سفیان ثوری اور اوزاعی امام مالک کے پاس آئے۔ وہ دونوں جب واپس ہو گئے تو امام مالک نے فرمایا۔ ان دونوں میں سے ہر ایک علم میں اپنے ساتھی سے بڑھا ہوا ہے۔ لیکن پہلا (سفیان) علم و مذہب کی امامت کی صلاحیت نہیں رکھتا اور دوسرے (اوزاعی) میں امام بننے کی صلاحیت موجود ہے۔

آپ کی وفات ۱۵۶ھ میں حمام میں اچانک آگ لگ جانے کی وجہ سے ہوئی ؎۲

؎۲ تذکرۃ الحفاظ جلد اوّل ص۱۶۰ و تہذیب التہذیب ج ۶ ص۲۳۸

؎۱ تاریخ سندھ سید ابوظفر ندوی - ص۳۵۹

۳۔ ابو معشر بن عبدالرحمٰن سندھی

ابو معشر حدیث کے مشہور راویوں میں شمار ہوتے ہیں۔ آپ کا والد سندھ سے گرفتار ہو کر عرب پہنچا۔ اور بنو ہاشم گھرانے کا غلام رہا۔ ابو معشر عرب میں پیدا ہوئے غلامی کی حالت میں تحصیل علم کی۔ اور ممتاز علماء میں شمار ہونے لگے۔ آپ کی روائتیں حدیث کی مشہور کتابوں "صحاح ستہ" میں سے ترمذی شریف میں موجود ہیں۔ آخر عمر میں آپ کا حافظہ اگرچہ کمزور ہو گیا تھا۔ جس کی وجہ سے علمائے جرح و تعدیل نے آپ پر جرح بھی کی ہے تاہم آپ ائمہ حدیث و مغازی میں شمار ہیں۔ علامہ ذہبی کا قول ہے کہ وہ (ابو معشر) حافظہ کی کمزوری کے باوجود بھی علم کا مخزن ہے"۔

امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ

"وہ (ابو معشر) فن مغازی میں صاحب بصیرت اور صادق تھے، لیکن سلسلۂ اسناد یاد نہ رکھ سکتے تھے"۔

خطیب بغدادی کہتے ہیں:۔"(ابو معشر) فن مغازی کے ماہرین میں سے تھے"۔ حدیث کے بڑے بڑے امام مثلاً محمد بن ابی معشر، عبدالرزاق، ابو نعیم، سفیان ثوری، محمد بن بکار، منصور بن ابی مزاحم لیث بن سعد وغیرہ کے نام ان کے شاگردوں کی فہرست میں داخل ہیں۔ باوجود اتنی مہارت اور قابلیت کے ان کا تلفظ درست نہ تھا اور ان کے تلفظ سے انکے وطن اصلی یعنی سندھ کی یاد تازہ رہتی تھی چنانچہ ابو نعیم کہتے ہیں۔ "ابو معشر سندھی تھے عربی الفاظ کا صحیح تلفظ نہیں کر سکتے تھے"۔ چنانچہ وہ کہتے تھے "حدثنا محمد بن قعب" اور اس "قعب" سے مراد "کعب" ہوتا تھا۔

عباسی خلفاء میں سے خلیفہ مہدی ان کے بڑے قدردان تھے اور ان سے محبت کرتے تھے۔ وہی ان کو مدینہ سے عراق لے گئے اور بغداد میں بٹھا کر تعلیم و تدریس کی خدمت ان کے سپرد کی آخر وہیں ماہ رمضان ۱۷۰ھ میں وفات پائی [1]

۴۔ ابو عبدالملک محمد بن ابو معشر سندھی

آپ ابو معشر عبدالرحمٰن کے فرزند اور شاگرد تھے، اپنے زمانہ کے بلند پایہ علماء میں شمار ہوتے

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۱۳ تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۴۱۹ لسان المیزان تاریخ بغداد للخطیب البغدادی ج ۱۳ ص ۴۲۷ لسان المیزان ج ۶ ص ۱۴۷ کتاب الانساب للسمعانی

تھے، باپ کی طرح حدیث اور مغازی کے فن میں خصوصی مہارت رکھتے تھے۔

بڑے بڑے علمائے حدیث آپ کے شاگرد ہیں۔ مثلاً آپ کے صاحبزادہ داؤد بن محمد بن ابی معشر ابو حاتم محمد بن ادریس رازی، محمد بن لیث جوھری، ابو یعلی موصلی وغیرہ۔

آپ نے ۹۹ سال کی عمر پا کر سال ۲۴۷ھ میں وفات پائی [۱]

۵۔ داؤد بن محمد بن ابی معشر سندھی

اپنے باپ محمد سے اپنے دادا ابو معشر کی کتاب المغازی روایت کرتے ہیں [۲]

۶۔ الحسین بن محمد بن ابی معشر سندھی

حدیث کے راویوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ابن حبان نے ان کو 'ثقہ' لکھا ہے [۳]۔

۷۔ ابو محمد خلف بن سالم

حافظ حدیث خلف بن سالم، سندھ سے عرب لائے گئے۔ آلِ مہلب کے غلام رہے۔ علم حدیث میں مہارت حاصل کر کے نام پیدا کیا، ذہبی اور ابن حجر عسقلانی نے ان کو "حافظ الحدیث" کے لقب سے یاد کیا ہے۔

آپ نے حدیث کا علم وقت کے بڑے بڑے محدثوں سے حاصل کیا، جن میں سے بعض کے نام یہ ہیں۔

ھشیم بن بشیر۔ یحیٰی بن سعید قطان، عبدالرحمٰن بن مھدی، اسمعیل بن علیہ ....

---

[۱] کتاب الانساب للسمعانی ورق ۳۱۴
تاریخ الخطیب البغدادی ج ۳ ص ۳۲۶
تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۴۸۷-۴۸۸

[۲] تاریخ بغداد الخطیب ج ۸ ص ۳۷۶

[۳] لسان المیزان ج ۲ ص ۳۱۲

سعد بن ابراہیم بن سعد، یعقوب بن ابراہیم بن سعد، معن بن عیسیٰ القزاز، ابونعیم، یزید بن ہارون، محمد بن جعفر، وہب بن جریر، عبدالرزاق بن ہمام، ابن نمیر۔ اور اسمٰعیل بن ابی حارث، حاتم بن لیث، یعقوب بن شیبہ۔ احمد بن ابی خیثمہ، جعفر طیالسی، عباس دوری، یعقوب بن یوسف مطوعی۔ حسن بن علی معمری۔ احمد بن حسن بن عبدالجبار صوفی۔ ابوالقاسم بغوی۔ احمد بن علی ابار۔ عثمان دارمی، امام احمد بن حنبل، یحییٰ بن معین۔ یعقوب بن شیبہ۔ حمزہ کتانی جیسے جلیل القدر علمائے حدیث ان کے شاگرد ہیں۔

امام نسائی نے ایک واسطے سے ان سے حدیث روایت کی ہے۔ ایک مسند بھی تصنیف کی تھی۔ بہت سادہ انسان تھے فن حدیث اور دوسرے علوم میں پوری مہارت رکھتے تھے۔

۲۲ رمضان پیر کے دن ۲۳۱ھ میں بعمر ۷۹ سال وفات پائی۔[۱]

۸۔ عبدالرحیم بن حماد الثقفی سندھی

عراق کے مشہور تاریخی شہر بصرہ میں رہتے تھے اعمش کے شاگرد تھے اور عراقیوں کو درس حدیث دیتے تھے۔ بیہقی نے شعب الایمان میں ان کے ضعف کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ابن حبان نے ان کو ثقہ میں شمار کیا ہے[۲]

۹۔ نصر اللہ بن احمد بن القاسم بن سیما سندھی

نام نصر اللہ کنیت ابوالحسن تھی۔ بغداد میں 'باب الازج' میں سکونت تھی ابوالقاسم بن سینک سے حدیث روایت کرتے تھے۔ خطیب بغدادی نے ان سے حدیث روایت کی ہے آپ نے ذی قعدہ ۴۳۳ھ میں وفات پائی۔[۳]

۱۔ تاریخ بغداد للخطیب ج ۸ ص ۳۲۸ - ۳۳۰ - تذکرۃ الحفاظ ج ۵ ص ۲۵
تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۱۵۲ - ۱۵۳

۲۔ لسان المیزان ج ۴ ص ۵ ۳۔ تاریخ بغداد للخطیب ج ۱۳ ص ۳۰۲۔

۱۰۔ ابو نصر فتح بن عبداللہ سندھی

آل حکم کے غلاموں میں سے تھے۔ آزادی کے بعد حدیث، فقہ اور کلام کی تعلیم حاصل کرکے مہارت پیدا کی۔ حدیث میں وقت کے مشہور محدث حسن بن سفیان کے شاگرد تھے۔ 'فقیہ' اور متکلم کے لقب سے مشہور تھے۔ شاگردوں کا مجمع ہر وقت آپ کے پیچھے لگا رہتا تھا۔ چنانچہ ایک دفعہ راستہ میں ایک بدمست عرب پڑا تھا۔ اُن کو دیکھ کر اس نے کہا۔ اے غلام! میں تو زمین پر پڑا ہوں۔ اور تو اس شان کے ساتھ جا رہا ہے؟ آپ نے جواب دیا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ میں نے تمہارے بزرگوں کا وطیرہ اختیار کیا اور تم میرے باپ دادوں کے طریقہ پر چل رہے ہو۔ [۱]

جن محدثین کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے، وہ نسلاً سندھی تھے لیکن ان کی ولادت نشوونما اور تعلیم و تربیت عرب میں ہوئی تھی۔ اب میں ان علمائے حدیث کا ذکر کرتا ہوں، جو نسلاً عرب تھے، ان کی پیدائش، نشوونما، تعلیم و تربیت عرب میں ہوئی لیکن وہ عرب سے ہجرت کرکے سندھ میں آئے اور یہاں وفات پائی۔

۱۔ الربیع بن صبیح السعدی ابوبکر او ابوحفص بصری ثم سندھی

آپ بصرہ کے باشندے تھے۔ بڑے عابد و زاہد تھے۔ سعد بن زید مناۃ قبیلہ کے آزاد کردہ غلام تھے۔ حدیث روایت کرتے تھے۔ حافظ ابن حجر نے ان کو صالح اور صدوق کہا ہے۔

بصرہ کے شہر میں یہ پہلے آدمی تھے جنہوں نے کتاب تصنیف کی۔

سنہ ۱۶۰ھ میں آپ نے سندھ میں وفات پائی۔ [۲]

---

[۱] ۔ کتاب الانساب للسمعانی ورق ۳۱۴

[۲] ۔ تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۲۴۷ - ۲۴۸

۲۔ موسیٰ بن یعقوب ثقفی اروری سندھی

آپ کی بھی پیدائش عرب میں ہوئی، وہاں علمی کمال حاصل کیا اور محمد بن قاسم کے ساتھ سندھ میں آئے سندھ فتح کرنے کے بعد انہوں نے آپ کو "ارور" کا قاضی اور سندھ کا قاضی القضاۃ مقرر کیا۔ آپ کا خاندان سلطان شمس الدین التمش کے زمانہ تک ارور میں موجود تھا۔ چنانچہ سنہ ۶۱۳ھ میں کمال الدین اسمٰعیل بن علی بن محمد ثقفی اپنے وقت کے بڑے عالم تھے۔ اور ارور میں قضا کے عہدہ پر مامور تھے [۱]

۳۔ محمد بن ابی الشوارب منصوری، سندھی

آپ سنہ ۲۸۳ھ میں عراق سے آکر سندھ میں آباد ہوئے۔ بہت بڑے عالم تھے عراق میں عموماً اور بغداد میں خصوصاً لوگ ان کی بڑی قدر کرتے تھے۔ خلیفۂ بغداد اور عباسی شہزادے ان کی صحبت سے فائدہ اٹھاتے اور بوقت ضرورت ان کی حاجت روائی بھی کرتے [۲]

۴۔ قاضی ابو محمد منصوری

آپ بھی غالباً ان محدثین میں سے ہیں جو عرب سے آکر سندھ میں بس گئے تھے۔ ظاہری مذہب کے امام تھے۔ اچھی اچھی کتابیں تصنیف کی تھیں۔ علم حدیث میں آپ کے پایہ بہت بلند تھا۔ چنانچہ منصورہ میں قضا کا عہدہ آپ کے سپرد کیا گیا تھا۔

آپ کا ایک مدرسہ بھی تھا جس میں آپ درس دیتے تھے [۳]۔ وفات کی تحقیق نہ ہو سکی البتہ یہ معلوم ہے کہ سنہ ۳۷۵ھ میں وہ منصورہ میں موجود تھے۔

مندرجہ ذیل محدثین کا شمار بھی اسی صف میں ہو سکتا ہے جو خلیفۂ وقت کے نائب بن کر سندھ میں تشریف لائے اور حکومت کے ساتھ ساتھ اپنا علمی مذاق بھی قائم رکھا۔ اس سلسلے میں سنان بن سلمہ ہذلی اور عمرو بن سلم باہلی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ اوّل الذکر حجاج بن یوسف کے زمانہ میں سندھ کے امیر

۱۔ چچنامہ

۲۔ الکامل ج ۷، ص ۳۳۴ ۳۔ احسن التقاسیم ص ۴۸۱

تھے اور حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ کے زمانے میں سندھ کی ولایت پر مامور تھے۔ ان دونوں حضرات کو اسماء الرجال کی کتابوں میں رواۃِ حدیث میں شمار کیا گیا ہے۔

اب ان بزرگوں کا ذکر کیا جاتا ہے جو سندھ میں پیدا ہوئے اور اسی ملک میں ان کی تعلیم و تربیت ہوئی بعد میں وہ عرب یا دوسرے اسلامی ملکوں کی طرف ہجرت کر گئے۔ اس سلسلے میں سب سے اول دیبل اور منصورہ کے مندرجہ ذیل علماء قابلِ ذکر ہیں:-

۱- خلف بن محمد موازینی دیبلی سندھی

دیبل میں پیدا ہوئے اور وہیں کے مشہور عالم علی بن موسیٰ دیبلی سے تعلیم پائی۔ پھر بغداد چلے گئے اور وہاں سکونت اختیار کی۔ حدیث کی روایت اپنے استاد علی بن موسیٰ دیبلی سے کرتے تھے۔ خطیب بغدادی نے ان کی ایک حدیث "کلام اھل السموات لاحول ولا قوۃ الا باللہ" تاریخ بغداد میں روایت کی ہے [۱]

۲- ابو جعفر محمد بن ابراہیم بن عبداللہ دیبلی، سندھی

آپ عراق میں رہتے تھے۔ ابو عبیداللہ سعید بن عبدالرحمٰن مخزومی سے ابن عیینہ کی کتاب التفسیر اور ابو عبداللہ حسین بن الحسن سے ابن مبارک کی کتاب البرّ والصِلہ روایت کرتے تھے۔ عبدالحمید بن صبیح، ابوالحسن احمد بن ابراہیم بن فراس مکی، ابوبکر محمد بن ابراہیم بن علی بن المقری ان کے شاگردوں میں سے تھے [۲]

۳- ابراہیم بن محمد بن ابراہیم، دیبلی، سندھی

آپ نے موسیٰ بن ھارون اور محمد بن علی صائغ وغیرھما سے حدیث روایت کی ہے [۳]

---

[۱]- تاریخ بغداد للخطیب ج ۸، ص ۳۳۳، کتاب الانساب للسمعانی ورق ۲۳۶

[۲]- کتاب الانساب للسمعانی ورق ۲۳۶

[۳] کتاب الانساب للسمعانی ورق ۲۳۶

۴- ابوالغنم شعیب بن محمد بن احمد بن شعیب دیبلی سندھی

ابن ابی قطعان کی کنیت سے مشہور تھے۔ دیبل سے مصر چلے گئے اور وہاں حدیث کا درس دیتے رہے، ابو سعید بن یونس ان کے شاگردوں میں سے تھے۔[1]

۵- ابوالعباس محمد بن محمد بن عبداللہ الوراق۔ دیبلی سندھی

بڑے جید عالم، صالح اور زاہد تھے، ابوخلیفہ فضل بن الحباب جمحی، جعفر بن محمد بن حسن الفریابی عبداللہ بن احمد بن موسیٰ عسکری اور عثمان بن ابو سوید بصری اور ان کے ہمعصروں سے روایت کرتے تھے ابوعبداللہ حاکم ان سے حدیث روایت کرتے ہیں۔ رمضان ۳۹۷ھ میں وفات پائی۔[2]

۶- ابوالعباس احمد بن عبداللہ بن سعید دیبلی سندھی

آپ بڑے عابد اور زاہد تھے۔ علم حاصل کرنے کے لئے کافی سفر کیا تھا۔ بصرہ میں قاضی ابوخلیفہ بغداد میں جعفر بن محمد الفریابی، مکہ شریف میں فضل بن محمد جندی اور محمد بن ابراہیم دیبلی، مصر میں علی بن عبدالرحمٰن و محمد بن زیان، دمشق میں ابوالحسن احمد بن عمیہ، بیروت میں ابوعبدالرحمٰن مکحول، حران میں ابوعروسہ حسین بن ابو معشر، تستر احمد بن زبر قشتری، عسکر میں مکرم عبدان بن احمد الحافظ اور نیشاپور میں ابوبکر محمد اسحاق بن خزیمہ سے حدیث سنی تھی، حاکم ان سے حدیث روایت کرتے تھے۔ ان کی وفات نیشاپور میں رجب ۳۳۴ھ میں ہوئی۔[3]

۷- احمد بن محمد قاضی منصوری سندھی

عراق اور فارس میں سکونت رکھتے تھے۔ ابوالعباس کنیت تھی فارس میں ابوالعباس اشرم اور بصرہ میں ابو رؤف ہروی اور ان کے طبقے کے لوگوں سے حدیث سنی تھی۔ حاکم ان کے شاگرد تھے۔

---

[1] کتاب الانساب ورق ۲۳۶

[2] کتاب الانساب ورق ۲۳۶م

[3] کتاب الانساب ورق ۲۳۶

ان کا کہنا ہے کہ ان سے زیادہ خوش طبع میں نے کوئی عالم نہیں دیکھا ہے،

داؤد اصفہانی ظاھری کے مذہب کے امام تھے [۱]

۹- ابو محمد عبداللہ بن جعفر بن مرہ منصوری سندھی

حسن بن مکرم اور ان کے طبقہ کے لوگوں سے حدیث روایت کرتے تھے۔ حاکم نے ان سے بھی روایت کی ہے۔

۱۰- قاضی عبداللہ بن قاضی ابراہیم دربیلوی سندھی

یہ ایک بڑے عالم اور متقی بزرگ تھے۔ انہوں نے مخدوم عبدالعزیز ابہری ہروی سے فضل و کمال حاصل کیا تھا۔ ان کا مزاج تند تھا۔ ابتدا میں اپنے پرانے وطن دربیلہ (ضلع نواب شاہ) میں رہتے تھے لیکن جب شاہ بیگ نے سندھ فتح کر لیا تو کچھ عرصہ وہ باغبان اور راوت میں بھی آ کر رہے تھے۔ ۹۳۲ھ میں وہ سندھ سے گجرات چلے گئے۔ پھر وہاں سے مدینہ منورہ جا کر رہنے لگے اور وہیں انتقال کر گئے۔ تاریخ وفات کی تحقیق نہ ہو سکی [۲]

۱۱- شیخ رحمتہ اللہ بن قاضی عبداللہ دربیلوی ثم مدنی سندھی

شیخ رحمتہ اللہ اپنے زمانے میں محدث بے مثل اور فقہ میں یگانہ تھے۔ احکام حج پر انہوں نے تین رسالے لکھے۔ جن میں سے 'المنسک المتوسط' عربستان میں آج تک رائج ہے اور ملا علی قاری جیسے علامہ وقت نے اس کی شرح لکھی ہے [۳]

آپ بھی اپنے والد کی تقلید کر کے مدینہ شریف ہجرت کر گئے اور آخر عمر تک وہیں رہے ۱۲ محرم ۹۹۲ھ کو مکہ شریف میں واصل بحق ہو گئے۔

تاریخ وفات "رحمتہ اللہ قد نال مرادہ" سے نکالی گئی۔ روایت ہے کہ جب لوگ آپ کی تدفین سے

---

[۱]- کتاب الانساب ورق ۳/۵؟

[۲]- تاریخ معصومی اردو ترجمہ ص ۲۷۸، ص ۲۷۹ [۳] تاریخ معصومی اردو ص ۲۷۹

فارغ ہوئے تو اس وقت بارش ہوئی۔

شیخ عبداللطیف مکّی معروف بہ مخدوم زادہ نے شیخ رحمۃ اللہ کی وفات پر ایک مرثیہ لکھا۔ اس کے ایک بیت میں اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے، چنانچہ فرمایا ہے۔

رحمۃ اللہ بالحیا و الغمام [۱] رحمۃ اللہ لا تفارق مثوی

حضرت مجدد الف ثانی فرماتے ہیں کہ آپ کو "شیخ الحرمین" کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔[۲]

۱۲- شیخ حمید بن قاضی عبداللہ دربیلوی ثم مدنی سندھی

شیخ عبدالحمید فضل وکمال سے آراستہ اور عقلی اور نقلی علوم میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ تفسیر و حدیث اور علی الخصوص علم حدیث میں بڑا دخل رکھتے تھے۔ سندھ سے گجرات چلے گئے وہاں بھی حدیث کا درس دیتے رہے۔ بھکر کے میر محمد معصوم، مصنف تاریخ معصومی و بانی مینار معصوم سکھر، نے گجرات میں آپ سے مشکوٰۃ شریف اور دیگر کتب احادیث از اوّل تا آخر پڑھکر اجازت حاصل کی تھی۔

شیخ موصوف نواب خان اعظم (عزیز کوکہ) کے ساتھ حرمین شریفین کی زیارت سے مشرف ہوئے اور پھر مکہ شریف میں سکونت اختیار کرلی اور وہاں کے شیوخ سے جن میں شیخ عبدالرحمٰن ابوالفضل زین الدین شاگرد علامہ ابن حجر عسقلانی بھی شامل ہیں، استفادہ کیا۔ اس کے بعد مکہ شریف میں ہی درس و تدریس میں مشغول رہے اور اپنے وقت میں مکہ میں علم حدیث کے شیخ مانے گئے۔[۳]

آپ کے اخلاق صوفیانہ تھے دنیا سے دور بھاگتے تھے اور سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ انہوں نے سال ۱۰۰۹ھ میں بعمر نوے سال رحلت فرمائی۔ اور مکہ شریف میں اپنے بھائی شیخ رحمۃ اللہ کے پاس دفن ہوئے۔[۴]

---

[۱]- النور السافر ص۲۱۴ [۲]- مکتوبات امام ربانی

[۳]- تاریخ معصومی ص۲۸۰

مولانا مصلح الدین لاری، سندھی

انتہائی دانشمند اور علوم عربیہ میں اچھی مہارت رکھتے تھے، سندھ کے حاکم مرزا شاہ حسن کے استادوں میں سے تھے۔ ۹۵۱ھ میں مکہ معظمہ چلے گئے۔

شرح شمائل ترمذی، حواشی تفسیر بیضاوی، شرح منطق فارسی اور دیگر رسائل ان کی تصنیفات میں سے ہیں۔[1]

شیخ عبداللہ متقی بن مولانا سعد در بیلوی سندھی

علوم مکتبی کے ماہر اور علوم تفسیر و حدیث میں اپنے عہد میں بے نظیر تھے ۹۲۷ھ میں سندھ سے گجرات گئے، اور قاضی عبداللہ علیہ الرحمتہ کی صحبت سے سرفراز ہوئے۔ اس کے بعد مدینہ طیبہ میں قاضی قاضن کی صحبت میں وقت گذارتے رہے۔ ہر علم میں ان کی تصنیفات اور رسالوں کا ذکر ملتا ہے[2] شیخ محی الدین عیدروس آپ کے حق میں لکھتے ہیں۔ "وہ زبردست عالم اور برگزیدہ متبحر امام تھے"۔ انہوں نے شیخ شہاب الدین سہروردی کی کتاب "عوارف المعارف" پر حاشیہ لکھا تھا

سال ۹۸۴ھ میں مکہ شریف میں رحلت فرمائی[3]

مخدوم ابوالحسن ٹھٹوی سندھی ثم مدنی

نورالدین محمد بن عبدالھادی ٹھٹوی ثم مدنی معروف بہ شیخ ابوالحسن کبیر۔ سندھ کے مشہور تاریخی شہر ٹھٹہ میں پیدا ہوئے۔ وہاں کے علماء سے علم حاصل کیا۔ پھر مدینہ شریف ہجرت کر گئے۔ اور وہیں سکونت اختیار کی۔

آپ نے مدینہ منورہ میں "مدرستہ الشفا" نام سے ایک مدرسہ قائم کیا یہ مدرسہ آج تک موجود ہے اور ترکی اوقاف میں شامل ہے۔ راقم الحروف کو جب اللہ تعالیٰ نے ۱۹۵۲ء میں حرم نبوی

۱۔ تاریخ معصومی اردو ص ۲۸۰-۲۸۱

۲۔ تاریخ معصومی اردو ص ۲۸۱ ۳۔ النور السافر ص ۳۵۷

کی زیارت کی توفیق عطا کی تو اس مدرسہ کو بھی دیکھنے کا موقعہ ملا۔

اس مدرسہ کو "مدرستہ الشفا" کیوں کہا گیا؟ اس کے متعلق دو روایتیں ہیں، ایک یہ کہ اس مدرسہ میں قاضی عیاض کی مشہور کتاب "الشفا فی تعریف حقوق المصطفیٰ" کا درس لازمی طور پر اور خاص اہتمام سے دیا جاتا تھا۔ دوسری روایت یہ ہے کہ شیخ کے زمانہ میں ایک سالار فوج بیمار پڑ گیا تھا اور زندگی کی امید منقطع ہو چکی تھی آخر اس نے شیخ ابوالحسن کی طرف رجوع کیا جو اس وقت مسجد نبوی میں حدیث کا درس دیتے تھے۔ اور نذر مانی کہ اگر اس کو اللہ تعالیٰ نے صحت عطا کی تو وہ حضرت شیخ کی تدریس کے لئے ایک مدرسہ تعمیر کرائیں گے۔ شیخ کی دعا مستجاب ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے اس کو تندرستی عطا کی اس نے اپنی نذر پوری کی اور شیخ کے لئے ایک مدرسہ بنایا۔ اس مدرسہ کا نام "مدرستہ الشفا" رکھ گیا ہمارے خیال میں ان دونوں روایتوں میں کوئی تعارض یا تضاد نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ مدرسہ کے نام میں دونوں مناسبتوں کا خیال رکھا گیا ہو۔

اس مدرسہ میں ایک اچھا خاصہ کتب خانہ ہے۔ جس میں مخطوطات کا ایک بڑا ذخیرہ جمع ہے کہتے ہیں کہ یہ کتابیں اکثر و بیشتر شیخ ابوالحسن کے شاگردوں کی لکھی ہوئی ہیں۔

مسند امام احمد بن حنبل کے ایک مخطوطہ نسخہ پر میں نے دیکھا کہ آخر میں ایک طالب علم نے لکھا تھا کہ میں نے یہ کتاب شیخ ابوالحسن سندھی کی خدمت میں مسجد نبوی میں فلاں وقت پڑھ کر پوری کی اور حلقۂ درس میں اتنے طالب علم شامل تھے۔

آپ کے اساتذہ میں شیخ شمس محمد بن عبدالرسول برزنجی، برھان کورانی اور عبداللہ بصری جیسے شیوخ شامل تھے۔

مخدوم ابوالحسن نے "صحاح ستہ" پر حواشی لکھے تھے، جن میں سے اکثر حواشی مصر اور ہندوستان میں چھپ چکے ہیں۔ ان کے علاوہ مسند امام احمد بن حنبل، اذکار نوویہ پر بھی حواشی تحریر کئے تھے۔ علامہ ابن حجر کی کتاب "شرح نخبۃ الفکر" پر بھی حاشیہ لکھا تھا۔ فقہ کی مشہور کتاب ہدایہ کی شرح بھی لکھی تھی۔ خلاصہ یہ کہ آپ فن حدیث کے ایک محقق حافظ اور صاحب تدقیق فاضل تھے۔ تاریخ

وفات میں اختلاف ہے - علامہ کتانی ۱۱۳۹ھ اور علامہ عبدالرحمٰن الجبرتی ۱۱۳۶ھ بتاتے ہیں - آپ کا مدینہ منورہ میں انتقال ہوا۔ ؎ ۱

شیخ محمد حیات عادلپوری سندھی - ثم مدنی

شیخ محمد حیات بن ابراہیم عرف پھلیارہ قوم چاچڑ آپ عادلپور ضلع سکھر سندھ کے باشندے تھے - حسن اتفاق سے آپ کی ولادت بھی مدینہ منورہ میں ہوئی تھی آپ کی تعلیم و تربیت سندھ میں ہوئی - بعد میں حجاز مقدس تشریف لے گئے وہاں جاکر شیخ ابوالحسن کبیر - شیخ عبداللہ بن سالم البصری، شیخ ابوطاہر کورانی اور شیخ حسین عجیمی جیسے فضلائے دہر سے استفادہ کیا۔

شیخ ابوالحسن سندھی کی رحلت کے بعد ۲۴ سال تک ان کی مسند پر بیٹھ کر حدیث کا درس دیا۔

شیخ محمد حیات کی مندرجہ ذیل تصانیف ہیں -

منذری کی کتاب "ترغیب و ترہیب" کی شرح دو جلد - نووی کی کتاب اربعین کی شرح، ملا علی قاری کی "اربعین" کی شرح - الایقاف علی سبب الاختلاف، و تحفۃ الانام فی العمل بحدیث النبی صلی اللہ علیہ والصلوٰۃ والسلام - رسالہ ردّ بدعت تعزیہ - النہی عن عشق المردان والنسوان -

شیخ عبدالقادر کوکبانی لکھتے ہیں کہ :- ایک طویل مدت ان کی صحبت میں رہا لیکن کبھی نہیں دیکھا کہ انہوں نے کوئی مباح (خلاف سنت) بات بھی منہ سے نکالی ہو۔

آپ کے شاگردوں کی فہرست بڑی طویل ہے جن میں شیخ عبدالقادر کوکبانی، شیخ محمد سویدی - شیخ ابوالحسن صغیر سندھی، سید غلام علی آزاد بلگرامی اور فاخر الہ آبادی جیسے جلیل القدر

؎ ۱ فہرس الفہارس - ج ۱ ص ۱۰۳ و الجبرتی ج ۱ ص ۲۷۳

علماء شامل ہیں۔

شیخ محمد فاخر الہ آبادی نے آپ کی شان میں ایک لمبا قصیدہ لکھا ہے۔ جس کے چند بند یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔

باد بر روی صفحۂ دوراں — محفل آرائی حلقۂ انساں

شیخ اسلام عصر و علامہ — در فنونِ حدیث فہامہ

موشگافِ دقائق ایماں — رازدانِ حقائق ایماں

رستہ از حبس ربقۂ تقلید — جستہ بر اجتہاد رائے مزید

آں محمد حیات بخت بلند — بحدیث نبی قوی پیوند

سرِ من خاک پائے او بادا — جانِ من در رضائے او بادا

(مثنوی زائر)

شیخ محمد حیات نے بتاریخ ۲۶ صفر ۱۱۶۳ء بیوم اربعاء وفات فرمائی اور جنت البقیع میں دفن ہوئے۔[۱] (مسلسل)

جس طرح تمام اہل تصوف کا اس بات پر اتفاق ہے کہ طریقت کے سب سلسلوں کی اصل ایک ہے، اسی طرح یہ سب بزرگ اس امر میں بھی متفق ہیں کہ سالک راہ طریقت کا سب سے پہلا کام یہ ہونا چاہیئے کہ وہ اپنے عقائد کو درست کرے۔ اس ضمن میں اسے صحابہ، تابعین، اور سلف صالحین کے عقائد کو اپنے لئے مشعل راہ بنانا چاہیئے۔ عقائد کو درست کرنے کے بعد اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اسلام کے جملہ ارکان کو بجالائے۔ گناہوں سے بچے۔ شریعت نے جن امور کو ملعون قرار دیا ہے، ان کا سدّباب کرے۔ یہ راہ طریقت کا پہلا مقام ہے۔ اور اسی کا نام طاعت ہے

(ہمعات)

[۱] - ابجد العلوم ص ۹۲۹ - نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۶۱ - سبحۃ المرجان ص ۹۵ - اتحاف النبلاء ص ۳۶۱ (?)

عرب قومیت اشتراکیت اور اسلام

محمد سرور

جہاں تک عرب قومیت کا، بحیثیت ایک سیاسی نصب العین اور نظریے کے، تعلق ہے، مراکش سے لے کر خلیج فارس تک (جسے اب خلیج عرب کا نام دیا جارہا ہے) جتنے بھی عرب ملک ہیں، سب کے سب اسے مانتے ہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ امت عربیہ" کا ایک حصہ ہے۔ اس بارے میں بظاہر ان میں کوئی اختلاف نہیں، چنانچہ ان کے انہی دعاوی کا عملی مظہر عرب لیگ (جامعہ دول العربیہ) ہے، جو باوجود اپنی تمام کمزوریوں اور رُکن ملکوں کے باہمی جھگڑوں کے، اس وقت تک قائم ہے۔ اور وہ ختم نہیں ہوئی، یہ گویا علامت ہے، ان کی اس خواہش کی کہ تمام عرب ایک "امت عربیہ" ہیں۔ اور اس کا ایک جامع ادارہ ہونا چاہیئے۔

عرب قومیت کے اس سیاسی نصب العین اور نظریئے میں ہم نوا ہونے کے باوصف آج ہر عرب ملک عرب قومیت کے محافظ اور علمبردار ہونے کے دعاوی کے ساتھ ساتھ دوسرے عرب ملک کے خلاف سازشوں میں مصروف ہے، اور اس طرح عرب دنیا گویا ایک بارود خانہ بنی ہوئی ہے، جس میں کہیں بھی ذرا سی چنگاری سے آگ لگ سکتی ہے۔ اور ملک کا پورا نظام تہس نہس ہو سکتا ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ اس وقت عرب ملکوں میں عرب قومیت کی حیثیت کم و بیش ایک نعرہ کی ہے۔ اور اس سے معین طور پر نظری و فکری اور معاشی و سیاسی و اجتماعی لحاظ سے کیا مراد ہے۔ اور وہ کون سے واضح نظریات ٹھوس اصول اور عملی طریقہ ہائے کار ہیں، جن کے غالب

مجموعے پر "عرب قومیت" کا اطلاق ہو سکتا ہے، یہ پہلو اب تک اس میں غیر موجود ہیں۔ اور اسی کی وجہ سے یہ تمام جھگڑے ہیں۔ سب سے پہلے تو عرب بادشاہتوں اور جمہوریتوں کا اختلاف آتا ہے۔ عرب جمہوریتوں کی عرب قومیت میں اشتراکیت (سوشلزم نہ کہ کمیونزم) ایک لازمی عنصر ہے۔ لیکن عرب بادشاہتیں اشتراکیت کو اسلام کے منافی، اس لئے عرب قومیت کی ضد سمجھتی ہیں، آخرالذکر میں پیش پیش سعودی عرب ہے۔ اور اس گروہ میں اردن اور مراکش بھی شامل ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے یمن بھی اسی گروہ میں تھا، اور سابق امام نے جن کا انتقال ہو چکا ہے، صدر ناصر کی اشتراکیت کے خلاف ایک نظم بھی لکھی تھی، جس کا عرب دنیا میں بڑا چرچا ہوا۔ اور سعودی عرب نے اس کا خوب پروپیگنڈا کیا۔ اس نظم میں دوسروں کے مال پر قبضے کرنیکی مخالفت کی گئی تھی، اور اسے اسلام کے منافی بتایا تھا۔

عرب قومیت کے بارے میں ایک تو یہ بنیادی اختلاف ہے۔ چنانچہ عرب شاہیت پسندوں کی عرب قومیت اور ہے اور جمہوریت پسندوں کی اور۔ اول الذکر عرب قومیت اور اسلام (جسے وہ اسلام کہتے یا سمجھتے ہیں) کو لازم و ملزوم قرار دیتے ہیں، بلکہ وہ عرب قومیت کو اسلام کے تابع رکھنے پر مُصر ہیں۔ آخرالذکر یعنی جمہوریت پسندوں کے نزدیک اشتراکیت کے بغیر عرب قومیت کے کوئی معنی نہیں، لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اپنی اِس اشتراکیت، کو اسلام کے منافی نہیں سمجھتے، بلکہ مصر والوں نے تو عرب اشتراکیت کی ایک اصطلاح بھی گھڑی ہے، جو اُن کے نزدیک مترادف ہے اسلام کے معاشی و سیاسی نظام کے۔ وہ عرب اشتراکیت کو اسلام کے معاشی نظام سے تعبیر کر کے درحقیقت ان حملوں کا جواب دینا چاہتے ہیں، جو سعودی عرب وغیرہ کی طرف سے "ناصرازم" کی لادینیت پر ہوتے ہیں۔

اگر عرب قومیت کے تصور و مقاصد کے متعلق صرف یہی اختلاف ہوتا، تو کوئی خاص بات نہ تھی۔ اس طرح کے نظری اختلافات تمام تحریکوں میں ہوتے ہیں۔ کمیونزم آج کئی نظریاتی دھڑوں میں بٹ چکی ہے۔ اور یہی حال مغربی جمہوریت کا ہے لیکن عرب قومیت کی مختلف تعبیروں کے شدید اختلافات کا سلسلہ صرف یہیں تک نہیں رکتا۔ ہر عرب جمہوریت کی، جو عرب قومیت کے لئے اشتراکیت کو ضروری سمجھتی ہے، اپنی اپنی اشتراکیت ہے۔ اور ان کی یہ اشتراکیتیں بھی باہم دست و گریباں ہیں۔ مثال کے طور پر

بعث پارٹی جس کے ہاتھوں میں عراق اور شام کی اُن کے حالیہ انقلابات کے بعد زمامِ اقتدار آئی ہے، سو فیصد اشتراکیت کی علم بردار ہے بلکہ اسے عرب سوشلسٹ پارٹی کہا جاتا ہے۔ لیکن اسے صدر ناصر کی عرب اشتراکیت سے سخت اختلاف ہے، اور اسی بنا پر دونوں گروہوں میں خوب ٹھنی ہوئی ہے۔ اور ایک دوسرے کے خلاف پروپیگنڈہ کی جنگ جاری ہے۔

غرض عرب قومیت اور اس کے ساتھ اشتراکیت میں ہم خیال ہوتے ہوئے بھی صدر ناصر اور بعث پارٹی میں نہ اتحادِ فکر ہے۔ اور نہ اتحادِ عمل۔ اور اگرچہ مصر، شام اور عراق میں ایک وفاق بنانے کا معاہدہ ہو چکا ہے، لیکن اس کے بعد بھی ان میں آپس میں چھڑی ہوئی ہے۔ چنانچہ نہ عرب قومیت کا کوئی واضح نقشہ بنتا ہے؛ اور نہ اشتراکیت کی حدود طے ہوتی ہیں۔ اس کش مکش میں بعث پارٹی جیتتی ہے یا صدر ناصر، فی الحال اس کے بارے میں قیاس آرائی مشکل ہے لیکن ہر ایک گروہ اپنی اپنی جگہ کافی مضبوط ہے، اور وہ آسانی سے ہار نہیں مانے گا۔ اور دونوں میں مقابلہ سخت ہو گا۔
اس سے تو شاید ہی کوئی انکار کر سکے کہ عرب دنیا میں مطلق العنان شخصی بادشاہت کا، جیسی کہ اب تک وہاں رہی ہے، کوئی مستقبل نہیں ہے۔ اور پچھلے دنوں یمن میں جو کچھ ہوا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نئی طرز کے ہتھیاروں سے مسلّح اور منظم فوج دنیائے عرب کے مطلق العنان بادشاہوں کے تخت و تاج کے لئے ایک مستقل خطرہ بن گئی ہے۔ اور خاص طور سے جب کہ اس کے سامنے قاہرہ اور بغداد کی مثالیں ہیں۔ اور ریڈیو "صوت العرب" دن رات اسے "اُمت عربیہ" کے نام سے "قومیت عربیہ" کے نام سے، بلکہ خود "اسلام" کے نام سے اُبھارتا رہتا ہے، اور یہودیوں کے ہاتھ سے فلسطین میں پوری عرب قوم کی جو تذلیل ہوئی تھی، اس کا بدلہ لینے کی صورت یہی بتاتا ہے کہ بادشاہتیں ختم ہوں اور "قومیت عربیہ" کے حقیقی ترجمان و محافظ برسرِ اقتدار آئیں۔ ایک تو قاہرہ اور بغداد کی مثالیں، دوسرے قاہرہ کے "صوت العرب" کا مسلسل پروپیگنڈہ، پھر عربوں کا گرم خون اور اس پر صدیوں کی نکبت و ادبار، محکومی و ذلت، اور غیروں اور اپنوں کے ظلم و استبداد کا شدید احساس۔ ان سب نے مل کر پوری عرب دنیا میں ایک ایسا زبردست جذباتی سیلاب پیدا کر دیا ہے، جس کے سامنے بادشاہتوں

کا جو خود اپنی بدکرداریوں اور بے تدبیریوں سے کھوکھلی ہو چکی ہیں، ٹھہرنا ناممکن ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس سیلاب کی قوت و وسعت میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اور اس کی موجیں پوری عرب دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے رہی ہیں۔

الجزائر کی آٹھ سالہ جدّ و جہد آزادی، جس کی تاریخ میں بمشکل کوئی مثال ملے گی۔ عرب آج آزادی کے لئے کیا کچھ کرنے کا عزم اور حوصلہ رکھتے ہیں، اس کا ایک عملی ثبوت ہے۔ یہ عزم اور حوصلہ کتنا سفاک ہو سکتا ہے، بغداد میں آئے دن جو خونریزیاں ہوتی رہتی ہیں اس سے ایک اندازہ کر لیجئے۔ صدیوں کے سیاسی استبداد، معاشی استحصال اور معاشرتی دباؤ کے خلاف جب جذبات اُبھرتے ہیں، تو ان کی تندی اور تیزی کا یہی عالم ہوتا ہے۔

عرب قومیت کے اس سیلاب کو عرب جمہوریتوں کے ریڈیو نجد و حجاز، خلیج فارس کی ساحلی عرب امارتوں اور عدن و حضرموت اور ان کے نواحی علاقوں میں بسنے والے ان پڑھ آبادیوں سے دور صحرا نشین بدوؤں کے خیموں تک پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑ رہے۔ دن رات ان کا یہی مشغلہ ہے۔ اور عربی زبان کی بے نظیر خطابت اس میں ان کی سب سے بڑی ممد و معاون ہے۔ ظاہر ہے یہ سیلاب جلد یا بدیر تمام عرب ملوک، امرا اور شیوخ کو حتمی طور سے بہا کر لے جائے گا۔ اور خواہ یہ لاکھ اسلام کے نام سے اس کے سامنے بند باندھیں، اور بڑی بڑی سلطنتوں کی طرف سے ان کی پشت پناہی ہو، یہ بچ نہیں سکتے کیونکہ ایک تو خود ان کا وجود اب تاریخ پر ایک بار ہے۔ دوسرے یہ لوگ حکمرانی کی تمام صلاحیتیں بھی کھو چکے ہیں۔ پھر جس اسلام کے نام سے وہ اپنی حفاظت کرنا چاہتے ہیں، اس کے نزدیک تو خود اِن کا وجود ہی سرتاسر ناجائز ہے۔

عرب ملکوں کی آج فوری ضرورتیں تین ہیں:۔ غیر ملکی استعمار اور ملکی استبداد سے آزادی۔ عرب اتحاد اور صدیوں کی پس ماندگی، جہالت، افلاس اور جمود کو دُور کرنا۔ عرب قومیت سے بے شک عربوں کو غیر ملکی استعمار اور ملکی استبداد سے آزادی حاصل ہو جائے گی۔ لیکن اس کے بعد دوسری منزل ان کے اتحاد کی ہے۔ اتحاد کسی شکل میں ہو، تمام عرب ممالک کی ایک متحدہ عرب جمہوریہ بنے، یا ان کی ایک فیڈریشن

یا کنفیڈریشن ہو، یا جیسے آج یورپ کو متحد کیا جارہا ہے، اسی طرح عرب دنیا متحد ہو۔ بہرحال ان میں سے کوئی صورت بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر عربوں کو موجودہ ہمہ جہتی پستی سے نکلنا ہے تو ان میں کسی نہ کسی درجے پر اتحاد ہونا ضروری ہے۔ اتحاد کے بغیر یہ آپس میں لڑتے رہیں گے۔ اور ان کے معاشی و معاشرتی مسائل کبھی حل نہیں ہو سکیں گے۔

قومیت بطور ایک نعرہ کے، نہ کسی مسئلے کا کبھی دائمی حل ہوئی ہے اور نہ آیندہ ہو سکتی ہے۔ یہی مثال عرب قومیت کی ہے۔ اسی لئے اہل مصر یا صدر ناصر اور بعث پارٹی اس کے لئے اشتراکیت کو لازم و ملزوم سمجھتی ہے۔ یہ اشتراکیت اور خاص طور سے صدر ناصر کی اشتراکیت کا دعویٰ ہے کہ عرب اشتراکیت ہے، وہ نہ خدا کے وجود کا انکار کرتی ہے نہ وہ مذہب کی منکر ہے۔ اور وہ اسلام کی دینی، روحانی اور تاریخی روایات کے سلسلے کو بھی منقطع کرنے کے حق میں نہیں۔ اسی لئے مصر کے آئین میں اسلام کو مملکت کا دین بدستور رہنے دیا گیا ہے۔ وہاں کے محکمہ اوقاف کی طرف سے اسلام کا ریڈیو کے ذریعہ پروپیگنڈا بھی ہوتا ہے دینی کتابیں بھی چھپتی ہیں۔ اسلام کی تبلیغ بھی کی جاتی ہے۔ اور قومی زندگی میں اسلام کی مسلّمہ حیثیت ہے

شاید بعث پارٹی کی اشتراکیت اس قدر اسلامی اثرات کے حق میں نہیں جتنی کہ مثال کے طور سے صدر ناصر کی عرب اشتراکیت ہے کیونکہ ایک تو اس پارٹی کی فکری قیادت مصر کی طرح خالصاً مسلمانوں کی نہیں، دوسرے نہ شام میں اور نہ عراق ہی میں جامعہ ازہر جیسا کوئی ایک ہزار سے سال قائم مذہبی و تعلیمی ادارہ ہے۔ جس کی حیثیت ایک مملکت کے اندر ایک اور مملکت کی ہے۔ اور کوئی حکومت خواہ وہ عوام میں کتنی بھی مقبول ہو، اس کے اثر و رسوخ کو چیلنج نہیں کر سکتی۔

آج عرب قومیت مع اشتراکیت کے۔ یہ اشتراکیت صدر ناصر کی عرب اشتراکیت ہو یا بعث پارٹی کی اشتراکیت۔ آزاد ترقی خواہ استعمار دشمن عرب جمہوریتوں کا سیاسی نصب العین ہے اور یہ مشتمل ہیں الجزائر، مصر، شام اور عراق پر۔ یہ اشتراکیت انہیں متحد کر سکتی ہے یا نہیں۔ اور اگر ان دونوں میں کشمکش ہوتی ہے، تو ان میں سے کون سی اشتراکیت کا پلّہ بھاری رہے گا۔ اس کا فیصلہ مستقبل ہی کر سکتا ہے۔ بہرحال عرب قومیت ان میں سے کسی نہ کسی شکل میں عرب دنیا میں بحیثیت ایک سیاسی طاقت

لازماً رہے گی۔ بلکہ طاقتور ہوتی جائیگی۔ اور یہ توقع کرنا کہ سعودی عرب یا اس طرح کی دوسری عرب بادشاہتیں اپنی نام نہاد اسلامی عربی قومیت کی مدد سے اس کے مقابلہ میں ٹھہر سکیں گی، خام خیالی ہے۔ لیکن یہ مسئلہ یہیں ختم نہیں ہوجاتا۔ دنیائے عرب میں صدر ناصر کی عربی اشتراکی قومیت اور بعث پارٹی کی اشتراکی عرب قومیت کی ایک اور حریف طاقت کمیونزم اور اشتمالیت ہے، جسے بے شک اس وقت عراق اور شام دونوں ملکوں میں بڑا دھکا لگا ہے، لیکن اس سے یہ سمجھنا کہ یہ تحریک جو زیر زمین کام کرنا جانتی ہے، ہمیشہ کے لئے عرب دنیا سے ختم ہوگئی صحیح نہیں ہوگا۔ عرب قومیت اور عرب اشتراکیت کے لئے یہ اشتمالیت ایک مستقل خطرہ ہے اور اس کا پورا امکان موجود ہے کہ مستقبل قریب یا بعید میں عرب دنیا کے اقتدار کے لئے ان دونوں تحریکوں میں باقاعدہ کش مکش ہو، اور عرب قومیت اور عرب اشتراکیت کی موجودہ شکل سے اشتمالیت کھلے بندوں ٹکرائے، اس بارے میں دو رائیں نہیں ہوسکتیں کہ جہاں تک عرب عوام یعنی جمہور کا تعلق ہے، ان کے دلوں میں اسلام کی محبت ہے اور ان کے ہاں اسلام کی مخالف کوئی تحریک مقبول نہیں ہوسکتی، لیکن یہ عوام اقتدار کی کش مکش میں کس حد تک اثرانداز اور فعّال ہوسکتے ہیں، سوچنے کی بات یہ ہے۔ اگر عرب قومیت اور عرب اشتراکیت عربوں کو وحدت نہیں دے سکتی، اور اس کی وجہ سے ان کی معاشرتی و معاشی پستی اور بدحالی قائم رہتی ہے تو اشتمالیت کا زیر زمین سے بالائے زمین آجانا چنداں غیر متوقع نہیں ہوگا۔

بدقسمتی سے عرب دنیا میں صدیوں سے اسلام بالعموم اپنی فقہی شکل میں زیادہ مقبول رہا ہے۔ سعودی عرب میں امام احمد بن حنبل کے فقہی مذہب کی شیخ محمد بن عبدالوہاب نے جو تعبیر کی ہے، علاوہ وہاں کا اسلام ہے۔ مصر میں اس وقت تو نہیں، لیکن آج سے تقریباً سو سال قبل یہی حالت تھی۔ چنانچہ جب سید جمال الدین افغانی وہاں تشریف لے گئے، اور آپ نے طلبا اور اہلِ علم کو علوم عقلیہ و حکمیہ کی طرف توجہ دلائی، تو علمائے ازھر سخت برافروختہ ہوئے، اور انہیں طرح طرح سے مطعون کیا۔ کتاب "رودِ کوثر" کے مصنف شیخ محمد اکرام اسی قسم کا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں۔

"ہمارے ایک دوست چند سال ہوئے اسپین ہوتے ہوئے اسپینی مراکش میں بھی بغرضِ سیر و سیاحت

چلے گئے۔ ایک مسجد میں گئے تو امام نے پوچھا "کَیفَ مَذْهَبُکُمْ"۔ ان بچاروں نے مذہب کا مطلب ہندوستانی محاورے کے مطابق دین لیا اور کہا کہ مسلمان ہوں۔ امام صاحب نے پھر اپنا سوال دہرایا اور بالآخر ایک اور ساتھی کو ترجمانی کرنی پڑی۔ انہوں نے اپنا فقہی مذہب حنفی بتایا، تو امام صاحب اتنے مایوس ہوئے کہ شاید ان صاحب کے یہودی ہونے سے بھی نہ ہوتے۔"[1]

شاید اب نہ ہو، لیکن کچھ عرصہ پہلے تک سعودی عرب میں حنفی مذہب فقہ رکھنے والے کو اس سے زیادہ بُرا سمجھا جاتا تھا۔

اب دنیائے عرب میں ایک طرف فقہی اسلام کے بارے میں اس قدر غلو پایا جاتا ہے، تو دوسری طرف جو لوگ مغربی علوم حاصل کر رہے ہیں، اور چونکہ ان کے ملکوں میں یورپ سے قریب ہونے اور وہاں یورپیوں کی کثیر آبادی کی وجہ سے یورپی تہذیب کافی پھیل چکی ہے، وہ اس سے بھی متاثر ہیں اس لئے وہ بڑی سرعت سے اسلام کی روحانی قدروں سے دُور ہوتے جا رہے ہیں۔ اور یورپ کی مادی قدریں انہیں اپنی طرف کھینچ رہی ہیں، اس طرح کے حالات، مذہب سے منکر اشتراکیت اور اشتمالیت کے فروغ کے لئے بڑے سازگار ہوتے ہیں، خدانخواستہ اگر عرب قومیت عرب عوام کے مذہبی عواطف و جذبات کو ساتھ نہ لے سکی اور نہ اس سے ان کے معاشی و معاشرتی مسائل حل ہوئے تو زیر زمین اشتمالیت کے لئے پر پُرزے نکالنے کے بڑے مواقع ہوں گے عرب ملکوں میں اسلام کو ایک بہت بڑے خطرے کا سامنا کرنا پڑے گا۔

واقعہ یہ ہے کہ آج کے تعلیم یافتہ اور مغربی علوم و فنون اور تہذیب و ثقافت سے متاثر عرب طبقوں کو پہلے کی طرح کا فقہی اسلام مطمئن نہیں کر سکتا۔ اور نہ آپ ان سے آج یہ منوا سکتے ہیں کہ قومیت فی نفسہ اور اس کے ساتھ ساتھ عرب قومیت بھی دین اسلام کے منافی ہے پس اس سے درگزرو۔ اور "اسلامی قومیت" اختیار کرو۔ اور وہ اس لئے کہ عرب قومیت اب ان کے ہاں ایک ٹھوس سیاسی حقیقت بن چکی

---

[1] رود کوثر ص ۵۵۶

ہے۔ اور اس سے انکار ٹھوس حقائق کا انکار کرنا ہے، اور اس کی آپ کسی عقلمند اور عملی زندگی سے تعلق رکھنے والے سے توقع نہیں کرسکتے۔

عربوں اور بالخصوص ان کے تعلیم یافتہ اصحاب کو یہ ایک بڑی آسانی ہے کہ وہ عربی زبان میں، جو کہ ان کی مادری زبان ہے، مہارت رکھنے کے علاوہ ایک نہ ایک مغربی زبان میں بھی دستگاہ رکھتے ہیں، اس لئے ان میں سے اہل بصیرت افراد سے امید کی جاسکتی ہے کہ اس وقت یورپی مادیت اور اشتمالیت کی طرف سے اسلام کو جو چیلنج درپیش ہے، وہ اس کا جواب دینے میں پیچھے نہیں رہیں گے۔ اور قرآن سنت اور دوسرے اسلامی علوم سے استفادہ کرکے جن تک کہ ان کی براہ راست رسائی ہو سکتی ہے، یورپی مادیت اور اشتمالیت کے مقابلے میں ایک بہتر نظام معاش واجتماع دیں گے، جو ان کا نعم البدل ہوگا، اور اسے اپنا کر عرب جمہور ان آنیوالے خطرات سے محفوظ رہیں گے۔

بے شک گزشتہ ڈیڑھ دو سو سال میں عرب دنیا میں متبحر علمائے اسلام کی کمی نہیں رہی لیکن جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے، ان ملکوں میں اہل علم کی توجہ زیادہ تر فقہ اور اس طرح کے دوسرے رسمی علوم کی طرف تھی۔ ان میں البتہ ہمیں خاص طور سے شیخ محمد عبدہ مصری کی ایک ایسی شخصیت نظر آتی ہے۔ جو اس پامال راہ پر نہیں چلے۔ انہوں نے اسلامی علم و فکر کو ایک نئی ڈگر پر ڈالا، اور اسلام کو وہ عمومیت اور ہمہ گیریت دینے کی کوشش کی، جن سے فکری جمود اور فقہی تقلید نے اسے ایک عرصہ دراز سے محروم کر رکھا تھا۔

مصر کی موجودہ مذہبی اصلاح کی تحریک کے بانی مبانی بھی شیخ محمد عبدہ تھے، لیکن شیخ محمد عبدہ کے ایک سوانح نگار کے الفاظ میں "مصر میں تحریک اصلاح کا اولیں جذبہ خود مصر کے اندر پیدا نہیں ہوا تھا۔ بلکہ سید جمال الدین افغانی کے اثرات و تعلیمات کا نتیجہ تھا۔" اور جہاں تک سید جمال الدین افغانی کا تعلق ہے اسی سوانح نگار کے الفاظ میں "وہ ایران اور افغانستان کے مختلف مقامات پر حصول تعلیم میں مصروف رہے۔ اٹھارہ برس کی عمر میں انہوں نے مسلمانوں کے تمام علوم بدرجہ اتم حاصل کرلئے۔ اور عربی صرف و نحو، علم اللسان، بلاغت اور اس کے تمام شعبوں۔ تصوف، منطق، فلسفہ، طبیعات، مابعد الطبیعات، ریاضی، ہیئت، طب، تشریح اعضا اور مختلف دوسرے علوم پر کماحقہ، حاوی ہو گئے۔" اور اس کے بعد

اٹھارہ سال کی عمر میں وہ ہندوستان آئے اور ڈیڑھ سال اس ملک میں رہے۔

مصر میں سید جمال الدین افغانی کے اثرات ان کے شاگردوں کے ذریعہ پھیلے، جن میں شیخ محمد عبدہٗ سب سے ممتاز تھے۔ اس سلسلے میں شیخ محمد عبدہ کا سوانح نگار لکھتا ہے کہ سید صاحب نے ان کو الہیات، فلسفہ، اصول فقہ، ہیئت اور تصوف کی انتہائی درسی کتابوں کا درس دینا شروع کر دیا" اور یہ کہ "قدامت پسند علماء علم و فن کے متعلق سید صاحب کے ترقی یافتہ خیالات کے مخالف تھے۔ خصوصاً درسِ فلسفہ کی تجدید کے بالکل روادار نہ تھے۔ کیونکہ ان کے نزدیک فلسفہ دین حق کا دشمن تھا۔ [۱]

سید جمال الدین افغانی کی اپنی غیر معمولی شخصیت سے قطع نظر، وہ علوم جن کے درس نے مصر میں مذہبی اصلاح و تجدید کی نیو ڈالی، اور شیخ محمد عبدہٗ نے اس پر اپنی دعوت کی عمارت اٹھائی، وہ تمام وہی علوم ہیں، جو شاہ ولی اللہ کی کتابوں میں بڑی منزہ اور اعلیٰ شکل میں موجود ہیں، اور فکر ولی اللہی اُن کا خلاصہ ہے۔ کیا ممکن نہیں، کہ آج خدا کا کوئی بندہ موجودہ فکری و مادی حالات کے پس منظر میں شاہ ولی اللہ کے اس فکر سے عرب دنیا کو متعارف کرائے۔ اور یورپی مادیت اور اشتمالیت کی طرف سے اسے اس وقت جو چیلنج درپیش ہے، اس کا مقابلہ کرنے کے لئے اس فکر سے استفادہ کرنا قابل عمل بنائے۔ ہمارے نزدیک اس نازک وقت میں فکر ولی اللہی ایک مشعل ہدایت کا کام دے سکتا ہے۔ اور اس سے وہی روشنی مل سکتی ہے۔ جو آج سے تقریباً ایک سو سال پہلے ایک اور ماحول میں سید جمال الدین افغانی کے درس و تدریس سے ملی تھی۔

فقہ، حدیث و سنت اور قرآن اِس فکر کی اساس ہے۔ تصوف اور حکمت و فلسفہ اس کا ایک جزو لاینفک ہے۔ عقائدٗ اعمال و احکام اور رسوم و شعائر کو ان کے مادی ماحول اور ان کے ماننے والوں کے تاریخی، نفسیاتی اور ذہنی پس منظر میں دیکھنا اس فکر کے ہاں ضروری

---

[۱] "اسلام اور تحریک تجدد مصر میں" از چارلس سی آدم - اردو ترجمہ

لازمی ہے - یہ زندگی میں ارتقا اور بقائے اصلح[1] کا قائل ہے - اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ وہ تمام شرائع الہیہ میں ایسے اصولوں کی نشان دہی کرتا ہے، جو پوری نوع انسانیت میں پائے جاتے ہیں اور شرعی احکام و عبادات کی وہ اسی نقطۂ نظر سے تشریح کرتا ہے - پھر وہ روحانی زندگی اور معاشی زندگی کو لازم و ملزوم قرار دیتا ہے، اور آخر الذکر کی ناہمواریوں کو مٹانا بھی لازمۂ نبوت ثابت کرتا ہے -

اسلام کو پوری انسانی تاریخ کے پس منظر میں دیکھنا اور اُسے انسانیت کا عملی مصداق ثابت کرنا فکر ولی اللہی کی امتیازی حیثیت ہے - اور آج مسلمانوں کے ہاں جو نظام اس اساس پر بنے گا، وہی اشتمالیت کا مقابلہ کرسکنے کی صلاحیت رکھتا ہے -

---

[1] جاننا چاہیئے کہ وہ اسباب جن کی بنا پر حسب عادتِ الٰہی قضاء و احکام وارد ہوتے ہیں، جب ان میں باہم تعارض ہو، اور ان کے تمام مقتضیات و دواعی مکمل نہ ہوں تو اس صورت میں حکمت الہیہ کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ اس چیز کی رعائت کی جائے، جو خیر مطلق اور خیر محض سے قریب تر ہو، اور یہی معنی ہیں لفظ میزان کے - جو ارشاد نبوی صلعم میں وارد ہوا ہے - آپؐ نے فرمایا بیدہ المیزان یرفع القسط و یخفضہ اور آیت کل یومِ ھو فی شانِ میں شان سے یہی مراد ہے -

...... باوجود اس کے کہ ہمارا علم محدود اور مختصر ہے .... ہم جانتے ہیں کہ عالم میں وہی چیز موجود ہوتی ہے اور وہی چیز وجود میں آتی ہے، جو وجود میں آنے کے زیادہ مستحق ہوتی ہے (حجۃ اللہ البالغہ اردو ترجمہ)

بات وہ دل نشیں کہی غیر بھی جس پہ مر مٹا
تیرے کمال کے مُقر ہیں سبھی شیخ و برہمن
جس کے جواب کے لئے دنگ ہے امت فرنگ
تو نے دیا ہے وہ ہمیں درس سیاست مدن

حکمت ولی اللّٰہی کے شارحین

مولانا عبدالحمید سواتی[1]

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے قرآن وسنت کی کلیات کو سامنے رکھ کر ایک ایسا فلسفہ ترتیب دیا ہے، جو نقل، عقل اور کشف تینوں پر جامع ہے، اور تینوں کو متوازی درجے میں رکھتا ہے۔ یہ جامعیت اور عمومیت شاہ ولی اللہ کے فلسفے کا خصوصی امتیاز ہے۔ عقلیات سے استدلال کرنا تو ہر دور میں فلاسفہ کا دستور رہا ہے لیکن عقل کے ساتھ نقل صحیح اور کشف مستقیم کو جگہ دینا یہ شاہ صاحب کا خاص کارنامہ ہے اسی طرح اگر صرف کشف کو ہی استدلال میں پیش کیا جائے، تو یہ بات بہت سے غیر مسلم صوفیہ میں بھی پائی جاتی ہے۔

لیکن کشف کو جب تک نقل صحیح کی کسوٹی پر نہ پرکھا جائے، وہ قابل اعتماد نہیں ہوگا۔ اب رہا عقل کا معاملہ، عقل سے تو کوئی طبقہ بھی خالی نہیں لیکن انسانی ترقی کے لئے صرف عقل کفایت نہیں کرتی حکمت ولی اللٰہی میں یہ بات بتائی گئی ہے کہ انسان کو صحیح ترقی اس وقت تک میسر نہیں ہوسکتی جب تک کہ اس کی خواہشات اور جذبات عقل کے تابع نہ ہوں اور اس کی عقل شریعت حقہ کے تابع نہ ہو، اسی طرح جو لوگ کشف صحیح کا سرے سے انکار کرتے ہیں وہ بھی علم کی ایک عظیم دولت سے محروم رہ جاتے ہیں

---

[1] - مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ (مغربی پاکستان) میں مدرس ہیں۔ حال ہی میں آپ نے حضرت شاہ رفیع الدین صاحب کے چند رسائل تصحیح و تحشیہ کے بعد شائع کئے ہیں۔

اور خشک قسم کی ظاہریت ان پر سوار رہتی ہے نیز بہت سے باطنی احوال و واقعات کی وہ کوئی صحیح توجیہہ نہیں کرسکتے۔

امام ولی اللہؒ نے اصل الاصول نقل صحیح (کتاب و سنت) کو قرار دیا ہے اور پھر عقل مستقیم اور کشف صحیح سے اس کی تائید و تشریح کا کام اس طرح لیا ہے کہ تمام باتیں اپنی اپنی جگہ صحیح بیٹھ جاتی ہیں۔ ان تینوں چیزوں کو شاہ صاحب نے اپنے فلسفہ میں اس طرح سمویا ہے کہ کسی دوسرے فیلسوف کے ہاں اس کی مثال نہیں ملتی اب شاہ ولی اللہ کا فلسفہ جتنا جامع ہے، اتنا وہ غامض بھی ہے آپ کے فلسفہ کی بعض باتیں تو یقیناً گذشتہ حکماء کی باتوں سے ملتی ہیں، لیکن آپ کے فلسفہ کا اکثر حصہ ایسا بھی ہے جو بالکل ایک نیا رنگ لئے ہوئے ہے اور یہ بڑا مشکل اور دقیق ہے اور اس کا غموض اس لئے بھی بڑھ گیا ہے کہ شاہ صاحب نے اپنے فلسفہ کو بیان کرنے میں ترتیب کو قائم نہیں رکھا اور پھر اسے اپنی مخصوص اصطلاحات میں بیان کیا ہے۔ چنانچہ وہ ایک بات کو ایک جگہ ایک نام سے پیش کرتے ہیں اور اسی بات کو دوسری کتاب یا دوسری جگہ میں دوسرے نام سے ذکر کرتے ہیں۔ اس مشکل کو حل کرنے کے لئے شاہ ولی اللہ کے فرزند شاہ رفیع الدینؒ نے بہت کام کیا ہے۔ اور اس سلسلے میں متعدد کتب اور رسائل تصنیف کئے ہیں، جو خاص اسی مقصد اور غرض کے لئے ہیں اسی طرح شاہ ولی اللہ کے حفیدِ شہید شاہ اسمعیل نے بھی کتاب "عبقات" میں ان مشکلات کو حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن عبقات خود اپنی جگہ اتنی آسان کتاب نہیں، جس سے کہ ہر شخص آسانی سے استفادہ کر سکے۔ عام اہل علم فلسفۂ ولی اللہی کو سمجھنے میں اس لئے دقت محسوس کرتے ہیں کہ شاہ صاحب نے اپنی تصنیفات میں عقلی و نقلی دلائل کے ساتھ اپنے کشف و مشاہدہ کو بھی وسیع پیمانے پر پیش کیا ہے چنانچہ تفہیمات الٰہیہ (یہ کتاب فی الواقع کشکول ولی اللہین ہے) میں شاہ صاحب نے اپنے فلسفہ کے طریق پر عقائد حقہ اور علم الکلام کو انہی تینوں قسم کے دلائل سے مبرھن فرمایا ہے۔ لیکن کشف کا پہلو اس میں زیادہ غالب ہے۔ اس کتاب میں شاہ صاحب نے تقریباً وہ تمام مسائل بیان کردیئے ہیں، جو متکلمین کے ہاں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ وہ مسائل جن تک متکلمین کی نظر و فکر

کی پہنچ نہیں ہو سکی، ان کو بھی شاہ صاحب نے بڑی خوبی سے بیان کیا ہے۔ اس کتاب کو کھول کر جب پڑھا جاتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان سمندر کے کنارے بیٹھا ہے جب کہ دوسرے متکلمین کی کتابوں کو دیکھنے کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ آپ کسی نہر یا ندی نالہ کے کنارے بیٹھے ہیں اس لئے عام اہل علم جو کشف سے مناسبت نہیں رکھتے، یا وہ لوگ جو ظاہریت پرستی کی بنا پر اس فن کا سرے سے ہی انکار کرتے ہیں، وہ اس قسم کی کتابوں میں کماحقہ دلچسپی نہیں رکھ سکتے اور نہ پوری طرح اس سے مستفید ہو سکتے ہیں۔

شاہ ولی اللہ کا فلسفہ مغربی علوم کے نقطہ نظر سے بھی بڑا اہم ہے کیونکہ مغربی علوم و فنون نے جہاں انسانی سوسائٹی میں مادی ترقی اور دنیوی خوشحالی کے سامان فراوانی سے پیدا کر دیئے ہیں کو ہاں اقلیم جان میں خاک بھی اڑادی ہے اور انسان کی روحانی ترقی کو بالکل ہی ختم کر دیا ہے۔ مغربیت نے الحاد اور بے دینی کا ایک سیل رواں جاری کر دیا ہے۔ اس سیلاب کو روکنے کے لئے اگر فی الواقع کوئی فلسفہ تریاق کا کام دے سکتا ہے تو وہ فلسفہ ولی اللہی ہے۔ یہ فلسفہ اتنا جاندار اور حقیقت کے قریب ہے کہ مغربی فلسفہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ شاہ صاحب کا فلسفہ (حکمت ولی اللہی) انسان کو ایمان یقین اور حقیقت کا مشاہدہ اور روحانی ترقی اور مادی دنیا میں بھی سکون دیتا ہے۔ برخلاف اس کے کہ مغربی فلسفہ انسان میں شکوک و شبہات کا ایک غیر متناہی سلسلہ پیدا کر دیتا ہے۔ جس کی وجہ ظاہر ہے کہ مغربی فلسفہ انسانی افکار و آرا سے ماخوذ ہے۔ خواہ اسکی قدامت کا رشتہ یونان کے فلاسفہ سے ملتا ہو، یا ہندی و ایرانی حکیموں سے، بہرحال انسانی افکار و آراء میں تضاد و اختلاف کا ہونا ایک بدیہی امر ہے۔ بالخصوص ایسے انسان جو کسی الہامی کتاب پر یقین ہی نہیں رکھتے۔ یا کوئی الہامی کتاب ان کے پاس موجود ہی نہ ہو اور نہ وہ اس سے روشناس ہوں کیونکہ وہ علم کے ایک قطعی اور یقینی ذریعے سے خالی ہوں گے۔ حضرت شاہ ولی اللہ کے فلسفہ کا ایک یہ بھی کمال ہے کہ وہ حکماء و عقلاء جن کے باتیں حقیقت سے قریب ہوں، ان کو انبیا علیہم الصلوٰۃ والسلام کی تعلیمات سے ہم آہنگ کر دیتے ہیں۔

فلسفہ ولی اللہی میں حیات انسانی کو مسلسل اور مربوط شکل میں تسلیم کیا گیا ہے، وہ حیات دنیوی

کو ایک اکائی مانتے ہیں اور زندگی کا تسلسل ان کے فلسفہ میں غیر منتہم ہے انسان صرف ایک منزل سے دوسری منزل کی طرف ترقی یا تنزل کی شکل میں منتقل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ دنیاوی حیات (مادی زندگی) اور پھر عالم برزخ اور عالم آخرت کی زندگی یہ ایک ہی زنجیر کی مختلف کڑیاں ہیں۔ شاہ صاحب کے فلسفہ میں انسان کو جو بلندیٔ فکر ملتی ہے، وہ کسی بھی دوسرے فلسفہ میں نہیں پائی جاتی

شاہ ولی اللہ نے علمی دنیا میں اپنے فلسفہ اور تعلیمات کے ذریعہ ایک ایسی جماعت تشکیل کی جو قرون اولیٰ کے مسلمانوں کا سا جذبۂ جہاد اور جوش ایمان رکھنے والی جماعت ثابت ہوئی اس سلسلہ میں سب سے پہلے شاہ صاحب نے اپنے مخصوص تلامذہ اور اپنے فرزندوں کو تعلیم و تربیت دی اور اس سلسلہ کو ان کے ذریعہ آگے بڑھایا۔ حقیقت یہ ہے کہ شاہ ولی اللہؒ کے خانوادہ نے علم و عمل کی دنیا میں عظیم انقلاب برپا کیا ہے۔ چنانچہ آج اس برصغیر میں علم و عمل کی جو شعاع بھی کہیں سے پھوٹتی ہوئی نظر آتی ہے، تو وہ اس جلیل القدر امام کے تجدیدی کارناموں کی برکات سے ہوگی۔ پاک و ہند میں اور اس کے علاوہ بعض دوسرے ممالک میں بھی آج کوئی عالم جو محقق اور راسخ فی العلم ہو یقیناً اسکا سلسلہ اس جلیل القدر امام تک ضرور منتہی ہوگا۔

شاہ ولی اللہ کے فلسفہ پر معرفت تامہ رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ آدمی عربی اور فارسی پر اچھا عبور رکھتا ہو قرآن اور حدیث، آثار صحابہ اور تابعین کا اسے وسیع مطالعہ ہو ادب عربی کے ساتھ ساتھ تاریخ اسلام پر اس کی نظر وافی ہو، فلسفہ یونانی اور علم منطق میں بھی مہارت رکھتا ہو۔ اور مذاہب کے اختلافات سے آگاہ ہو نیز علم الکلام سے اسے لگاؤ ہو۔ اور اس نے علوم و فنون میں مہارت کی وجہ سے کافی حد تک عقل مستفاد بہم کر لی ہو۔ چنانچہ شاہ ولی اللہؒ "الخیر الکثیر" کے شروع میں فرماتے ہیں۔

هٰذِهٖ علوم الحكمة التي من اوتيها فقد اوتي خيراً كثيرا والتي هي ضالة الحكيم فحيث وجدها فهو احق بها ومن لم يرزق الذهن الوقاد جبلة ولا الادراك الاشرف من التعقل كسباً فليكن من مطالعتها على حذر حاذر لئلا يخطئها

وانما هی حکمة ربانیة قدسیة

یہ اُس حکمت کے علوم ہیں کہ جسے وہ عطا ہوئی۔ اسے بہت بڑی بھلائی عطا کی گئی اور یہی حکیم کی گمشدہ چیز ہے، پس جہاں سے بھی وہ اسے ملے، وہ اس کا سب سے زیادہ حق دار ہے اور جس شخص کو فطرتاً تیز ذہن نہیں دیا گیا، اور اس کے حصے میں اعلیٰ درجے کا ادراک نہیں آیا ہے، جو عقل و فکر سے حاصل کیا جاتا ہے، تو ایسے شخص کو اس کے مطالعہ سے بچنا چاہیئے تاکہ (اپنی کم فہمی کی بنا پر) اس کو غلطی سے غلط محمول کر دے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ یہ ربانی اور قدسی حکمت ہے"

ظاہر ہے کہ اس قدر مشکل فلسفہ کی شرح و تفصیل کے لئے بھی ایسے لوگوں کی ضرورت ہے، جو ان علوم میں مہارت تامہ رکھتے ہوں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص فضل و کرم سے شاہ ولی اللہؒ کے فلسفہ اور ان کے علوم کی شرح و بسط اور تفہیم و تسہیل کے لئے ایسے لوگ پیدا کر دیئے جنہوں نے ان تمام علوم میں مہارت تامہ حاصل کرنے کے علاوہ خود شاہ ولی اللہ سے براہ راست استفادہ کیا تھا۔

فلسفہ ولی اللہی کے سب سے بڑے شارح شاہ صاحب کے بڑے فرزند شاہ عبدالعزیز ہیں۔ جنہوں نے بیشتر علوم و فنون تو خود شاہ ولی اللہ سے حاصل کئے اور باقی ماندہ علوم ان سے حاصل کئے جو شاہ ولی اللہ سے استفادہ کر چکے تھے۔ تحصیل و تکمیل کے بعد شاہ عبدالعزیزؒ عمر بھر علوم ولی اللہی کی نشر و اشاعت میں سعی فرماتے رہتے اور انہوں نے ان علوم میں دستگاہ رکھنے والے لوگ تیار کر دیئے۔ شاہ عبدالعزیزؒ کے تبحر علمی کا یہ عالم تھا جیسا کہ ملفوظات عزیزی میں خود ان کی زبان سے نقل کیا ہے۔ "جن علوم کا میں نے مطالعہ کیا ہے اور بقدر وسعت و طاقت مجھے یاد بھی ہیں، وہ ایک سو پچاس علم ہیں جن میں سے نصف تو وہ علوم ہیں جو گذشتہ امتوں اور قوموں نے تصنیف کئے، اور نصف وہ ہیں جن کو امت محمدیہ نے تصنیف کیا ہے" ظاہر ہے یہ جامعیت تو ہر شخص کو نصیب نہیں ہو سکتی اس لئے تقسیم کار کے اصول پر کام کیا گیا۔

شاہ ولی اللہ کے بارے میں شاہ عبدالعزیز فرماتے ہیں کہ والد نے ہر فن کے لئے الگ الگ آدمی تیار کئے تھے۔ اور ہر ایک کے سپرد الگ فن اور کام کیا تھا۔ اس کا ذکر خود شاہ ولی اللہ نے اپنی بعض تصانیف

میں کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ایک خاص احسان مجھ پر یہ بھی ہے کہ اس نے مجھے استعدادات نفوس انسانی کا علم عطا فرمایا ہے۔

علاوہ ازیں شاہ ولی اللہ اور ان کے پورے خاندان کا مشغلہ خاص طور پر علوم و فنون کی نشر و اشاعت اور تحقیق تھا۔ شاہ ولی اللہ نے اپنے اساتذہ کے بارے میں اپنے رسالہ "دانشمندی" میں لکھا ہے کہ میرے سلسلہ کے تمام اساتذہ محقق عالم تھے جن میں سے ہر ایک صاحب تصنیف و تحقیق تھا، البتہ اپنے والد گرامی شاہ عبدالرحیم کے متعلق لکھا ہے کہ ان کی توجہ تصنیف و تالیف کی طرف زیادہ نہ تھی بلکہ زیادہ توجہ سلوک و تربیت کی طرف فرماتے تھے۔ اگرچہ وہ خود محقق عالم تھے۔ مولوی بشیر الدین احمد صاحب نے "واقعات دہلی" میں لکھا ہے کہ "شاہ ولی اللہ کے چاروں صاحبزادوں نے تدریس کا وہی مشغلہ جاری رکھا اور تمام ہندوستان میں شہرت اور قبولیت عامہ حاصل کی اور آپ کے صاحبزادوں کے بعد شاہ اسحاق صاحب نے یہ سلسلہ برابر جاری رکھا اور یہ خدمت سرانجام دی" شاہ عبدالعزیز کی ولادت ۱۱۵۹ھ میں ہوئی اور اتفاق کی بات ہے کہ اپنے تمام چھوٹے بھائیوں کے بعد آپ کی وفات ۱۲۳۹ھ میں ہوئی ہے۔ اس طویل عرصہ میں آپ نے ہزاروں علماء اور فقہا اور مجاہدین اسلام تیار کر دیئے اور فلسفہ ولی اللہی کو اپنے درس، تصنیف، فتاویٰ اور وعظ و نصیحت کے ذریعہ عام کر دیا۔ خصوصاً تفسیر قرآن کریم میں اس فلسفہ کو اتنا سہل طریق پر پیش کر دیا۔ کہ عوام اہل علم بھی بخوبی اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

شاہ ولی اللہ کی حکمت اور فلسفہ کے دوسرے بڑے شارح اُن کے فرزند شاہ رفیع الدین ہیں، آپ کی ولادت ۱۱۶۳ھ میں ہوئی اور وفات ۷۰ سال کی عمر میں ۱۲۳۳ھ میں آپ نے اکثر علوم و فنون کی تحصیل اپنے والد گرامی سے کی لیکن کچھ علوم اپنے بڑے بھائی شاہ عبدالعزیز سے پڑھے تھے۔ جب کہ آپ کے والد وفات پا چکے تھے۔ آپ کو علوم دینیہ اور فنون عقلیہ میں مجتہدانہ کمال حاصل تھا۔ آپ کو ہر فن کے ساتھ ایک خاص قسم کی مناسبت تھی اور خدا نے حافظہ اور ذہن بھی بلا کا عطا فرمایا تھا۔ ہر فن میں آپ یکتا معلوم ہوتے تھے۔ آپ کا علم و فضل اور تبحر علمی، متانت و سنجیدگی، راستبازی، انصاف پسندی، بے طمعی، تواضع انکساری حلم و بردباری بے مثال تھی اور بقول صاحب "حیات ولی" کمالات ظاہری کے ساتھ فیض باطن کا یہ حال

تھا کہ اگر حضرت جنیدؒ اور حسن بصریؒ بھی آپ کے زمانہ مبارک میں ہوتے تو آپ کے پاک اور پُرجوش ولولے کو دیکھ کر یقیناً تحسین و آفرین فرماتے، آپ میں توکل استقلال جُود و کرم حد درجہ موجود تھا۔ گویا جامۂ بشریت میں فرشتہ خصلت تھے۔ عربی زبان و ادب میں بھی آپ کو کمال حاصل تھا۔ شاہ ولی اللہ کے فرزندان گرامی سب ہی ممتاز تھے۔ لیکن ذہانت و متانت کے لحاظ سے خصوصاً شاہ عبدالعزیزؒ اور شاہ رفیع الدین کو اللہ تعالیٰ نے خاص کمال عطا فرمایا تھا۔

شیخ محسنؒ نے شاہ رفیع الدین کی خصوصیات کے ذیل میں لکھا ہے کہ آپ کو موجودہ رائج الوقت علوم کے علاوہ علوم الاوائل میں بھی بڑی مہارت حاصل تھی اور یہ بات کم ہی لوگوں میں پائی جاتی ہے اور دوسری خصوصیت آپ کی اختصار پسندی تھی۔ آپ تھوڑے سے الفاظ میں بڑے بڑے مطالب ادا کر دیتے تھے چنانچہ آپ کی یہ عادت آپ کی تمام تصانیف میں عیاں ہے۔ جو کتابیں بھی آپ نے تصنیف کی ہیں یا فتاویٰ اور مضامین لکھے ہیں، ان سب میں اختصار کو ملحوظ رکھا ہے اور اسی اختصار کی بنا پر شیخ محسن نے لکھا ہے کہ آپ کی باتوں پر کم لوگ ہی اطلاع پاتے ہیں کیونکہ آپ کی کتابوں میں بکثرت رموز خفیہ درج ہیں۔

موصوف لکھتے ہیں کہ "شاہ رفیع الدین بہت ہی پختہ کار اور محقق عالم تھے اور اپنے بہت سے معاصرین سے فائق تھے۔ انہیں مروجہ علوم کے علاوہ پہلے لوگوں کے علوم سے بھی بہرہ وافر ملا تھا اور واقفیت تامہ حاصل تھی اور یہ چیز کم ہی اہل علم کو نصیب ہوئی ہے آپکی تصانیف بہت ہی عمدہ ہیں جن میں سے بعض کے دیکھنے کا مجھے اتفاق ہوا ہے۔" اور پھر لکھتے ہیں کہ اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کو علوم میں کس قدر گہرائی اور رسوخ حاصل تھا اور آپ کی نظر کس قدر دور رس اور بالغ تھی۔"

شاہ رفیع الدین نے بہت سی کتابیں تصنیف کی ہیں، یہاں ہم ان کی کتابوں کی ایک اجمالی

۱؎ شاہ رفیع الدینؒ کی کتابوں کا تعارف بقدر ضرورت ہم نے مقدمہ مجموعہ رسائل اور مقدمہ تفسیر آیت النور اور مقدمہ اسرار المحبۃ میں کرا دیا ہے ان تینوں کتابوں کی طباعت کا اہتمام ادارہ نشر و اشاعت مدرسہ نصرت العلوم گوجرانوالہ نے کیا ہے۔

سی فہرست درج کرتے ہیں اور بعض کتابوں کے بارے میں کچھ ضروری باتیں بھی لکھ دیتے ہیں:۔

ترجمہ قرآن کریم:۔ قرآن مجید کا اردو زبان میں شاہ رفیع الدین نے تحت اللفظ نہایت ہی آسان زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ اس ترجمہ کی بہت سی خوبیاں ہیں۔ مثلاً یہ ترجمہ بہت سہل ہے اور عوام جن کی تعلیم بہت کم ہوتی ہے، وہ اس سے بآسانی استفادہ کرسکتے ہیں جس طرح شاہ ولی اللہ نے فارسی زبان میں قرآن کا آسان ترجمہ کیا ہے، اس طرح شاہ رفیع الدین نے اس کا اردو زبان میں آسان ترجمہ کیا ہے۔ صاحب "حیات ولی" اس ترجمے کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "قرآن کا لفظی ترجمہ آپ ہی نے کیا ہے جو دریائے جمنا سے لیکر فرات تک نہایت مقبولیت کے ساتھ پھیلا ہوا ہے اور جس سے عامہ خلائق مستفیض ہو رہی ہے۔"

شاہ رفیع الدینؒ کی طرح آپ کے چھوٹے بھائی شاہ عبدالقادرؒ نے بھی قرآن پاک کا ترجمہ کیا ہے یہ بامحاورہ ترجمہ ہے جس کی خوبی تمام اہل علم نے تسلیم کی ہے اور جس کی مثال اردو زبان پیش کرنے سے عاجز ہے۔ اصل میں شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر نے اپنے والد کے کام کی تکمیل کی ہے۔ جیسا کہ خود شاہ عبدالقادر نے لکھا ہے۔

> "یہ کلام پاک خدا تعالیٰ کا عربی زبان میں ہے، ہندوستانیوں کو اس کا سمجھنا بہت مشکل ہے اس واسطے اس بندہ عاجز عبدالقادر کے خیال میں آیا کہ جس طرح ہمارے بابا (والد) صاحب بہت بڑے حضرت (بڑے بزرگ) شیخ ولی اللہؒ (جو حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب کے بیٹے۔ سب حدیثیں جاننے والے (حافظ الحدیث الحجۃ الحاکمۃ) ہندوستان کے رہنے والے نے فارسی زبان میں قرآن کے معنی آسان کرکے لکھے ہیں اسی طرح عاجز (شاہ عبدالقادر) نے ہندی زبان (اردو) میں قرآن شریف کے معنی لکھے ہیں۔ الحمدللہ کہ یہ آرزو بارہ سو پانچ ہجری میں حاصل ہوئی (موضح القرآن)

اس سے واضح ہوتا ہے کہ ان حضرات کا اصل مقصد اور غرض ان تراجم سے کیا تھی۔ اسی طرح شاہ عبدالعزیز نے اس مقصد کو اپنی مشہور تفسیر (تفسیر عزیزی) میں پورا کیا۔ شاہ عبدالعزیزؒ کی یہ فارسی تفسیر

علوم ولی اللہی کو سامنے رکھ کر اور ان کی تفہیم کے لئے لکھی گئی ہے بلکہ اس کا کمال یہ ہے کہ اس سے کم علم والے لوگ بھی فلسفہ ولی اللہی سے مانوس ہو گئے ہیں، امام المحدثین حضرت علامہ انور شاہ کشمیری قدس سرہ نے مشکلات القرآن میں تحریر فرمایا ہے کہ "اگر یہ تفسیر عزیزی مکمل ہو جاتی تو پھر کہہ سکتے تھے کہ تفسیر کا حق ادا ہو چکا ہے" افسوس کہ یہ تفسیر مکمل نہ ہو سکی لیکن بعض علماء کا خیال ہے کہ اس تفسیر کے بہت سے حصے مکمل ہو چکے تھے لیکن جنگ آزادی یا ہنگامہ ۱۸۵۷ میں اسکے بہت سے حصے ضائع ہو گئے جس طرح اور بھی بہت سے علمی ذخیرے اس طوفان کی نذر ہو گئے تھے۔ اب صرف اس تفسیر کا ابتدائی حصہ اور آخری دو پاروں کی تفسیر ملتی ہے۔ یہ بھی بہت غنیمت ہے۔

مورخ اسلام اکبر شاہ خان مرحوم نے اپنی ایک کتاب میں لکھا ہے کہ "اگر مجھ سے کوئی دریافت کرے کہ سب سے عمدہ ترجمہ قرآن کا کون سا ہے تو میں بلا تکلف کہوں گا کہ شاہ رفیع الدینؒ کا ترجمہ اور اگر مجھ سے تفسیر کے بارے میں دریافت کیا جائے تو میں کہونگا کہ عمدہ تفسیر "موضح القرآن ہے" اور پھر اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ جس قدر انسان قرآن کریم کے الفاظ سے دور ہوتا چلا جائیگا اسی قدر مشکلات زیادہ پیدا ہوتی چلی جائینگی، اب لفظی ترجمہ اور مختصر تفسیر جو جامع مانع ہو، دونوں کے علاوہ موجود نہیں۔

شاہ رفیع الدین نے ترجمۃ القرآن کے علاوہ جو کتابیں تصنیف کی ہیں، ان میں سے اکثر کتابیں اور رسائل ایسے ہیں جن سے امام ولی اللہیؒ کے فلسفہ کی تسہیل و تقریب مدنظر ہے۔ چنانچہ اس بارے میں خود شاہ رفیع الدین نے صراحت فرمائی ہے۔ تفسیر آیت النور میں لکھتے ہیں کہ "ثم لوالدیؒ اصول و اصطلاحات متفررۃ علی مسلک ادق واشمل" یعنی ہمارے والد کے خاص اصول اور اصطلاحات ہیں، جو نہایت ہی دقیق اور سب سے زیادہ جامع مسلک پر مبنی ہیں جو دوسرے حکماء کے مسلک سے بہرحال بہت ہی وسیع اور جامع ہے

اور اسی طرح تکمیل الاذہان کے فن تحصیل میں تحریر فرماتے ہیں کہ "اقول بتدوین العلوم غلب فی تحصیل المجھولات التعلم علی التفکر، ولم یکن لہ قانون۔ فدوّن والدی العارف الواصل النحریر الکامل الشیخ ولی اللہ بن المحقق المقرب الشیخ عبدالرحیم العمری

لمزاولتہ الکتب تعلیماً ضوابط" یعنی علوم کی تدوین کے سلسلہ میں مجہولات کو حاصل کرنے کے لئے تعلیم کا طریقہ تفکر کے طریقے پر غالب ہے۔ اور اس کے لئے کوئی قانون موجود نہیں تھا۔ اس لئے میرے والد نے کتابوں سے استفادہ کرنے کے لئے قواعد و ضوابط مقرر کئے۔ اور اس کے بعد یہ بھی لکھا ہے کہ میں نے اس سلسلہ میں کچھ اضافات کئے ہیں۔ کیونکہ فنون تلاحقِ افکار سے تکمیل پاتے ہیں۔

شاہ رفیع الدین اپنی مختلف تصانیف میں شاہ ولی اللہ کی کتابوں اور ان کے فلسفہ کی مشکلات کو نہایت ہی حکیمانہ طریق پر حل کرتے ہیں اور ان کے بارے میں کئے گئے شکوک و شبہات کو رفع کرتے اور ان کے مقاصد و مطالب کو بیان فرماتے ہیں۔

فلسفہ ولی اللہی کے ایک مسلّم ماہر مولانا عبیداللہ سندھی لکھتے ہیں:- "خواص کے لئے امام ولی اللہ کے فلسفہ کی تشریح میں مولانا رفیع الدین نے اسرار المحبتہ اور تکمیل الاذہان کے مختلف رسائل لکھے۔ حملتہ العرش کی تحقیق میں ان کا ایک رسالہ اس قدر اعلیٰ فکر دیتا ہے کہ امام عبدالعزیز نے وہ اپنی تفسیر میں نقل کر دیا ہے۔ ایسا ہی تفسیر آیت النور میں ان کا رسالہ بے نظیر ہے" (حزب امام ولی اللہ دہلوی کی اجمالی تاریخ کا مقدمہ)

مختلف تذکرہ نگاروں نے شاہ رفیع الدین کی کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً نزھتہ الخواطر۔ حدایق الحنفیہ، الیانع الجنی اور ابجد العلوم وغیرہ میں ان کی کتابوں کی فہرست دی گئی ہے۔ اس میں اسرار المحبتہ، تفسیر آیت النور، دفع الباطل، (یہ علم الحقائق و معارف، اور سلوک و تصوف پر مشتمل ہے) اور رسالہ فی علم العروض۔ رسالہ مقدمتہ العلم۔ رسالہ فی التاریخ۔ رسالہ فی اثبات شق القمر، رسالہ فی تحقیق الالوان۔ رسالہ فی آثار القیامتہ۔ (علامات قیامت یا قیامت نامہ) رسالہ فی الحجاب۔ رسالہ فی برہان التمانع۔ رسالہ فی عقد الانامل۔ رسالہ شرح چہل کاف۔ رسالہ فی المنطق۔ رسالہ فی الامور العامتہ۔ حاشیہ میر زاہد رسالہ۔ تکمیل الصناعتہ۔ (صاحب نزھتہ الخواطر نے تکمیل الصناعت کا ذکر کیا ہے، غالباً مراد تکمیل الاذھان ہے واللہ اعلم) تخمیس علی بعض القصائد لوالدہ۔ قصیدہ عینیہ فی رد شیخ ابو علی سینا۔

ان کے علاوہ راہ نجات اردو، تفسیر رفیعی، جو سورہ البقرۃ کی تفسیر ہے۔ تنبیہ الغافلین۔ قصیدہ معراجیہ اور تکمیل الاذہان میں خود شاہ رفیع الدین نے اپنی ایک اہم کتاب الدر الدراری کا ذکر کیا ہے۔
رسالہ فی تحقیق الفاظ الاذان (فارسی)، رسالہ فوائد عامہ (فارسی)، رسالہ حملۃ العرش (فارسی)، رسالہ شرح رباعیات (فارسی)، رسالہ بیعت (فارسی)، رسالہ برہان العاشقین (فارسی)، رسالہ نذر بزرگان (فارسی) رسالہ جوابات سوالات اثنا عشر۔ فتاوی فارسی۔

صاحب نزہۃ الخواطر نے شاہ رفیع الدین کی کچھ کتابوں کے نام ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے۔ "ولہ غیر ذالک من المؤلفات الجیدۃ"۔ یعنی ان کے علاوہ بھی شاہ رفیع الدین صاحب کی بہت سی عمدہ کتابیں ہیں۔

امام ولی اللہ کے فلسفہ کے تیسرے بڑے شارح شاہ اسمٰعیل شہید ہیں۔ ولی اللہی فلسفہ چونکہ ادق اور مشکل تھا اور ساتھ ہی جامع اور مشتمل بھی، اس لئے اسکی شرح و بسط اور توضیح و تفصیل کے لئے اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے آپ کے خاندان کے برگزیدہ افراد پیدا کر دیئے جو غیر معمولی درجہ کے جامع اور محقق علماء تھے جن کا ظاہر و باطن اور علم و عمل ہر بات ممتاز تھی۔
شاہ اسمٰعیل شہیدؒ نے اپنے جد امجد شاہ ولی اللہ کو افضل المحققین کے ممتاز لقب سے یاد کیا اور ان کے فلسفہ کو حل کرنے کے لئے بطور اصول موضوعہ کے اپنی معرکتہ الآرا کتاب عبقات تصنیف فرمائی۔ اس کتاب کی اہمیت کو محقق علماء جان سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ نے صراط مستقیم (فارسی) ایضاح الحق۔ رسالہ اصول فقہ۔ منصب امامت۔ تقویۃ الایمان۔ یکروزی اور تنویر العینین وغیرہ کتابیں لکھی ہیں۔

شاہ شہید نے عبقات لکھ کر امام ولی اللہ کے فلسفہ کے لئے خصوصاً اور علم الحقائق اور تصوف سلوک کے لئے عموماً بنیادی قواعد وضع فرمائے ہیں۔ اسی طرح حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے بعض رسائل مرتب کئے ہیں، جنہیں پڑھنے کے بعد فلسفہ ولی اللہی کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔ اس ضمن میں مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

"سرسید کے زمانہ میں حزب شاہ ولی کے باقی ماندہ لوگوں میں سے ایک حکیم پیدا ہوا۔ جس کا نام مولانا محمد قاسم نانوتوی تھا۔ وہ مدرسہ دیوبند کے بانی اور علوم اسلامیہ کے ازسرنو اشاعت کرنیوالے تھے لیکن آپ کے دماغ میں سیاسی مخالفت کی تلخی نے گنجائش نہیں چھوڑی تھی کہ آپ یورپین سائنس پہ غور کرتے۔ تاہم اس میں شک نہیں کہ آپ شاہ ولی اللہ کے سکول کے بہترین ترجمان تھے۔ اور آپ نے اپنے شاگردوں کی ایک کافی تعداد چھوڑی۔ آج ہندوستان (پاک و ہند) کی مذہبی علمی قوت کا اچھا بقیہ وہی لوگ ہیں۔ جو اپنے آپ کو شاہ ولی اللہ صاحب سے مربوط جانتے ہیں۔" موجودہ دور میں ایک ذہین مجاہد قسم کے محقق عالم یعنی امام الانقلاب حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ فلسفہ ولی اللہی کے بہترین شارح تھے۔ انہوں نے عمر کا اکثر حصہ گو برطانوی استعمار کے خلاف جہاد میں صرف کیا۔ لیکن اساسی طور پر آپ فلسفہ ولی اللہی کے بہترین محقق اور معلم تھے۔ اس سلسلہ میں آپ نے قرآن کریم کی تفسیر جسکو آپ کے تلامذہ نے آپ سے املا کی شکل میں حاصل کیا ہے۔ اس کے علاوہ مختلف تصانیف جو اردو اور عربی زبان میں آپ نے چھوڑی ہیں۔ اگر ان سے استفادہ کیا جائے تو امام ولی اللہ کے فلسفہ سے بخوبی استفادہ ہو سکتا ہے۔ لیکن مقام افسوس ہے کہ مولانا سندھیؒ کی بہت سی کتابیں ابھی تک مسودات کی شکل میں پڑی ہوئی ہیں اور طباعت تک ان کی نوبت ہی نہیں آئی۔ خصوصاً کتاب التمہید فی ائمۃ التجدید تو بہت ہی گراں قدر تالیف ہے۔

آج دفاعی نقطہ نظر سے امام ولی اللہ کا فلسفہ بڑی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ جس طرح اسلامی تعلیم کو عام کرنا امت کا اہم فریضہ ہے۔ اسی طرح اسلام کا دفاع بھی ضروری ہے۔ دفاع سے اگر غفلت اور کوتاہی اختیار کی گئی تو پھر اسلامی تعلیمات کو بچانا مشکل ہے۔ موجودہ دور چونکہ سائنس کے عروج کا دور ہے اور عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ موجودہ دور کے شکوک و شبہات بھی وزنی اور سنگین ہیں۔ اس دور میں اسلام میں شکوک و شبہات پیدا کرنے والی طاقتوں کا تجزیہ اور ان کا مقابلہ بہت ضروری ہے اور اسی میں شاہ ولی اللہ کی حکمت و فلسفہ سب سے زیادہ مددگار و معاون ہو سکتا ہے۔

امام ولی اللہ کے فلسفہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ جو لوگ صرف خانقاہی زندگی پر قناعت کرتے

ہیں اور اس کو وہ خالص اسلام سمجھتے ہیں۔ ایسے لوگ دراصل اسلام کو گوشۂ عافیت بنانا چاہتے ہیں۔ لیکن کبھی بھی ایسے لوگ معیاری مسلمان نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ جو لوگ اسلام کے نصب العین کو دنیا میں غالب کرنے کے لئے جہاد پر آمادہ نہیں ہوتے وہ قطعی طور پر منافق ہیں۔

امام ولی اللہ کے فلسفہ میں بنیادی طور پر اصل اصول قرآن و سُنت کو قرار دے کر للّٰہیت اور خدا پرستی اور روحانی ترقی حاصل کرنا اور اصلاحِ عالم یعنی بنی نوع انسان کی خدمت، طبقات امت میں توازن قائم کرنا۔ غرباء و مساکین کی پرورش لازمی جُز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ نیز شہنشاہیت کو ختم کرنا اور اسلامی نصب العین کی خاطر علی وجہ البصیرۃ قربانی دینا رسومات ضارہ یعنی سوسائٹی کو نقصان پہنچانیوالی بُری رسموں کو ختم کرنا۔ اور رسومات صالحہ کا اِجرا، اور تعظیم شعائر اللہ وغیرہ شامل ہیں۔ شاہ ولی اللہ نے تربیت اور اصلاح کے لئے جو صورتیں اختیار کی ہیں یا ائمہ ولی اللہین نے جن کے مطابق کام کیا ہے۔ ان کو اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ درس و تدریس

۲۔ تالیف و تصنیف

۳۔ تصوف اور سلوک کے طریق کے مطابق ریاضتوں سے تربیت

۴۔ وعظ و نصیحت سے اصلاح و تلقین

۵۔ علمی دفاع یعنی مباحثہ و مناظرہ سے اسلام کے حقائق کو ثابت کرنا۔ اور مخالفینِ اسلام طاقتوں کا دفاع کرنا۔

۶۔ فتاویٰ کا اجراء۔ یہ حوادثات میں ہوتا ہے۔

۷۔ مکاتیب اور مراسلات کے ذریعہ اصلاح

۸۔ جہاد۔

شاہ ولی اللہؒ کے فلسفہ کو عام کرنے والے اور آپ کے طریق کار پر کام کرنیوالی شخصیتوں میں آپ کے چاروں فرزند اور آپ کے شاگرد و رفیق شاہ محمد عاشق حضرت سیّد احمد شہیدؒ آپ کے حفید شہید

شاہ محمد اسحاق، مفتی صدرالدین۔ مولانا رشید الدین۔ مفتی الٰہی بخش کاندھلوی۔ مولانا عبدالحی داماد شاہ عبدالعزیز، شاہ غلام علی۔ مولانا مملوک علی۔ شاہ عبدالغنی مجددی۔ مولانا رشید احمد گنگوہی۔ مولانا محمد قاسم۔ مولانا شیخ الہند۔ مولانا سید انور شاہ۔ مولانا شبیر احمد عثمانی۔ مولانا حسین احمد مدنی۔ مولانا سندھی۔ مولانا احمد علی لاہوری رحمتہ اللہ علیہم وغیرہ حضرات کے اسمائے گرامی پیش کئے جا سکتے ہیں۔

حضرت مولانا شیخ الہند نے اسلام کی طرف سے دفاع کی ضرورت کی شدت کو محسوس کرتے ہوئے بہت عرصہ پہلے شاہ ولی اللہ اور مولانا محمد قاسم کی کتابوں کو نصاب تعلیم میں داخل کرنے کا فیصلہ کیا تھا چنانچہ وہ فرماتے ہیں۔

اب طالبان حقائق اور حامیان اسلام کی خدمت میں ہماری یہ درخواست ہے کہ تائید احکام اسلام اور مدافعت فلسفہ جدیدہ و قدیمہ کے لئے جو تدبیریں کی جاتی ہیں ان کو سامنے رکھ کر حضرت خاتم العلماء مولانا محمد قاسم کے رسائل کے مطالعہ میں بھی کچھ وقت ضرور صرف فرمادیں۔ اور پورے غور سے کام لیں۔ اور انصاف سے دیکھیں کہ ضروریات موجودہ زمانہ حال کے لئے وہ سب تدابیر سے فائق اور عمدہ اور بہتر ہیں یا نہیں، اور مختصر اور مفید ہیں یا نہیں، اہل فہم اس کا تجربہ کچھ تو کرلیں۔ میرا کچھ عرض کرنا دعوی بلا دلیل سمجھ کر غیر معتبر ہوگا۔ اس لئے زیادہ عرض کرنے سے معذور ہوں۔ اہل فہم خود موازنہ اور تجربہ فرمانے میں کوشش کرکے فیصلہ کرلیں۔ باقی خدام مدرسہ عالیہ دیوبند نے تو یہ تہیہ بنام خدا کرلیا ہے کہ تالیفات موصوفہ مع بعض تالیفات حضرت شاہ ولی اللہؒ وغیرہ تصحیح اور کسی قدر توضیح وتسہیل کے ساتھ عمدہ چھاپ کر اور نصاب تعلیم میں داخل کرکے ان کی ترویج میں اگر حق تعالیٰ توفیق دے تو جان توڑ کر ہر طرح سعی کی جائے اور اللہ تعالیٰ کا فضل حامی ہو۔ وہ نفع جو اُن کے ذہن میں ہے اوروں کو بھی اس کے جمال سے کامیاب کیا جائے۔" (مقدمہ حجتہ الاسلام)

واللہ یقول الحق وھو یہدی السبیل

افکار و آرا

۱۴۰ سال پہلے تحریک ولی اللہی مدراس میں

مدراس یونیورسٹی کے شعبۂ عربی و فارسی و اردو کے ریڈر جناب محمد یوسف کوکن عمری نے جنوبی ہند کے ایک مشہور و معروف علمی و دینی خاندان "خانوادہ قاضی بدرالدولہ" کا تذکرہ مرتب کیا ہے۔ اس خاندان کے آباؤ اجداد نویں صدی ہجری میں بصرے سے آئے تھے۔ اور شروع سے لیکر اب تک برابر اس خاندان میں بڑے بڑے اہل علم و قلم پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ دورِ آخر میں قاضی بدرالدولہ جن کا سن وفات ۱۲۸۰ھ ہے، اس تاریخی خاندان کے مشہور فرد تھے۔ کتاب میں ان کا تذکرہ تفصیل سے کیا گیا ہے۔

اتفاق سے انہی دنوں مجھے پروفیسر محمد یوسف صاحب کی اس تصنیف کو پڑھنے کا موقع ملا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آج سے کوئی ۱۳۰ سال قبل تحریک ولی اللہی کی صدائے بازگشت برصغیر پاک و ہند کے اس دور دراز کونے تک بھی پہنچی تھی۔ جس کا ردّ عمل بعض لحاظ سے تو اچھا ہوا۔ اور افسوس ہے کہ اس کے بعض پہلو ناخوشگواری کا موجب بنے میں اس بارے میں کتاب مذکور کے کچھ اقتباسات پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

بارہویں صدی ہجری کے اواخر سے تیرہویں صدی ہجری کے وسط تک جزیرہ عرب میں "وہابیوں" اور عثمانی سلطنت کے درمیان جنگیں ہوتی رہیں، مصنف لکھتے ہیں کہ مدراس کے لوگ ان سے ناآشنا نہیں تھے۔ نواب کرناٹک کے شریف مکہ کے ساتھ بڑے گہرے روابط تھے اور دونوں ایک دوسرے کو خطوط لکھا کرتے تھے، اس طرح مصنف کے الفاظ میں "وہابی تحریک اور ان کے ساتھ لڑائیوں کی خبریں

برابر مدراس پہنچ رہی تھیں۔ ان کے عقائد و خیالات سے یہاں کے علماء کو سخت اختلاف تھا۔ مولوی باقر آگاہ نے فارسی میں "وہابیت" کی تردید میں ایک رسالہ بھی لکھا تھا۔ "وہابیت" اور "وہابیوں" کے مختصر تذکرہ کے بعد پروفیسر محمد یوسف لکھتے ہیں:۔

"ایک طرف عربستان میں یہ حالات پیش آرہے تھے، تو دوسری طرف ہندوستان میں ایک نئی تحریکِ جہاد شروع ہوئی، جس کو لوگوں نے غلطی سے تحریک وہابیت کا نتیجہ سمجھا، حالانکہ اس کو وہابیت سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا چونکہ دعوت ولی اللہ میں دونوں گروہوں کا طریقۂ فکر ایک طرح کا تھا۔ اور دوسرے یہ کہ سید احمد مجاہد بریلوی، مولانا شاہ اسمٰعیل شہید اور مولانا عبدالحیؒ نے ۱۲۳۸ھ میں حج بیت اللہ ادا کیا تھا۔ اس لئے ہندوستان کے عام علماء نے ان لوگوں کو وہابیت سے متاثر سمجھ کر اس نئی تحریکِ جہاد کی جو در حقیقت انگریزوں اور سکھوں کے خلاف قائم کی تھی، مخالفت شروع کر لی تھی" اس کے بعد مصنف شاہ ولی اللہ، شاہ عبدالعزیز، سید احمد شہید، شاہ اسمٰعیل شہید اور تحریک ولی اللہی کے بعض دوسرے بزرگوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"حضرت شاہ اسمٰعیل شہید نے اتباعِ کتاب و سنت اور توحیدِ خالص کی تائید میں کئی کتابیں لکھی تھی، جن میں سے تنویر العینین، صراط مستقیم اور تقویت الایمان بہت مشہور ہیں۔ علم تصوف کے متعلق عبقات کے نام سے ایک مشہور کتاب لکھی ہے۔ ان کی یہ تمام کتابیں بڑی تیزی کے ساتھ ہندستان کے گوشے گوشے میں پھیل گئی تھیں۔ ان کی زندگی میں یہ کتابیں مدراس پہنچ چکی تھیں۔"

شاہ اسمٰعیل شہید کی ان کتابوں کے علاوہ اس زمانے میں اس تحریک کے ایک مبلغ بھی مدراس پہنچے، ان کا ذکر اب مصنف کی زبان سے ملاحظہ ہو۔

"سید صاحب (سید احمد شہید) کے خلفاء میں حضرت شاہ اسمٰعیل شہید کے علاوہ دو شخص ایسے تھے کہ جن کو اللہ تعالےٰ نے غیر معمولی علم و فضل کے ساتھ طلاقت لسانی کی نعمت سے بھی سرفراز کیا تھا۔ یہ دونوں شخص مولانا عبدالحی داماد حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی اور سید محمد علی واعظ رامپوری تھے۔ ان کے مواعظ اتنے دلچسپ، دل کش اور ایمان افروز ہوتے تھے کہ لوگ خود بخود ان کی طرف کھچ کر

چلے آتے تھے۔ اور پھر ان کے ہاتھوں پر اپنے گناہوں سے توبہ کر لیتے تھے۔"

اس کے بعد مصنف نے سید محمد علی واعظ رامپوری کا تذکرہ تفصیل سے کیا ہے۔ لکھتے ہیں :-

"وہ ماہ محرم ۱۲۵۴ھ کی ابتدا میں مدراس تشریف لائے۔ ۱۸ محرم کو نواب عظیم جاہ سے ملاقات کی نواب صاحب نے ان کے لئے کھانے وغیرہ کے سات تورے بھیجے۔ انہوں نے چند دن تک مدرسۂ کلاں مدراس میں جس کو نواب محمد علی والا جاہ نے قائم کیا تھا، سکونت اختیار کی۔ اس کے بعد جام بازار ٹریلیکین مدراس کے سامنے اس گھر میں مقیم ہوئے، جہاں آج مسجد امیر النساء بیگم بنی ہوئی ہے۔[1]

ان کے ایک دو وعظ ہوتے تھے کہ ہر طرف سے انہیں وعظ کہنے کے لئے مدعو کیا جانے لگا۔ وہ ہر جگہ نئے انداز سے اتباعِ کتاب و سنت اور ردِّ شرک و بدعت پر وعظ کہتے جارہے تھے۔ بیشمار آدمی ان کی مجلس وعظ میں شریک ہوتے تھے۔ اور اختتام پر ان سے ملاقات کرتے تھے۔ اور بعض ان کے ہاتھ پر اپنے گناہوں سے توبہ کرتے تھے۔"

مدراس میں سید محمد علی واعظ رامپوری کے ان مواعظ کی تاثیر کا یہ عالم تھا کہ مصنف لکھتے ہیں: "امراء و عمائدینِ شہر رقص و سرود اور لہو لعب کی محفلوں میں سرمست تھے۔ ان لوگوں نے ان کی شہرت سنی تو محض آزمانے کی خاطر ان کی مجلس میں شریک ہوتے تھے۔ ان کے وعظ کا ان پر اتنا اثر ہوتا تھا کہ وہ خود بخود اُن کے پاس پہنچکر ان کے مرید ہو جاتے تھے۔ چنانچہ سید جواہر حسین خاں قلعدار ویلور نے ان کے ہاتھ پر توبہ کر لی۔ کئی گویوں اور سازندوں نے اپنا پیشہ ترک کر دیا۔ مدراس کے محلہ چنتادری پٹ میں شیخ علی نامی ایک لعل بند رہتا تھا۔ وہ شراب کا بڑا عادی تھا۔ جب اس نے سید موصوف کا وعظ سنا تو خدمت میں حاضر ہو کر اس شرط پر بیعت کر لی کہ اسے شراب پینے کی اجازت ہوگی، مگر بیعت کے بعد

---

[1] - یہ مسجد ۱۲۵۳ھ میں بنی تھی۔ کسی نے اس کی ایک دلچسپ تاریخ لکھی تھی۔

امیر النساء مسجدِ خوب ساخت	بہ منزل گہ آں مبارک ولی
بگفتا خرد بہرِ تاریخ آں	فیوضِ قدومِ محمد علی

اس نے خود ہی شراب چھوڑ دی۔"

اور تو اور سید محمد علی کے وعظوں کا ہندوؤں پر بھی اثر ہونے لگا۔ چنانچہ اس ضمن میں مصنف لکھتے ہیں:۔

"ایک مرتبہ راجہ ٹیکم چند بہادر[۱] ان کی مجلس وعظ میں شریک تھے اور جب سید صاحب کی تقریر بہت زوروں سے ہونے لگی، تو انہوں نے اپنے کان بند کر لئے۔ انہوں نے ایسا محسوس کیا کہ گویا دین اسلام کی خوبیاں ان کے کانوں سے ان کے دل و دماغ میں اترتی جا رہی ہیں۔"

آپ کا وعظ و ارشاد کا یہ سلسلہ کئی ماہ تک جاری رہا۔ اس دوران میں اس کے جو اثرات ہوئے، ان کا ایک اجمالی خاکہ پروفیسر محمد یوسف کے الفاظ میں سنئے۔

"مدراس میں خان عالم خاں فاروق کی ایک نمایاں حیثیت تھی۔ وہ مشہور امیر جان جہاں خاں بہادر کے فرزند اور نواب غلام اعزالدین خاں بہادر مستقیم جنگ نامی المتوفی ۱۲۰۴ھ کے داماد تھے، عربی، فارسی، ترکی اور انگریزی میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ فارسی اور اردو کے بہترین شاعر تھے۔ فاروق تخلص کیا کرتے تھے۔ نامی اور ظفری سے اصلاح لی تھی اس کے ساتھ ساتھ موسیقی کے شیفتہ اور دلدادہ تھے۔ اس فن میں پوری مہارت پیدا کی تھی۔ ہزاروں روپے کے خرچ سے بہترین سے بہترین آلات موسیقی جمع کئے تھے۔ دوستوں کا ایک بہت وسیع حلقہ تھا۔ رقص و سرود کی مجلسیں قائم ہوتیں۔۔۔۔ ابتدا میں فاروق نے سید محمد علی کو ایک سالوسی پیر سمجھا، مگر جب ایک مرتبہ ان کے وعظ کو سننے کا موقع نصیب ہوا، تو اچانک ان کے دل و دماغ کی تمام کھڑکیاں کھل گئیں۔۔۔۔ انہوں نے فوراً سید محمد علی کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ اور گھر پہنچ کر آلات موسیقی توڑنے لگے۔ خان عالم خاں کے دونوں لڑکوں اور دونوں لڑکیوں نے بھی جن میں سے ایک بعد میں نواب عظیم جاہ سے بیاہی گئی تھی۔ سید موصوف کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ فاروق کی سوتیلی والدہ بھی ان کی مریدہ ہو گئیں۔

اس واقعہ کے بعد سے یہ حالت ہو گئی تھی کہ سید محمد علی جس کسی محفل میں پہنچ جاتے تھے، فوراً

---

[۱] یہ دربار والا جاہی میں منشی کی خدمت پر مامور تھے۔

رقص و سرود بند کر دیا جاتا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ مغرب کی نماز کے وقت نواب عظیم جاہ کی قیام گاہ پر پہنچے، تو ان کے تمام ساتھی بکھر گئے۔ اور نواب صاحب نے دست بستہ سید صاحب کا استقبال کیا، وہ کچھ دیر تک بیٹھ کر نصیحت آمیز گفتگو کرتے رہے۔ اور اس کے بعد وہاں سے چلے گئے۔

مدراس میں ولی اللہی تحریک کی یہ دعوت بتدریج پھیلتی گئی اور اس کا دائرہ برابر وسیع ہوتا گیا، یہاں تک کے مصنف کے الفاظ ہیں:۔ "مدراس کی بہت سی مستورات نے بھی سید صاحب کے ہاتھ پر بیعت کر لی تھی۔ ان میں نواب محمد علی والا جاہ مرحوم کی وہ بیوی بھی تھی، جو محمد اسمٰعیل شیر جنگ کی والدہ تھیں۔ الغرض سید صاحب کی بدولت مدراس، ارکاٹ، ویلور اور دوسرے مقامات کے بہت سے لوگ غیر شرعی امور سے تائب ہو کر ان کے مرید ہو گئے تھے۔ اس وقت کسی کو بھی وہم و گمان نہیں تھا کہ وہ وہابیت کی تبلیغ میں مصروف ہیں۔"

سید محمد علی واعظ رامپوری کی اس دعوت کا اثر اتنا بڑھا کہ مصنف لکھتے ھیں

"نواب عظیم جاہ نے ان کی اتنی عزت اور قدر کی تھی کہ جب وہ ۱۲ ذی قعدہ ۱۲۵۵ھ کو مدراس سے کلکتہ روانہ ہونے لگے تو نواب موصوف نے انہیں دو ہزار روپیہ اور ایک عمدہ خلعت بھی عنایت کی تھی۔"

قاضی بدرالدولہ کے بڑے بھائی مولوی عبدالوہاب مدارالامراء نے اسی تاریخ کے تحت اپنے روزنامچہ میں لکھا ہے۔

"مولوی میر محمد علی واعظ کہ عذب البیان وے بسیار از مردم ہدایت یافتند روانہ کلکتہ شدند۔ دو ہزار روپیہ و خلاع از سرکار عنایت شد۔"

بدقسمتی سے تحریک ولی اللہی کی یہ ہردلعزیزی اور اس کا اثر و رسوخ دیر پا ثابت نہ ہوا، اور اس کے خلاف وہ طوفان اٹھا کہ ۱۲۷۱ھ میں جب خان عالم خاں کا انتقال ہوا، تو چونکہ وہ آخر وقت تک اپنے مسلک پر قائم رہے تھے، تو سوائے ان کے خاص دوستوں اور رشتہ داروں کے کوئی شخص بھی ان کی نماز جنازہ میں شریک نہ ہوا، اور کسی نے ان کے متعلق حسب ذیل تاریخ لکھی۔

بروا بلیس از رہِ تلبیس دین وایماں خاں عالم خاں

مصنف کتاب نے یہ سارے واقعات بڑی تفصیل سے لکھے ہیں۔ اور اس سلسلے میں جو فتوے دیئے گئے اور عوام کو جس طرح مشتعل کیا گیا۔ اس ساری داستان کو بیان کیا ہے۔ چنانچہ جب ۱۲۵۱ھ میں سید محمد علی واپس مدراس آئے، تو ان کے بارے میں "شہر مدراس کے چیف مجسٹریٹ کے پاس پہنچکر اسے یہ سمجھایا گیا کہ سید محمد علی کی طرف سے شہر میں دنگے اور فساد کا خطرہ لگا ہوا ہے، بہتر ہے کہ انہیں مدراس سے روانہ کر دیا جائے۔" چنانچہ انہیں مدراس سے چلے جانے کے احکام دیئے گئے۔

یہ سب کچھ کیوں ہوا؟ پروفیسر محمد یوسف مصنفِ کتاب ہی کے الفاظ میں سنئے۔

حضرت سیّد احمد مجاہد شہید اور حضرت اسمٰعیل شہید اور ان کے دوسرے رفقا نے ۲۴ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ بالاکوٹ پنجاب کے معرکے میں شہادت پائی۔ تو قصداً ہر جگہ ان کے متعلق غلط فہمیاں پھیلائی جانے لگیں۔ کبھی تو یہ کہا جانے لگا کہ یہ سب مجاہدین درحقیقت محمد بن عبدالوہاب نجدی کے پیرو ہیں اور کبھی یہ الزام دیا جاتا تھا کہ ان کے دلوں میں ذرہ بھر بھی حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہٖ وسلّم اور دیگر انبیاء واولیاء کی حیثیت کو گھٹا دیتے ہیں کہ نعوذ باللہ عام آدمیوں بلکہ جانوروں سے بھی کم تر قرار دیتے ہیں۔ اُن کے اِن خیالات کے ثبوت میں عام علمائے مقلدین حضرت شاہ اسمٰعیل شہید کی تقویۃ الایمان، مولوی ولایت علی عظیم آبادی کی ردِّ شرک اور مولوی خرم علی بلہوری کی نصیحت المسلمین سے عبارتیں پیش کر رہے تھے۔ زیادہ تر اعتراض تقویۃ الایمان پر تھا۔ جس کی بعض عبارتیں تنقیص شانِ نبوی کی مُوہم تھیں۔"

اس پر اتنی شورش برپا ہوئی اور اس نے ایک ایسے زبردست فتنے کی شکل اختیار کر لی کہ باوجود اس کے کہ سید محمد علی نے ۱۲۵۱ھ کی مسجد والاجاہی مدراس میں اپنے عقائد کا اعلان کیا۔ نیز وہابی عقائد و خیالات سے برأت کی، لیکن ان کی مخالفت کم نہ ہوئی، اور ان سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ مولوی اسمٰعیل اور مولوی ولایت علی وغیرہ کے صریح کفر کا اعلان کریں، جس کے لئے وہ ہرگز آمادہ نہیں تھے" چنانچہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہی نواب عظیم جاہ جو پہلے سید محمد علی کے عقیدت مند تھے، انہوں

نے اعلان کیا کہ جو کوئی سید محمد علی واعظ رامپوری کی ارادت اور بیعت سے توبہ نہ کرے، اس کو سرکاری ملازمت سے برطرف کردیا جائے گا۔

اس پر بس نہیں کیا گیا، بلکہ تین دن بعد ۱۱ ذی قعدہ ۱۲۵۱ھ کو سید واعظ موصوف کے کفر کا فتویٰ دیا گیا۔ اور ان کو واجب القتل قرار دیا گیا۔۔۔ اور چونکہ نواب صاحب کو کسی کے قتل کرنے کے اختیارات نہیں تھے، اس لئے مجبور ہو کر ایک دوسرا اشتہار نامہ لکھا گیا

ان واقعات کی ابھی اور تفصیل ہے جو مصنف نے اس کتاب میں دی ہے۔ لیکن میں ان اقتباسات کو یہیں ختم کرتا ہوں۔ اس امید کے ساتھ کہ یہ افسوس ناک واقعات ہم سب کے لئے عبرت کا سامان ہوں گے۔ اور ہم سب اس سے سبق لیں گے۔ ایک اصلاحی دینی تحریک جسے شروع میں عوام نے کس طرح لبیک کہا، اور اس سے عملاً کتنے اچھے نتائج نکلے آگے چل کر اس نے کیا صورت اختیار کرلی اور عوام اس سے کس قدر برافروختہ ہوگئے، یا برافروختہ کردیئے گئے، اس پر اس تحریک کے حامیوں اور جو اس سے متفق نہیں دونوں کو آج کے حالات میں ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیئے، اور خود مصنف نے بھی ان بحثوں کے متعلق یہی لکھا ہے۔

"ان مسائل میں علماء کے خیالات کبھی متفق نہیں رہے ہیں۔ نقطۂ نظر کا ہمیشہ سے اختلاف رہا ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ ان بحثوں کو پڑھ کر اپنے لئے عمدہ ہدایت کی راہ پیدا کریں۔"

ضیاء

ایک استفسار

تاریخی اور بڑی شخصیتوں کو ماننے والے عام طور سے دو طبقوں میں بٹے ہوئے ہوتے ہیں۔ ایک طبقہ کسی بڑی شخصیت کو بغیر کسی علمی واسطے کے از خود اپنانے کی کوشش کرتا ہے اور اس میں وہ تمام تر اپنی ذاتی رائے کو ذریعہ بناتا ہے۔ چنانچہ یہ طبقہ اس شخصیت کے افکار و نظریات کی اپنی سمجھ اور مزاج کے مطابق توجیہ کرتا ہے، اور اسے اس قالب میں ڈھالتا ہے جو اس کو مرغوب ہوتا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جیسے جیسے وقت گزرتا ہے اور وہ بڑی شخصیت تاریخی لحاظ سے دور ہوتی جاتی ہے، اس کے افکار و نظریات میں تغیر و تبدل ہوتا چلا جاتا

ہے اور ہر بعد میں آنے والا ان کی اپنی تعبیر و توجیہ کرتا ہے۔ مثال کے طور پر اس طبقے کی ایک نسل اس شخصیت کو ایک رنگ میں دیکھتی ہے اور اس کے افکار و نظریات کو اپنے مخصوص معنی پہناتی ہے، اور اس کے بعد جو نسل آتی ہے، اس کا اس شخصیت اور اس کے افکار و نظریات کے متعلق بالکل دوسرا نقطۂ نظر ہوتا ہے، وہ اسے اور شکل میں پیش کرتی ہے، اس سے نہ صرف اس شخصیت کا صحیح مقام اور اس کی اصلی دعوت مبہم ہو کر رہ جاتی ہے، بلکہ بڑی شخصیت اور اس کے ماننے والوں کے درمیان وہ فکری تسلسل نہیں رہتا، جو ذہنی توازن کے لئے ضروری ہوتا ہے، جس سے انسان فکری انتشار سے محفوظ رہتا ہے۔ اور جذباتی لحاظ سے ماننے والے اس شخصیت سے وابستہ رہتے ہیں

ایک بڑی شخصیت کو براہ راست اور علمی واسطے کے بغیر ماننے کا مدّعی یہ طبقہ بالعموم ان افراد پر مشتمل ہوتا ہے، جو اس شخصیت کے افکار و نظریات کو اپنے من ملنے معنی پہنا کر خود اپنے آپ کو آگے کرنا چاہتے ہیں، اور ان کے پیش نظر اپنا وقار قائم کرنا ہوتا ہے۔ جب اس پر اہل علم کی طرف سے ان کی گرفت ہوتی ہے، تو ان کا یہ جواب ہوتا ہے کہ بے شک اصل افکار و نظریات تو اسی شخصیت کے ہیں، ہم نے البتہ ان کی عام فہم زبان میں تشریح کی ہے، لیکن عوام کے سامنے ان کا موقف دوسرا ہوتا ہے۔ وہ اپنی توجیہ اور تفسیر کو ایک مستقل حیثیت دیتے ہیں اور خود صاحبِ دعوت بن جاتے ہیں۔ اس طرح بڑی شخصیت کا مقام اس کا فلسفہ اور اس کے افکار و نظریات تو ثانوی درجہ پر آجاتے ہیں اور ان کی اپنی شخصیت مقدم ہو جاتی ہے۔

کسی بڑی شخصیت کو ماننے والوں کا دوسرا طبقہ وہ ہوتا ہے، جو اس شخصیت اور اس کے افکار و نظریات کو ان علمی واسطوں کے ذریعہ مانتا ہے جن سے اس تک اس شخصیت کے افکار نظریات پہنچے ہوں۔ وہ ان علمی واسطوں کے ذریعہ اس بڑی شخصیت سے تاریخی، ذہنی اور جذباتی تسلسل قائم رکھنے کی کوشش کرتا ہے، اور اس طرح اس کے افکار و نظریات سے رُشد و ہدایت حاصل کر کے عملی زندگی میں انہیں شمع راہ بناتا ہے۔ یہ سلسلہ نسلاً بعد نسل چلا جاتا ہے۔ چنانچہ بڑی شخصیت کے افکار و خیالات میں تحریف بھی نہیں ہو پاتی۔ اور ان سے استفادہ کرنے والوں کے ہاں ساتھ

ساتھ فکری ارتقاء بھی ہوتا رہتا ہے۔ اس کے نتیجے میں اس طبقے کا فکر و عمل ایک مسلسل تحریک کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ جس کے آگے بڑھنے کے بڑے مواقع ہوتے ہیں۔ غرضیکہ اس طرح بڑی شخصیت کا اصل فلسفہ، اس کے نظریات اور تعلیم ہمیشہ کے لئے ان قدروں کی شکل میں محفوظ ہو جاتی ہے جو اس کے پیش نظر تھی، اور بعد میں آنیوالوں کی توجیہات و تشریحات اس شخصیت کی اصل تعلیم کو مسخ نہیں کر سکتیں۔

اس تمہید کے بعد میں شاہ ولی اللہ اکیڈمی کے ارباب اختیار سے ایک استفسار کرنا چاہتا ہوں، اور وہ یہ کہ آپ نے اس اکیڈمی کے ذریعہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیمات اور ان کے فلسفہ و حکمت کی نشر و اشاعت کا بیڑا اٹھایا ہے۔ ایک ماہنامہ کا اجرا کیا گیا ہے، اور اس موضوع پر کتابیں لکھوانے اور چھپوانے کا ارادہ بھی ہے اس ضمن میں عرض یہ ہے کہ کیا شاہ ولی اللہ اکیڈمی حضرت شاہ ولی اللہ تک بلا کسی علمی واسطے کے پہنچنا چاہتی ہے، یا وہ اس میں کسی واسطے کو مانتی ہے۔ اور اگر وہ مانتی ہے، تو وہ کون سا علمی واسطہ ہے ہمجھے یہ استفسار کرنیکی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی ہے کہ آج حضرت شاہ صاحب کے نام سے بہت سے لوگ بہت سی باتیں کہہ رہے ہیں۔ اگرچہ آزادی رائے کے اس زمانے میں ہم کسی پر اس بارے میں کوئی پابندی نہیں لگا سکتے۔ لیکن جہاں تک شاہ ولی اللہ اکیڈمی کا تعلق ہے، اگر وہ فکر ولی اللہی کی نشر و اشاعت میں اپنی ایک سمت معین کرے، اور ان علمی واسطوں کو اپنے سامنے رکھے جن کے ذریعہ شاہ صاحب کو سمجھنا اور دوسروں کو انہیں سمجھانا چاہتی ہے، تو اس کا کام قدرے آسان ہو جائیگا۔ اور اس سے قوم و ملک کو زیادہ فائدہ بھی پہنچے گا۔ (الراقم ظہیر الحق دین پوری - خان پور)

تعمیری پہلو سامنے رکھئے

مکرمی ....

ماہنامہ الرحیم پڑھا...... اس وقت ابتدائی منزل میں شاہ صاحب کا تعارف حکیمانہ طرز پر کرانا چاہیئے۔ جس طرح کہ حکیم کسی عمومی اختلافی بحث میں حصہ لیکر رائے عامہ کو اپنے خلاف کرنا پسند نہیں کرتا۔ اس ابتدائی دور میں لکھنے والوں کو یہ خیال رکھنا چاہیئے کہ شاہ صاحب کے افکار اور نظریات کے اس حصے کو بیان کریں جس میں تعمیری پہلو زیادہ پایا جائے۔ اور ان مسائل کو عام کریں، جو عوامی ضروریات سے قریبی تعلق رکھتے ہوں۔ تاکہ رائے عامہ اس کے حق میں ہو جائے۔

شاہ صاحب کے نظریات اور افکار کو عوام تک پہنچانے کی کوشش کا واحد مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ اس ترقی یافتہ مادی دور میں مذہب کو انسان اپنی طبعی ضرورت سمجھ کر اپنا سکے اور یہ ولی اللہی نظریات کو سمجھے بغیر میسر نہیں آسکتا۔ شاہ صاحب میں بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ سیاسیات، معاشیات اور اجتماعی اخلاق کو اسلامی قدروں پر عقلی دلائل سے اس طرح واضح کرتے ہیں کہ انسان انہیں اپنے ضمیر کی آواز سمجھنے لگ جاتا ہے مذہب اور سیاست ایک ہو جاتے ہیں۔ اکیڈمی کو اپنی علمی سرگرمیوں میں خاص طور سے یہ چیزیں سامنے رکھنی چاہئیں۔　　　ایک قاری - از بہاولپور

تنقید و تبصرہ

شاہ ولی اللہ کی تعلیم

از پروفیسر غلام حسین جلبانی - ایم - اے
صدر شعبہ عربی، سندھ یونیورسٹی - حیدرآباد - پاکستان

زیر نظر کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں حضرت شاہ ولی اللہ کی تعلیم" تمام تر ان کی کتابوں کے حوالوں سے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اور اس سلسلے میں قابل ذکر بات یہ ہے کہ مصنف کے پیش نظر شاہ صاحب کی تقریباً تمام تصنیفات تھیں۔ جن کے نام کتاب کے آخر میں مندرج ہیں۔ دوران بحث میں مصنف نے جہاں بھی حضرت شاہ صاحب کی کسی کتاب کا حوالہ دیا ہے حاشیے میں اس کتاب کی اصل عبارت عربی یا فارسی میں درج کردی ہے۔

کتاب کے شروع میں نہایت اختصار سے شاہ ولی اللہ کے حالات کا ذکر ہے۔ اس کے بعد کے باب کا عنوان قرآن ہے۔ پھر حدیث، فقہ، تصوف، نبوت، شریعت، سیاست، ارتفاقات، اور فلسفہ کے ابواب آتے ہیں۔ ایک باب میں "متفرقات" کے عنوان سے امام مہدی، افضلیت شیخین، اثنا عشری خلفا، اور انشقاق قمر کے مسائل کا ذکر ہے، جن میں حضرت شاہ صاحب کا نقطۂ نظر دوسروں سے قدرے مختلف ہے۔ کتاب کا اختتام "حرف آخر" سے ہوتا ہے جس کا آغاز مصنف ان الفاظ سے کرتے ہیں۔

"شاہ ولی اللہ کی تصانیف میں بعض مقامات پر ہمیں اختلاف بھی نظر آتا ہے۔ یہ اختلافِ عبارت، جس کا خود شاہ صاحب کو بھی اعتراف ہے۔ دراصل آپ کی طبیعت کی جامعیت کا نتیجہ ہے،... ہماری رائے میں اسلامی تعلیم کو پیش کرنے کا جو طریقہ حضرت شاہ ولی اللہ نے اختیار کیا تھا، وہ صحیح ہے، خود ایک جگہ یوں اشارہ فرماتے ہیں۔ اگر لوگ بنظر غائر شریعت کے متعلق میری تفسیر ملاحظہ فرمائیں تو وہ بخوبی جان لیں گے کہ یہ عقل، نقل اور وجدان پر پوری اترتی ہے۔ نیز باہمی اختلاف کے لئے ذرا بھی گنجائش نہیں رہتی۔"

شاہ صاحب کی تعلیم کی جو خصوصیت ہے، مصنف نے چند الفاظ میں اسے بیان کردیا ہے۔ یہ خصوصیت ہے ان کی جامعیت اور اسلام کی ایسی تعبیر، جو عقل، نقل اور وجدان پر پوری اترتی ہے۔ اور اس میں باہمی اختلاف کی ذرا بھی گنجائش نہیں۔ اسلامی تعلیم کو اس طرح پیش کرنے میں شاہ صاحب کیوں کامیاب ہوئے۔ اس بارے میں مصنف لکھتے ہیں:۔ "قصہ دراصل یوں ہے کہ شریعت کی تجدید اور تاویل میں حالات کو بڑا دخل ہے۔ مثلاً اگر حالات اس کی تفہیم عقل و برہان کے ذریعہ چاہیں، تو اس کی تفہیم بھی اسی طریقے سے کی جاتی ہے۔ اور شاہ صاحب اپنی قوم کی حالت اور ملک کے تقاضے سے کماحقہٗ واقف تھے۔

اس ضمن میں مصنف نے ان لوگوں کو متنبہ کیا ہے، جو شاہ صاحب کی تعلیم کو مسلمانوں میں باہمی انتشار کا سبب

بناتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

"شاہ صاحب آئے ہی اسی لئے تھے کہ اتفاق اور اتحاد کو قائم کریں۔ منتشر مسلمین کی شیرازہ بندی کریں چنانچہ ہر وہ عمل جس کا نتیجہ مسلمانوں کا انتشار ہو، ان کے نزدیک غیر مقبول اور مذموم قرار پائے گا اتفاق اور اتحاد کے سلسلے میں جو خدمت شاہ صاحب نے انجام دی ہے وہ با علم حضرات سے مخفی و مستور نہیں۔"

باب "قرآن" میں مصنف نے بڑی تفصیل سے مطالعۂ قرآن کے متعلق شاہ صاحب کے جو خصوصی مباحث ہیں، ان پر تبصرہ کیا ہے اور اس بارے میں شاہ صاحب کے اجتہادات بیان کئے ہیں اس باب کا لب لباب مصنف نے ان الفاظ میں کیا ہے:۔ امام امام ولی اللہ کے نزدیک صحیح علم وہ ہے جو حال کے تقاضے اور ضروریات پوری کرے۔ ان کا فرمانا ہے کہ یہ صرف قرآن ہی ہے جو زمانے کا ہم رکاب ہے اور اس کے تقاضے پورے کرتا ہے۔ اگر کوئی موجودہ زمانے کی تحصیل کرنا چاہتا ہے تو اسکے لئے ضروری ہے، کہ وہ قرآن کے واضح اور ظاہر کو پکڑے اور حتی الامکان تاویل سے دور رہے۔

نیچے حاشیے میں مصنف شاہ صاحب کی دو عبارتیں نقل کرتے ہیں۔ ایک تفہیمات الہیہ جلد ثانی صفحہ ۱۶۶ ۔ اور دوسری تفہیمات الہیہ جلد اوّل صفحہ ۳۷ سے ہے اور وہ بالترتیب یہ ہیں۔

اِنّ العلم الحق عندنا ما کان بمشاکلۃِ الحال والقرآن الّذی ھو اعظم العلوم عندنا واجتّھا واجلھا انّما منزل بمشاکلۃ الحال۔

من اراد تحصیل ھذہ الدورۃ فعلیہ ان یَقرءَ القرآن بوضحہ

مطالعۂ قرآن کے سلسلے میں شاہ صاحب کا ایک اجتہادی کارنامہ قرآن میں علوم پنجگانہ کی تحقیق ہے مصنف نے اس پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ وہ الفوز الکبیر کی ایک عبارت کا مفہوم یوں پیش کرتے ہیں:۔

"مندرجہ بالا علوم کی تفہیم قدیم عربوں کی روش کے مطابق کی گئی ہے۔ اور اس میں متاخرین کا اصول اختیار نہیں کیا گیا۔ جس کی رو سے مضمون میں اختصار، ترتیب اور ربط کا خیال رکھا جاتا ہے خدا تعالیٰ نے جس بات کو لوگوں کے لئے مفید سمجھا اس کو اسی وقت بیان کر دیا۔ اسی لئے قرآن کا اسلوب توریت اور انجیل سے مختلف ہے اور اس میں تقدیم و تاخیر کا کوئی خیال نہیں رکھا گیا ہے ۔۔۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ قرآن پاک کے نزول کا اصل مقصد صرف انسانی قلوب کا تزکیہ اور لوگوں کے باطل عقائد اور برائیوں کی تردید کرنا تھا۔"

باب "حدیث" میں شاہ صاحب نے احادیث کی جو درجہ بندی کی ہے، پہلے تو اس کا ذکر ہے اس کے بعد شاہ صاحب کے ہاں مؤطا امام مالک کو جو اس قدر ترجیح دی گئی ہے۔ اس پر بحث ہے نیز شاہ صاحب نے مختلف احادیث میں تعارض اور اختلاف کو جس طرح رفع کیا ہے اس کی مثالیں دی گئی ہیں۔ موطا کے ضمن میں مصنف لکھتے ہیں کہ شاہ صاحب نے ایک جگہ تو یہانتک فرمایا ہے۔ طالب علم جب عربی سمجھنے کے قابل ہو جائے، تو اسے موطا پڑھائی جائے کہیں ایسا نہ ہو وہ موطا کے پڑھنے سے محروم ہی رہ جائے۔ کیونکہ یہ علم حدیث کی صحیح اور اصل بنیاد ہے، جس کے مطالعہ میں سعادت بھی ہے اور برکت بھی

آگے چل کر آپ فرماتے ہیں کہ اب مجھے یہ بات یقین سے معلوم ہو چکی ہے کہ موطا کے بغیر موجودہ دور میں اجتہاد کا دروازہ بند ہے۔

شاہ صاحب نے علم حدیث کی جو خدمت کی ہے، اسے خراج تحسین پیش کرتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں کہ اس کے لئے برصغیر آپ کا ہمیشہ مرہون منت رہے گا۔ موصوف نے شاہ صاحب کے متعلق علامہ الشریف عبدالحیٰ کا یہ قول نقل کیا ہے۔

"شاہ صاحب مثل　ایک طوبیٰ درخت کے تھے، جس کی جڑیں اپنے گھر میں اور شاخیں امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے گھروں میں تھیں۔"

فقہ کی اصلاح و تجدید کے سلسلے میں شاہ صاحب کی تعلیم کا ایک نمایاں پہلو مصنف کے الفاظ میں یہ تھا: "فقہ میں جامد تقلید کی شاہ صاحب نے شدید مذمت کی ہے۔ اور تقلید کے ضمن میں ارباب فقہ کے غلو کو توڑنے کی کوشش کی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ فقہی جمود کو اجتہاد میں تبدیل کرنے کے لئے کوشاں تھے۔"

اس ضمن میں مصنف نے بالکل ٹھیک لکھا ہے کہ فقہی جمود کی شاہ صاحب نے جو اتنی مخالفت کی ہے، تو اس کے یہ معنی نہیں کہ "وہ تقلید سے بالکلیہ منحرف تھے" بلکہ ان کے خیال میں "عام انسانوں کی فلاح و بہبود بڑی حد تک اس بات پر موقوف اور منحصر ہے کہ وہ چار مذاہب کی پیروی کریں" البتہ پروفیسر جلبانی صاحب کے نزدیک امام ولی اللہ کی یہ دلی آرزو تھی کہ چاروں مذاہب میں باہم پائے جانے والے تنازعات ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہوں۔ آپ نے ان کے باہمی اختلاف مٹانے اور ان کے متضاد اقوال میں موافقت پیدا کرنے کے سلسلے میں ایک قابل ذکر کردار انجام دیا ہے" چنانچہ آپ کا یہ مشورہ تھا حنفی اور شافعی مذاہب کو ملا کر ایک کر دیا جائے۔ شاہ صاحب کی رائے تھی کہ اس سلسلے میں امام مالک کی تصنیف، موطا ثالث اور حَکَم کے فرائض انجام دینے کی مکمل صلاحیت رکھتی ہے۔ تصوف تو شاہ صاحب کا خصوصی موضوع ہے ہی۔ اور اسے اسلام سے ہم آہنگ کرنے میں انہوں نے جو کوششیں فرمایئں　ان کا سب کو اعتراف ہے۔ شاہ صاحب کا یہ جملہ تصوف کے متعلق ان کے نقطہ نظر کی پوری وضاحت کرتا ہے: "جہاں تک تصوف کی اساسی روح کا تعلق ہے، تو یہ کہنا کافی ہوگا وہ آنحضرت صلعم کے زمانے میں موجود تھی لیکن ذرا قدرے مختلف شکل میں، اور موجودہ نام سے ابھی موسوم نہیں ہوئی تھی۔"

مصنف نے تصوف کے بارے میں وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے جو دو مذاہب ہیں ان پر بحث کی ہے۔ اور شاہ صاحب نے دونوں کے ظاہری اختلاف کو جس طرح رفع کیا ہے، اسے بیان کیا ہے آپ کے نزدیک دونوں مذاہب کے مابین کوئی معقول فرق نہیں، صرف لفظی نزاع ہے اور بقول مصنف۔ "اس مسئلے کو مثال کے طور پر یوں سمجھنا چاہیئے کہ ہماری کائنات حقیقت کے سورج کیلئے ایک آئینہ کی مانند ہے۔ کبھی تو ہم آئینہ میں منعکس سورج کی عکس کو سورج کہتے ہیں اور یہ وحدت الوجود کی عینیت کا تصور ہے اور کبھی یوں کہتے ہیں کہ یہ آفتاب جسے ہم آئینہ میں دیکھ رہے ہیں، اصل آفتاب کا عکس ہے، جو بہت دور اور بعید الحصول ہے اور یہ وحدت الوجود کی دوائیرت کا تصور ہے"

اس سلسلے میں پروفیسر جلبانی لکھتے ہیں۔

"شاہ صاحب کا خیال ہے کہ ابن عربی میں یہ دونوں تصورات پائے جاتے ہیں۔ اور یہ دونوں اپنی اپنی جگہ بالکل درست ہیں۔ وحدت الوجود اور وحدت الشہود کی اس طرح تشریح فرما کر شاہ صاحب نے نہایت

فن کارانہ ہوش مندی سے آریائی اور سامی اذہان کو ایک نقطۂ اتصال پر جمع کیا ہے سامی ذہن (ملل حنیفی) ذات باری تعالیٰ کو منزہ اور مجرد مانتا ہے اور مظاہر فطرت سے باہر تصور کرتا ہے۔ جب کہ آریائی ذہن (صابی) اس کے وجود کو کسی مظہر میں دیکھنے کا قائل ہے۔ اور مظاہر فطرت میں ذات باری کو جلوہ افروز سمجھتا ہے۔ ذات باری کا تعلق مظاہر کائنات کیساتھ بعینہٖ وہی ہے، جو روح کا جسم سے ہے"

خوش قسمتی سے حضرت شاہ صاحب صرف عالم ہی نہ تھے، بلکہ وہ صاحب ذوق و فکر عارف بھی تھے۔ اسی لئے جہاں انہوں نے قرآن حدیث اور فقہ کے علوم کو نیا طریقہ اور نیا فکر دیا، وہاں تصوف و سلوک و معرفت کے حقائق بھی واشگاف فرمائے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ جیسا کہ "نزھۃ الخواطر" "اور الوسیلہ الی اللہ" کے مصنفین نے لکھا ہے:۔

"حقیقت تو یہ ہے کہ جب علوم ولایت کے قوانین اور قواعد مرتب اور منضبط ہو کر کتابی صورت میں آئے تو ایک عرصہ دراز کے بعد کاملین کی استعداد کے اختلاف کے باعث علوم ولایت اور علوم نبوت آپس میں کچھ اس طور پر گھل مل گئے کہ ان کے درمیان امتیاز قائم کرنا دشوار ہو گیا امام ولی اللہ نے تصوف اور علم سلوک کو ایسی جلا بخشی کہ وہ نتھر کر صاف ہو گئے۔ نیز آپ نے ہر علم، ہر عبارت اور ہر اشارے کو اپنی صحیح جگہ قائم کیا اور جہاں بھی کوئی شک و شبہ یا الجھن پائی، اسے دور کیا۔" زیر نظر کتاب کے دوسرے ابواب میں بھی اسی طرح ہر موضوع پر جس سے ہر ہر باب مُعنوَن ہے۔ مصنف نے بڑی تحقیق اور اعتدال سے عالمانہ بحث کی ہے۔ ہم یہاں "نبوت" کے بارے میں کچھ اقتباسات دے کر اس تبصرے کو ختم کرتے ہیں اس امید کامل کے ساتھ، کہ اہل علم جو حضرت شاہ ولی اللہ کی تعلیمات و حکمت سے دلچسپی رکھتے ہیں، اصل کتاب کی طرف رجوع کریں گے، جس میں بڑی تفصیل سے یہ سب مطالب بیان کئے گئے ہیں۔ "یہاں یہ بات بھی ملحوظ رکھنی چاہیئے کہ مختلف اوقات کے اعتبار سے نبوت کی صورت بھی مختلف ہوتی ہے بسا اوقات نبی کا ظہور کسی شاہ یا خلیفہ کی صورت میں ہوتا ہے۔ اور کبھی ماہر عالم کے روپ میں۔ بعض موقعوں پر وہ ایک زاہد اور مرشد کی شکل میں نمودار ہوتا ہے چنانچہ اس اعتبار سے ظہور نبی کے اسباب، افعال اور آثار بھی مختلف رہے ہیں حضرت نوح علیہ السلام سے ماقبل نبی، ایک مفکر اور حکیم کی صورت میں ظاہر ہوتا تھا" آنحضرت صلعم کی ذات، رسالت، ریاست، خلافت، عالمیت، زاہدیت اور مرشدیت کی جامع تھی۔

دوسرا اقتباس ملاحظہ ہو:۔ "جب نبوت کا ظہور ہوتا ہے، تو ہر حال میں اضافی یا نسبی خیر کا ہی لحاظ رکھا جاتا ہے، بہ الفاظ دیگر جب اضافی خیر کے ظہور پذیر ہونے کا تمام تر دارومدار نبی کی بعثت پر موقوف ہے تو حکمت ولی الٰہی کی مشیت کے مطابق نبی کو مبعوث کہا جاتا ہے۔

پھر جب نبی معرض وجود میں آتا ہے، تو وہ لوگوں سے ان باتوں کا متمنی یا طلب گار نہیں ہوتا، جن کو ماننے کے لئے ان کی فطرت آمادہ نہیں ہوتی۔ کیونکہ نبوت خود فطرت کے ماتحت ہوتی ہے۔ نبی کے فرائض اشیاء کو سنوارنے اور انہیں اس طور پر اجاگر کرنے پر محمول ہیں جیسا کہ انہیں فی الواقع ہونا چاہیئے۔ نہ صرف یہ بلکہ نفوس کی اصلاح کچھ اس طرح سے کرے کہ پروردگار پر یقین مستحکم ہو جائے اور وہ ایسے کام کرنے لگیں جس کے ذریعہ دنیا کی بھلائی اور آخرت کی نجات حاصل ہو۔ علاوہ اسکے نبی کا یہ بھی فرض ہوتا ہے کہ بنی نوع انسان کو اخلاص اور احسان کا صحیح درس دے، کیونکہ یہی دونوں دین کی صحیح روح ہیں" "شاہ ولی اللہ کی تعلیم" بہت اچھے کاغذ پر اردو ٹائپ میں چھپی ہے کتاب مجلد ہے۔ اور شاہ ولی اللہ اکیڈمی حیدرآباد نے اسے شائع کیا ہے، قیمت ساڑھے سات روپے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ پروفیسر غلام حسین جلبانی صاحب کی اس کتاب سے جو انکی برسوں کی محنت و تحقیق کا حاصل ہے شاہ ولی اللہ صاحب کی تعلیمات کو سمجھنے میں بڑی مدد ملے گی اور ایک لحاظ سے اسے بجا طور پر ولی اللہی تعلیم و فکر کی کلید کہہ سکتے ہیں مصنف نے اس دور میں یہ کتاب لکھکر اسلام کی بڑی خدمت کی ہے۔ (م-س)

مطبوعات شاہ ولی اللہ اکیڈمی

★

لمحات (عربی)

شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے فلسفہ تصوف کی یہ بنیادی کتاب عرصے سے نایاب تھی - مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی کو اس کا ایک پرانا نسخہ، جو اغلاط سے پُر تھا، ملا - موصوف نے بڑی محنت سے اس کی تصحیح کی، اور شاہ صاحب کی دوسری کتابوں کی عبارات سے اُس کا مقابلہ کیا - اور وضاحت طلب امور پر تشریحی حواشی لکھے - کتاب کے شروع میں مولانا کا ایک مبسوط مقدمہ ہے -

شاہ صاحب نے اس کتاب میں "وجود" اور اس سے کائنات کا جس طرح صدور ہوا ہے، اُس پر بحث کی ہے، اور اپنی الٰہیاتی حکمت کے دوسرے مسائل بھی بیان کئے ہیں - قیمت دو روپے

——:o:——

شاہ ولی اللہ کی تعلیم

از پروفیسر غلام حسین جلبانی سندھ یونیورسٹی

پروفیسر جلبانی ایم اے صدر شعبہ عربی سندھ یونیورسٹی کے برسوں کے مطالعہ و تحقیق کا حاصل یہ کتاب ہے، اس میں مصنف نے حضرت شاہ ولی اللہ کی پوری تعلیم کا احصاء کیا ہے، اور اس کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل بحثیں کی ہیں - اردو میں شاہ صاحب کی تعلیم پر یہ پہلی جامع کتاب ہے -

کتاب مجلد ہے - قیمت ۷٫۵۰ روپے ہے

شاہ ولی اللہ اکیڈمی - صدر - حیدر آباد - پاکستان

Monthly "AR-RAHIM" Hyderabad Regd. S. No. 254

اغراض و مقاصد

۱- شاہ ولی اللہ کی تصنیفات اُن کی اصلی زبانوں میں اور اُن کے تراجم مختلف زبانوں میں شائع کرنا۔

۲- شاہ ولی اللہ کی تعلیمات اور ان کے فلسفہ و حکمت کے مختلف پہلوؤں پر عام فہم کتابیں لکھوانا اور اُن کی طباعت و اشاعت کا انتظام کرنا۔

۳- اسلامی علوم اور بالخصوص وہ اسلامی علوم جن کا شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتبِ فکر سے تعلق ہے، اُن پر جو کتابیں دستیاب ہو سکتی ہیں، اُنہیں جمع کرنا، تاکہ شاہ صاحب اور اُن کی فکری و اجتماعی تحریک پر کام کرنے کے لئے اکیڈمی ایک علمی مرکز بن سکے۔

۴- تحریک ولی اللہی سے منسلک مشہور اصحابِ علم کی تصنیفات شائع کرنا، اور اُن پر دوسرے اہلِ قلم سے کتابیں لکھوانا اور اُن کی اشاعت کا انتظام کرنا۔

۵- شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتبِ فکر کی تصنیفات پر تحقیقی کام کرنے کے لئے علمی مرکز قائم کرنا۔

۶- حکمت ولی اللہی اور اُس کے اصول و مقاصد کی نشر و اشاعت کے لئے مختلف زبانوں میں رسائل کا اجراء

۷- شاہ ولی اللہ کے فلسفہ و حکمت کی نشر و اشاعت اور اُن کے سامنے جو مقاصد تھے۔ اُنہیں فروغ دینے کی غرض سے ایسے موضوعات پر جن سے شاہ ولی اللہ کا خصوصی تعلق ہے، دوسرے مُصنفوں کی کتابیں شائع کرنا

محمد سرور پرنٹر پبلشر نے سعید آرٹ پریس حیدرآباد سے چھپوا کر شائع کیا ۔

شاہ ولی اللہ اکیڈمی کا علمی مجلہ
الرحیم

مجلسِ ادارت:

ڈاکٹر عبدالواحد ہالے پوتا،

مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی

مخدوم امیر احمد

مُدیر:

محمد سرور

قیمت سالانہ :— آٹھ روپے   قیمت فی پرچہ پچھتر پیسے

الرحیم

جلد ۱ ماہ ربیع الاول ۱۳۸۳ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۶۳ء نمبر ۳

فہرست مضامین

کتبہ۔ عبدالمجید ۶۳ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

پاکستان اور ہندوستان کے بہت سے علمی اداروں اور اہل قلم نے شاہ ولی اللہ اکیڈمی کے قیام پر خوشی کا اظہار کیا ہے۔ اور شاہ ولی اللہ صاحب کی تعلیمات اور ان کے فلسفہ وحکمت کی نشر واشاعت کے لئے اکیڈمی جیسے ایک مرکزی اشاعتی اور تصنیفی و تحقیقی ادارے کے معرض وجود میں آنے کا خیر مقدم کیا ہے۔ اس سلسلے میں متعدد اداروں اور کئی ایک اہل قلم نے ہمیں اپنی ان اشاعتی و تصنیفی کوششوں سے بھی مطلع کیا ہے، جو وہ شاہ صاحب اور ان کے خانوادۂ علمی کی کتابوں کی طباعت و اشاعت اور ان کے تراجم کے ضمن میں کر رہے ہیں۔ گودھرا (گجرات کاٹھیاواڑ) کے ایک بزرگ شاہ ولی اللہ کی ایک کتاب المسوی کا اردو ترجمہ کر رہے ہیں۔ حیدرآباد دکن کے ایک صاحب علم نے "الطاف القدس" کا اردو ترجمہ مکمل کر لیا ہے۔ گوجرانوالہ کا مدرسہ نصرۃ العلوم شاہ رفیع الدین کے متعدد رسائل شائع کر چکا ہے مجلس علمی کراچی نے بڑے اہتمام سے اور نہایت اچھے نسخ ٹائپ میں شاہ اسمٰعیل شہید کی تصوف و حکمت پر مشہور عربی کتاب "العبقات" چھاپی ہے اور مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم کا کیا ہوا اس کا اردو ترجمہ حیدرآباد دکن سے شائع ہوا ہے، کئی ایک ناشرین کتب شاہ ولی اللہ اور ان کے سلسلے کے بزرگوں کی تصنیفات اصل عربی اور فارسی میں نیز ان کے ترجمے اردو میں چھاپ رہے ہیں۔ اس کے علاوہ مغربی پاکستان کے بعض عربی دینی مدارس شاہ صاحب کی کتابوں کو اپنے نصاب میں باقاعدہ طور سے شامل کرنے کا سوچ رہے ہیں۔

یوں تو اس برصغیر میں اہل علم کی شروع ہی سے ولی اللہی علوم کی طرف توجہ رہی ہے اور اُسی زمانے سے شاہ صاحب کی کتابوں کے اردو میں ترجمے بھی ہو رہے ہیں لیکن اب کچھ عرصہ سے برصغیر میں جو نئے حالات رونما ہوئے ہیں اور سیاسی آزادی کے حصول کے بعد مسلمانوں پر داخلی اور خارجی ہر دو سمت سے نئے افکار و خیالات کی یورش شروع ہوئی ہے اس کی وجہ سے شاہ صاحب کے علوم کی طرف پہلے سے زیادہ توجہ ہو رہی ہے اور چونکہ موجودہ حالات میں نئے افکار و خیالات کی یورش اور بڑھے گی اور اس سے قدرتاً ذہنوں میں حرکت، اضطراب اور بے چینی بھی پیدا ہوگی، اس لئے ظاہر ہے شاہ ولی اللہ اور ان جیسے عظیم مفکرین اسلام کی کتابوں کی طرف مسلمانوں کا اور زیادہ رجوع ہوگا۔ وہ زیادہ چھپیں گی اور اُن کے مختلف زبانوں میں بکثرت ترجمے ہوں گے۔

"الرحیم" کی یہ کوشش ہوگی کہ جہاں تک ممکن ہے، وہ ان تمام علمی و اشاعتی سرگرمیوں کا احصاء کرتا رہے۔ اپنے قارئین کو ولی اللہی فکر پر اور اس سے متعلق حضرات کے بارے میں شائع ہونے والی کتابوں سے باخبر رکھے اور حتی الوسع ان کا جائزہ لیتا رہے۔ یہ اکیڈمی پاکستان اور ہندوستان دونوں میں شاہ ولی اللہ اور ان کے مکتب فکر پر تصنیفی و تحقیقی کام کرنے والوں کے درمیان اگر اس طرح کے علمی رابطے کی خدمات سرانجام دے سکے تو اسے یہ اپنی بڑی خوش قسمتی سمجھے گی۔

اس سلسلے میں ایک عام شکایت یہ ہے کہ اس وقت تک شاہ ولی اللہ کی کتابوں کے جو اردو ترجمے ہوئے ہیں، ان میں اکثر و بیشتر اتنے ہی مشکل اور غامض ہیں، جتنی کہ خود اصل کتابیں ہیں بلکہ بعض صورتوں میں تو اصل کتابوں سے زیادہ دقیق اور عسیر الفہم ان کے یہ اردو ترجمے ہیں۔ اب اگر شاہ صاحب کی تعلیمات اور خصوصاً ان کی حکمت کو عام کرنا ہے، تو ضرورت ہے کہ ان کی کتابوں کے ترجمے ملک کی تمام زبانوں میں ہوں، اور عام فہم اور آسان اسلوب میں ہوں تاکہ عام پڑھے لکھے اصحاب جنہیں تھوڑا بہت علمی و دینی شغف ہے، اور وہ فکر ولی اللہی کو سمجھنا چاہتے ہیں ان کا مطالعہ کر سکیں۔ اس ضمن میں یہ بھی ضروری ہے کہ آج کے ذہنوں اور شاہ صاحب نے دو سو سال

قبل جس ماحول، زبان اور پیرایۂ بیان میں اپنے خیالات و افکار پیش کئے تھے، اس کے درمیان جو قدرتی خلا پیدا ہو چکا ہے، اسے اس طرح پُر کرنے کی کوشش کی جائے کہ ان کتابوں کے مترجم محض لفظی ترجمے پر اکتفا نہ کریں، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ کتاب کے مطالب کی تشریح ہو، اور انہیں آج کے فکری و اجتماعی پس منظر میں پیش کیا جائے۔ فکر ولی اللہی سے حقیقی ذہنی ربط صرف اسی صورت میں ممکن ہے اور عام قاری اسے اسی طرح ہی اپنا سکتے اور انفرادی و اجتماعی عمل کے لئے مشعل ہدایت بنا سکتے ہیں۔

ہمارے خیال میں اگر شاہ صاحب کی کتابوں کے اس طرح ترجمے ہوں۔ اور ان کی تعلیمات اور حکمت کو آج کی زبان میں اور آج کے دینی و روحانی اور علمی و اجتماعی و معاشی تقاضوں کی روشنی میں پیش کیا جائے۔ تو فکر ولی اللہی کی طرف ہمارے تعلیم یافتہ طبقے کا عام رجوع ہو سکتا ہے اور وہ بالخصوص اس ملک میں اسلامی فکر و نظر کی ایک اہم بنیاد بن سکتا ہے۔ ہم اس سے پہلے یہ لکھ چکے ہیں کہ دین کی تعبیر و تشریح میں کسی خاص مکتب فکر کی اجارہ داری کے ہم قطعاً حامی نہیں ہیں۔ اور آزاد خیالی کے اس زمانے میں لوگوں کو اس کی دعوت دینا تو انتہائی بے سمجھی ہوگی۔ بے شک اس برصغیر میں شاہ ولی اللہ دین اسلام کے ایک بہت شارح ہیں اور ان کی یہ تشریح و تعبیر اس لئے خاص اہمیت رکھتی ہے کہ ان کی اپنی ایک جامع شخصیت تھی اور انہوں نے اسلام کو اسی جامعیت کے نقطۂ نظر سے دیکھا لیکن اس برصغیر میں اور اس سے باہر گزشتہ صدیوں میں بڑے بڑے مجتہد، عالم، حکیم اور مفکر گزر چکے ہیں۔ فکر ولی اللہی کے تخصیصی مطالعے کے ہرگز یہ معنی نہیں ہونے چاہئیں کہ ہم اُدھر سے آنکھیں اور دماغ بند کر لیں اور تصوف کے عقیدہ۔ "توحید فی الشیخ" پر علم و فکر کی دنیا میں بھی عامل ہوں بہرحال اس سلسلے میں ہم یہ ضرور کہیں گے کہ اگر ہمارے ہاں اس طرح فکر ولی اللہی کا تحقیقی مطالعہ شروع ہو جائے تو یہ ایک نقطۂ آغاز ہو سکتا ہے دوسرے بزرگان دین کے افکار و تعلیمات کے تحقیقی مطالعے کا کیونکہ حضرت شاہ ولی اللہ نے جہاں ان تمام علمائے عظام سے استفادہ کیا۔ جو ان سے پہلے ہوئے اور ان

کے افکار سے انتخاب کر کے اپنے فکر کی عمارت تعمیر کی۔ وہاں انہوں نے ان کے افکار کا تنقیدی جائزہ بھی لیا۔ اسلام کے مجموعی نقشے میں ان کی جگہ معین کی اور ان میں آپس میں جو تضادات تھے، ان کی تشریح کی۔ اور ان میں مطابقت پیدا کی۔ اگر ہمارے ہاں اسلام کی دینی تاریخ اور اس کے مختلف مذاہب و مکاتب فکر کے اس طرح کے مطالعے کا رجحان فروغ پا سکے تو اس سے ایک تو مذہبی فرقوں کی موجودہ مخاصمتیں کم ہو جائیں گی اور دوسرے آج کل اسلامی مباحث میں عام طور سے جو سطحیت، تنگ نظری، ہنگامہ پسندی اور وقت پرستی آگئی ہے۔ اس کا تدارک ہو سکے گا۔ اور ان مباحث میں ایک حد تک عمق، وسعت اور اس کے ساتھ ساتھ تفکر بھی پیدا ہوگا۔ جس کی کہ اس وقت ہمیں بڑی ضرورت ہے۔

بات یہ ہے کہ ہماری حالیہ تاریخ میں ایک دور وہ تھا، کہ ہم مسلمانوں کی غیر ملکی اور غیر مسلم تسلط کے خلاف جو سیاسی جدوجہد ہو رہی تھی، اس میں سب سے بڑا محرک اور فعّال جذبہ اسلام کا تھا اور نہ صرف عوام بلکہ خواص تک کے لئے بھی اس کی حیثیت ایک "رجز" کی تھی کہ اس کے ذریعہ مسلمانوں کو جنگ آزادی میں ثابت قدم رہنے پر ابھارا جاتا تھا۔ آزادی کے حصول اور اس کے نتیجے میں غیر ملکی اور غیر مسلم تسلط کے ختم ہونے کے بعد یہ صورت حال بدل گئی۔ اور اب اسلام کو "کفار" کے خلاف بطور "رجز" کے استعمال کرنے کی ضرورت نہ رہی۔ آزادی کے فوراً بعد بعض جماعتوں نے اسلام کو خود مسلمانوں کے خلاف بطور "رجز" استعمال کرنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ زیادہ کامیاب نہ ہوئیں۔ پھر انہوں نے اپنی وقتی سیاسی ضرورتوں کو اسلام کا نام دیا۔ اور اس سے اپنے جماعتی مصالح کی تائید میں دلائل اخذ کرنے لگیں اور اس طرح اسلام جو ساری انسانیت کے لئے اخوت، مساوات، حق و انصاف اور فلاح عامہ کا پیغام تھا۔ وہ ان جماعتوں کے ہاتھ میں محدود قسم کی حزبی سیاست کا آلۂ کار بن گیا۔ یقیناً سمجھ دار اور باشعور طبقوں میں اس کے خلاف ردِ عمل ہونا تھا اور وہ ہوا۔ اس پر مستزاد یہ کہ پچھلے چند سالوں میں ہمارے ہاں بعض بڑی دُور رس سیاسی اور معاشی تبدیلیاں

ہوئی ہیں۔ نیز ملک میں آزادی کے فوراً بعد جو صنعتیں قائم ہونا شروع ہوئی تھیں، ہماری سماجی زندگی میں اب ان کے نتائج سامنے آرہے ہیں۔ غرض اب ہمارے نہ وہ مسائل ہیں، جو آزادی سے پہلے دورِ غلامی میں تھے۔ اور ان مسائل کی نوعیت بھی یکسر بدل گئی ہے، جن سے ملک کو آزادی کے دس بارہ سال تک واسطہ رہا۔ فرد اور جماعت کے پرانے رشتے بسرعت ٹوٹتے جا رہے ہیں۔ اور ان کے ساتھ سماج کی پہلی اخلاقی بندھنیں بھی کمزور پڑ رہی ہیں، پرانا طبقاتی توازن ختم ہو رہا ہے اور نئے گروہ اقتدار میں آتے جاتے ہیں۔ اب جوں جوں صنعت و تجارت کا دائرہ وسیع ہوگا، سماج کے رنگ ڈھنگ بھی بدلیں گے اور ہم میں سے ہر ایک کو نئے سماجی، معاشی اور ذہنی مسائل کا سامنا کرنا پڑے گا۔

قدرتی بات ہے کہ جب حالات ہمیں ان مسائل کے حل ڈھونڈھنے پر مجبور کریں گے اور ہمیں اس بارے میں سوچنا پڑے گا، تو ہماری سوچ کا رخ لامحالہ اسلام کی طرف ہوگا۔ اور ہم اسی سے ہدایت حاصل کرنے میں کوشاں ہونگے۔ اب یہ مسائل جن کے ہمیں حل ڈھونڈنا ہوگا، ٹھوس اور سنگین مسائل ہیں اور یہ واضح، معین اور ممکن العمل حل چاہتے ہیں۔ یہاں جذبات پرستی، نعرہ بازی اور رجز خوانی سے کام نہیں چلے گا۔ تاریخ اسلام پر تنقیدی نظر ڈالنی ہوگی اس کے ساتھ ساتھ عہد حاضر اور اسکے علوم سے باخبر ہونا ضروری ہوگا۔ اور تاریخ کا رخ کدھر کو ہے۔ اس کا اندازہ کرنا بھی پڑے گا۔

بے شک ہم مسلمانوں کے لئے اسلام کیساتھ جذباتی اور نظریاتی ارتباط ضروری اور لابدی ہے۔ لیکن اس کے علاوہ آج اسلام کو ہماری عملی زندگی میں ایک تعمیری، تخلیقی اور اخلاقی کردار بھی ادا کرنا ہے اور اس کے لئے ضرورت ہے کہ ہم اسلام کا ایسے نقطۂ نظر سے مطالعہ کریں کہ جہاں وہ ہمیں باطنی سکون و اطمینان عطا کرسکے، وہاں اس کی مدد سے ہمیں اپنے مسائل کے حل بھی مل سکیں۔ وہ صرف "نظریۂ حیات" اور "آئیڈیالوجی" ہی نہ ہو، بلکہ ہمیں اپنے لئے "نظام حیات" کی تشکیل میں بھی مدد دے اور ہماری رہنمائی کرے۔

ہمارے ہاں بعض لوگوں کو "احیاء" اور "تجدید" کی اصطلاحوں سے بڑی چڑ ہے۔ اور وہ ایسی

اصلاحی اور تعمیری کوششوں کو سخت ناپسند کرتے ہیں، جن میں حال کو ماضی سے مکمل طور پر منقطع کئے بغیر مستقبل کی راہیں تلاش کی جاتی ہیں۔ اور قومی شیرازے کی روایات کا حتی الوسع تسلسل ٹوٹنے نہیں دیا جاتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جمود کے معنی موت کے ہوتے ہیں اور ہر وقت نظر میں پیچھے رکھنا قوم کو کہیں کا نہیں رہنے دیتا، لیکن آگے قدم بڑھاتے ہوئے پیچھے نہ دیکھنا یا اس کا خیال نہ رکھنا کہ جن کے ہم آگے چل رہے ہیں، وہ ہمارے ساتھ بھی ہیں یا نہیں، زیادہ دانشمندی کی بات نہیں ہوگی۔ اس ضمن میں مصطفیٰ کمال اتاترک اور اس کے انقلابی اقدامات ہمارے لئے ایک سبق ہیں مرحوم نے ترک قوم کو زبردستی "یورپین" بنایا۔ اسے "فرسودہ ماضی" سے یک قلم آزاد کرنے کی کوشش کی۔ اس کا لباس بدلا، قانون بدلا، زبان کا رسم الخط بدلا اور اس کے سماجی اطوار بدلے۔ لیکن ان اقدامات نے ترک قوم کو اس طرح دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے کہ اب ایک طرف روشن خیال اور یورپین اقلیت ہے اور دوسری طرف قدامت پسند اکثریت، اور دونوں میں خانہ جنگی کے سے حالات پیدا ہوگئے ہیں، اس سے آج ترکوں کے سمجھ دار طبقے خود پریشان ہیں۔ سیاسی انقلابات کی تو بات دوسری ہے۔ لیکن جہاں تک سماجی انقلابات یا دور رس تبدیلیوں کا تعلق ہے، انہیں بردئے کار لانے کے لئے عوام کی اکثریت کی نہ سہی، لیکن ان کے ایک کافی بڑے حصے کی رضامندی اور دلی تعاون کی ضرورت ہوتی ہے اور انہیں یقین دلانا پڑتا ہے کہ ان اقدامات سے ان کی انفرادی، جماعتی اور قومی شخصیت کی نفی نہیں ہوگی، بلکہ ماضی کے جن باقیات صالحات کو وہ اچھا سمجھتے ہیں اور جو ان کے ہاں "معروف" کا درجہ رکھتی ہیں، یہ اقدامات دراصل ان کے خلاف نہیں، خواہ ظاہری طور پر انہیں ان میں کچھ اختلاف نظر بھی آتا ہے۔ اسے آپ احیاء پرستی کہیں یا تجدید، اگر سیاسی و سماجی اصلاح خود قوم کے اندر سے ہونی ہے اور اسے وسط ایشیا کی مسلم ریاستوں کی طرح غیر ملکی طاقت کے ہاتھ سے اوپر سے تھوپا نہیں جانا تو احیاء اور تجدید کے بغیر کام نہیں بن سکتا۔ ہمارے نزدیک آج مسلمانوں کو اپنے سماج اور ذہن و فکر میں جن دور رس تبدیلیوں کی ضرورت ہے، اور ہم مانتے ہیں واقعی ان

کی ضرورت ہے۔ اس احیاء و تجدید میں فکر ولی اللہی ایک مشعل کا کام دے سکتی ہے اور اسلام کی جو تعبیر اس میں کی گئی ہے اس کے طفیل ہم ماضی کی باقیات صالحات کو برقرار رکھتے ہوئے کامیابی سے آگے بڑھ سکتے ہیں،

آج کی سائنٹفک زندگی کے تقاضوں سے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا۔ اور انسانی افکار جس سرعت سے ترقی کر رہے ہیں، ان کو بھی نظر انداز کرنا ممکن نہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ آخر انہیں کس طرح اپنایا جائے۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ اپنے ماضی کو دورِ جاہلیت قرار دیکر اس سے بالکل قطع تعلق کرلیا جائے۔ اور دوسرے یہ کہ ماضی کی اچھی باتوں کو برقرار رکھتے ہوئے نئی زندگی کو اپنا لیا جائے۔ اس طرح ہم اپنی قومی وملّی شخصیت قائم رکھ کر ترقی کرسکیں گے اور پہلی صورت میں ہماری مثال اس کشتی کی ہوگی جس کا لنگر ٹوٹ گیا ہو، اور وہ سمندر کی موجوں کے تھپیڑوں کے رحم وکرم پر ہو، شاہ ولی اللہ اور ان جیسے مفکرین اسلام کی تعلیمات ہمیں دوسری صورت کے اختیار کرنے میں ممد ومعاون ہوسکتی ہیں۔

شاہ ولی اللہ اکیڈمی کے ریسرچ پروفیسر مولانا غلام مصطفٰے قاسمی صاحب حج سے بخیریت واپس تشریف لے آئے ہیں، وہ مکہ معظمہ، مدینہ منورہ اور حجاز مقدس کے دوسرے شہروں کی زیارت کے بعد اردن، لبنان، شام اور عراق بھی گئے، وہاں کے مشہور علماء سے ملاقاتیں کیں تاریخی کتب خانے دیکھے، اور انہیں اس سفر میں ان اسلامی ملکوں کی علمی، فکری و اجتماعی سرگرمیوں کا قریب سے مطالعہ کرنے کا موقعہ ملا۔ مولانا موصوف نے الرحیم میں اپنی اس بابت کے تاثرات لکھنے کا وعدہ فرمایا ہے۔

فقہ میں حضرت شاہ ولی اللہ کا مقام

حافظ عباد اللہ فاروقی[1]

حضرت شاہ ولی اللہ کی اساسی تربیت فکری میں ان کے والد شاہ عبدالرحیم صاحب کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ کیونکہ شاہ صاحب نے فقہ اور دیگر علوم شاہ عبدالرحیم ہی سے حاصل کئے۔ شاہ عبدالرحیم فتاویٰ عالمگیری کے مصنفین میں سے ایک عالم ہیں۔ اس لحاظ سے حضرت شاہ ولی اللہ کے کمالاتِ علمی عالمگیر کے دور کا نتیجہ ہیں۔ شاہ صاحب اپنے والد شاہ عبدالرحیم کی وفات کے ۱۲ سال بعد تک دہلی میں درس و تدریس میں مشغول رہے اس کے بعد جب وہ حجاز گئے تو وہاں شیخ ابو طاھر شافعی اور شیخ تاج الدین حنفی کی صحبتوں سے مستفید ہوئے ان کی صحبت کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاہ صاحب نے حجاز پہنچکر فقہ شافعیہ اور حنفیہ کو ایک درجہ پر مانا۔ اور ان دونوں میں مؤطا امام مالک کو امر مشترک قرار دیا۔

فقہ کی ابتداء اور اس کے ارتقائی مراحل

عہد رسالت و صحابہ کرام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں نہ تو کوئی حدیث کی کتاب لکھی گئی اور نہ فقہی مسائل یا شرعی احکام کو کسی صحابی نے جمع کیا۔ نہ کسی اور علم کے اصول و قواعد

---

[1] ایم اے ایل ایل بی ایڈووکیٹ۔ رنگ محل، لاہور

اُس وقت معین ہوئے۔ اُس زمانے میں صورت یہ تھی کہ اصحاب نبویؐ جیسا کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو کرتا دیکھتے، ویسا ہی خود کرتے۔ چونکہ اصحاب میں سے ہر ایک کو آپؐ کی خدمت میں ہر وقت حاضر رہنے کا موقع نہ ملتا، اس لئے انہیں ایک دوسرے سے دریافت کرنے کی ضرورت پیش آتی۔ جو شخص صحابہ میں سے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہ کر اسوۂ حسنہ سے زیادہ واقف ہوا۔ وہی زیادہ ممتاز فقیہہ کہلایا۔

دورِ رسالت کے بعد جب صحابہ کا زمانہ آیا تو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دیکھی اور آپؐ سے سنی ہوئی باتوں پر عمل کرتے رہے۔ لیکن اگر کوئی نئی بات پیش آتی تو منصوصات کتاب وسنت پر غور کیا جاتا۔ اور ان کی روشنی میں اس کا حل تلاش ہوتا۔ اس زمانے میں لوگ بالعموم صحابہ کو ہی فقہا سمجھتے، اور شرعی معاملات میں ان کی طرف رجوع کرتے۔

آنحضرت صلعم کی وفات کے بعد صحابۂ کرام دور دراز ملکوں میں منتشر ہوگئے تھے۔ جہاں بھی وہ پہنچے، وہ اپنا علم حدیث ساتھ لے گئے۔ ان کی حیثیت بستیوں اور شہروں میں ائمہ کی تھی لوگ اپنے اپنے شہر اور محلّے کے علماء (یعنی صحابہ) سے امورِ دینی کی تحقیق کیا کرتے تھے۔ انہیں سے انہوں نے احادیث نبوی اور مسائل شرعی کو سیکھا۔ اگرچہ اصحاب نبیؐ اس زمانے میں فقہا کا کام بھی سرانجام دے رہے تھے لیکن ان میں باہمی اختلاف نہ تھا۔ ایک شہر کا فقیہہ دوسرے شہر کے فقیہہ سے کسی قسم کا بغض نہ رکھتا تھا۔ بلکہ ان کی کوشش یہ تھی کہ دین کی اشاعت کی جائے۔ غرض صحابۂ کرام کے عہد میں فقہی مسائل میں اختلاف کی راہیں نہیں کھلی تھیں اور فقیہہ ہونا دلائل منطقی کے جاننے اور اصولِ فلسفہ سے واقف ہونے پر منحصر نہ تھا۔ اور نہ اس زمانے کے لوگوں کو تفقہ کا اظہار منظور تھا۔ لوگ سیدھی سادھی روزمرہ کی باتوں کے لئے اپنے شہر کے عالم سے مسائل دریافت کر لیا کرتے تھے۔

جب صحابہ کا زمانہ گذر گیا تو ان کی جگہ علمائے تابعین اپنے اپنے شہر کے عالم اور محدّث قرار پائے اس زمانے میں لوگ اپنے اپنے شہر اور بستی کے امام کی بیان کی ہوئی احادیث اور شرعی مسائل روایت کرتے اس طرح ہر شہر کے آدمی اپنے ہی شہر کے فقیہہ مفتی اور محدث کے قول پر عمل کرتے اور اس سے

فتوے لیتے اور علم سیکھتے چنانچہ مکہ، مدینہ، کوفہ، بصرہ کے فقہا اور محدثین الگ الگ تھے۔ جن کے اصول اور اجتہاد کی وہاں کے لوگ تقلید کیا کرتے تھے۔

یہ صورت دوسری صدی کے وسط تک یعنی ۱۴۳ھ تک قائم رہی اور لوگوں نے شرعی مسائل میں اگرچہ اپنے اپنے امام کی پابندی کی لیکن ان کے درمیان کسی قسم کا کوئی اختلاف پیدا نہ ہوا۔ مگر بعد میں وہ زمانہ شروع ہوا۔ جس میں فقہ کے مذاہب اربعہ کی بنیاد پڑی۔

فقہ کے مذاہب اربعہ

تبع تابعین کے زمانے میں حدیث و فقہ کی تعلیم و تعلّم کی صورت تو وہی تھی، جو تابعین کے دور میں تھی لیکن اس زمانہ میں مسلمانوں کی تعداد کافی بڑھ گئی تھی۔ اور مذہبی امور کے بارے میں ان کے درمیان اختلافات پیدا ہو گئے تھے، ان حالات میں لوگ اصول و قواعد کے منضبط کرنے اور اجتہاد و استنباط اور استخراج کے قاعدے ترتیب دینے کی طرف راغب ہو گئے۔

سب سے پہلے حنفی مذہب کی بنیاد پڑی۔ امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کو اجتہاد اور استنباطِ مسائل اور استخراجِ فروعات میں ایک خاص قسم کی استعداد تھی۔ نیز ان کے زہد اور ورع میں کسی کو شک نہ تھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے شہر کے امام و فقیہہ ابراہیم نخعی کی احادیث اقوال اور روایات پر اپنے مذہب کی بنیاد قائم کی اور انہیں کے قائم کردہ اصول پر جزئیاتِ مسائل کا استخراج کرنا شروع کیا

غرض جب امام ابو حنیفہ نے فقہ کی تدوین کی تو فقہائے کوفہ نے ان کے اجتہاد کو قبول کر کے ان کے استخراجی مسائل پر عملدرآمد شروع کر دیا۔ قاضی ابو یوسف اور امام محمد نے اگرچہ فروعات میں امام ابو حنیفہ سے اختلاف کیا۔ لیکن اصول میں انہوں نے ان کی پوری تقلید کی۔ حنفی مذہب امام ابو حنیفہ کے مذکورہ بالا دو شاگردوں کی وجہ سے عراق خراسان اور ماوراءالنہر میں پھیل گیا

حنفی مذہب کے بعد مالکی مذہب فقہ کی بنیاد پڑی۔ امام مالک حدیث اور فقہ کے علم میں بے مثل تھے۔ انہوں نے حدیث کی ایک جامع کتاب "موطا" لکھی جسے حضرت شاہ ولی اللہ نے فقہ حنفی اور شافعی میں قدرِ مشترک

تسلیم کیا ہے۔ جہاں جہاں یہ کتاب پہنچی، مالکی مذہب پھیلتا گیا۔ ان کے بعد ان کے شاگردوں نے اپنے استاد کے مذہب کے اصول اور دلائل کو ترتیب دیا۔ مؤطا کی تلخیص کی اس طرح مالکی مذہب کی بڑی اشاعت ہوئی۔
مذکورہ بالا مذاہبِ فقہ کی بنیاد پڑ چکی تو امام شافعی پیدا ہوئے۔ انہوں نے مذکورہ بالا دونوں مذاہب کے اصول و فروع کو دیکھ کر اور ان کی کلیات و جزئیات پر نظر کرکے ان باتوں کو جو اُن کے نزدیک ان مذاہب میں ناقص تھیں، درست کیا۔ اور نئی طرز سے فقہ کے اصول اور قواعد کو ترتیب دیا اس موضوع پر انہوں نے ایک کتاب تالیف کی۔ اس میں احادیث مختلف کے جمع کرنے کے قاعدے مرتب کئے۔ اور احادیث مرسل اور منقطع پر ضروری شرائط کے بغیر استناد ترک کیا۔ واضح رہے کہ امام شافعی کے زمانے میں احادیث کا بہت بڑا ذخیرہ جمع ہو چکا تھا۔
شاہ ولی اللہ صاحب نے حجاز پہنچکر محسوس کیا کہ اسلامی بین الاقوامی سیاست میں عرب و عجم کو آپس میں متفق ہونا چاہیئے۔ اس لئے انہوں نے عربوں اور عجمیوں کی فقہ کی اصل یعنی موطاء امام مالک کو تسلیم کرکے حنفی اور شافعی مذاہب فقہ کو ایک درجہ پر مان لیا۔ حنفی فقہ ہندوستان اور ترکستان میں زیادہ ترائج تھی زوال بغداد کے بعد وہاں کی فارسی بولنے والی قومیں جب ہندوستان آیئں تو وہ حنفی فقہ اپنے ساتھ لایئں۔ لیکن عربی بولنے والی قومیں جو مصر اور مغرب کی طرف گیئں۔ وہ شافعی اور مالکی مذہب رکھتی تھیں۔ غرض شاہ صاحب اس نتیجہ پر پہنچے کہ فقط حنفی فقہ تمام مسلمانوں کو جو علاوہ فارسی کے عربی بھی بولتے ہیں ایک نقطہ پر جمع کرنے کے لئے کافی نہیں ہے اس اعتبار سے دیکھا جائے تو شاہ ولی اللہ مذہب حنفی اور شافعی میں مجتہد منتسب کی حیثیت رکھتے ہیں۔
امام احمد بن حنبل امام شافعیؒ کے شاگرد تھے۔ انہوں نے بھی امام شافعی ہی کا مسلک اختیار کیا یعنی جب احادیث کا ذخیرہ جمع ہو گیا تو انہوں نے صحابہ کے اقوال پر استدلال ترک کرکے احادیث کی طرف رجوع کیا۔ اور جو مسئلہ وہ قرآن اور حدیث میں نہ پاتے اس کے متعلق قرآن اور سنت کی روشنی میں غور و فکر کرتے۔
غرضیکہ ان ائمہ میں سے کسی نے بھی اپنے فقہی مذہب کی اس لئے طرح نہیں ڈالی تھی کہ لوگ

ان کی شخصی تقلید کریں۔ اور نہ اپنے آپ کو صاحب مذہب کہلوانے کے لئے انہوں نے شرعی مسائل میں اجتہاد اور استنباط کیا تھا۔ ان کے دل میں مقتدا بننے کی بھی بالکل خواہش نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اکثر اپنی شخصی تقلید سے لوگوں کو منع فرماتے اور اگر کوئی مسلمان فرمانروا چاہتا کہ ان کی مرتب کردہ کتابِ فقہ کو تمام لوگوں میں مشتہر کرے، تو وہ اس کو ایسا کرنے سے روکتے۔

مذاہب اربعہ میں اختلاف کے اسباب

مسلمانوں میں اختلاف دو قسم کا رونما ہوا۔ اوّل اختلاف عقائد میں رونما ہوا۔ دوسرا اختلاف مسائل اور فروع میں۔ جو شخص عقائد اور اصول میں مخالف ہے وہ اہل سنت کے گروہ سے خارج ہے مثلاً معتزلہ، قدریہ، مرجیہ اور خوارج وغیرہ۔ اس قسم کا اختلاف نہ تو صحابہ نہ تابعین نہ تبع تابعین اور نہ ائمہ میں پیدا ہوا۔ بلکہ یہ سب عقائد اور اصول میں متفق رہے۔ یہی وجہ ہے کہ چاروں مذہبِ فقہ اہل سنت ہی کہلاتے ہیں۔ مسائل اور فروع سے فقہ کے مسائل مراد ہیں۔ اور ان میں البتہ چاروں مذاہب میں اختلاف ہے صحابہ بھی اختلاف رکھتے تھے اس اختلاف کے اسباب حسب ذیل ہیں

صحابہ کے اقوال و افعال اور احکام و مسائل کا مدار ہمیشہ قرآن اور حدیث پر رہا ہے۔ قرآن پیغمبر صلعم کے سامنے جمع ہو گیا تھا، اس لئے کسی ایسے مسئلہ میں جو قرآن میں صاف موجود ہے۔ باہم اختلاف نہیں ہوا۔ اس کے برعکس احادیث نبوی آپؐ کے سامنے جمع نہ کی گئیں، اس لئے جن مسائل کا استخراج حدیث پر موقوف تھا۔ ان میں اختلاف پیدا ہوا۔ اس کے کئی اسباب ہیں جو حضرت شاہ ولی اللہ نے حجتہ اللہ البالغہ میں جمع کئے ہیں۔

اختلاف سماعت۔ یعنی ایک صحابی نے حدیث نبوی کو سنا۔ اس سے دوسرے صحابی نے سنا اور عمل کیا۔ مگر ایک صحابی جس کو یہ حدیث پہنچی ہی نہیں، جب اس کو ویسا معاملہ پیش آیا تو اس نے اجتہاد سے کام لیا۔ اگر اس کا اجتہاد حدیث کے مطابق ہوا تو دونوں صحابی متفق ہو گئے اور اگر اجتہاد میں خطا ہوئی تو ان میں اختلاف ہوا۔

ترک اجتہاد

یعنی کسی صحابی کا اپنے اجتہاد سے رجوع کرنا۔ مثلاً ایک صحابی نے کسی امر میں اجتہاد کیا، اس سبب سے کہ اس بارے میں حدیث اسے نہ پہنچی تھی۔ پھر جب اس کو وہ حدیث مل گئی تو اس نے اپنے اجتہاد کو ترک کر دیا۔ اور حدیث پر عمل کیا لیکن جن لوگوں نے اس صحابی کے اجتہاد کو سنا اور انہیں ان کے اس سے رجوع کرنے کی خبر نہ ملی انہوں نے اس صحابی کے قول پر عمل کیا اور اس طرح اس صحابی کا یہ فعل اختلاف کا باعث ہوا۔

اشتباہ فی الحدیث

جب حدیث کا راوی ضعیف ہوتا اور حدیث کی صحت میں کسی قسم کا شک و شبہ کیا جاتا تو اس صورت میں صحابہ اپنے اجتہاد پر قائم رہتے۔ اور اس حدیث کو صحیح نہ جان کر اس پر عمل نہ کرتے اس طرح اختلاف کی راہیں کھل گئیں۔

سمجھ میں اختلاف ہونا۔

یعنی مختلف صحابیوں نے پیغمبر خدا کو ایک کام کرتے ہوئے دیکھا اور اپنی اپنی سمجھ کے مطابق اسے سمجھا۔ اس طرح ایک نے دوسرے سے اختلاف کیا۔

سہو و نسیان۔

اختلاف کی وجہ یہ بھی ہوئی کہ کسی صحابی نے جو کچھ پیغمبر خدا صلعم سے سنا یا آپؐ کو کرتے دیکھا وہ اسے بھول گیا۔ لیکن دوسروں نے یاد رکھا۔

اختلاف ضبط۔

پیغمبر خدا صلعم نے جو کچھ فرمایا بعض صحابہ نے اس کا مطلب کچھ اور سمجھا جیسا کہ حضرت عمرؓ سے مروی ہے کہ مردہ کو اس کے گھر والوں کے رونے سے عذاب ہوتا ہے۔ اس حدیث کو حضرت عائشہؓ نے سنکر کہا کہ یہ صحیح نہیں ہے۔ اور راوی نے غلطی کی ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ پیغمبر صلعم ایک یہودی کے جنازہ پر گذرے اس کے گھر والے رو رہے تھے۔ آپؐ نے فرمایا یہ تو روتے ہیں اور

وہ عذاب میں مبتلا ہے۔

علت حکم میں اختلاف ہونا۔

رسول خدا صلعم کے حکم یا سنت کی کوئی علت قائم کرکے اس میں اختلاف کرنا مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ ایک جنازہ کو دیکھ کر رک گئے کسی نے اس قیام کی علت تعظیم ملائکہ خیال کی۔ کسی نے ہولِ قیامت۔

دو مختلف حدیثوں کے جمع کرنے میں اختلاف ہونا۔

یہ مسلّم ہے کہ عادات مباحات اور سنن میں رسول اللہ صلعم فرق نہ فرماتے تھے۔ اور جو صحابی صاحبِ علم تھے۔ وہ عادات کو عبادت سے اور سنن کو واجبات سے جدا کرتے اور جو اس میں تمیز نہ کرتے وہ سب کو عبادات اور واجبات ہی خیال کرکے اختلاف عادات کو اختلاف فی العبادات جانتے۔

تقلید و اجتہاد

مذاہب اربعہ میں مذکورہ بالا اختلاف کے باوجود حضرت شاہ ولی اللہ ان کو مساوی مانتے تھے اور ان کی پیروی پر زور دیتے تھے۔ اس سلسلے میں وہ جس تقلید کے معتقد تھے اس کے بارے میں مولانا خیر محمد صاحب ماہنامہ الفرقان کے ولی اللہ نمبر میں لکھتے ہیں

"تقلید کا اچھا ہونا یا برا ہونا "معتقد فیہ" کے احوال پر موقوف ہے۔ اگر معتقد فیہ غیر مطیع (فاسق و فاجر یا مشرک و کافر) ہو تو تقلید حرام و قبیح ہے قرآن و سنت میں اس کی ممانعت جابجا وارد ہے اور اگر معتقد فیہ مطیع اور لائق اتباع (امام و مجتہد) ہو تو تقلید حسن اور بعض حالات میں واجب ہے۔ قرآن و حدیث اس کی تاکید سے مملو ہے۔ اور یہی امت مرحومہ میں رائج و مشہور ہے اور حضرت شاہ صاحب اس تقلید کے معتقد ہیں" (ص ۳۷۳)

شاہ ولی اللہ نے اپنے اس نقطۂ نظر کو عقد الجید میں بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

"معرفت شریعت میں تمام امت نے بالاتفاق سلف پر اعتماد کیا اور تبع تابعین نے تابعین پر اعتماد کیا

ہر ہر طبقہ میں پچھلے علماء پہلے علماء پر اعتماد و اعتبار کرتے چلے آئے ہیں۔"

اس ضمن میں حضرت شاہ صاحب نے تقلید کی دو قسمیں بتائی ہیں۔ تقلید شخصی و غیر شخصی ائمہ اربعہ کے مذاہب کی تدوین سے قبل دوسری صدی کے آخر تک تقلید غیر شخصی کا رواج رہا، حتیٰ کہ صحابہ و تابعین میں بھی اس کا دستور تھا۔ ائمہ اربعہ کے مذاہب فقہ چوتھی صدی ہجری میں مدوّن ہوئے۔ اس کے بعد چاروں مذاہب کی تقلید شخصی شروع ہو گئی، شاہ صاحب عقد الجید میں فرماتے ہیں۔

"جب بجز مذاہب اربعہ دوسرے مذاہب حقہ معدوم ہو گئے تو انہیں چاروں کا اتباع سواد اعظم کا اتباع ٹھہرا۔ اور ان سے نکلنا سواد اعظم سے نکلنا ہوا" (ص ۵۳۸)

اسی طرح انصاف صفحہ ۷۰ میں لکھتے ہیں کہ ہندوستان میں عوام کے لئے مذہب حنفی کی تقلید کا ترک کرنا حرام ہے ان کی عربی عبارت کا ترجمہ حسب ذیل ہے۔

"جب ایک عامی انسان علاقہ ہندوستان اور ماوراء النہر میں رہنے والا ہو، جہاں کوئی عالم شافعی اور مالکی اور حنبلی اور ان کی کتب مذہبیہ میسر نہ آسکتی ہوں تو اس پر واجب ہے کہ صرف امام ابو حنیفہؒ کے مذہب کی تقلید کرے اور ان کے مذہب سے علیحدہ ہونا اس کے لئے حرام ہے کیونکہ وہ اس وقت شریعت کی رسی ہی اپنی گردن سے اتار کر مہمل بیکار رہ جائے گا"

اجتہاد کے بارے میں المصفیٰ میں فرماتے ہیں۔

"یہ لقین معلوم شد کہ طریق اجتہاد و فقہ امروز مسدود است الا از یک وجہ کہ "موطا" را پیش گیرند و وصل مرسل آں و ماخذ اقوال صحابہ و تابعین بہ شناسد۔ و نظر مجتہدانہ اختیار کند و تعقبات شافعی وغیر آں در نظر دارد۔ بعد از اں جہد کند بعلم احکام الٰہی و بقین یا غالب رائے حاصل کند۔ بدلالت دلائل بر آں مسائل"۔

اس طرح شاہ صاحب تقلید اور اجتہاد دونوں کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک اگرچہ تقلید کی بنیاد دوسری صدی کے وسط میں شروع ہوئی اور اس وقت یہ تقلید غیر شخصی تھی البتہ اس تکمیل چوتھی صدی میں ہوئی۔

ابوطالب مکیؒ نے قوت القلوب میں لکھا ہے کہ چوتھی صدی سے پہلے مذاہب اربعہ کی تقلید کا رواج نہ تھا۔ اور لوگ اپنے آپ کو حنفی یا شافعی نہیں کہتے تھے۔ بلکہ وہ ہر مذہب کے عالم سے ضرورت کے مطابق مسائل دریافت کرتے۔ لوگوں میں کچھ اہل حدیث اور کچھ صاحب اجتہاد تھے اور ان میں کچھ مقلّد بھی تھے۔ اگرچہ مقلّدین کی تعداد بہت زیادہ نہ تھی لیکن وہ تیسری صدی ہجری میں بھی موجود تھے۔ اہل حدیث کا طریقہ یہ تھا کہ وہ کتاب الٰہی حدیث نبوی اور آثار صحابہ پر عمل کرتے اور اشد ضرورت کے وقت کسی فقیہہ کی طرف رجوع کرتے۔ خواہ وہ فقیہہ مکّی ہوتا یا مدنی، کوفی ہوتا یا بصری اور جو صاحب اجتہاد تھے وہ اجتہاد اور تخریج کرتے۔ اصول اور قواعد کو سامنے رکھ کر ان سے فروعات کا استنباط کرتے۔ اگر ان کے یہ اصول و قواعد کسی امام کے ساتھ مخصوص ہوتے۔ تو لوگ اس مجتہد کو بھی اسی امام کی طرف منسوب کرتے۔ یہ صورت تیسری صدی کے آخر تک قائم رہی اس وقت تک نہ عمل بالحدیث پر کوئی طعن کرتا اور نہ اجتہاد پر الزام دیتا۔ مگر چوتھی صدی ہجری میں حالات دگرگوں ہوگئے سلاطین عباسیہ کے سامنے مناظرے اور مجادلے ہونے لگے۔ ہمسروں پر غالب آنے کے شوق نے لوگوں کے دلوں میں لالچ پیدا کر دیا۔ اور انہوں نے علم کو دنیائی تحصیل کا ذریعہ سمجھنا شروع کر دیا وہ اپنے ائمہ کے اقوال کو مثل کتاب اور سنت کے مستند گردانتے۔ یہاں تک کہ کورانہ تقلید کے جذبے میں لوگ حقائق سے غافل ہوگئے۔ اس طرح فقہ حکمت اور علم کی حقیقت تو جاتی رہی اور مباحثات و مناظرات کا نام استنباط و دقائق شرع رکھا گیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی۔ کہ جو کوئی علم الکلام کے جاننا والا ہوتا۔ اسے لوگ جامع منقول عالم سمجھتے جیسا کہ امام غزالی احیاء العلوم میں فرماتے ہیں۔

"یعنی جو شخص جھگڑالو اور چرب زبان ہوتا اس کو لوگ عالم جانتے اور جو بیہودہ قصّے بیان کرنے والا اور خرافات بکنے والا ہوتا اس کو سب عالم کہتے۔ غرض اس طرح تقلید جو دوسری صدی میں شروع ہوئی، چوتھی صدی میں پوری ہوگئی۔ اور یہ وہ وقت تھا جب کہ قال اللہ وقال الرسول کی جگہ قال زید و قال عمر رائج ہوگیا۔ اور فقہی امور میں بجائے عقلی دلائل کے نقل سے کام لیا

جانے لگا۔ اور بغیر کسی سند اور قول کے بات نہ بنتی تھی۔ جب قرآن اور سنت میں انہیں اپنے اقوال کے اثبات میں سند نہ ملتی تھی، تو انہوں نے اپنے شیوخ کے اقوال کو بطور سند پیش کرنا شروع کر دیا اور انہی کو حجت گردانا۔ جس طرح موضوع احادیث کو اس زمانہ میں صاحب الشریعت کی طرف منسوب کیا جاتا۔ اسی طرح اس زمانے میں علماء اور فقہا کے اقوال سند میں پیش ہونے لگے نیز فقہا کے قول کی عزت زیادہ کرنے کے لئے اکثر جھوٹی باتیں ان کی طرف منسوب کی جانے لگیں۔ موضوع احادیث کو الگ کرکے علماء نے ان کی موضوعیت کو تو بیان کر دیا۔ لیکن فقہا کے اقوال موضوعہ کو ان کے اقوال صحیحہ سے جدا کرنے پر اس طرح کسی نے توجہ نہ کی۔"

علامہ اقبال مرحوم نے اپنی کتاب تشکیل جدید الہیات اسلامیہ کے خطبہ ششم میں جس کا عنوان "ہیئت اسلامی میں اصول حرکت" ہے، فقہ اسلامی پر بحث کرتے ہوئے تقلید شخصی کا ذکر تو کیا ہے۔ لیکن تقلید غیر شخصی کے متعلق انہوں نے سکوت اختیار کیا ہے وہ اپنے مذکورہ بالا خطبہ میں لکھتے ہیں کہ بعض مغربی مصنفوں نے ترکوں کو تقلید اور جمود کا ذمہ دار قرار دیا ہے۔ لیکن یہ نظریہ بالکل سطحی ہے اس لئے کہ تاریخ اسلام میں ترکی اثر و نفوذ کے کارفرما ہونے سے بہت پہلے فقہی مذاہب مستقل بنیادوں پر قائم ہو چکے تھے۔ اور مسلمانوں نے اجتہاد کا دروازہ بند کر لیا تھا۔ ان کے نزدیک تقلید کی وجوہات مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ تحریک عقلیت (Rationalism) اسلام میں عہد عباسیہ کے آغاز میں پیدا ہوئی۔ اور اس تحریک نے تلخ اختلافات کو جنم دیا۔ آخری خلفائے عباسیہ کو عقلی آزاد خیالی سے خطرہ محسوس ہوا۔ تو ملک اور قوم کو انتشار سے بچانے کے لئے انہوں نے تمام شریعت اور فقہ کو جامد کر دیا۔

۲۔ مرتاض تصوف کا آغاز اور اس کی ترقی۔ اس نے تدریجی طور پر غیر اسلامی تاثیر کے اثرات کے تحت ایک خالص قیاسی پہلو تعمیر کیا تھا۔ بڑی حد تک تقلید اس طرز عمل کی ذمہ دار ہے۔ تصوف کی عقلی توجیہات میں غیر اسلامی عناصر نفوذ کر چکے تھے۔ لیکن مذہبی حیثیت سے وہ

فقہا، کی دُور از کار موشگافیوں کے خلاف ایک ردِ عمل تھا۔ اس طرح تصوف عقلیت اور آزاد خیالی کا حامی ہو گیا تھا۔ فقہا کی ظاہر پرستی سے بیزار ہو کر صوفیائے کرام نے ظاہری شریعت کو ترک کر کے تصوف کی راہ اختیار کر لی۔ تصوف کے اس طرز فکر نے اسلام کا معاشری نظام آنکھوں سے اوجھل کر دیا اور نفوس عالیہ کو تصوف نے اپنا گرویدہ بنا لیا۔ عوام کی رہبری کے لئے نہایت ہی معمولی قابلیت کے آدمی رہ گئے۔ اب عوام کے لئے تقلید کے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔

۳۔ تیرہویں صدی کے وسط میں بغداد کی تباہی سے کتب خانے تباہ ہو گئے۔ نیز علماء کثرت سے شہید ہو گئے۔ ان حالات میں اجتہاد کو روکا گیا۔ علامہ اقبال لکھتے ہیں کہ ہنگامی طور پر یہ طریق غلط نہ تھا۔ مگر بعد میں تقلید شیوۂ ملت بن گئی اور تباہی کا موجب ہوئی۔

اگر ہم غور کریں تو معلوم ہوگا کہ حضرت شاہ ولی اللہ کے زمانہ میں بھی حالات اجتہاد کے لئے سازگار نہ تھے۔ چنانچہ انہوں نے ہندوستان میں فقہ حنفی کی تقلید پر زور دیا۔ تاہم وہ اجتہاد کے خلاف نہ تھے۔

○

بات دراصل یہ ہے کہ فقہ کے مذاہب گو ایک دوسرے سے مختلف ہیں، لیکن جہاں تک فقہ کے ضمن میں دین اسلام کے ضروری اصول و مبادی کا تعلق ہے، مذاہب فقہ میں سے ہر مذہب میں وہ موجود ہیں۔ مزید برآں اگر کوئی شخص فقہ کے ان مذاہب میں سے کسی مذہب کا تابع نہ ہو، تو اس کی وجہ سے یہ نہیں ہوتا کہ آپؐ اس شخص سے ناراض ہوں۔ ہاں اس سلسلے میں اگر کوئی ایسی بات ہو، جس سے ملت میں اختلاف ہو یا اس بنا پر لوگ آپس میں لڑنے جھگڑنے لگیں اور ان میں ناچاقی پیدا ہو جائے تو ظاہر ہے اس سے بڑھ کر آپؐ کی ناراضگی کی اور کیا وجہ ہو سکتی ہے۔

فیوض الحرمین

سرزمین سندھ میں علمِ حدیث[1]

مخدوم امیر احمد

شیخ ابوالحسن ٹھٹوی سندھی ثم مدنی

نام محمد بن صادق سندھی ۱۱۳۵ھ میں ٹھٹھہ میں پیدا ہوئے۔ وہاں تعلیم حاصل کی اور حرمین شریفین کی طرف ہجرت فرما گئے۔ حرمین شریفین کے مشہور علماء شیخ محمد حیات سندھی، شیخ شمس بن عقیلہ، شیخ سالم بن عبداللہ بصری اور عطاء مکی وغیرہم سے استفادہ کیا ورزازی صغیر، فلانی، شیخ شاکر العقاد، حافظ مرتضیٰ زبیدی، امین الدین بن حمید الدین کاکوروی اور شیخ محمد عابد انصاری سندھی جیسے فضلائے وقت آپ کے شاگردوں میں شمار ہوتے ہیں۔

آپ وقت کے امام، علم حدیث کے شیخ اور اجتہاد کے درجہ پر فائز تھے۔ آپ میں مذہبی تعصب نہ تھا۔ آپ اصولاً حنفی تھے لیکن اگر آپ کو حق اپنے امام کے مذہب کے خلاف دکھائی دیتا تو اپنے امام کے مذہب کو چھوڑ کر حق پر عمل پیرا ہوتے۔ اپنے شاگردوں کو بھی ان فقہی روایات کو جو حدیث نبوی کے موافق ہوں ان کے مخالف روایات پر ترجیح دینے کی ہدایت فرماتے تھے۔ انہوں نے شرح نخبۃ الفکر تصنیف کی۔ ابن الاثیر کی کتاب جامع الاصول کی شرح بھی شروع کی تھی لیکن فقط ایک جلد مکمل کر سکے۔ اپنے استاذ شیخ محمد حیات سندھی کی وفات کے بعد ان کی مسند پر بیٹھ کر حدیث کا درس دیتے رہے۔

---

[1] اس مضمون کی پہلی قسط جولائی کے شمارے میں شائع ہوئی ہے۔

آپ بڑے خوشخط تھے اور عادت تھی کہ بخاری شریف نہایت احتیاط سے زیر وزبر کے ساتھ لکھتے جب مکمل ہوجاتی تو لوگ بڑے شوق سے ایک سو ریال تک قیمت ادا کرکے خرید کرتے آپ کے ہاتھ کا لکھا ہوا بخاری شریف کا ایک نسخہ امام یمن کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

۱۱۸۷ھ میں مدینہ منورہ میں وفات پائی اور جنت البقیع میں مدفون ہوئے۔

شیخ عبداللہ بن محمد سندھی

سرزمین سندھ میں پیدا ہوئے۔ مدینہ شریف ہجرت کرگئے اور وہاں شیخ محمد حیات سندھی کی صحبت اختیار کی۔ چالیس سال تک مدینہ منورہ میں رہ کر درس دیا اور مدینہ منورہ کے طلباء ان سے فیض یاب ہوتے رہے۔

آپ بڑے صاحب برکت تھے۔ جو طالب علم ان سے کچھ پڑھتا تھا، اس کا انشراحِ صدر ہوجاتا تھا اور کمال حاصل کرلیتا تھا۔ آپ بڑے سخی، صاحب مروت حیادار اور شفیق تھے۔

۱۱۹۴ھ میں مدینہ شریف میں فوت ہوئے۔

شیخ محمد عابد سیوستانی سندھی ثم مدنی

محمد عابد بن احمد علی بن حافظ یعقوب بن محمود انصاری خزرجی۔ آپ میز بانِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابوایوب انصاری خزرجی کے اولاد میں سے ہیں۔ سندھ کے مشہور تاریخی شہر سیون میں پیدا ہوئے آپ کا خاندان سندھ کا ایک مشہور علمی خاندان تھا۔ آپ کے دادا حافظ یعقوب شیخ الاسلام کے عہدہ پر فائز تھے آپ کے والد احمد علی اور چچا محمد حسین بھی بڑے عالم اور فاضل تھے۔ آپکے چچا محمد حسین شیخ محمد حیات سندھی کے شاگرد تھے۔

شیخ محمد عابد نے اپنے چچا شیخ محمد حسین سے تعلیم حاصل کی اور کمال کے درجہ کو پہنچے۔ آپکے دادا حافظ یعقوب نے آخر عمر میں عربستان کی طرف ہجرت کی اور جدہ میں وفات فرمائی۔ آپکے والد

---

(۱) الجبرتی علی حاشی الکامل ج ۲ ص ۹۲

احمد علی بھی جدہ میں فوت ہوئے اور آپ کے چچا محمد حسین یمن کی طرف گئے اور حدیدہ میں دارالبقا کی طرف راہی ہوتے۔

شیخ محمد عابد نے بھی عمر کا بڑا حصہ یمن کے شہر زبید میں گذارا اور اپنے چچا، نیز زبید اور حجاز کے مشہور علماء سے استفادہ کیا۔ پھر انہوں نے کچھ وقت یمن کے دارالسلطنت صنعاء میں اقامت اختیار کی اور یمن کے امام کا کامیاب علاج کیا اسی عرصہ میں یمن کے وزیر کی بیٹی سے آپ کا عقد بھی ہوگیا۔ یمن کے امام نے ان کو اپنا سفیر بنا کر ہدایا و تحائف دیکر مصر روانہ کیا۔ مصر کا حاکم آپ کے علم و فضل، عقل و ذہانت سے کافی متاثر ہوا۔ آپ کو مدینہ منورہ میں سکونت کا بڑا شوق تھا اور ہمیشہ اپنے پروردگار سے یہی دعا مانگتے رہتے تھے کہ "خدایا میری زندگی اور موت مدینہ میں ہو۔ تیرے محبوب کے سایہ میں زندگی گذرے اور دارالامان میں امان نصیب ہو"۔ ایک دفعہ آپ مدینہ شریف رہنے کے ارادہ سے پہنچے لیکن چونکہ آپ کی طبیعت میں حق گوئی اور راستبازی کی عادت تھی اس لئے وہاں کے لوگوں میں جو بدعات رائج ہو چکی تھیں ان پر ان کو ٹوکنا شروع کیا۔ لوگ آپ کے خلاف ہو گئے اور مجبوراً آپ کو جوارِ حبیبؐ ترک کرنا پڑا۔

اس حق گوئی کی وجہ سے آپ کو یمن میں بھی مصیبت سے دوچار ہونا پڑا۔ ہوا یہ کہ ۱۲۲۴ھ میں جب آپ حدیدہ میں ساکن تھے، اس وقت وہاں کے قاضی سید حسین بن علی الحازمی نے یمن کے زیدی شیعہ امام کو راضی کرنے کے لئے اذان میں "حی علی خیر العمل" بڑھانے کا حکم دیا۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی حکم دیا کہ فجر کی اذان سے الصلوٰۃ خیر من النوم کا جملہ نکال دیا جائے کیونکہ یہ جملہ عمر فاروقؓ نے اضافہ کرایا تھا۔ لوگوں نے قاضی کے اس حکم کو ماننے سے انکار کیا تو قاضی نے شہر کے چالیس سربرآوردہ حنفی علماء کو گردن میں زنجیر ڈال کر قید میں رکھ دیا۔ شیخ محمد عابد بھی ان میں شامل تھے۔ چھ دن تک قید میں رکھ کر دوسروں کو تو اس نے آزاد کر دیا لیکن شیخ محمد عابد کو شدید زدوکوب کے بعد حدیدہ سے جلاوطن کر دیا۔

اس کے بعد آپ ایک دفعہ پھر اپنے وطن مالوف سندھ واپس آئے اور لواری ضلع

حیدرآباد میں کچھ دن خواجہ محمد زمان لواروی کی صحبت میں رہے یہاں سے پھر دیارِ حبیب کا عشق ان کو کشاں کشاں مدینہ طیبہ لے گئے، لیکن اس دفعہ ان کو والیٔ مصر کی حمایت حاصل تھی اس لئے نہایت عزت و احترام کے ساتھ مدینہ منورہ میں رہنے لگے۔ آپ وہاں کے علماء کے سرگروہ تھے اور تازندگی اقامتِ سنت اور محوِ بدعت میں مصروف رہے۔

آپ بڑے عابد و زاہد، نیک سیرت اور خوش اخلاق بزرگ تھے۔ کئی ضخیم اور مختصر کتابیں یادگار چھوڑی ہیں جن میں سے چند یہ ہیں۔

المواھب اللطیفہ شرح مسند الامام ابی حنیفہ، اس میں آپ نے مسند امام ابی حنیفہ بروایت حصکفی کی نہایت شرح و بسط سے شرح کی ہے۔ مسند کی روایات کے لئے حدیث کی دوسری مشہور و معروف مسانید، جوامع اور سنن سے شواہد و متابعات پیش کی ہیں مشکل الفاظ کی شرح کی ہے، منقطع روایات کا وصل کیا ہے اور مرسل روایتوں کو مرفوع کر کے دکھایا ہے۔ خلافی مسائل پر بحث کر کے ان کے متعلق امام ابو حنیفہ کے دلائل بیان کئے ہیں۔ بہرحال کتاب قابل دید ہے۔ اس کا ایک نسخہ درگاہ شریف پیر جھنڈو کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

طوالع الانوار شرح درمختار۔ فقہ کی مشہور کتاب درمختار کی شرح ہے۔ اس میں حنفی مذہب کے فروع، واقعات اور فتاویٰ کو انتہائی طور پر جمع کیا ہے۔ شاید ہی کوئی مسئلہ ہو جو اس کتاب سے باہر ہو۔ اس کتاب کا ایک نسخہ مدینہ منورہ میں شیخ الاسلام کے کتب خانہ میں اور ایک نسخہ لواری شریف کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔

شرح تیسیر الوصول۔ یہ شرح بڑی شرح و بسط کے ساتھ لکھی تھی اور کتاب الحدود تک پہنچے تھے کہ یمن کے بعض بزرگوں نے ان سے یہ مانگی تو ان کو دے دی اور اس کتاب کو کوئی نہ دیکھ سکا حافظ ابن حجر عسقلانی کی کتاب "بلوغ المرام من ادلۃ الاحکام" کی شرح بھی شروع کی تھی لیکن مکمل نہ کر سکے۔

آپ کے پاس ایک بڑا اچھا کتب خانہ تھا، جس میں تفسیر حدیث اور چاروں فقہی مذاہب کی

عمدہ کتابوں کا بڑا ذخیرہ تھا۔ آپ نے یہ پورا کتب خانہ مدینہ کے کتب خانہ شیخ الاسلام کے لئے وقف کر دیا۔ مجھ سے ۱۹۵۲ء میں میرے بزرگ استاد شیخ مالکی مکی نے بتایا کہ مذکورہ بالا کتب خانہ میں شیخ عابد سندھی کا ایک بیاض ہے جو بڑی نادر چیز ہے اور اس پر ان کے دستخط ہیں۔ میں نے اس کے دیکھنے کی بہت کوشش کی لیکن چونکہ مکتبہ شیخ الاسلام مسجد نبوی کی توسیع کے کام کی وجہ سے بند تھا اس لئے میں یہ بیاض نہ دیکھ سکا۔

شیخ محمد عابد مدینہ منورہ میں ۱۹ ربیع الاول ۱۲۵۷ھ پیر کے دن اس دار فنا کو چھوڑ کر دار بقا کو روانہ ہوئے۔

شیخ محمد عابد کا سب سے بڑا تصنیفی کارنامہ جس کی نظیر دنیا میں نہیں ملے گی سندوں کی کتاب "ثبت" ہے اس ثبت سے زیادہ صحیح اور جامع آج تک کوئی ثبت نہیں لکھی گئی ہے۔ شیخ نے یہ کتاب ایک ضخیم جلد میں لکھی ہے اور اس کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ قسم اول میں تفسیر، حدیث فقہ، معانی، بیان، صرف، نحو، منطق اور طب وغیرہ کی کتابوں کی سندیں لکھی ہیں۔ قسم ثانی میں مسلسل حدیثوں کا ذکر کیا ہے۔ قسم ثالث میں تصوف کے سلسلوں کا بیان ہے۔ یہ کتاب درگاہ شریف پیر جھنڈو کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

شیخ کے شاگردوں کی فہرست بڑی لمبی ہے۔ دنیا کے کونے کونے میں ان کے شاگرد موجود ہیں۔ آج کل کے مکہ شریف اور مدینہ شریف کے علماء ان کے خوشہ چیں ہیں۔ آپ کے شاگردوں میں سے چند بزرگوں کے اسماء گرامی یہ ہیں۔

سید ہاشم بن شیخ حبشی باعلوی مدنی، شیخ حسن حلوانی مدنی۔ عبداللہ بن ادریس سنوسی شیخ جمال بن شیخ عمر مکی مفتی الحنیفہ۔ سید داؤد بن سلیمان بغدادی۔ ابوالمحاسن محمد بن خلیل قاؤقجی طرابلسی۔ شیخ برہان الحق بن شیخ نورالحق انصاری لکھنوی فرنگی محل۔ شیخ علیم الدین بن شیخ رفیع الدین عمری قندھاری حیدرآبادی، علامہ محمد حیدر بن ملا مبین انصاری حیدرآبادی۔ خواجہ محمد زماں لواروی سندھی۔ قاضی ارتضیٰ علی خاں عمری صفوی مدراسی۔ شیخ محمد بن عمر

جامی زادہ مدنی مفتی الحنفیہ بالمدینۃ، استنبول کے شیخ الاسلام شیخ عارف اللہ بن حکمۃ اللہ ترکی اور شیخ عبدالغنی دہلوی عمری وغیرہم ۔[1]

اب ہم ان محدثین کا ذکر کرتے ہیں جو سندھ میں پیدا ہوئے ۔ سندھ میں تعلیم حاصل کی اور سندھ میں فوت ہوئے ایسے بزرگوں کی ایک لمبی چوڑی فہرست تیار کی جا سکتی ہے لیکن ہم مضمون کی تنگ دامانی کو مدنظر رکھتے ہوئے صرف چند بزرگوں کا ذکر کرتے ہیں ۔

مخدوم بلال ٹلٹی

آپ موضع ٹلٹی ضلع دادو میں سکونت رکھتے تھے، تفسیر اور حدیث میں ماہر تھے ۔ زہد و تقویٰ میں ان کا کوئی ہمسر نہ تھا ۔ لوگوں کو پند و نصیحت کرنا آپ کا وظیفہ تھا ۔

ایک بار وہ ٹلٹی سے سلطان العارفین مخدوم شہباز قلندر کے اشارہ پران کی زیارت کے لئے آرہے تھے کہ راستہ میں دریا پار کرنے کے لئے کشتی میں سوار ہو گئے اس اثناء میں جیسا کہ ملاحوں کا دستور ہوتا ہے ایک ملاح نے بعض سواروں کے حق میں فحش اور بیہودہ کلمات استعمال کرنے شروع کر دیئے ۔ یہ آواز مخدوم صاحب کے گوش گزار ہوئی تو انہوں نے اپنی ٹوپی اپنے خادم کو دی جس نے اسے لیکر ملاح کے سر پر رکھ دیا ۔ ملاح فی الفور وعظ نصیحت اور آیات قرآنی کی تفسیر بیان کرنے لگا ۔ کشتی میں بیٹھے ہوئے سارے لوگ حیران رہ گئے ۔ قاضی ڈتہ سیوہانی اور مخدوم رکن الدین عرف متو آپ کے شاگردوں میں سے ہیں، آپ کی وفات سنہ ۹۲۹ھ میں واقع ہوئی ۔

مخدوم بلال بڑے محب وطن تھے جب مرزا شاہ بیگ ارغون نے سندھ پر حملہ کرکے جام فیروز سے ٹھٹھہ فتح کیا اور جام فیروز نے اس کی اطاعت قبول کر لی تھی اس وقت سندھ کے باشندوں نے دریا خاں کے بیٹے محمود کی قیادت میں ٹلٹی میں شاہ بیگ سے مقابلہ کرنے کے لئے ایک زبردست لشکر جمع کیا تھا سہتہ اور سوڈھا قبائل کے لوگوں نے کہ جو وہاں موجود تھے

---

[1] فہرس الفہارس ص ۲۵، ص ۲۷۶، الیانع الجنی طبع جید پریس دہلی ص ۹۹ ۔ ۳ ۔ ۲، دحصر اشارد

طے کیا تھا کہ جب تک جان باقی رہے گی جنگ سے ہاتھ نہ اٹھائیں گے، اس وقت کے دوسرے بڑے عالم قاضی قاضن نے جو شاہ بیگ کے طرفدار ہو گئے تھے۔ شاہ بیگ کے کہنے پر چاہا کہ محمود کو اچھی نصیحتوں اور سودمند ہدایتوں سے مخالفت کرنے سے باز رکھ کر اطاعت اور فرمانبرداری کی راہ پر لگائیں لیکن قاضی صاحب کے وہاں پہنچنے پر ان لوگوں نے ان سے ملنا تک گوارا نہ کیا۔ آخرکار شاہ بیگ ٹلٹی کے سامنے آ کر خیمہ زن ہوا۔ تین دن بعد ٹلٹی کا ایک شخص شاہ بیگ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اسے حریفوں کے افواج کی حقیقت سے واقف کر کے یہ بھی بتایا کہ لشکر کے قائدین میاں محمود، متن خاں جام سارنگ اور نمل سوڈھا وغیرہ خدمت میں حاضر ہونے کے لئے آمادہ ہوئے تھے لیکن مخدوم بلال جو اس ملک کے علمائے مشائخ میں سے ہیں انہیں روکے ہوئے ہیں اور آنے نہیں دیتے بلکہ جنگ کی ترغیب دے کر جوش دلا رہے ہیں یہی وجہ ہے کہ فتح حاصل کرنے کے بعد شاہ بیگ نے مخدوم بلال پر سختی کی اور ان پر جرمانہ عائد کیا۔

(میں کہتا ہوں کہ سندھ میں یہ بات مشہور بلکہ متواتر ہے کہ مرزا شاہ بیگ نے مخدوم بلال کو کولھو میں ڈلوا کر سرسوں کی طرح پیڑا تھا۔ اس مجاہد نے یہ عذاب ہنستے ہوئے برداشت کیا اور زبان سے اُف نہیں کی اور جاں جان آفریں کے حوالہ کر دی۔ لیکن یہ روایت کسی تاریخ میں نہیں ملتی)

ان کی وفات ۹۲۹ھ میں واقع ہوئی [1] آپ کا مزار قصبہ باغبان ضلع دادو میں زیارتگاہ خاص و عام ہے

قاضی دتہ سیوھانی

والد کی جانب سے ان کا سلسلہ نسب پانچویں پشت پر قاضی صدرالدین سے جا ملتا ہے، جو پرگنہ خطہ میں قضا کے عہدہ پر مامور تھے۔ کئی بزرگوں کی خدمت میں رہ کر انہوں نے

---

[1] تاریخ معصومی ص۱۶۱ و ۱۷۰ و ۱۹۸ و ۱۹۹ و تحفۃ الکرام ص۱۴۱

تعلیم اور تربیت حاصل کی تھی مطول تک انہوں نے اپنے والد قاضی شرف الدین عرف مخدوم راہو کی خدمت میں رہ کر استفادہ کیا تھا۔ تفسیر اور حدیث کی تحصیل مخدوم بلال کی خدمت میں رہ کر کی۔ ان کے علاوہ انہوں نے مخدوم فخر بلوتہ اور مخدوم عبدالعزیز ابہری ہردی کے حلقۂ درس میں بھی شامل ہوکر علوم و فنون کی تکمیل کی تھی۔ ان کو اٹھارہ تفسیریں یاد تھیں جن میں سے بعض انہوں نے درس میں پڑھی تھیں اور بعض کا خود مطالعہ کیا تھا۔ خط ترکی بڑی آسانی سے پڑھ لیتے تھے۔ علم جفر اور نجوم میں بھی انہیں بڑا دخل تھا۔ سندھ کے حاکم مرزا شاہ حسن اور سندھ کے مورخ میر معصوم بھکری ان کے شاگردوں میں سے تھے مرزا شاہ حسن انہیں اپنے وقت کا امام جاراللہ (زمخشری) کہا کرتے تھے۔

آپ کی وفات کی صحیح تاریخ معلوم نہیں آپ قصبۂ باغبان میں مدفون ہیں۔ [۱]

مخدوم رکن الدین عرف مخدوم متو ٹھٹوی

حضرت صدیق اکبر کی اولاد اور مخدوم بلال کے خلفا میں سے تھے۔ اکثر اوقات وظائف وعبادات میں مشغول رہتے۔ زہد و تقویٰ کے سالک اور ہدایت و ارشاد کے طالب ان سے انتہائی عقیدہ رکھتے تھے۔ وہ علم حدیث میں اپنے دور میں یگانہ تھے ان کی تصنیفات میں شرح اربعین شرح کیدانی اور بعض دوسرے رسائل مشہور ہیں۔

۹۴۹ھ میں ہمایوں کے عین فترہ کے زمانہ میں ٹھٹھہ میں فوت ہوئے۔ مکلی کے قبرستان میں مدفون ہیں [۲]

قاضی قاضن بن قاضی ابوسعید بن زین الدین بھکری

ان کے بزرگ سیوھن شہر کے باشندے تھے۔ ان کے جد امجد (لکڑدادا) ابوالخیر نے

---

[۱] - تحفۃ الکرام ص۱۳۷، تاریخ معصومی ص۱۹۸، ۱۹۹

[۲] - تحفۃ الکرام ص۲۱۸، تاریخ معصومی ص۲۰۰

جو صاحب حال و فضیلت تھے، ٹھٹھہ میں آکر سکونت اختیار کی۔

قاضی صاحب زہد و تقویٰ سے آراستہ اور صاحب کشف بزرگ تھے۔ انہیں بہتیرے بزرگوں کی صحبت حاصل تھی۔ قرآن مجید انہیں پورا حفظ تھا۔ اور اس کے ساتھ قرأت اور تجوید بھی بہت خوب جانتے تھے۔ علم حدیث، تفسیر، اصول و فقہ، تصوف اور علوم آلیہ میں کمال دسترس رکھتے تھے۔ انشا میں بھی اپنے عہد میں یگانہ تھے۔ حرمین شریفین کی زیارتوں سے بھی مشرف تھے علاوہ بریں وہ سید محمد جونپوری کے، جو کہ میراں مہدی کے لقب سے مشہور ہیں مریدوں اور عقیدتمندوں کے سلسلہ میں داخل تھے۔ اسی وجہ سے عالمانِ شریعت ان پر طنز کیا کرتے تھے۔

وقت کے حاکم مرزا شاہ بیگ و مرزا شاہ حسن ان کی بڑی قدر کرتے تھے۔ مرزا شاہ حسن کے دنوں میں وہ بھکر کی قضا کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ اور شرعی مقدمات کا فیصلہ انتہائی احتیاط اور دیانتداری سے کرتے تھے۔ آخر میں انہوں نے اس عہدہ سے استعفیٰ دیدیا تھا جس کے بعد یہ عہدہ ان کے بھائی قاضی نصراللہ کے حوالہ ہوا۔

قاضی صاحب کی وفات ۹۵۸ھ میں ہوئی [1]

مخدوم میراں بن مولانا یعقوب ٹھٹوی

صفاتِ حمیدہ اور اخلاق پسندیدہ میں مشہور اور علم معقول و منقول کے جامع تھے ان کی خدمت میں رہ کر طلبا کے ایک مجمع کثیر نے علم حاصل کیا۔ سندھ کے حاکم مرزا شاہ حسن نے بھی کچھ عرصہ مخدوم کی خدمت میں حاضر رہ کر تعلیم حاصل کی تھی۔

تاریخ وفات ۹۴۹ھ ہے۔

مادہ تاریخ وارث الانبیاء ہے [2]

---

[1] تحفۃ الکرام ص۱۳۷ - ۱۳۸، تاریخ معصومی ص۲، ۲۰۱، ۲۰۲

[2] تاریخ معصومی ص۲۰۲، تحفۃ الکرام ص۲۱۵

مخدوم جعفر بن مخدوم میراں بوبکائی

سندھ کے مشہور شہر بوبک ضلع دادو میں سکونت رکھتے تھے آپ وقت کے جید عالم اور صاحب تصانیف کے ساتھ ساتھ باطنی کمالات کے جامع بھی تھے۔ سندھ کے مشہور ولی اللہ سہروردی طریقہ کے پیر طریقت مخدوم نوح رحمۃ اللہ علیہ کے ہمعصر تھے ایک دفعہ مخدوم نوح رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں ان ظاہری آنکھوں سے خدا تعالیٰ کو دیکھتا ہوں۔ اس پر مخدوم جعفر رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو کہا کہ جس وقت آپ پر اس قسم کی حالت طاری ہو، اس وقت آپ کسی خادم کو حکم دیں کہ آپ کی ان ظاہری آنکھوں کو بند کر دے اگر پھر بھی مشاہدہ کی حالت باقی رہے تو یقیناً آپ کا یہ مشاہدہ ظاہر آنکھ سے نہیں بلکہ باطنی آنکھ سے ہے۔ مخدوم نوح رحمۃ اللہ علیہ نے ایسا کیا اور جب تجربہ کیا کہ ظاہری آنکھ بند ہونے کے بعد مشاہدہ کی حالت قائم رہتی ہے تو فرمایا "اگر جعفر نہ ہوتا تو نوح کافر ہو جاتا۔"

مخدوم جعفر کی تصانیف میں حل العقود فی طلاق المسنود۔ المتانتہ فی مرمتہ الخزانتہ عجالتہ الطالبین مشہور ہیں۔ آپ نے ایک رسالہ 'تعلیم' پر لکھا تھا جس کے اکثر نظریے آج بھی قابل عمل ہیں۔

علاّمہ محمد معین ٹھٹوی

مخدوم محمد معین بن مخدوم محمد امین بن مخدوم طالب اللہ ٹھٹھہ میں پیدا ہوئے اپنے وقت کے مشہور استاد مخدوم عنایت اللہ ٹھٹوی کی خدمت میں تحصیل علم کی، ابن عربی کی کتاب الفصوص علی رضا درویش سے پڑھی۔ امام الوقت شاہ ولی اللہ دہلی سے بھی استفادہ کیا۔ مکہ شریف کے مفتی عبدالقادر صدیقی سے بھی روایت حدیث کی اجازت حاصل تھی۔ اپنے وقت کے مرشد شیخ ابوالقاسم نقشبندی سے بیعت تھے۔

مخدوم معین کسی معین امام کی تقلید کے قائل نہ تھے انہوں نے تقلید کے ردّ میں ایک معرکتہ الآرا کتاب دراسات اللبیب کے نام سے تصنیف کی تھی۔ آپ نے فقہ، حدیث

منطق، فلسفہ اور تصوف میں کئی چھوٹے چھوٹے رسائل بھی لکھے ہیں لیکن آپ کا صحیح کمال دراسات اللبیب سے ہی ظاہر ہوتا ہے،

مخدوم محمد معین کی وفات ۱۱۶۱ھ میں ہوئی۔ ٹھٹھہ کے مشہور مقام مکلی میں مدفون ہیں [1]

مخدوم محمد ہاشم ٹھٹوی

سرگروہ کاملینِ وقت و قدوہِ محدثین زماں مجددادان مخدوم محمد ہاشم بن عبدالغفور بن عبدالرحمٰن ٹھٹوی ۱۱۰۴ھ میں بٹورہ ضلع ٹھٹہ میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم اپنے والد مخدوم عبدالغفور سے حاصل کی اس کے بعد ٹھٹھ جاکر وہاں کے مشہور عالم مخدوم ضیاء الدین ٹھٹوی کی خدمت میں حدیث و فقہ و دیگر علوم و فنون کی تکمیل کی۔ بعدہٗ حرمین شریفین جاکر مقامات مقدسہ کی زیارت کا شرف حاصل کیا اور مکہ شریف کے مشہور علما اور محدثین مثلاً شیخ عبدالقادر صدیقی۔ شیخ عبد بن علی مصری، شیخ محمد ابی طاہر مدنی اور شیخ علی بن عبدالملک دراوی سے حدیث کی سند حاصل کی۔ طریقت کا خرقہ سید سعداللہ سورتی سے پہنا جو اپنے وقت کے مرشد کامل تھے۔

آپ نے تین سو سے زائد کتابیں تفسیر، حدیث، فقہ، تجوید، حساب، فلسفہ وغیرہ علوم و فنون پر عربی فارسی اور سندھی میں لکھی ہیں۔ جس میں اکثر ضائع ہو چکی ہیں جو موجود ہیں وہ آپ کی جلالت شان اور تبحر علمی پر دلالت کرتی ہیں۔ آپ کی تصانیف میں سے حیاۃ القاری باطراف البخاری، فرائض الاسلام، تحفۃ القاری۔ مجمع المقاری ایسی کتابیں ہیں جن کی نظیر شاید ہی کہیں مل سکے۔ آپ کا ایک ثبت بنام اتحاف الاکابر اور اس کا ذیل موجود ہے۔

---

[1] - مقدمہ علی بذل القوۃ فی حوادث سنی النبوۃ و مقدمہ دراسات اللبیب و تحفۃ الکرام صـ ۱۲۴ و مقالات الشعراء صـ ۱۲۱ - ۱۲۹ و ۳۸۴ و ۶۳۶

مخدوم ابوالحسن صغیر ٹھٹوی ثم مدنی، حاجی فقیراللہ علوی شکارپوری مخدوم عبداللطیف بن مخدوم محمد ہاشم نامور علما آپ کے شاگرد تھے۔

مخدوم ہاشم کی رحلت ۱۱۷۴ھ میں ہوئی ٹھٹھ شہر میں مکلی کے قبرستان میں مدفون ہیں۔ آپ کا مزار زیارت گاہ خاص و عام ہے راقم الحروف نے آپ کے حالات زندگی آپ کی مصنفہ کتاب بذل القوہ فی حوادث سنی النبوہ کے مقدمہ میں بالتفصیل ذکر کئے ہیں۔

سید حاجی فقیر اللہ علوی شکارپوری

عارف کامل عالم باعمل غوث وقت رتاس ضلع جلال آباد میں پیدا ہوئے افغانستان اور ہندوستان کے علما سے کسب علم کیا۔ حدیث مخدوم محمد ہاشم ٹھٹوی رحمۃ اللہ علیہ مخدوم محمد حیات ٹھٹوی اور علمائے حرمین سے حاصل کی آپ نے بھی کافی کتابیں تصنیف کیں جن میں قطب الارشاد، براہین النجاۃ، الفتوحات الغیبیہ، الازھار فی ثبوت الاثار وغیرہ مشہور ہیں۔ آپ کی علمی شان صحیح معنوں میں آپ کے مکتوبات سے ظاہر ہوتی ہے۔ جو آپ کی اولاد میں سے ایک جید عالم سید میر علی نواز علوی کی سعی و کوشش سے لاہور میں چھپ کر شائع ہوئے تھے۔ اس مجموعہ میں آپ کے ۵۸ مکتوبات ہیں جن میں حدیث تفسیر، فقہ، سیاست، تصوف وغیرہ پر نادر معلومات اور عجیب و غریب تحقیقات مندرج ہے حدیث کے اسناد کے متعلق آپ کا ایک ثبت بھی ہے جس کا نام وثیقۃ الاکابر ہے۔ آپ عربی اور فارسی کے شاعر بھی تھے۔

سید حاجی فقیر اللہ علوی کی وفات ۱۱۹۵ھ میں ہوئی شکارپور کے محلہ ہزاری در میں آپ کا مزار زیارت گاہ خاص و عام ہے۔ [۱]

خواجہ محمد زمان ولد حاجی عبداللطیف لواری

آپ سندھ کے مشہور پیر اور طریقۂ نقشبندیہ کے شیخ ہیں۔ سندھ پنجاب اور

[۱] مقدمہ بذل القوہ فی حوادث سنی النبوہ

راجپوتانہ میں آپ کے ہزاروں مرید ہیں۔

آپ رمضان ۱۱۲۵ھ میں ٹھٹھہ میں پیدا ہوئے ظاہری علوم کی تکمیل ٹھٹھہ کے مشہور عالم مخدوم محمد صادق کی خدمت میں کی اور تصوف میں خلافت کا خرقہ مخدوم ابوالقاسم نقشبندی ٹھٹوی سے پہنا۔ عام طور پر ان کو پیر طریقت کی حیثیت میں پہچانا جاتا ہے لیکن آپ بڑے پایہ کے محدث بھی تھے۔

مخدوم محمد عابد انصاری جیسے جلیل القدر محدثین آپ کے شاگردوں میں سے ہیں عرب کے علماء تک آپ سے حدیث کی روایت کرتے ہیں۔

ان کی وفات ۴ ذوالقعد ۱۱۸۸ھ میں ہوئی اور لواری ضلع حیدرآباد میں آپ کا مزار زیارت گاہ خلائق ہے۔

اس مختصر مقالہ میں ان چند بزرگوں کے مختصر تعارف پر اکتفا کی جاتی ہے اس سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے برصغیر ہند و پاک میں حدیث کے پہلے علمبردار سندھی بزرگ ہیں

○

اس ضمن میں تمہیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ شریعتوں کے احکام و قواعد کی تشکیل لوگوں کی عادات کے مطابق ہوتی ہے۔ اور اس بات میں اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی حکمت پوشیدہ ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ جب کسی شریعت کی تشکیل ہونے لگتی ہے، تو اس وقت اللہ تعالیٰ لوگوں کی عادات پر نظر ڈالتا ہے اب جو عادتیں بری ہوتی ہیں ان کو ترک کرنے کا حکم دیا جاتا ہے۔ اور جو عادتیں اچھی ہوتی ہیں، ان کو اپنے حال پر رہنے دیا جاتا ہے، یہی کیفیت "وحی متلو" کی ہے۔ یہ وحی ان الفاظ، کلمات اور اسالیب میں جو خود صاحب وحی کے ذہن میں پہلے سے محفوظ ہوتے ہیں، صورت پذیر ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ عربوں کے لئے اللہ تعالیٰ نے عربی زبان میں وحی کی، اور سریانی بولنے والوں کے لئے سریانی میں اور اسی قبیل سے رویائے صالحہ اور سچے خواب ہیں۔ (فیوض الحرمین)

علوم کشفیہ اور شاہ ولی اللہؒ

مولانا محمد عبداللہ عمرپوریؒ[1]

علوم عقلیہ کی طرح علوم کشفیہ و وجدانیہ میں بھی حضرت شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ کا طریقہ بڑی احتیاط، نہایت سلامت روی، حکیمانہ استنباط و استخراج اور استقامت علی الدین القویم کا پورا حامل ہے، حضرت شاہ صاحب کے نزدیک علوم کشفیہ وہی معتبر ہیں، جو کہ نقل صحیح سے پوری مطابقت رکھتے ہیں۔ اور نقل صحیح وہ ہے، جس کا سلسلۂ روایت مخبر صادق و مصدوق اور احسن عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات مبارک تک بلا غبار و بلا ریب و شک پہنچتا ہے آپ کے نزدیک نقل صحیح ہی علوم کشفیہ کا اصل مرکز و منبع ہے اور علوم کشفیہ میں سے جو چیز اس کے مخالف ہو، یا اس سے متصادم ہوتی ہو اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی است

اسی نقل صحیح کی روشنی میں حضرات صحابہ کرام، تابعین اور تبع تابعین کے اقوال کی تنقیح کی جاتی ہے، اور تحقیق کے بعد ان کے ارشادات نبوی کے مطابق ہونے پر علوم فقہ، تفسیر، تاریخ، معارف، آثار، فتاویٰ اور اقضیہ قابل اعتبار قرار پاتے ہیں، اور ان کا شمار علوم نقلیہ میں کیا جاتا ہے

---

[1] اس سلسلے کا پہلا مضمون "علوم عقلیہ اور خانوادۂ ولی اللہی" جولائی کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔

مکشوفات اور وجدانیات کے علوئے مرتبت کے درجات کا تعین صاحبِ کشف کی پاکیزگیِ طبع، صحتِ شعور و وجدان اور بلندیِٔ فکر سے ہوتا ہے، اور یہ چیز انبیائے علیہم السلام کے بتلائے ہوئے راستے پر چلنے اور ان کی ہدایت سے مستفید ہوئے بغیر میسّر نہیں ہوتی، اسی لئے ہمارے نزدیک مکاشفہ و مشاہدہ وہی معتبر ہوگا۔ جو شریعت حقہ کے نقیض نہ ہو۔

نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیثِ خواب گویم
چوں غلام آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم

بذاتِ خود کشف صحیح ایک حقیقت ثابتہ ہے، جس کا انکار کوئی سلیم الفطرت انسان نہیں کر سکتا۔ اس ضمن میں رویائے صادقہ بھی آتا ہے جو روحانی مشاہدے کا ایک ذریعہ ہے۔ اور اس کی اصلیت، واقعیت اور اس سے مترتب ہونے والے آثار کسی سے پوشیدہ نہیں خود انبیا علیہم السلام کی نبوت بھی اس سلسلے کی ایک نہایت کامل اور ترقی یافتہ صلاحیت ہے، جو عالم بالا سے تعلق پیدا کرنے کے بعد وہاں مقبولیت کا درجہ حاصل کرکے اس عالم اسفل کو نور ہدایت سے منور کر دیتی ہے۔ رویائے صادقہ اور روحانی مشاہدہ کے واقعات بکثرت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہیں، جن کا انکار نہیں کیا جاسکتا یہ فیض قیامت تک جاری رہے گا۔ خصوصیت کے ساتھ اس صلاحیتِ روحانی سے اکابر اولیاء اللہ اور صالحین امت کو حصہ وافر عطا ہوتا ہے اور ان میں سے ہر ایک کی ذات سے اس کی ہمت اور قوت کے مطابق عملی زندگی میں اس کا مظاہرہ ہوتا رہتا ہے

شاہ ولی اللہ کا گھرانا ایسے ہی پاکیزہ نفوس بزرگان دین اور صالحین امت کا تھا اور اس میں روحانی کمالات نسلاً بعد نسل چلے آتے تھے۔ علاوہ ازیں آپ کو اپنے والد بزرگوار کے واسطے سے حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی نقشبندی رحمتہ اللہ علیہ کے ارشد و اکابر خلفاء حضرت سید آدم بنوری اور حضرت خواجہ عبداللہ بن حضرت خواجہ باقی اللہ رحمتہ اللہ علیہ سے مزید فیوض روحانی حاصل کرنے کا موقع ملا۔ مزید یہ کہ آپ نے اپنی ان بہم کردہ روحانی صلاحیتوں کو اہل حرمین شریفین کی خدمت عالیہ میں پہنچکر اور تقویت پہنچائی۔ اور حرمین شریفین کی برکات، انوار، فیوضات

اور حضور اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی روح پُر فتوح سے آپ بلا واسطہ استفادہ کرتے رہے جس کا بیان شاہ صاحب نے بڑی تفصیل سے اپنی کتاب فیوض الحرمین میں کیا ہے۔ نیز آپ تمام سلاسل ولایت و بیعت کے خانوادوں سے تعلق رکھتے تھے اور ان سب کے اذکار و اشغال کے مراحل طے فرما چکے تھے۔ ان سب امور کا ذکر آپ نے اپنی تصانیف قول جمیل۔ الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ اور ہمعات میں کیا ہے۔

شاہ ولی اللہ صاحب نے معارفِ تصوف و ولایت کے متبحرین اور اکابر واصلین باللہ کی بلند پایہ کتابوں کا بڑی غائر نظر اور دقتِ فکر سے مطالعہ کیا تھا۔ اور شیخ محی الدین ابن عربی امام غزالی اور دوسرے اہل سنت کی تصنیفات سے کافی استفادہ فرمایا آپ نے شیخ ابن عربی کی کتاب فصوص الحکم کی طرز پر حضرات انبیاء علیہم السلام کے لطائف روحانیہ عارفانہ انداز میں اپنی کتاب تاویل الاحادیث میں قلم بند کئے ہیں۔ اور اسی قسم کی دوسری کیفیات خصوصی عنوانات کے تحت خیر کثیر، بدور بازغہ، تفہیمات الہیہ، اور کلمات طیبات میں بھی ذکر کی ہیں حضرت امام ابو حامد الغزالی کی ایک کتاب معارج القدس ہے شاہ صاحب نے اسی موضوع پر کہ انسان کے روحانی قوائے اور جسمانی لطائف کی کیا کیفیات اور خصوصیات ہیں ان کی تربیت اور تہذیب کے کیا طریقے ہیں اور اس کی تکمیل کے بعد ان کا انسان کی زندگی پر کیا اثر پڑتا ہے۔ اپنی کتاب الطاف القدس لکھی۔ اور بعض دوسری کتابوں میں بھی ان پر روشنی ڈالی ہے۔

الطاف القدس کا مطالعہ کرنے کے بعد انسان روحانی کمالات کے جھوٹے مدعیوں کے دھوکے سے آگاہ ہو جاتا ہے۔ اور ان کے فریب میں نہیں آسکتا۔ اس ضمن میں ایک لطیفہ بھی سنئے $\frac{۱۳۵۲ھ}{۱۹۳۳ء}$ کا واقعہ ہے راقم السطور مکہ معظمہ سے واپسی کے بعد علاج کے لئے کراچی میں مقیم تھا کہ حیدرآباد دکن سے ایک ماہر روحانیت کی آمد کا بڑا شہرہ ہوا۔ حکیم علی محمد قادری مرحوم کے دولت کدے پر میری اس شخص سے ملاقات ہوئی اس کا کمال یہ تھا کہ اگرچہ اس کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی ہوتی، لیکن وہ کاغذ پر لکھی ہوئی تحریر فر فر

پڑھ ڈالتا۔ اور اس میں کوئی غلطی نہ ہوتی۔ لوگوں کا اس شخص کی طرف بے پناہ رجوع تھا اور وہ بڑی فرط عقیدت سے اس کے ہاتھ چومتے تھے۔ حالانکہ یہ شخص مطلق دین دار نہ تھا اور اس کے اخلاق بھی اچھے نہ تھے۔ اس قسم کی شعبدہ بازی سے بچنا بہت ضروری ہے۔

حضرت امام غزالی کا ایک رسالہ مشکوٰۃ الانوار ہے۔ اس کے موضوع معارف آیۃ النور (اللہ نور السموات والارض) پر حضرت شاہ صاحب نے بھی لکھا ہے، آپ کا رسالہ السطعات اسی موضوع پر ہے۔ امام غزالی کے رسالہ ہدایہ الہدایہ کی طرز پر شاہ صاحب نے قول جمیل اور رسالہ الوصیتہ لکھا۔ نیز آپ نے تصوف و سلوک کے تمام معارف کا گہری نظر سے مطالعہ کیا اُس راہ کے ہر مقام کی صحیح قدر و قیمت معین کی اور اپنی کتابوں میں ان امور کی توضیح فرمائی۔ آپ کو فیضان قدرت سے ابداع اور معرفتِ استعدادِ نفوس کے نئے علوم عطا ہوئے۔ ہاں تجلی، تدلی، خلق و تدبیر کے معارف میں آپ دوسرے اہل عرفان کے ساتھ مساوی الاقدام ہیں۔ نیز آپ کو تاثیر دا جابت دعا کے اسباب الہام کئے گئے نیز آپ پر تاثیراتِ اسماء اللہ تعالیٰ منکشف کی گئیں لمحات، ہوامع، خیر کثیر، تفہیمات الہیہ اور بدور بازغہ میں انہی معارف فائقہ کو قلم بند کیا گیا ہے۔ پھر ان مطالب عالیہ کو قابل فہم بنانے کے لئے قرۃ العینین میں خلاصہ کے طور پر ایک متن مرتب فرمایا۔ جسے ہم الحکمتہ الفائقہ کہہ سکتے ہیں اب اس متن کو آپ مرکز تصور کریں اور علوم ولی اللہیہ کو اس کے گرد پیدا ہونے والے وسیع دائرہ کی توسیں اور معارف ولی اللہیہ کی مرکزی کتاب حجتہ اللہ البالغہ کو اس مرکز کا قریب ترین دائرہ۔

شکر للہ کہ کند بندۂ خود را تعلیم
گہ بوحی وگہ بالہام گہ بطریق تفہیم
ہر کہ جانش نشود معدنِ اسرار الٰہ
اُو نہ صوفی است نہ ملا نہ محقق نہ حکیم

(حضرت شاہ عبدالعزیز)

شاہ عبدالعزیزؒ کے ایک شاگرد مولوی عبدالرحیم

ابو سلمان شاہجہاں پوری

مولانا ابوالکلام آزاد بچپن ہی سے ذہین وطباع تھے۔ ان کے اساتذہ ان کی ذہانت پر حیرت زدہ تھے اور مولانا کے اعتراضات سے گھبراتے اور جوابات سے کتراتے تھے۔ ان کی تعلیم کسی درس گاہ میں نہیں ہوئی۔ بلکہ انہوں نے اپنے مکان پر مختلف اساتذہ سے تحصیل علم کی۔ ایک استاد جو حافظ رمضان کے مدرسہ میں مدرس تھے اپنے ساتھ مدرسہ کے چند طلباء کو لے آتے تھے لیکن ہنگام درس جب مولانا آزاد کی ذہانت وطباعی کے مظاہر دیکھے اور ان کے اعتراضات کے سامنے خود کو عاجز ودرماندہ پایا تو مدرسہ کے طلباء کو ساتھ لانا چھوڑ دیا۔

مولانا کی ذہانت کا احساس ان کے والد مولانا خیرالدین کو بھی تھا۔ اور اس کی وجہ سے وہ نہ صرف حیران بلکہ پریشان بھی تھے۔ چنانچہ مولانا آزاد کی روایت کے مطابق انہوں نے کئی بار فرمایا تھا۔

"مجھے اس کے آثار اچھے نظر نہیں آتے۔ بہت زیادہ ذہانت انسان کے لئے بسا اوقات گمرہی کا ذریعہ ہو جاتی ہے۔ میں اس کی ذہانت سے ڈرتا ہوں۔"

اس سلسلے میں وہ بعض اشخاص کے حالات سنایا کرتے تھے جو ذہانت وطباعی کی وجہ سے ہر طرف خیال دوڑانے لگے تھے اور بالآخر دین و دنیا سے کھوئے گئے۔ اس سلسلے میں ایک دن انہوں نے شاہ عبدالعزیزؒ کے ایک شاگرد مولوی عبدالرحیم گورکھپوری کے حالات سنائے۔ مولوی

عبدالرحیم شاہ اسمٰعیل شہید کے شریک درس رہ چکے تھے مولانا خیرالدین (مولانا آزاد کے والد) کے نانا مولانا منورالدین جب حضرت شاہ صاحب سے پڑھنا ختم کر چکے تھے تو یہ نئے نئے درس میں شریک ہوئے تھے۔ مولانا آزاد نے اپنے والد کی زبانی یہ روایت بیان کی ہے۔

"ان کی (مولوی عبدالرحیم کی) ذہانت وطباعی کا یہ حال تھا کہ شاہ صاحب کے حلقہ تلامذہ میں جو اس وقت علمی جماعتوں کا خلاصہ وعطر تھا، کوئی شخص ان کی ٹکر کا نہ تھا۔ معقولات کے حافظ تھے اور ہنگام درس ایسے ایسے اعتراضات اور ایسے ایسے نکتے اور پہلو تراشتے تھے کہ شاہ صاحب کو بھی اعتراف کرنا پڑتا تھا۔

"یہ حال دیکھ کر شاہ صاحب کہا کرتے تھے، مجھے تمہاری ذہانت وطباعی کے پیچھے دہریت کھڑی نظر آتی ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ دہلی سے کلکتہ آئے اور انگریزوں کی نوکری کر لی۔ پھر ان کو زبان اور علوم کا شوق ہوا، اور چند دنوں کے بعد کھلم کھلا ملحد و دہری ہو گئے۔ خدا کے وجود پر ایک سو سترہ اعتراضات ایسے کئے تھے، جن کی نسبت دعویٰ تھا کہ تمام دنیا کے عقلا بھی اکٹھے ہو جائیں، تو بھی جواب نہیں دے سکتے۔ غرض کہ ذہانت و دانشمندی موجب ہلاکت ہوئی۔ اور سرے سے ایمان و یقین ہی کھو بیٹھے!" (آزاد کی کہانی خود اس کی زبانی ص۳۸۷ مطبوعہ دہلی)

مولانا آزاد نے اپنے والد کی زبانی یہ روایت بیان کرنے کے بعد اس کی تردید کی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں۔''

"میں نے بہت جستجو کی، بجز شہرت عام کے کوئی تحریری ثبوت ان کی دہریت کا نہیں ملا۔"

(بحوالہ مذکورۂ بالا ص۳۸۸)

مولانا آزاد نے اپنے حالات کے سلسلۂ بیان میں مولوی عبدالرحیم گورکھپوری المعروف بہ دہری کا کسی قدر تفصیل کے ساتھ تذکرہ کیا ہے۔ ہم یہاں مولانا ہی کے الفاظ میں ان کی کہانی بیان کئے دیتے ہیں۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی جو "آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی" کے راوی ہیں "غدر سے پہلے کی ایک عجیب ہستی" کے زیر عنوان، مولانا کے الفاظ نقل فرماتے ہیں۔

مولوی عبدالرحیم...... ان لوگوں میں سے ہیں۔ جنہوں نے غدر سے بہت پہلے محض اپنی رسائیِ ذہن و فکر سے دنیا کا علمی انقلاب محسوس کیا، اور نئے علوم سے آشنا ہوئے، نیز یورپ کی زبانیں سیکھیں اور اس حد تک قابلیت حاصل کی، جو آج باوجود نئی تعلیم کے عموم و رواج کے کم یاب ہے، عام طور پر یہ "عبدالرحیم دہری" کے نام سے مشہور ہیں، لیکن میں نے بہت جستجو کی، بجز شہرت عام کے کوئی تحریری ثبوت ان کی دہریت کا نہیں ملا۔ معلوم نہیں، صحیح معنوں میں دہری بھی تھے یا یہ بھی لوگوں کی اختراع ہے [1] مُلّا عبدالقادر بدایونی کی آنکھوں سے دیکھا جائے تو ابوالفضل، فیضی اور نہیں معلوم اور کتنے عہد اکبری میں بھی دہری تھے، لیکن وہ جیسے دہری تھے،

---

[1] لیکن مولانا غلام رسول مہر صاحب نے ٹیپو سلطان کے خاندان کے بعض افراد کی گمرہی اور خیالات بگڑنے کا ذمہ دار مولوی عبدالرحیم کو قرار دیا ہے۔ اس لئے میرا خیال ہے کہ حقیقت کچھ نہ کچھ ہوگی۔ ممکن ہے ان کی کتابوں میں دہریت کا سراغ نہ لگایا جاسکے لیکن ان کے آزادانہ خیالات اور مذہبی عقائد کے باب میں ان کے استدلال و احتجاج کی نئی شکل سے لوگ واقف ہوں گے۔ پھر سلطان ٹیپو کے خاندان کے بعض بگڑے ہوئے افراد جن کی مولوی عبدالرحیم سے صحبت رہی ہوگی، ان کی آزادانہ روش اور گمراہ کُن خیالات نے مولوی صاحب مرحوم کی بُری شہرت کو اور بھی چمکا دیا ہوگا۔

لیکن خاندان ٹیپو کی گمراہی اور ان کے بگڑنے کی ساری ذمہ داری مولوی عبدالرحیم پر عائد ہوتی ہے۔ اس بارے میں مجھے تردّد ہے۔ مولانا مہر صاحب فرماتے ہیں۔

ٹیپو سلطان کے خاندان کے بعض افراد کلکتے ہی میں رہتے تھے۔ ان میں سے بعض شہزادوں کے عقائد مولوی عبدالرحیم فلسفی کی صحبت میں بگڑ چکے تھے۔ مولوی عبدالرحیم گورکھپور کے رہنے والے تھے، والد کا نام مصاحب علی تھا۔ شاہ عبدالعزیز، شاہ عبدالقادر، اور شاہ رفیع الدین سے تعلیم پائی تھی، پھر فلسفہ و منطق میں توغل کے باعث "دہری" مشہور ہوگئے۔

(سید احمد شہید ص ۲۱۷)

اس کا حال ہمیں معلوم ہے۔

عموماً ایسا ہوا ہے کہ جہاں ایک شخص نے شاہ راہ عام سے باہر قدم اٹھایا' یا مذہبی عقائد کے باب میں استدلال و احتجاج کی کوئی نئی شکل اختیار کی یا اس طرح کا مشرب' جیسا سرسید وغیرہ کا تھا' تو عام طور پر اسے دہریت ہی کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ معتزلہ کی نسبت بھی ایسے ہی خیالات ظاہر کئے گئے تھے۔ پس عجب نہیں کہ مولوی عبدالرحیم کا بھی یہی حال ہو' اور عقلیات کے اشتغال و انہماک کی وجہ سے "دہری" مشہور ہو گئے ہوں' یا ممکن ہے اس کی کچھ اصلیت ہو بہرحال ان کی جو تصنیفات پائی جاتی ہیں' ان میں کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ [1]

(مولوی عبدالرحیم دہری) شاہ عبدالعزیز کے شاگردوں میں سے ہیں اور مولانا اسمٰعیل شہید کے ہم درس۔ کلکتے میں نیا نیا فورٹ ولیم کالج قائم ہوا تھا۔ اس میں بحیثیت مدرس کے ملازم ہو گئے' اور ڈاکٹر مارٹن وغیرہ جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے میں ہندوستان کے یورپین علماء میں بہت ممتاز لوگ تھے اور فارسی کی بھی بہت اچھی استعداد رکھتے تھے' ان کی صحبت رہی اسی وجہ سے نئے علوم کا بھی شوق ہوا' اور انگریزی اور لاطینی (جو اس وقت یورپ کی کلاسیکل زبان ہونے کی وجہ سے ضروری سمجھی جاتی تھی) سیکھی۔

انگریزی میں ایسی عمدہ استعداد پیدا کر لی تھی کہ مشہور ہے' پردے کی دوسری جانب وہ بٹھا دیئے جاتے تھے اور انگریزی میں تقریر کرتے تھے' اور اس طرف بڑے بڑے قابل انگریز بیٹھے تھے' اور مقرر کی شخصیت کی نسبت دھوکا کھا جاتے۔ سب کہتے کہ یہ یقیناً کوئی انگریز بول رہا ہے ان کا لب و لہجہ اس درجہ فصیح اور مثل اہل زبان کے تھا۔ ساتھ ہی لیٹن بھی ایسی ہی فصاحت سے بولتے تھے۔ عربی، فارسی، ترکی، پشتو اور ہندوستان کی زبانوں میں بھی یہی حال تھا۔

ایک مجلس میں کئی عرب' ایرانی' انگریز' افغانی جمع ہو گئے تھے۔ اس کا حال صاحب

---

[1] مولانا مہر صاحب نے بھی فلسفہ و منطق میں توغل کے باعث دہری ہونے کی صرف "شہرت" کا ذکر کیا ہے

"تحفۃ العالم" نے لکھا ہے۔ وہ ایک ہی مجلس میں عرب سے بالکل عرب کی طرح، ایرانی سے (یعنی مصنف تحفۃ العالم سے) بالکل ایرانی لب و لہجہ میں، انگریز سے ٹھیک ایک انگریز کی طرح اور افغانی سے ایک افغانی کی طرح باتیں کرتے تھے اور تمام مجلس کا یہ حال تھا کہ نقش تصویر تھی! والد مرحوم (مولانا خیرالدین) بھی نقل کرتے تھے کہ ان کی عربی و فارسی تقریر ایسی فصیح ہوتی تھی کہ شاید ہی کسی ہندستانی کی ہوگی۔

ریاضی و ہندسے کے بہت بڑے ماہر تھے۔ ایک بہت ضخیم کتاب ریاضیات میں جدید تقسیم و اضافات کے ساتھ عربی میں لکھی ہے، جو فورٹ ولیم کالج پریس میں چھپی اور میرے پاس موجود ہے، جامع العلوم جامع العلوم اس لئے کہ اس طرح تمام علوم کے ضبط کا ارادہ تھا اور شروع ریاضی سے کیا تھا۔

پرنس اعظم شاہ ابن ٹیپو سلطان کی فرمائش سے جان مارش کلاک کی ہسٹری آف انڈیا کا نہایت ہی فصیح اور بامحاورہ فارسی میں ترجمہ کیا۔ اور بپٹسٹ مشن پریس میں بڑے اہتمام سے نستعلیق ٹائپ میں چھپی۔ باوجود عربی الفاظ سے اجتناب کے اور انگریزی ترجمے کے، عبارت بڑی چست اور شگفتہ ہے۔ ایک فارسی میں پندنامہ ہے، جس میں گلستاں کے طرز پر چھوٹے چھوٹے بند لکھے ہیں اور عربی الفاظ سے اجتناب کا التزام کیا ہے، یہ بھی چھپ گیا ہے۔

ایک رسالہ عربی میں جر ثقیل پر ہے اور اس میں جدید علم میکانکس کے اصول ضبط کئے ہیں۔ میکانک کی جگہ منجنیق کا لفظ استعمال کیا ہے۔ دیباچہ میں لکھا ہے کہ ہم نے عبارت کی صحت قرآۃ کے لئے انگریزی کی علامات قرآۃ استعمال کی ہیں۔ پھر پورے پنکچوایشن کو نقل کیا ہے اور میں نے "کاما" کا الٹا استعمال سب سے پہلے اس میں دیکھا۔ بعد کو بمبئی میں منشی غلام محمد نے ایک رسالہ میں یہ صلاح دی اور لکھا کہ واؤ کے اشتباہ سے بچنے کے لئے اسے منقلب کر دینا چاہیئے۔ پھر سرسید مرحوم بھی اس طرح تہذیب الاخلاق میں استعمال کرنے لگے۔

علوم جدیدہ کے داعی

لوگ یہ سنکر تعجب کریں گے کہ سرسید سے بہت پہلے مسلمان علماء میں انگریزی اور

نئے علوم کی ترویج کے کتنے ہی حامی و دُعات گذر چکے ہیں۔ مولوی عبدالرحیم ان سب میں مقدم ہیں۔ ان کا زمانہ تو لارڈ میکالے کا زمانہ ہوگا۔ تقریباً اسی زمانے میں لارڈ میکالے نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی قدیم پالیسی سے اختلاف کیا، اور اپنی مشہور تاریخی یادداشت پیش کی۔ جس میں قدیم مشرقی السنہ وعلوم کی جگہ انگریزی زبان اور نئے علوم کی ترویج پر زور دیا۔

مجھے ایک رسالہ مولوی عبدالرحیم کا فارسی میں ملا "عرض داشت درباب ترویج زبان انگریزی وعلوم فرنگ"۔ یہ دراصل ایک سوال کا جواب ہے۔ جو اس وقت حکام نے تعلیم کے باب میں شائع کیا تھا۔ مقصود اس سے یہ ہوگا کہ جہاں تک ممکن ہو، اہل ہند کی خواہشیں بھی اس باب میں معلوم کی جائیں۔ اس وقت ان مسائل کو کون محسوس کرنے والا تھا؟ لیکن ہندوؤں میں راجہ رام موہن رائے اور مسلمانوں میں مولوی عبدالرحیم دو شخص کلکتے میں تھے، جنہوں نے اس پر توجہ کی۔ راجہ رام موہن رائے کی عرضداشت بنام لارڈ وارن ہسٹنگز مشہور ہے، لیکن مولوی عبدالرحیم کا حال لوگوں کو معلوم نہیں۔

انہوں نے انگریزی زبان اور نئے علوم کی تحصیل و ترویج کے موضوع پر ایسی جامع بحث کی ہے جیسی کہ اب کی جا سکتی ہے۔ تمام وجوہ و دلائل، جو بعد کی بحث میں آئے، وہ سب اس میں موجود ہیں۔ یہ امید بھی ظاہر کی ہے کہ اب ہندوستان کی قسمت انگریزوں سے وابستہ ہو چکی ہے، اور وہ وقت دُور نہیں کہ تمام بقیہ حصص بھی کابل تک انگریزوں کے قبضے میں آجائیں گے۔

ایک عمدہ بات یہ ہے کہ انگریزی کی ضرورت پر صرف علمی حیثیت سے نظر ڈالی ہے اور صرف اس لئے وہ ہندوستانیوں کے لئے اسے ضروری سمجھتے ہیں کہ علوم میں انقلاب ہو چکا ہے۔ علوم قدیمہ اب تحقیقاتِ جدیدہ کے مقابلے میں تقویم پارینہ کا حکم رکھتے ہیں، اور ہندوستانیوں کے لئے بھی ترقی و تقدم کی صرف یہی ایک راہ ہے کہ ان علوم کی تحصیل کریں۔

یہ بھی لکھا ہے کہ مسلمانوں نے یونانی علوم اپنی زبان میں منتقل کر لئے تھے، لیکن اب ایسا ممکن نہیں ہے، اس لئے کہ اول تو اس وقت حکومت تھی، جو اب مفقود ہے۔ ثانیاً یونانی علوم

ایک خاص حد تک پہنچ کر اور مدوّن ہو کر ختم ہو چکے تھے، جن کا انتقال ممکن تھا۔ لیکن یورپ کی تحقیقات جاری ہیں اور محدود ذخیرہ نہیں، جو منتقل کر لیا جا سکے۔ سائنٹیفک سوسائٹی کے بعد سرسید کی یہی سب سے بڑی دلیل انگریزی زبان کی تحصیل و ترویج کے لئے ہی تھی، رسالے میں خطاب لارڈ وارن ہسٹنگز سے ہے۔

ان تمام کتابوں میں ایسے ہی حمد و نعت طرح طرح کے اسلوب میں موجود ہیں۔ جیسے کہ قدیم کتابوں کی رسم رہی ہے۔

ایک فارسی مثنوی پرنس اعظم شاہ کی فرمائش پر لکھی ہے، شاہ نامہ کے وزن پر ٹیپو سلطان کا معرکہ نظم کیا ہے۔ اس کا نام "صولت ضیغم" ہے۔ ضیغم اس مناسبت سے کہ لارڈ ڈلہوزی نے ٹیپو سلطان کو دکن کا شیر کہا تھا۔ ایک اور نثر میں بھی خاندان میسور کی تاریخ ملی جس میں حیدر علی کے حالات تفصیل کے ساتھ جمع کئے ہیں اور نہایت اہتمام سے تصاویر تیار کر کے کتاب میں شامل کی گئی ہیں [1]

عجیب لطیفہ

مشہور ہے کہ جب مدراس جاتے ہوئے مولانا اسمٰعیل شہید اور سید صاحب کلکتہ آئے تو مولانا اسمٰعیل نے مولوی عبدالرحیم سے ملنا چاہا۔ اس لئے کہ ان کی "دہریت" کا بڑا غلغلہ

---

[1] ۔ مولوی عبدالرحیم کی غالباً یہ وہی کتاب ہے جس کی جانب مولانا آزاد نے مولانا مہر صاحب کے نام ایک خط میں ذکر کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

"فارسی میں تین کتابیں قابل اعتنا ہیں، لالہ کھیم نرائن کی "فتوحات حیدری" حسین علی کرمانی کی "نشان حیدری" اور مولوی عبدالرحیم کی "کارنامہ حیدری"

(نقش آزاد ص ۱۴۴ مکتوب مورخہ ۷ ستمبر ۱۹۳۷ء)

تھا اور شاہ صاحب کے درس میں یہ مولانا اسمٰعیل کے ہم درس رہ چکے تھے، لیکن باوجود بڑی کوشش واہتمام کے یہ منھ چھپاتے رہے۔ وہ ایک دروازے سے مکان میں داخل ہوں تو یہ پچھواڑے سے فرار کر جائیں۔ معلوم نہیں کہاں تک یہ بات صحیح ہے؟ ڈاکٹر محمد جعفر نے سید صاحب کے حالات میں ایسا ہی لکھا ہے [1]

---

[1] مولانا مہر صاحب کی تحقیقات سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ شاہ صاحب اور مولوی عبدالرحیم میں گفتگو ہوئی تھی۔ ٹیپو سلطان کے شہزادے" کے ذیل میں لکھتے ہیں۔

"شہزادوں نے محمد قاسم خواجہ سرا کو بھیج کر سید صاحب کو اپنے ہاں بلایا۔ شاہ اسمٰعیل مولوی عبدالرحیم کو جانتے تھے۔ انھوں نے بات چیت کر کے فلسفی (مولوی عبدالرحیم) کا ناطقہ بند کر دیا۔

(سید احمد شہید ص ۲۱۷)

مولانا آزاد نے ڈاکٹر محمد جعفر کے بیان پر نقد و تبصرہ نہیں کیا۔ حقیقتاً مولانا آزاد نے مولوی عبدالرحیم کے بارے میں جو کہا وہ سلسلہ بیان کی ایک چیز تھی۔ اس کی جانب بھی چند الفاظ میں اشارہ کر دیا۔ تحقیق مقصود نہ تھی لیکن یہ بات بھی ایسی ہی ہے جیسا کہ ان کی دہریت کا افسانہ ہے۔ میرے خیال میں اس باب میں مولانا مہر صاحب کا بیان زیادہ مستند ہے۔

میں پچاس سال سے حجۃ اللہ کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ شروع شروع میں اس کا کچھ حصہ سمجھا تھا اور کچھ حصہ نہیں سمجھا تھا۔ لیکن جو چیزیں سمجھ گیا تھا، وہ میرے نزدیک محقق تھیں۔ اور جو چیزیں نہیں سمجھ سکا تھا اسے میں نے چھوڑ دیا۔ جوں جوں میری استعداد ترقی کرتی گئی۔ اور میرا مطالعہ بڑھتا گیا، حجۃ اللہ کے جو مشکل مباحث تھے، وہ صاف ہوتے گئے۔ آخر میں جب میں مکہ معظمہ پہنچا ہوں، تو میں نے حجۃ اللہ کے اصولوں پر سارے قرآن کو حل کیا۔

(فرمودات مولانا عبیداللہ سندھی)

دنیائے اسلام میں تجدید و اصلاح کی تحریکیں

محمد سرور

ہنگری کا مشہور مستشرق، جو بعد میں مسلمان ہو گیا تھا، الحاج ڈاکٹر عبدالکریم جرمانوس لکھتا ہے۔ "اگر مسلمان علما کے شاندار علمی کارنامے نہ ہوتے، تو یورپ ابھی تک جہالت اور نکبت میں پڑا سڑتا۔ کئی طویل صدیوں تک دنیا کی روحانی روشنی اسلامی ممالک ہی سے پھوٹتی رہی اس کے بعد دنیا دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ چنانچہ جہاں یورپ مادی اور معنوی دنیا کی تسخیر کے لئے نکل پڑا، وہاں مشرق قدیم مذہبی کتابوں کی خشک تاویلات اور ان کی نقلیں کرنے میں لگا رہا اس نے اپنے آپ کو اس حد تک ماضی اور اس کی قدیم روایات کے حوالے کر دیا کہ وہ گویا اس کے اندر محدود ہو کر فرسودگی کی نذر ہو گیا۔"

گذشتہ صدیوں میں مشرق کے مقابلے میں یورپ کی اس مادی و معنوی سربلندی میں اگرچہ ان تاریخی اسباب کا بھی بڑا دخل ہے، جو اہل یورپ کے حق میں پیدا ہو گئے تھے، اور جن کی بدولت انہیں تمام دنیا پر چھا جانے کا موقع مل گیا، مثلاً امریکہ کا انکشاف، مشرق اور مغرب کی تجارت کا مشرق قریب کے خشکی کے راستے کے بجائے سمندری راستوں سے ہونا، اور مشین کی ایجاد۔ لیکن مصنف مذکور کے نزدیک اس کے ساتھ ساتھ اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مشرقی اقوام کی فرسودہ ذہنیت بھی ان کے جمود اور معاشی افلاس کا بہت حد تک سبب ہے۔

[illegible]ہویں صدی کے بعد سے مشرقی ذہنیت اپنی روایتی قسم کی تربیت کے زیر اثر جامد بن کر رہ گئی

اس جمود کے اسباب کا تجزیہ کرتے ہوئے ایک دفعہ مصر کے مشہور اہل قلم محمد حسین ہیکل نے لکھا تھا: "جب خلافت اسلامیہ کا نظام شوریٰ سے وراثت میں، مسلمانوں کی نمائندگی کے بجائے ان پر امیر بننے میں، اور ان کے نام سے بات کرنے کے بجائے ان پر استبداد کرنے میں بدل گیا، اور اسے ایسا حق سمجھ لیا گیا، جو خدا تعالٰی کی طرف سے عطا کردہ ہے، تو وہ دن تھا جب مسلمان فقہا نے افراد کی زندگی کی ہر چھوٹی بڑی تفصیل کے لئے قواعد و ضوابط مقرر کئے اور اس نظام کی مخالفت کے لئے سزائیں تجویز کیں، اور ان سب کو دین سے منسوب کیا جب انہیں یہ ڈر پیدا ہوا کہ مبادا احساسِ ذات اور شعورِ انسانیت لوگوں کے دلوں میں کہیں ان پابندیوں کے خلاف کوئی حرکت نہ پیدا کرے۔ انہوں نے اجتہاد کا دروازہ ہی سرے سے بند کر دیا اور اپنے مقرر کردہ احکام کی خلاف ورزی کرنے والوں کو کافر قرار دیا اس کے بعد مسلمانوں کی زندگی کے ہر پہلو پر یہ فکری جمود اور ذہنی استبداد مسلّط ہو گیا۔ اور ان کے اکثر علماء ایسی فرضی بحثوں میں الجھ گئے، جن کا عملی زندگی سے دُور کا بھی تعلق نہ تھا"[1]

ہیکل صاحب اپنے اس مضمون میں، جس کا عنوان "الاجتہاد والتقلید" ہے، آگے چل کر لکھتے ہیں کہ علماء کی ان بحثوں کا سارا زور الفاظ پر ہوتا۔ اور وہ روح سے بالکل خالی ہوتیں اِس نے ان میں سے اکثر کو الفاظ کا پرستش کرنے والا بنا دیا۔ اور وہ دین پر ایمان لانے والے نہ رہے وہ مادی صورتوں کے پرستار ہو گئے، اور اللہ کے پرستار نہ رہے، جو مادہ، زمان اور مکان سے منزّہ اور ماورائی ہے اور یہ نتیجہ تھا تقلید کا، جس نے ذہنوں کو بنجر بنا دیا، اور وہ اس قابل نہ رہے کہ ان بلندیوں تک پہنچ سکیں، جن کا دینِ اسلام متقاضی تھا۔ موصوف کے نزدیک اندھی تقلید خواہ وہ اپنے پہلوؤں کی ہو، یا یورپ کے نئے لوگوں کی، دونوں ایک سی ہیں اور دونوں سے ایک ہی سے نتیجے نکلتے ہیں، یعنی ترقی کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں اور انسان میں آزادیٔ فکر

---

[1] ہفت روزہ السیاست ۷، جنوری ۱۹۳۳ء

نہیں رہتی اور آگے کے بجائے ہمیشہ پیچھے کو دیکھتا ہے۔

مسلمانوں کے فکری جمود اور اندھی تقلید کے اس رجحان نے، جس کا آغاز ان کے ہاں سیاسی استبداد سے ہوا تھا، آخر میں مسلمانوں کو اس درجے پر پہنچا دیا کہ جب اٹھارویں صدی میں یورپی اقوام نئے افکار و خیالات سے سرشار ہو کر مشرق کی طرف بڑھی ہیں تو پوری اسلامی دنیا ان کے قدموں میں تھی۔ اور اس کی معاشی لوٹ کھسوٹ میں کوئی بھی ان کا ہاتھ پکڑنے والا نہ تھا۔ عین اسی زمانے میں یورپ کے اس سیاسی استیلاد تسلط اور معاشی استحصال کے خلاف دنیائے اسلام میں ردّ عمل ہوتا ہے، اور وہاں مختلف ناموں سے اصلاحی تحریکیں جنم لیتی ہیں۔ اس ردّ عمل کی روداد ہنگری کے مستشرق جرمانوس کی زبان سے سنئے۔

"لیکن اسلامی دنیا میں یورپ کی یہی دخل اندازی تھی، جس نے آخر کار چیدہ اور منتخب مسلمانوں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ اپنے عوام اور مذہب کی خاطر اٹھیں۔ چنانچہ جہاں جہاں یورپی تعلیم کی وجہ سے مسلمانوں کو یورپی افکار سے سابقہ پڑا، وہاں ان کی بیداری نے سب سے زیادہ شورش انگیز صورت اختیار کی .... یہ سمجھتے ہوئے کہ مذہب ہی کے اختلاف نے مسلمان اقوام کو اتنا پیچھے ڈال دیا ہے، وہ اسلام اور عیسائیت کا مقابلہ کرنے لگے۔ وہ گزرے ہوئے دنوں کی عظمت کا ذکر کرتے۔ اور اس کو دوبارہ زندہ کرنا چاہتے۔"

عہد حاضر میں احیائے اسلام کی یہ تحریکیں تقریباً ایک ہی زمانے میں مختلف ملکوں میں اٹھیں اگرچہ اپنی ظاہری شکل میں یہ ایک دوسرے سے کچھ نہ کچھ مختلف تھیں لیکن ان سب کے پیش نظر ایک ہی مقصد تھا اور وہ یہ کہ صحیح اور حقیقی اسلام کا احیاء ہو تاکہ اس طرح مسلمانوں کو پھر وہ عظمت و سربلندی حاصل ہو، جو تاریخ اسلام کے اوّلیں دور میں انہیں حاصل تھی۔

اِحیائے اسلام کی یہ تحریکیں اگرچہ جرمانوس صاحب کے الفاظ میں یورپ کی دخل اندازی کا نتیجہ تھیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کی سوتیں بہت پہلے سے عالم اسلام میں پھوٹ چکی تھیں۔

اور ان سے بہت سے ملکوں کے اہل علم کسی نہ کسی حد تک مستفید ہو چکے تھے آخری صدیوں میں اندھی تقلید اور جمود کے خلاف سب سے پہلی آواز امام ابن تیمیہؒ کی تھی ۶۶۱ھ میں پیدا ہوئے اور ۷۲۸ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔ امام ابن تیمیہؒ کے زمانے میں تقلید شخصی رائج ہو گئی تھی۔ ہر بات کا جواب اپنے مذہب اور مسلک کی کتابوں سے دیا جاتا تھا۔ فقہی امور میں تو یہ تقلید جامد ہو گئی تھی ...... امام موصوف نے سب سے پہلے یہ طریقہ بدلا مختلف علوم و فنون کا کوئی جزئی سے جزئی مسئلہ کیوں نہ ہو سب سے پہلے وہ قرآن مجید میں اس کو تلاش کرنے کی کوشش کرتے تھے .... اس کے بعد بہ ترتیب حدیث اور فقہ کے حوالے دیتے تھے ان کے اس نئے طرز تحریر نے علمار کے اندر قرآن مجید اور حدیث نبوی میں تدبر و تفکر کرنے کا ایک خاص ذوق پیدا کر دیا ان کی تصنیفات سے نہ صرف ان کے زمانے کے علماء کی ذہنیت میں تبدیلی پیدا ہوئی بلکہ ان کے بعد سے ہر ایک دور کے علماء کے خیالات اور ان کی تحریروں پر ان کا اثر پڑنے لگا۔ امام ابن تیمیہؒ نے خود بھی قرآن و حدیث کے خوب چرچا کیا اور عام لوگوں کو بھی اس کی طرف توجہ دلائی، جس سے عام مسلمانوں میں شریعت اسلامیہ پر عمل پیرا ہونے کا ایک خاص احساس پیدا ہو گیا۔[۱]

امام ابن تیمیہؒ کی دعوت ان کے قابل شاگردوں اور ان کی کتابوں کے ذریعہ دُور دُور تک پہنچی اور اس نے دنیائے اسلام میں جمود اور اندھی تقلید کے خلاف ایک لہر پیدا کر دی۔ جس سے بہت سے اہل علم متاثر ہوئے۔ شاہ ولی اللہ دہلوی بارہویں صدی کے وسط میں جب مدینہ منورہ پہنچے، تو وہاں بقول مولانا ابوالکلام آزاد۔ ابن تیمیہ اور ابن القیم دونوں کی کتابیں حضرت شیخ ابراہیم کورانی (متوفی ۱۱۰۱ھ والد شیخ ابوطاہر کُردی استاد حدیث شاہ صاحب) کی وسعت نظر و بلندی مشرب کی وجہ سے ان کے مطالعہ

---

[۱] امام ابن تیمیہ از افضل العلماء محمد یوسف کوکنی عمری ایم اے۔ مدراس یونیورسٹی

میں رہ چکی تھیں ۔" اس مطالعہ کی جھلک شاہ صاحب کی کتابوں میں کافی نظر آتی ہے ...." [1]

اس ضمن میں اس بات کا اظہار ضروری ہے کہ بے شک شاہ صاحب امام ابن تیمیہؒ کی دعوت کتاب وسنت سے متاثر ہوئے لیکن اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے تصوف ومعرفت میں ابن عربی اور مجدد الف ثانی سے بھی اثر لیا اور خاص طور سے اکبری دور میں سرزمین ہندوستان میں عقلیت اور حکمت عملی کو جو فروغ حاصل ہوا تھا انہوں نے اسے بھی ایک حد تک اپنایا۔ اور ان تینوں رجحانات کو سمونے کی کوشش کی۔ مصر، شام اور جزیرۂ عرب کے مختلف حصوں میں امام ابن تیمیہؒ کے اثرات براہ راست پڑے، اور متشددین کا دائرہ وقت کے ساتھ ساتھ برابر وسیع ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ پروفیسر محمد ابوزہرہ کے الفاظ میں نجد میں امام محمد بن عبدالوہاب کی دعوت تجدید و اصلاح کے نتیجے میں بارہویں صدی ہجری میں محمد بن سعود نے۔ ابن تیمیہؒ کے مسلک کی تبلیغ واشاعت اور تائید وحمایت کے لئے تلوار میان سے نکالی ... یہ چھوٹی سی مملکت "سعودیہ" افکار ابن تیمیہ پر عمل پیرا ہوگئی۔

چودھویں صدی ہجری کے اوائل میں سید جمال الدین افغانی کے شاگرد رشید شیخ محمد عبدہ نے مصر میں اپنی اصلاحی تحریک شروع کی، جس کے اثرات ان کے شاگردوں کی بدولت دنیائے اسلام کے دور دراز حصوں تک پہنچے۔ وہ جمود اور اندھی تقلید کے خلاف تھے۔ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں "اسلام نے علی الاعلان بیان کیا کہ انسان اس لئے پیدا نہیں ہوا کہ کوئی اس کی گردن میں رسی ڈال کر کھینچتا پھرے۔ بلکہ اس کی فطرت یہ ہے کہ علم سے کائنات کی نشانیوں سے اور واقعات وحوادث کے آثار سے ہدایت حاصل کرے اور حقیقی معلم وہی ہے جو لوگوں میں تحقیق کے ذوق کو پیدا کر کے انہیں رشد وہدایت کے راستے پر چلائیں۔ مشہور مستشرق گولڈ سیہر نے شیخ محمد عبدہ کی تحریک اصلاح کے تین عوامل بتائے

---

[1] حیات شیخ الاسلام ابن تیمیہ از محمد ابوزہرہ (اردو ترجمہ)

ہیں۔ ایک امام غزالی کے اخلاقی و مذہبی تصورات۔ دوم تیرہویں صدی عیسوی کے دو موحدین ابن تیمیہؒ اور ان کے شاگرد ابن القیمؒ الجوزی کے حد سے زیادہ سلفی رجحانات اور سوم زمانۂ حاضر کی ترقی کے مطالبات سے مطابقت پیدا کرنے کی ضرورت [۱]

اسی زمانے میں برصغیر پاک و ہند میں سرسید، دیوبند اور بعد میں مولانا شبلی اور ان کے ندوۃ العلماء کی اصلاحی، تعلیمی اور دینی تحریکیں اٹھیں۔ ترکی میں تنظیمات کے نام سے اصلاحی اقدامات ہوئے اور انڈونیشیا میں شیخ محمد عبدہ کے شاگرد شیخ رشید رضا کے رسالے "المنار" کا اثر پھیلا گویہ سب تحریکیں جمود اور اندھی تقلید کی مخالفت کرتی تھیں اور مسلمانوں کو نئے دور کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کی دعوت دیتی تھیں لیکن ان سب کا زور اسی پر تھا کہ مسلمان صحیح معنوں میں مسلمان بنیں، اور اسلام میں اس کے طویل عہد زوال میں اِدھر اُدھر کی جو رطب و یابس چیزیں شامل ہو گئی ہیں، ان کا انکار کر کے وہ اصل اسلام کی طرف لوٹیں۔ قدرتی طور پر اس مذہب میں، جو یہ مانتا ہے کہ اس کے پاس ہدایت کا آخری اور مکمل سرچشمہ خدا کی کتاب کی شکل میں موجود ہے۔ اصلاح و تجدید کے معنی یہی ہوں گے کہ اس سرچشمۂ ہدایت کی طرف لوٹا جائے، اور اس سے استفادہ کیا جائے ان تمام اصلاحی تحریکوں میں جو کم و بیش بیسویں صدی کے ربع اوّل تک دنیائے اسلام میں مقبول رہیں۔ یہی رجحان غالب تھا۔ سب کی سب عہد نبوت اور خلافت راشدہ کو ایک مثالی دور سمجھتی تھیں، اور ان کے پیش نظر اصلاح سے مراد اسی دور کا احیاء تھا۔ مولانا ظفر علی خاں مرحوم عوامی جلسوں میں مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے اکثر اس رجحان کا اظہار اپنے اس تاریخی فقرے میں یوں کیا کرتے تھے: "بس ایسی اُلٹی زقند لگاؤ کہ جہاں تم تیرہ سو سال پہلے تھے، وہاں پہنچ جاؤ۔"

یہ مختصر سا خاکہ ہے ان اصلاحی تحریکوں کا جو موجودہ تحریکوں سے، جو اِس وقت

---

[۱] اسلام اور تحریک تجدد مصر میں

عالم اسلام میں چل رہی ہیں، پہلے کی ہیں اب مختصراً موجودہ یعنی جدید اصلاحی تحریکوں کا ذکر کیا جاتا ہے ــــــ آئندہ سطور میں زیادہ تر ایک لبنانی اہل قلم حسن صاب کے انگریزی مضمون سے استفادہ کیا گیا ہے، جو حال ہی میں مجلہ "اسلامک سٹیڈیز" کراچی کے تازہ شمارے میں چھپا ہے۔ مضمون نگار لکھتے ہیں کہ اٹھارہویں صدی عیسوی کے اواخر میں اسلام کو دورِ حاضر کے جس چیلنج کا مقابلہ کرنا پڑا تھا، وہ مغرب یعنی اکثر و بیشتر مغربی یورپ، مغرب کے رنگ میں رنگے ہوئے روس اور امریکہ کی طرف سے تھا۔ اور آج اسلام کو جس چیلنج سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے وہ کئی اطراف سے ہے۔ یعنی مغرب سے، کمیونسٹ مشرق سے اور کافی حد تک ہندوستان اور افریقہ کی قومیتوں اور ان کی ترقی پسندی (پروگریسیوازم) سے۔ موصوف کے الفاظ ہیں :۔ "بے شک اسلام ان تمام چیلنجوں پر غالب آیا، جن سے اسے اپنے ابتدائی ادوار میں سابقہ پڑا لیکن آج وہ جس چیلنج سے رُو در رُو ہے وہ ان تمام سے مختلف ہے، جن سے وہ اس سے پہلے عہدہ برآ ہو چکا ہے۔ جہاں تک مغربی استعمار سے سیاسی آزادی حاصل کرنے کا تعلق ہے۔ اسلام اس میں یقیناً کامیاب رہا ہے اور الجزائر کی جدوجہد آزادی اس کی روشن ترین مثال ہے۔ لیکن سیاسی آزادی کے حصول کے بعد عہدِ حاضر کے چیلنج سے نبرد آزما ہونے کی جدوجہد آزاد اسلامی ملکوں میں اب شروع ہو رہی ہے۔ رسولِ مقبول علیہ الصلوٰۃ والسلام نے موجودہ مسلمانوں کے اس مرحلے کو جہادِ اصغر سے جہادِ اکبر کی طرف لوٹنے کا ضرور نام دیا ہوتا۔ یعنی اب تک ان کی جدّوجہد دوسروں کے خلاف تھی، اور اب انہیں خود اپنے آپ سے نبرد آزما ہونا پڑے گا۔

عہدِ حاضر کی شکل میں اسلام کو آج جس چیلنج سے سابقہ پڑ رہا ہے، وہ مختصراً مشتمل ہے ایک مختلف نوعیت کے علم کی بے اندازہ طاقت، ایک مختلف نوعیت کی تنظیم اور ایک مختلف طرزِ زندگی پر۔ اس چیلنج کے ردّعمل کے طور پر مسلمانوں میں جو اصلاحی رجحانات پیدا ہوئے ہیں، وہ حسبِ ذیل ہیں۔

۱۔ رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام اور خلفائے راشدین کے زمانے میں ہمارے ہاں جو کچھ تھا، وہ عہد حاضر نے جو کچھ ہمیں دیا ہے، اس سے بہتر ہے۔ اس لئے ہمیں اس مثالی دور کی تجدید کرنا چاہیئے اور اس کے ساتھ ساتھ عہد حاضر میں ٹیکنالوجی میں جو ایجادات ہوئی ہیں، انہیں اپنا لینا چاہیئے۔ یہ مسلک آج سعودی عرب کی ریاست، سنوسیوں، جماعت اسلامی، اخوان المسلمین، حزب التحریر اور دارالاسلام کا ہے۔

۲۔ ہمارے ہاں جو کچھ تھا، اس میں بعض اچھائیاں ہیں اور عہد حاضر نے جو کچھ دیا ہے، اس میں بھی اچھائیاں ہیں، ہمارا طریقۂ اصلاح یہ ہونا چاہیئے کہ اپنے ہاں کی باقیات صالحات کی تجدید کریں اور اس میں عہد حاضر کی اچھائیاں بھی شامل کر لیں۔ یہ مسلک جمال الدین افغانی، شیخ محمد عبدہٗ رضا، علی عبدالرزاق، ابن بادیس اور ان کے متبعین کا ہے، جن میں علمائے دین بھی ہیں، مفکر بھی ہیں اور سیاسی لیڈر بھی۔ عرب دنیا، پاکستان، ایران اور انڈونیشیا کی زیادہ تر قومی جماعتیں کسی نہ کسی حد تک اسی مسلک سے رہنمائی حاصل کرتی ہیں۔

۳۔ جو کچھ ہمارے پاس تھا، خواہ وہ اچھا تھا یا برا، اس کا دور بیت گیا اور عہد حاضر نے جو کچھ دیا ہے، وہ اس پر سبقت لے گیا ہے۔ اس لئے اسے ہمیں آج کلیتہً اپنا لینا چاہیئے باقی رہا مذہب کا سوال، تو یہ ایک شخص کا نجی معاملہ ہے، اور اس میں اسے آزادی ہونی چاہیئے اس مسلک کا سب سے نمایاں علم بردار ترکی شاعر ضیا گوکلپ تھا۔ جس کے افکار نے کمال ازم کی شکل اختیار کی۔ اگرچہ مصر کے ڈاکٹر طہٰ حسین بھی اسی راہ پر چلے، لیکن وہ ایک مقام پر جا کر رک گئے اور اب ان کا نقطۂ نظر کچھ درمیان درمیان ہے۔

اِس کے علاوہ دنیائے اسلام میں ایک اور رجحان بھی اُبھر رہا ہے اور وہ مارکسزم کا ہے۔ اس کے پیش نظر اسلام اور قرآن سے قطع نظر کر کے مکمل طور پر تبدیلی لانا ہے۔ اس رجحان کے سوا اس وقت مسلمان ملکوں میں جو بھی اصلاحی تحریکیں چل رہی ہیں، ان میں سے کسی میں بھی قرآن مجید سے انکار نہیں کیا جا رہا۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ بعض مصلحین اس کے

من مانے معنی کرتے ہیں اس کی تحریف کے مرتکب ہوتے ہیں، اور جتنی اہمیت اسے دینی چاہیئے نہیں دیتے، لیکن قرآن کا انکار کوئی بھی نہیں کرتا۔

اوپر جن تین مسلکوں کا ذکر ہوا ہے، ان میں سے پہلے مسلک پر آج پورے عالم اسلام میں صرف سعودی حکومت ہی عمل پیرا ہے۔ اس کے محکمہ "أمر بالمعروف" کے سربراہ محمد شمل نے قومیت اور اسلام کے موضوع پر ایک کتاب لکھی ہے، جس میں ایک جگہ وہ اپنی حکومت کے طرز عمل کو ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:۔ اسلام دنیا کا بہترین اصول اور موزوں ترین طریقۂ حیات ہے ... اس ملک میں صرف ایک ہی اصول اور ایک ہی دعوت پیش کی جا سکتی ہے، اور وہ اسلام کا اصول اور دعوت ہے یہ واحد مملکت ہے جو اس زمانے میں خدا تعالیٰ کی توحید، قرآن کے احکام، رسول اکرمؐ کی سنت اور سلف صالح کے نظریات پر قائم ہوئی ہے" اس کے معنی یہ ہوئے کہ ایسی مملکت میں کوئی نئی چیز اس وقت تک اختیار نہیں کی جا سکتی، جب تک کہ پہلے یہ ثابت نہ ہو جائے کہ وہ قرآن کے خلاف نہیں۔ سنت نبوی اور سلف صالح کے خلاف نہیں۔ یعنی ان کے نقطۂ نظر سے،

دوسرے مسلک والے جس کے علمبردار سید جمال الدین افغانی اور شیخ محمد عبدہ مصر میں اور سرسید اور ان کے ہم خیال برصغیر میں تھے، اسلام کو دینِ عقل قرار دیتے ہیں، اور ان کے نزدیک جو چیز عقل کے معیار پر پوری اترتی ہے، وہ اسلام کے خلاف نہیں۔ ان کے ہاں اجتہاد کا دروازہ کھلا ہے اور آج سیاسی و انتظامی و معاشی نظم و نسق حکومت کے لئے جو تبدیلیاں ناگزیر ہیں وہ ان کے حق میں تھے، چنانچہ شیخ محمد عبدہ نے بنک کے منافع کو جائز قرار دیا تھا۔

اس مسلک پر چلتے ہوئے آج ایک مسلمان مملکت اپنے ضابطۂ قوانین میں فقہی قانون کے ساتھ ساتھ سیکولر قانون کو شامل کر سکتی ہے۔ وہ ایک جدید طرز کا آئین اختیار کر سکتی ہے اور اسکے ساتھ یہ صراحت بھی کر دیتی ہے کہ اس کا سربراہ اور صدر مسلمان ہی ہو سکتا ہے آج اکثر عرب ملکوں، پاکستان اور ایران کا اس پر عمل ہے۔ اور اس کا خیال رکھا جاتا ہے کہ کوئی ایسا قانون نہ بنے، جو قرآن کی روح کے خلاف ہو۔ اس مسلک کے حامیوں میں سے لبنان کے ایک پروفیسر المحمصانی ہیں، جنہوں نے اپنی کتاب

"فلسفۂ اصول فقہ اسلامی" میں لکھا ہے ۔ مسلمانوں میں ایسے خلفاء رہنما اور فقیہہ گزرے ہیں جنہوں نے قرآن کے مفہوم کی نئی تعبیر کرنے کی اجازت دی ہے ان کے نزدیک اس نئی تعبیر کے لئے ضروری ہے کہ پہلی تعبیر جن حالات واسباب کی بنا پر ہوئی وہ بدل چکے ہوں ۔ اسی طرح مصلحت عامہ اور ضرورت عامہ کے ماتحت بھی قرآن کے مفہوم کی نئی تعبیر ہوسکتی ہے ۔ چنانچہ موصوف کے اس نقطۂ نظر کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مسلمان خود قانون ساز کا درجہ اختیار کر لیتے ہیں اور اس کے لئے ضروری نہیں کہ وہ قرآن مجید کے ظاہری الفاظ کے پابند رہیں، صرف اس کی روح کی پابندی ہونی چاہیئے اسی مسلک کے تتبع میں مصر نے شرعی عدالتوں کو جو اب تک وہاں چلی آرہی تھیں، جدید سول عدالتوں میں مدغم کر دیا ہے ۔ اور پورے ضابطہ قوانین پر نظر ثانی ہو رہی ہے ۔ اور تیونس میں ایک نئے قانون کے ذریعہ تعدد ازدواج کو ممنوع قرار دیا گیا ہے ۔

اب رہا تیسرے مسلک کا معاملہ جس پر کمالی ترک گامزن ہیں، وہ زیادہ سیدھا سادا اور جراَت مندانہ ہے ۔ ان کا کہنا ہے کہ ہم نے اجتہاد کا حق جو اسلام کی رو سے مسلمانوں کو حاصل ہے، صحیح حق داروں یعنی عوام کے نمایندوں کو دے دیا ہے اور اب ان پر مشتمل قومی اسمبلی قانون بنانے کی مجاز ہے ۔ بعض غیر ترک اہل الرائے نے بھی جن میں علامہ اقبال مرحوم شامل ہیں، اجتہاد کے بارے میں کمالی ترکوں کے اس نقطۂ نظر کی تائید کی ہے اس کے علاوہ انہوں نے اجماع کے یہ معنی لئے ہیں کہ جب ترک قوم کا اپنے ہاں سیکولر نظام حکومت قائم کرنے پر اجماع ہو جاتا ہے، تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم نے قرآن کو ترک کر دیا ہے الغرض آزاد مسلم مملکتوں کو جیسے جیسے اپنے مسلمان عوام کے لئے قانون سازی کرنی پڑ رہی ہے، ان کے ہاں دوسرا اور تیسرا مسلک جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے، قریب آتے جا رہے ہیں اور ترکی جیسا سیکولر ملک بھی نئے قوانین اور نئی تبدیلیوں کے جواز کے لئے قرآن وسنت کی نئی تعبیرات سے استمداد کرتا ہے ۔

لبنانی مضمون نگار کے الفاظ میں اگر پہلے مسلک کے حامی قدامت پسندوں اور سلفیین کا گروہ عقل واستدلال اور تاریخی تغیر و تبدل کے درمیان صحیح ربط پیدا کرنا سیکھ لے جس کی تلقین

خود قرآن مجید نے کی ہے، تو یہ تینوں مسلک :- ایک قدامت پسندوں کا، دوسرا اعتدال پسندوں کا اور تیسرا انتہا پسندوں کا۔ ایک دوسرے کے قریب آسکتے ہیں اور سب مل کر قرآن کے بتلائے ہوئے صحیح راستہ پر چل سکتے ہیں۔

دنیائے اسلام میں آج جتنی بھی اصلاحی کوششیں بروئے کار ہیں، سوائے مارکسزم کے متبعین کے، اپنے استدلال میں قرآن ہی کی طرف رجوع کرتی ہیں۔ ان میں بعض کے استدلال کو خواہ آپ کھلی تحریف کا نام دیں۔ اور ان کے خلاف علمائے کرام کی غالب اکثریت کفر کا فتویٰ ہی کیوں نہ دے، اب تک کسی مسلمان ملک میں قرآن کے انکار کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ اور سیکولر سے سیکولر مسلمان بھی تجدید و اصلاح کے حق میں قرآن ہی سے مدد لیتا ہے البتہ وہ اس کے مفہوم کی نئی تعبیر کرتا ہے۔ یہ رجحان بہت حد تک اسلام اور مسلمانوں کے لئے خوش آئند ہے۔ اور اس سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں کا قومی ضمیر مسلمان رہتے ہوئے دور حاضر کے ساتھ قدم ملا کر چلنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ اور اس کے نزدیک آج کی معاشی اجتماعی اور سیاسی ضرورتیں اسلامی روح کو برقرار رکھتے ہوئے پوری کی جاسکتی ہیں۔ اور جدید بننے کے لئے ضروری نہیں کہ قدیم کا سرے سے انکار ہو۔ بلکہ قدیم اور جدید میں ہم آہنگی پیدا کر کے امت مسلمہ آگے بڑھ سکتی ہے۔

جہاں تک عقائد کا تعلق ہے، اسلام نے توحید، رسالت، انسانیت اور اخلاق عامہ کے بارے میں جو تصورات دیئے ہیں، جب بھی ان کا مقابلہ دوسرے مذاہب کے ان تصورات سے ہوا ہے اسلام ہمیشہ غالب رہا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں میں بہت کم لوگ اسلام ترک کر کے ان مذاہب میں سے کسی مذہب کو اختیار کرتے ہیں۔ مسلمانوں پر ایک بڑی ابتلا یورپی اقوام کی سیاسی غلامی تھی، خدا نے کیا اس سے انہیں نجات مل گئی ہے۔ اب ان کے سامنے اپنی معاشی و سماجی پس ماندگی کو دور کرنے کا مسئلہ ہے۔ اور یہ اتنا نظریاتی نہیں، جتنا عملی ہے اور اس صورت حالات نے کہ ایک طرف ان پر مشرق کی طرف سے کمیونسٹ ملکوں کی یلغار ہو رہی ہے اور دوسری طرف امریکہ اور دوسرے مغربی ملکوں نے ان پر ہلّہ بول دیا ہے۔ اس مسئلے کو اور بھی نازک، پیچیدہ، اہم

اور خطرناک بنا دیا ہے یہ اسلام کے لئے بہت بڑا چیلنج ہے اور یہ چیلنج محض عقائد، نظریات اور لبرلزم کی قسم کا سطحی نہیں، بلکہ یہ افراد اور قوموں کی مجموعی زندگی کو محیط ہے اور اس کا جواب مثبت عمل، نتیجہ خیز عمل اور مجموعی عمل سے ہی دیا جا سکتا ہے۔

لبنانی مضمون نگار کے الفاظ ہیں:۔ "سماج روحانیت سے بے تعلق ہو جائے تو اس کا کچھ بھی حشر ہو سکتا ہے اور اگر روحانیت کی جڑیں سماج میں نہ ہوں، تو وہ بجا طور سے مارکس کی افیون ہو سکتی ہے۔ ہم نے بار بار اس امر کا اعادہ کیا ہے کہ اسلام ان دونوں کا جامع ہے اور دونوں کو باہم ہم آہنگ کرتا ہے۔ یہ اسلام کی منفرد اور امتیازی خصوصیت ہے، جو اس سے کسی حال میں چھٹنی نہیں چاہیئے۔ اس ضمن میں یہ بھی ملحوظ رہے کہ سماج اور روحانیت کا باہمی تعلق حرکی اور نمو پذیر ہے نہ کہ جامد۔ دنیا کی مادی زبان میں روحانیت کا سرچشمہ انسان بحیثیت فرد کے ہے اور سماج کا سرچشمہ انسان بحیثیت جماعت کے۔"

اور آخر میں بقول مضمون نگار موصوف کے

"آج انسانیت کے روحانی مستقبل کا دارومدار اس پر ہے کہ اس ضمن میں اسلام کدھر جائیگا اور کیا کرے گا۔ اسلام نے اپنی ابتدائی صدیوں میں مغرب کی توحید پرستی اور مشرق کے کائنات ہی کو ذات الٰہ سمجھنے والے عقیدہ وحدت الوجود میں ایک تخلیقی رشتہ پیدا کیا تھا۔ آج ان دونوں اور مادی وحدانیت (MONiSM) کے درمیان ایک تخلیقی رشتہ بننے کے لئے اسلام کو اس قابل ہونا چاہیئے کہ وہ اپنی ان صدیوں کی حرکی اور تغیر قبول کرنے والی روح کو آزادی، انصاف اور نظم و ضبط کے تخلیقی دوائر میں کارفرما کرے۔"

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مرد مسلماں
اللہ کرے تجھ کو عطا جدت کردار
اقبال

اسرار المحبۃ

شاہ رفیع الدینؒ کی ایک نادر تصنیف

حضرت مصنف کتاب کی ابتدا اس تمہید سے فرماتے ہیں :-

"سب تعریف اللہ تعالیٰ کے لئے ہے کمال محبت کے ساتھ، اور درود و سلام پہنچے اس کے حبیب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو جو تمام احباء میں سے سب سے زیادہ محبوب ہیں اور آپؐ کی آل کو اور جو آپؐ کے اصحاب تھے اور جنھوں نے کہ آپؐ کی پیروی کی اور آپؐ سے محبت رکھی۔ بندۂ مسکین محمد رفیع الدین، اللہ اسے اپنے سلف صالحین سے ہم کنار کرے، عرض کرتا ہے :-

:- محبت ایک نیک وصف اور لطیف کیفیت ہے۔ یہ ایک انتہائی وجدانی لذت ہے۔ اس کی نشو و نما محبوب میں کسی ممتاز کمال کے وجود سے ہوتی ہے۔ اس کا اظہار مُحِبّ عاشق کی ذات میں اس کمال کے پُر زور اثر کے امتزاج میں ہوتا ہے۔ اور یہ اس کمال کی معرفت کی بحیثیت اس کمال کے خبر دیتی ہے۔ اگر اسے اپنا صحیح محل و مقام ملے اور جو اس کے اہل و مستحق ہیں۔ وہاں یہ وارد و اثر انداز ہو تو پھر وہ سبب بنتی ہے قربِ الٰہی کے متعدد مراتب

۱؎ حضرت شاہ رفیع الدین کی یہ نادر کتاب پہلی دفعہ زیور طبع سے آراستہ ہوئی ہے، اور اس کا سہرا ادارۂ نشر و اشاعت مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ اور مولانا عبدالحمید صاحب سواتی کے سر ہے۔ اس مضمون میں کتاب مذکور پر ایک اجمالی تبصرہ کیا گیا ہے۔ (مدیر)

ذہن کی صفائی اور تفکر کی عمدگی کا۔ نیز بہت سے اخلاق فاضلہ کے تزکیہ و تہذیب اور تمام اعمال صالح پر عمل پیرا ہونے کا اور اس کی وجہ سے دنیا اور آخرت کے جملہ نفع بخش روابط سے مضبوط رشتہ قائم ہوتا ہے۔ اور جب اسے اپنا صحیح محل و مقام نہ ملے، اور جو اس کے اہل نہیں وہاں یہ وارد ہو تو وہ دینی و دنیوی فتنوں کا باعث بنتی ہے۔ اسی بنا پر اس حدیث میں "آدمی اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے۔ تم میں سے ہر شخص کو دوست بناتے وقت اس کا خیال رکھنا چاہیئے۔" متنبہ کیا گیا۔ محبت ہر کمال کے حصول کی شرط اور مقامات فنا و بقاء دارلآخرت میں وسیع و عریض مملکت اور عزت و مرتبے والے دنیوی مناصب تک ترقی کا ذریعہ ہے۔ محبت کے موضوع پر جس کے تسلط میں کہ تمام کے تمام لوگ آتے ہیں، جن گروہوں نے بحث کی ہے، ان میں سے چار گروہ حسب ذیل ہیں۔"

شاہ رفیع الدین صاحب نے محبت کی اس ابتدائی تعریف کے بعد ان چار گروہوں کا ذکر کیا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

ان میں سے سب سے مقدم ارباب شرائع ہیں۔ انجیل میں آیا ہے۔ یہودیوں نے حضرت عیسیٰ روح اللہ سے امتحاناً پوچھا۔ تمہارے نزدیک توارت کے کون سے احکام سب سے بلند مرتبہ ہیں حضرت عیسیٰؑ نے جواب میں فرمایا:۔ یہ کہ تم اپنے خدا سے پورے دل کے ساتھ محبت کرو۔ اور جو تم اپنے لئے محبوب رکھتے ہو، وہی اپنے بھائی کے لئے بھی محبوب رکھو۔ اسی طرح حبیب خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کے مختلف شعبوں، اس کے فوائد اور احکام کے بارے میں متواتر احادیث میں اتنا کچھ آیا ہے کہ اس کا احاطہ نہیں ہو سکتا۔

دوسرا گروہ اصحاب تصوف کا ہے۔ اکابر صوفیہ، پہلوں اور بعد میں آنیوالے ہر دو سے محبت کے باریک رموز اور نازک معاملات روایت کئے گئے ہیں۔ اس کے احکام کے بیان میں شیخ احمد الغزالی نے "فوایح الجمال" اور شیخ فخرالدین عراقی نے "اللمعات" نام کی خاص طور سے کتابیں لکھیں۔ مولانا جلال الدین رومی کی مثنوی میں محبت کے دریاہائے عظیم موجزن ہیں۔ اسی طرح سید علی ہمدانی کی "شرح الخمریہ" میں اسی کا بیان ہے۔ مولائے جامی نے بڑی تفصیل سے اس کا ذکر کیا ہے۔ احیاء العلوم کے

آخر جین العلم میں اس کے متعلق ایک باب ہے۔ "فتوحات" میں محبت، دوستی اور اخوت پر کئی ابواب ہیں۔ "عوارف" میں محبت پر باب ہے، اور اسی طرح اتنا کچھ لکھا ہے کہ حد و حساب میں نہیں آسکتا۔

"تیسرا گروہ حکما یعنی فلسفیوں کا ہے۔ ان میں سے بوعلی ابن سینا نے عشق پر ایک مستقل رسالہ لکھا ہے۔ صدر شیرازی نے "الاسفار" میں اس پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ اس سلسلے میں جو سودادی، دماغی بیماریاں ہو جاتی ہیں، تو وہ محبت کی ردّی اور خراب اقسام میں سے ہیں۔ اور چوتھا گروہ شعراء کا ہے۔ عرب عجم اور ہنود کا۔ ان شعراء نے محبت کے اسرار کی نشر و اشاعت کی اور اس کے متعلق منظوم حکایات لکھیں"

شاہ رفیع الدین صاحب فرماتے ہیں کہ میں ایک عرصہ سے اپنے اصدقاء و احباب سے اس کے متعلق بحث و گفتگو کیا کرتا تھا۔ یہاں تک کہ ۱۲۱۴ھ میں ایک ایسی تقریب بہم ہوئی کہ مجھے ان بحثوں کو اس کتاب میں مدون کرنے کا موقع ملا۔

اس تمہید کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے۔ جو تین اجزاء پر مشتمل ہے پہلے جزو کا عنوان "تحصیل" ہے۔ زیر نظر کتاب کے مقدمہ میں مولانا عبدالحمید سواتی اس کا خلاصہ یوں بیان کرتے ہیں۔ "تحصیل" میں محبت کی حقیقت، اس کی اقسام اور اس کے مختلف شعبوں مثلاً محبتِ الٰہیہ، محبت بشریہ اور محبت جامعہ کا ذکر ہے۔ محبت الٰہیہ کی دو قسمیں ہیں۔ محبت من اللہ اور محبت مع اللہ اسی طرح محبت بشریہ کی دو قسمیں ہیں محبت طبعیہ اور محبت عرضیہ اور تیسرے شعبے محبت جامعہ کی ایک ہی قسم ہے اور وہ محبت مرکبہ ہے اس کے بعد ہر شعبے کی پوری تفصیل و تشریح ہے۔

شاہ صاحب "تحصیل" کا باب یوں شروع کرتے ہیں:۔ ہم پورے یقین کے ساتھ یہ مانتے ہیں کہ محبت ایک قدسی اور غیبی راز ہے۔ یہ ایک عظیم الٰہی شان ہے اور اس کا احاطہ نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ کی علم، حیات اور قدرت کی صفات کی طرح یہ ایک صفت ہے اور اس کا ظہور تمام مظاہر اور کل کون و مکان میں ہوا ہے۔ آخر یہ کیوں نہ ہو، یہ عالم خود اسی محبت کا ہی تو نتیجہ ہے جیسا کہ وارد ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ پہچانا جاؤں، چنانچہ میں نے یہ کائنات پیدا کی

اب اس کائنات میں خدائے رحمان کی رحمت کے آثار بے شمار ہیں۔ اور قرآن مجید کی آیت "ورحمتی وسعت کل شئی" میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔ اور رحمت محبت ہی کی ایک قسم ہے ایک اور روایت ہے۔ "اللہ تعالیٰ کے ہاں سو رحمتیں ہیں۔ اور اس نے دنیا میں اپنی صرف ایک رحمت نازل کی ہے جس کا اظہار مخلوقات کی آپس کی محبت میں ہوتا ہے اور باقی کی ۹۹ رحمتیں قیامت کے دن کے لئے مخصوص ہیں"۔

الغرض دین اور دنیا اور پوری کائنات میں محبت جس طرح کارفرما ہے اسے "تحصیل" میں بیان کیا گیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ ایمان جو تمام فضائل کی اصل ہے، وہ بھی اسی کی شدت کا نام ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے۔ والذین آمنوا اشد حباً للہ۔ اور حدیث شریف میں آیا ہے کہ تم میں سے کوئی اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک میں اس کو اس کے ماں باپ، اولاد اور سب لوگوں سے عزیز نہ ہوں۔

"تحصیل" ہی میں ایک مقام پر شاہ صاحب لکھتے ہیں: "عقل کا خاصہ یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کی طرف پوری توجہ کرتی ہے، تو اس پر اس چیز کے احکام اور اس کی باریکیاں منکشف ہو جاتی ہیں اور قلب کا خاصہ یہ ہے کہ جب وہ سب سے کٹ کر کسی چیز کے لئے ہو جاتا ہے، تو وہ اسی کے رنگ میں رنگا جاتا ہے چنانچہ جب آدمی ذات حق کی طرف پوری ہمت سے متوجہ ہوتا ہے اور اسے تصفیہ میسر ہوتا ہے، تو اس کے ادراک میں قیومیت کی حقیقت جلوہ افروز ہوتی ہے۔ اور وہ قوت فعالہ کے رنگ میں رنگا جاتا ہے۔ اس حالت میں اس سے کرامات کا ظہور ہوتا ہے اور جس طرح قوت وہمی بدن میں موثر ہوتی ہے اسی طرح ہیولیٰ اس آدمی سے متاثر ہوتا ہے۔

کتاب کے دوسرے جزو کا عنوان "تذئیل" ہے۔ اس میں محبت کے حقوق کیا ہیں اور طرفین کے لئے محبت کن شرائط کے ساتھ مفید ہو سکتی ہے، ان کا ذکر ہے، اور یہ بھی بیان کیا ہے کہ کفار کو بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ اس میں نقص ہوتا ہے۔ اس لئے آخرت میں ان کے لئے زیادہ کارگر ثابت نہ ہوگی۔ اسی سلسلے میں یہ بھی بیان کیا ہے کہ جو شخص اولیاء اللہ

کے ساتھ محبت کا دعویٰ کرتا ہے، لیکن ان کی اقتدا نہیں کرتا۔ ایسا شخص اپنے دعوے میں جھوٹا ہے
کتاب کے تیسرے جزو کا عنوان "تفصیل" ہے۔ اس میں "تحصیل" کی بعض مجمل اور مبہم باتوں کی وضاحت
کی گئی ہے۔ اور درجاتِ محبت کی تفصیل ہے۔

مولانا عبدالحمید صاحب نے "اسرار المحبۃ" کی تصحیح و اشاعت کے لئے بڑی کاوش کی ہے شاہ صاحب
کی یہ کتاب اب تک غیر مطبوعہ تھی اس کا ایک نسخہ مولانا عبدالحمید صاحب کو مجلس علمی کراچی سے ملا۔
اس کا مقابلہ موصوف نے ایک اور نسخہ سے کیا۔ جو انہیں مولوی محمد شفیع صاحب مرحوم سے ملا تھا
اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں "ہم سے جہاں تک ہو سکا، مجلس علمی کراچی کے نسخے اور مولوی محمد شفیع صاحب
مرحوم کے ذاتی نسخے کو سامنے رکھ کر دونوں کا تقابل کیا اور بعض مقامات پر اپنی دانست کے مطابق
اغلاط کی درستگی اور تصحیح کر دی ....." یہ کام بڑی محنت اور توجہ چاہتا تھا جس کے لئے غیر
معمولی خلوص و للّٰہیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ خانوادہ ولی اللہی کے افکار
تعلیمات اور ان کی تصنیفات سے مولانا عبدالحمید صاحب کو ذاتی لگن اور دلی شغف ہے اور ان کی
اشاعت میں کوئی تکلیف ان کے لئے تکلیف نہیں اس سے پہلے ان کے اہتمام میں شاہ رفیع الدین صاحب
کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ اسرار المحبۃ تیسری کتاب ہے اور شاہ صاحب کی تکمیل الاذہان
اب زیر طباعت ہے۔ اللّٰھم زِد فَزِد

زیر نظر کتاب کے ناشرین اور خود مولانا عبدالحمید سے ہمیں ایک شکایت ہے اور یہی شکایت
ہم ان سے پہلے بھی کر چکے ہیں، شاہ رفیع الدین کی پہلی کتابوں کی طرح اسرار المحبۃ بھی نستعلیق میں چھپی
ہے۔ گو خط بڑا اچھا ہے، لیکن ناشرین جہاں اتنا خرچ برداشت کرتے ہیں، وہاں وہ تھوڑا سا اور
خرچ برداشت کر کے اگر انہیں نسخ میں چھاپیں تو ایک تو ان کا مطالعہ زیادہ آسان ہو اور دوسرے
ان کتابوں کو عربی ملکوں میں برآمد کیا جا سکتا ہے خانوادہ ولی اللہی کی علمی وراثت کو عام کرنے کی
مدرسہ نصرۃ العلوم نے جو خدمت ذمے لے لی ہے، اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ اور اس
سلسلے میں مولانا عبدالحمید سواتی کی ہمت، کوشش اور لگن قابل داد ہے۔ خدا تعالیٰ اس ادارے

اور اس کے کارکنوں کے ارادوں کو برکت دے۔

کتاب کے آخر میں شیخ ابن سینا کا وہ مشہور قصیدہ بھی شامل کر دیا گیا ہے، جس کے جواب میں حضرت شاہ رفیع الدین صاحب نے قصیدہ لکھا تھا۔ نیز مصر کے مشہور شاعر امیر الشعراء شوقی نے ابن سینا کے اسی قصیدے پر ایک قصیدہ لکھا تھا وہ بھی کتاب میں درج کر دیا گیا ہے، اس کے علاوہ کتاب میں شاہ رفیع الدین کے دو قصیدے اور ہیں۔ ایک میں اپنے والد بزرگوار حضرت شاہ ولی اللہ کے ایک قصیدے کی جو "حقیقت النفس" کے متعلق ہے تخمیس ہے، اور دوسرا معراج النبیؐ پر ہے

ابن سینا کے قصیدے کے کُل ۱۲۱ ابیات ہیں۔ ان میں وہ کہتا ہے کہ روح محل ارفع سے اتری اس دنیا میں آئی۔ اسے یہاں مختلف حالات سے گزرنا پڑا۔ اور اس دوران میں اسے برابر اس محل ارفع کی یاد ستاتی رہی۔ آخر وہ پھر واپس گئی یہاں ابن سینا سوال کرتا ہے۔

فلای شئ اھبطت من موضع سام الی القعر الحضیض و ضع

آخر وہ مقام بلند سے اس ذلیل پستی میں اُتری کیوں۔

اس کے بعد کہتا ہے کہ اگر اللہ نے اسے کسی حکمت کی بنا پر اتارا تھا کہ وہ ذہین اور عقل مند آدمی سے بھی مخفی ہے۔ یا اس کا اترنا اس لئے ضروری تھا کہ جو کچھ اس نے نہیں سنا تھا، وہ اسے سن لے اور وہ عالم کی ہر خفیہ چیز سے باخبر ہو کر لوٹے، تو اس کی مراد پوری نہیں ہوئی۔

شاہ رفیع الدین صاحب نے ابن سینا کے اس قصیدے کا جواب اسی ردیف اور قافیے میں کوئی ۲۴۰ ابیات میں دیا ہے، جن میں اس "فیلسوف المعی" کو جس کی آنکھوں سے شریعت کا روشن راستہ مخفی تھا، روح کے اس دنیا میں آنے اور پھر واپس جانے کی حکمت بتائی ہے اس سلسلہ میں شاہ صاحب کے دو تین ابیات کا اردو ترجمہ ملاحظہ ہو۔

اگر تم نفس کی زندگی اور موت سے واقف ہوتے اور جس طرح یہ سرعت سے لوٹتا ہے وہ تمہیں معلوم ہوتا تو تم جانتے کہ نفس جسم میں داخل ہونے سے پہلے ایک ایسے بیج کی طرح ہے، جو ابھی بویا نہیں گیا۔ اور بیج کی مختلف قسمیں اور مختلف اوصاف ہوتے ہیں۔ اس کے

پھل جدا جدا ہوتے ہیں اور اس کی صنفیں الگ الگ ہوتی ہیں۔ اس کی تمام قوتیں اس کے اندر مخفی ہوتی ہیں، اور اس کا شعور مجمل ہوتا ہے۔

مولانا عبدالحمید سواتی صاحب کی یہ تصحیح شدہ کتاب ادارہ نشر و اشاعت نصرۃ العلوم گوجرانوالہ نے چھاپی ہے۔ دو روپے پچاس پیسے اس کی قیمت ہے۔ اور ادارہ مذکور کے ناظم یا ماسٹر الہ دین ناظم انجمن اسلامیہ گکھڑ منڈی ضلع گوجرانوالہ سے مل سکتی ہے۔

○

المسویٰ من احادیث الموطا

تالیف

الامام ولی اللہ الدہلوی

(عربی)

شاہ ولی اللہؒ کی یہ مشہور کتاب آج سے ۳۲ سال پہلے مکہ مکرمہ میں مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کے زیر اہتمام چھپی تھی اس میں جگہ جگہ مولانا مرحوم کے تشریحی حاشیے ہیں شروع میں حضرت مولفؒ کے حالات زندگی اور الموطا کی فارسی شرح المصفّٰی پر آپ نے جو جو مقدمہ لکھا تھا، اس کا عربی ترجمہ ہے شاہ صاحب نے المسویٰ میں الموطا امام مالک کو نئے سرے سے ترتیب دیا ہے امام مالک کے وہ اقوال جن میں وہ باقی مجتہدین سے منفرد تھے حذف کر دیئے گئے ہیں الموطا کے ابواب سے متعلق قرآن مجید کی آیات کا اضافہ کیا گیا ہے اور تقریباً ہر باب کے آخر میں شاہ صاحب نے آخر میں اپنی طرف سے توضیحی کلمات بھی شامل کر دیئے ہیں۔

حدیث و فقہ میں الموطا امام مالکؒ سب سے بنیادی کتاب ہے اور جیسا کہ شاہ صاحب نے لکھا ہے "کتاب اللہ کے بعد روئے زمین پر اصح الکتاب یہی ہے" اس کتاب کے مطالعے اور اس سے استفادہ میں المسویٰ آپ کے لئے بہترین مددگار ہو سکتی ہے۔ المسویٰ کے دو حصے ہیں مجموعی صفحات ۹۶۲ ہیں۔ کاغذ بیزادر چکنا ہے اچھے ٹائپ میں چھپی ہے۔ اور غلطیوں سے پاک ہے۔ قیمت بیس روپے

ملنے کا پتہ :- شاہ ولی اللہ اکیڈمی صدر حیدرآباد مغربی پاکستان

تنقید و تبصرہ

اسلامی نظریۂ حیات

مؤلفہ خورشید احمد لیکچرار کراچی یونیورسٹی

ناشر شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ کراچی یونیورسٹی کراچی

جہاں تک اسلام کی فکری و نظریاتی بنیادوں کا تعلق ہے کراچی یونیورسٹی مستحق مبارک باد ہے کہ اس نے اس موضوع پر یہ کتاب شائع کی، جو صرف جامعات اور کالجوں کے نوجوان طالب علموں کو اسلام کے ان پہلوؤں کے متعلق وہ سب معلومات فراہم کرے گی جن کی انہیں آج سخت ضرورت ہے، بلکہ ملک کے عام تعلیم یافتہ اردو داں حضرات بھی استفادہ کر سکیں گے مؤلف نے مضامین کے انتخاب میں غیر معمولی حسن ذوق کا ثبوت دیا ہے۔ اور کوشش یہ کی ہے کہ اسلام کے بارے میں ان سب مباحث پر اصحاب علم و فکر کے آراء و افکار آجائیں۔ جو آج کل علمی و تعلیمی حلقوں کے موضوع بنے ہوئے ہیں اور ان کے متعلق اکثر بحثیں ہوتی ہیں۔

"اسلامی نظریۂ حیات" کے مندرجات دینی و علمی لحاظ سے تو ایمان افروز، خیال پرور اور مفید ہیں ہی، نیز ان میں تنوع اور جامعیت دونوں ہیں، لیکن ان کے ساتھ ساتھ اس کتاب کی اپنی ایک ادبی حیثیت بھی ہے اور قاری اسے پڑھتے ہوئے یوں محسوس کرتا ہے کہ وہ گویا ایک ادبی کتاب پڑھ رہا ہے۔ تمام مندرجات کا اسلوب بیان اور زبان ادبی چاشنی لئے ہوئے ہے اور ان میں بڑی روانی ہے۔ غرض یہ کتاب دینی حس کی بھی تسکین کرتی ہے اور اس میں ادبی حس کی تسکین کا پورا اہتمام ہے۔

خورشید صاحب نے کتاب کا آغاز اسلام کی اس تعریف سے کیا ہے:

اسلام کسی ایسے مذہب کا نام نہیں ہے، جو صرف انسان کی نجی اور انفرادی زندگی کی اصلاح کا داعی ہو۔ اور جس کا کل سرمایۂ حیات کچھ عبادات، چند افکار اور چند رسوم پر مشتمل ہو بلکہ یہ ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے، جو خدا اور اس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کی روشنی میں زندگی کے تمام شعبوں کی صورت گری کرتا ہے۔ اور زندگی کے ہر پہلو کو خدا کے نور سے منور کرتا ہے۔ خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی، معاشرتی ہو

یا تمدنی، مادی ہو یا روحانی، معاشی ہو سیاسی اور ملکی ہو یا بین الاقوامی۔ اسلام کی اصل دعوت یہ ہے کہ خدا کی زمین پر خدا کا قانون جاری وساری ہو اور دل کی دنیا سے لیکر تہذیب و تمدن کے ہر گوشے تک خالق حقیقی کی مرضی پوری ہو۔"

مرتب نے مذکورہ بالا الفاظ میں اسلام کی جو تعریف کی ہے، کتاب کے تمام مندرجات دراصل اسی جامع تعریف کی تفصیل ہیں اور ہر صاحب قلم نے اسی نقطۂ نظر سے اسلام کے کسی نہ کسی پہلو پر بحث کی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ بحث کا پورا حق ادا کیا ہے۔ اور اس سلسلے میں جن جن شکوک و شبہات کا ان دنوں اظہار ہوتا ہے۔ ان کا جواب دیا ہے۔

جہاں تک مذہب کی ضرورت، مذاہب عالم میں اسلام کی برتری۔ اور اس ضمن میں اسلام کے تصور زندگی۔"اسلامی نظریۂ حیات کی بنیادی خصوصیات"۔ اسلام کے بنیادی عقائد" توحید" رسالت" اسوۂ حسنہ" عقیدہ آخرت" اور اسلامی تصور عبادت" اور اسلامی عبادات کے مباحث کا تعلق ہے، کوئی منصف مزاج غیر مسلم اور تعصب سے خالی مسلمان ان کے مندرجات کی افادیت اور حقانیت سے انکار نہیں کر سکے گا۔ اور پروفیسر عبدالحمید صدیقی نے "دور حاضر کی تحریکیں اور مذہب" کے باب میں تہذیب جدید اور اس کے معانی و مقاصد و مظاہر پر جس عالمانہ و محققانہ اور موثر طریقے سے کڑی تنقید کی ہے اسے پڑھنے کے بعد اگر کسی کے ذہن میں اشتمالیت یا مغربی جمہوریت کے لئے کوئی وجہ کشش ہوگی، تو اسے لامحالہ اپنے مزعومات پر نظر ثانی کرنا ہوگا۔ اور اس کے لئے سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہیں ہوگا کہ وہ "اسلامی نظریہ حیات" کی برتری کو مانے۔

مرتب کے الفاظ میں یہ سب تھی "اسلام کی علمی اور فکری بنیادوں اور دور حاضر کے پیدا کردہ مسائل پر گفتگو" جس کا ماحصل موصوف کے الفاظ میں یہ ہے کہ انسان کی سب سے بڑی ضرورت صحت مند نظریۂ حیات ہے۔ مذہب سے انحراف کی جتنی راہیں بھی انسان نے اختیار کی ہیں، بالآخر وہ سب غلط اور تباہ کن ثابت ہوئی ہیں عقلی تجزیہ اور تاریخی تجربہ دونوں اس حقیقت کی طرف رہنمائی کرتے ہیں کہ مذہب کے بغیر زندگی حقیقی کامیابی، سکون و اطمینان اور امن و امان سے مالا مال نہیں ہو سکتی۔ اور وہ مذہب جو اپنی حقیقی شکل میں محفوظ ہے اور جو زندگی کے تمام مسائل کو حل کر سکتا ہے اسلام ہے" اس کے بعد مسئلہ آتا ہے۔ "اسلامی نظام حیات" کا جس پر کتاب کے حصہ سوم میں بحث ہے۔ اس کی تمہید میں خورشید صاحب لکھتے ہیں "اسلام زندگی کا جو نقشہ تجویز کرتا ہے، وہ محض انسانی عقل اور تجربہ کی روشنی میں ترتیب نہیں پاتا۔ بلکہ ابتدائی اور اولین رہنمائی خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت سے حاصل کی جاتی ہے۔ اور ان کی روشنی میں عقل اور تجربہ کی مدد سے زندگی کا نظام قائم کیا جاتا ہے۔"

غرض اسلام کی رو سے زندگی کا جو نقشہ تجویز ہوگا، گو اس کے لئے ابتدائی اور اوّلیں رہنمائی خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت سے ہی حاصل کرنا ہوگی، لیکن جیسا کہ خورشید صاحب نے لکھا ہے اس میں انسانی عقل اور تجربے سے مدد لینا پڑے گی اور وہ اس لئے کہ

> قرآن جزئیات کی کتاب نہیں ہے، بلکہ اصول اور کلیات کی کتاب ہے، اس کا اصل کام یہ ہے کہ بنیادی چیزوں کو پوری وضاحت کے ساتھ پیش کرے، لیکن وہ زندگی کے ایک ایک پہلو کے مطابق تفصیلی ضابطے اور قوانین نہیں بناتا۔ بلکہ وہ ہر شعبہ زندگی کے حدود اربعہ بنا دیتا ہے۔ (صفحہ ۴۳۹)

"قرآن کے بعد سنت اسلامی شریعت کا دوسرا ماخذ ہے ۔۔۔ سنت اپنی اصل حیثیت سے قرآن کے اجمال کی تفصیل اور اس کے اشکال کی توضیح و تفسیر ہے" لیکن اسلامی زندگی کے نقشے کی تجویز کے سلسلے میں "اجتہاد" کی بھی ضرورت ہوتی ہے، جس کے ماتحت براہ راست کتاب و سنت کے نصوص سے حکم معلوم کرنے کے بجائے کوشش کرکے کتاب و سنت کے اشارات سے ایک حکم معین کرنا پڑتا ہے اس ضمن میں مولف کے نزدیک "اجتہاد" کو جو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے، اس کا اندازہ کتاب کے اس اقتباس سے ہو سکتا ہے۔

"اجتہاد کی ضرورت انسانی زندگی میں مسلّم ہے۔ کیونکہ زندگی برابر نت نئے مسائل سے دوچار رہتی ہے۔ ان مسائل کا حل اگر شریعت سے معلوم کرنے کی کوشش نہ کی جائے، تو ہماری زندگی کا ربط شریعت سے ٹوٹ جائیگا۔ اور اس کو کوئی مسلمان اسلام پر قائم رہتے ہوئے گوارا نہیں کر سکتا۔ ہماری روحانی وایمانی زندگی کے لئے اس سے کہیں زیادہ ضرورت "اجتہاد" کی ہے جتنی ہماری مادی زندگی کے قیام و بقا کے لئے ہوا اور پانی کی ہے۔"

زیر نظر کتاب میں خورشید صاحب نے مثال کے طور سے "اسلام کا جو سیاسی نظام" پیش کیا ہے ظاہر ہے وہ اجتہاد ہی کا نتیجہ ہے کیونکہ سیاسی زندگی کے یہ مسائل اس دور کے ہیں اور ان کے بارے میں "عقل اور تجربہ کی روشنی" ہی میں احکام معین کئے گئے ہیں، گو اس ضمن میں یہ مان لیا جا سکتا ہے "ابتدائی اور اولیں رہنمائی ضرور خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت" سے حاصل کی گئی ہوگی۔ لیکن احکام کی بہ معین صورت اجتہاد ہی کا نتیجہ ہے۔ کتاب کا یہی باب ہمارے نزدیک محل نظر ہے اور اس میں انہوں نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان کی دینی حیثیت کے بارے میں اختلاف ہو سکتا ہے۔ مرتب کا اپنے اس مجوزہ سیاسی نظام کو "اسلام کا سیاسی نظام" کہنا ٹھیک نہیں مثلاً صفحہ ۴۰۶ پر ارشاد ہوتا ہے "اسلامی ریاست کی سب سے پہلی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک اصولی اور نظریاتی ریاست ہے اس ریاست کی بنیاد نہ نسل پر ہے اور نہ رنگ پر، نہ زبان پر ہے اور نہ وطن پر۔ نہ محض معاشی مفاد کا اشتراک اس کی اساس ہے اور نہ محض سیاسی الحاق۔" یہاں قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے

کہ آیا اس عالم آب و گل میں اس طرح کی ریاست عملاً وجود پذیر ہو سکتی ہے؟ اور خود مؤلف نے اسی باب کے شروع میں جس سے یہ عبارت لی گئی ہے، ریاست کی تعریف یوں کی ہے۔ "ریاست وہ ہیئت سیاسی ہے، جس کے ذریعہ ایک ملک کے باشندے ایک باقاعدہ حکومت کی شکل میں اپنا اجتماعی نظام قائم کرتے ہیں۔"

معلوم ہوتا ہے مؤلف کو شاید خود یہ تضاد کھٹکا ہے چنانچہ یہ سب کچھ لکھنے کے بعد ہی وہ فرماتے ہیں کہ "ہر ریاست کی طرح اسلامی ریاست کے لئے بھی ایک متعین علاقہ اور آبادی ہونا ضروری ہے۔" غرض یہ ہے کہ اسی کو تو عام اصطلاح میں وطن کہتے ہیں ایک ملک یا وطن کے بغیر ایک ریاست کا تصور ایسا ہی ہے، جیسے کہ ایک انسان کا جسم کے بغیر تصور ہو۔ بے شک ایک ریاست ایک معین ملک اور وطن رکھتے ہوئے ایک نظریاتی و اصولی ریاست ہو سکتی ہے، جیسے ایک شخص ایک شہر، ایک صوبے اور ایک ملک کا باشندہ ہوتے ہوئے بین الاقوامیت اور انسانیت عامہ کا حامل ہو سکتا ہے اور دونوں میں کوئی تضاد نہیں۔ اور ہم بیک وقت پاکستانی بھی ہو سکتے ہیں اور مسلمان بھی۔

آگے چل کر مؤلف "سیکولرزم" کی تعریف یوں کرتے ہیں۔ "یہ اس نظام کو کہتے ہیں، جس میں سیاسی اور ریاستی معاملات میں مذہب کو کوئی دخل نہ ہو، لیکن اگر مزید تجزیہ کیا جائے تو بات یہاں آجاتی ہے کہ یہ مذہبی اور نظریاتی غیر جانب داری کا داعی ہے۔" اس پر بڑی تفصیل سے بحث کرنے کے بعد ٹیپ کا بند یہ آتا ہے۔

"آج کی دنیا میں سیکولرزم کے لئے کوئی گنجائش نہیں، تاریخ اسے بہت پیچھے چھوڑ آئی ہے۔ آج کی ضرورت نظریاتی ریاست ہے جو سیکولرزم کی عین ضد ہے، اور جسے اسلام قائم کرنے کا داعی ہے۔"

شاید خورشید صاحب کو معلوم ہو کہ کیتھولک اسپین کی طرح آج کئی مسلمان ملک بھی ایسے ہیں، جہاں سیاسی اور ریاستی معاملات میں "مذہبی اور نظریاتی غیر جانب داری" نہیں۔ اور اس نام سے ایک مخصوص مذہبی فرقے کے عقائد کے مطابق کاروبار حکومت چلایا جاتا ہے۔ اس دور میں اگر موصوف "مذہبی اور نظریاتی جانب داری" کو حکومت میں کارفرما کریں گے تو عملاً وہی ہوگا، جو ان مسلمان ملکوں میں ہو رہا ہے۔ کہیں "اثنا عشریہ" نظریۂ اسلام کی حکومت ہوگی، اور کہیں حنبلی طریقہ فقہ کی۔ اسی طرح صفحہ ۲۱۳ پر ارشاد ہوتا ہے :۔ "اسلامی ریاست کا مزاج نہ آمریت کو گوارا کر سکتا ہے اور نہ موروثی شہنشاہیت کو۔ اس کا مزاج خالص جمہوری اور شورائی ہے۔ . . . . نیز اس میں تمام انسان برابر ہیں اور رنگ، نسل، نسب کسی کی بنیاد پر کسی خاص گروہ کو کوئی تفوق حاصل نہیں" گویا خیال، نظریہ اور عقیدہ کی بنا پر تفوق حاصل

ہو سکتا ہے۔ اگر ایسی الٰہی ریاست کو کوئی جمہوری نہیں کہے گا۔ اس قسم کا نظام آمرانہ ہی ہوتا ہے۔ جسے آپ نظریاتی آمریت کہہ سکتے ہیں۔ اور نہ اس نظام میں تمام انسان برابر ہوتے ہیں"

آج اس دور میں قومیت کا مسئلہ بڑا اہم ہے، کیونکہ زندگی کے ہر موڑ پر، سرکاری ملازمت کے سلسلے میں، کوئی کاروبار شروع کرتے وقت، یا پاسپورٹ لے کر اپنے ملک سے باہر دوسرے ملکوں میں جاتے ہوئے قومیت کا سوال پوچھا جاتا ہے، اور عام طور سے ایک شخص کی قومیت کا تعین اس کے وطن سے ہوتا ہے۔ ایک انڈونیشی خواہ وہ لاکھ مارکس، لینن اور اشتمالیت کو ماننے والا ہو، اس کی قومیت انڈونیشی ہی رہے گی۔ وہ اشتمالی ہونے کی بنا پر روسی یا چینی یا اشتمالی قومیت کا حامل نہیں ہو سکے گا۔ یہ زندگی کی عملی ضرورتوں کا تقاضا ہے اور اسی بات کو ملحوظ رکھا جا رہا ہے لیکن خورشید صاحب کے نزدیک نسل، رنگ، زبان یا وطن کو قومیت کی اساس بنانا غیر عقلی اور غیر فطری ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

"اسلام ان سب کے مقابلے میں ایک انقلابی پیغام دیتا ہے۔ وہ تمام انسانوں کو برابر سمجھتا ہے اور اپنی قومیت کی بنیاد خود اسلام پر رکھتا ہے جو ایک عالمگیر نظریہ ہے"

اسلام بے شک ایک عالمگیر نظریہ ہے، لیکن جب اسے ایک ایک وطن اور علاقے کے مسلمان اپنائیں گے تو کیا ہوگی، جس سے ان کی ایک مخصوص اور متعین قومیت وجود میں نہیں آئے گی، اور وہ مسلمان ہوتے ہوئے پاکستانی ترکی ایرانی قومیت کے افراد نہیں ہوں گے۔ اور کیا ایک شخص کے مسلمان ہونے پر اس کی قومیت کی نفی ہو جاتی ہے؟

مرتب نے اسلام کے اصول و مبادی اور افکار و تصورات پر اتنا مفید اور روح پرور مواد فراہم کرنے کے بعد اس سے عملی زندگی کے لئے جو نتائج اخذ کئے ہیں، ان سے سوائے اس کے کہ تخیل کی تسکین ہو جائے اور کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اسلام کے نام سے ایک فرضی ریاست، ایک فرضی سیاسی نظام اور ایک فرضی قومیت کی دعوت سے موجودہ انتشار بڑھے گا کم نہیں ہوگا۔ اور جس مقصد سے یہ کتاب لکھی گئی ہے، اس سے یقیناً الٹا نتیجہ نکلے گا۔

ہمارے ائمہ اور فقہاء نے مسائل مذہبی میں اجتہاد کے لئے بڑی کڑی شرطیں لگائی تھیں لیکن اس زمانے میں اسلام کے سیاسی و معاشی و معاشرتی نظام کے متعلق اجتہاد کے دروازے چوپٹ کھلے ہیں چنانچہ جس کا جی چاہتا ہے وہ اسلام کے نام سے کبھی جمہوریت کو کفر، کبھی اسے عین اسلام اور کبھی غیر محدود ملکیت کو خدا اور رسول کا حکم اور کبھی اس کی تحدید کو جائز قرار دے دیتا ہے۔ بدقسمتی سے کراچی یونیورسٹی کی اس کتاب میں جو حیثیت

مجموعی ایک مفید کتاب ہے "اسلام کا سیاسی نظام" کے باب میں اس قسم کے اجتہاد کا ضرورت سے زیادہ استعمال ہوا ہے۔ جو ایک درسی کتاب میں نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ تعلیمی اداروں اور بالخصوص یونیورسٹیوں میں ان مسائل پر ایک خاص مکتبِ خیال کے افکار کی اشاعت جو وقتی اور حزبی سیاست اور مخصوص جماعتی اغراض سے متعلق ہوں، ہمارے نزدیک زیادہ سودمند نہیں۔ اور یوں بھی خیال آرائیاں شعر و شاعری کا حسن ہے، سیاسی و معاشی نظاموں کی بنیاد ٹھوس حقائق ہوتے ہیں۔ علامہ اقبال کا ایک شعر ہے۔

حقائق ابدی پر اساس ہے اس کی
یہ زندگی ہے نہیں ہے طلسمِ افلاطوں

(م۔س)

شاہ ولی اللہ صاحب کے دلائل میں مابعد الطبیعاتی رجحانات کے ساتھ ساتھ مشاہدات اور تجربات کو بھی خاص دخل ہے۔ ان کی دلیلیں استقرائی اور استخراجی دونوں ہیں۔ گویا کہ وہ مشائی اور اشراقی مکاتیب فکر کے سنگم ہیں مثلاً وہ انسانی اجتماعی اداروں کے متعلق غور و خوض کرنے کے لئے استقرائی دلائل دیتے ہیں۔ اور اس امر سے بحث کرتے ہیں کہ ان اداروں کے قیام کے محرکات کیا تھے۔ پھر ازمنہ قدیم کی تاریخ کو سامنے رکھ کر اس امر کا جائزہ بھی لیتے ہیں کہ یہ اجتماعی ادارے کب وجود میں آئے۔ اور انہوں نے وقتاً فوقتاً کیا کیا روپ دھارے گویا کہ وہ زمانہ گزشتہ کے تجربات اور اپنے مشاہدات کو بروئے کار لاکر اجتماعِ انسانی کا جائزہ لیتے ہیں۔ اس طرح ان کے دلائل میں عینیت پسندی (IDEALISM) اور حقیقت پسندی (REALISM) کا عجیب و غریب امتزاج پایا جاتا ہے۔ وہ خود کہتے ہیں کہ کامل وہ ہے جو جزو سے کل تک پہنچے اور کل سے جزو پر آئے۔ اور دونوں کے تضاد کو دور کرے۔"

مسلمانوں کے سیاسی افکار

مصنفہ پروفیسر رشید احمد

افکار و آراء

چند خطوط

محترمی !...

آپ نے میری کتاب "خانوادۂ قاضی بدرالدولہ" کی جو قدر فرمائی ہے اس کے لئے حد درجہ شکر گزار ہوں۔ مجھ جیسے ایک دور افتادہ خادم علم کے لئے رسالہ "الرحیم" کا زریں تحفہ ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔ انشاء اللہ اس سے ضرور علمی استفادہ کرونگا اور اس کو پڑھنے کے بعد اپنے تاثرات ظاہر کر سکوں گا۔ رسالہ ابھی تک نہیں ملا۔ ایک دو دن کے اندر مل جائیگا۔

یہ معلوم کرکے اور بھی مسرت ہوئی کہ صیغہ اوقاف کے چیف ایڈمنسٹریٹر ہمارے مشہور و معروف اور مقبول اہل قلم مولانا اکرام صاحب ہیں جنہوں نے شبلی نامہ موج کوثر، آب کوثر وغیرہ لکھ کر ہند و پاک کے اہل قلم سے خراج تحسین حاصل کیا ہے ہمیں پوری امید ہے کہ ان کی رہنمائی میں شاہ ولی اللہ اکیڈمی کے ارباب علم و قلم نمایاں علمی اور ثقافتی خدمت انجام دیں گے۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی مختلف کتابوں کے اردو ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔ مگر ان میں سے بعض کی زبان صاف اور واضح نہیں ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کی تمام تصنیفات کے ترجموں پر نظر ثانی کی جائے اور جن کتابوں کا ترجمہ نہیں ہے ان کا ترجمہ اچھی کتابت اور طباعت کے ساتھ کیا جائے۔ آجکل پاکستان سے بہت سی عمدہ کتابیں شائع ہو رہی ہیں۔ مگر معلوم نہیں ان میں جدید طباعت کے اصول کیوں ملحوظ نہیں ہوتے مثلاً ہر کتاب کے صفحہ پر کتاب کا نام اور زیر تذکرہ مضمون کا ذکر ہونا چاہیئے۔ اگر اس کا ایک کاغذ بھی علیحدہ کر دیا جائے تو فوراً معلوم کیا جا سکے کہ یہ کس کتاب کا ہے

محمد یوسف کوکن عمری (نائب صدر دار التصنیف) ریڈر شعبۂ عربی و فارسی و اردو، مدراس یونیورسٹی مدراس ۵

محبی فی اللہ۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔۔ شاہ صاحب کی ہستی عجیب و غریب ہستی تھی۔ مفسر سمجھتا ہے مفسر ہیں۔ فقیہہ سمجھتا ہے فقیہہ ہیں متکلم سمجھتا ہے متکلم ہیں۔ محدث سمجھتا ہے محدث ہیں۔ صوفی سمجھتا ہے صوفی ہیں۔ سیاسی آدمی سمجھتا ہے شاہ صاحب سیاسی آدمی ہیں فلسفی سمجھتا ہے فلسفی ہیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ امام ولی اللہ سب کچھ تھے اور طریق سلف پر گامزن تھے۔ مولانا محمد قاسم بانی مدرسہ دیو بند نے کیا اچھے جملے اس اعجوبۂ دہر کے متعلق استعمال کئے ہیں۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی لکھتے ہیں: "اگر صرف شاہ ولی اللہ محدث دہلوی سرزمین ہند میں پیدا ہوتے تو یہ فخر ہندوستان کے لئے کافی ہے" نواب صدیق حسن خاں مرحوم نے اور دیگر حضرات نے بھی شاہ صاحب کی تعریف لکھی ہے۔ اور یہ واقعہ ہے هو كذلك كما قالوا۔ امام ولی اللہ کی سیرت پر ایک رسالہ لکھ چکا ہوں جس کو مولانا محمد سورتی صاحب قرول باغ دہلی سے شائع کر چکے ہیں۔ اس کے بعد امام ولی اللہ کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ کا ترجمہ شائع ہو گیا۔۔۔۔ ابھی حال ہی میں امام ولی اللہ کی المسوی کا ترجمہ ہو رہا ہے۔ پہلی جلد کا ترجمہ مکمل ہے۔ دوسری جلد کا ترجمہ ہو رہا ہے۔ یہ نصف کے قریب ہو گیا ہے۔

ابو العلاء محمد اسمٰعیل کان اللہ لہ

گودھرہ، گجرات کاٹھیاواڑ

۔۔۔۔۔۔۔۔۔

شاہ ولی اللہ اکیڈمی کی تاسیس کی خبر ملی۔ عرصہ سے امام صاحب علیہ الرحمۃ کے افکار اور مشن پر ایک مستقل ادارہ ضرورت تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ وجود میں آگیا۔ اب امید بندھی ہے کہ ان کے علمی کارناموں اور ان کے فلسفۂ حکمت اشاعت کا کام اعلیٰ پیمانہ پر انجام پائے گا۔ اور یہ علوم کا خزینہ نہ صرف مشرقی زبانوں کے حدود میں محیط رہے گا۔ بلکہ مغربی زبانوں میں بھی اس کی تبلیغ و اشاعت ہو گی ۔۔۔ توقع ہوئی ہے کہ مجوزہ پروگرام جلد عملی جامہ پہنے گا اور علمی مرکز ان مقاصد کی تکمیل کرے گا، جو اس کے پیش نظر ہیں ۔۔۔۔۔ شیخ صاحب نے اس کی نگرانی قبول کی ہے امید افزا بات ہے۔ خدا کامیابیوں سے نوازے۔

سید احتشام بن حسن ریسرچ اسسٹنٹ

انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک سٹیڈیز مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

افکار و آراء

چند خطوط

محترمی! ...

آپ نے میری کتاب "خانوادہ قاضی بدرالدولہ" کی جو قدر فرمائی ہے اس کے لئے صد درجہ شکر گزار ہوں۔ مجھ جیسے ایک دور افتادہ خادم علم کے لئے رسالہ "الرحیم" کا زرین تحفہ ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔ انشاء اللہ اس سے ضرور علمی استفادہ کرونگا اور اس کو پڑھنے کے بعد اپنے تاثرات ظاہر کر سکوں گا۔ رسالہ ابھی تک نہیں ملا۔ ایک دو دن کے اندر مل جائیگا۔

یہ معلوم کر کے اور بھی مسرت ہوئی کہ صیغہ اوقاف کے چیف ایڈمنسٹریٹر ہمارے مشہور و معروف اور مقبول اہل قلم مولانا اکرام صاحب ہیں جنہوں نے شبلی نامہ، موج کوثر، آب کوثر وغیرہ لکھ کر ہند و پاک کے اہل قلم سے خراج تحسین حاصل کیا ہے ہمیں پوری امید ہے کہ ان کی رہنمائی میں شاہ ولی اللہ اکیڈمی کے ارباب علم و قلم نمایاں علمی اور ثقافتی خدمت انجام دیں گے۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی مختلف کتابوں کے اردو ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔ مگر ان میں سے بعض کی زبان صاف اور واضح نہیں ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کی تمام تصنیفات کے ترجموں پر نظر ثانی کی جائے اور جن کتابوں کا ترجمہ نہیں ہے ان کا ترجمہ اچھی کتابت اور طباعت کے ساتھ کیا جائے۔ آجکل پاکستان سے بہت سی عمدہ کتابیں شائع ہو رہی ہیں۔ مگر معلوم نہیں ان میں جدید طباعت کے اصول کیوں ملحوظ نہیں ہوتے مثلاً ہر کتاب کے صفحہ پر کتاب کا نام اور زیر تذکرہ مضمون کا ذکر ہونا چاہیئے۔ اگر اس کا ایک کاغذ بھی علیحدہ کر دیا جائے تو فوراً معلوم کیا جا سکے کہ یہ کس کتاب کا ہے

محمد یوسف کوکن عمری (نائب صدر دار التصنیف) ہیڈ شعبہ عربی و فارسی و اردو، مدراس یونیورسٹی

محبی فی اللہ......

...... شاہ صاحب کی ہستی عجیب و غریب ہستی تھی۔ مفسر سمجھتا ہے مفسر ہیں۔ فقیہہ سمجھتا ہے فقیہہ ہیں متکلم سمجھتا ہے متکلم ہیں۔ محدث سمجھتا ہے محدث ہیں۔ صوفی سمجھتا ہے صوفی ہیں۔ سیاسی آدمی سمجھتا ہے شاہ صاحب سیاسی آدمی ہیں فلسفی سمجھتا ہے فلسفی ہیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ امام ولی اللہ سب کچھ تھے اور طریق سلف پر گامزن تھے۔ مولانا محمد قاسم بانی مدرسہ دیوبند نے کیا اچھے جملے اس اعجوبۂ دہر کے متعلق استعمال کئے ہیں۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی لکھتے ہیں: "اگر صرف شاہ ولی اللہ محدث دہلوی سرزمین ہند میں پیدا ہوتے تو یہ فخر ہندوستان کے لئے کافی ہے" نواب صدیق حسن خاں مرحوم نے اور دیگر حضرات نے بھی شاہ صاحب کی تعریف لکھی ہے۔ اور یہ واقعہ ہے ھو کذلک کما قالوا۔ امام ولی اللہ کی سیر پر ایک رسالہ لکھ چکا ہوں جس کو مولانا محمد صدیق صاحب قرول باغ دہلی سے شائع کر چکے ہیں۔ اس کے بعد امام ولی اللہ کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ کا ترجمہ شائع ہو گیا۔... ابھی حال ہی میں امام ولی اللہ کی المسوّی کا ترجمہ ہو رہا ہے۔ پہلی جلد کا ترجمہ مکمل ہے۔ دوسری جلد کا ترجمہ ہو رہا ہے۔ یہ نصف کے قریب ہو گیا ہے۔

ابوالعلاء محمد اسمٰعیل کان اللہ لہٗ
گودھرہ، گجرات کاٹھیاواڑ

....

شاہ ولی اللہ اکیڈمی کی تاسیس کی خبر ملی۔ عرصہ سے امام صاحب علیہ الرحمتہ کے افکار اور مشن پر ایک مستقل ادارہ کی ضرورت تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ وجود میں آگیا۔ اب امید بندھی ہے کہ ان کے علمی کارناموں اور ان کے فلسفۂ حکمت کی اشاعت کا کام اعلیٰ پیمانہ پر انجام پائے گا۔ اور یہ علوم کا خزینہ نہ صرف مشرقی زبانوں کے حدود میں محیط رہے گا۔ بلکہ مغربی زبانوں میں بھی اس کی تبلیغ و اشاعت ہوگی ... توقع ہوئی ہے کہ مجوزہ پروگرام جلد عملی جامہ پہنے گا اور یہ علمی مرکز ان مقاصد کی تکمیل کرے گا، جو اس کے پیش نظر ہیں..... شیخ صاحب نے اس کی نگرانی قبول کی ہے یہ امید افزا بات ہے۔ خدا کامیابیوں سے نوازے۔

سید احتشام بن حسن ریسرچ اسسٹنٹ
انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک سٹیڈیز مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

جناب محترم ......

...... یہ ایک پائیدار کام ہے۔ اور انشاءاللہ اس میں بنی نوع انسان کی ترقی ہوگی، روحانی و معاشی دونوں
رسالے میں خوب لکھا ہے کہ اعجاز قرآن صرف فصاحت نہیں بلکہ وہ حکمت عملی ہے جو فلاح دنیوی بھی پیش نظر رکھتی ہے۔
بشرط استطاعت آپ کے رسالے کے لئے کچھ پیش کروں گا۔

اجمل

۱/۷ شیر شاہ میس نئی دہلی

محترم ......

...... بندہ کو شاہ صاحب کی تعلیمات اور ان کے فلسفے سے پرانی دلچسپی ہے۔ اور ان کی شخصیت سے خاص
شغف ہے۔ میں نے انفرادی طور پر اس سلسلے میں جزوی تحقیق کا کام شروع کر رکھا ہے۔ اور یہ انشاءاللہ جاری رہے
گا۔ حسب ذیل امور زیر تحقیق ہیں۔

۱۔ شاہ صاحب اور تراجم قرآن (۲) شاہ صاحب اور علوم قرآن (الفوز الکبیر زیر بحث ہے) (۳) عالمگیر
اور شاہ عبدالرحیم (۴) شاہ صاحب کا سلسلۂ تلمذ (۵) نیز شاہ صاحب کا رسالہ "الارشاد الی مہمات الاسناد" دوبارہ
صحت کے ساتھ مرتب کر رہا ہوں۔ جن علماء کے تراجم پہلے ایڈیشن میں درج نہیں ہو سکے، اس میں ان کا اضافہ
کر رہا ہوں۔

محمد عبدہ

جامعہ محمدیہ اوکاڑہ

باسمہ تعالیٰ

مکرمی!

سلام مسنون۔ "الرحیم" کا پہلا پرچہ موصول ہوا۔ ممنون ہوں۔ شاہ ولی اللہ اکیڈمی کا قیام اور "الرحیم"
کا اجراء یقیناً ایک نیک فال ہے۔ دعا ہے کہ یہ اقدام امت مسلمہ کے لئے باعث خیر و برکت ہو۔ خدا کرے کہ "الرحیم"
کے ذریعہ مسلمانوں کو از سر نو فکر و عمل کے صحیح قالب نصیب ہوں اور اکیڈمی کے ارباب بست و کشاد اور ان کے ہم

حضرات کو یہ توفیق میسر آئے کہ وہ معیاری اسلامی زندگی کا عملی نمونہ خود بھی پیش کر سکیں۔ خدا نہ کرے کہ یہ عسزیز ادارہ "علمیات" کے گراں بار و گراں خیز حجابات میں دب کر رہ جائے۔

چند سال قبل جب میں کراچی میں تھا تو مولانا طاسین صاحب کی عنایت سے میں نے لمحات عربی مولانا قاسمی صاحب کے قلمی نسخہ سے نقل کی تھی۔ یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ یہ نایاب کتاب زیور طباعت سے آراستہ ہو گئی ہے مہربانی فرماکر لمحات کا ایک نسخہ فوری طور پر بذریعہ وی پی پی ارسال فرمائیں۔

دعاگو

محمد ایوب راولپنڈی

محترمی

...... سوا چھ بجے شام گوٹھ پیر جھنڈا پہنچا ۔۔۔ صبح بدھ کے روز کام شروع کر دیا۔ اور جمعرات کے روز تو لائحہ عمل پر پورے زور سے کام شروع ہوا۔ کل جمعہ بھی پوری ہمت سے کام ہوا۔ امید ہے کہ آج فہرست قسم علوم القرآن کے سیکشن ہائے (۱) مصحف شریف (متن کلام الہی) (۲) تجوید و قراءۃ۔ وقوف وغیرہ (۳) اصول تفسیر و ناسخ و منسوخ۔ لغات القرآن۔ تلاش آیات۔ احکام قرآن۔ (۴) تفسیر ہر قسم کی فہرست مکمل ہو جائیگی۔ اس قسم میں کتب مطلقاً منقش۔ قلمی مطبوعہ۔ عربی۔ فارسی۔ انگریزی۔ اردو۔ سندھی سبھی شامل ہیں۔ اصل فہرست قدیم و جدید سے بے نیاز ہو کر یہ فہرست مرتب کی جارہی ہے۔ اور علوم کی کلاسی فیکیشن (جماعت بندی) اور تفصیلات اس بسط کے ساتھ مہیا کی جارہی ہیں۔ کہ ماہرین علوم جدیدہ و قدیمہ اس فہرست کو طرز جدید و قدیم کا مجمع البحرین تسلیم فرمائیں گے۔ اس قسم میں اگرچہ فہرست قدیم ترین ملاحظہ کرنے سے تحقیقی اور معیاری شاہکار کتابوں کا بحر ذخار معلوم ہوتا تھا لیکن اب اس نئی فہرست مرتب کرنے کے دوران صرف ایک ایسی کتاب قدیم ترین مطبوع مکاشفات الاخیار معروف بہ تفسیر حضرت شاہی مؤلفہ جناب حکیم مولوی محمد حسن امروہی دستیاب ہوئی۔ جو کہ تمام تحریکات علمی کے لئے بمنزلہ اساس و خشت اول ہے۔ اور اکثر و بیشتر مرکزی علمی خزائن کتب اس جوہر جدید جہانتاب اور مدعیان اصلاح کے متاع حیات سے خالی ہیں حکیم صاحب موصوف علوم قدیمہ کی مہارت کے ساتھ ساتھ اسرائیلیات اور کتب سماویہ و ادیان قدیمہ کے تمام تر لٹریچر پر نظر غائر اور فکر صائب کے مالک ہیں۔ موصوف نے اس کتاب میں اجمالاً اور اپنی دوسری مایۂ ناز تصنیف تفسیر و تاویل البرہان میں تفصیلاً آیات قرآنیہ

کو کتب سماویہ کی عبارتوں سے تطبیق دینے کا طریقہ ایجاد کیا۔ اور اسی طرز کو احادیث صحیحہ و آثار ثابتہ کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اصلی تفسیر قرآن کریم قرار دیا۔ پھر یہی فکر تو جدیداسلام کا خالق بنا۔

ہر بوالہوس نے طرز سخن اختیار کی — اس دور میں اب قدر فکر و نظر کہاں

انگریزی دورِ حکومت اور امروہی طرز فکر نے نیچریت کو جنم دیا۔ جس کی تردید مفکر اسلام حضرت سید جمال الدین افغانی رح نے رسالہ "ردِ نیچریت" میں فرمائی اور اسی دورِ انقلاب کی دوسری مصیبت تحریف القرآن بصورت "تفسیر قرآن" کی تردید تفسیر فتح المنان معروف بہ تفسیر حقانی میں ہوئی تیسری آفت جو کہ ان دونوں نوزائیدہ فتنوں کو پرورش دینے پروان چڑھانے کے لئے سامنے لائی گئی۔ وہ رسالہ "تہذیب الاخلاق" کی اشاعت اور اس پوری جماعت جدید اسلام کا قلمی جہاد ہے جس کے جواب میں دیوبند سے رسالہ "تصفیۃ العقائد" "قاسم العلوم" اور لکھنؤ سے "نورالآفاق" وغیرہ کا سلسلہ جاری ہوا۔

(مولانا) محمد عبداللہ عمر پوری

محترمی ....

...... شاہ عبدالرحیم رح کا ایک مختصر سا رسالہ "انفاس رحیمیہ" کوئی پچاس برس ہوئے شائع ہو چکا ہے۔ یہ تصوف پر مختصر ہدایات ہیں جو ان کے مکتوبات پر مشتمل ہیں اور جن کو ان کے بیٹے اور شاہ ولی اللہ رح کے بھائی شاہ اہل اللہ نے ترتیب دیا اس میں انقلاب کی زمین تیار کی گئی ہے اور اس کی اولین خشت فلسفۂ اخلاق ہے، جو اس وقت ہماری قوم میں ناپید ہے تو می اخلاق کے بغیر انقلاب پیدا نہیں ہوا کرتے یہاں آجکل یہ حال ہے کہ اخلاق کے معنی ہی کوئی نہیں سمجھتا اس کے دونوں پہلو داخلی اور خارجی تعمیری ہیں۔ مگر ہمارے ہاں تو ہر طرف تخریب ہی تخریب نظر آتی ہے اور ہر مسلمان کہتا ہے کہ میں مسلمان ہوں۔ مجھے کچھ نہ کہو۔ مجھ سے بہتر مہذب قوم ہی دنیا میں پیدا نہیں ہوئی ہیں دنیا کو تہذیب سکھا سکتا ہوں۔ شاہ عبدالرحیم نے توحید کا سبق سکھا کر قوم کو بیدار کرنا چاہا تاکہ ان کا ایک ضابطۂ اخلاق ترتیب پا جائے اس پر حضرت شاہ ولی اللہ کے فلسفہ کی بنیاد کھڑی ہوئی ہے۔ اس رسالے میں چھوٹے چھوٹے نکتے بڑے عمدہ پیرائے میں بیان کئے ہیں چند ایک یہاں نقل کرتا ہوں۔ فرماتے ہیں۔

"اے طالب مولا! بنگر کہ از راحت رسانیدن حیوانے بہشتے را جنتی کرد۔ اگر از راحت رسانیدن انسان حضرت رحمان تراتقرب جمال باکمال خویش رساند و سعید ابدی گرداند بعید نیست، واز اذیت حیوانے بہشتی دوزخی گشت۔

ازادیت ولی کہ حرم انوار حق تعالیٰ دحل اسرار جل وعلیٰ است باسفل سافلین افتد چہ دور است"

اس کے بعد ایک رباعی نقل کی ہے۔ ع

روزے آں بتو بودم ونمیدانستم شب باتو غنودم ونمیدانستم

ظن بردہ بودم ودش کہ من جملہ منم من جملہ تو بودم ونمیدانستم

اور پھر تلقین یاد الٰہی یوں کرتے ہیں۔

"بے یار خدا زیستن بصورت مرگ است بلکہ بدتر از مرگ" سعادت در عبادت است وشقاوت در فراغت"

پر سنبھکر یے توڑ دیتے ہیں! سبحان اللہ۔ ان چند فقروں میں دریا بھر کر رکھدیا ہے۔ کیا پرخلوص تعلیم ہے اور اخلاق کی بنیاد۔ آج کل یہ کہاں نصیب۔ یہ یاد خدا ہی تو ذکر الٰہی ہے جس سے قلب مصفا ہوتا ہے اور جو انقلاب کی اولین خشت ہے۔ ذرہ یاد آگاہی بہ از ہزار بادشاہی! اور طالب مولا از ہمہ اولیٰ۔ یہی چیز ہے جو تفصیلاً حضرت شاہ ولی اللہ نے ہم تک پہنچائی۔

انفاس رحیمیہ تو تیس پینتیس صفحہ کا رسالہ ہے مگر جب اسکی تعلیم شاہ محمد کے ذہن میں اتری تو سمندر بنکر ٹھاٹھیں مارنے لگی۔

مخلص عبدالرشید عفی عنہ کراچی

مکرم ومحترم.....

...... شاہ ولی اللہ اکیڈمی کے متعلق آپ کا پمفلٹ ملا۔ ازحد خوشی ہوئی۔ کیونکہ بندہ بھی حضرت شاہ ولی اللہ کی تعلیمات وفلسفہ کا عاشق ہے۔ بندہ کے بھی عزائم تھے کہ اس حکیم الامتؒ کی تعلیم کو عام کیا جائے۔ اور عالم اسلام کو ان کی جلیل القدر خدمات سے روشناس کیا جائے میں نے آپ کے علوم کو نشر کرنے کے چند ارادے کر رکھے ہیں، جو اس توقع میں پیش خدمت ہیں کہ اس عاجز کو بھی اس کار خیر میں شریک کیا جائے۔

۱۔ آپ کے فارسی ترجمے معہ مختصر حاشیے کو جو فتح الرحمان کے نام سے موسوم ہے، اردو میں منتقل کیا جائے۔ اگرچہ شاہ رفیع الدینؒ کا ترجمہ اسی ترجمے سے ماخوذ ہے۔ لیکن وہ دلی کی پرانی زبان میں ہے۔ اور اردو میں جدید محاورے اور الفاظ کافی آچکے ہیں۔ اس لئے اس ترجمے کی اشد ضرورت ہے اس کا نام اردو ترجمہ

شاہ ولی اللہ رکھا جائے تاکہ اردو داں حضرات شاہ ولی اللہ کے فارسی ترجمے سے مستفید ہوسکیں بندہ اس خدمت کے لئے تیار ہے

۲۔ حضرت شاہ ولی اللہ نے اس مختصر سی تفسیر اور علم تفسیر پر الفوز الکبیر تصنیف کرنے کے علاوہ قرآن مجید کی بعض اور آیات کی بھی محققانہ تفسیر کی ہے۔ جو ان کی مختلف تصانیف میں کہیں کہیں مذکور ہے جیسے کہ ازالۃ الخفا اور تفہیمات میں ان تفسیر کو جمع کیا جائے اور اس مجموعے کا نام تفسیر شاہ ولی اللہ رکھا جائے۔ اس میں فوز الکبیر اور فتح الخبیر بھی شامل ہو۔

۳۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے تفہیمات میں جگہ جگہ علم کلام پر بحثیں کی ہیں اور اس ضمن میں عقائد کے متعلق اپنا نقطۂ نظر پیش فرمایا ہے۔ میں انہیں جمع کر کے ان کا اردو ترجمہ کرنا چاہتا ہوں تاکہ علم کلام میں شاہ صاحب نے جو تجدید کی ہے وہ سامنے آجائے

۴۔ حضرت شاہ صاحب کی بعض عبارتوں پر بعض اہل علم نے اعتراض کئے ہیں، جیسے کہ بعض تصوف کی عبارتیں ہیں۔ چونکہ یہ اعتراض کرنے والے اس طریقے کے راہرو نہ تھے اس لئے انہوں نے خواہ مخواہ حضرت شاہ صاحب کو مورد طعن بنایا ہے ان اعتراضات کا جواب دیا جائے۔

۵۔ آپ کی جملہ تصانیف سے مختلف مسائل کا استنباط کر کے ان کے متعلق مستقل رسائل شائع ہوں۔

۶۔ آپ کی ایک جامع سیرت مدون کی جائے۔

محمد ابوالخیر اسد ہے

مخدوم رشید (ملتان)

مکرمی۔۔

۔۔۔۔۔ مجلہ "الرحیم" بابت ماہ جون ۶۳ء نظر سے گذرا۔ مجھے یہ دیکھکر بڑی مسرت ہوئی کہ سندھ میں بھی ایسے اچھے اہل علم حضرات موجود ہیں۔ جو شمع علم کو فروزاں کرنے کی اہلیت تامہ رکھتے ہیں۔ امید ہے کہ شاہ ولی اللہ اکیڈمی کے تحت مذکورہ مجلہ اپنے قارئین کو مطمئن رکھنے میں کامیاب ہوگا۔ لیکن اس شمارہ میں زیادہ تر ایسے نظریاتی مسائل پر زور دیا گیا ہے جو نہ تو موجودہ فلسفہ کی سطح کے ہم پایہ ہیں اور نہ ہی علمی دنیا میں عمل صالح کے محرک ہو کر سود مند ہوسکتے ہیں۔ مثلاً بیشتر مقالہ نویسوں نے شاہ صاحب ممدوح کے نظریہ (وحدت الوجود) اور وحدت الشہود کو اپنا مطمح نظر بنایا حالانکہ یہ نظریہ چاہے صحیح ہو یا غلط، محض ایک خیال ہی خیال ہے اور اس سے موجودہ زوال زدہ تہذیب مسلم کا اچھا نہیں ہوگا! اس نظریہ کو غالب نے ایک ہی شعر میں جس خوبی سے ادا کیا وہ ان طویل مقالوں سے بلند تر ہے

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے!
حیران ہوں پھر مشاہدے کس حساب میں؟

اقبالؔ نے اور عام فہم الفاظ میں اس کی یوں وضاحت کی ہے

حقیقت ایک ہے ہر شے کی خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے، اگر ذرے کا دل چیریں!

محترم ڈاکٹر عبدالواحد ہالے پوتا نے شاہ صاحب کے "اصول حکمت" بیان کرنے کی اچھی کوشش کی ہے مگر انہوں نے بھی ان کی بعض ایسی باتوں کو پیش فرمایا جو نہ تو قرآن کے مطابق ہیں اور نہ عملی دنیا میں بکار ہو سکتی ہیں۔ مثلاً وہ فرماتے ھیں۔

"الغرض ولی اللہ اس محدود مادی کائنات کو تخلیق کا حرف آخر نہیں سمجھتے، ان کے نزدیک اس سے ماورا "عالم مثال" ہے اور "عالم مثال" سے ماورا دوسرے عالم ہیں۔ ان سب کو وہ "عالم غیب" کا نام دیتے ہیں۔ چنانچہ "عالم شہادت" سے بالاتر "عالم مثال" ہے اور اس سے بالاتر "عالم ارواح" ہے۔"

جہاں تک تخلیق کے عمل جاری اور لامتناہی کا تعلق ہے اس میں نہ تو شک کی کوئی گنجائش ہے اور نہ ہی قرآنی حکم کے خلاف ہے۔ مگر یہ "عالم مثال" اور "عالم ارواح" خیالی اصطلاحات ہیں جو نہ تو قرآن حکیم میں ہیں اور نہ ہی ان کی حقیقت ثابت ہے اس لئے میرا یہ مخلصانہ مشورہ ہے کہ ایسی بعید از حقیقت باتوں سے "الرحیم" کی افادیت کو نقصان نہ پہنچایا جائے تو بہتر ہوگا۔ اس وقت کرنے کا کام یہ ہے کہ اسباب زوال امت کی قرآن سے نشان دہی کر کے قرآن ہی کے اٹل و منبدل اصولوں کے مطابق ملت مرحومہ کی بازآفرینی کی کوشش کی جائے۔ شاہ صاحب موصوف نے اس بارے میں بہت کچھ پیش فرمایا ہے۔ اگر ان کے خیالات کو اس جہت میں حرف آخر ماننا ہی ہے تو بھی ان ہی کو با لوضاحت پیش کیا جائے تاکہ ملت کے احیاء و بازآفرینی کی کوئی صورت بن پڑے۔

فقیر بخش بجگوٹ۔ از زیارت (کوئٹہ ڈویژن)

محترم۔۔۔

۔۔۔۔ آپ کا رسالہ "الرحیم" صفر موافق جولائی ۶۳ء موصول ہوا۔ شذرات پڑھے۔ آپ نے موجودہ دور کا نقشہ

جس خوش فہمی سے کھینچا ہے۔ اس سے حیرت ہوئی۔ اصل میں اسلامی تعلیمات کی طرف جس اہمیت سے توجہ کی ضرورت تھی اور ہے اس کا عشر عشیر بھی نہیں پایا جا رہا ہے۔ اور اسلامی مملکت کے لئے اس سے بڑھ کر المیہ کوئی نہیں ہو سکتا۔

عربی مدارس کے متعلق آپ نے عمومی تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ دین و دنیا کی تعلیمات کو جمع کیا جا رہا ہے۔ اگر اس حقیقت کا اظہار فرما سکتے تو بہتر ہوتا کہ اس ضمن میں جامعہ محمدی کی خدمات کس درجہ اثرانداز ہوئی ہیں تو کیا ہی اچھا ہوتا۔ جامعہ کا مختصر سا تعارفی لٹریچر ارسال خدمت کیا جا رہا ہے۔ اسے بغور مطالعہ فرمایا جائے۔

گذشتہ چٹھی میں آپ کو نظریاتی اتحاد اور اشتراک عمل کی دعوت دی گئی تھی۔ لیکن آپ کے مکتوب پہ ۵ میں اس کے بارے میں کچھ نظر نہیں آیا۔ امید ہے اس چٹھی کو سامنے رکھکر رائے سے مطلع فرمایا جائے گا۔

جامعہ کے بلند تعلیمی منصوبہ کے لئے چند ایسے بلند فکر رفقاء کی ضرورت ہے جو اعلیٰ علمی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ جامعہ کے عزائم و مقاصد سے پوری طرح ہم آہنگ ہوں اور اس عظیم مقصد کی خاطر زندگی وقف فرما سکیں۔ ایم۔ اے۔ پی ایچ ڈی ہونے کے ساتھ اگر عربی علوم میں دسترس رکھتے ہوں تو زیادہ قابل ترجیح ہوں گے۔ وظیفہ حسب استعداد پیش کیا جائیگا۔ ایسے افراد کی تلاش فرماکر مطلع فرما سکیں تو جامعہ کی خصوصی اعانت ہوگی۔ اگر کوئی مشہور شخصیت اس مقصد کے لئے تیار ہو سکے بہت بہتر ہوگا۔ والسلام

صادق جامعہ

جامعہ محمدی شریف جھنگ

مکرمی ..

..... گرامی قدر! الرحیم نظرنواز ہوا۔ ایک ہی نشست میں از اوّل تا آخر پڑھ ڈالا۔ میں مفصل طور پر اپنی رائے لکھنا چاہتا ہوں اور فرصت کا منتظر ہوں خصوصاً ایک استفسار کا جواب۔ لیکن اس وقت چند لفظ آپ کے شذرات کے بارے میں عرض کرنا کی اجازت چاہتا ہوں۔

عام مولویوں اور ان کے انقلابی اقدامات کے بارے میں آپ کی رائے، میں سمجھتا ہوں خوش فہمی پر مبنی ہے آپ ان کے لئے حسن ظن رکھتے ہیں یہ بات اسلامی تعلیمات کے عین مطابق ہے اور اس لئے آپ نے اچھے الفاظ میں ان کا تذکرہ فرمایا ہے۔ لیکن میں اپنے علم مشاہدہ اور تجربہ کی بنا پر کہتا ہوں کہ ان کے اخلاق و کردار اور علم و فضل کے لئے بہت زیادہ اچھے

الفاظ استعمال نہیں کئے جا سکتے۔ نصاب تعلیم کے بارے میں انہوں نے اس سے زیادہ تیر ابھی تک نہیں مارا کہ تعلیمی مدت میں ایک آدھ سال کی کمی ہو جائے۔ حالانکہ سوال تعلیمی مدت کا نہ تھا، سوال اس فرسودہ نصاب تعلیم کا تھا جسے پڑھ کر بھی حقیقتاً انہیں کچھ یاد نہیں آتا۔ پھر کیا اسے تبدیل کیا گیا؟ بعض تبدیلیاں جو ہوئی ہیں ان کی حیثیت اور ان کی نتیجہ خیزی ایسی ہی ہے جیسے کسی مشن اسکول میں یا یہاں کے ایک مشنری اسکول "گرامر اسکول" میں اسلامیات کی ہو سکتی ہے کیا آپ یقین فرمائیں گے اگر میں یہ کہوں کہ بالعموم یہ مولوی عام مسلمانوں سے علم میں ضرور ایک درجہ فضیلت رکھتے ہیں لیکن عام اخلاق و کردار میں وہ کوئی درجہ فضیلت انہیں حاصل نہیں۔ حقیقت یہی ہے ہم اسے تسلیم کریں یا نہ کریں۔ یہ پکی ہوئی نصلیں ہیں جنہیں صرف کاٹ ڈالنا چاہیئے اور بس!

ان عربی مدارس میں، ان کے اساتذہ میں، تلامذہ میں کچھ نہیں دھرا ان پر آپ اپنا وقت ضائع کیوں کریں؟ آپ ان سے کسی انقلاب لانے کے متوقع ہیں۔ حالانکہ میرا خیال ہے کہ یہ حالات سمجھنے اور تجزیہ کرنے اور اس سے نتیجہ نکالنے کی ادنیٰ صلاحیت بھی نہیں رکھتے۔ یہ لوگ تو صرف یہ جانتے ہیں کہ کس مجمع، کس آبادی اور کن دنوں میں کس کے نام اور کس کے ذکر سے عوام کی توجہات کا مرکز بنا جا سکتا ہے۔ اور ان کی خوشنودی طبع حاصل کی جا سکتی ہے۔ وہ خلاف عقیدہ غلاف کعبہ کی زیارت کا مشرکانہ ڈھونگ بھی ہو سکتا ہے اور شاہ ولی اللہ کا نام اور ان کا ذکر خیر بھی ہو سکتا ہے اور مولانا عبید اللہ سندھی کے کفر پر اصرار بھی ہو سکتا ہے۔ میں یہ بلا خوف تردید اور مع الثبوت کہہ سکتا ہوں کہ جو ان کی زبانوں پر ہوتا ہے وہ دلوں میں نہیں ہوتا۔ اور جو دلوں میں ہوتا ہے اس پر خود یہ پختہ ایمان و یقین نہیں رکھتے۔ آج یہ مولوی حضرات زوال امت کے اسباب ڈھونڈتے ہیں اور عوام کی جہالت اور بے دینی کو اس کا اصل قرار دیتے ہیں حالانکہ میرا پختہ یقین ہے کہ زوال امت کا اصلی سبب ان مولویوں کا وجود اور ان کا علم اور ان کی دینداری ہے۔ ان مولویوں کو درست کر دیجئے ساری امت سدھر جائے گی۔ آپ جانتے ہیں کہ حضرت شاہ صاحب اور خانوادہ ولی اللہی کی کتنی بیش قیمت کھڑیاں ان مولویوں اور صوفیوں نے ضائع کر دیں! کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ مجاہدین نے انگریزوں اور سکھوں سے شکست کھائی تھی؟ اور اس کے بعد ہر دور میں علمائے حق کی ابتلاؤں اور مصیبتوں کا باعث کفار و مشرکین ثابت ہوئے؟ دنیا کا سب سے بڑا فتنہ انہیں علماء سُو کا وجود رہا ہے اور میں پختہ یقین رکھتا ہوں کہ آئندہ بھی اگر اسلامی تحریک، اسلامی تصورات اور مسلمانوں کو کسی سے خطرہ ہے تو وہ یہی ہیں۔

لیکن یہ جو کچھ عرض کیا ایک عام حالت ہے، مجھے تسلیم کر لینا چاہیئے کہ علمائے حق کے وجود مقدس سے دنیا کا کوئی دور خالی نہیں رہا۔ نہ یہ دور خالی ہو سکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ کے پیش نظر ایسے ہی علمائے کرام دامت فیوضہم ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کو وہ بصیرت عطا فرماتا ہے کہ ان کی شہادت کے لئے بارش کا وجود ضروری نہیں، وہ ہواؤں میں بو سونگھ لیتے ہیں۔ اور بارش کی پیش گوئی کرتے ہیں وہ عام حالات و واقعات کو دیکھ کر سال بعد پیش آنے والے حالات و واقعات کی نشاندہی کر سکتے ہیں، وہ وجود مقدس ہوتے ہیں کہ اگر بے خودی میں بھی ان کے منہ سے کوئی بات نکل جائے تو اللہ تعالیٰ ان کو شرمسار نہیں ہونے دیتا وہ ان کی بات کی لاج رکھ لیتا ہے۔

....

علی گڈھ سوسائٹی کراچی

محترمی ....

.... ہمارے برصغیر میں احیاء کی تحریکیں بے شمار رہی ہیں۔ شاہ صاحبؒ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہیں احیائیت (REVIVALISM) کی ان تحریکوں کی بدولت ہی ہماری اینٹ سے اینٹ بج گئی سائنس اور صنعت کے اس دور میں یہ سارے نسخے کس طرح مرض کا علاج کر پائیں گے مجھ جیسے ان پڑھ آدمی کی سمجھ سے بالاتر بات ہے۔

مخدوم امیر احمد صاحب کا مضمون دوسرے شمارے میں کافی دلچسپ ہے۔

قریشی۔ ناظم آباد کراچی

عقل و مذہب کو سمویا تو نے اس انداز سے
صبح میں جیسے نمایاں ہو دھندلکا رات کا
تیرے ارشادات میں سامان تسکین ضمیر
روح ایمان نقطہ نقطہ تیرے ملفوظات کا

ماہر القادری

مطبوعات شاہ ولی اللہ اکیڈمی

★

لمحات (عربی)

شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے فلسفہ تصوف کی یہ بنیادی کتاب عرصے سے نایاب تھی - مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی کو اُس کا ایک پرانا نسخہ، جو اغلاط سے پُر تھا، ملا - موصوف نے بڑی محنت سے اس کی تصحیح کی، اور شاہ صاحب کی دوسری کتابوں کی عبارات سے اُس کا مقابلہ کیا - اور وضاحت طلب آمور پر تشریحی حواشی لکھے - کتاب کے شروع میں مولانا کا ایک مبسوط مقدمہ ہے -
شاہ صاحب نے اس کتاب میں ''وجود'' اور اُس سے کائنات کا جس طرح صدور ہوا ہے، اُس پر بحث کی ہے، اور اپنی الہیاتی حکمت کے دوسرے مسائل بھی بیان کئے ہیں - قیمت دو روپے

—— : o : ——

شاہ ولی اللہ کی تعلیم

از پروفیسر غلام حسین جلبانی سندھ یونیورسٹی

پروفیسر جلبانی ایم اے صدر شعبہ عربی سندھ یونیورسٹی کے برسوں کے مطالعہ و تحقیق کا حاصل یہ کتاب ہے، اس میں مصنف نے حضرت شاہ ولی اللہ کی پوری تعلیم کا احصاء کیا ہے، اور اُس کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل بحثیں کی ہیں - اُردو میں شاہ صاحب کی تعلیم پر یہ پہلی جامع کتاب ہے -

کتاب مجلد ہے - قیمت ۵۰ء۷ روپے ہے

شاہ ولی اللہ اکیڈمی - صدر - حیدر آباد - پاکستان

onthly "AR-RAHIM" Hyderabad Regd. S. No. 2548

شاہ ولی اللہ اکیڈمی

اغراض و مقاصد

۱۔ شاہ ولی اللہ کی تصنیفات اُن کی اصلی زبانوں میں اور اُن کے تراجم مختلف زبانوں میں شائع کرنا۔

۲۔ شاہ ولی اللہ کی تعلیمات اور ان کے فلسفہ و حکمت کے مختلف پہلوؤں پر عام فہم کتابیں لکھوانا اور اُن کی طباعت و اشاعت کا انتظام کرنا۔

۳۔ اسلامی علوم اور بالخصوص وہ اسلامی علوم جن کا شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتبِ فکر سے تعلق ہے، اُن پر جو کتابیں دستیاب ہو سکتی ہیں انہیں جمع کرنا، تاکہ شاہ صاحب اور اُن کی فکری و اجتماعی تحریک پر کام کرنے کے لئے اکیڈمی ایک علمی مرکز بن سکے۔

۴۔ تحریک ولی اللّٰہی سے منسلک مشہور اصحابِ علم کی تصنیفات شائع کرنا، اور اُن پر دوسرے اہلِ قلم سے کتابیں لکھوانا اور اُن کی اشاعت کا انتظام کرنا۔

۵۔ شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتبِ فکر کی تصنیفات پر تحقیقی کام کرنے کے لئے علمی مرکز قائم کرنا۔

۶۔ حکمت ولی اللّٰہی اور اُس کے اصول و مقاصد کی نشر و اشاعت کے لئے مختلف زبانوں میں رسائل کا اجراء

۷۔ شاہ ولی اللہ کے فلسفہ و حکمت کی نشر و اشاعت اور اُن کے سامنے جو مقاصد تھے انہیں فروغ دینے کی غرض سے ایسے موضوعات پر جن سے شاہ ولی اللہ کا خصوصی تعلق ہے، دوسرے مصنفوں کی کتابیں شائع کرنا

محمد سرور پرنٹر پبلشر نے سعید آرٹ پریس حیدرآباد سے چھپوا کر شائع کیا۔

ربیع الثانی ۱۳۸۳ھ ستمبر ۱۹۶۳ء

الرحیم

جلد ۱ ربیع الثانی ۱۳۸۳ھ مطابق ستمبر ۱۹۶۳ء نمبر ۴

فہرست مضامین

کتبہ :- عبدالمجید

شذرات

۲۱ر جولائی کو شاہ ولی اللہ اکیڈمی کے بورڈ آف ڈائرکٹرز کا اجلاس تھا۔ جناب سید باقر شاہ صاحب ایڈوکیٹ اس میں شرکت کے لئے کراچی سے تشریف لائے تھے۔ گو آپ کی طبیعت کچھ عرصے سے ناساز تھی، لیکن اس کے باوجود آپ اکیڈمی کے اجلاس میں تشریف لائے اور اس کے مشوروں اور فیصلوں میں بڑا نمایاں حصہ لیا۔ بلکہ اجلاس میں جو بھی فیصلہ ہوئے۔ آپ ہی انہیں قلم بند فرماتے رہے۔ یہ ۲۱ر جولائی کا واقعہ ہے۔ ۸ر اگست کو یک بارگی کراچی سے خبر آتی ہے کہ جناب سید باقر شاہ صاحب کو دل کا دورہ پڑا۔ وہ جان لیوا ثابت ہوا۔ اور آپ انتقال فرما گئے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

مرحوم ومغفور کی اچانک اور بے وقت موت کا جس نے بھی سنا، اسے انتہائی دلی صدمہ ہوا، اور خاص طور سے وہ لوگ جن کا کسی نہ کسی حیثیت سے سید صاحب سے زندگی میں واسطہ رہا تھا۔ ان کے لئے تو یہ صدمہ بڑا ہی جانکاہ تھا۔ لیکن شاہ ولی اللہ اکیڈمی اور اس کے ہمدردوں کے لئے یہ سانحہ غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ اکیڈمی جس "وقف سید محمد رحیم" کی بدولت وجود میں آئی، اس کے قیام میں سید عبدالرحیم شاہ مرحوم، اور محترمہ بی بی زیب النساء مرحومہ کے بعد سب سے زیادہ

سید باقر شاہ کی کوششوں کا دخل ہے۔ اس میں شک نہیں کہ "واقفین" حضرت مولانا عبیداللہ سندھی کے واسطے سے حضرت شاہ ولی اللہ کے عقیدت مند تھے۔ اور انہوں نے دین اسلام کی جو حکیمانہ تعبیر فرمائی ہے، اسے وہ مسلمانوں اور تمام انسانیت کے لئے فلاح کا ذریعہ سمجھتے تھے، لیکن "وقف سید محمد رحیم" کو موجودہ قانونی شکل دینے کا تمام خاکہ سید باقر شاہ مرحوم نے تیار کیا تھا۔ اور وہی اس کار خیر اور صدقہ جاریہ کے سب سے بڑے محرک تھے، اور وقف مذکور کے شرائط بھی انہوں نے مرتب فرمائے تھے۔

۱۹۵۷ء میں محترمہ بی بی زیب النساء صاحبہ کا انتقال ہوا، اس سے پہلے ان کے خاوند جناب سید عبدالرحیم شاہ اپنے رب کو پیارے ہو چکے تھے۔ بعدازاں جب تک کہ چیف ایڈمنسٹریٹر اوقاف مغربی پاکستان شیخ محمد اکرام صاحب کے عملی اقدام کے نتیجے میں حیدرآباد سندھ میں شاہ ولی اللہ اکیڈمی وجود میں نہیں آگئی، اور اس نے اپنا کام نہیں شروع کر دیا، سید باقر شاہ مرحوم کا یہ معمول ہو گیا تھا کہ جن اہل علم سے انہیں یہ توقع ہوتی کہ وہ شاہ ولی اللہ کے علوم اور ان کی حکمت اسلامی کی نشر و اشاعت میں دلچسپی رکھتے ہیں، وہ ان کے پاس جاتے، اور انہیں آمادہ کرتے کہ وہ اس کام کو شروع کریں۔ اور "وقف سید محمد عبدالرحیم" جس بلند مقصد کے لئے قائم ہوا تھا، اس کو پورا کرنے میں ساعی ہوں۔ مرحوم کو حضرت شاہ ولی اللہ اور مولانا عبیداللہ سندھی سے غیر معمولی عقیدت تھی، اور وہ اٹھتے بیٹھتے، اور دوست احباب کے حلقوں میں اکثر انہی بزرگوں کا ذکر کرتے رہتے۔ جب فروری ۱۹۶۳ء میں شاہ ولی اللہ اکیڈمی کا قیام عمل میں آیا۔ اور اس کے نظام کار کا تعین ہوا، اور اکیڈمی کے نگراں ڈائریکٹر چنے گئے تو یہ دن جناب سید باقر شاہ مرحوم کے لئے ان کی زندگی کا سب سے مسرت بخش دن تھا۔ اور وہ اتنے خوش تھے کہ گویا انہیں اپنی زندگی کی سب سے بڑی متاع حاصل ہو گئی۔

اس دنیا میں کسی انسان کے لئے دوام نہیں، اور ہر ایک کو ایک نہ ایک دن اپنے رب کے حضور

میں جانا ہے، اور جو دن قبر میں لکھا ہے، وہ قبر کے باہر نہیں آسکتا۔ کتنے خوش نصیب ہیں وہ لوگ کہ جب وہ اس دنیا سے رخصت ہوتے ہیں، تو جو کام ان کے ہاتھوں سرانجام پاتے ہیں، یا ان کاموں کی تکمیل میں ان مرنے والوں کی کوششوں کا کچھ دخل ہوتا ہے، تو ان کے بعد بھی ان کی اچھی یادیں باقی رہتی ہیں اور اس طرح انہیں دوام بخشتی ہیں۔ آخر اس حیاتِ ناپائیدار کا اس کے سوا اور کیا حاصل ہے کہ ہم مرنے والوں کو اس طرح ان کے نیک اور اچھے کاموں کی وجہ سے بعد میں یاد رکھیں۔

جناب سید باقر شاہ صاحب انہی خوش نصیب لوگوں میں سے تھے، جو موت کے بعد اپنی اچھی یادیں چھوڑ جاتے ہیں۔

آج سے ۱۹ سال قبل اسی اگست کے مہینے کی بائیس تاریخ کو مولانا عبیداللہ سندھی ہم سے رخصت ہوئے تھے، مولانا سندھیؒ کی عملی سیاست سے قطع نظر کرتے ہوئے جب ہم دیکھتے ہیں کہ انہوں نے کس طرح اپنی ساری زندگی حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے خانوادہِ علمی کے علوم اور ان کی حکمت کے مطالعہ، ان پر عمیق و پیہم غور و فکر کرنے اور ان کی مسلسل تعلیم و تلقین اور نشر و اشاعت میں صرف کر دی، تو حکمت ولی اللہی کے ایک طالب علم کی حیثیت سے اس موقع پر ہمارے دل ان کی یاد کے لئے سرتا پا وقف ہو جاتے ہیں اور ہم اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں کہ عہدِ حاضر کے شارحینِ حکمت ولی اللہی میں سب سے بلند مقام انہیں کا ہے۔ ان کی تحقیقات کو اپنے مطالعہ کے لئے دلیل راہ بنائیں، اور ان سے استفادہ کریں۔ ہر سال ماہ اگست میں مولانا عبیداللہ سندھی کے یوم وفات پر بعض جگہوں میں مولانا مرحوم کی یاد میں تذکاری جلسے ہوتے ہیں، جن میں مولانا کے نیازمند اور عقیدتمند جمع ہوتے ہیں، اور ان کو خراج تحسین ادا کرتے ہیں۔ نیز بعض اخبارات مولانا مرحوم کے متعلق مقالات شائع کرتے ہیں اور اس طرح سال بہ سال حکمت ولی اللہی کے اس عظیم مبلغ و شارح کی یاد تازہ ہوتی رہتی ہے۔

مولانا سندھیؒ نے خود اپنے قلم سے نسبتاً بہت کم لکھا، ان کی تمام تر توجہ اکثر پڑھانے ہی کی طرف

رہی۔ لیکن ان کی چند ایک تحریری باقیات میں سے ایک کتاب کا مسودہ بڑی اہمیت رکھتا ہے یہ عربی زبان میں ہے اور مولاناؒ نے زمانۂ قیام حجاز میں اسے مرتب فرمایا۔ اس میں آپ نے حضرت شاہ ولی اللہؒ اور ان کی تحریک تجدید اسلام کا تعارف کرایا ہے۔ یہ کافی مبسوط کتاب ہے۔ اور اس کا نام ہے "التمہید لتعریف ائمۃ التجدید" حضرت مولانا سندھیؒ کے عزیز شاگرد اور شاہ ولی اللہ اکیڈمی کے ریسرچ پروفیسر مولانا غلام مصطفےٰ قاسمی کے پاس "التمہید" کا مسودہ ہے۔ وہ اس کی نظر ثانی کر چکے ہیں خوش قسمتی سے مولانا سندھی کی اس اہم تاریخی کتاب کے چھپوانے کا انتظام بھی ہو گیا ہے، امید ہے وہ چند ماہ تک شائع ہو جائے گی۔

روس کے مشہور ترک عالم جناب موسیٰ جار اللہ مرحوم کچھ عرصہ مکہ معظمہ میں مولانا سندھیؒ کے ساتھ رہے تھے۔ اور آپ سے قرآن مجید کی تفسیر سنی تھی، مرحوم نے اسے قلم بند بھی کر لیا تھا، مولانا کی یہ تفسیر بروایت موسیٰ جار اللہ عربی میں ہے، اگر اسے بھی مرتب کر کے شائع کر دیا جائے تو یہ اور "التمہید" ولی اللہی مکتب فکر کو دنیائے اسلام میں بالعموم اور عرب ملکوں میں بالخصوص متعارف کرانے کا بہترین ذریعہ ہو سکتی ہے

شاہ ولی اللہ اکیڈمی کے زیر اہتمام حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے دو رسالوں "الفوز الکبیر" اور "القول الجمیل" کا سندھی میں ترجمہ ہو رہا ہے، جیسے ہی ترجمہ مکمل ہوا، یہ دونوں رسالے شائع کر دیئے جائیں گے۔ اس کے علاوہ شاہ ولی اللہ کی کتاب "سطعات" پریس میں ہے اور مولانا قاسمی کی زیر نگرانی چھپ رہی ہے۔ "لمحات" کے بعد شاہ ولی اللہ صاحب کی یہ دوسری کتاب ہے، جو اکیڈمی کی طرف سے اپنی اصل زبان میں شائع ہوگی۔ اس کے بعد "ہمعات" کے چھاپنے کا پروگرام ہے۔

قیام پاکستان کے بعد شروع شروع میں یہ جو شکایت تھی کہ پاکستان میں اعلیٰ معیار کی علمی، دینی اور تاریخی کتابیں کم چھپ رہی ہیں، جیسے جیسے دن گزر رہے ہیں، بحمد اللہ کم ہوتی جا رہی ہے اب ملک کے کئی ایک ادارے علوم دینیہ اور تاریخ اسلام پر معیاری کتابیں چھاپنے لگے ہیں، لیکن اپنی تمام ہمتوں اور کوششوں کے باوجود یہ ماننا پڑے گا کہ ان اداروں کا دائرۂ کار آخر محدود ہے اور انہیں اکثر و بیشتر اپنے کاروباری مصالح کو پیش نظر رکھنا ہوتا ہے اور ان کے لئے

یہ بڑا مشکل ہے کہ وہ ایسی پرانی اور نئی کتابیں چھاپ سکیں، جن پر ایک طرف تصحیح، ایڈیٹنگ، تصنیف و تالیف اور ترجمے میں زیادہ مصارف اٹھتے ہیں، اور دوسری طرف وہ کاروباری لحاظ سے زیادہ نفع مند نہیں ہوتیں، لیکن وہ کتابیں قومی ذہن کی صحت مند نشوونما اور اسے صحیح راہوں پر ڈالنے کے لئے ہیں بہت ضروری۔ کتابوں کی نشر و اشاعت کے اداروں کا ان کے اس مفید اور اہم کام میں ہاتھ بٹانے کے لئے محکمہ اوقاف مغربی پاکستان نے "بیورو آف ریسرچ اینڈ پبلیکیشن" قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے جس کے مقاصد حسب ذیل ہیں۔

۱۔ مذہبی مدارس اور اسلامیات کے طلبار کے لئے موجودہ دینی و قومی ضرورتوں کے مطابق درسی کتابیں تیار کرنا۔

۲۔ مغربی پاکستان کی مذہبی تاریخ اور خاص طور سے وہ صوفیہ اور بزرگ جن کے مزارات محکمہ اوقاف کی تحویل میں ہیں، ان پر تصنیف و تالیف کی کوششوں کی حوصلہ افزائی۔

۳۔ اسلامی علوم پر معیاری اور نادر کتابوں کی اشاعت اور مساجد کے ائمہ اور خطبار حضرات کے مطالعہ کے لئے موزوں تصنیفات کی تیاری۔

۴۔ اسلامی علوم کی جو اہم اور مشہور کتابیں ہیں، ان کے تراجم طالب علموں اور اہل علم کے عام استفادے کے لئے مناسب صورت میں شائع کرنا۔

۵۔ یورپ کے مستشرقین نے اسلامی علوم پر جو کتابیں لکھی ہیں، ان میں سے مفید اور اہم کتابوں کے تراجم کرانا۔

اس کے علاوہ محکمہ اوقاف کا قائم کردہ "یہ بیورو" موجودہ اسلامی ملکوں کی مذہبی، فقہی اور فکری تحریکات کے متعلق کتابیں شائع کرے گا۔ اور اسلامی تصوف کی معیاری کتابوں یا ان کے انتخابات کے سستے ایڈیشن شائع کرنے میں مدد دے گا۔

ان کتابوں کی طباعت و اشاعت تمام تر تاجران و ناشران کتب کے ذریعہ ہوگی۔ "بیورو"

کا کام صرف یہ ہوگا کہ وہ ان کتابوں کی تصحیح، تالیف اور ترجمہ کرا کے قابل اشاعت شکل میں ناشرین کے حوالے کر دے۔ اور انہیں اس مفید اور تعمیری ادب کی اشاعت میں ہر ممکن مدد دے۔

آج کے دور میں جب کہ نشر و اشاعت کے ذرائع روز بروز وسیع تر اور اسی حساب سے موثر ہوتے جا رہے ہیں، اور تعلیم کے ساتھ ساتھ مطالعۂ کتب کا شوق روز افزوں ہے، اسلامی علوم و فنون کی مشہور کتابوں کی اشاعت اور اسلاف کے بارے میں آج کی ضرورتوں کے مطابق دینی و تاریخی ادب فراہم کرنا قوم کی اصلاح و تعمیر کا ایک لازمی جزو ہے۔ مستقبل کی قومی عمارت ماضی کے ان آثار پر اٹھائی جانی چاہیئے، جو مرور زمانہ کے باوجود باقی رہنے والے ہوتے ہیں اور یہ قوم کا دینی و تاریخی ادب ہی ہے، جو ان آثار کی صحیح نشان دہی کر سکتا ہے۔ اگر "بورڈ" اس ادب کو نئی زندگی دینے اور اسے عوام و خواص یعنی قوم کے ہر دو طبقوں کے لئے قابل استفادہ بنانے میں ممد معاون ہو سکے تو یہ اس کی بہت بڑی ملی اور دینی خدمت ہوگی، اور موجودہ اور آئندہ نسلوں کو اسلامیت کی صحیح تربیت حاصل کرنے میں اس سے بڑی مدد ملے گی۔

یہی دینی و تاریخی ادب ہے، جو بقول علامہ اقبال مرحوم کے، ہمیں اپنے آپ سے آگاہ کرتا اور آشنائے کار اور مرد راہ بناتا ہے۔ یہ روح کے لئے سرمایۂ تاب ہے اور ملت کے جسم کے لئے اس کی حیثیت اعصاب کی ہے اس کی شمع بخت امم کے لئے کوکب ہے اور اس سے اس کا آج اور کل روشن ہے۔ اس سلسلے میں ان کا ارشاد ہے۔

چشم پر کارے کہ بیند رفتہ را
پیش تو باز آفریند رفتہ را
بادۂ صد سالہ در مینائے او
مستی پارینہ در صہبائے او

صید گیرے کو بدام اندر کشید
طائرے کز بوستانِ ما پرید

اور آخر میں فرماتے ہیں :-

ضبط کن تاریخ را پائندہ شو
از نفسہائے رمیدہ زندہ شو

اگر محکمۂ اوقاف مغربی پاکستان موجودہ اور آئندہ نسلوں کو ان کی ملی تاریخ کے تابناک اوراق اور پائیدار نقوشِ عظمت سے متعارف کرانے میں اس طرح کامیاب ہو جائے تو یہ اس کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہوگا، اور قومی تعمیر میں اس کی خدمات ہمیشہ یادگار رہیں گی۔

ہم بڑی مسرت سے یہ اطلاع دیتے ہیں کہ پروفیسر غلام حسین جلبانی صدر شعبہ عربی سندھ یونیورسٹی اور شاہ ولی اللہ اکیڈمی کے بورڈ آف ڈائرکٹرز کے رکن نے اپنی کتاب "شاہ ولی اللہ کی تعلیم" کا انگریزی ترجمہ مکمل کر لیا ہے اور اب وہ اس کی نظر ثانی کر رہے ہیں۔ امید ہے ہم بہت جلد حضرت شاہ ولی اللہ پر انگریزی زبان میں ایک ایسی کتاب جو اجمالی طور سے ان کی تعلیمات کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہوگی، شائع کر سکیں گے۔ پروفیسر جلبانی صاحب کی یہ کتاب سندھی اور اردو میں پہلے شائع ہو چکی ہے۔ اس کا انگریزی ترجمہ ان حضرات کے لئے جو ان دونوں زبانوں سے ناواقف ہیں، حضرت شاہ صاحب کی تعلیمات کو سمجھنے میں بڑی مدد دے گا۔

اکیڈمی کے بورڈ آف ڈائرکٹرز کے اجلاس منعقدہ ۵ اگست میں یہ فیصلہ بھی کیا گیا ہے کہ اکیڈمی کے زیر اہتمام الرحیم کا سندھی میں ایک سہ ماہی ایڈیشن نکالا جائے، جس میں اردو ایڈیشن کی طرح حکمت ولی اللہی اور دوسرے اسلامی مسائل پر مضامین ہوں گے۔

شاہ ولی اللہؒ ۔ تاریخی پس منظر

خاندانی حالات

شاہ ولی اللہ اپنے بزرگوں کے ذکر میں لکھتے ہیں : "یہ یقینی بات ہے کہ ہمارے اجداد عظام میں سب سے پیشتر حضرت شیخ شمس الدین مفتی ہندوستان تشریف لائے ۔ اور انہوں نے قصبہ رہتک میں سکونت اختیار کی۔" رہتک دہلی سے کوئی تیس میل دور ہے ۔ اور اس زمانے میں یہ بڑا آباد شہر تھا۔ شیخ شمس الدین ایک بزرگ شیر ملک کے بیٹے اور محمد عطا ملک کے پوتے تھے ۔ جن کے زیادہ حالات نہیں ملتے ۔ بیان کیا جاتا ہے کہ شیخ موصوف نے رہتک میں اپنا ایک مدرسہ قائم کیا تھا۔ ان کے پرپوتے شیخ عبدالملک کے عہد میں قضا و احتساب اور افتاء کے عہدے اس خاندان میں موروثی کر دیئے گئے ۔ چنانچہ شیخ عبدالملک کے بعد ان کے صاحبزادے قاضی بدھا اس منصب پر فائز ہوئے ۔ انہیں قاضی بدھا کی اولاد میں سے شیخ محمود تھے جنہوں نے منصبِ قضا ترک کر کے "اعمال سلطانیہ" اختیار کر لئے ۔ اور یہ فیصلہ کیا کہ "موجودہ حالات میں زندگی بسر کرنے سے سپاہیانہ زندگی اچھی اور انسب و اولیٰ ہے ۔" شیخ محمود کے صاحبزادے شیخ احمد تھے ۔ جن کی تربیت شیخ عبدالغنی بن شیخ عبدالحکیم نے کی ، جو رہتک میں نہیں بلکہ سونی پت میں رہتے تھے ۔ شیخ احمد کے بیٹے شیخ منصور کی شادی بھی اپنے ننہیال میں ہوئی اور اسی طرح ان دونوں خاندانوں کا سلسلہ اکٹھا ہو گیا ۔

یہ شیخ عبدالغنی بن شیخ عبدالحکیم جلال الدین اکبر کے دور میں تھے ، اور بادشاہ ان کی بڑی عزت کرتا تھا ۔ آپ نے راجپوتانہ کے قلعہ چتوڑ کی فتح کی پیش گوئی کی تھی چنانچہ تھوڑے ہی روز گزرے تھے کہ چتوڑ کی فتح اسی اسلوب و طریقہ پر بادشاہ کی

ا۔ اس حصہ مضمون کی ترتیب میں زیادہ تر حیات ولی از مولانا محمد رحیم بخش دہلوی سے مدد لی گئی ہے ۔ مدیر

خدمت میں معروض ہوئی، جیسا کہ جناب شیخ عبدالغنی صاحب نے بیان فرمایا تھا اس پر بادشاہ بہت خوش ہوا۔ اور اپنی فیاضانہ ہمت سے بارہ وسیع گاؤں جناب امام ناصرالدین شہید کے مزار کی نذر کر دیئے اور شیخ عبدالغنی کے نام ایک شاہی فرمان جاری ہوا۔ کہ ان قصبات کی سالانہ آمدنی آپ کی تفویض میں ہمیشہ رہے گی"

انہیں شیخ عبدالغنی صاحب کے متعلق "حیات ولی" میں ایک اور واقعہ منقول ہے:۔

"خواجہ محمد ہاشم کشمی شیخ مجدد یعنی حضرت شیخ احمد صاحب سرہندی قدس سرہ سے ناقل ہے کہ شیخ مجدد فرماتے ہیں۔ ہمارے والد بزرگوار ایک مدت تک جناب شیخ عبدالغنی صاحب کی ملاقات کے جویاں رہے جو شہر سونی پت کے ایک کامل درویش اور مشہور و معروف بزرگ تھے۔ ہمارے والد بزرگوار کو آپ سے نیاز حاصل کرنے اور خدمت میں حاضر ہونے کا اس لحاظ سے اور بھی بے تابانہ شوق تھا کہ انہیں کسی معتبر ذریعہ سے معلوم ہو گیا تھا کہ شیخ عبدالغنی صاحب اپنے بزرگ و محترم پیر کا ایک خاص راز مضمر رکھتے ہیں"۔

شیخ منصور جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، ان کے ہاں شیخ عبدالغنی صاحب کی پوتی سے دو صاحبزادے ہوئے ایک شیخ معظم اور دوسرے شیخ اعظم۔ شیخ معظم کے بیٹے شیخ وجیہ الدین تھے، جو شیخ عبدالرحیم کے والد بزرگوار ہیں، جن کے ہاں ۱۱۱۴ھ میں حضرت شاہ ولی اللہ پیدا ہوئے تھے۔ شیخ معظم کے حالات میں صاحب "حیات ولی" لکھتے ہیں:۔

"جب شیخ معظم علمی تحصیل سے فارغ ہوئے تو آپ کی طبیعت بے اختیارانہ جوش کے ساتھ سپاہیانہ فنون کی تحصیل اور تحصیل کے ساتھ تکمیل کی طرف دوڑی۔ گو آپ کی طرز معاشرت بالکل درویشانہ اور عالمانہ تھی لیکن آپ کی پرشوق اور تیز نظریں اس لاجواب اور عدیم المثال شجاعت کی طرف بڑی شتابی کے ساتھ اٹھ رہی تھیں، جو زمانہ سابق میں اسلام اور بانیان اسلام کے حق میں فطرت کی عام بخششیں سمجھی گئی تھیں۔ ۔ ۔"

"شیخ معظم کے والد بزرگوار شیخ منصور بھی بہت بڑے شجاع اور دلیر تھے۔"

شیخ عبدالرحیم (والد شاہ ولی اللہ) نے اپنے دادا شیخ معظم اور پردادا شیخ منصور کی بہادری کے بہت سے واقعات ذکر کئے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ اپنے والد شیخ وجیہ الدین کا ذکر کرتے ہیں فرماتے ہیں۔ میرے واجب الاحترام والد نہایت محتاط اور متورع آدمی ہیں۔ چونکہ آپ کا قالب بالکل سپاہیانہ تھا اور آپ فطرتاً چاق و چوبند تھے، اس لئے شمشیر زنی اور اپنی بے خوف شجاعت کے جوہر ظاہر کرنے کا آپ کو زیادہ شوق تھا

یہی وجہ تھی کہ آپ ابتدائی زمانے سے سلطنت مغلیہ کی فوج میں بھرتی ہو گئے تھے۔ اور اپنے کارہائے نمایاں کے صلے میں کوئی بڑا اور معزز فوجی عہدہ رکھتے تھے... اس وقت شاہجہاں بادشاہ تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہوا۔ شیخ عبدالرحیم نے بعض ان معرکوں کا ذکر کیا ہے جن میں شیخ وجیہہ الدین نے اپنی شجاعت و جرأت کے جوہر دکھائے تھے۔

عالمگیر کی تخت نشینی پر جب اس میں اور اس کے بھائی شاہ شجاع میں موضع کھجوہ پر خونریز جنگ ہوئی تھی، تو اس میں شیخ وجیہہ الدین اورنگ زیب عالمگیر کی طرف تھے ان کی بہادری کی بدولت جنگ کا ایک اہم مورچہ سر ہوا تھا، جس کی تفصیل "حیات ولی" میں یوں ہے۔

لڑائی کے دوسرے دن شاہ شجاع نے دو تین کوہ پیکر مست ہاتھی عالمگیر کے لشکر کی طرف دھکیل دیئے۔ جن کے پیچھے زرہ پوش سپاہی تھے۔ شاہ شجاع کا یہ حملہ بڑا کامیاب رہا اور عالمگیر کی فوج میں بھگدڑ مچ گئی۔ شیخ وجیہہ الدین نے اپنے مورچے پر کھڑے جو یہ صورت حال دیکھی۔ تو اپنے ساتھیوں کو لے کر ہاتھیوں کی طرف بڑھے اور سب سے پہلے اس ہاتھی پر حملہ کیا، جو سب سے سرکش تھا، ہاتھی نے سونڈ بڑھا کر آپ کو اپنی گرفت میں لینا چاہا آپ نے تلوار کا ایک وار کیا، جس سے اس کی سونڈ کٹ گئی اور وہ چنگھاڑتا ہوا پیچھے کی طرف بھاگا۔ اس کا بھاگنا تھا کہ زرہ پوشوں کے پاؤں اکھڑ گئے۔ اور شاہ شجاع کے لشکر کو شکست ہو گئی۔

عالمگیر نے اس فتح کی خوشی میں ایک شاندار جلسہ کیا اور چونکہ وہ عین معرکہ میں جناب شیخ وجیہہ الدین صاحب کی بہادرانہ کوشش اور وفادارانہ جوش کو اپنی آنکھ سے دیکھ چکا تھا اس لئے اس نے آپ کو بہت انعامات دیئے اور خود اپنے ہاتھ سے آپ کی کمر میں تلوار باندھی۔

شاید سیواجی کا زمانہ تھا، شیخ وجیہہ الدین دکن جا رہے تھے کہ راستے میں راہزنوں سے مٹھ بھیڑ ہو گئی۔ جس میں آپ شہید ہو گئے۔

شیخ وجیہہ الدین کی شادی شیخ رفیع الدین محمدؒ کی صاحبزادی سے ہوئی تھی جو ایک مشہور خانوادہ طریقت سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد شیخ قطب العالم اور دادا شیخ عبدالعزیز دہلوی البحر المواج عرف شکر بار تھے۔

مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم "امام ولی اللہ کی حکمت کا اجمالی تعارف" میں لکھتے ہیں:۔ چشتی طریقے میں حضرت

شیخ عبدالعزیز دہلوی متوفی ۹۷۵ھ ایک بہت بڑے عالم، عارف اور متشرع بزرگ گزرے ہیں۔ آپ کی تصنیفات میں ایک رسالہ "عینیہ" ہے جو موصوف نے شیخ امان پانی پتی کے رسالہ "غیریہ" کے جواب میں لکھا تھا۔ اور اس میں آپ نے وحدت الوجود کے بعض عمیق مسائل کو اپنے کشفی رنگ میں پیش فرمایا ہے حضرت شیخ عبدالعزیز البحر المواج کے والد شیخ حسن[1] بن طاہر متوفی ۹۰۹ھ سلطان سکندر لودھی کے زمانے میں دہلی آ بسے تھے۔ آپ کے پوتے شیخ رفیع الدین بن قطب العالم خواجہ باقی باللہ کے خواص اصحاب میں سے تھے۔ آپ شیخ وجیہ الدین کے خسر اور شیخ عبدالرحیم کے نانا تھے ...... مشہور ہے کہ جس طرح مغلیہ خاندان میں سلطنت سلسلہ بہ سلسلہ چلتی رہی، اسی طرح علم و عرفان شیخ عبدالعزیز کی اولاد میں شاہ ولی اللہ تک اور شاہ ولی اللہ سے ان کی اولاد تک جاری رہا۔

شیخ عبدالرحیم جنہیں ہم آئندہ شاہ عبدالرحیم لکھیں گے، شیخ وجیہ الدین کے صاحبزادے اور شیخ رفیع الدین بن قطب العالم کے نواسے تھے۔ ان کی شادی ایک صاحب کرامات بزرگ حضرت شیخ محمد پھلتی کی صاحبزادی سے ہوئی شیخ محمد کا بڑا پرانا نامور خاندان تھا۔ ان کے بزرگوں میں سے ایک شیخ احمد تھے جو سلطان سکندر کے دربار میں پہنچے اور چند ہی روز میں اپنی بے نظیر قابلیت سے شاہی دربار میں وہ اعزاز و اعتبار پیدا کر لیا کہ سلطنت کی طرف سے چند قریے آپ کو مدد معاش کے لئے نسلاً بعد نسل عنایت ہو گئے۔ اور یہ خاندان دہلی کے نواح پھلت میں آباد ہو گیا۔

شاہ عبدالرحیم سے بڑے ان کے بھائی شاہ ابوالرضا محمد تھے۔ ایک بھائی اور بھی تھے لیکن ان کے حالات نہیں ملتے۔ شاہ عبدالرحیم تقریباً ۱۰۵۴ھ میں پیدا ہوئے اور ۷۷ برس کی عمر پا کر ۱۱۳۱ھ میں آپ نے انتقال فرمایا۔ جب آپ پیدا ہوئے، تو آپ کے والد بزرگوار شیخ وجیہ الدین سلطنت کے ایک معزز عہدے پر فائز تھے۔

---

[1] [illegible] طاہر ملتان میں پیدا ہوئے۔ ملتان میں آپ کا خاندان بڑا واجب الاحترام تھا۔ تحصیل علم کے لئے آپ تھا [illegible] آئے اور وہاں سے بہار کا رخ کیا بہار کے [illegible] غنی نے اپنی لڑکی آپ کے عقد میں دی۔ آخر میں آپ مع خاندان جونپور آ گئے۔ آپ صاحبزادے شیخ [illegible] جو بہت بلند پایہ عالم تھے۔ دہلی لائے سلطان سکندر آپ کا بڑا معتقد تھا۔ علم سلوک میں آپ کی کتاب [illegible] الفیض بڑی مشہور ہے۔ (ملخص از حیات ولی)

اور ظاہر ہے دولت وثروت کی فراوانی تھی۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ میرے ماموں شیخ عبدالحی ایک نہایت صالح اور خداترس بزرگ تھے اور اہل دنیا سے طبعی نفرت رکھتے تھے بدقسمتی سے اپنی اولاد ان کی توقعات کے مطابق نہ نکلی ایک دفعہ انہوں نے مجھے بچپن میں پورے سُنن وآداب کے ساتھ وضو کرتے دیکھا۔ تو بڑے خوش ہوئے اور فرمانے لگے کہ "میں ہمیشہ ڈرتا تھا کہ ہمارے اسلاف کا سِرّ ہماری اولاد سے منقطع ہو جائے گا، لیکن اب مجھے قطعی طور سے معلوم ہو گیا کہ اس سِرّ کا حامل ہمارے خاندان میں موجود ہے گو اپنی نسل میں نہ سہی بہن کی نسل میں موجود ہے"

صاحب "حیات ولی" لکھتے ہیں :- جب آپ کا نواں یا دسواں سال شروع تھا تو شرح عقائد اور حاشیہ خیالی پڑھتے تھے۔ اور معقول کی اکثر کتابیں نکال چکے تھے جس زمانے میں اورنگ زیب اکبرآباد (آگرہ) میں جلوس فرما تھا۔ آپ کے والد بزرگوار شیخ وجیہہ الدین صاحب بھی وہاں موجود تھے۔ اور اس تقریب سے آپ اکبرآباد میں مرزا محمد زاہد ہروی سے تعلیم پاتے رہے۔ ابتدائی رسائل سے شرح عقائد و حاشیہ خیالی تک تو آپ نے اپنے برادر کلاں شیخ ابوالرضا محمد سے نکالے اور شرح مواقف اور تمام کتب کلامیہ و اصولیہ مرزا زاہد ہروی سے پڑھیں۔ شاہ ولی اللہ اپنے والد کے ذکر میں فرماتے ہیں "اس نیلگوں آسمان کے نیچے جناب شیخ عبدالرحیم سے زیادہ فن حدیث میں طاق اس عہد میں کوئی نہ تھا۔۔۔ میں نے ان جیسا ایک شخص بھی نہیں دیکھا، جو تمام علوم میں عموماً اور حدیث اور فقہ میں خصوصاً تبحر رکھتا ہو۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے بعد آپ جیسے محدث و مفسر، فقیہ کو ہندوستان کی گود میں پرورش پانا بہت کم نصیب ہوا ہوگا۔"

شاہ عبدالرحیم نے مرزا محمد زاہد ہروی اور خواجہ خورد بن خواجہ باقی اللہ کے علاوہ کئی اور بزرگوں سے بھی استفادہ کیا۔ جن میں خلیفہ ابوالقاسم اکبرآبادی خاص طور سے ممتاز ہیں۔ ان کی شہرت اگرچہ زیادہ تر تصوفی تحقیقات میں ہے لیکن حقیقت میں وہ تمام علوم میں اجتہاد کا درجہ رکھتے تھے۔ اور ہندوستان میں مجتہدین فن تسلیم کئے جاتے تھے۔ شاہ صاحب کے ایک اور استاد عبداللہ تھے، جو اس قدر خوش الحانی سے قرآن پڑھتے تھے کہ سننے والوں پر محویت طاری ہو جاتی تھی۔ یہ عالم کے ساتھ بڑے عارف بھی تھے۔ شاہ عبدالرحیم فرماتے ہیں کہ جب خلیفہ ابوالقاسم صاحب نے مجھے تکمیل و ارشاد کی اجازت سے سرفراز فرمایا، تو ایک دعوت کا انتظام کیا۔ اور اس میں اپنے مریدوں اور جاننے والوں کو مدعو کیا

آپ نے فقیر کو طلب فرمایا۔ میرے سر پر دستار باندھی ایک اجازت نامہ لکھکر دیا۔ اور مجھے طالبان حق کی رہنمائی اور دینی علوم کی اشاعت و درس کی اجازت دی اور یہ بھی فرمایا کہ اب اگر تم مناسب سمجھو تو دہلی میں جاکر رہو اور وہاں کے باشندوں میں دینیات کی اشاعت کرو" شاہ عبدالرحیم صاحب نے چند دن اور اکبرآباد (آگرہ) میں اپنے اُستاد کے قدموں میں رہنا پسند کیا۔ اور ان کی ہدایت کے مطابق بعض بزرگوں سے ملتے رہے ؎

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے، شاہ عبدالرحیم کے بزرگوں کا منصب و مشغلہ ابتدا میں تعلیم و تدریس اور قضا و افتاء کا تھا۔ البتہ بعد میں انہوں نے فوجی زندگی اختیار کر لی تھی۔ شاہ عبدالرحیم نے پھر درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ صاحب "حیات ولی" لکھتے ہیں "شاہ عبدالرحیم نے مدرسہ رحیمیہ کی بنیاد ڈالی۔ اور اس میں علم حدیث کی تعلیم دینی شروع کی" مولانا عبیداللہ سندھی نے لکھا ہے کہ شاہ ولی اللہ اور ان کے والد کے زمانے

؎ خلیفہ ابوالقاسم کے ارشاد پر شاہ عبدالرحیم نے شاہ عظمت اللہ نامی بزرگ کے ہاں حاضری دی، جو سلسلہ چشتیہ کے ایک معمر بزرگ تھے، اور آگرہ میں رہتے تھے۔ وہ بیمار تھے، اور پلنگ پر لیٹے لیٹے شاہ صاحب سے باتیں کرتے رہے۔ دوران گفتگو میں جیسے ہی شاہ صاحب نے اپنا خاندانی تعلق شیخ عبدالعزیز شکر بار سے ظاہر کیا آپ فوراً پلنگ سے نیچے اترے اور شاہ صاحب کو گلے سے لگالیا اور ایک سوال پوچھا۔ اس کے بعد کہا کہ میرے دادا کو شیخ عبدالعزیز شکر بار نے کچھ تبرکات دیئے تھے، اور فرمایا تھا کہ میری اولاد میں سے اگر کوئی آئے تو اسے یہ تبرکات دے دینا۔ چنانچہ آپ نے شاہ صاحب کے سر پر عمامہ باندھا اور اپنے طریقے کی اجازت دی۔ جب چلنے لگے تو مٹھائی اور نقد روپے بھی ساتھ کر دیئے۔ شاہ صاحب نے واپس آکر اپنے مرشد خلیفہ ابوالقاسم کی خدمت میں سب ماجرا بیان کیا انہوں نے شاہ عبدالرحیم کو یہ بشارت دی ۔ روپیہ تو ظاہر حال کے اطمینان اور فارغ البالی کی طرف اشارہ ہے اور عمامہ باطنی اطمینان اور اجازت کا اشارہ ہے۔" شاہ عبدالرحیم کا بیان ہے کہ اس بشارت کے بعد معاشی پراگندگی کا سوال ان کی زندگی میں سرے سے کبھی پیدا نہیں ہوا۔ "انفاس العارفین" اور بعض دوسری کتابوں میں شاہ عبدالرحیم کی جس صاف ستھری زندگی کا پتہ ملتا ہے اس کے پڑھنے سے دل کو راحت ہوتی ہے ۔ ملخص از تذکرہ شاہ ولی اللہ مصنفہ مولانا مناظر احسن گیلانی

میں فقہا اور مفسرین نے عوام مسلمانوں کی روزہ مرہ کی زندگی سے قرآنی تعلیمات کو بحیثیت مجموعی خارج کر دیا تھا۔
سب سے پہلے شاہ ولی اللہ صاحب کے والد شاہ عبدالرحیم نے ادھر توجہ کی اور اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے انہوں
نے ایک بہت اچھا طریقہ اختیار کیا اس سے پہلے علمار کا یہ دستور تھا کہ پہلے تو وہ قرآن مجید کو محض تلاوت کی
خاطر پڑھا دیتے۔ پھر اگر انہیں طالب علموں کو قرآن مجید کے مطالب و معانی کی تعلیم دینا مقصود ہوتی، تو
جس فن سے خود انہیں دلچسپی ہوتی، اس فن کے نقطۂ نظر سے قرآن مجید کی تفسیر کی جو کتاب وہ مناسب سمجھتے
طالب علموں کو پڑھاتے .... اس کے خلاف شاہ عبدالرحیم نے یہ کیا کہ قرآن کے متن پر زیادہ زور دیا، لیکن
بجائے اس کے کہ متنِ قرآن محض تلاوت کی غرض سے پڑھا جاتا، یا کسی خاص فن کی تفسیر کے ذریعہ قرآن کے
مطالب کو حل کرنے کی کوشش ہوتی۔ آپ یہ کرتے کہ قرآن کے متن کو شروع سے لے کر آخر تک بڑی تحقیق
اور بصیرت کے ساتھ پڑھاتے۔ اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ قرآن کے جملہ مطالب اور معانی تک براہ راست
طلبہ کی رسائی ہو جائے۔ اور وہ جان لیں کہ قرآن کا مجموعی طور پر کیا پیغام ہے۔ اس ضمن میں شاہ ولی اللہ اپنے والد
بزرگوار کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "آپ کی عادت یہ تھی کہ اپنے اصحاب کے حلقے میں ہر روز قرآن مجید کے دو یا تین
رکوع پڑھتے اور اس پر نہایت تدبر کرتے اور ان کے معانی پر غور و خوض فرماتے۔" ایک اور جگہ شاہ ولی اللہ نے لکھا
ہے "خدا تعالٰے نے مجھ ضعیف پر جو بڑے بڑے الطاف کئے ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مجھے چند بار
والد بزرگوار سے تدبر معانی، شان نزول کے بیان اور تفاسیر میں مطالب کی تحقیق کے ساتھ قرآن عظیم کو پڑھنے
کا موقع ملا۔ اس کی وجہ سے مجھ پر علم و عرفان کا ایک بڑا دروازہ کھل گیا۔" شاہ عبدالرحیم اپنے درس و تدریس
میں "حکمت عملی" پر بہت زور دیا کرتے تھے۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا عبیداللہ سندھی لکھتے ہیں:۔
اُس وقت حالت یہ تھی کہ عام متکلمین نے ارسطو کی نظری حکمت کو اپنا مطمح نظر بنا لیا تھا۔ اور ان کا سارا زور
قیاس آرائیوں اور استدلالی بحثوں پر صرف ہوتا تھا۔ وہ عملی زندگی کی ضرورتوں سے بے خبر تھے اور "حکمت عملی"
سے سروکار نہ رکھتے تھے لازمی طور پر اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ علم کلام میں دلچسپی لینے والے فقہا اور متکلمین قومی زندگی
کی ضروریات میں تدبر اور تفکر سے محروم ہو گئے۔ شاہ ولی اللہ نے اپنے والد بزرگوار کے مذکورہ بالا رجحانِ
فکری کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:۔ "حضرت شجاعت، فراست، کفایت، غیرت وغیرہ اخلاق سلیمہ میں

درجۂ کمال پر تھے۔ نیز دینی اور مابعد الطبیعاتی علوم میں درک کامل رکھنے کے ساتھ ساتھ آپ "عقل معاشی" سے بھی جس کے ذریعہ انسان زندگی کی معاشی اور اجتماعی ضرورتوں کو سمجھتا ہے پورے طور پر بہرہ ور تھے۔ آپ اپنی مجلس میں اکثر "حکمت عملی" اور کاروبار زندگی کے معاملات کے آداب کی تعلیم دیا کرتے تھے۔"

درس وتدریس کے ان مشاغل میں انہماک کی وجہ سے شاہ عبدالرحیم ملک وملت کے عام امور سے بالکل بے تعلق نہیں ہو گئے تھے۔ کتاب "سیرت سید احمد شہید" کے مقدمہ میں مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے شاہ عبدالرحیم کے ذکر میں لکھا ہے کہ ان کے مکاتیب کا ایک نسخہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کے کتب خانے میں میری نظر سے گزرا ہے۔ اس میں ان کا خط نظام الملک آصف جاہ اوّل کے نام ہے، جس میں انہوں نے نواب مرحوم کو مرہٹوں سے جہاد کی ترغیب دی ہے۔ اور یوں بھی مولانا مناظر احسن گیلانی کے الفاظ میں "شاہ صاحب کا خاندانی تعلق جس قبیلہ اور نسل سے تھا علم وتصوف کے ساتھ اس خاندان کے لوگ فوجی کاروبار میں یگانۂ روزگار تھے ــــ بلکہ شاہ عبدالرحیم سے پہلے تو شاہ صاحب کے خاندان میں علم وتصوف کی محض ثانوی حیثیت تھی اصلی کام اس خانوادہ کا جہاد ہی تھا۔ آپ (شاہ ولی اللہ) کے براہ راست جدِّ امجد یعنی شیخ وجیہہ الدین کے واقعات تو خود شاہ (شاہ ولی اللہ) نے اپنی مختلف کتابوں میں درج کئے ہیں، جن کو سنکر حیرت ہوتی ہے" اس سے آگے مولانا گیلانی مرحوم فرماتے ہیں :۔ "اور کون کہہ سکتا ہے کہ دوسری ہی پشت میں حضرت شاہ صاحب کے گزرنے سے جو وہ مرد غازی مولانا اسمٰعیل شہید اٹھے، اور ایک مدت تک بجائے قلم کے تلوار کو کمر سے لگائے رہے۔ تا اینکہ اس راہ میں بالآخر جان عزیز بھی نذر کی، یہ شاہ صاحب کی کسی اندرونی تربیت کا نتیجہ نہ تھا جس کا رواج ان کے خاندان میں چلا آرہا تھا۔"

عام زندگی میں شاہ عبدالرحیم کا کیا مسلک تھا، مندرجہ ذیل سطور میں اس کا مختصراً ذکر کیا جاتا ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب فرماتے ہیں :۔ ایک بار والد بزرگوار نماز ظہر کے قریب دفعتہً میری طرف متوجہ ہوئے اور برجستہ یہ رباعی پڑھی ۔

گر تو راہ حق بخواہی اے پسر ‌ ‌ خاطر کس را مرنجاں الحذر

در طریقت رکن اعظم حرمت است ‌ ‌ این چنیں فرمود آں خیر البشر

یہ رباعی پڑھ کر فرمایا۔ ولی اللہ! یہ رباعی لکھ لو۔ حق تعالیٰ نے دفعۃً میرے دل میں اس مضمون کو بایں غرض القا فرمایا ہے کہ تمہیں وصیت کروں۔

شاہ عبدالرحیم صاحب جب احباب کو رخصت کیا کرتے، تو الوداع کہتے ہوئے یہ بیت پڑھا کرتے تھے۔

آسائشِ دو گیتی تفسیر ایں دو حرف است
با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

نیز فرماتے تھے کہ جو لوگ تم سے قدر و منزلت میں کم درجے پر ہوں، اگر وہ تمہیں سلام کرنے میں پہل کریں تو اسے خدا تعالیٰ کی ایک نعمت سمجھو اور ان سے نہایت خندہ پیشانی سے ملاقات کرو۔

صد ملک دل بہ نیم نگہ میتواں خرید
خوباں دریں معاملہ تقصیر میکنند

ایک دفعہ شاہ عبدالرحیم کے ایک معتقد نے سوال کیا کہ ابنائے روزگار کے ساتھ کس طرح زندگی بسر کرنی چاہیئے۔ فرمایا کُن فی الناس کاحدمن النّاس (لوگوں میں اس طرح رہو جیسے تم ان میں سے ایک ہو) پھر اس نے دریافت کیا کہ حضرت حق تک پہنچنے کا کیا طریقہ ہے، فرمایا۔ رجالٌ لا تلھیھم تجارۃ ولا بیعٌ عن ذکر اللہ (وہ ایسے لوگ ہیں کہ نہ تو تجارت اور خرید و فروخت ہی انہیں ذکر اللہ سے غافل کرتی ہے)

شاہ عبدالرحیم کی ابتدائی تعلیم و تربیت میں ان کے بڑے بھائی شاہ ابوالرضا محمد کا بڑا حصہ ہے۔ "حیاتِ ولی" میں لکھا ہے۔ "ابتداً میں شاہ عبدالرحیم کی اتالیقی آپ ہی کے سپرد تھی۔ اگرچہ شاہ عبدالرحیم کی تعلیم پر دیگر ماہرین فن بھی چار سال کی عمر میں مقرر تھے ... لیکن پوری پوری خدمتِ تربیت شیخ ابوالرضا محمد ہی کے ہاتھ میں تھی ...." "شوارق المعرفہ" میں ہے کہ شیخ ابوالرضا محمد متعدد علوم میں اعلیٰ درجہ کا کمال رکھتے تھے اور اسے فطرت کی بخشش و عنایت سمجھنا چاہیئے کہ آپ کا ذہن و حافظہ اس بلا کا تھا کہ ایک ہی مجلس میں مختلف علوم تحصیل کرتے تھے۔" ظاہری علوم سے فارغ ہونے کے بعد آپ حضرت خواجہ باقی باللہ کے فرزند رشید جناب

خواجہ خورد کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے کمالات باطنی حاصل کئے۔

جیسا کہ اوپر ذکر ہوچکا ہے، شاہ عبدالرحیم اور شاہ (شیخ) ابوالرضا محمد کے والد بزرگوار شیخ وجیہہ الدین عالمگیر کی فوج میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے لیکن ان کے دونوں صاحبزادے شاہی دربار سے بے تعلق رہے۔ اور درس و تدریس ہی کو اپنا مقصد حیات بنایا۔ شیخ ابوالرضا محمد کے متعلق "حیات ولی" میں لکھا ہے۔ اوّل اوّل اگرچہ آپ بصوابدید والد بزرگوار اس زمانے کے اُمراء سے ملتے جلتے تھے، اور شاہی دربار سے ایک معزز و ممتاز عہدہ بھی آپ کے لئے نامزد ہوگیا تھا۔ لیکن دفعتہً آپ کی فطری استعداد ظہور پذیر ہوئی اور آپ نے عزلت نشینی، تجرید تام، توکل کلی، ہر حال میں سنت نبوی پر عمل کرنا اختیار کیا۔ اور یک لخت ابنائے دنیا حتیٰ کہ عزیز و اقارب سے بھی ملنا ترک کر دیا۔

اوّل اوّل آپ طلبا کو ہر قسم کے علوم و فنون کا درس دیتے تھے۔ اور مختلف علوم کے شائقین جوق در جوق حاضر ہوتے تھے لیکن آخر میں بجز تفسیر بیضاوی اور مشکوٰۃ شریف کے اور کسی علم کا درس دینا پسند نہ کرتے تھے۔ آپ کا دستور تھا کہ نماز جمعہ کے بعد ہمیشہ وعظ فرمایا کرتے تھے۔۔ ہر درجے اور مرتبے کے آدمی جن میں طالب علم، علماء، فضلاء، صوفیہ، رئیس شہزادے وغیرہ ہوتے تھے، سب آ آکر جمع ہو جاتے تھے۔۔۔ ان کا ایک مشہور قول ہے ہمارے عرفائے زمانہ کو ذاتی تجلی میسر نہیں ہے، ورنہ اپنے، اپنی اولاد و اقارب کے حصولِ اغراض کے لئے سلاطین کے محتاج نہ ہوتے۔

شاہ ابوالرضا محمد کی طرح شاہ عبدالرحیم بھی دربار شاہی سے بے تعلق رہے۔ ان کے متعلق ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے۔ جب وہ طالب علم تھے اور فتاویٰ عالمگیری کی تدوین ہو رہی تھی تو ان کے ایک دوست نے انہیں اس کام میں شریک ہونے پر آمادہ کیا، لیکن شاہ عبدالرحیم صاحب نے انکار کر دیا۔ جب اس انکار کی خبر شاہ صاحب کی بیوہ والدہ کو ہوئی تو وہ برہم ہوئیں اور اصرار کر کے حکماً نوکری قبول کرنے پر مجبور کیا چنانچہ شاہ صاحب تدوین فتاویٰ عالمگیری سے متعلق ہو گئے، مگر جب یہ خبر اُن کے مرشد خلیفہ ابوالقاسم کو ہوئی تو وہ ناخوش ہوئے اور ترک ملازمت پر زور دیا۔ شاہ صاحب نے والدہ کے حکم کا عذر پیش کیا، لیکن آپ کے مرشد برابر مُصر رہے۔ آخر شاہ صاحب نے خلیفہ ابوالقاسم صاحب سے عرض کی کہ آپ دعا فرمائیں کہ نوکری چھوٹ

جائے۔ ورنہ یوں چھوڑوں گا تو والدہ ناراض ہوں گی چنانچہ ترک ملازمت کے لئے دعا کرائی گئی۔ اور وہ قبول ہوئی بعد میں عالمگیر نے زمین دینی چاہی لیکن شاہ صاحب کے الفاظ میں "میں نے قبول نہیں کیا اور شکر ادا کیا"[1]

شاہ عبدالرحیم کا خاندانی پیشہ طبابت تھا۔ اس بارے میں شاہ عبدالعزیز کا یہ قول ان کے ملفوظات میں ہے "حکمت ہم در خاندان ما معمول بود۔ چنانچہ جدّ بزرگوار و عمّ فقیر دوامی کردند والد ما جد بندہ موقوف ساختہ" صفحہ ۲۳

یہ خاندان عربی النسل تھا۔ شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالرحیم کا سلسلہ نسب والد کی طرف سے حضرت عمر فاروقؓ تک پہنچتا ہے اور والدہ کی جانب سے حضرت امام موسیٰ کاظم تک تحقیقی طور سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس خاندان نے سرزمین عرب کو کیسے چھوڑا، لیکن شاہ ولی اللہ نے جو شجرہ نسب بیان کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ کے بعد پانچویں پشت میں افراد خاندان کے ناموں میں عجمیت آگئی تھی۔ اس خاندان کے سب سے پہلے بزرگ جو ہندوستان آئے، اور رہتک میں آباد ہوئے، جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے، شیخ شمس الدین مفتی تھے۔

شاہ عبدالرحیم کی ساٹھ سال کی عمر تک کوئی اولاد نہ تھی ایک دفعہ آپ حضرت خواجہ قطب الدین کے مزار کی زیارت کو گئے، آپ پر منکشف ہوا کہ آپ کے ہاں اور اولاد ہوگی۔ اس پر شاہ عبدالرحیم نے ایک بزرگ شیخ محمد کی صاحبزادی سے عقد فرمایا۔ جس سے شاہ ولی اور دو صاحبزادے اور ہوئے شادی کے بعد شاہ عبدالرحیم سترہ اٹھارہ سال تک زندہ رہے۔

(اس سلسلے کا دوسرا مضمون جس میں اس عہد کے سیاسی و معاشی حالات کا جائزہ ہوگا اگلے شمارے میں شائع ہوگا۔)

---

[1] ماخوذ از تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ مصنفہ مولانا مناظر احسن گیلانی

وحدت دین کا تصور

ڈاکٹر عبدالواحد ہالے پوتا

قانون ارتقاء کے تحت جیسے جیسے معاشرہ اپنی ابتدائی منزل سے، جسے شاہ ولی اللہ صاحب نے "ارتفاق اول" کا نام دیا ہے، ترقی کر کے اعلیٰ منازل کی طرف جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کے مذہب کے اسلوب، طریقہائے اظہار یا انہیں آپ مناہج اور رسوم کہہ لیں، بدلتے جاتے اور ارتقا پذیر ہوتے ہیں۔ اس خیال کے حامیوں کے نزدیک مذہب انسان کا فطری خاصہ ہے جو اس کی انفرادی و اجتماعی زندگی کے فطری کردار اور اعمال پر محیط ہوتا ہے۔ اور وہ اسی طرح عمومی قانون فطرت ہے، جیسے دوسرے حیاتیاتی قوانین ہیں۔ اور جس طرح پوری انسانی زندگی میں، جس کے یہ حیاتیاتی قوانین ایک حصہ ہیں، ارتقاء کا عمل ہوتا رہا ہے، ایسے ہی مذہب کا عملی اظہار جن شکلوں اور صورتوں میں ہوتا ہے ان میں بھی تاریخ کے ادوار میں ارتقاء جاری رہا ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ انسانوں میں ستارہ پرستی عام تھی۔ ہو سکتا ہے کہ اس زمانے میں وہ ان لوگوں کے حالات کے مطابق ہو، لیکن حضرت ابراہیمؑ نے اس کو ختم کیا، اور ستاروں کے ذریعہ خدا تک پہنچنے کے بجائے براہ راست غیر مشہود خدائے مطلق کی عبادت کا طریقہ رائج فرمایا۔[1]

۱؎ حجۃ اللہ البالغہ میں ہے:۔ بعض لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ خدا تعالیٰ ہے تو مدبر کل، لیکن اپنے مخصوص

(باقی حاشیہ ص۳۱ پر)

مظاہر فطرت کو قدرت خداوندی کا جلوہ سمجھنے کے بجائے انہیں خود ذات خداوندی کا قائم مقام بنالینا ارتقائے انسانی کی ابتدائی منزلوں میں عام تھا، اس دور میں انسان کے لئے یہ ایک امر محال تھا کہ وہ ذات خداوندی کا عالم تجرد میں ادراک کر سکے۔ وہ ان مظاہر کو خدائی صفات کا حامل قرار دے دیتا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسّلام نے ایک اعلیٰ و برتر اور منزہ اور مجرّد ذات خداوندی کا تصوّر پیش فرمایا۔ اور مظاہر کو مظاہر کا درجہ دیا۔

بندوں کی شفاعت قبول کرتا ہے۔ اس لئے وہ ان مخصوص بندوں کو "عباد اللہ" کہنے سے گریز کرتے ہیں۔ عام یہود و نصاریٰ اور ہمارے زمانے کے بعض مسلمانوں میں یہ مرض ہے۔ اور چونکہ شریعت کی بنا اس پر ہے کہ مشتبہ امور کو قائم مقام اصل کے نہ گردانا جائے۔ اس لئے وہ امور محسوسہ جن سے شرک کا شبہ ہو سکتا ہے شریعت نے کفر گردانا۔ جیسا کہ بتوں کے سامنے سجدہ کرنا، ان کے لئے جانور ذبح کرنا وغیرہ۔

اِس علم کے بارے میں پہلی مرتبہ مجھے یوں انکشاف ہوا کہ میرے سامنے ایک ایسی قوم پیش کی گئی، جو ایک چھوٹی سی مکھی کے سامنے جو ہر وقت اپنی دُم اور بازو ہلایا کرتی تھی، سجدہ کر رہی تھی۔ پھر میرے قلب میں القاء ہوا کہ کیا تم اس کے اندر شرک کی تاریکی پاتے ہو اور جس عصیاں نے بت پرستوں کو گھیر لیا ہے وہ ان پر بھی محیط ہے؟ میں نے کہا، نہیں۔ ان کے اندر میں یہ چیز نہیں پاتا۔ کیونکہ ان لوگوں نے مکھی کو معبود نہیں گردانا بلکہ قبلہ گردانا ہے۔ اور تذلل و انکساری اور شرف و عزت کے اصل درجہ کو مخلوط نہیں کیا ہے اس پر مجھ سے کہا گیا کہ تم نے واقعی اس کا اصل راز پالیا۔ چنانچہ اس دن سے میرا قلب اسی علم سے معمور ہو گیا اور میں علم و بصیرت کی منزل تک پہنچ گیا۔ اور توحید و شرک اور شریعت نے جن امور کو مظنۂ توحید یا مظنۂ شرک گردانا ہے اس کی حقیقت سے پوری طرح آگاہ ہو گیا۔ اور عبادت و تدبیر میں کیا ربط اور تعلق ہے، اس سے اچھی طرح واقف ہو گیا۔ اور مجھے پوری پوری معرفت حاصل ہو گئی۔ واللہ اعلم"

ہو سکتا ہے کہ حضرت ابراہیم سے پہلے ستاروں کی معبود نہیں، بلکہ قبلہ سمجھ کر عبادت کی جاتی ہو اور چونکہ اس میں مظنۂ شرک تھا، اسی لئے اسے ممنوع قرار دیا گیا ہو، اس کے بعد حضرت ابراہیم سے براہ راست اَن دیکھے خدا کی عبادت کا طریقہ رائج ہوا۔

اگر ہم دنیا کے بڑے مذاہب کا ان کے جو اخلاقی، فلسفیانہ، عباداتی اور روحانی پہلو ہیں اس لحاظ سے مطالعہ کریں، تو ہمیں ان میں ارتقاء کے جو اعلیٰ درجات ہیں، ان تک انسان کے پہنچنے کے لئے جو نہایت ہی ضروری اور لابدی ذرائع ہیں۔ ان کے بارے میں عظیم صداقتیں اور اہم خیالات ملیں گے۔ جو کہ باقیات صالحات ہیں ان پیغامات کی جو وقتاً فوقتاً انسانیت کو دیئے گئے ہیں۔ ان عظیم پیغامات کی ایک جھلک ان مذاہب کے ادب اور ان کی تعلیمات کے مطالعہ میں آپ کو مل سکے گی، جو یہ ہیں۔ ہندو مت۔ بدھ مت، زرتشتیت، کنفیوشینزم، ٹاؤازم، یہودیت، عیسائیت، اور اسلام۔

یہ آٹھ مذاہب دنیا میں عظیم ادب، عظیم فن اور عظیم موسیقی کے سب سے بڑے سرچشمہ رہے ہیں۔ اور جب آپ ان کا جائزہ لیں۔ اور ان کا باہم مقابلہ کریں تو یہ حیرت انگیز حقیقت واشگاف ہوگی کہ جہاں ان میں کئی ایک معمولی اور بعض اوقات کئی بڑے امور میں وسیع اختلافات پائے جاتے ہیں، وہاں ان میں انسان کے خدا تک پہنچنے نیز خدا کی صفات کے متعلق، خواہ اس کی اپنی ذات کے بارے میں خواہ اپنی مخلوقات سے اس کے تعلق کے بارے ہیں، جو وسیع تر اصول ہیں، وہ ان سب مذاہب میں آپس میں ملتے ہیں، اور اگر وہ مختلف بھی ہیں تو ان میں تضاد نہیں، بلکہ ہم آہنگی ہے گویا جس طرح ایک ہی سورج کی روشنی مختلف رنگوں کے شیشوں کی کھڑکیوں میں منعکس ہوتی ہے، اسی طرح ایک خدا کے بارے میں ایک ہی حقیقت مختلف دماغوں کے مختلف شیشوں کے ذریعہ دنیا میں منعکس ہوئی ہے۔ [1]

شاہ ولی اللہ صاحب کی مشہور کتاب حجۃ اللہ البالغہ کے ایک باب کا عنوان ہے:۔ "تمام مذاہب و ادیان کی اصل ایک ہے۔ شرائع، مناہج، طریقے مختلف ہیں"۔ اس باب میں وہ لکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ شرع لکم من الدین ما وصی بہ نوحا والذی اوحینا الیک او وصینا بہ ابراھیم وموسیٰ وعیسیٰ ان اقیموا الدین ولا تتفرقوا (اس نے تمہارے لئے دین کا وہ راستہ ٹھہرایا ہے، جس پر چلنے کا اس نے نوح کو حکم دیا تھا۔ اور اے پیغمبر! تمہاری طرف

---

[1] The Divine Universe by H. N. Spalding P P 1-2

بھی ہم نے اسی راستہ کی وحی کی ہے اور اسی کا ہم نے ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو حکم دیا تھا کہ اسی دین کو قائم کرنا اور اس میں تفرقہ نہ ڈالنا) حضرت مجاہد نے اس آیت کی تفسیر اور معنی یہ کئے ہیں کہ اے محمدؐ! ہم نے تم کو اور ان کو ایک ہی دین کی وصیت کی ہے۔

" اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وان ھٰذہٖ امتکم امۃ واحدۃ وانا ربکم فاتقون۔ فتقطعوا امرھم بینھم زبراً کل حزب بما لدیھم فرحون (اور یہ تمہاری امت ایک امت ہے اور میں تمہارا رب ہے۔ تو تم مجھ سے ڈرتے رہو۔ پھر لوگوں نے آپس میں پھوٹ ڈالکر اپنا اپنا دین جدا کرلیا۔ اور جو دین جس فرقے کے پاس ہے وہ اسی سے خوش ہے) یعنی تمہاری ملت اور تمہارا دین و ملّت اسلام ہے اور مشرکین، یہود اور نصاریٰ نے اس میں پھوٹ ڈال دی۔

" اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ لکلٍ جعلنا منکم شرعۃ ومنھاجا (اور ہم نے وقتاً فوقتاً تم میں سے ہر ایک کے لئے ایک شریعت اور طریقہ خاص ٹھہرایا) اس آیت کی تفسیر میں حضرت ابن عباس فرماتے ہیں شریعت اور منہاج کے معنی راہ اور طریقے کہیں۔

" اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ لکل امۃ جعلنا منسکاً ھم ناسکوہ (ہم نے ہر ایک امت کے لئے عبادت کے طریقے قرار دیئے کہ اُن پر چلتے رہیں"

اس کے بعد شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں :" معلوم ہونا چاہیئے کہ اصل دین ایک ہے اور تمام انبیائے کرام اس پر متفق ہیں۔ تمام انبیائے کرام کا اتفاق ہے کہ خدا کو ایک مانا جائے، اس کی عبادت کی جائے ۔۔۔ قیامت حق ہے، مرنے کے بعد زندہ ہونا حق ہے ۔۔۔۔ اسی طرح تمام انبیائے کرام بر یعنی نیکی کے اصولی اقسام پر بھی متفق ہیں ۔۔۔ اور اسی طرح تمام انبیائے کرام نکاح کی ضرورت، زنا کی حرمت عدل و انصاف قائم کرنے، ظلم و جور کی حرمت ۔۔۔۔۔ پر متفق ہیں۔

" یہ امور ان لوگوں کے نزدیک جو قرآن کے مخاطب تھے۔ بطور مسلمات کے تھے اور اگر اختلاف تھا تو صرف ان امور کی صورتوں اور شکلوں میں تھا ۔۔۔ حاصل کلام یہ کہ وہ خاص خاص صورتیں اور مخصوص ہیئتیں جو مختلف قسم کی نیکیوں اور تدبیر منزل و معاشی اور امور معاشرت کی [illegible]

صید گیرے کو بدام اندر کشید
طائرے کز بوستانِ ما پرید

اور آخر میں فرماتے ہیں :-

ضبط کن تاریخ را پائندہ شو
از نفسہائے رمیدہ زندہ شو

اگر محکمۂ اوقاف مغربی پاکستان موجودہ اور آئندہ نسلوں کو ان کی ملی تاریخ کے تابناک اوراق اور پائیدار نقوشِ عظمت سے متعارف کرانے میں اس طرح کامیاب ہو جائے تو یہ اس کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہوگا، اور قومی تعمیر میں اس کی خدمات ہمیشہ یادگار رہیں گی۔

ہم بڑی مسرت سے یہ اطلاع دیتے ہیں کہ پروفیسر غلام حسین جلبانی صدر شعبۂ عربی سندھ یونیورسٹی اور شاہ ولی اللہ اکیڈمی کے بورڈ آف ڈائرکٹرز کے رکن نے اپنی کتاب "شاہ ولی اللہ کی تعلیم" کا انگریزی ترجمہ مکمل کر لیا ہے، اور اب وہ اس کی نظر ثانی کر رہے ہیں۔ امید ہے ہم بہت جلد حضرت شاہ ولی اللہ پر انگریزی زبان میں ایک ایسی کتاب جو اجمالی طور سے ان کی تعلیمات کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہوگی، شائع کر سکیں گے۔ پروفیسر جلبانی صاحب کی یہ کتاب سندھی اور اردو میں پہلے شائع ہو چکی ہے۔ اس کا انگریزی ترجمہ ان حضرات کے لئے جو ان دونوں زبانوں سے ناواقف ہیں، حضرت شاہ صاحب کی تعلیمات کو سمجھنے میں بڑی مدد دے گا۔

اکیڈمی کے بورڈ آف ڈائرکٹرز کے اجلاس منعقدہ ۱۵ اگست میں یہ فیصلہ بھی کیا گیا ہے کہ اکیڈمی کے زیر اہتمام الرحیم کا سندھی میں ایک سہ ماہی ایڈیشن نکالا جائے، جس میں اردو ایڈیشن کی طرح حکمت ولی اللہی اور دوسرے اسلامی مسائل پر مضامین ہوں گے۔

شاہ ولی اللہؒ – تاریخی پس منظر

خاندانی حالات

شاہ ولی اللہ اپنے بزرگوں کے ذکر میں لکھتے ہیں: "یہ یقینی بات ہے کہ ہمارے اجداد عظام میں سب سے بیشتر حضرت شیخ شمس الدین مفتی ہندوستان تشریف لائے۔ اور انہوں نے قصبہ رہتک میں سکونت اختیار کی"۔ رہتک دہلی سے کوئی تیس میل دور ہے۔ اور اس زمانے میں یہ بڑا آباد شہر تھا۔ شیخ شمس الدین ایک بزرگ شیر ملک کے بیٹے اور محمد عطا ملک کے پوتے تھے جن کے زیادہ حالات نہیں ملتے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ شیخ موصوف نے رہتک میں اپنا ایک مدرسہ قائم کیا تھا۔ ان کے پرپوتے شیخ عبد الملک کے عہد میں قضاء احتساب اور افتاء کے عہدے اس خاندان میں موروثی کر دیئے گئے۔ چنانچہ شیخ عبد الملک کے بعد ان کے صاحبزادے قاضی بدھا اس منصب پر فائز ہوئے۔ انہیں قاضی بدھا کی اولاد میں سے شیخ محمود تھے جنہوں نے منصبِ قضا ترک کر کے "اعمال سلطانیہ" اختیار کر لئے۔ اور یہ فیصلہ کیا کہ موجودہ حالات میں زندگی بسر کرنے سے سپاہیانہ زندگی اچھی اور انسب و اولیٰ ہے۔" شیخ محمود کے صاحبزادے شیخ احمد تھے۔ جن کی تربیت شیخ عبد الغنی بن شیخ عبد الحکیم نے کی، جو رہتک میں نہیں بلکہ سونی پت میں رہتے تھے۔ شیخ احمد کے بیٹے شیخ منصور کی شادی بھی اپنے ننہیال میں ہوئی اور اسی طرح ان دونوں خاندانوں کا سلسلہ اکٹھا ہو گیا۔

یہ شیخ عبد الغنی بن شیخ عبد الحکیم جلال الدین اکبر کے دور میں تھے، اور بادشاہ ان کی بڑی عزت کرتا تھا۔ آپ نے راجپوتانہ کے قلعہ چتوڑ کی فتح کی پیش گوئی کی تھی چنانچہ چند ہی روز گزرے تھے کہ چتوڑ کی فتح اسی اسلوب و طریقہ پر بادشاہ کی

---

[1] اس حصۂ مضمون کی ترتیب میں زیادہ تر حیات ولی از مولانا محمد رحیم بخش دہلوی سے مدد لی گئی ہے۔ — مدیر

اور آخر میں فر

اگر حکمت اوقات
اوراق اور پائیدار نقو
کا ایک بہت

ہم بڑی مسرت ... بیغلا

شاہ ولی اللہ اکیڈمی کے بورڈ آف ڈائرکٹرز کے رکن نے اپنی کتاب
اور اب وہ اس کی نظر ثانی کر رہے ہیں۔ امید ہے ہم بہت جلد حضرت شاہ ... کتاب
جو اجمالی طور سے ان کی تعلیمات کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہوگی، شائع کر سکیں گے۔ پروفیسر جلبانی صاحب کی یہ
کتاب سندھی اور اردو میں پہلے شائع ہو چکی ہے۔ اس کا انگریزی ترجمہ ان حضرات کے لئے جو ان دونوں زبانوں سے
ناواقف ہیں، حضرت شاہ صاحب کی تعلیمات کو سمجھنے میں بڑی مدد دے گا۔

اکیڈمی کے بورڈ آف ڈائرکٹرز کے اجلاس منعقدہ ۵ اگست میں یہ فیصلہ بھی کیا گیا ہے کہ اکیڈمی
کے زیر اہتمام الرحیم کا سندھی میں ایک سہ ماہی ایڈیشن نکالا جائے، جس میں اردو ایڈیشن کی طرح
حکمت ولی اللہی اور دوسرے اسلامی مسائل پر مضامین ہوں گے۔

تاریخی پس منظر

خاندانی حالات

ولی اللہ اپنے بزرگوں کے ذکر میں لکھتے ہیں: "یہ یقینی بات ہے کہ ہمارے اجدادِ عظام میں سب سے پیشتر
[illegible]س الدین مفتی ہندوستان تشریف لائے۔ اور انہوں نے قصبہ رہتک میں سکونت اختیار کی۔" رہتک دہلی سے کوئی
[illegible] ہے۔ اور اُس زمانے میں یہ بڑا آباد شہر تھا۔ شیخ شمس الدین ایک بزرگ شیر ملک کے بیٹے اور محمد عطا ملک کے
[illegible] جن کے زیادہ حالات نہیں ملتے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ شیخ موصوف نے رہتک میں اپنا ایک مدرسہ قائم کیا تھا۔ ان
کے پرپوتے شیخ عبدالملک کے عہد میں قضاء، احتساب اور افتاء کے عہدے اس خاندان میں موروثی کر دیئے گئے۔ چنانچہ شیخ
عبدالملک کے بعد ان کے صاحبزادے قاضی بدھا اس منصب پر فائز ہوئے۔ انہیں قاضی بدھا کی اولاد میں سے شیخ محمود تھے
جنہوں نے منصبِ قضا ترک کر کے "اعمالِ سلطانیہ" اختیار کر لئے۔ اور یہ فیصلہ کیا کہ "موجودہ حالات میں زندگی بسر کرنے
سے سپاہیانہ زندگی اچھی اور انسب و اولیٰ ہے۔" شیخ محمود کے صاحبزادے شیخ احمد تھے۔ جن کی تربیت شیخ عبدالغنی
بن شیخ عبدالحکیم نے کی، جو رہتک میں نہیں بلکہ سونی پت میں رہتے تھے۔ شیخ احمد کے بیٹے شیخ منصور کی شادی بھی اپنے
ننھیال میں ہوئی اور اسی طرح ان دونوں خاندانوں کا سلسلہ اکٹھا ہو گیا۔

یہ شیخ عبدالغنی بن شیخ عبدالحکیم جلال الدین اکبر کے دور میں تھے، اور بادشاہ ان کی بڑی عزت کرتا تھا۔ آپ نے
راجپوتانہ کے قلعہ چتوڑ کی فتح [illegible] تھے کہ چتوڑ کی فتح اسی اسلوب و طریقہ پر بادشاہ کی

سلہ اس حصہ مضمون کی [illegible] مولانا [illegible] رحیم بخش دہلوی سے مدد لی گئی ہے۔ مدیر

صید گیرے کو بدام اندر کشید
طائرے کز بوستانِ ما پرید

اور آخر میں فرماتے ہیں :-

ضبط کن تاریخ را پائندہ شو
از نفسہائے رمیدہ زندہ شو

اگر محکمۂ اوقاف مغربی پاکستان موجودہ اور آئندہ نسلوں کو ان کی ملی تاریخ کے تابناک اوراق اور پائیدار نقوشِ عظمت سے متعارف کرانے میں اس طرح کامیاب ہو جائے تو یہ اس کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہوگا، اور قومی تعمیر میں اس کی خدمات ہمیشہ یادگار رہیں گی۔

ہم بڑی مسرت سے یہ اطلاع دیتے ہیں کہ پروفیسر غلام حسین جلبانی صدر شعبۂ عربی سندھ یونیورسٹی اور شاہ ولی اللہ اکیڈمی کے بورڈ آف ڈائرکٹرز کے رکن نے اپنی کتاب "شاہ ولی اللہ کی تعلیم" کا انگریزی ترجمہ مکمل کر لیا ہے، اور اب وہ اس کی نظرِ ثانی کر رہے ہیں۔ امید ہے ہم بہت جلد حضرت شاہ ولی اللہ پر انگریزی زبان میں ایک ایسی کتاب جو اجمالی طور سے ان کی تعلیمات کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہوگی، شائع کر سکیں گے۔ پروفیسر جلبانی صاحب کی یہ کتاب سندھی اور اردو میں پہلے شائع ہو چکی ہے۔ اس کا انگریزی ترجمہ ان حضرات کے لئے جو ان دونوں زبانوں سے ناواقف ہیں، حضرت شاہ صاحب کی تعلیمات کو سمجھنے میں بڑی مدد دے گا۔

اکیڈمی کے بورڈ آف ڈائرکٹرز کے اجلاس منعقدہ ۱۵ اگست میں یہ فیصلہ بھی کیا گیا ہے کہ اکیڈمی کے زیرِ اہتمام الرحیم کا سندھی میں ایک سہ ماہی ایڈیشن نکالا جائے، جس میں اردو ایڈیشن کی طرح حکمتِ ولی اللہی اور دوسرے اسلامی مسائل پر مضامین ہوں گے۔

شاہ ولی اللہؒ ــ تاریخی پس منظر

خاندانی حالات

شاہ ولی اللہ اپنے بزرگوں کے ذکر میں لکھتے ہیں:۔ "یہ یقینی بات ہے کہ ہمارے اجداد عظام میں سب سے پیشتر حضرت شیخ شمس الدین مفتی ہندوستان تشریف لائے۔ اور انہوں نے قصبہ رہتک میں سکونت اختیار کی۔" رہتک دہلی سے کوئی تیس میل دور ہے۔ اور اس زمانے میں یہ بڑا آباد شہر تھا۔ شیخ شمس الدین ایک بزرگ شیر ملک کے بیٹے[1] اور محمد عطا ملک کے پوتے تھے۔ جن کے زیادہ حالات نہیں ملتے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ شیخ موصوف نے رہتک میں اپنا ایک مدرسہ قائم کیا تھا۔ ان کے پرپوتے شیخ عبدالملک کے عہد میں قضا و احتساب اور افتاء کے عہدے اس خاندان میں موروثی کر دیئے گئے۔ چنانچہ شیخ عبدالملک کے بعد ان کے صاحبزادے قاضی بدھا اس منصب پر فائز ہوئے۔ انہیں قاضی بدھا کی اولاد میں سے شیخ محمود تھے جنہوں نے منصبِ قضا ترک کر کے "اعمال سلطانیہ" اختیار کر لئے۔ اور یہ فیصلہ کیا کہ "موجودہ حالات میں زندگی بسر کرنے سے سپاہیانہ زندگی اچھی اور انسب و اولیٰ ہے۔" شیخ محمود کے صاحبزادے شیخ احمد تھے۔ جن کی تربیت شیخ عبدالغنی بن شیخ عبدالحکیم نے کی، جو رہتک میں نہیں بلکہ سونی پت میں رہتے تھے۔ شیخ احمد کے بیٹے شیخ منصور کی شادی بھی اپنے ننہیال میں ہوئی اور اسی طرح ان دونوں خاندانوں کا سلسلہ اکٹھا ہو گیا۔

یہ شیخ عبدالغنی بن شیخ عبدالحکیم جلال الدین اکبر کے دور میں تھے، اور بادشاہ ان کی بڑی عزت کرتا تھا۔ آپ نے راجپوتانہ کے قلعہ چتوڑ کی فتح کی پیش گوئی کی تھی چنانچہ چند ہی روز گزرے تھے کہ چتوڑ کی فتح اسی اسلوب و طریقہ پر بادشاہ کی

---

[1] اس حصۂ مضمون کی ترتیب میں زیادہ تر حیات ولی از مولانا محمد رحیم بخش دہلوی سے مدد لی گئی ہے۔ مدیر

خدمت میں معروض ہوئی، جیسا کہ جناب شیخ عبدالغنی صاحب نے بیان فرمایا تھا۔ اس پر بادشاہ بہت خوش ہوا۔ اور اپنی فیاضانہ ہمت سے باو وسیع گاؤں جناب امام ناصرالدین شہید کے مزار کی نذر کر دیئے اور شیخ عبدالغنی کے نام ایک شاہی فرمان جاری ہوا۔ کہ ان قصبات کی سالانہ آمدنی آپ کی تفویض میں ہمیشہ رہے گی۔"

انہیں شیخ عبدالغنی صاحب کے متعلق "حیات ولی" میں ایک اور واقعہ منقول ہے:-

"خواجہ محمد ہاشم کشمی شیخ مجدد یعنی حضرت شیخ احمد صاحب سرہندی قدس سرہ سے ناقل ہے کہ شیخ مجدد فرماتے ہیں۔ ہمارے والد بزرگوار ایک مدت تک جناب شیخ عبدالغنی صاحب کی ملاقات کے جویاں رہے جو شہر سونی پت کے ایک کامل درویش اور مشہور و معروف بزرگ تھے۔ ہمارے والد بزرگوار کو آپ سے نیاز حاصل کرنے اور خدمت میں حاضر ہونے کا اس لحاظ سے اور بھی بے تابانہ شوق تھا کہ انہیں کسی معتبر ذریعہ سے معلوم ہو گیا تھا کہ شیخ عبدالغنی صاحب اپنے بزرگ و محترم پیر کا ایک خاص راز مضمر رکھتے ہیں۔"

شیخ منصور جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، ان کے ہاں شیخ عبدالغنی صاحب کی پوتی سے دو صاحبزادے ہوئے ایک شیخ معظم اور دوسرے شیخ اعظم۔ شیخ معظم کے بیٹے شیخ وجیہ الدین تھے، جو شیخ عبدالرحیم کے والد بزرگوار ہیں، جن کے ہاں ۱۱۱۴ھ میں حضرت شاہ ولی اللہ پیدا ہوئے تھے۔ شیخ معظم کے حالات میں صاحب "حیات ولی" لکھتے ہیں:-

"جب شیخ معظم علمی تحصیل سے فارغ ہوئے تو آپ کی طبیعت بے اختیارانہ جوش کے ساتھ سپاہیانہ فنون کی تحصیل اور تحصیل کے ساتھ تکمیل کی طرف دوڑی۔ گو آپ کی طرز معاشرت بالکل درویشانہ اور عالمانہ تھی، لیکن آپ کی پر شوق اور تیز نظریں اس لاجواب اور عدیم المثال شجاعت کی طرف بڑی شتابی کے ساتھ اٹھ رہی تھیں، جو زمانہ سابق میں اسلام اور بانیان اسلام کے حق میں فطرت کی عام بخششیں سمجھی گئی تھیں۔ . . ."

"شیخ معظم کے والد بزرگوار شیخ منصور بھی بہت بڑے شجاع اور دلیر تھے۔"

شیخ عبدالرحیم (والد شاہ ولی اللہ) نے اپنے دادا شیخ معظم اور پردادا شیخ منصور کی بہادری کے بہت سے واقعات ذکر کئے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ اپنے والد شیخ وجیہ الدین کا ذکر کرتے ہیں فرماتے ہیں۔ میرے واجب الاحترام والد نہایت محتاط اور متورع آدمی ہیں۔ چونکہ آپ کا قالب بالکل سپاہیانہ تھا اور آپ فطرتاً چاق و چوبند تھے، اس لئے شمشیر زنی اور اپنی بے خوف شجاعت کے جوہر ظاہر کرنے کا آپ کو زیادہ شوق تھا

یہی وجہ تھی کہ آپ ابتدائی زمانے سے سلطنت مغلیہ کی فوج میں بھرتی ہوگئے تھے۔ اور اپنے کارہائے نمایاں کے صلے میں کوئی بڑا اور معزز فوجی عہدہ رکھتے تھے۔۔۔ اس وقت شاہجہاں بادشاہ تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہوا۔ شیخ عبدالرحیم نے بعض ان معرکوں کا ذکر کیا ہے جن میں شیخ وجیہ الدین نے اپنی شجاعت و جرأت کے جوہر دکھائے تھے۔

عالمگیر کی تخت نشینی پر جب اس میں اور اس کے بھائی شاہ شجاع میں موضع کھجوہ پر خونریز جنگ ہوئی تھی، تو اس میں شیخ وجیہہ الدین اورنگ زیب عالمگیر کی طرف تھے ان کی بہادری کی بدولت جنگ کا ایک اہم مورچہ سر ہوا تھا، جس کی تفصیل "حیات ولی" میں یوں ہے۔

لڑائی کے دوسرے دن شاہ شجاع نے دو تین کوہ پیکر مست ہاتھی عالمگیر کے لشکر کی طرف دھکیل دیئے۔ جن کے پیچھے زرہ پوش سپاہی تھے۔ شاہ شجاع کا یہ حملہ بڑا کامیاب رہا اور عالمگیر کی فوج میں بھگدڑ مچ گئی۔ شیخ وجیہہ الدین نے اپنے مورچے پر کھڑے جو یہ صورت حال دیکھی۔ تو اپنے ساتھیوں کو لے کر ہاتھیوں کی طرف بڑھے اور سب سے پہلے اس ہاتھی پر حملہ کیا، جو سب سے سرکش تھا، ہاتھی نے سونڈ بڑھا کر آپ کو اپنی گرفت میں لینا چاہا آپ نے تلوار کا ایک وار کیا، جس سے اس کی سونڈ کٹ گئی اور وہ چنگھاڑتا ہوا پیچھے کی طرف بھاگا۔ اس کا بھاگنا تھا کہ زرہ پوشوں کے پاؤں اکھڑ گئے۔ اور شاہ شجاع کے لشکر کو شکست ہوگئی۔

عالمگیر نے اس فتح کی خوشی میں ایک شاندار جلسہ کیا اور چونکہ وہ عین معرکہ میں جناب شیخ وجیہہ الدین صاحب کی بہادرانہ کوشش اور وفادارانہ جوش کو اپنی آنکھ سے دیکھ چکا تھا اس لئے اس نے آپ کو بہت انعامات دیئے اور خود اپنے ہاتھ سے آپ کی کمر میں تلوار باندھی۔

شاید سیواجی کا زمانہ تھا، شیخ وجیہہ الدین دکن جارہے تھے کہ راستے میں راہزنوں سے مٹھ بھیڑ ہوگئی۔ جس میں آپ شہید ہوگئے۔

شیخ وجیہہ الدین کی شادی شیخ رفیع الدین محمدؒ کی صاحبزادی سے ہوئی تھی جو ایک مشہور خانوادۂ طریقت سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد شیخ قطب العالم اور دادا شیخ عبدالعزیز دہلوی البحر المواج عرف شکر بار تھے۔ مولانا عبیداللہ سندھی مرحومؒ "امام ولی اللہ کی حکمت کا اجمالی تعارف" میں لکھتے ہیں:۔ "چشتی طریقے میں حضرت

شیخ عبدالعزیز دہلوی متوفی ۹۷۵ھ ایک بہت بڑے عالم، عارف اور متشرع بزرگ گزرے ہیں۔ آپ کی تصنیفات میں ایک رسالہ "عینیہ" ہے جو موصوف نے شیخ امان پانی پتی کے رسالہ "غیریہ" کے جواب میں لکھا تھا۔ اور اس میں آپ نے وحدت الوجود کے بعض عمیق مسائل کو اپنے کشفی رنگ میں پیش فرمایا ہے حضرت شیخ عبدالعزیز البحر المواج کے والد شیخ حسن[1] بن طاہر متوفی ۹۰۹ھ سلطان سکندر لودھی کے زمانے میں دہلی آ بسے تھے۔ آپ کے پوتے شیخ رفیع الدین بن قطب العالم خواجہ باقی باللہ کے خواص اصحاب میں سے تھے۔ آپ شیخ وجیہ الدین کے خسر اور شیخ عبدالرحیم کے نانا تھے ... مشہور ہے کہ جس طرح مغلیہ خاندان میں سلطنت سلسلہ بہ سلسلہ چلتی رہی، اسی طرح علم و عرفان شیخ عبدالعزیز کی اولاد میں شاہ ولی اللہ تک اور شاہ ولی اللہ سے ان کی اولاد تک جاری رہا۔

شیخ عبدالرحیم جنہیں ہم آیندہ شاہ عبدالرحیم لکھیں گے شیخ وجیہ الدین کے صاحبزادے اور شیخ رفیع الدین بن قطب العالم کے نواسے تھے۔ ان کی شادی ایک صاحب کرامات بزرگ حضرت شیخ محمد پھلتی کی صاحبزادی سے ہوئی شیخ محمد کا بڑا پرانا نامور خاندان تھا۔ ان کے بزرگوں میں سے ایک شیخ احمد تھے جو سلطان سکندر کے دربار میں پہنچے اور چند ہی روز میں اپنی بے نظیر قابلیت سے شاہی دربار میں وہ اعزاز و اعتبار پیدا کر لیا کہ سلطنت کی طرف سے چند قریے آپ کو مدد معاش کے لئے نسلاً بعد نسل عنایت ہوگئے۔ اور یہ خاندان دہلی کے نواح پھلت میں آباد ہوگیا۔

شاہ عبدالرحیم سے بڑے ان کے بھائی شاہ ابوالرضا محمد تھے۔ ایک بھائی اور بھی تھے لیکن ان کے حالات نہیں ملتے۔ شاہ عبدالرحیم تقریباً ۱۰۵۴ھ میں پیدا ہوئے اور ۷۷ برس کی عمر پاکر ۱۱۳۱ھ میں آپ نے انتقال فرمایا۔ جب آپ پیدا ہوئے، تو آپ کے والد بزرگوار شیخ وجیہ الدین سلطنت کے ایک معزز عہدے پر فائز تھے۔

---

[1] شیخ حسن بن طاہر ملتان میں پیدا ہوئے۔ ملتان میں آپ کا خاندان بڑا واجب الاحترام تھا۔ تحصیل علم کے لئے آپ تھانیسر آئے اور وہاں سے بہار کا رخ کیا۔ بہار کے قاضی نے اپنی لڑکی آپ کے عقد میں دی۔ آخر میں آپ سب خاندان جونپور آ گئے۔ آپ کے صاحبزادے شیخ حسن جو بہت بلند پایہ عالم تھے۔ دہلی آ گئے سلطان سکندر آپ کا بڑا معتقد تھا۔ علم سلوک میں آپ کی کتاب "مفتاح الفیض" بڑی مشہور ہے۔ (ملخص از حیات دہلی)

اور ظاہر ہے دولت و ثروت کی فراوانی تھی۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ میرے ماموں شیخ عبدالحی ایک نہایت صالح اور خدا ترس بزرگ تھے اور اہل دنیا سے طبعی نفرت رکھتے تھے بد قسمتی سے اپنی اولاد ان کی توقعات کے مطابق نہ نکلی ایک دفعہ انہوں نے مجھے بچپن میں پورے سُنن و آداب کے ساتھ وضو کرتے دیکھا۔ تو بڑے خوش ہوئے اور فرمانے لگے کہ میں ہمیشہ ڈرتا تھا کہ ہمارے اسلاف کا سِتر ہماری اولاد سے منقطع ہو جائے گا، لیکن اب مجھے قطعی طور سے معلوم ہو گیا کہ اس سِتر کا حامل ہمارے خاندان میں موجود ہے گو اپنی نسل میں نہ سہی بہن کی نسل میں موجود ہے

صاحب "حیات ولی" لکھتے ہیں:- جب آپ کا نواں یا دسواں سال شروع تھا تو شرح عقائد اور حاشیہ خیالی پڑھتے تھے۔ اور معقول کی اکثر کتابیں نکال چکے تھے جس زمانے میں اورنگ زیب اکبرآباد (آگرہ) میں جلوس فرما تھا۔ آپ کے والد بزرگوار شیخ وجیہ الدین صاحب بھی وہاں موجود تھے۔ اور اس تقریب سے آپ اکبرآباد میں میرزا محمد زاہد ہروی سے تعلیم پاتے رہے۔ ابتدائی رسائل سے شرح عقائد و حاشیہ خیالی تک تو آپ نے اپنے برادر کلاں شیخ ابوالرضا محمد سے نکالے اور شرح مواقف اور تمام کتب کلامیہ و اصولیہ میرزا زاہد ہروی سے پڑھیں۔ شاہ ولی اللہ اپنے والد کے ذکر میں فرماتے ہیں "اس نیلگوں آسمان کے نیچے جناب شیخ عبدالرحیم سے زیادہ فن حدیث میں طاق اس عہد میں کوئی نہ تھا۔۔۔ میں نے ان جیسا ایک شخص بھی نہیں دیکھا، جو تمام علوم میں عموماً اور حدیث اور فقہ میں خصوصاً تبحر رکھتا ہو۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے بعد آپ جیسے محدث و مفسر، فقیہہ کو ہندوستان کی گود میں پرورش پانا بہت کم نصیب ہوا ہوگا۔"

شاہ عبدالرحیم نے میرزا محمد زاہد ہروی اور خواجہ خرد بن خواجہ باقی اللہ کے علاوہ کئی اور بزرگوں سے بھی استفادہ کیا۔ جن میں خلیفہ ابوالقاسم اکبرآبادی خاص طور سے ممتاز ہیں۔ ان کی شہرت اگرچہ زیادہ تر تصوفی تحقیقات میں ہے لیکن حقیقت میں وہ تمام علوم میں اجتہاد کا درجہ رکھتے تھے۔ اور ہندوستان میں مجتہدینِ فن تسلیم کئے جاتے تھے۔ شاہ صاحب کے ایک اور استاد عبداللہ تھے، جو اس قدر خوش الحانی سے قرآن پڑھتے تھے کہ سننے والوں پر محویت طاری ہو جاتی تھی۔ یہ عالم کے ساتھ بڑے عارف بھی تھے۔ شاہ عبدالرحیم فرماتے ہیں کہ جب خلیفہ ابوالقاسم صاحب نے مجھے تکمیل و ارشاد کی اجازت سے سرفراز فرمایا، تو ایک دعوت کا انتظام کیا۔ اور اس میں اپنے مریدوں اور جاننے والوں کو مدعو کیا

آپ نے فقیر کو طلب فرمایا۔ میرے سر پر دستار باندھی ایک اجازت نامہ لکھکر دیا۔ اور مجھے طالبان حق کی رہنمائی اور دینی علوم کی اشاعت و درس کی اجازت دی اور یہ بھی فرمایا کہ اب اگر تم مناسب سمجھو تو دہلی میں جاکر رہو اور وہاں کے باشندوں میں دینیات کی اشاعت کرو۔ شاہ عبدالرحیم صاحب نے چند دن اور اکبرآباد (آگرہ) میں اپنے اُستاد کے قدموں میں رہنا پسند کیا۔ اور ان کی ہدایت کے مطابق بعض بزرگوں سے ملتے رہے [1]

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے، شاہ عبدالرحیم کے بزرگوں کا منصب و شغلہ ابتدا میں تعلیم و تدریس اور قضا و افتاء کا تھا۔ البتہ بعد میں انہوں نے فوجی زندگی اختیار کرلی تھی۔ شاہ عبدالرحیم نے پھر درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ صاحب حیات ولیؒ لکھتے ہیں "شاہ عبدالرحیم نے مدرسہ رحیمیہ کی بنیاد ڈالی۔ اور اس میں علم حدیث کی تعلیم دینی شروع کی" مولانا عبیداللہ سندھی نے لکھا ہے کہ شاہ ولی اللہ اور ان کے والد کے زمانے

---

[1] خلیفہ ابوالقاسم کے ارشاد پر شاہ عبدالرحیم نے شاہ عظمت اللہ نامی بزرگ کے ہاں حاضری دی، جو سلسلہ چشتیہ کے ایک معمر بزرگ تھے، اور آگرہ میں رہتے تھے۔ وہ بیمار تھے، اور پلنگ پر لیٹے لیٹے شاہ صاحب سے باتیں کرتے رہے۔ دوران گفتگو میں جیسے ہی شاہ صاحب نے اپنا خاندانی تعلق شیخ عبدالعزیز شکر بار سے ظاہر کیا آپ فوراً پلنگ سے نیچے اترے اور شاہ صاحب کو گلے سے لگالیا اور ایک سوال پوچھا۔ اس کے بعد کہا کہ میرے دادا کو شیخ عبدالعزیز شکر بار نے کچھ تبرکات دیئے تھے، اور فرمایا تھا کہ میری اولاد میں سے اگر کوئی آئے تو اسے یہ تبرکات دے دینا۔ چنانچہ آپ نے شاہ صاحب کے سر پر عمامہ باندھا اور اپنے طریقے کی اجازت دی۔ جب چلنے لگے تو مٹھائی اور نقد روپے بھی ساتھ کر دیئے۔ شاہ صاحب نے واپس آکر اپنے مرشد خلیفہ ابوالقاسم کی خدمت میں سب ماجرا بیان کیا انہوں نے شاہ عبدالرحیم کو یہ بشارت دی ــ روپیہ تو ظاہر حال کے اطمینان اور فارغ البالی کی طرف اشارہ ہے اور عمامہ باطنی اطمینان اور اجازت کا اشارہ ہے۔" شاہ عبدالرحیم کا بیان ہے کہ اس بشارت کے بعد معاشی پراگندگی کا سوال ان کی زندگی میں سرے سے کبھی پیدا نہیں ہوا۔ "انفاس العارفین" اور بعض دوسری کتابوں میں شاہ عبدالرحیم کی جس صاف ستھری زندگی کا پتہ ملتا ہے اس کے پڑھنے سے دل کو راحت ہوتی ہے ــــ ملخص از تذکرہ شاہ ولی اللہ مصنفہ مولانا مناظر احسن گیلانی

میں فقہا اور مفسرین نے عوام مسلمانوں کی روزہ مرہ کی زندگی سے قرآنی تعلیمات کو بحیثیت مجموعی خارج کر دیا تھا۔ سب سے پہلے شاہ ولی اللہ صاحب کے والد شاہ عبدالرحیم نے ادھر توجہ کی اور اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے انہوں نے ایک بہت اچھا طریقہ اختیار کیا اس سے پہلے علمار کا یہ دستور تھا کہ پہلے تو وہ قرآن مجید کو محض تلاوت کی خاطر پڑھا دیتے۔ پھر اگر انہیں طالب علموں کو قرآن مجید کے مطالب و معانی کی تعلیم دینا مقصود ہوتی، تو جس فن سے خود انہیں دلچسپی ہوتی، اس فن کے نقطۂ نظر سے قرآن مجید کی تفسیر کی جو کتاب وہ مناسب سمجھتے طالب علموں کو پڑھاتے .... اس کے خلاف شاہ عبدالرحیم نے یہ کیا کہ قرآن کے متن پر زیادہ زور دیا، لیکن بجائے اس کے کہ متن قرآن محض تلاوت کی غرض سے پڑھا جاتا، یا کسی خاص فن کی تفسیر کے ذریعہ قرآن کے مطالب کو حل کرنے کی کوشش ہوتی۔ آپ یہ کرتے کہ قرآن کے متن کو شروع سے لیکر آخر تک بڑی تحقیق اور بصیرت کے ساتھ پڑھاتے۔ اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ قرآن کے جملہ مطالب اور معانی تک براہ راست طلبہ کی رسائی ہو جائے۔ اور وہ جان لیں کہ قرآن کا مجموعی طور پر کیا پیغام ہے۔ اس ضمن میں شاہ ولی اللہ اپنے والد بزرگوار کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں "آپ کی عادت یہ تھی کہ اپنے اصحاب کے حلقے میں ہر روز قرآن مجید کے دو یا تین رکوع پڑھتے اور اس پر نہایت تدبر کرتے اور ان کے معانی پر غور و خوض فرماتے" ایک اور جگہ شاہ ولی اللہ نے لکھا ہے "خدا تعالے نے مجھ ضعیف پر جو بڑے بڑے الطاف کئے ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مجھے چند بار والد بزرگوار سے تدبر معانی، شان نزول کے بیان اور تفاسیر میں مطالب کی تحقیق کے ساتھ قرآن عظیم کو پڑھنے کا موقع ملا۔ اس کی وجہ سے مجھ پر علم و عرفان کا ایک بڑا دروازہ کھل گیا۔" شاہ عبدالرحیم اپنے درس و تدریس میں "حکمت عملی" پر بہت زور دیا کرتے تھے۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا عبیداللہ سندھی لکھتے ہیں :-

اُس وقت حالت یہ تھی کہ عام متکلمین نے ارسطو کی نظری حکمت کو اپنا مطمح نظر بنا لیا تھا۔ اور ان کا سارا زور قیاس آرائیوں اور استدلالی بحثوں پر صرف ہوتا تھا۔ وہ عملی زندگی کی ضرورتوں سے بے خبر تھے اور "حکمت عملی" سے سروکار نہ رکھتے تھے لازمی طور پر اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ علم کلام میں دلچسپی لینے والے فقہا اور متکلمین قومی زندگی کی ضروریات میں تدبر اور تفکر سے محروم ہو گئے۔ شاہ ولی اللہ نے اپنے والد بزرگوار کے مذکورہ بالا رجحانِ فکری کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :- "حضرت شجاعت، فراست، کفایت، غیرت وغیرہ اخلاق سلیمہ میں

مہارت کامل رکھتے تھے۔ نیز دینی اور مابعد الطبیعاتی علوم میں ملکۂ کامل رکھنے کے ساتھ ساتھ آپ "عقل معاشی" سے کہ جس کے ذریعہ انسان زندگی کی معاشی اور اجتماعی ضرورتوں کو سمجھتا ہے پورے طور پر بہرہ ور تھے۔ آپ اپنی مجلس میں اکثر "حکمت عملی" اور کاروبار زندگی کے معاملات کے آداب کی تعلیم دیا کرتے تھے۔"

درس وتدریس کے ان مشاغل میں انہماک کی وجہ سے شاہ عبدالرحیم ملک و ملت کے عام امور سے بالکل بے تعلق نہیں ہو گئے تھے۔ کتاب "سیرت سید احمد شہید" کے مقدمہ میں مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے شاہ عبدالرحیم کے ذکر میں لکھا ہے کہ ان کے مکاتیب کا ایک نسخہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کے کتب خانے میں میری نظر سے گزرا ہے۔ اس میں ان کا خط نظام الملک آصف جاہ اول کے نام ہے، جس میں انہوں نے نواب مرحوم کو مرہٹوں سے جہاد کی ترغیب دی ہے۔ اور یوں بھی مولانا مناظر احسن گیلانی کے الفاظ میں "شاہ صاحب کا خاندانی تعلق جس قبیلہ اور نسل سے تھا علم وتصوف کے ساتھ اس خاندان کے لوگ فوجی کاروبار میں یگانہ روزگار تھے ۔۔۔ بلکہ شاہ عبدالرحیم سے پہلے تو شاہ صاحب کے خاندان میں علم وتصوف کی محض ثانوی حیثیت تھی اصلی کام اس خانوادہ کا جہاد ہی تھا۔ آپ (شاہ ولی اللہ) کے براہ راست جدِ امجد یعنی شیخ وجیہہ الدین کے واقعات تو خود شاہ صاحب (شاہ ولی اللہ) نے اپنی مختلف کتابوں میں درج کئے ہیں، جن کو سنکر حیرت ہوتی ہے" اس سے آگے مولانا گیلانی مرحوم فرماتے ہیں :- "اور کون کہہ سکتا ہے کہ دوسری ہی پشت میں حضرت شاہ صاحب کے گزرنے سے جو وہ مرد غازی مولانا اسمٰعیل شہید اٹھے، اور ایک مدت تک بجائے قلم کے تلوار کو کمر سے لگائے رہے۔ تا اینکہ اس راہ میں بالآخر جان عزیز بھی نذر کی، یہ شاہ صاحب کی کسی اندرونی تربیت کا نتیجہ نہ تھا جس کا رواج ان کے خاندان میں چلا آرہا تھا۔"

عام زندگی میں شاہ عبدالرحیم کا کیا مسلک تھا، مندرجہ ذیل سطور میں اس کا مختصراً ذکر کیا جاتا ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب فرماتے ہیں :- ایک بار والد بزرگوار نماز ظہر کے قریب [illegible] طرف متوجہ ہوئے اور یہ رباعی پڑھی۔

گر تو راہ حق بخواہی اے پسر [illegible]

طریقت [illegible]

یہ رباعی پڑھ کر فرمایا۔ ولی اللہ! یہ رباعی لکھ لو۔ حق تعالیٰ نے دفعۃً میرے دل میں اس مضمون کو بایں غرض القا فرمایا ہے کہ تمہیں وصیت کروں۔

شاہ عبدالرحیم صاحب جب احباب کو رخصت کیا کرتے، تو الوداع کہتے ہوئے یہ بیت پڑھا کرتے تھے۔

آسائشِ دو گیتی تفسیر ایں دو حرف است
با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

نیز فرماتے تھے کہ جو لوگ تم سے قدر و منزلت میں کم درجے پر ہوں، اگر وہ تمہیں سلام کرنے میں پہل کریں تو اسے خدا تعالیٰ کی ایک نعمت سمجھو اور ان سے نہایت خندہ پیشانی سے ملاقات کرو۔

صد ملک دل بہ نیم نگہ میتواں خرید
خوباں دریں معاملہ تقصیر میکنند

ایک دفعہ شاہ عبدالرحیم کے ایک معتقد نے سوال کیا کہ ابنائے روزگار کے ساتھ کس طرح زندگی بسر کرنی چاہیئے۔ فرمایا کُن فی الناس کاحدٍ من النّاس (لوگوں میں اس طرح رہو، جیسے تم ان میں سے ایک ہو) پھر اس نے دریافت کیا کہ حضرتِ حق تک پہنچنے کا کیا طریقہ ہے، فرمایا۔ رجالٌ لا تلھیھم تجارۃ ولا بیعٌ عن ذکر اللہ (وہ ایسے لوگ ہیں کہ نہ تو تجارت اور خرید و فروخت ہی انہیں ذکر اللہ سے غافل کرتی ہے)

شاہ عبدالرحیم کی ابتدائی تعلیم و تربیت میں ان کے بڑے بھائی شاہ ابوالرضا محمد کا بڑا حصہ ہے۔ "حیاتِ ولی" میں لکھا ہے۔ "ابتدا میں شاہ عبدالرحیم کی اتالیقی آپ ہی کے سپرد تھی۔ اگرچہ شاہ عبدالرحیم کی تعلیم پر دیگر ماہرین فن بھی چار سال کی عمر میں مقرر تھے۔۔۔ لیکن پوری پوری خدمتِ تربیت شیخ ابوالرضا محمد ہی کے ہاتھ میں تھی۔۔۔۔" "شوارق المعرفۃ" میں ہے کہ "شیخ ابوالرضا محمد متعدد علوم میں اعلیٰ درجہ کا کمال رکھتے تھے ... سے فطرت کی بخشش و عنایت سمجھنا چاہیئے کہ آپ کا ذہن و حافظہ اس بلا کا تھا کہ ایک ہی نظر میں مختلف علوم حاصل کر لئے [illegible]

خواجہ خرد کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے کمالات باطنی حاصل کئے۔

جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے، شاہ عبدالرحیم اور شاہ و شیخ ابوالرضا محمد کے والد بزرگوار شیخ وجیہ الدین عالمگیر کی فوج میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے لیکن ان کے دونوں صاحبزادے شاہی دربار سے بے تعلق رہے۔ اور درس و تدریس ہی کو اپنا مقصد حیات بنایا۔ شیخ ابوالرضا محمد کے متعلق "حیات دلی" میں لکھا ہے۔ اوّل اوّل اگرچہ آپ بصوابدید والد بزرگوار اس زمانے کے امراء سے ملتے جلتے تھے، اور شاہی دربار سے ایک معزز و ممتاز عہدہ بھی آپ کے لئے نامزد ہو گیا تھا۔ لیکن دفعتہً آپ کی فطری استعداد ظہور پذیر ہوئی اور آپ نے عزلت نشینی، تجرید تام، توکل کلی، ہر حال میں سنت نبوی پر عمل کرنا اختیار کیا۔ اور یک لخت اہلِ دنیا حتیٰ کہ عزیز و اقارب سے بھی ملنا ترک کر دیا۔

اوّل اوّل آپ طلباء کو ہر قسم کے علوم و فنون کا درس دیتے تھے۔ اور مختلف علوم کے شائقین جوق در جوق حاضر ہوتے تھے لیکن آخر میں بجز تفسیر بیضاوی اور مشکوٰۃ شریف کے اور کسی علم کا درس دینا پسند نہ کرتے تھے۔ آپ کا دستور تھا کہ نماز جمعہ کے بعد ہمیشہ وعظ فرمایا کرتے تھے۔۔ ہر درجے اور مرتبے کے آدمی جن میں طالب علم، علماء، فضلاء، صوفیہ، رئیس، شہزادے وغیرہ ہوتے تھے، سب آ آکر جمع ہو جاتے تھے۔۔۔ ان کا ایک مشہور قول ہے ہمارے عرفائے زمانہ کو ذاتی تجلی میسر نہیں ہے، ورنہ اپنے، اپنی اولاد و اقارب کے حصولِ اغراض کے لئے سلاطین کے محتاج نہ ہوتے۔

شاہ ابوالرضا محمد کی طرح شاہ عبدالرحیم بھی دربار شاہی سے بے تعلق رہے۔ ان کے متعلق ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے۔ جب وہ طالب علم تھے اور فتاویٰ عالمگیری کی تدوین ہو رہی تھی تو ان کے ایک دوست نے انہیں اس کام میں شریک ہونے پر آمادہ کیا، لیکن شاہ عبدالرحیم صاحب نے انکار کر دیا۔ جب اس انکار کی خبر شاہ صاحب کی بیوہ والدہ کو ہوئی تو وہ برہم ہوئیں اور اصرار کر کے حکماً نوکری قبول کرنے پر مجبور کیا چنانچہ شاہ صاحب تدوین فتاوی عالمگیری سے متعلق ہو گئے، مگر جب یہ خبر ان کے مرشد خلیفہ ابوالقاسم کو ہوئی تو وہ ناخوش ہوئے اور ترک ملازمت پر زور دیا۔ شاہ صاحب نے والدہ کے حکم کا عذر پیش کیا، لیکن آپ کے مرشد برابر مُصر رہے۔ آخر شاہ صاحب نے خلیفہ ابوالقاسم صاحب سے عرض کی کہ آپ دعا فرمائیں کہ نوکری چھوٹ

جائے، ورنہ یوں چھوڑوں گا تو والدہ ناراض ہوں گی چنانچہ ترک ملازمت کے لئے دعا کرائی گئی ۔ اور وہ قبول ہوئی بعد میں عالمگیر نے زمین دینی چاہی لیکن شاہ صاحب کے الفاظ میں "میں نے قبول نہیں کیا اور شکر ادا کیا"[1]

شاہ عبدالرحیم کا خاندانی پیشہ طبابت تھا۔ اس بارے میں شاہ عبدالعزیز کا یہ قول ان کے ملفوظات میں ہے "حکمت ہم در خاندان ما معمول بود۔ چنانچہ جد بزرگوار و عم فقیر دوامی کردند والد ماجد بندہ موقوف ساختہ" صفحہ ۲۳

یہ خاندان عربی النسل تھا۔ شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالرحیم کا سلسلہ نسب والد کی طرف سے حضرت عمر فاروقؓ تک پہنچتا ہے اور والدہ کی جانب سے حضرت امام موسیٰ کاظم تک تحقیقی طور سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس خاندان نے سرزمین عرب کو کیسے چھوڑا، لیکن شاہ ولی اللہ نے جو شجرہ نسب بیان کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ کے بعد پانچویں پشت میں افراد خاندان کے ناموں میں عجمیت آگئی تھی ۔ اس خاندان کے سب سے پہلے بزرگ جو ہندوستان آئے، اور رہتک میں آباد ہوئے، جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے، شیخ شمس الدین مفتی تھے ۔

شاہ عبدالرحیم کی ساٹھ سال کی عمر تک کوئی اولاد نہ تھی ایک دفعہ آپ حضرت خواجہ قطب الدین کے مزار کی زیارت کو گئے، آپ پر منکشف ہوا کہ آپ کے ہاں اور اولاد ہو گی ۔ اس پر شاہ عبدالرحیم نے ایک بزرگ شیخ محمد کی صاحبزادی سے عقد فرمایا ۔ جس سے شاہ ولی اور دو صاحبزادے اور ہوئے شادی کے بعد شاہ عبدالرحیم سترہ اٹھارہ سال تک زندہ رہے ۔

(اس سلسلے کا دوسرا مضمون جس میں اس عہد کے سیاسی و معاشی حالات کا جائزہ ہو گا اگلے شمارے میں شائع ہو گا۔)

---

[1] ماخوذ از تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ مصنفہ مولانا مناظر احسن گیلانی

وحدتِ دین کا تصوّر

ڈاکٹر عبدالواحد ہلے پوتا

قانونِ ارتقار کے تحت جیسے جیسے معاشرہ اپنی ابتدائی منزل سے، جسے شاہ ولی اللہ صاحب نے "ارتفاق اوّل" کا نام دیا ہے، ترقی کر کے اعلیٰ منازل کی طرف جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کے مذہب کے اسلوب، طریقہائے اظہار یا انہیں آپ مناہج اور رسوم کہہ لیں، بدلتے جاتے اور ارتقا پذیر ہوتے ہیں۔ اس خیال کے حامیوں کے نزدیک مذہب انسان کا فطری خاصہ ہے جو اس کی انفرادی و اجتماعی زندگی کے فطری کردار اور اعمال پر محیط ہوتا ہے۔ اور وہ اسی طرح عمومی قانون فطرت ہے، جیسے دوسرے حیاتیاتی قوانین ہیں۔ اور جس طرح پوری انسانی زندگی میں، جس کے یہ حیاتیاتی قوانین ایک حصہ ہیں، ارتقار کا عمل ہوتا رہا ہے، ایسے ہی مذہب کا عملی اظہار جن شکلوں اور صورتوں میں ہوتا ہے ان میں بھی تاریخ کے ادوار میں ارتقاء جاری رہا ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ انسانوں میں ستارہ پرستی عام تھی۔ ہو سکتا ہے کہ اس زمانے میں وہ ان لوگوں کے حالات کے مطابق ہو، لیکن حضرت ابراہیم ؑ نے اس کو ختم کیا، اور ستاروں کے ذریعہ خدا تک پہنچنے کے بجائے براہ راست غیر مشہود خدائے مطلق کی عبادت کا طریقہ رائج فرمایا۔[۱]

---

[۱] حجۃ اللہ البالغہ میں ہے:۔ بعض لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ خدا تعالیٰ ہے تو مدبّر کل، لیکن اپنے مخصوص (باقی حاشیہ صلا پر)

مظاہر فطرت کو قدرت خداوندی کا جلوہ سمجھنے کے بجائے انہیں خود ذات خداوندی کا قائم مقام بنا لینا ارتقائے انسانی کی ابتدائی منزلوں میں عام تھا، اس دور میں انسان کے لئے یہ ایک امر محال تھا کہ وہ ذات خداوندی کا عالم تجرّد میں ادراک کر سکے۔ وہ ان مظاہر کو خدائی صفات کا حامل قرار دے دیتا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک اعلیٰ و برتر اور منزہ اور مجرّد ذات خداوندی کا تصوّر پیش فرمایا۔ اور مظاہر کو مظاہر کا درجہ دیا۔

بندوں کی شفاعت قبول کرتا ہے۔ اس لئے وہ ان مخصوص بندوں کو "عباد اللہ" کہنے سے گریز کرتے ہیں۔ عام یہود و نصاریٰ اور ہمارے زمانے کے بعض مسلمانوں میں یہ مرض ہے۔ اور چونکہ شریعت کی بنا اس پر ہے کہ مشتبہ امور کو قائم مقام اصل کے نہ گردانا جائے۔ اس لئے وہ امور محسوسہ جن سے شرک کا شبہ ہو سکتا ہے شریعت نے کفر گردانا۔ جیسا کہ بتوں کے سامنے سجدہ کرنا، ان کے لئے جانور ذبح کرنا وغیرہ۔

اِس علم کے بارے میں پہلی مرتبہ مجھے یوں انکشاف ہوا کہ میرے سامنے ایک ایسی قوم پیش کی گئی، جو ایک چھوٹی سی مکھی کے سامنے جو ہر وقت اپنی دُم اور بازو ہلایا کرتی تھی، سجدہ کر رہی تھی۔ پھر میرے قلب میں القاء ہوا کہ کیا تم اس کے اندر شرک کی تاریکی پاتے ہو اور جس عصیان نے بت پرستوں کو گھیر لیا ہے وہ ان پر بھی محیط ہے؟ میں نے کہا، نہیں۔ ان کے اندر میں یہ چیز نہیں پاتا۔ کیونکہ ان لوگوں نے مکھی کو معبود نہیں گردانا بلکہ قبلہ گردانا ہے۔ اور تذلل و انکساری اور شرف و عزت کے اصل درجہ کو مخلوط نہیں کیا ہے اس پر مجھ سے کہا گیا کہ تم نے واقعی اس کا اصل راز پا لیا۔ چنانچہ اس دن سے میرا قلب اسی علم سے معمور ہو گیا اور میں علم و بصیرت کی منزل تک پہنچ گیا۔ اور توحید و شرک اور شریعت نے جن امور کو مظنۂ توحید یا مظنۂ شرک گردانا ہے اس کی حقیقت سے پوری طرح آگاہ ہو گیا۔ اور عبادت و تدبیر میں کیا ربط و تعلق ہے، اس سے اچھی طرح واقف ہو گیا۔ اور مجھے پوری پوری معرفت حاصل ہو گئی۔ واللہ اعلم،

ہو سکتا ہے کہ حضرت ابراہیم سے پہلے ستاروں کی معبود نہیں، بلکہ قبلہ سمجھ کر عبادت کی جاتی ہو اور چونکہ اس میں مظنۂ شرک تھا، اسی لئے اسے ممنوع قرار دیا گیا ہو، اس کے بعد حضرت ابراہیم سے براہ راست اُن دیکھے خدا کی عبادت کا طریقہ رائج ہوا۔

اگر ہم دنیا کے بڑے مذاہب کا ان کے جو اخلاقی، فلسفیانہ، عباداتی اور روحانی پہلو ہیں اس لحاظ سے مطالعہ کریں، تو ہمیں ان میں ارتقاء کے جو اعلیٰ درجات ہیں، ان تک انسان کے پہنچنے کے لئے جو نہایت ہی ضروری اور لابدی ذرائع ہیں۔ ان کے بارے میں عظیم صداقتیں اور اہم خیالات ملیں گے۔ جو کہ باقیات صالحات ہیں ان پیغامات کی جو وقتاً فوقتاً انسانیت کو دیئے گئے ہیں۔ ان عظیم پیغامات کی ایک جھلک ان مذاہب کے ادب اور ان کی تعلیمات کے مطالعہ میں آپ کو مل سکے گی، جو یہ ہیں۔ ہندومت۔ بدھ مت، زرتشتیت، کنفیوشسزم، ٹاؤزم، یہودیت، عیسائیت، اور اسلام۔

یہ آٹھ مذاہب دنیا میں عظیم ادب، عظیم فن اور عظیم موسیقی کے سب سے بڑے سرچشمے رہے ہیں۔ اور جب آپ ان کا جائزہ لیں۔ اور ان کا باہم مقابلہ کریں تو یہ حیرت انگیز حقیقت واشگاف ہوگی کہ جہاں ان میں کئی ایک معمولی اور بعض اوقات کئی بڑے امور میں وسیع اختلافات پائے جاتے ہیں، وہاں ان میں انسان کے خدا تک پہنچنے نیز خدا کی صفات کے متعلق، خواہ اس کی اپنی ذات کے بارے میں خواہ اپنی مخلوقات سے اس کے تعلق کے بارے ہیں، جو وسیع تر اصول ہیں، وہ ان سب مذاہب میں آپس میں ملتے ہیں، اور اگر وہ مختلف بھی ہیں تو ان میں تضاد نہیں، بلکہ ہم آہنگی ہے گویا جس طرح ایک ہی سورج کی روشنی مختلف رنگوں کے شیشوں کی کھڑکیوں میں منعکس ہوتی ہے، اسی طرح ایک خدا کے بارے میں ایک ہی حقیقت مختلف دماغوں کے مختلف شیشوں کے ذریعہ دنیا میں منعکس ہوئی ہے۔[1]

شاہ ولی اللہ صاحب کی مشہور کتاب حجۃ اللہ البالغہ کے ایک باب کا عنوان ہے: "تمام مذاہب وادیان کی اصل ایک ہے۔ شرائع، مناہج، طریقے مختلف ہیں"۔ اس باب میں وہ لکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ شرع لکم من الدین ما وصی به نوحا والذی اوحینا الیک وما وصینا به ابراهیم وموسیٰ وعیسیٰ ان اقیموا الدین ولا تتفرقوا (اس نے تمہارے لئے دین کا وہی راستہ ٹھہرایا ہے، جس پر چلنے کا اس نے نوح کو حکم دیا تھا۔ اور اے پیغمبر! تمہاری طرف

---

[1] The Divine Universe by H. N. Spalding P P 1-2

بھی ہم نے اسی راستہ کی وحی کی ہے اور اسی کا ہم نے ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو حکم دیا تھا کہ اسی دین کو قائم کرنا اور اس میں تفرقہ نہ ڈالنا) حضرت مجاہد نے اس آیت کی تفسیر اور معنی یہ کئے ہیں کہ اے محمدؐ! ہم نے تم کو اور ان کو ایک ہی دین کی وصیت کی ہے۔

"اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وان ھذہٖ امتکم امۃ واحدۃ وانا ربکم فاتقون۔ فتقطعوا امرھم بینھم زبراً کل حزب بما لدیھم فرحون (اور یہ تمہاری امت ایک امت ہے اور میں تمہارا رب ہے۔ تو تم مجھ سے ڈرتے رہو۔ پھر لوگوں نے آپس میں پھوٹ ڈالکر اپنا اپنا دین جدا کر لیا۔ اور جو دین جس فرقے کے پاس ہے وہ اسی سے خوش ہے) یعنی تمہاری ملت اور تمہارا دین وملّت اسلام ہے اور مشرکین، یہود اور نصاریٰ نے اس میں پھوٹ ڈال دی۔

"اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ لکلٍ جعلنا منکم شرعۃ ومنھاجاً (اور ہم نے وقتاً فوقتاً تم میں سے ہر ایک کے لئے ایک شریعت اور طریقہ خاص ٹھہرایا) اس آیت کی تفسیر میں حضرت ابن عباس فرماتے ہیں۔ شریعت اور منہاج کے معنی راہ اور طریقے کے ہیں۔

"اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ لکل امۃ جعلنا منسکاً ھم ناسکوہ (ہم نے ہر ایک امت کے لئے عبادت کے طریقے قرار دیئے کہ اُن پر چلتے رہیں۔"

اس کے بعد شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں:۔ "معلوم ہونا چاہیئے کہ اصل دین ایک ہے اور تمام انبیائے کرام اس پر متفق ہیں۔ تمام انبیائے کرام کا اتفاق ہے کہ خدا کو ایک مانا جائے، اس کی عبادت کی جائے۔ ... قیامت حق ہے، مرنے کے بعد زندہ ہونا حق ہے ..... اسی طرح تمام انبیائے کرام بر یعنی نیکی کے اصولی اقسام پر بھی متفق ہیں.... اور اسی طرح تمام انبیائے کرام نکاح کی ضرورت، زنا کی حرمت عدل وانصاف قائم کرنے، ظلم وجور کی حرمت ..... پر متفق ہیں۔

"یہ امور ان لوگوں کے نزدیک جو قرآن کے مخاطب تھے۔ بطور مسلّمات کے تھے اور اگر اختلاف تو صرف ان امور کی صورتوں اور شکلوں میں تھا ... حاصل کلام یہ کہ وہ خاص خاص صورتیں اور مخصوص ہیئتیں مختلف قسم کی نیکیوں اور تدابیر نافعہ ومعاشی اور امور معاشرت کی آسانیوں اور سہولتوں کی

عمارت قائم کی جاتی ہے، انہیں کا نام شریعت اور منہاج ہے۔[۹]

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سے اسباب تھے، جن کی وجہ سے مختلف زمانوں میں مختلف قوموں کے لئے مختلف شرائع نازل ہوتے رہے۔ اس پر بحث کرتے ہوئے شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں۔ "معلوم ہونا چاہیئے کہ انبیائے کرام کے شرائع میں اختلاف چند اسباب و مصالح کی بنا پر ہوا کرتا ہے اور یہ اس طرح کہ شرائع الہیہ کے لئے چند ایسے اسباب اور وجوہات ہوتے ہیں جن کی بنا پر ان شرائع کو شعائر قرار دیا جاتا ہے۔ اور شرائع کے مقدار و اندازے کی مشروعیت میں بھی مکلفین کے حالات، عادات اور اطوار کا لحاظ کیا جاتا ہے۔"[۹] اس کی مثالیں دینے کے بعد شاہ صاحب لکھتے ہیں:-

"انبیائے کرام کا سب سے بڑا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان ارتفاقات اور معاشرت کی ان تدابیر نافعہ کی اصلاح کی جائے، جو ان کے مخاطبین میں موجود اور ان میں جاری و ساری ہیں۔ اور اسی لئے ان کو انکی مالوفات اور شب و روز کی عادی چیزوں سے یکسر جدا کر کے غیر مالوف چیزوں کی طرف دعوت نہیں دی جاتی۔ الّا ماشاء اللہ اور یہ ظاہر ہے کہ مصالح کے مواقع باعتبار زمانہ اور عادتوں کے مختلف ہوا کرتے ہیں اور اسی بنا پر شریعتوں میں نسخ صحیح اور جائز ہے۔ اس کی مثال طبیب کی سی ہے کہ وہ ہر حال میں مزاج کا اعتدال اور اس کا تحفظ چاہتا ہے۔ اور اس لئے مختلف اشخاص اور مختلف اوقات کے لحاظ سے اس کے احکام اور طبی طریقے مختلف ہوا کرتے ہیں۔ جس چیز کا حکم وہ جوان کو دیتا ہے۔ بوڑھے کو نہیں دیتا۔ گرمیوں کے زمانے میں کھلے میدان اور کھلی ہوا میں سونے کا حکم دیتا ہے اور سردیوں میں وہ گھر میں سونے کا حکم دیتا ہے کیونکہ گھر کے اندر سردی کا بچاؤ ہو سکتا ہے۔ اسی طرح جو شخص اصل دین اور شرائع و مناہج کے اختلاف کے اسباب کو سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک یہ تغیر و تبدل درحقیقت تغیر و تبدل نہیں ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ شرائع کی نسبت قوموں کی طرف ہوا کرتی ہے اور چونکہ ان کی استعداد و قابلیت نے یہ شرائع اور مناہج ان پر واجب اور لازم کئے ہیں اور زبان حال سے مناسب سعی والتماس کے ساتھ ان شرائع کی خواست اور مطالبہ کیا ہے اس لئے بہت ملامت اور مکمل مواخذہ یہی قومیں اور یہی لوگ

اب مختلف مذاہب کی تعلیمات میں یہ جو ہم ظاہری اختلافات پاتے ہیں جنہیں شرائع و مناہج کا اختلاف کہنا چاہیئے، انہیں حل کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ان سارے مذاہب کا ایک اور صرف ایک دین کے مختلف پہلو سمجھ کر مطالعہ کیا جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ انسانیت اور اس کی تہذیب کے ارتقاء اور اس کی ذہنی جمالیاتی اور روحانی ترقی کے ساتھ ساتھ اس دین کو خود اپنے عمل ارتقاء میں مختلف مراحل سے گزرنا پڑا۔ انسانی تہذیب کی عمومی ترقی کا ایک رخ مذہب کی ترقی بھی ہے۔ جیسے آدمی ہوتے ہیں ایسے ہی انکے الٰہ (معبود) ہوتے ہیں۔ اجتماعی اخلاقیات اور انسانی آداب و اطوار کی ہر ترقی، اور دنیا اور اس کے قوانین کے بارے میں انسان کے علم میں ہر اضافہ اس کے تصورات میں جو وہ اپنے معبودوں کے متعلق رکھتا ہے اثر انداز ہوتا ہے۔" [1]

پھر انسانیت کے دورانِ ارتقاء میں اس کی ذہنی، جمالیاتی، روحانی اور معاشرتی ترقی نیز سیاسی اداروں کی تشکیل اور تہذیبی و ثقافتی قدروں کی سمتوں میں کئی پہلو ہوتے ہیں۔ وہ ذرائع جن کے توسط سے ارتقاء کی نچلی سطح سے انقلابی تبدیلیوں کے ساتھ بلند سطح پر پہنچنے میں بہت مدد ملتی رہی وہ عام طور سے غیر معمولی افراد تھے جن کی بڑی پُر قوت شخصیتیں تھیں اور انہیں غیر معمولی بصیرت اور مافوق الطبعی ذہن عطا ہوئے تھے، جو الہام اور وحی قبول کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے اگر انسانیت کے مذہب کی تاریخ کا اس کے مختلف ارتقائی پہلوؤں کو پیش نظر رکھ کر تجزیہ کیا جائے تو صاف واضح ہوتا ہے کہ مذہب ایک ہی ارتقائی تحریک ہے، اگرچہ مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے یہ مختلف صورتوں میں ظہور پذیر ہوتی رہی ہے۔

مذہبی ارتقاء کے دوران جن ذرائع سے انقلابی تبدیلیاں رونما ہوئیں، ان پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ وقتاً فوقتاً جو پیغامات آتے رہے، ان کی نشر و اشاعت مختلف زبانوں میں مختلف

---

[1] Studies in the Philosophy of religion by Pringle Patteson. P.P. 8-9

طبقات کے افراد کے ذریعہ ہوتی رہی ہے۔ اس ضمن میں سب سے پہلے کاہن آتا ہے۔ اس کے بعد سیاسی فرمانروا یا سپاہی لیکن آخری پیغام کا حامل ایک تاجر بھی ہے اور عامل (مدبر) بھی ایک سیاح تاجر اپنے پیغام کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتا ہے اور اسی طرح وہ مختلف قوموں کے درمیان ربط و ارتباط کا ذریعہ بنتا ہے۔ اس لئے آخری پیغام میں سفر اور سیاحت کو تعلیم و تبلیغ کا بہترین طریقہ بتایا گیا ہے۔ لیکن اس پیغام میں سب سے زیادہ تعریف عامل اور مدبر" کی گئی ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ ہر وہ مفید عمل جس سے انسان کے حقیقی مقصد کی تکمیل میں مدد ملے وہ خدا کی عبادت ہے"۔ [۱]

انسانی تاریخ کا اگر دوسری نظر سے تجزیہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ جن بزرگوں اور عارفین کی بدولت انسانیت نے ترقی کی، اپنے اپنے وقت میں وہ تہذیب اور ثقافت (کلچر) کے مختلف پہلوؤں کے ارتقاء کا بھی ذریعہ بنے تھے۔ ثقافت سے یہاں میری مراد باطن کی اصلاح و تزکیہ اور افراد کی داخلی صلاحیتوں کی ترقی ہے۔ اور تہذیب کا تعلق میرے نزدیک اجتماعی زندگی کے ربط و ارتباط اور مختلف گروہوں میں ہم آہنگی پیدا کرنے سے ہے۔ زرتشت، منو اور موسیٰ علیہ السلام نے انسانی تہذیب کے نمائندہ معلمین کی حیثیت سے جو تعلیم دی، اس کا بڑی اچھی طرح سے اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ زرتشت نے خاندانی زندگی کی طرح ڈالی۔ منو مشترکہ خاندانی زندگی اور دیہی آبادی کا بانی ہے۔ اور بنو اسرائیل کے رہنما و قائد حضرت موسیٰ پہلے آدمی ہیں، جنہوں نے قبائل کو متحد کر کے قومی زندگی کی ضرورت کو پورا کیا۔

تاریخ مذہب کے مطالعے سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ بعض ترقی یافتہ قدیم مذاہب میں روح اور مادہ کی دوئی پر زور دیا گیا اور روحانیت کی ترقی کو سب کچھ سمجھا گیا۔ اس کے خلاف بعض ایسے مذاہب بھی تھے، جن کا زیادہ زور زندگی کے معاشرتی پہلوؤں کی ترقی اور اس کے خارجی مظاہر کی تحسین پر تھا۔ اور انہوں نے باطنی زندگی کو اہمیت نہ دی۔ آخری الہامی مذہب، جو قرآن مجید پر مشتمل ہے، اس دوئی کو ختم کر کے

---

[۱] Adventures of Brown Girl in her search for God - by - I. I. Qazi. P. P. 158 - 159

دونوں کو باہم مربوط کرتا ہے۔ اس کے نزدیک آدمی کا ہر معمولی سے معمولی عمل اگر اس نیت سے ہو کہ اس سے ایک عالمی و عمومی مقصد کو تقویت پہنچے گی۔ تو یہ بذات خود ایک بہترین عبادت ہے۔ انسانی ارتقا کے ابتدائی مراحل میں جب کہ مادیت اور روحانیت کی دوئی بعض اعتبار سے ایک ضرورت تھی، وہ ایک عالمی مذہب کے آنے سے ختم ہو گئی۔ اب بذات خود کوئی چیز غیر روحانی یا دنیادی نہیں رہی اگر اس سے خدائی مقصد کی تکمیل میں مدد ملتی ہے ؎

مذہب کے عام ارتقار کی طرح خدا اور اللہ کا جو انسانی تصور ہے اس میں بھی برابر ارتقا ہوتا رہا ہے۔ تاریخ کے ہر دور میں آپ کو انسانی معاشرے میں کسی نہ کسی شکل میں خدا کے بارے میں شعور ملے گا۔ "الٰہ" (معبود) کے تصور کے متعلق انسانی علم نے درجہ بدرجہ ترقی کی ہے۔ یہاں تک کہ آخر میں وہ وقت آیا جب توحید کا تصور عام ہو گیا۔ اس ضمن میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان قوانین کی طرح جو زندگی کے مختلف شعبوں پہ کارفرما ہوتے ہیں، انسانوں کے نقطہ ہائے نظر، عقائد اور شعور بھی معاشرے کے ارتقار کے ساتھ ساتھ بدلتے اور ترقی کرتے ہیں۔ اور یہی کیفیت خدا کے بارے میں انسانی شعور کی بھی ہے۔ غرض یہ ایک حقیقت ہے کہ افرادِ انسانی کے لئے خدا کے بارے میں شعور اتنا ہی فطری ہے جتنی کہ ان کی ذہنی اور روحانی ترقی؛ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ انسان کی فطری ترقی اور اس کے طبائع و اطوار کے ارتقار کے پہلو بہ پہلو خدا کے بارے میں اس کا یہ صحت مند شعور بھی ترقی کرتا رہا ہے۔ جہاں تک ابتدائی انسان کا تعلق ہے، لازماً اس میں بھی کسی نہ کسی صورت میں خدا کے بارے میں شعور ہوگا۔ گو یہ اس طرح واضح اور معین نہ ہو، جیسے کہ بعد کے ترقی یافتہ انسان میں ہے، ایک ایسی مافوق الطبعی طاقت جو پیدا کرتی ہے، پرورش کرتی ہے اور پھر موت دیتی ہے، یعنی خالق، رب اور مُمیت کا شعور ابتدائی سے ابتدائی انسان کو بھی ضرور ہوگا۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ معاشرتی ارتقار کی شروع کی منزلوں میں ان تین طاقتوں کو الگ الگ سمجھا جاتا ہو، اور ان کی کائنات پر علیحدہ علیحدہ فرمانروائی مانی جاتی ہو۔ اور بعد میں فہم و دانش کی ترقی اور علم کے مسلسل ارتقار کے ساتھ

؎ Adventures of Brown Girl in her search for God -
by - I. I. Qazi. P. P. - 159

کائنات پر ایک سے زیادہ فرمانروا طاقتوں کے خیال کی جگہ اس عقیدے نے لے لی ہو کہ اس ساری کائنات پر صرف ایک طاقت کی حکمرانی ہے جس کے ہاتھ میں یہ سارے اختیارات ہیں۔ مختصراً خدا کا یہ تصور انسانی شعور کی بعد کی ترقی یافتہ منزل میں آگے آیا ہے، اور جہاں تک قرآن کے تصورِ توحید کا تعلق ہے وہ تو اس سے بہت بلند تر ہے اور بڑے ترقی یافتہ انسانی معاشرے کے مذہب کا امتیاز ہے۔

قرآن مجید کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ذریعہ نہ صرف ایک خدا پر عقیدے کا اس شکل میں تعین ہوا بلکہ روحانیت اور مادیت کی اس دوئی میں جس کا اوپر ذکر ہوا ہے، نئے نقطہ ہائے نظر کی تخلیق سے ہم آہنگی پیدا کر دی گئی، جس میں کہ ہر چیز کو اپنا ایک نیا مقام اور تناسب ملا۔ اور اس طرح یہ ہم آہنگی انسانی ذہن کی مزید ترقی کے امکانات کا باعث بنی اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے ذریعہ ایک نئی اجتماعی زندگی کی بنیاد بھی پڑی جسے آپ مافوق قومیت اور بین الاقوامیت کہہ سکتے ہیں اور جو انسانی زندگی کو ایک نامی وحدت کلی کی طرف لے جانے میں مدد معاون ہوتی ہے۔ بنوعِ انسان میں مذہب کا جس طرح ارتقا ہوا اس کے بعض عام پہلو سرسری طور سے اوپر بیان ہوئے ہیں۔ اور اس ارتقاء کے مختلف مراحل میں اصحاب مذاہب، عارفین اور حکماء نے اس کی مختلف نمایاں خصوصیات پر جس طرح زور دیا ہے اس کا بھی اجمالاً ذکر کیا گیا ہے اب ضرورت ہے کہ اس کی روشنی میں مذہب کا مطالعہ انسانی ترقی کی ایک مستقل اور منظم نامی تحریک کی حیثیت سے کیا جائے، جس کے پیش نظر افرادِ انسانی کی بلحاظ نوعِ انسان کے افراد ہونے کے ان کی جو فطری ضرورتیں اور تقاضے ہیں، ان کی تکمیل ہے۔ اس مقصد کے لئے ضروری ہے کہ انسانیت کے مذہب کی تاریخ کا مطالعہ اسکے ابتدائی مراحل سے شروع کیا جائے اور بتدریج اس کے ارتقا کے اس ترقی یافتہ مرحلے پر پہنچا جائے، جب کہ وہ پوری نوعِ انسانی کے لئے ایک عالمی (Universal) اور انتلافی (Synthesized) مذہب بن گیا ہے۔ یعنی ایسا مذہب جس کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ ساری انسانیت ایک نامی وحدت کلی ہے۔ اور اس ساری کا ایک ہی خالق اور ایک ہی رب ہے۔ اور اس سب پر ایک ہی طاقت کی فرمانروائی اور حکمرانی ہے۔ اس عالمی وحدت کو سامنے رکھتے ہوئے فلسفۂ مذہب کے شارحین کا یہ کام ہونا چاہیئے کہ وہ زندگی کے تمام شعبوں میں خواہ وہ معاشرتی

---

[1] Adventures of Brown Girl in her search for God - P. 164 .

ہوں یا اخلاقی و روحانی اس مذہب کی تعلیم و تلقین کی اہمیت کا تجزیہ کریں۔ اس ضمن میں زندگی کی روحانی اور دنیوی (سیکولر) دو خانوں میں تقسیم کے کوئی معنی نہیں رہتے۔ چنانچہ زندگی کا یہ اخلاقی نقطۂ نظر اس عظیم مذہب کی تعلیمات کے مقتضیات کو صحیح طور پر سمجھنے میں بڑی مدد دیتا ہے۔

جو لوگ فلسفۂ مذہب کا اس نظر سے مطالعہ کرنا چاہیں، انہیں اس میں شاہ ولی صاحب کے طریقۂ بحث سے بڑی مدد مل سکتی ہے، جو انہوں نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں اختیار کیا ہے۔ شاہ صاحب کا طریقۂ بحث بڑا جامع ہے اور وہ عالمی مذہب یا دین فطرت کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کر سکتا ہے اور اس کا اطلاق انسانیت کے جو بھی ترقی یافتہ مذاہب ہیں ان کے تمام تر بنیادی اصولوں پر ہو سکتا ہے۔

○

اللہ تبارکؐ و تعالٰے کا ارشاد ہے:- یا ایھا الذین آمنوا لا تسئلوا عن اشیاء ان تبد لکم تسؤکم و ان تسئلوا عنھا حین ینزل القرآن تبد لکم۔ (اے مسلمانو! بہت چیزوں کا سوال نہ کیا کرو۔ اگر وہ تمہارے سامنے ظاہر کی جائیں گی، تو تمہارے حق میں بُری ہوں گی۔ اور قرآن نازل ہونے کے وقت تم ان چیزوں کا حال دریافت کروگے تو تم پر ظاہر کردی جائیں گی)

اور اصل رضائے الٰہی اس میں ہے کہ نزول شرائع و احکام کے لئے اس قسم کے اسباب کم ہوں۔ کیونکہ اس قسم کے شرائع و احکام کا نزول اکثر و بیشتر کسی مخصوص مصلحت اور وقت خاص کے ماتحت ہوا کرتا ہے۔ اور بعد میں جاکر پیچھے آنے والوں کے لئے تنگی کا باعث بن جاتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ مسائل دریافت کرنے کو برا سمجھتے تھے۔

(حجۃ اللہ البالغہ)

امروٹ شریف سندھ میں علوم ولی اللہی کی تعلیم

مولانا ابوبکر شبلی[1]

تعلیمات شاہ ولی اللہ کے عظیم ترجمان حضرت مولانا عبیداللہ سندھی رحمتہ اللہ علیہ کو سندھ سے جو جذباتی وابستگی تھی، وہ آپ کی تصانیف سے پوری طرح عیاں ہیں۔ یہ آپ ہی کی ہستی تھی جن کی مساعی جمیلہ سے سندھ کے علماء اور مشائخ براہ راست شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ سے متعارف ہوئے۔ اور بالآخر یہ سندھ کو ہی شرف حاصل ہوا ہے کہ اب "شاہ ولی اللہ اکیڈمی" کی وجہ سے فلسفۂ ولی اللہی کی مرکزیت اسے حاصل ہو گی۔

حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے سندھ میں ابتدائی کارنامے اور ان کی علمی و مذہبی کوششیں آج تک منظر عام پر نہیں آسکیں۔

"سوانح سیدنا تاج محمود امروٹیؒ" کی تدوین اور ترتیب کے دوران جو معلومات مجھے حاصل ہوئیں، وہ قارئین "الرحیم" کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ شبلی

حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے سندھ میں آکر حضرت حافظ محمد صدیق صاحب بھر چونڈوی رحمتہ اللہ علیہ (مرشد حضرت مولانا تاج محمود صاحب امروٹیؒ) کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا اور ان ہی کی ہدایت پر مختلف مقامی علماء سے اکتساب علم کرنے کے بعد آپ علوم اسلامیہ کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے دیوبند

---

[1] استاد ادبیات عربی۔ تعمیر نو قومی درس گاہ ۔ کوئٹہ

تشریف لے گئے۔ مولانا سندھیؒ کو دیوبند میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنے کا شرف ملا۔ اور بالاخر آپ نے آپ کے مقربین اور معتمد علیہ لوگوں میں ایک ممتاز حیثیت حاصل کرلی۔ فراغت تحصیل علوم کے بعد جب حضرت مولانا سندھی نے وطن کی طرف مراجعت کی تو سیدھے بھرچونڈی شریف آئے۔ آپ کے آنے سے دس دن قبل سید العارفین حضرت حافظ محمد صدیق صاحب بھرچونڈویؒ اس دنیا سے رحلت فرما گئے تھے۔ آپ بھرچونڈی میں مختصر قیام کرنے کے بعد سیدھے امروٹ شریف تشریف لے گئے۔ جہاں آپ کے روحانی والد اور مرشد حضرت بھرچونڈیؒ کے خلیفۂ اعظم قطب الاقطاب سیدنا تاج محمود امروٹی رحمۃ اللہ علیہ اپنے فیوضات روحانی سے ہر خاص و عام کو فیضیاب فرمارہے تھے۔

مولانا عبیداللہ صاحب سندھی حضرت مولانا سیدنا تاج محمود امروٹیؒ سے بھرچونڈی کے دوران قیام ہی میں متعارف ہوچکے تھے۔ اس لئے آپ کو امروٹ میں آکر کوئی اجنبیت محسوس نہیں ہوئی چنانچہ اپنے روحانی والد کی وفات کے بعد آپ نے حضرت سیدنا امروٹی کو ہی اپنا روحانی پیشوا تسلیم کیا، اور ان ہی کے ساتھ مستقل طور پر امروٹ میں رہنے کا عزم مصمم کرلیا۔

اس ضمن میں حضرت مولانا عبیداللہ صاحب سندھی رحمۃ اللہ علیہ اپنی ذاتی ڈائری میں لکھتے ہیں :۔

" میں شوال (۱۳۰۸ھ) میں سید العارفین حضرت حافظ محمد صدیق بھرچونڈویؒ کے دوسرے خلیفہ حضرت مولانا ابوالحسن تاج محمود امروٹیؒ کی طرف امروٹ ضلع سکھر کی طرف چلا گیا۔ آپ نے اپنے مرشد کا وعدہ پورا کیا۔ آپ میرے لئے باپ کی طرح تھے آپ نے میرا نکاح سکھر میں اسلامیہ سکول کے معلم مولوی محمد عظیم خاں یوسف زئی کی بیٹی سے فرمایا۔ میری والدہ کو بھی بلوایا۔ جو آخر تک میرے ساتھ رہیں آپ نے میرے مطالعہ کے لئے ایک بہت بڑا کتب خانہ جمع کیا میں ان کے سایہ عاطفت میں ۱۳۱۵ھ تک نہایت اطمینان سے مطالعہ میں مصروف رہا۔"

مذکورہ بالا اقتباس سے حسب ذیل باتیں واضح طور پر عیاں ہوتی ہیں۔

۱۔ حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ دیوبند سے مراجعت کے بعد سیدھے امروٹ شریف آئے اور اسی کو اپنا مسکن منتخب کیا۔

۲۔ حضرت مولانا سیدنا تاج محمود امروٹیؒ نے آپ کے قیام کے لئے تمام وسائل مہیا کئے اور حضرت آپ پر بے مثال شفقت فرماتے رہے۔

۳۔ حضرت مولانا سیدنا تاج محمود صاحب امروٹی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کی شادی کرائی اور آپ کے مزید اطمینان قلب کے لئے آپ کی والدہ کو آپ کے پاس بلوایا۔

۴۔ حضرت سیدنا امروٹی نے حضرت مولانا سندھیؒ کے علم کے اضافہ کے لئے ایک عظیم کتب خانہ جمع کیا۔ (جو اب تک خستہ حالت میں موجود ہے) یہی وجوہات تھیں جن کی بنا پر مولانا عبیداللہ صاحب سندھی نے ابتدا میں امروٹ شریف کو اپنا مستقل مسکن بنا کر اپنی علمی اور سیاسی جدوجہد کا آغاز کیا۔

جس وقت حضرت مولانا عبیداللہ صاحب سندھی نے امروٹ کو اپنا مستقل مسکن بنا کر اپنی علمی اور سیاسی جدوجہد کا آغاز کیا، اس وقت صوبہ سندھ زندگی کے ہر میدان میں بہت پیچھے تھا۔ علمی لحاظ سے پورے صوبہ میں کوئی بھی مرکزی دینی درس گاہ نہیں تھی بعض قصبات میں چھوٹے چھوٹے دینی مدارس تھے جن کا آپس میں کوئی ربط نہیں تھا ان کا وجود کسی مدرس یا مولوی کی ذاتی جدوجہد کا مرہون منت ہوتا تھا۔ جونہی وہ شخصیت اس کام سے سبکدوش ہوتی تو مدرسہ کا تمام نظام ختم ہو جاتا۔ ان مدارس کا نصاب صدیوں کا گھسا گھسایا تھا جس میں کوئی بھی تبدیلی ممکن نہیں تھی۔ اس لئے صوبہ سندھ کے دینی مدارس کے طلبہ میں کسی قسم کی ذہنی بیداری لانا تقریباً ناممکن تھی۔

سیاسی لحاظ سے سندھ تقریباً عضو معطل تھا۔ کراچی کے علاوہ پورے صوبہ میں کہیں بھی سیاسی شعور نہیں تھا۔ سندھ اپنے مخصوص جغرافیائی اور لسانی حالات کی وجہ سے برطانوی ہند کے دوسرے تمام صوبہ جات سے الگ تھلگ تھا۔ علمی اور ادبی لحاظ سے سندھ صفر تھا۔ پریس اور نشر و اشاعت کے تمام ذرائع اور وسائل پر ہندو دانشوروں کا قبضہ تھا۔ مسلمانوں کے تمام مذہبی کتابیں حتیٰ کہ قرآن مجید بھی ہندو پریسوں میں ہندوؤں کے سرپرستی میں شائع ہوتا تھا۔

ان حالات میں حضرت مولانا عبیداللہ صاحب سندھیؒ نے امروٹ شریف میں حضرت مولانا سیدنا تاج محمود امروٹی رحمۃ اللہ علیہ کے تعاون اور سرپرستی میں اپنے پروگرام کا آغاز کیا۔ آپ کے پروگرام کے تین

بڑے مراحل یہ تھے۔ ابتدا میں امروٹ شریف میں ایک عظیم دینی درس گاہ قائم کی جائے جو دقیانوسی طرز عمل سے ہٹ کر جدید طریقے پر تعلیمی کام کرے۔ اس عظیم دینی درس گاہ کے نصاب میں شاہ ولی اللہ کی تصانیف کو بنیادی اہمیت حاصل ہو تاکہ ان کے فلسفہ کے ذریعہ پہلے سندھ میں، بعد میں تمام ہندوستان میں اسلام کا فکری اور علمی انقلاب لایا جا سکے۔ مسلمانوں میں دینی، سیاسی، اور علمی انقلاب لانے کے لئے ایک "دار الاشاعت الاسلامیہ" کھولا جائے۔ جس کا اپنا پریس ہو جس کے ذریعہ مسلمانوں میں علمی اور سیاسی شعور بڑھانے کے لئے مختلف موضوعات پر کتابیں شائع کی جائیں اور "دار الاشاعت" کی طرف سے سندھی زبان میں ایک مستقل ماہنامہ بھی شائع کیا جائے۔ چنانچہ انہی خطوط پر حضرت مولانا عبید اللہ صاحب سندھی نے امروٹ شریف میں اپنا کام شروع کیا۔

سب سے پہلے آپ نے ایک دینی درس گاہ قائم کی اس کی چند ایک قابل ذکر خصوصیات یہ تھیں کہ اس درس گاہ کو دیوبند کے طریقہ پر جاری کیا گیا۔ اور اس کا روحانی تعلق دیوبند سے قائم رکھا گیا اس لحاظ سے سندھ کو پہلی مرتبہ دیوبند سے علمی اور روحانی رابطہ پیدا ہوا۔ اس درس گاہ کے نصاب میں حدیث، تفسیر اور شاہ ولی اللہ کی تصانیف کو بھی شامل کیا گیا۔ اس طرح سندھ کے طالب علموں کو پہلی مرتبہ علوم اسلامیہ کی اعلیٰ تعلیم سے بہرہ ور ہونے کا موقع ملا۔ اس درس گاہ میں فکری جلا پر سب سے زیادہ زور دیا جاتا تھا۔ چنانچہ طلبہ میں حریتِ وطن اور احیائے دین قیم کی روح پیدا کرنے کی پوری کوشش ہوتی تھی۔ اس درس گاہ کی لائبریری میں مصر استنبول اور ہندوستان سے مشہور اور نادر کتابیں جمع کی گئیں۔ اور اس طرح سندھ کے طلبہ کو ایک جید عالم کی نگرانی میں توسیع مطالعہ کا پہلی دفعہ موقع ملا۔

اس درس گاہ میں تقریباً سات سال تک جب تک کہ حضرت مولانا سندھی امروٹ شریف میں رہے۔ اس طرح کام ہوتا رہا۔ اس دوران میں سندھ اور بیرون سندھ کے سینکڑوں علماء نے اس سے استفادہ کیا اور اسی درس گاہ کی وجہ سے سندھ میں حریت وطن اور احیائے دین قیم کی جدوجہد کا آغاز ہوا۔

اس درس گاہ کے تلامذہ میں حضرت الحاج مولانا عبد العزیز صاحب تھریچانوی رحمۃ اللہ علیہ خلیفہ اوّل حضرت سید تاج محمود صاحب امروٹی اور حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری رحمۃ اللہ علیہ اور

جناب مولانا خوشی محمد صاحب لاڑکانوی کے نام قابل ذکر ہیں۔ اول الذکر دونوں حضرات وفات پاچکے ہیں موخرالذکر حضرت بقید حیات ہیں اور سندھ کے علمی حلقوں میں احترام اور عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ حضرت مولانا عبیداللہ صاحب سندھی نے مسلمانوں میں دینی بیداری پیدا کرنے کے لئے پریس کی ضرورت کو بڑی شدت سے محسوس کیا۔ وہ صوبہ سندھ کے لئے "دارالاشاعت" کا قیام بہت ضروری سمجھتے تھے۔ اس لئے امروٹ شریف میں پریس لگا کر دینی کتابیں چھاپنے کی تجویز آپ کے ذہن میں آئی اور آپ نے حضرت مولانا تاج محمود امروٹی سے مدد چاہی، لیکن اس وقت حضرت امروٹی کی مالی حالت اتنی اچھی نہیں تھی اس لئے آپ اس عظیم کام کے لئے فوری طور آمادہ نہیں ہو رہے تھے۔ ادھر حضرت مولانا سندھیؒ کو اس پر شدید اصرار تھا۔ آخرکار ذاتی جدوجہد سے حضرت مولانا سندھی نے ایک چھوٹی سی مشین خرید لی اور سندھ کے ایک چھوٹے سے قصبہ میں طباعت واشاعت کا کام شروع کر دیا۔ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد اس "دارالاشاعت" سے سندھی زبان میں ایک ماہنامہ بھی جاری کیا گیا۔ جو کافی عرصہ تک شائع ہوتا رہا۔

اس "دارالاشاعت" سے ماہنامہ کے علاوہ سندھی زبان میں کئی کتابیں بھی شائع ہوئیں جن میں حضرت مولانا امروٹیؒ کا قرآن مجید کا سندھی ترجمہ "الہام الرحمان فی تفسیر القرآن" خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ ایک دینی درس گاہ شاہ ولی اللہ کے فلسفہ کی تعلیم اور محمود المطابع کے قیام کی وجہ سے امروٹ شریف نے تھوڑے ہی عرصہ میں سرزمین سندھ میں علمی اور سیاسی لحاظ سے ایک مرکزی حیثیت حاصل کرلی اور سندھ کے علاوہ بیرون سندھ میں بھی اس کی شہرت ہو گئی۔ حضرت مولانا عبیداللہ صاحب سندھی نے اپنے ذاتی روابط اور تعلقات سے حضرت مولانا امروٹیؒ اور حضرت مولانا شیخ الہند کو باہمی متعارف کرایا۔ اسی تعارف اور تعلق کے بعد حضرت شیخ الہندؒ اپنی زندگی میں دوبار امروٹ شریف تشریف لائے آپ کے تلامذہ میں سے حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ اور حضرت مولانا تھانویؒ بھی امروٹ شریف آئے تھے۔

امروٹ شریف میں دینی درس گاہ اور محمود المطابع کے قیام اور اس سے شائع ہونے والے رسائل اور کتب کے نتائج بڑے اچھے نکل رہے تھے۔ اور حضرت مولانا عبیداللہ صاحب سندھی نہایت اطمینان سے اپنی جدوجہد میں مصروف تھے۔ لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ کچھ ایسے اسباب در پیش آئے کہ تعلیم کمال

سے زیادہ عرصہ جاری نہ رہ سکا۔ اور مولانا سندھی نے امروٹ شریف چھوڑنے کا فوری فیصلہ کر لیا۔ جن اسباب کی وجہ سے آپ کو امروٹ شریف چھوڑنا پڑا وہ یہ ہیں۔

حضرت مولانا عبیداللہ صاحب سندھیؒ امروٹ شریف میں بڑی پرسکون متاہل زندگی گذار رہے تھے کہ بعض ناسازگار حالات پیدا ہو گئے۔ قیام امروٹ کے آخری ایام میں آپ کی زوجہ محترمہ مختصر علالت کے بعد اس دار فانی سے رخصت ہو گئیں اور اپنے پیچھے دو ننھی معصوم بچیاں چھوڑ گئیں جن کی پرورش اور پرداخت کا مسئلہ حضرت مولانا عبیداللہ صاحب سندھی کے لئے ایک دردسر بن گیا۔ اس طرح حضرت مولانا سندھی ہر وقت متفکر رہنے لگے۔

اسی دوران میں حضرت مولانا سندھی اور حضرت مولانا امروٹیؒ کے درمیان دینی درس گاہ کے طریق کار میں اختلاف پیدا ہوئے۔ جو آخر میں مولانا سندھی کے امروٹ شریف چھوڑنے پر منتج ہوئے بات دراصل یہ تھی کہ جب امروٹ شریف میں یہ دینی مدرسہ قائم ہوا، اور وہ بتدریج فروغ پانے لگا تو یہ وہ دور تھا جب سلطنت برطانیہ کے زیر سایہ نیا نظام تعلیم رُو بہ ترقی تھا اور پرانا نظام تعلیم دم توڑ رہا تھا۔ مسلمانوں کی نئی پود کو انگریز اپنی مشینری کے پرزے بنانے کے لئے ملک کے گوشے گوشے میں اسکولوں کا ایک وسیع جال پھیلا رہا تھا۔ جو بچے ان اسکولوں میں تعلیم پاتے، ان کا مستقبل مادی لحاظ سے بڑا اچھا ہو جاتا اور ان کے مقابلے میں دینی مدارس میں تعلیم پانے والے بچے انگریزی سلطنت کے کارندوں کی نظر میں تو حقیر تھے ہی، لیکن خود مسلمان بھی ان کو ناکارہ اور معاشرہ پر ایک بوجھ سمجھنے لگے تھے۔ اس کے علاوہ یہ بھی تھا کہ مسلم معاشرہ کے ذہین اور اونچے خاندانوں کے بچے ان اسکولوں کی طرف کھنچتے جا رہے تھے۔ اور دینی مدارس کی طرف اکثر معاشی یا جسمانی لحاظ سے معذور بچے رجوع کرتے تھے۔ مولانا سندھی کا خیال تھا کہ دینی مدارس کے طلبہ کا معیار زندگی اتنا اونچا ہو کہ اونچے خاندانوں کے ذہین بچے بھی ان میں داخلہ لینے پر فخر محسوس کریں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ان کا ایک مستقل ہاسٹل ہو۔ جس میں ان کے لئے عمدہ خوراک اور عمدہ لباس کا بندوبست کیا جائے۔

مولانا سندھیؒ نے امروٹ شریف کی دینی درس گاہ کو اس طرز پر چلانا چاہا۔ لیکن اس عظیم کام کے لئے جن ذرائع اور وسائل کی ضرورت تھی، وہ وہاں بالکل ناپید تھے اور انہیں نہ مولانا سندھیؒ مہیا کر سکتے تھے نہ حضرت

مولانا تاج محمود امروٹیؒ اس کے علاوہ یہ دینی درس گاہ امروٹ شریف کی خانقاہ کے احاطہ میں قائم تھی جہاں حضرت مولانا امروٹی اپنے متوسلین کو روحانی فیوضات سے مستفید کرتے تھے۔ ان متوسلین کو تصوف کے مشہور طریقہ پر فقر فاقہ، صبر اور قناعت کی تلقین کی جاتی تھی۔ اب یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ ایک ہی جگہ طریقت کے طالب تو سادگی اور فقر فاقہ سے زندگی بسر کریں اور اسی وقت ان کے سامنے شریعت ظاہریہ کے تلامذہ ٹھاٹ سے رہیں یہی وجہ تھی کہ حضرت مولانا امروٹیؒ اس سلسلہ میں نہ صرف مولانا سندھی کی معاونت نہ کر سکے بلکہ ان کے اس خیال کی تائید پر بھی آمادہ نہ ہوئے نتیجہ یہ نکلا کہ مولانا سندھی مستقل طور پر ایک ذہنی کش مکش میں مبتلا ہو گئے۔

انہی دنوں میں پیر جھنڈہ کے دینی مدرسہ دارالرشاد کو ایک بہت بڑے دارالعلوم کی شکل دینے کے لئے ایک وسیع و عریض جدید طرز کی شاندار عمارت بنائی گئی۔ صاحب العَلَم حضرت رشداللہ صاحب بذات خود اس میں دلچسپی لے رہے تھے۔ ویسے بھی علمی لحاظ سے یہ مدرسہ سندھ میں ایک مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔ یہاں کا کتب خانہ ہندوپاکستان میں حیدرآباد دکن کے کتب خانہ کے بعد دوسرے درجہ پر تھا حضرت رشداللہ صاحب کو کسی ایسے جید عالم کی تلاش تھی جو قدیم اور جدید علوم کا مجمع ہونے کے علاوہ کام کی تڑپ اور جذبہ بھی رکھتا ہو حضرت مولانا سندھیؒ کی جدوجہد اور مساعی ان سے پوشیدہ نہیں تھیں۔ مولانا سندھی کو امروٹ میں اپنے کام کے سلسلے میں جو بےچینی اور بے اطمینانی تھی اس کا بھی ان کو علم تھا۔ آپ نے مولانا کو پیر جھنڈہ آکر کام کرنے کی دعوت دی، جو مولانا نے فوراً قبول کر لی۔ اور اس طرح امروٹ شریف کو الوداع کر کے پیر جھنڈہ چلے آئے۔

اس طرح مولانا سندھی کی سات سال سے جاری تمام اسکیمیں بند ہو گئیں اور آپ نے اب پیر جھنڈہ میں نئی علمی زندگی کا آغاز کیا۔

حضرت مولانا سندھی کے امروٹ چھوڑنے پر حضرت مولانا امروٹی کو بہت رنج اور ملال ہوا۔ آپ نے ان کو روکنے کی بہت کوشش کی، لیکن مولانا سندھیؒ اپنے عزم سے باز نہ آئے۔ بالآخر مولانا امروٹی نے بادل ناخواستہ ان کو الوداع کہا۔ پیر جھنڈہ کے دوران قیام میں بھی حضرت مولانا سندھیؒ اور حضرت مولانا امروٹی کے درمیان سیاسی اور علمی روابط بدستور قائم رہے۔

مولانا سندھی کے ہجرت کابل کے اکثر انتظامات بھی مولانا امروٹی نے کرلئے تھے۔ کابل پہنچکر بھی آپ نے حضرت مولانا امروٹیؒ کے ساتھ اپنا ربط قائم رکھا، چنانچہ حضرت مولانا امروٹی کی پہلی نظربندی ان ریشمی رومالوں کی وجہ سے ہوئی تھی، جو مولانا سندھی نے آپ کو کابل سے روانہ کئے تھے۔ نیز ان سات سالہ کارکردگی کا یہ اثر ہوا کہ حضرت مولانا سید تاج محمود صاحب امروٹیؒ جو بعد میں سندھ کی ایک عظیم روحانی اور سیاسی شخصیت بن چکے تھے، وطن عزیز کی آزادی کی جدوجہد میں نہایت سرگرمی سے حصہ لینے لگے اور ایک وقت آیا کہ امروٹ پورے سندھ میں سیاسی مرکزیت حاصل کرگیا۔ خصوصاً خلافت تحریک کے سلسلہ میں حضرت مولانا امروٹیؒ کی خدمات زرین حروف سے لکھنے کے قابل ہیں۔

میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ میں جس حکمت ولی اللہی کی دعوت دیتا ہوں، وہ شاہ ولی اللہ صاحب کی کتابوں میں مرتب اور مدون شکل میں موجود نہیں۔ دراصل اس زمانے میں اور ان حالات میں اس قسم کے فکر کی ترتیب اور تدوین کا کوئی امکان نہ تھا۔ مجھے اس کے ماننے میں بھی تامل نہیں کہ حضرت شاہ صاحب کی کتابوں میں بعض باتیں ایسی ہیں، جو ان کے زمانے سے تعلق رکھتی ہیں اور وہ آج بھرتی معلوم ہوتی ہیں۔ آپ اکثر دیکھیں گے کہ شاہ صاحب صفحے کے صفحے لکھ گئے ہیں، اور ان میں آپ کو ایک دو باتیں کام کی مل جاتی ہیں۔ میرا کام یہ ہے کہ میں طالب علموں کو ادھر متوجہ کروں تاکہ وہ ان کتابوں کا بالاستیعاب مطالعہ کریں۔

میں مانتا ہوں کہ آج کل کے ذہین نوجوانوں میں جو شکوک پیدا ہوتے ہیں، میں سب کا جواب نہیں دے سکتا لیکن میرا خیال ہے کہ ایک وقت آئے گا کہ یہ نوجوان شک سے بیزار ہوں گے، اور انہیں زندگی میں کسی مثبت فکر کی ضرورت محسوس ہوگی۔ میرے نزدیک شاہ ولی اللہ صاحب اسلام کی جو تعبیر کرتے ہیں وہ ہمارے نوجوانوں کے لئے اطمینان اور تسلی کا باعث ہوسکتی ہے۔

(ارشادات مولانا سندھیؒ)

امام ابو حامد غزالیؒ

حسینی امینی (بغداد)[1]

عباسیوں کے بغداد میں مدرسہ نظامیہ کے نام سے ایک مدرسہ تھا، جسے سلجوقیوں کے مشہور و معروف وزیر نظام الملک نے ۴۵۹ھ میں قائم کیا تھا۔ نظام الملک نے بغداد کے علاوہ سلطنت کے بعض دوسرے شہروں میں بھی اس قسم کے مدرسے قائم کئے تھے، اور انہیں بھی نظامیہ کہا جاتا تھا۔ اسی طرح کا ایک مدرسۂ نظامیہ نیشاپور میں بھی تھا، جس میں سب سے مشہور مدرس امام الحرمین ابوالمعالی عبدالملک جوینی متوفی ۴۷۸ھ تھے۔ یہ بڑے عالم و فاضل بزرگ تھے۔ اور طلبہ ان سے اس قدر مانوس تھے کہ کہا جاتا ہے جب ان کا انتقال ہوا تو طالب علموں نے شدت غم میں جامع مسجد کا وہ منبر توڑ دیا، جہاں سے ان کے شفیق استاد وعظ کہا کرتے تھے۔ اور انہوں نے اپنی قلمیں اور دواتیں بھی توڑ دیں، اور پورے ایک سال تک وہ درس و تدریس کو چھوڑے رہے، ان چار سو طالب علموں میں سے ایک طالب علم امام ابو حامد غزالی بھی تھے

نظام الملک کے بنائے ہوئے مدارس نظامیہ میں سے سب سے زیادہ شہرت بغداد کے نظامیہ کو حاصل ہوئی۔ جہاں کا کہ دور دراز سے طالبانِ علم قصد کرتے، اور جس میں ہر علم و فن کے متبحر اور مسلمہ علماء درس دیا کرتے تھے۔ انہی مدرسین میں سے، جو اپنے وقت میں بہت مشہور ہوئے، ایک مدرس حجۃ الاسلام

---

[1] جامعہ بغداد (عراق) کے "مجلہ کلیہ الآداب" میں شائع شدہ ایک عربی مضمون کا اردو ملخص۔ مولانا شبلی کی کتاب "الغزالی" کے حاشیے مترجم کے ہیں۔

ابوحامد الغزالی بھی تھے۔ یہ مدرسہ کوئی دو سال میں بن کر تیار ہوا تھا، اور بغداد کے مدرسہ مستنصریہ کے قیام سے پہلے وہ سب سے بڑا اور شان دار مدرسہ تھا۔ اس مدرسے کا قیام خاص طور سے فقہ شافعی کی تدریس کے لئے وجود میں آیا تھا اور واقف کی یہ شرط تھی کہ "اس میں مدرس، واعظ اور کتابوں کا متولی اصلاً اور فرعاً شافعی ہو"۔[1]

امام غزالی کا پورا نام محمد بن محمد بن محمد بن احمد ہے۔ وہ ۴۵۰ھ میں طوس میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا اُون کاتنے کا کاروبار تھا۔ اس بنا پر وہ الغزالی کے لقب سے منسوب ہوئے۔ وہ بچپن ہی میں اپنی ذہانت کی وجہ سے بڑے ممتاز تھے۔ امام غزالی نیشاپور کے مدرسہ نظامیہ میں داخل ہوئے اور وہاں انہیں امام الحرمین عبدالملک جوینی سا کامل استاد ملا۔ انہوں نے بہت دل لگا کر پڑھا، اور درس و مطالعہ میں بڑی محنت کی یہاں تک کہ ایک طرف وہ فقہ، کلام، اصول اور منطق میں ماہر ہو گئے۔ اور دوسری طرف انہوں نے حکمت اور فلسفہ میں بھی درک حاصل کیا۔ نیز مختلف علوم پر انہوں نے کئی کتابیں لکھیں۔ امام الحرمین کے انتقال کے بعد ایک علمی مجلس میں امام غزالی کی نظام الملک سے ملاقات ہوئی۔ اس مجلس میں دوسرے علماء بھی موجود تھے۔ ان کے اور امام غزالی کے درمیان کسی مسئلہ پر بحث چھڑ گئی، جس میں امام غزالی کا پلّہ بھاری رہا۔[2] اور انکے استدلال

---

[1] ابن الجوزی۔ المنتظم ج ۹ ص ۶۶

[2] مولانا شبلی اپنی کتاب "الغزالی" میں لکھتے ہیں:۔ "چونکہ ان (امام غزالی) کی علمی شہرت دور دور تک پہنچ چکی تھی، نظام الملک نے نہایت تعظیم و تکریم سے ان کا استقبال کیا۔ اُس وقت فضیلت اور کمال کے اظہار کا جو طریقہ تھا علمی مناظرات تھے۔ رؤساء و امراء کے دربار میں علماء اور فضلاء کا مجمع ہوتا تھا۔ اور مسائل علمی پر مناظرانہ گفتگوئیں ہوتی تھیں۔ جو شخص زور تقریر سے حریفوں کا منہ بند کر دیتا تھا، وہی سب سے ممتاز سمجھا جاتا تھا۔۔ امام غزالی نظام الملک کے دربار میں پہنچے، تو سیکڑوں اہل کمال کا مجمع تھا۔ نظام الملک نے مناظرہ کی مجلس منعقد کی۔ متعدد جلسے ہوئے اور مختلف مضامین پر بحثیں رہیں۔ ہر معرکہ میں امام صاحب ہی غالب رہے۔ اس کامیابی نے امام صاحب کی شہرت کو چمکا دیا۔ اور تمام اطراف و دیار میں اس کے چرچے پھیل گئے۔ (ابن خلکان)

اور زور بیان کے سامنے کوئی نہ ٹھہر سکا، سب علماء نے ان کے علم و فضل کا اعتراف کیا۔ اور نظام الملک کے دل میں ان کا بڑا احترام پیدا ہو گیا۔ چنانچہ اس نے امام غزالی کو مدرسہ نظامیہ بغداد میں مدرس و استاد مقرر کر دیا۔[1]

علوم و فنون میں تبحر و مہارت کے باوجود امام صاحب نے اپنا مطالعہ برابر جاری رکھا، اور ان کی ہمیشہ یہی کوشش رہی کہ ان پر نئے سے نئے حقائق واشگاف ہوں، اور وہ اس راہ میں برابر آگے بڑھتے جائیں چنانچہ اس سلسلے میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں :-

"عنفوان شباب سے لے کر جب میں بلوغ کو پہنچا تھا، اس وقت تک، جب کہ میری عمر پچاس کے قریب ہے، میں اس گہرے سمندر کی موجوں میں گھس رہا ہوں اور اس کی گہرائیوں میں غوطہ زن رہا ہوں۔ ایک جرأت مند آدمی کی طرح نہ کہ ایک بزدل اور جھجکنے والے کی طرح میں ہر اندھیرے میں کودا اور ہر مشکل مسئلے پر لپکا ہوں میں نے ہر فرقے کے عقیدے کی چھان بین کی۔ اور ہر گروہ کے اسرار مذہب کا کھوج لگایا۔ تاکہ میں حق پرست اور باطل پرست اور سنت پر چلنے والے اور بدعتی میں تمیز کر سکوں۔ میں نے ہر فرقہ باطنیہ والے کی باطنیت اور ہر ظاہری فرقے والے کی ظاہریت کا جو حاصل ہے اس پر یہ مطلع ہونا چاہا۔ میں نے کسی فلسفی کو نہیں چھوڑا کہ اس کے فلسفے کی کنہ و حقیقت سے واقف ہونے کی کوشش نہ کروں کسی متکلم یعنی علم کلام والے کو نہیں چھوڑا کہ اس کے کلام اور اس کے بحث و نظر کے مقصد و مدعا سے واقف نہ ہوں۔ کسی صوفی کو نہیں چھوڑا کہ اس کی صوفیت کے راز پر اطلاع پانے کی خواہش نہ کروں۔ کسی عابد و زاہد کو نہیں چھوڑا کہ یہ معلوم نہ کروں کہ اس کی عبادت کا حاصل مقصود کیا ہے۔ اور اسی طرح کسی زندیق کو نہیں چھوڑا کہ اس کے بارے میں یہ سراغ نہ لگاؤں کہ اس کی اس جرأت زندیقی کے کیا اسباب ہیں۔ غرضکہ ابتدا سے اور عنفوان شباب ہی سے حقائق کے ادراک کی پیاس میرا معمول رہی ہے۔ اور یہ خاصیت اللہ تعالیٰ نے میری جبلت اور فطرت میں رکھی ہے۔ اور میرے اختیار یا

---

[1] امام صاحب کی عمر اس وقت صرف ۳۴ برس سے زیادہ نہ تھی۔ اس عمر میں نظامیہ کی افسری حاصل کرنا ایک ایسا فخر تھا، جو امام صاحب کے سوا کسی کو کبھی حاصل نہیں ہوا۔ (الغزالی از مولانا شبلی)

میری کوشش کا نتیجہ نہیں؟

ایک تو اللہ تعالیٰ نے امام غزالی کو بحث و تحقیق، تجسس و تدقیق اور ہر چیز کے اصل اسباب کا سراغ لگانے کی یہ جبلت عطا کی تھی، اور دوسرے وہ جس زمانے میں پیدا ہوئے، اور بعد میں جو ماحول انہیں ملا، وہ انتہائی اضطراب اور انتشار سے بھرپور تھا۔ اس وقت خلافت عباسیہ میں ضعف آچکا تھا، اور وہ بڑی سرعت سے زوال پذیر تھی۔ مسلم معاشرہ فقہی گروہ بندیوں اور کلامی کشمکشوں کا اکھاڑا بنا ہوا تھا۔ اور اس میں طرح طرح کے مذہبی فرقے بکثرت موجود تھے امام غزالی ہی کے زمانے میں صلیبی جنگوں کا بھی سلسلہ شروع ہوا ایک طرف تو یہ حالت تھی، دوسری طرف اسی عہد میں مدارس کے قیام کی تحریک بڑے زوروں پر شروع تھی اور علماء کی بڑی کثرت تھی اور اس کے ساتھ ساتھ تصوف پھیل رہا تھا۔ اس کے علاوہ اسی زمانے میں یونانی فلسفے کے زیر اثر ایسے فرقوں کا ظہور ہوا جنہیں امام غزالی نے دہریت، طبیعت اور الہیت کے نام دیئے ہیں۔ امام صاحب نے فلسفیوں پر تنقید کی اور ان کے رد میں اپنی مشہور کتاب "تہافتہ الفلاسفہ" لکھی امام غزالی کے نزدیک فلسفی دین کے لئے ایک خطرہ ہیں، کیونکہ وہ شریعت اور اس کی حدود کا احترام نہیں کرتے اور شعائر دین کو نظر حقارت دیکھتے ہیں انہوں نے خود فلسفہ کا مطالعہ کیا تاکہ وہ اس سے پوری طرح واقف ہوں اور اس کی کمزوریوں کو سمجھیں۔ فلسفے کا یہ مطالعہ انہیں ایک نئے فکری مذہب کی طرف لے گیا جس کا بنیادی نقطہ شک ہے۔ انتشار کا یہ دور جس میں کہ امام غزالی کی زندگی گزری اور جس میں کہ افکار و آراء اور فقہی مذاہب و مذہبی گروہوں میں باہم اس قدر تصادم تھا یقیناً اس کے اثرات امام صاحب کے درس و تدریس، بحث و مطالعہ، علمی نقطۂ نظر اور فکری تبدیلیوں پر پڑے۔ وہ ایک ذہین و محنتی طالب علم سے ترقی کر کے اس بلند مقام پر پہنچے کہ وہ امام اور حجتہ الاسلام کہلائے۔ پھر وہ مدرسہ نظامیہ بغداد میں استاد مقرر ہوئے۔ اور فقہ اور علم کلام کی تعلیم دینے لگے۔ اس زمانے کے حالات اور اس میں جو افکار و آراء تھے، ان کا ہی اثر تھا کہ اس وقت امام صاحب میں ایک فکری انقلاب رونما ہوا۔ اور انہوں نے مدرسہ نظامیہ میں درس و تدریس چھوڑ کر زہد کی زندگی اختیار کر لی اور آخر میں وہ طوس شہر میں زاویہ نشین ہو کر بیٹھ گئے اور ہمہ تن تصنیف و تالیف ہی میں لگ گئے۔

امام غزالی کے افکار و آراء ان میں بعد میں جو ذہنی انقلاب ہوا، اُن سے اُس زندگی کا جو اُس وقت

بغداد کی تھی، بڑا گہرا تعلق ہے۔ ان کے عہد میں بغداد لوگوں کی نظروں کا کعبہ مقصود تھا۔ وہاں علماء کی بڑی ریل پیل رہتی تھی۔ طرح طرح کے خیالات اور اعتقادات آپس میں ٹکراتے تھے۔ مدارس اور علمی مرکزوں کی بڑی کثرت تھی۔ [1]

امام غزالی ۴۸۴ھ میں جب بغداد میں وارد ہوئے، تو ان کی عمر ۳۴ سال کی تھی۔ انہوں نے نظامیہ میں درس دینا شروع کیا تو ان کی طرف طلبہ کا عام رجوع ہوا اور درس سننے کے لئے بکثرت لوگ آنے لگے اس کے علاوہ سب کے سب ان کے اخلاق، علم اور وسعتِ معلومات کے بھی گرویدہ ہو گئے اور ان کے درس میں بڑے بڑے علماء اور فقہا نے آنا شروع کر دیا، جن میں سے خاص طور پر قابل ذکر ابو الخطاب اور ابن عقیل ہیں۔ اور یہ دونوں کے دونوں حنبلی تھے غرضکہ مدرسۂ نظامیہ میں امام غزالی کا تعلیم وتدریس کا یہ دور ایک طرف علم وفکر سے بھر پور تھا، اور دوسری طرف طلبہ کا جمّ غفیر تھا، جو ہر وقت ان کا احاطہ کئے رہتا اور جو کچھ ان کی زبان سے نکلتا، وہ بڑے ذوق وشوق سے اسے سنتے، اور دلوں میں جگہ دیتے [2]

---

[1] مولانا شبلی "الغزالی" میں لکھتے ہیں ۔۔ امام صاحب نے جس قسم کی تعلیم وتربیت پائی تھی اس کا مقتضیٰ یہ تھا کہ وہ اپنے اہل مذہب کے طریقے کے سوا کسی طرف التفات نہ کرتے۔ چنانچہ ان کے تمام ہمعصروں کی یہی حالت رہی لیکن امام صاحب ابتدا ہی سے ایک خاص قسم کی طبیعت رکھتے تھے۔ ان کا مذاق یہ تھا کہ ان کے سامنے جس قدر مذہبی فرقے موجود تھے اور ان کے جو عقائد اور خیالات تھے، سب پر وہ غور کی نگاہ ڈالتے تھے نیشاپور وغیرہ میں سلجوقیہ کے اثر کی بدولت دوسرے مذاہب کا بہت کم چرچا تھا۔ لیکن بغداد دنیا بھر کے عقائد اور خیالات کا دنگل تھا۔ اس زمین پر قدم رکھ کر ہر شخص پورا آزاد ہو جاتا تھا اور جو کچھ چاہتا تھا کہہ سکتا تھا۔ شیعی، سُنّی، معتزلی، زندیق، ملحد، مجوسی، عیسائی، بغداد ہی کے دنگل میں باہم علمی لڑائیاں لڑتے تھے۔ اور کوئی شخص ان سے معترض نہیں ہو سکتا تھا۔ اس آزادی کی بدولت ہر قسم کے مختلف عقائد وخیالات پھیلے ہوئے تھے۔

[2] ان کے درس میں تین سو مدرسین اور سو امراء روساء حاضر ہوتے تھے۔ درس کے علاوہ خود وعظ بھی فرماتے تھے ۔۔۔ یہ وعظ بھی درحقیقت علمی لیکچر ہوتے تھے ۔۔۔ ایک سو تراسی وعظ قلمبند کئے گئے، جن کا مجموعہ دو ضخیم جلدوں میں تیار ہوا ۔۔۔ (الغزالی)

۴۸۸ھ میں امام غزالی نے مدرسۂ نظامیہ میں درس دینا چھوڑ دیا، اور وہ بغداد سے شام روانہ ہوگئے۔ [1] جہاں انہوں نے دو سال قیام کیا۔ یہ مدت انہوں نے عزلت نشینی اور اعتکاف میں گزاری۔ شام سے وہ بیت المقدس گئے اور مسجد صخرہ میں قیام فرمایا اور پھر انہوں نے حج کا ارادہ کیا۔ فریضۂ حج ادا کرنے کے بعد وہ مدینہ منورہ گئے اور ایک مدت مدینہ میں آپ کا قیام رہا۔ اب ان کے دل میں بیوی بچوں اور خاندان کا خیال آیا۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں: "مجھے بال بچوں کے خیال اور ان کی آواز نے وطن کی طرف کھینچا، اور میں وطن لوٹا حالانکہ میں اس کی طرف لوٹنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا، لیکن وطن میں بھی میں نے عزلت کو ترجیح دی تاکہ مجھے تنہائی اور خلوت میسر آئے۔ اور میں ذکر و فکر کرسکوں زمانے کے حوادث، اولاد و اطفال کے مسائل اور معاش کی ضروریات حصولِ مراد میں حارج اور خلوت کی صفائی قلب میں تشویش کا باعث ہوتی ہیں"

امام غزالی نے تقریباً تمام اسلامی دنیا کی سیاحت کی تھی۔ وہ مصر بھی گئے۔ قاہرہ اور اسکندریہ میں بھی ان کا جانا ہوا۔ اور ان دونوں شہروں میں وہ ایک مدت قیام فرما ہوئے۔ اس دوران سیاحت میں انہوں نے اپنی کتاب "احیاء علوم الدین" مکمل کی وہ جہاں کہیں بھی جاتے، جلوت پر خلوت کو مقدم رکھتے۔ اور اس خلوت میں ان کے پیش نظر طریقہ تصوف ہوتا۔ اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں: "ان خلوتوں میں مجھ پر

---

[1] "۔۔۔۔ ادھر اپنے اشغال کو دیکھا، تو کوئی خلوص پر مبنی نہ تھا۔ درس و تدریس کی طرف طبیعت کا میلان اس وجہ سے تھا کہ وہ جاہ پرستی اور شہرت عامہ کا ذریعہ تھا۔ ان واقعات نے دل میں تحریک پیدا کی کہ بغداد سے نکل کھڑا ہوں۔ اور تمام تعلقات کو چھوڑ دوں یہ خیال رجب ۴۸۸ھ میں پیدا ہوا۔ لیکن چھ مہینے تک لیت و لعل میں گزرے۔ نفس کسی طرح گوارا نہیں کرتا تھا کہ اس بڑی عظمت و جاہ سے دست بردار ہوجائے۔ ان ترددات میں نوبت یہاں تک پہنچی کہ زبان رک چلی۔ درس دینا بند ہوگیا۔ رفتہ رفتہ ہضم کی قوت جاتی رہی۔ آخر طبیبوں نے علاج سے ہاتھ اٹھالیا اور کہہ دیا کہ ایسی حالت میں علاج کچھ سودمند نہیں ہوسکتا۔ بالآخر میں نے سفر کا قطعی ارادہ کرلیا۔"

المنقذ من الضلال (الغزالی)

جو امور منکشف ہوئے، ان کا احاطہ و استقصا نہیں ہوسکتا۔ ان میں سے صرف ایک حصہ میں بیان کرتا ہوں تاکہ اس سے فائدہ اٹھایا جائے۔ میں نے یقینی طور سے یہ جان لیا کہ صوفیہ ہی بالخصوص اللہ کے راستے پر سب سے آگے ہیں۔ ان کی سیرت سب سے اچھی، ان کا طریقہ سب سے صحیح اور ان کے اخلاق سب سے بہتر ہیں ..... اور ان کی تمام حرکات و سکنات اپنے ظاہر و باطن میں شمع نبوت کے نور سے منور ہیں "

امام غزالی علم الکلام اور عقلیت سے کس طرح تصوف تک پہنچے اور انہوں نے نظامیہ بغداد میں درس و تدریس کی زندگی کے بجائے عزلت نشینی اختیار کی۔ اس کو سمجھنے کے لئے آپ کے یہ پیش نظر رہنا چاہئے کہ ان کی طبیعت میں تلاش اور جستجو کا ملکہ شروع سے تھا اور جب تک وہ کسی مسئلے کے تمام پہلوؤں کا احصار نہ کر لیتے، وہ اس کے بارے میں قطعی رائے نہ دیتے تھے مذہب شک تک پھر وہ بعد میں پہنچے، یہ رجحان دراصل ان میں ابتدا سے تھا۔ لیکن امام غزالی شک کو حرف آخر نہیں سمجھتے۔ بلکہ ان کے نزدیک شک ذریعہ ہے حق الیقین تک پہنچنے کا فرماتے ہیں "اگر کوئی شخص کہے کہ تین کا عدد دس سے بڑا ہے اور اس کی دلیل وہ یہ دے کہ میں لاٹھی کو سانپ میں تبدیل کر سکتا ہوں۔ اور وہ فعلاً ایسا کر دے اور میں اسے دیکھوں بھی، تو میں اس کی وجہ سے اپنے اس علم میں کہ دس کا عدد تین سے بڑا ہے شک نہیں کروں گا۔ البتہ اس نے لاٹھی کو جس طرح سانپ میں تبدیل کر دیا ہے اس کی قدرت پر تعجب ضرور ہوگا۔ اس سے میں نے یہ جانا کہ ہر وہ علم جو مجھے اس طرح حاصل نہیں ہوتا اور نہ میں اس طرح یقین کرتا ہوں وہ علم ناقابل اعتبار ہے اور اس میں آدمی غلطی سے مامون نہیں ہوسکتا۔ اور جس علم میں آدمی غلطی سے مامون نہ ہو۔ وہ علم یقینی نہیں ہوتا۔"

اس کے بعد امام غزالی نے جملہ علوم کی تحقیق شروع کی اس طرح ان میں سے اکثر کے بارے میں جو معلومات انہیں حاصل تھیں ان پر انہیں شک ہونے لگا۔ اور یہ شک اتنا آگے بڑھا کہ وہ اپنے یقین پر بھی شک کرنے لگے۔ یہ چیز تو جانی بوجھی ہے کہ یقین کی بنیاد حس ہے اور حس کے متعلق ضروری نہیں کہ اس کا تاثر ہمیشہ صحیح ہو۔ امام غزالی فرماتے ہیں "میں کوشش بلیغ کے ساتھ ادھر متوجہ ہوا اور محسوسات اور ضروریات پر غور کرنے لگا میں نے سوچا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ میں خود اپنی ذات پر شک کروں آخر میں مجھے اس طرف سے شک ہو گیا کہ میرا نفس محسوسات میں بھی غلطی سے مامون نہیں" تشکک کے یہ مراحل طے کرتے ہوئے وہ محسوسات سے عقلیات پر پہنچے، اور آخر الذکر پر ان کو اعتماد ہوا۔ لیکن

آگے چل کر وہ عقلیات پر بھی شک کرنے لگے۔ فرماتے ہیں۔ محسوسات نے کہا کہ اس کا کیا بھروسہ کہ تمہارا عقلیات پر
ایسا ہی اعتماد ہو، جیسے محسوسات پر تھا۔ تم تو ہم پر بھی اعتماد کرتے تھے چنانچہ حاکمِ عقل کا ورود ہوا، اور اس نے ہمیں
جھٹلایا اور اگر حاکمِ عقل نہ ہوتا، تو تم پہلے کی طرح ہم (محسوسات) پر اعتماد کرتے رہتے، ہو سکتا ہے کہ ادراکِ عقلی
کے بعد بھی کوئی اور حاکم ہو"

اس طرح امام غزالی کشمکشِ افکار سے دو چار ہوتے ہیں اور ان کا تشکک آگے بڑھتا ہے اور آخر
میں ان کا اعتماد "ضروریاتِ عقلی" پر جا کر ٹھہرتا ہے۔ کیسے؟ یہ وہ نہیں بتاتے۔ ارشاد ہوتا ہے:۔ "یہ نور تھا، جو
اللہ تعالےٰ نے سینے میں ڈالا اور یہی نور بیشتر معرفتوں کی کنجی ہے۔"

آپ نے دیکھا کہ کس طرح امام غزالی لوگوں میں، علوم میں، اور ان کے گرد و پیش جو کچھ ہو رہا تھا، ان سب
میں شک کرتے ہیں۔ اور آخر اُن کا یہ شک انہیں علم الیقین تک پہنچا دیتا ہے وہ اس بارے میں لکھتے ہیں۔ "یہ
شکوک بھی حق کے لئے ایک موجب ہے جس نے شک نہیں کیا، اس نے دیکھا نہیں، اور جس نے دیکھا نہیں، اسے
کوئی چیز نظر نہیں آئی، وہ اندھے پن اور گمراہی میں رہا۔" اس کا قدرتی نتیجہ یہ نکلا کہ جس چیز پر بھی ان کی نظر
پڑتی تھی یا جو چیز وہ کانوں کے ذریعہ سنتے تھے ان کا شک انہیں اس کے بارے میں سوچنے پر آمادہ کرتا تھا
اور وہ اس پر غور و خوض کرتے تھے، معلوم ہوتا ہے کہ ان کی لوگوں سے کنارہ کشی اور الگ خلوت میں بیٹھنا اسی لئے
تھا کہ وہ اُن امور پر جو زندگی میں انہیں پیش آئے تھے، علیحدگی میں اطمینان سے غور کر سکیں۔ اور ان کے بارے
میں شک سے یقین پر پہنچیں چنانچہ یہی وہ عوامل تھے، جنہوں نے امام غزالی کو مجبور کیا کہ وہ بغداد چھوڑیں۔
مدرسہ نظامیہ میں تعلیم و تدریس چھوڑیں لوگوں سے الگ تھلگ ہو کر گوشۂ عزلت ڈھونڈیں۔ اور اپنے
شکوک کا مداوا کریں۔

امام غزالی ۴۸۴ھ سے ۴۸۸ھ تک بغداد میں رہے بغداد آنے سے پہلے قدرتی طور پر امام صاحب
کے دل میں "مقام خلافت" کے بارے میں بڑی عقیدت اور احترام ہوگا اور وہ اس کے متعلق بڑے اچھے خیالات
رکھتے ہوں گے، لیکن جب وہ بغداد پہنچے اور وہاں انہوں نے وہ سب عیش و عشرت لہو و لعب، فسق و فجور
اور منکرات دیکھیں، جن سے کہ اس زمانے کا بغداد بھرا ہوا تھا۔ تو اس کا ان پر شدید ردِ عمل ہوا ہوگا اور اس کی

دیرسے وہ تدریجاً تصوف کی طرف مائل ہو گئے۔ جس کی تعلیم وہ پہلے یوسف النساج سے حاصل کر چکے تھے یعنی تصوف کا بیج پہلے موجود تھا بغداد کی زندگی کے حالات و کوائف نے اسے نمی بخشی، اور وہ پھوٹ کر بال و پر لایا۔

بعض مورخین نے لکھا ہے کہ امام غزالی کے فرمانروائے مراکش یوسف بن تاشفین کے ساتھ روابط تھے، اور عباسی خلیفہ کو یہ پسند نہ تھا۔ چنانچہ وہ اکثر امام صاحب سے اعراض برتا کرتا تھا۔ جب انہیں یہ محسوس ہوا۔ تو انہوں نے یہی مناسب سمجھا کہ بغداد سے نکل جائیں۔

اس ضمن میں یہ بھی پیش نظر رہے کہ جب امام غزالی طوس سے بغداد گئے اور نظامیہ بغداد میں درس و تدریس شروع کیا تھا، تو وہ شادی شدہ تھے، اور ان کی اولاد تھی، جو طوس ہی میں سکونت پذیر رہی۔ امام صاحب بغداد میں تجرد کی زندگی گزارتے تھے۔ الغرض امام غزالی کی ذات گرامی ایک مستقل مکتب فکر تھی، جس کا اثر و نفوذ بہت دور دور تک پھیلا۔ اور بعد والوں نے ان کا اتباع کیا [1]

---

[1] آج تقریباً تمام دنیا میں الٰہیات نبوت اور معاد کے متعلق مسلمانوں کے جو معتقدات و مسلمات ہیں وہی ہیں، جو امام صاحب کے مقرر کردہ ہیں۔ (ابعد کی) جس قدر مشہور تصنیفات (کلام) ہیں سب امام صاحب کے ہی عقائد کے گویا شرح و حاشیے ہیں۔ حضرات صوفیہ اور علمائے اسلام سر تا پا اس الٰہیات کے پیرو ہیں، جس کو امام غزالی نے اسرار شریعت سے تعبیر کیا ہے اور جس کی نسبت ان کو نہایت اصرار ہے کہ عام نہ ہونے پائے۔ حضرات صوفیا اور فلاسفۂ اسلام کے سرگروہ مولانا روم شیخ الاشراق ابن رشد اور شاہ ولی اللہ صاحب ہیں۔ ان بزرگوں کی تصنیفات درحقیقت امام صاحب ہی کے خیالات کا نمونہ ہیں تعجب یہ ہے کہ علامہ صدرالدین شیرازی باوجود اختلاف مذہب کے الٰہیات میں امام غزالی کے خوشہ چین ہیں۔ اور سند کے طور پر امام صاحب کی عبارت صفحہ کے صفحے نقل کرتے جاتے ہیں۔ (الغزالی)

خود امام غزالی نے بھی پہلوؤں سے بڑی آزادی سے فائدہ اٹھایا۔ اس سلسلے میں مولانا شبلی لکھتے ہیں:۔ تحقیقات کے شوق میں امام صاحب نے فلسفہ اور عقلیات کی کتابیں بھی پڑھیں اور ان فنون میں مجتہدانہ کمال پیدا کیا فلسفہ کی تصنیفات میں سے جو کتابیں زیادہ تر ان کے مطالعہ میں رہیں، بوعلی سینا کی تصنیفات اور ابن مسکویہ کی کتاب تہذیب الاخلاق تھی امام مازری شارح صحیح مسلم کا بیان ہے کہ میں نے غزالی کے شاگردوں سے سنا کہ وہ اخوان الصفا کے رسالے اکثر دیکھا کرتے تھے امام صاحب نے خود بھی ایک موقعہ پر اخوان الصفا کا ذکر کیا ہے۔" (الغزالی)

ان کے معترضین میں سے ایک امام ابن القیم ہیں جنہوں نے امام غزالی پر بیس مسئلوں کے بارے میں اعتراضات کئے ہیں۔ ان کا سب سے بڑا اعتراض آپ کے اس قول پر ہے "لیس فی الامکان ابدع مما کان" (جو ہے اس سے بہتر ممکن نہیں) ابن قیم کے نزدیک اس کے معنی یہ ہوئے کہ اللہ تعالیٰ اس سے بہتر پیدا کرنے سے عاجز ہے اور یہ گویا اس کی قدرت کا عجز ہوا۔ جو کسی طرح بھی صحیح نہیں لیکن امام غزالی کا اس سے مطلب دراصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ پیدا کیا ہے وہ اس قدر اعلیٰ ہے کہ اس سے اعلیٰ اور کوئی چیز ہو نہیں سکتی اس سے ان کی مراد تخلیق کی عظمت کا اثبات ہے نہ کہ باری تعالیٰ کی قدرت کے عجز کا اظہار۔

امام غزالی کا سب سے بڑا علمی کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے دین کو عقل کے قیاس آرائی کی عقل نہیں بلکہ علمی اور "اعتیادی" عقل کے قریب کیا۔ اور عام ذہنوں کے لئے اس کی باریکیاں آشکار کیں، درآں حالیکہ ان کے اور ان کے پہلے زمانے میں اکثر فقہا اور اصحاب دین معموں میں باتیں کیا کرتے تھے۔ اور ابہام اور پیچیدگی ان کا مسلک تھا۔ امام غزالی نے دین کو عقلِ علمی یا "اعتیادی" سے قریب کر کے دین کا مرتبہ کم نہیں کیا۔ بلکہ ایمان کو اس کی اساس قرار دیکر دین کو فکر بلند کی قوت عطا کی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ امام غزالی ان تمام اوصاف کے حامل تھے جو ایک عالم کے ہوتے ہیں۔ ان میں علم تھا۔ ادب تھا۔ تواضع تھی اور اخلاق حسنہ رکھتے وہ ایک زاہد و عبادت گزار صوفی تھے۔ انہوں نے بدعات کے خلاف جہاد کیا وہ ایک کامل استاد تھے۔ ان کے مواعظ و نصائح اب تک دلوں کو متاثر کرتے ہیں وہ ایک بلند پایہ مصنف تھے۔ ان کی ذات میں بڑی خوبیاں جمع تھیں آپ کا ۵۰۵ھ میں جمادی الثانی کی چودھویں تاریخ کو انتقال ہوا اور وہ طوس میں مشہور شاعر فردوسی کی قبر کے قریب دفن کئے گئے۔

فلسفہ کو بخوبی سمجھ لینے کے بعد میں نے جان لیا کہ جو غرض ہے اس کے لئے یہ بھی غیر کافی ہے اور عقل جمیع مطالب کے احاطے کے لئے کافی نہیں ہے۔ اور نہ تمام مشکلات سے پردہ اٹھانے والی ہے۔

(امام الغزالی)

شاہ ولی اللہ اور علوم نقلیہ[1]

مولانا محمد عبداللہ عمرپوری

علوم نقلیہ میں حضرت شاہ صاحب کی وسعت نظر، اصابت فکر اور جامعیت کا شاید ہی کوئی ہو جو انکار کر سکے۔ وہ جس مسئلے پر بحث کرتے ہیں، اس کے تمام پہلوؤں کا پورا احاطہ فرماتے ہیں۔ ان میں الجھے ہوئے مطالب کی اس طرح وضاحت ہوتی ہے اور اختلافات میں یوں تطبیق دی جاتی ہے کہ قاری کو پورا اطمینان ہو جاتا ہے۔

علوم نقلیہ کے اہم شعبوں میں شاہ صاحب کی جو شاندار خدمات ہیں، اب میں مختصراً ان کو بیان کروں گا۔

علوم القرآن

سرزمین پاک و ہند میں شاہ صاحب پہلے بزرگ ہیں، جنہوں نے قرآن مجید کا ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ فارسی میں ہے اور اس پر مختصر فوائد بھی ہیں۔ آپ نے اپنے مجوزہ نصاب تعلیم میں قرآن مجید کا ترجمہ لازمی قرار دیا اور اس کی تشریح کے لئے قرآن کی مختصر ترین تفسیر جلالین کا اضافہ کیا۔ (ملاحظہ ہو رسالہ دانش مندی و رسالہ وصیت) قرآن مجید کے جملہ مطالب کا اجمالی تعارف کرانے کے لئے شاہ صاحب نے الفوز الکبیر لکھی۔ اور

---

[1] اس سلسلے کے دو مضمون جولائی اور اگست کے شماروں میں شائع ہو چکے ہیں۔

فتح الخبیر تصنیف فرماکر تفسیر بالرائے کے بجائے تفسیر بالروایت کی طرف متوجہ کیا۔

دراصل شاہ صاحب کے پیش نظر یہ تھا کہ تعلیم کے ابتدائی مرحلے ہی میں طالب علم کا قرآن کریم سے براہ راست تعلق ہو جائے۔ اور وہ ہر شعبہ علم میں، روایت میں بھی اور درایت میں بھی، قرآن ہی کو اپنی بنیاد بنائے اور ہر مسئلے میں سب سے پہلے اس کی توجہ قرآن کی طرف مبذول ہو، اور اس سے حل ڈھونڈے۔

قرآن مجید کے غامض اور مشکل مباحث کی تشریح شاہ صاحب نے اپنی مختلف کتابوں میں بڑی وضاحت سے کی ہے۔ قرآن کریم کا اکثر حصہ حضرات انبیاء علیہم السلام کے قصص و واقعات پر مشتمل ہے شاہ صاحب نے تاویل الاحادیث میں ان کی حکمت بیان کی ہے اور حضرت آدم علیہ السلام سے لیکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک سلسلۂ نبوت کے ارتقاء میں جو تدبیر ملحوظ تھی، اسے بیان کیا ہے۔

علوم الحدیث

علوم دینیہ میں علم حدیث کا درجہ بڑا بلند ہے۔ قرآن کریم کی تفسیر و تشریح اس کے بغیر غیر معتبر ہے۔ علم فقہ کی بنیاد اسی پر ہے۔ علم اصول دین و معتقدات اسی کا محتاج ہے اور تاریخ اسلام اس کے بغیر ناتمام رہتی ہے۔ برصغیر میں عمومی فتوحات اسلامیہ غزنوی سلاطین سے شروع ہوئیں اور ان کے مراکز لاہور اور ملتان میں۔ زیادہ تر علماء کا وہ گروہ وارد ہوا۔ جس پر عقلیت اور اس کے بعد فقہ حنفی غالب تھی ان کے شاگردوں میں سے مولوی عبداللہ اور مولوی عزیز اللہ برادران تلمبہ نواح ملتان سے دہلی پہنچے۔ اور اپنے استادوں کے طرز پر وہاں مسند درس و تدریس بچھائی، ان کے حلقہ درس میں ہندوستان کی ہر طرف سے طالب علم شریک ہونے لگے۔ اور اس طرح یہ سلسلہ برصغیر میں رواج پاگیا۔ یہ ان دیار کی خوش قسمتی تھی کہ ۹۵۸ھ میں شیر شاہ سوری کے عہد میں شیخ سیف الدین ترک کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا، جو بعد میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے نام نامی سے مشہور ہوا۔ آپ اڑتیس سال کی عمر میں حج کے لئے تشریف لے گئے۔ اور حجاز میں کئی سال رہے۔ اور وہاں علم حدیث کی تحصیل کی۔ شیخ عبدالحق حضرت شیخ علی متقی مکی مشہور محدث کے شاگرد رشید اور ملک العلماء حضرت ملا علی قاری کے ہم درس تھے۔ حجاز سے واپس

پر دہلی میں آپ نے حدیث کا درس شروع کیا۔ اور اس طرح ان دیار میں تدریس حدیث کی طرح پڑی۔

اگرچہ اُس عہد میں حاجی محمد افضل سیالکوٹی کا بھی علم حدیث کا اپنا سلسلۂ تدریس تھا، لیکن زیادہ شہرت حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی ہی کی ہوئی، آپ نے مشکوٰۃ المصابیح کی دو شرحیں ایک فارسی اور ایک عربی میں لکھی۔ آپ کو فقہ حنفی میں بڑا غلو تھا۔ یہاں تک کہ ان ضعیف حدیثوں کو جو فقہ حنفی کے مطابق ہوتیں احادیث صحیحہ پر ترجیح دیا کرتے۔ ان کے بارے میں حضرت مجدد الف ثانی کا یہ مقولہ مشہور ہے "سنی سنت۔ حنفی چپت"۔

شاہ ولی اللہ نے علم حدیث اپنے والد سے پڑھا، جن کا سلسلۂ تلمذ حاجی محمد افضل سے ملتا ہے۔ بعد میں آپ حجاز تشریف لے گئے، اور وہاں کے اساتذۂ کاملین سے نئے سرے سے اسی علم کو حاصل کیا وطن واپس آکر آپ نے تعلیم حدیث کا طرز بدل دیا۔ اور بجائے مشکوٰۃ کے موطا، امام مالک کی تدریس پر زور دینے لگے۔ المسوی اور المصفّٰی اسی کی عربی اور فارسی میں شرحیں ہیں۔ جس طرح آپ نے قرآن کریم کی تعلیم اپنے فارسی ترجمے فتح الرحمٰن سے شروع کرنے کی تلقین کی اس طرح علم حدیث کے درس میں المسوی اور المصفّٰی کو ابتدائی اور حجۃ اللہ البالغہ کو تکمیلی کتاب قرار دیا۔

موطا امام مالک کے بعد صحتِ روایتِ حدیث اور استنباطِ مسائل میں صحیح بخاری کا مرتبہ ہے اس کے ابواب کے متعلق مشہور ہے کہ بڑے دقیق اور مشکل ہیں شاہ صاحب نے اس سلسلے میں تراجم ابواب البخاری تالیف فرمائی عوام کے لئے چہل حدیث نام سے ایسی چالیس حدیثیں جمع کیں جو بہت مختصر سہل اور پرمعنی ہیں آپ کے فرزند اکبر کے نواسے شاہ محمد اسحاق نے مشکوٰۃ کی اردو میں چار ضخیم جلدوں میں مظاہر الحق کے نام سے شرح لکھی۔

اصول حدیث

شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے علم حدیث کی تدریس کے سلسلے میں علم اصول حدیث پر ایک رسالہ لکھا تھا۔ جو کہ مقدمۂ شیخ عبدالحقؒ کے نام سے مشہور ہے اس میں موصوف نے حدیث کے متون کو معین

کرنے کا طریقہ بتایا ہے شاہ ولی اللہ صاحب نے اس میں اصلاح کی اور متونِ حدیث کے انتقاد کا محققانہ طریقہ وضع کیا اس سلسلے میں ایک انتباہ ملحوظ رہے اور وہ یہ کہ محدثین کرام کی ایک جماعت کی یہ رائے رہی ہے کہ جتنی بھی زیادہ سے زیادہ حدیثیں جمع ہو سکیں، جمع کی جائیں تاکہ ان سے زیادہ سے زیادہ شرعی مسائل اخذ کئے جائیں۔ یہ جماعت نیک نیتی سے یہ رائے رکھتی ہے کہ احادیث ضعیفہ بھی قابل عمل ہیں، اس لئے کہ ممکن ہے پہلے زمانے میں (صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ کے زمانے میں) یہ حدیثیں مشہور اور صحیح ہوں بعد میں ان کے سلسلۂ اسناد میں ضعیف وغیر معتبر راویوں کے آنے سے زمانہ تدوین حدیث میں انہیں ضعیف قرار دیا گیا ہو۔ یہ طریقہ شیخ عبدالرحمٰن سیوطی مصری کا ہے۔ شیخ علی متقی مکی اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی بھی یہی رائے رکھتے تھے۔

محدثین کرام کی دوسری جماعت وہ ہے جو احادیث صحیحہ کا ذخیرہ بہت کم تسلیم کرتی ہے لیکن اسکے نزدیک وہ دین کے استنباط کے لئے کافی ہے۔ یہ رائے امام محی الدین نووی مصری، حافظ زین الدین عبدالرحیم عراقی (استاد حافظ ابن حجر عسقلانی صاحب فتح الباری) شیخ عبدالرحمٰن سخاوی مصری اور دیگر محدثین محققین کی ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ اسی دوسری جماعت کے ہم خیال ہیں۔ آپ نے اپنے اس نقطۂ نظر کی اشاعت کے لئے مستقل تصنیفات کیں المصفّٰی کا مقدمہ الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ کا حصّہ حدیث وفقہ اور حجۃ اللہ البالغہ کا باب طبقات کتب الحدیث اس ضمن میں آتے ہیں۔ اسی طریقۂ تحقیق کی مزید وضاحت شاہ عبدالعزیزؒ نے اپنی مبسوط کتاب بستان المحدثین اور مختصر رسالے عجالہ نافعہ میں کی شاہ ولی اللہ نے اپنی تالیف قرۃ العینین میں تصریح فرمائی ہے کہ احکام و شرائع کے ماخذ بننے کے لئے احادیث صحیحہ کے موجودہ ذخیرے میں سے دس ہزار متون کارآمد ہیں۔ باقی روایاتِ مقبولہ ان متون کی توثیق اور تائید کے لئے رائج ہیں لہذا ہر مسئلے کے لئے نیا متنِ حدیث تلاش کرنے کی ضرورت نہیں نیز تحقیقِ احادیث کی مشق کا آغاز موطا امام مالک سے ہونا چاہیئے۔ اور اس میں جو احادیث مروی ہیں، ان کی اسناد و روایت کی تحقیق کتب صحاح خمسہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن نسائی، سنن ابوداود

امعان ترمذی میں کی جائے اس ضمن میں سب سے پہلے یہ بات پیش نظر رہے کہ ان کتب صحاح میں کسی حدیث کے جو اسنادِ روایت ہیں ان میں امام مالکؒ کے ہم عصر جو راوی ہیں، وہ قابل اعتماد ہیں یا نہیں اگر نہیں ہیں تو وہ حدیث قابل قبول نہیں۔ اور اگر موجود ہیں، تو حدیث کے متن پر غور کیا جائیگا کہ یہ متن الفاظ کے اعتبار سے دیگر احادیث ثابتہ صحیحہ کے منافی تو نہیں اگر منافی ہے تو یہ حدیث متروک ہے، اگر یہ دونوں مذکورہ بالا معیاروں پر پوری اترتی ہے تو نیچے کی اسناد پر غور کیا جائیگا۔ اگر وہاں کوئی راوی ضعیف یا ناقابل اعتبار ہے اور بیرونی شہادت اور قرآئن سے تائید علی نہیں ہوتی تب بھی یہ حدیث ناقابل عمل ہوگی۔ لیکن اگر راوی ضعیف نہیں، ثقہ اور قابل اعتبار ہے یا قرائن خارجہ روایت کی صحت کے موئید ہیں تو حدیث (متن) قابل عمل اور قابل قبول ہے۔ اور پھر قبولیت اور اعتبار کے لحاظ سے اس کے غریب حسن، مشہور، مستفیض اور متواتر کے درجے ہوں گے۔ اور یہ احکام شرعیہ کے ماخذ کا کام دے گی۔

شاہ صاحب کے نزدیک اس وقت بھی معتدبہ مشق کرنے کے بعد ائمہ محدثین کی مرویات کی تحقیق کرنے کی قابلیت پیدا کی جا سکتی ہے۔ اور علم حدیث کا ایک طالب علم اسناد کی آزادانہ تحقیق کر کے ایک حدیث کے متعلق وہی حکم لگا سکتا ہے جو کہ مثال کے طور پر امام ترمذیؒ نے ہر ایک متن اور سند پر اپنی کتاب جامع ترمذی میں لگایا ہے۔ اکثر احادیث صحیحہ موطا اور صحاح خمسہ میں موجود ہیں اور جو تھوڑی بہت باہر سے لینی پڑیں گی، وہ مسند امام احمدؒ میں مروی احادیث ثابتہ صحیحہ سے لی جا سکتی ہیں۔ مسند امام احمد میں تین قسم کی مرویات ہیں۔

ایک مرویات امام احمدؒ۔

دوسری مرویات عبداللہ ابن امام احمدؒ۔

تیسری مرویات کتعی (شاگرد امام احمدؒ) ان میں سے مرویات امام احمد کا درجہ اعلیٰ ہے۔ اس کے علاوہ روایات کا ذخیرہ ہے، وہ علم حدیث کے صرف متبحرین کی بحث و جستجو اور مشق و مہارت کے لئے کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔ وہ نہ تو اثباتِ احکام شرعیہ کے کام آسکتا ہے۔

اور نہ یہ علم حدیث کے مبتدی طالب علموں کے لئے کارآمد ہے۔ جیسا کہ الفیہ عراقی میں صحیح حدیث کے بیان میں امام نوویؒ کے قول کو اس مصرعے میں بیان کیا گیا ہے۔

ولم یفت الخمسۃ الا النذر

پانچ کتابوں سے کوئی شاذونادر ہی صحیح حدیث رہ گئی ہے

○

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حنفی مذہب کے ایک بڑے اچھے طریقے سے مجھے آگاہ فرمایا۔ اور حنفی مذہب کے یہ طریقہ ان مشہور احادیث سے جو امام بخاری اور ان کے اصحاب کے زمانے میں جمع کی گئیں اور ان کی اس زمانے میں جانچ پڑتال بھی ہوئی، موافق ترین ہے۔ وہ طریقہ یہ ہے کہ امام ابو حنیفہ امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے اقوال میں سے وہ قول لیا جائے جو مسئلہ زیر بحث میں مشہور احادیث سے سب سے زیادہ قریب ہو۔ پھر ان فقہائے احناف کے فتاویٰ کی پیروی کی جائے جو علمائے حدیث میں شمار ہوتے ہیں۔ چنانچہ بہت سی چیزیں ایسی ہیں کہ امام ابو حنیفہ اور ان کے دونوں ساتھی جہاں تک کہ ان چیزوں کے اصول کا تعلق ہے، وہ اس معاملے میں خاموش رہے اور انہوں نے ان کے بارے میں ممانعت کا کوئی حکم نہیں دیا، لیکن ہمیں ایسی احادیث ملتی ہیں، جن میں ان چیزوں کا ذکر ہے۔ اس حالت میں ان چیزوں کا اثبات ظاہر لازمی اور ضروری ہوتا ہے۔ اعمال اور احکام میں اس روش کو اختیار کرنا بھی مذہب حنفی میں داخل ہے۔

"فیوض الحرمین"

علم لطائف کے بیان میں

مصلح الدین احمد اسیر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وہی اللہ تعریف و حمد کے لائق ہے جس نے اپنے مخلص بندوں کو جہان میں اور ان کے نفوس میں اپنی عظمت کی نشانیاں اور اپنی قدرت کے آثار دکھائے جن سے انہوں نے جان لیا کہ حق ہی سے انفس و آفاق اور ان کی ذات اور ان کی صفات، عالم اجسام ہو یا عالم ارواح، قائم ہے اور باقی اس کے سوا جو چیز ہے، باطل ہے اور اللہ ہی کل اشیاء کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے اور جدھر ہم دیکھتے ہیں، اللہ ہی کی جلوہ گری ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور رسول ہیں۔

اس کے بعد فقیر ولی اللہ بن عبدالرحیم العمری الدہلوی، اس پر اس کے والدین اور مشائخ پر اللہ رحمت نازل فرمائے، عرض کرتا ہے کہ یہ چند ورق جن کا نام "الطاف القدس" ہے نفس کے لطائف کی معرفت اور حقیقت قلب و عقل و نفس و روح و سِر و خفی و اخفیٰ و حجر بحت اور ان کے بیان میں ہیں نیز ان سب کی اصلاح کے طریق اس میں بیان کئے گئے ہیں مگر اس رسالہ کا مقصد یہ ہے کہ خالص وہ مسائل لکھے جائیں جو وجدانی اور کشفی

---

[1] شاہ ولی اللہ صاحب کی کتاب "الطاف القدس" کی تمہید کا یہ اردو ترجمہ ہے، جو جناب مصلح الدین احمد صاحب اسیر نے لکھنؤ سے ارسال فرمایا ہے صاحب موصوف نے "الطاف القدس" کا ترجمہ مکمل کر لیا ہے۔

طور پر حاصل کئے گئے ہیں۔ اس رسالہ میں عقلی و نقلی علم سے بحث نہیں کی گئی ہے۔

اللہ علی ما نقول وکیل

فصل اوّل، علم لطائف کے شرف اور فائدہ کے بیان میں

علم لطائف ایک بہت بڑی میراث ہے جس سے خداوند تعالیٰ نے پچھلے زمانہ کے صوفیوں کو برگزیدہ فرمایا ہے ان میں سے جو سب سے زیادہ ان لطائف کی بصیرت رکھتا ہے، وہ سب سے زیادہ تہذیب نفس میں بصیرت رکھتا ہے اور ان میں سے جو سب سے زیادہ ان لطائف کے احکام کی تمیز رکھتا ہے وہ سب سے زیادہ مسترشدین کے ارشاد پر قادر ہے۔ ان لطائف کے علم کا عالم بہ نسبت ان صوفیوں کے جنہوں نے تصوف کے میدان میں عمریں گذاری ہیں، اور اس علم سے واقفیت نہ حاصل کر سکے، مثل ایک طبیب حاذق کے ہے جو مرض کے اقسام کا اس کے اسباب، علامات اور علاج وغیرہ کی تشریح سے، نیز ان قوانین سے جو حکمائے سلف نے عمر بھر کے تجربوں کے بعد حاصل کئے تھے کما حقہ واقف ہے۔ یا بمقابلہ ان بوڑھیوں کے جو اپنے ناقص تجربوں یا سنی سنائی روایتوں سے کہ فلاں دوا کا یہ فائدہ ہے اور فلاں کا یہ نقصان، دوا کی خاصیت بیان کرتی ہیں۔ یا ان لطائف کے جاننے والے کی مثال ایسی ہے جیسے کہ وہ راہبر جو عمر بھر جنگلوں میں پھرتا رہا ہو اور راستہ کے نشیب و فراز کو خوب سمجھتا ہو اور صحیح اور غلط راستہ کی شناخت بخوبی کر سکے، بہ نسبت اس جماعت کے جس نے مصیبت یا شوق کے ہاتھوں بلا مقصد اور بغیر راستہ مقرر کئے ہوئے جنگل کی راہ لی۔ جس میں سے کچھ لوگ تو ہلاک ہوئے اور کچھ مراد کو پہنچے۔ اور عمر دراز کے بعد اپنے وطن مالوف کو لوٹے ان میں سے سبھوں نے اپنا اپنا قصہ بیان کیا اور اپنی نامکمل اور ناقص حکایتوں سے سننے والوں کو تنگدل کر دیا۔ ان میں سے ایک بھی اس قابل نہ ہوا کہ کسی کے اعتراض کا جواب دے سکے یا ان کے شک کو رفع دفع کر سکے اور صحیح بات بیان کر سکے بہر حال اگر تم اہل تمکین کی راہ جو کہ انبیاء کے وارث ہیں، معلوم کرنا چاہتے ہو تو یہ سمجھ لو کہ وہ بجز علم لطائف کے حاصل کئے معلوم نہیں ہو سکتی۔ اگر تم یہ چاہتے ہو کہ صراط مستقیم کا (طریقہ) سلوک جس میں نہ کوئی لغو حرکت ہے اور نہ کوئی بے فائدہ تکلیف ہے، حاصل ہو جائے تو وہ بھی بغیر علم لطائف کے ناممکن ہے اور یہ ایک نعمت عظمیٰ ہے کہ متاخرین اس سے پوری طرح محظوظ

ہوتے چلے آئے ہیں ذالک من فضل اللہ علینا وعلی الناس ولکن اکثر الناس لا یشکرون اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنا فضل فرمایا لیکن ان میں سے اکثروں نے اللہ کا شکر ادا نہ کیا۔ آج کل اذکار و افکار کے جو طریقے رائج ہیں انہیں یہاں اپنے بزرگوں سے نقل کیا جاتا ہے۔ یہ دو قسم کے ہیں ایک تو وہ کہ ایک عزیز کو اس راہ کا شوق ہوا۔ اس سے جس طرح بنا سلسلۂ سلوک اختیار کیا اور آخر ایک قسم کے اطمینان کی حالت تک پہنچا اور مرشد و ہدایت کے آثار اس سے ظاہر ہونے لگے اور طالبان راہ حق اس سے رجوع کرنے لگا۔ یہ خود جس مقام تک پہنچا تھا، ان کو پہنچا دیا گویا اس کے سوا کوئی اور ٹھکانا نہیں اور نہ اس کے علاوہ کوئی کمال ہے۔ اس عزیز کے یار دوستوں نے اسی کی راہ اختیار کی اور اسی کیفیت پر اعتماد کلّی کر بیٹھے۔ اس جماعت کے اکثر لوگ صرف ایک نسبت کے حامل ہوتے ہیں یا تو نسبت شوق و تعلق یا ارواح بزرگان سے اویسی طور پر استفادہ کرنے کی نسبت، یا نیچے طبقہ کے ملائکہ کے مشابہت کی نسبت یا نسبتِ توحید یا نسبتِ طہارت، یا عالم مثال کے اذکار کی صورتوں سے ارتباط کی نسبت یا وہ کوئی دوسری اسی قسم کی کوئی نسبت پیدا کر لیتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے لطیفوں میں سے کوئی لطیفہ اس نسبت کی مناسبت سے مہذب ہو جاتا ہے، اور باقی لطائف ویسے ہی کدورت میں پڑے رہتے ہیں۔ اگر ان کے کمال کی صورتِ مثالی تمہارے سامنے آجائے تو وہ ایسی صورت ہوگی جس کی آدھی شکل کالی ہوگی اور آدھی سفید یعنی ان کے عمل نیک و بد دونوں ہوں گے، اس جماعت کے بہت سے لوگ شرع کی پابندی نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ یہ سب ظاہری شرع ہے اور حقیقت اور لب لباب اس کا وہ ہے جس کا ہمیں ادراک ہوا۔ وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون۔

دوسری قسم وہ ہے کہ ان کے استاد ایسے کامل و مکمل ہوتے ہیں جن کو تدبیر کلّی حق نے مرشد خلق کا خلعت بخشا۔ امت مرحومہ کا بچا کھچا ان کے ہاتھوں میں سونپا اللہ کی مرضی سے ان سے رشد و ہدایت کا ظہور ہوا۔ ان کو اس کے متعلق ضروری باتوں کا الہام فرمایا گیا۔ اور ان کو سالکوں کی ہدایت کے لئے مقرر کیا گیا وہ انکی اتباع شدت کے ساتھ کرتے رہے ان بزرگواروں نے ضرورت کے مطابق قواعد کی تمہید ڈالی اور ہر مرض کی دوا اور ہر آفت کا علاج مقرر کیا وغیرہ وغیرہ مسترشدین میں سے بہتوں کا ایک ہی لطیفہ اصل جبلت میں قوی ہوتا ہے اور دوسرے لطائف ضعیف ہوتے ہیں۔ پس اگر انسب ہے ہی سے اشتغال و اذکار کرنا شروع

کریں اوران تمام کی تربیت کا قصد کریں تو مدت دراز چاہیئے کہ وہ طاقتور لطیفہ اپنا سرور اُن سب لطائف سے حاصل کرکے مہذب ہو، جوش وخروش میں آئے اور اس لطیفہ کے تہذیب کے آثار ظاہر ہوں۔ اور یہ سالک اطمینان تک پہنچ سکے۔ ہاں اگر کوئی سالک خصوصیت کے ساتھ اس لطیفہ کی تقویت کو سامنے رکھ کر دوسرے لطائف کو عمل طور پر جاری کرنیکی کوشش کرے تو جلد اس مطلب کو پہنچ جائیگا اور اطمینان حاصل کرے گا۔ اس اطمینان کا باعث جو متعدد مراتب فنا طے کرنے کے بعد حاصل ہوتا ہے، وہی لطیفہ ہے، جس کی فطرت زیادہ قوی ہوتی ہے

دوسرے یہ کہ راہ طریقت کے سالک پر فنا و بقا کے مختلف احوال ظاہر ہوتے ہیں اور وہ ہر حالت کی نسبت کو لطیفہ کے ساتھ سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا اور حیرت میں پڑ جاتا ہے اور عدم حصول کے گمان میں مبتلا ہو جاتا ہے اور جانتا ہے کہ اس سے پیشتر جو ظاہر ہوا تھا، وہ محض غرور نفس کی وجہ سے تھا اس لئے اس کو بہت ملال اور قبض لاحق ہو جاتا ہے اور اس کا کام رک جاتا ہے۔ اور اگر وہ ہر حالت کا انتساب لطیفہ سے کرے اور ہر فنا و بقا کے رجوع کے وقت ایک خاص امر کا ادراک کرے تو وہ اس قسم کے قبض سے نجات پا جائیگا دوسرے یہ کہ اولیاء کے احوال ملاحظہ کریگا ان کے اقوال اور احوال کے اختلاف کو سمجھے گا اور شک میں پڑ جائے گا۔ کبھی اس حالت کی طرف متوجہ ہوگا اور کبھی اس حال کی طرف، اور کام سے ہاتھ کھینچ لے گا۔ اور ہو سکتا ہے کہ انتہا درجہ تک ایک شخص تامل کرے اور سمجھے کہ سلوک کی حقیقی انتہا یہی ہے اور فی الحقیقت ان کے اقوال واحوال کا اختلاف اور اس کے انتہا کی گوناگونی لطائف کے فطری قوت وضعف پر مبنی ہوتی ہے دوسرے یہ کہ ایک کام کے معقول اسباب پیدا کرنے جائیں اس کام کے ساتھ مناسبت حقیقی پیدا کر لی جائے تو اس کام میں تھوڑی سی کوشش بہت سی کوشش کی برابر حکم رکھتی ہے اور روز بروز فائدہ اس سے زیادہ ہوتا جاتا ہے اور جب بصیرت اور معرفت کے اصول سے اس میں فکر کی جائے تو راستہ کھلتا جاتا ہے۔

بہرحال علم لطائف کی فضیلت اور فائدے بہت ہیں یہ تھوڑا سا اس بہت کا نمونہ پیش کیا گیا۔

معرکہ بالاکوٹ کی شکست

عمر فاروق خاں

شاہ ولی اللہ صاحب کا جو زمانہ (۱۱۱۴ھ - ۱۱۷۶ھ) ہے اسی زمانہ میں جزیرہ عرب میں ایک اور اصلاحی تحریک وجود میں آئی۔ جس کے بانی شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی (۱۱۱۵ھ - ۱۲۰۶ھ) تھے[1] اس کے بعد افریقہ میں بھی اسی قسم کی ایک اصلاحی تحریک شروع ہوئی، جو سنوسی کے نام سے مشہور ہے۔ اور لیبیا میں آج اسی کے امام برسر اقتدار ہیں۔ شیخ محمد بن عبدالوہاب کا انتقال ۱۷۹۲ء میں ہوا، اور سنوسی اعظم ۱۷۸۷ء میں پیدا ہوئے

---

[1] "فقہ واعتقاد میں محمد بن عبدالوہابؒ نے امام ابن تیمیہؒ کے کتب و رسائل کا امعان نظر سے مطالعہ کیا انہوں نے امام صاحب کے افکار و دعوت کو سمجھا اور اپنا لیا۔ اور اس طرح اپنایا کہ پورے جوش و خروش کے ساتھ اس کی تبلیغ و اشاعت میں لگ گئے۔ اپنے حوالی موالی کو انہوں نے افکار ابن تیمیہؒ قبول کرنے کی دعوت دی۔ یہ دعوت کچھ ایسے اثر انگیز انداز میں دی کہ لوگوں نے دل کے کانوں سے سنی۔ رفتہ رفتہ بہت جلد ایک بڑا گروہ ایسا تیار ہوگیا جس کا مدار اعتقاد افکار ابن تیمیہؒ تھے۔ یہ لوگ محمد بن عبدالوہابؒ کے معین و مددگار اور یار و انصار بن گئے بلکہ ان لوگوں کی ایک چھوٹی سی مملکت بھی وجود میں آگئی کیونکہ محمد بن عبدالوہاب کے زبردست حامیوں میں ان کے خسر محمد بن سعود بھی تھے، جو موجودہ مملکت سعودیہ کے جد اعلیٰ تھے۔"

حیات شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ از پروفیسر محمد ابوزہرہ مصری (اردو ترجمہ)

یہ دور مسلمانوں کے لئے بڑا پُرفتن اور انحطاط کا تھا۔ برصغیر پاک و ہند میں مغل سلطنت اور اُدھر مغربی ایشیا میں ترکوں کی عثمانی سلطنت پوری طرح زوال کے نرغے میں آ چکی تھی۔ ایک طرف ان پر یورپی قوموں کی یلغار جاری تھی اور وہ ان کے سامنے بُری طرح پسپا ہو رہی تھیں دوسری طرف شہنشاہی اور جاگیرداری نظام، جس پر ان سلطنتوں کی عالی شان عمارتیں کھڑی تھیں، بتدریج ٹوٹ رہا تھا۔ اور یورپ کی تجارتی معیشت جس نے بعد میں وہاں صنعتی انقلاب کی شکل اختیار کی، اور علاقائی قومیتوں کا پیدا کردہ استعماری سیلاب مشرق کی طرف بڑھنا شروع ہو گیا تھا۔ دنیائے اسلام کے ہاتھ سے مشرق و مغرب کی باہمی تجارت کی اجارہ داری چھن چکی تھی، اور اب پرتگالیوں، ولندیزیوں (ڈچ) فرانسیسیوں اور انگریزوں کے سمندری جہاز ساحل افریقہ کے گرد گھوم کر براہ راست ہندوستان، انڈونیشیا اور چین پہنچنے لگے تھے۔ اور وہ زمانہ ختم ہو چکا تھا جب پرتگالی ملاح واسکوڈاگاما کو بحر ہند میں ہر جگہ مسلمانوں ہی کے تجارتی جہاز اور ہندوستان سے لیکر چین تک ہر ساحلی مقام پر انہیں کی تجارتی کوٹھیاں نظر آئی تھیں، اس کے علاوہ اسی زمانے میں خود ان ملکوں کے اندر یورپی تاجروں کی آمد کی وجہ سے دولت و ثروت جاگیرداروں، زمینداروں اور دستی کام کرنیوالے کاریگروں سے جو زیادہ تر مسلمان تھے۔ ایک نئے طبقے میں جو اکثر غیر مسلم تھا بتدریج منتقل ہونی شروع ہو گئی۔ یہ طبقہ یورپی تاجروں اور مقامی زمینداروں اور کاریگروں کے درمیان واسطے کا کام کرتا تھا۔ ترکوں کی عثمانی سلطنت میں یہ یونانی، ارمنی اور یہودی تھے، اور برصغیر میں اکثر و بیشتر ہندو تھے چنانچہ برصغیر کی دیہی معیشت کی دولت کھنچ کر کلکتہ اور بمبئی کے راستے جب یورپ کی طرف جانے لگی، تو اس کا ایک حصہ اس نئے طبقے کو بھی ملنے لگا۔ اور یہ امیر سے امیر تر ہوتا گیا اس طرح یورپی تاجر اور اس کا یہ ہندوستانی غیر مسلم گماشتہ برصغیر کی معیشت پر بتدریج چھانے لگا۔ اس کے نتیجے میں یہاں مختلف گروہوں اور طبقوں میں، جو سیاسی توازن چلا آ رہا تھا، وہ خلل پذیر ہونے لگا اور شمالی ہند اور وسط ہند کے شہروں کے بجائے کلکتہ اور بمبئی برصغیر کی سیاست و معیشت کے مرکز ثقل بن گئے

غرض جیسے جیسے مسلمانوں کے ہاتھ سے سیاسی اقتدار چھنتا گیا۔ اور ان کی نوابیوں کے ساتھ ساتھ ان کی سرداریاں اور جاگیرداریاں بھی ختم ہونی شروع ہوئیں تو ان سے متعلق ان کے جو فوجی طبقے تھے، وہ بے روزگار

ہونے لگے۔ اور ان پر کسب معاش کے دروازے بند ہونے گئے۔ یہ تو اس برصغیر میں مسلمانوں کے حکمراں اور ان سے تعلق رکھنے والے طبقات کا حال ہوا، لیکن مسلمانوں کے دست کار طبقے یورپی تاجروں کی آمد سے اور بھی زیادہ تباہ ہوئے۔ ان کی دستی صنعتیں یورپی مصنوعات کا مقابلہ نہ کر سکیں۔ اور کچھ تو اس مقابلہ کی وجہ سے اور کچھ سیاسی دباؤ کے ماتحت وہ بالکل اپاہج ہو کر رہ گئے اور یورپی تاجر اور غیر مسلم بنیا تمام آزاد پیشوں پر مسلط ہوتا گیا۔ سیاسی اقتدار سے محرومی اور اس معاشی زبوں حالی کے اثرات کا ان کے معاشرے پر پڑنا لازمی تھا۔ چنانچہ اس میں پہلے جو خرابیاں تھی، وہ اور بڑھنے لگیں۔ غلط رسم ورواج میں اور اضافہ ہوا۔ اخلاقی نظم و ضبط کے بندھن ڈھیلے ہونے لگے۔ افراد کا کوئی عہد و وفاداری نہ رہا۔ جماعت کا شیرازہ بڑی سرعت سے بکھرنے لگا۔ ذہن کا جمود، نظر کی تنگی اور عمل کی کوتاہی روز بروز زیادہ نمایاں ہونے لگی۔

یہ دور تھا، جس میں شاہ ولی اللہ کی تحریک اصلاح کا آغاز ہوتا ہے۔ اس وقت مذہبی لحاظ سے مسلمان چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بٹے ہوئے تھے اور بڑی شدت سے ایک دوسرے کی تکفیر میں منہمک تھے۔ علمائے امت کا زیادہ زور فروعات پر تھا۔ اور دین کے اصل مقاصد ان کی نظروں سے اوجھل تھے۔ صوفیاء کا حال ان سے بھی بدتر تھا۔ وہ سلف کے نام لیوا ضرور تھے، لیکن سلف کی حقیقی روح ان کے تصوف سے غائب تھی ان میں سے ہر ایک اپنے ہی گروہی تصوف کو حرف آخر سمجھتا تھا اور کمال تصوف رہبانیت بنتا جا رہا تھا۔ نجات کے لئے چند وظائف کی تکرار کافی سمجھی جاتی۔ کسی کو معاشرتی و ملکی مسائل سے دلچسپی نہ تھی۔

رموز مملکت خویش خسرواں دانند" کہہ کر وہ اپنے دل کو اطمینان دے لیتے تھے۔ ہندوستان میں اسلامی سلطنت کے تین پائے تھے۔ بادشاہ، اس کے امراء و فوج یعنی حکمراں طبقہ۔ علماء اور صوفیاء، علماء قانون اور ایڈمنسٹریشن چلاتے۔ صوفیاء عوام اور حکومت کے درمیان واسطہ تھے اور بادشاہ اور امراء تو حکومت کرتے ہی تھے۔ اسلامی سلطنت کے ان تینوں پایوں کو گھن لگ چکا تھا، اور یہ بتدریج ناکارہ ہو رہے تھے۔ مختصراً یہ کہ ملا طوائف الملوکی کا زمانہ تھا اکبر سے لیکر عالمگیر تک کی بنائی ہوئی یہ وسیع و عریض سلطنت امراء گردی کا شکار ہو رہی تھی۔ ہر امیر اپنی جگہ خود مختار ہونے کی کوشش کرتا۔ اور مرکز سے اس کا تعلق بس برائے نام

ہوتا، خود مرکز میں حکومت کرنے کی صلاحیتیں ختم ہو چکی تھیں۔ بادشاہ امرا کا قیدی اور ان کی خواہشات کو عملی جامہ پہنانے کا ایک آلۂ کار بن کر رہ گیا تھا۔ غرض برصغیر میں بسنے والے مسلمان خواص و عوام بڑی سرعت سے سیاسی انتشار، معاشرتی خلفشار، معاشی پستی اور اخلاقی و روحانی تباہی کی طرف جا رہے تھے۔ ظاہر ہے شاہ ولی اللہ جیسے صاحب النظر بزرگ ان حالات سے کیسے مطمئن ہو سکتے تھے اور یہ کس طرح ممکن تھا کہ وہ ہر طرف سے مصائب کو یوں امنڈتا ہوا دیکھتے اور ان سے اسلام اور ملت اسلام کو بچانے کے لئے کچھ نہ کرتے انہوں نے سوچا، اور برصغیر کے اُس ماحول میں، اور اُس زمانے میں جس میں کہ شاہ صاحب تھے اس کے علاوہ اور کیا سوچا جاسکتا تھا کہ احمد شاہ ابدالی کو جو مغل سلطنت کے تین صوبوں پنجاب، سندھ اور کشمیر پر قابض تھا۔ دھلی کی طرف کوچ کرنے پر آمادہ کیا جائے، اور اس کی مدد سے برصغیر کے جنوب سے آنے والی مرہٹہ طاقت کو کچلا جائے۔ برصغیر کی گزشتہ تاریخ میں بارہا ہو چکا تھا کہ جب کبھی بھی اس کے مرکز میں مسلمانوں کی حکومت کمزور ہوئی تو شمال سے نئی طاقت اُدھر بڑھی اور اس نے زوال پذیر حکومت کو ہٹا کر خود ایک نئی حکومت کی بنیاد رکھی اس طرح اسلامی سلطنت کو تازہ خون مل جاتا۔ اور برصغیر میں مسلمانوں کا اقتدار بحال ہو جاتا اس دور میں احمد شاہ ابدالی کا قندھار اور لاہور سے چل کر پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کے خلاف صف آرا ہونا کسی غیر ملکی کا ملکی طاقت کے خلاف صف آرا ہونا نہیں تھا۔ وہ دور اور تھا۔ اُس دور میں برصغیر کی سیاسی حدود اور تھیں اور پھر ملکی اور غیر ملکی کے جو تصورات آج ہیں وہ اس دور میں نہیں تھے یہ تو بہر حال دو سو سال قبل کی بات ہے۔ اِس برصغیر میں پچھلے سترہ اٹھارہ سالوں میں ملکی اور غیر ملکی کی تعریف جس طرح بدلی ہے اور اس کے تصورات کیا سے کیا ہو گئے ہیں، وہ آج سب کے سامنے ہے۔

احمد شاہ ابدالی کی مدد سے مرہٹوں کا زور تو ٹوٹ گیا، لیکن بدقسمتی سے دہلی کے اسلامی مرکز میں جان نہ پڑ سکی۔ اور نہ برصغیر میں مسلمانوں کے اقتدار کو تازہ خون مل سکا احمد شاہ واپس چلا گیا اور مغل سلطنت اسی زبوں حالی کا شکار رہی بلکہ اس کی حالت اور بدتر ہو گئی۔ شاہ ولی اللہ صاحب کا خیال تھا کہ اسلامی ہند کے زوال کا تدارک شمال مغرب کی طرف سے ہو سکتا ہے۔ اب احمد شاہ ابدالی کے تجربے کی ناکامی کے بعد ان کی توجہ عوام کی طرف ہوئی۔ انہوں نے ایک اصلاحی اسلامی تحریک کی فکری بنیاد رکھی جسے بعد میں ان کے پیرو کاروں

نے ایک سیاسی جمعیت کی شکل دی، اور اس نے برصغیر کے شمال مغرب میں جاکر اپنا ایک مرکز بنایا۔ اس مرکز کی پنجاب کی غیر مسلم حکومت کے ساتھ جنگیں ہوئیں۔ اور ایک وقت میں اس کی پشاور میں حکومت بھی قائم ہوگئی۔ لیکن یہ زیادہ دیر پا ثابت نہ ہوئی، اور بالاکوٹ کے مقام پر ولی اللہی تحریک کی ان عملی طاقتوں کو شکست اٹھانی پڑی۔ تاریخ کے ان دو حادثوں میں کتنی عجیب مشابہت ہے کہ جس طرح شاہ ولی اللہ کے پیروکاروں کو سکھ حکومت کے مقابلے میں، جس کے پاس یورپی افسروں کی تربیت یافتہ فوج تھی، بلکہ اس کے بعض سالار اور کمانڈر بھی یورپی فوجی افسر تھے۔ شکست اٹھانی پڑی اسی طرح شیخ محمد بن عبدالوہاب کے پیروکار بھی مصر کے محمد علی پاشا کی فوجوں کے مقابلے میں نہ ٹھہر سکے، جو یورپی افسروں کی تربیت یافتہ تھیں اور رنجیت سنگھ کی سکھ فوجوں کی طرح ان کے بعض اعلیٰ افسر بھی یورپی تھے، اور جزیرۂ عرب میں ان کی حکومت ختم ہوگئی۔ تاآنکہ پہلی جنگ عظیم کے بعد سلطان عبدالعزیز بن سعود اٹھا، اور اس نے اپنے باپ دادوں کی حکومت کو بحال کیا، جو اب سعودی عرب کی صورت میں موجود ہے۔

اس ضمن میں جہاں تک فکر ولی اللہی کا تعلق ہے، میرے نزدیک شکستِ بالاکوٹ سے اس کے شکست کھا جانے یا دور از کار اور غیر موثر ہونے کا نتیجہ نکالنا صحیح نہیں۔ دراصل اس فکر کی اساس پر اُس وقت جو سیاسی جمعیت بنی تھی اس کی بہت سی مجبوریاں تھی اور وہی اس کی ناکامی کا باعث بنیں۔ ایک تو اس سیاسی جمعیت کی قیادت باوجود اپنی تمام روحانی رفعتوں، عقائد کی بلندیوں اور اخلاق و اعمال کی پاکیزگیوں کے ایک زوال پذیر جاگیرداری دور کی پیداوار تھی اور دوسرے اپنے سیاسی مرکز کے لئے جو سرزمین اس نے منتخب کی، اس میں ثبات و استقلال کی قدرتی صلاحیتیں سرے سے مفقود تھیں [1] اور وہاں بیٹھ کر ایک منظم اور باقاعدہ حکومت کا

---

[1] واقعہ یہ ہے کہ حضرت علیؓ اور ان کے خاندان کے مقابلہ میں امیر معاویہ کی کامیابی کا ایک بڑا سبب عراق کی قبائلی زندگی کی انتشار پسندی کے خلاف شامیوں کی اجتماعیت پسندی اور ان کا فطری ثبات و استقلال تھا۔

مقابلہ کرنا ناممکن تھا۔ قبائل کی آپس کی منافستیں انہیں ایک عمومی مقصد پہ بمشکل ہی جمع ہونے دیتی ہیں۔ ان کی جو حالت ۱۸۳۲ء میں تھی۔ آج بھی کم و بیش ان کی وہی حالت ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ اسے مقابلہ کرنا پڑا ایک ایسی طاقت کا جو مشینی انقلاب سے آشنا ہو چکی تھی۔ اور مشین جو نظم و ضبط اور ڈسپلن دیتی ہے، اور اس کے استعمال سے ذہن و عمل میں جس قسم کی مستعدی و کارکردگی آتی ہے، اس کا آج ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے۔ سید احمد شہید، شاہ اسمٰعیل شہید اور ان کے ساتھیوں کی معرکۂ بالاکوٹ میں شکست حقیقت میں اس سماج کی شکست تھی۔ جو اب اس قابل نہیں رہا تھا کہ وہ ان قوتوں کے مقابلہ کر سکے، جو یورپ کے سیاسی، معاشرتی اور معاشی انقلاب کے بعد اُبھری تھیں۔ اور وہ ایک سیل جرار کی طرح سب کو بہا کر لے جا رہی تھیں۔

اور یوں بھی ایک فکر کی خواہ وہ کتنا بھی عالمگیر کیوں نہ ہو، جب عملی تعبیر ہوتی ہے اور ایک مخصوص زمانے اور ایک مخصوص ماحول میں وہ اساس اور محرک بنتا ہے کسی اجتماعی عمل کا، تو اسے لامحالہ اس زمانے اور ماحول کی بعض باتوں کو اپنانا پڑتا ہے اور سچ پوچھئے تو عمل تو نام ہی ہوتا ہے آئیڈیل اور وقتی حالات و ضروریات کے درمیان مفاہمت کا۔

مرزا غالب نے اسی حقیقت کو شاعری کی زبان میں یوں ادا کیا ہے کہ

ع۔ لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی

یہ عملی دنیا کی مجبوریاں ہیں اور جو اہل بصیرت ہوتے ہیں، وہ ایک فکر کی عملی تعبیروں میں الجھ کر نہیں رہ جاتے بلکہ ان کی نظریں ان سے گزر کر اصل فکر تک پہنچتی ہیں، اور وہ ہر نئے زمانے میں اس کی نئی تعبیر کرتے اور اسے عمل کے لئے، مشعل راہ بناتے ہیں۔ آج ہمارے ہاں بھی اسی کی ضرورت ہے۔ اور ہمیں فکر ولی اللہی کو اسی نظر سے دیکھنا اور اس سے اسی طرح استفادہ کرنا چاہیئے۔

اب میں مختصراً شاہ ولی اللہ کے فکر کے بعض عمومی و عالمگیر پہلوؤں کا ذکر کروں گا، جن کی میرے نزدیک آج بڑی اہمیت ہے۔ اور جن پر ذہنی و عملی دونوں لحاظ سے ہمیں اس وقت زیادہ سے زیادہ زور دینا چاہیئے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے تو یہ ملحوظ رہنا چاہیئے کہ شاہ صاحب ایک مسلم صاحب فکر ہیں، اور ان کا روئے سخن اولاً مسلمانوں ہی سے ہے۔ اب اس بارے میں شاہ صاحب کے فکر کی امتیازی خصوصیت

یہ ہے کہ ان سے پہلے تک مسلمانوں میں فقہ، کلام، تصوف اور مذہبی و سیاسی اختلافات کی وجہ سے جو چھوٹی چھوٹی وحدتیں بن گئی تھیں، اور ان میں باہم مناصمت پائی جاتی تھی، شاہ صاحب نے ان چھوٹی چھوٹی وحدتوں کو اسلام کی ایک بڑی وحدت کے اندر ہم نوا کرنے کا تصور دیا ہے اور کوشش کی ہے کہ وہ ان کے باہمی تناقضات میں تطبیق دے کر ان سب کو ایک اصل کی فروع یا ایک حقیقت کے مختلف عکس ثابت کریں۔ اور اس طرح ملّت اسلامیہ کو وہ وحدت اور سالمیت دیں، جس سے وہ گزشتہ کئی صدیوں سے محروم تھی۔

یہ فکر ولی اللہی کا ایک اہم جزو ہے۔ اور اس فکر کی دوسری امتیازی خصوصیت اس کی نظریۂ وحدت الوجود کی خصوصی تعبیر ہے۔ اس سے ایک تو شاہ صاحب نے روح اور مادہ کی نام نہاد دوئی کو ختم کرنے کی کوشش کی، دوسرے انہوں نے اسے بنیاد بنایا وحدتِ ادیان اور وحدت انسانیت کے تصوّر کا نیز حکمت یعنی فلسفہ اور نبوت یا حکماء اور انبیاء میں جو مغائرت مانی جاتی ہے۔ اور ادراک حقیقت کے معاملے میں سامی اور آریائی ذہن میں جو اختلاف پایا جاتا ہے، اس کو وحدت الوجود کی اپنی تعبیر سے دور کرنے کی سعی کی۔ شاہ صاحب کے فکر کی تیسری امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ باوجود ایک عالم، صوفی اور صاحبِ ذکر و فکر ہونے کے انہوں نے اس بات پر خاص طور سے زور دیا کہ معاشی لحاظ سے ایک حد تک مطمئن معاشرے کے بغیر روحانیت کا حصول ناممکن ہے۔ اور معاشی استحصال بھی ظلم کی ایک صورت ہے اور اللہ تعالےٰ اس قسم کے ظلموں کو ختم کرنے کے لئے نبی مبعوث کرتا رہا ہے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے اُس دور میں ایک فلاحی مملکت کا تصور دیا، لیکن ایسی فلاحی مملکت جو آبادی کی معاشی ضرورتوں کے ساتھ ساتھ اس کے روحانی تقاضوں کا بھی خیال رکھے۔

میرے نزدیک آج ہمیں فکر ولی اللہی کے ان پہلوؤں کو خاص طور سے اجاگر کرنا چاہیئے، اور انہیں اپنے لئے مشعلِ راہ بنا کر اس مملکت کی تشکیل نو کی کوشش کرنی چاہیئے۔

تنقید و تبصرہ

مسلمانانِ ہند پاکستان کی تاریخِ تعلیم

زیرِ نظر کتاب کے مصنف سیفیہ کالج بھوپال کے وائس پرنسپل پروفیسر سید نوشہ علی ہیں۔ "پیش لفظ" پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کے جنرل سیکرٹری ڈاکٹر سید معین الحق نے لکھا ہے اور کتاب میں جہاں جہاں "حواشی و تعلیقات" کی ضرورت تھی، وہ مفتی انتظام اللہ شہابی نے پوری کردی ہے۔ گو مصنف اس مفید اور اہم موضوع کا پورا احاطہ نہیں کر سکے جس کا کہ موصوف نے خود اعتراف کیا ہے، لیکن چونکہ اس موضوع پر یہ پہلی کتاب ہے، اس لئے پروفیسر نوشہ علی کی یہ علمی کوشش ہر لحاظ سے قابل تعریف ہے اور یقیناً علمی حلقے اس کا خیر مقدم کریں گے۔

"پیش لفظ" میں بالکل صحیح لکھا گیا ہے کہ "اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے، جس میں انسان کی روحانی اور دنیوی زندگی کے ہر پہلو کی فلاح و بہبود کے لئے ہدایت موجود ہے۔ بہ الفاظ دیگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلام میں روحانیت اور لادینیت کا وہ فرق جو یورپ کے مذہبی تصورات میں اس قدر نمایاں نظر آتا ہے، موجود نہیں۔ اس لئے تعلیم میں دین کا عنصر شامل ہونے سے اس کے تصورات میں نہ تنگ نظری کا خطرہ ہے اور نہ تنگیٔ میدان کا۔ اس نظام تعلیم سے جس کی بنیاد دینی تصورات اور عوامل پر رکھی گئی ہے عظیم المرتبت مفکر، فلسفی، سائنس داں، ادیب، اور شاعر پیدا ہوئے۔ جن کی تخلیقات کسی نہج سے دینی نہیں کہی جا سکتیں"

اسلامی تاریخ کا وہ دور جب کہ تعلیم میں دین کا عنصر شامل تھا، اور اس کے باوجود اس کے تصورات میں نہ تنگ نظری تھی اور نہ تنگیٔ میدان، واقعہ یہ ہے کہ علمی و ذہنی لحاظ سے مسلمانوں کا بہترین دور تھا۔ اس دور میں ایک تو دینی اور

دنیوی علوم میں اس طرح تفریق نہیں کی جاتی تھی، جیسی بعد کے دور میں، جسے "دورِ زوال کہنا چاہیئے" کی جانے لگی۔
اس دور میں ہر دینی علم دنیوی بھی تھا۔ اور ہر دنیوی علم دینی بھی۔ اور یہ کہ "اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے" اس کی علمی تعبیر
یوں ہوتی تھی۔ اور اسلام کو حقیقتاً "حسنۃً فی الدنیا" اور "حسنۃً فی الآخرۃ" کا حامل اور جامع سمجھا جاتا تھا
اس دور میں اس زمانے کے جو بھی معلوم و مروج علوم تھے سب ایک ساتھ پڑھائے جاتے تھے۔ اور ان کی تحصیل کے
بعد ایک آدمی "عالم دین" بھی ہوتا تھا، اور "سول سرونٹ" بھی۔ دوسرے اس دور میں جب کہ دینی اور دنیوی علوم کی
موجودہ تفریق نہیں تھی، علمی و ذہنی لحاظ سے بڑی آزادی تھی اور بعد میں ہمارے ہاں تصورات میں جو تنگ نظری اور
تنگیٔ میدان پیدا ہوئی وہ اس وقت نہیں تھی۔ دینی اور دنیوی علوم کو ایک جگہ پڑھانے کا یہ لازمی نتیجہ ہوتا ہے۔ اس
سے ذہن آزاد رہتا ہے۔ طلبہ اور اہل علم کے سامنے ہر قسم کے موضوع آتے رہتے ہیں اور ان کا زاویہ نگاہ محدود
نہیں ہوتا۔

مثال کے طور سے امام غزالی کو لیجئے۔ ان کے فکر کی جدت، عظمت اور اجتہاد و خلاقی تمام تر رہینِ منت
تھی اُس دور کے بغداد کی، جس کی اس وقت مولانا شبلی کے الفاظ میں علمی و تعلیمی فضا یہ تھی:۔ "بغداد دنیا
بھر کے عقائد و خیالات کا دنگل تھا۔ اس زمین پر قدم رکھ کر ہر شخص پورا آزاد ہو جاتا تھا۔ اور جو کچھ چاہتا تھا کہہ سکتا تھا۔"
"پیش لفظ" میں مشہور مسلمان فلسفیوں الکندی، فارابی، ابن رشد، ابن سینا۔ اور البیرونی کا ذکر کیا گیا ہے جنہوں نے
فلسفہ و سائنس کی تاریخ میں ایک نمایاں مقام حاصل کر لیا تھا۔ ڈاکٹر معین الحق کے الفاظ میں یہ اسی نظم تعلیم کا حاصل
تھے جس میں دین کا عنصر شامل ہونے کے باوجود نہ تصورات کی تنگ نظری کا خطرہ تھا نہ تنگیٔ میدان کا۔ افسوس یہ ہے
کہ برصغیر پاک و ہند میں اس نظم تعلیم کی جڑیں زیادہ نہ جم سکیں اور ہمارے ہاں سے اس بلند پائے کے فلسفی پیدا نہ ہو سکے
مصنفِ کتاب اس ضمن میں لکھتے ہیں:۔ "عام خیال لوگوں کا یہ ہے کہ ہندوستان نے اعلیٰ درجے کے علماء پیدا نہیں
کئے۔ ہندوستانی مفکر بغداد، دمشق و قرطبہ کے علماء کی تقلید کرتے رہے۔ ہندوستان نے کوئی بلند پایہ عالم پیش
نہیں کیا۔" موصوف کے نزدیک اس اعتراض کو دور کرنے میں بہت دشواریاں ہوں گی۔۔۔ اس میں ہندوستانی
دوسرے اسلامی ممالک کی درس گاہوں کا مقابلہ کرنا پڑے گا۔" بہر حال یہ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ ہندوستان نے بوعلی سینا،
غزالی اور ابن رشد پیدا نہیں کئے، مگر ان علماء کو ہندوستان میں کتبِ درسیہ کی شکل میں لانا اور اس تعلیم کو

زندہ رکھنا یہ بھی کوئی آسان کام نہیں ہے۔ خاص طور پر جب کہ ملک کی زبان عربی فارسی نہ ہو"

یہ کتنے تعجب کی بات ہے کہ ابتدا میں ایرانیوں نے دین اسلام کے ساتھ ساتھ عربی زبان بھی قبول کی اور اس میں نظم ونثر، اور دوسرے علوم کے لازوال آثار چھوڑے، پھر انہوں نے عربی زبان ترک کر کے اپنی زبان فارسی کو زندہ کیا اور اس میں بھی عربی کی طرح اعلیٰ پائے کی علمی تخلیقات کیں، لیکن اس کے برعکس ہندپاکستان میں تقریباً ایک ہزار سال تک مسلمانوں کی حکومت رہی، لیکن انہوں نے یہاں ایسی علمی یادگاریں نہ چھوڑیں کہ انکی تاریخ تعلیم زیر نظر کتاب سے بہتر لکھی جا سکتی۔ مصنف کو اس کتاب کی ترتیب میں بڑی جان کاہی کرنی پڑی ہے۔ کیونکہ بقول ان کے "مفید طلب واقعات مسلسل اور یکجا نہیں مل سکے۔ یہ تاریخی میدان میں بکھرے ہوئے موتی ہیں، جن کو ایک لڑی میں پرونا آسان کام نہیں ہے اس طرح بعض مرتبہ ایک بہت مفید مطلب کتاب کو چند شکوک کی بنا پر نظر انداز کرنا پڑا۔ اور سیکڑوں صفحات پڑھنے کے بعد چند سطور مفید مطلب نظر آئیں"

ہندوستان میں لتنے طویل اسلامی عہد میں عراق، ایران، وخراسان مصر وشام اور اسپین کی طرح اعلیٰ پائے کے کیوں فلسفی ومفکر پیدا نہ ہوئے یہ موضوع اس قابل ہے کہ اس پر تحقیق ہو اور اس کے وجوہ معلوم کئے جائیں کہ آخر کیوں برصغیر کے ذہین اور دانشور غیر مسلم طبقوں نے بالعموم اس طرح اسلام اور اسلامی تہذیب کو نہ اپنایا جس طرح مثال کے طور سے ایرانیوں نے اپنایا تھا، نیز اتنا عرصہ گزرنے کے باوجود اسلامی علوم کی جڑیں اس سرزمین میں زیادہ کیوں نہ پھیلیں۔ یہ علوم "اسلامی ہندی" کیوں نہ ہوئے اور ہمارے اہل علم دفکر کی نظریں ہمیشہ شمال کی طرف سے آنے والے علماء کی طرف کیوں لگی رہیں کیا یہ تکلیف دہ بات نہیں کہ مسلمانان ہند وپاکستان کی تاریخ تعلیم کے مصنف کو یہ لکھنا پڑا کہ اگرچہ ہندوستان سے بوعلی سینا غزالی اور ابن رشد پیدا نہیں کئے، لیکن اس کے علماء کا یہی کارنامہ بہت بڑا ہے کہ انہوں نے ان کتابوں کو درس میں شامل کیا اور اس طرح انہیں زندہ رکھا۔

زیر نظر کتاب کے مصنف نے زیادہ تر دہلی اور وسطِ ہند کی تعلیمی سرگرمیوں تک اپنی بحث کو محدود رکھا ہے اس میں سندھ، پنجاب اور مشرقی پاکستان کی تعلیمی زندگی کا کوئی ذکر نہیں، ضرورت ہے کہ کوئی صاحب اس کمی کو پورا کریں اطراف کی تاریخ تعلیم بھی مرتب کردیں، خاص طور سے سندھ کی اس نوع کی

تاریخ لکھنا زیادہ مشکل نہیں، کیونکہ اس کے لئے کافی سے زیادہ مواد موجود ہے، اور سندھی علماء کا سلسلہ شروع سے آخر تک ملتا ہے۔

کراچی کی سلمان اکیڈمی، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، اور پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کی طرف سے کچھ عرصے سے بڑی اچھی اور مفید کتابیں شائع ہو رہی ہیں جو علمی بھی ہیں اور تحقیقی بھی۔ اور جن سے اس نئی مملکت میں صحیح معنوں میں علمی و فکری زندگی پیدا کرنے میں مدد مل سکتی ہے یہ کتاب سلمان اکیڈمی نے شائع کی ہے۔ اور ۳۰ نیو کراچی ہاؤسنگ سوسائٹی۔ کراچی ۵ سے مل سکتی ہے۔ کتاب مجلد ہے۔ ضخامت ۳۲۵ صفحے اور قیمت ۷۵-۱۰ روپے ہے۔

طباعت اور کتابت زیادہ اچھی نہیں، کتابت کی بعض غلطیاں کافی تکلیف دہ ہیں ایک علمی و تحقیقی کتاب کی اشاعت پر زیادہ توجہ ہونی چاہیئے تھی۔

تاریخ شیر شاہی

از عباس خاں سروانی

مترجم۔ مظہر علی خاں

ہندوستان کے مشہور پٹھان بادشاہ شیر شاہ سوری کی اس تاریخ کے مصنف عباس خاں سروانی پٹھان تھے اور شیر شاہ کے خاندان سے ان کی قرابت تھی خود اکبر اعظم نے جس کے باپ ہمایوں کو شیر شاہ نے پے در پے شکستیں دے کر ہندوستان سے فرار اختیار کرنے پر مجبور کیا تھا، مصنف کو ہدایت کی کہ وہ شیر شاہ کی تاریخ لکھے۔ ڈاکٹر سید معین الحق مقدمہ کتاب میں لکھتے ہیں :"تاریخ شیر شاہی شیر شاہ کی پہلی تاریخ ہے اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کی وفات کے پینتیس چالیس سال بعد لکھی گئی اس وقت تک بعض وہ لوگ بقید حیات تھے، جنہوں نے شیر شاہ کی فتوحات یا انتظام سلطنت میں حصہ لیا تھا، ایسے لوگ بھی کافی تعداد میں موجود تھے، جو اس عہد کے واقعات کی چشم دید گواہی دے سکتے تھے۔ عباس خاں نے ان ہی کے بیانات اور شہادت پر اپنی تاریخ تیار کی۔۔۔ عباس خاں نے واقعات اور معلومات کی فراہمی میں بہت احتیاط سے کام لیا ہے۔ کتاب کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ عباس خاں بہت بڑا ادیب نہ تھا۔ لہذا عبارت آرائی کے ذریعہ اس نے واقعات کی شکل بدلتے یا ان کو کسی خاص رنگ میں پیش کرنے کی کوشش ہی نہیں کی"

یہ اکبر کی شخصی عظمت کی ایک بہت بڑی دلیل ہے کہ وہ ایک پٹھان مورخ کو ایک ایسے پٹھان بادشاہ کی

تاریخ لکھنے کا حکم دیتا ہے جس نے اس کے باپ سے تخت چھینا تھا اور اسے شکست دی تھی اور جس کی یادیں ابھی تازہ تھیں۔ عباس خاں نے اکبر کے حکم سے یہ تاریخ لکھی اور ظاہر ہے، اسے اکبر نے ضرور دیکھا ہوگا، اور شیر شاہ کے ہاتھوں جس طرح اس کے باپ کو شکستیں ہوئیں، وہ اس کی نظر سے گذری ہوں گی۔ مصنف نے جہاں شیر شاہ کی تعریف میں کسی قسم کے مبالغے سے کام نہیں لیا، جو اس کے لئے ان حالات میں ناممکن تھا اس نے اکبر کو خوش کرنے کے لئے شیر شاہ کے ساتھ زیادتی بھی نہیں کی اور حتی الوسع اس کی تمام خوبیاں بیان کردی ہیں اس لحاظ سے تاریخ شیر شاہی کی بہت اہمیت ہے، اور تاریخ ہند کے ہر طالب علم کو اسے پڑھنا چاہیئے۔

شروع میں فریدخاں (شیر شاہ) کے خاندانی حالات ہیں۔ اور سوتیلی ماں کی وجہ سے اپنے والد کے ساتھ جو ناچاقی ہوگئی تھی اسے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ پھر جس خوبی سے اس نے اپنے باپ کی جاگیر کا انتظام کیا اور بعد میں آہستہ آہستہ ترقی کرکے پورے بہار اور بنگال کا وہ حاکم ہوگیا، مصنف نے اس کا ذکر کیا ہے۔

جب فریدخاں اپنے باپ میاں حسن سے رخصت ہوکر جاگیر کو جانے لگا، تو اس نے بقول مصنف باپ سے جو عرض کیا، وہ دراصل بنیادی نقطہ ہے اس کی تمام بعد کی کامیابیوں کا اور اساس ہے اس کے نظام حکومت کا۔ فریدخاں نے اپنے باپ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:- سپاہیوں میں اکثر تمہارے عزیز ہیں کہ وے لوگ دونوں پرگنوں میں ہیں۔ اور میں بہت سی زراعت اور عمارت کے زیادہ ہونے میں سعی کرونگا اور عمارت و زراعت کی زیادتی سوائے عدل کے میسر نہیں ہوتی۔ حکیموں نے کہا ہے اچھی خصلتوں سے عدل ہے کہ نتیجہ اس کا بقا بہت پادشاہت کی اور وسعت ملک کی ہے۔ اور زیادتی خزانے کی اور آباد ہونا گاؤں اور شہر کا ہے، اور بُرے کاموں سے ظلم ہے کہ ثمرہ اس کا زوال پادشاہت کا اور خرابی ملک کی اور موجب بدنامی کا دنیا و آخرت میں ہے اور آباد ہونا ملک کا رعیت پر موقوف ہے اوّل تمام رعیت پر شفقت کرنا اور زیردستوں پر رحم کرنا کہ وے سپرد کئے ہوئے حق تعالےٰ کے ہیں تا یہ کہ بیامراد انہوں کی ظالموں کی جفا اور ستمگاروں کی بلا کی شدت سے محفوظ رہیں۔

بیت

ملک گر آباد چاہے خلق کو معمور رکھ	اور بلا سے ظالموں کی ان کے تیئیں نت دور رکھ

دوسری سیاست کہ آبادی ملک کی اس پر موقوف ہے۔ اگر وہ شہ حکام اس بندوبست پر نہ رہے اور طمع سی کی

پادشاہت میں جلدی خرابی پڑتی ہے۔

بیت

سیاست سے ہو ملک کا انتظام ۔۔۔ سوائے سیاست کے ہووے خلل

اور بدوں قاعدے شریعت کے حق اپنے مرکز پر قرار نہیں پاتا کام شرع اور دین کا بے واسطے سیاست کے رونق نہیں پکڑتا۔"

اس کے بعد حاکم کے فرائض کی یوں نشان دہی کی:۔ "حاکم کو چاہیئے کہ سستی اور کاہلی کو کام نہ فرمادے اور بارعام کا حکم کرے تاکہ مظلوموں کے احوال سے بخوبی آپ واقف ہو اور عدالت کے باغ کو سیاست کی آب جو سے پانی دے۔ نہیں ہے ملک مگر عدل سے اور نہیں ہے عدل مگر سیاست سے، پادشاہت سوائے سیاست کے قبضے میں نہیں رہتی اور سوائے آب زلالِ سیاست کے فتنے کا غبار نہیں بیٹھتا۔

بیت

تیغِ سیاست ایسی ہے رُخسارِ ملک کو ۔۔۔ عالم فروز کرتی ہے مانند آفتاب"

شیر شاہ نے جونپور میں تعلیم پائی تھی، جو ایک سو سال سے بہت بڑا علمی مرکز چلا آتا تھا عباس خاں نے لکھا ہے کہ اس نے کافیہ قاضی شہاب الدین کے حاشیوں سمیت خوب یاد کیا اور علم بھی تحصیل کیا۔ گلستان، بوستان اور سکندر نامہ وغیرہ بھی پڑھا اور اس بادشاہ کے عہد میں علماء جو واسطے تلاش معاش کے آتے تھے، ان سے حاشیہ بندی کا پوچھتا اور اکثر اوقات تواریخ پادشاہان گزشتہ کی مطالعہ کرتا۔"

وہ کچھ عرصہ بابر کی فوج میں رہا، وہاں اس نے ایک مدت مغلوں میں رہ کر لڑائی کا طور اور تدبیر ملک داری کی اور سب ارکانِ دولت کا معلوم کیا۔ پھر اکثر اوقات پٹھانوں کی مجلسوں میں کہتا اگر میرے بخت نے ساعدت کی اور اقبال نے یاوری کی تو مغلوں کو ملک ہند سے بآسانی نکالوں گا۔" چنانچہ ایسا ہی ہوا، اس نے واقعی مغلوں کو ملک ہند سے نکال دیا۔

علہ سیاست سے یہاں مراد سرکشوں پر سختی سے ہے۔ (تبصرہ نگار)

بنگال سے واپسی پر چوسہ کی لڑائی میں جب شیر شاہ نے ہمایوں کو شکست دی اور مغل لشکر تتر بتر ہو گیا۔
واس نے ہمایوں کے حرم محترم کے ساتھ جو سلوک کیا، وہ عباس خاں کی زبان سے سنئے :۔ "عباس احمد سروانی
جو مولف تحفہ اکبر شاہی کا ہوں زبانی خان اعظم مظفر خاں کہ نواسہ مسند عالی ہیبت خاں اور نواسہ مسند عالی
عمر خاں ککھور کا تھا سنا ہیں نے کہ کہتا تھا کہ میں شیر خاں کے پاس کھڑا تھا کہ بیگم اور جمیع حرم محترم ہمایوں بادشاہ
کی بہت سے رنڈیوں کے ہمراہ لائے جس وقت شیر خاں نے ان کو دیکھا گھوڑے سے اتر کر بہت سی تعظیم و
عزت کی اور دوبارہ وضو کر، دوگانہ شکرانے کا حق سبحانہ' تعالی کی جناب میں ادا کیا اور ہاتھ مناجات کے
واسطے اٹھا کر نہایت عجز و نیازی سے کہا یا الہ العالمین بزرگی اور دست قدرت تجھے سزاوار ہے کہ اس میں
زوال و نقصان کو راہ نہیں کہ ادنی بندہ فرید کو سرفراز کیا اور ہزیمت ہمایوں بادشاہ کے لشکر میں کہ وہم و خیال
میں نہ آتی تھی اور اس کے اہل و عیال کو میرا اسیر کیا۔ بعد اس کے نقیبوں کو حکم دیا کہ لشکر میں پکار دو کہ کہ کوئی
دی مغلوں کے زن و فرزند کو اسیر نہ کرے۔ رات کی رات اپنے اپنے ڈیرے میں رکھیں اور تڑکے ہی سب
د بیگم کے سرا چوں پاس لادیں اور اس کے حکم کا دبدبہ پٹھانوں کے لشکر میں ایسا خوب تھا کہ کسی کو
قدرت نہ تھا کہ اس کے خلاف کرے"۔

اس کے بعد ہمایوں سے شیر شاہ کی ایک اور جنگ ہوتی ہے، اس کا ایک واقعہ عباس خاں یوں بیان
کرتا ہے :۔ "حمید خاں گاگر کہ مشیروں سے شیر خاں کے تھا، اس نے عرض کیا کہ ابھی سارا لشکر مغل کا نہیں
اترا (دریائے گنگا سے پار نہیں ہوا) مارا چاہیئے شیر خاں نے کہا اس سے آگے میرے تئیں دست قدرت
نہ تھی اور ہر ایک طرح کا مکر و حیلہ لڑائی میں کرتا تھا اور ان دنوں میں برکت سے لطف قادر قیوم کی لشکر میرا
بادشاہ کے لشکر سے کم نہیں ہے، آپس کی مخالفت اور کم طالعی کے باعث پہلے مغلوب تھے اور میرے
اقبال دولت کے سبب پٹھان جس مقام پر مغلوں سے لڑے غالب آئے اس قدرت پر میں عہد شکنی نہیں
کروں گا"۔

غرض پوری کتاب اس طرح کے دلچسپ واقعات پر مشتمل ہے اور اسے پڑھ کر شیر شاہ کی پوری
تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔

آخر میں شیر شاہ کے اخلاق وعادات اور اس کے نظام حکومت کا بیان ہے۔ مصنف لکھتا ہے۔

"شیر خاں بڑا عادل تھا اور اکثر اوقات فرماتا کہ عدل ہر دین میں بہتر ہے۔ اور کفر و اسلام کے بادشاہوں کے نزدیک بھی خوب ہے کوئی طاعت وعبادت برابر عدل کے نہیں ۔۔۔ اور جو کچھ بھی کاہلی ارکان دولت سے ظہور میں آوے، تو سبب ملک کے زوال کا ہے۔ اور طمع دنیوی کو سپاہی اور رعیت کے حق میں زور و قوت کے باعث اور فوج وحشم کی بہتایت سے راہ نہ دے اور مظلوم وستم رسیدہ کے تیر آہ سے پرہیز کرے۔

بیت

فولاد کی زرہ سے اگر گزرے تیرا تیر　　　پیکان آہ گزرے ہے کوہ حدید سے"

افسوس شیر شاہ کو ہندوستان پر حکومت کرنے کا زیادہ موقع نہ ملا، لیکن اس کے عہد حکومت میں ہندوستان کو جو امن ملا، وہ عباس خاں کی زبان سے سنئے۔

"جس روز سے شیر خاں نے مسند حکومت وسرداری پر قرار پایا کسی شخص کو مخالفت کی دم مارنے کی مجال نہ تھی اور کوئی شخص نشان زبردستی اور بغاوت کا اور کوئی خار دل آزار اس کے ملک کے گلشن میں نہ اگا اور کسی امیر وسپاہی یا چور و قضاق (قزاق) کا یہ زہرہ نہ تھا اور شیر خاں کے عصر میں مسافر و رہ گزر نگہبانی کی محنت سے بے پروا تھے اور چلنے کے وقت تعین منزل سے کچھ فکر و اندیشہ دل میں نہ رکھتے تھے اور جس مکان پہ رات ہوتی، خواہ ویران ہو خواہ آباد، وہاں نڈر اتر پڑتے اور مال واسباب اپنا بے اندیشے رکھ دیتے اور مرکب کو چراگاہ میں چھوڑ دیتے اور آپ بفراغت تمام اپنے گھر کی طرح سو رہتے اور اس اطراف کے زمیندار اس وہم سے کہ مبادا ان کو آزار پہنچے اور وہ سبب اپنی گرفتاری وخواری کا ہو نگہبانی کرتے اور اس کے عصر میں کیسی ہی بڑھیا زر و زیور اپنے سر پر راہ میں لئے جاتی ہو تو کوئی چور یا کتوال کا پیادہ شیر خاں کے ڈر سے اس کے امن کے گرد نہ پھر سکتا۔

بیت

کیا سایہ عالم میں اس طور پر　　　کہ رستم سے بڑھیا بھی ہے گی نڈر

صل کتاب فارسی میں تھی۔ مظہر علی خاں ولا نے جن کا تعلق فورٹ ولیم کالج سے تھا ایک انگریز کپتان کی فرمائش پر اس کا اُردو میں ترجمہ کیا، سلمان اکیڈمی نے بجنسہ وہی ترجمہ چھاپ دیا ہے اور الفاظ و ترکیب کے علاوہ املا تک بھی ہی رہنے دی ہے۔ جیسے قبول نکیا'، "سپاہی یوئیں"۔ "ہو"۔ "نر ہے"۔ "تھا"۔ "نڈروں گا"۔ "قصاق" نلے سکے"۔ "رکھتے"۔ وغیرہ وغیرہ۔

اگر ناشرین حضرات کسی وجہ سے مظہر علی خاں ولا کے ترجمے کی زبان اور اس کا اسلوب برقرار رکھنا ضروری سمجھتے تھے، تو وہ اسے ضرور برقرار رکھتے، لیکن اگر کم سے کم وہ طریقۂ املا ہی آج کے زمانے کے مطابق کر دیتے، تو س کتاب کی افادیت بہت بڑھ جاتی۔ اور اسے پڑھنا اور سمجھنا آسان ہوتا۔ آخر یہ ادب کی کتاب تو ہے نہیں کہ فورٹ لیم کالج کے عہد کے لئے سند کا کام دیتی، یہ تاریخ کی کتاب ہے، اور اس کا عام فہم ہونا ضروری ہے۔

کتاب مجلد ہے، ضخامت ۱۵۶ صفحات، بڑا سائز $\frac{20 \times 26}{8}$، قیمت پانچ روپے

ناشر۔ سلمان اکیڈمی۔ حق نشان۔ ۳۰ نیو کراچی ہاؤسنگ سوسائٹی۔ کراچی ۵

سیرت سید احمد شہیدؒ حصہ اوّل

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی اس مشہور تصنیف کے حصہ اوّل کا یہ چوتھا ایڈیشن ہے جسے کچھ عرصہ ہوا، رے اہتمام سے لاہور سے شائع کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں حضرت سید احمد شہیدؒ کے ولادت سے بیعت امامت تک کے حالات آ گئے ہیں۔ حصہ دوم "بیعت امامت کے بعد سے معرکۂ بالاکوٹ اور شہادت کے حالات پر مشتمل ہوگا" حصہ شاید اب تک شائع نہیں ہو سکا۔ زیر نظر کتاب کے بڑے سائز کے ۴۰۸ صفحات ہیں حصہ دوم کی ضخامت اس سے زیادہ ہوگی، اس میں سید صاحبؒ کے اوصاف و اخلاق اور صفات و خصوصیات کا بیان ہوگا۔ اور آپ کے مجددی اور اصلاحی کارنامے، آپ کی جماعت کی سیرت و اخلاق خلفا اور اہل ارادت پر مستقل ابواب ہوں گے۔"

ان سالوں میں حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان کی تحریک احیائے دین پر دو صاحبوں نے بڑی تفصیل سے لکھا ہے ل تو اس کتاب کے مصنف ہیں، اور دوسرے مولانا غلام رسول مہر۔ ان دونوں بزرگوں کو سید صاحب سے انتہائی قیدت بھی ہے۔ انھوں نے اس موضوع پر تحقیق کرنے میں اپنی طرف سے کوئی کسر بھی نہیں چھوڑی، ...

سید صاحب اور ان کی تحریک پر جو بھی تاریخی مواد کہیں سے مل سکتا تھا، اس سے استفادہ کیا۔ اور کئی سال اس میں لگائے۔ آخر میں اپنی تحقیق و تدقیق کا حاصل ان کتابوں میں پیش کیا۔ واقعہ یہ ہے کہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور مولانا غلام رسول مہر کی تصنیفات حضرت سید احمد شہید اور ان کی تحریک کا پورا احاطہ کرتی ہیں اور اس کے جملہ پہلوؤں پر حاوی ہیں۔

زیر نظر کتاب کے مصنف کے نزدیک سید احمد شہیدؒ ان افراد امت میں سے ایک فرد ہیں "جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا مکمل صحیفہ ہیں، جنہوں نے آپ کے کمالات میں سے انتخاب نہیں کیا، بلکہ ان کو مسلّم لیا۔ یہ وہ افراد ہیں، جن میں سے ہر فرد اپنی جامعیت میں ایک پوری امت ہے"۔ سید احمد شہیدؒ کے پیش نظر کیا مقاصد تھے۔ مصنف نے مختصراً انہیں یوں بیان فرمایا ہے:۔ "سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس نکتے کو اچھی طرح سمجھا کہ حکومت الٰہی کے قیام اور اسلامی نظام و قوانین و حدود کے اجرا اور ماحول کی تبدیلی کے بغیر یہ سب کوششیں "کوہ کندن وکاہ برآوردن" ثابت ہوں گی۔ صرف چند لوگوں کی اصلاح ہو گی۔ لیکن ضرورت فضا بدلنے اور جڑ مضبوط کرنے کی ہے آپ اسی نقشے پر کام کرنا چاہتے تھے، جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے خلفائے راشدین نے کیا، اور تجربہ یہ ہے کہ سب سے زیادہ اور پائدار کامیابی اسی کو ہوئی اور قیامت تک اسلام کی ترقی کے لئے وہی نظام عمل ہے"۔

سید صاحبؒ کی کوششوں کے عملی نتائج کا ذکر کرتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں کہ "آپؒ نے تھوڑے زمانے میں ایک دینی فضا قائم کردی، جس کی صحیح تعریف یہ ہے کہ وہ تیرھویں صدی میں صحابہؓ کا نمونہ تھے ایک رنگ میں رنگے ہوئے ایک سانچے میں ڈھلے ہوئے اللہ کے لئے جان دینے والے ..... تاریخ اسلام میں ایک جگہ اتنی بڑی تعداد میں اس پختگی اور جامعیت کی کوئی جماعت صحابہؓ و تابعینؒ کے بعد مشکل سے ملے گی۔ کیفیات ایمانی کے جاں نواز جھونکے تاریخ اسلام میں بارہا چلے ہیں، لیکن ایمان و یقین اور خلوص و للّٰہیت کی ایسی باد بہاری ہمہ علم میں کہہ سے کم اس ملک میں اس سے پہلے نہیں چلی۔ نہ اس سے پہلے اتنے بڑے پیمانے پر عزم و توکل، جوش جہاد، ایمان و احتساب، شوق شہادت اور یقین آخرت کے ایسے نمونے دیکھنے میں آئے آدم گری اور مردم سازی، اصلاح و انقلاب کے لیے محیر العقول واقعات بھی اصلاح و تربیت کی تاریخ میں نایاب نہیں، تو کم یاب ضرور ہیں" اور جہاں

تک سید صاحب کی اس دعوت و تحریک کا تعلق ہے مصنف کے الفاظ میں "ان آخری صدیوں میں ہم کو دنیائے اسلام میں کسی ایسی مذہبی تحریک کا علم نہیں ہوا، جو ہندوستان کی اس تحریک احیائے سنت وجہاد سے زیادہ منظم و وسیع ہو، اور جس کے سیاسی و مذہبی اثرات اتنے ہمہ گیر اور دور رس ہوں ...."

لیکن ان تمام فضائل اور کارناموں کے باوجود تاریخ کا یہ کتنا بڑا اور دردناک سانحہ ہے کہ اس تحریک کے داعی و قائد معا رکۂ بالاکوٹ میں شہید ہوئے، اور یہ تحریک نہ تو اس سرزمین میں غلبۂ کفار کو روک سکی اور نہ اس سے احیائے دین کے سلسلہ میں وہ نتائج نکلے، جو اس کے دعاۃ اور کارکنوں کے پیش نظر تھے۔

جہاں تک حضرت سید احمد شہیدؒ کے سوانح حیات اور آپ کے اصلاحی و تجدیدی کارناموں کا تعلق ہے، مصنف نے واقعی اس کتاب میں اس کا پورا حق ادا فرمایا ہے، اور ان کی یہ سعی ہر لحاظ سے کامیاب ہے، لیکن سید صاحب کی دعوت کا جو تاریخی پس منظر انہوں نے پیش کیا ہے، ایک تو وہ بہت مختصر ہے، دوسرے اس میں عقیدت مندانہ جذبات ضرورت سے زیادہ ہے بے شک اس دنیا کی زندگی میں "ایمان ویقین اور خصوصی وللّہیت" کی بہت اہمیت ہے، لیکن سیاسی، معاشی، اجتماعی اور طبقاتی ٹھوس حقیقتوں کی بھی اس زندگی میں اپنی جگہ ہے، جن کو نظر انداز کرنا گویا ناکامی کو دعوت دینا ہے۔ حضرت سید احمد شہید کے سوانح نگار ان حقیقتوں کو پیش نظر رکھ کر اس موضوع پر لکھیں، تو ہمارے خیال میں اس کے اثرات زیادہ نتیجہ خیز ہوں گے اور قارئین حضرت سید احمد شہیدؒ کی عظمت ذاتی اور ان کے ساتھیوں اور پیروؤں کے "عزم و توکل، جوش جہاد، ایمان و احتساب، شوق شہادت اور یقین آخرت" کے محیر العقول واقعات کے ساتھ ساتھ ان کی ناکامی کے اسباب بھی جان سکیں گے اور یہ مطالعہ ان کے لئے سامان عبرت بھی ہوگا، اور مستقبل کے لئے مشعل راہ بھی، (ا - س)

کتاب مجلد ہے۔ قیمت :- ۸ - ۵۰ روپے ہے اور اس پتے پر مل سکتی ہے۔

القادر۔ ناشران کتب اسلامی۔ ۱۸ ایمپریس روڈ ــــــــ لاہور

افکار و آرا

مکرمی .....

"الرحیم" کے مطالعے کے دوران ایک بات یہ محسوس ہوئی کہ بعض ضروری اصطلاحات کے مرادفات کا انگریزی میں شاملِ متون ہونا نہایت مفید ہی نہیں، بلکہ ضروری بھی ہے۔ اور متعدد علمی رسائل کا ایک عرصہ سے یہ دستور چلا بھی آرہا ہے۔ آپ بھی یہ طریقۂ کار اختیار کریں بالخصوص اس دور میں جب کہ شاہ صاحب کی اصطلاحات علمیہ کا تعارف نہایت اہم اور ناگزیر ہے، یہ چیز اکیڈمی کے بنیادی مقاصد میں ہونی چاہیئے۔

ایک عرض اور ہے۔ رسالے کی زبان ذرا سہل کیجئے۔ بہت سے شائقین مضامین کو عربی کے ادق الفاظ سے مملو پاکر ان سے استفادہ نہیں کرسکتے۔ مقصد خیالات کی نشر و اشاعت ہونی چاہیئے نہ کہ لوگوں پر الفاظ کی بم باری۔ اگرچہ "شذرات" میں شاہ صاحب کی علمی اصطلاحات اور دقیق مسائل کی تشریح کی ضرورت کا اظہار کیا گیا ہے لیکن جس زبان میں خود یہ "شذرات" ہیں اگرچہ وہ لکھنے والے کے مبلغ علم کے عمق و وسعت پر مشعر ہیں۔ لیکن عام قارئین کے لئے باعث گرانی ہیں۔

ایک حقیقت جس پر بار بار زور دینے کی ضرورت ہے وہ ہے تنگ نظری سے دست کشی اور وسعت نظری۔ بد قسمتی سے ہمارے اکثر اہل علم حضرات میں تعصبات پلائے جاتے ہیں اور وہی سب سے زیادہ نقصان موجب ہوئے ہیں۔ اگر شاہ صاحب کی تعلیمات کے طفیل ہمارے ہاں سے یہ تعصبات ختم ہو جاتے تو یہ ایک عظیم کارنامہ ہوتا۔ بہرحال اب ہمیں شاہ صاحب کی تعلیمات کی اس روح کو خاص طور سے پیش نظر رکھنا چاہیئے۔

آج تقلیدی ذہن کو جھنجھوڑنے کی بڑی سخت ضرورت ہے۔ نیز جن منابع (SOURCES)

سے شاہ صاحب نے استفادہ کیا ہے، جب تک ان تک موجودہ نسل کی رسائی نہیں ہوگی، شاہ صاحب کو ٹھیک طرح سمجھا نہیں جا سکتا۔ مزید برآں شاہ صاحب نے جس حد تک کام کو بڑھایا ہے، وہ آخری حد نہیں ہے۔ اس کام کو اور آگے بڑھانا چاہیئے۔ اور اس کے لئے باہمت نفوس کی ضرورت ہے، اور وہ جب ہی پیدا ہوں گے کہ تحقیق اور ریسرچ آزادانہ اور وسیع پیمانے پر ہو۔ اب وقت آگیا ہے کہ بے جا تقدس کو راستہ میں بلا وجہ اور بے فائدہ حائل نہ ہونے دیا جائے۔

(حکیم) محمد قاسم۔ مزنگ لاہور

"الرحیم" کے دوسرے شمارے میں "عرب قومیت، اشتراکیت اور اسلام" مضمون پڑھا۔ واقعہ یہ ہے کہ آج دنیا میں بڑے پیمانے پر سیاسی، معاشی اور سماجی تبدیلیاں ہو رہی ہیں اور پس ماندہ اور محکوم قومیں ترقی اور آزادی کی منزل پر پہنچنے کے لئے کوشاں ہیں، صرف عرب ممالک میں ہی نہیں ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے دوسرے ممالک میں بھی آئے دن انقلابات رونما ہو رہے ہیں۔ بات یہ ہے کہ ترقی یافتہ حکمران قوموں نے پس ماندہ محکوم قوموں کو سیاسی آزادی دینے کے بعد بھی بدستور اپنی اقتصادی غلامی میں جکڑ رکھا ہے جس کے خلاف ان کے عوام میں سخت ہیجان برپا ہے اور وہ اپنے ہاں سیاسی آزادی کے بعد اقتصادی آزادی بھی بروئے کار لانا چاہتے ہیں اور اس کے لئے اپنے سماج میں بنیادی اور دور رس تبدیلیاں لانے کے حق میں ہیں، یہ ساری کشمکش آج ہماری آنکھوں کے سامنے ہو رہی ہے،

سوال یہ ہے کہ یہ تبدیلیاں کیسی ہوں گی، اور انہیں کون لائے گا؟ کیا استحصال پسند طبقے اپنے اپنے ملکوں میں یہ تبدیلیاں لا سکتے ہیں اور آیا یہ تبدیلیاں دینی حدود کے اندر ہوں گی، یا ان کے لئے دین کا انکار کرنا پڑے گا میرا خیال ہے کہ اگر ان ملکوں کی سیاسی قیادتوں کو دین کی کوئی ایسی عملی تعبیر مل گئی، جو آج کے سماجی و سیاسی تقاضوں کو پورا کر سکے، تو وہاں جو انقلابات ہوں گے، ان میں مذہب کا انکار ضروری جزو نہیں ہوگا۔ اور ان کی قومی زندگی میں لازماً مذہب کی باقیات صالحات رہیں گی۔ ان دنوں جو کچھ عرب دنیا میں ہو رہا ہے وہ دیر یا سویر دوسرے ملکوں میں بھی ہو کر رہے گا۔ اور وہ اس لئے کہ صنعتی اور مشینی زندگی اپنے سماجی اور سیاسی تبدیلیاں لازمی طور پر لاتی ہے۔ خدا نخواستہ اگر ہم مذہب کا وہی جامد تصور پیش کرتے رہے جو کسی زمانے میں یورپ کے کلیسا نے

یعنی کیا تمام اقتصادی ہوگا، جو یورپ میں ہو چکا ہے، یعنی عوام کی انقلابی قوتیں مذہب سے بیزار ہو کر وہ تبدیلیاں لائیں گی، جن کا تقاضا آج کا سماج کر رہا ہے۔ یہ خیال کہ محض اسلام کا نام اور عوام کی اس سے جذباتی عقیدت اس سیلاب کو روک سکے گی، محض خوش فہمی ہے، ہمارے ہمسائے ملک ہندوستان اور برما میں مذہب کا جو حشر ہو رہا ہے وہ ہماری آنکھیں کھولنے کے لئے کافی ہے۔

صدر ناصر اپنی سیاسی، سماجی و اقتصادی تبدیلیوں کو اسلام کے ساتھ ہم نوا کرنے کی جو کوششیں کر رہا ہے وہ کہاں تک کامیاب ہوتی ہیں، ابھی اس کے بارے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ آج برما میں بدھ مت بحیثیت ایک روحانی تحریک کے ختم ہو چکا ہے اور ہندوستان میں ہندو دھرم بس ایک ہندو سرمایہ دارانہ نظام کی شکل میں زندہ ہے ہمیں اس سے سبق لینا چاہیئے۔

میرے نزدیک ولی اللہی فکر اسلام کی ایک ایسی تعبیر ہے جسے اگر آج کے دور کی سیاسی، معاشی اور سماجی ضرورتوں اور فکری تقاضوں کی روشنی میں از سر نو ترتیب دیا جائے اور مولانا سندھیؒ کے الفاظ میں حضرت شاہ ولی اللہؒ کو "مجتہد مطلق" مان کر مولانا محمد قاسم کو اس ضمن میں "مجتہد فی المذہب" کا درجہ دیا جائے اور اس سلسلۂ فکر کو اور آگے بڑھایا جائے تو ایک ایسا نظریہ حیات مرتب ہو سکتا ہے، جو دینی بھی ہوگا، اور اس میں اتنی وسعت بھی ہوگی کہ وہ اس دور کے سماجی و سیاسی و اقتصادی تقاضوں کو پورا کر سکے۔

ع۔ ف۔ سواتی (مانسہرہ)

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

شاہ ولی اللہ اکیڈمی کا قیام اللہ تعالےٰ مبارک فرمائے

ہندوستان کی کئی صدیوں کی تاریخ علم و ادب میں شاہ ولی اللہؒ کے سوا کوئی اور شخص ایسا نظر نہیں آتا کہ جس کے قلم نے جدت دکھائی ہو۔ اور اس سے مسلمانوں کے ادب میں کسی نئی تخلیق کا اضافہ ہوا ہو۔۔۔ اس رسالے میں شاہ ولی اللہؒ کی تعلیم سے ماخوذ ایسے مضامین کی کثرت ہونی چاہیئے جن سے مسلمان نوجوانوں میں کمیونزم اور الحاد و دہریت کی سکت تھام ہو۔ اس وقت یہی سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ اور سارے درد مند مسلمان اہل علم و قلم کو

س جانب متوجہ ہونا چاہیئے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ آپ کے کام میں خیر و برکت عطا فرمائے اور مسلمان پھر ایک بار حکمت حقہ کے علم بردار اور قائد ہو جائیں۔

(ڈاکٹر) محمد غوث (ایم اے۔ ایل ایل بی۔ پی ایچ ڈی) مدراس

جناب ایڈیٹر صاحب

شاہ ولی اللہ اکیڈمی کا شائع شدہ ٹریکٹ اور مقاصد و نظام کار اور اس کے ماہنامہ الرحیم کے دونوں شمارے پڑھے۔ ان سے میں نے جو تاثر لیا، اسے قلم بند کر کے بھیج رہا ہوں اس امید کے ساتھ آپ اسے شائع کر دیں گے

میں حضرت شاہ صاحب کی علمی عظمت کا معترف ہوں اور مجھے یہ بھی تسلیم ہے کہ وہ برصغیر کے عظیم ترین عالم، عارف اور حکیم تھے۔ اسلامی علوم میں بھی ان کا مرتبہ بڑا بلند تھا۔ اور تصوف و حکمت میں بھی ان کی گہری نظر تھی اور یہ کہ وہ عالم کے ساتھ ساتھ محقق بھی تھے اور مجتہد بھی اور مجھے اس کے ماننے میں کوئی امر مانع نہیں کہ ان کے افکار و تعلیمات کی اشاعت کی جتنی ضرورت اس دور میں ہے شاید ہی کسی اور دور میں ہو۔

الرحیم کے پہلے شمارے میں آپ نے "کیا شاہ ولی اللہ اکیڈمی یہ کرے گی" کے عنوان سے جو مراسلہ شائع کیا ہے۔ اور اس میں یہ جو سوال پوچھا گیا ہے، وہ واقعی قابل توجہ ہے کہ آخر شاہ صاحب کے بعد ان کی کتابیں لوگوں کے زیر مطالعہ رہیں۔ ان کے ماننے والے ان کی تعلیمات کو فروغ دینے میں کوشاں رہے اور شاہ صاحب کے نام سے ایک مستقل سیاسی فکری تعلیمی علمی تحریک بھی چلی، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا اور آگے چلکر شاہ صاحب کی دعوت محدود ہو کر رہ گئی اس سے نہ تو ذہنی جمود ٹوٹا، نہ ہمارے ہاں کی تنگ نظری ختم ہوئی۔ اور نہ ہم اس قابل ہوئے کہ یورپ سے آنیوالے فکری سیلاب کا مقابلہ کر سکیں۔ بلکہ آپ ناراض نہ ہوں تو میں عرض کروں کہ شاہ صاحب کے نام لیوا جمود، رجعت پسندی اور اسلاف پرستی کے سب سے بڑے پشتیبان بن گئے اور ان کی تمام تر کوششیں اس کے لئے وقف رہیں کہ گردش ایام کو پیچھے کی طرف لے چلیں۔

میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ آج شاہ صاحب کے افکار و تعلیمات کی اشاعت کی ضرورت نہیں لیکن اس کے باوجود یہ سوال اپنی جگہ رہتا ہے کہ شاہ صاحب کی فکری دعوت سے ہمارے ہاں کیوں ذہنی بیداری پیدا نہیں ہوئی۔

میں نے اس مسئلہ پر تھوڑا سا غور کیا ہے اور اس بارے میں میری جو رائے ہے، وہ بھی لکھتا ہوں۔ شاہ صاحب کی ایک مذہبی تجدیدی دعوت تھی اور ہر مذہبی تجدیدی دعوت کی طرح یہ دو اجزا سے مرکب تھی، ایک جزو اتباعِ سلف اور وجدانی اور جذباتی اپیل کا تھا۔ اور دوسرا عقلیت کا۔ بدقسمتی سے اس دعوت کی جو عملی شکل بنی اس میں تمام زور اول الذکر پر رہا، اور جزو ثانی سے بے اعتنائی برتی گئی۔ اور اس کا وہ نتیجہ نکلا جو آج ہمارے سامنے ہے۔

احمد سعید

سمن آباد، لاہور

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ،

ماہنامہ الرحیم کا تیسرا نمبر موصول ہوا۔

فلسفہ ولی اللہی کے پیاسے مدت سے آس لگائے بیٹھے تھے کہ قدرت کی جانب سے اچانک ان کی تشنگی کو بجھانے کا سامان ایک مستقل ادارے کی طرف سے ہو رہا ہے، یہ خدا کا فضل ہے اور احسان۔

جو بھی کتابیں اور مطبوعات اس فلسفے کے متعلق آپ کی جانب سے شائع ہوں یا دوسرے اداروں کی ہوں یا حضرت سندھی رحمۃ اللہ علیہ کے کتابچے جو شروع سے اب تک چھپے ہیں وہ سب چاہتا ہوں۔ الرحیم نیا ہے ابتدائی خامیاں آگے چل کر درست ہو جائیں گی حق جل مجدہ سے دعا ہے کہ یہ ادارہ پھلے اور پھولے اور اس کا نور اکناف عالم کو منور کرے۔

ولی اللّٰہی فلسفہ صرف پاکستانیوں کا حق نہیں ہے اور نہ فقط مسلمانوں کا ورثہ ہے بلکہ یہ تو نوع انسانی کا فلسفہ ہے جو اسے اخلاق کے ساتھ سمجھیں، وہی اس کے مستحق ہیں والسلام

احقر حکیم عبدالغفور سرہندی شہدادپور، ضلع سانگھڑ

محمد سرور پرنٹر پبلشر نے سعید آرٹ پریس حیدرآباد سے چھپوا کر شائع کیا

مطبوعات شاہ ولی اللہ اکیڈمی

★

لمحات (عربی)

شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے فلسفہ تصوف کی یہ بنیادی کتاب عرصے سے نایاب تھی - مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی کو اُس کا ایک پرانا نسخہ، جو اغلاط سے پُر تھا، ملا - موصوف نے بڑی محنت سے اس کی تصحیح کی، اور شاہ صاحب کی دوسری کتابوں کی عبارات سے اُس کا مقابلہ کیا - اور وضاحت طلب امور پر تشریحی حواشی لکھے - کتاب کے شروع میں مولانا کا ایک مبسوط مقدمہ ہے -

شاہ صاحب نے اس کتاب میں ''وجود'' اور اُس سے کائنات کا جس طرح صدور ہوا ہے، اُس پر بحث کی ہے، اور اپنی الہیاتی حکمت کے دوسرے مسائل بھی بیان کئے ہیں - قیمت دو روپے

—— : o : ——

شاہ ولی اللہ کی تعلیم

از پروفیسر غلام حسین جلبانی سندھ یونیورسٹی

پروفیسر جلبانی ایم اے صدر شعبہ عربی سندھ یونیورسٹی کے برسوں کے مطالعہ و تحقیق کا حاصل یہ کتاب ہے، اس میں مصنف نے حضرت شاہ ولی اللہ کی پوری تعلیم کا احصاء کیا ہے، اور اُس کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل بحثیں کی ہیں - اُردو میں شاہ صاحب کی تعلیم پر یہ پہلی جامع کتاب ہے -

کتاب مجلد ہے - قیمت ۵۰ء۷ روپے ہے

شاہ ولی اللہ اکیڈمی - صدر - حیدرآباد - پاکستان

Monthly "AR-RAHIM" Hyderabad Regd. S. No. 2548

شاہ ولی اللہ اکیڈمی

اغراض و مقاصد

۱۔ شاہ ولی اللہ کی تصنیفات اُن کی اصلی زبانوں میں اور اُن کے تراجم مختلف زبانوں میں شائع کر

۲۔ شاہ ولی اللہ کی تعلیمات اور ان کے فلسفہ و حکمت کے مختلف پہلوؤں پر عام فہم کتابیں لکھوانا اور اُن کی طبا
واشاعت کا انتظام کرنا۔

۳۔ اسلامی علوم اور بالخصوص وہ اسلامی علوم جن کا شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتبِ فکر سے تعلق ہے، اُن
جو کتابیں دستیاب ہو سکتی ہیں، انہیں جمع کرنا، تاکہ شاہ صاحب اور اُن کی فکری و اجتماعی تحریک پر کام کر
کے لئے اکیڈمی ایک علمی مرکز بن سکے۔

۴۔ تحریک ولی اللہی سے منسلک مشہور اصحابِ علم کی تصنیفات شائع کرنا، اور اُن پر دوسرے اہلِ قلم
کتابیں لکھوانا اور اُن کی اشاعت کا انتظام کرنا۔

۵۔ شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتبِ فکر کی تصنیفات پر تحقیقی کام کرنے کے لئے علمی مرکز قائم کرنا۔

۶۔ حکمت ولی اللہی اور اُس کے اصول و مقاصد کی نشر و اشاعت کے لئے مختلف زبانوں میں رسائل کا

۷۔ شاہ ولی اللہ کے فلسفہ و حکمت کی نشر و اشاعت اور اُن کے سامنے جو مقاصد تھے۔ انہیں فروغ دینے
غرض سے ایسے موضوعات پر جن سے شاہ ولی اللہ کا خصوصی تعلق ہے، دوسرے مصنفوں کی کتابیں شائ

جمادی الاول ۱۳۸۳ھ اکتوبر ۱۹۶۳ء

قیمت سالانہ :- اٹھ روپے قیمت فی پرچہ پچھتر پیسے

جلد ۱ جمادی الاوّل ۱۳۸۳ھ مطابق اکتوبر ۱۹۶۳ء نمبر ۵

فہرست مضامین

شذرات

علوم ولی اللٰہی کے طلبہ اور اساتذہ کو یہ سنکر بڑا رنج ہوگا کہ مولانا ابو العلا محمد اسمٰعیل صاحب گودھروی کا اپنے وطن گودھرا، ضلع پنچ محل، گجرات اسٹیٹ ہندوستان میں انتقال ہوگیا ہے مرحوم ومغفور کے صاحبزادے محمد سعید صاحب نے گودھرا سے اطلاع دی ہے کہ ۵ ستمبر ۱۹۶۳ء کو مولانا رحلت فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا مرحوم کی تمام زندگی درس وتدریس اور تصنیف وتالیف میں گزری۔ شاہ ولی اللہ صاحب کے علوم سے مولانا کو خاص شغف تھا۔ آپ نے شاہ صاحب کی مشہور ترین تصنیف حجۃ اللہ البالغہ کا اردو ترجمہ کیا تھا، جسے کئی سال ہوئے لاہور کے ایک ناشر نے شائع کیا گو اس کتاب کے اب تک متعدد ترجمے ہو چکے ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے مولانا مرحوم کا یہ ترجمہ ہر لحاظ سے ان پر فوقیت رکھتا ہے۔ آپ نے شاہ صاحب کی کتاب المسوی کا بھی جو مؤطا امام مالکؒ کی عربی شرح ہے، اردو ترجمہ مکمل کر لیا ہے۔ اس کے علاوہ آپ نے بہت سی کتابوں کے مسودات چھوڑے ہیں، جنہیں وہ اپنی زندگی میں چھپوا نہ سکے۔ افسوس مولانا مرحوم کے ساتھ ہمارے ان بزرگوں کا سلسلہ ختم ہوگیا جو ایک عرصہ دراز سے ولی اللٰہی علوم کے مطالعہ وتحقیق کے لئے وقف تھے اور ان میں وہ محقق مانے جاتے تھے۔

سب سے پہلے ۱۹۱۹ء میں مولانا ابو الکلام آزاد نے جب کہ وہ رانچی (بہار) میں نظربند تھے مولانا مرحوم کو

حجۃ اللہ البالغہ کا اردو ترجمہ کرنے کا فرمایا۔ اس کے بعد جب مرحوم ۱۹۳۷ء میں حج بیت اللہ کے لئے مکہ معظمہ تشریف لے گئے تو مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم نے بھی نہ صرف آپ کو ادھر متوجہ کیا بلکہ اس پر پیہم اصرار کیا۔ غرض شاہ ولی اللہ صاحب کی تصانیف اور خاص طور سے حجۃ اللہ البالغہ کافی عرصہ تک مرحوم کے زیر مطالعہ وتحقیق رہیں۔ چنانچہ آخرالذکر کتاب کا اردو ترجمہ ان کی کئی سالوں کی محنت کا نتیجہ ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ان کا یہ ترجمہ بہت مقبول ہوا۔

مولانا گودھروی مرحوم کا شاہ ولی اللہ صاحب کے خانوادۂ علمی سے صرف یہی تعلق نہیں تھا، بلکہ ان کا سلسلۂ اسنادِ حدیث بھی شاہ صاحب تک جاتا ہے۔ اس ضمن میں مولانا مرحوم نے لکھا ہے:۔ "اس وقت ہندوستان میں جس قدر بھی محدثین کی اسانید ہیں، ان سب کا سلسلۂ اسناد آخر میں جاکر حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی تک منتہی ہوتا ہے۔ مترجم (حجۃ اللہ البالغہ) کا سلسلہ اسناد بھی حضرت شاہ صاحب تک جاتا ہے۔ فقیر کی اکثر و بیشتر تعلیم مدرسہ عالیہ رامپور میں ہوئی معقولات، فقہ، اصول فقہ، تفسیر اور دیگر علوم و فنون کی سند حضرت علامہ مولانا ابوالافضال محمد فضل حق صاحب رامپوری پرنسپل مدرسہ عالیہ سے مجھے ملی، جو مشہور خیرآبادی خاندان کے ایک جلیل القدر اور جامع کمالات فاضل تھے۔ اور صحاح ستہ، شرح نخبہ وغیرہ کی سند و اجازت حضرت علامہ ابوالمنصور محمد منور العلی صاحب محدث رامپوری سے ملی جو مدرسۂ عالیہ میں درجۂ حدیث کی مسند پر تھے۔ اور جن کا سلسلہ اسناد و اجازت حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی تک منتہی ہوتا ہے حضرت ممدوح ہی کے سلسلے سے فقیر کو دعائے حزب البحر کی بھی سند و اجازت حاصل ہے" جس کی اسناد و اجازت حضرت شاہ ولی اللہ تک منتہی ہوتی ہے"۔ غرض مولانا مرحوم کا حدیث اور اوراد عملیۂ تصوف میں علمی تعلق اور نسبت خانوادہ ولی اللہی سے تھی، اور معقولات میں خانوادہ خیرآبادی سے۔

ہمارے یہ بزرگ ایک ایک کر کے اُٹھتے جا رہے ہیں۔ اور اس طرح جو جگہیں خالی ہو رہی ہیں، انہیں پُر کرنے والے کہیں نظر نہیں آرہے۔ مولانا گودھروی صاحب کی دینی و علمی و تحقیقی

زندگی ہم سب کے لئے ایک نمونہ ہے۔ خدا تعالیٰ انہیں ان کی دینی وعلمی خدمات کا صلۂ عظیم عطا فرمائے اور انہیں اپنی رحمت ومغفرت سے نوازے۔ آمین

آج دنیائے اسلام میں بالعموم اور پاکستان میں بالخصوص جو غیر معمولی سیاسی، سماجی اور اقتصادی تبدیلیاں ہو رہی ہیں، ان کا مسلمانوں کی انفرادی واجتماعی نیز اخلاقی وجذباتی زندگی پر بڑے دور رس اثرات پڑ رہے ہیں جن کی وجہ سے ان کے معاشرے میں ایک بحران کی سی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ اب چونکہ اسلام مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبے پر حاوی ہے، اور ہر معاملے میں اسی کی طرف رجوع کیا جاتا۔ اور اس سے رہنمائی حاصل کی جاتی ہے اس لئے قدرتاً اسلام پر عبور رکھنے والے حضرات سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ آگے بڑھیں اور اس بحران کے تدارک کی کوشش کریں۔

ہمارا پرانا معاشرہ ختم ہو رہا ہے اور اس کی جگہ ایک نیا معاشرہ جسے موجودہ صنعتی انقلاب نے جنم دیا ہے، لے رہا ہے، قوموں کی زندگی میں یہ "تداخل" کا دور ہوتا ہے اور اس میں اضطراب و خلفشار لازمی ہے۔ یہ ایک اچھی بات ہے کہ سرکاری وغیر سرکاری علمی وتحقیقی اداروں کے علاوہ بعض نجی و آزاد ادارے بھی وجود میں آ رہے ہیں جن کے پیش نظر اُن ہمہ جہتی مسائل کا اسلامی حل پیش کرنا ہے جو موجودہ بحران کے موجب ہیں۔

ہم ان کوششوں کا خیر مقدم کرتے ہیں اور جن نازک حالات سے مسلمانوں کو آج سابقہ پڑ رہا ہے۔ اور آیندہ پڑے گا۔ ان کی سنگینی اس امر کی متقاضی ہے کہ مطالعہ وتحقیق کے اس کام میں آپس میں زیادہ سے زیادہ تعاون ہو۔

اٹھارہویں صدی عیسوی کا ہندوستان

محمد سرور

تاریخ میں یہ بارہا ہو چکا ہے کہ جب بڑی بڑی سلطنتیں بنتی ہیں، اور ان کے زیر سایہ کافی عرصہ تک ان کی رعایا کو امن نصیب ہوتا ہے تو اس میں آہستہ آہستہ بیداری کے جذبات نشو ونما پانے لگتے ہیں، اور جیسے ہی ان سلطنتوں میں ضعف کے آثار ظاہر ہوتے ہیں، جو کہ فطری طور سے ناگزیر ہوتا ہے، تو محکوم رعایا کے جان دار طبقے آزادی کے لئے کوشش کرتے ہیں، اور اکثر اوقات ان کی یہ کوششیں کامیاب ہو جاتی ہیں چنانچہ بڑی سلطنتیں ختم ہو جاتی ہیں، اور ان کی جگہ نئے طبقے مسند اقتدار پر آجاتے ہیں۔ تاریخ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں اسلام جہاں بھی پہنچتا تھا خواہ بحیثیت ایک حکمراں طاقت کے، یا بطور ایک تبلیغی مذہب کے، اس سے وہاں کے عوام متاثر ہوتے تھے، چنانچہ بعض تو دائرہ اسلام میں داخل ہو جاتے، اور اس طرح ملت اسلامی کا جزو بن جاتے، لیکن جو اسلام نہ لاتے، وہ بھی اس کی تعلیمات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہتے۔ توحید اور مساوات، اسلام کا یہ عقیدہ وعمل، دو ایسی چیزیں تھیں، کہ ان کی غیر مسلم عوام کے استحصال پسند مذہبی طبقوں پر براہ راست زد پڑتی تھی اور ان کا تقدس واقتدار متزلزل ہوتا تھا شروع شروع میں مثال کے طور پر اسلام ایران پہنچا، ایرانیوں نے اسے اپنایا اور ڈیڑھ صدی نہیں گزری تھی کہ وہ از سر نو ایک زندہ قوم بن گئے۔ ان کی سیاسی آزادی بحال ہو گئی۔ ان کی زبان دوبارہ زندہ ہو گئی۔ اور علوم وفنون کو ترقی دینے اور تہذیب وتمدن کو مالا مال کرنے میں انہوں نے جو کچھ کیا وہ اسلامی تاریخ کا ایک تابناک باب ہے۔ یہی مثال تاتاریوں اور ترکوں کی ہے وہ اسلام کو اپنا کر کہاں سے کہاں پہنچے اور انہوں نے کتنی شاندار حکومتیں قائم کیں، یہ سب کو معلوم ہے۔

برّ اعظم یورپ میں اسلام بحیثیت ایک حکمراں طاقت کے ایک خاص رقبے سے آگے نہ بڑھ سکا،

لیکن یورپ کو قرونِ مظلمہ سے نکلنے، وہاں نشاۃ ثانیہ کو بروئے کار لانے اور روما کی پاپائیت کے خلاف مذہبی اصلاح کی تحریک کو جنم دینے میں ان اسلامی اثرات کا جو اسپین، سسلی اور مشرقِ قریب کے ملکوں سے یورپ میں پہنچے، اور وہاں ان دُور رس تبدیلیوں کا باعث بنے، کتنا بڑا حصہ ہے، اس سے تاریخ کا کوئی طالب علم انکار نہیں کرسکتا۔ کم و بیش یہی مثال برصغیر پاک و ہند کی ہے، گو ایک وقت ایسا آیا کہ اس پوری سرزمین پر اسلام بحیثیت ایک سیاسی حکمراں طاقت کے مسلط ہوگیا، لیکن وہ یہاں کے عوام کو اس طرح اپنا نہ سکا، جیسے اس سے پہلے وہ ایرانیوں اور تاتاریوں اور ترکوں کو اپنا چکا تھا، لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اس برصغیر میں اسلام کی آمد کے بعد اس کے غیر مسلم عوام میں جو مذہبی، ذہنی، سماجی اور بعد میں سیاسی تبدیلیاں ہوئیں یا تو اسلامی اثرات کی وجہ سے نہ تھیں یا وہ ان کا ردّعمل نہ تھا۔

ڈاکٹر تارا چند نے اپنی مشہور کتاب "انڈین کلچر پر اسلام کے اثرات" میں لکھا ہے کہ ہندو مذہب میں اصلاحی تحریک کی بنا سب سے پہلے جنوبی ہند میں پڑی، جہاں کہ اسلام بطور ایک غیر فوجی طاقت کے پہنچا، اور وہاں کے ہندوؤں کو مسلمانوں کے ساتھ آزادی سے ملنے جلنے کا موقع ملا، اور وہ اسلام کی تعلیمات سے متاثر ہوئے سیاسی بیداری کی ابتدا بالعموم مذہبی اصلاحی تحریکوں سے ہی ہوا کرتی ہے۔ جب اسلام کے زیر اثر یا اس کے ردّعمل میں ہندوؤں میں مذہبی اصلاحی تحریکیں اٹھیں، تو لامحالہ آگے چل کر انہوں نے سیاسی بیداری کی شکل اختیار کی اور ہندوؤں کے یہ طبقے سیاسی آزادی کے لئے جدوجہد کرنے لگے۔

سنہ ۱۰۰۰ء کے لگ بھگ جب محمود غزنوی نے ہندوستان پر اپنے تاریخی حملے شروع کئے، تو گو ابتدا میں اس کا کچھ مقابلہ ہوا، لیکن اس کے بعد میدان بالکل صاف تھا۔ غزنویوں کے بعد جب غوری اور خلجی آئے، تو انہیں برصغیر کی تسخیر اور بھی آسان ہوئی۔ محمد بن بختیار خلجی کے متعلق تاریخوں میں لکھا ہے کہ اس نے تھوڑی سی جمعیت کے ساتھ بہار اور بنگالے کے وسیع علاقے اسلامی حکومت میں شامل کئے اور بنگالے کی راجدھانی تو اس نے فقط اٹھارہ سو سواروں کی مدد سے فتح کی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ہندوستان میں شمالی اور وسط ہند کے راجپوتوں کے سوا کہیں بھی ہندوؤں کوئی فوجی گروہ بندی نہیں تھی، کہ وہ مسلمان حملہ آوروں کا مقابلہ کرتی۔ چنانچہ جب راجپوت زیر ہوگئے، تو مسلمانوں کے سامنے پورا ہندوستان کھلا تھا۔ اور اسے فتح کرنے میں انہیں زیادہ دقت نہیں ہوئی۔

لیکن ۱۷۰۷ء میں پچاس سال کی حکومت کے بعد جب اورنگ زیب عالمگیر کا انتقال ہوتا ہے تو جنوبی ہند میں مرہٹے سر اٹھا رہے تھے۔ اور ان کی حالت یہ تھی کہ "ہر مرہٹہ کاشت کار سپاہی تھا۔ جو کبھی شیواجی کے کسی خوردسال جانشین کی زیر قیادت اور کبھی کسی من چلی رانی کی متابعت میں مغلوں کے لئے عذاب جان بنا ہوا تھا۔ . . . . . مرہٹوں میں ابھی ابھی پنڈھرپور کی مذہبی تحریک نے نئی روح پھونک دی تھی۔ وہ اب ایک زندہ قوم بن رہے تھے۔ اس نئی تحریک کے زیر اثر ان کی شخصی اور خاندانی نزاعیں بڑی حد تک دب گئی تھیں۔ اور ان کا ہر فرد مغلوں کے مقابلے میں قلمے، قدمے، درمے جس طرح بھی ہو سکتا تھا، برسرکار تھا۔" شمال میں گورو نانک جی کے ماننے والے گورو گوبند جی کے زیر اثر ایک فوجی طاقت بن گئے تھے دہلی کے گرد و نواح میں ہندو جاٹوں میں بیداری پیدا ہو گئی تھی اور وہ اپنی تنظیم کر رہے تھے اس کے علاوہ اسلامی سلطنت کے زیر سایہ ہندو عوام کو جو دو تین سو سال کا پُر امن دور ملا تو ان میں مذہبی اصلاح کے ساتھ ساتھ سیاسی بیداری بھی پیدا ہو گئی تھی جیسا کہ شروع میں بتایا گیا ہے، جب بڑی بڑی سلطنتوں کو حکومت کرتے ایک عرصہ گزر جائے، اور اس کے تحت ان کی رعایا کو امن و امان میسّر آئے تو رعایا میں اس طرح کی سیاسی بیداری کا پیدا ہونا فطری ہوتا ہے، چنانچہ جیسے اور ملکوں اور قوموں میں ہوا، وہی اس برصغیر میں بھی ہونا لازمی تھا، ہندو عوام بالعموم اور ہندوؤں کے جنگجو طبقے جیسے مرہٹے، سکھ اور جاٹ بالخصوص بیدار ہو گئے تھے۔ ان کی فوجی تنظیمیں بن گئیں۔ اور وہ سیاسی آزادی کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے لگے۔ جہاں تک راجپوتوں کا تعلق ہے، بے شک وہ اکبر کے زمانے سے مغل سلطنت کے حلیف چلے آتے تھے اگرچہ عالمگیر کی پالیسی سے وہ ناخوش تھے، لیکن بحیثیت ایک فوجی طاقت کے ان کا اب وہ دم خم نہیں رہا تھا۔ اور ان کی جگہ ہندوؤں کے نئے فوجی طبقوں نے لے لی تھی،

اب ایک طرف ہندوؤں کی یہ فوجی تنظیمیں تھیں، جو ایک نئے ولولۂ زندگی سے سرشار تھیں۔ وہ بہت حد تک عوامی بھی تھیں ان میں نئی نئی مذہبی بیداری کا زبردست جذبہ کارفرما تھا اور دوسری طرف وسیع و عریض مغل سلطنت تھی جسے مسلسل حکومت کرتے کوئی ۱۵۰ سال ہو گئے تھے۔ ایک شخصی شہنشاہی نظام جو اتنے طویل عرصے تک صاحب اقتدار رہے، اس میں جو خرابیاں پیدا ہو سکتی ہیں، وہ اس مغل سلطنت میں بافراط تھیں اور انہوں نے اسے اندر سے گھن کی طرح کھا لیا تھا۔

اورنگ زیب عالمگیر کا وقائع نگار محمد ساقی مستعد خاں "مآثر عالمگیری" میں جلوس عالمگیری کے انچاسویں سال کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"آخر کار مرض نے شدت اختیار کی اور جہاں پناہ پر ضعف کی وجہ سے غشی طاری ہونے لگی۔ حضرت کی علالت سے لشکر میں ایک بے چینی پھیل گئی اور مخلوق خدا نے اس حیات پر موت کو ترجیح دی۔ ہر چہار جانب وحشت ناک خبریں شائع ہوئیں۔ اور عظیم الشان شورش برپا ہوگئی۔ پست فطرت کم حوصلہ افراد نے یہ خیال کرکے کہ اس زمین میں جہاں کہ دشمن ہر طرف سے غارت گری کے لئے آمادہ ہے، بادشاہ کی علالت ہماری کامیابی کا بہترین ذریعہ ہے ان تیرہ بختوں نے ارادہ کیا کہ فتنہ و فساد کا بازار گرم کریں، لیکن رحمت الٰہی نے مخلوق خدا کی یاوری کی اور دس بارہ روز شدید بیماری کے بعد قبلۂ عالم کی حالت بہتر ہوگئی۔"

اس وقت عالمگیر دکن میں تھا اور مرہٹوں کے خلاف مغل فوجوں کی خود کمان کر رہا تھا۔ اس کے وقائع نگار نے یہ جو حالت بتائی ہے، خود لشکر شاہی کی ہے، جس میں عالمگیر بنفس نفیس موجود تھا۔ دور دراز صوبوں میں شاہی کارندوں کا کیا حال ہوگا۔ اس کا اندازہ اس بیان سے لگایا جا سکتا ہے۔

جہاں تک خود عالمگیر کا تعلق ہے اس کی ذاتی خوبیوں، تقویٰ اور مشقت پسندی کی زندگی میں کوئی کلام نہیں لیکن اس کے سپہ سالاروں اور سپاہیوں میں آرام طلبی، غداری، فرض ناشناسی، اور خود غرضی جیسی قبیح خصلتیں گھر کر چکی تھیں اور اخلاقی حالت میں وہ اپنے مرہٹے مخالفوں سے پست درجے پر تھے۔ مغل فوج میں صرف آرام طلبی اور محنت سے جی چرانے کا مرض ہی نہ تھا، بلکہ ان میں غدار اور نمک حرام بہت تھے۔ جس کثرت سے مغل سپہ سالار مرہٹوں سے مل جاتے تھے، اس کی مثال ہندوستان کی تاریخ میں مشکل سے ملے گی اور تو اور مغل شہزادے اور اورنگ زیب کے بیٹے اس سے بالاتر نہ تھے۔ دشمنوں سے ساز باز کرنے اور اپنی نالائقی اور غفلت شعاری سے ان کا ہاتھ بٹانے کے علاوہ مغلوں نے اب ایک نئی بات یہ سیکھی تھی کہ لڑنے سے جی چراتے اور اگر انہیں کہیں خطرات کا سامنا کرنا پڑتا تو بجائے ان کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کے راہ فرار اختیار کرتے اور لطف یہ ہے کہ اس "فن کثیف" میں بادشاہ کے بھائی بند تورانی اور "بدمذہب" ایرانیوں سے بڑھے ہوئے تھے۔"

یاد رہے کہ امرائے سلطنت، سپہ سالاران افواج اور لشکریوں کی یہ حالت ایک ایسے فرمانروا کے

دور میں تھی، جو صاحب "ماثر عالمگیری" کے الفاظ میں "مذہبی معاملات کے بے حد پابند تھے۔ حنفی المذہب سنی تھے اور اسلامی فرائض خمسہ کی پابندی اور ان کے اجرا میں بے حد کوشاں رہتے تھے۔ حضرت ہمیشہ باوضو رہتے اور کلمہ طیبہ، نیز دیگر اوراد و وظائف ہر وقت زبان پہ جاری رکھتے تھے۔ نماز اول وقت مسجد میں جماعت کے ساتھ ادا فرماتے... جمعہ کی نماز مسجد میں تمام مسلمانوں کے ساتھ ادا فرماتے۔ منکوحہ عورتوں کے سوا کسی غیر محرم کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ کبھی غیر شرع لباس زیب تن نہیں فرمایا۔ اور چاندی اور سونے کے برتنوں کے استعمال سے ہمیشہ پرہیز فرماتے رہے۔"

بادشاہ کے ان اعلیٰ اوصاف کے باوجود اس کے عمائد و ارکان کی اس حد تک پستی اس بات پر صاف دلالت کرتی ہے کہ مغل نظام شہنشاہی اپنی تمام افادیت اور توانائی کھو چکا تھا۔ اور اس کی تباہی مقدر ہو چکی تھی۔ خود عالمگیر کو اس کا احساس تھا۔ وہ ایک جگہ لکھتا ہے "حالا یک کس برائے دیوانی بنگالہ کہ بہ حلیہ راستی و کاردانی آراستہ باشد، می خواہم، یافتہ نمی شود، از نایابی آدم کار، آہ، آہ"

وہ بار بار اپنے رقعات میں دیانت دار کاردان ملازموں کی کمی پر آنسو بہاتا ہے۔ ایک جگہ لکھتا ہے "آدم ہوشمند امانت دار، خداترس، آباداں کار کمیاب۔

آنچہ بر جستیم وکم دیدیم دل بسیارست ونیست
نیست جز آدم دریں عالم کہ بسیارست ونیست"

شہنشاہی نظام حکومت کا یہ طبعی ضعف بجائے خود ایک ایسا مزمن مرض تھا کہ اس سے مغل سلطنت کا جان بر ہونا مشکل تھا، لیکن ہوا یہ کہ جہاں ایک طرف نئے بیدار شدہ ہندو فوجی عناصر روز بروز زور پکڑتے جا رہے تھے، وہاں دوسری طرف خود یہ مغل سلطنت جن حکمراں عناصر سے مرکب تھی، وہ ایک دوسرے کے درپئے آزار تھے اور ایک دوسرے کو مٹانے پر تل گئے تھے۔ عالمگیر کے عہد میں راجپوت تو مغل سلطنت کے فعّال عنصر رہے ہی نہیں تھے۔ اور "ماثر عالمگیری" کے الفاظ میں "غیر مسلم افراد حتی الوسع عہدہ ہائے جلیلہ پر فائز نہیں کئے جاتے تھے"۔ شاہی خاندان، تورانی، ایرانی اور پٹھان، یہ ارکان تھے مغل سلطنت کے تخت و تاج حاصل کرنے کے لئے مغل شہزادوں میں برابر جو باہی کشمکشیں ہوتی رہیں اور خاص طور سے شاہجہاں کی زندگی ہی میں اس کے بیٹوں کی

آپس کی جنگوں اور خود عالمگیر کی وفات کے بعد اس کے بیٹوں کی باہم لڑائیوں نے شاہی خاندان سے امراء و سپہ سالارانِ افواج کی وفاداری کے رشتہ کو کافی کمزور کر دیا، اور ظاہر ہے شخصی حکومتوں میں اس قسم کی شخصی و خاندانی وفاداری بڑی ضروری ہوتی ہے۔ تورانی خاندان شاہی کے ہم قوم تھے۔ وہ اتفاق سے سنی تھے اور ایرانیوں سے جو شیعہ المذہب تھے، ان کی ٹھن گئی تھی۔ غوریوں سے لے کر لودھیوں تک جتنے بھی خاندان تخت دہلی پر آئے وہ سب سنی حنفی تھے۔ جب ہمایوں نے ایرانیوں کی مدد سے دوبارہ تخت حاصل کیا تو ہندوستان میں درحقیقت ایرانی یعنی شیعی اثر شروع ہوتا ہے۔ عالمگیر کے بعد تورانی اور ایرانی نزاع شدت اختیار کر گیا، اور سادات بارہ کے ہاتھوں جو شیعہ تھے، مغل شہنشاہ فرخ سیر کے قتل نے اس نزاع کو اتنا تیز کر دیا کہ فریقین ایک دوسرے کو زیر کرنے کے لئے غیر مسلم فوجی عناصر کی مدد لینے لگے۔

پٹھان شروع سے مغلوں کے خلاف تھے۔ کیونکہ بابر اور ہمایوں نے دہلی کا تخت انہیں سے چھینا تھا۔ اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کے عہد میں وہ بھی تورانیوں، ایرانیوں اور راجپوتوں کی طرح مغل سلطنت کے وفادار رہے، لیکن عالمگیر کے دور حکومت میں اٹک پار کے پٹھانوں میں بھی مرہٹوں جاٹوں اور سکھوں کی طرح سیاسی آزادی کے جذبات ابھرنے لگے اور خوشحال خاں خٹک نے اپنی شاعری کے ذریعہ پٹھانوں کو مغلوں کے خلاف برانگیختہ کرنا شروع کیا۔ خوشحال خاں خٹک کو شروع میں تو عالمگیر کی ذات سے شکایات پیدا ہوئی تھیں لیکن "آہستہ آہستہ اس عداوت نے ایک قومی رنگ اختیار کر لیا۔ اور اس نے تلقین شروع کی کہ افغان پھر اپنی کھوئی ہوئی عظمت حاصل کر لیں۔ اس نے کئی نظموں میں قدیم افغان بادشاہوں کا ذکر کر کے افغانوں کو ابھارا ہے۔" اس کے قصیدے کا ایک شعر ہے، جس کا ترجمہ یہ ہے۔

جب صورت حالات یہ ہو تو دو ہی باتیں ہو سکتی ہیں کہ یا تو مغل دنیا سے نیست و نابود ہو جائیں یا افغان تباہ ہو جائیں۔

پٹھان لودھیوں کے زمانے میں کافی تعداد میں ہندوستان میں آباد ہو چکے تھے۔ شیر شاہ نے انہیں متحد اور منظم کر کے ہمایوں کو شکست دی اور مغلوں سے ہندوستان کی بادشاہی چھین لی۔ ایک مورخ کے الفاظ میں "یہ قاعدہ مقرر تھا کہ ایک لاکھ پچاس ہزار سوار اور پچیس ہزار پیادے بندوقچی توڑہ دار ہمیشہ رکاب سعادت

ماآب میں رکھتا تھا۔ اور بعض سفر میں اپنے ساتھ زیادہ فوج رکھتا تھا" اطراف ملک میں پھیلے ہوئے قلعوں میں متعین فوجوں کی تعداد اس کے علاوہ تھی۔ اور اس کی تعداد بھی کچھ کم نہ تھی۔ آخری زمانے میں اٹک پار سے بہت زیادہ تعداد میں پٹھان آئے، اور وہ دہلی کے شمال مشرق میں آباد ہو گئے۔ اور روہیلے کہلائے۔ تورانیوں اور ایرانیوں کے بعد یہ تیسری مسلمان فوجی طاقت تھی، جس کا عالمگیر کے بعد زور بڑھا۔ اور ان کی وجہ سے مولانا مناظر احسن گیلانی کے الفاظ میں "ایرانی و تورانی عناصر کے ساتھ اب ملک اور دربار دونوں میں ایک جدید موثر عنصر کا اضافہ ہو گیا"۔ اور ان میں سے ایک سردار غلام قادر روہیلہ نے بعد میں عالمگیر کے ایک جانشین شاہ عالم ثانی کی آنکھیں نکال لی تھیں۔

شاہ ولی اللہ صاحب اور ان کی سیاسی تحریک کا چونکہ ان روہیلوں اور اٹک پار آباد پٹھانوں سے بڑا تعلق رہا ہے اس لئے قدرے تفصیل سے ان کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔

یوں تو ہندوستان میں مغلوں سے پہلے سے ہی پٹھانوں کی آبادیاں چلی آتی تھیں لیکن ان کے آخری دور میں جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے وہ بہت بڑی تعداد میں ہندوستان آ گئے۔ ادھر نادر شاہ کے قتل کے بعد افغانستان میں شاہ ابدالی کی حکومت قائم ہو گئی اور مختلف اسباب و وجوہ کی بنیاد پر ایک دفعہ نہیں بلکہ مسلسل تھوڑے تھوڑے وقفہ کے ساتھ صرف روہیلوں کے جرگوں کے ساتھ لے کر شاہ ابدالی نے ہندوستان پر سات حملے کئے، جن میں سب سے اہم حملہ وہی تھا، جو پانی پت کی "مرہٹہ جنگ" کے نام سے مشہور ہے۔

مرہٹوں کو شکست دینے کے بعد جب شاہ ابدالی واپس گیا تو اس نے بادشاہی تو تورانیوں میں رکھی۔ وزارت ایرانیوں کے سپرد کی اور امیر الامراء ایک روہیلہ سردار نجیب الدولہ کو بنایا۔ روہیلے تورانیوں کی طرح سنی تھے، بلکہ ان سے زیادہ اس معاملے میں متشدد تھے۔ چنانچہ ہندوستان کی اسلامی سیاست میں اس نئے عنصر کی آمد سے شیعہ سنی نزاع اور شدید ہو گیا۔ لیکن بہرحال اب روہیلے اسلامی ہند کی ایک بڑی طاقت تھے[1] اس ضمن میں

---

[1] "ابدالی کا یہ اقدام بہت مناسب تھا کہ اس نے سلطنت ہند کی نگرانی ایک ترقی پذیر طاقت کے حوالے کی، مگر بد قسمتی یہ تھی کہ یہ ترقی پذیر طاقت سیاسی گٹھ جوڑ میں تنہا تھی۔۔۔۔ اور اس تنہائی کے باوجود اندرونی رقابتوں میں مبتلا تھی"۔ علمائے ہند کا شاندار ماضی

علامہ محسن مصنف "الیانع" لکھتے ہیں :-

"جب احمد شاہ ابدالی جو درانی کے لقب سے مشہور ہیں اور افغانی کوہستانوں کے بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ ہیں، ان کا تسلط دہلی پر ہو گیا۔ اور دلی کی گلیوں میں بکثرت ان کی قوم کے لوگ بھر گئے۔ اور یہ لوگ قبیلہ کلب کی بکریوں کے بالوں سے بھی زیادہ تعداد میں تھے۔"

بعد میں اگرچہ شجاع الدولہ نواب اودھ اور انگریزوں نے مل کر ۱۷۷۴ء میں روہیلوں پر یورش کی، اور ان کا قتل عام کیا۔ لیکن اس کے باوجود بچے کھچے روہیلوں کی انگریزی دورِ حکومت میں بھی رامپور، ٹونک[1] اور بھوپال کی ریاستیں موجود رہیں۔ اس زمانے میں تو ان کی بہت بڑی طاقت تھی۔

شاہ ولی اللہ صاحب ۱۷۰۳ میں پیدا ہوئے، اس کے چار سال بعد اورنگ زیب عالمگیر کا انتقال ہوا۔ اس وقت ہندوستان کے اندر مسلمانوں اور غیر مسلموں کی جو فوجی جمعیتیں تھیں، ان کا مختصر تذکرہ کیا جا چکا ہے عالمگیر کے بعد اس کا بیٹا بہادر شاہ تخت نشین ہوا۔ اس کی موت پر معز الدین جہاندار شاہ اور فرخ سیر میں جنگ ہوئی۔ آخر الذکر کامیاب ہوا۔ اور اس کی یہ کامیابی تمام تر سادات بارہ کے دو بھائیوں کی وجہ سے تھی، جو اب اصل حکمراں تھے بعد میں فرخ سیر انہیں دو بھائیوں کے ہاتھ سے مارا گیا۔ اور اس کے بعد انہوں نے رفیع الدرجات اور رفیع الدولہ کو بادشاہ بنایا۔ تین چار مہینے کے اندر یہ دونوں ختم ہو گئے۔ ان کا جانشین محمد شاہ بنا، جسے بر سر تخت

---

[1] ان چار طاقتوں کے علاوہ ... ایک پانچویں بڑھتی ہوئی آزاد طاقت تھی، جس کو وقت کا کوئی مبصر نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ یہ روہیلکھنڈ کے افغانوں کی طاقت تھی، جن کی قیادت سنبھل (ضلع مرادآباد) کا ایک حوصلہ مند افغان زادہ امیر خاں کر رہا تھا۔ امیر خاں کے ساتھ روہیلکھنڈ اور شمالی ہند کے دلیر اور حوصلہ مند پٹھانوں اور سپاہ پیشہ نوجوانوں کی ایک کثیر تعداد اور طاقت ور جمعیت رہتی تھی ..... ۱۲۱۵ھ میں جب وہ سرونج کی طرف گئے ہیں تو ستر اسی سوار اور پیادہ ان کے ہمراہ تھے۔" (سیرت سید احمد شہید)

جب انگریزوں سے نواب امیر خاں کی صلح ہوئی تو انہیں ٹونک کی ریاست دی گئی۔

لانے والے یہی دو بھائی تھے۔ لیکن تورانیوں کے سردار نظام الملک آصف جاہ کی کوششوں سے وہ قتل کردیئے گئے۔ اور ایک بار پھر تورانی امیروں کو دربار شاہی میں غلبہ حاصل ہوگیا۔ ۱۱۵۱ھ ۱۷۳۷ء میں نادر شاہ حملہ آور ہوتا ہے اور دہلی کی اینٹ سے اینٹ بج جاتی ہے۔ نادر شاہ کا دہلی میں آنا شرفاء اور امراء، عوام اور خواص کے لئے تباہی کا پیغام تھا، معمولی سے جھگڑے پر دہلی کے تیس ہزار باشندے تہ تیغ کردئے۔

نادر شاہ کے ہاتھوں دہلی پر جو کچھ گزری، شاہ عبدالعزیز کی زبانی یوں اسے بیان کیا گیا ہے:۔ آپ نے نادر شاہی قتل[1] اور پرانی دلی کے شریفوں کے اس ارادہ کا ذکر فرمایا کہ وہ "جوہر" کا قطعی طور پر ارادہ کرچکے تھے۔ پھر والد صاحب نے ان سے جواب میں امام علیہ السلام کا قصہ بیان فرمایا (ملفوظات) نادر شاہ نے جس طرح دلی کو لوٹا۔ فریزر نے لکھا ہے کہ مال غنیمت کا اندازہ ستر کروڑ تھا۔ آنند رام مخلص کا خیال ہے کہ صرف جواہرات کی قیمت پچاس کروڑ سے کم نہ ہوگی۔ اسی مال غنیمت میں تخت طاؤس اور کوہ نور ہیرا بھی تھا۔ اور تین سو ہاتھی۔ دس ہزار گھوڑے اور اتنے ہی اونٹ تھے[2]۔ گپتا کا بیان ہے کہ نادر شاہ کے حملے نے مغل حکومت کے رعب داب کو عوام کے دلوں سے ختم کردیا[3]۔

محمد شاہ افیون کے استعمال کے باعث اپنی صحت خراب کر بیٹھا۔ اور محل سے کم نکلتا تھا۔ یہی گپتا

۱؎ اس قتل عام میں مرنے والوں کا اندازہ آٹھ ہزار سے ڈیڑھ لاکھ تک کیا گیا ہے۔ (تاریخ ہندوستان ذکاء اللہ۔ علمائے ہند کا شاندار ماضی)

۲؎ بائیس کروڑ روپے نقد خزانہ شاہی سے اور تقریباً نوے کروڑ کے جواہرات اور تخت طاؤس وغیرہ قلعہ سے لوٹے گئے (عماد السعادت۔ علمائے ہند کا شاندار ماضی)

۳؎ اس مالی بربادی اور تباہی کے علاوہ سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ ملکی وحدت پارہ پارہ ہوگئی۔ شمال مغرب میں دریائے سندھ تک کا پورا علاقہ اور پنجاب کے چند محال کا دہلی کے بجائے ایران کے ساتھ باقاعدہ الحاق کردیا گیا۔ مشرق میں علی وردی خاں مہابت جنگ نے موقع غنیمت دیکھ کر مستقل حیثیت اختیار کرلی اور اس طرح بنگال، بہار اور اڑیسہ مرکز سے علیحدہ ہوگئے۔

ایک معاصر مورخ کا یہ بیان نقل کرتا ہے۔ جب کسی علاقے میں مرہٹوں کے حملے کی خبر پہنچتی تو بجائے امداد بھیجنے کے، بادشاہ اور وزیر عیش و عشرت اور سیر و شکار میں مشغول ہو جاتے تاکہ یہ غم دور ہو سکے۔ اس طرح ملک کے مالیہ کی صورت بھی ابتر ہو گئی۔ اور فوج کی تنخواہوں کا بھی خیال نہ تھا۔ (مومن۔ حالات زندگی)

جب بادشاہ کی یہ حالت ہو، تو امراء داد عیش دینے میں اس سے پیچھے کیوں رہتے نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اپنے سپاہیوں کو تنخواہ نہ دے سکتے اور سپاہی آئے دن ان کے خلاف بغاوت کرتے رہتے۔ اس ضمن میں محمد شاہ کے ایک سردار عمدۃ الملک امیر خاں انجام کا خود اس کے سپاہیوں کے ہاتھوں جو حشر ہوا۔ مذکورہ بالا کتاب "مومن" کے مصنف نے اس کا یوں ذکر کیا ہے:۔ "محمد شاہ کے اشارے سے اس کے پرانے ملازم نے کسی سابقہ رنجش کی بنا پر دیوان خاص میں داخل ہوتے وقت اسے قتل کر دیا۔ اس کے مکان پر لاش لے جائی گئی تو ملازموں نے تجہیز و تکفین نہ ہونے دی۔ فوج کی چودہ ماہ کی تنخواہ اس پر واجب تھی۔ بادشاہ نے ضبطی مال کا حکم دیا۔ لیکن تعمیل کیسے ہوتی آخر اس کا سامان فروخت کر کے فوج کو تنخواہ دی گئی۔ پھر کہیں چار دن کے بعد اسے دفن کیا گیا

نادر شاہ کے حملے سے پہلے ہی مرہٹے شمالی ہند کا رخ کر چکے تھے۔ مرہٹوں نے نواح دہلی پر یلغار[۱] کی اور اسے خوب لوٹا۔

---

[۱] سلطنت اودھ کے بانی برہان الملک نواب سعادت خاں اور بانی سلطنت آصفیہ نظام الملک آصف جاہ میں مغل بادشاہ کو اپنے زیر اثر رکھنے میں برابر کشمکش ہوتی رہی سید برادران کے قتل کے بعد محمد شاہ پر برہان الملک کا اثر بڑھ گیا۔ اس کے توڑ کے لئے نظام الملک نے مرہٹوں کو دہلی کا راستہ دکھایا اور اس طرح مرہٹے پہلی بار شمالی ہندوستان آئے۔ برہان الملک نے اس کا بدلہ نادر شاہ کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی دعوت دے کر لیا نظام الملک نے نادر شاہ کو دو کروڑ روپے دے کر واپس جانے پر آمادہ کر لیا تھا۔ لیکن برہان الملک نے یہ چال ناکام بنا دی اور اسے دہلی چلنے کا لالچ دیا۔ جس کا نتیجہ دہلی کی تباہی و بربادی نکلا۔ انہیں دنوں برہان الملک کا انتقال ہو گیا اور اس کے بعد اس کا داماد اور بھانجا صفدر جنگ جانشین بنا۔ اور اس کا بیٹا شجاع الدولہ تھا۔ جو جنگ پانی پت میں ابدالی کے ساتھ تھا۔ اور بعد میں اس نے انگریزوں کی سربراہی قبول کر لی تھی۔ علمائے ہند کا شاندار ماضی

مرہٹوں کو شمالی ہند کی تاخت و تاراج پر آمادہ کرنے والا نظام الملک آصف جاہ تھا۔ ایک تو وہ اس طرح ان کی توجہ اپنی طرف سے ہٹانا چاہتا تھا تاکہ وہ اپنی سلطنت کو مستحکم کر سکے، دوسرے وہ مرہٹوں کے ذریعہ بادشاہ کو اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتا تھا۔ مغل سلطنت اور شمالی ہند کو مرہٹوں کی ان یلغاروں سے خواہ کتنا بھی نقصان پہنچا ہو، لیکن نظام الملک اور اس کے خاندان کی دکن میں سلطنت قائم ہو گئی۔ ۱۱۵۱ھ / ۱۷۳۷ء میں نادر شاہ کا حملہ ہوا۔ پھر ۱۱۶۰ھ / ۱۷۴۷ء سے احمد شاہ ابدالی کے حملے شروع ہو گئے۔

نادر شاہ کے قتل و غارت نے دہلی کو اقتصادی لحاظ سے تباہ کر دیا تھا۔ "صوبے مرکزی حکومت سے آزاد ہو چلے تھے۔ مہابت خاں بنگال و بہار میں مختار بنا بیٹھا تھا۔ نظام الملک دکن میں۔ اودھ کے صوبے میں صفدر جنگ کی حکومت تھی۔ اور فرخ آباد میں بنگش رئیس اور روہیل کھنڈ میں روہیلہ سردار آزاد ریاستوں کی بنیاد ڈال چکے تھے۔ دلی کے برابر سورج مل جاٹ اپنی طاقت بڑھا رہا تھا۔ راجپوت بھی مرہٹوں سے کم نہ تھے۔ (یہ وقت تھا) کہ احمد شاہ کے حملے ہندوستان پر شروع ہو گئے۔"

جنوری ۱۷۴۸ء میں ابدالی لاہور پر حملہ آور ہوا۔ قصور کا افغان حاکم ابدالی کے ساتھ مل گیا۔ اور مغل صوبے دار کو شکست ہوئی۔ ابدالی کی فوجوں نے لاہور کی مضافاتی بستی بیگم پورہ کو بے دریغ لوٹا۔ اسی ایک بستی سے درانی فوج کو اتنا کچھ ہاتھ آیا کہ اسے باقی لاہور کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت نہ رہی، اس زمانے میں لاہور سولہ سترہ میل میں پھیلا ہوا تھا۔ عالمگیر کے بعد بیرونی حملوں اور اندرونی بدامنی کی وجہ سے شہر تباہ ہو گیا۔ اور شہر پناہ تک محدود ہو کر رہ گیا۔

ابدالی لاہور میں تھا کہ عید کی تقریب ہوئی۔ اس نے عید کی نماز مسجد وزیر خاں میں ادا کی۔ مسجد کے خطیب مولانا محمد صدیق نے خطبے میں ابدالی کو السلطان العادل کہا۔ اس پر مولانا مذکور کے استاد مولانا شہر یا چلا ہور کی مسجد چنیاں والی میں درس دیا کرتے تھے اور بڑے صاحب دل بزرگ تھے اس موقع پر موجود تھے، نماز کے بعد بلند آواز سے کہنے لگے۔

احمد شاہ ابدالی اور اس فوج کے ظلم و ستم سے سارا شہر نالاں ہے کون سا ظلم ہے جو افغانوں نے اہل شہر پر روا نہیں رکھا۔ اسلام ایسے بادشاہ کو عادل کہنے کی ہرگز اجازت نہیں دیتا۔

ابدالی نے جھلاکر مولانا شہریار کو ٹانڈہ ضلع ہوشیار پور کی طرف شہر بدر کردیا۔

(ماخوذ از رسالہ الاعتصام - لاہور) یہ محمد شاہ کا زمانۂ حکومت تھا۔

دوسرے حملے پر ابدالی کے مقابلے کے لئے دلّی سے ولی عہد احمد شاہ روانہ ہوئے۔ اتفاق سے سرہند کے مقام پر ابدالی کے ذخیرہ آلات آتشیں میں آگ لگنے سے انہیں فتح ہوئی، لیکن کچھ دن بعد محمد شاہ کا جسے تاریخ میں "رنگیلا" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ انتقال ہوگیا۔ احمد شاہ کی والی اودھ صفدر جنگ نے واپسی پر پانی پت کے قریب رسم تخت نشینی کرائی۔ جس کے معاوضے میں شاہی دربار میں اس کا اثر بڑھ گیا۔ اور اس طرح تورانی پارٹی پر ایرانی پارٹی غالب آئی۔ چنانچہ ایک طرف ان کی باہمی کش مکش بڑھی، دوسری طرف صفدر جنگ نے جاٹوں اور مرہٹوں سے امداد لے کر روہیلوں سے جنگ چھیڑ دی اس دوران میں ابدالی کا پھر حملہ ہوتا ہے۔ اور اسے لاہور اور ملتان کے صوبے دیکر صلح کرلی جاتی ہے۔ صفدر جنگ بھی روہیلوں سے صلح کرکے اپریل ۱۷۵۲ء میں پچاس ھزار مرہٹوں کو ساتھ لیکر جمنا کے کنارے پہنچا، اس وقت تک ابدالی واپس جا چکا تھا۔ اس نے مرہٹوں کو ۵۰ لاکھ روپے دینے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ اسے پورا کرنے سے قاصر رہا۔ تو انہوں نے دلّی کے اطراف جوانب کو لوٹنا شروع کیا۔ آخر عمادالملک غازی الدین خاں فیروز جنگ نے اس شرط پر مرہٹوں کو واپس جنوبی ہند لے جانے کی پیش کش کی کہ اسے دکن کا صوبہ دیا جائے بادشاہ مان گیا اور وہ ۱۷۵۲ء میں مرہٹوں کو لے کر دہلی سے روانہ ہوگیا۔ اس طرح لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا، لیکن مرہٹوں کے لئے شمالی ہند کے دروازے کھُل گئے تھے۔ اور وہ جب بھی موقع ملتا، ادھر کا رخ کرتے، اور تباہی و بربادی ان کے جلو میں ہوتی۔

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، احمد شاہ کی تخت نشینی کے بعد سے دربار شاہی میں ایرانی پارٹی برسر اقتدار آگئی تھی جس کے سربراہ والیِ اودھ صفدر جنگ تھے۔ احمد شاہ کچھ عرصہ بعد اس سے ناراض ہوگیا۔ اور دربار میں تورانی امرا کا عمل دخل بڑھنے لگا۔ جن کا قائد عمادالملک غازی الدین فیروز جنگ تھا۔ آخر صفدر جنگ اور بادشاہ میں کھُلی جنگ چھڑ گئی۔ صفدر جنگ نے جاٹوں سے مدد لی۔ عمادالملک نے ایک طرف شیعہ سنی کا ہنگامہ برپا کرایا اور دوسری طرف راجپوتوں اور مرہٹوں کو بلالیا چھ ماہ کی کشمکش کے بعد ۱۷۵۳ء میں اس بات پر مفاہمت ہوئی کہ صفدر جنگ اپنے صوبے اودھ کو چلا جائے۔ اب عمادالملک کو مرہٹوں کا مطالبۂ زر پورا کرنا تھا اس کے

لئے اس نے سورج مل جاٹ پر حملہ کیا، جو قلعہ بند ہوگیا اور لڑائی طول کھینچ گئی۔ عماد الملک کو پتہ چلا کہ بادشاہ سورج مل جاٹ اور صفدر جنگ سے خط و کتابت کر رہا ہے اس لئے سورج مل سے صلح کر لی اسی اثناء میں مرہٹوں نے شاہی کیمپ پر حملہ کر دیا (۱۷۵۴ء) بادشاہ جان بچا کر بھاگا۔ شاہی مستورات مرہٹوں کے قبضے میں آگئیں عماد الملک اور مرہٹوں نے دلّی کا رخ کیا۔ اگرچہ بادشاہ نے عماد الملک کی ہر بات مان لی لیکن اس کے باوجود اس نے احمد شاہ کو معزول کیا؛ اس کی آنکھوں میں سلائی پھیر دی گئی۔ اور اس کی جگہ عالمگیر ثانی کو بادشاہ بنایا گیا۔

اکتوبر ۱۷۵۶ء میں اس بادشاہ کے عہد میں ابدالی نے پھر دلّی کا رخ کیا۔ روہیلہ سردار نجیب الدولہ نے اس کا خیر مقدم کیا۔ عماد الملک نے عذر خواہی کی اور اس شرط پر اس کی وزارت بحال رکھی گئی کہ وہ روپیہ پیش کرے۔ عماد الملک دو آبہ سے رقم لانے کا وعدہ کر کے ابدالی سردار جان باز خاں کو لے کر فرخ آباد پہنچا اور یہاں سے ساز و سامان لے کر شجاع الدولہ (اودھ کے صوبے دار) کو دھمکی دی کہ وہ نذر شاہی پیش کرے۔ بڑی مشکل سے پانچ لاکھ اس کے ہاتھ لگے۔ ادھر دلی کو ابدالی کی فوج نے دل کھول کر لوٹا شرفا کی عورتوں نے خودکشی کر لی۔ متھرا کو بری طرح لوٹا گیا۔ اور قتل عام ہوا۔ جمنا کا پانی متعفن ہوگیا۔ جب ابدالی کی فوج میں ہیضہ پھوٹ پڑا تو مجبوراً واپسی کی ٹھہرائی۔ چلتے چلتے اس نے حضرت بیگم دختر محمد شاہ سے شادی کی۔ اور اپنے بیٹے تیمور شاہ کی عالمگیر ثانی کی لڑکی سے۔ عالمگیر ثانی کی سفارش پر نجیب الدولہ کو امیر الامراء مقرر کیا۔ اور واپسی کے وقت دوبارہ دلی کو لوٹ کر چلتا بنا۔ لوٹ کے مال کا اندازہ کروڑ سے بارہ کروڑ تک کیا گیا ہے۔

اس سلسلے میں مولوی ذکاء اللہ خاں تاریخ ہند میں لکھتے ہیں:۔ "دلّی سے جس وقت احمد شاہ ابدالی روانہ ہوا، تو غازی الدین خاں (عماد الملک ابن نظام الملک) فرخ آباد میں تھا۔ اس نے نجیب الدولہ کی مخالفت کے سبب سے احمد خاں بنگش (والی فرخ آباد) کو امیر الامراء مقرر کیا۔ (یہ بھی روہیلہ سردار تھے) اور شاہجہاں آباد دہلی کی طرف چلا۔ مگر وہ یہ جانتا تھا کہ نجیب الدولہ کو معطل کرنا اس اکیلے کا کام نہیں ہے۔ مرہٹوں کے اقبال کا ستارہ چمک رہا تھا۔ اس لئے اس نے رگھناتھ راؤ اور ملہار راؤ کو دکن سے بلایا اور شاہجہاں آباد کا محاصرہ کیا۔ عالمگیر ثانی اور نجیب الدولہ محصور ہوگئے۔ آخر میں عماد الملک نے نجیب الدولہ کو شہر سے نکال دیا اور باقی افسروں کو بھی جو بادشاہ کے طرفدار تھے نظر بند کیا۔

نجیب الدولہ تو دلی سے نکل گیا، لیکن مرہٹے ملک کے ہر حصے پر چھا گئے۔ عماد الملک نے اپنی گلو خلاصی کے لئے ان کا رخ نجیب الدولہ کی طرف موڑ دیا۔ اس اثنار میں مرہٹے پنجاب سے ابدالی کے بیٹے کو نکالنے میں بھی کامیاب ہوگئے۔ مرہٹوں نے پورے ملک میں آفت مچادی تھی وہ جس علاقے کا رخ کرتے وہ تباہ و برباد ہوجاتا۔ ان کی تاخت و تاراج سے عوام و خواص سب تنگ تھے۔ نجیب الدولہ نے ابدالی سے مدد مانگی اس کی آمد پر مرہٹے پیچھے ہٹ گئے اس موقع سے فائدہ اٹھاکر عالمگیر ثانی نے عماد الملک سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کی، لیکن اس کا راز فاش ہوگیا اور اسے عماد الملک نے ۱۷۵۹ء / ۱۱۷۳ھ میں دھوکے سے مروا دیا اور ایک شہزادے کو شاہجہاں ثانی کا لقب دے کر تخت پر بٹھایا۔ مگر کسی نے اسے بادشاہ تسلیم نہ کیا۔ شہزادۂ عالی گہر ولی عہد کو جو بنگال کی طرف گیا ہوا تھا، اپنے باپ کے قتل کی اطلاع ملی تو اس نے شاہ عالم ثانی کا لقب اختیار کیا، اور اپنی بادشاہی کا اعلان کردیا۔ یہ ۱۷۵۹ء ۱۱۷۳ھ کا واقعہ ہے۔

اسی بادشاہ کے عہد میں پانی پت کی تیسری جنگ ہوئی، جس نے شمالی ہند میں مرہٹوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کو ضرب کاری لگائی [۱] پانی پت کی جنگ سے پہلے مرہٹے دلی میں داخل ہوئے۔ لال قلعہ کے دیوان خاص کی چھت اکھیڑلی۔ محمد شاہ کی قبر اور نظام الدین اولیار کی قبر کو لوٹا اور وہاں سے سونے چاندی کے برتن

---

[۱] ابدالی کا یہ مشہور حملہ جس میں مرہٹے تباہ ہوئے، مرہٹوں کے علاوہ عماد الملک غازی الدین خاں کے خلاف بھی تھا، جس کی چیرہ دستیاں حد سے بڑھ گئی تھیں اور ان سے نہ مغل بادشاہ محفوظ رہے تھے، نہ امرار و وزرار۔

جب پانی پت میں یہ معرکہ کارزار گرم تھا، مولانا ذکار اللہ خاں کے الفاظ میں "وہ (عماد الملک) اپنی جان بچاکر اپنے دوست مہاراجہ بھرت پور (سورج مل جاٹ) کے قلعہ میں پناہ گزیں ہوگئے"۔ راجہ سورج مل بھی اس لڑائی سے علیحدہ رہا، اسی طرح راجپوتوں نے بھی مرہٹوں کا ساتھ نہ دیا۔ دراصل شمالی ہند کے اکثر لوگ امرار و عوام، ہندو بلاتمیز مذہب مرہٹہ گردی سے تنگ آچکے تھے۔ علمائے ہند کا شاندار ماضی

وغیرہ لے گئے - پانی پت کی یہ فیصلہ کن لڑائی جنوری ۱۷۶۱ء کو ہوئی - جس نے ایک حد تک یہ فیصلہ کر دیا کہ ہندوستان کی عنان اقتدار کے مالک اب نہ مرہٹے ہوں گے اور نہ مسلمان، بلکہ اس سے ایک تیسری طاقت کو جو بتدریج اپنا اثر و نفوذ بڑھا رہی تھی، آگے بڑھنے کا موقع ملے گا، اور آئندہ کشورِ ہندوستان کے مالک انگریز ہوں گے -

پانی پت سے ابدالی دلی آیا - اور وہاں دو ماہ قیام کیا - جاتے وقت اس کی فوج نے دلی کو پھر لوٹا اس تمام عرصے میں دلی کے لوگوں پر جو کچھ گذری، وہ ساری تفصیلات کتابوں میں ملتی ہیں - الغرض مغلوں کے طویل دور حکومت میں دلی کی جو عظمت وشان بنی تھی اور وہاں جو دولت و ثروت جمع ہوئی تھی وہ سب خاک میں مل گئی - اور میر تقی میر کے الفاظ میں "دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب" وہ ایک اجڑا دیار بن کر رہ گیا -

۱۷۶۱ء کی جنگ پانی پت نے مرہٹوں کو اس قابل نہ رہنے دیا کہ وہ سمندر پار سے آنے والی ایک نئی طاقت کا مقابلہ کر سکتے - اسی طرح اگر مسلمانوں کے فوجی جتھوں میں اسلامی سلطنت کو برقرار رکھنے کی صلاحیت ہوتی تو احمد شاہ ابدالی جاتے وقت یہ جو انتظام کر کے گیا تھا کہ سلطنت برائے شاہ عالم جو تورانی تھا، وزارت بنام شجاع الدولہ جو ایرانی گروہ کا سردار تھا - اور امیر الامرائی بنام نجیب الدولہ جو روہیلوں کا سردار تھا - تو وہ اس انتظام کو برقرار رکھتے اور مغل سلطنت کو اس کے ہونے والے انجام سے بچاتے جنگ پلاسی ۱۷۵۷ء میں ہوئی جس میں بنگال کی دیوانی انگریزوں نے حاصل کی - اس کے ساڑھے چار سال بعد ۱۷۶۱ء / ۱۱۷۴ھ میں جنگ پانی پت ہوئی تھی - ۱۷۶۴ء / ۱۱۷۸ھ میں شاہ عالم بنگال کی تسخیر کو چلا اور صوبہ دار اودھ شجاع الدولہ اس کے ساتھ تھا، ۲۳ اکتوبر ۱۷۶۴ مطابق ۲۶ ربیع الثانی ۱۱۷۸ھ کو ان دونوں کو بکسر کے مقام پر انگریزوں نے شکست دی اور بادشاہ سے بنگال اور بہار واڑیسہ کی دیوانی اپنے نام لکھوا لی اس واقعہ سے تقریباً دو سال پہلے شاہ ولی اللہ صاحب کا ۲۹ محرم ۱۱۷۶ھ میں انتقال ہو چکا تھا -

الغرض شاہ عالم ثانی گئے تھے بنگال و بہار فتح کرنے لیکن واپس آئے ان دونوں صوبوں کو انگریزوں کے حوالے کرنے کا معاہدہ کر کے - اس معاہدے سے اگر کسی کو فائدہ پہنچا، تو وہ نجف خاں

تھا۔ جو بیک وقت انگریزوں کا جاسوس تھا۔ شجاع الدولہ کا ہواخواہ اور شاہ عالم ثانی کا ایسا معتمد[1] کہ جب شاہ عالم دہلی پہنچا، تو یہی اس کا وزیر اعظم بنا۔ یہاں یہ بھی فراموش نہ ہونا چاہیئے کہ یہی نجف خاں ہے جس کے دور وزارت میں (۱۷۷۳ء تا ۱۷۸۲ء) میں شاہ عبدالعزیز صاحب کو بار بار جلا وطن کیا گیا طرح طرح کی اذیتیں پہنچائی گئی۔ اور واجب الاحترام بزرگ حضرت مرزا مظہر جانجاناں کو شہید کرایا گیا۔ رحمہم اللہ[2]

الغرض ۱۷۰۳ء میں جب شاہ ولی اللہ صاحب پیدا ہوئے تو سلطان عالمگیر کا دور حکومت تھا اور ہندوستان کی اسلامی مملکت اپنی پوری عظمت اور اس کا پایۂ تخت دلّی اپنے انتہائی عروج پر تھا۔ اور جب ۱۷۶۳ء میں آپ کی آنکھیں بند ہوئیں، تو وہ یہ سب تباہی و بربادی دیکھ چکی تھیں، جس کا اوپر مختصراً ذکر ہوا ہے۔ کتاب "علمائے ہند کا شاندار ماضی" کے محترم مصنف مولانا سیّد محمد میاں نے اس اٹھارہویں صدی پر تبصرہ فرماتے ہوئے جو جملے لکھے ہیں۔ آخر میں ہم انہیں نقل کرکے اس مضمون کو ختم کرتے ہیں

"اس صدی کا آغاز ہوا تو قندھار سے آسام تک، نیپال اور تبت سے مالابار و کھمبات تک پورے ملک کا سیاسی مرکز ایک تھا۔ مگر ابھی پہلی دھائی ختم نہیں ہوئی تھی کہ فروری ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد وہ قیامت برپا ہوئی کہ شیرازۂ ملک کا ایک ایک ورق جدا ہوگیا۔ اور یورپ کی وہی سفید فام طاقتیں جن پر عالمگیر کے دادا پردادا نے مہربانیوں اور شاہانہ عنایات کی بارشیں کی تھی، جن کو عالمگیر کے باپ شاہجہاں نے شکنجۂ تادیب میں کسا تھا۔ جن کو عالمگیر نے پہلے ملک بدر کیا تھا۔ پھر معاف کرکے

---

[1] نجف خاں جوانی میں ایران سے آیا۔ اس کی بہن کی شادی شجاع الدولہ کے عم زاد بھائی محمد قلی خاں سے ہوگئی۔ شجاع الدولہ کے ہاتھ سے محمد قلی خاں کے قتل کے بعد یہ دہلی آگیا۔ اور شاہ عالم ثانی کا مقرب بن گیا۔ (علمائے ہند کا شاندار ماضی)

[2] علمائے ہند کا شاندار ماضی

تجارت کی اجازت دی تھی، ابھی سو سال پورے نہیں ہوئے تھے کہ عالمگیر کی راجدھانی پر

ان کا تسلط اور عالمگیر کا پوتا شاہ عالم ان کا وظیفہ خوار تھا (۱۸۰۳ء)"

الغرض صاحب موصوف کے الفاظ میں۔

"یہ وہ انقلاب آفریں اور ہنگامہ خیز صدی تھی، جس میں ایک شاہنشاہت کا آفتاب

ڈھلتے ڈھلتے غروب کے قریب پہنچ رہا تھا۔ اور ایک دوسری شاہنشاہیت کی صبح کاذب

ہندوستان کے مشرق میں صبح صادق بنتی جا رہی تھی"

مختصراً خلاصہ یہ ہے کہ سلطان اورنگ زیب عالمگیر کی شاہنشاہانہ عظمت سے اس کا آغاز ہوا اور خاتمہ اس

فدائے ملک وملّت کی شہادت پر ہوا، جس کو دنیا سلطان ٹیپو کے نام سے پہچانتی ہے۔ جس کے خون شہادت

میں لتھڑے ہوئے جنازے کو دیکھکر انگریز فاتح کی زبان بے ساختہ پکار اٹھی تھی۔ آج ہندوستان ہمارا ہے

دہلی کی تباہی سے خود خواجہ میر درد کتنے متاثر تھے، اس کا اظہار انہوں نے نالۂ درد میں کیا

ہے۔ فرماتے ہیں :- شہر مبارک دلی کہ روضۂ مقدسہ حضرت قبلہ کونین قدسنا اللہ بنصرہ وسرہ

درآن است وخدایش تا قیامت آباد دارد و عجب گلستانے بود و حالا پامال خزاں حوادث زمانہ گشتہ و

طرفہ انہار واشجار وآبادیہا و مردمانِ ہر جنس داشت داکنوں تاراج صدمات و ہرشدہ بہر وجہ در تمام

روئے زمین چوں روئے محبوباں ماہ وشش و مانندِ سبزہ خط ریشاں دلکش بود"

دہلی کہ خراب کردہ اکنوں دہرش

جاری شدہ اشک ہا بجائے نہرش

بوداست ایں شہر مثل روئے خوباں

چوں خطِ بتاں بود سواد شہرش

(از دیوان درد)

امام مالکؒ صاحب المؤطا

شاہ ولی اللہؒ

سب تعریف اللہ کے لئے ہے، جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔ اور درود و سلام پہنچے اس کے رسول محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) آپؐ کی آل اور تمام صحابہؓ کو۔ اس کے بعد خدائے کریم کی رحمت کا محتاج ولی اللہ بن عبدالرحیم جو نسباً العمری اور وطناً دہلوی ہے، کہتا ہے کہ مذاہب فقہار میں اختلاف اور اس کی وجہ سے علمار کے جو بکثرت گروہ بن گئے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے سے کھچا ہوا ہے، اس صورت حال سے میرے دل کو بڑی تشویش ہوئی۔ اور یہ اس لئے کہ عمل کے لئے ضروری ہے کہ ایک طریقے کا تعین ہو۔ اور بغیر ترجیح دینے والی دلیل کو ملحوظ رکھے کسی امر کا تعین کرنا منطقی مغالطہ ہے۔ اب ترجیح کے بہت سے وجوہ ہیں۔ اور اس بارے میں علمار میں اجمالی بھی اور تفصیلاً بھی بڑا اختلاف ہے۔ چنانچہ میں نے دائیں بائیں بہت ہاتھ پاؤں مارے، لیکن بے کار، اور ہر ایک سے مدد چاہی، پر بے نتیجہ۔ پھر میں بڑے خشوع و خضوع کے ساتھ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف متوجہ ہوا اور اس کی بارگاہ میں یوں عرض کی۔ لئن لم یھدنی ربی لا

لہ ۱۳۵۱ھ میں مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم کے زیر اہتمام مکہ مکرمہ میں شاہ ولی اللہ کی عربی شرح المؤطا "المسوی من احادیث المؤطا" شائع ہوئی تھی۔ اس کے شروع میں شاہ صاحب کی المؤطا کی فارسی شرح المصفی کا مقدمہ فارسی سے عربی میں ترجمہ کر کے شامل کیا گیا تھا۔ یہ مضمون اسی عربی مقدمے کا ترجمہ ہے۔

(مدیر)

کونن من القوم الضالین - انی وجهت وجهی للذی فطر السموات والارض حنیفاً وما انا من المشرکین"[۱] اس پر مجھے بذریعہ الہام امام عظیم حجۃ الاسلام مالک بن انس کی کتاب "الموطا" کی طرف اشارہ کیا گیا۔ اور یہ خیال آہستہ آہستہ میرے ذہن میں تقویت پکڑتا گیا۔ اور مجھے یہ یقین ہوگیا کہ اس وقت علم فقہ میں کوئی کتاب بھی امام مالکؒ کی الموطاء سے قوی تر نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کتابیں ایک دوسرے سے فضیلت رکھتی ہیں۔ بعض کی فضیلت مصنف کی وجہ سے ہوتی ہے، یا اس بنا پر ان کی فضیلت ہوتی ہے کہ ان میں صحت کا خاص التزام کیا گیا ہے یا ان کی احادیث کی بڑی شہرت رہی ہے یا ان کی فضیلت کی وجہ عامۃ المسلمین میں ان کی مقبولیت ہوتی ہے یا یہ کہ ان کی ترتیب بڑی اچھی ہے اور ان میں تمام اہم امور آگئے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

اب جہاں تک کتاب الموطاء کے مصنف امام مالک بن انس کا تعلق ہے، ان کی فضیلت کسی سے مخفی نہیں۔ آج الموطاء کے سوا کوئی ایسی کتاب موجود نہیں ہے، جسے تبع تابعین[۲] میں سے کسی امام نے مرتب کیا ہو۔ نیز کوئی ایسی کتاب موجود نہیں، جس کے مصنف کے بلند مرتبے کی وجہ سے "اہل الحدیث[۳]" کا اس پر اس طرح اتفاق ہوا ہو، جیسے الموطا پر ہوا۔ کیونکہ تبع تابعین کے زمانے میں امام مالک جیسے کم لوگ تھے اور ان میں سے بھی کسی نے کوئی کتاب تالیف نہیں کی۔ چنانچہ تبع تابعین میں جو ائمہ فقہ تھے، ان میں سے الموطاء کے سوا کسی کی کوئی تالیف نہیں ہے۔

الشافعی کا قول ہے:۔ جب علماء کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان میں مالکؒ کی حیثیت ستارہ (نجم) کی ہے"۔ (ان کے علوئے مرتبہ اور ان سے روشنی کے ظہور کی وجہ سے یہ تشبیہ دی گئی ہے) ان کا ایک اور قول ہے۔ مجھ پر اللہ کے دین کے معاملے میں مالکؒ سے زیادہ کسی شخص کا احسان نہیں ہے"۔ نیز الشافعی

---

[۱] ترجمہ۔ اگر میرا رب مجھے ہدایت نہ دیتا تو میں یقیناً گمراہ لوگوں میں سے ہوتا۔ میں اپنا منہ سب طرف سے موڑ کر صرف اس ذات کی طرف کرتا ہوں، جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور میں ان میں سے نہیں ہوں، جو شرک کرتے ہیں۔ [۲] جن بزرگوں کو صحابہ کا عہد ملا وہ تابعین کہلائے اور جنہیں تابعین کا عہد ملا، وہ تبع تابعین ہیں (مترجم) [۳] مراد علمائے حدیث (مترجم)

کہتے ہیں:۔ مالکؒ اور ابن عیینہؒ دونوں ہم عہد ہیں، اگر یہ دونوں نہ ہوتے تو حجاز کا علم ضائع ہو جاتا۔"
الشافعی کا ایک اور قول ہے کہ علم ان تینوں پر گھومتا ہے:۔ مالک بن انس، سفیان بن عیینہ اور لیث بن سعد۔
سفیان بن عیینہ علم حدیث کے ضمن میں کہتے ہیں:۔ عنقریب لوگ اونٹوں پر سوار ہو کر علم کی تلاش میں نکلیں گے۔
تو انہیں عالمِ مدینہ سے بڑھ کر کوئی عالم نہیں ملے گا" ہمارے نزدیک عالم مدینہ سے ان کی مراد مالک بن انس
سے ہے۔ ابن عیینہ ہی کا قول ہے:۔"اللہ مالکؒ پر اپنا فضل وکرم کرے۔ وہ لوگوں پر انتقاد کرنے میں
کتنے سخت تھے۔" ان ہی کا ایک اور قول ہے "مالکؒ صحیح حدیث تک ہی پہنچتے ہیں۔ وہ ثقہ لوگوں سے
روایت کرتے ہیں اور میں دیکھتا ہوں کہ مالکؒ کی موت کے بعد مدینہ اجڑ جائیگا[1]۔"

عبدالرحمٰن بن مہدی کہتے ہیں:۔" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کے معاملے میں مالک بن انس
سے بڑھ کر روئے زمین پر کوئی شخص (غلطیوں سے) مامون باقی نہیں رہا۔" ان کا ایک اور قول ہے صحت حدیث
کے معاملے میں مالکؒ پر کوئی شخص مقدم نہیں۔ عبدالرحمٰن بن مہدی کہتے ہیں:۔ سفیان ثوری امام حدیث
ہیں لیکن امام سنت نہیں۔ الاوزاعی امام سنت ہیں، امام حدیث نہیں۔ لیکن مالک بن انس دونوں
(حدیث وسنت) میں امام ہیں۔ حافظ الصلاح سے اس قول کے معنی دریافت کئے گئے۔ انہوں نے
بتایا کہ یہاں سنت سے مراد بدعت کی ضد ہے ہو سکتا ہے کہ ایک آدمی حدیث کا عالم ہو، لیکن سنت
کا عالم نہ ہو۔ اس ضمن میں میرا کہنا یہ ہے:۔ اس قول کی شرح تفصیل چاہتی ہے۔ بات یہ ہے کہ
معانی ومطالب اور فتاویٰ کے استنباط کے معاملے میں سلف کے دو گروہ تھے، ایک گروہ نے قرآن
حدیث اور آثار صحابہ جمع کئے اور ان سب سے استنباط کیا۔ اور محدثین کا اصل طریقہ یہی ہے۔ اور دوسرے
گروہ نے ان قواعد کلیہ کو جنہیں ائمہ کی ایک جماعت نے تنقیح وتہذیب کے بعد مرتب کیا تھا بغیر
ان کے ماخذوں کی طرف التفات کئے لے لیا۔ چنانچہ جب کوئی ان کے سامنے مسئلہ پیش ہوتا ہے
تو وہ ان قواعد کلیہ سے اس کے جواب کو تلاش کرتے ہیں۔ اور یہ فقہا کا اصل طریقہ ہے پہلا یعنی
محدثین کا طریقہ بعض سلف کے ہاں غالب تھا۔ اور ان میں سے بعض دوسرے طریقے پر عامل تھے۔

---

[1] ظاہر ہے علمی لحاظ سے (مترجم)

یہ جو کہا جاتا ہے کہ حماد بن ابی سلیمان[۱] ابراہیم نخعی کے "مسائل" کا سب لوگوں سے زیادہ علم رکھتے تھے۔ تو ان "مسائل" سے مراد وہ قواعد کلیہ ہیں، جن کا ابراہیم نخعی نے اپنے فتووں میں اثبات کیا اور ان کی تنقیح و تہذیب کی۔

اب چونکہ امام مالکؒ کتاب الموطا میں سنت سے وہ قواعد مراد لیتے ہیں، جو اہل مدینہ کے ہاں مقرر تھے اور وہ اس سلسلے میں بار بار لکھتے ہیں "سنت جس کے بارے میں ہمارے ہاں کوئی اختلاف نہیں اور وہ یہ ہے" اس لئے عبدالرحمٰن بن مہدی اپنے اوپر کے قول میں اس طرف گئے ہیں چنانچہ انہوں نے کہا

۱؎ مغیرہ کہتے ہیں کہ میں نے ابراہیم نخعی سے کہا کہ حماد آپ کے پاس بیٹھا تھا۔ اور اب فتوے دیتا ہے۔ ابراہیم کہنے لگے کہ آخر فتوے دینے سے اس کو کون سی چیز روکتی ہے اس اکیلے نے مجھ سے اتنا کچھ پوچھا ہے کہ تم سب نے مل کر اس کا دسواں حصہ نہیں پوچھا۔ الحافظ نے "التہذیب" میں اس کا ذکر کیا ہے ابو عمر بن عبدالبر کہتے ہیں کہ ابو حنیفہ حماد کے پاس زیادہ بیٹھتے تھے۔ القرشی نے اس کا الطبقات میں ذکر کیا ہے۔

امام ولی اللہ دہلوی حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں :۔ —— امام ابو حنیفہؒ ابراہیم النخعی اور اس کے اصحاب کے مذہب (فقہ) کا سب سے زیادہ التزام کرتے تھے۔ اور وہ اس سے کم ہی تجاوز فرماتے تھے۔ امام ابو حنیفہؒ ابراہیم کے مذہب پر مسائل کے استنباط و تخریج میں بلند مرتبہ رکھتے تھے۔ استنباطات اور تخریجات میں ان کی بڑی گہری نظر تھی اور وہ فروع کی طرف پوری طرح متوجہ تھے۔ اگر تم ہمارے اس قول کی حقیقت جاننا چاہو تو ابراہیم النخعی اور اس کے اصحاب کے اقوال کو محمد رحمہ اللہ کی کتاب الآثار جامع عبدالرزاق اور مصنف ابی بکر بن ابی شیبہ میں سے ملخص کرو، پھر اس کا مقابلہ ابو حنیفہ کے مذہب (فقہ) سے کرو، تو تم دیکھو گے کہ چند امور کے سوا ابراہیم النخعی کے طریقے کو نہیں چھوڑتے۔ اور ان چند امور میں بھی وہ فقہائے کوفہ کے مذہب سے باہر نہیں جاتے۔"

عبیداللہ بن الاسلام السندھی الدیوبندی

سفیان ثوری احادیث اور آثار صحابہ کو ان کی صحیح اسناد کے ساتھ روایت کرنے، لفظ حدیث کی اقامت ابواب فقہ میں حدیث کی تقسیم اور ہر باب میں احادیث کی ترتیب میں کوفہ میں امام ہیں۔ الاوزاعی ابواب فقہ میں سے ہر باب میں سلف کے جو قواعد ہیں، ان کی معرفت کے امام ہیں۔ باقی رہے مالک تو یہ ان دونوں امور میں امام ہیں۔ جو لوگ فن حدیث سے شغف و اشتغال رکھتے ہیں، ان کے ہاں یہ بات اس طرح ثابت ہے جیسے نصف النہار کا سورج۔"

عبدالرحمٰن بن مہدی کا یہ بھی قول ہے کہ میں نے مالکؒ سے زیادہ عقل مند کوئی نہیں دیکھا۔ یحییٰ بن سعید القطان کہتے ہیں۔ مالک حدیث کے امیر المومنین ہیں۔ ابن معین نے کہا مالکؒ بندوں کے لئے اللہ کی حجتوں میں سے ایک حجت ہیں۔ ابن وہب کا قول ہے کہ اگر مالک اور لیث نہ ہوتے، تو ہم گمراہ ہو جاتے۔ اسی طرح ابو قدامہ[۱] کہتے ہیں کہ مالک اپنے زمانے کے لوگوں میں سب سے بڑھ کر حافظ تھے۔ عبداللہ نے اپنے والد امام احمد (ابن حنبل) سے پوچھا کہ اصحاب الزہری میں سے سب سے بڑھ کر روایات میں ثقہ کون ہیں، انہوں نے فرمایا ہر چیز میں مالک بن انس۔ البخاری کہتے ہیں:۔ روایات میں سب سے صحیح سند مالک عن نافع عن ابن عمر کی ہے۔ ابو نعیم "الحلیۃ" میں مالکؒ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ کوئی رات ایسی نہیں کہ میں سویا ہوں اور نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زیارت نہ ہوئی ہو۔

امام مالک کا نسب یہ ہے:۔ مالک بن انس بن مالک بن ابو عامر بن عمر بن الحارث الاصبحی۔ ابو عامر

---

[۱] المصفی کے ایک مطبوعہ نسخے میں ابن قدامہ چھپا ہے۔ اور یہ غلط ہے۔ صحیح ابو قدامہ ہے السیوطی تنویر الحوالک میں لکھتے ہیں:۔ "قال ابو قدامۃ کان مالک احفظ اھل زمانہ" عبیداللہ بن سعید بن یحییٰ الیشکری کے مولیٰ ابو قدامہ السرخسی تھے۔ جو نیشاپور میں آباد ہوئے۔ وہ الحافظ تھے اور بخاری مسلم اور نسائی کے شیخ تھے۔ ابن حبان کا قول ہے کہ انہوں نے سرخس میں سنت کی ترویج کی۔ اور لوگوں کو اس کی طرف بلایا۔ بخاری کہتے ہیں کہ ان کا ۲۴۱ھ میں انتقال ہوا۔ الخلاصہ میں یوں مرقوم ہے۔

عبیداللہ سندھیؒ

ایک جلیل القدر صحابی تھے۔ جو غزوہ بدر کے علاوہ ہر غزوہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک ہوئے۔ حضرت ابو عامر کے صاحبزادے مالک جو امام مالک کے دادا ہیں، ممتاز اور اہل علم تابعین میں سے تھے۔ آپ ان چار افراد میں سے ایک ہیں جنہوں نے حضرت عثمان بن عفان کا رات کو جنازہ اٹھایا اور مدینہ کے قبرستان البقیع میں دفن کیا۔ یہ اس سخت فتنے کے دنوں کا ذکر ہے۔ جب حضرت عثمانؓ کو شہید کر دیا گیا تھا۔ اور کسی کو جرأت نہ ہوتی تھی کہ وہ آپ کے جنازے کو اٹھائے، امام مالک کے دادا مالک حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ سے روایت کرتے ہیں امام مالک کے چچا ابو سہیل نافع بن مالک بن ابو عامر ثقہ تابعین میں سے ہیں۔ اور امام مالک نے ان سے بہت روائتیں لی ہیں۔

امام مالک ۹۳ھ میں پیدا ہوئے، اور ایک روایت ہے کہ ۹۰ھ میں پیدا ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ تین سال تک ماں کے پیٹ میں رہے۔ آپ طویل القامت اور بڑے سر والے تھے آپ کے سر کے بال آگے سے اڑے ہوئے تھے۔ آپ کا رنگ سرخی مائل سفید تھا۔ اور سر اور داڑھی کے بال بھی سفید تھے۔ امام مالک نے حدیث کی اکثر روائتیں اہل مدینہ سے کی ہیں۔ ان سے آپ نے سلسلہ وار علم حاصل کیا اس کی تفصیل یہ ہے کہ خلفائے راشدین کے عہد میں علم فقہ و فتاویٰ امیر المومنین عمر بن الخطاب کے گرد گھومتا تھا۔ اور وہ اس سلسلے کی بیچ کی کڑی تھے۔ اس کے بعد اس علمی دائرہ کا مرکز فقہائے صحابہ ہوئے، جیسے مثال کے طور پر ابن عمر، عائشہ، ابن عباس، انس اور جابر رضی اللہ عنہم۔ دور صحابہ کے بعد اس عظیم کام کا بار ساتھ فقہائے تابعین نے اٹھایا، جیسے کہ سعید بن المسیبؒ، عروہؒ، سالمؒ اور قاسمؒ وغیرہم۔ اور ان کے بعد ان کے شاگرد الزہری، یحیٰ بن سعید الانصاری، زید بن اسلم، ربیعہ، ابو الزناد اور نافع آتے ہیں اور وہ اس سلسلے کو آگے بڑھاتے ہیں،

امام مالک ان سب کے وارث ہوئے۔ آپ نے ان سب کی احادیث و آثار کی تدوین کی اور نسلاً بعد نسل جو سینوں میں محفوظ چلا آتا تھا اسے کاغذ کے صفحات پر جمع کر دیا۔ اب تمام علاقوں کے لوگ حدیث اور فتاویٰ کی روایت کے لئے ان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں چنانچہ وہ اپنے زمانے کے لوگوں کے سردار بن جاتے ہیں۔ اور انہیں اتنی عظیم شہرت ملتی ہے کہ کوئی اس تک نہیں پہنچ سکتا۔ امام مالک مدینہ میں

جو کہ عالم اسلامی کی مدح اور اس کا قلب ہے، ایک طویل مدت تک اس علمی و دینی ریاست پر فائز رہے۔ اس کے بعد آپ بیمار پڑے اور بائیس دن تک بیمار رہے۔ پھر ۱۷۹ھ میں ربیع الاول کی دس تاریخ (ایک روایت چودہ کی ہے) کو اپنے رب کی طرف رحلت فرما گئے۔

امام مالک کے شاگرد سحنون کا قول ہے کہ ان کی عمر ۸۷ سال تھی اور وہ مدینہ منورہ میں اجتہاد اور افتا کے منصب پر ساٹھ سال تک رہے اور اس طویل مدت میں ہر طرف سے ان کے پاس مسائل آتے جن کا وہ جواب دیا کرتے۔ جیسا کہ ایک شاعر نے ان کی مدح میں کہا ہے۔

یدع الجواب فلا یراجع ھیبۃ

والسائلون نواکس الاذقان

ادب الوقار وعز سلطان التقی

فھو المطاع ولیس ذا سلطان[1]

جس دن امام مالک کی وفات ہوئی اس رات عمر بن سعد انصاری نے خواب میں کسی کو یہ شعر پڑھتے سنا۔

لقد اصبح الاسلام زعزع رکنہ

غداۃ ثوی الھادی لدی ملحد القبر

امام الھدی مازال للعلم صائناً

علیہ سلام اللہ فی آخر الدھر[2]

---

[1] ترجمہ) وہ جب سوالات کا جواب دیتے تو ہیبت کی وجہ سے ان سے کوئی بحث نہیں کرتا اور سوالات پوچھنے والے گردنیں جھکائے بیٹھے رہتے ہیں۔ ان کے وقار کا ادب ہے اور ان کے تقوی کی طاقت کی عزت ہے اسی وجہ سے لوگ ان کی اطاعت کرتے ہیں اگرچہ ان کے پاس کوئی سیاسی طاقت نہیں۔

[2] ترجمہ۔ جس دن ہدایت دینے والے (امام مالک) لحد میں رکھے گئے، اسلام کا ستون لرز گیا۔ وہ ہدایت وارشاد کے امام تھے۔ وہ علم کے برابر محافظ رہے۔ ان پر آخر وقت تک اللہ کی برکتیں نازل ہوں۔

امام مالکؒ کے زمانے میں اور آپ سے پہلے مدینہ منورہ فضلا کا مرجع اور علما کا مرکز تھا۔ اسی لئے عہد اول کے جلیل القدر اصحاب فتاویٰ کے عہد میں بعد بھی، جو علم میں دنیا کے قبلہ مقصود تھے، مدینہ منورہ میں ایک زمانے تک سرچشمہ علم جاری رہا۔ امام مالک انہیں بزرگوں کے علمی وارث بنے۔ اور آپ نے اس عظیم الشان کام کا بار اٹھایا۔ آپ نے ان بزرگوں سے اس طرح رُو در رو علم حاصل کیا۔ جیسے ہم سے کوئی دوسرے سے ایک ٹھوس چیز جو چھوئی جا سکتی ہے، اپنے ہاتھ سے اس طرح لے کہ اس چیز کے لینے دینے میں کسی قسم کا شک نہ رہے۔ امام مالک نے ان بزرگوں سے جو کچھ اخذ کیا اُسے اپنی کتاب میں جمع کر دیا، جو محدثین اور فقہا کی مرجع بنی۔

واقعہ یہ ہے کہ مذہب الشافعی درحقیقت کتاب الموطا کی تفصیل ہے اور امام محمدؒ نے المبسوط میں جو فقہ مدوّن کی ہے، اس کا راس المال اور سرمایہ وہ علم ہے، جو انہوں نے امام مالک سے لیا۔ مختصراً وہ ائمہ مجتہدین جن کا علم تمام اطراف واکناف میں عام ہوا۔ چار ہیں:۔ امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد (ابن حنبل) ان میں سے صرف دو امام ابوحنیفہ اور امام مالک تبع تابعین کے دور کے ہیں اب ان میں سے جو اول الذکر (امام ابوحنیفہ) ہیں، ان سے اصحاب ثقہ (ثقات) کے ذریعہ حدیث کی مسلسل روایت نہیں ہوئی، یہاں تک کہ جو محدثین کے سردار (رؤس) جیسے کہ احمد (ابن حنبل) البخاری، مسلم، الترمذی، ابوداؤد، النسائی۔ ابن ماجہ اور الدارمی ہیں، انہوں نے امام ابوحنیفہؒ سے ایک حدیث بھی روایت نہیں کی۔ لیکن جہاں تک امام مالک کا تعلق ہے، تمام اہل نقل کا اس پر اتفاق ہے کہ اگر کوئی حدیث ان کی روایت سے ثابت ہو جائے، تو وہ صحت کے اعتبار سے سب سے بلند درجے پر ہوگی علاوہ ازیں ان چار ائمہ مجتہدین میں سے آخر الذکر دو امام (الشافعی اور احمد) ان کے شاگردوں اور ان کے علم سے استفادہ کرنے والوں میں سے ہیں۔

کتاب الموطا کی صحت کے بارے میں الشافعی کا قول ہے۔ روئے زمین پر کتاب اللہ کے بعد کتاب المالک (الموطا) صحیح ترین ہے۔ اور الشافعی ہی سے یہ روایت ہے کہ کتاب المالک (الموطا) سے بڑھ کر قرآن مجید سے قریب ترین زمین پر کوئی کتاب نہیں ہے اور انہیں سے یہ

روایت بھی ہے :۔ کتاب اللہ کے بعد زمین پر موطا مالک سے بڑھ کر کوئی غلطیوں سے پاک (اکثر صواباً) کتاب نہیں ہے۔ الحافظ مغلطائی (الحنفی) کا قول ہے کہ جس نے سب سے پہلے "الصحیح" مرتب کی وہ مالک ہیں۔

الحافظ ابن حجر کہتے ہیں :۔ کتاب مالک (الموطا) ان (امام مالک) کے، نیز ان لوگوں کے نزدیک جو اس امر میں ان کی تقلید کرتے ہیں کہ مرسل اور منقطع وغیرہ احادیث حجت ہیں، صحیح ہے، مطلب یہ ہے کہ مرسل اور منقطع حدیث پر عمل کرنے کے معاملے میں علماء میں اختلاف ہے۔ امام مالک امام ابوحنیفہ اور تبع تابعین میں سے اکثر علماء ان پر عمل کرنے کو صحیح سمجھتے ہیں اور ان کے نزدیک عمرؓ (ابن الخطاب) اور ان جیسے دوسرے صحابہ، نیز اہل مدینہ میں سے تابعین کی جماعت کے اتفاق سے استدلال کرنا صحیح ہے۔ چنانچہ امام مالک اپنے اسی مسلک پر عامل ہیں۔ اور ان کے نزدیک کسی حدیث کا مرسل یا منقطع ہونا اس کی صحت کے منافی نہیں۔ اس اعتبار سے امام مالک، امام ابوحنیفہ اور باقی کے تبع تابعین کے نزدیک الموطا ساری کی ساری صحیح ہے۔

الحافظ ابن حجر کے اس قول پر السیوطی نے یہ اضافہ کیا ہے :۔ "مرسل اور منقطع حدیث امام مالکؒ اور جو اس مسئلے میں ان سے متفق ہیں، ان کے نزدیک حجت ہے اور اسی طرح یہ ہمارے یعنی شافعیہ کے نزدیک بھی حجت ہے، بشرطیکہ کسی مرفوع روایت یا موقوف روایت سے جس کا کہ سلسلہ کسی صحابی پر ختم ہوتا ہے اس کی تائید ہوتی ہو۔ اب صورت یہ ہے کہ الموطا میں کوئی ایسی مرسل حدیث نہیں کہ کسی مرفوع روایت سے لفظاً یا معناً اس کی تائید نہ ہوتی ہو۔ الغرض یہ کہنا بالکل قرین صواب ہے کہ المؤطا سب کے نزدیک صحیح ہے۔"

اس بارے میں میں یہ کہتا ہوں کہ صحاح ستّہ کے مصنفین نے اپنی کتابوں میں اور الحاکم نے المستدرک میں اپنی طرف سے پوری کوشش کی ہے کہ مالک کی مرسل احادیث کے موصول اور ان کی موقوف احادیث کے مرفوع ہونے میں روایات کا جو خلا تھا اسے پُر کریں۔ اس لحاظ سے یہ ساری کتابیں المؤطا،

کی شرحیں اور اس کا اتمام کرنے والی ہیں۔ چنانچہ اس (الموطاء) میں کسی صحابی پر ختم ہونیوالی کوئی موقوف، اور کسی تابعی پر ختم ہونے والی روایت نہیں کہ اس کا ماخذ کتاب اور سنت میں نہ ہو۔ جیسا کہ تم آگے چل کر ہماری اسی شرح (الموطاء) میں دیکھو گے۔

ابن عبدالبر نے الموطار کی مرسل احادیث کے اتصال پر ایک کتاب تالیف کی ہے۔ اور اس سلسلہ میں لکھا ہے کہ الموطا میں صرف اکسٹھ حدیثیں ایسی ہیں جو امام مالک تک ایسے لوگوں کے ذریعہ پہنچیں، جو ان کے نزدیک ثقہ تھے۔ ان میں چار کے سوا باقی سب کی مالک کی سند کے علاوہ اور اسناد بھی ملتی ہیں۔ البتہ چار کا ماخذ ہمیں معلوم نہیں ہوا۔[1]

اس بارے میں میں (شاہ ولی اللہ) کہتا ہوں کہ اگرچہ ان الفاظ کے ساتھ یہ چار احادیث ثابت نہیں ہوتیں، لیکن ان کے معنی صحیح ہیں۔ ہم انشاءاللہ اس بحث پر اس کے مقام پر گفتگو کریں گے۔

جہاں تک موطار امام مالک کی شہرت کا تعلق ہے خود اس کے مصنف امام مالک سے ہر گروہ میں سے ایک جم غفیر نے اسے روایت کیا ہے۔ خلفائے اسلام میں سے ہارون الرشید امین، مامون الرشید اور ایک روایت میں ہے مہدی اور ہادی نے، مجتہدین میں سے الشافعی اور محمد بن الحسن نے بلا واسطہ اور احمد نے عبدالرحمٰن بن مہدی کے واسطے سے اور ان سے ایک جماعت نے، اور ابویوسف نے ایک آدمی کے واسطے سے اسے روایت کیا ہے۔

اس کے علاوہ محدثین کی بہت بڑی جماعتوں نے کہ اُن کا حصر ممکن نہیں، اور اصحاب مالک میں سے یحییٰ بن یحییٰ المصمودی، ابن قاسم اور اصبغ نے اسے روایت کیا۔ صوفیہ میں سے ذوالنون مصری وغیرہ نے موطا مالک کو روایت کیا۔ اسی طرح اہل مصر و شام و عراق و یمن و خراسان میں سے بکثرت لوگوں نے روایت کیا۔

---

[1] اصل مقدمے میں ان چار احادیث کا ذکر ہے۔

الموطا کے کوئی تیس سے زیادہ نسخے ہیں۔ شیخ ابن عبدالبرؒ نے اپنی کتاب "الاستذکار والتمہید" بارہ نسخوں[1] سے مرتب کی ہے۔ اور یہی سب سے قوی اور مشہور ہے۔ قاضی عیاض کہتے ہیں کہ جس قدر اہتمام الموطا، کا کیا گیا، کسی اور کتاب کا نہیں کیا گیا۔　　(مسلسل)

---

[1] الغافقی نے اصحاب مالک میں سے کوئی بارہ حضرات سے کتاب الموطا کی روایت کی ہے۔ میرے پاس الغافقی کے اس خطی نسخے کی ایک نقل خانہ کعبہ کے کتب خانے میں موجود ہے۔ محمد عبدالرزاق آل حمزہ شیخ دارالحدیث مکہ مکرمہ۔

مالکی مذہب مدینہ میں پیدا ہوا اور تمام ملک حجاز میں پھیل گیا، لیکن بعد میں صرف مغرب اقصیٰ اور اندلس میں محدود ہو کر رہ گیا۔ ابن خلدون نے اس کا سبب یہ بیان کیا ہے کہ ان ملکوں کے فقہا کا منتہائے سفر حجاز رہا اور وہ اس سے آگے نہ بڑھے۔ اس زمانے میں چونکہ مدینہ ہی علمی مرکز تھا اور عراق ان کے راستے میں نہیں پڑتا تھا اس لئے انہیں جو کچھ سیکھنا تھا وہ علمائے مدینہ ہی سے سیکھا۔ دوسرے یہ کہ مغرب اقصیٰ اور اندلس کے باشندے بدوی معاشرت کے دل دادہ تھے اور اہل عراق کے تمدن سے سروکار نہ رکھتے تھے، لہذا معاشرے کی یکسانی کے سبب سے ان کا میلان طبع اہل حجاز کی طرف زیادہ تھا۔

(فلسفہ شریعت اسلام تالیف ڈاکٹر صبحی محمصانی۔ اردو ترجمہ)

ذات وصفاتِ الٰہی

حافظ عباد اللہ فاروقی

حضرت شاہ ولی اللہ کا موقف ذات و صفاتِ خداوندی سے متعلق واضح الفاظ میں یہ ہے کہ صفاتِ الٰہیہ ازل ہی سے ذاتِ بحت میں بالقوۃ موجود تھیں۔ تخلیقِ آدم سے پہلے ان صفات کا مرتبہ ہویت میں خوابیدگی کے عالم میں تھا۔ چنانچہ اس وقت ان کا علم بالفعل نہ تھا بلکہ بالذات تھا،

اس سلسلہ میں شاہ صاحب فرماتے ہیں :۔ "ذات حق خود اس امر کی متقاضی تھی کہ وہ استعدادیں جو اس کے اندر مضمر ہیں، ان کا ظہور عمل میں آئے۔ چنانچہ سب سے پہلے ذات حق کا مرتبہ وجود ہے اس مرتبے میں ذات حق کی ان استعدادوں کا عقلی ظہور ہوا۔ اس ظہور سے وہاں اشیائے ممکنات کے اعیان' اور ذات بحت کے ظہور کی ہر صورت اور اس کی تبدلی کے ہر مظہر کے کرشیون متمثل ہوئے۔ مرتبۂ وجوب میں ذات کا تقاضا یہ ہوا کہ وہ ان ظہورات کو عدم مادہ اور خارج سے متصف کرے۔ چنانچہ اس ضمن میں اس نے جو کچھ کہ اعیان اور پہنائیوں میں مضمر تھا۔ اسے ظاہر کر دیا۔"

اس طرح جب اللہ تعالیٰ کی صفات اس کے ارادہ سے ظہور کی طرف مائل ہوئیں تو یہ کائنات وجود میں آئی۔ اس بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ موجوداتِ عالم اللہ کے اسماء و صفات کا آئینہ ہیں۔ ہر شئے اللہ کے کسی نہ کسی اسم و صفت کا ظہور ہے۔ مگر انسان خلیفۃ اللہ ہونے کے اعتبار سے مظہرِ جامع واقع ہوا ہے۔ صفات کا انکار ذات کے انکار پر منتہی ہوتا ہے اس انکار کے بعد ذات کا اقرار بے معنی ہو جاتا ہے کیونکہ ذات بغیر صفات کے کوئی اثباتی تصور پیش نہیں کرتی۔

صفاتِ الٰہیہ کے بارے میں مختلف نظریات

لفظ اللہ میں جیسا کہ حضرت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات اور اسمائے حسنہ سب شامل ہیں۔ مرتبہ ذات الٰہی وراء الوراء اور غیب الغیب ہے۔ انسان ذات بحت کو سمجھنے کا دعا نہیں کرسکتا۔ کیونکہ اس جیسی کوئی شے نہیں (لیس کمثلہ شیء) حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ماعرفناک حق معرفتک (ہم جیسا حق ہے ویسا تجھے نہیں پہچان سکے) غرض اللہ تعالیٰ اپنی ذات و صفات میں یکتا ہے۔ وہ معبود حقیقی ہے جملہ صفات ازلی اور ابدی ہیں۔ جس طرح اس کی ذات قدیم ہے، اسی طرح اس کی جملہ صفات بھی قدیم ہیں۔ اس کے برعکس انسان چونکہ مخلوق اور حادث ہے اس لئے اس کی صفات بھی حادث ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی جملہ صفات مخلوق کی صفات سے مخالف اور مغائر ہیں۔ سید اسد الرحمٰن قدسی "معارف وطریقت" میں لکھتے ہیں "قرآن اور حدیث میں لفظ وجود کا اطلاق جناب باری تعالےٰ پر نہیں ہے۔ اور یہ لفظ اسمائے الٰہی سے بھی نہیں ہے۔ اس لئے وجود سے مراد نور ہے کیونکہ وجود اور نور کی تعریف ایک ہی ہے۔ یعنی ظاہر بنفسہ اور مظہر لغیرہ۔ جس طرح وجود کا مقابل عدم ہے اس طرح نور کا مقابل ظلمت ہے۔ واللہ یخرجکم من الظلمٰت الی النور۔ اللہ تعالےٰ تم کو عدم سے وجود کی طرف خارج کرتا ہے۔ اس اعتبار سے نور یا وجود صفت اول ہے نور حق اصطلاحاً وجود مطلق سے عبارت ہے جو تمام اشیاء کو محیط ہے اور تمام کائنات کی ہستی اسی کی وجہ سے ہے۔"

اگرچہ اللہ تعالےٰ کی جملہ صفات مخلوق کی صفات سے مخالف اور مغائر ہیں۔ تاہم اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بعض صفات الٰہی بندوں کی صفتوں سے بہ لحاظ الفاظ مشابہ ہیں۔ ان کو صفات متشابہات کہتے ہیں۔ ان کی حقیقت اور کنہ ادراک انسانی سے بالاتر ہے۔ چونکہ ان کا ذکر قرآن اور حدیث میں بکثرت موجود ہے۔ اس لئے ہم ان کو بلا کیف وتشبیہ مانتے ہیں فرقہ معتزلہ ان صفات متشابہات کی حقیقت اور کنہ کو معلوم کرنے سے قاصر رہا۔ بالآخر راہ مستقیم سے منحرف ہوگیا۔

ان صفات کو بلا کیف و تشبیہ و تمثیل ماننے کے بغیر چارہ ہی نہیں ان کی مثالیں حسب ذیل ہیں:۔

اللہ کا ہاتھ پاؤں آنکھ۔ نفس (ذات) نزول۔ خوشی۔ غضب۔ رحم۔ صبر۔ محبت۔ غیرت رضا وغیرہ اس کی چند مثالیں ہیں۔ لیکن واضح رہے کہ اللہ کا ہاتھ آنکھ اور نفس ایسی صفتیں ہیں۔ جو انسانی صفات سے مختلف النوع ہیں۔ نیز انسان کی جملہ صفات فانی اور ساقط ہو سکتی ہیں۔ لیکن اللہ تعالے کی صفات ازلی اور ابدی ہیں۔ ان میں نہ کبھی تعطل اور رکود پیدا ہوا اور نہ ہوگا۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ خالق اور رازق ہے تو ہمیں یقین رکھنا چاہیئے کہ وہ ازل سے یہ صفات لئے ہوئے ہے۔ وہ تخلیق کائنات سے پہلے بھی رازق تھا۔ اور اس کے پیدا کرنے کے بعد بھی اس طرح وہ متکلم۔ عالم اور فاعل بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ جن صفات سے پاک اور منزہ ہے وہ سلبی صفات کہلاتی ہیں۔ مثلاً نیند۔ موت جوہر وغیرہ اس کے علاوہ جو صفات اس کی ذات کے ساتھ وابستہ ہیں، وہ ثبوتی کہلاتی ہیں مثلاً اس کا خالق ہونا۔ سمیع ہونا وغیرہ۔

اللہ تعالیٰ کی صفات سے متعلق صوفیا علماء اور حکماء نے الگ الگ بحثیں کی ہیں جن کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ان کے نظریات اسلامی افکار و تعلیمات میں گھل مل گئے کہ ان کو الگ الگ کرنا دشوار ہو گیا ہے علمائے ظاہری کے نزدیک صفاتِ حق کی تحقیق یوں ہے :۔ اشاعرہ سات صفات کے قائل ہیں اور ماتریدی آٹھ صفات کے۔ اشاعرہ کے نزدیک حیات، علم، قدرت، ارادہ، سمع، بصر اور کلام وغیرہ صفات الہیہ میں شامل ہیں۔ لیکن ماتریدی تکوین (پیدا کرنا) کو بھی ان میں شامل کرتے ہیں ان کا خیال ہے کہ تکوین قدرت سے جداگانہ ایک مستقل صفت ہے ماتریدی دوسری صفات اضافیہ جیسے احیاء، اماتت ترزیق وغیرہ کو تکوین کی جانب راجع سمجھتے ہیں۔ لیکن اشاعرہ صفت اضافیہ کو صفت قدرت سے متعلق تصور کرتے ہیں اس طرح اشاعرہ اور ماتریدی مدرسہ ہائے فکر کے علمائے مذکور سات یا آٹھ صفات حقیقیہ کے سوا جنہیں یہ امہات صفات کہتے ہیں، تکثیر صفات کے قائل ہیں۔ صوفیہ صفات حقیقیہ کی نفی کرتے ہیں اور ایک ذات کے قائل ہیں۔ لیکن چونکہ تحقیق عالم کے لئے صفات کے بغیر چارہ کار نہ تھا۔ اس لئے مجبوراً علم کے ضمن میں ثبوت صفاتِ اعتباری کے قائل

نظر آتے ہیں اس کے علاوہ وہ ذات احدیت کے تنزلاتِ خمسہ یعنی مرتبہ (۱) وحدت (۲) احدیت (۳) ارواح ۴۔ مثال (۵) اور شہادت کے قائل ہیں۔ ڈاکٹر میر ولی الدین نے اپنی تصنیف قرآن اور تصوف کے صفحہ ۱۰۷ پر تنزلات خمسہ کی توضیح یوں کی ہے۔ فرماتے ہیں کہ نزول کے مراتب بے شمار ہیں۔ لیکن کلی اعتبار سے ان کا چھ میں حصر کیا جا سکتا ہے۔ ان کو صوفیہ تنزلات ستّہ کہتے ہیں۔ ان میں سے پہلے تین کو مراتب الٰہیہ کہا جاتا ہے۔ جو یہ ہیں (۱) احدیت (۲) وحدیت (۳) وحدانیت۔ باقی تین مراتب کونیہ کہلاتے ہیں جو یہ ہیں (۱) روح (۲) مثال (۳) جسم۔ ان سب کے بعد انسان کا مرتبہ ہے، جو مرتبہ جامعہ ہے چونکہ احدیت مرتبہ ذات بحت ہے لہٰذا وحدیت یا تنزلِ اوّل سے مرتبہ انسان تک چھ تنزل ہوئے۔

(۳) حکماء ذات باری کو معرا از صفات مانتے ہیں اور اس کی ذات کے لئے انہوں نے ایک فعل ایجابی ثابت کیا ہے جسے عقل اوّل کہتے ہیں۔ عقل اول کو فلک اوّل و عقل دوم کا خالق قرار دیا گیا ہے اور عقل دوم سے فلک دوم اور عقل سوم اس طرح عقل دہم کی پیدائش کا اثبات کرتے ہیں۔ اور حوادث کائنات کو (جسے وہ قدیم تصور کرتے ہیں) اور اس کے جملہ کاروبار کو عقل اول کے تحت خیال کرتے ہیں۔ اور مخلوقات کو مذکورہ مراتب سے پیدا شدہ سمجھتے ہیں۔

غرض علمائے ظاہری ذات باری کے مراتب صفات کو ذات سے زائد سمجھتے ہیں اس طرح وہ مرتبۂ ذات میں نسبت وجوب اور مرتبۂ صفات میں نسبت امکان ثابت کرتے ہیں۔ ان کے برعکس صوفیا کے یہاں ایک حد تک سہی ذات اور صفات کی عینیت کا تصور ملتا ہے نظریہ وحدۃ الوجود کی رو سے وجود صرف ایک ہے اور وہ ذات خداوندی۔ کائنات کی تمام اشیاء اللہ تعالیٰ کی صفات کے مختلف مظاہر اور شیون ہیں۔ وہ ذات ہر وقت اپنی شانوں کا طرح طرح سے اظہار کرنے میں سرگرم عمل رہتی ہیں آیہ کریمہ کل یوم ھو فی الشان اس طرف اشارہ کر رہی ہے اس نظریہ کے مطابق بعض قائلین کے نزدیک ذات خداوندی اور کائنات ایک دوسرے کے عین ہیں۔ اور ان میں دوئی کا کوئی شائبہ نہیں۔ ذات خداوندی کی حقیقت ایک بحر ناپیدا کنار کی سی ہے اور اشیائے کائنات اس کی سطح پر بلبلے ہیں جو ابھرتے اور مٹتے رہتے ہیں۔ دریا اپنی ذات میں حقیقی اور

اور قائم بالذات ہے اور بلبلے محض عوارض ہیں - ان کا وجود دریا کے بغیر ممکن نہیں۔ اس کے برعکس نظریۂ وحدۃ الشہود کے بموجب ذات خداوندی اور اشیائے کائنات ایک دوسرے کے عین نہیں بالفاظ دیگر اشیائے کائنات خدا کی ذات یا صفات کے مظاہر نہیں - بلکہ موجود بالذات ہیں خدا نے عدم محض سے ان کو پیدا کیا ہے۔ اس لئے خدا اور جملہ اشیاء میں خالق اور مخلوق کا تعلق ہے لیکن وجودی حضرات کے نظریہ کے مطابق یہ جہان کثیف اللہ تعالیٰ کی ذات مقدس کا عین اور جزو بن کر رہ گیا ہے ڈاکٹر میر ولی الدین اس نظریہ کے خلاف فرماتے ہیں۔

جب تک غیریت ہے، شریعت ہے، جب غیریت مرتفع ہو کر عینیت ثابت ہوگی - اور حق ہی حق رہا تو حق کے لئے شریعت کی پابندی کیسی ؟ (قرآن اور تصوف)

قرآن اور حدیث کی رو سے تمام صفات الٰہی خواہ ذاتی ہوں خواہ اضافی، فعلی ہوں یا نسبتی، قدیم اور غیر حادث ہیں - نیز صفات الٰہیہ کی تعداد بیان کر کے انہیں محصور نہیں کیا جا سکتا کیونکہ صفات الٰہی اسماء باری تعالیٰ کی طرح غیر محدود و ناقابل شمار ہیں۔

صفاتِ ازلی اور صفاتِ فعلی میں فرق

اللہ تعالیٰ کی صفات ذاتی یا ازلی ہیں اور صفات فعلیہ میں جو فرق بتایا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ صفات فعلیہ کا ظہور تکوین عالم کے بعد ہوا۔ لیکن اس کی ذاتی صفات ازل سے ظہور میں آچکی ہیں۔ ذاتی صفاتِ الٰہیہ مندرجہ ذیل ہیں۔

علم - قدرت - حیات - سمع - بصر - کلام - ارادہ اور تکوین اور صفات فعلی یہ ہیں - ابداع، تخلیق، ترزیق، انشاء، احیاء، اماتت، ربوبیت، رحمانیت،

ابداع کے معنی حضرت شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں یہ بیان کئے ہیں :- ابداع نام ہے ایک چیز کو بغیر کسی چیز کے پیدا کرنے کا۔ یعنی پہلے کوئی چیز نہ ہو۔ ایسی حالت میں کوئی چیز پیدا کرنا ابداع ہے - بالفاظ دیگر عدم سے بغیر کسی مادے کے کسی شے کو وجود میں لانے کا نام ابداع ہے

تخلیق برعکس نام ہے ایک چیز سے دوسری چیز کے پیدا کرنے کا۔ جیسے اللہ تعالےٰ نے آدم کو مٹی سے بنایا اور جنّات کو آگ کے شعلوں سے خلق کیا۔ ابداع اور خلق اللہ تعالےٰ کی فعلی صفات ہیں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ ذاتی صفات نہیں کیونکہ ذاتی صفات وہ ہیں، جو ازل سے اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ ظہور پذیر رہی ہیں تخلیق کائنات سے پہلے اگر فعلی صفات ہم تسلیم کریں، تو لامحالہ ہمیں قدامت مادہ کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ یعنی اس سے قدامت مادہ کا تصور لازم آئے گا اور دوئی کا خیال بمنزلہ شرک ہے روح ہو یا مادہ کسی کو جداگانہ قدامت نہیں ہے کوئی چیز بغیر واجب الوجود قائم نہیں ہو سکتی لیکن اگر ہم یہ تسلیم کریں کہ صفاتِ فعلیہ اس ذاتِ قدیم میں بالقوۃ موجود تھیں لیکن ان کا ظہور تکوین عالم کے بعد ہوا۔ تو اس صورت میں ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ اللہ تعالےٰ کی صفات فعلی ایک عرصہ تک اس کی ذات میں بالقوۃ موجود رہیں، لیکن تکوین عالم کے بعد ہی وہ فعل کے سانچے میں ڈھلیں۔ اس سے جو نتائج مستنبط ہوتے ہیں وہ یہ ہیں۔

ا۔ ذات حق ابتدا میں فعّال *Sonnata* نہ تھی بلکہ انفعالی کیفیت سے دوچار تھی۔

ب۔ اس کی صفات اس تعطل اور رکود کی وجہ سے کمال تک نہیں پہنچی تھیں کیونکہ کمال فعل و اثر آفرینی کا مقتضی ہے۔

اس طرح صفاتِ خلق و ابداع کو نہ تو ازل سے سرگرم عمل تسلیم کرنے سے مطلب حل ہوتا ہے اور نہ ان میں رکود اور ٹھہراؤ کے نظریئے کو تسلیم کرنے سے الجھن دور ہوتی ہے۔ بصورت اوّل قدامت عالم کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ بصورت دیگر اللہ تعالیٰ کی صفات کاملہ میں رکود اور تعطل لازم آتا ہے جو کمال کے منافی ہے اس طرح ابتدائے آفرینش کا مسئلہ بھی الجھ کر رہ جاتا ہے ؎

ساقیا جام منم دہ کہ نگارندۂ غیب
نیست معلوم کہ در پردۂ اسرار چہ کرد
آنکہ بر نقش زد این دائرۂ مینائی
کس ندانست کہ در گردشِ پرکار چہ کرد

(حافظ)

امام ابن تیمیہؒ کا موقف

امام ابن تیمیہؒ نے "منہاج السنۃ" میں ان اشکالات کے جواب میں جو حل پیش کیا ہے اس کی وضاحت مولانا محمد حنیف ندوی نے اپنے مضمون بہ عنوان "امام ابن تیمیہؒ کا تصورِ صفات" میں یوں کی ہے فرماتے ہیں :- ان اشکالات کے جواب میں علامہ ابن تیمیہ نے "تسلسل بالآثار" کا نظریہ پیش کیا ہے جس کا یہ معنیٰ ہے کہ مادہ اگرچہ فی نفسہ حادث ہے اور یہ عالم بھی بہ حیثیت مجموعی قدیم نہیں تاہم اللہ تعالےٰ کی صفات ابداع و تخلیق نے ہر لمحہ کچھ نہ کچھ پیدا ضرور کیا ہے۔ اور ازل سے تا ابد ان کا یہ عمل بغیر کسی خلل اور انقطاع کے جاری رہے گا۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ اس متحرک اور رواں دواں عالم کی ہر کڑی حادث اور فانی ہے اور اللہ تعالےٰ کی تخلیقی قدرتوں کا کرشمہ ہے۔" (ماہنامہ ثقافت مئی ۱۹۶۱ء)

خلق اور ابداع کے معانی پر غور کرنے سے یہ مسئلہ یوں حل ہو سکتا ہے کہ ابداع کے معنی بغیر نمونہ کے پیدا کرنے کے یعنی بغیر مادّے کے، لیکن خلق متقاضی ہے کسی شے یعنی مادّے سے پیدا کرنے کے۔ اللہ تعالےٰ نے انسان کو مٹی سے پیدا کیا۔ جنات کو آگ سے، ملائکہ نوری مخلوق کہلائی اس طرح عالم مادی کے حدوث سے پہلے اللہ تعالیٰ کی فعلی صفات ساقط نہ تھیں بلکہ وہ کسی اور صورت میں موجود تھیں۔

امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ یہ درست ہے کہ مادہ قدیم نہیں لیکن اللہ تعالیٰ کی صفات ابداع و خلق قدیم اور ازلی ہیں اور ان کے قدیم اور ازلی ہونے کی وہ یہ کیفیت بتلاتے ہیں۔ کہ روزِ ازل سے ہر شئے اللہ تعالیٰ کے ارادے کی جنبش سے پیدا ہو رہی ہے۔ اللہ تعالےٰ کو اپنے تخلیقی فعل میں مادّہ کی ضرورت یا حاجت نہیں پڑتی۔ بلکہ مادّہ اشیاء کی پیدائش کے ساتھ حادث اور بعد میں فنا ہو جاتا ہے۔ گویا مادّے کا مستقل کوئی وجود نہیں۔ اس طرح اللہ تعالےٰ اپنی فعلی صفات کا ازل ہی سے مظاہرہ کر رہا ہے۔

غرض امام ابن تیمیہؒ کے نظریۂ "تسلسل بالآثار" کے مطابق مادّہ مستقل وجود نہیں رکھتا۔ وہ ہر دم تبدّل و تحوّل سے دوچار ہو رہا ہے۔ اگر مادہ قدیم ہوتا۔ تو فنا نہ ہوتا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ اپنی تخلیقی قوتوں

سے اپنی فعلی صفات کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ بقول اقبال مرحوم

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آرہی ہے دمادم صدائے کُن فیکُون

جیسا کہ قبل بیان ہو چکا ہے کہ قرآن اور حدیث میں لفظ وجود کا اطلاق اللہ تعالےٰ کی ذات پر نہیں کیا گیا۔ وجود سے مراد نور ہے۔ اور عدم کے معنی ظلمت ہے نور اللہ تعالیٰ کی صفت اوّل قرار پائی ہے۔ چنانچہ جب ہم یہ کہتے ہیں۔ کہ فلاں شے کو اللہ تعالےٰ نے خلق کیا، اس کا مطلب یہ ہے کہ اسے ظلمت کے دھندلکوں سے نکال کر نور کے اجالے میں لے آیا، گویا وہ مادہ کے ساتھ مل کر ظہور میں آیا اور اشیار کی تخلیق کا سبب بنا۔

ہم عالم کائنات میں حوادث (افعال) کا مشاہدہ کرتے ہیں اور نہ صرف افعال کا، بلکہ افعال میں ایک سلسلۂ نظام کا بھی مشاہدہ کرتے ہیں، جو خاص خاص اسباب اور نتائج پر مشتمل ہے اور یہ ایک ایسا واضح امر ہے کہ جس کو ہر ایک طبقہ کی عقل کا آدمی تسلیم کرتا ہے، یہ سلسلۂ نظام جس میں ہم افعال کا مشاہدہ کرتے ہیں، صفات کا نتیجہ ہے، یعنی جب تک ہم علم، ارادہ، قدرت اور حکمت کا وجود بطور علت کے تسلیم نہ کر لیں، ہمیں افعال کا وجود میں آنا صحیح معلوم نہیں ہوتا کیونکہ یہ امر ہمارے لئے طبعی ہے کہ ہم کسی واقعہ کو بلا علت تسلیم نہیں کر سکتے۔ منکر خواہ ان افعال کی علت کچھ سمجھے، مگر یہ ضروری ہے کہ افعال بدون صفات ظہور پذیر نہیں ہوتے۔ اب ہم منکر سے سوال کرتے ہیں کہ وہ کون سی ہستی ہے جو ان صفات کی متحمل ہے؟ کیونکہ صفات بدون کسی موصوف کے وجود نہیں رکھتے۔ یہ ایک فطری امر ہے کہ علم کسی محل سے جس کو عالم کہتے ہیں، قائم رہ سکتا ہے۔ اسی طرح ارادہ کسی مرید سے اور قدرت کسی قادر سے اور حکمت کسی حکیم سے۔ (از "ثانی الاسلام" مصنفہ مولانا روحی مرحوم)

علوم ولی اللّٰہی

مولانا محمد عبد اللہ عمر پوری

علمِ فقہ مشتمل ہے ان مسائل و احکام پر، جو کہ قرآن کریم، احادیث صحیحہ اور آثار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ثابت ہیں، نیز وہ مشتمل ہے ان مسائل و احکام پر، جو مذکورہ بالا تینوں ماخذوں سے واقعات جدیدہ کے لئے استنباط کئے جاتے ہیں۔ قرآنِ کریم، احادیث صحیحہ اور آثار صحابہ کرام رضؓ سے واقعات جدیدہ کے لئے مسائل و احکام کے استنباط کا عمل اجتہاد کہلاتا ہے۔

ظاہر ہے ہر شخص کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ قرآن و حدیث اور آثار صحابہؓ سے پیش آمدہ امور کے لئے احکام استنباط کر سکے۔ اس لئے اُسے لامحالہ علمائے کاملین کی تحقیق پر اعتماد کرنا پڑتا ہے اسے اصطلاحاً تقلید یا اتباع کہا جاتا ہے۔ یہ تقلید اور اتباع صرف ان بزرگان کرام کی ہونی چاہیئے، جو تفقہ فی الدین اور اجتہاد میں کمال رکھتے ہیں

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے فقہ حنفی کے ماہرین اور فضلائے کاملین کے زیر سایہ پرورش پائی۔ آپ کے والد ماجد حضرت شاہ عبد الرحیمؒ فتاوی عالمگیری کی تدوین سے متعلق رہے تھے۔ مدینہ منورہ میں آپ نے حضرت شیخ محمد طاہر مدنی کردی سے استفادہ فرمایا، جو شافعی المذہب تھے اس طرح آپ کو فقہ شافعی سے بھی دسترس حاصل ہو گئی۔ فقہ حنفی اور فقہ شافعی ہر دو میں دستگاہِ کامل رکھنے کا نتیجہ تھا کہ آپ نے موطا امام مالک کی جو دو شرحیں لکھی ہیں (ایک عربی اور ایک فارسی میں) ان میں ان دونوں مذاہب فقہ پر ایسی سیر حاصل بحث کی ہے کہ بے اختیار دل سے صدائے امتنان نکلتی ہے۔ چنانچہ برصغیر پاک و ہند کے مسلم فقیہہ و محشی ہدایہ

لہ اس سلسلے کا یہ آخری مضمون ہے، اس سے پہلے اس کی تین قسطیں جولائی، اگست اور ستمبر کے شماروں میں چھپ چکی ہیں

وغیرہ حضرت مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی نے اپنی کتاب "التعلیق" میں شارحین موطا شریف کے نام گناتے ہوئے شاہ ولی اللہ صاحب کی شرح مصفی فارسی کے تذکرے میں فرمایا :- وتکلم فیہ ککلام المجتھدین (ترجمہ :- شاہ صاحب نے اس کتاب میں مسائل شرعیہ پر مجتہدین جیسے دلائل قائم فرمائے ہیں)

فقہی علم کی تفہیم اور ان کے تمام پہلوؤں کو واضح کرنے کی غرض سے شاہ ولی اللہ صاحب نے مندرجہ ذیل کتابیں تصنیف فرمائیں :- الانصاف فی اسباب الاختلاف - عقد الجید فی الاجتہاد والتقلید - مصفی مقدمہ مصفّی - الانتباہ، حصہ درایت فقہ درایتِ حدیث - حجۃ اللہ البالغہ - المسوّی - ابحاث قرۃ العینین - ابحاث ازالۃ الخفاء - ابحاث الفوز الکبیر - ابحاث تاویل الاحادیث - ابحاث تفہیمات الٰہیہ - فصل الخطاب فی مذہب حضرت عمر بن الخطاب - فوائد فتح الرحمٰن -

آپ کے فرزند اکبر شاہ عبدالعزیز صاحب نے اسی سلسلہ میں الآمالی (الفتاوی) العزیزیہ، ابحاث تحفۂ اثنا عشریہ اور ابحاث تفسیر فتح العزیز لکھیں - دوسرے فرزند شاہ رفیع الدین نے الفتاوی اور ابحاث تکمیل الاذہان لکھیں، اور تیسرے فرزند شاہ عبدالقادر کی تصنیفات فوائد موضح القرآن اور رسالہ ترجمۃ الصلوٰۃ اسی باب میں ہیں - شاہ ولی اللہ صاحب کے نبیرہ شاہ محمد اسمٰعیل شہید بن عبدالغنی بن شاہ ولی اللہ نے رسالہ اصول فقہ، رسالہ ردّ الاشراک - تقویۃ الایمان - ایضاح الحق الصریح، اور منصب امامت لکھیں اور شاہ عبدالعزیز صاحب کے نواسے شاہ محمد اسحاق، رسالہ الاجوبۃ الاربعین، رسالہ مائۃ مسائل - اور ابحاث کتاب مظاہر الحق مرتب فرمائیں -

علمِ تاریخ

علم تاریخ میں انسانیت پر وارد شدہ واقعات کو بغرض حصول عبرت و تجربہ بیان کیا جاتا ہے - تاکہ ان کے مطالعہ سے دوراندیشی، فکر معاش و معاد اور بصیرت تامہ حاصل ہو -

علم تاریخ میں بھی شاہ ولی اللہ صاحب کی خدمات قابل تعریف ہیں - آپ نے قصص الانبیاء کے سلسلے میں تاویل الاحادیث لکھی - سرور المحزون فی سیر الامین والمامون رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی

حیات طیبہ پر حافظ ابن سید الناس الیعمری کی مبسوط کتاب جلاء العیون کا خلاصہ ہے، العطیہ الصمدیہ فی الانفاس المحمدیہ بھی اسی موضوع پر ہے ۔ آپ کی معرکہ آراء کتاب حجۃ اللہ البالغہ کے ابواب الخلافۃ والفتن اور ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء کے محققانہ تاریخی مباحث بے نظیر ہیں۔ انسان العین فی مشائخ الحرمین اسی عہد کے علمائے حرمین شریفین کی تاریخ ہے، رسالہ الارشاد فی مہمات علم الاسناد میں آپ نے ان مشائخ محدثین کا ذکر کیا ہے، جو آپ کے سلسلہ اسناد میں ہیں۔ الامداد فی ماثر الاجداد میں اپنے خاندان کا ذکر ہے۔ النبذۃ الابریزیہ فی اللطیفۃ العزیزیہ اپنے مورث اعلیٰ حضرت شیخ عبدالعزیز شکر بار اور ان کے متعلقین کے حالات میں ہے ۔ شاہ عبدالعزیز صاحب کی تصنیفات تحفہ اثنا عشریہ، سر الشہادتین اور اسمائے شہدائے کربلا اسی موضوع پر ہیں ۔

علمِ احسان (تصوف)

علم احسان وتصوف کے دو شعبے ہیں :۔ اذکار واشغال اور وجدانیات اور کشفیات ۔ آخرالذکر پر پہلے تبصرہ کیا جا چکا ہے، جہاں تک اذکار کا تعلق ہے وہ قرآن کریم اور احادیث میں مذکور ہیں! اور اشغال حضرات کاملین کے معین کردہ ہیں، جن کی وہ اپنے مریدین سے بطور معمولات کے پابندی کراتے تھے اس سے مقصد مریدین کا تزکیۂ نفوس اور ان کے اندر عقائد حقہ اور اعمال دینی میں رسوخ پیدا کرنا ہوتا ہے۔

اس موضوع پر شاہ ولی اللہ صاحب نے القول الجمیل، الانتباہ، التفہیمات الالہیہ، ہمعات، ملحقات حزب البحر اور ملحقات دلائل الخیرات مرتب فرمائیں ۔ شاہ عبدالعزیز نے رسالہ فیض عام لکھا ۔ شاہ رفیع الدین کا رسالہ شرح چہل کاف اسی موضوع پر ہے ۔ اسی سلسلہ میں شاہ اسمٰعیل شہید نے کتاب الصراط المستقیم تصنیف کی ۔

علمِ اسرارِ دین

احکام دین کی خوبیوں، ان کے تجربی فوائد اور اجتماعی مصالح کا بیان اس علم کے تحت آتا ہے۔

اس علم پر امام ابوزید دبوسی حنفی کی ایک کتاب "کتاب الاسرار" ہے جس میں اگرچہ دین اسلام کے اسرار و رموز بیان کئے گئے ہیں، لیکن ان کا ذکر بطور ضمنی مباحث کے ہے، کتاب کا اصل موضوع مذاہب اہل السنۃ میں جو اختلافات پائے جاتے ہیں، ان کا محاکمہ ہے۔ اس لئے مذکورہ بالا کتاب فی الحقیقت علم اسرار دین کی نہیں ہے۔ اس علم کی پہلی باقاعدہ کتاب شیخ عزّالدین ابن عبدالسلام مالکی شافعی نے القواعد الکبریٰ کے نام سے تصنیف فرمائی، ان سے پہلے حضرات قاضی بیضاوی شافعی مصری، امام خطابی شافعی، امام ابوبکر جصاص حنفی رازی اور امام ابوجعفر الطحاوی حنفی مصری نے اپنی مبسوط تصانیف میں علم اسرار دین کے ضمن میں کہیں کہیں مختصر جملے لکھے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اس علم کی سب سے جامع مفید اور بے نظیر تصنیف شاہ ولی اللہ صاحب کی ہے۔ جو حجۃ اللہ البالغہ کے نام سے تمام دنیائے اسلام میں مشہور و معروف ہے۔

علم تطبیق

مجتہدین عظام اور علمائے کرام میں دینی و علمی مسائل میں وقتاً فوقتاً جو اختلاف رونما ہوتے رہتے ہیں، ان کی اس طرح توجیہات کرنا کہ حقیقت نفس الامری کی وضاحت کے ساتھ ساتھ مختلف اقوال میں موافقت اور ہم آہنگی بھی پیدا ہو جائے، علم تطبیق کہلاتا ہے۔ اس علم میں ائمہ اسلام نے نہایت قابل قدر تصنیفات کی ہیں، جن میں امام شاطبی مالکی کی کتاب الموافقات، امام شعرانی شافعی کی المیزان الکبریٰ اور امام ابن تیمیہ کی الائمۃ الاعلام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

شاہ ولی اللہ صاحب کی غیر معمولی علمی خصوصیات میں سے ایک بہت بڑی خصوصیت ان کا اس علم تطبیق میں متبحر ہونا ہے۔ اس ضمن میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ اہل عصر فقہ کے مختلف اصناف میں اختلاف کر رہے ہیں۔ خصوصاً حنفی اور شافعی۔ ہر فرقہ اپنے استادوں کی پچ کرتا ہے۔ اسی وجہ سے ہر فقہی مذہب میں استخراجی مسائل کی کثرت ہو گئی ہے اور حق کا پتہ لگانا مشکل ہو گیا ہے۔ چنانچہ شاہ صاحب نے ایک طرف تو حنفی اور شافعی فقہ اور دوسری طرف حدیث و فقہ میں تطبیق دی اور اس کے ساتھ ساتھ

وحدت الوجود اور وحدت الشہود میں جو تضاد بتایا جاتا تھا اسے رفع کیا۔ اسی سلسلہ میں شاہ ولی اللہ صاحب نے مکتوب مدنی" میں لکھا ہے :۔ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے ہمیں اس زمانے میں یہ سعادت نصیب ہوئی ہے کہ ہمارے سینے میں اس امت کے علمار کے سب علوم جمع ہو گئے ہیں کیا معقولات کیا منقولات اور کیا کشف و وجدان کے علوم اور ہمیں خدا نے یہ توفیق دی ہے کہ ایک علم کو دوسرے پر تطبیق دے سکتے ہیں۔ اس طرح بظاہران میں جو اختلافات ہوتے ہیں، وہ ختم ہو جاتے ہیں اور ہر بات اپنی حد پر ٹھیک بیٹھ جاتی ہے۔ اور ان میں کوئی تناقض نہیں رہتا مختلف اور متعارض اقوال میں ہمارا تطبیق کا یہ اصول علم کے تمام حصوں پر حاوی ہے اس کے تحت فقہ بھی آتی ہے۔ علم کلام بھی آتا ہے اور تصوف کے مسائل بھی" شاہ ولی اللہ صاحب علم تطبیق کے تحت فقہا کے مختلف مذاہب میں تطبیق دیتے ہیں۔ پھر صحیح حدیثوں اور فقہا کے اقوال میں مطابقت پیدا کرتے ہیں۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو قرآن مجید سے مستنبط قرار دیتے ہیں۔ پھر ادیان اور ملتوں میں جو اختلاف ہیں ان کو وہ ایک قاعدے کے تحت لاتے ہیں، اسی طرح تصوف ہیں وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے جو دو مختلف نقطہ ہائے نظر ہیں ان میں تطبیق دی ہیں۔ الغرض شاہ ولی اللہ اس علم کے کاملین میں سے سب سے ممتاز ہیں۔

تمہارے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارادہ یہ ہے کہ وہ تمہارے ذریعہ امت مرحومہ کے منتشر اجزا کو جمع کر دے۔ اس لئے یہ جو کہا گیا ہے کہ صدیق اس وقت تک صدیق نہیں ہو سکتا، جب تک کہ ایک ہزار صدیق اسے زندیق نہ کہیں، تمہیں چاہیئے کہ اس چیز سے بچو۔ اس کے ساتھ ساتھ تمہارے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ فروعات میں اپنی قوم کی ہرگز مخالفت نہ کرو۔ کیونکہ ایسا کرنا ارادۂ الٰہی کے خلاف ہے۔　　(فیوض الحرمین)

اسلام میں روح آزادی

ابراہیم حدادؔ[۱]

اسلام سے قبل ایک عرب اپنی آزادی و حریت کو زندگی کی سب سے بڑی متاع سمجھتا تھا۔ اور وہ اس سے متمتع ہونے کے لئے ہر نعمت کو چھوڑنے کے لئے تیار رہتا تھا۔ لیکن اس کا یہ جذبۂ حریت انفرادی یا زیادہ سے زیادہ قبائلی تھا۔ اور قبیلے سے بھی اس کی وفاداری اسی وقت تک قائم رہتی تھی جب تک وہ اس کی شخصی آزادی میں زیادہ مخل نہ ہوتی تھی۔ اسی لئے ایک قبیلے کے افراد جیسے جیسے بڑھتے، وہ مختلف شاخوں میں تقسیم ہوتے جاتے تھے تاکہ قبیلے کا وجود افراد کی آزادی میں زیادہ مانع نہ ہو سکے اور وہ اپنی من مانی کرتے رہیں

عربوں کا یہ جذبۂ آزادی حقیقت میں اسلام کے آنے سے پہلے ان کے لئے ایک مصیبت بن گیا تھا اور اس نے فعلاً ان کے ہاں انارکی اور نزاع کی شکل اختیار کر لی تھی۔ ہر قبیلہ دوسرے کے خلاف برسر پرخاش رہتا۔ بلکہ خود ایک قبیلے میں ایک دادا کی اولاد ایک ساتھ نہیں رہ سکتی تھی اس کی وجہ سے عربوں میں اجتماعیت کا فقدان تھا۔ یہاں تک ان کا کوئی قبیلہ یہ بھی گوارا نہ کرتا تھا کہ وہ دوسرے قبیلے کے "اِلٰہ" کو پوجے۔ اس لئے ہر قبیلے کا

---

[۱] "الحریۃ عند العرب" مصنفہ ابراہیم حدادؔ سے تلخیص و ترجمہ۔ اس کتاب کے سرورق پر حضرت عمر بن الخطاب کا یہ قول ــــ متی استعبدتم الناس وقد ولدتھم امھاتھم احراراً (تم نے کب سے لوگوں کو غلام بنا لیا ہے، درآں حالیکہ ان کی ماؤں نے انہیں آزاد جنا تھا۔ بڑے نمایاں طور پر دیا ہے۔

(مدیر)

اپنا مخصوص بت ہوتا، اور وہ اسی کی عبادت کرتا۔

اسلام نے نہ صرف عربوں کے اس جذبۂ حریت کو نظم وضبط کا پابند بنایا، بلکہ انہیں اجتماعیت بھی بخشی، چنانچہ جب وہ مسلمان ہو کر جزیرۂ عرب سے باہر نکلے ہیں۔ تو جہاں بھی وہ گئے محکوم اقوام اور پسے ہوئے عوام کی آزادی کے علم بردار بنے، اور ان کا فطری جذبۂ آزادی دوسروں کی آزادی کا پیغام بر بنا۔ مشہور فرانسیسی مورخ ارنسٹ رینان (۱۸۲۳ء - ۱۸۹۲ء) اپنی کتاب "تاریخ لغات سامیہ" میں لکھتا ہے:-

"محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے پہلے عربوں کی کوئی قابل ذکر سیاسی تہذیبی اور دینی تاریخ نہ تھی اور نہ جزیرہ عرب کی قدیم زمانے میں جب کہ وہ جہالت کے اندھیروں میں ڈوبا ہوا تھا۔ کوئی حیثیت تھی عربوں کی قوت و عظمت اور ان کے فضائل کا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بعثت کے بعد چھٹی صدی عیسوی ہی میں ظہور ہوا ہے"

غرض جب اسلام نے دین کے جھنڈے کے نیچے عرب قبائل کو متحد کیا تو ان کی قدرتی صلاحیتیں ظاہر ہوئیں۔ اور آزادی کا ان کے اندر جو جوہر تھا وہ ایک اعجوبۂ دہر کی حیثیت سے نمایاں ہوا۔ چنانچہ ایک سو سال سے بھی کم عرصے میں یہی عرب جو جزیرۂ عرب کے اندر آپس میں گتھم گتھا ہوتے رہتے تھے، ایک عظیم مملکت قائم کرنے میں کامیاب ہوئے، انہوں نے ایک شاندار تہذیب کی بنیاد رکھی اور جن قوموں پر وہ غالب آئے ان کو انہوں نے حریت، حق اور عدل کا سبق پڑھایا۔ اور ان کے اندر نئی زندگی پیدا کی۔

ظہور اسلام کے وقت ایران اور بازنطینی دو بڑی سلطنتیں تھیں۔ جو دنیائے قدیم کے ایک بڑے حصے پر قابض تھیں۔ بے شک ان میں سے ہر ایک سلطنت کی اپنی مخصوص تہذیب، اور انسانی زندگی۔ اجتماع اور حریت کے متعلق اپنی قدریں تھیں۔ اب عربوں نے جہاں ان دونوں سلطنتوں کو ختم کیا، وہاں ایک کام یہ بھی کیا کہ ان سلطنتوں کے عوام میں آزادی کی روح پھونکی اور ان کے دلوں میں غیرت انسانی کی چنگاری روشن کی، جو ان کے لئے نعم البدل ثابت ہوئی اس اقتدار اور حکومت کی جس سے کہ وہ عربوں کے ہاتھوں محروم ہو گئے تھے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ اسلامی فتوحات کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ ان ملکوں میں بڑے بڑے عالم، ادیب، شاعر اور فلسفی پیدا ہوئے چنانچہ جب مامون الرشید نے دوسری زبانوں کے علوم کو عربی میں منتقل کرنے کے لئے بغداد میں دارالترجمہ قائم کیا تو اس کا سربراہ حنین بن اسحاق مقرر ہوا۔ منصور عباسی کا طبیب خصوصی ایک عیسائی جورجیس

بن بختیشوع تھا۔ اور اس کے منجم نوبخت فارسی اور اس کا بیٹا ابو سہل تھے۔ منصور کے بیٹے مہدی کا منجم ایک لبنانی عیسائی تیوفیل ابن توما تھا۔ اس نے تاریخ پر کتابیں لکھیں، اور یونانی شاعر ہومر کا سریانی میں ترجمہ کیا۔ اسی طرح اور بہت سے غیر عرب اور غیر مسلم فلسفی اور طبیب تھے، جن کو خلفائے عباسیہ نے بڑے بڑے عہدوں پر فائز کیا۔ اور اسی طرح وہ تہذیب برومند ہوئی۔ جو اسلامی اور عرب تہذیب کے نام سے مشہور ہے۔

مختصراً آزادی و حریت کا وہ جذبہ جو عربوں میں مدتوں سے موجود تھا۔ جب اسے اسلام کی سرپرستی حاصل ہوئی اور عرب اس سے بہرہ ور ہو کر باہر نکلے اور شرق و مغرب میں انہوں نے فتوحات کیں تو اس کے طفیل ایک ایسی تہذیب وجود میں آئی جس میں علوم و فنون، ادب و ثقافت اور حکمت و فلسفہ کو خوب فروغ ہوا۔ اب اگر عرب اسلام کی اس نعمت سے سرفراز نہ ہوتے، اور ان کے فطری جذبۂ آزادی کو اسلام کی رہنمائی نہ ملتی تو ایرانی اور بازنطینی سلطنتیں ختم ہوتیں، نہ ان کے عوام اس شکنجے سے نکلتے، جس میں کہ وہ مقید تھے، اور نہ وہ تہذیب وجود میں آتی جس کی روشنی کی شعاعیں بعد میں یورپ پہنچیں، اس کا اندھیرا چھٹا، اور وہاں نشاۃ ثانیہ کی تحریک شروع ہوئی۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے افراد کی آزادی کو ایک نظم و ضبط دیا، اور ان پر ایسی پابندیاں عائد کیں کہ افراد کی آزادی اور اجتماع کی آزادی میں ہم آہنگی ہو، اور دونوں مل کر مفید کام کر سکیں۔ اسی ہم آہنگی کی وجہ سے اسلام کے دور اول میں عربوں کو سربلندی نصیب ہوئی، اور وہ ایک مدت مدید تک دوسری قوموں کے رہنما استاد بنے رہے۔ کیا یہ واقعہ نہیں کہ اسلام اپنے آپ کو دوسروں سے زبردستی نہیں منواتا۔ بلکہ وہ انہیں قائل اور مطمئن کرنا چاہتا ہے۔ کیونکہ زبردستی کرنا آزادی کے نقیض ہے اور دوسرے کو قائل اور مطمئن کرنا مظاہر آزادی میں سے ایک مظہر ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے :۔ لا اکراہ فی الدین (دین میں کوئی زبردستی اور جبر نہیں) ایک اور آیت ہے :۔ وقل الحق من ربکم فمن شاء فلیؤمن ومن شاء فلیکفر (تو کہدے کہ تمہارے رب کی طرف سے حق آیا ہے، پس جو چاہے اس پر ایمان لائے، اور جو چاہے اس کا انکار کرے) یہ آیات قطعی طور پر دین میں جبر و اکراہ کی نفی اور آزادی ضمیر کا جو کہ اسلام کی ایک اساس ہے اثبات کرتی ہیں بعد کے زمانے میں بعض مفسرین نے ان آیات کو، آیت فاقتلوا المشرکین حیث وجدتموھم (جہاں بھی تمہیں مشرکین ملیں، انہیں قتل کرو) سے منسوخ قرار دیا ہے، لیکن شیخ محمد عبدہ اور ان کے استاد

علامہ جمال الدین افغانی نے ان مفسرین کی بڑے محکم دلائل سے تردید کی ہے[۱] اور دین میں جبر و اکراہ کی نفی کی تائید میں ابن عباسؓ سے ابوداؤد، نسائی، ابن حبان اور ابن جریر نے روایت کی ہے، وہ سند کے طور پر پیش کی ہے۔ اور وہ یہ ہے:۔

"آیت 'لا اکراہ فی الدین' انصار کے قبیلے بنو سالم بن عوف میں سے ایک شخص کے بارے میں اتری ہے جس کا نام الحصین تھا۔ وہ خود تو مسلمان تھا، لیکن اس کے دو بیٹے عیسائی تھے۔ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کیا میں انہیں مجبور نہ کروں۔ وہ عیسائیت سے انکار کرنے کو تیار نہیں ہو رہے۔ اس پر یہ آیت اتری۔ بعض تفسیروں میں آیا ہے کہ اس شخص نے اپنے بیٹوں کو اسلام لانے پر مجبور کیا، اور جب ان میں نزاع ہوئی۔ تو وہ سب کے سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جھگڑا لے کر آئے۔ اس شخص نے کہا کہ یا رسول اللہ! یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں دیکھتا رہوں، اور میرے جگر گوشے دوزخ میں جائیں، تو اس پر یہ آیت اتری سعید بن جبیرؓ روایت کرتے ہیں کہ جب یہ آیت اتری تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ نے تمہارے ساتھیوں کو اختیار دیا ہے۔ اگر وہ تمہیں اختیار کرتے ہیں، تو وہ تم میں سے ہیں۔ اور اگر وہ انہیں اختیار کرتے ہیں تو وہ ان میں سے ہیں۔ نیز نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانے میں مشرکین مکہ مسلمانوں پر طرح طرح کی سختیاں کر کے انہیں دین اسلام سے برگشتہ کرنے کی کوشش کرتے تھے اور مشرکین اپنی ان حرکات سے باز نہیں آتے تھے۔ بعض مسلمانوں کے دل میں یہ خیال آیا کہ کیوں نہ ہم بھی اسلام کے لئے لوگوں کو مجبور کریں۔ چنانچہ یہ آیت لا اکراہ فی الدین اتری۔ اس سے پہلے "ولو شاء ربک لآمن من فی الارض کلھم جمیعاً افانت تکرہ الناس حتیٰ یکونوا مومنین" (اگر تیرا رب چاہتا تو زمین میں جتنے بھی ہیں، سب کے سب ایمان لے آتے۔ پس کیا تم لوگوں کو مجبور کرو گے کہ وہ ایمان لائیں) علاوہ ازیں علمائے اسلام کا اس پر اجماع ہے، کہ جس شخص کو بہ جبر و اکراہ ایمان پر مجبور کیا جائے۔ اس کا ایمان باطل اور غیر صحیح ہے اور آیات ادفع بالتی ھی احسن" اس طریقے

---

[۱] - "الحریۃ الدینیۃ فی الاسلام" از عبدالمتعال صعیدی استاد جامعہ ازھر

سے جواب دو جو زیادہ اچھا ہے) ادجادلھم بالتی ھی احسن" (ان سے زیادہ اچھے طریقے سے بحث کرو۔) اس امر کی تائید کرتی ہیں۔

خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ایسے واقعات ہوئے۔ جو قطعی طور پر بغیر کسی شک و شبہ کے یہ ثابت کرتے ہیں کہ آپؐ کے زمانے میں مذہبی آزادی اور اعمال و معاملات کی آزادی تھی، مثلاً کعب الاحبار یہودی مدینہ میں رہتا تھا۔ اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں سے امور دین میں بحث کیا کرتا تھا، لیکن کسی نے اسے اسلام لانے پر مجبور نہیں کیا۔ وہ خلافت عثمان بن عفان تک اپنی یہودیت پر قائم رہا۔ اسی طرح نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مرض الموت کے دوران کا اپنا ایک واقعہ حریت و مساوات کی تاریخ میں اپنی مثال نہیں رکھتا۔ آپؐ حالت بیماری میں حضرت عائشہؓ کے ہاں قیام فرما تھے، ایک دن آپ فضل بن عباس اور علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہما کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر مسجد میں تشریف لے گئے اور منبر پر بیٹھے اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کرنے کے بعد فرمایا:۔ اے لوگو اگر میں نے کسی کی پیٹھ پر کوڑے لگائے ہوں، تو یہ میری پیٹھ ہے۔ وہ اس کا بدلہ لے لے۔ اور اگر میں نے کسی کو برا بھلا کہا ہو، تو وہ مجھے برا بھلا کہہ لے اور بدلہ لے لے۔ اور اگر میں نے کسی سے کوئی مال لیا ہو تو میرا مال موجود ہے، وہ اس سے لے لے۔ اور میری طرف سے کسی کینے کا اسے ڈر نہ ہو، کیونکہ یہ میری طبیعت میں داخل نہیں پھر آپؐ منبر سے نیچے اترے نماز ظہر ادا کی۔ اور دوبارہ منبر پر چڑھے اور وہی باتیں دہرائیں۔ اس پر ایک شخص اٹھا اور اس نے کہا کہ آپؐ کے ذمے میرے تین درہم ہیں۔ آپؐ نے وہ ادا کر دیئے اور فرمایا اس دنیا کی فضیحت آخرت کی فضیحت سے آسان ہے۔ اس کے بعد آپؐ نے جنگ احد کے شہدائے کے لئے دعا کی، اور واپس حضرت عائشہؓ کے گھر تشریف لے گئے۔

یہ تھی آزادی و حریت کی وہ روح، جو درحقیقت بنیاد تھی اسلام اور اسلام کی دعوت کی، اور اوپر کے واقعہ میں رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے خود اپنے عمل سے لوگوں کو بتایا کہ ان سب کے ایک سے حقوق ہیں اور وہ عزت نفس کے معاملے میں سب برابر ہیں۔ اور اس میں بڑے اور چھوٹے کی تمیز نہیں۔ خلفائے راشدین اسی اسوۂ حسنہ پر چلے، اور واقعہ یہ ہے کہ ان کا عہد سرزمین مشرق میں آزادی و حریت کا عہد تھا جس سے

دوسری قومیں متاثر ہوئیں۔ اور انہوں نے اسے اپنایا اور اس طرح بعد کی صدیوں میں ایک عظیم تہذیب وجود میں آسکی۔

یہ آزادی و مساوات صرف مسلمانوں کے لئے نہیں تھی، بلکہ اس عہد میں وہ نصاریٰ جو حجاز، شام اور عراق میں آباد تھے، وہ بھی اس سے برابر متمتع ہوتے رہے۔ انہی کے بارے میں قرآن مجید کی یہ آیات نازل ہوئیں :- وقفّینا علیٰ آثارھم بعیسی بن مریم مصدقاً لما بین یدیہ من التوراۃ وآتیناہ الانجیل فیہ ھدی ونورٌ ومصدقا لما بین یدیہ من التوراۃ وھدی وموعظۃ للمتقین ولیحکم اھل الانجیل بما انزل اللہ فیہ ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولٰئک ھم الفاسقون (ان کے بعد ہم نے عیسیٰ بن مریم کو بھیجا۔ وہ تصدیق کرتا تھا تورات کی، جو اس سے پہلے تھی۔ اور ہم نے اسے انجیل دی جس میں ہدایت اور نور ہے اور وہ تصدیق کرتی ہے تورات کی، جو اس سے پہلے تھی۔ اور وہ ہدایت اور نصیحت ہے متقیوں کے لئے۔ انجیل والوں کو چاہیئے کہ جو کچھ اللہ نے اس میں اتارا ہے، اس کے مطابق فیصلہ دیں، اور جو اللہ کی طرف سے نازل شدہ احکام کے مطابق فیصلہ نہیں کرتا، وہ فاسق ہیں) اور ایک اور آیت ہے :- ان الذین آمنوا والذین ھادوا والنصاریٰ والصابئین من آمن باللہ والیوم الاخر وعمل عملاً صالحاً فلھم اجرھم عند ربھم ولا خوفٌ علیھم ولا یحزنون (وہ لوگ جو ایمان لائے اور جو یہودی نصاریٰ اور صابئین ہیں۔ جو ایمان لایا اللہ پر، یوم آخرت پر اور اس نے عمل صالح کئے۔ ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے۔ ان کے لئے کوئی خوف نہیں اور نہ وہ غم کریں۔) اور ایک اور آیت میں ارشاد ہوتا ہے۔ ولا تجادلوا اھل الکتاب الا بالتی ھی احسن (اہل کتاب سے بحث کرو تو وہ طریقہ اختیار کرو، جو زیادہ اچھا ہے) قرآن مجید کے یہی وہ ارشادات، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی وہ اسوہ اور خلفائے راشدین کا ان کے مطابق عمل تھا، جس کی بنا پر مشہور مصنف جبرنسون اپنی کتاب "تاریخ شارلکان" میں لکھتا ہے :- یہ صرف مسلمان ہی تھے جو جہاد کو اور دوسرے مذاہب کے ساتھ جو اُن سے مغلوب ہوئے، رواداری کو باہم جمع کرسکے۔ اور انہوں

نے دوسرے مذاہب والوں کو اپنے شعائر دینی بجالانے میں پوری آزادی دی"۔ ایک اور مورخ میشود نے اپنی کتاب تاریخ حروب صلیبی میں لکھا ہے۔ اسلام نے جہاں ایک طرف۔ جہاد کا حکم دیا ہے وہاں ساتھ ہی وہ دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کے ساتھ رواداری کا حکم دیتا ہے چنانچہ اس نے پادریوں، راہبوں اور ان کی خدمت کرنے والوں کو ٹیکسوں سے مستثنیٰ قرار دیا۔ اور خاص طور سے راہبوں کو جو کہ اللہ تعالےٰ کی عبادت کے لئے وقف ہیں قتل کرنے سے سختی سے منع کیا۔ عمر بن خطاب (رضی اللہ عنہ) نے جب بیت المقدس فتح ہوا، نصاریٰ کو چھوا تک نہیں تھا۔ یہی مصنف میشود جو راہب ہے اپنی ایک اور کتاب "شرق میں ایک دینی سیاحت" میں لکھتا ہے:۔ "اور یہ افسوس کی بات ہے کہ عیسائی قومیں رواداری، تقویٰ، دوسروں کے عقائد کا احترام اور زبردستی دوسرے پر اپنا عقیدہ نہ تھوپنے کا طریقہ مسلمانوں سے لیں"۔

"نظریہ وحدت الوجود میں اعتقاد کا اثر علمی زندگی پر بہت گہرا پڑتا ہے اس پر اعتقاد رکھنے والا بلند نظر، اس کی ہمدردیاں وسیع اور اس کے مقاصد اعلیٰ ہو جاتے ہیں رواداری اس کا مزاج بن جاتی ہے۔ اور وہ ہر نظریہ ہر خیال اور ہر تصور کو ہمدردانہ طور پر دیکھنے لگتا ہے۔ اس لئے کہ اس نظر میں حقیقت تو ایک ہی ہے یہ نظریہ بالخصوص ایسے ممالک کے لئے بہت اہمیت رکھتا ہے، جہاں دوسرے مذاہب کے پیرو بھی موجود ہوں۔ اس نظریہ کے ذریعہ اسلام کی تبلیغ واشاعت بہت سلیقہ اور صحیح طور پر ہو سکتی ہے۔"

(جمیل جالبی)

عصرِ حاضر کا جلیل القدر مفکّر

خواجہ عبدالوحید صاحب
ایڈیٹر الاسلام، کراچی

مغرب کی زبان سے "انقلاب" کا لفظ سننے والے مغربیت پسند، ہندو پاکستان کے نوجوانوں کو یہ سنکر تعجب ہوگا کہ آج سے تقریباً اڑھائی سو برس پیشتر برصغیر ہندو پاکستان کی سرزمین پر مغلیہ سلطنت کے مرکز (دہلی) میں اسلام کے ایک جلیل القدر مفکر نے انقلاب کا نعرہ بلند کیا۔ یہ انقلاب اس لئے نہیں تھا کہ قانون کی حد بندیوں کو توڑ کر اخلاقی انار کی پھیلادی جائے۔ نہ اس انقلاب کا مقصد یہ تھا کہ افراد کو دنیا میں من مانی کارروائیاں کرنے کے لئے کھلا چھوڑ دیا جائے۔ بلکہ اس انقلاب کی غرض یہ تھی کہ نوع انسانی کی سیاسی، معاشی اور عمرانی مصیبتوں کا یک قلم خاتمہ کردیا جائے۔

ہندو پاکستان کے عام باشندے اس زمانہ میں اس جلیل القدر مفکر کے افکار عالیہ کو نہ سمجھ سکے۔ یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ تاریخ عالم میں بارہا ایسا ہوا ہے کہ خدا کا ایک بندہ گرے ہوؤں کو اٹھانے اور مرے ہوؤں کو دستور حیات پیش کرتا ہے، لیکن گرے ہوئے اس کی طرف توجہ نہیں کرتے اور موت کے منہ میں جانے والے اس کے نعرۂ حیات کو نہیں سنتے۔ لیکن اس کے باوجود نیک خیالی اور نیک عملی کا جو بیج خدا کا وہ بندہ نامساعد حالات اور ناموافق ماحول میں بو جاتا ہے، وہ بالآخر برگ و بار پیدا کرکے رہتا ہے۔ ایسا ہی معاملہ شاہ ولی اللہ دہلوی کے ساتھ بھی پیش آیا۔

حضرت شاہ ولی اللہ ۱۷۰۳ء میں سلطنت مغلیہ کے سیاسی مرکز "دہلی" میں پیدا ہوئے، ایسے ماحول میں جہاں ملوکیت اپنی تمام خرابیوں کے ساتھ چھا رہی تھی۔ تعلیم و تربیت کے ساتھ کارفرمائے غیب سے

شاہ صاحبؒ کو وہ علمی اور عملی استعداد بھی عطا ہوئی تھی کہ انہوں نے دنیائے افکار کے ہر شعبہ میں انقلاب عظیم برپا کردیا۔ سمجھنے والے اگرچہ اس وقت تھوڑے تھے، لیکن ان مٹھی بھر مخلصین کی جماعت نے جس خلوص اور تندہی کے ساتھ کام کیا، اس کا نتیجہ آگے چل کر بہت شاندار صورت میں نمودار ہوا۔

شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے علوم وفنون مختلفہ کا جو عظیم الشان ذخیرہ کثیر المقدار تصانیف کی صورت میں چھوڑا ہے آج اگر کوئی قوم اس کو اپنا سرمایۂ حیات بنالے تو خدا سے بغاوت کے بغیر وہ دنیا کی ہر اس لعنت سے نجات پاسکتی ہے، جس سے نجات کا دعویٰ مغربیت، اشتراکیت اور دوسرے تمام لادینی مکتبۂ فکر کرتے ہیں۔ آج کے پاکستانی اور ہندوستانی مسلمانوں کی بدبختی ہے کہ وہ عربی اور فارسی عام طور پر نہیں جانتے، اور یہی وہ زبانیں ہیں، جن میں شاہ صاحب نے اپنے افکار عالیہ کو قلم بند فرمایا ہے۔ اس لئے مسلمانان ہندو پاکستان کو ان حضرات کا ممنون ہونا چاہیئے، جنہوں نے شاہ صاحب کے خیالات کو اردو اور دیگر ملکی زبانوں میں پیش کرنے کا عہد کر لیا ہے۔ اس موقع پر ہم اس جلیل القدر خاتون کو خراج عقیدت پیش کئے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتے، جس کی اولوالعزمی اور فیاضی نے حضرت شاہ صاحب کے فلسفۂ اسلامی کی نشرواشاعت کی ایک مستقل صورت پیدا کردی ہے۔ مسلمانان ہندو پاکستان پر یہ بہت بڑا احسان ہے، جس سے عہدہ برآ نہیں ہوا جاسکتا تصور میں بھی نہ آتا تھا کہ اس دور جہل وعہد فتن میں کوئی عورت آگے بڑھے گی اور درجۂ "السابقون الاولون" حاصل کرے گی! لیکن اب یہ ایک حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

این سعادت بزور بازو نیست

تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

سب سے اول یہ امر ذہن نشین کرلینا ضروری ہے کہ شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا روئے سخن تمام عالم انسانیت کی طرف ہے انہوں نے جس قدر قواعد کلیہ بیان کئے ہیں، وہ عمومی حیثیت رکھتے ہیں اور تمام اقوام عالم کے لئے قابل قبول وعمل ہیں۔ البتہ اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ چونکہ ان کے اولین مخاطب قرآن کے ماننے والے ہیں، اس لئے انہوں نے مسائل کی مثالیں شریعت اسلامی سے دی ہیں یہ تخصیص اس لئے کی گئی ہے کہ اگر قرآن کو ماننے والی قوم کے صاحب فکر وعمل حصے کو دنیا کے سامنے عملی نمونہ بناکر پیش کردیا

جائے تو پھر اس کے ذریعہ آگے چل کر دیگر باشندگان ملک اور اس کے بعد عالم انسانی میں ایک عمومی انقلاب پیدا کیا جا سکتا ہے۔

شاہ صاحب کے فکر میں اساسی حیثیت قرآن کریم کو حاصل ہے، وہ اسے انسانی زندگی کا مکمل ضابطۂ حیات قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک نزول قرآن کا مقصد یہ نہیں تھا کہ ہنگامہ ہائے درس و تدریس میں گرمی پیدا کی جائے، بلکہ قرآن اس لئے آیا تھا کہ انسانوں کے لئے اس زندگی کی مصیبتوں اور موت کے بعد کی زندگی کی صعوبتوں کو ان کے راستے سے ہٹا دے۔ ان کے نزدیک قرآن کا اصلی اعجاز اس کے متعین کئے ہوئے نظام حیات ہی میں ہے۔ اس لئے کہ اس نظام حیات میں ہر شخص کے لئے خواہ وہ مشرقی یا مغربی، سیاہ ہو یا سفید، امیر ہو یا غریب، عالم ہو یا جاہل، پیغام فلاح و کامرانی موجود ہے۔

اسلام میں قرآن حکیم کی اساسی حیثیت واضح کرنے میں شاہ صاحبؒ نے بہت ہی قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ علمائے فقہ نے دین کے جو چار اصول قائم کئے ہیں یعنی قرآن، سنت، اجماع اور قیاس۔ ان میں سے شاہ صاحب قیاس کو کوئی مستقل حیثیت نہیں دیتے۔ اجماع کا دار و مدار ان کے نزدیک کتاب و سنت پر ہے اور سنت خود قرآن سے مستنبط ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دین کی اصل قرآن میں ہے اس حقیقت کے پیش نظر شاہ صاحب نے قرآن حکیم کے متن کو واضح کرنا سب سے زیادہ ضروری سمجھا وہ پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے برصغیر ہند و پاکستان میں قرآن کا کسی زبان میں ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ فارسی زبان میں تھا اس لئے کہ اس زمانہ میں اس ملک میں فارسی زبان عام طور پر سمجھی، بولی اور لکھی جاتی تھی۔ اس ترجمہ قرآن میں شاہ صاحب کے کمالات علمیہ کا بہترین مظاہرہ ہوا ہے، اس لئے کہ اس تحت اللفظ ترجمے کے پڑھ لینے سے قرآن حکیم کے مطالب سمجھ لینا بالکل آسان ہو جاتا ہے۔ اور پڑھنے والا دوسری بڑی بڑی تفاسیر کا محتاج نہیں رہتا۔

شاہ صاحب نے حکمت قرآنی کو ایک موثر اور مربوط صورت میں بیان فرما کر قرآن حکیم کی شاندار خدمت انجام دی ہے انہوں نے ان تمام انبیاء کی تعلیم میں جن کا ذکر قرآن حکیم میں آیا ہے فکری وحدت دکھائی ہے اور انسانی فکر کو اول سے آخر تک ایک تاریخی تسلسل میں مرتب کر دیا ہے۔ بقول مولانا عبیداللہ سندھیؒ :-

"انسانی فکر کی تدریجی ترقی کا تعین اور پھر قرآن سے اس کی مطابقت کرنا، یہ خصوصیت ہے
شاہ ولی اللہ صاحب کے کمال علم کی، جو انہیں قدرت کی طرف سے ودیعت ہوا تھا اگر
شاہ صاحب کی اس حکمت کو بخوبی سمجھ لیا جائے تو قرآن کا متن واضح ہو جاتا ہے۔"

شاہ صاحبؒ کی خدماتِ قرآن کا سلسلہ بہت وسیع ہے، انہوں نے بے شمار ایسے مسائل صاف کئے ہیں، جن کے متعلق صدیوں سے غلط فہمیاں چلی آرہی تھیں۔ مثلاً قرآنی آیات کے شانِ نزول کے متعلق انہوں نے یہ وضاحت کی کہ اگرچہ مختلف آیات خاص خاص مواقع پر خاص خاص حالات اور اشخاص کے متعلق نازل ہوئیں، تاہم قرآنی مطالب کی تشریح میں ان کی عمومیت مدنظر رہے گی۔ اس لئے کہ اگر قرآنی آیات کو جزئی واقعات سے مختص کر دیا جائے تو آج کل کی زندگی میں قرآن بحیثیت مجموعی موثر نہیں ہو سکتا حالانکہ قرآن تا قیام قیامت نوعِ انسانی کی عملی رہنمائی کے لئے نازل ہوا ہے۔

حکمت قرآن کی وضاحت کے سلسلے میں شاہ صاحب نے جو مجتہدانہ کارہائے نمایاں انجام دیئے ان کے سلسلے میں مسئلہ نسخ کا ذکر مفید ہوگا۔ عام مفسرین نے قرآن حکیم کی سینکڑوں آیات کو منسوخ قرار دیا ہے۔ علامہ جلال الدین السیوطی نے اپنی مشہور کتاب "الاتقان فی علوم القرآن" میں ان تمام آیتوں کو گو غیر منسوخ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے لیکن بیس آیات ایسی ہیں جنہیں وہ غیر منسوخ ثابت نہیں کر سکے۔ شاہ ولی اللہ نے ان بیس آیتوں میں سے پندرہ آیتوں کی ایسی تطبیق فرما دی کہ ان کا منسوخ ہونا غیر ضروری ہو گیا اب صرف پانچ آیتیں ایسی رہ جاتی ہیں، جن کا غیر منسوخ ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ حکمت ولی اللہی کی روشنی میں وہ پانچ آیتیں بھی غیر منسوخ قرار دی جا سکتی ہیں۔ مولانا عبید اللہ سندھیؒ اس بات کے مدعی ہیں کہ ایسا ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ان پانچ آیتوں میں سے مثال کے طور پر وہ اس آیت کو لیتے ہیں، جو سب سے زیادہ مشکل سمجھی گئی ہے۔ یعنی آیت وصیت، اس آیت کو اس لئے منسوخ قرار دیا جاتا ہے کہ اس آیت کے بعد آیات وراثت نازل ہو گئیں اور چونکہ ان میں ورثا کے حصے متعین کر دیئے گئے۔ اس لئے اب ان کے حق میں وصیت کی ضرورت نہ رہی مولانا عبید اللہ صاحب کے نزدیک بعض حالات میں اب بھی آیت وصیت پر عمل ہو سکتا ہے، مثلاً اگر ایک مسلمان کے والدین کافر ہوں تو بوجہ اپنے کفر کے وہ اس کی وراثت میں شریک نہیں ہو سکتے

ایسی صورت میں اگر وہ مسلمان اپنے والدین کے حق میں وصیت کردے تو وصیت والی آیت قابل عمل بن جاتی ہے اور اسے منسوخ قرار دینے کی ضرورت نہیں رہتی۔

قرآن کے بعد علوم اسلامیہ میں حدیث کا درجہ آتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی تعلیمات پر عمل کرنے کے لئے ایک مفصل نظام یا دستور العمل مرتب فرمایا تھا۔ اس نظام کو "سنت" کا نام دیا گیا ہے۔ علمائے حدیث نے دو سو برس کی متواتر محنت سے سنت کے اس مواد کو احادیث کی کتابوں میں جمع کر دیا ہے ان کتابوں میں بعض کتابیں ایسی ہیں، جن میں اہتمام کے ساتھ "صحیح" روایات جمع ہیں (اگرچہ ایسی روایتوں کے متعلق ساتھ ساتھ تصریح کر دی گئی ہے کہ وہ صحیح نہیں) اس طرح شاہ صاحب کے نزدیک کتب حدیث میں اور بھی کئی طرح کے فرق ہیں۔ ان تمام فروق کو مد نظر رکھ کر شاہ صاحب نے تمام کتب حدیث کو مختلف طبقات میں تقسیم کر دیا ہے۔ طبقۂ اول میں وہ موطا امام مالک صحیح بخاری اور صحیح مسلم کو شمار کرتے ہیں اور طبقۂ دوم میں سنن ابوداؤد، جامع ترمذی اور سنن نسائی کو۔ ان چھ کتابوں کی روایات کو شاہ صاحب حجت تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن ان کے علاوہ دوسرے طبقات کی کتب حدیث میں جو روایات ہیں، شاہ صاحب کے نزدیک وہ حجت نہیں ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک قابل توجہ امر یہ ہے کہ اول تو شاہ صاحبؒ موطا امام مالک کو صحاح ستہ میں شمار کرتے ہیں اور پھر ان میں سے اصح الکتب مؤطا کو تسلیم کرتے ہیں۔ موطا کی اہمیت کے پیش نظر شاہ صاحب نے اس کی ایک شرح عربی زبان میں "المسوّیٰ" کے نام سے لکھی اور فارسی زبان میں "المصفیٰ" کے نام سے۔ مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے خیال میں شاہ ولی اللہ کا موطا کو حدیث کی تمام کتابوں پر فائق اور مقدم قرار دینا طریقۂ ولی اللہی کا اساسی جوہر ہے۔

حدیث کے بعد علوم اسلامیہ میں فقہ کا درجہ ہے۔ اور حسب معمول فقہ میں بھی شاہ ولی اللہ صاحب کا مقام بہت بلند نظر آتا ہے۔ اصول فقہ کے بیان کرنے میں شاہ صاحب نے بے شمار نکات ایسے بیان فرمائے ہیں، جنہیں سمجھ لینے کے بعد دنیا کے دوسرے قوانین کے مقابلے میں فقہ اسلامی کی برتری واضح ہو جاتی ہے۔ اس سلسلہ میں ایک نمایاں خدمت شاہ صاحب نے یہ انجام دی ہے کہ انہوں نے ائمہ

مجتہدین کے ظاہری اختلافات کے باوجود، اصلاً ان کے اجتہادات کو یکساں ثابت کردیا ہے۔ اس طرح فلسفہ میں شاہ صاحبؒ کی مجتہدانہ تصریحات کی روشنی میں آریائی تخیل اور سامی حکمت کا ظاہری اختلاف رفع ہو جاتا ہے۔

تصوف میں بھی شاہ صاحب نے مسئلہ وحدت الوجود کی جو تفصیل و تصریح فرمائی ہے اس سے ایک عظیم الشان فائدہ یہ مرتب ہوتا ہے کہ آریائی ذہنیت اسلامی فکر کو قبول کرنے کے قابل ہو جاتی ہے۔ تصوف کے سلسلے میں شاہ صاحبؒ کی ایک اور نمایاں خدمت قابل ذکر ہے، وہ یہ کہ غلط کار صوفیوں اور تنگ نظر اور ظاہر بیں مولویوں نے طریقت اور شریعت کے درمیان حجابات کی جو دیوار قائم کردی تھی، شاہ صاحب نے اسے گرا دیا۔ آپ نے یہ ثابت کردیا کہ اگر شریعت انسان کے ظاہری پہلو کی صفائی کا اہتمام کرتی ہے تو طریقت اس کے باطنی پہلو کا تزکیہ کرتی ہے اور اس لئے مجموعی انسانی ترقی کے لئے دونوں ناگزیر ہیں۔ ظاہری طہارت کے بغیر قلب کی پاکیزگی پیدا نہیں ہو سکتی اور قلب کی صفائی کے بغیر ظاہری پاکیزگی بیکار ہو کر رہ جاتی ہے اس طرز خیال سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شریعت اور طریقت میں اصلاً کوئی تضاد نہیں۔

غرضکہ شاہ ولی اللہ دہلوی بیک وقت قرآن کے مفسر بھی ہیں اور حدیث کے ماہر بھی، وہ فقہ میں اجتہاد کا مرتبہ بھی رکھتے ہیں اور ایک باکمال صوفی بھی ہیں اور اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس طرح کی جامع کمالات شخصیتیں دنیائے اسلام میں صدیوں کے بعد ہی پیدا ہوتی ہیں۔

اب ہم شاہ صاحب کے فکر کے ایک اور اہم حصے کی طرف متوجہ ہونا چاہتے ہیں، شاہ صاحب کا نظریہ یہ ہے کہ جب تک انسان کا مادی ماحول درست نہ ہو اس وقت تک وہ اپنی اعلیٰ تر روحانی استعدادوں کی ترقی و تہذیب کی طرف توجہ نہیں کر سکتا اس لئے سوسائٹی کا نظام، حکومت کا دستور اور معاشی تنظیم، ان سب چیزوں میں جب تک انقلاب عظیم برپا نہ ہو نسل انسانی کی روحانی ترقی کے لئے سازگار ماحول تیار نہ ہوگا۔ اس بنا پر شاہ صاحب کا پیغام "انقلاب" کا پیغام ہے۔ وہ جابر حکمرانوں، ظالم سرمایہ داروں اور سیاسی خود غرضوں کو بیک وقت مٹا کر ایک صالح نظام کی بنیاد رکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن وہ یہ بھی بتا دینے

ہیں کہ اس قسم کی کوئی تحریک کامیاب نہیں ہو سکتی۔ جب تک کہ اس کی بنیاد اخلاق پر نہ رکھی جائے شاہ صاحب انسانی کامیابی کا دارومدار چار بنیادی اخلاق قرار دیتے ہیں۔

۱- طہارت

۲- خضوع وخشوع

۳- ضبط نفس

۴- عدالت

ان میں سے آخری چیز یعنی عدالت پر تفصیلی بحث کے دوران شاہ صاحبؒ نے اس بات کی تصریح فرمائی ہے کہ کسی سوسائٹی میں عدل وانصاف پیدا نہیں ہو سکتا۔ جب تک رزق کمانے والی جماعتوں پر ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ ڈالنے سے احتراز کلی نہ برتا جائے۔ ان کے نزدیک چونکہ نزول قرآن کے زمانہ میں قیصر وکسریٰ کی غیر صالح حکومتوں نے متمدن دنیا کے بیشتر حصے کو اقتصادی بدحالی میں مبتلا کر رکھا تھا، جس کا نتیجہ عام بداخلاقی کی صورت میں ظاہر ہو رہا تھا۔ اس لئے نزول قرآن کا ایک بہت بڑا مقصد یہی تھا کہ قیصر وکسریٰ کا نظام سلطنت توڑ کر ایک صالح نظام قائم کر دیا جائے جو اقوام عالم کو ہر طرح کی مصیبتوں سے نجات دلا دے۔

شاہ صاحب نے ایک طرف تو اپنے فکر کو عربی اور فارسی تصانیف میں تفصیل کے ساتھ بیان فرما دیا اور دوسری طرف اس فکر کو معرض عمل میں لانے کے لئے ایک جماعت بھی مرتب فرمائی جسے مولانا سندھیؒ "حزب ولی اللہ" کا نام دیتے ہیں۔ اس جماعت کے حالات بیان کرنے کے لئے مولانا نے اپنی کتاب "شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک" مرتب فرمائی اس کتاب میں مولانا نے "حزب ولی اللہ" کی اجمالی تاریخ کا مقدمہ ترتیب دیا ہے۔

مولانا ہمیں بتلاتے ہیں کہ شاہ صاحب نے مئی ۱۷۳۱ء میں حکومت دہلی کے مفاسد کا خاتمہ کرنے کے لئے ایک مستقل انقلابی تحریک شروع کرنے کا فیصلہ فرمایا۔ ہمارے انقلاب پسند نوجوانوں کو

تعجب ہوگا کہ یہ واقعہ انقلاب فرانس سے اٹھاون سال پیشتر ہوا تھا۔ شاہ صاحب نے ایک جمعیت مرکزیہ قائم کی، اس کا ایک نصب العین متعین کیا، اس کے لئے ایک مفصل لائحہ عمل مرتب کیا اور پھر اس جمعیت کی شاخیں تمام ملک میں پھیلا دیں۔ شاہ صاحب کے علمی و عملی مرتبہ کا اثر یہ ہوا کہ اس تحریک میں علماء و صوفیا، امراء اور عہدہ داران سلطنت، ہر طرح کے لوگ شریک ہوگئے۔

شاہ ولی اللہ صاحب نے پانی پت کی مشہور تاریخی جنگ کے دو سال بعد ۱۷۶۳ء میں وفات پائی۔

اس سلسلے کی ایک دلچسپ بات وہ ہے، جسے براہ راست اس فقیر نے مولانا حافظ محمد احمد مرحوم سابق مہتمم دارالعلوم سے سنی تھی اپنے والد مرحوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی بانی دارالعلوم کے متعلق یہ قصہ بیان کرتے تھے کہ آخری حج میں جب جا رہے تھے تو کپتان جہاز نے جو غالباً کوئی اٹالین تھا، عام مسلمانوں کے اس رجحان کو جسے مولانا کے ساتھ عموماً وہ دیکھ رہا تھا، یہ دریافت کیا کہ یہ کون صاحب ہیں۔ جہاز میں کوئی انگریزی جاننے والے مسلمان بھی تھے انہوں نے کپتان سے مولانا کے حالات بیان کئے اس نے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ وہاں کیا تھا۔ مولانا بخوشی کپتان سے ملے کپتان نے اجازت چاہی کہ کیا مذہبی مسائل پر گفتگو کر سکتا ہوں۔ مولانا نے اسے بھی منظور فرمالیا۔ وہی انگریزی خواں صاحب ترجمان بنے۔ کپتان پوچھتا تھا، اور مولانا جواب دیتے تھے تھوڑی دیر کے بعد مولانا کے خیالات کو سنکر وہ کچھ مبہوت سا ہوگیا۔ اور مولانا کے ساتھ اس کی گرویدگی اتنی بڑھی کہ قریب تھا کہ اسلام کا اعلان کردے۔ اس نے شاید وعدہ بھی کیا کہ وہ ہندوستان حضرت سے ملنے کے لئے حاضر ہوگا اس واقعہ کا مولانا محمد قاسمؒ پر اتنا اثر پڑا کہ آپ نے جہاز ہی پر عزم فرمالیا کہ واپس ہونے کے بعد میں انگریزی زبان خود سیکھوں گا۔

(مولانا سید مناظر احسن گیلانی ۔ ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت)

تنقید و تبصرہ

اسلام اینڈ دی ورلڈ (انگریزی)

یہ مولانا ابوالحسن علی ندوی کی کتاب کا انگریزی ترجمہ ہے جو ڈاکٹر محمد آصف قدوائی ایم۔ اے پی۔ ایچ ڈی نے کیا ہے مولانا موصوف نے اصل کتاب عربی میں لکھی تھی جو ۱۹۵۰ میں قاہرہ سے شائع ہوئی۔ پھر مصنف نے خود ہی اس کا اردو ایڈیشن مرتب فرمایا، جو ۱۹۵۴ء میں شائع کیا گیا۔ زیر نظر کتاب اسی کا انگریزی ترجمہ ہے۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی کی شخصیت نہ صرف پاکستان و ہند میں، بلکہ عرب دنیا میں بھی مانی ہوئی ہے اس کے علاوہ مولانا موصوف ان اصحاب ہدایت وارشاد علمائے کرام میں سے ہیں، جو اسلام کو از سر نو زندگی میں بحیثیت ایک فعال روحانی و اجتماعی طاقت کے بروئے کار لانے میں سرگرم کار ہیں اور علمی و عملی دونوں جہت سے اس کے لئے کام کر رہے ہیں۔ اس لحاظ سے مولانا کی یہ کتاب خاص اہمیت رکھتی ہے، امید ہے انگریزی خواں طبقے میں اسے بڑے شوق سے پڑھا جائیگا۔

کتاب کے پہلے باب میں چھٹی صدی عیسوی کا جس میں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تھے، اخلاقی، اجتماعی و سیاسی جائزہ لیا گیا ہے، اور جیسا کہ فاضل مترجم نے دیباچے میں لکھا ہے کہ شاید ہی

لے۔ اس کتاب کا ترجمہ عرصہ ہوا ڈاکٹر شیخ محمد اقبال مرحوم (پرنسپل اورنٹیل کالج لاہور) نے اردو میں کیا تھا ایران قبل از اسلام پر یہ ایک بڑی اہم تصنیف ہے۔ (اگلے صفحے پر دیکھئے)

کسی زبان میں کوئی کتاب ہو، جس میں انسانی تاریخ کے اس جاں بلب دور کا نقشہ اتنی عمدگی سے پیش کیا گیا ہو، مصنف نے بڑی تفصیل سے اپنے بیان کی تائید میں مسلّم قابل اعتماد مصنفین کی کتابوں سے حوالے دیئے ہیں۔ خاص طور سے قبل از اسلام ایران کے متعلق کرسٹنسن کی کتاب "ایران بعہد ساسانیاں" کے اقتباسات بڑے ہی عبرت انگیز ہیں، اُس وقت ایران مذہبی اخلاقی اور سماجی لحاظ سے پستی کے کن گڑھوں میں گرا ہوا تھا واقعہ یہ ہے کہ یہ کتاب اس کی بڑی واضح اور حقیقی تصویر پیش کرتی ہے۔ ایران کے بعد دوسری سلطنت جس کے جزیرۂ عرب سے جہاں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوتے ہیں، قریبی روابط تھے، بازنطینی یا عام اصطلاح میں رومی تھی، اس کا مذہب عیسائی تھا۔ لیکن یہ مختلف گروہوں میں بٹا ہوا تھا، اور ان میں آپس میں کشت و خون کا بازار گرم رہتا تھا۔ پھر اس میں جو یہودی آباد تھے وہ آئے دن ظلم و تشدد کا نشانہ بنتے تھے۔ مصنف اے جی ٹیلر کے حوالے سے لکھتے ہیں ــ کہ "۶۱۰ء میں انطاکیہ (شام) کے یہودیوں نے بغاوت کی، اسے رومی جنرل نے اس بے دردی سے کچلا کہ انطاکیہ کی تمام یہودی آبادی کا صفایا کر دیا۔ پانچ سال بعد ۶۱۵ء میں جب شاہ ایران نے شام فتح کیا۔ تو یہودیوں نے اسے اُکسا کر اس کے ہاتھ سے عیسائیوں کو بے دریغ قتل کرایا۔ جس کا انتقام پندرہ سال بعد جب رومی دوبارہ شام پر قابض ہوئے پوری طرح لیا گیا، اور رومی سلطنت میں یہودیوں کے لئے کوئی جائے پناہ نہ رہی"۔ ایران اور روم کے علاوہ اسی باب میں ہندوستان، چین بعض دوسرے ممالک کی اخلاقی ابتری اور سماجی پستی کا بھی مختصراً ذکر ہے۔ اور رسول اکرم صلعم کی بعثت کے وقت پوری دنیا کی جو حالت تھی اسے اجمالاً پیش کیا گیا ہے۔

دوسرے باب کا موضوع "بعثت نبوی" ہے۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے فیض صحبت اور آپؐ کے لائے ہوئے دین اسلام کے اثر سے عربوں میں جو حیرت انگیز تبدیلی ہوئی، اور آپؐ کے صحابہ اور تربیت یافتگان کی شکل میں تاریخ نے انسانوں کا جو ایک بہترین گروہ دیکھا اُس کی ایک تصویر پیش کی گئی ہے۔ بقول مصنف کے "اس سے پہلے یقینی طور پر کبھی بھی تاریخ میں اس سے زیادہ متوازن اور ہم آہنگ انسانی جماعت دیکھنے میں نہیں آئی۔ یہ ہر اس وصف کی حامل تھی، جو اس دنیا اور دوسری دنیا میں کامیابی کی

ضمانت ہے، اس نے ایک ایسے کلچر اور ایک ایسی سلطنت کی طرح ڈالی جس نے ایک مختصر سے عرصے میں تینوں عظیم براعظموں پر اپنا اثر قائم کر لیا"

بعثت نبوی سے پہلے دنیا میں مذہبی کشمکش، سماجی و اخلاقی ابتری اور سیاسی انارکی کی جو حالت تھی، اُسے دین اسلام نے اصولاً و عملاً کس طرح حل کیا، اگر مصنف اس باب میں اس کا ذکر بھی کرتے اور مثال کے طور سے یہ بتاتے کہ ایک مذہب کی حکومت کے تحت دوسرے مذاہب والے کس طرح امن و امان سے رہ سکتے ہیں، اس مسئلے کو اسلام نے یوں حل کیا۔ یا ہر ملک میں اوپر کے طبقے نچلے طبقوں کا جو معاشی استحصال کر رہے تھے، اسلام کے برسر اقتدار آنے سے اس کا یوں تدارک ہوا۔ اسی طرح مذہبی گروہ بندیوں اور ان کی باہمی لڑائیوں کا مداوا یوں کیا گیا۔ تو اس باب کی خاص طور سے انگریزی داں طبقوں کے لئے افادیت اور جاذبیت اور بڑھ جاتی، اور مصنف نے جس اعلیٰ غرض کے لئے یہ کتاب لکھی ہے وہ ہمارے نزدیک باحسن وجوہ پورا ہو سکتی۔

یہ جو انسانی معاشرے میں مذہبی و سماجی و اخلاقی ابتری اور سیاسی افراتفری ہوتی ہے، اس کا سبب زیادہ تر معاشرے کے مختلف طبقات کی باہمی ناہمواری اور آپس کی کشمکش ہوا کرتی ہے۔ اسلام جب آیا، تو اس نے نہ صرف اُس وقت کے معاشرے میں جو طبقاتی ناہمواریاں تھیں، انہیں دور کیا، جس کا کہ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ ایک صدی کے اندر اندر ملتان سے لیکر اسپین تک پھیل گیا۔ بلکہ اس نے ہمیشہ کے لئے ان ناہمواریوں کو حل کرنے کے لئے ایسے اصول بھی دیئے کہ وہ ہر دور میں کام آسکتے ہیں۔ ضرورت تھی کہ جہاں مصنف نے قبل از اسلام دنیا کی خرابیوں کا علمی و تحقیقی جائزہ لیا تھا، اسی طرح اسلام نے ان خرابیوں کا جیسے علاج کیا۔ اس کا بھی ذکر کرتے۔ اسلام صرف ایک نظریہ حیات ہی نہ تھا، بلکہ وہ نظام حیات بھی تھا جس سے مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلم بھی مستفید ہوئے، اور انہوں نے اپنی بگڑی بنائی۔

مولانا موصوف نے یورپی معاشرے میں آج جو زبردست طوفان بدتمیزی برپا ہے اس کا نقشہ بڑی تفصیل سے خود یورپی اہل قلم کے اقتباسات کی مدد سے کھینچا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ خوب

کھینچا ہے اس سلسلے میں وہ فرماتے ہیں کہ اس معاشرے کی جملہ خرابیوں کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اس کی اٹھان یونانی فکر و کلچر اور رومی اجتماع و سیاست پر ہوئی، ہمیں مولانا کی اس رائے سے بھی کلی اتفاق نہیں - جہاں تک یونانی فکر کو اپنانے کا تعلق ہے کیا یہ حقیقت نہیں کہ مسلمانوں نے بھی اپنے علمی دور عروج میں اسے کچھ کم نہیں اپنایا تھا - بلکہ آج بھی ہمارے مذہبی مدارس میں یونانی فکر کسی نہ کسی شکل میں داخلِ نصاب ہے - باقی رہا رومی اجتماع و سیاست کو اختیار کرنے کا معاملہ، بے شک مسلمان اس سے محفوظ رہے لیکن انھوں نے اس کے بجائے ایرانی اجتماع و سیاست کو اپنایا - اور اتنا اپنایا کہ عباسی خلافت عربی کم اور ایرانی زیادہ ہوگئی تھی -

ہمیں یورپی معاشرے کی موجودہ ناہمواریوں اور بداخلاقیوں سے انکار نہیں اور اس بارے میں ہم سو فی صد مولانا سے اتفاق کرتے ہیں، لیکن آج یورپی معاشرے کی جو حالت ہے کچھ فرق کے ساتھ (جو بدلے ہوئے حالات اور خاص طور سے آج کی جیٹ اور ایٹمی زندگی کی تیز رفتاری کی وجہ سے) ایک زمانے میں بغداد، قاہرہ، دہلی، اور لکھنؤ وغیرہ کے معاشروں کی بھی یہ حالت رہ چکی ہے - اور یہ لازمی نتیجہ ہوتا ہے استعماری اور استحصال پسند نظام حکومت کا، یہی نظام اسلام سے پہلے ایران اور روم کا تھا - پھر چند صدیوں بعد مسلمانوں نے اسے اپنایا - اب یورپ اسی میں گرفتار رہا - یورپی معاشرے کی تمام خرابیوں کا سراغ یونانی کلچر اور رومی اجتماع میں لگانا ذرا دور کی کوڑی لانا ہوگا -

فاضل مصنف چاہتے ہیں کہ مسلمان انسانی تاریخ میں پہلے کی طرح پھر وہ رول ادا کریں جو انھوں نے چھٹی صدی عیسوی میں ادا کیا تھا، اور پھر وہ جاں بلب انسانیت کو نئی زندگی دیں - اور کون مسلمان ہے، جو دل سے یہ نہیں چاہتا، لیکن سوال یہ ہے کہ یہ کس طرح ہو؟ مولانا نے علامہ اقبال کی نظم "ابلیس کی مجلس شوریٰ" کا اقتباس دے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ بقول ابلیس کے

ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس امت سے ہے

جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرار آرزو

لیکن چند ہی صفحات بعد وہ کتاب کے آخر میں یورپ اور مسلمان قوموں کا مقابلہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں

اگر مغرب اب تک زندہ اور طاقتور ہے، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں کے لوگوں میں قومی سیاسی شعور اور فعّال احساس شہریت موجود ہے۔ وہاں شاذ و نادر ہی کسی کی اپنے ملک سے وفاداری کی خلاف ورزی یا قومی مفادات پر ذاتی اغراض کو ترجیح دینے کی خبریں سننے میں آتی ہیں، اس کے برعکس مسلم ممالک کے لیڈر اپنے عوام کی قسمتوں کا سودا کر کے بے کھٹکے جا سکتے ہیں۔ اور عوام بدستور ان کے حلقہ بگوش رہیں گے۔ اور ان کے حق میں نعرے لگائیں گے۔ یہ اس لئے کہ مسلمانوں کا طریقۂ فکر جامد ہو چکا ہے۔ اور ان کا سماجی شعور بالکل مردہ ہے۔"

زیر نظر کتاب میں اسلام سے قبل کی دنیا کے مفاسد کا بڑا واضح بیان ہے۔ اسلام نے جو اعلیٰ اخلاق کے حامل افراد اور گروہ پیدا کئے ان کا بھی اثر انگیز ذکر ہے۔ اور آج یورپ کا سماج جن بدعنوانیوں کا مرتکب ہے، انہیں بھی بڑی عمدگی سے پیش کیا لیکن مسلمانوں کا طریقۂ فکر جو بقول مصنف کے جامد ہو چکا ہے اس کا جمود کس طرح ٹوٹے، اور مسلمان عوام کا سماجی شعور جو خود مصنف کے نزدیک بالکل مردہ ہے، اس میں کیسے جان پڑے، موصوف نے اس ضمن میں کوئی رہنمائی نہیں کی۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحب نے یہ کتاب بڑے خلوص اور دل سوزی سے لکھی ہے، اس لئے اسے پڑھ کر آدمی بڑا متاثر ہوتا ہے۔ کتاب کی یہ خوبی اسکے انگریزی ترجمے میں بھی بدرجہ اولےٰ موجود ہے۔ اگر مولانا موصوف ان مباحث کو بھی جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے، شامل کر لیتے تو کتاب کی تاثیر اور افادیت اور بھی بڑھ جاتی۔

ضخامت ۱۷۰ صفحے، کاغذ اور طباعت اوسط سے بہتر، اور قیمت چار روپے ہے

ملنے کا پتہ۔ القادر۔ ۱۸، ایمپرس روڈ۔ لاہور۔ ۵

تذکرہ اولیائے لاہور

مولانا محمد وارث کامل
جن کا افسوس ہے پچھلے دنوں انتقال ہو گیا

زیر نظر کتاب کے مصنف میں، مرحوم ایک صاحب علم ادیب اور ممتاز انشا پرداز تھے۔ اور علوم دینی کے ساتھ ساتھ تصوف سے بھی انہیں غیر معمولی شغف تھا۔ آپ نے اس کتاب میں

۱۲۰ صوفیا، و اولیاء کے جن کا ایک ہزار سال سے کچھ زیادہ عرصے تک سرزمین لاہور سے تعلق رہا ہے، حالات جمع کئے ہیں - اس لحاظ سے زیر نظر کتاب ان دو کتابوں سے جو اسی موضوع پر انہی دنوں شائع ہوئی ہیں، جامع تر ہے اور اس میں ان سے کہیں زیادہ اولیائے کرام کے حالات آ گئے ہیں -
کتاب کے شروع میں لفٹیننٹ کرنل خواجہ عبدالرشید کا مقدمہ ہے، موصوف نے ایک جگہ بالکل صحیح لکھا ہے -

"لائق مصنف نے جگہ جگہ اولیاء اللہ کی کشف و کرامات کا ذکر کیا ہے یہ ایک ایسی بات ہے جس پر خود کبھی صاحب کشف نے زور نہیں دیا - اور ہمیں سزاوار نہیں کہ ہم بھی ان کو بے جا اہمیت دیں "

اتفاق سے کشف و کرامات کے ساتھ ضرورت سے زیادہ عقیدت ہمیشہ سے انسان کی کمزوری رہی ہے کیونکہ جیسا کہ خواجہ صاحب نے لکھا ہے - "انسان کا قاعدہ ہے کہ وہ محیر العقول حادثات کا متلاشی رہتا ہے. ان کو ان میں ایک عجیب قسم کی دلچسپی محسوس ہوتی ہے - اور وہ ہاتھ دھو کر ان کے پیچھے پڑ جاتا ہے" حالانکہ بقول ان کے "ایسی باتوں کی طرف توجہ نہیں دینا چاہیئے اصل بات جو ہے وہ ان کی تعلیمات ہیں اور اگر یہی انسان میں تغیر پیدا کر دیں تو یہ ان کا سب سے بڑا معجزہ ہے "

عجیب بات یہ ہے کہ اس کتاب میں اولیاء کی کشف و کرامات ہی کا زیادہ ذکر ہے اور ہمارے خیال میں مصنف مرحوم اس بارے میں معذور بھی تھے کیونکہ ان بزرگوں کے جو بھی سوانح حیات کتابی شکل میں ملتے ہیں ان میں تمام تر زور ان کی کشف و کرامات پر ہوتا ہے - اور اس موضوع پر کوئی بھی لکھنے والا انہیں نظرانداز نہیں کر سکتا - تذکرہ اولیائے لاہور کی یہ خصوصیت خاص طور سے قابل ذکر ہے کہ اس کے ۲۳۰ صفحات میں ہمیں برصغیر کے شمال کے ایک اہم مرکز کی ایک ہزار سال کی روحانی تاریخ کا ایک مختصر سا خاکہ مل جاتا ہے -

مصنف مرحوم نے "افتتاحیہ" میں تصوف کے موضوع پر مبسوط بحث کی ہے - اس ضمن میں آپ نے امام غزالی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :- "امام غزالی نے یہ حقیقت واضح کی کہ توحید ذات کا صحیح تصور تصوف کے بغیر ممکن نہیں ہے - آپ نے شریعت و طریقت کے ڈانڈے ملا دیئے .... فرماتے ہیں کہ

ایمان کا پہلا درجہ وہ ہے جس کے ذیل میں عوام آتے ہیں یعنی وہ عوام جن کے معتقدات کا دارومدار محض تقلید پر ہوتا ہے۔

۲۔ دوسرے درجے میں وہ علما آتے ہیں، جو دلائل و براہین کا سہارا ڈھونڈتے ہیں۔

۳۔ تیسرے درجے میں وہ ارباب حق شمار ہوتے ہیں، جو بلا کسی واسطے کے خدا کی ذات و صفات کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

مصنف مرحوم نے مطالب کو دلچسپ بنانے کے لئے شاعری سے کافی کام لیا ہے چنانچہ مادھولال حسین کے ذکر میں عشق کے باب میں مرزا داغ کے اشعار نقل کئے ہیں۔ اور حضرت داتا گنج بخش اور حضرت میاں میر کا بیان کرتے ہوئے علامہ اقبال نے ان بزرگوں کے بارے میں جو اشعار کہے تھے وہ بھی درج ہیں اس طرح یہ کتاب بڑی جاذب توجہ ہوگئی ہے۔ لیکن شروع سے لے کر آخر تک اس میں کتابت کی جو جو فاش غلطیاں ہیں، وہ بہت کھٹکتی ہیں مصنف نے صفحہ ۱۳۷ پر حضرت میاں میر صاحب کے ضمن میں "مرہٹوں کی سرکوبی" کا ذکر کیا ہے، واقعہ یہ ہے اس وقت تک اس فتنے نے سر نہیں اٹھایا تھا۔ اس لئے اقبال کے شعر "در دکن ہنگامہ ہا بسیار دار" کا اشارہ مرہٹوں کی طرف نہیں ہو سکتا۔

کتاب مجلد ہے۔ قیمت چھ روپے

ناشر مکتبہ ماحول ۹۔ بہادر شاہ مارکیٹ بندر روڈ کراچی

برگ نوخیز

(اردو زبان میں سانیٹ کا پہلا مجموعہ)

برصغیر پاک و ہند کے انتہائی جنوب مدراس میں "دار التصنیف" کے نام سے ایک اشاعتی ادارہ ہے، جس نے تمنائی عزیز کے سانیٹوں کا زیر نظر مجموعہ اس قدر خوبصورت اور دل آویز طریقے سے چھاپا ہے کہ ہر شاعر و ادیب اس پر رشک کرے گا اردو ٹائپ، طباعت، کاغذ اور جلد غرض ہر چیز اعلیٰ حسن ذوق کا ایک نمونہ ہے، اور جہاں تک اس مجموعے کے مواد شاعری کا تعلق ہے وہ بھی کچھ کم دل کو موہنے اور دماغ کو متاثر کرنے والا نہیں۔

اس سے پہلے اسی دار التصنیف مدراس نے "خانوادۂ قاضی بدرالدولہ" کے نام سے جناب

مولانا محمد یوسف کوکن ریڈر شعبہ عربی و فارسی و اردو مدراس یونیورسٹی کی ایک بلند پایہ علمی تحقیقی کتاب شائع
کی ہے، جو محض ایک علمی خانوادہ کی سرگزشت نہیں بلکہ وہ ایک مفصل صحیفہ ہے اُن علمی و دینی سرگرمیوں
کا جو شمالی ہند کے علمی مرکزوں سے دُور مدراس جیسے دور افتادہ علاقے میں عرصہ دراز تک برسرکار
رہیں۔ "خانوادۂ قاضی بدرالدولہ" مولانا محمد یوسف کے الفاظ میں "جنوبی ہند کا ایک مشہور و معروف
خاندان ہے، جو نویں صدی ہجری کی ابتدا سے لے کر مسلسل دین اور علم کی خدمت کرتا ہوا چلا آرہا ہے
تاریخ میں کوئی ایسا عالی شان خاندان نظر نہیں آیا جو اس طرح سترہ پشتوں سے اپنی علمی قدر و منزلت
کو قائم رکھتے ہوئے دین اور علم کی زریں خدمات کرتا چلا جارہا ہو۔۔۔ موجودہ دور میں ڈاکٹر
حمید اللہ حیدرآبادی) کئی مشہور کتابوں کے مصنف اور متعدد یورپی زبانوں کے ماہر حال مقیم پیرس
ا۔س) قاضی بدرالدولہ کے حقیقی پوتے ہیں"۔ [۱]

یہ صنفِ شاعری جو داخلی کیفیات کے اظہار کے لئے زیادہ موزوں ہے، کیونکہ اس میں غزل کی اشاریت
اس کا رچاؤ، اس کی گہرائی، اس کی پہنائی بھی موجود ہے۔ اور نظم کا تسلسل، اس کی ہم آہنگی اس کا داخلی اور
خارجی تناسب، اس کا محاکاتی انداز بھی۔ غزل اور نظم کی تمام اہم خصوصیات کا یہ حسین امتزاج سانیٹ کو
یک انوکھی خوبی ایک نرالی کشش عطا کرتا ہے۔"

سانیٹ دراصل غنائی داخلی شاعری کی ایک صنف ہے، جس کی ابتدا اطالیہ میں ہوئی، وہاں سے یہ فرانس
پہنچی، اور فرانس سے برطانیہ، پھر ہمارے ہاں کے بعض شعرا نے اس صنف کو اپنایا۔ گو اُس وقت
ان کا یہ تجربہ زیادہ کامیاب نہ ہوا، لیکن "برگِ نوخیز" پڑھنے سے محسوس ہوتا ہے کہ عزیز تمنائی کے یہ
سانیٹ اردو شاعری میں ایک نئے باب کا افتتاح کر رہے ہیں۔ اردو کے مشہور نقاد پروفیسر سید
احتشام حسین کتاب کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:۔ برگ نوخیز کے سانیٹوں میں جذبات اور محسوسات کا
اظہار تخیل اور فکر کی آمیزش کے ساتھ ہوتا ہے۔ ان میں شاعر کے وہ خیالات اور افکار ہیں۔ جو اسے
زندگی کے تجربوں سے حاصل ہوئے ہیں اور جنہوں نے اسے اظہار جذبات پر مجبور کیا ہے یہ خیالات

۱۔ اس کتاب پر آئندہ کبھی مفصل تبصرہ کیا جائیگا۔ مولانا محمد یوسف کی ایک اور کتاب امام ابن تیمیہ بھی شائع ہوچکی ہے۔

فنی، سیاسی، ذاتی اور مفکرانہ ہر قسم کے ہیں، لیکن جذبے نے ان میں ایسی داخلیت پیدا کر دی ہے کہ ایک طرح کے انفرادی رنگ کا احساس ہونے لگتا ہے۔"

یہ سانیٹ ہر موضوع پر ہیں، "شاعر کے بیدار اور خلّاق ذہن نے وقت کے قدموں کی" جو بھی آہٹ سنی اس کے تاثرات کو بڑے حُسن کارانہ طریقے سے پیکر شعر میں ڈھالا ہے۔ اور کہیں جذبے کو بے لگام نہیں چھوڑا ہے، بلکہ ہر جگہ خیال انگیزی کی کوشش کی ہے۔" جو اس بات کا ثبوت ہے کہ "شاعر کے پاس ایک سوچنے والا ذہن اور محسوس کرنے والا دل موجود ہے۔"

عدم گنجائش کی وجہ سے یہاں "برگ نوخیز" میں سے زیادہ اقتباس نہیں دیئے جا سکتے، صرف چند اشعار پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نعت کے شعر ملاحظہ ہوں۔

ہستی کو جس پہ ناز تھا وہ ہستیٔ عظیم
جس کا وجود باعث تخلیق کائنات
جس سے حریم ذات میں ہے جلوۂ صفات
وہ منتہا وہ منزل ہر راہ مستقیم
اُس حسن بے مثال کے اوصاف کیا کہوں
خیر البشر کہوں، اسے خیر الوریٰ کہوں

"نئی نسل" کا ایک بند :-

اوہام کی زنجیر میں پابستہ خرد ہے
دل میں اثرِ پیچ و خم گیسوئے تشکیک
ایمان و یقین فہم و ذکا، قابل تضحیک
آزادیٔ افکار کی شاید یہ سند ہے
تشکیک ہی بنیاد ترقی کی ہے شاید
ظلمات کا اک نام تجلی بھی ہے شاید

"رنگ" کے عنوان کا ایک سانیٹ ہے، جس میں گلشن میں رنگ بہ رنگ پھولوں کے کھلنے

کا ذکر ہے۔ شاعر کے الفاظ ہیں۔

مگر سب پھول ہیں گلشن کے اور سب کا ہے اک مالی

اس کے بعد کے شعر یا مصرعے ملاحظہ ہوں۔

وہ مالی جس نے ذرہ ذرہ گلشن کا نکھارا ہے
وہی خالق، وہی مالک، وہی حاکم، وہی قادر
وہی باطن، وہی ظاہر، وہی اوّل وہی آخر
وہی روحِ گلستاں ہے اسے ہر پھول پیارا ہے
سکھائے اس نے اک اک پھول کو آداب آفاقی
تعجب ہے کہ پھر بھی امتیازِ رنگ ہے باقی

الغرض سانیٹوں کا یہ پورا مجموعہ شاعر کے فکر انگیز جذبات اور فن کارانہ مہارت کا ایک دل آویز نمونہ ہے۔

کتاب میں کوئی ۱۰۹ سانیٹ ہیں، ضخامت ۱۱۰ صفحے۔ قیمت ڈھائی روپے
دارالتصنیف مدراس۔ ۱۴ نے اسے شائع کیا ہے۔

ا۔س

خدا کو کھو کے مردہ دل مسافرانِ وقت تھے
تڑپ تڑپ کے خود گلا وہ اپنا گھونٹنے لگے
حیات سوچتی رہی، بہار سوچتی رہی
چمن چمن میں روحِ برگ و بار سوچتی رہی
نہ جانے کب فروغ پائے گی نہادِ اضطراب
سوادِ شہر میں کب آئے گا خدائے انقلاب

"برگِ نوخیز"

افکار و آراء

محترمی ....

"الرحیم" کے تین شمارے ملے، میں نے آپ کے پرچے میں شائع ہونیوالے مضامین کو اتنی سنجیدگی اور احتیاط سے پڑھا ہے کہ بعض جگہ اعتراضات اور سوالات ذہن میں پیدا ہوتے۔ میں ایک مفصل مضمون آپ کے رسالے کے متعلق لکھنا چاہتا تھا مگر اس خیال سے باز رہا کہ آپ کو غلط فہمی ہوگی اور آپ سمجھیں گے کہ میں نکتہ چینی کر رہا ہوں۔ میں دینی علوم کے باب میں جاہل ہوں۔ تصوف کا مطالعہ تو درکنار، میں تو نام بھی چار چھ کتابوں کا جانتا ہوں۔ البتہ یہ آرزو رکھتا ہوں کہ علمائے راسخین مسلمانوں کی ہدایت کے لئے کچھ کریں۔ اگر مجھے آپ کے رسالے کے متعلق کچھ کہنے کا حق پہنچتا ہے تو صرف اس حد تک کہ میں مغرب سے تھوڑا سا واقف ہوں، اور جو لوگ عموماً اسلام کے متعلق لکھتے ہیں انہیں "مغربی علوم" اور مغرب کے کارناموں کے بارے میں بڑی خوش فہمیاں ہیں۔ یہ حضرات راکٹ اور مصنوعی سیارے کا تماشہ تو دیکھتے ہیں، مگر جو لوگ راکٹ چھوڑتے ہیں انہیں نہیں جانتے۔ مثلاً آپ کے رسالے میں یہ تقاضا بار بار سامنے آتا ہے کہ اسلامی علوم کو نئے "علوم" کا جامہ پہنایا جائے۔ میرے نزدیک سب سے خطرناک بات یہی ہے ان حضرات کی نیت تو ضرور نیک ہے، لیکن انہیں یہ معلوم نہیں کہ اس جامے کی تو اب دھجیاں بھی ہوا میں اڑ گئیں۔

میری تجویز یہ ہے کہ جہاں آپ اسلامی علوم کے بارے میں مضمون شائع کرتے ہیں، وہاں احتیاط کے ساتھ انتخاب کر کے چند مضامین (ترجمے ہی سہی) مغرب کے بارے میں بھی شائع کریں۔ اپنے پڑھنے والوں کو سائنس کے کرشمے دکھانے کے بجائے یہ بتائیے کہ یہ سائنس ہے کیا چیز، اور مغرب میں انسانی ذہن کس کس طرح گھل گھل کر ختم ہو رہا ہے۔ مثلاً دو مضمون اس وقت مجھے یاد آئے۔ ایک تو فرانسیسی شاعر کا

دوسرا مغرب میں انسانی زبان کے بتدریج خاتمے کے متعلق[1]۔

اس قسم کے مضمون اس لئے اور بھی ضروری ہیں کہ ہمارے یہاں جو لوگ دینی علوم جانتے ہیں وہ مغرب سے قرار واقعی آگاہی نہیں رکھتے۔

آپ کے مضمون نگار جن اصطلاحات کو از کار رفتہ سمجھتے ہیں، وہی تو اس دنیا میں یقینی چیز بن رہ گئی ہیں۔

دوسری بات مجھے یہ کہنی ہے کہ اگر آپ اسلامی علوم کو ایسی شکل میں پیش کرنا چاہتے ہیں جو آجکل کے لوگوں کی سمجھ کے مطابق ہو تو اوّل تو یہ کام صرف مجتہد کا ہے۔ دوسرے یہ کام فرانس کے چند مسلمان صوفی اتنی اچھی طرح کر چکے ہیں کہ ہم بڑے اطمینان کے ساتھ ان کی نقل کر سکتے ہیں۔ مگر افسوس یہ ہے کہ دنیا بھر کے مسلمان ان حضرات کے ناموں تک سے واقف نہیں، حالانکہ مستشرقین کو قابل استناد سمجھتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ اکیڈمی کو کم سے کم ایسی کتابیں اپنے کتب خانے میں جمع کر لینی چاہیئں۔ دس بارہ کتابوں کا ترجمہ تو انگریزی میں بھی ہو چکا ہے۔ مثلاً Rene Gnenon اور Frithj of Schnon کی کتابیں ہیں۔

امید ہے کہ میری یہ معروضات آپ کو ناگوار نہیں گزریں گی۔ اگر خدا نے مدد کی تو آپ کے رسالے کے لئے کچھ لکھوں گا۔

محمد حسن عسکری

کشمیر روڈ، کراچی

مکرمی . . . . .

شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ کا فکر اور ان کا مشن ملت اسلامیہ کا قیمتی سرمایہ ہے جس کی اشاعت اور حکیمانہ پیغام کو عام فہم انداز میں پیش کرنے کا جو مقصد ادارہ کی طرف سے ظاہر کیا گیا ہے اس سے ہمارے علمی حلقوں میں مسرت اور انبساط کا اظہار قدرتی امر ہے۔

اس سلسلے میں میں ایک دردناک حقیقت کے طرف دینی اداروں کے سرپرستوں کو "الرحیم" کی وساطت سے متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔ امید ہے کہ دینی اداروں کے "سربراہ" خوگر حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لیں گے۔

آج اس صدی کے گذشتہ نصف اوّل پر ایک اجمالی نگاہ ڈال لیں۔ تو ہمیں نظر آئے گا کہ

---

[1] غلطی سے نام رہ گئے ہیں۔

وہ دور ہماری نشاۃ ثانیہ کا روح پرور دور تھا۔ جس میں ہر طبقہ میں ہمیں ایسی باکمال اور برگزیدہ شخصیتیں نظر آتی ہیں جنہوں نے ہماری اجتماعی زندگی کے ہر شعبہ کو متاثر کیا تھا اور غیر منقسم ہند میں اسلامی علوم اور کلچر کی رفتار ترقی کو تیز تر کر دیا تھا چنانچہ ایک طرف مولانا شبلی، مولانا ابوالکلام آزاد، امام انقلاب مولانا عبیداللہ سندھی حضرت انورشاہ کشمیری، مولانا سید سلیمان ندوی مولانا امروہی اور مولانا کفایت اللہ وغیرہم تھے۔ اور دوسری طرف جدید تعلیم یافتہ طبقے میں علامہ اقبال، مولانا محمد علی۔ مولانا حسرت موہانی اور علامہ مشرقی ہیں جنہوں نے علم و فن، ادب و شعر، تہذیب و ثقافت میں بڑے گہرے نقوش چھوڑے۔ اور ہمارے فکر و تخیل میں بھی عظیم انقلاب پیدا کر دیا لیکن ان کے بعد اب ان کی جگہیں یکسر خالی ہیں۔ مجھے بتایا جائے کہ ہماری نئی نسل میں وہ شخصیتیں تو دور رہیں لیکن کیا ان سے ملتی جلتی شخصیتیں پیدا ہونے کی بھی کوئی توقع ہے جو صرف ان کی روایات حسنہ کو ہی باقی اور برقرار رکھ سکیں۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس سوال کا جواب اثبات میں نہیں ملے گا۔

یہاں اور شعبوں کے متعلق کچھ کہنا نہیں۔ البتہ علوم اسلامیہ و دینیہ کے بارے میں عرض کروں گا کہنے کو تو مدارس عربیہ آج ملک کے گوشے گوشے میں ہیں۔ جہاں مجموعی اعتبار سے ہزاروں طلبہ تعلیم پا رہے ہیں اور قوم کا لاکھوں روپیہ خرچ ہو رہا ہے لیکن حال یہ ہے کہ اس کے باوجود ان علوم کے ماہرین کا روز بروز قحط ہوتا جاتا ہے۔ یوں تو ہمارے مدارس کے فارغ التحصیل اور سند یافتہ حضرات آج ملک کے اکناف و اطراف میں پھیلے ہوئے ہیں لیکن ان میں کتنے ہیں، جن میں حقیقتاً علمی ذوق ہو۔ مطالعہ کا شوق ہو۔ وہ مسائل پر تحقیقی نظر رکھتے ہوں۔ اور کتب درسیہ کی بند کوٹھری سے باہر آکر اسلامی علوم و فنون کی غیر درسی کتابوں سے بھی کوئی واسطہ یا رابطہ رکھتے ہوں۔

اس میں شبہ نہیں کہ انہیں لوگوں میں بڑی اچھی استعداد رکھنے والے بھی ہیں لیکن بدقسمتی سے ہمارا ماحول ایسا بن گیا ہے کہ یہ لوگ اپنی استعداد سے کام لیکر نہ اپنے اوقات کو علمی تحقیق و تفتیش میں صرف کر سکتے ہیں اور نہ وہ علمی ذوق کو پروان چڑھا سکتے ہیں۔ اگر کوئی مدرس ہے تو اسے دن بھر میں آٹھ آٹھ نو نو مختلف مضامین کے سبق پڑھانے ہوتے ہیں، پھر چونکہ تنخواہ کم ہوتی ہے اس بنا پر اسے اخراجات پورا کرنے کے لئے درس کے علاوہ ٹیوشن، کسی مسجد کی امامت یا کوئی اور دھندا کرنا

پڑتا ہے۔ ظاہر ہے ایسا مصروف شخص اتنا وقت کہاں سے لا سکتا ہے کہ وہ غیر درسی کتابوں کا مطالعہ بھی جاری رکھ سکے۔

علمی انحطاط و تنزل کی یہ رفتار بہت ہی خطرناک ہے۔ اگر اس کی فوری اصلاح نہ کی گئی تو ممکن ہے ایک وقت ایسا آ جائے کہ ہمارے اسلاف کرام کے علمی خزانے تاریخ کا ایک گم شدہ ورق ہو کر رہ جائیں اور کوئی بھی ایسا نہ ہو جو ان کے نام سے بھی آشنا ہو، لاریب ایسا دن ہماری قوم اور ملت کی تہذیب کی موت کا دن ہوگا اور ایک قوم کی تہذیب اور علمی سرمایہ کی موت خود اس قوم کی موت ہے۔ اس بنا پر شاہ ولی اللہ اکیڈمی کے ارکان اور دوسرے دینی اداروں کے سربراہ حضرات کا فرض ہے کہ وہ اس طرف متوجہ ہوں اور قبل اس کے ہم پر تباہی مسلط ہو، ہم اس سے تحفظ کا سروسامان کر لیں ورنہ ؎

ڈر ہے کہیں یہ نام بھی مٹ جائے نہ آخر
مدت سے اسے دورِ زماں میٹ رہا ہے

راقم الحروف کو سندھ کے اکثر مدارس میں جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ بعض مدارس میں بحیثیت ایک ممتحن کے بھی گیا ہوں اور اس طرح مجھے قابل ذکر مدارس دینیہ کے ممتاز اساتذہ سے ملنے اور اس بارے میں گفت گو کرنے کا شرف بھی حاصل ہوا ہے۔ میں نے اپنا یہ عندیہ بارہا سندھی اور اردو اخبارات میں بھی ظاہر کیا ہے۔ اس کی وجہ سے مجھے مدارس کے مہتمم اور اساتذہ کی طرف سے مدح و ذم سننے کا بھی سابقہ پڑا ہے لیکن تا حال مدارس میں کسی قسم کی گرمی یا ولولہ کا دُور دُور تک کوئی نشان نہیں ملتا۔

پچھلے کئی سالوں سے "وفاق المدارس" کے نام سے دینی اداروں کی تنظیم بھی عمل میں آئی ہے۔ لیکن وہ تنظیم بس برائے نام ہے۔ وفاق نے بھی اس ضمن میں اب تک کوئی قابل قدر یا حوصلہ افزا قدم نہیں اٹھایا ہے حالانکہ اس وفاق میں مولانا سید محمد یوسف بنوری، مولانا خیر محمد، مولانا شمس الحق افغانی اور مولانا مفتی محمد شفیع جیسے متبحر عالم موجود ہیں۔ جو اگر چاہیں تو بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ مجھے وفاق کے ایک جلسہ میں بھی حاضری کا شرف حاصل ہوا ہے مگر افسوس ہے کہ مجھے وہاں کسی خوش آئند

مستقبل کا کوئی سراغ نہیں ملا۔

حال ہی میں انھوں نے مولانا غلام مصطفیٰ صاحب قاسمی کو نصاب کمیٹی میں شامل کیا ہے۔ ممکن ہے مولانا قاسمی صاحب کی مساعی سے یہ وفاق کوئی جاندار پروگرام مرتب کر سکے میرے نزدیک اگر وفاق مولانا افغانی، مولانا بنوری، مولانا مفتی محمد شفیع، مولانا احتشام الحق۔ اور مولانا قاسمی وغیرہم پر مشتمل اسلامی تحقیقات کا کوئی مستقل شعبہ قائم کرے تو اس کے نتائج خاطر خواہ برآمد ہو سکتے ہیں۔ ایک ایسا شعبہ جس میں اسلامی علوم و فنون کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابوں کا بڑے سے بڑا ذخیرہ فراہم کیا جائے اور فارغ التحصیل طلبہ میں سے دو چار ہونہار ذہین محنتی اور صاحب ذوق طلبہ کا انتخاب کر کے ان سے کسی بڑے عالم اور محقق کی نگرانی میں اس میں کام کرایا جائے۔ اس میں ہر طالب علم کو کم از کم سو روپیہ ماہوار وظیفہ دیا جائے اور اس کے ذوق اور صلاحیت کے مطابق کسی ایک موضوع کا انتخاب کر کے اس پر اس سے ریسرچ کرائی جائے اور اس شعبہ میں کام کرنے کی مدت کم از کم تین سال رکھی جائے۔ اس کے علاوہ اس کی بھی ضرورت ہے کہ سال میں مدارس عربیہ کا کسی جگہ پر ایک سیمینار کیا جائے جس میں مختلف علوم و فنون کے ماہر اساتذہ شریک ہو کر مختلف مباحث پر لیکچر دیں۔ بحث و مباحثہ اور مذاکرہ کریں اور اس طرح طلبہ میں علمی ذوق کی تربیت اور اس کی آبیاری کریں۔ یہ کام مدرسہ مظہر العلوم، جامعہ اسلامیہ نیوٹاؤن کراچی دار الفیوض الہاشمیہ سجاول، اشرف العلوم ٹنڈو الہ یار، خیر المدارس ملتان اور دار الہدیٰ ٹھیڑی کے اکابر آسانی سے کر سکتے ہیں۔

میرے خیال میں اس کام کو لازمی طور پر ہونا چاہیئے۔ مولانا بنوری، مولانا حاجی عبداللہ سجاولی، مولانا مفتی محمد شفیع، مولانا احتشام الحق تھانوی، مولانا خیر محمد اور مولانا افغانی کی ادنیٰ توجہ اور دلچسپی سے اس کام کا سرانجام پا جانا چنداں مشکل نہیں۔ خدانخواستہ اگر یہ نہ کیا گیا تو مدارس کی یہ زبوں حالی ایک بدتر مستقبل کی نشاندہی کرتی ہے۔ جب کہ ان کے طلبہ اور اساتذہ کو دیکھ کر بے اختیار یہ شعر زبان پر آجایا کرے گا

اے جسم محرم وہ تری روح کہاں ہے
اے تعزیہ تو کس کے جنازہ کا نشاں ہے

اللہ ورایہ بردہی۔ مدرسہ مظہر العلوم کھڈہ کراچی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ برکاتہٗ

آپ کا ادارہ ایک بہت ہی بڑی دینی اور علمی خدمت انجام دے رہا ہے۔ موجودہ ماحول میں شاہ ولی اللہ کی تعلیمات کی نشر واشاعت کو ایک اہم اور ضروری خدمت تصور کرتا ہوں۔ اسلامی تعلیمات سے متعلق شاہ صاحب کے اساسی تصورات انسانی فطرت کے تقاضوں کو بدرجۂ اتم پورا کرتے ہیں خصوصاً موجودہ دور کا انسان ان کی تصنیفات کو پڑھ کر ذہنی، دماغی، اور روحانی آسودگی حاصل کرسکتا ہے اور اسلام کے مزاج کو ٹھیک طور پر سمجھ سکتا ہے ان کا انداز بیان نہایت دلکش اور جاذب نظر ہے شاہ صاحب کے علمی اور مذہبی کارناموں پر آج ریسرچ کی سخت ضرورت ہے۔ الحمد اللہ کہ آپ کا ادارہ اس ضرورت کو پورا کر رہا ہے مجھے امید ہے کہ علم دوست حضرات اس اکیڈمی کے ساتھ عملی تعاون فرمائینگے۔ میری دعا ہے کہ آپ کی اور آپ کے رفقائے کار کی کوششیں بارآور ثابت ہوں۔ آمین۔

حبیب خاں عمری - آرٹس کالج مدراس

....

امام المفکرین حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ وہ مقدس بزرگ ہیں، جن کی مثال نہیں ہے۔ اور آپ کے بعد سید جمال الدین افغانی سیاسی جہاد میں بے مثل ہیں۔ مُردہ اور باغی مصر کو زندہ کردیا اور عالم اسلام کا امام بنادیا۔ مصری قوم میں صلاحتیں تھیں اس لئے امام وقت کی پیروی میں چار چاند لگ گئے۔ اس راہ میں اور سلسلۂ تراجم میں میں آپ کا ہم نوا انشاء اللہ تعالیٰ رہونگا۔

مولانا غلام مصطفےٰ صاحب سے میری امیدیں زیادہ وابستہ ہیں اس لئے کہ وہ اس راہ پر گامزن ہیں۔ تفہیمات الہیہ کے شروع ۹ صفحات کا ترجمہ میں نے کیا ہے جو بصائر میں شائع ہو چکا ہے۔ اور کتاب الخراج امام ابویوسف کا ترجمہ بھی کر رہا ہوں جو دو ایک ماہ میں انشاء اللہ ختم ہو جائے گا۔

حضرت شاہ صاحب کے افکار اساتذہ کے لئے مرشد راہ ہیں اور ترویج عربیت عوامی اصلاحی فکر ہے اور ہم جس عہد میں ہیں، اس میں جھوٹے دجاجلہ ہر رنگ و بو میں نمودار ہیں اور یہودی دجال کا وقت دیوارِ گریۂ فلسطین کے زیر سایہ سر پر آگیا ہے۔ ضرورت ہے کہ بہت تیزی سے بیدار ہوں اور

انتہائی ایثار سے آگے بڑھیں اور یہ تیاری جہاد وقت کی تیاری ہے جس کے لئے امت مسلمہ پیدا کی گئی ہے۔

مقصود علی خیرآبادی
ناظم آباد کراچی

محترم.....

السلام علیکم۔ میں بھی آپ کا رسالہ الرحیم پڑھنے والوں میں سے ہوں۔ اس مرتبہ اتفاق سے ماہ اگست کا شمارہ پڑھنا نصیب ہوا۔ "افکار آرا" میں جناب فقیر بخش بگٹی کا خط بھی نظر سے گذرا عالم مثال و عالم ارواح بہت زیادہ تشریح طلب موضوع ہیں۔ یہاں اس کی گنجائش نہیں۔ مختصراً عرض کرتا ہوں اگر کسی مادی یا غیر مادی شے کا وجود ہی نہ ہو تو اس کا وجود میں آجانا کوئی معنی نہیں رکھتا وجود میں صرف وہی چیز آسکتی ہے جس کا وجود پہلے سے ہو انسانی دماغ ایک محدود حد تک کام کرتا ہے اس حد سے آگے عقل سر پٹکنے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتی۔ ذہن انسانی میں ایک تصویر ابھرتی ہے اور جب تک اسے مادی شکل میں نہ لایا جائے، دیکھا نہیں جاسکتا، ذہن میں کسی شے کا تصوّر اور پھر مادی طور پر اسکی حقیقت مختلف مرحلے ہیں۔ ہماری ترقی یافتہ دنیا کی ہر شے ان تصورات خیالی کی مرہون منت ہے جو ذہن انسانی میں ابھرے اور انسان نے اسے ٹھوس شکل میں تبدیل کرنا چاہا (یا کردیا)

کیا یہ ممکن ہے کہ ایک مصوّر بلا خیالی تصوّر کے کسی تصویر کو جنم دے سکے؟ نہیں۔ ہرگز نہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نئی نئی باتوں کے خیالی تصورات کیسے اور کہاں سے پیدا ہو جاتے ہیں جب کہ کسی مادی یا غیر مادی شے کا وجود ہی نہ ہو۔ ہم اپنے ذہن میں ایک خوبصورت کوٹھی کا تصور کرتے ہیں بتایئے.. یہ کوٹھی جو آپ کو تصور میں دکھائی دے رہی ہے مادی ہے یا غیر مادی؟ آخر یہ کونسی دنیا ہے جس میں ہم اسے دیکھ رہے ہیں۔ انسان اپنی اس خیالی دنیا کا محتاج محض ہے۔ اس کے بغیر وہ کچھ نہیں کر سکتا اسے اس عالم سے نقشے مانگنے پڑتے ہیں۔ لیکن جس عالم میں ہم اس کوٹھی کو دیکھ رہے ہیں اس سے پرے بھی ایک عالم ہے جہاں سے یہ تصوّر آپ کے دماغ میں پہنچا یہی عالم مثال ہے۔

آغا عبدالرزاق۔ کوئٹہ

محترمی ....

اگست کے شمارے میں جناب فقیر بخش بگٹی صاحب کا خط پڑھا، جس میں انہوں نے "عالم مثال" اور "عالم ارواح" پر اپنے شکوک کا اظہار کرتے ہوئے ان مشکلات کی طرف اشارہ کیا ہے، جو شاہ ولی اللہ صاحب کے فلسفے کی تشریح کے سلسلے میں پیش آسکتی ہیں۔ صاحب موصوف کے ان خدشات کے برمحل ہونے پر مجھے ایک حد تک اتفاق ہے، اور گزشتہ تاریخ اس امر کی شاہد بھی ہے۔ لیکن اس ضمن میں میں جناب فقیر بخش صاحب سے یہ عرض کروں گا کہ مسئلہ وحدت الوجود و وحدت الشہود بنفسہ شاہ صاحب کے فلسفے کا بنیادی مسئلہ نہیں بات یہ ہے کہ شاہ صاحب کے زمانے میں مسلمانوں کے ارباب فکر اس مسئلے میں بڑا انہماک رکھتے تھے اور یہ ان کے ہاں مسئلۃ المسائل یعنی سب مسئلوں میں سے بڑا مسئلہ بنا ہوا تھا۔ شاہ صاحب کو بھی لازماً اس مسئلے پر بحث کرنا پڑی، لیکن اس بارے میں اصل چیز وحدت الوجود کی وہ تعبیر ہے، جو شاہ صاحب نے کی اور اسے اساس بنایا اپنے وحدت ادیان کے تصور کا۔

چنانچہ حجۃ اللہ البالغہ کے ایک باب کا عنوان ہے :۔ "تمام مذاہب وادیان کی اصل ایک ہے، شرائع مناہج۔ طریقے مختلف ہیں"۔ اس باب میں شاہ صاحب لکھتے ہیں :۔ "معلوم ہونا چاہیئے کہ اصل دین ایک ہے، اور تمام انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام اس پر متفق ہیں۔ .... وہ خاص خاص صورتیں اور مخصوص ہیئتیں جن پر مختلف قسم کی نیکیوں اور تدابیر نافعہ و معاش اور امور معاشرت کی آسانیوں اور سہولتوں کی عمارت قائم کی جاتی ہے، انہی کا نام شریعت اور منہاج ہے"

وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے باہمی فکری نزاع جو اُس وقت بڑے زوروں سے چل رہا تھا، شاہ صاحب کا اول الذکر کو اپنانا اور اس کی ایسی تعبیر کرنا جس سے وحدتِ ادیان کا اثبات ہو، یہ شاہ صاحب کا اصل بنیادی فکر ہے۔ اگر بگٹی صاحب کے پیش نظر اُس عہد کی ہندوستانی تاریخ ہوتی اور وہ جانتے کہ اورنگ زیب عالمگیر کے دور حکومت میں اور اس کے بعد برصغیر میں مذہبی نزاع کتنی خطرناک صورت اختیار کر گیا تھا تو وہ شاہ ولی اللہ صاحب کی اس دعوتِ وحدت الوجود پر اتنے خشمگیں نہ ہوتے، اور وہ اسے ان کا ایک فکری کارنامہ سمجھتے۔

باقی رہا "عالم مثال" یا "عالم ارواح" کا معاملہ تو یہ درحقیقت شاہ صاحب کا اِس عالم اور ماورائے عالم

کے متعلق ایک کشفی وجدان ہے اور جہاں تک اس قبیل کے کشفوں کا تعلق ہے، خود شاہ صاحب ان کے التباس کے قائل ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ اگر یہ کشوف ارشاداتِ نبوت کے مطابق نہ ہوں، تو یہ حجت نہیں ہو سکتے۔ بہر حال عالم غیب اور قدرت کی لامتناہی تخلیق کے بارے میں انسانی ذہن ہمیشہ سے سرگرداں رہا ہے اور اس کی حقیقت کے ادراک کے لئے اس نے تخیل سے کام لیا ہے۔ عالم غیب کے بارے میں شاہ صاحب کے ان تصورات کو بھی اسی سلسلے کی کڑی سمجھنا چاہیئے۔ عالم غیب یا اس لامتناہی تخلیق کے طلسم کو حل کرنے کے لئے انسان نے ہمیشہ خیال ہی سے کام لیا ہے اب یہ خیال کہاں تک عمل اور صالح عمل کی قوتوں کو بروئے کار لانے کا سبب بنتا ہے، یہ چیز معیار ہوتی ہے اس خیال کے مفید یا غیر مفید ہونے کی، ہمیں عالم غیب کے متعلق ان تصورات کو اس نظر سے دیکھنا چاہیئے۔ اس وقت دنیا میں دو نظام ہائے حیات بڑے نمایاں ہیں، اور ان دونوں کی اساس لادینی فلسفہ ہے۔ ایک تو امریکہ کا نظام حیات ہے۔ اور دوسرا روس کا۔ ان دونوں کے پیش نظر مظلوم و مقہور انسانوں کی خوش حالی اور محکوم قوموں کی آزادی تھی۔ اب اس سے ایک حد تک عہدہ برآ ہونے کے بعد وہ ایک ایسے نظریے کی تلاش میں ہیں، جو مادی زندگی کے ماوراء، جو غیر مادی زندگی ہے، اس پر بھی حاوی ہو سکے اور یہ اس لئے کہ اگر انسانوں کو تمام دنیاوی آسائشیں میسر آجائیں، جو کہ امریکی و روسی نظام ہائے حیات کا مقصود ہے تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کے بعد کیا ہوگا اور انسانیت کدھر جائے گی؟ آخر اس زندگی کی جو فنا پذیر ہے، کوئی نہ کوئی تو فلسفیانہ تشریح ہونی چاہیئے۔ یہ تشریح ظاہر ہے کسی نظریے ہی سے ہوگی۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے اسلام کی اساس پر اس مادی اور ماوراء مادی زندگی کی ایک تشریح پیش کی ہے۔ یہ تشریح کس حد تک قابل اعتنا ہے؟ اس کا معیار صرف یہی ہو سکتا ہے کہ اس سے ایک فعّال عقیدے اور صالح عمل کو تقویت ملتی ہے یا نہیں۔ میرے نزدیک موجودہ دور میں مسلمانوں کی پستی اور زوال کے منجملہ اور اسباب کے ایک سبب یہ بھی ہے کہ ان کے ہاں ایک ایسے نظریئے کا فقدان ہے، جو ایک فعّال عقیدے اور صالح عمل کا موجب ہو۔

عمر فاروق — ملک پورہ مانسہرہ۔ ہزارہ

"الرحیم" کے توسط سے حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے افکار و تعلیمات سے متعارف ہوا ہوں۔ مجھے تصوف سے خصوصی شغف ہے۔ اور میں اس موضوع میں کافی پڑھتا رہتا ہوں ان دنوں جناب اعجاز الحق قدوسی کی ایک کتاب "تذکرہ صوفیائے پنجاب" پڑھنے کا موقع ملا، اس میں ہمارے علاقے کے مشہور صوفی بزرگ حضرت پیر سید مہر علی شاہ گولڑوی مرحوم کا بھی ذکر ہے۔ مجھے یہ پڑھ کر تعجب انگیز مسرت ہوئی کہ حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب قبلہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے بڑے معتقد تھے اس سلسلے میں مصنفِ کتاب نے حضرت پیر صاحب مرحوم کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:-

> اپنے تبحر علمی کے اعتبار سے سید مہر علی شاہ صاحب پنجاب کے ممتاز ترین علماء میں سے تھے آپ کے ملفوظاتِ طیبہ کے نام سے شائع ہوئے ہیں آپ کی وسعت نظر، تبحر علمی، وسعت معلومات اور حقائق و معارف کے شاہد ہیں

پیر سید مہر علی شاہ کو حضرت شاہ ولی اللہ سے بے حد عقیدت تھی۔ ایک جگہ حضرت شاہ صاحب سے اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا۔

> کمالات شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی مرحوم بحد غایت کمال رسیدہ اند۔ در علم ظاہر و باطن نظیر خود، خود گزاشتہ اند
>
> شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی مرحوم کمال کی اس حد تک پہنچے ہوئے ہیں کہ علوم ظاہر و باطن میں وہ اپنی نظیر آپ ہی تھے

نظریہ وحدت الوجود پر بھی غیر معمولی بصیرت رکھتے تھے۔ شیخ ابن عربی کی مشہور کتاب فصوص الحکم کا باقاعدہ درس دیتے تھے۔

محمد صادق

راجہ بازار۔ راولپنڈی

محمد سرور پرنٹر پبلشر نے سعید آرٹ پریس حیدرآباد سے چھپوا کر شائع کیا

مطبوعات شاہ ولی اللہ اکیڈمی

☆

لمحات (عربی)

شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے فلسفہ تصوف کی یہ بنیادی کتاب عرصے سے نایاب تھی - مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی کو اُس کا ایک پرانا نسخہ، جو اغلاط سے پُر تھا، ملا - موصوف نے بڑی محنت سے اس کی تصحیح کی، اور شاہ صاحب کی دوسری کتابوں کی عبارات سے اُس کا مقابلہ کیا - اور وضاحت طلب امور پر تشریحی حواشی لکھے - کتاب کے شروع میں مولانا کا ایک مبسوط مقدمہ ہے -

شاہ صاحب نے اس کتاب میں ''وجود'' اور اُس سے کائنات کا جس طرح صدور ہوا ہے، اُس پر بحث کی ہے، اور اپنی الٰہیاتی حکمت کے دوسرے مسائل بھی بیان کئے ہیں - قیمت دو روپے

—— : o : ——

شاہ ولی اللہ کی تعلیم

از پروفیسر غلام حسین جلبانی سندھ یونیورسٹی

پروفیسر جلبانی ایم اے صدر شعبہ عربی سندھ یونیورسٹی کے برسوں کے مطالعہ و تحقیق کا حاصل یہ کتاب ہے، اس میں مصنف نے حضرت شاہ ولی اللہ کی پوری تعلیم کا احصاء کیا ہے، اور اُس کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل بحثیں کی ہیں - اُردو میں شاہ صاحب کی تعلیم پر یہ پہلی جامع کتاب ہے -

کتاب مجلد ہے - قیمت ۷ء۵۰ روپے ہے

شاہ ولی اللہ اکیڈمی - صدر - حیدر آباد - پاکستان

Monthly "AR-RAHIM" Hyderabad Regd. S. No. 2548

شاہ ولی اللہ اکیڈمی

اغراض و مقاصد

۱- شاہ ولی اللہ کی تصنیفات اُن کی اصلی زبانوں میں اور اُن کے تراجم مختلف زبانوں میں شائع کرنا۔

۲- شاہ ولی اللہ کی تعلیمات اور ان کے فلسفہ و حکمت کے مختلف پہلوؤں پر عام فہم کتابیں لکھوانا اور اُن کی طباعت و اشاعت کا انتظام کرنا۔

۳- اسلامی علوم اور بالخصوص وہ اسلامی علوم جن کا شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتبِ فکر سے تعلق ہے، اُن پر جو کتابیں دستیاب ہو سکتی ہیں اُنہیں جمع کرنا، تاکہ شاہ صاحب اور اُن کی فکری و اجتماعی تحریک پر کام کرنے کے لئے اکیڈمی ایک علمی مرکز بن سکے۔

۴- تحریک ولی اللّٰہی سے منسلک مشہور اصحاب علم کی تصنیفات شائع کرنا، اور اُن پر دوسرے اہلِ قلم سے کتابیں لکھوانا اور اُن کی اشاعت کا انتظام کرنا۔

۵- شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتب فکر کی تصنیفات پر تحقیقی کام کرنے کے لئے علمی مرکز قائم کرنا۔

۶- حکمت ولی اللّٰہی اور اُس کے اصول و مقاصد کی نشر و اشاعت کے لئے مختلف زبانوں میں رسائل کا اجرا

۷- شاہ ولی اللہ کے فلسفہ و حکمت کی نشر و اشاعت اور اُن کے سامنے جو مقاصد تھے- اُنہیں فروغ دینے کی غرض سے ایسے موضوعات پر جن سے شاہ ولی اللہ کا خصوصی تعلق ہے، دوسرے مُصنفوں کی کتابیں شائع کرنا

شاہ ولی اللہ اکیڈمی کا علمی مجلہ
الرحیم
ماہنامہ
شعبۂ نشر و اشاعت شاہ ولی اللہ اکیڈمی ۔ صدر حیدرآباد
جمادی الاخر ۱۳۸۳ھ
نومبر ۱۹۶۳ء

مجلسِ ادارت

ڈاکٹر عبدالواحد ہالے پوتا،

مولانا غلام مصطفےٰ قاسمی،

مخدوم امیر احمد،

مدیر:

محمد سرور،

قیمت سالیانہ:- آٹھ روپے   فی پرچہ:- پچھتر پیسے

جلد ۱ جمادی الآخر ۱۳۸۳ مطابق نومبر ۱۹۶۳ء نمبر ۶

فہرست مضامین

○

کتبہ :- عبد المجید

شذرات

اس برصغیر میں مسلمانوں کی اپنی ایک اسلامی و قومی آزاد مملکت کے معرض وجود میں آنے کی وجہ سے انہیں پہلی بار اپنے تمام سیاسی، معاشی، اجتماعی، اور دینی مسائل سے جمہوری طریقہ کار پر عہدہ برآ ہونے کا موقع ملا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں کو اپنی طویل تاریخ میں اس طرح کے مسائل سے برابر سابقہ پڑتا رہا ہے۔ اور ان سے وہ نمٹتے بھی رہے ہیں، لیکن اُن ایام میں آخری فیصلہ کن طاقت مسلمان جمہور کی نہیں ہوتی تھی۔ ان مسائل کے بارے میں خلفا و سلاطین اور ان سے متعلق علماء جن فیصلوں پر پہنچتے، ان کا عملی نفاذ کردیا جاتا، اور جمہور انہیں طوعاً وکرہاً مان لیتے۔ اگر کسی گروہ کو اختلاف ہوتا اور وہ ہیئتِ حاکمہ کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کو تیار نہ ہوتا، تو وہ ایک مذہبی فرقہ کی شکل اختیار کر لیتا۔ پھر وہ اپنے الگ اور مستقل وجود کو قائم رکھنے اور دوسروں سے اسے منوانے کے لئے جدّو جہد کرتا رہتا۔ تاریخ اسلام کے مختلف ادوار میں مسلمانوں میں اکثر مذہبی فرقے اس طرح بنے اور امت ہفتاد و دو گروہوں میں یوں تقسیم ہوئی۔

اب اتفاق سے یہ صورت نہیں رہی۔ دنیا کے ہر حصّے میں مسلمانوں کی قومی و جمہوری مملکتیں وجود میں آرہی ہیں، جن میں قومی حکومتوں کے نظم و نسق کو حتی الوسع زیادہ سے زیادہ اپنے جمہور کی مرضی اور ان کی پسند اور ناپسند کو ملحوظ رکھنا پڑتا ہے۔ اور یہ کہ "السلطان ظل اللہ" ہے اور اس کی اطاعت خداوند تعالےٰ

کی اطاعت ہے، یہ تصور عوام مسلمانوں کے ذہنوں سے ختم ہوگیا ہے۔ اب لامحالہ ایک اسلامی مملکت کی ہیئت حاکمہ کو جمہور مسلمانوں کے رجحانات، ان کی انفرادی و اجتماعی ضرورتوں اور ان کے مصالح و مفادات کا خیال کرنا ہوگا اور اسی کے پیش نظر اپنی ملکی و انتظامی پالیسیاں بنانا ہوں گی۔ آج کے دور میں کاروبار حکومت میں جو روز بروز قومی زندگی کے ہر شعبے پر حاوی ہوتا جارہا ہے، رائے عامہ کا عمل دخل برابر بڑھ رہا ہے اور کوئی بھی ہیئت حاکمہ خواہ وہ براہ راست نمائندہ اداروں سے آئینی طور پر کتنی آزاد کیوں نہ ہو، رائے عامہ کی مرضی کے خلاف قانون سازی نہیں کرسکتی اسے بالواسطہ یا بلاواسطہ اپنے جمہور کے ردِ عمل کا لحاظ کرنا پڑتا ہے۔ اور اس کے مطابق اپنی پالیسیاں وضع کرنا پڑتی ہیں

اس کے ساتھ ساتھ انہی دنوں دوسرے اسلامی ملکوں کی طرح پاکستان میں بھی ایک اور صورت حال بروئے کار آرہی ہے، اور وہ یہ کہ مملکت کے دفاع، اس کے سیاسی استحکام، اس کی معاشی تعمیر و ترقی اور معاشرتی فلاح و بہبود کی ضرورتیں اس امر کی متقاضی ہیں کہ اس کے بسنے والے عوام میں زیادہ سے زیادہ جذباتی ہم آہنگی ہو وہ اپنے آپ کو ایک وحدت سمجھیں اور سب مل کر اس مملکت کو جس کے وہ برابر کے شہری ہیں، اور نہ صرف وہ اس کے اقتدار میں شریک ہیں بلکہ اس کا استحکام ان کی حفاظت کا ضامن اور اس کی خوش حالی خود ان کی خوش حالی ہے۔ مضبوط بنائیں اور اسے مستحکم بنیادوں پر کھڑا کریں۔ اس میں ان کا بھلا ہے ان کی آئندہ آنے والی نسلوں کا بھلا ہے۔ اور اسی سے ان کا تمام تر مستقبل وابستہ ہے

گزشتہ صدیوں میں مسلمانوں میں مختلف مذہبی فرقوں کا کس طرح ظہور ہوا۔ اس کے کون سے سیاسی، تاریخی اور فکری اسباب تھے اور ان فرقوں کی آپس میں کیا کیا چپقلشیں ہوئیں، اس بحث میں پڑے بغیر جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، آج ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ ہر اسلامی مملکت کی ملکی و قومی ضرورتیں اس کے عوام کو مجبور کررہی ہیں کہ وہ عہد ماضی کے فرقہ وارانہ اختلافات سے قطع نظر کرکے فکری و عملی ہر دو لحاظ سے متحد ہوں، اور جن مسائل سے انہیں دوچار ہونا پڑ رہا ہے انہیں حل کرنے کی کوششیں کریں ان مسائل کے صحیح حل ہی پر ان کی زندگی کا انحصار ہے اور یہ کسی ایک گروہ سے خاص نہیں بلکہ مملکت کے سارے باشندوں کو بحیثیت مجموعی ان سے سابقہ پڑتا ہے اور وہ تمام مل کر ہی ان سے نمٹ سکتے ہیں

ان حالات میں اس قسم کی علیحدگی پسند مذہبی فرقہ پرستی سے، جس کی وجہ سے سب مسلمانوں کو ایک جیسا مسلمان سمجھنے کے بجائے ان کے درمیان کفر و اسلام کی دیواریں کھڑی کی جایئں، آج اگر ہر فرقے کے باشعور طبقوں میں ایک عام بیزاری پائی جاتی ہے، تو یہ چنداں غیر متوقع نہیں۔ اب انفرادی و اجتماعی اور ملکی و قومی ضرورتیں تو ایک مملکت کے تمام مسلمانوں کے اتحاد و اتفاق کا مطالبہ کرتی ہیں اور یہ علیحدگی پسند فرقہ پرستی ہے، جو ان میں افتراق و انشقاق پیدا کرنے کی داعی ہے۔ ظاہر ہے یہ تضاد زیادہ دیر تک نہیں چل سکتا۔ اسلامی و قومی اتحاد و اتفاق کی قوتیں یقیناً زور پکڑیں گی اور ان کے سامنے علیحدگی پسند فرقہ پرستی کو پسپا ہونا پڑے گا۔

خوشی کی بات یہ ہے کہ پاکستان کے مختلف مذہبی فرقوں کے باشعور طبقوں میں آج کل اس قسم کا رجحان پیدا ہو رہا ہے اور وہ یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ یہاں اسلامی عقائد اور اصول و مبادی کی ایک ایسی عمومی وحدت ہونی چاہیئے، جو تمام فرقوں کے مسلمانوں کو اپنے اندر لے سکے، اور وہ مختلف فرقوں میں رہتے ہوئے جن کی کہ اپنی اپنی جگہ ایک تاریخی حیثیت ہے، اسلام کی بڑی وحدت میں آسکیں اور اس طرح وہ سب ایک ہو کر اس مملکت اور اس قوم کی ترقی و سربلندی میں کوشاں ہوں۔

آج ضرورت اس رجحان کو تقویت دینے اور اس کے لئے فکری و علمی و تعلیمی سازگار فضا پیدا کرنے کی ہے مادی و تاریخی حالات تو اس رجحان کے حق میں ہیں ہی بے شک ہر فرقے کی اپنی اپنی مذہبی تنظیمیں قائم رہیں، اور ان کی مخصوص مذہبی تعلیم کے ادارے بھی کام کرتے رہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ اگر مذہبی تعلیم کی اس طرح کی جامعات بھی قائم ہوں جیسی کہ پچھلے دنوں محکمۂ اوقاف مغربی پاکستان نے بہاولپور میں قائم کی ہے۔ تو ہمارے خیال میں اس سے اسلامی یگانگت اور قومی وحدت کے رجحان کو بڑی مدد ملے گی۔ اور اسلامی مذہبی تعلیم جو اس وقت تک زیادہ تر فرقہ وارانہ طور پر دی جاتی ہے، وہ جامع اور قومی بنیادوں پر دی جائیگی اور اس سے وہ مقصود حاصل ہو سکے گا، جو آج کی ضرورت ہے اور اسلام بھی اس کا متقاضی ہے۔

جامعہ اسلامیہ بہاولپور کو صحیح معنوں میں اسلامیہ کے ساتھ ساتھ جامعہ یعنی یونیورسٹی بھی ہونا چاہیئے جس طرح ایک یونیورسٹی میں مختلف علوم و فنون پڑھائے جانے کی وجہ سے ایک عمومی و جامع علمی و فکری فضا پیدا ہو جاتی ہے اسی طرح جامعۂ اسلامیہ بہاولپور میں مختلف اسلامی علوم و فنون اور مختلف اسلامی مکاتب فکر کے بارے میں اس طرح کی فضا پیدا کرنے کی کوشش ہونی چاہیئے یہی آج اسلام کی حقیقی روح ہے، اسی میں مسلمانوں کی دنیوی و اخروی فلاح ہے اور پاکستان کے استحکام اور اس کی ترقی کا انحصار بھی اسی پر ہے۔

شاہ ولی اللہ ۔ تاریخی پس منظر
علمی و فکری روایات

یوں تو سرزمین پاک وہند اسلام سے اس کی ابتدائی صدیوں ہی میں متعارف ہو گئی تھی، سندھ عرب حملہ آوروں کے ذریعہ، اور جنوبی ہندوستان کے ساحلی مقامات مسلمان تاجروں کی وساطت سے۔ لیکن ان انتہائی شمال مغرب اور انتہائی جنوب کے علاقوں سے اسلام کے اثرات برصغیر کے دوسرے حصوں میں نہ پہنچ سکے اور یہ کمی اس وقت پوری ہوئی جب ۱۰۰۱ء میں اٹک پار سے مسلمان فاتح پانچ دریاؤں کی سرزمین میں داخل ہوتے ہیں۔ اور اس کے بعد ان کے سلسلہ برابر جاری رہتا ہے۔ اور ایک وقت آتا ہے کہ وہ سارے برصغیر کو فتح کر لیتے ہیں اور ہرات اور کابل سے لیکر مدراس اور بنگال تک کے یہ سب علاقے ان کے زیرنگیں ہو جاتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ سندھ پر اسلامی حکومت کی وجہ سے اسلام کے بہت اثرات پڑے ہوں گے۔ لیکن یہ بھی اپنی جگہ بالکل صحیح ہے کہ سرزمین سندھ نے بھی عربوں اور مسلمانوں کو اس دور میں بہت کچھ دیا۔ مشہور علم ہیئت کی تصنیف "سدھانت" ایک عالم کے ذریعہ سندھ سے منصور عباسی کے زمانے میں بغداد پہنچی اور

ؔ یہ اس سلسلے کا تیسرا مضمون ہے۔ پہلے مضمون میں شاہ ولی اللہ کے تاریخی پس منظر کے ضمن میں آپ کے خاندان کا ذکر ہے۔ دوسرے مضمون میں تاریخی وسیاسی حالات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اور اس مضمون میں مختصراً وہ فکری وعلمی روایات پیش کی گئی ہیں، جن کے شاہ ولی اللہ صاحب وارث ہوئے ــــــــــ محمد سرور

"ہی عالم ریاضی کا ایک رسالہ بھی اپنے ساتھ لیتا آیا تھا، جس نے عربی ریاضی کی بنا ڈالی تھی۔ اس رسالے کا عربی ترجمہ ابراہیم الفزاری (۷۹۶ء اور ۸۰۶ء کے درمیان) نے کیا تھا۔ اسی رسالے کے وسیلے سے مسلمان صفر اور ہندی اعداد کے استعمال سے روشناس ہوئے تھے .... علم الحساب اور الجبرا پر جو قدیم ترین عربی رسالہ لکھا گیا ہے، اس کا مصنف بھی الخوارزمی ہی تھا۔ اس کی وہ کتاب جو اس نے ہندوی طریق احصا پر قلمبند کی تھی، اس کی بنیادوں پر ہمارے علم ریاضی کی عمارت کھڑی ہوئی ہے۔"[۱]

علم الافلاک و ہیئت کی اس کتاب "سدھانت" نے بقول مصنف آب کوثر "عربوں کی علم ہیئت پر گہرا اثر ڈالا۔ ہندو فاضل کے بغداد میں کئی شاگرد ہوئے، جنہوں نے سدھانت کے اصولوں کو اپنے اپنے طرز پر عربی میں منتقل کیا.... (بعد میں) سب ترقیوں کے باوجود ایک مدت تک عرب ہیئت داں بغداد سے لے کر اسپین تک اسی ہندی کتاب سدھانت کے پیچھے لگے رہے اس کے خلاصے کئے۔ اس کی شرحیں لکھیں ...." علم ہیئت و حساب کے علاوہ سندھی عالموں نے عربوں کو ہندی طب سے بھی متعارف کرایا اور یہیں سے حکمت و دانش کی کئی کتابیں بغداد پہنچیں، اور وہاں ان کے عربی میں ترجمے ہوئے۔ مزید برآں اور بہت سے فنون پر سنسکرت کی کتابوں کے عربی میں ترجمے کئے گئے، اور اس طرح یونانی اور ایرانی اثرات کے ساتھ ساتھ عربی اور اسلامی تہذیب نے بڑے کھلے دل سے سندھ کے اثرات قبول کئے اسی سلسلے میں نفحات الانس میں مولانا جامی نے لکھا ہے کہ "بایزید بسطامی، گوید من از ابوعلی (سندھی) علم فنا و توحید آموختم و ابوعلی (سندھی) از من الحمد و قل ہو اللہ احد"[۲] انہی تاریخی شواہد کی بنا پر بعض مستشرقین کا خیال ہے کہ اسلام میں تصوف کا آغاز بھی ہندوستانی اثرات کی وجہ سے ہوا۔" (آب کوثر)

یہ تو بہر حال ایک مختلف فیہ مسئلہ ہے۔ اس ضمن میں مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم فرماتے تھے کہ جب سنہ ۱۰۰۱ء میں مسلمان اٹک پار سے پنجاب اور وادی گنگ و جمن کی طرف بڑھے ہیں، تو سندھ کے راستے سے

---

[۱] مسلمانوں کے افکار .... تصنیف پروفیسر میاں محمد شریف ص ۵۶

[۲] آب کوثر ص ۱۲

ہندوستان کے علوم و معارف جو بغداد پہنچے تھے، ان کی وجہ سے ان حملہ آور مسلمانوں کے ساتھ یا ان کے بعد جو اہل علم و عرفان آئے، وہ ہندوستان کے علوم و معارف سے کماحقہٗ واقف ہو چکے تھے۔ بلکہ بغداد کی عالمی تہذیب سے مستفید ہو کر وہ ان علوم و معارف میں بہت کچھ اضافہ بھی کر چکے تھے چنانچہ یہ نووارد مسلمان نہ صرف ایک ترقی یافتہ اور زیادہ موثر فوجی نظام اور بہتر سیاسی ہیئت اجتماعیہ کے حامل تھے بلکہ وہ ایک برتر عالمگیر مذہب کے ساتھ ساتھ فکر و دانش کے اعلیٰ معیار بھی ہمراہ لائے تھے محض فوجی و سیاسی تنظیم کے اعتبار سے ان کا پلّہ بھاری نہ تھا بلکہ وہ علمی، عقلی، اخلاقی اور تہذیبی لحاظ سے بھی ہندو اہل کمال پر فوقیت رکھتے تھے۔ بات یہ ہے کہ ہندوستانی علم و فلسفہ اور تہذیب و تمدن باہر کی دنیا سے کٹ کر اور ملکی حدود میں گھر کر رُکے ہوئے پانی کی طرح زندگی کی حرکت کھو بیٹھا تھا، لیکن آنیوالے مسلمان اہل علم و عرفان کے پاس اپنا مذہب یعنی اسلام تو تھا ہی اس کے علاوہ وہ یونانی، ایرانی، ہندوستانی، مصری، بلکہ دنیا کی دوسری تہذیبوں کے باقیات صالحات سے بھی متمتع ہو چکے تھے۔ اور ان کے پاس ایک بہتر اور وسیع مشرب کلچر تھا۔ جس میں اس وقت تک کی تہذیبوں کے سب سوتے مل چکے تھے، مثال کے طور سے غزنویوں کے عہد کے عالم البیرونی کو دیکھئے۔ تاریخ الحکما میں لکھا ہے کہ "اس نے چالیس سال سے زیادہ تحصیل علوم میں صرف کئے اور ایک اونٹ کے بوجھ سے زیادہ کتابیں لکھیں۔۔۔ البیرونی نے علوم تاریخ، سنین، ریاضی، ہیئت جغرافیہ، طبیعات، کیمیا اور علم معدنیات میں کتابیں تصنیف کیں۔ وہ عربی، فارسی، ترکی، خوارزمی کے علاوہ عبرانی اور یونانی سے واقف تھا۔ اور سنسکرت میں تو اس نے عربی سے کئی کتابیں ترجمہ کیں" اس کی کتاب الہند تو عالمی شہرت حاصل کر چکی ہے۔

اسی دور کے ایک صاحب معرفت بزرگ داتا گنج بخش ہیں۔ یہ غزنی کے نواح میں پیدا ہوئے اور پھر تحصیل فیض کے لئے آپ نے مشرق کے تمام اسلامی ممالک کی سیاحت کی، اور آخر میں لاہور تشریف لائے۔ آپ کی کتاب کشف المحجوب اب تک اہل تصوف کا مرجع ہے۔

ایک ہزار سن عیسوی میں اٹک پار سے آنے والے مسلمان فاتحوں کا دور شروع ہوتا ہے لیکن

دو سو سال تک ان کی عملداری صرف پنجاب تک محدود رہی، اس کے بعد دہلی اُن کا پایۂ تخت بنتا ہے، اور فتوحات اور توسیع مملکت کا سلسلہ آگے بڑھتا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے، جب کم و بیش مسلمانوں کے تمام علوم مدوّن ہو چکے تھے اور علم و فن کی ہر صنف میں ان کے ہاں مستقل مکاتب خیال قائم ہو گئے تھے۔ تفسیر، حدیث، فقہ اور علم کلام کی اساسی کتابیں وجود میں آ چکی تھیں۔ الکندی سے لے کر ابن رُشد (متوفی ۱۱۹۸ء) تک تمام نامور مسلمان فلسفی گزر چکے تھے۔ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی جنہیں تصوف کا علمی و فکری بانی کہا جاتا ہے، ان کا سن وفات ۱۲۴۰ء ہے۔ علم کلام میں اشعری و ماتریدی سکول بروئے کار آ چکے تھے، اور فقہ چار مذاہب میں بڑی سختی سے پابند کر دی گئی تھی اور امام غزالی کو وفات پائے بھی کافی عرصہ ہو گیا تھا۔

مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم نے اپنی کتاب "ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت" میں ہندوستان کے اس علمی "پُرسکون ماحول" کا نقشہ یوں کھینچا ہے۔

"مسلمانوں نے تو اس ملک کو وطن بنانے کے بعد تعلیم کا جو خاکہ تیار کیا تھا اس میں نظام کی وحدت کے ساتھ ساتھ علم کی طغیانی کے نشے پر ان الیٰ ربک المرجعیٰ، کی ترشی کا نچوڑنا بھی تعلیم کا قریب قریب ایک لازمی جزو قرار دیا گیا تھا، تاکہ دماغ کی لگام ہمیشہ دل کے ہاتھوں میں یا عقل کی باگ ایمان کے پنجوں میں دبی رہے۔

"اس ملک میں جب اسلام آیا، تو دین کا سارا ذخیرہ بحمد اللہ منقح ہو چکا تھا۔ حدیثوں کی تنقیح ہو چکی تھی۔ فقہ کے اصول منضبط ہو چکے تھے۔ یہاں کے اہل علم کو یہ ساری چیزیں پکی پکائی حالت میں ملی تھیں۔ اس لئے مذہب کے متعلق صرف عمل کا کام رہ گیا تھا۔ یا زیادہ سے زیادہ حوادث یومیہ جو لا محدود ہیں، ان کے متعلق فقہی کلیات کی روشنی میں حکم پیدا کرنا۔ اس وقت تک اس ملک کے مذہبی دائروں میں نہ فساد تھا، نہ جھگڑے۔ ایک روح پرور سکون کا عالم تھا، جو طاری تھا"

ظاہر ہے اس قسم کا "روح پرور سکون کا عالم" ذہنوں کو جامد بھی کر سکتا ہے، اور خاص طور سے جب حالت یہ ہو، جیسا کہ مولانا مناظر احسن لکھتے ہیں "تقریباً صدیوں اس ملک کے مسلمانوں میں شیعہ اور

سنی یا حنفی و شافعی کے اختلافات بھی نہیں پائے جاتے تھے۔ سب کا ایک مسلک ایک مشرب تھا۔" یہ سرزمین جو صدیوں سے علم و حکمت کا مرکز رہ چکی تھی، اور جہاں کے علوم و فنون ایک زمانے میں عربی میں منتقل ہو کر تمام دنیائے اسلام میں پھیلے، جب خود مسلمان یہاں آکر بسے اور عرصہ دراز تک ان کی یہاں حکمرانی رہی تو ان میں الغزالی، ابن رُشد، ابن سینا اور ابن عربی جیسے محقق و فلسفی نہ پیدا ہوئے تو اس کی ایک وجہ علم کا وہ "روح پرور سکون" تھا جس کا ذکر مولانا مناظر احسن نے کیا ہے[1] لیکن صرف یہی وجہ نہیں بلکہ اس کی ایک اور وجہ بھی ہے، جس کا ذکر ذرا تفصیل کا طالب ہے۔

ابتدائی فتوحات کے بعد جب مسلمان سرزمین پاک و ہند میں ذرا جم کے بیٹھے اور ان کے لئے علمی مطالعہ و تحقیق کے سلسلہ میں یہاں کے حالات سازگار ہوئے تو اسلامی دنیا کے وہ مراکز جہاں صدیوں سے ارباب علم و حکمت دادِ تحقیق دے رہے تھے اور درس گاہوں، علمی اداروں اور کتب خانوں کا جال بچھا ہوا تھا، وہ یکے بعد دیگرے تباہ ہو گئے۔ چنانچہ جن سرچشموں سے علمی سوتے نکل کر پوری اسلامی دنیا کو سیراب کر رہے تھے، اس طرح وہ خشک ہو گئے اور اس کی وجہ سے تقلید و جمود اور قدامت پرستی مسلمانوں میں زور پکڑ گئی۔

---

[1] خدا کا شکر ہے کہ تصوف اس "روح پرور سکون" کے دائرے سے باہر تھا۔ اور اس کے ذریعہ اس تمام عرصہ میں علم، عقل اور جذبات کی "طغیانی" کو اظہار کا آزادانہ موقع ملتا تھا ورنہ ہندوستان کا پورا اسلامی عہد علمی لحاظ سے صرف فقہی جزئیات کا مرقع ہو کر رہ جاتا۔ مولانا مناظر احسن گیلانی اس ضمن میں لکھتے ہیں "ہمیشہ رسد طلب کی تابع رہی ہے۔ اسی پرسکون فضا میں جو اکبری عہد سے پہلے اس ملک کے دینی اور علمی دائروں پر چھائی ہوئی تھی، مسلمانوں کی ساری توانائیاں اسی مسئلے کی طرف متوجہ ہو گئی تھیں ... (چنانچہ) لوگوں کو اکثر حیرت ہوتی ہے کہ بہ نسبت دوسرے علوم و فنون کے ہندوستانی مسلمانوں کی تصنیفات کے سلسلے میں تصوف کی کتابیں زیادہ اور بہت زیادہ کیوں نظر آتی ہیں۔"

۱۰۹۷ء میں صلیبی حملوں کا آغاز ہوتا ہے۔ جو تقریباً دو سو سال تک جاری رہے۔ انہوں نے شام و فلسطین و مصر کو جو اس زمانے میں علم و حکمت کے مرکز تھے، تباہ و برباد کر دیا۔ وہاں کے لاکھوں باشندے تہ تیغ ہوئے۔ کتب خانے جلا دیئے گئے۔ درس و تدریس کے سلسلے بند ہوگئے اور گزشتہ چار پانچ سو سال کے عرصے میں ان علاقوں میں جتنی بھی علمی و تہذیبی ترقی ہوئی تھی وہ صلیبی حملوں کی نذر ہوگئی۔ یورپ کے ان صلیبی حملہ آوروں کو روکنے کے لئے وسط ایشیا سے ترکمانوں کو بڑی تعداد میں بھرتی کرنا پڑا۔ یہ بہادر تو تھے لیکن نہ ان کی کوئی تہذیبی روایات تھیں اور نہ یہ علم وغیرہ سے بابہرہ تھے۔ مختصراً ان کے ہاتھوں میں جب اقتدار آیا، تو علم و حکمت کے لئے فضا اور بھی ناسازگار ہوگئی۔ اسی دوران میں تاتاریوں کا سیلاب پھوٹ پڑتا ہے، اور وہ دمشق سے لے کر دریائے اٹک سے ادھر تک کی ساری اسلامی دنیا کو بہا کر لے جاتا ہے۔ چنگیز خاں نے وسط ایشیا کے آباد شہروں کو جلا کر راکھ کر دیا۔ اس کے جانشین ہلاکو نے ۱۲۵۸ء میں بغداد فتح کیا، اور اسے تباہ کر دیا بقول سید امیر علی:۔ "پانچ صدیوں کی جمع شدہ علمی متاع ہمیشہ کے لئے نابود ہوگئی، اور وہ طبقے جو قوم کا نچوڑ تھے مٹ گئے۔"[1]

سلطان شمس الدین التمش اور اس کے جانشینوں کی ہمت سے ہندوستان اس سیلاب سے تو محفوظ رہا۔ لیکن وسط ایشیا، عراق اور شام میں علم و حکمت اور تہذیب و ثقافت کی صدیوں سے جو شمع روشن تھی، اس کے بجھ جانے کا ہندوستان کو یہ فائدہ ضرور ہوا کہ چنگیز خاں کی تباہ کاریوں سے جان

---

[1] جب ابن سینا کا ستارہ افق پر ظاہر ہوا، تو اس زمانے کے حالات بڑے سازگار نظر آتے تھے ... لیکن عین اس وقت صلیبی حملوں نے مسلمانوں کی ساری توجہ موت و زندگی کی اس کش مکش میں اپنے آپ کو بچانے کی طرف مبذول کر دی۔ اور ابھی اس سے انہیں نجات ملی ہی تھی کہ تاتاری سیلاب نے ان کو آلیا۔ اور وہ اپنے ساتھ مشرق کا تمام کلچر اور تہذیب بہا کر لے گیا۔
سید امیر علی

بچا کر بہت سے علماء و فضلا اور ارباب حکم و سیاست ادھر آ گئے ضیاء الدین برنی کے الفاظ میں "اس زمانے میں دہلی میں ہر طرف سے مخلوق امڈ کر آ گئی تھی۔ چنانچہ التمش کے فضل و کرم سے یہ شہر دنیا بھر کے بڑے آدمیوں کا مرجع بن گیا۔"

چنگیز خاں اور ہلاکو کی تباہ کاریوں سے تو ہندوستان محفوظ رہا، لیکن بعد میں امیر تیمور نے ان کی کسر پوری کر دی۔ تغلقوں کے عہد میں اس نے دہلی پر حملہ کیا اور اس شہر کو جو التمش کے زمانہ سے ہندوستان کا پایۂ تخت چلا آتا تھا۔ جلا کر راکھ کر دیا۔ اس کے بعد پھر کہیں شاہ جہاں کے دور میں دہلی سلطنت کا مرکز بنتا ہے، اور وہاں علم و حکمت کی مسند بچھتی ہے۔

اکبر کے دور حکومت سے پہلے اسلامی ہند کی علمی زندگی میں فقہ کو غیر معمولی اہمیت حاصل تھی۔ لہ البتہ اس کے ساتھ ساتھ تصوف اس کا ایک لازمی جزو تھا۔

اس ضمن میں مولانا مناظر احسن لکھتے ہیں:۔ "ساتویں صدی سے بارھویں صدی کی اس طویل مدت میں آپ مشکل ہی سے کسی ایسے عالم کی نشان دہی کر سکتے ہیں، جس نے مدرسہ سے نکلنے کے بعد یا مدرسی زندگی کے ساتھ ساتھ کسی خانقاہ سے تعلق نہ پیدا کیا ہو۔۔۔۔ ہمارے تعلیمی نظام کا آخری اختتامی جزو یہی چیز تھی۔ مدرسوں میں دماغوں کو بنایا جاتا تھا اور خانقاہوں میں دلوں کو سمجھایا جاتا تھا۔۔۔۔"
(نظام تعلیم و تربیت جلد دوم ص۲۹)

ان حالات میں قدرتی بات تھی کہ تصوف کو زیادہ فروغ حاصل ہوتا۔ اور صوفیا کی عوام اور خواص

لہ "عجیب بات ہے کہ بعض لوگ جنہیں بخارا اور سمرقند۔۔۔ کے علمی ماحول کا صحیح اندازہ نہیں ہے ہندوستان کی معقولیت کا الزام ان ہی بیچارے علماء پر ڈال دیتے ہیں، جو ماوراء النہر سے ہندوستان آئے۔ حالانکہ تاتاری فتنہ کے بعد جب اس ملک میں پھر علم کا رواج ہوا تو اس میں زیادہ تر فقہ و اصول فقہ جیسے علوم تھے۔ منطق و فلسفہ سے ان کا تعلق بہت معمولی تھا۔"

(ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت) صفحہ ۲۰۵ جلد اول

بلکہ درباروں میں بھی زیادہ قدر و منزلت کی جاتی چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ نہ صرف ان کی بدولت عوام میں اسلام کی اشاعت ہوئی۔ بلکہ ان کا اثر و نفوذ ارباب حکومت پر بھی ایک قسم کے اخلاقی ضابطے کا کام دیتا رہا ہندوستانی تاریخ کے اس طویل عہد میں جو مشہور صوفیائے کرام گذرے ہیں، ان کے حالات اور ملفوظات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک طرف اسلام کے مبلغ تھے تو دوسری طرف وہ مسلمانوں کی اخلاقی تربیت بھی کرتے تھے۔ "وہ ہر ایک کو خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان، ایک بلند تر روحانی زندگی کا پیغام دیتے اور اس کا عملی نتیجہ یہ تھا کہ کفار اسلام کی طرف راغب ہوئے۔ اور عام مسلمان ایک پاک بے عیب زندگی کی طرف۔"

تصوف محض ریاضتوں اور مجاہدوں کا نام نہ تھا۔ صوفیا اپنے زمانے کے علوم پر بھی عبور رکھتے تھے۔ نظام الدین اولیا، مروجہ درسی علوم کا نصاب ختم کر کے حضرتِ فریدالدین شکر گنج کی خدمت میں پہنچے تھے، لیکن اس کے باوجود آپ نے انہیں "براہ راست تمہید سالمی بھی اوّل سے آخر تک سبقاً سبقاً پڑھائی۔ عوارف المعارف بھی پڑھائی... چھ پارے کامل تجوید کے ساتھ پڑھائے۔" حضرت نظام الدین اولیا، فرماتے ہیں:۔ "اوّل دریں کار علم است"۔ مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم کے الفاظ میں "ہمارے صوفیائے کرام اشراقی حکیم ہیں۔ انہوں نے علم و حکمت کو اشراقی طریقے پر اپنایا۔ اور صدیوں اس پر ریاضت کی۔" آخر تصوف میں جو "وجود" کی بحثیں ہیں، اور جس پر شیخ اکبر ابن عربی نے اتنا کچھ لکھا ہے۔ حکمت نہیں تو اور کیا ہے۔ مشہور مورخ فرشتہ ناقل ہے کہ ابن عربی کی کتابیں حضرت سلطان المشائخ (نظام الدین اولیا) کے زیر مطالعہ رہتی تھیں بمبئی کے نواح میں ایک بزرگ شیخ علی مہائمی گزرے ہیں۔ آپ نے عربی میں قرآن مجید کی ایک تفسیر لکھی۔ اس کے علاوہ عوارف المعارف اور فصوص الحکم جیسی تصوف کی کتابوں کی شرح لکھی۔ آپ شیخ اکبر ابن عربی کے پیرو اور وحدت الوجود کے قائل تھے۔ شیخ عبدالحق محدث ان کے متعلق لکھتے ہیں کہ وہ صوفیہ موحدہ کے علماء میں سے تھے اور علوم ظاہر و باطن کے عالم تھے۔ انہی کی تفسیر کے بارے میں حضرت مجدد الف ثانی کا ایک خط ہے، جس میں وہ لکھتے ہیں:۔

"مصنف ایں کتاب خیلے میل بمذہب فلاسفہ دارد و نزدیک است کہ حکیماں را عدیل انبیاء سازد علیہم الصلوٰۃ والتسلیمات - آیت در سورۂ ہود بنظر درآمد کہ بیان آں را بطرز حکماء خلاف طورِ انبیا علیہم الصلوٰۃ والتسلیمات کردہ است وتسویہ درمیان قول انبیاء وحکماء دادہ ..... ودر مواضع دیگر آیت ہائے قرآنی را موافقِ مذاق حکماء بیان میکند[1]

عقیدۂ وحدت الوجود میں شیخ علی مہائمی کو اتنا انہماک تھا کہ وہ اپنے ایک رسالے میں لکھتے ہیں کہ یمن میں ایک فاضل شیخ ابن عربی کا مخالف تھا - اسے قائل کرنے کے لئے میں نے یمن کا سفر کیا - آپ کا انتقال ۱۴۳۱ء میں ہوا - مولانا عبدالحی مرحوم نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ "میرے نزدیک ہندوستان کے ہزار سالہ دور میں شاہ ولی اللہ دہلوی کے سوا حقائق نگاری میں ان کا کوئی نظیر نہیں" (آب کوثر)

شیخ علی مہائمی اپنے قصبے مہائم کے قاضی بھی تھے -

اس دور میں تصوف اور حکمت اور اس کے ساتھ ساتھ علوم دینیہ جس طرح جمع ہو رہے تھے شیخ موصوف کی ذات اس کی ایک مثال ہے[2]

مولانا مناظر احسن اس زمانے کے "درجہ فضل کی کتابیں" کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ تفسیر و حدیث، فقہ، اصول فقہ کی دینیات میں اور نحو و صرف، ادب، معانی، بیان وغیرہ کی عربیت کے سلسلہ میں تعلیم ہوتی

---

[1] آب کوثر ص ۵۱۲

[2] اکبر کے دور سے پہلے ایک صوفی بزرگ شیخ عبدالقدوس گنگوہی گزرے ہیں - "آپ کی عمر کا بڑا حصہ ریاضتوں، مجاہدوں، عبادت الٰہی، رشد و ہدایت اور مریدوں کی اصلاح و تربیت میں گزرا - لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس غیر معمولی علم و فضل کی بناء پر جس سے آپ کو قدرت نے نوازا تھا، آپ نے متعدد کتابیں بھی تصنیف فرمائیں -

(شیخ عبدالقدوس گنگوہی اور ان کی تعلیمات - اعجاز الحق قدوسی)

تھی" باقی جہاں تک معقولات کا تعلق ہے۔ اور جس الزام سے ہندی نظام تعلیم کو بدنام کیا جا رہا ہے، اس کا ان صدیوں میں یعنی ساتویں اور آٹھویں میں پتہ بھی نہیں چلتا۔ انتہا یہ ہے کہ منطق و فلسفہ، ریاضی وغیرہ تو دور کی چیزیں ہیں، علم کلام تک کی کتابوں کا ذکر عام علماء کے نزدیک تدریسی نظام میں نہیں ملتا" اس کے بعد وہ لکھتے ہیں۔

"البتہ آٹھویں صدی جب ختم ہو رہی تھی اور دلی میں لودیوں کے آہنی پنجوں نے پھر ایک مرکزی حکومت قائم کرنے میں کامیابی حاصل کی، تو اس خاندان کے دوسرے بادشاہ سلطان سکندر لودی کے عہد میں ۔۔۔ ایک خاص تعلیمی انقلاب ہوا"

بقول مولانا موصوف "۔۔۔ دو سو سال یعنی سکندر لودھی کے زمانے تک معقولات کا جتنا حصہ[1] ہمارے نصاب میں پایا جاتا ہے، وہ صرف قطبی اور شرح صحائف تک محدود تھا۔۔۔ سکندر لودھی سنہ ۸۹۴ھ میں تخت نشین ہوا۔ اس وقت تک یہاں کے نصاب میں منطق اور کلام دونوں علوم کا سرمایہ لے دے کر قطبی اور شرح صحائف پر ختم ہو جاتا تھا"

یہ خاص تعلیمی انقلاب کیا تھا، مولانا موصوف شیخ عبدالحق محدث کا یہ قول سکندری عہد کے متعلق نقل کرتے ہیں:۔ "از اکناف عالم از عرب و عجم بعضے بہ سابقہ استدعا و طلب، و بعضے بے آں در عہد دولت او تشریف آوردہ توطن ایں دیار اختیار کردند"۔ مزید یہ کہ مولانا مناظر احسن کے الفاظ ہیں "۔۔۔ اسی زمانے میں ایک خوش باش شخص جمالی دلی ہی میں تھے۔ خود بھی صاحب علم و بصیرت تھے۔ لکھا ہے کہ:۔

---

[1] شیخ عبدالحق محدث ان کی نسبت لکھتے ہیں "یگانہ روزگار و مجمع اطوار بود ۔۔۔ اقسام شعر از مثنوی اور قصیدہ و غزل گفتہ ۔۔۔" شیخ ایک درویش منش انسان تھے ۔۔۔ عمر کا ایک حصہ بلاد اسلامیہ کی سیر و سیاحت میں گزارا۔ اثنائے سفر میں جن بزرگوں سے ملاقات ہوئی، ان میں سے مولانا جامی، ملا حسین واعظ کاشفی اور مولانا جلال الدین محمد دوانی کے نام قابل ذکر ہیں۔ جمالی کا مشہور ترین شعر جسے علامہ اقبال نے نعت کا بہترین شعر کہا ہے

"موسیٰ ز ہوش رفت بہ یک پرتو صفات ۔۔۔ تو عین ذات می نگری و تبسمی" (آب کوثر)

"بزیارت حرمین شریفین مشرف شدہ و مولانا عبدالرحمٰن جامی و جلال الدین محمد دوّانی را علیہ الرحمتہ دریافتہ" (اخبار الاخیار) انہی شیخ جمالی کے صاحبزادے میاں عبدالحی تھے، جنہیں "مبلغ کثیر از ترکہ پدر رسیدہ بود" لیکن ان کا بھی یہی دستور تھا۔ "در زمان افغانان ہر کہ از جنس طالب علم یا شاعر، یا قلندر از ولایت باین جانب می افتاد در منزل او لبود بر ہر یک مہربانیہا و خدمتہا می کرد"

عہد سکندری کی دلی میں تعلیم و تعلم اور علم و فن کے بارے میں یہ چہل پہل تھی کہ انہی دنوں ملتان سے شیخ عبداللہ اور شیخ عزیز اللہ دو بھائی پہنچتے ہیں۔ "کوئی خاص تصریح تو نہیں ملی، لیکن غالب گمان یہی ہوتا ہے کہ شیخ عبداللہ و شیخ عزیز اللہ نے لکھی ہے، معقولات کا علم انہی مولانا سماء الدینؒ سے حاصل کیا ہو۔ جب وہ یعنی مولانا سماء الدین بہ یک واسطہ میر سید شریف جرجانی کے شاگرد ہیں تو ظاہر ہے کہ ان عقلی فنون کا ان پر جتنا غلبہ ہو کم ہے۔" اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ شرح مطالع شرح حکمت العین، شرحِ مواقف جیسی کتابیں جن میں آخر الذکر دو کتابیں خود میر سید شریف اور اوّل الذکر ان کے استاد قطب الدین رازی کی ہیں، یہاں کے نصاب میں داخل ہوئی ہوں گی۔ خصوصاً شرح مطالع پر جب میر صاحب کا معرکۃ الآرا حاشیہ بھی موجود ہے بلکہ میر جرجانی کے ساتھ ساتھ علامہ تفتازانی کی کتابیں بھی اسی زمانے میں شریک درس ہوئی ہوں، تو کچھ تعجب نہیں ہے۔" [۲]

مغل دورِ حکومت سے پہلے ہندوستان کی علمی و ذہنی فضا پر بالعموم ماوراء النہر کا اثر زیادہ تھا جہاں منطق و فلسفہ کے مقابلے میں فقہ اور اصول فقہ پر زیادہ زور دیا جاتا تھا، البتہ تصوف اور صوفیا کا اثر و نفوذ وہاں بھی تھا، جب ہمایوں نے ایرانیوں کی مدد سے دوبارہ تخت حاصل کیا تو اس سرزمین میں ایرانیوں کا عمل دخل بہت بڑھ گیا۔ اور ایران سے بڑی کثرت میں اہل علم و فضل آنے لگے۔ .... ہمایوں کے بعد

---

[۱] - اسی قرن میں ملتان کے اندر ہم مشہور معقولی عالم کو پاتے ہیں، جن کا نام مولانا سماء الدین تھا۔ (نظام تعلیم و تربیت)

[۲] ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت جلد اوّل ص۱۹۱

سلسلہ بہت وسیع ہوگیا۔ ایران کے بڑے بڑے شاعر...... اور قابل مدبر...... ہمایوں کے جانشینوں
کے عہد میں ہندوستان آئے اور علوم و فنون کی اشاعت اور اسلامی تہذیب و تمدن کی تشکیل میں
بہت مفید ثابت ہوئے۔ مغلیہ حکومت کے استحکام اور قرار میں بھی ایرانی ذہانت اور تدبر کو بڑا
دخل تھا...... ہمایوں کے بعد شیعہ حضرات کی ایک کثیر تعداد ایران سے اس زمانے میں آئی، جب وہاں
۱۵۷۶ء میں شاہ اسمٰعیل ثانی نے اہل سنت والجماعت کا طریقہ اختیار کیا اور سنی عقائد کے عارضی
فروغ کے دوران برگزیدہ شیعہ علماء اور اکابر پر سختی شروع ہوئی۔ اس کے بعد یہ سلسلہ اور وسیع ہوگیا۔
اور شمالی ہند میں بھی شیعوں کی معقول تعداد ہوگئی، حتیٰ کہ اورنگ زیب کے امرا میں اکثریت شیعوں کی تھی[1]

ایرانی علماء و فضلا اپنے ساتھ منطق و فلسفہ پڑھنے پڑھانے کا شوق بھی ساتھ لائے۔ بقول
مولانا مناظر احسن "...... معقولاتی کتابوں کے اضافے کا یہ (سکندر لودھی کا) تو پہلا دور تھا۔ اس
کے بعد لودیوں کی حکومت ختم ہو جاتی ہے۔ بابر مغل حکومت قائم کرتے ہیں...... ہمایوں کے بعد
دور اکبری شروع ہوا۔ مختلف دینی اور عقلی قلابازیوں سے گزرتے ہوئے اکبر کا دربار صرف فلسفہ
و حکمت کا دربار بن گیا[2] مثال کے طور سے ایک ایرانی عالم میر فتح اللہ شیرازی تھے۔ انہیں اکبر نے
"در منصب وزارت با راجہ ٹوڈرمل شریک ساختند" ان کے بارے میں مولانا غلام علی آزاد فرماتے ہیں:۔
تصانیف علمائے متاخرین ولایت (ایران و خراسان وغیرہ) مثل محقق دوانی و میر صدر الدین، و میر
غیاث منصور و مرزا جان میر (فتح اللہ شیرازی) در ہندوستان آورد" صرف یہی نہیں کہ ان ولائتی
مشہور معقولیوں کی کتابیں وہ ہندوستان لائے...... ۔ انہی میر فتح اللہ نے ان مصنفین کی کتابوں کو
(بقول مولانا غلام علی آزاد)

"در حلقہ درس انداخت۔"

---

[1] رود کوثر ص ۳۲

[2] ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت جلد اول،

اگرچہ سکندر لودھی کے زمانے میں، جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، ملتان سے شیخ عبداللہ اور شیخ عزیز اللہ معقولات کا ذخیرہ لائے تھے، لیکن مولانا مناظر احسن کے الفاظ میں "ایران سے عقلیت کے جس طوفان کو میر فتح اللہ شیرازی ہندوستان لائے، اسے تو سلطنت کی صرف پشتیبانی ہی نہیں حاصل تھی بلکہ حکومت کے اساطین و اراکین کے گھر گھر میں ایک ایک بچے کو میر صاحب یہ شیرازی شراب پورے انہماک سے پلا رہے تھے ... مولانا غلام علی آزاد نے لکھا ہے۔ "ازاں عہد (از عہد فتح اللہ شیرازی) معقولات را رواجے دیگر پیدا شد" مولانا غلام علی نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس "رواج دیگر" کا بڑا موثر سبب یہی تھا کہ میر صاحب نے کثرت سے اس ملک میں اپنے شاگرد پیدا کر دیئے۔"

اور بقول مولانا سید مناظر احسن گیلانی

یہ تھا ہمارے تعلیمی نصاب کا دوسرا انقلابی دور

مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم نے ایک دفعہ مسلمانوں کے ہاں اس دور آخر میں حکمت و فلسفہ کی ترویج کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا تھا[1]

"شروع شروع میں مسلمانوں کے ہاں افلاطون اور ارسطو کی کتابوں کے ترجمے ہوئے پہلے تو ان اجنبی افکار کو مردود قرار دیا گیا۔ اور ان کی ترویج دین کی مخالفت سمجھی گئی۔

"اصحاب قدامت نے یونانی فلسفہ کی اساساً و کلیتہً مخالفت کی۔ اور اس کی تعلیم اور اشاعت کو ملعون ٹھہرایا۔ معتزلہ نے یونانی فلسفہ تو پڑھا، لیکن اسے اپنے فکر کے تابع کیا اور جو چیز ان کے فکر کے مطابق نہ تھی، اسے رد کر دیا۔ اس سے علم کلام کی نشو و نما ہوئی۔ اور وہ علوم اسلامیہ میں ایک اہم علم بن گیا۔ اس کے بعد مسلمانوں میں حکماء کی ایک جماعت پیدا ہوتی ہے، جو اپنی ذہنی آزادی کو برقرار رکھتے ہوئے اس فلسفہ کو پڑھتی ہے۔ میرے خیال میں اس رجحان کو پیدا کرنے میں صوفیہ کا

---

[1] مولانا مرحوم کی اس گفتگو کو ضبط تحریر میں لاتے وقت، ہوسکتا ہے راقم الحروف سے فرو گذاشت ہوگئی ہو۔ ——— محمد سرور

بڑا حصّہ ہے"

تاتاریوں کے بعد ایران میں فلسفہ و منطق کا فروغ کیسے ہوا، اسی سلسلے میں اجمالاً مولانا سندھی نے یوں بیان فرمایا۔

"محقق نصیرالدین طوسیؒ نے ابن سینا کی کتابوں کا خلاصہ تجرید کے نام سے کیا۔ محقق طوسی شیعہ تھا۔ اس نے تجرید کی ترتیب میں شیعی فکر کو پیش نظر رکھا۔ تجرید کی شرح ایک سنی عالم علامہ علی قوشجی نے کی۔ اس شرح کو دو عالموں علامہ جلال الدین دوانی اور صدرالدین الاشتگی نے موضوع بحث بنایا۔ اور اس پر حاشیے لکھے۔ دوانی سنی تھا اور صدرالدین شیعہ اور دونوں نے اس کتاب کی اپنے اپنے نقطہ نظر سے تشریح کی۔ پہلے دوانی نے حاشیہ لکھا اس کا جواب صدرالدین نے دیا، پھر دوانی نے اس کے جواب میں حاشیہ لکھا، جس کا پھر جواب دیا گیا۔ اور جواب کا جواب دوانی نے دیا۔ اور اس طرح دوانی کے شرح تجرید پر تین حاشیے ہو گئے۔

"فلسفہ کی یہ کتابیں اس زمانے کے بعد اہل علم کے لئے غایتِ تحصیل بن گئیں اور ان کو نصاب کے طور پر پڑھایا جانے لگا۔ واقعہ یہ ہے کہ ارسطو کے فلسفے کو سمجھنے کے لئے ان کتابوں سے بڑی مدد مل سکتی ہے۔ دوانی اور صدرالدین دونوں مذہب کے موید ہیں۔ اس لئے ان کا فکر اشراقیت کا انکار نہیں کرتا۔ چنانچہ دونوں کے افکار میں افلاطونیت کا اثر موجود ہے۔ اور یہ اثر انہوں نے فارابی سے لیا تھا۔ جو ابن سینا سے پہلے گزرا ہے۔

"نصیرالدین طوسی کے ایک ممتاز شاگرد علامہ قطب الدین شیرازی تھے۔ ان کے بعد ان کے دو شاگرد علامہ عضدالدین اور علامہ قطب الدین رازی مشہور ہوئے۔ ان دونوں سے تفتازانی اور سید شریف کو تلمذ حاصل ہے۔ اور ان دونوں کے دو واسطوں سے دوانی شاگرد ہیں۔ اس طرح دوانی طوسی کی حکمت کے وارث ہوتے ہیں۔ دوانی سے تین واسطوں سے میرزا زاہد اُن کے شاگرد ہیں اور میرزا زاہد ہروی سے

لہ۔ یہ ہلاکو کے مقربین میں سے تھے، انہوں نے اس کے لئے ایک رصدگاہ بنائی تھی

شاہ عبدالرحیم اور شاہ ابوالرضا محمدؒ (شاہ ولی اللہؒ کے والد اور چچا) نے حکمت پڑھی"

الغرض برصغیر میں معقولات کے ساتھ ساتھ علوم تصوف اور علوم دینیہ کا یہ سلسلہ صدیوں تک جاری رہا، یہاں تک کہ وہ دور آتا ہے، جس میں شاہ ولی اللہؒ صاحب پیدا ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں مولانا گیلانی لکھتے ہیں۔

......اکبر اور اکبر کے بعد ہم جہاں تک مستقبل کی طرف بڑھتے چلے آتے ہیں ہندوستان کے عام اہل علم پر معقول کا رنگ نظر آتا ہے کہ زیادہ گہرا ہوتا چلا گیا ہے۔ اور تو اور سیدنا الامام حضرت مجدد سرہندی قدس اللہ سرہٗ نے حالانکہ جو کچھ لکھا ہے، عقلیت کے اسی رنگ کو پھاڑنے کے لئے لکھا ہے، لیکن عقلیت کے خلاف ان کا سارا کلام جیسا کہ پڑھنے والوں پر مخفی نہیں، سراسر عقلی رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ یہی حال حضرت شاہ ولی اللہؒ اور مولانا محمد قاسم رحمتہ اللہ علیہم جیسے بزرگوں کا ہے کہ نشانہ سب کا وہی غلط عقلیت ہے، جس میں لوگ مذہب کے باب میں بھی مبتلا ہو جاتے ہیں، لیکن عقلیت کی تردید جب تک خود اسی عقلیت کی راہ سے نہیں کی گئی۔ اس تردید کو اپنے زمانے میں کبھی پذیرائی میسر نہیں آئی۔

سلطان علاء الدین خلجی متوفی ۷۱۶ھ کے عہد میں امیر خسرو نے دہلی کا نقشہ یوں کھینچا ہے

خوشا ہندوستان و رونق دیں — شریعت را کمال عزّ و تمکیں

ز علم با عمل، دہلی بخارا — ز شاہاں گشتہ اسلام آشکارا

مسلمانان بہ نعمانی روش خاص — ز دل ہر چار آئین را بہ اخلاص

نہ کیں با شافعی نے مہر با زید

جماعت را و سنت را بجاں صید

ملتان و اوچ کے سہروردی مشائخ

محمد ایوب قادری ایم۔ اے

شیخ شہاب الدین سہروردیؒ عراق عجم کے قصبہ سہرورد میں ۵۳۶ھ / ۱۱۴۱ء میں پیدا ہوئے اور بغداد میں اپنے چچا ابو نجیب عبدالقاہر کے سایۂ عاطفت میں پرورش و تربیت پائی۔ بڑے بڑے علماء و فضلا سے مروجہ علوم حاصل کئے۔ حدیث، فقہ، کلام اور علوم ادبیہ میں مہارت کاملہ رکھتے تھے۔ تصوف اور زہد و اتقاء میں اپنی نظیر آپ تھے۔ خلفائے بغداد اور بہت سے امراء و سلاطین شیخ سہروردی کا بہت احترام کرتے تھے[1] وہ سنت کے نہایت متبع تھے اور شافعی مسلک رکھتے تھے۔ فقہ میں اجتہاد کا درجہ حاصل تھا۔ محرم ۶۳۲ھ / ۱۲۳۴ء میں بغداد میں انتقال کیا شیخ سہروردی کثیر تصانیف کے مالک تھے۔ بروکلمان نے اپنی مشہور عربی ادب کی تاریخ میں شیخ کی اکتیس کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ حکیم شمس اللہ قادری نے ان میں سے دس کا مفصل تعارف کرایا ہے[2]۔ سب سے اہم کتاب عوارف المعارف ہے جو تصوف کی نہایت مقبول اور اہم کتاب سمجھی جاتی ہے صوفیاء کے حلقوں میں اس کا باقاعدہ درس ہوتا تھا[3]۔ ہندو پاکستان میں نامور

---

[1] امام العارف شیخ شہاب الدین سہروردی از حکیم شمس اللہ قادری ص ۱۲ تا ۱۶

[2] " ایضاً ص ۲۱ تا ۲۳

[3] حضرت بابا فریدالدین گنج شکر سے شیخ نظام الدین اولیاء بدایونی نے عوارف کے پانچ باب پڑھے تھے ملاحظہ ہو فوائد الفواد از امیر حسن سنجری (اردو ترجمہ) ص ۱۱۶ (اللہ والے کی قومی دکان لاہور ۱۹۵۶ء)

علماء اور مصنفین نے عوارف المعارف پر شروح و حواشی لکھے ہیں اور مختلف زبانوں فارسی ترکی اور اردو[1] میں ترجمے ہوئے ہیں[2]۔

شیخ شہاب الدین سہروردی اجل صوفیائے کرام میں ہیں۔ لوگ مختلف دیار وامصار سے بغداد میں آکر شیخ سے فیض حاصل کرتے تھے۔ ان کے نامور خلفاء میں قاضی حمید الدین ناگوری (ف ۶۴۱ھ / ۱۲۴۳ء) شیخ نورالدین مبارک غزنوی (ف ۶۳۲ھ / ۱۲۳۴ء) اور شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا ملتانی (ف ۶۶۵ھ / ۱۲۶۶ء) خاص طور سے قابل ذکر ہیں ان حضرات کے ذریعے ہند پاکستان میں سہروردی سلسلہ کی خاص طور سے ترویج و اشاعت ہوئی۔ یہاں ہم آخرالذکر شخصیت حضرت بہاؤ الدین زکریا ملتانی اور ان کے خانوادے اور سلسلہ کے ان مقتدر شیوخ کا ذکر کریں گے جن کی تبلیغی و روحانی سرگرمیوں کے مراکز خاص طور سے ملتان واوچ رہے۔

بہاء الدین زکریا ملتانی

شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا ملتانی ۵۶۶ھ / ۱۱۷۲ء میں قصبہ کوٹ کروڑ میں پیدا ہوئے بارہ سال کے تھے کہ ان کے والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔

خراسان اور بخارا میں علوم متداولہ کی تحصیل کی پھر حرمین شریفین کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ بغداد پہنچکر شیخ شہاب الدین سہروردی کے حلقۂ ارادت میں منسلک ہوگئے اور بہت قلیل عرصے میں اجازت و خلافت سے سرفراز ہوئے اور مرشد کے حکم کے مطابق ملتان کو رشد وہدایت کا مرکز بنایا۔ ان اطراف میں حضرت زکریا ملتانی کی بدولت سہروردی سلسلہ کی بڑی نشرواشاعت

۱؎ اردو زبان میں سب سے پہلے عوارف المعارف کا ترجمہ مولوی ابوالحسن فرید آبادی نے کیا تھا جو ۱۸۹۳ء میں نول کشور پریس لکھنؤ سے شائع ہوا۔ ۱۹۶۳ء میں حافظ رشید احمد ارشد نے دوبارہ اردو ترجمہ کیا ہے جسے شیخ غلام علی (لاہور) نے شائع کیا ہے۔

۲؎ ۔ عوارف کا خلاصہ مفتاح الہدایہ و مفتاح الکفایہ کا انگریزی ترجمہ کرنل ایچ ڈبلو کلارک نے ۱۸۹۱ء میں لندن سے شائع کیا

اور ترویج و تبلیغ ہوئی۔ ہزارہا اشخاص حلقہ ارادت میں منسلک ہوئے اور بہت سے مشرف بہ اسلام بھی ہوئے۔ مغربی پاکستان کے اکثر قبیلے حضرت زکریا ملتانی کی تعلیم و تلقین سے مسلمان ہوگئے[1] شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کے تربیت یافتہ درویشوں کی جماعتیں ملتان، سندھ اور اس کے گردونواح میں مسلسل دورے کرتیں اور اس سے بہت مفید نتائج نکلے۔

سلطان شمس الدین التمش اور بہاء الدین زکریا ملتانی سے بہت اچھے تعلقات تھے۔ اوچ ملتان میں اس وقت اگرچہ ناصر الدین قباچہ کی حکومت تھی مگر شیخ زکریا ملتانی کی تمام تر ہمدردیاں سلطان التمش سے وابستہ تھیں اور انہوں نے کھل کر التمش کا ساتھ دیا۔ قباچہ کے استیصال کے بعد یہ تعلقات اور بھی استوار ہوگئے التمش نے شیخ زکریا ملتانی کو شیخ الاسلام کے منصب پر فائز کیا[2] ۶۶۵ھ / ۱۲۶۶ء میں اس عظیم المرتبت صوفی شیخ کا ملتان میں وصال ہوا[3] حضرت جلال سرخ ساکن اوچ حضرت زکریا ملتانی کے مشہور خلیفہ ہیں۔

صدرالدین عارف

صدرالدین عارف ۶۲۱ھ / ۱۲۲۴ء میں پیدا ہوئے اور اپنے والد بزرگوار حضرت شیخ زکریا ملتانی کے

---

[1] دعوت اسلام (اردو ترجمہ پریچنگ آف اسلام از ٹی ڈبلو آرنلڈ) از مولوی عنایت اللہ دہلوی ص ۳۰۰ (طبع علی گڑھ ۱۸۹۸ء)

[2] ملتان کے سہروردی مشائخ کے سلاطین سے تعلقات اور ان کی سیاسی سرگرمیوں پر پروفیسر خلیق احمد نظامی (علی گڑھ) نے ایک مفصل تحقیقی مقالہ لکھا ہے جو میڈیول انڈیا کواٹرلی علی گڑھ (جلد سوم شمارہ اول و دوم) میں شائع ہوا ہے۔

[3] حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی کے مفصل حالات مولانا نور احمد خاں فریدی نے بڑے دلچسپ انداز میں تذکرہ بہاؤ الدین زکریا ملتانی کے نام سے لکھے ہیں جو ۱۹۵۵ء میں قصر الادب جگووالہ ضلع ملتان سے شائع ہوئے ہیں۔

سایہ عاطفت میں تعلیم وتربیت پائی قرآن کریم سے بڑا شغف رکھتے تھے اس لئے عارف مشہور ہوئے[1] اور اپنے والد حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی کے وصال کے بعد رشد وہدایت کی مسند پر متمکن ہوئے[2] ترکے میں سات لاکھ درہم نقد ملے، مگر سخاوت کا ایسا مظاہرہ کیا کہ ایک ہی دن میں ساری دولت فقراء ومساکین میں تقسیم کردی[3]۔ مگر اس جود وسخا کے باوجود ان کے یہاں دولت کی فراوانی تھی۔ ایک مرتبہ شیخ رکن الدین فردوسی (ف ۷۲۴ھ / ۱۳۲۴ء) ملتان پہنچے[4] اور حضرت صدر الدین عارف کے مہمان ہوئے، تو ایسا پُر تکلف دسترخوان بچھا جیسا کہ بادشاہوں کے یہاں ہوا کرتا ہے۔ حضرت شیخ عارف کے سامنے طرح طرح کے کھانے اور حلوے تھے[5]

شیخ عارف مسندِ رشد وہدایت کے صدر نشین ہونے کے ساتھ ساتھ مسند درس کو بھی زینت بخشتے تھے۔ ہر مبتدی ومنتہی کو درس دیتے تھے یہاں تک کہ صرف ونحو کے طلباء کو بھی محروم نہ فرماتے تھے۔ تصریف جدولی شیخ عارف کی تصنیف ہے[6] شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں[7] کہ ہندوستان کے مشائخ میں سب سے پہلے آپ تھے، جنہیں شیخ ابن عربی کے نظریات اور تصنیفات کے متعلق شیخ فخر الدین عراقی (ف ۶۸۸ھ) کے ذریعہ معلومات بہم پہنچیں۔ شیخ عراقی شیخ عارف کے بہنوئی

---

[1] سیر العارفین از حامد بن فضل اللہ جمالی ص۱۲۸ (مطبع رضوی دہلی ۱۳۱۱ھ)

[2] شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں کہ غالباً ہندوستان میں موروثی سجادہ نشینی یہ پہلی اہم رسم ہے جس پر بعد میں اوچ کے بخاری پیروں نے عمل کیا (آب کوثر، ص۳۰۱)

[3] سیر العارفین ص۱۲۸

[4] رکن الدین فردوسی کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو تاریخ سلسلہ فردوسیہ از معین الدین دوائی

[5] بزم صوفیہ ص۱۰۷-۱۰۸

[6] تذکرہ صدر الدین عارف جلد اوّل از نور احمد خاں فریدی ص۱۹ (قصر الادب جگو والہ ۱۹۵۸ء)

[7] آب کوثر ص۳۲ وسیر العارفین ص۱۳۹-۱۴۰

اور حضرت زکریا ملتانی کے مرید خاص تھے[1] حضرت عارف کے زمانے میں سہروردیہ بہائیہ سلسلہ کی وسعت سندھ و ملتان سے شمالی ہند تک پہنچ گئی۔ بدایوں میں شیخ حسام الدین معروف بہ حاجی جمال ملتانی (ف ۶۸۷ھ ۱۲۸۸ء) مشہور صاحب نسبت بزرگ تھے، جو شیخ عارف کے خلیفہ تھے[2] ۷۰۹ھ ۱۳۰۹ء میں شیخ عارف کا انتقال ہوا ان کے ملفوظات کنوز الفوائد کے نام سے ان کے مرید ضیاء الدین نے جمع کئے تھے شیخ عارف کے خلفاء میں اوچ کی دو ممتاز شخصیتیں حضرت احمد کبیرؒ اور شیخ جمال خنداں روؒ ہیں۔

شیخ رکن الدین ابو الفتح

شیخ رکن الدین ابو الفتح ۶۴۹ھ ۱۲۵۱ء میں پیدا ہوئے۔ وہ اپنے جد امجد کے براہ راست مرید اور اپنے والد شیخ صدر الدین عارف کے خلیفہ تھے، انہیں اپنے زمانے میں بڑا عروج حاصل ہوا۔ سلطان علاؤ الدین خلجی ان کا بڑا معتقد تھا، حضرت اس کی زندگی میں دو مرتبہ دہلی گئے۔ سلطان نے بڑی عقیدت سے استقبال کیا اور رخصت کے وقت کئی لاکھ تنکے نذر کئے مگر انہوں نے سب مستحقین و فقراء میں تقسیم کر دیئے۔

قطب الدین مبارک شاہ حضرت شیخ نظام الدین اولیاء بدایونی سے خصومت رکھتا تھا اس لئے اس نے حضرت رکن الدین ملتانی کو دہلی بلایا اور چاہا کہ شیخ دہلی ہی میں قیام کریں[3] جب حضرت شیخ ملتانی دہلی پہنچے تو حضرت شیخ المشائخ نے ان کا استقبال کیا اور یہ شیخین السعیدین آپس میں

---

[1] شیخ عراقی کے حالات کے لئے دیکھئے بزم صوفیہ ص ۱۵۳ - ۱۷۰

[2] حاجی جمال ملتانی کے حالات کے لئے دیکھئے اخبار الاخیار ص ۷۸ سیر العارفین ص ۱۳۸ - ۱۳۹ تذکرۃ الواصلین از مولوی رضی الدین بدایونی ص ۳۷ - ۴۰ (نظامی پریس بدایوں ۱۳۴۵ھ)

[3] حضرت شیخ رکن الدین سے سلاطین دہلی کے تعلقات کے سلسلہ میں ملاحظہ ہو بزم صوفیہ ص ۲۶۳ - ۲۷۳

بڑے خلوص و محبت سے ملے بادشاہ نے حضرت ملتانی سے ملاقات کے دوران میں پوچھا کہ سب سے پہلے آپ کا کس نے استقبال کیا تو فرمایا[1] "کسے کہ بہترین اہل شہر است"

جب ملتان میں کشلو خاں نے بغاوت کی اور محمد تغلق نے اس کو شکست دے کر اہل ملتان کے خون کی ندیاں بہانے کا حکم دیا اور اس پر عمل بھی شروع ہو گیا تو حضرت رکن الدین ابوالفتح ننگے پاؤں بادشاہ کے پاس سفارش کے لئے گئے اور اہل شہر کو معافی دلائی عصامی لکھتا ہے[2]

یکے آتشے کینہ را برفروخت ۔۔۔ وزاں آتش اقصائے ملتان بسوخت

چوں بشنید در شہر طوفان خون ۔۔۔ برہنہ سر و پائے آمد بروں

کشادہ زبان شفاعت گری ۔۔۔ ہمی گفت شاہا جہاں پروری

بر اہل گناہ نزد اہل صفا ۔۔۔ پسندیدہ تر است عفو از جزا

چوں بشنید آں شاہ آفاق گیر ۔۔۔ شد از شیخ مشفق شفاعت پذیر

۷۳۵ھ / ۱۳۳۵ء میں حضرت کا انتقال ہوا، ملتان میں حضرت رکن الدین کا عالی شان مقبرہ ہے جو دنیا کی مشہور ترین عمارتوں میں شمار ہوتا ہے۔ حضرت کے کوئی اولاد نہ تھی۔ خلفاء میں شیخ وجیہہ الدین سنامیؒ (ف ۷۳۹ھ)[3] حمید الدین حاکمؒ (ف ۷۳۷ھ)[4] اور حضرت جلال الدین مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ وغیرہ مشہور ہیں، اب ہم اوچ کے مشائخ کا ذکر کرتے ہیں اور اس سے پہلے اوچ کی علمی و ثقافتی حیثیت کو پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

۱۔ سیر الاولیاء ص ۱۳۶

۲۔ فتوح السلاطین ص ۴۴۳ (طبع مدراس)

۳۔ شیخ وجیہہ الدین کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو اخبار الاخیار ص ۱۳۱ سیر العارفین ص ۱۲۵-۱۲۶

۴۔ حمید الدین حاکم کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو تاریخ جلیلہ از مولوی دستگیر نامی ص ۷۳ تا ۱۲۶ (لاہور ۱۹۶۰ء)

اوچ مرکز علم و عرفان

اوچ ایک قدیم تاریخی شہر ہے، جہاں سکندر اعظم تک کے قدم پہنچے ہیں[1] ہندوؤں کے زمانے میں یہ شہر مرکزی حیثیت کا مالک تھا اور مسلمانوں کے ابتدائی دور حکومت میں بھی اس کو نہایت عروج حاصل ہوا۔ غزنوی عہد میں اوچ میں ایک نامور بزرگ صفی الدین گازرونی پہنچے۔ وہ مشہور صوفی بزرگ خواجہ ابو اسحق[2] گازرونی کے مرید اور بھانجے تھے۔ صفی الدین گازرونی نے ۳۹۸ھ / ۱۰۰۸ء میں وصال فرمایا[3] یہ پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے اوچ میں مدرسہ اور خانقاہ قائم کی۔ وہاں سے ہزاروں طالبان حق فیض حاصل کرتے تھے۔ حضرت گازرونی نے اوچ کو بہت ترقی دی۔ بہت سی عمارتیں بنوائیں[4] اور بقول

---

[1] دی اینشینٹ جاگرفی آف انڈیا از الیگزنڈر کننگھم ص ۲۴۲-۲۴۳ (لندن ۱۸۷۱ء)

[2] ابو اسحاق گازرونی بن شہریار اپنے زمانے کے بڑے اجل شیخ ہیں ابو علی حسین بن محمد فیروز آبادی سے علم تصوف حاصل کیا۔ علم حدیث میں بڑا درجہ رکھتے تھے مکہ میں شیخ ابو الحسین علی بن عبداللہ کی زیارت کی تھی اور ان سے حدیث روایت کرتے ہیں (ملاحظہ ہو نفحات الانس، از شیخ عبدالرحمان جامی ص ۱۶۱ مطبع نول کشور لکھنؤ ۱۸۸۵ء) ابو اسحاق گازرونی فارسی الاصل تھے۔ ان کے والد مشرف بہ اسلام ہوئے تھے۔ حضرت شیخ نظام الدین اولیاء بدایونی فرماتے ہیں کہ حضرت ابو اسحق گازرونی کے والد پارچہ بافی کیا کرتے تھے (فوائد الفواد ص ۲۰۸) ۴۲۶ھ میں انتقال ہوا۔

[3] مولوی حفیظ الرحمان نے تاریخ اوچ میں صفی الدین گازرونی کی ولادت ۳۵۳ھ اور اوچ میں آمد ۳۷۰ھ لکھی ہے مگر مولوی حفیظ الرحمان کے ماخذ کا ذکر نہیں ملتا کہ انہوں نے صفی الدین گازرونی کے سنن اور حالات کہاں سے لئے ہیں۔

[4] شیخ عبدالحق محدث لکھتے ہیں کہ "بنائے بلدۂ اچہ و عمارت از صفی الدین شدہ است" (اخبار الاخیار ص ۲۰۵)

مؤلف تاریخ اوچ حضرت گازرونی کے مدرسہ میں ڈھائی ہزار طالب علم تعلیم پاتے تھے[1] حضرت گازرونی کی خانقاہ اوچ بخاری کے شمالی جانب محلہ خوبجے میں واقع ہے۔ اس کے بعد اوچ کی سب سے زیادہ ترقی ناصرالدین قباچہ کے عہد (۶۰۷ھ/۱۰-۱۳۱۰ء تا ۶۲۵ھ/۲۸-۱۲۲۸ء) میں ہوئی۔ اس زمانے میں یہ شہر علم وفضل کے اعتبار سے دلی کی ٹکر کا تھا۔ قاضی منہاج سراج نے اس شہر کو "حضرت اچہ" لکھا۔[2] قباچہ کے عہد میں اوچ میں بڑے بڑے علماء وفضلاء شعراء وحکما علم وحکمت اور شعر وادب کی مجلسیں جمائے ہوئے تھے۔ تاتاریوں کی غارت گری اور دہشت انگیزی سے بھاگ بھاگ کر لوگ اوچ پہنچتے تھے اور قباچہ کے انعام واکرام سے سرفراز ہوتے تھے۔[3] طبقات ناصری کے مؤلف قاضی منہاج سراج ۲۶ جمادی الاول ۶۲۴ھ کو اوچ پہنچے اور چھ ماہ بعد ذی الحجہ میں مشہور دارالعلوم "مدرسۂ فیروزی" ان کے سپرد ہوا۔[4]

قباچہ کا وزیر عین الملک بھی علم دوست اور علماء وفضلاء کا قدرداں تھا۔ تذکرہ لباب الالباب کا مؤلف[5] سدید الدین عوفی اس معارف پرور وزیر کے الطاف وعنایات کا خاص طور پر معترف ہے۔ عوفی کا تذکرہ عین الملک کی سرپرستی میں لکھا گیا۔ عوفی کی دوسری تصنیف جوامع الحکایات ولوامع الروایات[6] ناصرالدین قباچہ کی تحریک پر شروع ہوئی، مگر اس کتاب کے مکمل ہونے سے

---

[1] تاریخ اوچ ص ۶۹

[2] طبقات ناصری ص ۵۶ (مرتبہ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی طبع لاہور)

[3] ایضاً ص ۵۶-۵۷ [4] ایضاً ص ۵۷

[5] مؤلف لباب الالباب کا نام بعض نے صدرالدین یا نورالدین بھی لکھا ہے (بزم مملوکیہ ص ۲۶)

[6] اس کتاب کا اردو ترجمہ وتلخیص ادیب ابن ادیب اختر شیرانی مرحوم نے کی ہے جو انجمن ترقی اردو (ہند) کی طرف سے شائع ہو چکی ہے۔

پہلے ہی قباچہ کی کتابِ حیات ختم ہوگئی۔ عوفی کی ایک کتاب مدائح السلطان کا بھی ذکر ملتاہے ناصرالدین قباچہ کے عہد میں پاکستان کی سب سے پہلی تاریخ چچ نامہ عربی سے فارسی میں منتقل ہوئی اور وزیر عین الملک کے نام پر معنون کی گئی[1]

اس کتاب کا مؤلف محمد بن علی بن حامد بن ابی بکر اپنے وطن کوفے سے اوچ پہنچا اور اس نے اس کتاب کا عربی نسخہ مولانا کمال الدین سے حاصل کرکے فارسی میں منتقل کیا اصل کتاب ڈاکٹر محمد بن عمر داؤد پوتہ مرحوم کی ترتیب وحواشی کے ساتھ شائع ہوچکی ہے اردو اور سندھی میں بھی اس کتاب کا ترجمہ ہوچکا ہے۔

قباچہ کے عہد میں اوچ تعلیم وتدریس کا بڑا مرکز تھا مدرسہ گازرونی اور مدرسہ فیروزی کا ذکر ہوچکاہے۔ ناصرالدین قباچہ نے اس زمانہ کے مشہور عالم قاضی قطب الدین کاشانی کے لئے ملتان میں ایک مدرسہ تعمیر کرایا۔

قاضی کاشانی ایسے عظیم المرتبت عالم تھے کہ حضرت بہاءالدین زکریا ملتانی ان کے اقتدا میں نماز ادا فرمایا کرتے تھے۔ جب وہ دہلی پہنچے تو شمس الدین التمش نے ان کا بڑا اعزاز فرمایا[2]۔ مؤلف تاریخ اوچ لکھتے ہیں کہ بعد میں قاضی کاشانی اوچ آگئے تھے اور یہاں بھی ان کے لئے مدرسہ تعمیر ہوا تھا[3] یہ بات محل نظر ہے کیونکہ قطب الدین کاشانی دہلی کے بعد پھر ملتان ہی میں مقیم رہے اور ان کے مدرسہ میں طلبائے مستعدین کا اجتماع ہوگیا ملتان ہی میں ان کا انتقال ہوگیا۔ دسویں صدی ہجری تک قلعہ (ملتان) پر ان کی قبر معلوم ومشہور تھی[4]

---

[1] چچ نامہ ص ۷ [2] فوائد الفواد ص ۱۹۱ تا ۱۹۲

[3] تاریخ اوچ ص ۱۴۴ - ۱۴۵

[4] تاریخ اوچ کا یہ بیان بھی غلط ہے کہ قطب الدین کاشانی کا انتقال اوچ میں ہوا اور جنگ پورہ میں دفن ہوئے (تاریخ اوچ ص ۱۴۴ - ۱۴۵

۶۲۵ھ / ۱۲۲۸ء میں ناصرالدین قباچہ شمس الدین التمش سے شکست کھاکر دریائے سندھ میں غرق ہوگیا۔ اس کے بعد اوچ کی مرکزی حیثیت ختم ہوگئی اور مغلوں کے پیہم حملوں کی وجہ سے یہ شہر خاصا تباہ و برباد ہوا۔ ناصرالدین قباچہ کے عہد کے بعد حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے زمانے میں اوچ کو سب سے زیادہ شہرت و عظمت حاصل ہوئی اور آج اوچ صرف ایک معمولی سے قصبہ کی صورت میں اپنے شان دارماضی کا نوحہ خواں ہے جس کا ذرہ ذرہ علم و عرفان کا روشن آفتاب اپنے اندر پوشیدہ رکھتا ہے [۱]

حضرت جلال سُرخ بخاری

حضرت جلال سرخ بخاری [۲]، مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے جدّ امجد، اپنے دور کے نامور شیخ اور خاندان بخاری کے ممتاز فرد ہیں۔

یہ وہ شخص [۳] ہیں جن کو بخارا سے ہند پاکستان آنے پر سب سے زیادہ شہرت نصیب ہوئی۔ پہلے ملتان پہنچے اور پھر کچھ عرصے بعد بھکر کا رخ کیا۔ وہاں کے ایک رئیس بدرالدین بن صدرالدین خطیب کی بیٹی سے عقد ہوگیا۔ [۴] بدرالدین بھکری کے مزید حالات نہیں ملتے۔ ابن بطوطہ ۷۳۴ھ / ۱۳۳۳ء میں بھکر پہنچا ہے۔ وہ بدرالدین، ان کے خاندان یا اولاد و احفاد کا کوئی ذکر نہیں کرتا۔ اس نے وہاں

---

[۱] اوچ ضلع بہاولپور (مغربی پاکستان) میں واقع ہے اسٹیشن ڈیرہ نواب صاحب (احمدپور شرقیہ) ہے وہاں سے اوچ کو بس جاتی ہے۔ یہ قصبہ تین حصوں اوچ بخاری ۲۔ اوچ گیلانی اور ۳ اوچ موغلاں پر مشتمل ہے۔

[۲] یہ بزرگ مختلف القاب اور اسماء میر سرخ، شریعت اللہ، ابوالبرکات، میر بزرگ، مخدوم اعظم جلال اکبر اور عظیم اللہ کے نام سے مشہور ہیں (خزینۃ الاصفیاء جلد دوم ص ۳۵)

[۳] سیر العارفین ص ۱۵۵ و تحفۃ الکرام ص ۳۶۷ از میر شیر علی قانع تھتوی (اردو ترجمہ از اختر رضوانی)

[۴] اخبار الاخیار ص ۶۱ خزینۃ الاصفیا جلد دوم ص ۳۷-۳۸، تحفۃ الکرام ص ۳۶۷ - ۳۸۹

کے تین بزرگوں یعنی امام عبداللہ حنفی، قاضی شہر ابوحنیفہ اور شیخ شمس الدین شیرازی کا ذکر کیا ہے[1] حضرت جلال سرخ بھکر سے ملتان منتقل ہو گئے اور اس انتقالِ سکونت کی وجہ یہ تھی کہ بعض اہل قرابت اور برادری کے لوگوں سے نزاع ہو گیا[2]۔ نواب صدیق حسن لکھتے ہیں[3]

نخستین از بخارا برآمده بخانقاه	بخارا سے نکل کر پہلے خانقاہ
شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا اقامت	شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا میں مقیم
گزید و کان ذالک فی سنتہ	ہوئے اور یہ واقعہ ۶۳۵ھ / ۱۲۳۷ء
ست مائتہ و خمس و ثلاثین میں ہوا۔	

تحفۃ الکرام میں تحریر ہے کہ جب وقت حضرت جلال سرخ بھکر میں پہنچے تو اس وقت ان کے ہمراہ ان کے دو فرزند علی اور جعفر تھے خزینۃ الاصفیاء کی روایت یہ ہے کہ یہ دونوں فرزند بخارا واپس چلے گئے اور پھر کبھی ہند پاکستان نہیں آئے۔ ممکن ہے ان کی واپسی میں آپس کے نزاع کو بھی دخل ہو، جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔

حضرت جلال الدین سرخ اپنے مرشد شیخ الاسلام بہاؤ الدین زکریا ملتانی کے انتقال کے بعد کچھ دنوں اور ملتان میں رہے اور پھر اپنے مرشد زادہ شیخ صدرالدین عارف کی اجازت و حکم سے اوچ میں سکونت پذیر ہوئے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ حضرت جلال سرخ کا اوچ میں آنا جانا ان کے مرشد کی زندگی میں ہو گیا تھا۔ مگر وہاں مستقل سکونت حضرت عارف

۱؎ سفرنامہ ابن بطوطہ جلد دوم صـ۱۸ (طبع کراچی)

۲؎ سیر العارفین صـ۱۵۵ اخبار الاخیار صـ۶۱ خزینۃ الاصفیاء جلد دوم صـ۳۵

۳؎ الفرع النامی من الاصل الناہی از نواب صدیق حسن خاں صـ۱۴
(مطبع صدیقی بھوپال ۱۳۰۱ھ)

کی اجازت سے اختیار کی، حضرت مخدوم فرماتے ہیں [۱]

"شیخ کبیر بہاء الحق والدین نے دعاگو کے دادا کو بعد تیس برس کے اچہ کی طرف بھیجا۔ بعد وفات شیخ کبیر کے، شیخ صدرالدین نے چند زمانہ رکھا بعد اس کے اجازت دی کہ اچہ میں ساکن ہو۔"

حضرت بہاء الدین زکریا کے انتقال (۶۶۱ھ / ۱۲۶۲ء) کے کچھ مدت بعد حضرت جلال سرخ اوچ میں پہنچے۔ مؤلف تاریخ اوچ لکھتے ہیں [۲] کہ ۶۶۱ھ / ۱۲۶۲ء میں حضرت جلال سرخ اوچ پہنچکر سکونت پذیر ہوئے۔ اس وقت اس مقام کا نام دیوگڑھ تھا، اور یہاں کا راجہ دیو سنگھ تھا۔ وہ حضرت کے رعب سے بھاگ گیا اور اس مقام کا نام اوچ ہوگیا۔ شیخ محمد اکرام صاحب نے اس بیان کو قبول کرلیا ہے [۳] حالانکہ یہ بات درست نہیں۔ اس شہر کا نام "اچہ" طبقات ناصری اور عوفی کے تذکرہ لباب الالباب اور چچ نامہ میں مذکور ہے۔ اور قباچہ کی حکومت کے بعد التمش کے زیر نگیں آیا۔ لہٰذا کسی راجہ کا یہاں قابض ہونا تاریخی حقائق کے خلاف ہے۔

حضرت جلال سرخ نے اوچ میں قیام کے بعد اصلاح و تبلیغ کا کام پوری مستعدی کے ساتھ شروع کردیا۔ علاقہ اوچ کی اقوام چدہر، ڈہر اور سیال وغیرہ نے حضرت کی ہدایت سے متاثر ہوکر اسلام قبول کیا [۴] مفتی غلام سرور لاہوری لکھتے ہیں [۵]

ہزارہا مخلوق خدا را بہدایت ہادی حقیقی	ہزارہا مخلوق خدا کو اللہ تعالیٰ کی ہدایت
براہ راست آورد و شہر جھنگ	سے راہ راست پر لائے اور شہر
سیالاں کہ در پنجاب مشہور معروف است	جھنگ سیالاں کی جو پنجاب میں مشہور و
بنا فرمود۔	معروف ہے بنیاد ڈالی

---

[۱] الدر المنظوم ص ۶۶۷-۷۶۸ [۲] تاریخ اوچ ص ۹۵ [۳] آب کوثر ص ۳۰۹

[۴] تاریخ اوچ ص ۹۸ [۵] خزینۃ الاصفیاء جلد دوم ص ۳۶

اس علاقہ کا ایک راجہ گھلو بھی حضرت جلال سرخ کے دست حق پرست پر مسلمان ہوا۔ جس کی اولاد ٹھٹھہ گھلواں، اوماڈرہ، جھمنڈ میانی، بیٹو واہی، چوٹالہ، خانواہ، ملک پور، صبراہ، کرم علی والا اور سعد اللہ پور (ضلع ملتان) کے مواضعات میں پھیلی ہوئی ہے [1]

تقریباً پچانوے سال کی عمر میں ۱۹ جمادی الاول ۶۹۰ھ ۱۲۹۱ء کو حضرت جلال سرخ کا وصال ہوا۔ سن وصال لفظ "مخدوم" سے برآمد ہوتا ہے [2] اس زمانے میں اوچ ایک وسیع قصبہ تھا اور حضرت جلال سرخ کا قیام اس موقعہ پر تھا جو موجودہ اوچ سے چھ کوس کے فاصلہ پر چناب رسول پور کے نام سے مشہور ہے اور وہیں پر دفن ہوئے۔ مگر دریا کی طغیانی کی وجہ سے حضرت جلال سرخ کی خاک پاک کو اس موقعہ پر منتقل کیا گیا، جو بیلونک بیلا کہلاتی ہے۔ یہاں دریا کی طغیانی نے مزار پر حملہ کیا پھر یہاں سے دوبارہ خاک کو نکال کر صدرالدین راجو قتال (ف ۸۲۷ھ ۱۴۲۴ء) کے مزار کے متصل دفن کیا گیا۔ پھر مخدوم محامد نوبہار اول نے ۱۰۲۶ھ ۱۶۱۷ء میں یہ ارادہ کیا کہ حضرت کی خاک پاک کو راجو قتال کے مقبرے سے نکال کر علیحدہ دفن کیا جائے۔ اس سلسلہ میں جنگ وجدال تک نوبت پہنچی چوتھی مرتبہ حضرت جلال سرخ کی خاک پاک یہاں سے نکال کر اس موقعہ پر دفن کی گئی جہاں اب مزار ہے [3]

حضرت کے مقبرہ کی موجودہ عمارت کو ۱۲۶۱ھ ۱۸۴۵ء میں نواب بہاول خاں ثالث امیر بہاولپور نے نہایت پائیدار صورت میں بنوایا۔ مقبرہ کے احاطے میں ایک کنواں اور تالاب کھدوایا پھر ۱۳۰۱ھ ۱۸۸۳ء میں نواب صادق محمد خاں رابع نے اس کی مرمت، وسعت اور خوبصورتی کا مزید اہتمام کیا۔ مقبرہ کے دروازہ پر یہ رباعی درج ہے [4]

یارب برسالت رسول الثقلین　　یارب بغزا کنندۂ بدر و حنین

عصیان مرا دو حصہ کن در عرصات　　نیمے بہ حسن بخش و نیمے بہ حسین

---

[1] تذکرہ صدرالدین عارف ص ۱۷۱

[2] تعجب ہے کہ مولوی نور احمد خاں فریدی مؤلف تذکرۂ صدرالدین عارف نے حضرت جلال سرخ کی تاریخ وفات ۶۸۵ھ لکھدی ہے جو قطعاً غلط ہے (تذکرہ صدرالدین عارف ص ۱۷۱)

[3] ملاحظہ ہو تاریخ اوچ ص ۹۷ - ۹۸　　[4] ایضاً

امام مالکؒ صاحب الموطا

از شاہ ولی اللہؒ [1]

قاضی عیاض کہتے ہیں کہ جس قدر اہتمام الموطا کا کیا گیا، کسی اور کتاب کا نہیں کیا گیا۔ متقدمین میں سے ابن عبدالبرؒ نے "التمہید والاستذکار" کے نام سے اس کی شرح لکھی۔ ابوالولید بن الصفار نے اپنی کتاب "المرغب" میں الموطا کے بہت سے شارحین کے نام گنائے ہیں۔ قاضی عیاض کی کتاب "مشارق الانوار" الموطا اور صحیحین دونوں کی شرح ہے۔ بعض علماء نے الموطا کی مسند تالیف کی ہیں۔ بعض نے اس کے اسمائے رجال سے بحث کی ہے اور اس کی منقطع احادیث کا اتصال کیا ہے الغرض اس کے بعد سے لے کر اب تک کوئی زمانہ ایسا نہیں گزرا کہ اس میں الموطا کی شرح و توضیح کرنے والے اور اس کی روایت اور اسناد سے بحث کرنے والے نہ ہوں یہاں تک کہ اس فقیر نے بعض اہل مکہ سے جملہ قرأتوں کے ساتھ اس کی مسلسل روایت کی ہے اور جیسا کہ اسے امام مالک سے سنا گیا تھا۔ اس کو بلا انقطاع سنا۔ غرض آج نہ صرف یہ کہ امام مالک کے اہل عصر کی کوئی کتاب موجود نہیں، بلکہ اس پر مستزاد یہ کہ یہ ایسی کتاب ہے جس کی سماعت مسلسل چلی آئی ہے۔

اور جہاں تک مسلمانوں کے ہاں الموطا کی مقبولیت کا تعلق ہے تو مالکیوں کا تو اس پر عمل ہے ہی

---

[1] اس کی پہلی قسط اکتوبر کے شمارے میں شائع ہوئی ہے۔

پھر مذہب شافعی کی اصل اور اس کی اساسِ اجتہاد بھی یہی المؤطا ہے۔ البتہ بعض مواضع میں امام شافعی نے اعتراضات کئے ہیں۔ اور بعض روایات کو ترجیح دینے میں اختلاف کیا ہے۔ اسی طرح امام محمد (بن الحسن شیبانی) کی فقہ جو المبسوط[1] وغیرہ میں ہے، اس کا سرمایہ اور رأس المال بھی المؤطا ہی ہے کیونکہ آثار ابو حنیفہ جو امام محمد اپنے استاد سے روایت کرتے ہیں، فقہ کے تمام مسائل کے لئے کافی نہ تھے

---

[1] امام ولی اللہ حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں :۔ امام ابو حنیفہ کے اصحاب میں شہرت کے اعتبار سے سب سے مشہور ابو یوسف ہیں۔ ہارون الرشید کے عہد میں وہ قاضی القضاۃ کے منصب پر فائز ہوئے، اور یہی سبب بنا اطرافِ عراق، خراسان اور ماوراء النہر میں حنفی مذہب کے فروغ کا اور اس کے مطابق نظام قضاء کے قیام کا۔ امام ابو حنیفہ کے اصحاب میں سے تصنیف و تالیف میں سب سے بہتر اور درس و تدریس کے معاملے میں سب سے بڑھ کر محمد بن الحسن تھے۔ ان کے حالات یہ ہیں کہ انہوں نے فقہ امام ابو حنیفہ اور ابو یوسف سے پڑھی پھر وہ مدینہ گئے۔ جہاں انہوں نے امام مالک سے موطا پڑھی اس کے بعد انہوں نے الگ بیٹھ کر غور و خوض کیا۔ اور ہر ہر مسئلے میں اپنے اصحاب کے مذہب کو المؤطا سے تطبیق دی۔ اگر ان کے اصحاب اور الموطا میں موافقت ہوئی تو فبہا، اور اگر انہوں نے دیکھا کہ صحابہ اور تابعین کی کوئی جماعت ان کے اصحاب کے مذہب سے متفق ہے تو خیر لیکن اگر انہوں نے دیکھا کہ ان کے ہاں ضعیف قیاس یا قدرے نرم تخریج ہے اور اس کے خلاف کوئی ایسی صحیح حدیث ہے جس پر کہ فقہا کا عمل ہے۔ یا اس قیاس اور تخریج کے خلاف اکثر فقہا کا عمل ہے تو وہ اسے ترک کر کے مذاہب سلف میں سے جو مذہب بھی ان کے نزدیک مرجح ہوتا، اسے اختیار کر لیتے۔ یہ دونوں (امام ابو یوسف اور امام محمد) ابراہیم نخعی اور ان کے ساتھیوں کے طریقے پر برابر عامل رہے، جیسا کہ امام ابو حنیفہ اس پر عامل تھے البتہ اس سلسلے میں ان میں مندرجہ ذیل دو چیزوں میں سے اختلاف ہوا۔ یا تو ابو یوسف اور محمد بن الحسن اپنے استاد امام ابو حنیفہ سے کسی ایسی تخریج کے بارے میں اختلاف کرتے جو انہوں نے ابراہیم نخعی کے طریقے پر کی ہوتی یا یہ کہ ابراہیم نخعی (باقی صفحہ ۳۵ پر

چنانچہ امام محمد اپنی المؤطا میں جو انہوں نے امام مالک سے روایت کی ہے، اکثر یہ جملہ لکھتے ہیں۔
"اور یہ میرا قول ہے اور ابو حنیفہ کا بھی یہی قول ہے۔"

اب رہی صحاح ستہ کے مؤلفین کے ہاں المؤطا کی مقبولیت تو اس ضمن میں یہ بات اتنی مشہور ہے کہ اس کے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں کہ جب امام بخاری بروایت مالکؒ کوئی متصل مرفوع حدیث پاتے ہیں، تو وہ اسے نظر انداز کر کے کسی دوسری روایت کی طرف بالکل متوجہ نہیں ہوتے، سوائے اس کے کہ امام مالک کی یہ روایت ان کی شرائط کے مطابق نہ ہو، لیکن اس صورت میں امام بخاری اس روایت کی تائید میں اور شواہد لاتے ہیں چنانچہ اس طرح اکثر مقامات میں وہ المؤطا کے آثار کی حدیث کے اشارات سے تائید کرتے ہیں۔

اور جہاں تک المؤطا کی ترتیب اور اس کے جملہ مسائل پر حاوی ہونے کا تعلق ہے، تو اس سلسلے میں یہ بات مخفی نہیں رہنی چاہیئے کہ صحابہ اور تابعین کے زمانے میں علم کی کتابی شکل میں تدوین نہیں ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ عمر بن عبدالعزیز مسندِ خلافت پر فائز ہوئے اور آپ

(بقیہ صفحہ ۳۴) اور ان کے ساتھیوں سے مختلف اقوال مروی ہوتے اور ان کے استاد امام ابو حنیفہ نے ان اقوال میں سے کسی ایک کو ترجیح دی ہوتی، تو وہ اس ترجیح کے متعلق اپنے استاد سے اختلاف کرتے
محمد بن الحسن نے تصنیف و تالیف کو اپنایا اور ان تینوں کی رایوں کو جمع کر دیا۔ جس سے ایک کثیر مخلوق کو فیض پہنچا۔ چنانچہ امام ابو حنیفہ کے اصحاب نے ان تصانیف کو موضوع بحث بنایا ان کی تلخیص کی ان کی تقریبیں لکھیں۔ ان کی شرح و تخریج کی اور ان سے استدلال کیا۔ پھر یہ اصحاب خراسان اور ماوراء النہر میں پھیل گئے۔ اور ان کا مذہب، مذہبِ ابو حنیفہ کہلایا۔ (عبیداللہ سندھی دیوبندی)

نے اپنے عہد کے فقہاء کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سنن اور عمر (رضی اللہ عنہ) کے آثار جمع کرنے کا حکم دیا۔ سب سے پہلے ابن شہاب الزہری نے اس کام کو شروع کیا، لیکن وہ اس ضمن میں کوئی ترتیب یا تبویب ملحوظ نہیں رکھتے تھے۔ ان کے بعد طبقہ ثالث کے بڑوں نے تبویب اور تصنیف کا کام اپنے ہاتھ میں لیا۔ چنانچہ ربیع بن صبیح اور سعید بن ابی عروبہ نے علم کے بعض پہلو مدوّن کئے ان کے بعد امام مالک نے احکام سے متعلق جو امور تھے، وہ مدون کئے۔ فقہ کے تمام ابواب پر بحث کی، اور اہل حجاز کی جو قومی احادیث تھیں، انہیں جمع کیا۔ اور ان کی مرسل روایات، بلاغات، اقوال صحابہ اور تابعین کے فتاوی سے شرح کی۔ اور اسی منہج اور طریقے پر مکہ میں ابن جریج، شام میں الاوزاعی، کوفے میں الثوری، بصرہ میں حماد بن سلمہ، واسط میں ہشیم، یمن میں معمر، خراسان میں ابن المبارک اور رے میں جریر بن عبدالحمید تصنیف و تالیف میں لگ گئے۔ دوسری ہجری کے گزرنے کے بعد مسانید کی تصنیف ہونے لگی اور آثار وغیرہ سے احادیث نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو علیحدہ کیا جانے لگا۔

امام مالک نے پہلے الموطا میں دس ہزار حدیثیں جمع کی تھیں۔ پھر وہ برابر ان کی جانچ پڑتال کرتے رہے۔ اور ان کو بتدریج کم کرتے گئے، یہاں تک کہ ان کی وہ تعداد رہ گئی جو اس وقت الموطا میں ہے۔ ابو حاتم رازی سے پوچھا گیا کہ اس کتاب کا نام الموطا کیوں ہے؟ انہوں نے کہا کہ امام مالک نے اس کتاب کو مرتب کیا۔ پھر اسے ہموار کر کے لوگوں کے لئے آسان بنایا جس کی وجہ سے اس کا نام موطا مالک بن انس پڑ گیا۔ جب امام مالک نے یہ کتاب تالیف کی تو بہت سے دوسرے علماء نے بھی ایسی کتابوں کی تالیف شروع کر دی۔ اس پر امام مالک سے کہا گیا کہ آپ نے اس کتاب کی تالیف میں اپنی جان کو خواہ مخواہ تکلیف میں ڈالا۔ اب دیکھئے اور لوگوں نے بھی ایسی کتابیں مرتب کر لی ہیں امام مالک نے جواب میں فرمایا کہ تم دیکھو گے کہ ان کتابوں میں سے صرف اسی کو مقبولیت حاصل ہو گی۔ جو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے حصول کے لئے لکھی گئی ہے۔ چنانچہ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ ان کتابوں کا لوگوں نے نام لینا چھوڑ دیا

گویا جیسے وہ سب کی سب کنوئیں میں پھینک دی گئی ہوں۔

ایک دن امام مالک نے مطرف بن عبداللہ سے پوچھا کہ لوگ میری کتاب المؤطا کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔؟ انہوں نے کہا کہ دو طرح کے لوگ ہیں۔ جو دوست ہیں، وہ تو تعریف کرتے ہیں اور جو حاسد ہیں، وہ افترا باندھتے ہیں۔ امام مالک نے فرمایا کہ اگر تمہاری عمر دراز ہوئی، تو تم دیکھو گے کہ اللہ تعالیٰ کو اس کتاب کے بارے میں کیا منظور ہے۔ ابوبکر الابہری کہتے ہیں کہ المؤطا میں کل مرفوع احادیث اور موقوف و مقطوع آثار مل ملا کر ایک ہزار سات سو بیس حدیثیں ہیں ان میں سے مسند چھ سو ستر، مرسل دو سو بائیس، موقوف چھ سو ستر، اقوال تابعین دو سو پچھتر ہیں۔ ابن حزم کا قول ہے کہ میں نے المؤطا کے مندرجات کا شمار کیا۔ میں نے اس میں مسند کوئی پانچ سو سے اوپر اور مرسل کوئی تین سو سے اوپر پائیں۔ باقی اللہ بہتر جانتا ہے (یہ امر مخفی نہ رہے کہ امام مالک کے بعد فقہا اور محدثین نے تسلسل افکار و علوم کی وجہ سے احادیث کی تبویب اور مسائل کی ترتیب میں مہارت حاصل کر لی ہے) اس لئے فقیر نے المؤطا کی احادیث کو کتب فقہ کی ترتیب پر مرتب کرنے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کی، جیسا کہ تم اس کتاب میں دیکھو گے اور توفیق دینے والا تو اللہ تعالیٰ ہی ہے۔"

اب ہم اپنی اس گفت گو کو سعدون کے ایک بلیغ قصیدے پر ختم کرتے ہیں، جس میں اس نے لوگوں کو المؤطا کی طرف دعوت دی ہے۔ (عربی اشعار کا ترجمہ حسب ذیل ہے)

میں اس شخص سے جو حدیث کی روایت کرتا اور اسے لکھتا ہے۔ اور فقہ کی راہوں پر چلنے والا اور اس کا طالب ہے کہتا ہوں۔

اگر تو اللہ تعالیٰ کے ہاں عالم کہے جانے کا خواہش مند ہے، تو یثرب (مدینہ) میں جو علم جمع ہوا تھا، اس سے تجاوز نہ کرنا۔

کیا تو اس سرزمین کو چھوڑے گا، جس کے گھروں میں جبرائیل مُقربِ (خداوندی) صبح و شام آتے تھے۔

اور جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی۔ آپؐ کے صحابہ نے آپؐ کی سنت کو اپنایا۔ اور اس سے تربیت حاصل کی۔

اور جہاں صحابہ میں سے ہر اس شخص نے جو صاحب مذہب تھا۔ تابعین میں علم کی نشر و اشاعت کی۔

مالک نے لوگوں کے عمل کے لئے اس علم کو خالص کیا۔ حالانکہ اس علم کی روایات کچھ صحیح اور کچھ ضعیف ہیں آپ نے روایات کی تصحیح کر کے ان کی کمزوری واشگاف کی۔ اور روایات کی تصحیح ہی تو ان کی تمام امراض کی مجرب دوا ہوتی ہے۔

اگر المؤطا کا نور رات میں چلنے والے کے لئے روشن نہ ہوتا، تو اسے کچھ نظر نہ آتا اور وہ نہ جانتا کہ اسے کہاں جانا ہے۔

مؤطائے مالک کی طرف اس کے ہاتھ سے جانے سے پہلے ہی لپکو اور اگر وہ ہاتھ سے چلی گئی تو پھر حق تک رسائی نہیں ہو سکے گی۔

ہر علم کو جس کے تم خواہاں ہو، مؤطا کی وجہ سے چھوڑ دو۔ کیونکہ باقی علم بمنزلہ ستارے کے ہیں اور مؤطا آفتاب ہے۔

وہ جڑ ہے اور اس کے اچھے ہونے کی وجہ سے اس سے جو شاخیں پھوٹی ہیں، وہ بھی اچھی ہیں اور جب جڑ اچھی ہو، تو اس کی شاخیں کیوں اچھی نہ ہوں گی۔

اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کی کتاب کے بعد المؤطا ہی وہ علم ہے جس میں لسانِ صدق حق کے ساتھ گویا ہے۔

اور اس کے آثار اس کی شہادت دیتے ہیں اور تمام جہانوں میں اس کا کوئی جھٹلانے والا نہیں اہل حجاز اسی پر فخر کرتے ہیں۔ عراق میں بھی یہی المؤطا محبوب ہے جس شخص کے گھر میں المؤطا کی کتابیں نہ ہوں یوں سمجھو کہ وہ گھر خدا کی برکت سے خالی ہے۔

کیا تم اس پر تعجب کرتے ہو کہ امام مالک کا ان کی زندگی میں اتنا بلند مقام تھا۔ لیکن موت کے

بعد انہیں جو سر بلندی ملی، وہ اور بھی زیادہ تعجب خیز ہے اللہ تعالیٰ مالکؒ کو اس کے مؤطا کے عوض ہماری طرف سے زیادہ سے زیادہ جزائے خیر دے۔ جو کہ ایک فرزانہ و پاکیزہ اخلاق والے کو مل سکتی ہے۔

آپ نے اپنی مرویات کی بڑی اچھی تلخیص کی، جیسے کہ کوئی اللہ تعالےٰ سے ڈرنے والا اور اس سے ہیبت کھانے والا کرے۔

وہ زندگی اور موت دونوں میں اہل علم سے فوقیت لے گئے ـــــ چنانچہ اب لوگوں میں ان کا نام بطور ضرب المثل لیا جاتا ہے۔

وہ محض اپنے تقویٰ اور خشیت الٰہی کی وجہ سے فوقیت لے گئے کیونکہ ان کی رضا اور ان کا غضب اللہ ہی کے لئے ہوتا تھا۔

ہر برسنے والی بدلی ان کی قبر کو سیراب کرے، اور یہ بدلی ایسی ہو کہ برابر برستی ہی رہے۔

مجھے اس امر پر انشراحِ صدر اور یقین ہو گیا ہے کہ روئے زمین پر اللہ کی کتاب کے بعد صحیح ترین کتاب المؤطا ہے، اسی طرح مجھے اس بات پر بھی پورا یقین ہو گیا ہے کہ جس شخص کے پیش نظر تدقیق و تحقیق ہو، اس پر آج اجتہاد اور فقہ کی تحصیل کا راستہ (یعنی تفصیلی دلائل سے احکام شرعی معلوم کرنا) بند ہے سوائے اس کے کہ یہ تحقیق کا طالب الموطا کو اپنا نصب العین بنائے۔ اور اس کی مرسل احادیث کے اتصال اور ائمہ محدثین کی کتابوں کا مطالعہ کر کے صحابہ اور تابعین کے اقوال کے ماخذ معلوم کرنے کی جدوجہد کرے۔ اس کے بعد وہ (مذاہب فقہ میں) فقہائے مجتہدین کے مسلک پر گامزن ہو۔ یعنی الفاظ کے مفہوم کو محدود کرنے، دلائل کو تطبیق دینے، رکن و شرط و آداب کی توضیح کرنے، جامع و مانع قواعد کلیہ کے اخذ کرنے احکام کی علتوں کو جاننے اور ان کی عمومی و خصوصی علّت کے لحاظ سے تعمیم و تخصیص کرنے اور اس طرح کے دوسرے امور میں بعد ازاں وہ امام شافعی وغیرہ کے تعقبات کو جیسے کہ امام محمد بن الحسن کے امام مالک سے روایت کردہ

الموطا اور کتاب الحج کے تعقبات ہیں، سمجھنے کی کوشش کرے اس کے بعد جو مختلف اقوال ہیں، ان کی تطبیق اور ان میں سے جو احسن ہو، اس کی ترجیح میں کوشاں ہو۔ اور اس طرح وہ ان مسائل میں دلائل کی بنا پر یقین یا غالب ظن کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے احکام کی معرفت حاصل کرے۔ یہ جو اجمالاً کہا گیا، اس کی تفصیل یہ ہے۔

ہر زمانے میں اجتہاد فرضِ کفایہ کی طرح ضروری ہے یہاں اجتہاد سے مراد استقلالی اجتہاد نہیں جیسے کہ امام شافعی کا اجتہاد تھا۔ کیونکہ امام شافعی نہ تو رجال روایت کے حسن و قبح یعنی ان کی تعدیل و تجریح میں اور نہ الفاظ کے معانی وغیرہ کے تعین کے لئے کسی اور کے محتاج تھے اور اسی طرح وہ اجتہادی فہم و درایت کے جملہ انواع میں بھی کسی اور کے تابع نہ تھے۔ بلکہ وہ اس زمانے کی اصطلاح میں مجدد مُلہم تھے۔ یہاں اجتہاد سے ہماری مراد "اجتہاد منتسب ہے"۔ اور وہ عبارت ہے تفصیلی دلائل سے احکام شرعی کی معرفت اور مجتہدین کے طریقے پر ضمنی احکام کی تخریج و استنباط اور ترتیب سے، خواہ یہ کسی "صاحب مذہب" کے قواعد کے تحت ہی ہو۔ یہ جو ہم نے کہا ہے کہ اجتہاد ہر زمانے میں فرض ہے[۱]۔ (اہل علم میں سے محققین کے ہاں یہ امر تسلیم شدہ ہے) تو اس کا باعث اور سبب یہ ہے کہ مسائل بڑی کثرت سے وقوع پذیر ہوتے ہیں اور وہ غیر محدود ہیں۔ اور ان کے بارے میں

۱۔ فقہ حنفی کی کتاب ہدایہ میں ہے:۔ قاضی کا منصب قضا پر تقرر اس وقت تک صحیح نہیں ہوتا جب تک کہ ایک تو اس میں شہادت کی تمام شرائط پائی جائیں اور دوسرے وہ اہل اجتہاد میں سے ہو۔ اجتہاد کے بارے میں اصول فقہ میں بحث کی گئی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ اگر وہ "صاحب حدیث" ہے تو اسے فقہ کی معرفت ہو، تاکہ وہ آثار کے معانی جان سکے اور اگر "صاحب فقہ" ہے، تو اسے حدیث کی معرفت ہو، تاکہ جہاں نص موجود ہو" وہاں وہ قیاس سے کام نہ لے۔ نیز ضروری ہے کہ قاضی ذہانت و فطانت سے بہرہ ور ہو، اور اس کے ساتھ ساتھ وہ لوگوں کی عادات سے واقف ہو۔ کیونکہ بعض احکام ایسے ہوتے ہیں، جن کی بنیاد ان پر ہوتی ہے

(عبیداللہ السندھی الدیوبندی)

اللہ کے حکم کو جاننا واجب ہے۔" اور جو کچھ مدون و مکتوب شکل میں موجود ہے، وہ ناکافی ہے۔ پھر اس میں بہت اختلافات ہیں اور دلائل کی طرف رجوع کئے بغیر ان کا حل ممکن نہیں۔ علاوہ ازیں ائمہ مجتہدین سے جو مسائل مروی ہیں ان کے طریقہ ہائے روایت اکثر منقطع ہیں، جس کی وجہ سے ان پر اعتماد کر کے دل کو اطمینان نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ ان مروی مسائل کو اجتہاد و تحقیق کے قواعد کی کسوٹی پر پرکھے بغیر بات نہیں بنتی۔

یہ جو ہم نے کہا ہے کہ اجتہاد کا راستہ سوائے اس جہت کے جس کا اوپر ذکر ہوا بند ہے، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ جو مرفوع احادیث ہیں، وہ اکیلی سارے احکام کے لئے کافی نہیں، اس لئے لامحالہ صحابہ اور تابعین کے آثار کی ضرورت پڑتی ہے۔ اب صورت یہ ہے کہ سوائے المؤطا کے، اس وقت صحابہ اور تابعین کے ان آثار پر کوئی بھی ایسی جامع کتاب نہیں، جو علماء کی "مخدوم" ہو اور مجتہدین کے ایک طبقے کے بعد دوسرے طبقے نے اس پر غور و خوض کیا ہو۔ اس شخص کو جو کتب ماثورہ (احادیث و آثار) سے جو کہ اصول شرع کی حیثیت رکھتی ہیں، واقف ہے۔ نیز وہ ان کے بارے میں اہل علم کی رائے اور ان کی شرح کے سلسلے میں مجتہدین کے نقطہ ہائے نظر کو جانتا ہے المؤطا کے اس امتیاز کے متعلق کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ باقی رہے اس زمانے کے کوتاہ عقل اور مغفل جو کلی طور سے اس حقیقت کا انکار کرتے ہیں اور وہ نکیل ڈالے ہوئے اونٹوں کی طرح ادھر ادھر

لہ فقہ حنفی کی کتاب ہدایہ میں ہے:۔ بے شک استنباط و استخراج کرنے والے متقدمین نے ہر جلی و دقیق مسئلے کے متعلق احکام وضع کئے ہیں۔ لیکن حوادث برابر واقع ہوتے رہتے ہیں، اور امور اتنے در پیش آتے ہیں کہ وہ محدود نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ جو اصول و احکام مرتب ہو چکے ہیں ان سے اقتباس کر کے نئے مسائل کا حل اور پہلی مثالوں کو سامنے رکھ کر ان سے نتیجہ نکالنا اصحاب علم کا کام ہے۔ اور ماخذوں کی واقفیت ایک ایسی چیز ہے کہ اسے مضبوطی سے پکڑا جائے۔

عبیداللہ السندھی الدیوبندی

ہنکائے جاتے ہیں، اور نہیں جانتے کہ وہ کدھر جا رہے ہیں، ان کا تو معاملہ ہی دوسرا ہے وہ ایک اور وادی میں ہیں اور انہیں ان امور کو سمجھانا ناممکن ہے۔

خلق اللّٰہ للحروب رجالاً
ورجالاً لقصعۃ وثریدٌ[1]

المؤطا کی ان خصوصیات نے پہلے تو میرے اندر یہ اشتیاق پیدا کیا کہ میں اسے روایت کروں۔ اور پھر یہ کہ اس کی شرح کروں۔ چنانچہ میں نے اس کے فقہی مسائل کو کتب فقہ کی ترتیب پر مرتب کیا اور ہر باب میں اس کے مناسب جو آیات شریفہ تھیں، ان کا اضافہ کیا۔ نیز ان آیات اور احادیث کا فارسی میں ترجمہ کیا (جو اس عصر میں ہندوستان کی اسلامی سلطنت کی رسمی زبان تھی)، میں نے اس کے غریب و نامانوس الفاظ کی شرح کی۔ اور ہر مسئلے میں فقہاء کا جو اختلاف ہے، اسے بیان کیا۔ پھر میں نے نصوص میں وارد شدہ الفاظ کی تحدید کی۔ ہر حکم کی علت کا جس طرح استخراج واستنباط کیا گیا ہے، اس کی کیفیت بیان کی۔ اور اس طرح جیسے جامع و مانع قواعد کلیہ تک پہنچا گیا، اس کا ذکر کیا اور مؤطا امام مالک پر امام شافعی وغیرہ کے جو تعقبات ہیں، انہیں بیان کیا۔ شاید اس سے آپ سمجھ جائیں گے کہ یہ سب امور اجتہاد کے گہرے اسرار میں سے ہیں۔

علاوہ ازیں میں نے المصفّی میں مرسل احادیث کا اتصال کیا۔ اور علوم محدثین کے اسرار و غوامض کے سلسلے میں صحابہ اور تابعین کے جو اقوال ہیں، ان کے ماخذ بیان کئے۔ اب اگر اس زمانے کے لوگوں کے ذہن اس جیسی چیز لانے سے قاصر ہیں اور وہ اس کی صحیح قدر و قیمت نہیں جانتے تو انہیں معذور سمجھنا چاہیئے کیونکہ وہ تو مجتہدین و محدثین ہر دو کے علوم کے اسرار و غوامض سے پہلوتہی کئے ہوئے ہیں۔ اور انسان کی یہ فطرت ہے کہ وہ جس چیز سے ناواقف ہو وہ اس کا دشمن بن جاتا ہے۔

---

[1] اللہ تعالیٰ نے بعض لوگ جنگوں کے لئے پیدا کئے ہیں، اور بعض صرف نا و نوش کے لئے۔

قواعد۔ امام مالک جو تبع تابعین کے دور کے ترجمان ہیں، ان کی کتاب سے یہ قواعد مستنبط ہیں۔

تمہیں یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ فقہ امام مالک کی بنا اوّلاً حدیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ہے، وہ حدیث مسند ہو یا اصحاب ثقہ کی مروی شدہ مرسل۔ اس کے بعد فقہ امام مالک کی بنا عمر (بن الخطاب) کے فیصلوں پر ہے۔ بعدازاں ابن عمر کے فتووں اور ان کے عمل پر ہے۔ اس کے بعد دوسرے صحابہ کے فتاویٰ اور فقہائے مدینہ کے فتاویٰ پر، جن کے نام یہ ہیں: سعید بن المسیب عروہ بن زبیر، قاسم، سالم، سلیمان بن یسار، ابوسلمہ، ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن حارث بن ہشام، ابوبکر بن عمرو بن حزم اور خلیفۃ المسلمین عمر بن عبدالعزیز وغیرہم۔

امام مالکؒ نے اپنی فقہ کی بنیاد عمر (بن الخطاب) کے فیصلوں پر جو رکھی ہے، تو وہ اس لئے کہ عمر (بن الخطاب) کی رائے اکثر وحی وتنزیل کے مطابق ہوتی تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث ہے:۔ آپؐ نے فرمایا۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں نے خواب میں دودھ پیا۔ اور جو اس میں سے بچا، وہ عمر (بن الخطاب) کو دیا۔ آپؐ نے اس کی تعبیر علم سے کی۔ یہی وجہ ہے کہ غالب اوقات میں عمر (بن خطاب) کے فیصلوں پر صحابہ کا اجماع ہوا کرتا تھا۔ باقی امام مالک کا ابن عمر کے عمل کو اپنی فقہ کی بنیاد بنانا، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ بڑے بڑے صحابہ نے ابن عمر کی استقامت کی شہادت دی ہے اور اس معاملے میں دوسرے صحابہ پر جو باہمی جنگوں (فتنہ) کے بعد باقی رہ گئے تھے) ان کی فوقیت مانی ہے۔ حذیفہ کا قول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات پر ہمیں جس حال میں چھوڑا، عمر بن الخطاب) اور عبداللہ بن عمر کے سوا ہم میں سے کوئی ایسا نہیں، جس نے اس حال میں کوئی تغیر وتبدل نہ کیا ہو۔

مالک کہتے ہیں کہ ابن شہاب نے کہا کہ ابن عمر کی رائے سے اعراض نہ کرنا۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ساٹھ سال تک زندہ رہے، اور ان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کا کوئی امر مخفی نہ تھا۔ ام المومنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں:۔ عبداللہ بن عمر سے بڑھ کر ہم

نے کسی کو "امر اول" کا التزام کرنے والا نہیں پایا۔ محمد بن الحنفیہ کہتے ہیں۔ ابن عمر اس امت کے بہترین آدمی تھے۔ سعید بن جبیر کہتے ہیں کہ میں نے ابن عمر، ابوہریرہ اور ابو سعید وغیرہم کو دیکھا ہے ان کی رائے تھی کہ ان میں سے کوئی بھی سوائے ابن عمر کے اس حال پر نہیں ہے، جس پر کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے چھوڑا تھا۔ جابر کا قول ہے کہ اگر تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کو اس حال میں دیکھنے کی مسرت حاصل کرنا چاہو کہ ان میں کوئی تغیر و تبدل نہ ہوا ہو۔ تو عبداللہ بن عمر کو دیکھو، ہم میں سے کوئی نہیں، جو نہ بدلا ہو۔ ابوجعفر کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے کوئی ایسا نہ تھا کہ جو کچھ وہ آپؐ سے سنے، اس میں کسی طرح کا اضافہ یا کمی کرنے میں ابن عمر سے زیادہ محتاط ہو۔ نافع کا قول ہے۔ اگر تم ابن عمر کو دیکھتے کہ وہ کس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آثار کی ٹوہ میں رہتے ہیں، تو تم انہیں مجنوں کہتے۔ جعفر بن محمد اپنے باپ سے اور وہ اپنے دادا علی بن الحسین سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا۔ ابن عمر سب سے بڑھ کر زاہد اور سب سے بڑھ کر صحیح الرائے تھے۔ (یہ سب روایات الحاکم نے المستدرک میں بیان کی ہیں۔)

عبداللہ بن عمر کی استقامت روی کی دلیل یہ ہے کہ وہ باہمی جنگوں کے فتنوں سے بالکل بے تعلق رہے۔ اور ان میں مداخلت نہیں کی۔ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر اس شرط پر بیعت کی کہ وہ کسی مسلمان کے خلاف جنگ میں شریک نہیں ہوں گے اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ان کی یہ شرط مان لی تھی۔ اسی وجہ سے ابن عمر حضرت علی کی جنگوں میں شریک نہیں ہوئے۔ نافع کہتے ہیں:۔ ابن عمر کعبہ میں داخل ہوئے اور میں نے انہیں سجدہ میں یہ کہتے سنا (اے رب!) تو جانتا ہے کہ یہ تیرا خوف ہی ہے جو مجھے اس دنیا کے متعلق قریش کی مزاحمت کرنے سے مانع ہے۔

اب رہا امام مالک کا اپنی فقہ میں اہل مدینہ کے تابعین کے اقوال اختیار کرنا۔ تو بات یہ ہے کہ مدینہ ملکوں کی روح اور شہروں کا دل تھا۔ اور علماء یہاں وقتاً فوقتاً آتے اور اہل مدینہ کے

سامنے اپنی آراء پیش کرتے تھے - اور یہ اس لئے کہ اہل مدینہ کے پاس مصفّا اور منقّح شکل میں علوم تھے، جو دوسروں کے ہاں نہیں تھے چنانچہ سوائے ان چھ کے امام مالک کے سارے مشائخ اہل مدینہ ہیں سے ہیں - اور یہ چھ حسب ذیل ہیں -

ابوالزبیر المکی، حمید الطویل، اور ایوب السختیانی بصرے سے - عطار بن عبداللہ خراسان سے، عبدالکریم جزیرہ سے، اور ابراہیم بن ابی عیبلہ شام سے -

---

ارشاد فرمایا - جس طرح طریقہ باطن کے چار اصول ہیں :- چشتیہ، قادریہ، نقشبندیہ اور سہروردیہ، اور یہ سب جدا جدا ہیں - جب ان چہار سلسلہ سے واقفیت ہو جاتی ہے، سب کو اچھی طرح سمجھنے لگتا ہے، اس طرح چاروں اماموں کے چاروں طریقے بہت خوب ہیں - اور ہر ایک کے یہاں اپنے اپنے طریقے کی رعایت اور حجت موجود ہے - چنانچہ امام مالک قراء سبعہ کو جن کو صحابہ کرام سے صحتِ سند حاصل تھی، معتبر سمجھتے تھے - اور امام مالک نے کوفی اور عراقی احادیث کو ترک فرما کر مدینہ کی روایات اور احادیث کو اپنے لئے معمول بہا بنایا تھا - اسی طرح امام شافعی نے تمام حدیثوں کو جمع کیا اور ان میں سے جن کو مرجح، صحیح اور مستند سمجھا، ان کو قابل عمل گردانا، باقی کو ترک فرما دیا - اور امام احمد بن حنبل نے ظاہر حدیث پر اپنے عمل کی بنا رکھی .- امام اعظم ارشاد فرماتے ہیں کہ جب کوئی حدیث میرے سامنے آتی ہے، تو میں اس کو تمام شریعتوں کے ساتھ مطابق کرتا ہوں - اگر موافق پاتا ہوں اس کو قبول کر لیتا ہوں ورنہ نہیں - لیکن اس کو ردّ نہیں کرتا بلکہ اس کے مطالب اور معنی کو اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ یا اس میں احکام سیاست ہوتے ہیں یا تحقیقی .... حدیث کے ظاہری معنی کو امام اعظم ترجیح نہیں دیتے بلکہ جو کچھ بھی قرآن اور حدیث مشہور کے اصول کلیہ کے خلاف پاتے، اس کو پسند نہیں فرماتے تھے، بلکہ باہم تطبیق دینے کے لئے تاویل کر کے مشترک معنی لیتے -

(ماخوذ از ملفوظات شاہ عبدالعزیز)

قرآنی انقلاب کے مراکز

مولانا محمد صدیق احمد

قرآن حکیم کے بغور مطالعہ سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے، جو بدقسمتی سے گزشتہ صدیوں میں اکثر نظروں سے اوجھل رہی کہ تمام انبیائے کرام اپنے اپنے زمانے میں اپنی قوم کو دعوتِ انقلاب دیتے رہے ہیں۔ چنانچہ قرآن حکیم میں جن انبیاء کی دعوتوں کا ذکر ہے، اگر ان کے فکری وعملی متضمنات پر غور کیا جائے تو ان کی تعلیم کی انقلاب آفرینی واضح ہو جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی انبیاء کی ان دعوتوں کے ذیل، جن کا ذکر قرآن حکیم نے کیا ہے، ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ان میں سے بیشتر انبیاء کی انقلابی دعوت صرف اپنے قومی معاشرے تک محدود رہی بے شک ان میں سے بعض ایسے انبیاءؑ بھی ہیں، جن کی دعوت بین الاقوامی تھی۔ ان میں سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام آتے ہیں۔ تاریخ انسانیت میں ان کی دعوت حنیفیت بہت بلند مقام رکھتی ہے۔ آج دنیا کے جو تین بڑے مذاہب ہیں، اسلام، عیسائیت، اور یہودیت، یہ سب کے سب حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی کو اپنا پیشوا مانتے ہیں۔ سیدنا ابراہیمؑ نے اپنی دعوت کے دو مرکز قائم کئے تھے۔

۱۔ ارض فلسطین، جس میں مشہور شہر القدس ہے۔ یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے فرزند سیدنا اسحاقؑ تھے۔

۲۔ سرزمین حجاز، جہاں سیدنا اسمٰعیلؑ آباد ہوئے۔ اور اسے اپنی دعوت کا مرکز بنایا۔

القدس کے مرکز کے خادم اور کار پرداز بنی اسرائیل کہلائے۔ جو سیدنا اسحاقؑ کے صاحبزادے سیدنا یعقوبؑ کی طرف منسوب ہیں۔ اگرچہ بنی اسرائیل نے حضرت ابراہیمؑ کی دعوت حنیفی کو اپنایا، لیکن انہوں نے اسے صرف اپنی نسل تک اس طرح محدود کر دیا کہ یہ بین الاقوامی اور انسانیت گیر دعوت بنی اسرائیل کی قبائلی اور نسلی دعوت بن کر رہ گئی گو قدرت نے اس دعوت کو عمومی بنانے کا سامان بھی کیا۔ اور بنی اسرائیل ارض فلسطین سے نکل کر دور دور کے ملکوں میں منتشر ہونے پر مجبور ہوئے۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے غیر بنی اسرائیل کو اس دعوت میں شریک نہ کیا۔ آخر کار حکمت الٰہی نے عین اس وقت جب کہ تاریخ میں مختلف قوموں کے باہم قریب ہونے کے اسباب پیدا ہو رہے تھے، دعوت حنیفیت کی ذمہ داری بنی اسمٰعیل پر ڈالی، اور اسلام اس کا ترجمان و داعی بنا۔

بنو اسمٰعیل کا سب سے بڑا مرکز مکہ مکرمہ تھا، جو وادی غیر ذی زرع تھا۔ یہاں کے رہنے والوں کو کسب معاش کے لئے تجارت کے سلسلہ میں ادھر ادھر کے سفر کرنے پڑتے تھے، جس کی وجہ سے وہ "قید مقامیت" سے بہت حد تک آزاد تھے۔ جب حکمت الٰہی نے مکہ مکرمہ میں آباد قریش کو دعوت حنیفیت کی خدمت کے لئے منتخب کیا، تو ان کی تعلیم و تربیت کے لئے ایک جلیل القدر نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث فرمائے۔ دعوت حنیفیت کے اس دور میں جس کا آغاز آپؐ کی زیر ہدایت ہوا، قریش جو دائرہ اسلام میں داخل ہوئے اس دعوت کے پہلے کار پرداز بنے، اور اس دعوت کو انہوں نے آگے بڑھایا۔ شروع شروع میں یہ انقلابی جماعت عدم تشدد پر عامل رہی، اور اس کے ہاں قتل و قتال ممنوع قرار پایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تربیت کے فیضان سے اس جماعت کا ایک ایک فرد ایمان و یقین اور ثبات و استقامت کا گویا ایک پہاڑ تھا۔ جسے مخالفین کی تمام سختیاں اور ایذائیں اپنی جگہ سے سر مو نہ ہٹا سکیں۔ اور وہ اسلام لانے کے بعد اس دعوت کی انقلابیت اور فعّالیت کا پیکر بن گیا۔ اس دور میں رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مکہ مکرمہ میں جو "ریاست" (STATE) بروئے کار تھی، اسے امام ولی اللہؒ نے خلافت باطنہ کا نام دیا ہے۔ اس دور میں مسلمانوں نے اپنا جماعتی نظام اندرونی لحاظ سے اتنا مضبوط کر لیا تھا کہ جب وہ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ

پہنچے اور وہاں انہیں خلافت ظاہرہ کا نظام حکومت قائم کرنا پڑا، تو اس میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ اور وہ اس میں کامیاب رہے۔ یہ دعوت اس دور میں بھی جب کہ وہ مکہ، مدینہ اور اس کی آس پاس کی بستیوں تک محدود تھی اپنے اندر بین الاقوامی رنگ لئے ہوئے تھی۔ چنانچہ جہاں اس میں قریش انصار اور دوسرے عرب قبائل کے افراد شامل ہوئے، وہاں اس کی صفوں میں ہم بلال حبشی، صہیب رومی، سلمان فارسی اور دوسرے غیر عرب افراد نمایاں دیکھتے ہیں۔ اور ان میں سے مثال کے طور پر حضرت بلال حبشی رضؓ کی اتنی قدر و منزلت تھی کہ امیر المومنین حضرت عمر بن الخطاب سیدنا بلال کہہ کر پکارتے تھے۔

مکہ مکرمہ قرآنی انقلاب کا پہلا مرکز تھا۔ تیرہ سال کی تگ و دو کے دوران اس مرکز میں ایک انقلابی جماعت تیار ہوتی ہے، اور وہ مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ پہنچتی ہے اور اسے اپنا مرکز بناتی ہے۔ یہاں خلافت ظاہرہ کی تاسیس ہوتی ہے۔ اور اس جماعت کو اپنے تحفظ و بقا کے لئے قتل و قتال کی اجازت ملتی ہے۔ مدینہ منورہ میں ایک عرصہ تک مخالفین سے جنگیں ہوتی رہیں یہاں تک کہ سارا عرب اسی انقلابی جماعت کا مطیع ہو گیا۔ اور جیسا کہ قرآن مجید میں آیا ہے لوگ فوج در فوج دین اسلام میں داخل ہونے لگے اور "نصر اللہ" اور "فتح" آ گئی، یہ حنیفیت کی کامیابی و کامرانی کی پہلی منزل تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال تک جزیرہ عرب کا غالب حصہ تحریک حنیفیت کے تابع ہو چکا تھا۔ آپؐ کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضؓ آپ کے خلیفہ ہوئے انہوں نے ایک طرف عرب کی ان رجعت پسند طاقتوں کو ختم کیا۔ جو بین الاقوامی اور انسانیت گیر حنیفیت کے خلاف عرب قبائلیت کی علم بردار تھیں۔ جس کا کہ ایک نمایندہ قبیلہ بنو حنیفہ کا سردار مسلیمہ تھا۔ جس کے پیرو یہ کہتے تھے کہ بے شک محمدؐ اللہ کے نبی ہیں، لیکن قریش کے سچے نبی سے اپنے قبیلے کا جھوٹا نبی بہتر ہے۔ اور دوسری طرف انہوں نے اس دعوت کو جزیرہ عرب کے باہر مشرق و مغرب میں پھیلایا۔ حضرت ابوبکر رضؓ کے بعد حضرت عمر رضؓ اور ان کے بعد حضرت عثمان رضؓ کو اس جماعت کی قیادت سپرد ہوئی۔ اور اس زمانے میں ادہر خراسان سے لے کر ادہر الجزائر تک اس تحریک کا بول بالا ہو گیا۔ اور یہ ساری زمین اسلام کی مطیع و منقاد ہو گئی اب اس انقلابی جماعت میں افتراق پیدا ہوتا ہے۔ اور ایسا عموماً ہوا ہی کرتا ہے۔ ایک فریق کا مرکز مشرق میں

کوفہ تھا، اور دوسرے فریق کا مرکز مغرب میں دمشق دونوں میں جنگ ہوئی اور آخر میں انقلابی تحریک کا مرکز دمشق قرار پایا۔ اور اس کی وجہ سے اسلام کو شمالی افریقہ اور شمالی افریقہ سے اسپین میں پھیلنے کا موقع ملا۔ دمشق قرآن کی انقلابی تحریک کا تیسرا مرکز تھا۔ اب جہاں اس انقلابی جماعت میں اس کے پہلے مرکز میں "سوشلسٹ نظام" بروئے کار تھا۔ وہاں اس نے اپنے دوسرے مرکز یعنی مدینہ منورہ میں خلافت کے جمہوری نظام کو اپنایا۔ لیکن دمشق میں یہ جماعت ایک لحاظ سے قومی رنگ اختیار کر لیتی اور بنوامیہ کی قومی بادشاہت وجود میں آجاتی ہے لیکن یہ بادشاہت اس زمانے کی بادشاہتوں کی طرح مطلق العنان نہ تھی، بلکہ خلفائے دمشق کو قرآن کے قانون کی متابعت کرنا پڑتی تھی، لیکن جب بعد میں یہ بادشاہت مسلمان عوام سے دور ہو گئی تو اس کے خلاف عوام کی مدد سے بنوعباس نے خروج کیا۔ اور اس تحریک کی عنان اقتدار ان کے ہاتھ میں آگئی اور دمشق کی جگہ بغداد اس تحریک کا مرکز بنا۔

بغداد میں بنوعباس کئی صدیوں تک برسر اقتدار رہے۔ اس عرصے میں بڑی کثرت سے غیر عرب اقوام اسلام میں داخل ہوئیں۔ اور یہ تحریک جس کا جزیرہ عرب کے شہر مکہ مکرمہ سے آغاز ہوا تھا۔ فعلاً ایک بین الاقوامی تحریک بن گئی۔ اس میں ایشیا، افریقہ اور یورپ کی مختلف قومیں شامل ہو گئیں اور ان سب کی کوششوں سے ایک عظیم الشان عالمگیر اسلامی ثقافت وجود میں آئی جس کی شعاعیں ظلمت زار یورپ میں پہنچیں اور وہاں بعد میں نشاۃ ثانیہ کی بنیاد پڑی۔ ان غیر عرب مسلمان قوموں نے اپنی اپنی حکومتیں بنائیں اور دنیائے اسلام کے ایک سرے سے لیکر دوسرے سرے تک ان حکومتوں کا جال بچھ گیا۔ ۱۲۵۸ھ میں بغداد کا علمی و ثقافتی مرکز منگولوں کے ہاتھ سے تباہ ہو گیا اور اس کا ایک حصہ جس کی زبان فارسی تھی، وہ بخارا اور غزنی کے راستے لاہور اور دہلی پہنچا، اور دوسرے حصے کا مرکز جس کی زبان عربی تھی، قاہرہ بنا۔

لاہور اور دہلی کے مرکز سے اسلام برصغیر میں ایک فرمانروا سیاسی طاقت کی حیثیت سے آگے بڑھتا ہے۔ التمش سے لے کر جلال الدین خلجی تک سارے کا سارا شمالی ہند اس کے تابع آجاتا ہے علاؤ الدین خلجی کے عہد میں دکن تسخیر ہوتا ہے۔ پھر بہار و بنگال کے دروازے کھل جاتے ہیں۔

اس دور میں بہت سے اولیائے کرام نے اس تحریک کو اسلامی رنگ دینے کی قابل قدر خدمات سرانجام دیں۔ غزنویوں کے عہد میں مثال کے طور سے داتا گنج بخش، غوریوں کے عہد میں حضرت معین الدین چشتی خلجیوں اور تغلقوں کے عہد میں حضرت نظام الدین اولیاء اسی طرح لودھیوں کے عہد میں دوسرے بزرگوں نے اسلام کے عدل و مساوات کی شمع کو جلائے رکھا۔ اور سیاسی طاقت کو حتی الوسع اسلامی ضابطوں کا پابند رکھنے کی کوشش کی۔ مغلوں کا دور آیا تو اکبر نے ہندوستان کی تمام قوموں کو "دین الٰہی" کے سررشتے میں باندھ کر ایک ملکی وحدت بنانی چاہی، لیکن وہ اس میں ناکام ہوا۔ اس کے پرپوتے عالمگیر نے اس مرکزیت کو اسلامی بنانے کی کوشش کی، لیکن جن قومی عناصر سے یہ مرکزیت عبارت تھی وہ کھوکھلے ہو چکے تھے۔ اسی دوران میں یورپ سے ایک نئی طاقت برصغیر میں داخل ہوتی ہے۔ اور وہ اس پر قابض ہو جاتی ہے۔ بے شک یہ نئی طاقت امپیریلزم کی حامل تھی۔ اور غیر یورپی اقوام کو کمتر اور ذلیل سمجھتی تھی، اور ان کا معاشی استحصال اس کا مقصود و نصب العین تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ چونکہ اس طاقت کو قومیت، قوم پرستی اور جمہوریت کے تصورات نے جنم دیا تھا۔ اس لئے جہاں بھی وہ جاتی تھی، اس کے برسراقتدار آنے کے نتیجے میں وہاں ان تصورات کو جنم لینے اور نشوونما پانے کے مواقع ملتے تھے۔

یورپ کی یہ طاقت اب ایشیا اور افریقہ کے براعظموں سے دست کش ہونے پر مجبور ہوگئی ہے چنانچہ اس کے بجائے ہر جگہ قومی و جمہوری نظام برسرکار آنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں، لیکن جہاں یورپ کا سیاسی استیلاء ختم ہوا ہے، وہاں اس کا معاشی استیلاء اب بھی برقرار ہے، اور جب تک یہ نہیں ٹوٹتا، وہ براہیمی دعوت جو حنیفیت اور ہمہ گیر انسانیت و صحیح بین الاقوامیت کے اصولوں پر مشتمل ہے، اور مذکورہ بالا ادوار سے جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے، گزر چکی ہے۔ عملی جامہ نہیں پہن سکتی۔

اس عہد آخر میں اس دعوت کے پیغامبر اور نقیب حضرت شاہ ولی اللہ صاحب

تھے جنہوں نے عین اس وقت اپنی آواز بلند کی تھی، جب یورپ کی یہ طاقت اس سرزمین میں قدم جمارہی تھی۔

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ وہ "عظموت" کا لباس پہنے ہوئے ہیں۔ اور "جبروت" سے مشابہ ہیں۔ اور آپؐ کی ذات اقدس حامل ہے بہت سی لطافتوں کی۔ اور یہ لطافتیں ایک تو خود آپؐ کے ذاتی کمالات میں سے ہیں، اور دوسرے جو مختلف استعدادوں کے لوگ آپؐ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، تو ان کی ان استعدادوں کے اعتبار سے بھی آپ میں یہ لطافتیں موجود ہیں۔ چنانچہ اس مجلس میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مجھے اپنی اجمالی مدد سے سرفراز فرمایا۔ اور یہ اجمالی مدد عبارت تھی مقام مجددیت، وصایت اور قطبیت ارشادیہ سے۔ یعنی آپؐ نے مجھے ان مناصب سے نوازا نیز مجھے شرف قبولیت عطا فرمایا اور امامت بخشی۔ اور تصوف میں میرا جو مسلک ہے اور فقہ میں میرا جو مذہب ہے، ہر دو کو اصل اور فرع دونوں اعتبار سے راہ راست پر بنایا، لیکن یہ سب کے لئے نہیں بلکہ صرف مخصوص لوگوں کے لئے جن کی فطرت میں تحقیق کا مادہ ہے، لیکن اس میں بھی شرط یہ رکھی کہ اس مسلک تصوف اور مذہب فقہی کا اتباع باہمی اختلاف اور آپس کی لڑائی جھگڑے کا باعث نہ بنے چنانچہ جو شخص بھی فقہ میں اصل اور فرع کے لحاظ سے اور تصوف میں سلوک کے اعتبار سے ہمارے مذہب فقہی اور مسلک تصوف کو اختیار کرے، اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس سلسلے میں مندرجہ بالا نکتہ پر اپنی نگاہ رکھے۔

"فیوض الحرمین"

ذاتِ حق اور وجودِ حق

حافظ عباد اللہ فاروقی

ذات خداوندی کو ہم اس کی صفات کاملہ کے لحاظ سے کامل مانتے ہیں۔ موجودات خارجہ جس طرح زمان و مکان میں واقع ہیں اسی طرح علم الٰہی میں ہیں۔ جیسے قبل ظہور وہ علم الٰہی میں موجود تھیں۔ موجودات پر ہر آن ان کے اعیان کے مطابق فیضان جاری ہے۔ اور کُن فیکُون کارفرما ہے۔

عرفان ذات ممکن نہیں، البتہ عرفان الٰہی باعتبارات صفات ممکن ہے۔ ہر ایک صفت ایک جداگانہ اسم فعل اور اثر رکھتی ہے۔ ان میں اگرچہ باہم غیریت موہوم ہوتی ہے۔ مگر حقیقت میں وہ تمام صفات ایک ہی ذات میں جمع ہیں اور اللہ ان سب صفات کو جامع ہے۔

جب اللہ تعالیٰ کی صفات مائل بہ ظہور ہوئیں، تو یہ خارجی وجود یعنی کائنات وجود میں آئی۔ اس کائنات کا ذرہ ذرہ (موجودات عالم) اللہ کے اسماء و صفات کا آئینہ ہے اور اس کی ہر شے ذات واجب کے اسم و صفت کا ظہور ہے۔ انسان چونکہ خلیفۃ اللہ ہے۔ اس اعتبار سے وہ مظہر جامع واقع ہوا ہے اس اعتبار سے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ہستی مطلق کو اپنی جھلک دکھانے کے لئے یہی آئینہ پسند آیا ؎

نظرے کرد کہ بیند بہ جہاں صورت خویش
خیمہ در آب و گلِ مزرعۂ آدم زد

کتب مقدسہ میں ہے کہ اللہ تعالٰی نے انسان کو اپنی شکل پر پیدا کیا اور آیات قرآنی فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیہا ... اور لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم - کا اشارہ بھی اسی طرف ہے - غرض جب صفات الہیہ نے نزول کیا، تو صورت اختیار کی - اس لحاظ سے مادی صورت میں بھی وہی ہے - اور منزّہ ہونے کی صورت میں بھی وہی -

ھو الاوّل والآخر والظاھر والباطن - وجود یعنی ہستی حقیقی ایک ہے اس کا ایک ظاہر وجود ہے اور ایک باطن - باطن وجود ایک نور ہے - جو عالم کے لئے ایک جان کی طرح ہے - اسی نور باطن کا عکس ظاہر وجود ہے - ظاہر وجود کا اصل باطن وجود ہے (یعنی نور ہے) اگر باطن نہ ہو تو ظاہر بھی نہ ہو - گویا اس کثرت کی حقیقت وہی وحدت ہے - غرض "وجودی اصحاب" کے نزدیک جملہ افرادِ کائنات تجلیاتِ حق ہیں -

سبحان الذی خلق الاشیاء وھو عینھا

حضرت عبدالقدوس گنگوہی ایک موقع پر فرماتے ہیں -

"حقیقت او سبحان ہستی مطلق است - اما کسوت کونیہ خاک در جسم محجوباں مے اندازد - و دور و مہجور مے سازد -"

توحید وجودی میں ماسوا کی نفی ہے - وجود اور موجود میں کوئی امر فارق نہیں - یعنی وجود کسی بھی موجود سے منفک نہیں ہے - اس طرح نظریہ وحدۃ الوجود کی رو سے وجود صرف ایک ہے وہ وجود ہستی مطلق ہے - مظاہر خارجی اس کی صفات کے مختلف مظاہر اور شیون ہیں - ذات مطلق ہمیشہ جلوہ گری میں مصروف ہے - آیت کُلَّ یومٍ ھُوَ فی شان کا اشارہ اسی طرف ہے -

اس نظریئے کے بموجب صفات الہیہ و کائنات ایک دوسرے کے عین ہیں - ذات حق مع جملہ صفات کے ایک سمندر کی مانند ہے - اور کائنات اس کی سطح پر حباب اور لہریں ہیں - یہ کائنات ذات خداوندی کے بغیر معدوم ہے جس طرح لہریں بغیر سمندر کے معدوم ہیں - با لفاظِ دیگر ذاتِ حق قائم بالذات ہے لیکن لہریں وغیرہ (کائنات) عوارض ہیں یعنی عارضی حباب اور امواج اگرچہ

مختلف النوع چیزیں خیال کی جاتی ہیں۔ لیکن ان کا وجود بجز پانی کے اور کچھ نہیں۔

گفتم از وحدت و کثرت سخنے گوئی بہ رمز۔ گفت موج و کف و گرداب ہمانا دریاست

نیز — با وحدتِ حق ز کثرتِ خلق چہ باک

صد جائے اگر گرہ زنی رشتہ یکیست

غرض کائنات میں صرف ایک ہی ذات کا جلوہ و ظہور ہے۔ جس میں دوئی کی گنجائش نہیں بلکہ دوئی کا خیال بمنزلۂ شرک ہے۔ بصورتِ دگر پھر وہی یزداں واہرمن کی تفریق قائم ہوگی ـــ اور ثنویت لازم آئے گی جو بمنزلۂ شرک کے ہے۔ عارف شیرازی نے درست فرمایا ہے۔

ندیم و مطرب و ساقی ہمہ اوست

خیالِ آب و گل در رہ بہانہ

اسی طرح کسی حقیقت شناس شاعر کا یہ شعر ہے ؎

کافراں سجدہ کہ بر روئے بتاں مے کردند

ہمہ رو سوئے تو بود و ہمہ سو روئے تو بود

غرض جملہ مظاہر کائنات ہستی مطلق کی مختلف صفتیں ظاہر کرتے ہیں۔ گو متضاد اصطلاحوں سے ان کی تعبیر کی جاتی ہے خیر و شر، کفر و اسلام، بت و برہمن، اور عاشق و معشوق ایک ہی سلسلۂ نسب میں وابستہ ہیں

در حقیقت نسبِ عاشق و معشوق یکیست

بوالفضولاں صنم و برہمنے ساختہ اند

یک چراغ است دریں خانہ کہ از پرتو آں

ہر کسے مے نگری انجمنے ساختہ اند

وحدت الوجود اور وحدت الشہود

حضرت مجدد الف ثانیؒ صفات الٰہیہ کو زائد علی الذات اور عالم کو ظلِ صفات قرار دیتے ہیں ان کے نزدیک صفات عین ذات نہیں۔ اور نہ ذات صفات سے تکمیل پاتی ہے۔ ذاتِ حق بنفسِ خود

کامل ہے وہ اپنی ذات سے سمیع. علیم اور بصیر ہے۔ شیخ مجددؒ کے نزدیک صفات ظلِ ذات ہیں اور عالم ظلِّ صفات ہے۔ ان کے نزدیک صفات کا علم بالاتفاق ممتنع ہے۔ مولنٰا رومؒ کے نزدیک بھی اوصاف باری تعالیٰ ادراک انسانی سے باہر ہیں۔ فرماتے ہیں۔

مر صفاتش را چناں داں اے پسر
کز وے اندر وہم ناید جز اثر
ظاہر ست آثار و نور و رحمتش
لیک کے داند جز او ماہیتش
ہیچ ماہیات اوصاف کمال
کس نداند جز بہ آثار و مثال

اُس طرح شیخ مجددؒ کو اس پر اصرار ہے کہ عالم کو اپنے صانع بے چوں کے ساتھ سوائے اس کے اور کوئی نسبت نہیں کہ عالم اس کا مخلوق ہے اور اس کے پوشیدہ کمالات پر دلیل ہے۔ اس حکم کے سوا جتنے حکم ہیں، یعنی اتحاد، عینیت، احاطہ، معیت وغیرہ، وہ سب اہل سلوک کے سُکرِ وقت اور غلبۂ حال پر مبنی ہیں وہ سالک جو صحو سے بہرہ یاب ہو جاتے ہیں، ان علوم سے بیزار ہوتے ہیں۔ انہیں بھی اثنائے راہ میں یہ معارف حاصل ہوئے تھے، لیکن آخر کار وہ ان معارف سے گذر گئے۔ اور علوم شریعت کے مطابق ان پر ایراد کرنے لگے۔ حقیقت یہ ہے کہ عالم اور خدا کے مابین اتحاد و عینیت کا اثبات کرنا بڑی سخت غلطی ہے۔ یہ غلطی اس قسم کی ہے جیسے کوئی صاحب کمال اپنے پوشیدہ کمالات کو ظاہر کرنے کے لئے ایسے حروف اور آوازیں ایجاد کرے جو اس کے کمالات پر دلیل ہوں اس پر کوئی یہ کہنے لگے کہ یہ حروف اور یہ آوازیں اس موجد کا عین ہیں۔

مکتوبات امام ربانی دفتر اول مکتوبات ع۳۱، ع۲۸۷ بہ حوالہ حضرت امام ربانی کا نظریہ توحید"

شیخ مجددؒ کا نظریہ وحدت الشہود وحدت الوجود کے نظریہ کا ردِّ عمل ہے۔ مولنٰا شبلیؒ سوانح مولنٰا روم (صفحہ ۱۶۱) میں فرماتے ہیں کہ "وحدت وجود اور وحدتِ شہود میں یہ فرق ہے کہ

وحدت وجود کے لحاظ سے ہر چیز کو خدا کہہ سکتے ہیں۔ جس طرح حباب اور موج کو بھی پانی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن وحدتِ شہود میں یہ اطلاق جائز نہیں کیونکہ انسان کے سائے کو انسان نہیں کہہ سکتے۔"

نظریہ وحدت الشہود کے بموجب ذات حق اور اشیائے کائنات ایک دوسرے کے عین نہیں بلکہ غیر ہیں ذات حق وراء الوراء ہے۔ کائنات اس کی صفات کی مظاہر نہیں۔ بلکہ اس کا ظل یا سایہ ہے سایہ اور اصل میں بہت فرق ہے۔ اس لئے کائنات اور موجودات عالم ذات حق کی صفات کا عین نہیں ہو سکتے۔ مجدد الف ثانیؒ کائنات کو موجود بالذات تصور کرتے ہیں۔ خدا نے عدم محض سے اس کو پیدا کیا ہے۔ اس لئے خدا اور جملہ اشیاء میں خالق اور مخلوق کا تعلق ہے۔ اس میں شک نہیں جب انسان عشق الٰہی میں مستغرق ہوتا ہے تو وفور محبت سے اسے محبوب کی ذات کے علاوہ اور کسی چیز کا وجود نظر نہیں آتا۔ یہاں تک کہ من و تو کا سوال بھی درمیان سے اٹھ جاتا ہے۔ اور یہ عشق کی انتہا ہے خواجہ حافظ اپنے اس شعر میں اس طرف اشارہ کرتے ہیں ؎

میان عاشق و معشوق ہیچ حائل نیست
تو خود حجاب خودی حافظ از میاں برخیز

یہ ایک خاص کیفیت ہے، جس میں سوائے ذات حق کے کوئی شے نظر نہیں آتی۔ یہ کیفیت ایسی ہوتی ہے جیسے طلوع آفتاب میں ستاروں کی روشنی۔ خارج میں تمام چیزیں موجود ہوتی ہیں لیکن ضیائے شمس کے سامنے معدوم ہو جاتی ہیں۔ لیکن حقیقتاً وہ معدوم نہیں ہوتیں۔

یہ امر ملحوظ رہے کہ مجدد الف ثانیؒ نے اپنے استدلال کی بنیاد منطق و حکمت پر نہیں بلکہ کشف و شہود اور روحانی تجربات پر رکھی ہے۔

شیخ اکبر جو وحدۃ الوجود کے قائل ہیں، فرماتے ہیں کہ وجود کا اطلاق صرف ذاتِ باری تعالیٰ پر ہو سکتا ہے۔ لا موجود الا اللہ۔ صرف اللہ کی ذات ہی وجود کی صفت سے متصف ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ وجود ہے کیا؟ وجود ایک ماہیت ہے یا نور۔ وہ نہ عرض ہے نہ جوہر نہ جسم ہے نہ روح بلکہ ایک ماہیّت ہے۔ جس کے مراتب و تنزلات عالم کثرت میں جلوہ گر ہیں۔ مولٰنا جامی

فرماتے ہیں۔

در کون و مکان نیست عیاں جز یک نور
ظاہر شدہ آں نور بانواع ظہور
حق نور و تنوع ظہورش عالم
توحید ہمیں است دگر وہم و غرور

خواجہ باقی باللہ بھی توحیدِ وجودی اور ہمہ اوست کے قائل ہیں۔ فرماتے ہیں:۔ ہمہ ذراتِ عالم آئینہ صفات اُویند۔ ہر کجا علمے است علم اوست۔ ہر کجا قدرتے است قدرتے اوست ہمہ صفات اویند کہ از پردہ مخلوقات ظہور کردہ اند۔ بل ہمہ اوست۔ مخلوقات نمودنی اند۔ بے بود چنانچہ در آئینہ مے نمایند لیکن آئینہ ہمچناں پاک وصاف است از صورت۔ نہ در روئے آئینہ است نہ در درونِ اُو۔"

(رقعات باقیہ قلمی)

حضرت امام ربانیؒ فرماتے ہیں کہ بعض اوقات غلبۂ شہود کی وجہ سے حق تعالیٰ کا ماسوا نظروں سے مخفی ہو جاتا ہے۔ تو غلبۂ حال کی وجہ سے ان کی زبان سے انا الحق یا سبحانی ما اعظم شانی جیسے الفاظ نکل پڑتے ہیں۔ جن میں حق کے سوا غیر کی نفی ہوتی ہے۔

شاہ ولی اللہ کا محاکمہ

حضرت شاہ ولی اللہؒ فیصلہ وحدت الوجود والشہود میں فرماتے ہیں۔ "جس چیز کا نام وحدتِ شہود ہے، وہ یہ ہے کہ اسماء و شیون منعکس ہو گئے ہیں اعدام متقابلہ میں اس طرح ممکن وجود میں آ گیا۔ لیکن استعارے اور تشبیہ سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو اس کے معنی فقط یہ نکلتے ہیں کہ واجب کامل ہے اور ممکن ناقص اور ضعیف اور بے حقیقت، اور یہ سمجھنا کہ حقائقِ ممکنات اسماء و صفات ہیں جو مرتبۂ علم میں متمیز ہو گئے ہیں۔ یا یہ سمجھنا کہ حقائق ممکنات اسماء و صفات ہیں جو اعدام متقابلہ میں منطبع ہو گئے ہیں بعینہ ایک ہی بات ہے۔ ان میں اگر کچھ فرق ہے بھی تو وہ اتنا کم ہے کہ صاحبانِ تفحص اسے خاطر میں نہیں لاتے۔" (حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی کا نظریہ توحید صفحہ ۱۲۱)

گویا شاہ ولی اللہ کے نزدیک مجدّد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے نظریۂ وحدت الشہود پیش کر کے شیخ اکبر کے نظریۂ وحدت الوجود کی جو تردید کی ہے وہ حقیقت میں تردید نہیں اور نہ وحدتِ وجود اور وحدتِ شہود میں تباین ہے۔ ان دونوں نظریات میں محض نزاعِ لفظی ہے۔ وحدتِ شہود سے مراد صرف یہ ہے کہ واجب کے کامل ہونے پر اور ممکن کے ناقص اور ہیچ ہونے پر اصرار کیا جائے لیکن ابن عربی بھی یہی کہتے ہیں۔ کہ ممکن ناقص اور ہیچ ہے اور کمال صرف ذات واجب ہی کو حاصل ہے۔

شاہ صاحب نے اس نکتہ کو بڑی وضاحت سے پیش کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ وحدت الوجود اور وحدت الشہود دو الفاظ ہیں، جو مختلف جگہوں میں بولے جاتے ہیں۔ حالتِ عروج میں جب سالک سیر الی اللہ (یا سیر فی اللہ) کرتا ہے تو وہ خدا سے بہت قریب ہوتا ہے۔ وہ حقیقت جامعہ کی معرفت میں عالم کو فانی سمجھتا ہے اس حیثیت سے کہ وہ ساقط ہو جائیں۔ غرض یہاں وحدت الوجود کا مطلب استغراق ہے۔ اور جب حالت نزول میں سالک کو نظام دنیا کی غرض سے بندوں کی طرف لوٹنا پڑتا ہے تو وہ وحدۃ الشہود کہنے پر مجبور ہوتا ہے یہ سیر من اللہ کا مقام ہے۔

طویل بحث کے بعد شاہ ولی اللہؒ نے مولانا عبد الرحمٰن جامیؒ کی رائے سے اتفاق کیا ہے فرماتے ہیں "اسی طرح کلام مولانا عبد الرحمٰن جامیؒ کا میرے نزدیک مسلّم ہے کیونکہ ان کا مقصود نفی ہے۔۔ اصل ہونا حقائق کا اس کے مقابل کہ وہ اعتبارات اور اضافات ہیں ان کا مقصود یہ بتانا ہرگز نہیں کہ وجود حق ظاہر ہوا اشیاء میں، اور ان ہی کی وجہ سے ان کا تعین ہوا۔ نہ ان کا مقصود یہ ہے کہ خدا کی ذات اور کائنات کا فرق محض اعتباری ہے"۔

غرض حضرت شاہ ولی اللہ نے ایک درمیانی راستہ اختیار کر کے ان دونوں نظریوں میں مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ تاہم شاہ صاحب نے شہودیوں کے بعض نظریات کی تردید بھی کی ہے تاکہ اصلیت ظاہر ہو سکے۔ مندرجہ ذیل سطور سے یہ امر بکلّی واضح ہو جاتا ہے کہ شاہ صاحب کا رجحان نسبتاً وحدت الوجود کی طرف زیادہ ہے۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں۔ کہ سب سے پہلے جس صفت نے ظہور کیا وہ اللہ کا نور تھا۔ نور

وجود کا دوسرا نام ہے۔ جو عدم اور مادے کو احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اس طرح یہ نور قائم مقام بن گیا ذات کا اس عقیدہ کے مطابق اشیائے کائنات تجلیاتِ صفات الٰہیہ ہیں شاہ صاحب کو شہودیوں کا یہ عقیدہ کہ عدم وجود کے بالمقابل ہے جس میں اسماء و صفات کے عکس پڑ رہے ہیں قبول نہیں۔ اس لئے کہ ذات حق قائم بالذات ہے۔ اس کے مقابل ہونے کا مطلب یہ ہوا کہ مقابل شے اس کی نفی کر رہی ہے۔ اس طرح وہ عدم کو ذات کا ضد تصور نہیں کرتے کیونکہ ضد کا مطلب یہ ہے کہ وہ کسی شے کی نفی کرنے والی ہے۔ یعنی وہ شے جس کی وہ نفی کر رہی ہے اس کی کوئی بھی صفت اس میں موجود نہیں اس لئے وہ نفی کر رہی ہے۔ حقیقت یہ ہے اللہ واجب الوجود ہے جس کی کوئی شے نفی نہیں کر سکتی بلکہ سب اس کے سہارے قائم ہیں۔ اس کی ذات واحد ہے اس کا کوئی شریک یا غیر موجود نہیں۔ اس اعتبار سے عدم ذات حق کی ضد نہیں۔ اگر ہم شہودیوں کی طرح عدم کو ذات حق کی ضد تسلیم کریں تو ثنویت لازم آئے گی۔ اس لئے شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ صفات عین ذات ہیں اور ذات عین صفات۔ وہ حضرت مجددؒ اور دیگر شہودیوں کے خیال کے مطابق صفات زائد بر ذات تصور نہیں کرتے۔ بلکہ وہ اسماء و شیون یا مرتبہ وحدت کو ذات بر ذات سے تعبیر کرتے ہیں شاہ صاحب کے نزدیک مظاہر کا وجود معنوی خارج میں ظاہر ہونے سے پہلے عالم باطن اور ملاء اعلیٰ میں موجود تھا۔ اور اب بھی ان کا مثالی وجود وہاں موجود ہے۔ تنزلات یعنی تخلیقی اور تکوینی تاثرات کی منزل میں ارادۂ الٰہی کی وجہ سے صفات میں حرکت یا قابلیت پیدا ہوئی اس طرح ذاتِ حق کا فیضان صورِ علمیہ اور اعیان ثابتہ کو معرض وجود شہود میں لانے کا باعث بنا۔ ان اعیان ثابتہ میں وجود کی بو تک نہ تھی۔ ما شمت رائحۃ الوجود، لیکن تجلی صفات حق نے انہیں ہستی کے لباس سے آراستہ کیا۔ اور یہ نور ہر لحظہ جاری ہے۔ اور یہی تجلی ہر لحظہ کائنات کے افراد کو علم ارادہ حیات اور دیگر صفاتِ ذات (علیٰ قدرِ ظرف و استعداد) سے متصف کرتی رہتی ہے۔ غرض اللہ تعالیٰ کا نور ہی ہے جو ہمیں ظلمت سے نکال کر روشنی میں لاتا ہے یعنی ہستی کا لباس پہناتا ہے۔ اور ہمیں ارادہ بخشتا ہے۔

شاہ صاحب ارتقاء کے قائل ہیں۔ فرماتے ہیں کہ وجودِ حق ہمیشہ سے کائنات کی تخلیق و تعمیر و

ارتقا کا مظاہرہ کرتا رہتا ہے۔ یہ محض حقیقت الحقائق کے باطنی علم میں نہیں بلکہ کائنات کے خارجی مظاہر میں بھی ذوق و شوق و مقاصد حیات کی لاتعداد صورتوں میں جلوہ گر ہے۔" اس طرح اسماء و صفات کے مظاہر عالم خارجی، عالم مثال اور عالم ملکوت میں برابر جاری و ساری رہتے ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ کے بعد صوفیا دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ ان میں سے کچھ شاہ صاحب اور مولانا جامی کے ہمنوا تھے۔ لیکن اس کے برعکس ایک گروہ ایسا بھی تھا۔ جو شاہ صاحب کے نظریات کی مخالفت کرتا رہا۔

میر درد "واردات درد" اور "علم الکتاب" میں فرماتے ہیں۔

"وحدت وجود کے فقط یہ معنی ہیں کہ موجود بالذات صرف وہی ہے اور یہ معنی نہیں کہ واجب اور ممکن کی ماہیت ایک ہے۔ اور عبد اور معبود ایک دوسرے کا عین ہیں اور کلی طبعی کی طرح اپنے افراد میں موجود ہے کیونکہ یہ سراسر زندقہ ہے۔ مذہب میں توحید وجودی کی بایں معنی کوئی اہمیت نہیں کہ وجود موجودات میں ساری ہے۔ کیونکہ کثرت میں وحدت جو عوام کی زبان پر ہے۔ اور ہر ہندو جوگی بھی اس پر گفت گو کرتا ہے۔ نیز اس لئے ایمان کی بھی شرط نہیں بالکل مبتذل مسئلہ ہے جو ذرا سمجھانے سے سمجھ میں آتا ہے۔ لہذا انبیاء کی بعثت کا مقصود نہیں ہو سکتا۔"

مولانا غلام یحییٰ نے شاہ صاحب کی نہایت ہی شد و مد سے تردید کی ہے۔

"شاہ صاحب کا یہ کہنا کہ وحدت وجود اور وحدت شہود حقیقت اشیاء اور حادث اور قدیم کے مابین ربط کو ظاہر کرتے ہیں۔ اور ان دونوں میں کوئی فرق نہیں دونوں کا مطلب ایک ہی ہے سراسر غلط ہے ان دونوں مسئلوں کے درمیان کوئی تطابق کسی طرح ممکن نہیں۔ کیونکہ وحدۃ وجود کی بنیاد عالم اور موجد عالم کے مابین عینیت پر ہے اور وحدۃ الشہود کی رو سے واجب اور ممکن کے درمیان غیریت محض ہے"

وحدت الوجود والشہود مصنفہ مولوی شیخ محمد تھانوی (صفحہ ۱۱۸)

مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم مدرسہ مظہر العلوم کھڈہ کراچی میں

مولانا حافظ محمد اسمٰعیل [1]

مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کی پوری زندگی جہاں ایک طرف سرتاپا انقلاب تھی، وہاں دوسری طرف انہیں حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے علوم و معارف سے عشق کی حد تک شغف تھا۔ اور وہ ان کی نشر و اشاعت میں اپنی طرف سے کوشش کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے تھے۔ چنانچہ جہاں بھی انہیں موقع ملتا اور وہ فضا سازگار دیکھتے، حضرت شاہ صاحب کے علوم کا درس و تدریس

---

[1] مولانا حافظ محمد اسمٰعیل مہتمم مدرسہ مظہر العلوم کھڈہ کراچی ——— آپ مولانا محمد صادق صاحب مرحوم کے صاحبزادے ہیں مولانا مرحوم نہ صرف سندھ کی، بلکہ پورے برصغیر کی مشہور و معروف شخصیت تھے۔ موصوف ایک عرصے تک جمعیت العلماء ہند کی سندھ شاخ کے صدر رہے۔ نیز دار العلوم دیوبند کی مجلس عاملہ کے رکن تھے۔ مولانا محمد صادق نے برطانوی استبداد کے خلاف جدوجہد کی، اس کی ایک طویل تاریخ ہے۔ کھڈہ کراچی کا مشہور دینی مدرسہ مظہر العلوم مولانا مرحوم کا قائم کردہ ہے۔ آپ مولانا عبید اللہ سندھی کے دست راست تھے۔

(مدیر)

شروع فرما دیتے۔ علم و عمل اور عزم و ہمت کے اس پیکر نے ملک کی آزادی، علمائے کرام کی بیداری، عربی و دینی مدارس کے نصاب تعلیم کی اصلاح اور نوجوانوں میں قومی و ملی امنگ پیدا کرنے کی جدوجہد کے ساتھ ساتھ اس برصغیر میں ولی اللّٰہی علوم کو متعارف کرانے میں جو کارہائے نمایاں سرانجام دیئے ہیں، ان کی تاریخ بڑی طویل ہے۔ وہ تمام عمر ان مقاصد عظیم کی تکمیل کی خاطر ساحل نیل سے لے کر خاک کاشغر تک سرگرداں اور سرگرم کار رہے۔ جب کبھی سرزمین پاک و ہند کی تاریخ حریت منصف مزاج اور حق پسند مورخ لکھیں گے تو اس سلسلے میں مولانا سندھی نے جو کوششیں کی ہیں، اس وقت ان کا صحیح اعتراف ہوگا۔

آج سے بائیس سال پیشتر اپنی زندگی کے آخری ایام میں جب مولانا مرحوم واپس وطن تشریف لائے، تو باوجود اس کے کہ اس وقت کے سندھ کے وزیر اعلیٰ اللہ بخش مرحوم نیز شیخ عبدالمجید سندھی کا اصرار تھا کہ مولانا ان کے ہاں قیام فرمائیں۔ آپ نے مدرسہ مظہر العلوم کھڈہ میں قیام کرنے کا فیصلہ کیا اور فرمایا کہ ہم ہمیشہ مدرسہ مظہر العلوم میں ٹھہرتے ہیں اور اب بھی یہیں ٹھہریں گے۔ چنانچہ مولانا سندھی مرحوم مدرسہ مظہر العلوم کھڈہ میں ٹھہرے اور راقم السطور کے والد مرحوم مولانا محمد صادق بانی مدرسہ مظہر العلوم کے مہمان ہوئے۔ مولانا سندھی کے نیاز حاصل کرنے اور ان سے مستفید ہونے کے لئے ہر طبقے کے حضرات مدرسہ مذکور میں تشریف لاتے اور ہر وقت وہاں سیاسی رہنماؤں علماء ماہرین تعلیم اور سربرآوردہ حضرات کا اجتماع رہتا۔

مولانا مرحوم اپنے پہلو میں ایک بے قرار دل رکھتے تھے اور ان کا دماغ بھی برابر اسی سوچ میں سرگرداں رہتا تھا۔ کہ یہ ملک کس طرح آزاد ہو۔ یہاں کے عوام کی حالت کیسے بہتر کی جائے۔ مسلمانوں کی موجودہ پس ماندگی کس طرح دور ہو سکتی ہے۔ اور ان کو تشتت و افتراق سے نکالنے کے کیا طریقے ہیں۔ اسلام جس نے ایک زمانے میں انسانیت کو نئی زندگی عطا کی تھی۔ اب وہ انسانیت کے دکھوں کا کیسے مداوا ہو۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ برصغیر کے مسلمانوں میں اس وقت جو انتشار پھیلا ہوا تھا، اس کا علاج کیا ہے؟ مولانا مرحوم زیادہ تر انہیں امور پر سوچتے رہتے۔

اور جوان سے ملنے آتے، ان سے بھی اکثر انہی امور پر گفت گو فرماتے۔ مولانا مرحوم کو یہ فکر تھی کہ آگے آگے جو ملکی اور بین الاقوامی انقلابات آرہے ہیں۔ اگر ہندوستان کے مسلمان ذہنی طور سے ان کے لئے تیار نہ ہوئے، تو ان کا بہت برا حشر ہوگا۔ اور وہ کہیں کے نہیں رہیں گے۔ مولانا ہندوستان سے باہر افغانستان، روس، ترکی اور سرزمین حجاز میں زندگی کا ایک بڑا حصہ گزار کر آئے تھے اور اس دوران میں انہوں نے بہت کچھ دیکھا۔ بہت کچھ پڑھا اور بہت زیادہ سوچا تھا۔ اور اس طرح تجربات کی ایک لمبی تاریخ ان کے ذہن میں تھی۔ مولانا مرحوم نے اس ملک اور بالخصوص یہاں کے مسلمانوں کے لئے ایک فکری راہ متعین کی تھی اور وہ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں اسی غرض سے وطن لوٹے تھے کہ وہ اپنے اہل وطن کو اس سے متعارف کرائیں۔

اپنی اس فکری راہ کو عملی شکل دینے کے لئے حضرت مولانا سندھی ضروری سمجھتے تھے کہ مسلمانوں میں قدیم اور جدید علوم میں بُعد اور اجنبیت کی جو خلیج واقع ہوگئی ہے اسے ختم کرکے ان دونوں علوم کے حاملوں کو ایک دوسرے سے قریب کیا جائے، اور یہ دونوں مل کر اس ملت کی طاقت بنیں۔ نئے تعلیم یافتہ طبقے اسلام، اس کے علوم اور اس کی حقیقی روح سے بیگانہ نہ رہیں اور پرانی تعلیم پائے ہوئے لوگ آج کے زمانے کی علمی و فکری ضرورتوں کو سمجھیں۔ اس سلسلے میں مدرسہ مظہر العلوم کھڈہ میں قیام کے دوران وہ مولانا محمد صادق صاحب مرحوم سے برابر اصرار کرتے رہے کہ وہ علماء کو اس بات پر آمادہ کریں کہ وہ جمود کو چھوڑیں۔ اپنی تنگ اور قدامت پرستی کی زندگی سے باہر نکلیں ملک میں جو نئے حالات پیش آرہے ہیں ان کو سمجھیں اور ان سے عہدہ برآ ہونے کے لئے دوسرے طبقوں سے تعاون کریں۔ اور قوم کو جس علمی، فکری اور عملی قیادت کی ضرورت ہے اسے مہیا کریں۔ مولانا سندھی مرحوم کو ان باتوں کا اتنا شدید احساس تھا۔ اور جو مستقبل میں ہونے والا تھا، وہ ان کی چشم تصور کے سامنے اس طرح واشگاف تھا کہ وہ ان امور پر گفت گو کرتے کرتے جوش میں آجاتے۔ اور ان کے وہ عقیدت مند جوان کی بات ماننے کو تیار نہ ہوتے ان پر بے طرح برس پڑتے مولانا سندھی کی یہ جھلاہٹ جوش و غضب اور بے قراری بالکل فطری تھی کیونکہ مولانا جو کچھ دیکھ رہے تھے وہ دوسرے نہیں دیکھ سکتے تھے

مولانا محمد صادق اگرچہ مولانا سندھی رحمۃ اللہ علیہ کے خیالات سے بڑی حد تک متفق تھے اور وہ آپ کی ان تمام باتوں کو بڑے ادب و احترام سے سنتے تھے، لیکن اس وقت ملک کی جو عام فضا تھی اور پھر مولانا محمد صادق کا جو اپنا قدامت پسند ماحول تھا۔ جس میں ان کی ساری زندگی گزری تھی۔ اس سے یکایک نکل آنا ان کے بس میں نہ تھا۔ نیز مولانا سندھیؒ کی بعض باتیں اتنی آگے کی تھیں اور اس وقت کے حالات اور ماحول ان کے لئے بظاہر اتنا ناساز گار نظر آتا تھا کہ وہ اکثر علماء کو ناقابل عمل معلوم ہوتیں وہ انہیں مولانا سندھی کی مجذوبانہ طبیعت کا نتیجہ سمجھتے، لیکن ان باتوں کو جو دل پر بڑا اثر کرنے والی ہوتی تھیں، سنتے سب تھے، اور ان سے متاثر بھی ہوتے تھے کیونکہ "دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے" مولانا سندھی مرحوم کی سب سے بڑی اور پاکیزہ تمنا یہ تھی کہ دینی مدارس میں شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی حکمت کی تعلیم ہو، علمائے کرام اسے اپنائیں۔ اور اس کے مطالعے اور اس کی تحقیق سے ان میں شغف پیدا ہو۔ مولانا مرحوم کا خیال تھا کہ حکمت ولی اللہی ایک طرف اس دیوار کو جو قدیم اور جدید علوم کے درمیان انگریزی سیاست نے حائل کر دی ہے، ختم کر سکتی ہے، اور دوسرے برصغیر کے مسلمانوں کو آج جس فکری رہنمائی کی ضرورت ہے وہ اس سے پورا ہو سکتی ہے۔

مولانا مرحوم کے نزدیک حضرت شاہ ولی اللہ ایک عالم ربّانی محدث، مفسر، فقیہہ و مجتہد کے ساتھ ساتھ ایک حکیم و فلسفی بھی ہیں، اور اس وقت ہمیں ایک ایسے ہی جامع علوم و حکیم بزرگ کی ضرورت ہے، جو دین کے ساتھ ساتھ دنیوی مسائل مہمہ میں بھی ہماری رہنمائی کر سکے۔

واقعہ یہ ہے کہ مولانا عبید اللہ سندھی ایک عہد آفریں شخصیت تھے۔ وہ پوری ملّت اسلامیہ کی ایک ایسی دولت گراں مایہ تھے، جس کا جواب شاید پھر پیدا نہ ہو سکے۔ بقول علامہ اقبال مرحوم کے

حفظِ اسرار کا فطرت کو ہے سودا ایسا
رازداں پھر نہ کرے گی کوئی پیدا ایسا

وہ پوری اسلامی دنیا میں اسلامی فلسفہ و حکمت کا سرمایہ لے کر پھرتے رہے، اور ایک عرصہ دراز تک دیارِ حرم میں رہ کر اس فلسفہ و حکمت کی تعلیم دیتے رہے۔ مسلمانوں کے انحطاط اور زوال

پر اُن کا دل کڑھتا تھا۔ اور وہ شب و روز اسی فکر میں غلطاں رہتے تھے کہ کسی طرح مسلمان اس انحطاط و زوال سے نکلیں جس کا کہ واحد نسخہ ان کے نزدیک ولی اللہی حکمت تھی وطن واپس آنے کے ساتھ ہی مولانا سندھیؒ نے مولانا محمد صادق مرحوم سے اپنی اس پُر زور خواہش کا اظہار فرمایا کہ مدرسہ مظہر العلوم کھڈہ کراچی میں شاہ صاحب کی حکمت کی تعلیم کا انتظام ہو۔ اور مولانا محمد صادق مرحوم اس کے سربراہ اور قائد بنیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں شیخ عبدالمجید سندھی، مولانا وفائی مرحوم، سید باقر شاہ مرحوم، محمد امین کھوسو، مولانا غلام مصطفےٰ قاسمی، مولانا عزیز اللہ جرووار۔ سید حسن بخش شاہ، جی ایم سید۔ حاجی مولا بخش سومرو، حضرت مولانا احمد علی صاحب مرحوم، مولانا عبداللہ لغاری مرحوم، اور مولانا عبدالقادر لغاری سے برابر مشورے ہوتے رہے۔ جب تک مولانا سندھیؒ مدرسہ مظہر العلوم کھڈہ میں قیام پذیر رہے یہ حضرات اکثر آپ سے ملنے وہاں تشریف لاتے۔ اور باہم تبادلۂ خیالات ہوتا۔ ان سب بزرگوں کو مولٰنا سندھی کی علمی عظمت، ان کے تدبر اور دور اندیشی پر پورا اعتماد تھا۔

غرض بروز یک شنبہ ۱۲ ذی القعدۃ الحرام ۱۳۵۸ھ (۲۴ دسمبر ۱۹۳۹ء) دار الرشاد میں اور ۱۶ ذی القعدہ کو مظہر العلوم کراچی میں ایک مستقل شعبہ قائم کیا گیا۔ جو حضرت مولانا سندھیؒ کے الفاظ میں "اسلامی فلاسفی کا خادم اور محافظ ہوگا، اگر خدا کو منظور رہے تو وہ ایک سوچے سمجھے ہوئے دینی پروگرام پر چل کر مسلمانوں کا تشتت دور کردے گا۔ واللہ الموفق والمعین۔"

اس شعبے کا نام جمعیت "خدام الحکمۃ" تجویز ہوا، اور اس کے اساسی اصول یہ مقرر ہوئے۔

(ا) امام ولی اللہ دہلوی کو جمیع علوم شرعیہ مثلاً کتاب و سنت اور حکمت و سیاست میں امام تسلیم کرنا۔

(ب) ان کی کتابیں (۱) الفوز الکبیر۔ فتح الرحمن۔ ازالۃ الخفا (۲) حجۃ اللہ البالغہ، مسوی مصفی (۳) قول جمیل، الطاف القدس، ہمعات، (۴) سطعات، لمحات، البدور البازغہ، الخیر الکثیر تاویل الاحادیث (۵) فیوض الحرمین، التفہیمات الالہیہ وغیرہ کو ان کی اصلی زبانوں میں پڑھنے پڑھانے کا انتظام کرنا۔

(ج) امام ولی اللہ دہلوی کی حکمت کی تشریح میں امام عبدالعزیز دہلوی کو امام ماننا۔ اور مولٰنا

رفیع الدین کی "تکمیل الاذہان" مولانا محمد اسمٰعیل شہید کی "عبقات" مولانا محمد قاسم دیوبندی کی "تقریر دلپذیر" اور "شرح حدیث ابن رزین" اور "قبلہ نما" کو بطور مبادی پڑھنا پڑھانا۔

مولانا محمد صادق مرحوم نے مولانا سندھیؒ کے اس تعلیمی لائحہ عمل کو متقل شکل دینے کیلئے مذکورہ بالا کتابوں میں سے چند کو مدرسہ مظہر العلوم میں شامل کر دیا۔ اور اس غرض کے لئے انہوں نے مولنا غلام مصطفےٰ قاسمی کی خدمات حاصل کیں اور خدا کے فضل وکرم سے مولنا محمد صادق مرحوم و مغفور کی زندگی ہی میں یہ سلسلہ شروع ہو گیا لیکن ان کی وفات اور ان کے بعد ان سے متعلق و منتسب حضرات کی سرد مہری کی وجہ سے یہ سلسلہ آگے نہ بڑھ سکا۔ اور حکمت ولی اللہی کو عام کرنے کے ضمن میں مدرسہ مظہر العلوم کھڈہ کو جو اہم رول ادا کرنا تھا۔ اور جس کی حضرت مولانا سندھیؒ کو اس سے بڑی توقعات تھیں، وہ ادا نہ ہو سکا۔ بہر حال اب وقت آگیا ہے کہ اس خواب کی، جو حضرت مولانا سندھی نے دیکھا تھا، اور جس کی عملی تعبیر کی مولانا محمد صادق صاحب نے طرح ڈالی تھی ایک مرتب و منضبط عملی شکل ہمارے سامنے آئے اور آج کے حالات میں ان بزرگوں کے کام کو آگے بڑھایا جائے آج ضرورت اس امر کی ہے کہ علوم دینیہ سے شغف رکھنے والے حضرات سر جوڑ کر بیٹھیں، اور اس مظلوم رہبر نے ملت کو اسلام کے احیاء اور مسلمانوں کی سر بلندی کی جو راہ دکھائی تھی اور جس کی تلقین وہ تمام عمر کرتے رہے، اس پر گامزن ہونے کی تدبیر سوچیں۔ جیسا کہ میں اوپر عرض کر آیا ہوں مولانا سندھیؒ کے شب و روز کی کوششوں اور ان کی مسلسل جد و جہد کا ماحصل یہ تھا کہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ کے افکار و معارف کو عام کیا جائے، اور انہیں ہم اپنی فکری و علمی اساس بنا کر آگے بڑھیں۔ اس سلسلے میں مولانا سندھی فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے شاہ ولی اللہ کو ایک ایسی تحریک کا امام بنایا ہے جس کے پیش نظر اس دور کے فرسودہ اور زوال آمادہ نظام کو ختم کرنا تھا۔ چنانچہ ان کو مخاطب کرتے ہوئے "فک کل نظام" کا ارشاد ہوا۔ امام ولی اللہ نے پیش گوئی کی تھی کہ ان کی اولاد کے پہلے طبقے سے علم الحدیث کو فروغ ملے گا۔ اور دوسرے طبقے میں علم حکمت کی اشاعت ہو گی۔ چنانچہ امام عبد العزیز سے حدیث کا شیوع ہوا۔ اور مولانا رفیع الدین کی تکمیل الاذہان اور شاہ اسمٰعیل شہید کی عبقات سے حکمت کے ایک نئے سکول کی طرح پڑی۔ نیز امام ولی اللہ نے فرمایا تھا کہ ان کی بیٹیوں کی اولاد سے ایسے افراد

پیدا ہوں گے، جو ان کے بیٹوں کے بعد ان کے کام کو آگے بڑھائیں گے الصدر الحمید مولانا محمد اسحٰق اور مولانا محمد یعقوب حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی اس پیش گوئی کے مصداق بنے۔

اسی سلسلے میں امام ولی اللہ نے فیوض الحرمین میں خلافت کے ذکر میں لکھا ہے کہ خلافت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک خلافت ظاہرہ اور دوسری خلافت باطنہ۔ خلافت باطنہ سے امام ولی اللہ جماعتی تنظیم و جدوجہد کا وہ دور مراد لیتے ہیں، جو باقاعدہ حکومت کی تشکیل سے قبل کا ہوتا ہے اور جس کے نتیجے میں، یہ باقاعدہ حکومت بروئے کار آتی ہے۔ ہجرت سے پہلے مکہ معظمہ میں مسلمانوں کا جو دور زندگی تھا، مولانا سندھی اسے خلافت باطنہ کا نام دیتے ہیں ان کے نزدیک خلافت ظاہرہ کے قیام کے لئے تشدد اور محاربہ ضروری ہوتا ہے درآں حالیکہ خلافت باطنہ کا دور عموماً عدم تشدد کا ہوتا ہے۔ ملک کا خراج بزور وصول کر کے مستحقین کو پہنچانا، مصارف عامہ میں خرچ کرنا، اور عدالت کا نظام بزور قائم کر کے مظلومین کی حمایت کرنا خلافت ظاہرہ کے اہم اجزا ہیں۔ یہ اور اس قسم کی باتیں مولانا سندھی جس انوکھے انداز سے کرتے تھے، گو ان کی معقولیت اور اثر آفرینی کی وجہ سے کسی کو انکار کی جرأت نہیں ہوتی تھی، لیکن ان خطوط پر کسی فکری و عملی تحریک کو چلانا علمائے کرام اس زمانے میں دشوار سمجھتے تھے۔ چنانچہ نتیجہ یہ نکلا کہ مولانا مرحوم کے ان افکار پر کسی تحریک کی باقاعدہ داغ بیل نہ پڑ سکی اور مولانا کی کوششیں محض دعوت و ارشاد اور تعلیم و تلقین تک محدود ہو کر رہ گئیں۔ اس سلسلے میں یہاں یہ ذکر کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اُس وقت برصغیر میں بھی جو سیاسی تحریکیں چل رہی تھیں، مولانا سندھی مرحوم ان میں سے کسی کے ساتھ بھی بالجملہ متفق نہ تھے، اگرچہ جزواً جزواً بعض کے ساتھ ان کا اتفاق تھا۔ اسی لئے وہ علمائے کرام سے برابر یہ اپیل کرتے رہے کہ وہ دینی مدارس میں حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے خانوادہ علمی کے علوم و حکمت کو شامل نصاب کریں تاکہ موجودہ اور آیندہ نسلوں کے ذہنوں کی آبیاری ہو سکے۔ نیز وہ ہمیشہ اس پر زور دیا کرتے تھے کہ علماء جدید اور انگریزی پڑھے ہوئے طبقوں کو اپنے سے قریب لائیں اور قدیم و جدید کی خلیج کو پُر کریں۔

آج جب ہم اس دور کو دیکھتے ہیں، اور ہمارا ماحول جس سرعت سے بدل رہا ہے اس

کے احوال وکوائف کا مطالعہ کرتے ہیں، اور وہ جن نئے تقاضوں کا حامل ہے ان پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں بے اختیار حضرت مولانا سندھی کا پیغام یاد آتا ہے۔ جو ان کی زندگی میں لوگوں نے ان کی زبان سے سنا، لیکن اس وقت اس پر عمل نہ ہو سکا۔ خدا کرے اب ملت ادھر متوجہ ہو اور حکمت ولی اللہی کو عام کر کے اور اس کے اصول و مبادی کو اپنا کر مولانا سندھیؒ کی بے تاب روح کو طمانیت و سکون بخشے۔

میں یقیناً ۱۳-۱۴-سال (قیام حجاز کے دوران) سے قرآن عظیم اور حجۃ اللہ البالغہ کا بنظر عمیق مطالعہ کرتا رہا۔ تفسیر قرآن میں جس قدر مقامات میرے لئے مشکل تھے اس زمانہ میں انھیں امام ولی اللہ دہلوی کے اصول پر بالاطمینان حل کر سکا۔ جو لوگ میری طرح امام ولی اللہ دہلوی کو نہیں مان سکتے ان کو مطمئن کرنے کا دعویٰ میں نہیں کر سکتا لیکن مجھے اپنے اصول پر قرآن عظیم میں اس زمانہ میں قابل عمل تعلیم کا ایک اعلیٰ نصاب نظر آیا۔ اس میں اس تجلی ریز مقدس مقام کی تاثیر ضرور ماننا پڑتی ہے میں نے امام ولی اللہ دہلوی کی مشہور کتابوں کا خاص طور پر مطالعہ جاری رکھا مثلاً بدور بازغہ۔ خیر کثیر۔ تفہیمات الٰہیہ۔ سطعات۔ الطاف القدس لمحات وغیرہ۔ ان کتابوں کے لئے بطور مفتاح میں نے مولانا رفیع الدین دہلوی کی تکمیل اذہان اور مولانا اسمٰعیل شہید کی عبقات اور مولانا محمد قاسم العلوم اور تقریر دلپذیر۔ اور آب حیات کو استعمال کیا مجھے ان کتابوں کے پڑھانے کا بھی موقع ملتا رہا۔ اور ساتھ ہی مدارستہ قرآن عظیم بھی جاری رہا اس سے میرے نظریات بہت وسیع ہو گئے۔ للہ الحمد

اگر مجھے موقعہ دیا جائے کہ میں امام ولی اللہ دہلوی کو حکمت کا مجتہد مستقل فرض کر لوں اور امام عبدالعزیز دہلوی اور مولانا رفیع الدین دہلوی کو اس حکمت کا منتسب اور مولانا اسمٰعیل شہید اور مولانا محمد قاسم کو مجتہد فی المذہب کے رتبہ پر تسلیم کر لوں تو میں اس حکمت کا ایسا اسکول قائم کر سکتا ہوں جس میں (الف) قرآن عظیم۔ (ب) سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وسنت الخلفا الراشدین (ج) تاریخ اسلام کی پوری عقلی تشریح ممکن ہو۔ اس کے بعد تمام مذاہب عالم اور کتب مقدسہ کی تحقیق وتطبیق اسی اصول پر آسان ہو جائیگی (ذلک من فضل اللہ واللہ ذو الفضل العظیم)

(مولانا عبیداللہ سندھی)

حکمت ولی اللہی میں تاریخ کا مرتبہ

ڈاکٹر صبیح احمد کمالی[1]

الف تمہید

ب التذکیر بایام اللہ

ج قدرت، عادت، اور رحمت

د مقصد و معنی اور ان کے ٹھکانے

ہ ارتفاقات

و علم اسرار الدین

ز خاتمۂ کلام

تمہید

شاہ ولی اللہ صاحب کی وفات کو اب تک پوری دو صدیاں گذر چکی ہیں اس طویل مدت کو دیکھتے ہوئے یہ سوال برمحل ہے کہ بعد والوں نے ان کی تعلیم کو کس طرح سمجھا ہے اس میں شک نہیں کہ ان کی تحریریں فارسی اور عربی زبان میں ہونے کی وجہ سے اس ادبی سرمائے سے ذرا الگ ہیں

---

[1] ڈاکٹر صبیح احمد کمالی ریڈر ادارۂ علوم اسلامیہ ۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۔ یہ مضمون ادارۂ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (ہند) کے مجلہ علوم اسلامیہ سے ماخوذ ہے ۔ مدیر

جیسے ان کے (اردو داں) وارثوں نے اپنایا ہے۔ اس پر طرہ یہ ہے کہ وہ تحریریں جس شکل میں اب تک نشر و اشاعت پاتی رہی ہیں وہ انتہائی ناقص ہے۔ ایک یا دو کتابوں کے استثناء کے ساتھ شاہ صاحب کی تصانیف ہندستان اور پاکستان کے مقامی چھاپے خانوں کے معمولی بلکہ ردی اڈیشنوں میں ملتی ہیں جنہیں پڑھکر سمجھنا اور پھر صحیح کچھ حاصل کر لینا جوئے شیر لانا ہے۔ کتابوں کی اس صورت حال سے قطع نظر، روایتی طور پر شاہ صاحب کی تعلیم کا خاصہ چرچا رہا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان میں علم حدیث کے ادارے اور سلسلے شاہ صاحب کی شخصیت سے منسوب یا اس پر منتھی ہو کر اس علم کے بین الاقوامی دھارے میں جا ملتے ہیں۔ دار العلوم دیوبند میں شاہ صاحب کے اٹھائے ہوئے یا بڑھائے ہوئے بعض کاموں نے ایک مقام یا مرکز حاصل کر لیا ہے اور

لہ اس مضمون کی اساس میرے ایک انگریزی مقالے پر ہے جو ڈاکٹری کی سند کے لیے ۱۹۵۹ میں میک گل یونیورسٹی (مانٹ ریال، کناڈا) کے ادارۂ علوم اسلامی کو پیش کیا گیا تھا۔ اس مقالے میں شاہ ولی اللہ صاحب کے فلسفے اور ان کے فقہی مسلک کے درمیان منطقی ربط کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی تھی جو ذیل کے ابواب پر مشتمل تھی۔

(اول) اخلاقی اور نفسیاتی مباحث (دوم) ارتفاقات

(سوم) فلسفۂ تاریخ (چہارم) تاریخ علوم اسلامی

(پنجم) عام تبصرہ

مقالے کی تیاری کے بعد سے اب تک جو مدت گزری ہے اس میں بعض ابواب کو میں نے مختلف طریقوں سے استعمال کر لیا ہے۔ مثلاً پہلا باب مکمل طور سے رسالہ Islamic Culture (حیدرآباد - دکن) کے جولائی اور اکتوبر ۱۹۶۲ کے پرچوں میں شائع ہو چکا ہے۔ دوسرے باب کا ایک حصہ رسالہ Iqbal (لاہور) کے جنوری ۱۹۶۳ کے شمارے میں شائع ہوا ہے لیکن بحیثیت مجموعی ارتفاقات کی بحث کو میں نے اپنی کتاب Types of Islamic Thought in Criticism and Reconstruction (1963) میں شامل

باقی ص

اب پاکستان میں ان کے نام پر ایک اکیڈمی کا قیام[۲] ہمیں امید دلاتا ہے کہ ان کی تعلیم کو زیادہ وسیع حلقوں میں پھیلایا جا سکے گا۔ اس کے علاوہ بیرونی ممالک میں بھی اہل علم شاہ صاحب کی تصانیف اور شخصیت سے واقف ہو رہے ہیں۔ مصر میں ازہر یونیورسٹی کے استاد اور طالب علم "حجۃ اللہ البالغہ" کو اسلامی ادب کے ایک شاہکار کی حیثیت سے جانتے ہیں اور بعض معاصر عرب مصنفین[۳] کے یہاں اس کتاب کی طرف اشارے یا حوالے ملتے ہیں۔ مغربی درسگاہوں میں بھی اب یہ قاعدہ مان لیا گیا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کی "جدید" زندگی کی تاریخ کے مطالعے میں ابتدا شاہ ولی اللہ سے ہونی چاہیئے۔ ایک اور چیز جس کو اہل مغرب بہت دلچسپی کے ساتھ دیکھتے ہیں۔

(بقیہ حاشیہ) کر لیا ہے جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ادارۂ علوم اسلامی کے زیر اہتمام اشاعت کی غرض سے پیش کی گئی ہے۔ تیسرے اور چوتھے باب کے مواد کو موجودہ مضمون میں منتقل کیا جا رہا ہے۔ رہا آخری باب، تو وہ استعمال میں آنے سے پہلے نظر ثانی چاہتا ہے۔

۲ دیکھئے ماہنامہ "الرحیم" (مدیر محمد سرور) شعبۂ نشر و اشاعت شاہ ولی اللہ اکیڈمی حیدرآباد سندھ (پاکستان جون ۱۹۶۳ء)

۳ مثلاً دیکھئے۔

(الف) تعلیل الاحکام از محمد مصطفےٰ الشلبی۔ قاہرہ، مطبعۃ الازہر۔ ۱۹۴۹م، ص "ت"

(ب) اصول الفقہ الاسلامی از زکی الدین شعبان۔ قاہرہ، دار التألیف بلا تاریخ ص ۳۵۲

(ج) الفقہ الاسلامی از محمد یوسف موسی - بار سوم - قاہرہ، دار الکتاب العربی ۱۹۵۸- ص ۵۰۳

وہ شاہ صاحب کے یہاں "مذہب طبیعی" کا تصور ہے جس کی بدولت مغرب والے انہیں خود اپنے ان مفکرین کا ہمسر سمجھتے ہیں جنہوں نے شاہ صاحب کے ہی عہد میں (لیکن ان کی توجہات کے دائرے سے دور) اس مسئلے کی تحقیق میں نئی راہیں نکالی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض مغربی درسگاہوں میں ابھی گذشتہ چند سال کے اندر ہی حکمت ولی اللہی پر کچھ تحقیقی کام بھی ہوا ہے۔[۴]

سب سے آخر میں یہ چیز بھی قابل ذکر ہے کہ ہندوستان اور پاکستان میں فکر اسلامی کے زعما (مثلاً سر سید احمد خاں، مولانا شبلی، مولانا ابوالکلام آزاد اور ڈاکٹر محمد اقبال) شاہ صاحب کے افکار سے براہ راست اثر قبول کرتے رہے ہیں اور مستفید ہوئے ہیں۔

شاہ صاحب کا خیال تھا[۵] کہ جو لوگ علم و دانش میں ان کے وارث اور جانشین ہوں گے ان کا

---

[۴] اس سلسلے میں ایک نام تو اسی تحریر کا ہے جس کا ذکر پہلے نوٹ میں آچکا، لیکن اس سے پہلے ڈاکٹر عبدالواحد ہالی پوتا (صدر شعبۂ مذاہب، حیدرآباد سندھ یونیورسٹی، پاکستان) آکسفورڈ میں شاہ ولی اللہ صاحب کے فلسفے پر کام کر چکے تھے۔ ان کے مقالے کو سندھ یونیورسٹی نے ۱۹۵۹ میں شائع کرنا شروع کیا۔

[۵] "این فقیر را آگاہانیدند کہ در طبقہ کہ بعد از وی باشد علوم ظاہرہ ظہور نمایند و در طبقۂ ثالثہ علوم باطنہ۔ مراد این جا از طبقۂ ثانیہ اولاد است و از طبقۂ ثالثہ احفاد یا اولاد صغار کہ بمنزلۂ احفاد باشند و مراد این جا شیوع علوم ایشان است و ظہور امر ایشان۔ و مراد از علوم ظاہرہ کتاب و سنت است و از علوم باطنہ علومی کہ بلطائف خفیہ تعلق دارد" التفہیمات الالہیۃ (بجنور ۱۹۳۶) حصۂ اول ص ۱۱۵۔

یہ چیز قابل ذکر ہے کہ تفہیمات کے ایک قلمی نسخے میں جو علی گڑھ کے مجموعہ حبیب گنج میں موجود ہے، یہی عبارت کتاب کے بالکل آخری حصوں میں ل۱۳۶ پر ملتی ہے۔ معلوم نہیں ترتیب کے اس اختلاف کا سبب کیا ہے۔

سب سے پہلا گروہ ایسے افراد پر مشتمل ہوگا جو حکمت ولی اللّٰہی کے روایتی یا ظاہری حصے پر اپنی توجہ صرف کریں گے لیکن ان کے بعد جو نسل آئے گی اسکے بارے میں شاہ صاحب کا خیال تھا کہ اس کے لئے حکمت مذکورہ کے مفکرانہ یا باطنی پہلو زیادہ دلکش ثابت ہوں گے جس حد تک شاہ صاحب نے اس دعوے کو ایک مکاشفے کا رنگ دیا ہے اور اس کے ذریعے سے اپنے بیٹوں اور پوتوں کے علمی مناصب اور مقاصد کی تفریق کی ہے اس حد تک یہ ایک نجی معاملہ ہے جس پر رائے زنی کرنا ہمارا کام نہیں ہے لیکن ان کے لفظوں کے مفہوم کی توسیع اور تعمیم کی جاسکتی ہے مثلاً ہم یہ نتیجہ اخذ کرسکتے ہیں کہ شاہ صاحب اپنی تعلیم کے ظاہری یا منقول حصوں کو اپنی شخصیت سے زیادہ قریب اور زیادہ سرعت کے ساتھ ذہن نشین ہونے والا سمجھتے ہیں۔ بعد میں آنے والے زمانے نے شاہ صاحب کے اس اندازے کی مکمل طور سے تصدیق یا تائید نہیں کی ہے۔ بلکہ اب یہ محسوس ہوتا ہے کہ خود ان کے زمانے میں یا اس کے فوراً بعد لوگوں نے ان کو زیادہ تر "وحدت وجود" اور "وحدت شہود" کے تقابل یا سنی اور شیعہ نزاعات کی روشنی میں دیکھا۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ حدیث اور فقہ کی درس و تدریس کا انہوں نے جو کام شروع کیا تھا وہ آہستہ آہستہ ایک محدود دائرے میں اپنی جڑیں بھی پھیلا رہا تھا۔ اس طرح ان کے ظاہری اور باطنی علوم کی میراث بیک وقت بٹنا شروع ہوگئی تھی بہرحال موجودہ زمانے میں شاہ صاحب کے مختلف علوم اور کمالات کی تفریق اٹل ہے اور جس حد تک ان کی مختلف تاویلیں کرنے والے اپنے اختلاف کی جھلک خود ان کے کلام میں پاتے ہیں، اس حد تک انہیں شاہ صاحب کی اس بصیرت کا شکرگزار ہونا چاہیئے جس نے انہیں شاہ صاحب کی تعلیم کے ساتھ وفاداری نہ کرنے کے الزام سے بچا لیا ہے۔

اس وقت جو مضمون سپرد قلم کیا جارہا ہے اس کے بارے میں بعض تصریحات ضروری معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً اس کے عنوان میں لفظ "تاریخ" کا استعمال تھوڑی سی توضیح چاہتا ہے واقعہ تو یوں ہے کہ ہم اس مضمون کی محدود گنجائشوں کے اندر شاہ صاحب کی تعلیم کے ہر ایک قابل ذکر گوشے

کو روشنی میں لانے کی کوشش کریں گے۔ لیکن تاریخ کی تخصیص ہم نے اس لئے کر دی ہے کہ بحث کی جہات متعین ہو جائیں۔ بہر حال مضمون کے عنوان سے کسی کو یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ شاہ صاحب کے فلسفے میں تاریخ منجملہ اور بہت سے مباحث کے ایک ایسا مبحث ہے جس کو رکھ لینے یا چھوڑ دینے سے اس فلسفے پر کوئی اثر نہیں پڑے گا بالفاظ دیگر شاہ صاحب کے نظام فکر میں تاریخ کی وہ حیثیت نہیں ہے جو مثلاً انسانیت سے بحث کرنے کے وقت اس بات کی ہو سکتی ہے کہ بعض انسان کالے ہوتے ہیں اور بعض گورے، یا بعض طبیب ہوتے ہیں اور بعض شاعر آپ سیاہ اور سفید رنگ یا طبابت اور شاعری سے قطع نظر کر لیجیے۔ تب بھی انسانوں کے بارے میں کہنے کی بہت سی بلکہ کہیں زیادہ کارآمد اور اہم باتیں باقی رہ جائیں گی لیکن اس کے برخلاف اگر آپ مسئلہ تاریخ کو درمیان سے ہٹا دیں گے تو شاہ صاحب کے نظام فکر میں سے ریڑھ کی ہڈی غائب ہو جائے گی۔

دوسری بات جس کا یہاں پر اظہار ضروری ہے وہ یہ ہے کہ یہ مضمون ایک طویل تحریر کا اختصار یا تلخیص ہے[۶] چنانچہ اس میں بہت سی ایسی باتوں کو بیان کرنے میں اجمال کے بغیر چارہ نہ ہوگا جن کی تفصیل اور تحقیق کے سلسلے میں مضمون نگار اپنی ذمہ داری سے یہاں نہیں تو کہیں اور عہدہ برآ ہو چکا ہے۔ سب سے آخر میں ہمیں اس امر کا احساس کرنا چاہیئے کہ شاہ صاحب کے وہ افکار جن سے ہم بحث کریں گے ان کی نظر میں بہت اہمیت رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنی نادر الوقوع لیکن قابل توجہ شاعری میں ایک جگہ کہا ہے[۷]

سویدا اے دل ما یابی اندر پیچ و تاب او   نقوش عالم ام الکتابش می تواں گفتن

بحیثیت مجموعی ان کا تصنیف و تالیف کا پورا سرمایہ شاہد ہے کہ وہ اپنی تحریریں ہر جگہ انہیں "نقوش" کو اپنا نصب العین بناتے تھے جن کی طرف اس شعر میں اشارہ ہے یعنی ان کی تحریر علمی کد و کاوش کا نتیجہ تو ہوتی ہی تھی لیکن مزید برآں وہ ان کے روحانیت کے تقاضوں کو بھی پورا کرتی تھی ہمیں ان کے افکار

۶ے دیکھئے نوٹ نمبر ۱

۷ے رسالہ الفرقان (مرتبہ محمد منظور نعمانی) کے شاہ ولی اللہ نمبر بریلی ۱۳۵۲ھ میں اس شعر کو صدر کتاب میں نقل کیا گیا ہے۔

کی ترجمانی کرنے کے وقت اس بات پر دھیان دینا چاہیئے کہ کہاں وہ علمی تحقیق سے کام لے رہے ہیں اور کس جگہ ان کی توجہ روحانی تقاضوں پر مرکوز ہے۔

التذکیر بایام اللہ

عربی اور اردو میں لفظ "تاریخ" کے بہت سے معنی ہیں امام بخاری نے اسماء الرجال پر جو کتاب لکھی ہے اس کا نام "تاریخ" ہے۔[۵] ہم خط لکھنے سے پہلے جگہ اور وقت کی جو تفصیلات دیتے ہیں وہ بھی تاریخ ہیں کہا جاتا ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کا ایک نام "فیروز بخت" تھا جس کے ۱۳۰۵ عدد ان کے سال پیدائش کا پتہ دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ ان کا تاریخی نام ہے کسی شاعر نے کہا ہے۔

شیریں تر از حکایت ما نیست قصۂ تاریخ روزگار سراپا نوشتہ ایم

ان مثالوں کے متضمنات پر الگ الگ بحث کرنے کا یہاں موقع نہیں ہے۔ صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ ان سب سے مل کر وہ مفہوم بنتا ہے جس کے اعتبار سے لفظ تاریخ انگریزی (بلکہ مغربی) لفظ History کا مترادف بن گیا ہے۔ جب بہت سی چیزیں اس طرح سے ترکیب پا جاتی ہیں تو ان کا مجموعہ اپنے اجزاء سے مماثلت بھی رکھتا ہے اور مغائرت بھی چنانچہ History کے معنی میں تاریخ کو اوپر گنائی ہوئی تاریخوں سے اس قسم کی نسبت ہے بلکہ بعض دوسری زبانوں نے تو اس مثال میں جزو کل کے فرق کو واضح کرنے کے لئے اجزائے تاریخ کو جداگانہ نام دے رکھے ہیں۔ مثلاً انگریزی میں امام بخاری کی تاریخ کو Biography کہا جائیگا۔ کسی خط کی تاریخ کے لئے لفظ Date استعمال کیا جائے گا اور مولانا آزاد والی تاریخ کو Chronogram کہا جائے گا۔

اس تشریح سے ثابت ہوا کہ History کے معنی میں تاریخ کا استعمال قدیم نہیں ہے اور پھر مغربی زبانوں میں فلسفیانہ افکار کے اثر سے History کے معنی میں جو تنوعات پیدا ہو گئے ہیں ان کی تو ابھی پرچھائیں بھی ہمارے لفظ "تاریخ" تک نہیں پہنچی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہمارے مفکرین

---

۵ التاریخ الکبیر مطبوعہ دائرۃ المعارف، حیدرآباد دکن ۱۳۶۱ھ

ان متنوع معانی سے یکسر ناآشنا رہے ہیں۔ اردو تو ایک کم عمر زبان ہے لہذا اس کو یہاں بیچ میں نہ لایئے البتہ عربی زبان کا ادبی سرمایہ ایسی مثالوں سے خالی نہیں جن سے یہ ثابت ہوگا کہ لفظ تاریخ کا استعمال نہ کرنے کے باوجود کسی مصنف نے اس کے بنیادی مسائل کا احصار کر لیا ہے مثلاً اہل منطق پر تنقید کرتے ہوئے ابن تیمیہ نے اس بات پر زور دیا ہے کہ عالم اسلام میں ارسطاطالیسی منطق کی تائید اور تبلیغ کرنے والے تاریخی شعور سے عاری ہیں[۹]۔ لیکن اس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے وہ لفظ تاریخ کا استعمال نہیں کرتے چنانچہ کبھی تو وہ متبعین ارسطو کو "اخبار امم" سے ناواقف بتلاتے ہیں، کبھی انہیں "تواتر" سے کام لینے والے علوم کا دشمن کہتے ہیں، اور کبھی یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ خیالی گھوڑے دوڑانے کی وجہ سے اور حقائق کا احترام نہ کرنے کی وجہ سے ان مفکرین کی اجتماعی شخصیت انحطاط پذیر اور آمادہ زوال ہے اسی طرح ابن خلدون نے جس معرکۃ الارا کتاب میں تاریخ کا فلسفہ بیان کیا ہے اس کا نام "دیوان المبتدا والخبر" ہے[۱۰]۔

ان مثالوں کے پیش نظر، کسی کو یہ سن کر تعجب نہیں کرنا چاہیئے کہ بعض دوسرے عنوانات کے تحت شاہ ولی اللہ صاحب بھی تاریخ کے بنیادی مسائل سے دوچار ہوتے ہیں۔ عام طور سے وہ اس چیز کے لئے ایام اللہ کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں حکمائے تاریخ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ لفظ history کا اطلاق ماضی کے واقعات پر بھی ہوتا ہے اور ان واقعات کے تذکرے پر بھی ایام اللہ کو ان دو باتوں میں سے پہلی کے ساتھ مطابقت ہے۔ دوسری کے لئے شاہ صاحب کی مکمل ترکیب "التذکیر بایام اللہ" موجود ہے۔

گویا جس چیز کو history کہا جاتا ہے وہ شاہ صاحب کی اصطلاح میں اللہ تعالیٰ کے "دنوں" یا ان "دنوں" کی یاددہانی سے عبارت ہے۔ ان دنوں کی یادآوری کا کام عبادت بھی ہے اور علم بھی عبادت اس معنی میں کہ اس کا موضوع صفات و افعال رب ہیں

اور علم اس معنی میں کہ یہ انسانی ذہن کو سب سے زیادہ عظیم الشان معلومات کی طرف متوجہ

۹۔ کتاب الرد علی المنطقین (بمبئی ۱۹۴۹ء)، ص ۴۳-۱۸۲، ۱۰۰-۹۸، ۵۱۱

۱۰۔ کتاب کا پورا نام ہے۔ عنوان العبر و دیوان المبتدا والخبر فی ایام العرب والعجم والبربر ومن عاصرھم من ذوی السلطان الاکبر۔

کرتا ہے۔ (شاہ صاحب نے اللہ تعالیٰ کے دنوں کے ساتھ اس کی نعمتوں کی یاد دہانی اور آخرت کے ذکر کو بھی علوم میں شامل کیا ہے یہ دو چیزیں عبادت کی حیثیت سے تو ذکر ایام اللہ کی برابر ہیں، لیکن علم کی حیثیت سے انہیں اس کی فروع سے تعبیر کیا جا سکتا ہے چنانچہ عام طور سے شاہ صاحب خود ایام اللہ کو ایسے وسیع اور ہمہ گیر معنی میں استعمال کرتے ہیں کہ ان کے علم میں دوسرے علوم بھی شامل نظر آتے ہیں)

اب اگر یہ سوال اٹھایا جائے کہ تصور ایام اللہ کا سرچشمہ کیا اور کہاں ہے تو جواب دینا زیادہ دشوار نہ ہوگا بائیبل میں لفظ "یوم الرب" کا استعمال ہوا ہے۔[12] یہ دن (جو واحد ہے) آزمائش کا دن ہے اور اس کا آنا دنیا کے معمولی دنوں کے سلسلے کی شکست یا انقطاع سے عبارت ہے اس مفہوم کے برخلاف قران شریف میں اللہ تعالیٰ کے دن کا بھی بیان ملتا ہے اور دنوں کا بھی، اور بہر صورت یہ بیان امید آفریں ہے۔ مثلاً ایک جگہ پر وارد ہوا ہے۔[13]

ولقد ارسلنا موسیٰ بآیاتنا انّ اخرج قومک من الظلمات الی النور وذکرہم بایام اللہ انّ فی ذلک لآیات لکل صبار شکور" سورہ ابراہیم (۱۴-۵)

ایک اور جگہ پر ارشاد ہوا ہے[14]

---

۱۲ آہ علی الیوم لانّ یوم الرب قریب یاتی کخراب من القادر علی کل شیٔ ۔۔۔ یوم ظلام وقتام یوم غیم وضباب ۔۔۔۔۔ قدامہ نار تاکل وخلفہ لہیب یحرق ولا تکون منہ نجاۃ۔"

(الکتاب المقدس، مطبوعہ نیویارک ، ۱۸۶۷ ، صحیفۂ جوئیل)

۱۳ اور بھیجا تھا ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیاں دے کر کہ نکال اپنی قوم کو اندھیروں سے اجالے کی طرف اور یاد دلا ان کو دن اللہ کے البتہ اس میں نشانیاں ہیں اس کو جو صبر کرنے والا ہے، شکر گزار (ترجمہ از مولانا محمود حسن دیوبندی۔ بجنور ۱۹۵۲ء)

۱۴ اس سے مانگتے ہیں جو کوئی ہیں آسمانوں میں اور زمین میں ہر روز اس کو ایک دھندا ہے۔ (ایضاً)

"یسئلہ من فی السماوات والارض کل یوم ھو فی شان" سورہ رحمان (۵۵ - ۲۹)

جس چیز کو اردو مترجم نے (اللہ تعالیٰ کے) دن کا "دھندا" کہا ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب اسی کو نظم کائنات کے ایک دور سے تعبیر کرتے ہیں جس میں اللہ کی قدرت اور رحمت موجودات کو ایک نئے ڈھب سے کسی نئی منزل کی طرف چلائے۔ اس قسم کے ادوار کی تفصیل میں شاہ صاحب ارتقا کے ان نظریات سے کام لیتے ہیں جو تصوف کے حلقوں میں رائج تھے۔ حضرات صوفیہ نے چہارگانہ اقسام موجودات (معادن نبات حیوان اور انسان) کے تصور کو "جدید افلاطونی" نظریۂ فیضان Emanation سے ملا کر ارتقاء کا ایک پورا سلسلہ مرتب کر لیا تھا۔ وہ اس بات کے قائل تھے کہ وجود اشیاء کی کوئی اضافی صفت نہیں ہے بلکہ ان کا جوہر ہے چنانچہ معاون اور نبات اور حیوان اور انسان ایسی ناقابل تغیر انواع Immutable species نہیں جو ایک ہی وقت میں ساتھ ساتھ تو رہ لیتی ہوں لیکن جن کے درمیان تداخل ممکن نہ ہو۔ نہیں صوفیہ کا رجحان تو اس خیال کی طرف تھا کہ ان اقسام کے درمیان جو اختلاف پایا جاتا ہے وہ مدارج وجود کی تکمیل یا عدم تکمیل (یعنی ان کی بلندی یا پستی) کا پیمانہ ہے، ورنہ ان کے اندر تدریج سے گذرنے والی یا ارتقاء کرنے والی حقیقت وجود تو واحد اور غیر منقسم ہے اس حد تک پہنچکر ارباب تصوف مختلف راہیں اختیار کر لیتے تھے۔ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی اور ان کے متبعین "وحدت وجود" پر اب بھی اپنی توجہ اس طرح سے مرکوز رکھتے تھے کہ ارتقاء کی کہانی انہیں ایک قسم کی Tragedy معلوم ہوتی تھی۔ ان لوگوں کے برخلاف، مولانا جلال الدین رومی اس کہانی کے پیچ و خم میں تدبیر عالم کی کرشمہ سازیاں (یعنی اللہ تعالیٰ کی حکمت اور رحمت کی آیتیں) تلاش کرتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ارتقاء کی راہوں میں پھول بھی کھلتے ہیں اور کانٹے بھی بکھرے ہوئے ہیں لیکن بہر صورت ان راہوں سے گزرنا اس بات کی دلیل ہے کہ جو چیز سادہ یا بسیط یا بے رنگ تھی، ہنگامۂ وجود نے اب اس کے اندر وسعت یا تنوع یا ترکیب پیدا کر دی ہے اور اس کو رنگین بنا دیا ہے۔ "کزرع اخرج شطاہ فآزرہ فاستغلظ فاستویٰ علیٰ سوقہ یعجب الزراع" [16]

[16] قرآن شریف سورہ فتح (۴۸ - ۲۹) جیسے کھیتی نے نکالا اپنا پٹھا، پھر اس کی کمر مضبوط کی، پھر موٹا ہوا، پھر کھڑا ہوا اپنے نال پر، خوش لگتا کھیتی والوں کو (اردو ترجمہ از شاہ عبد القادر دہلوی مطبوعہ تاج کمپنی، لاہور، بلا تاریخ)

شاہ ولی اللہ صاحب ان دونوں تاویلوں میں سے رومی کے مسلک کی طرف رجحان رکھتے ہیں اس مسئلے کی بعض تفصیلات سے ہم آگے چل کر بحث کریں گے سردست ہمیں تصور ایام اللہ کی طرف رجوع کرنا چاہیئے شاہ صاحب یہاں اس تصور کے مصادر کو بیان کر دینے کے بعد اب یہ کہنا باقی ہے کہ وہ ایام اللہ سے وجود کے مراتب مراد لیتے ہیں سب سے پہلے خدا تھا اور کوئی اور چیز نہ تھی لیکن اس وقت بھی وجود میں آسکنے والی چیزوں کی سکت یا ان کا امکان خدا کے دست قدرت میں تھا پھر "دنوں" کا سلسلہ شروع ہوا۔ ابتدا مواد سے ہوئی جن کی حیثیت ایسے مرکب کی سی تھی جس کا کوئی راکب نہ ہو۔ انہیں مواد کو ایک صورت دے دی گئی (یعنی ہیولاتی مرکب کو ایک راکب ملا) اس طرح عناصر وجود میں آئے اور اس خاص "دن" میں اس ایک راکب و مرکب کی خوش حالی خیر و شر کا معیار تھی، اس لئے کہ یہ دونوں مل کر اپنے خالق کا شاہ کار تھے۔ اگلے دن یہ دونوں مل کر کسی اور راکب کے کام آنے کے لائق ہو گئے چنانچہ مواد اور صورت عنصری مل کر صورت نبات کا ہیولا بن گئے۔ اس طرح اگنے والی چیزیں ظاہر ہوئیں اور اب ان کی خوش حالی خیر و شر کا معیار تھی اس لئے کہ وہ خالق کا تازہ ترشاہکار تھیں اس کے بعد والے دن میں سابق راکب و مرکب مل کر پھر کسی نئے راکب کے کام آنے کے لائق ہوئے۔ اب جانور وجود میں آئے، اور ان کے لحاظ سے خیر و شر کا معیار پھر بدلا گیا سب سے آخر میں انسان کا ظہور ایک ایسے راکب کی حیثیت سے ہوا جو کسی اور راکب کا مرکب نہیں، لیکن جس کے لئے باقی تمام موجودات مرکب ہیں اب تک ایام اللہ کا سلسلہ ایک سیدھی لکیر کی شکل میں سادگی سے کثرت یا ترکیب یا رنگینی کی طرف چلا تھا۔ لیکن انسان کی ذات میں ہر قسم کی کثرت اور ترکیب اور رنگینی درجہ کمال تک پہنچی اس لئے کہ وہ ہر کسی مرکب کا راکب تھا۔ چنانچہ اب اسی کی زندگی کے دائرے میں محدود ہوئے۔ "وتلک الأیام نداولھا بین الناس"

بالفاظ دیگر، ایام اللہ سے ماقبل انسانی ادوار تاریخ بھی مراد ہو سکتے ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ صحیح طریقہ یہ ہے کہ انہیں انسانی زندگی کے دائرے تک محدود سمجھا جائے یا کم سے کم اس حقیقت کا اعتراف کیا جائے کہ انسانی خوشحالی سے پہلے دوسرے اقسام موجودات کی خوشحالی بھی خیر و شر کا معیار ہوتی تھی۔ لیکن وہ معیار منسوخ ہوئے۔ لہٰذا اب یہ کہنا درست ہے کہ انسانی زندگی کے مقاصد اور مصالح مطلق طور سے خیر و شر کا معیار ہیں۔

دائرۃ المعارف عثمانیہ حیدرآباد دکن کی نادر کتابیں

کتاب	مصنف	قیمت
جامع مسانید الامام الاعظم ۲ جلد	الخوارزمی	۱۵/-
الجوہر النقی	ابن الترکمانی	۲۰/-
شرح تراجم ابواب صحیح البخاری	شاہ ولی اللہ	۵/-
کنز العمال کامل ۱۰ جلدیں	علی متقی الھندی	۲۲۵/-
التاریخ الکبیر ۷ جلدیں	الامام البخاری	۱۵۰/-
تذکرۃ الحفاظ کامل	الذھبی	۶۵/-
تقدمۃ الجرح والتعدیل ۹ جلد کامل	ابن ابی حاتم الرازی	۱۷۵/-
کتاب الکنی والاسماء دو جلد	ابو بشر الدولابی	۳۲/۵۰
دلائل النبوۃ	ابو نعیم الاصفہانی	۲۵
فتح المتعال	احمد المغربی	۱/-
الدرر الکامنۃ جز ۲، ۳، ۴	ابن حجر العسقلانی	۳۵/-
الجواہر المضیئۃ ۲ جلد کامل	عبد القادر	۲۰/-
نزہۃ الخواطر ۷ جلدیں	عبد الحئی الندوی	۱۲۰/-
الامالی فی الفقہ	الامام محمد بن حسن الشیبانی	۴/-
الاربعین فی اصول الدین (فی الکلام)	فخر الدین الرازی	۱۵/-
شرح الفقہ الاکبر	ابو منصور الماتریدی	۸/-
الرسائل التسع	جلال الدین سیوطی	۱۰/۵۰
الفقہ الاکبر	الامام ابو حنیفہ	۱/-
الاربعین فی التصوف	ابو عبد الرحمن السلمی	۱/-
دول الاسلام کامل ۲ جلد	الذھبی	۱۷/۵۰
کتاب المحبر	ابو جعفر البغدادی	۲۰/-
ذیل مراۃ الزمان ۴ اجزاء کامل	قطب الدین الیونینی	۸۰/-
المنتظم مع فہرس الاسماء کامل ۶ جلدیں	ابو الفرج ابن الجوزی	۶۰/-
دستور العلماء کامل ۴ جلدیں	عبد النبی احمد نگری	۴۵/-
الامالی الشجریۃ ۲ جلد	ابن الشجری	۲۰/-
کتاب الخیل	ابو عبیدۃ	۶/-
کتاب المجتنی	ابن درید	۴/-
مصدق الفضل شرح قصیدہ بانت سعاد	شہاب الدین دولت آبادی	۶/-
الاشباہ والنظائر (فی النحو)	جلال الدین سیوطی	۳۷/-
کتاب الاقتراح	السیوطی	۴/-
کتاب الانواء	ابن قتیبہ	۱۸/-

مکتبۂ اسحاقیہ جونا مارکیٹ کراچی پاکستان

پرنٹر پبلشر محمد سرور نے سعید آرٹ پریس سے چھپوا کر دفتر الرحیم حیدرآباد سے شائع کیا

مطبوعات شاہ ولی اللہ اکیڈمی

★

لمحات (عربی)

شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے فلسفہ تصوف کی یہ بنیادی کتاب عرصے سے نایاب تھی۔ مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی کو اس کا ایک پرانا قلمی نسخہ، جو اغلاط سے پر تھا، ملا۔ موصوف نے بڑی محنت سے اس کی تصحیح کی، اور شاہ صاحب کی دوسری کتابوں کی عبارات سے اس کا مقابلہ کیا۔ اور وضاحت طلب امور پر تشریحی حواشی لکھے۔ کتاب کے شروع میں مولانا کا ایک مبسوط مقدمہ ہے۔

شاہ صاحب نے اس کتاب میں "وجود" اور اس سے کائنات کا جس طرح صدور ہوا ہے، اس پر بحث کی ہے، اور اپنی الہیاتی حکمت کے دوسرے مسائل بھی بیان کئے ہیں۔ قیمت دو روپے

——:o:——

شاہ ولی اللہ کی تعلیم

از پروفیسر غلام حسین جلبانی سندھ یونیورسٹی

پروفیسر جلبانی ایم اے صدر شعبہ عربی سندھ یونیورسٹی کے برسوں کے مطالعہ و تحقیق کا حاصل یہ کتاب ہے، اس میں مصنف نے حضرت شاہ ولی اللہ کی پوری تعلیم کا احصاء کیا ہے اس کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل بحثیں کی ہیں۔ اردو میں شاہ صاحب کی تعلیم پر یہ پہلی جامع کتاب ہے۔

کتاب مجلد ہے۔ قیمت ۷/۵۰ روپے ہے

Monthly "AR-RAHIM" Hyderabad Regd. S. No. 2548

اغراض و مقاصد

۱- شاہ ولی اللہ کی تصنیفات اُن کی اصلی زبانوں میں اور اُن کے تراجم مختلف زبانوں میں شائع کرنا۔

۲- شاہ ولی اللہ کی تعلیمات اور ان کے فلسفہ و حکمت کے مختلف پہلوؤں پر عام فہم کتابیں لکھوانا اور اُن کی طباعت و اشاعت کا انتظام کرنا۔

۳- اسلامی علوم اور بالخصوص وہ اسلامی علوم جن کا شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتبِ فکر سے تعلق ہے، اُن پر جو کتابیں دستیاب ہو سکتی ہیں اُنہیں جمع کرنا، تاکہ شاہ صاحب اور اُن کی فکری و اجتماعی تحریک پر کام کرنے کے لئے اکیڈمی ایک علمی مرکز بن سکے۔

۴- تحریک ولی اللہی سے منسلک مشہور اصحاب علم کی تصنیفات شائع کرنا، اور اُن پر دوسرے اہلِ قلم سے کتابیں لکھوانا اور اُن کی اشاعت کا انتظام کرنا۔

۵- شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتب فکر کی تصنیفات پر تحقیقی کام کرنے کے لئے علمی مرکز قائم کرنا۔

۶- حکمت ولی اللہی اور اُس کے اصول و مقاصد کی نشر و اشاعت کے لئے مختلف زبانوں میں رسائل کا اجراء

۷- شاہ ولی اللہ کے فلسفہ و حکمت کی نشر و اشاعت اور اُن کے سامنے جو مقاصد تھے۔ اُنہیں فروغ دینے کی غرض سے ایسے موضوعات پر جن سے شاہ ولی اللہ کا خصوصی تعلق ہے، دوسرے مُصنفوں کی کتابیں شائع کرنا

محمد سرور پرنٹر پبلشر نے سعید آرٹ پریس حیدر آباد سے چھپوا کر شائع کیا۔

شاہ ولی اللہ اکیڈمی کا علمی مجلہ
الرحیم
ماہنامہ
شعبۂ نشر و اشاعت شاہ ولی اللہ اکیڈمی ○ صدر حیدرآباد
رجب ۱۳۸۳ھ، دسمبر ۱۹۶۳ء

قيمت ساليانه :- آڈھ روپے   في پرچ :- پڇهتر پيسے

جلد ۱ رجب ۱۳۸۳ھ مطابق دسمبر ۱۹۶۳ء نمبر ۷

فہرست مضامین

کتبہ - عبدالمجید

شذرات

یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ نہ صرف ہند پاکستان میں بلکہ عرب ممالک کے علمی حلقوں اور مغربی درس گاہوں میں بھی اب شاہ ولی اللہ اور ان کی تعلیمات سے خاص دلچسپی لی جا رہی ہے عرب دنیا میں تو شاہ صاحب کی مشہور کتاب "حجۃ اللہ البالغہ" کا ایک عرصہ ہوا، تعارف ہو چکا ہے۔ اور جیسا کہ "الرحیم" کے نومبر کے شمارے میں ایک مضمون میں بتایا گیا ہے، مغربی درسگاہوں میں اب یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے مسلمانوں کی "جدید" زندگی کی تاریخ کے مطالعے میں ابتدا شاہ ولی اللہ سے ہونی چاہیئے حال ہی میں پاکستان کے ایک مؤقر دینی مجلّہ میں ایک اہل قلم نے لکھا ہے کہ جہاں تک ہند پاکستان میں اسلامی احیاء کے کام کا تعلق ہے، ایک ایماندار مورخ مجبور ہے کہ ان ڈھائی سو سالوں کو شاہ ولی اللہ کا دور قرار دے۔

شاہ ولی اللہ صاحب نے پیش گوئی کی تھی کہ ان کے بعد ان کے جو "علوم ظاہرہ" ہیں، جن سے ان کی مراد کتاب و سنت کے علوم ہیں، ان کی پہلے نشر و اشاعت ہو گی اور اس کے بعد ان کے "علوم باطنہ" یعنی علوم حکمیہ کو فروغ ہوگا۔ اب جہاں تک شاہ صاحب کے علوم ظاہرہ کا تعلق ہے اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ ان کی جتنی نشر و اشاعت ہوئی ہے اس دو سو سال کے عرصے میں کسی اور صاحبِ علم کے علوم کی نہیں ہوئی، شاہ ولی اللہ کے صاحبزادے شاہ عبدالعزیز کے زمانے کا ذکر ہے کہ ایک غیر ہندوستانی عالم نے سارے ہندوستان کی سیاحت کی اور اسے علم حدیث کا کوئی بھی استاد ایسا نہ ملا، جو شاہ عبدالعزیز کا شاگرد نہ ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ آج شاہ ولی اللہ کے اتباع کی بدولت کتاب و سنت کے علوم کے درس و تدریس کا جو چرچا برصغیر میں ہے، کسی بھی اور مسلمان ملک میں نہیں اور گزشتہ دو صدیوں میں مسلمانان پاک و ہند نے جتنی علم حدیث کی خدمت کی ہے، کسی اور ملک کے مسلمانوں نے نہیں کی۔

لیکن اس کے ساتھ ہی یہ ماننا پڑے گا کہ شاہ ولی اللہ کے علوم حکمیہ کی طرف ابھی تک اتنی توجہ نہیں ہوئی جس قدر کہ ہونی چاہیئے تھی۔ اس سلسلے میں مولانا عبیداللہ سندھی کا یہ بہت بڑا احسان ہے کہ چوبیس سال کی جلاوطنی کے بعد جب وہ واپس وطن آئے تو انہوں نے آتے ہی خاص طور پر اہل علم کو اس طرف متوجہ کیا اور اپنی زندگی کے آخری دموں تک وہ شاہ صاحب کے علوم حکمیہ کے پڑھنے پڑھانے اور ان پر غور و خوض کرنے کی بڑی شدّ و مد سے دعوت دیتے رہے مرحوم علمائے کرام سے بار بار یہ کہتے تھے کہ آج یورپ کے فکری و علمی انقلاب کو نظر انداز کرنا ناممکن ہے۔ اور اسے سمجھنے، اس کے خیر و شر میں تفریق کرنے اور اس کے اچھے اثرات کو اپنانے اور انہیں عملاً نافذ کرنے کے لئے امام ولی اللہ کے علوم حکمیہ کا مطالعہ بے حد ضروری ہے خدا کا شکر ہے مولانا سندھی مرحوم کی یہ دعوت صدا بصحرا ثابت نہیں ہوئی۔ اور ہمارے علمی حلقوں میں اب شاہ ولی اللہ کے علوم حکمیہ کی ضرورت و اہمیت کا احساس پیدا ہو چلا ہے، اور اہل علم ادھر متوجہ ہو رہے ہیں۔

اس راہ میں ایک بڑی دقت شاہ صاحب کی اصل کتابوں کی نایابی ہے۔ بے شک ان میں سے بعض کتابیں اردو تراجم کی شکل میں دستیاب ہو جاتی ہیں، لیکن وہ اکثر و بیشتر ناقابل فہم ہیں، اور ان سے کما حقہ استفادہ نہیں کیا جا سکتا۔ شاہ ولی اللہ اکیڈمی کی یہ کوشش ہے کہ وہ شاہ صاحب کی اصل کتابوں کے متون کم سے کم عرصے میں زیادہ سے زیادہ تعداد میں شائع کرے، لیکن طباعت کی رکاوٹیں اس میں حائل ہو رہی ہیں۔ اس وقت سطعات زیر طباعت ہے۔ اس کے بعد تاویل الاحادیث چھپے گی۔ پھر یکے بعد دیگرے دوسری کتابیں شائع کرنے کا انتظام کیا جائے گا۔

شاہ ولی اللہ صاحب کے علوم ظاہرہ اور علوم باطنہ کے مطالعے کے سلسلے میں شاہ صاحب کے سوانح حیات اور ان کے افکار و خیالات کے اجمالی جائزے پر ایک ایسی کتاب کی ضرورت ہے جو شاہ صاحب کے علوم دینیہ و حکمیہ کو سمجھنے کے لئے ایک گائیڈ کا کام دے۔ اکیڈمی اس قسم کی کتاب خود تیار کرا کے شائع کرنا چاہتی ہے لیکن ابھی تک اس کا انتظام نہیں ہو سکا پاکستان یا ہندوستان کے کسی اہل قلم نے

نے اگر اس موضوع پر کچھ کام کیا ہو، اور وہ ایسی کتاب مرتب کرنے کا خیال رکھتے ہوں، تو اس ضمن میں اکیڈمی ان سے پورا تعاون کرنے کو تیار ہے۔ شاہ صاحب پر اس قسم کی تحقیقی و جامع کتاب کی فوری ضرورت ہے، اور اسے جلد سے جلد شائع ہونا چاہیئے۔

ان دنوں ہالینڈ سے ایک ڈچ عالم ڈاکٹر بالجن پاکستان آئے ہوئے ہیں۔ وہ شاہ ولی اللہ صاحب کے فلسفیانہ و دینی افکار پر تحقیقی کام کرنے کے لئے علمی مواد جمع کر رہے ہیں۔ پاکستان سے وہ ہندوستان بھی جائیں گے۔ موصوف ۱۰ر اکتوبر سے ۲۹ر اکتوبر تک شاہ ولی اللہ اکیڈمی میں رہے۔ یہاں انہوں نے ڈاکٹر عبدالواحد ہالے پوتا اور مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی سے استفادہ کیا، اور شاہ صاحب کی بعض کتابوں کے بارے میں ڈاکٹر بالجن کی ان دونوں حضرات سے کافی گفت گو رہی۔ موصوف فروری میں پھر یہاں تشریف لا رہے ہیں۔

الرحیم کے سہ ماہی سندھی ایڈیشن کے جملہ انتظامات مکمل ہو گئے ہیں، اب صرف اس کے ڈیکلریشن کا انتظار ہے، جیسے ہی اس کی منظوری آ گئی، الرحیم سندھی شائع ہو جائے گا۔ اسی طرح اکیڈمی کی طرف سے سال میں ایک بار انگریزی زبان میں "الحکمہ" کے نام سے ایک جرنل شائع کرنے کا بھی فیصلہ ہوا ہے۔ اس کے لئے مضامین جمع ہو رہے ہیں، انشاء اللہ "الحکمہ" بھی نئے سال کے شروع میں شائع ہو جائیگا۔ شاہ صاحب کے دو مختصر رسائل "حسن العقیدہ" عربی میں اور "وصیت نامہ" فارسی میں ہے۔ پروفیسر جلبانی صاحب نے اول الذکر کا سندھی میں ترجمہ کیا ہے، جو چند دنوں تک چھپ جائے گا۔ "وصیت نامہ" کا بھی سندھی میں ترجمہ ہو رہا ہے اور وہ بھی عنقریب چھپ جائے گا۔

کشمیری تصوف کا تاریخی پس منظر

سلیم خاں گمی[1]

آسانی کے لئے کشمیری تصوف کو تین ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے:-

دورِ اوّل کا کشمیری تصوف افکار و تصورات یا اشغال و اعمال کے کسی منضبط، منطقی یا واضح دبستان کا نام نہیں ہے، یہ ایک ایسا آمیزہ ہے جس کے اجزاء میں ناگ مت کی رسومات، برہمن مت کی عزلت پسندی، بدھ مت کی رہبانیت، اور شومت کی تصوریت شامل ہے۔ یہ نظریات و عقائد کا ایک جنگل ہے، جو توہمات کی پُرخار جھاڑیوں سے اٹا پڑا ہے۔ اس جنگل میں تلاش حق کی سعی بے سود ہے۔ یہ وہ راستہ ہے جو ژولیدہ نگاہی اور انتشار ذہنی کی طرف لے جاتا ہے۔

دوسرے دور کا کشمیری تصوف خالصتاً اسلامی تصوف ہے۔ جو ایران کے صلحاء و اتقیاء کے وعظ و تبلیغ کے طفیل خطۂ فردوس نما میں اشاعت پذیر ہوا اور دورِ اوّل کے سلبی متصوفانہ افکار و تصورات پر غالب آیا۔ اس عہد کے صوفیائے کرام و مبلغین عظام میں سید شرف الدین بلال شاہؒ (سید عبدالرحمٰن بلبل شاہ) اور شاہ ہمدانؒ سرفہرست ہیں۔

۱؎ سلیم خاں گمی۔ آزاد کشمیر ریڈیو تراڑ کھل میں پروگرام آرگنائزر اور اردو کتاب "کشمیر، ادب و ثقافت" کے مصنف ہیں۔

تیسرے دور کا کشمیری تصوّف وہ ہے جس کے بانی شیخ نورالدین نورانیؒ عرف نُندرشی ہیں۔ اصل میں یہی وہ دور ہے، جس میں کشمیری مقامی تصوّف پروان چڑھا۔ اس دور کا تصوّف پہلے اور دوسرے دور کے متصوّفانہ افکار و تصوّرات کی پیوندکاری اور آمیزش کا نتیجہ ہے۔ یہی وہ اصل کشمیری تصوّف ہے جو نہ تو بدھ مت یا ہندو مت سے لگّا کھاتا ہے اور نہ خالصتاً اسلامی تصوّف ہے۔ اس کے برعکس یہی وہ دلستان تصوف ہے جس میں اسلامی تصوف کے صحت مند افکار کے پہلو بہ پہلو بدھ مت کی رہبانیت، برہمن مت کی عزلت پسندی، اور شومت کی تصوریت ملتی ہے۔ یہی وہ کشمیری تصوّف ہے، جس نے اہل کشمیر کو سر والٹر لارنس (مصنف ویلی آف کشمیر) کے الفاظ میں ایذا پسند اور ظلم پرست بنادیا اور اقبالؒ کو کہنا پڑا۔ ؏

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسم شبّیری

ڈاکٹر جی۔ ایم۔ ڈی، صوفی (مصنف کشیر KASHIR) اہل کشمیر پر تصوف کے اس مکتب کے اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"سات سو سال تک بدھ مت کی ویدانت کی تعلیم کو اور ایرانی ماخذ سے سرایت کرنے والے اسلامی تصوف کو کشمیر نے سر آنکھوں پر بٹھایا ہے پیروں اور پنڈتوں نے لئے توہم پرست بنانے کی کوشش بھی بڑے زور شور سے کی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ تصوف اور وہم اب ایک کشمیری کی فطرت میں رچ گئے ہیں۔ درحقیقت وہ وہم اور تصوف کی فضا میں سانس لیتا ہے۔ کشمیر کے پیروں اور صوفیوں کے خیال میں طریقت کو شریعت پر ترجیح حاصل ہے لہٰذا اہلِ طریقت شریعت سے کوئی سروکار نہیں رکھتے۔"

۲

وادیٔ کشمیر کے قدیم ترین آبادکار ناگ مت کے پیرو کار ہیں۔ انہیں ناگا اور ناگی کہا جاتا ہے۔ بعض محققوں کا خیال ہے کہ ناگا لوگ چین کے رہنے والے ہیں جیسا کہ مرزا محمد کاظم برلاس مرادآبادی نے اپنی اردو تصنیف بہ عنوان "التثلیث" کے صفحہ ۲۵۸ پر لکھا ہے کہ تواریخ چین سے ثابت ہے کہ ساکنانِ خطا کو ناگ کہتے ہیں اور وہ ہندوستان میں آریہ لوگوں کے ہمراہ پہنچے۔ ڈاکٹر جی ایم ڈی صوفی کو اس دعوے سے اختلاف ہے آپ اپنی انگریزی تصنیف "کشیر" (جلد اوّل ص۱۵) میں لکھتے ہیں کہ آریاؤں کی آمد سے پہلے کشمیر سمیت سارے

ہندوستان میں ناگا لوگ پھیلے ہوئے تھے۔ اور کشمیر میں بدھ مت کی اشاعت سے پہلے اور بعد اس فردوس نما وادی میں ناگ پوجا کے آثار و علائم ملتے ہیں۔ لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ کشمیر میں ناگ پوجا کرنے والے لوگ تہذیب و ثقافت کے کس دور میں تھے۔ اور ان کی معاشرت کی نوعیت کیا تھی۔ تاہم یہ طے ہے کہ ناگا لوگ دیوی دیوتاؤں کے طور پر سانپوں اور اژدہوں کی پوجا کیا کرتے تھے۔ ان کے سردار اعلیٰ کا نام نیل تھا۔ جس نے نیل مت پران تحریر کیا۔ اس پران میں نیل کی نہک ہدایات ملتی ہیں۔ ڈاکٹر جی ایم ڈی صوفی "کشیر" (جلد اوّل صفحہ ۳۵) میں لکھتے ہیں کہ کشمیر کے مشہور عالم مؤرخ پنڈت کلہن نے کشمیر کی تاریخ پر کتاب بہ عنوان "راج ترنگی" تحریر کرنے میں نیل مت پران سے استفادہ کیا تھا۔ جیمز فیر گارسن (مصنف درخت اور سانپ کی پوجا) کا خیال ہے کہ ناگا تورانی نسل سے ہیں۔ جو شمالی ہند میں اقامت پذیر تھے۔ جب آریا لوگ شمالی ہند میں وارد ہوئے تو انہوں نے ناگ پوجا کرنے والوں کو شکست دی۔ ڈاکٹر سی ایف اولڈھم (مصنف سورج اور سانپ) کی رائے میں ناگا لوگ اپنے آپ کو آفتاب کی اولاد تصور کرتے ہیں اور سانپ کا پھن ان کا قبائلی نشان ہے۔

جدید تحقیقات سے پتا چلتا ہے کہ ناگا لوگ چین، جاپان، فلپائن، نیپال اور ہندوستان کے قدیم ترین باشندے ہیں۔ جب آریہ لوگ شمالی ہند میں داخل ہوئے تو انہوں نے کولوں دراوڑوں اور ناگاؤں کو شکست دے کر ان کی ثقافت کو ختم کر دیا۔ مگر ہندوستان کے یہ قدیم باشندے قطعی طور پر ختم نہ ہو سکے۔ اور مغربی ہند کی طرف نکل گئے۔ آسام میں بھیل گونڈ اور ناگا لوگ اب بھی پائے جاتے ہیں۔ کشمیر میں ناگاؤں نے سوا تین سو سال (۷۰۲ء سے ۷۷۹ء تک) حکومت کی ہے۔ کشمیر کے کراکوٹہ خاندان کے حکمران ناگ مت کے پیروکار تھے۔

ناگ مت کے بعد کشمیر میں ہندو دھرم کا اقتدار ہوا۔ شمالی ہند میں آریاؤں کی آمد سے لے کر ۲۷۲ ق م تک کشمیر میں ہندو دھرم کے راجاؤں نے حکومت کی ۲۷۲ ق م میں موریہ خاندان کا حکمران اشوک کشمیر میں برسر اقتدار آیا۔ چونکہ وہ خود بدھ مت کا پیروکار تھا اس لئے بدھ مت کو وادی میں بے پناہ فروغ حاصل ہوا۔ تاہم ناگ مت اور برہمن مت کے ماننے والوں کو اشوک کی طرف سے کوئی گزند نہ پہنچا۔

انگریزی کتاب "کشمیر اور لداخ میں بدھ مت" کے مصنف جے این گنہار اور پی این گنہار کا خیال ہے کہ کشمیر میں

بدھ مت کا پہلا پیروکار حکمراں اشوک نہیں سرندر تھا۔ سرندر کے بعد گودھارا اور گودھارا کے بعد اس کا بیٹا جنک کشمیر کا حکمراں بنا۔ جنک کی موت کے بعد کشمیر پر شاچی نارا نے حکومت کی۔ اور اشوک نے اس حکمراں کے بعد کشمیر پر قبضہ کیا۔ اشوک نے ۲۷۲ ق م سے ۲۳۱ ق م تک حکومت کی اس کے بعد کشمیر میں شومت کا پیروکار جلوکا برسر اقتدار آیا۔ کشمیر میں بدھ مت کو دوسری بار کنشک کے زمانہ میں ترقی نصیب ہوئی، جس نے ۷۸ء سے ۱۲۳ء تک حکومت کی۔

۱۷۸ء میں کشمیر میں کشن خاندان کا خاتمہ ہوگیا اور بدھ مت کے فروغ کے امکانات ختم ہوگئے جب ۱۷۸ء میں کشمیر میں ہندو دھرم پھر برسر اقتدار آیا تو گونند خاندان کے چھٹے حکمراں نارا نے بدھ مت کے ہزاروں وہاروں اور خانقاہوں کو نذر آتش کردیا۔ کشمیر میں ہندو دھرم کے احیا کا دور بدھ مت کے پیرو کاروں پر ظلم و تعدی کا دور ہے۔

۱۷۸ء سے لے کر ۱۳۲۰ء تک کشمیر پر گونند خاندان (ہندومت) سفید ہنوں (لامذہب) کراکوٹہ خاندان (ناگ مت) اور لوہارا خاندان (ہندومت) نے حکومت کی۔ اس عہد میں کشمیر مختلف مذاہب اور ادیان کی رزم گاہ بنا رہا۔ تاہم اس سارے دور میں ہندو دھرم کا پلہ بھاری رہا۔ اس عہد میں ہندو دھرم کی حیثیت برہمن پرستی سے زیادہ نہ تھی۔ خدا تک پہنچنا یا خدا کو پانا آسان نہ تھا۔ برہمن اور پروہت خدا اور انسان کے درمیان سنگ راہ کی حیثیت اختیار کرچکے تھے۔ ہندو راجے اور حکمراں اخلاق باختہ ہوچکے تھے۔ اور برہمن ان حکمرانوں کے پشت پناہ تھے۔ معاشرہ بدکردار پنڈتوں اور عیش کوش حکمرانوں کے چنگل میں سسک رہا تھا۔ حصول اقتدار کی جنگ محلوں، مندروں اور رقص گاہوں میں لڑی جارہی تھی۔ سپہ سالار بددیانت تھے، اور سپاہی بزدل۔ ان حالات میں لداخ کا ایک شہزادہ رنچن کشمیر میں آیا اور سیاسی مخالفوں کو مات دے کر ۱۳۲۰ء میں کشمیر کا حکمراں بن گیا۔ وہ بدھ مت کا پیرو تھا مگر بدھ مت کی تعلیمات سے وہ روحانی تسکین حاصل نہ کرسکا۔ آخر اس نے اسلام کی طرف رجوع کیا۔ اور ایک مسلمان مبلغ سید شرف الدین (بلبل شاہ) ترکستانی کی دعوت پر مشرف باسلام ہوا۔ اور اپنا اسلامی نام سلطان صدرالدین رکھا۔ مسلمان کشمیر میں ۱۳۲۰ء سے ۱۸۱۹ء تک برسر اقتدار رہے۔ ۱۸۱۹ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے کشمیر پر

قبضہ کیا۔ ۹ مارچ ۱۸۴۶ء میں انگریزوں نے سکھوں سے ریاست جموں و کشمیر تاوانِ جنگ کے طور پر حاصل کی اور ایک ہفتہ بعد یعنی ۱۵ مارچ ۱۸۴۶ء کو ۷۵ لاکھ نانک شاہی سکوں کے عوض جموں کے ہندو راجپوت گلاب سنگھ ڈوگرہ کے ہاتھ فروخت کر دی۔

۳

کشمیر میں اسلام کی اشاعت سے پہلے (تیرہویں صدی عیسوی میں) انتشار کی کیفیت برپا تھی بدھ مت اور برہمن مت کے افکار و تصوّرات باہم دست و گریباں تھے۔ اس کشاکش نے شو مت کو جنم دیا جو بعض امور میں ناگ مت سے قریب ہے۔ بے محل نہ ہوگا اگر یہاں شو مت کے نظامِ فکر اور طریق عبادت کو ذرا تفصیل سے بیان کر دیا جائے۔

شو مت کے دو دبستانِ خیال ہیں:۔

۱:۔ کشمیری شو مت جسے تصوراتی (IDEALIST) شو مت کہا جاتا ہے۔

۲ - دکنی یا تامل شو مت جسے حقیقت پسندانہ (REALIST) شو مت کہا جاتا ہے۔

کشمیری شو مت کے افکار و تصوّرات کی توضیح واسو گپتا کلاتا بٹ (KALATTABHAT) سوم آنند، اتپال دیو، ابھی نارا گپتا اور جیارتھ نے کی ہے۔

دکنی شو مت کے شارحین کے نام ہیں (۱) سدیو جیوتس (۲) رام کنتھ (۳) نارائین کنتھ۔

شو مت کے پیروکار خدا کو شو کا نام دیتے ہیں۔ شو ہر جگہ حاضر و ناظر ہے اس کو ثابت کرنے کی ضرورت نہیں وہ رحیم بھی ہے اور قہار بھی۔ وہ ایک ہے اور اس کا کوئی ساتھی یا شریک نہیں۔ کائنات اور کائنات کی ہر شے، ہر عنصر اور ہر منظہر خدا کی ذات کا پرتو ہے۔

روح غیر مادی ہے۔ لافانی ہے اور علم و عرفان ہی روح کی غایت اولیٰ ہے۔

مرد و زن میں کوئی تفاوت نہیں۔ ان کے حقوق مساوی ہیں۔ ذات پات اور رنگ و نسل کے امتیازات فضول ہیں۔ برہمن اور شودر کی روحیں یکساں طور پر عظیم روح (پرماتما۔ شو) میں جذب ہو سکتی ہیں۔

شو مت کے چھتیس اصول ہیں۔ ان اصولوں کو تتوئے کہا جاتا ہے ان میں پانچ بنیادی اصول یا عناصر کائنات ہیں:۔

۱- وایو (ہوا) (۲) اگنی (آگ) ۳- جل (پانی) ۴- بھومی (مٹی) ۵- آکاش- آسمان (انگریزی میں ایتھر کہا جائیگا)

یہ پانچ عناصر مادہ (پراکرتی) کی تشکیل میں بنیادی اہمیت رکھتی ہیں۔

علم (گیان) کے پانچ کارکن (اندری) ہیں۔

۱- لوچن - (آنکھ) رنگ کے لئے ۲- کنٹرو- (کان) آہنگ کے لئے (۳) ناسکا - (ناک) بوباس کے لئے- (۴) جبیا - (زبان) ذائقہ کے لئے (۵) توچا- (چمڑی) لمس کے لئے۔

عمل - (کرم) کے بھی پانچ کارکن (اندری) ہیں

(۱) ہاتھ - (کر) ۲- پاؤں (پیر) ۳- مقعد (گدا) ۴- عضوِ تناسل (لنگ) ۵- منھ (مکھ)

جیو- روح کے تین بندھن ہیں -

۱- گناہ (اپیاسے) ۲- عمل (کرم) ۳- کثافت - (مایا)

روح (جیو) کی آزادی کے لئے جہالت سب سے بڑا اور مضبوط بندھن ہے- اسے تین طرح سے ختم کیا جاسکتا ہے

۱- مشاہدہ (چاریا) ۲- عمل (کریا) ۳- ریاضت (یوگا)

جیون مکتی - (آزاد زندگی) کے لئے ضروری ہے کہ گیان اور کرم کی اندریوں سے کام لے کر جیو کو نجات دلائی جائے۔

"روح کی نجات کا اس طریقِ فکر کا لابدی نتیجہ یہ ٹھہرا کہ انسان عبادات اور غور و فکر کی تمام صورتوں کو عرفان کے تابع کرتا ہے۔ بلکہ جب عرفان حاصل ہو جاتا ہے تو مشاہدہ اور عبادات کو بھی ترک کر دیتا ہے۔ جیون مکتی کی حالت میں انسان کو کسی قسم کا کوئی کام بھی سرانجام نہیں دینا چاہیئے [1]

ARTICLE BY S.S. SURYANARAYANA ENTITLED "THE PHILOSOPHY OF SAIVISM" IN THE CULTURAL HERITAGE OF INDIA VOLUME II PUBLISHED BY RAMAKRISHNA CENTENARY COMMITTEE, CALCUTTA.

شومت اور ترکا فلسفہ کے بارے میں میرے ایک استفسار پر شیخ محمد مہدی لکھتے ہیں۔

(TRIKKA) ہندو فلسفہ میں کشمیر کے مخصوص مکتب خیال کا نام ہے۔ ہندو فلسفہ ایک تثلیث (TRINITY) کے گرد چکر کاٹتا ہے۔ وہی آتما، پرماتما، اور پرکراتی۔ یعنی خدا۔ روح اور مادہ، شومت میں اس تثلیث کے اقانیم کے مترادف تین "پ" سے شروع ہوتے ہیں۔ "پتی" (خدا) "پاسو" (روح) اور "پاسم یا پاسا" (مادہ یا تقیدات)

شومت عموماً حقیقت پرست (REALIST) تسلیم کیا جاتا ہے۔ اور کثرت (PLURALISTIC VIEW) کا داعی ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ شومت ہندوستان کا قدیمی مذہب ہے اور آریاؤں سے قبل رائج تھا۔ لیکن حقیقت پسندانہ تخیل جس کو اب "سیوا سدانتا" کہتے ہیں، آریائی ثقافت سے متاثر ہونے کے بعد وجود میں آیا۔ "سیوا سدانتا" آخری ثابت شدہ حقائق کے ہم معنی ہے۔ سب سے بڑی حقیقت یہ ہے کہ سیوا، خدا، یا "وجود مطلق" تجزیہ کے بعد تین اقانیم سے مرکب ہے۔

TRIKKA نے کشمیری شومت میں یہ ترمیم کی ہے کہ یہ تینوں اقانیم ایک ہی ہیں۔ اور سیوا یا "وجود مطلق" کے بارے میں یہ کہا ہی نہیں جاسکتا کہ وہ مذکر ہے یا مونث کیا ہے۔ کیا نہیں۔ وہ ہمہ تن ہستی ہے۔ جو کسی محمول (PREDICATE) کو قبول ہی نہیں کرسکتا۔

اس کشمیری مکتب خیال میں دوسری ترمیم یہ ہوئی کہ عام شومت تینوں اقانیم کو "موجود فی الخارج" (BXTERNALLY EXISTENT) مانتا ہے۔ کشمیری شومت بھی اس کو تسلیم کرتا ہے۔ لیکن ترکا اس کا داعی ہے۔ کہ اشیاء ایک ذہن میں موجود ہیں بلکہ ایک ذہن ہی ہے جو خارج میں موجود ہے۔ ہمارا ذہن (HUMAN MIND) اسی ذہن کا ایک پرتو ہے۔ بلکہ دونوں باعتبار خواص "واحد" (IDENTICAL) ہیں۔ فقط فرق

۲۔ فلسفیانہ نظام فکر

اطلاق (ABSOLUTE) اور "تقیید" (LIMITS) کا ہے یہی "تقیید" و اطلاق کی اضافی نسبت (BONDS) یا "مادہ" ہے چونکہ تینوں موجود اور تینوں ذہنی (دو ذہنی ایک اضافی) ہیں اس لئے حقیقت ہیں اور "تصور" بھی۔ یہی وجہ ہے کہ کشمیری ترکا کو REALISTIC- IDEALISM کہتے ہیں۔ بالفاظ دیگر کشمیری ترکا "وجود مادی" کا قائل نہیں۔ بلکہ وجود ذہنی کا معتقد ہے۔

اس مکتب خیال میں تینوں کو ایک سمجھا گیا ہے۔ اس لئے یہ TRIKKA تین کا ایک ہونا کہلاتا ہے۔

اس مکتب کا داعئ اول واسوگپتا تھا، وہ مرگیا لیکن کوئی کتاب نہ چھوڑی۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اس کے ایک شاگرد "کلاتا" نے اس نظریہ کو تفصیل کے ساتھ پیش کیا۔

اس مسلک میں حقیقت شناسی ریاضت (یوگ) سے ممکن ہے۔ ریاضت ہی سے "محدود" یا "مقید ذہن" "غیر محدود" یا "مطلق ذہن" کا شعور حاصل کرسکتا ہے۔

اس بازیافت کا آخری ثمرہ "ارادہ مطلق" ہے۔ جس سے "اولیاء" یا "بڑے یوگی" "کرامات" دکھلاتے ہیں۔ ترکا فعل (ACTION) کا قائل ہی نہیں۔ (ACTION) ترکا میں ارادہ کے پھیلاؤ کا دوسرا نام ہے۔ یعنی "آزاد ارادہ" (ABSOLUTE FREE WILL) کا حصول انسانیت کا آخری مقام سمجھا جاتا ہے۔ یہ تخیل نویں صدی عیسوی میں ظاہر ہوا۔ معلوم ہوتا ہے کہ مسلم صوفیاً کے فکر سے یہ خیال متاثر ہے۔

شنکر اچاریہ جو معتزلہ اور صوفیا کے افکار سے متاثر تھا، آٹھویں صدی کے آخر میں گذرا ہے اس کا انتقال کشمیر ہی میں ہوا۔ اگر واسوگپتا کی تاریخ ولادت کو نویں صدی میں تسلیم کیا جائے تو اسلامی تصوف کے اثرات اور روابط کے لئے ہمیں تاریخی بنیاد مل جاتی ہے۔

۴

کشمیر میں اسلام یوں تو ۲۰-۱۳۱۳ء میں برسراقتدار آیا۔ یعنی بدھ مت کا پیرو فرماں روائے کشمیر راجہ رنچن شاہ (سلطان صدرالدین) مسلمان ہوا مگر کشمیر میں مسلمانوں کی آمد آٹھویں صدی عیسوی میں ہی شروع ہو چکی تھی۔ کشمیر میں داخل ہونے والا پہلا مسلمان غالباً حمیم بن سامہ تھا۔ جو وطنیت کے اعتبار سے

شام کا باشندہ تھا اور سپاہی کی حیثیت سے سندھ میں مقیم تھا۔ اس کے بعد کشمیر کی وادی مینو سواد میں مسلمان مبلغین آہستہ آہستہ داخل ہونے لگے کیونکہ اسلام چین، چینی ترکستان، کابل اور شمالی ہند میں پھیل چکا تھا۔ انہی مبلغوں میں سے سیّد شرف الدین ترکستانیؒ (بلبل شاہ) تھے جن کی تبلیغ سے رنچن شاہ مسلمان ہوا۔ آپ کے بعد کشمیر میں ایران کے سات سو سیّد مبلغ تشریف لائے جنہوں نے کشمیر میں اشاعت اسلام کا نیک کام کیا۔ ان مبلغوں میں میر سیّد علی ہمدانیؒ (شاہ ہمدان) کا مقدس نام سرفہرست ہے۔ آپ کے بعد آپ کے بیٹے میر محمد ہمدانیؒ نے کشمیر میں اسلامی شریعت کے نفاذ کے لئے خدمات سرانجام دیں۔ آپ کے ہمراہ ایران سے تین سو سیّد مبلّغ کشمیر میں تشریف لائے۔ یوں ایران سے کشمیر آنے والے سیّد مبلغوں کی تعداد ایک ہزار تک پہنچتی ہے۔ یہ مبلّغ نہ صرف عالم تھے بلکہ متصوفانہ افکار و تصوّرات کے حامل بھی تھے۔ اس لئے کشمیر میں ان گرامی قدر مبلّغوں کی وساطت سے نہ صرف اسلامی شریعت کی اشاعت ہوئی بلکہ اسلامی تصوّف کے امکانات بھی پیدا ہوئے۔ ڈاکٹر جی ایم ڈی صوفی اپنی انگریزی تصنیف "کشیر" (جلد اوّل صفحہ ۹۴) میں لکھتے ہیں کہ ان سیّد مبلغوں اور ان کے پیروکاروں نے کشمیر میں تصوف کے رجحان کو تقویت دی۔ اور اس تقویت کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ بدھ مت اور ویدانت نے پہلے ہی ایران کی راہ سے آنیوالے اسلامی تصوف کے لئے راستہ ہموار کر دیا تھا۔

پروفیسر محب الحسن اپنی انگریزی تصنیف "کشمیر عہد سلاطین میں" لکھتے ہیں کہ ان سیّد مبلغوں کی خاص تکریم کی جاتی تھی۔ بادشاہ اور امراء ان کا خاص خیال رکھتے تھے۔ ان میں سے کچھ تو فقہ کے عالم تھے جن کو قاضی اور مفتی کے عہدے تفویض کئے گئے، کچھ درس و تدریس کے پیشے میں چلے گئے کچھ پیر اور مرشد بن گئے۔ اور یوں ناخواندہ عوام کی روحانی بالیدگی کا باعث بنے۔ اور چند سیّد مبلغ ایسے بھی تھے جو دیہات کی طرف نکل گئے اور کاشتکاری کے فرائض اپنے ذمہ لئے بیہقی سیّدوں نے سیاسیات میں دلچسپی لی اور امراء میں شامل ہو گئے۔

چودھویں صدی عیسوی میں اسلام ریاست جموں و کشمیر کے کونے کونے میں پھیل چکا تھا۔ اور تصوف کے چھ بڑے سلسلے استوار اور قائم ہو چکے تھے۔

یہ چھ سلسلے قادریہ، سہروردیہ، کبرادیہ، نقشبندیہ، نوربخشیہ اور رشی تھے۔ پہلے پانچ سلسلوں کا منبع ایران اور ترکستان کی مملکتیں تھیں۔ لیکن مؤخرالذکر یعنی رشی سلسلۂ تصوف خاص کشمیر سے متعلق تھا۔ جہاں کہیں اور

جب کبھی کشمیری تصوّف کا تذکرہ ہوتا ہے اس سے ہمیشہ رشی سلسلہ تصوّف مراد ہوتی ہے۔

رشی سلسلۂ تصوف کے بانی شیخ نورالدین نورانیؒ ہیں۔ کشمیر کے ہندو آپ کو نند رشی کہتے ہیں۔ آپ ۷۷ ۱۳ء میں بیج بہارا کے قصبہ سے دو میل دور کیموہ کے گاؤں میں پیدا ہوئے، آپ کے والد کا نام شیخ سالارالدین تھا۔ شیخ سالارالدین متقی اور پرہیزگار انسان تھے اور کشتواڑ کے راجاؤں کے خاندان میں سے تھے۔ شیخ نورالدین نورانیؒ نے ۶۳ سال عمر پائی اور ۱۴۳۸ء میں بعہد بڈشاہ فوت ہوئے۔ آپ کا مقبرہ سرینگر کے جنوب مغرب میں بیس میل کے فاصلے پر چرار شریف میں ہے، جہاں ہر سال عرس منعقد ہوتا ہے۔ آپ کے کثیر تعداد شاگرد تھے۔ جن میں بابا نصیب الدین بابا مام الدین، بابا زین الدین، اور بابا لطیف الدین زیادہ معروف ہیں۔

شیخ نورالدین نورانیؒ پیدا ہوئے تو اپنی ماں (جن کا نام صدرہ ماجی تھا) کا دودھ نہ پیتے تھے کہا جاتا ہے شومت کی مشہور راہبہ اور کشمیری زبان کی شاعرہ للہ عارفہ نے آپ کو اپنی گود میں لیا اور کہا کہ دنیا میں آتے وقت شرم محسوس نہ کی۔ اب ماں کا دودھ پیتے وقت شرم محسوس کرتے ہو۔ اس پر آپ نے اپنی ماں کا دودھ پیا۔

آپ کے دو بھائی تھے۔ دونوں بڑے تھے اور بد قماش تھے۔ چوری چکاری اور لوٹ مار سے گذر اوقات کرتے تھے۔ ایک بار وہ دونوں شیخ نورالدین نورانیؒ کو زبردستی اپنے ساتھ چوری کی واردات کے لئے لے گئے۔ تینوں بھائی ایک گھر میں داخل ہوئے یہ گھر کسی غریب کنبہ کا تھا۔ سردی کا موسم تھا اور گھر والے سردی سے ٹھٹھر رہے تھے۔ آپ نے اپنی لوئی اتاری، ان پر ڈالی، اور باہر چلے آئے۔ بھائیوں نے لوئی کے بارے میں استفسار کیا تو آپ نے فرمایا کہ لوئی تو میں عریاں جسموں پر ڈال آیا ہوں۔

شیخ نورالدین نورانیؒ کی شادی ہوئی۔ آپ کے دو بچے بھی تھے۔ (لڑکے کا نام حیدر اور لڑکی کا نام زون تھا) مگر آپ نے گھر بار چھوڑ کر جنگل کی راہ لی۔ ماں نے بہتیرا کہا کہ ایسی زندگی اختیار نہ کرو جو صعوبتوں اور مشکلوں کی زندگی ہے لیکن آپ نہ مانے اور آخر ایک غار میں بسیرا کیا اور خدا کی یاد میں محو ہو گئے۔ عبادت اور ریاضت کا یہ عالم تھا کہ کئی کئی دن کھانا نہ کھاتے تھے۔ اور پانی نہ پیتے تھے۔ آپ نے لکڑی کی روٹی تیار کی ہوئی تھی۔ جب بھوک ستاتی تو لکڑی کی روٹی کو دانتوں تلے دبا لیتے۔

آپ شاعر بھی تھے اور آپ نے اپنے اشعار میں دنیا کی بے ثباتی اور ناپائداری، عبادت، زہد، ریاضت

نفس کشی، تقدیر کی بالادستی، اور رضائے الٰہی پر زور دیا ہے۔ آپ نے اپنے اشعار میں مذہب کے نام پر ریاکاری کرنے والے لوگوں کو بھی ہدف ملامت بنایا ہے۔ اور مغرور اور متکبر مذہبی عالموں پر چوٹیں کی ہیں جب آپ فوت ہوئے تو سلطان زین العابدین بڈشاہ نے آپ کی میت کو کندھا دیا اور آپ کی تجہیز و تکفین کا انتظام کیا۔

آپ نے آخری عمر میں رہبانیت ترک کردی تھی۔ ہوا یوں کہ جب سید السادات سالار عجم شاہ ہمدانؒ کو معلوم ہوا کہ شیخ نورالدین نورانیؒ گھربار اور بیوی بچے چھوڑ کر جنگلوں کی طرف نکل گئے ہیں تو آپ نے اپنے بیٹے اور خلیفہ میر محمد ہمدانیؒ کو شیخ صاحب کے پاس بھیجا تاکہ وہ ان کو (شیخ صاحب کو) بتائیں کہ اسلام میں گھربار چھوڑ کر جنگلوں او بیابانوں کی راہ لینا معیوب ہے۔ شیخ صاحب نے اس پیغام پر صاد کیا اور چرار شریف میں مقیم ہو کر عوام کی ذہنی اور روحانی تربیت کے لئے مدرسہ کھولا۔

شیخ نورالدین نورانیؒ اور ان کا اتباع کرنے والے رشی اور بابا تارک الدنیا ہو کر یاد الٰہی میں محو رہتے تھے۔ گوشت اور مچھلی نہ کھاتے تھے۔ جڑی بوٹیوں اور جنگل کے پھلوں سے پیٹ بھرتے تھے۔ حیوانات اور نباتات کے اتلاف کو ناپسند کرتے تھے۔ جنگلوں اور کھیتوں میں پھل دار اور سایہ دار درخت لگاتے تھے۔ تاکہ عوام ان سے مستفید ہو سکیں۔ انھوں نے عوام کی تہذیب و تربیت کے لئے زیارتیں اور مدرسے قائم کئے۔ عوام اور مقتدر لوگوں پر زور دیا کہ وہ سادہ زندگی بسر کریں۔ کسی کو اذیت نہ پہنچائیں اور مساوات کے نظریہ پر عمل کریں۔ کیونکہ دولت اور اقتدار کو دوام حاصل نہیں ہے۔ کشمیر کے رشی اور بابا منشیات کے استعمال کے خلاف تھے۔ ایک بار شیخ حمزہ مخدومؒ نے ایک شرابی کو اپنی چھڑی سے اتنا پیٹا کہ آخر وہ مرگیا۔

اکبر اور جہانگیر کے زمانہ میں وادئ کشمیر میں رشیوں کی تعداد دو ہزار تھی۔ جہانگیر "تزک جہانگیری" میں لکھتے ہیں کہ اگرچہ ان رشیوں میں مذہبی واقفیت اور علم کی کمی ہے تاہم وہ سادہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور ان میں نخوت نام کو بھی نہیں۔ وہ کسی کو گالی نہیں دیتے۔ وہ آرزو کی زبان کو دراز نہیں کرتے اور جاہ و طلب کے پاؤں کو آگے نہیں بڑھاتے وہ گوشت نہیں کھاتے۔ شادی نہیں کرتے اور کھیتوں میں پھل دار درخت لگاتے ہیں۔ تاکہ لوگوں کا بھلا ہو۔ رشیوں کی تعداد وادی میں دو ہزار کے قریب ہے۔

فرشتہ اور ابوالفضل نے بھی کشمیر کے ان رشیوں کا ذکر کیا ہے اور انہیں متقی اور پرہیزگار بیان کیا ہے ابوالفضل نے لکھا ہے کہ یہ رشی وادئ کشمیر کے دور افتادہ علاقوں میں رہتے ہیں۔ اور اپنا وقت یادِ الٰہی میں صرف کرتے ہیں مشہور سیاح جی۔ ٹی۔ وگنی (G. T. WIGNE) نے سکھ عہد میں کشمیر کا سفر کیا تھا۔ اس نے بابا سعید سے ملاقات کی۔ وگنی نے لکھا ہے کہ بابا سعید نے کشمیر کے سکھ صوبیدار کو ملنے سے انکار کر دیا تھا بیان کیا جاتا ہے کہ ایک بار کشمیر کا ڈوگرہ حکمراں مہاراجہ پرتاپ سنگھ (۱۸۸۵ء تا ۱۹۲۵ء) شاہ عبدالرحیم صفاپوری کو ملنے کے لئے گیا اور رشی سے پوچھا کہ وہ (مہاراجہ) ان کی کیا خدمت کرے؟ آپ نے ڈوگرہ حکمراں کو جو جواب دیا وہ دیوجانس کلبی کی یاد تازہ کرتا ہے۔ (دیوجانس کلبی نے ایک ایسے سوال پر سکندر اعظم کو کہا تھا کہ ذرا ہٹ جاؤ تاکہ مجھے دھوپ آسکے) شاہ عبدالرحیم صفاپوری نے مہاراجہ سے کہا کہ وہ آئندہ ان کے پاس کبھی نہ آئے

وادئ کشمیر میں رشی سلسلۂ تصوف کا قیام اسلام پر بدھ مت اور شومت کے افکار و تصورات کا نتیجہ ہے پنڈت پریم ناتھ بزاز (مصنف "کشمیر میں تحریکِ آزادی کی تاریخ") نے اسے مذہبی انسان پرستی (RELIGOUS HUMANISM) کا نام دیا ہے۔ آپ مذکورہ کتاب میں لکھتے ہیں کہ کشمیر میں اسلام کی آمد پر رجعت پسند برہمنوں نے احتجاج کیا مگر ان کی چیخ پکار صدا بصحرا ثابت ہوئی۔ ایسا ہونا ضروری تھا کیونکہ شومت پہلے ہی کشمیر کی سرزمین کو اسلام کی اشاعت کے لئے تیار کر چکا تھا۔ اسلام کے لئے برہمن مت کی مخالفت اور شومت کے فلاسفروں کی پسندیدگی کا نتیجہ یہ ہوا کہ کشمیر میں ایک نیا متحرک اور مشترک کلچر پیدا ہوا جسے تصوراتی، جذباتی، یا مذہبی انسان پرستی کا نام دیا جا سکتا ہے۔ یہ کلچر اپنی اصلیت کے اعتبار سے مرکب ہے۔ اور اس مرکب میں اسلام اور شومت کے اعلیٰ حقائق اور بلند مقام ثقافتی اثرات شامل ہیں۔ (صفحہ ۸۲)

کشمیر کے رشیوں پر مہاتما بدھ کی تعلیمات اور بدھ مت کے طریق و عبادت کے اثر کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ جس طرح مہاتما بدھ نے خدا کی تلاش میں گھر بار کو تیاگ دیا تھا اسی طرح شیخ نورالدین نورانی نے بیوی بچوں اور گھر بار کو چھوڑ کر جنگل کی راہ لی اور یوگیوں کی طرح جسم و جاں پر اذیت ناک کیفیتیں طاری کیں۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ آخری عمر میں آپ نے فرمایا ؎

جنگلن گھس گیم خامی
رانیوم یہ چھو عبادت
ناچھیم حاصل گیم بدنامی
سرہ ایس کرن اکی کتھ

ترجمہ:۔ جنگلوں میں گھومنا پھرنا میری کمزوری تھی۔ میرا خیال تھا یہ عبادت ہے اس سے تو خواہ مخواہ مجھے بدنامی ہوئی۔ (کہ شیخ نورالدین بہت بڑا پرہیزگار ہے) دراصل مجھے تو ایک ہی بات معلوم کرنا تھی۔ (کہ میں کون ہوں اور میرا پیدا کرنے والا کون ہے)

ڈاکٹر جی ایم ڈی صوفی اپنی انگریزی تصنیف "کشمیر" (جلد اوّل صفحہ ۹۶) میں لکھتے ہیں کہ شیخ نورالدین رح بابا نصیرالدین بابا ہام الدین رح۔ شیخ حمزہ مخدوم رح سید احمد کرمانی رح۔ سید محمد حصاری رح۔ بابا زین الدین رح۔ بابا لطیف الدین بابا شکورالدین رح۔ بابا حنیف الدین رح۔ سعید بابا اور خواجہ حسن کرّی جیسے ریشیوں اور بزرگوں نے سیرت و کردار کی مثالوں اور نیک ہدایتوں کے ذریعہ اسلام کی اشاعت کے لئے راستہ ہموار کیا۔ اور وہ بتدریج اور منظم طور پر ساری وادی کو اسلام کے دامن میں لے آئے۔

پروفیسر محب الحسن اپنی انگریزی تصنیف "کشمیر عہد سلاطین میں" میں لکھتے ہیں کہ صوفیوں نے کشمیر میں اسلام کی اشاعت کے کام میں اہم حصّہ لیا۔ مزید برآں چونکہ تصوف میں سماجی مساوات کی طرف زیادہ رجحان تھا۔ اس لئے صوفیوں نے غریبوں اور امیروں کے درمیان پُل (رابطہ) کا کردار ادا کیا۔ صوفیوں کی ذکرو فکر کی محفلیں محض مذہبی تقریبیں نہ تھیں بلکہ ان کا ایک سماجی فریضہ بھی تھا۔ ان محفلوں میں غریب اور امیر شریک ہوا کرتے تھے اور یوں افلاس اور فراوانی کے اختلافات مٹ جاتے تھے۔ یعنی ان محفلوں میں محمود و ایاز کی تفریق روا نہ رکھی جاتی تھی۔ صوفیوں نے ہمیشہ ظلم و تعدی کے خلاف آواز بلند کی اور حاکموں کو باور کرایا کہ منصف مزاج حاکم خدا کا مقرب ہوتا ہے اور ظالم حاکم کو روز محشر سخت سزائیں دی جاتی ہیں۔ تاہم ان فیوض و برکات کے باوجود اہل تصوف نے معاشرہ میں رجعت پسندانہ کردار بھی ادا کیا۔ انہوں نے آخرت پر زور دے کر سکون اور فرار کے فلسفہ کو مقبول بنایا۔ کشمیر کے رشی اس فلسفہ کے بہترین نمائندے

قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ لیکن کشمیری تصوف میں غیر اسلامی رسمیں اور افکار و تصورات در آئے جس سے یہ مکتب فکر اپنی قدر و قیمت کھو بیٹھا۔ درگاہیں اور خانقاہیں جن سے وادی اٹی پڑی تھی۔ اوہام اور بدقماشی کے مرکز بن گئیں۔ سادہ لوح عوام جو بزرگوں سے امداد طلب کرنے آتے تھے ان درگاہوں اور خانقاہوں کو پوجنے لگے

پروفیسر محب الحسن کی مندرجہ بالا رائے سے اتفاق کرنا ضروری نہیں تاہم اب حالات قطعاً بدل چکے ہیں ریاست جموں و کشمیر کے مسلمان گذشتہ ڈیڑھ سو سال سے استبداد کے خلاف رزم آرا ہیں اور اسلامی اور قرآنی تصوف اور سنت رسول ان کے لئے مینارۂ نور کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ ریاست سے غیر اسلامی اقتدار ختم کرنے کے لئے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں آگے بڑھ رہے ہیں اور انشا اللہ ایک دن اپنی عظیم جدوجہد میں کامران ٹھہریں گے۔

جس طرح گنگا جمنا کا دوابہ ہندو تہذیب کا منبع ہے، اسی طرح سندھ ساگر مسلم تہذیب کا معدن ہے اگر ہم ان دو عظیم الشان قطعات کا اپنے نظریہ پر سمجھوتہ کرا سکے۔ ان کی تالیف قلوب پر قادر ہو سکے تو اس لاینحل مشکل کی کلید مل جائے گی۔

اہل علم جانتے ہیں کہ اسکندریہ میں حکماء کا ایک طائفہ نو فلاطونی پیدا ہوا تھا۔ اسی منہاج پر مسلمانوں میں کئی حکیم پیدا ہوئے، جن میں سے الشیخ الاکبر محی الدین ابن عربی اور شیخ الاشراق شیخ شہاب الدین السہروردی مشہور عالم ہیں۔ ہندوستان میں سلطان محمود غزنوی کے زمانہ سے صوفیہ کرام کی آمد شروع ہوئی سلطان شہاب الدین غوری کے بعد اس خاک سے تصوف کے چاروں طریقوں میں کثرت سے معرفت الٰہی میں کامل خادم انسانیت پیدا ہوئے وہ سب اسی حکمت اشراقی کے امام تھے۔ ان تمام ائمہ تصوف کا مرکزی فکر وحدت الوجود ہے۔ جو ویدانت فلاسفی کا اصل اصول ہے۔ شاہ ولی اللہ نے اس کی تہذیب و تکمیل سے انسانیت کی تشریح کی۔ اور اسے کتاب و سنت کا بطن بنایا۔ جیسا کہ ان کی معرکتہ الآرا کتاب حجۃ اللہ البالغہ اور ان کی فلسفی تصانیف البدور البازغہ اور التفہیمات الالٰہیہ وغیرہ سے واضح ہوتا ہے۔

(مولانا عبید اللہ سندھی)

علمائے سندھ اور شاہ ولی اللہ کے علمی روابط

مولانا غلام مصطفےٰ قاسمی

عارف باللہ حضرت شاہ ولی اللہ (۱۱۱۴ھ - ۱۱۷۶ھ) کی غیر معمولی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں شاہ صاحبؒ دنیائے اسلام کے بڑے نامور بزرگ گزرے ہیں اور آپ کے نام نامی سے علمی دنیا کا ہر شخص آگاہ ہے۔ آپ کو اپنے دور کے علماء پر نمایاں امتیاز حاصل تھا۔ بارہویں صدی ہجری کے ایک ملنے ہوئے اہل اللہ مرزا مظہر جانجاناں شہید آپ کے متعلق فرماتے ہیں "اللہ تعالیٰ نے مجھے روئے زمین کی ہاتھ کی ہتھیلی کی طرح سیر کرائی، میں نے اپنے دور میں شاہ ولی اللہ صاحب جیسا کسی کو نہیں پایا" شاہ صاحبؒ نے اپنی تعلیمات اور علمی تصانیف کے ذریعہ اسلام اور مسلمانوں کی وہ خدمت سرانجام فرمائی جسے کبھی فراموش نہیں کیا جائے گا۔ موصوف ایک ہی وقت میں اپنی صدی کے مجدد، اسلام کے عظیم مفکر، جیّد محدث، مفسر، حکیم اور ربانی عالم تھے، آپ نے شریعت، طریقت، فلسفہ، تصوف اور جملہ علوم عقلیہ و نقلیہ میں نئے انداز اور حکیمانہ طرز پر کلام فرما کر بعد میں آنے والوں کے لئے سوچنے کی نئی راہیں کھولدیں۔

ٹھیک اسی دور میں سرزمین سندھ بھی علم اور عرفان کا گہوارہ تھی۔ یہاں مخدوم ابوالقاسم نقشبندی، شاہ عبداللطیف تارک بھٹائی، مخدوم محمد معین ٹھٹوی، مخدوم محمد ہاشم ٹھٹوی اور خواجہ محمد زمان لواری والہ وغیرہم جیسے اولیاء اور برگزیدہ علماء موجود تھے جن کے فیوضات دور دراز ممالک تک پہنچ چکے تھے یہاں قدرتاً یہ سوال پوچھا جاسکتا ہے کہ کیا بارہویں صدی کے اس علمی دور میں شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے سندھ کے افاضل

سے علمی اور روحانی روابط تھے؟

اس سلسلے میں ہمیں تین سندھی جلیل القدر فضلاء کے اسمائے گرامی ملتے ہیں، جن کے ساتھ شاہ صاحبؒ کا براہ راست علمی تعلق رہا ہے۔ ان تین بزرگوں میں سے ایک تو شیخ القراء محمد فاضل سندھی ہیں جو کہ شاہ صاحبؒ کے فن قرأت میں استاد ہیں۔ دوسرے مخدوم محمد معین ٹھٹوی صاحب "الدراسات" ہیں جنہیں شاہ صاحب موصوف سے علم حدیث کی اجازت عطا ہوئی۔ اور تیسرے بزرگ محمد شریف بن خیر اللہ سندھی ہیں جنہوں نے شاہ صاحبؒ سے باطنی فیوضات کی سند اور خرقہ خلافت حاصل کیا۔

شیخ القراء محمد فاضل سندھی سندھ میں کہاں پیدا ہوئے کہاں ان کی سکونت تھی وہ کیسے دہلی گئے اور کب گئے۔ ان تمام سوالوں کے متعلق یہاں کے جملہ تذکرے خاموش ہیں "نزھتہ الخواطر" جو کہ اس صدی کی تصنیف ہے، اس سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ شیخ عالم مجود (تجوید کے ماہر) محمد فاضل سندھی دہلی میں شیخ القرا تھے۔ شیخ عبدالخالق دہلوی سے بروایت امام حفص قرآن پڑھا اور آپ سے شاہ ولی اللہ اور دوسرے بہت سے لوگوں نے فیض پایا[۱]۔ شاہ صاحبؒ خود بھی قرآن پاک کے فارسی ترجمہ فتح الرحمن کے مقدمہ میں اس طرح رقمطراز ہیں۔

قال العبد الضعیف ولی اللہ بن عبدالرحیم عفی عنہ قرأت القرآن کلہ من اولہ الی آخرہ بروایتہ حفص عن عاصم علی الصالح الثقتہ حاجی محمد فاضل السندی سنہ ۱۱۵۴ھ قال تلوتہ الی آخرہ بروایتہ حفص علی الشیخ عبدالخالق شیخ القراء بحضرتہ دھلی[۲]

(اللہ پاک کا) کمزور بندہ ولی اللہ بن عبدالرحیم عفی عنہ کہتا ہے کہ میں نے قرآن کو اول سے آخر تک بروایت حفص عن عاصم، صالح ثقہ حاجی محمد فاضل سندھی سے سنہ ۱۱۵۴ھ میں پڑھا اور انہوں نے کہا کہ میں نے اس کو اول سے آخر تک بروایت حفص دارسلطنت دہلی کے شیخ القرا شیخ عبدالخالق سے پڑھا۔

۱ھ نزھتہ الخواطر ج ۶ ص ۳۱۲

۲ھ مقدمہ فتح الرحمن فارسی

دوسرے سندھی عالم مخدوم محمد معین سندھی ہیں جن سے شاہ صاحبؒ کا براہ راست علمی تعلق رہا ہے۔ اس بزرگ عالم کے فضل و کمال کی جتنی تعریف کی جائے کم ہوگی۔ موصوف علم حدیث کے بحر بے کنار، عربی ادب کے شہسوار اور علم کلام کے یکتائے روزگار تھے، فلسفہ میں آپ کے زور قلم کا یہ عالم ہے کہ آپ کے طرز تحریر میں ملّا صدرا کی مشہور عالم کتاب "اسفار اربعہ" جیسی روانی پائی جاتی ہے۔ سندھ کے مشہور مورخ میر علی شیر قانع ٹھٹوی نے آپ کے متعلق اپنے تاثرات کا اس طرح اظہار فرمایا ہے۔

مخدوم محمد معین شاگرد مخدوم عنایت اللہ مذکور است، خداتعالیٰ آں ذات حمیدہ صفات را در زمان خود جامع جمیع فنون کمال آفریدہ، در منقول و معقول نحریر عصر و علامہ دہر شد باوجود آں کمالات علمی آشنا شدہ بساجزرگ دیں راصحبت کرد میاں ابوالقاسم نقشبندی کہ مذکور شد ارادت اتم یافت و در اواخر ایام بجناب کرامت نصاب سید عبداللطیف تارک لقب بوضع یارانہ دارا و تمنارانہ جوشیدہ۔[1]

مخدوم محمد معینؒ شاہ صاحب سے عمر میں بیس سال بڑے تھے۔ مخدوم صاحب کی ولادت ۱۰۹۳ھ میں ہوئی[2] اور وفات ۱۱۶۳ھ میں۔ شاہ صاحب کا سن ولادت ۱۱۱۴ھ اور سن وفات ۱۱۷۶ھ ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ مخدوم صاحب کا شاہ صاحب سے تلمذ صرف اجازتِ حدیث کی حد تک ہے، باقی انہوں نے شاہ صاحب سے کوئی کتاب نہیں پڑھی۔

عربی کے مختلف علوم و فنون کے متعلق بالعموم یہ دستور رہا ہے کہ علمار متند اور مشہور کتب کے مصنفین تک اپنا اسناد اور روایت کا سلسلہ محفوظ رکھتے آئے ہیں، علم حدیث میں تو اس کا خاص خیال رکھا جاتا ہے اس ضمن میں اثبات اور اسانید کی کئی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اس اجازت میں یہ ضروری نہیں ہوتا کہ جن کتابوں کی

---

[1] تحفۃ الکرام فارسی ج ۳ ص ۲۲۹

[2] ایک قلمی بیاض سے جو کہ فضلائے سندھ کے مادہ ہائے تاریخ کا ایک مجموعہ ہے مخدوم صاحب کی یہ تاریخ ولادت ہمیں دستیاب ہوئی ہے اور یہ اس مصرعہ سے نکلتی ہے :- "مخدوم عالم محمد معین" لطف یہ ہے کہ اس معروف شخصیت کی تاریخ ولادت کے متعلق ان کے کسی بھی سوانح نگار نے کچھ نہیں لکھا۔

روایت کی اگر کسی بزرگ عالم سے اجازت لی جائے تو وہ کتابیں ان سے پڑھی بھی جایئں چنانچہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک متبحر عالم ہے جس کا ان علمی اسانید کا سلسلہ ثقات اساتذہ کے ذریعہ اوپر جاتا ہے تو وہ اپنے جیسے کسی دوسرے بزرگ عالم کو اپنی مرویات کی روایت کرنے کی اجازت دے دیتا ہے پھر یہ اجازت بالمشافہ بھی دی جاتی ہے اور غائبانہ بھی۔ مخدوم محمد معین صاحب کو شاہ صاحب سے اسی قسم کی اجازت حاصل ہوئی اس ملاقات میں مخدوم صاحب نے جو کہ نہایت ہی منکسر المزاج اور صوفی بزرگ تھے، شاہ ولی اللہ صاحب سے کتب احادیث اور دوسرے علوم کی روایت کی اجازت حاصل کی۔ باقی یہ ملاقات کہاں ہوئی اور کب ہوئی۔ اس کے متعلق خیال آرائیوں کے علاوہ اور کوئی ثبوت نہیں ملتا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلہ میں مخدوم محمد معین صاحب کی اپنی تصریحات پیش کی جایئں

فقیر کتب ستہ احادیث و معاجم و کتب علم کلام و کتب علم اصول و کتب علم ادب و کتب شریفہ علم شریف تصوف بسند متصل الی المصنفین حتی الکافیۃ فی النحو بسندھا المتصل الی ابن حاجب از دو شیخ روایت میکند یکے قدوۃ العلماء الراسخین فی وقتہ شیخ عبدالقادر مفتی المکتہ باجازتہ الخاصتہ لی بروایت ہا بجمیع مافی فہرست الجامع الصحیح مرویاتہ۔

یہ فقیر صحاح ستہ، معاجم، علم کلام، علم اصول، علم ادب اور علم شریف تصوف کی کتابوں کی ان کے مصنفوں تک (یہاں تک کہ نحو کی کتاب کافیہ کی اس کے مصنف ابن حاجب تک) دو شیوخ سے روایت کرتا ہے ایک اپنے دور کے علمائے راسخین کے پیشوا شیخ عبدالقادر مفتی مکہ سے جنہوں نے جامع صحیح کی فہرست کی جملہ مرویات کی بہ مخصوص اجازت مرحمت فرمائی۔

دیگر شیخ رفیع القدر شیخ ابوطاہر بن شیخ ابراہیم الکردی المدنی باجازۃ لی بروایت ہا لجمیع مافی فہرس ابیہ الجامع لجمیع ما یجوز لہ روایتہ۔

دوسرے شیخ رفیع القدر شیخ ابوطاہر بن شیخ ابراہیم الکردی المدنی، انہوں نے بھی اپنے باپ کے ثبت کے جملہ طرق کی اجازت عطا فرمائی۔

شیخ سوم کہ اجازت حدیث باین فقیر

تیسرے شیخ جنہوں نے اس فقیر کو حدیث کی

واده قدوة المشائخ فی بلدنا فیض بن العارف والقطب فی وقتہ الشیخ آدم تتوی کہ ایں شیخ کریم اجازت از شیخ حسن عجمی دارد کہ از عمدہ مشائخ حضرت شیخ عبد القادر مذکور است، اسانید ایں ہر دو شیخ از شیخ عجمی بالا ترمی رود۔ بآنکہ شیخ عبد القادر از مشائخ بسیار دیگر ہم روایت دارد۔ شیخ چہارم کہ ایں فقیر اجازت از ایشاں دارد حضرت عارف بن عارف الکاشف المشاھد شیخ اجل زکی اللہ سرھندی است قدس سرہ۔

اجازت عنایت فرمائی ہمارے ملک کے مشائخ کے پیشوا شیخ فیض بن عارف وقطب وقت شیخ آدم تتوی ہیں یہ شیخ شیخ حسن عجمی سے اجازت رکھتے ہیں۔ شیخ عجمی شیخ عبد القادر مکی کے بڑے مشائخ میں سے ہیں ان دونوں بزرگوں کی اسانید کا سلسلہ بواسطہ شیخ عجمی اوپر جاتا ہے شیخ عبد القادر دوسرے کئی مشائخ سے بھی روایت کرتے ہیں چوتھا شیخ جس سے یہ فقیر اجازت رکھتا ہے حضرت عارف بن عارف صاحب کشف ومشاہدات شیخ اَجلّ زکی اللہ سرہندی قدس سرہٗ ہیں۔

اپنے سلسلۂ روایت کے ان چار اکابر شیوخ کے ذکر کے بعد فرماتے ہیں :۔

شیخ پنجم کہ فقیر اجازت از ایشاں دارد حضرت ولی الوقت حضرت میاں ولی اللہ بن شیخ عبد الرحیم است

پانچواں شیخ جس سے یہ فقیر اجازت رکھتا ہے حضرت ولی وقت حضرت میاں ولی اللہ بن شیخ عبد الرحیم ہیں۔

مذکورہ عبارت سے تو صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ ان پانچوں اکابر علماء سے مخدوم محمد معین کو اجازت عطا ہوئی ہے، لیکن ان شیوخ سے یہ اجازت بالمشافہ (روبرو ملاقات میں) ملی یا خط وکتابت کے ذریعہ اور خاص طور پر شاہ ولی اللہ صاحب کے معاملے میں تو یہ سوال بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ مخدوم محمد معین تتوی کے ناقدوں نے مخدوم صاحب کی تالیف "دراسات اللبیب فی الاسوۃ الحسنۃ بالحبیب" کی اس عبارت کو (جس میں شاہ ولی اللہ صاحب نے ایک ملاقات میں مخدوم محمد معین کو ان کی تحقیق میں منفرد قرار دیا ہے) غلط بتایا ہے اور لکھا ہے کہ وہ سندھ سے باہر ہی نہیں گئے۔ اس لئے پھر یہ تحسین کیسے ہو سکتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ

لیکن یہ ناقدوں کی بے انصافی اور ہٹ دھرمی ہے، مخدوم عبداللطیف ٹھٹوی "ذب ذبابات الدراسات" کے مصنف مخدوم محمد معین سے بہت چھوٹے ہیں خود مخدوم عبداللطیف کے والد بزرگوار مخدوم محمد ہاشم ٹھٹوی مخدوم محمد معین سے عمر میں چھوٹے ہیں اور آپ ان سے مستفید ہوئے ہیں، جس کا اعتراف انہوں نے اپنے ان رسائل میں کیا ہے، جو انہوں نے اپنے شیخ مخدوم محمد معین سے اختلاف کرتے ہوئے ردّ میں بطور استفسار لکھے ہیں ان حالات میں اس طرح کی تکذیب نامناسب معلوم ہوتی ہے کیونکہ معاصرین میں سے مخدوم محمد معین صاحب کی کتاب "دراسات" کی مذکورہ عبارت کی کسی نے تکذیب نہیں کی۔ اس سلسلہ میں ہم یہاں مخدوم محمد معین کے قلمی رسائل سے شاہ ولی اللہ کے ساتھ ان کی ملاقات کے متعلق تصریح پیش کرتے ہیں۔ موصوف فرماتے ہیں۔

سواء دو شیخ اول کہ از ایشاں اجازت بالمکاتبہ است ازیں سہ شیخ اجازت بالمشافہ و من الاثنین منہم بالمکاتبۃ ایضا حاصل دارد رحم اللہ الکل برحمتہ واسعتہ وزاد فی عمر الخامس ونورنا بنورہ	پہلے دو شیوخ کے علاوہ جن سے اجازت خط و کتابت کے ذریعہ لی ہے باقی تینوں شیوخ سے ملاقات میں اجازت لی ہے اور ان میں دو سے اجازت بالمکاتبۃ بھی حاصل ہے اللہ سب پر رحم فرمائے۔ اور پانچویں (شاہ ولی اللہ) کی عمر بڑھائے اور اس کے نور سے ہمیں منور فرمائے۔

آگے چل کر حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے سلسلے کے متعلق ایک لطیفہ بھی ذکر فرماتے ہیں:۔

از عجائب الاتفاقات آنکہ سلسلہ حضرت میاں شاہ ولی اللہ و سلسلہ حضرت میاں زکی اللہ بحضرت قطب الاقطاب مجدد الف ثانی رضی اللہ عنہ می رسد و من نعماء اللہ الھنیتہ	یہ عجیب اتفاق ہے کہ میاں شاہ ولی اللہ اور حضرت میاں زکی اللہ دونوں کا سلسلہ حضرت قطب الاقطاب مجدد الف ثانی رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔ یہ اللہ پاک کی مبارک نعمتوں میں ایک نعمت ہے۔

اس وضاحت کے بعد تو میرے خیال میں ایک منصف اور محقق کے لئے مخدوم محمد معین صاحب کی شاہ ولی اللہ صاحب کے ساتھ ملاقات میں شک کرنے کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔

آخر میں وہ لکھتے ہیں کہ ان روایات کے شیوخِ اسانید کا ذکر کرنے کے لئے تو ایک پوری کتاب چاہیئے۔ یہاں تبرک کے طور پر صرف دو متصل سندیں لکھی جاتی ہیں۔ ان دو میں سے سند اول حضرت شاہ ولی اللہ کے طریقہ کی ہے اور دوسری شیخ زکی اللہ کے طریقہ کی' ہم یہاں پہلے طریقہ کی سند کو ان کے لفظوں میں پیش کرتے ہیں کیونکہ اس میں "ابنانی" (مجھے خبر دی) کا لفظ استعمال کیا ہے جو کہ ملاقات کی صورت میں استعمال ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں۔

ابنانی وانا الفقیر محمد الملقب بالمعین	مجھ فقیر المسمّی محمد الملقب معین بن
ابن محمد الملقب بالأمین ستر اللہ	محمد الملقب امین کو اللہ دونوں کے عیب
عیوبھما وغفر ذنوبھما۔ ولی اللہ بن	کو ڈھانکے) ولی اللہ بن عبدالرحیم نے (اللہ
عبد الرحیم عاملھا اللہ بلطفہ	دونوں کو اپنے لطفِ عظیم سے نوازے) خبردی
الجسیم قال: سمعت الحدیث المسلسل	اور فرمایا کہ میں نے حدیث مسلسل باولیت کو
بالاولیۃ من الثقۃ الثبت حاجی	ثقہ و ثبت حاجی محمد افضل سے سنا اور انہوں نے
محمد افضل قال سمعتہ عن الشیخ	بتایا کہ میں نے اسے شیخ عبدالواحد سے سنا اور
عبد الأحد قال سمعتہ عن ابی	انہوں نے بتایا کہ میں نے اسے اپنے باپ شیخ محمد سعید
الشیخ محمد سعید قال سمعتہ عن	سے سنا اور انہوں نے بتایا کہ میں نے اسے اپنے والد
ابی الشیخ احمد السرھندی رضی اللہ عنہ	شیخ احمد سرہندی رضی اللہ عنہ سے سنا۔
ح وسمعتہ من حاجی محمد افضل	اس روایت کا ایک دوسرا طریقہ سند یہ ہے کہ میں نے
قال سمعتہ من الشیخ عبد اللہ	حاجی محمد افضل سے سنا انہوں نے بتایا کہ میں نے
المکی البصری بسندہ المذکور	شیخ عبداللہ المکی البصری سے سنا' اس سند سے
فی مسندہ۔[1]	جو اُن کی مسند میں مذکور ہے۔

[1] مجموعہ رسائل مخدوم معین (قلمی) کتب خانہ قاضی محمد مراد سیوہانی۔

شاہ صاحب اور مخدوم محمد معین کا آپس میں سلسلہ خط و کتابت بھی تھا، معلوم ہوتا ہے مخدوم محمد معین نے اپنے ایک خط میں شاہ صاحب سے اول الاوائل بطریق ابداع اور دوسرے مسائل کے متعلق استفسار کیا ہوگا چنانچہ شاہ صاحب نے مخدوم محمد معین کے نام اپنے مکتوب میں ان مسائل پر روشنی ڈالی ہے، اس مکتوب کی ابتدائی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاہ صاحب مخدوم صاحب کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ عبارت ملاحظہ ہو۔

در جواب سوال مخدوم معین از بعض اشکالات تائید الٰہی شامل حال آں نقاد اقوال الرجال باد۔ عنایت نامہ شکین شمامہ از اموری کہ عواقب آں انشاء اللہ تعالیٰ بخیراست رسید فقیر را مخلص صمیمی و دعا گوئی خلا و ملا تصور فرمایند جعل اللہ لکم من کل ضیق مخرجا الخ [1]

مخدوم محمد معین کے بعض علمی اشکالات کے سوال کے جواب میں اس اقوال رجال کے نقاد (مخدوم معین) کے ساتھ اللہ کی تائید شامل حال ہو۔ مشک جیسی مہکتی خوشبو والا عنایت نامہ (ان حالات کے متعلق جن کی انشاء اللہ عاقبت اچھی ہے) پہنچا اس فقیر کو مخلص صمیم اور خلوت و جلوت میں دعا گو خیال فرمائیں، دعا ہے کہ اللہ آپ کو ہر تنگی سے راہ خلاص عنایت فرمائے

تیسرے سندھی بزرگ محمد شریف بن خیر اللہ بن عبد الغنی سندھی ہیں جو کہ ٹھٹہ کے مضافات اگھم کوٹ کے متوطن تھے۔ باطنی فیض کی پیاس اور طلب نے ٹھٹہ سے دہلی پہنچایا اور وہاں آپ نے شاہ ولی اللہ صاحب کی خدمت میں سفر سلوک کی تکمیل فرمائی۔

اس سندھی بزرگ کی سوانح حیات کے سلسلہ میں بھی یہاں کے تذکرے خاموش ہیں شاہ صاحب نے انہیں خرقہ خلافت کے ساتھ جو سند مرحمت فرمائی تھی اس سے اس سندھی بزرگ کے کمالات پر کچھ

---

[1] تفہیمات الٰہیہ ج ۱ ص ۱۰۹ طبع مجلس علمی

روشنی پڑتی ہے۔ یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب نے انہیں ارشاد و تلقین کی اجازت دیتے ہوئے جو سند عطا فرمائی تھی، اس کا ترجمہ کردیا جائے۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں :۔ سب تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جس کی نعمت سے نیکیاں تمام ہوتی ہیں اور جملہ حالات میں اسی کے فضل پر بھروسہ اور مدار ہے۔ سیدنا محمد اور آپ کی آل واصحاب پر اللہ کی رحمت ہو۔

حمد اور صلوٰۃ کے بعد بندۂ ضعیف اللہ کریم کی رحمت کا محتاج ولی اللہ بن عبدالرحیم العمری الدھلوی (اللہ نے اس پر اور اس کے مشائخ اور والدین پر احسان فرمایا) کہتا ہے کہ ۱۱۵۳ھ کے مہینوں میں ہمارے بھائی اللہ کی طرف پہنچنے کے راغب محمد شریف بن خیر اللہ بن عبدالغنی ملک سندھ کے بلدہ ٹھٹھ کے مضافات اگھم کوٹ کے متوطن طریقہ صوفیہ کی تلاش میں مہاجر بن کر میرے پاس آئے۔ اس سے قبل ایک مدت تک وہ طریقہ صوفیہ کے اعمال، اشغال اور مراقبات کی مزاولت کرچکے تھے اس کے نشیب و فراز سے واقف تھے اور اس علم کے چھوٹے بڑے مسائل کی تفتیش کرچکے تھے۔ میں نے انہیں نفس کے لطائف، ہر لطیفہ کے مخصوص مقامات اور نسبتیں سب سمجھائیں اور وہ نسبتیں بھی سمجھادیں جن پر مشہور طرق کا مدار رہا ہے اور انہیں یہ بھی سمجھایا کہ راہ سلوک کا طالب ایک لطیفہ سے دوسرے لطیفہ اور ایک نسبت سے دوسری نسبت کی طرف کس طرح منتقل ہوتا ہے۔ اور اسی طرح میں نے انہیں (اس علم کے) اہم دقائق سمجھائے۔

میں نے انہیں خوارقِ عادات (کرامات) کے ظہور کی کیفیت اور ان کے دواعی و اسباب بتلائے یہ سب چیزیں میں نے انہیں اس طرح سمجھادیں جس طرح اللہ تعالیٰ نے میرے اوپر انکشاف کیا اور مجھے سمجھایا تھا۔ اور میں نے اپنے مشائخ سے وراثت میں پایا تھا، اللہ تعالیٰ نے اس میں برکت فرمائی تھی (میرے سمجھانے کے بعد) وہ انہیں مناسب طور پر سمجھ گئے۔ میں نے اپنے میزان (عقل) سے جو میرے پروردگار نے مجھے عطا فرمایا تھا انہیں معلوم کرنا چاہا تو میں نے ان کے (فہم کو) درست پایا۔ والحمدللہ۔ اب میں انہیں طالبوں کو مختلف طرق صوفیہ کے ارشاد کی اجازت دیتا ہوں، اسی طرح ان کو خرقہ پہنانے، ان کی طرف توجہ کرنے اور ان کو صحبت سے مستفید کرنے اور خرقہ صوفیہ کی نسبت عطا کرنے کی اجازت دیتا ہوں جس طرح کہ ان کی میرے شیخ، میرے والد

میرے آقا، میرے مرجع اور جن پر کہ تمام امور میں میرا اعتماد رہا ہے، انہوں نے مجھے تلقین کی ان کی اجازت دی اور مجھے ان کا خرقہ پہنایا۔

اللہ تعالیٰ ان کی روح کو راحت عطا فرمائے۔ اور انہیں حرمین محترمین کے جملہ مشائخ سے (بھی) جو میرے پاس اجازات ہیں۔ ان سب کی انہیں اجازت دیتا ہوں۔

میں نے انہیں بتایا کہ سہروردی طریقہ میں ان اذکار اور اوراد پر دوام کرنا اچھا گنا جاتا ہے جو کہ کتاب عوارف المعارف میں مذکور ہیں۔ میں نے انہیں یہ بھی بتایا کہ میں نے مدینہ کے ایک شیخ سے سنا ہے کہ ان کے ہاں (سلوک میں) احیاء اور قوت القلوب پر عمل پیرا ہونا بہتر سمجھا جاتا ہے۔

میں نے انہیں بتایا کہ جتنے بھی (اصفیا) کے طریقے جنید تک پہنچتے ہیں، وہ سب اگرچہ اشغال واذکار اور مراقبات میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں لیکن تہذیب لطائف اور نسبتوں میں سب ہمنوا ہیں ہاں بعض نسبتیں ایسی بھی ہیں جن کے طریقے ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں اور تہذیب نفس کی تعبیرات میں بھی کچھ اختلاف پایا جاتا ہے جس کا اصلی سبب یہ ہے کہ بعض اصفیاء کسی معین اور مخصوص لطیفہ کا نام ذکر نہیں کرتے لیکن اس لطیفہ کی جو مخصوص نسبت ہوتی ہے اس کا اور تہذیب نفس پر اس سے جو اثر مرتب ہوتا ہے (صرف) اس کی طرف اشارہ کر دیتے ہیں جس کی ہم ایک مثال بیان کرتے ہیں۔

چشتیہ طریقے والے ملکوت، جبروت اور لاہوت کے مراتب کا ذکر کرتے ہیں۔ اگر کسی کو سرور، انس اور انبیاء کی ارواح کے ساتھ اجتماع کی کیفیات (جو کہ تہذیب روح کا نتیجہ ہے) حاصل ہوتی ہیں تو ایسے شخص کے حق میں اصفیاء یہ کہتے ہیں " فلاں فتح اللہ علیہ الملکوت " یعنی فلاں شخص پر اللہ تعالیٰ نے ملکوت کو منکشف کیا اور اگر کسی کے لئے لطیفہ خفیہ کے تہذیب کا ثمرہ "حق کو مخلوق میں دیکھنا اور مخلوق کو حق میں دیکھنا" واضح ہوتا ہے تو اس وقت ایسے شخص کے لئے یہ کہتے ہیں کہ فلاں شخص پر اللہ تعالیٰ نے مرتبہ لاہوت کو منکشف کیا۔

عباراتنا شتی وحسنک واحد　　　وکل الی ذاک الجمال یشیر

یعنی ہماری عبارتیں مختلف ہیں اور تیرا ایک ہی حسن ہے ہر ایک عبارت اسی ایک ہی حسن و جمال

کی غمازی کر رہی ہے۔

اس تفہیم کے آخر میں شاہ صاحبؒ اپنے مرید اور معتقد محمد شریف سندھی کو کچھ وصیتیں فرماتے ہیں۔

" اب میں انہیں خاص ان کے نفس کے لئے ظاہر و باطن میں تقویٰ کی وصیت کرتا ہوں اور اس کی بھی کہ وہ سنن اور شرائع کا خیال رکھیں۔ صوفیہ جنیدیہ کے طریقے کے پابند رہیں میں انہیں طالبانِ قربِ خدا کے متعلق یہ وصیت کرتا ہوں کہ ان کے ساتھ شفقت سے پیش آئیں اور انہیں نیک کاموں کے کرنے کا کہیں اور برائی سے روکیں۔ اور ان کو علم حدیث کی روایت کرنے کی رغبت دلائیں۔

والحمدللہ اولا و آخراً[1]"

سندھ کا یوں تو ہر قصبہ اور قریہ، بلکہ یوں کہئے کہ چپہ چپہ اور گوشہ گوشہ تصوف اور عرفان، رشد اور ہدایت کا مرکز رہا ہے، لیکن خاص طور پر قدیم شہروں میں دیبل، سیوستان، منصورہ، ٹھٹھ، بھکر، وغیرہ اور جدید شہروں میں روہڑی، ریل، لکعلوی، منتعلوی، ہالا، لواری، ٹلٹی اور بوبک وغیرہ کو اس سلسلے میں ہمیشہ سے مرکزی حیثیت رہی ہے۔ اور یہی شہر تھے جو عرفان و تصوف، اصلاح اخلاق اور تزکیہ نفس کے سرچشمہ بنے رہے اور سندھ میں سماجی انقلاب لانے کا باعث ہوئے۔ اور یہیں کی خانقاہیں تھیں، جن کے نظام اصلاح و تربیت نے نہ صرف اخلاقی قدروں کو بلند کیا، بلکہ ایمان اور عمل کی قوتوں کو اجاگر کر کے خود شناسی کی فضا قائم کی۔ اور تعصب کے تمام سوتوں کو خشک کر دیا۔ آج کے گئے گزرے دور میں بھی جب کوئی ان شہروں میں پہنچتا ہے، تو جو قلبی سکون، ذہنی راحت اور روحانی طمانیت وہاں میسر آتی ہے وہ اور کہیں ملنی مشکل ہے۔ اور یہ ساری برکت اسی گزرے ہوئے زمانے کی وجہ سے ہے۔

(سید حسام الدین راشدی)

---

[1] تفہیمات ج ۱ ص ۱۰۲ - ۱۰۳ - ۱۰۴

ملتان و اوچ کے سہروردی مشائخ

محمد ایوب قادری ایم۔اے

احمد کبیر سہروردی

آپ حضرت جلال سرخ کے فرزند اور حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے والد ماجد اور شیخ صدر الدین عارف کے مرید و خلیفہ ہیں، بڑے عارف، ذاکر اور صاحب کرامت بزرگ تھے۔ کشف و کرامات کا اخفا فرمایا کرتے تھے[1] ہر وقت خشیت الٰہی کا غلبہ رہتا۔ حضرت مخدوم فرماتے ہیں کہ وہ کسی وقت خوف کی وجہ سے بستر پر نہیں سوتے تھے۔ سردی اور گرمی میں صرف ایک کپڑا اوڑھ لیا کرتے تھے۔ روزانہ دو قرآن کریم ختم کیا کرتے تھے[2] ایک دن میں اور دوسرا رات میں۔ قرآن کریم سے بڑا شغف رکھتے تھے۔ جس وقت احمد کبیر کوئی آیت تلاوت فرماتے تو معلوم ہوتا کہ گویا سینۂ مبارک سے نعرے نکل رہے ہیں[3]

حضرت صدر الدین عارف کے خلیفہ اور سلسلہ سہروردیہ کے نامور بزرگ شیخ جمال خنداں رو اوچی حضرت

---

[1] الدر المنظوم ص۲۰۳ [2] ایضاً ص۲۳۸ [3] ایضاً ص۲۴۶

---

[*] اس مضمون کی پہلی قسط نومبر کے شمارے میں شائع ہوئی ہے۔ (مدیر)

احمد کبیر کی حفاظت اور رعایت فرماتے تھے۔ حضرت مخدوم سے روایت ہے کہ ایک موقع پر شیخ جمال نے فرمایا کہ مجھ سے حضرت جلال سرخ نے کہا تھا کہ میرا فرزند احمد کبیر بڑا باشوق اور عشق الہی میں سرشار ہوگا۔ تم اس کی حفاظت کرنا۔ لہٰذا میں اس رعایت کو ملحوظ رکھتا ہوں[۱]۔ خود احمد کبیر ابتدا میں حضرت شیخ جمال کا کچھ زیادہ خیال نہیں رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ شیخ رکن الدین ابوالفتح نے حضرت مخدوم کے ذریعے پیغام بھیجا تو احمد کبیر فوراً حضرت جمال خنداں رو کی خدمت میں پہنچے اور قدم بوس ہوئے اور پھر آئندہ کبھی بے اعتنائی کا اظہار نہیں کیا۔[۲] حضرت احمد کبیر پر غلبہ اور کشف کا یہ عالم ہوتا تھا کہ فرض اور نفل نماز میں بھی نعرہ مارتے اور زار زار روتے تھے[۳]

اس زمانے میں اوچ میں تین خانقاہیں تھیں۔

۱- خانقاہ شیخ جمال خنداں رو

۲- گازرونیوں کی خانقاہ

۳- حضرت احمد کبیر سہروردی کی خانقاہ، احمد کبیر کی خانقاہ میں دور ونزدیک کے اکثر مسافر، مشائخ اور سیاح آکر مقیم ہوا کرتے تھے[۴]

حضرت احمد کبیر کا اوچ میں انتقال ہوا۔ حضرت مخدوم انتقال کی کیفیت کے متعلق فرماتے ہیں[۵]

"جس رات میرے والد کا انتقال ہوا، میں اس رات موجود تھا۔ اس روز وہ عشاء کی نماز وقت مستحب میں نہ پڑھ سکے جب آدھی رات ہوئی تو مجھے بلایا۔ وضو کیا اور نماز عشاء ادا کی۔ اور ویسے ہی قبلہ کی طرف منہ کر کے جاں بحق تسلیم کی[۶]"

۱؎ الدر المنظوم ص ۵۵۰-۵۵۱ ۲؎ ایضاً ص ۵۵۱ ۳؎ ایضاً ص ۵۵۰

۴؎ الدر المنظوم ص ۳۱۰، ۳۰۳ ۵؎ ایضاً ص ۵۹۷

۶؎ الدر المنظوم میں ہے کہ سات سال کی عمر میں احمد کبیر اپنے فرزند مخدوم جہانیاں کو شیخ جمال اوچی کی خدمت میں لے گئے تھے سیر العارفین ص ۵۶ تاریخ فرشتہ (اردو) ص ۶۸۵ اور پھر اس کے بعد ابتدائی تعلیم اوچ میں حاصل کر کے حضرت مخدوم جہانیاں ملتان گئے اور وہاں سے تحصیل علم کر کے اوچ آئے تو ان کے والد احمد کبیر زندہ تھے الدر المنظوم ص ۵۰۷

احمد کبیر کا سن وصال بھی معلوم نہ ہوسکا۔ مگر ۷۱۴ھ/۱۳۱۴ء سے کئی سال بعد ضرور انتقال ہوا۔ مؤلف تاریخ اوچ لکھتے ہیں کہ حضرت جلال سرخ بخاری کے مزار کے بالکل متصل ان کے فرزند احمد کبیر کا مزار ہے حالانکہ خود ہی مؤلف مذکور نے بڑی صراحت سے لکھا ہے کہ حضرت جلال سرخ کا جہاں آج کل مزار ہے وہاں حضرت کی خاک پاک ۱۰۲۶ھ/۱۶۱۷ء میں چوتھی مرتبہ منتقل کی گئی تھی۔ لہٰذا حضرت احمد کبیر کا مزار اس کے متصل ہونا صحیح نہیں[۱]

حضرت احمد کبیر کے بہت سے مرید تھے۔ ان کے خلفاء میں شیخ جلال مجرد سلہٹی خاص طور سے مشہور ہیں، جنھوں نے بنگال و سلہٹ میں اسلام کی شمع روشن کی اور ان ہی کی کوششوں سے اس دور دراز کفرستان میں شمع اسلام روشن ہوئی۔ مشہور ہے کہ وہ احمد کبیر کے بھانجے تھے۔ زمانہ حال کے بعض مورخین کا خیال ہے کہ کام روپ میں ابن بطوطہ شیخ جلال مجرد سلہٹی سے ملا تھا[۲]

شیخ جمال خنداں روؒ

شیخ جمال نامور محدث، متورع عالم، صاحبِ نسبت درویش اور صدرالدین عارف کے خلیفہ تھے۔ شیخ الاسلام بہاؤالدین زکریا ملتانی نے بچپن ہی میں ان کی جبین منور سے ان کے علم و فضل اور صلاح و تقویٰ کا اندازہ لگالیا تھا[۳] اور حضرت عارف کو وصیت فرمائی تھی کہ جب جمال اوچی تمہارے پاس پہنچیں تو خاص طریقے سے تعلیم و تربیت فرمانا اور نصف تبرکات و آثار ان کے سپرد کردینا۔ چنانچہ اس طرح عمل میں آیا[۴]

شیخ جمال محدث اپنے مرشد کے حضور سے باطنی نعمتوں سے مالا مال ہوکر اوچ واپس آئے اور وہاں ایک مدرسہ اور خانقاہ کی بنیاد ڈالی۔ مدرسہ میں خود حدیث کا درس دیتے تھے حضرت مخدوم جہانیاں نے شیخ جمال محدث سے ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی۔ شیخ جمال محدث کی خانقاہ اوچ کی مشہور خانقاہ تھی۔[۵]

---

[۱] تاریخ اوچ ص۹۷-۹۸ و ۱۴۰-۱۴۱

[۲] شیخ جمال سلہٹی کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو تذکرہ صدرالدین عارف ص۱۷۸-۱۸۹ آب کوثر ص۳۵۵-۳۶۹ جنرل آف دی پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی (کراچی) [۳] تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے کہ شیخ جمال حضرت بہاؤالدین زکریا ملتانی کے مرید تھے۔ (اردو ایڈیشن ص۶۸۵) [۴] سیرالعارفین ص۱۲۹ و خزینۃ الاصفیاء جلد دوم ص۲۶-۲۷

[۵] الدر المنظوم ص۸۳۱

وہ بڑے حلیم بردبار اور صاحب اخلاق درویش اور عالم تھے۔ ایک مرتبہ قلندروں نے ان کے ساتھ زیادتی کی مگر انہوں نے حلم و استقلال کو ہاتھ سے نہ دیا[۱] ظاہر میں مخلوق کے ساتھ بڑی محبت اور اخلاق سے پیش آتے تھے اور باطن میں خالق سے اُنس و رغبت رکھتے تھے[۲] آخر زمانے میں ان کے مدرسے اور خانقاہ کے لئے بادشاہ وقت کی طرف سے معافی و وظیفہ بھی مقرر ہو گیا تھا۔ شیخ جمال محدث کی شہرت ہندپاکستان سے باہر دنیائے اسلام میں بھی تھی اور وہاں کے اکابر علماء و مشائخ ان سے متعارف تھے[۳]

شیخ جمال محدث اتباع سنت کا بڑا خیال رکھتے تھے اسی لئے ہمیشہ موٹا کپڑا زیب تن فرماتے تھے بازار سے ایک تنکے کی ایک چادر منگواتے اور اس میں تینوں کپڑے پگڑی کرتا اور ازار بنا لیتے تھے[۴]

شیخ جمال خنداں رُو کا صحیح سال وفات معلوم نہ ہو سکا۔ مفتی غلام سرور لاہوری نے ۶۷۶ھ ۱۲۷۷ء[۵] اور مولوی حفیظ الرحمان بہاولپوری اور مولوی نور احمد خاں فریدی نے ۷۰۰ھ ۱۳۰۱ء تحریر کیا ہے[۶] جو صریحاً غلط ہے اس لئے کہ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت کی پیدائش ۷۰۷ھ تمام تذکرہ نویسوں اور مورخین کے نزدیک مسلّمہ ہے اور حضرت مخدوم جہانیاں سب سے پہلے شیخ جمال خنداں رو کی خدمت میں سات سال کی عمر یعنی ۷۱۴ھ ۱۳۱۴ء میں حاضر ہوئے، اس کے بعد ان کی خدمت میں تعلیم حاصل کی لہذا ہمارا خیال ہے کہ جمال خنداں رو کا انتقال آٹھویں صدی کے ربع اول کے اختتام پر ہوا ہے۔ صحیح سال وفات کا تعین دشوار ہے شیخ جمال کا مزار اوچ موغلہ میں ہے۔ اس وجہ سے اس حصہ کو اوچ جمالی بھی کہتے ہیں۔

شیخ جمال خنداں رو کے بعد ان کے جانشین ان کے عالم و فاضل فرزند رضی الدین گنج علم ہوئے۔ ان کو ظاہری علم و فضل کے ساتھ باطنی نعمت سے بھی بہرۂ وافر ملا تھا۔ حضرت گنج علم نے اپنے والد کے بعد مدرسہ اور خانقاہ کا خوب انتظام کیا۔ ذکر کرام میں تحریر ہے کہ شیخ رضی الدین گنج علم ۶۶۷ھ ۱۲۶۸ء میں پیدا

۱؎ الدرالمنظوم ص۴۰۳۔ ۴۰۴۔ ۴۲۲۔ ۴۲۹ ۲؎ ایضاً۔ ص۴۰۳۔ ۴۰۴ ۳؎ ایضاً ص۱۵۱۔ ۳۷۶

۴؎ خزینۃ الاصفیاء جلد دوم ۵؎ تاریخ اوچ ص۱۴۹ و تذکرہ صدرالدین عارف ص۵۵

۶؎۔ تاریخ اوچ ص۱۴۹

ہوئے اور ۷۷۰ھ، ۱۳۶۸ء میں انتقال ہوا[1] شیخ جمال خنداں رو کا خاندان علم و فضل کے اعتبار سے ہمیشہ ممتاز رہا حضرت خود، مخدوم جہانیاں کے استاد تھے اس کے بعد ان کے خاندان کو بخاری مخادیم کی اتالیقی کی عزت برابر حاصل رہی مولوی حفیظ الرحمان اپنی ۱۹۳۱ء کی تالیف "تاریخ اوچ" میں لکھتے ہیں کہ آج تک یہ رسم ہے کہ جب بخاری سجادہ نشین کے گھر میں فرزند پیدا ہوتا ہے تو شیخ جمال الدین کی خانقاہ پر ایک گھوڑا بطور نذر کے تحفہ دیا جاتا ہے[2]

مخدوم جہانیاں جہاں گشت

مخدوم جہانیاں جہاں گشت، احمد کبیر کے بڑے صاحبزادے، مشہور صوفی شیخ اور نامور سیاح معرفت گزرے ہیں۔ ان کی پیدائش ۱۴ شعبان ۷۰۷ھ کو اوچ میں ہوئی[3] حضرت مخدوم کا نام نامی ان کے جد امجد کے اسم گرامی پر جلال الدین رکھا گیا، لیکن عام طور پر "مخدوم جہانیاں جہاں گشت" کے نام سے معروف ہیں۔ "مخدوم جہانیاں" لقب ہے جو ان کو بطور عیدی کے اپنے سلسلہ کے مشائخ عظام سے ملا ہے مخدوم نے سیر و سیاحت خوب فرمائی تھی اس لئے "جہاں گشت" مشہور ہوئے۔ ایک موقع پر حضرت مخدوم کو ان کے والد ماجد شیخ جمال خنداں رو کی خدمت میں لے گئے تو شیخ خنداں رو نے فرمایا۔[5]

بابا آرے! شما پسرانید کہ دودمان خویش منور ساخت وہم خاندان مشائخ۔	بابا ہاں! تم وہ صاحبزادے ہو کہ اپنے خاندان اور اپنے مشائخ کے خاندان کو روشن کروگے۔

---

[1] ذکر کرام از مولوی حفیظ الرحمان ص ۸۵-۸۶ (بہاولپور ۱۹۳۸ء)

[2] تاریخ اوچ ص ۱۵۰

[3] لطائف اشرف جلد اول از نظام یمنی ص ۳۹۲ (دہلی ۱۲۹۹ء)

[4] سیر العارفین ص ۱۵۷-۱۵۸ و تاریخ فرشتہ (اردو اڈیشن) ص ۶۸۶

حضرت مخدوم کی ابتدائی تعلیم اوچ میں شیخ بہاؤالدین قاضی اوچ اور شیخ جمال خنداں روؒ کے پاس ہوئی[1] پھر حضرت مخدوم ملتان پہنچے اور حضرت شیخ رکن الدین ابوالفتح کے زیر نگرانی تعلیم پائی۔ حضرت رکن الدین حضرت مخدوم پر بہت شفقت فرماتے تھے۔ حضرت مخدوم فرماتے ہیں۔

"ایک برس تک میں وہاں رہا۔ چند کتابیں جو کہ بعد انتقال قاضی بہاؤالدین رہ گئی تھیں ان کو میں نے تمام کیا۔"

حضرت مخدوم شیخ رکن الدین ابوالفتح کے سلسلۂ سہروردیہ میں مرید ہوئے، اور خلافت پائی چشتیہ سلسلہ میں شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلیؒ کے خلیفہ تھے۔ حضرت مخدوم کو سیوستان کی چالیس خانقاہوں کا نظام سپرد کر کے محمد تغلق نے شیخ الاسلام مقرر کیا، مگر مخدوم نے اس منصب کو چھوڑ کر مختلف ممالک کی سیر و سیاحت فرمائی

حضرت مخدوم نے حرمین شریفین کی زیارت کی۔ سات سال مکہ میں اور دو سال مدینہ میں مقیم رہے۔ وہاں کے مشائخ سے تمام علوم تفسیر، حدیث، فقہ وغیرہ پڑھے۔ ان کے مشائخ میں عبداللہ مطری اور عبداللہ یافعی بہت مشہور و معروف ہیں۔

حضرت مخدوم نے جو سیاحت فرمائی ہے، افسوس اس کا مستند مرقع نہیں ملتا۔ حضرت مخدوم سے منسوب جو سفرنامہ فارسی یا اردو میں ملتا ہے، وہ قطعاً جعلی اور وضعی ہے۔ اس میں بے سر و پا واقعات، من گھڑت حکایتیں اور دور از کار قصے درج ہیں۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ کسی شخص نے جہاں گشت کے لقب کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے معتقدات کی روشنی میں ایک سفرنامہ گڑھ دیا ہے بعض شہرو قصبات کے نام ملفوظات سے لے لئے گئے ہیں اور پھر اس سفرنامہ میں مختلف لوگوں نے قطع و برید کی ہے۔

حضرت مخدوم نے اپنے عہد میں سیاست میں خاصا حصہ لیا۔ فیروز شاہ تغلق کا زمانہ تھا۔ فیروز شاہ سے حضرت کے تعلقات خوب استوار تھے، جب فیروز شاہ نے ٹھٹھہ پر تاخت کی تو اوّل مرتبہ اس کو ناکامی ہوئی اور دوسری مرتبہ حضرت مخدوم کی کوششوں سے امیران ٹھٹھہ نے اطاعت قبول کی۔ مخدوم کئی مرتبہ دہلی تشریف لے گئے۔ وہاں کے

---

[1] الدرالمنظوم ص ۶۳۱

عمائدین امراء وزراء، شہزادوں اور بادشاہ سے اکثر ملاقاتیں ہوتی تھیں، الدرالمنظوم میں بڑی تفصیل ملتی ہے۔

حضرت مخدوم اپنے زمانے کے نامور شیخ اور ولی کامل تھے۔ دور دراز سے لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہوکر ارادت و خلافت سے سرفراز ہوتے تھے۔ حضرت باقاعدہ درس دیتے تھے۔ ان کا ایک اچھا کتب خانہ تھا۔ مسلک حنفی کے متبع اور صحابہ کی محبت سے سرشار تھے۔

حدیث پر بڑی گہری نظر رکھتے تھے۔ حضرت مخدوم اپنی مریدوں کی خاص طور سے تربیت فرماتے تھے آپ کے ذریعہ سے بہت سے لوگ داخل اسلام ہوئے، بلکہ راجپوتوں کے بعض قبائل حضرت مخدوم کے دست حق پرست پر ہی مشرف بہ اسلام ہوئے۔ آپ مقامی زبانوں میں رشد وہدایت اور تبلیغ واشاعت کے فرائض انجام دیتے تھے۔ ان کے بعض ہندی (اردو) مقولے ملتے ہیں جن سے اردو کے نشو ونما اور ارتقا کا اندازہ ہوتا ہے۔

مشہور ہے کہ دہلی کا قدم شریف فیروز شاہ کے زمانے میں حضرت مخدوم مصر سے لائے۔ تاریخی اور واقعاتی اعتبار سے یہ بات بالکل غلط ہے ہم نے اپنی کتاب "مخدوم جہانیاں جہاں گشت" میں اس مسئلہ پر بڑی مفصل بحث کی ہے۔

آپ کی خدمت میں مشہور سیاح ابن بطوطہ حاضر ہوا۔ آپ کے تعلقات ان کے زمانے کے مشہور درویش و شیخ شرف الدین یحییٰ منیری اور خواجہ گیسو دراز سے بہت اچھے تھے۔

حضرت مخدوم کی عمر اٹھتر سال کی ہوئی سال وفات ۷۸۵ھ / ۱۳۸۴ء ہے ۱۰ ذی الحجہ عید قرباں چہار شنبہ کا دن تھا، نماز دوگانہ ادا کرنے کے بعد طبیعت زیادہ خراب ہوگئی۔ اور غروب آفتاب کے ساتھ ساتھ رشد و ہدایت، فلاح وخیر اور علم وفضل کا آفتاب ہمیشہ کے لئے غروب ہوگیا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

مزار شریف، اوچ ضلع بہاولپور میں ہے۔ دروازہ پر حسب ذیل تاریخ ثبت ہے۔

تاریک گشت جملہ جہاں بے جمال شاہ
تاریخ بود ہفت صد ہشتاد و پنج سال

حضرت کے بہت سے خلیفہ ہوئے جن سے سلسلہ کی نشر واشاعت ہوئی مخدوم کے ملفوظات

جامع العلوم (الدر المنظوم) خزانہ جلالی، جواہر جلالی۔ مظہر جلالی۔ سراج الہدایہ، مقررنامہ، مناقب مخدوم جہانیاں، علوم و معارف کے خزائن ہیں، مخدوم نے حضرت قطب الدین دمشقی کے رسالہ مکیہ کا فارسی میں ترجمہ کیا ہے اس کا ایک نسخہ کیمبرج یونیورسٹی کے کتب خانہ میں ہے۔

شیخ الشیوخ شہاب الدین عمر سہروردی اپنے وقت کے بہت بڑے بزرگ، محققِ اسرار حقیقت عالم و عامل اور فاضل یگانہ تھے۔ حضرت محمد بن ابی بکر صدیق رضؓ کی اولاد سے تھے۔ غوث اعظم عبدالقادر جیلانی کی صحبت کا شرف بھی حاصل تھا۔ اور ان سے فیض بھی پایا۔..... ملک عراق میں آپ کی بہت شہرت ہوئی۔ چنانچہ دور و نزدیک سے ارباب طریقت استفادہ کی غرض سے آپ کے پاس آنے لگے۔ آپ کا مذہب شافعی اور طریقہ کامل اتباعِ سنت رسول تھا۔ آپ نے کئی کتابیں لکھیں جن میں عوارف المعارف زیادہ مشہور ہے...

دور دراز ملکوں سے لوگ آپ سے مسئلے دریافت کرتے اور فتوے حاصل کرنے کے لئے آتے ایک مرتبہ ایک شخص نے آپ کو لکھا کہ میں عمل کو ترک کرتا ہوں تو میری طبیعت بطالت کی طرف مائل ہو جاتی ہے۔ اور اگر عمل کرتا ہوں تو دل میں عجب پیدا ہوتا ہے۔ آپ نے جواب میں لکھا کہ عمل کرتے رہو اور عجب سے نجات حاصل کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتے رہو۔

رجب ۵۳۹ھ میں پیدا ہوئے۔ اور ترانوے برس کی عمر میں محرم ۶۳۲ھ میں انتقال فرمایا مزار مبارک بغداد میں ہے۔

شیخ سعدی شیرازی بلند پایہ بزرگ بھی آپ کے مرید تھے۔ چنانچہ انہوں نے پیر و مرشد کی ایک نصیحت کو اس طرح نظم کیا ہے۔

مرا پیر دانائے مرشد شہاب	دو اندرز فرمود بر روئے آب
یکے آنکہ بر خویش خودبیں مباش	دوم آنکہ بر غیر بدبیں مباش

(رشید احمد ارشد از ترجمہ اردو عوارف المعارف)

فیلسوف العرب ۔ الکندی

شیخ عبدالکریم الزنجانی النجفی[1]

ابویوسف یعقوب ابن اسحاق بن الصباح الکندی کا سلسلۂ نسب یعرب بن قحطان سے ملتا ہے۔ وہ واسط میں پیدا ہوا۔ تیسری صدی ہجری یعنی نویں صدی عیسوی اس کا زمانہ ہے۔ ایک روایت ہے کہ وہ بصرے میں پیدا ہوا، اور دوسری روایت میں اس کی جائے پیدائش کوفہ بتائی گئی ہے جہاں اس کے والد کوئی بیس برس تک والی رہے۔ وہ کس خاص سن میں پیدا ہوا۔ یہ حتمی طور سے معلوم نہیں، اس طرح اس کا سن وفات کا بھی تعین نہیں ہو سکا۔

الکندی کی ایک ایسے شریف النسب خاندان میں نشو و نما ہوئی، جس میں ایک عرصہ دراز سے امارت و سیادت چلی آتی تھی۔ اس کے والد اسحاق بن الصباح خلفائے عباسیہ میں سے مہدی اور ہارون الرشید کے عہد میں کوفہ کے والی تھے۔ اور ان کے آباؤ اجداد میں سے اشعث بن قیس کو اسلام لانے کے بعد

---

[1] گزشتہ سال جمہوریۂ عراق کے زیر اہتمام بغداد میں عرب اور اسلام کے پہلے فلسفی الکندی کی ہزار سالہ برسی منائی گئی۔ اس موقع پر "الامام الاکبر فیلسوف العرب والاسلام الاشہر" الشیخ عبدالکریم الزنجانی النجفی نے الکندی پر ایک مقالہ پڑھا۔ جس کا اردو ترجمہ نذر قارئین ہے۔ ——— مدیر

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہونے کا شرف حاصل ہوا، وہ عہد جاہلیت میں اپنے قبیلے کندہ کے بادشاہ تھے اور انہیں یہ بادشاہت اپنے باپ دادا سے ورثے میں ملی تھی۔

الکندی کی درس و تدریس کی زندگی کا آغاز بصرے ہی میں ہوگیا تھا۔ بعد میں وہ بغداد منتقل ہوگیا جو اس زمانے میں علوم و فنون اور عالمی تہذیب و ثقافت کا عظیم مرکز تھا۔ جن سے اس نے خوب استفادہ کیا، اور بغداد کے علمی سرچشموں سے وہ پوری طرح سیراب ہوا، یہاں تک کہ اس کا ذہن ایک عظیم دائرہ معارف (انسائیکلو پیڈیا) بن گیا، جس میں فلسفہ، ادب، طب، علم الافلاک، فن موسیقی، علوم ریاضی اور طبیعات و کیمیائیات سب کچھ تھے۔ مختصراً اکیلے الکندی کے ذہن نے بغداد سے اتنا کچھ حاصل کر لیا کہ دس ذہن بھی اسے حاصل کرنے سے عاجز رہتے اس کی علمی پیاس اسے علم کے ہر سرچشمے کی طرف لے گئی۔ اس نے یونانی و سریانی زبانیں سیکھیں۔ اور ان سے عربی زبان میں ترجمے کئے۔ الکندی کا شمار اس دور کے مشہور اور ماہر مترجموں میں ہوتا تھا، جن کے نام یہ ہیں:۔ حنین بن اسحاق، یعقوب بن اسحاق الکندی، ثابت بن قرہ الحرانی اور عمر بن الفرخان الطبری۔ الکندی یونانی فلسفے، ہندی حکمت اور فارسی معارف سے بڑی شیفتگی رکھتا تھا۔ چنانچہ ان پر مشتمل جو کتاب بھی ہاتھ لگتی، وہ اسے لے کر بیٹھ جاتا اور بغیر ختم کئے دم نہ لیتا اس سے پہلے عربوں میں الکندی کی کوئی نظیر نہ تھی اسی لئے اسے "فیلسوف عرب" کا لقب دیا گیا۔

بعض مورخوں نے الکندی کی ۲۵۰ تصنیفات گنائی ہیں، جن میں کتابیں اور رسالے سب شامل ہیں۔ اور بعض کے نزدیک ان کی تعداد ۲۳۱ ہے۔ ابن الندیم نے "الفہرست" میں ان کا ذکر کیا ہے۔ اور ابن ابی اصیبعہ نے اپنی کتاب "عیون الانباء" میں ان میں سے بہت سوں کو بغیر کسی ترتیب و نظام کے گنایا ہے۔ "تاریخ الحکماء" میں انہیں الگ ہر فصل کے تحت تقسیم کیا گیا ہے۔ بعض مورخوں نے الکندی کی تصنیفات کو فصل وار یوں گنایا ہے۔ فلسفہ ۲۲، نجوم ۱۹، علم الافلاک ۱۶، بحث و جدل ۱۷، احداث ۱۴، الکریات ۸، فن موسیقی ۷، علم النفس ۵، تقدمۃ المعرفہ ۵، حساب ۱۱، ہندسہ ۲۳، طب ۲۲، سیاست ۱۲، طبیعات ۳۳، منطق ۹، احکام ۱۰، اور ابعاد ۸۔ اس ضمن میں افسوس ناک بات یہ ہے کہ ان تصنیفات میں سے بہت کم ضائع ہونے سے بچیں، اتنی کم کہ ان سے الکندی کے فلسفے پر پوری روشنی نہیں پڑ سکتی۔ بعض ثقہ

مورخین کی رائے ہے کہ الکندی کا فلسفہ افلاطون، ارسطو اور افلوطین کے فلسفوں کا امتزاج ہے جسے تمام تر ارسطو سے منسوب کر دیا گیا۔ لیکن ہمارے پاس الفارابی اور ابن سینا دو ایسے ذرائع ہیں، جو الکندی کے فلسفہ کی ایک واضح اور حقیقی تصویر ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔

قبل اس کے کہ ہم فلسفہ الکندی کی یہ تصویر پیش کریں، عربوں اور مسلمانوں میں فلسفہ کی جس طرح نشو و نما ہوئی، اس کا اجمالاً ذکر کریں گے۔

الکندی کے بالخصوص اور عربوں اور مسلمانوں کے بالعموم فلسفے میں دلچسپی لینے کے اہم اسباب میں سے ایک سبب خود اسلام ہے جو کہ "دین فطرت و طبیعت" ہے اور اس کی کتاب قرآن کریم پہلی آسمانی کتاب ہے جس نے اپنے پیروؤں پر تحصیل علم و دانش فرض قرار دیا۔ اور کائنات کے اسرار اور وجود کے رازوں پر غور و فکر کرنا ان کے لئے لازم ٹھہرایا تاکہ وہ اس طرح خالق و مبدع اول کی معرفت حاصل کر کے اس پر ایمان لائیں اور انہیں روح کی بقا و خلود اور دوسری زندگی میں اس کے لوٹنے کا جہاں کہ عدل الٰہی کی طرف سے بدی اور نیکی کرنے والوں کو پورا پورا بدلہ ملے گا، یقین حاصل ہو۔ کیا اس کے علاوہ صحیح فلسفہ کوئی اور چیز ہے؟ اور کیا فلسفہ اپنے پیروؤں کو یہ جو دعوت دیتا ہے کہ وہ عالم کی ابتدا اور اس کی انتہا اور کائنات کی عظمت اور جس طرح کہ اس کا نظام چل رہا ہے، اس پر غور و فکر کریں اس میں اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں۔ اولم یتفکروا فی ملکوت السماوات والارض وما خلق اللہ من شئی [۱] اور اس کے اس ارشاد میں — ان فی خلق السموات والارض واختلاف الیل والنھار لآیات لاولی الالباب [۲]" نیز اس طرح کی دوسری آیات میں کوئی فرق ہے؟ کیا یہ آیات اس امر کی صراحت نہیں کرتیں کہ اسلام نے عقل فطری کو جو اوہام کی آلائشوں سے پاک ہو، پورا اختیار دیا ہے، اور یہ کہ اس نے اس کے غور و فکر کے لئے کسی خاص جہت کی شرط نہیں رکھی اور نہ اس کے لئے کوئی مخصوص حد معین کی ہے۔ بلکہ اسلام نے سلیم عقلوں کو عقائد اور عالم کون و مکان کے بارے

---

[۱] کیا وہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہت میں اور اللہ نے جو چیزیں پیدا کی ہیں، ان میں غور نہیں کرتے۔

[۲] بے شک آسمان اور زمین کے پیدا کرنے میں اور رات اور دن کے بدلتے رہنے میں عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں

میں مجرو حقائق تک پہنچنے کے لئے پورا آزاد چھوڑا ہے تاکہ وہ معلوم کرسکیں کہ اس عالم کی ابتداء اور انتہا کیا ہے؟ یعنی وہ "مبدا و معاد" جانیں جیسا کہ انسان کے اندر جبلی طور سے جو دینی شعور ہے، وہ اس بات کا مطالبہ کرتا ہے۔ عقل و فکر کی یہی آزادی، جو فلسفہ و علم و حکمت میں پائی جاتی ہے، اس کی اساس ہے اور اسی کی وجہ سے فلسفہ و علم و حکمت کو احترام و دوام حاصل ہے۔ اور وہ برابر ترقی پذیر ہے۔ اب اسلام کے علاوہ اور کون سا مذہب ہے جس میں آپ عقل و فکر کی یہ آزادی پاتے ہیں۔

دین اسلام کا عقل و فکر پر یہی اعتماد تو تھا، جس نے عربوں اور مسلمانوں کو علوم و معارف کی تحصیل و تحقیق، اسلامی فلسفہ کی ایجاد اور نئے نئے علوم کی اختراع پر آمادہ کیا۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ عقل ہی تو ہے جو فطری اساس ہے، جس پر کہ زندگی کی تمام انواع اور اس کے جملہ شعبوں کا دار و مدار ہے۔ اور یہی ارتقا و ترقی کا ذریعہ ہے۔ اسی لئے اسلام نے جو "دین فطرت و طبیعت و اجتماع" ہے، اس پر زور دیا ہے اور اپنے ماننے والوں پر طلب علم فرض ٹھہرایا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ جو شخص قرآن کریم کا مطالعہ کرتا ہے اور اس کی ان آیات پر جو خاص طور سے تدبر و تفکر پر ابھارتی ہیں، غور کرتا ہے، تو اس پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ یہی وہ آسمانی کتاب تھی جو پہلا سبب بنی عربی ماحول میں فلسفہ کے داخل ہونے کا۔ اور اسی کی وجہ سے سب سے پہلے عربوں کے لئے فلسفیانہ بحثوں کا جن کی اساس منطق اور غور و فکر ہے، دروازہ کھلا قرآن مجید کے نزول سے قبل وہ اس قسم کی بحثوں سے بالکل ناآشنا تھے۔ یہ فلسفیانہ بحثیں جن کا آغاز قرآن مجید کی وجہ سے ہوا، ان کا دائرہ علوم کون و مکان اور علوم دین یعنی توحید، تفسیر اور فقہ و تشریع ہر دو پر محیط تھا۔

یہ تھی گویا صدرِ اسلام میں فلسفی فکر کی ابتدا۔ اس کے بعد فلسفی فکر برابر فروغ پاتا گیا یہاں تک کہ وہ دور آیا، جس میں یونانی، ایرانی اور ہندی زبانوں سے ترجموں کا آغاز ہوا۔ اس زمانے کا مسلمان عرب اپنی فطری ذہانت، خداداد دماغی قوت اور ہر نئی چیز سے باخبر ہونے کے ذوق و اشتیاق میں ایک امتیازی درجہ رکھتا تھا، چنانچہ اسی کا نتیجہ تھا کہ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ وہ ان تمام قدیم قوموں کی تہذیب و ثقافت کا جن پر کہ اسے غلبہ نصیب ہوا، یا ان سے اس کا سابقہ پڑا، وارث بن گیا۔ دوسری زبانوں سے ترجموں کے طویل دور کے بعد

مسلمانوں کے ہاں ایجاد واختراع وتخلیق کا دور شروع ہوا، اور یہی وہ اساس تھی جس پر اسلامی تہذیب وثقافت کی عالی شان عمارت تعمیر ہوئی تھی۔

۱۳۹ھ مطابق ۷۵۶ء میں خاندان عباسیہ کے دوسرے خلیفہ منصور نے دریائے دجلہ کے غربی کنارے پر اپنے دارالحکومت بغداد کی تعمیر شروع کی یہ وہ جگہ تھی جہاں ساسانی دور میں بغداد (جس کے معنی عطیۂ خداوندی کے تھے) نام سے ایک گاؤں آباد تھا۔ دجلہ وفرات کی وادی میں، جہاں نئے دارالحکومت کی بنا رکھی گئی عہد قدیم میں بڑی بڑی بادشاہتیں اور ان کے پایۂ تخت رہ چکے تھے۔ منصور کے بغداد کی تعمیر میں چار سال لگے اور اس میں تقریباً ایک لاکھ کے قریب مہندسوں (انجینیروں) اور کاریگروں ومزدوروں نے کام کیا بغداد کو بنے زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ وہ ایک عظیم الشان شہر بن گیا۔ ہارون رشید کے زمانے میں (۷۸۶ء - ۸۰۹ء) تو بغداد دولت وثروت اور عالمی اہمیت میں سب سے بازی لے گیا تھا۔ وہاں فکر اسلامی کی بیداری عروج کو پہنچی بلکہ اس دور میں بغداد میں ایک ایسی عظیم الشان فکری وثقافتی تحریک بروئے کار آئی جس کا شمار دنیا کی عظیم فکری وثقافتی تحریکوں میں کیا جا سکتا ہے۔ غرض بغداد کو وجود میں آئے بمشکل پچھتر سال گزرے ہوں گے کہ عرب مسلمانوں کے ہاں افلاطون اور ارسطو کی اہم فلسفیانہ کتابیں، نوافلاطونی اصحاب فلسفہ کی شروح میں سے منتخب تصانیف، جالینوس کی اکثر طبی کتابیں اور ایران وہندوستان کی بہت سی علمی تصنیفات منتقل ہو چکی تھیں۔

وہ علمی ذخیرے، جنہیں بہم کرنے میں اہل یونان کو صدیاں لگی تھیں، ایک مختصر مدت میں وہ عرب مسلمانوں کی تحویل میں آ گئے، اور اس طرح عربی اسلامی زندگی میں یونانی ثقافت جو اسلامی ثقافت کو اپنے اندر سمو چکی تھی، ایک موثر طاقت بن گئی۔ مامون الرشید کے دور میں جسے "ترجمے کا دورِ زریں" کا نام دیا گیا ہے اس یونانی ثقافت کا اثر ونفوذ اپنے نقطۂ معراج پر پہنچ گیا۔ کیونکہ ایک تو خلیفہ مامون الرشید کے اپنے خاص فکری رجحانات تھے، اور دوسرے اس نے امام الرضا علی بن موسیٰ بن جعفر الصادق سے حکمت اسلامیہ کے حقائق کا استفادہ کیا تھا۔

۲۰۷ھ مطابق ۸۳۰ء میں مامون الرشید نے بغداد میں "بیت الحکمت" کی بنیاد رکھی، اور وہ عبارت

تھا خزانہ کتب، دارِ علم اور مکتبِ ترجمہ سے بغداد کا یہ "بیت الحکمت" اسکندریہ کے تاریخی کتب خانے کے بعد جس کی بنا مصر کے شہر اسکندریہ میں تیسری صدی قبل مسیح میں پڑی تھی، علم و حکمت کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ اس کی تاسیس سے پہلے بعض عیسائی، یہودی اور نو مسلم اہل علم دوسری زبانوں سے عربی میں از خود ترجمے کیا کرتے تھے۔ مامون الرشید اور اس کے جانشینوں کے عہد میں یہ "بیت الحکمت" ترجمے کا گویا ایک مرکز بن گیا۔ ترجمے کا یہ دور تقریباً ۷۵۰ء میں شروع ہوتا ہے اور ایک سو سال تک اس کا سلسلہ جاری رہتا ہے اس دور کا شیخ المترجمین حنین بن اسحاق تھا، جسے مامون الرشید کے عہد میں انتہائی عروج نصیب ہوا، جب کہ اس کے سپرد بیت الحکمت کی ریاست کی گئی۔ خلیفہ المتوکل نے اسی حنین بن اسحاق کو اپنا خاص طبیب مقرر کیا۔ لیکن کچھ عرصے بعد اسے قید کر دیا، اور پورے ایک سال تک قید میں رکھا کیونکہ اس نے خلیفہ کے لئے کوئی ایسی دوا تجویز کرنے سے انکار کر دیا تھا، جس سے وہ اپنے دشمن کو ہلاک کر سکتا بعد ازاں خلیفہ نے اسے بلایا اور اس کے سامنے اپنا وہی مطالبہ پیش کیا۔ اور ساتھ ہی جلاد اور تلوار بھی منگوائی گئی۔ حنین نے خلیفہ سے کہا کہ اس ضمن میں جو کچھ مجھے کہنا تھا وہ میں کہہ چکا ہوں، اس پر متوکل بولا تو پھر میں تمہیں قتل کرتا ہوں۔ حنین نے جواب دیا کہ میرا رب موجود ہے، جو حشر کے دن میرے ساتھ انصاف کرے گا۔ یہ سنکر متوکل مسکرایا اور کہنے لگا کہ تم مطمئن ہو جاؤ۔ ہم تو تمہارا امتحان لے رہے تھے۔ پھر خلیفہ نے حنین سے پوچھا کہ آخر وہ کون سی چیز تھی جس نے تمہیں ہماری بات ماننے سے روکا دراں حالیکہ تم دیکھ رہے تھے کہ ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں، وہ ہم کرنے پر تُلے ہوئے ہیں۔ حنین کا جواب یہ تھا:۔ "دو چیزیں تھیں۔ ایک دین اور دوسری چیز پیشہ۔ جب دین ہمیں حکم دیتا ہے کہ ہم اپنے دشمنوں کے ساتھ بھی بھلائی کریں، تو دوستوں کے بارے میں آپ کیا کہیں گے۔ باقی رہا میرے پیشے کا معاملہ، تو یہ بنی نوع انسان کے فائدے کے لئے ہے اور اس کا مقصد ان کا علاج و معالجہ ہے۔ اس کے علاوہ اطباء سے سخت سے قسمیں دے کر یہ قول و قرار بھی لیا جاتا ہے کہ وہ کسی کو ہلاک کرنے والی دوا نہیں دیں گے"۔ اس دور کے دوسرے مشہور مترجموں کی طرح فیلسوف العرب ابو یوسف یعقوب بن اسحاق الکندی نے ارسطو کی مابعد الطبیعیات کی تیرھویں کتاب اور تحلیل القیاس والبرہان نام کی دو کتابوں کے عربی میں ترجمے کئے۔

"مقولات" کی شرح لکھی اور ارسطو کی تصنیفات کی ترتیب پر ایک کتاب تصنیف کی، الکندی کے ان ترجموں پر بعد میں معلم ثانی ابونصر فارابی نے نظر ثانی کی۔ اس ضمن میں یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیئے کہ اس دور میں جسے قرون وسطیٰ کہا جاتا ہے، شارح کا کام یہ ہوتا تھا کہ وہ پہلے کی ایک کتاب کو سامنے رکھ کر اور اسے اساس بنا کر اپنے فلسفیانہ اور علمی خیالات کو ایک کتاب میں منضبط کرے۔ اور یہ شارح کی طرف سے اس کتاب کی شرح ہوتی۔ چنانچہ الکندی اور ابونصر فارابی نے جو شرحیں لکھی ہیں وہ اپنی جگہ مستقل کتابیں ہیں جن میں فلسفے پر ان شارحین کی اپنی بھی مخصوص رائیں ہیں۔ اگرچہ ان کتابوں کے نام و عنوان ارسطو اور دوسرے یونانی فلسفیوں کی کتابوں کے ہیں اور ان میں ان فلسفیوں کے افکار و خیالات کی تاویل بھی کی گئی ہے اس لئے الکندی کے نام کے ساتھ "شارح" کے لقب کی وہی حیثیت ہے۔ جو ارسطو اور فارابی کے ساتھ "معلم" کی ہے۔

غرض یہ عرب مسلمان مترجم محض قدیم قوموں کی علمی وراثت کو اپنے دور میں منتقل کرنے والے ہی نہیں تھے۔ جیسا کہ بعض مخالفین کا اعتراض ہے۔ بلکہ وہ اپنی اسلامی و قرآنی ثقافت کی بدولت مخصوص آراء اور مستقل افکار کے بھی مالک تھے۔ انہوں نے فلاسفہ متقدمین کی کتابوں سے بڑی آزادی سے استنباط کئے اور ان کی آراء پر تنقید کی اور ایک کو دوسرے پر ترجیح دی۔ اس لحاظ سے وہ اس کے مستحق ہیں کہ ان کا شمار مستقل فلسفیوں اور حکماء میں ہو۔ باقی عربیت اور اسلام کے دشمن یہ جو ان پر اعتراض کرتے ہیں وہ جدید فلسفی مذاہب کو وجود میں نہیں لائے، تو یہ بات صرف ان مترجمین کے بارے میں صحیح ہے جو مسلمان عرب نہیں تھے۔ ان کی غالب اکثریت عیسائی تھی۔ اور وہ اس دور کے کلیسائی نظام کے تحت دبی ہوئی تھی، جس میں فکر انسانی پر طرح طرح کی پابندیاں تھیں نیز بعض مورخین کا یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ ان مترجمین کو فلسفے میں اختراع و تخلیق کی راہ سے روکنے والے اسباب میں سے ایک اہم سبب یہ تھا کہ وہ خلفاء اور امراء کے درباروں سے وابستہ تھے۔ جو جامد فقہاء اور عوام مسلمانوں کی خوشنودی چاہتے تھے اور انہیں یہ منظور نہ تھا کہ علوم فلسفہ کے یہ مترجم اپنے افکار میں اتنے آزاد ہوں کہ جامد علماء اور متعصب عوام ان سے بگڑ جائیں۔ بات یہ ہے کہ جہاں تک صحیح اسلامی عقیدے کا جو کہ کتاب اللہ اور سنت الرسول صلی اللہ علیہ وسلم سے مستنبط ہے، تعلق ہے وہ نہ تو فلسفہ سے ہراساں ہے اور نہ اسے اس کی سطوت و اقتدار سے کوئی خطرہ ہے۔ بلکہ اس سے صحیح

اسلامی عقیدے کا کوئی تصادم ہی نہیں کیونکہ فلسفہ عقل سلیم کا نتیجہ ہے، جسے اسلام نے پورا اختیار دیا ہے اور
اللہ کی کتاب اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت نے عقل نظری کے لئے کسی معین سمت کی شرط نہیں
رکھی اور نہ اس کے لئے کوئی مخصوص حد مقرر کی ہے۔ بلکہ عقل سلیم کو آزاد چھوڑا ہے کہ وہ حقیقت تک پہنچنے میں
کوشاں ہو۔ باقی امام شافعی کی طرف یہ قول جو منسوب ہے کہ جس نے فلسفہ کا شغل اختیار کیا۔ وہ زندیق ہوگیا۔ اوّل تو
اس کی صحت ثابت نہیں۔ اور اگر اسے صحیح مان بھی لیا جائے تو اس کا اشارہ ان لوگوں کی طرف ہے، جو دین اور اخلاق
میں بے راہ رویوں کے مرتکب ہوتے تھے اور اپنے آپ کو فلسفیوں کے زمرے میں شمار کرتے تھے۔ علاوہ ازیں
منصور، مہدی، ہارون الرشید اور مامون الرشید جیسے خلفاء کب اس کے محتاج تھے کہ وہ عوام کی چاپلوسی کریں
اور حق کے ناحق اور ناحق کے حق ہونے کا اعلان کرتے پھریں۔

یہ ایک تسلیم شدہ تاریخی حقیقت ہے کہ ظہور اسلام کے بعد امت عربی ترقی و اقبال کی منزل کی طرف دو دفعہ
بڑے زور شور سے آگے بڑھی ہے۔ ایک جب اس کے ہاں قرآن کی شعاعیں پھوٹیں جس نے اسے اندھیروں
کے بعد روشنی اور حیرانی و گمراہی کے بعد ہدایت دی۔ اسے خلفشار و انتشار کے بعد نظم و ضبط عطا کیا۔ اور اس
کے افراد کے ذہنوں کو بندشوں سے آزادی دی۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ قرآن کریم میں اعلیٰ ربّانی معارف اور بڑے
بڑے الہیاتی علوم ہیں اور یہ سب کے رب اس کے نور سے مستنیر ہیں نیز قرآن مجید نے امت عربی کی زبان
میں نئے لفظوں، دقیق اسلوبوں اور فنی و علمی تعبیروں کا جن سے وہ پہلے بے بہرہ تھی، اضافہ کیا اور بہت سے
عجمی کلمات کو معرب بنایا اور اس طرح اس کے سامنے زبان کو مالا مال کرنے کا دروازہ کھولا۔ ان سب امور سے
پہلے قرآن مجید نے کائنات، نفوس انسانی، اسباب و مسببات اور علتوں و معلولات پر غور و خوض کرنے کی
طرف توجہ دلائی۔ چنانچہ یہ وہ شمع تھی، جس نے اسلام قبول کرنے والوں کے لئے حکمت و فلسفہ کی راہ روشن کی۔
اور وہ اس راہ پر بڑے ذوق و شوق سے چل پڑے، اور اسے حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ ہاں یہ تھی تاثیر
امت عربی میں اللہ تعالیٰ کی اس عظیم کتاب کی۔

یہ پہلی دفعہ تھی، جب عرب ترقی و اقبال کی منزل کی طرف بڑے زوروں سے لپکے ہیں۔ دوسری دفعہ وہ تھی
جب یونانی فلسفے، ہندی حکمت اور ایرانی ثقافت کا سرمایہ عربی زبان میں منتقل ہوتا ہے اور اس سے عرب

استفادہ کرتے ہیں، لیکن اسلامی معارف اور دین حنیفی کی روشنی میں اس کی اصلاح کے بعد عربی زبان میں ان تراجم کی بدولت مسلمان عرب ان قوموں کی فلسفیانہ زندگی سے متعارف ہوتے ہیں۔ انھوں نے ان قوموں کے افکار و خیالات اور ان کے مذاہب کا مطالعہ کیا۔ اس سے ان کے ذہن پر جو پہلے اسلامی ثقافت کے قالب میں ڈھل چکا تھا۔ دُور رس اثرات پڑے۔ یہ واقعہ ہے کہ اگر تاتاریوں کے ہاتھوں امت عربی کو وہ تباہی و بربادی نہ دیکھنی پڑتی، تو آج کی دنیا بغداد کے کتب خانوں کو ان علوم و فنون کے سرمائے سے بھرپور پاتی، جسے اس وقت تک تمام روئے زمین میں بسنے والے انسانوں کی عقل نے تخلیق کیا تھا۔ ان تراجم نے عرب مسلمانوں کے دماغوں میں جو پوشیدہ صلاحیتیں تھی، انہیں علمی دنیا میں ظہور پذیر ہونے کے لئے تیار کیا۔ چنانچہ ان کا اس طرح ظہور ہوا کہ مورخین اور اہل علم اس سے حیرت میں ہیں۔ اس کے نتیجے میں اسلامی فلسفہ اور عربی علوم وجود میں آئے جو صرف مسلمانوں کے لئے خاص ہیں اور ان کی بدولت تاریخ اسلام کا یہ دور فلسفہ اور علوم و فنون میں اختراع و تخلیق اور جدید نظریات کا دور بن گیا۔

الکندی کے بارے میں بعض اہل علم پریشانی میں مبتلا ہیں اور ان کا خیال ہے کہ اس نے اہل یونان کے علوم اور ان کے فلسفے میں کسی نئی چیز کا اضافہ نہیں کیا اور یہ کہ اس کا مبہم اور پیچیدہ اسلوب اس کی بقائے دوام کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ اس کی جملہ تصنیفات میں سے جو تھوڑی بہت بچ رہی ہیں، وہ اس کے فلسفے کی واضح تصویر پیش نہیں کرتیں۔ لیکن جہاں تک ہمارا تعلق ہے، ہم نے الکندی کے فلسفے کو اس کی اپنی تصنیفات نیز اس کے معاصرین نے اپنی کتابوں میں اس کے جو افکار و خیالات دیئے ہیں۔ ان سے جانا ہے، الکندی کے معاصرین میں سے ایک تو "معلم ثانی" فارابی ہے۔ ابن سینا بھی فارابی ہی کے نقش قدم پر چلا۔ اس کے بعد فلسفہ اور تاریخ کے مشہور عرب اور مسلمان مصنفوں میں سے ایک کثیر تعداد نے اس کی پیروی کی۔

یہ بات تو بہرحال طے شدہ ہے کہ الکندی تیسری صدی ہجری میں ہوا۔ اس نے یونانی فلسفے، ایرانی معارف اور ہندوستانی حکمت کو عربی میں منتقل کیا۔ اور ان کی شرح کی۔ اور ان میں اعلیٰ مقام حاصل کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے اسلامی و قرآنی ثقافت سے بھی استفادہ کیا۔ اور دونوں کی مدد

سے فلسفہ میں اپنے ایک مستقل مکتب کی بنیاد رکھی، جس میں منطقی براہین اور نظری دلائل سے جن کا کہ قضیہ اوّل مسلمہ بدیہیات پر ختم ہوتا ہے۔ کام لیا جاتا تھا۔ چنانچہ یہ مکتب فکر عرب اور مسلمان فلسفیوں میں سے جو الکندی کے معاصر یا جو اس کے بعد آئے۔ ان کے لئے افکار اور اعلیٰ نظریات کا سرچشمہ بنا۔ اس بنا پر بجا طور سے اسے عربوں اور مسلمانوں کے پہلے فلسفی کا لقب دیا گیا۔ الکندی پہلا مسلمان اور عرب فلسفی تھا، جس نے افلاطون اور ارسطو کے افکار و آراء میں مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی اس کے بعد فارابی اس کے نقش قدم پہ چلا۔ پھر ابن سینا نے یہی راہ اختیار کی۔ چنانچہ اس نے مشائی (ارسطالیسی) حکمت پر اپنی کتاب "الشفا" لکھی اور اشراقی (افلاطونی) حکمت کے موضوع پر "الاشارات" تصنیف کی۔ الکندی ایک الہیاتی اور عقلیاتی حکیم ہونے کے ساتھ ساتھ اخلاق و ادیان کو بھی ماننے والا تھا۔ وہ انسانیت کے مجد و شرف پر اعتقاد رکھتا اور قوانین فطری کا احترام کرتا تھا۔

الکندی کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ قرآن کریم پر غور و خوض کرتے ہوئے جب اس نے یہ آیت دیکھی۔ "ھوالذی انزل علیک الکتاب منہ اٰیات محکمات ھن ام الکتاب واخر متشابھات فاما الذین فی قلوبھم زیغ فیتبعون ما تشابہ منہ ابتغاء الفتنۃ وابتغاء تاویلہ ولا یعلم تاویلہ الا اللہ والراسخون فی العلم[۱]" تو وہ آیات متشابہات کے بارے میں حیرت میں پڑ گیا۔ اس پر اس کے ایک شاگرد نے اسے کہا کہ جو قرآن مجید کے مخاطب تھے، وہی اس کے معنی بہتر جانتے ہیں اور وہ رسول اللہ صلی اللہ وآلہ وسلم تھے اور آپؐ کے بعد آپ کے اہل بیت۔ چنانچہ آج کل اہل بیت

---

[۱] وہی ہے جس نے اتاری تجھ پر کتاب اس میں بعض آیتیں ہیں محکم یعنی ان کے معنی واضح ہیں وہ اصل ہیں کتاب کی اور دوسری ہیں متشابہ یعنی جن کے معنی معلوم یا معین نہیں۔ سو جن کے دلوں میں کجی ہے وہ پیروی کرتے ہیں متشابہات کی گمراہی پھیلانے کی غرض سے اور مطلب معلوم کرنے کی وجہ سے اور ان کا مطلب کوئی نہیں جانتا سوا اللہ کے اور مضبوط علم والوں کے۔ الخ۔

میں سے امام حسن عسکری ہیں، جنہیں خلیفہ نے سامرا میں نظر بند کر رکھا ہے۔ آپ ان سے قرآن مجید کی تفسیر اور آیات متشابہات کی تاویل سیکھے۔ الکندی کو یہ بات پسند آئی اور اس نے امام حسن عسکری بن علی بن علی بن موسیٰ بن جعفر بن محمد بن علی بن حسین بن علی بن ابی طالب امیر المومنین سے قرآنی معارف حاصل کئے اور یہ الکندی کا خصوصی اعزاز ہے، جو کسی اور عرب اور مسلمان فلسفی کو نصیب نہیں ہوا۔ الکندی کے الہیاتی اور تکوینی فکر کا لب لباب یہ ہے کہ اللہ کے ماسوا یہ جو عالم ہے، وہ حادث ہے اور یہ اللہ واحد واحد کی تخلیق ہے، جو اس کا مبدع اول اور علت العلل ہے۔ نیز مبداءِ اوّل نے اپنی ازلی قدرت اور اپنے اس علم سے جو بہترین نظام کے اہتمام میں رہتا ہے، امکانی موجودات کے جس سلسلے کا فیضان کیا ہے اس کی ابتدا اکمل ترین اور اتم ترین چیز سے ہوتی ہے، اور وہ عقل ہے۔ جو ذاتاً اور فعلاً مادہ سے مجرد ہے۔ چنانچہ نہ وہ مادی ہے نہ زمانی، بلکہ مادے اور زمانے دونوں سے بالاتر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے عقل اول کو پیدا کیا۔ جس میں یہ قدرت رکھی کہ وہ اپنی بعد والی چیز یعنی عقل ثانی میں موثر ہو سکے۔ اس طرح عقول عشرہ (دس عقلوں) کی تخلیق عمل میں آئی۔ عالم عقول کو عالم ابداع کہا جاتا ہے اور یہ مادے اور زمانے سے منزہ ہے۔ امکانی موجودات کے سلسلے کا یہ مرتبہ اولیٰ ہے۔ اس کے بعد مرتبہ ثانیہ مخترعات کا ہے۔ جن سے مراد افلاک، نفوس کلیہ اور عالم مثال ہے۔ اور مرتبہ ثالثہ عالم تکوین ہے یعنی وہ موجودات جو مادے اور زمانے دونوں کی حامل ہیں۔ اور وہ عناصر، طبائع، صور جسیمہ اور ھیولیٰ ہیں۔
امکانی موجودات کے سلسلے کا آخری درجہ عنصرِ مادی ہے۔ جو منتج ہوتا ہے نبات، حیوان اور انسان کے اجسام پر۔ اب جہاں تک انسان کا تعلق ہے اس میں عنصر مادی کے علاوہ نفس ناطقہ بھی ہے جو مادہ سے مجرد ہوتا ہے اور عالم ملکوت سے عالم شہادت میں نزول کرتا ہے۔

شاہ ولی اللہ کا مقام عظمت

از مولانا ابوالکلام آزاد

مرتب - ابوسلمان شاہجہاں پوری

مولانا ابوالکلام آزاد کے والد کی ننہیال کی طرف سے ان کے عزیز فضل الدین احمد تھے قصور کے رہنے والے اور "الہلال" کلکتہ کے مینجر تھے موصوف مولانا آزاد سے تقاضا کر رہے تھے کہ وہ اپنے حالات و سوانح قلم بند کر دیں۔ پہلے تو مولانا آزاد ان کو ٹالتے رہے پھر جب انہوں نے زیادہ اصرار کیا تو یہ کہہ کر صاف انکار کر دیا کہ،

"کتنی بزرگ اور عظیم الشان زندگیاں ہمارے سامنے ہیں، جن کے سوانح و حالات نہیں لکھے گئے۔ ان کو چھوڑ کر میری زندگی کے حالات مرتب کرنا محض ایک تمسخر انگیز حرکت ہوگی ۔" (تذکرہ از مقدمہ)

لیکن فضل الدین احمد اس کو اسی قدر ضروری خیال کرتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنا اصرار جاری رکھا حتیٰ کہ مولانا آزاد کو حکومت بنگال نے اپنی حدود سے خارج کر دیا اور مولانا رانچی (بہار) چلے گئے۔ فضل الدین احمد نے پھر بھی ہمت نہ ہاری اور مولانا کو برابر اس جانب متوجہ کرتے رہے۔ بالاخر ان کے اصرار کے آگے حضرت مولانا کو سپر انداز ہونا پڑا۔ اور اپنے حالات و سوانح لکھنے کا وعدہ فرمالیا۔ پھر جو کچھ حضرت مولانا نے لکھا وہ "تذکرہ" کی صورت میں دنیا کے سامنے ہے۔ اس میں اگرچہ حضرت مولانا اور ان کے خاندان کے بارے میں بھی مفید اور قیمتی معلومات ملتی ہیں، لیکن حقیقتاً "تذکرہ" مولانا آزاد یا ان کے خاندانی بزرگوں کا نہیں بلکہ تجدید و احیائے دین اور دعوت و عزیمت کی تاریخ بن گیا ہے۔ مولانا نے اس میں

امام الحرمین حضرت امام احمد ابن حنبل، شیخ الاسلام حضرت امام ابن تیمیہ اور امام ابن قیم وغیرہم رضی اللہ عنہم اجمعین کے مقام علم وفضل، ان کی دعوت، مقام عزیمت اور ان کے کارناموں کو والہانہ انداز میں بیان کیا ہے۔ تقریباً پونے تین سو صفحات لکھنے کے بعد بیرونِ ہندوپاکستان کے علمائے حق کی جانب سے ہندوپاکستان کے علمائے حق وصاحبانِ دعوت وعزیمت کی طرف خیالات کی باگ موڑدی ہے۔ فرماتے ہیں۔

"یہ چند متفرق مثالیں تو دور کی تھیں۔ خود ہندوستان کی تاریخ دیکھو تو ہمیشہ ایسا ہی معاملہ نظر آئے گا" ہندوپاکستان کے علمائے حق میں حضرت مجدد الف ثانی، حضرت شاہ ولی اللہؒ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ حضرت اسمعیل شہید رحمہم اللہ اجمعین کی عظیم شخصیتیں ان کی توجہ اور محبوبیت کا مرکز رہی ہیں۔ حضرت مجدد الف ثانی کے بارے میں فرماتے ہیں۔

"شہنشاہ اکبر کے عہد کے اختتام اور عہد جہانگیری کے اوائل میں کیا ہندوستان علماء ومشائخِ حق سے بالکل خالی ہوگیا تھا؟ کیسے کیسے اکابر موجود تھے! لیکن مفاسد وقت کی اصلاح وتجدید کا معاملہ کسی سے بھی بن نہ آیا۔ صرف حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کا وجود گرامی ہی تن تنہا اس کاروبار کا کفیل ہوا۔"

مولانا آزاد نے حضرت شیخ سرہندیؒ کی جامعیت وکاملیت اور ان کے کارناموں کے بارے میں جو کچھ لکھا وہ خود ایک مفصل مقالہ کا مواد ہے۔ اس مختصر صحبت میں ہم دورۂ آخر کے فاتح وسلطانِ عصر حجۃ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ رضی اللہ عنہ کے کارنامۂ تجدید واحیائے دین وتدوین علوم ومعارف اسلامیہ کے متعلق مولانا آزاد مرحوم کے خیالات پیش کریں گے۔

مولانا آزاد فرماتے ہیں!

پھر بارہویں صدی کا ایک عظیم ترین ظہور علوم ومعارف دیکھو، زمین بنجر ہوچکی تھی۔ پھر بھی کھیتوں کی سرسبزی اور چمنوں کی لالی سے کوئی گوشہ بالکل خالی نہ تھا۔ تیرھویں صدی کے تمام کاروبار علم وطریقت کے اکابر واساتذہ اسی صدی میں سربرآوردہ ہوئے، بعض بڑے بڑے سلاسلِ درس وتدریس کی بنیادیں اسی میں استوار ہوئیں۔ جیسے خاندان مشہور فرنگی محلی، اور

اور ہندوستان سے باہر بلاد عربیہ و عثمانیہ میں اکثر مشاہیر علم و ارشاد جیسے شیخ ابراہیم کورانی محمد بن احمد سفارینی النجدی، سید عبدالقادر کوکبانی، شیخ عمر فاسی تیونسی، شیخ سالم بصری، امیر محمد بن اسمعیل یمانی، شیخ عبدالخالق زبیدی، علامہ فلانی صاحب الیقاظ، شیخ محمد حیات سندھی المدنی وغیرہم کہ شاہراہ عام سے اپنی راہ الگ رکھتے تھے اور حقیقت مستورہ کے شناسا و حق آگاہ تھے۔ بایں ہمہ معلوم ہے کہ وہ جو دورۂ آخر کے "فاتح" اور "سلطان عصر" ہونے کا مقام تھا اور "قطبیت وقت" کا وہ صرف حجۃ الاسلام شاہ ولی اللہ (رضی اللہ عنہ) ہی کے لئے تھا۔ اور لوگ بھی بیکار نہ رہے، کام کرتے رہے۔ مگر جو کام یہاں انجام پایا وہ صرف یہیں کے لئے تھا۔

احسنت ازیں عشق کہ دوراں امروز
گرم دارد ز تو ہنگامۂ رسوائی را! فیضی

تفہیمات میں اس معاملے کے معارف لکھتے ہوئے کہیں تو اپنی طرف بیگانہ وار اشارہ کر جاتے ہیں، کہیں کہیں جوش قلبی کی بے اختیاریوں میں صاف صاف بھی لکھ گئے ہیں۔ اپنے ترجمہ میں لکھتے ہیں۔

نعمت عظمیٰ بریں ضعیف آنست کہ اورا خلعت فاتحیت دادند و فتح دورۂ بازپسیں بردست وے کردند	اللہ تعالیٰ کا یہ مجھ ضعیف پر عظیم احسان ہے کہ اس نے خلعت فاتحیت سے نوازا، اور اس دورۂ آخر کا افتتاح اسکے ہاتھ سے کرایا [1]

تفہیمات میں لکھتے ہیں

بہ سرم درداد ند کہ ایں خفیقت بمردم برساں۔ امروز وقت تست	میرے ذہن میں یہ حقیقت ڈالی گئی کہ میں لوگوں تک یہ حقیقت پہنچا دوں کہ یہ

---

[1] مولانا آزاد نے تذکرہ میں محولہ عبارات حضرت شاہ کا ترجمہ نہیں کیا تھا۔ راقم نے استفادۂ عام کے خیال سے اس کا مطلب بھی شامل کر دیا ہے۔ ابو سلمان

وزبان زبانِ تو۔ وائے برکسے کہ زیر لوائے تو نہ باشد۔

زمانہ تیرا زمانہ ہے، اور یہ وقت تیرا وقت ہے۔ افسوس اس شخص پر جو تیرے جھنڈے کے نیچے نہ آئے۔

ایک اور تفہیم میں یہ کیفیت زیادہ سرمستی کے ساتھ کھلی ہے۔

فھمنی ربی انا جعلناک امام ھذہ الطریقۃ وسددنا طرق الوصول الی حقیقۃ القرب کلھا الیوم غیر طریقۃ واحدۃ وھو محبتک والانقیاد لک فالسماء لیس علی من عادک بسماء ولیست الارض علیہ بارض فاھل الشرق والغرب کلھم رعیتک وانت سلطانھم علموا اولم یعلموا فان علموا فازوا وان جھلوا خابوا۔

میرے رب نے مجھے بتایا کہ ہم نے تجھے اس طریقے کا امام بنایا ہے، اور سوائے ایک طریقے کے جو تیری محبت اور تیری اطاعت کا طریقہ ہے، قُرب حقیقت تک پہنچنے کے سب راستے آج بند کر دیئے ہیں اور جو تیری مخالفت کرے، اسے نہ آسمان میں پناہ مل سکتی ہے اور نہ زمین میں۔ پس اہل شرق و غرب سب کے سب تیری رعیت ہیں اور تم ان کے سلطان ہو خواہ وہ اسے جانیں یا نہ جانیں۔ اگر وہ جانیں گے تو کامیاب ہوں گے۔ اگر نہ جانیں گے تو ناکام ہوں گے۔

ایک اور تفہیم میں لکھتے ہیں

ومن نعم اللہ علیّ ولا فخر، ان جعلنی ناطق ھذہ الدورۃ وحکیمھا وقائد ھذہ الطبقۃ وزعیمھا فنطق علی لسانی ونفث فی نفسی فان نطقت

اور اللہ کی مجھ پر جو نعمتیں ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے اور اس میں کوئی فخر نہیں کہ اس نے مجھے اس دور کا ناطق اور حکیم اور اس طبقے کا قائد اور زعیم بنایا۔ اور وہ میری زبان سے گویا ہوا، اور اس نے میرے نفس میں اپنی

باذکار القوم واشغالهم
نطقت بجوامعها۔ وان تکلمت
علی نسب القوم فیما بینهم
وبین ربهم رویت لی مناکبها
وقبضت علی جوامع خطامها
وان خطبت باسرار اللطائف
وغوامض الحقائق تغوصت
قاموسها وتلمست ناعوسها
وقبضت علی جلابیبها واخذت
بتلابیبها، وان بحثت عن
علم الشرائع والنبوات، فانا
لیث عرینها، وحافظ جربینها
ووارث خزائنها، وباحث
مغابنها۔ واتیتهم بعجائب لا
تحصی، وغرائب لا اکتناهها
یرجی۔ شعر

وکم لله من لطف خفی
یدق خفاه عن فهم الذکی

روح پھونکی۔ پس اگر میں لوگوں کے اذکار
واشغال بیان کروں، تو میرے اس بیان
میں جامعیت ہوگی۔ اور اگر میں ان نسبتوں
کو بیان کروں، جو ان لوگوں کی آپس میں
اور اپنے ربّ کے ساتھ ہیں تو ان کے سب
پہلو ہر جہت سے مجھ پر عیاں ہوں گے اور
میں ان پر پورے طور سے حاوی ہوں گا
اور اگر میں اسرار لطائف اور غوامض حقائق
پر تقریر کروں، تو میں ان تمام کا احاطہ کروں گا
اور اگر میں علم شرائع ونبوات پر بحث کروں
تو میں اس میدان کا مرد اور
اس کے خزانوں کا وارث ہوں ہی۔ چنانچہ
میں ایسی عجیب وغریب باتیں کہوں گا کہ
نہ ان کا شمار ہو سکے، اور نہ ان کی حقیقت
کا احاطہ ممکن ہو،

اور اللہ تعالیٰ کے کتنے مخفی لطف وکرم
ہوتے ہیں کہ ایک ذہین وفہیم آدمی کے
ذہن میں بھی وہ نہیں آسکتے۔

ایک اور موقعہ پر کہتے ہیں۔

لماتمت بی دورۃ الحکمۃ

جب میرے لئے دورۂ حکمت

البسنی اللہ تعالی خلعۃ المجددیۃ فعلمت علم الجمع بین المختلفات" الخ

پیدا کر دیا گیا تو اللہ تعالی نے مجھے خلعت مجددیت پہنایا، پس مجھے اختلافی مسائل میں جمع و تطبیق کا علم حاصل ہو گیا۔

اس باب میں ان کے اشارات بے شمار ہیں۔ علی الخصوص تفہیمات ہیں کہ متعدد رسائل و مقالات اسی مقام کی شرح و تحقیق میں لکھے ہیں۔ اور ان سب کے آخر میں ذوق باطن کے التہاب و اضطراب سے بے خود ہو کر اپنے معاملات کی طرف بھی اشارہ کر جاتے ہیں، گویا ابو العلا معری کا یہ شعر جا بجا نئے پیرایوں میں ان کی زبانِ مترنم اور کلکِ تحدیث تک آ آ کر رہ جاتا ہے۔

وانی وان کنت الاخیر زمانہ
لاتٍ بما لم تستطعہ الاوائل!

(تذکرہ صـ۲۶۸ تا ۲۷۰)

اور ایک دوسرے مقام پر فتنتین عظمتیں، یونانیت و عجمیت کو امت مسلمہ کی تمام اعتقادی و عملی و قلبی و ذہنی ضلالت اور تمام مفاسد و مصائب کی اصلی جڑ قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"اور اسی لئے مدتوں تک غور کرنے کے بعد یہ حقیقت کھلی کہ امت اسلامیہ کے تمام مفاسد و مصائب کی اصلی جڑ دو ہی چیزیں ہیں جن کو "یونانیت" اور "عجمیت" سے تعبیر کرنا چاہیئے۔ سارے برگ و بار و ثمراتِ فساد کو انہی سے ظہورِ نمو ہوا آج ہمارے مدارس میں جو علوم باسم اصل و اساس علوم شرعیہ پڑھائے جاتے ہیں، اگر کسی صاحبِ حکمت کی نظرِ کیمیادی ان کی تحلیل و تفرید کرے، تو کھل جائے کہ کس قدر حصہ ان کا شریعت اصلیہ والدین الخالص سے مرکب ہے، اور کس قدر اسی فتنہ عالم آشوب یونانیت و عجمیت سے؟

"کوئی شے اس سے نہ بچی حتی کہ علماً علوم آلیہ و عربیت و بلاغت و بیان اور عملاً جزئیات اعمال و رسوم و ہیئات و معاشرت و غیر ذلک، جب یہ حال علوم شرعیہ بلکہ نام نہاد اصولیہ کا ہے،

تو پھران اساطیر اولام و دساتیر خزعبلات و ہفوات کا کیا پوچھنا جن کو بہ لقب شریف "معقولات" پکارا جاتا ہے؟ وان من العلم جہلاً۔

برعکس نہند نام زنگی کافور (تذکرہ ص ۲۱۵ حاشیہ)

لیکن اگر اس "ظلمات و بعضہا فوق بعض" میں مولانا آزاد کو کوئی روشنی کی کرن نظر آتی ہے تو وہ حجۃ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ رضی اللہ عنہ کی ذات گرامی ہے اور ذخائر عجائب و غرائب میں کوئی چیز قابل مطالعہ و نظر معلوم ہوتی ہے تو وہ صرف حضرت شاہ صاحبؒ کی محققانہ وانفع مصنفات! مولانا فرماتے ہیں۔

"ائمہ متاخرین میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ واصحابہ کے بعد حضرت شاہ ولی اللہؒ کی تنقیحات و تعقبات اس باب میں نہایت محققانہ وانفع واقع ہوئی ہیں - حجۃ اللہ البالغہ وغیرہ میں گو اشارات واجمال (ولکن ابلغ من التصریح) سے کام لیتے ہیں، لیکن التفہیمات الالہیہ اور خیر کثیر اور البدور البازغہ میں بالکل پردہ اٹھا دیا ہے - صرف یہی نہیں کرتے کہ ان علوم مخلوطہ کو "فن دانشمندی" کے حوالے کر کے باقی معاملات ذوق سلیم پر چھوڑ دیں یا "تشکیکات خام معقولیاں" کہہ کر خاموش ہو جائیں، بلکہ صاف صاف اور بے پردہ لکھتے ہیں - ایک تفہیم میں اس پر مفصل بحث کی ہے۔

در علوم شرعیہ پسینیاں چیزہا آوردند	متاخرین نے علوم شرعیہ میں بہت سی ایسی
کہ مقصود و معلوم پیشنیاں نہ بود، بلکہ در	چیزیں شامل کر دیں، جو نہ سلف کا مقصود
سلف امت ازاں اثرے یافتہ نمی شود	تھیں بلکہ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا
جموع کثیرہ فلسفہ و حکمت یونانیاں را با علم	اور نہ سلف امت میں ان چیزوں کا کوئی
شریعت آمیختند - واصول کتاب و ماثور	اثر و نشان ہی پایا جاتا ہے۔
را از دست دادہ، تا آنکہ ظاہر شریعت	اکثر نے یونانیوں کے فلسفہ و حکمت کو
بنا بر کثرت ایراد و انصراف و تحریف و	علم شریعت کے ساتھ ملا دیا اور کتاب و
تخلیط چیزے دیگر گردیدہ علم اصول دین	سنت کو چھوڑ دیا - یہاں تک کہ شریعت

را کہ افضل علوم اسلام است، ببیں کہ متکلمین درآں چہ صنائع وبدائع آفریدند، ودر وادئ جدل وتعمق تابکجا رسیدند؟ حالانکہ سلف امت نکیر عظیم داشتند بریں جنس کلام وآنرا خارج از شریعت پنداشتند۔ ودر کتب فقہ وفتاوی تامل کن کہ دامن رائے وتفریع را تا بکجا کشیدند، واز اصل اصول شرع واثر ست چہ قدر دوری جستہ واہچنیں حال دیگر علوم دیں است کہ بسبب خلط با فنون وصنائع رنگ و صوت دیگر پیدا نمودہ۔"

کثرت رائے، بحث وجدل وانحراف اور تحریف وآمیزش سے بالکل ایک دوسری ہی چیز بن کر رہ گئی اور علم عقائد دین کہ علوم اسلامیہ میں افضل علوم ہے، دیکھئے کہ متکلمین نے اس میں کیا کیا گل افشانیاں کی ہیں اور وادئ جدل وتعمق اور نکتہ آفرینی کے شوق میں بھٹک کر کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ حالانکہ سلف امت اس قسم کی باتوں سے سخت نفرت کرتے تھے۔ اور اس کو شریعت سے خارج قرار دیا تھا۔ اور کتب فقہ وفتاوی میں غور کرو کہ انہوں نے دامن رائے وتفریع کو کس قدر کھینچ دیا اور اصول شریعت وسنت سے کس قدر دور نکل گئے؟ اور یہی حال دوسرے علوم دینیہ کا ہے کہ دوسرے فنون وصنائع سے اختلاط کے باعث ان کا رنگ روپ بالکل بدل گیا۔

(تذکرہ ص۲۱۵، ۲۱۶ حاشیہ)

اور پھر غور فرمائیے کہ حضرت شاہ صاحب کی نظرِ تجدید وصدق فہم اور نفوذ ذہن پر مولانا آزاد کس طرح اظہار تحسین ومسرت اور اعتراف فضل وکمال فرماتے ہیں۔

"اور سبحان اللہ! حضرت موصوف کی نظر تجدید اور صدق فہم اور نفوذ ذہن کہ ایک دوسرے موقع پر اس فتنہ کو من جملہ ثمرات ردیۂ نفاق کے قرار دیتے ہیں کما قال فی الفوز الکبیر۔ نفاق اول (یعنی بباطن

کفر و انکار و بظاہر شکل اسلام) بعد ازاں حضرت نتواں دانست اما نفاق ثانی (یعنی حدیث نفس و تشکیک و عدم یقین وایمان حقیقی) کثیر الوقوع ست - لاسیما در زمانِ ما- وازاں جملہ جماعت معقولیان کہ شکوک و شبہات بسیار می آرند (او کما قال)

یہ جو حضرت نے فرمایا۔

پسینیاں چیزہا آوروند کہ معلوم پیشنیاں نہ بود

تو یہ وہی حقیقت ہے جس پر تمام ائمہ سلف متفق ہوئے۔" (تذکرہ ص۲۱۶ حاشیہ)

حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کا خیال ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ کا اصل کارنامہ صرف تجدید و تدوین علوم و معارف اور تعلیم و تربیتِ اصحاب استعداد تک محدود رہا اور دعوت و اصلاح امت اور عملاً اجراء و نفاذ کا پورا کام کسی اور مرد میدان کا منتظر تھا اور معلوم ہے کہ توفیق الہی نے یہ معاملہ سلطان وقت و اسکندر عسزم حضرت شاہ اسمٰعیل شہید ابن شاہ عبدالغنی ابن حضرت شاہ ولی اللہ اور مجاہد کبیر و امیر المومنین حضرت سید احمد بریلوی شہیدؒ تلمیذ رشید و فیض یافتہ حضرت شاہ عبدالقادر و حضرت شاہ عبدالعزیز ابناء حضرت شاہ ولی اللہ کے لئے مخصوص تھا، اس میں حضرت شاہ صاحبؒ کا حصہ نہ تھا۔ حضرت مولانا آزاد کے بقول حضرت علامہ و مجدد شہید رضی اللہ عنہ کا یہ وہ کارنامہ ہے جو ان کے لئے خاص تھا۔ اور اگر خود شاہ صاحب بھی اس وقت ہوتے تو انہی کے جھنڈے کے نیچے نظر آتے - اگرچہ اس مسئلہ کا ہر پہلو حضرت شاہ صاحب کا سلسلہ تعلیم و تربیت' ان کے ابناء عظیم اور فیض یافتگان' خانوادہ حضرت ایشاں کا ہر فرد صاحب علم و نظر اور فضل و کمال ظاہری و باطنی کا حامل' بنابریں مستحق صد التفات و توجہ! لیکن اس مضمون کو میں مولانا کے ان الفاظ پر ختم کرتا ہوں جس میں حضرت مجدد اسمٰعیل شہیدؒ کے عظیم الشان کارنامے اور ان کے مقام عزیمت و استقامت کا اعتراف بھی ہے اور حضرت شاہ ولی اللہ فاتح دور آخر و سلطان عصر کے مقام و مرتبہ اور ان کے کارنامہ تعلیم و تربیت و تجدید دین و تدوین علوم و معارف عالیہ و اسلامیہ کی طرف اشارہ بھی ہے :-

شاہ صاحبؒ نے مزاج وقت کے عدم تحمل و استعداد سے مجبور ہو کر بحکم

بہ رمز نکتہ ادا می کنم کہ خلوتیاں
سر سبو بکشادند و در فرو بستند

دعوت و اصلاح امت کے جو بھید پرانی دہلی کے کھنڈروں اور کوٹلہ کا حجروں میں دفن کر دیئے تھے، اب اس سلطانِ وقت و اسکندرِ عزم کی بدولت شاہ جہاں آباد کے بازاروں اور جامع مسجد کی سیڑھیوں پر ان کا ہنگامہ مچ گیا، اور ہندوستان کے کناروں سے بھی گذر کر نہیں معلوم کہاں کہاں تک چرچے اور افسانے پھیل گئے۔ جن باتوں کے کہنے کی بڑوں بڑوں کو بند حجروں کے اندر بھی تاب نہ تھی، وہ اب برسرِ بازار کی جا رہی اور ہو رہی تھیں۔ اور خونِ شہادت کے چھینٹے حرف و حکایات کے نقوش و سواد بنا کر صفحۂ عالم پر ثبت کر رہے تھے

آخر تو لائیں گے کوئی آفت فغاں سے ہم
حجت تمام کرتے ہیں آج آسماں سے ہم

(تذکرہ صـ ۲۷۱)

اٹھارہویں صدی کے اواخر میں جب نپولین نے مصر پر حملہ کیا، تو مراد بک نے جامعہ ازہر کے علماء کو جمع کر کے ان سے مشورہ کیا کہ اب کیا کرنا ہے۔ علمائے ازہر نے بالاتفاق یہ رائے دی کہ جامعہ ازہر میں صحیح بخاری کا ختم شروع کر دینا چاہیئے کہ انجام مقاصد کے لئے تیر بہدف ہے چنانچہ ایسا ہی کیا گیا لیکن ابھی صحیح بخاری کا ختم ختم نہیں ہوا تھا کہ اہرام کی لڑائی نے مصری حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ انیسویں صدی کے اوائل میں جب روسیوں نے بخارا کا محاصرہ کیا تو امیر بخارا نے حکم دیا کہ تمام مدرسوں اور مسجدوں میں ختم خواجگان پڑھا جائے۔ ادہر روسیوں کی قلعہ شکن توپیں شہر کا حصار منہدم کر رہی تھیں اور ادہر لوگ ختم خواجگان کے حلقوں میں یا "مقلب القلوب یا محول الاحوال" کے نعرے بلند کر رہے تھے۔ بالآخر وہی نتیجہ نکلا جو ایک ایسے مقابلہ کا نکلنا تھا، جس میں ایک طرف گولہ بارود ہو اور دوسری طرف ختم خواجگاں۔

(مولانا ابوالکلام آزاد)

تعبیر کی غلطی[1]

(جماعت اسلامی کا جائزہ)

زیر نظر کتاب "تعبیر کی غلطی" کے مصنف جناب وحید الدین خاں ہیں، جو ہندوستان کی جماعت اسلامی سے پندرہ سال تک متعلق رہے، پھر کافی غور و خوض اور مولانا مودودی صاحب اور جماعت اسلامی ہند کے بعض ممتاز بزرگوں اور علماء سے گفت گو اور خط و کتابت کرنے کے بعد انہوں نے ۱۵ اکتوبر ۱۹۶۲ء جماعت سے استعفیٰ دے دیا۔ جو چھ ماہ بعد منظور ہوا۔ اس آخری فیصلہ کرنے میں موصوف کو چار سال لگے، اس دوران میں انہیں جماعت کے آرگن رسالہ "زندگی" رام پور کی ادارت کے لئے مجلس شوریٰ نے نامزد کیا، لیکن خود ان کے الفاظ میں "میں نے صرف اس بنیاد پر اس کو قبول کرنے سے معذوری ظاہر کی کہ جماعت کی فکر سے مختلف فکر رکھتے ہوئے میں اپنے لئے اس کو صحیح نہیں سمجھتا تھا کہ جماعت کے آرگن میں ایڈیٹر کی ذمہ داری قبول کروں" جماعت اسلامی سے وحید الدین خاں صاحب کا نظری اختلاف جس طرح شروع ہوا۔ اور وہ جن جن

---

[1] کوہ نور پریس، لال کنواں دہلی سے یہ کتاب تبصرے کے لئے ہمیں ملی ہے اس مضمون میں صرف اس کتاب کے تبصرے پر اکتفا نہیں کیا گیا، بلکہ کتاب کے مطالب کا ایک مختصر خلاصہ بھی دے دیا ہے اس کتاب کا نہ صرف ہندوستان بلکہ پاکستان کے بھی دینی و علمی حلقوں میں بڑا چرچا ہے اور اسے بڑی اہمیت دی جا رہی ہے۔ (مدیر)

مراحل سے گزرا، زیرِ نظر کتاب میں اسے قدرے تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، محض مصنف کی زبان سے نہیں بلکہ اس ضمن میں جماعت کے ذمہ دار حضرات سے ان کی جو خط و کتابت ہوئی اسے بھی من و عن نقل کر دیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ کتاب جماعت اسلامی سے اس کے ایک اہم رکن کے نظری اختلاف کے بارے میں ایک دستاویزی حیثیت رکھتی ہے، اس لئے خاص توجہ کی مستحق ہے۔

آغازِ اختلاف مصنف کے الفاظ میں یوں ہوا:۔

"میں تقسیم ہند کے بعد نومبر ۱۹۴۷ء میں جماعت اسلامی کی تحریک سے متاثر ہوا۔ اور دس سال تک پوری یکسوئی کے ساتھ اس سے مل کر کام کرتا رہا۔ یہ وقت تھا جب کہ اس کے بہت سے دیگر افراد کی طرح میں سمجھتا تھا کہ مجھ کو آخری صداقت کا علم ہو گیا ہے اس زمانے میں زیادہ تر جماعت کے عملی کاموں میں مشغول رہا۔ اور جماعت کے مخصوص لٹریچر کے علاوہ دیگر چیزوں کے مطالعہ کی طرف بہت کچھ توجہ نہ دے سکا۔ اس کے بعد ایک ایسا وقت آیا جب بعض اسباب نے مجھے یکسوئی کے ساتھ مطالعہ کے مواقع فراہم کر دیئے۔ خاص طور پر دو سال کا بیشتر وقت میں نے قرآن پڑھنے اور اس کے مطالب پر غور و فکر کرنے پر صرف کیا۔ اس وقت پہلی بار میں نے محسوس کیا کہ اس فکر پر میرا یقین متزلزل ہو رہا ہے قرآن کے مطالعہ کے دوران میں شدت سے مجھ پر یہ احساس طاری ہوا کہ قرآن میرے اس تصورِ دین کی تصدیق نہیں کر رہا۔ جس کو میں اب تک اسلام کا صحیح ترین تصور سمجھ رہا تھا۔"

جماعت اسلامی سے وحیدالدین خاں صاحب کے نظری اختلاف کی یہ گویا ابتدا تھی اس سے پہلے وہ جماعت کے پیش کردہ تصورِ دین کو اسلام کا صحیح ترین تصور سمجھتے تھے، لیکن دو سال تک خاص طور پر قرآن کے مطالعہ اور اس کے مطالب پر غور و فکر کرنے کے بعد جب انہوں نے اپنے اس یقین کو متزلزل ہوتا محسوس کیا تو ساتھ ہی انہوں نے اپنے اس تزلزل کے مداوا کی کوششیں بھی شروع کر دیں۔ چنانچہ اس بارے میں وہ لکھتے ہیں:۔

"خوش قسمتی سے اس زمانے میں جماعت اسلامی کے شعبۂ تصنیف و تالیف سے متعلق ہونے کی وجہ سے میں جماعت کے مرکزی دفتر (رام پور) میں مقیم تھا۔ اور اسی کے ساتھ چونکہ میں اس کی مرکزی مجلس شوریٰ

کارکن تھا، اس لئے جماعت کے انتہائی منتخب افراد سے ملنے جلنے کے مواقع بھی مجھے حاصل تھے چنانچہ میں نے اپنی ذہنی کشمکش کے سلسلے میں تحریک کے اوپر کے افراد اور مرکزی شخصیتوں سے تبادلہ خیال شروع کیا۔ مگر طویل مدت کے غور و فکر اور بحث و گفتگو کے بعد بالآخر میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اس فکر کی طرف سے زبانی یا تحریری طور پر اب تک جتنے بھی دلائل دیئے گئے ہیں ان میں سے کوئی ایک بھی۔ کم از کم میرے علم و فہم کی حد تک۔ ان سوالات کو رفع نہیں کرتا (جنہوں نے) مجھے موجودہ حالت تک پہنچایا ہے۔"

جماعت کے منتخب افراد سے تبادلۂ خیال کے دوران جو طویل مدت تک ہوتا رہا، وحید الدین خاں صاحب کی کیا ذہنی و نفسیاتی کیفیت تھی اس کا اندازہ مندرجہ ذیل ایک واقعہ سے ہوتا ہے۔ موصوف لکھتے ہیں۔

"لفافہ کھول کر میں نے مولانا صدر الدین[1] صاحب کے جواب کی سرخی دیکھی۔ لکھا ہوا تھا "تعبیر کی غلطی کا ایک اجمالی جائزہ" جی چاہا کہ فوراً پڑھنا شروع کر دوں۔ مگر مجھے اپنا وہ عہد یاد آیا جو میں نے اپنے خدا سے کیا تھا میں فوراً اٹھا، کتابیں الماری میں رکھیں۔ کمرہ بند کیا۔ اور قریب کی مسجد میں جا کر وضو کیا۔ دو رکعت نماز پڑھی اس کے بعد بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ دعا کی:۔

> خدایا! جو کچھ تیرے نزدیک حق ہے، اس کو مجھ پر واضح کر دے۔ میں پناہ مانگتا ہوں کہ اپنی عقل کے پیچھے بھٹکتا رہوں۔ یقیناً ایک روز ایسا آنے والا ہے جب تیرے فرشتے ایسے فرشتے جن کو میں لوٹا نہیں سکتا، میرے پاس آئیں گے اور مجھ کو پکڑ کر تیرے پاس حاضر کر دیں گے خدایا اس روز تو مجھ سے جو کچھ چاہے گا، وہ مجھ کو آج ہی بتا دے۔ پردہ اٹھنے کے بعد میں جو کچھ دیکھوں گا وہ آج ہی مجھے دکھا دے۔

میں نے عہد کیا تھا کہ جب صدر الدین صاحب کا تبصرہ مجھے ملے گا، تو پہلے میں دو رکعت نماز پڑھ کر خدا سے دعا

---

[1] موصوف (مولانا صدر الدین صاحب اصلاحی) امیر جماعت اور پوری مجلس شوریٰ کے متفقہ فیصلہ کے مطابق خاص طور پر میری تحریر کا جواب تیار کرنے کے لئے مامور کئے گئے تھے۔ اور ان سے کہا گیا تھا کہ اگر وہ ضرورت سمجھیں تو چار مہینے کا اپنا پورا وقت دے کر اس کا مکمل اور مفصل جواب لکھیں" (مصنف)

کروں گا۔ اور پھر اس کا مطالعہ کروں گا۔ چنانچہ اس عہد پر عمل کر لینے کے بعد اب میں نے اصل تحریر پڑھنی شروع کی اور اس کو پہلی فرصت میں ختم کر ڈالا۔ اس کے بعد اس کو بار بار پڑھا۔ اس پر نوٹ تیار کئے، اس میں جو حوالے تھے، ان کو نکال کر دیکھا یہاں تک کہ تحریر ملنے کے چوتھے دن یعنی ۲ اگست کو میرے ذہن نے فیصلہ کر دیا کہ یہ تحریر نہایت ناقص ہے اپنے خیالات پر میرا یقین بڑھ گیا۔ اور میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس تبصرہ کے ذریعہ اس نے میرے ذہن کی مزید صفائی اور میرے خیالات کی مزید وضاحت کا انتظام کر دیا۔"

مولانا صدرالدین اصلاحی کے علاوہ امیر جماعت اور شوریٰ کے ارکان کی خواہش پر مصنف کی اس تحریر[1] کی ایک ایک نقل مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور مولانا جلیل احسن ندوی کی خدمت میں بھی بھیجی گئی۔ "مولانا مودودی کی اہمیت اس لحاظ سے ہے کہ جماعت اسلامی جس فکر کی بنیاد پر اٹھی ہے اس فکر کے پیدا کرنے والے دراصل وہی ہیں۔ اور مولانا جلیل احسن ندوی کی اہمیت اس اعتبار سے ہے کہ وہ جماعت کے حلقے میں اس حیثیت سے ایک نمایاں شخص ہیں کہ انہوں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ قرآن کے مطالعہ میں صرف کیا ہے۔ اور آج بھی قرآن کے استاد کی حیثیت سے ان کے بہترین اوقات کا مصرف یہی کتاب ہے۔ اس لئے اس سلسلے میں ان کی رائے بہت اہمیت رکھتی ہے۔"

مولانا مودودی مولانا صدرالدین اور مولانا جلیل احسن ندوی سے اپنے ان شکوک کے بارے میں مصنف کی جنہیں انہوں نے اپنی تحریر "تعبیر کی غلطی" میں منضبط کر دیا تھا، جو خط و کتابت ہوئی زیر نظر کتاب میں وہ شامل کر دی گئی ہے۔ اور اس ضمن میں جماعت اسلامی کے ذمہ دار بزرگ جو کچھ کہنا چاہتے تھے، ان کا نقطۂ نظر بھی کتاب میں آگیا ہے۔

مصنف نے "تعبیر کی غلطی" میں جو سوالات اٹھائے ہیں وہ مختصراً یہ ہیں۔

۱۔ مولانا مودودی نے "اپنی حد تک ایک ایسی تشریح بھی ڈھونڈ نکالی، جس میں دین ایک ہم آہنگ کل (INTERRELATED WHOLE) کی شکل میں نظر آنے لگا۔ مولانا مودودی کا کام اپنے خارجی

---

[1] تعبیر کی غلطی

استعمال کے لحاظ سے اسلام کی دعوت ہے اور اپنی علمی نوعیت کے اعتبار سے دین کی حکیمانہ توجیہ ہے۔ فی الحقیقت ان کے کام کی یہی دوسری خصوصیت ہے، جس نے موجودہ دور کے بہت سے لوگوں کے لئے ان کے خیالات میں کشش پیدا کردی۔ اور انہوں نے لپک کر اسے قبول کرلیا۔"

مولانا نے دین کے اس "ہم آہنگ کل" کی پوری عمارت "نظام" کے تصور پر، یعنی اسلام زندگی کا ایک مکمل اور مفصل نظام ہے" اٹھائی۔ اور یہی ان کے فکر کی بنیادی غلطی ہے بقول مصنف اس (فکر) نے دین کی جو تصویر بنائی، اس میں اجزا تو سب وہی استعمال کئے جو کسی نہ کسی اعتبار سے دین کے اجزا تھے مگر جس کلی تصور کے تحت انہیں ایک مجموعہ میں ترتیب دیا گیا، وہ تصور صحیح نہیں تھا۔" اور پھر یہ تصور اتنا ہمہ گیر ہے کہ اس کے ایک مبلغ کے الفاظ میں "۔ اسلام ایک نظام حیات ہے، جو زندگی کے سارے انفرادی و اجتماعی اور مابعد الطبیعی مسائل کو ایک وحدت میں پرو دیتا اور سب کو عقل و فطرت کے مطابق حل کرتا ہے"

یہ تصور کیوں صحیح نہیں، اس کی وضاحت مصنف یوں کرتے ہیں:۔ "دین کا ایک نظام ہونا بذات خود غلط نہیں ہے۔ مگر جب نظام کے تصور کو یہ حیثیت دی جائے کہ یہی وہ سبب جامع ہے جو اس کے متفرق اجزا کو ایک کل میں سموتا ہے، تو یقیناً غلط ہو جاتا ہے اور یہی اس فکر کی اصل غلطی ہے۔ یہ فکر دین کا مطالعہ اس حیثیت سے کرتی ہے کہ وہ زندگی کا ایک "نظام" ہے اس کے نزدیک وہ مجموعی تخیل جس کے تحت پورے دین کو سمجھا جاسکتا ہے، وہ اس کا نظام ہوتا ہے۔ حالانکہ دین کی حیثیت یہ ہے کہ وہ خدا اور بندے کے درمیان تعلق کا عنوان ہے، دین محض ایک قانونی نظام نہیں ہے جیسے دوسرے نظام ہوا کرتے ہیں بلکہ وہ خدا سے نفسیاتی تعلق کا ایک ظہور ہے۔ عمل میں آنے کے بعد بے شک دین میں وہ ساری چیزیں شامل ہو جاتی ہیں، جن کے مجموعے کو "نظام حیات" کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مگر دین کا نظام ہونا حقیقت دین کا ایک مظہر ہے۔ یہ اس کی اضافی حیثیت ہے نہ کہ اصل حقیقت"۔

جماعت اسلامی کی طرف سے دین اسلام کا یہ جو نظریہ پیش کیا گیا ہے، مصنف لکھتے ہیں کہ "یہ نہ تو قرآن کی آیات پر چسپاں ہوتا ہے اور نہ صلحائے امت کی زندگیاں اس کے "معیار" پر پوری اترتی ہیں۔ دین کا وہ مخصوص نقشہ جو اس فکر کے نزدیک دین کا صحیح ترین نقشہ ہے، اس کے حق میں سارے قرآن میں کوئی بھی

صریح آیت موجود نہیں ...... یہ اس استدلال کی نظریاتی خامی ہوئی۔ اسی طرح عملی اعتبار سے دیکھئے تو امت کی ساری تاریخ میں کوئی بھی ایسا شخص نظر نہیں آتا، جس نے اس ڈھنگ پر "جامع انقلابی تحریک" چلائی ہو۔ دنیا کے بے شمار علاقوں میں مسلمان پھیلے اور ہر جگہ انہوں نے دعوت دین کا کام کیا، جن میں بہت سے مقامات پر بعد کو اسلام کی حکومتیں بھی قائم ہوئیں، مگر کہیں بھی ایسا نہیں ہوا کہ انہوں نے اسلامی انقلاب برپا کرنے یا "حکومت الہیہ" قائم کرنے کی دعوت کے ساتھ اپنے کام کا آغاز کیا ہو..... اب اگر کوئی شخص کہتا ہے کہ ان تمام لوگوں کی دعوت ادھوری تھی یا ان کو پورے دین کا شعور نہیں تھا تو ایسی ہر تاویل محض اپنی غلطی کا اعتراف ہو گی۔ کیونکہ اسلام کی پوری دعوتی تاریخ کو ناقص ماننے سے زیادہ بہتر یہ ہے کہ ہم ایک شخص کے خیالات کو ناقص مان لیں"۔

۲۔ مولانا مودودی نے اپنے دینی تصور کو سب سے زیادہ واضح اور مربوط شکل میں اپنی کتاب "قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں" میں پیش کیا ہے۔ "اس کتاب میں قرآن کے چار بنیادی الفاظ — الٰہ، ربّ، عبادت اور دین کی تشریح کی گئی ہے۔ اور ثابت کیا گیا ہے کہ انہیں چار الفاظ میں وہ ساری انقلابی دعوت چھپی ہوئی ہے، جو زیر بحث تعبیر نے پیش کی ہے۔ مولانا کا کہنا یہ ہے کہ مسلمانوں کے ہاں ان چاروں الفاظ کے معانی بدل گئے۔ چنانچہ ان کے نزدیک "نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن کا اصل مقصود ہی سمجھنا لوگوں کے لئے مشکل ہو گیا .... پس یہ حقیقت ہے کہ محض ان چار بنیادی اصطلاحوں کے مفہوم پر پردہ پڑ جانے کی بدولت قرآن کی تین چوتھائی سے زیادہ تعلیم بلکہ اس کی حقیقی روح نگاہوں سے مستور ہو گئی ہے۔ اور اسلام قبول کرنے کے باوجود لوگوں کے عقائد و اعمال میں جو نقائص نظر آ رہے ہیں ان کا ایک بڑا سبب یہی ہے ...."

مولانا نے قرآن کی ان چار بنیادی اصطلاحوں کی جو تشریح کی ہے۔ اور جو ان کے نزدیک "قرآن مجید کی مرکزی تعلیم اور اس کے حقیقی مدعا کو واضح کرنے کے لئے نہایت ضروری ہے" مصنف نے ان پر بڑی تفصیل سے تنقید کی ہے۔ اور ثابت کیا ہے کہ مولانا نے جن آیات سے اپنی ان اصطلاحوں کا مفہوم اخذ کیا ہے وہ آیات سرے سے اس مفہوم کی حامل ہیں ہی نہیں۔

اس ضمن میں مصنف لکھتے ہیں :- "یہاں میں صرف ایک مثال درج کرتا ہوں۔ اس کتاب میں "ربّ"

کے پانچ مفہومات میں سے تیسرا مفہوم "اجتماع کا مرکز" بتایا گیا ہے (صفحہ ۶۳) یعنی "جو مرکزی حیثیت رکھتا ہو جس پر متفرق اشخاص مجتمع ہوتے ہوں" صفحہ (۲۹) جس کا "مرکزی اقتدار مملکت کی تمام رعیت کے لئے اجتماع کی بنیاد ہو" (صفحہ ۴۰) "جس کی مرکزی شخصیت کسی سرزمین کے تمدن واجتماع کی اساس ہو" (صفحہ ۵۱) اصولاً مجھے اس سے اختلاف نہیں کہ خدائے واحد پر ایمان ہی وہ مشترک تصور ہے جو مسلمانوں کو ایک امت ہونے کا احساس دلاتا ہے .... مگر مذکورہ بالا قسم کے اجتماعی اور تمدنی تصور کو رب کے "تیسرے مفہوم" کی حیثیت سے ثابت کرنے کے لئے جو حوالے دیئے گئے ہیں، وہ سب کے سب اصل مسئلہ سے بالکل غیر متعلق ہیں ان میں سے کسی ایک حوالے سے بھی یہ "تیسرا مفہوم" ثابت نہیں ہوتا۔

یہ کُل پانچ آیتیں ہیں، جن میں سے پہلی آیت یہ ہے۔

هُـو ربکم والیه ترجعون (وہی تمہارا رب ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے) یہ سورۂ ہود کی آیت ہے۔ اور اس میں جس رجوع الی الرب کا ذکر ہے۔ اس کا تعلق آخرت سے ہے نہ کہ دنیا سے ..... دوسری آیت یہ ہے۔ ثمّ الی ربکم مرجعکم (پھر تمہارا لوٹنا خدا کی طرف ہے) ..... اس آیت میں جس "مرجعیت" کا ذکر ہے، اس کا تعلق آخرت سے ہے، کہا گیا ہے کہ دنیا کی زندگی میں اگر تم شکر گزار بندے بنوگے تو اللہ تعالیٰ تم سے راضی ہوگا اور اگر تم نے کفر کا رویہ اختیار کیا، تو کفر کر کے تم کہیں جا نہیں سکتے۔ تمام لوگوں کو بالآخر خدا ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے وہ تمہارے دلوں تک سے باخبر ہے اور وہ ہر ایک کو پورا پورا بدلہ دے گا۔ اس "لوٹنے" اور اپنے عمل سے "خبردار" کئے جانے کا دنیا کی سماجی تنظیم سے کیا تعلق۔

تیسری آیت یہ ہے۔ قل یجمع بیننا ربنا (کہو ہم کو ہمارا رب جمع کرے گا) اس آیت میں بھی جس "اجتماع" کا ذکر ہے، وہ آخرت کا اجتماع ہے۔... چوتھی آیت یہ ہے۔ ثمّ الی ربھم یحشرون (پھر وہ سب اپنے رب کی طرف سمیٹے جائیں گے) اس آیت کا بھی تمدنی حشر سے کوئی تعلق نہیں.... پانچویں آیت یہ ہے۔ ونفخ فی الصور فاذا ھم من الاجداث الی ربھم ینسلون (اور جوں ہی صور پھونکا گیا۔ وہ سب اپنی قبروں سے اپنے رب کی طرف نکل پڑیں گے)، یہ آیت بھی ظاہر ہے آخرت کے متعلق ہے۔ اس میں اس اجتماع کا ذکر ہے جب لوگ دوبارہ زندہ کئے جائیں گے اور اپنی قبروں سے اٹھ کر خدا کے حضور

اکٹھا کئے جائیں گے - میدان حشر کے اس اجتماع سے سماجی زندگی کے لئے مرکزِ اجتماع کا مفہوم نکالنا ایسا ہی ہے جیسے "قرآنی نظام ربوبیت" کے علم بردار جنت کی زندگی سے متعلق آیتوں (مثلاً طٰہٰ - ۱۹ - ۱۱۸) کو پیش کر کے اس سے کھیت اور کارخانوں کی ریاستی ملکیت کا اصول ثابت کرتے ہیں۔"

یہ تو چار بنیادی اصطلاحوں میں سے صرف ایک اصطلاح سے متعلق ایک "مفہوم" کا ذکر ہوا۔ اسی طرح مولانا مودودی نے دوسری اصطلاحوں کے مفہوم بھی ایسی آیات سے اخذ کئے ہیں، جن کا ان مفہومات سے کوئی تعلق نہیں مصنف نے اس پر بھی مفصل بحث کی ہے۔ اور زیر بحث آیات پیش کی ہیں۔

۳ - جماعت اسلامی کی ابتدائی تاسیس کے وقت اس کا نصب العین یہ متعین ہوا تھا۔

"جماعت اسلامی کا نصب العین اور اس کی تمام سعی و جہد کا مقصود دنیا میں حکومت الٰہیہ کا قیام اور آخرت میں رضائے الٰہی کا حصول ہے۔"

اور دستور میں اس کی یہ تشریح کی گئی تھی:- "اس سے مراد اللہ کی شرعی حکومت کا قیام ہے، جس کا تعلق انسان کی زندگی کے اس حصے سے ہے، جس میں اللہ نے انسان کو اختیار عطا کیا ہے" اس ضمن میں "مومن کی زندگی کا مشن" یہ بتایا گیا ہے کہ "جس طرح خدا کا قانونِ تکوینی تمام کائنات میں نافذ ہے اسی طرح خدا کا قانون شرعی بھی عالم انسانی میں نافذ ہو" یوں تو یہ کام فی الاصل ترغیب و تبلیغ ہی سے کرنے کا ہے لیکن "جو لوگ ملک خدا کے ناجائز مالک بن بیٹھے ہیں ... وہ عموماً اپنی خداوندی سے محض نصیحتوں کی بنا پر دست بردار نہیں ہو جایا کرتے اس لئے مومن کو عموماً جنگ کرنی پڑتی ہے تاکہ حکومت الٰہیہ کے قیام میں جو چیز سدِ راہ ہو، اسے راستے سے ہٹا دیا جائے۔"

ملک کی تقسیم کے بعد ہندوستان کی جماعت اسلامی نے "دنیا میں حکومت الٰہیہ کا قیام" کی جگہ "دنیا میں اقامت دین (اللہ تعالے کے دین کو قائم کرنا)" کے الفاظ رکھے ہیں اور اپنے دستور میں اس کی وضاحت یوں کی ہے:- "یہ دین انسان کے ظاہر و باطن اور اس کی زندگی کے تمام انفرادی و اجتماعی گوشوں کو محیط ہے۔ عقائد عبادات اور اخلاق سے لے کر معیشت، معاشرت اور سیاست تک انسانی زندگی کا کوئی ایک شعبہ بھی ایسا نہیں ہے جو اس کے دائرہ سے خارج ہو...... اس دین کی اقامت کا مطلب یہ ہے کہ کسی تفریق و تقسیم کے بغیر اس پورے

دین کی مخلصانہ پیروی کی جائے اور ہر طرف سے یک سو ہو کر کی جائے۔ اور انسانی زندگی کے انفرادی و اجتماعی گوشوں میں اسے اس طرح جاری و نافذ کیا جائے کہ ـــــ فرد کا ارتقا، معاشرہ کی تعمیر اور ریاست کی تشکیل سب کچھ اسی دین کے مطابق ہو۔"

مصنف اوپر کے اقتباسات دینے کے بعد لکھتے ہیں کہ "یہی بات اس فکر کے تحت پیداشدہ لٹریچر میں بار بار مختلف انداز سے دہرائی گئی ہے"۔ ایک اور اقتباس ہے جس میں مولانا مودودی نے لکھا ہے:۔ "یہ مذہبی تبلیغ کرنے والے واعظین اور مبشرین کی جماعت نہیں، بلکہ خدائی فوجداروں کی جماعت ہے اور اس کا کام یہ ہے کہ دنیا سے ظلم، فتنہ و فساد، بداخلاقی طغیان اور ناجائز انتفاع کو بزور مٹا دے۔ ارباب من دون اللہ کی خداوندی کو ختم کردے اور بدی کی جگہ نیکی قائم کرے۔ لہٰذا اس پارٹی کے لئے حکومت کے اقتدار پر قبضہ کئے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔"

اس فکر کی طرف سے اپنے نصب العین، دستور اور مقاصد کی اساس قرآن مجید کی یہ آیت بتائی گئی ہے۔

هو الذی ارسل رسوله بالهدیٰ ودین الحق لیظهره علی الدین کله ولو کره المشرکون۔

اور اس کی وضاحت یوں کی گئی ہے۔

"اس آیت میں الھدیٰ سے مراد دنیا میں زندگی بسر کرنے کا صحیح طریقہ ہے، انفرادی برتاؤ، خاندانی نظام سوسائٹی کی ترکیب، معاشی معاملات، ملکی انتظام، سیاسی حکمت عملی، بین الاقوامی تعلقات، غرض زندگی کے تمام پہلوؤں میں انسان کی زندگی کے لئے صحیح رویہ کیا ہونا چاہیئے یہ چیز اللہ نے اپنے رسول کو بتا کر بھیجا ہے۔

"دوسری چیز جو اللہ کا رسول لے کر آتا ہے، وہ دینِ حق ہے۔ دین معنی اطاعت کے ہیں۔ کیش اور مذہب کے لئے جو دین کا لفظ استعمال ہوتا ہے، یہ اس کا اصل معنی موضوع لہٗ نہیں ہے بلکہ اس کو دین اس وجہ سے کہتے ہیں کہ اس میں بھی انسان خیال و عمل کے ایک خاص سسٹم کی اطاعت کرتا ہے۔ ورنہ دراصل دین کا لفظ قریب قریب وہی معنی رکھتا ہے، جو زمانہ حال میں "اسٹیٹ" کے معنی ہیں۔"

غرض اس فکر کے نزدیک دین بمعنی زمانۂ حال کے "اسٹیٹ" کے ہیں۔ اس کی مزید تشریح یوں کی جاتی ہے۔

"لوگوں کا کسی بالاتر اقتدار کو تسلیم کر کے اس کی اطاعت کرنا، یہ "اسٹیٹ" ہے۔ یہی دین کا مفہوم بھی ہے اور "دین حق" یہ ہے کہ انسان دوسرے انسانوں کی، خود اپنے نفس کی۔ اور تمام مخلوقات کی بندگی و اطاعت چھوڑ کر صرف اللہ کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرے۔ اور اسی کی بندگی و اطاعت اختیار کرے۔ پس درحقیقت اللہ کا رسول اپنے بھیجنے والے کی طرف سے ایک ایسے "اسٹیٹ" کا نظام لے کر آیا ہے، جس میں نہ تو انسان کی خود اختیاری کے لئے کوئی جگہ ہے۔ نہ انسان پر انسان کی حاکمیت کے لئے کوئی مقام۔ بلکہ حاکمیت و اقتدار اعلیٰ جو کچھ بھی ہے، صرف اللہ کے لئے ہے پھر رسول کے بھیجنے کا یہ مقصد بتایا گیا ہے کہ وہ اس نظام اطاعت (دین) اور اس قانونِ حیات (الھدیٰ) کو پوری جنس دین پر غالب کر دے۔ پوری جنس دین سے مراد یہ ہے کہ دنیا میں انسان انفرادی یا اجتماعی طور پر جن جن صورتوں سے کسی کی اطاعت کر رہا ہے وہ سب "جنس دین" کی مختلف انواع ہیں۔۔۔۔ یہ اور ایسی ہی دوسری بے شمار اطاعتیں بحیثیت مجموعی ایک نظام اطاعت بناتی ہیں اور اللہ کی طرف سے رسول کے آنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ پورا نظام اطاعت اپنے تمام اجزا سمیت ایک بڑی اطاعت اور ایک بڑے قانون کے ماتحت ہو جائے۔ تمام اطاعتیں اللہ کے تابع ہوں۔ ان سب کو منضبط (REGULATE) کرنے والا ایک اللہ ہی کا قانون ہو۔ اور اس بڑی اطاعت اور اس ضابطۂ قانون کی حدود سے باہر کوئی اطاعت باقی نہ رہے۔"

مختصراً مولانا مودودی کے الفاظ میں

"یہ رسول کا مشن ہے۔ اور رسول اس مشن کو پورا کرنے پر مامور ہے۔۔" اس موضوع پر مولانا کے طویل اقتباسات دینے کے بعد مصنف اس کا محاکمہ کرتے ہیں چنانچہ لکھتے ہیں۔۔۔۔ اسلامی مشن کا یہ تصور کہ اسلام ایک بہترین سیاسی اور تمدنی (نظام ہے۔ اور اس نظام کو جاری و نافذ کرنا وہ کام ہے جو خدا کی طرف سے ہمارے سپرد ہوا ہے یہ اسلامی مشن کا ایک ایسا تصور ہے، جس سے قرآن کے صفحات ناآشنا ہیں۔ مجھے کتاب الٰہی میں کوئی ایک فقرہ بھی ایسا نہیں ملا، جس سے اس نقطہ کو واقعی طور پر اخذ کیا جا سکتا ہو اس سلسلے میں جن آیتوں کے حوالے دیئے جاتے ہیں، ان کو اگلے صفحات میں نقل کر کے ان پر مختصر گفت گو کروں گا۔"

چنانچہ مصنف نے یہ آیتیں نقل کی ہیں۔ اور ان سے اپنے "اسلامی مشن" کے حق میں مولانا مودودی نے

جس طرح استدلال کیا ہے، پہلے مفسرین کے حوالے دے کر اس کی تغلیط کی ہے۔

" پہلی آیت ہے۔

وکذلک جعلنکم امۃ وسطاً لتکونوا شھداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیداً۔ اس آیت کو سمجھنے کے لئے جب ہم علمائے تفسیر کی طرف رجوع کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ تقریباً سب کے سب اس میں "شہادت" سے مراد ایک ایسا کام لیتے ہیں، جس کا تعلق اس دنیا سے نہیں، بلکہ آخرت سے ہے" اس ضمن میں مصنف نے علامہ آلوسی بغدادی اور ابو حیان اندلسی کی تشریحات پیش کی ہیں۔

" دوسری آیت جو اس سلسلے میں پیش کی جاتی ہے، حسب ذیل ہے۔

شرع لکم من الدین ما وصّی بہ نوحا والذی اوحینا الیک وما وصّینا بہ ابراھیم وموسیٰ وعیسیٰ ان اقیموا الدین ولا تتفرقوا فیہ۔ اس آیت سے یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ اس میں "الدین" سے مراد وہ سارے انفرادی و اجتماعی، قومی و بین الاقوامی احکام ہیں جو اسلامی شریعت میں ملتے ہیں۔ اور اقامت کا مطلب ہے ان کو قائم کرنا۔ اس طرح یہ آیت پورے شرعی نظام کو مکمل طور پر انسانی زندگی میں غالب و نافذ کرنے کا حکم دے رہی ہے"

بقول مصنف کے، "مگر یہ اس آیت کی ایسی تفسیر ہے جو میرے علم کی حد تک کسی قابل ذکر مفسر نے اب تک نہیں کی۔ تمام علمائے تفسیر اس آیت میں الدّین سے مراد اصل دین یا دین کی بنیادی تعلیمات لیتے ہیں کہ کل دین ان کے نزدیک اقامتِ دین سے مراد سارے شرعی نظام کو لوگوں کے اوپر قائم کرنا نہیں ہے، بلکہ دین کے اس بنیادی حصے کو پوری طرح اختیار کرنا ہے جو ہر شخص سے اور ہر حال میں لازمی طور پر مطلوب ہے اور جس کو اپنی زندگی میں پوری طرح شامل کر لینے کے بعد کوئی شخص خدا کی نظر میں مسلمان بنتا ہے (۔۔۔۔۔۔۔۔ سائر ما یکون المرء باقامتہ مسلماً ــــ مدارک التنزیل وغیرہا)"

پھر اقیموا الدین کے فقرے کا یہ مطلب کہ "دین کو غالب اور نافذ کرو" یا یہ کہ "اپنی ذات سے لے کر ساری دنیا تک اسے زندگی کے شعبوں میں جاری کرو" ہرگز نہیں ہے۔ اس سلسلے میں مصنف لکھتے ہیں۔

"چنانچہ (قرآن مجید کے) اردو مترجمین میں سے کسی ایک نے بھی اس کا ترجمہ "دین قائم کرو" نہیں کیا ہے بلکہ بلا استثنا سب کا ترجمہ وہی ہے، جو ہم نے اپنے ترجمے میں اختیار کیا ہے۔ چند مشہور علماء کے ترجمے یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔

شاہ عبدالقادرؒ	یہ کہ قائم رکھو دین اور پھوٹ نہ ڈالو
شاہ رفیع الدینؒ	یہ کہ قائم رکھو دین کو اور مت متفرق ہو بیچ اس کے
عبدالحق حقانیؒ	اسی دین پر قائم رہنا اور اس میں پھوٹ نہ ڈالنا
اشرف علی تھانویؒ	اسی دین کو قائم رکھنا اور اس میں تفرقہ نہ ڈالنا
ڈپٹی نذیر احمدؒ	اسی دین کو قائم رکھنا اور اس میں تفرقہ نہ ڈالنا
شیخ الہند محمود الحسن	قائم رکھو دین کو اور اختلاف نہ ڈالو اس میں"

یہ تو لفظ اقامت کے معنی ہوئے، ورنہ مصنف لکھتے ہیں۔ "پوری آیت کو سامنے رکھنے سے معلوم ہوتا ہے، کہ یہاں ایک ایسے دین کی اقامت کا حکم دیا جا رہا ہے، جو حضرت نوح سے لے کر آخری رسول تک تمام انبیاء پر اترا تھا۔ اب چونکہ مختلف انبیاء پر نازل کی جانے والی تعلیمات اپنی پوری شکل میں یکساں نہیں تھیں۔ عقائد اور بنیادی اصولوں کی حد تک تو ان سب کا دین بالکل ایک تھا، مگر تفصیلی شریعت اور عملی احکام میں ان کے درمیان کافی فرق تھا۔ اس لئے حکم کے الفاظ کے مطابق اس سے دین کا وہی حصہ مراد ہو سکتا ہے، جو سب میں مشترک رہا ہو"

مصنف نے اس کی تائید میں امام رازی کا حوالہ دیا ہے۔ امام رازی لکھتے ہیں۔ "(ترجمہ) شرع لکم من الدین — کے فقرے پر تمام انبیاء کا عطف ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس حکم کا مطلب شریعت کے اس حصہ پر پوری طرح عائد ہوتا ہے، جو تمام انبیاء کے درمیان متفق علیہ ہے"، اس سے آگے امام رازی نے اس کی مفصل تشریح کی ہے، جو مصنف نے نقل کی ہے۔

اس سلسلے میں مولانا اشرف علی تھانوی لکھتے ہیں۔

"مراد اس دین سے اصول دین ہیں، جو مشترک ہیں تمام شرائع میں، مثل توحید و رسالت،

لبعث ونحوہ - اور قائم کرنا یہ کہ اس کو تبدیل مت کرنا - اس کو ترک مت کرنا" (بیان القرآن سورہ شوریٰ)
بقول مصنف کے، "یہی رائے تمام مفسرین کی ہے - کسی بھی قابل ذکر تفسیر میں مجھے آیت کا یہ مفہوم نہیں ملا کہ "دین کے تمام انفرادی واجتماعی احکام کو زندگی کے سارے شعبوں میں نافذ کرو" یہاں موصوف نے اس آیت کے متعلق متعدد مفسرین کے حوالے نقل کئے ہیں اصل عربی عبارت مع ترجمے کے -

اس سلسلے میں مولانا مودودی نے جن دوسری آیات سے جماعت اسلامی کے نصب العین کی تائید میں دلائل اخذ کئے ہیں، مصنف نے ان سب پر بحث کی ہے اور دوسرے مفسرین کے حوالوں سے ثابت کیا ہے کہ ان آیات سے جو مفہوم لیا گیا ہے، وہ اصلاً ان میں سرے سے موجود نہیں - کتاب کے اس باب کا اختتام وہ ان الفاظ سے کرتے ہیں -

"میں کہوں گا کہ یہ واقعہ کہ قرآن میں آپ کی اسلامی تعبیر کے حق میں کوئی "واضح حکم" نہیں ملتا، یہ بذات خود اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ اسلامی تحریک کی صحیح تعبیر نہیں ہے اگر یہ اس کی صحیح تعبیر ہوتی تو یقیناً خدا کی کتاب میں بھی اس کا ذکر آنا چاہیئے تھا - اس حقیقت کے باوجود اگر آپ کسی عقلی قیاس کی بنا پر اپنی مخصوص تعبیر پر اصرار کر رہے ہیں تو یہ اس کے مزید نقص کا ثبوت ہے - جب ایسا ہو کہ ایک تعبیر کے حق میں قرآن کی واضح تصدیق موجود نہ ہو - اور اس کو ماننے والے قرآن کی آیات کے بجائے عقلی قیاسات پیش کر رہے ہوں تو اس قسم کے قیاسات اس کی صحت کا نہیں بلکہ صرف اس کی غلطی کا ثبوت ہوں گے - کیونکہ اسلامی تحریک کا مقصد اور امت مسلمہ کا نصب العین قرآن کی صریح آیات سے معلوم ہونا چاہیئے - نہ کہ عقلی قیاسات سے "

بدقسمتی سے اپنے ان عقلی قیاسات کو اس فکر کے حاملوں نے محکم دلائل سمجھ لیا ہے - اور بقول مصنف کے

"یہی وہ محکم دلائل ہیں جن کی بنا پر اس تعبیر کے حاملین یہ یقین کئے ہوئے ہیں کہ ان کی تعبیر قرآن وحدیث کے صریح نصوص سے ثابت ہو چکی ہے - کاش انسان یہ جانتا کہ اکثر "یقین" کی حقیقت ایک دھوکہ کے سوا اور کچھ نہیں ہوتی "

۴ - دین کے مفہوم کی اس طرح جو "غلط تعبیر" کی گئی ہے اس سے جو عملی نتائج نکلے، مصنف نے زیر نظر کتاب کے ایک باب میں ان پر بھی بحث کی ہے - وہ لکھتے ہیں -

"قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں۔ اس تعبیر کے تحت پیدا شدہ لٹریچر میں ایک اہم ترین کتاب ہے، جس میں دین کا "وسیع اور مکمل" تصور پیش کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں "عبادت" کی بحث کو ختم کرتے ہوئے کہا گیا ہے۔

"جو لوگ قرآن کی دعوت کا ایک محدود تصور لے کر ایمان لائیں گے، وہ اس کی ناقص و ناتمام پیروی کرینگے"

مگر افسوس کہ قرآنی دعوت کو وسیع اور مکمل کرنے کی کوشش اس کو محدود کرنے کی ایک نئی صورت بن گئی۔ دین کے ناقص تصور کی وجہ سے فطرت اور دین فطرت کے درمیان صحیح رشتہ قائم نہ رہ سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دین کے اثرات و نتائج بھی صحیح شکل میں برآمد نہ ہو سکے۔"

اس کی مثال مصنف نے یہ دی ہے۔

"جو لوگ اس ذہنیت میں مبتلا ہوں، فطری طور پر وہ اپنی قوتوں کے استعمال کے لئے سیاسی پروگرام تلاش کریں گے۔ "وہ کام" اس کو سمجھیں گے کہ حکومت بدلنے کی جدوجہد ہو رہی ہو۔ محض تبلیغ و تفہیم ان کے نزدیک وہ کام نہ ہوگا، جو خارجی دنیا میں انہیں اپنے ایمانی تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے انجام دینا ہے[1]"۔

جو لوگ اسلام کی اس تشریح کو حرف آخر سمجھیں گے، مصنف کے الفاظ میں

"ایسے لوگوں کا حال یہ ہوگا کہ وہ اپنے آپ سے غافل ہوں گے، مگر مسائل عالم کے موضوع پر گفت گو کرنے سے ان کی زبان کبھی نہیں تھکے گی نماز کی "اقامت" سے انہیں کچھ زیادہ دلچسپی نہ ہوگی۔ مگر وہ حکومت الٰہیہ قائم کرنے کا نعرہ بلند کریں گے۔ ان کی اپنی زندگی میں زبردست خلا ہوں گے، مگر وہ عالمی نظام کے خلا کو پُر کرنے کی باتیں کریں گے۔ ان کا گھر جہاں وہ آج بھی قوام کی حیثیت رکھتے ہیں، اس میں اپنی بساط بھر عام دنیا پرستوں کے گھر کی تقلید ہو رہی ہوگی۔ مگر ملک کے اندر وہ قوام کی حیثیت حاصل کرنے کی تحریک چلائیں گے تاکہ ملک کو دنیا پرست لیڈروں کے اثرات سے پاک کر سکیں۔ ان کا سینہ خدا کی یاد سے خالی ہوگا مگر وہ اقتدار حاصل کر کے براڈ کاسٹنگ اسٹیشن پر قبضہ کرنے کی تجویز پیش کریں گے۔ تاکہ دنیا بھر میں خدا پرستی کا چرچا کیا جا سکے۔ اپنی ذاتی ذمہ داریوں کو ادا

---

[1] ..... میرا اعتراض دراصل یہ ہے کہ سیاست جو صرف اسلام کا ایک پہلو ہے اسی کی بنیاد پر پورے اسلام کی تشریح کرنے کی کوشش کی گئی ہے ...." از مصنف

کرنے کے لئے جن اصولوں پر عمل کرنے کی ضرورت ہے، ان پر عمل کرنے میں وہ ناکام رہیں گے۔ مگر ملکی نظام سے لے کر اقوام متحدہ کی تنظیم تک کی اصلاح کے لئے ان کے پاس درجنوں اصول موجود ہوں گے۔ ان کے کاغذی نقشے اور اخباری بیانات دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ملت اسلام کا انہیں اس قدر درد ہے کہ کسی مسئلے کا دور قریب کا رشتہ بھی اگر ملت کے ساتھ ثابت ہو جائے تو وہ اس کو حل کرنے کے لئے بے قرار ہو جاتے ہیں، لیکن ان کے قریب جا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ان کے اس اظہار غم کی حیثیت رسمی تعزیت سے زیادہ نہیں ہے۔ جو مرنے والے کے غم میں نہیں، بلکہ صرف اس اندیشہ سے کی جاتی ہے کہ زندہ رہنے والوں کو شکایت ہوگی۔ اپنے آج کے حاصل شدہ دائرے میں وہ نہایت سطحی اور غیر ذمہ دار زندگی گزار رہے ہوں گے، مگر اپنی انقلابی تحریک کی کامیابی کے بعد انہیں کام کا جو وسیع تر دائرہ حاصل ہوگا۔ اس کا نقشہ اس طرح پیش کریں گے کہ گویا خلافت راشدہ از سر نو دنیا میں لوٹ آئے گی"

اور یہ اس لئے کہ ان کے ہاں ہر وقت نظر حصول اقتدار پر ہے۔ اور جو کچھ کیا جاتا ہے اس کو سامنے رکھ کر کیا جاتا ہے۔ نظریئے بنتے ہیں تو اسی کی خاطر اور پروگرام طے ہوتے ہیں تو اسی کے پیش نظر جس کی وجہ سے دین کا جو اصل مقصود ہے اس سے توجہ ہٹتی جا رہی ہے۔ مصنف نے ایک اور جگہ اسی ضمن میں غلاف کعبہ کے مسئلے کی مثال دی ہے

"غلاف کے ٹکڑوں کو جس طرح دھوم دھام کے ساتھ مکہ روانہ کیا گیا اور لاکھوں آدمیوں کے جلوس کے ساتھ اس کو ایک تعزیہ کی شکل میں ہوائی اڈے تک پہنچایا گیا، وہ خود اصطلاحی بدعت ہو یا نہ ہو مگر یہ یقینی ہے کہ محض ایک عوامی تماشا تھا، جس کا حقیقی دینداری سے کوئی تعلق نہیں مگر وہی لوگ جن کے نزدیک میلاد النبی کے جلسے اور جلوس اسلامیت اور محبت رسول کا ثبوت نہیں تھے۔ آج ان کا فتویٰ یہ ہے کہ غلاف کعبہ کا یہ جلوس ایک "خیر عظیم" کا مظاہرہ تھا جو بہت بڑے پیمانہ پر شہر لاہور میں رونما ہوا۔ اور جو لوگ اس پر تنقید کر رہے ہیں، ان کی حیثیت گویا "مکھیوں" کی سی ہے جو اس کے تمام بہترین پہلوؤں کو نظر انداز کر کے گندگی کے چھینٹوں پر جا بیٹھی ہوں" (ترجمان القرآن اپریل ۱۹۶۳ء صفحہ ۵۵)

"صحیح ذہن نہ ہو تو تحریکیں بالآخر اسی مقام پر پہنچتی ہیں۔ ابتداءً جب تک اس قسم کے عوامی واقعات ان کے لئے کسی سیاسی اہمیت کے حامل نہیں ہوتے، وہ ان پر تنقید کرتی ہیں۔ مگر اگلے مراحل میں پہنچنے کے بعد جب اس قسم کے واقعات میں ان کو سیاسی اہمیت نظر آنے لگتی ہے، تو ان کی زبان اور ان کی اصطلاحات بدل جاتی ہیں، جو چیز پہلے فضول اور عیب دکھائی دیتی تھی، وہ اب خیر عظیم بن جاتی ہے۔

کتاب کے شروع میں کوئی ۱۵۰ صفحات پر مشتمل وہ خط و کتابت ہے، جو مصنف کی مولانا صدرالدین اصلاحی مولانا ابواللیث امیر جماعت اسلامی ہند، مولانا جلیل احسن ندوی اور مولانا مودودی صاحب سے ہوئی۔ عجیب بات یہ ہے کہ مصنف نے اپنی تحریر "تعبیر کی غلطی" میں جن تعبیر کی غلطیوں کی نشان دہی کی ہے، ان بزرگوں میں سے کسی نے بھی ان کے بارے میں جواب دینے کی کوشش نہیں کی اور ایک بار جواب دیا گیا، تو اس کے حوالے صحیح نہ تھے

۸ر نومبر ۶۲ء کو مصنف نے امیر جماعت اسلامی ہند کے نام ایک خط لکھا ہے جس میں اس جواب کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔

"ایک آیت جس کے اوپر جماعت اسلامی کے ہمہ گیر انقلابی نصب العین کی عمارت کھڑی کی گئی ہے اس کے متعلق ایک شخص دعوے کرتا ہے کہ آیت کے مخصوص الفاظ کی بنا پر علمائے تفسیر نے بالاتفاق اس میں الدین سے ہمہ گیر شریعت کا مفہوم مراد نہیں لیا ہے۔ بلکہ صرف دین کی بنیادی تعلیمات مراد لیتے ہیں۔ اس لئے اس آیت سے کوئی ہمہ گیر انقلابی نصب العین اخذ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے جواب میں جماعت کا ایک لائق ترین عالم کئی مہینے کی تلاش و جستجو کے بعد دو حوالے فراہم کرتا ہے اور کہتا ہے کہ مدعی کا یہ کہنا غلط ہے کیونکہ بعض ایسے مفسر موجود ہیں، جن کے نزدیک اقامت دین کے اس حکم میں شریعت کے تفصیلی احکام بھی داخل ہیں اور پورے کے پورے داخل ہیں۔

"اب مدعی دوبارہ آپ کے سامنے آتا ہے اور کہتا ہے کہ ان علماء کی طرف یہ انتساب بالکل غلط ہے دونوں مفسرین کے مکمل اقتباسات آپ کے سامنے رکھ دیتا ہے، جس سے صریح طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے جو بات الذین اوحینا الیک[1] کے فقرے کے متعلق کہی تھی اس کو بالکل غلط طور پر اقیموا الدین کے فقرے کے ساتھ جوڑ دیا گیا۔ حالانکہ یہ دوسرا فقرہ جو اصلاً زیر بحث ہے۔ اس کے متعلق انہوں نے

---

[1] دونوں شارحین نے جو کچھ کہا ہے، وہ یہ ہے کہ اقیموا الدین کے فقرے میں تو صرف توحید اور اس کے بنیادی تقاضوں کی اقامت کا حکم ہے، جیسا کہ جلالین میں مذکور ہے نہ کہ تفصیلی شریعت کا، مگر دوسرے فقرے الذی اوحینا الیک کا معاملہ اس سے مختلف ہے کیونکہ اس کے مفہوم میں ساری وحی محمدی شامل ہے مگر علامہ صاوی اور شیخ سلیمان (شارحین جلالین) نے جو بات الذی اوحینا الیک کے بارے میں کہی تھی، اس کو اقیموا الدین کے فقرے کے ساتھ جوڑ کر یہ دعویٰ کر دیا گیا کہ دونوں بزرگوں کے نزدیک اقامت دین کے اس حکم میں شریعت کے تفصیلی احکام بھی داخل ہیں" از مصنف

صراحت کی ہے کہ یہاں عموم مراد نہیں۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ایسی کھلی ہوئی گرفتوں کے باوجود آپ کا خاموش رہنا اور صدرالدین صاحب کو اس طرح خط لکھنا گویا کہ ان کے دعاوی اور استدلال میں آپ کے نزدیک اب بھی کوئی فرق نہیں پڑا، کیسے صحیح ہے۔"

آخر میں خط و کتابت کے دوران بقول مصنف بات یہاں تک پہنچی کہ "اگر امیر جماعت اسلامی ہند یہ طے کر دیں کہ مولانا مودودی کا لٹریچر جماعت اسلامی کے فکر کی مستند شرح نہیں ہے[1]" تو میری خلش دور ہو جائے گی اور میں بدستور جماعت اسلامی کے ساتھ رہ کر کام کر سکوں گا، لیکن اس کے لئے امیر موصوف تیار نہ ہوئے اور مصنف کے پیہم اصرار کے بعد ان کا جماعت اسلامی سے استعفاء ۲ر اپریل ۶۳ء کو منظور کر لیا گیا۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی خدمت میں مصنف نے جب اپنی تحریر "تعبیر کی غلطی" بھیجی تو ان کا پہلا ردِ عمل کافی درشت تھا۔ پھر وہ جواب دینے پر آمادہ ہوئے، لیکن شاید ہندوستان کی جماعت کے حضرات کے کہنے پر انہوں نے جواب دینے سے معذرت کی۔ اور مصنف کے بارے میں اچھے خاصے سخت الفاظ استعمال کئے۔

زیر نظر کتاب "تعبیر کی غلطی" اس لحاظ سے بڑی اہم ہے کہ ایک تو اس کے لکھنے والے جماعت اسلامی ہند کے رکن بلکہ اس کی مرکزی مجلس شوریٰ کے رکن رہ چکے ہیں اور دوسرے اس میں جماعت کی سیاست یا دوسری سرگرمیاں زیر بحث نہیں لائی گئیں بلکہ فکری و نظری لحاظ سے جماعت اسلامی ہند و پاکستان کا جو دینی اساس ہے اس پر تنقید کی ہے قرآن مجید کی جن آیات پر جماعت اسلامی کے نصب العین، دستور اور مقاصد کا تعین ہوا ہے اور اس کی دعوت کو دین اسلام کا اصل مقصود بنا کر پیش کیا گیا ہے، ان پر بحث ہے اور مفسرین کرام کے بیانات سے ثابت کیا گیا ہے کہ ان آیات کا وہ مفہوم ہی نہیں۔ جو مولانا مودودی نے اخذ کیا ہے اور اگر یہ بات صحیح ہے تو یقیناً جماعت اسلامی کی وہ دینی و فکری بنیاد ڈھ جاتی ہے، جس پر کہ اس کی موجودہ عمارت کھڑی ہے۔

---

[1] اب میں دوبارہ اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ میرے لئے جماعت اسلامی میں رہنے کا کوئی سوال نہیں ہے جیسا کہ میں واضح طور پر بتا چکا ہوں۔ مولانا مودودی جس انداز سے دین کی تشریح کرتے ہیں، اس سے مجھے اختلاف ہے اور چونکہ یہی تشریح آپ کے اور عام افراد جماعت کے نزدیک جماعت کے فکر کی صحیح ترجمانی ہے۔ اس لئے میرے لئے صحیح راہ یہی ہے کہ میں اس سے الگ ہو جاؤں۔

(خط بنام امیر جماعت اسلامی ہند۔ ۷ر فروری ۶۳ء)

افکار و آراء

مکرمی ۔۔۔ بارک اللہ فی مساعیکم

السلام علیکم ۔ ماہنامہ الرحیم دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ آپ حضرت امام الہند شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ اور ہمارے شیخ المجاہد الجلیل مولانا عبید اللہ سندھی کی تعلیمات کی اشاعت کر رہے ہیں۔ بندہ حضرت مولانا کے خدام اور تلامیذ میں سے ہے اور مکہ مکرمہ میں ان سے فیض یاب ہوا تھا۔ جس میں عرصہ پچیس سال سے درس قرآن کریم دے رہا ہوں ماہ شعبان و رمضان کے درس میں تین چار صد سے زیادہ طلبہ اور علما شریک ہوتے ہیں۔ میں نے رسالہ دیکھ کر اپنے مشفق استاد کی دیرینہ تمنا کو پورا پایا۔ جو حضرت مولانا مکہ معظمہ میں تجویز کیا کرتے تھے۔ خداوند کریم آپ کی مدد فرمائے۔

مولانا سندھی قدس سرہ کی تصانیف سے مطلع فرماتے ہیں۔

احقر محمد طاہر عفی اللہ عنہ

انجمن تعلیم القرآن ۔ پنج پیر

تحصیل صوابی ۔ ضلع مردان

مکرمی ۔۔۔۔

ماہ اگست کے الرحیم میں "افکار و آراء" کے عنوان کے تحت میرا ایک مراسلہ شائع ہوا ہے، جس میں ضمناً سر سیّد کا بھی ذکر آ گیا ہے۔ اس پر بعض علم دوست، معارف پرور اور اہل تحقیق بزرگوں نے گلہ کیا ہے کہ میں نے سر سیّد علیہ الرحمۃ کو خواہ مخواہ مطعون کر کے راست روی اور انصاف دوستی کا ثبوت نہیں دیا۔ میں اپنے ان کرم فرماؤں کی خدمت میں یہ گزارش کروں گا کہ میرے نزدیک سر سیّد مرحوم کی زندگی کے دو پہلو ہیں۔ ایک سیاسی اور دوسرا

اجتہادی۔ دوسرے لفظوں میں ایک ان کا قومی و اجتماعی پہلو ہے اور دوسرا علمی و مذہبی۔ اب جہاں تک سرسید مرحوم کے سیاسی اور قومی کردار کا تعلق ہے وہ لاریب مسلمانوں کے محسن، ان کی بروقت مدد کرنے والے اور ان کے سچے رہنما تھے اور آزادی وطن کی اب تک جتنی بھی تحریکیں چلی ہیں، ان میں کسی نہ کسی حیثیت میں سرسید مرحوم کی قومی مساعی کے پیدا کردہ اثرات کام کر رہے تھے۔ اس لحاظ سے ان کی قدر و منزلت رہتی دنیا تک باقی رہے گی اور برصغیر ہند و پاکستان کے مسلمان مرحوم کے ان احسانات کو ہمیشہ یاد رکھیں گے۔ اس سلسلے میں میں نے جوان پر تنقید کی تھی وہ ان کے مذہب میں اجتہادی پہلو پر تھی۔ اور میرے نزدیک یہ تنقید اس اعتبار سے صحیح ہے کہ جہاں ملت اسلامیہ اب تک سرسید مرحوم کے قومی و سیاسی کردار کو مانتی ہے۔ اور اسے صدق دل سے سراہتی ہے، وہاں ان کے مذہبی اجتہاد کا آج کوئی بھی نام لیوا نہیں۔ اور ان کی وہ ساری کوششیں تاریخ نے نسیاً منسیاً کر دی ہیں۔

آپ کا۔ محمد عبداللہ عمرپوری

(فاضل دارالعلوم دیوبند) بہاولپور

مکرمی ....

"الرحیم" ملا۔ اور اسے پڑھا، مضامین کافی اونچے پائے کے ہیں، جہاں تک میرا علم و فہم ہے، اس کے لحاظ سے مجھے یہ پسند آئے۔ وحدت الوجود اور وحدت الشہود والا مضمون اچھا ہے، لیکن اس موضوع پر پروفیسر سلیم چشتی کا ایک مضمون ان کی شرح دیوان غالب میں ہے وہ میرے نزدیک زیادہ عام فہم بھی ہے اور مفصل بھی اس کے علاوہ مرحوم داؤد پوتا نے وحدت الوجود پر سندھی میں ایک مضمون لکھا تھا، وہ بھی بہت اچھا تھا، اور الرحیم کے اس مضمون سے بہتر تھا۔ یوں تو میں کوئی عالم نہیں ہوں کہ ان حضرات پر تنقید کروں۔ بہر حال یہ مضمون پڑھ کر جو میں نے محسوس کیا وہ لکھ دیا ہے۔

غلام محمد۔ ایڈوانی اسٹریٹ۔ کراچی

"ادارۂ چراغِ راہ کراچی" نے "تحریک اسلامی" کے باب میں اپنا ایک خاص نمبر نکالا ہے، جس میں ایک مضمون "تحریک اسلامی۔ شاہ ولی اللہ اور ان کے بعد" ہے خورشید احمد صاحب کے قلم سے۔ اس مضمون میں شاہ ولی اللہ صاحب کی اصلاحی و تجدیدی مساعی پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ خورشید احمد صاحب حضرت شاہ صاحب کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

...... آپ کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے اسلام کو زندگی کے ایک ہمہ گیر پروگرام کی حیثیت سے قوم کے سامنے پیش کیا اور اس پروگرام کے مطابق نہایت حکمت، دانش مندی، اور حسن توازن کے ساتھ اپنے کام کا آغاز کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۷۰۳ء کے بعد سے جو بھی اصلاحی تحریک ہندوستان میں اٹھی، اس پر شاہ ولی اللہ کی چھاپ نظر آتی ہے حتیٰ کہ وہ تحریکیں جو راہ اعتدال پر قائم نہ رہ سکیں، انہیں بھی اگر کہیں سے تحریک حاصل ہوئی تو وہ شاہ ولی اللہ ہی کی فکر تھی۔" ایک ایماندار مورخ مجبور ہے کہ ان ڈھائی سو سالوں کو شاہ ولی اللہ کا دور قرار دے۔"

بڑا اچھا ہوتا اگر مضمون نگار صاحب یہ بھی صراحت فرما دیتے کہ ان کے نزدیک وہ کون سی تحریکیں تھیں "جو راہ اعتدال پر قائم نہ رہ سکیں۔"

اس کے بعد خورشید احمد صاحب لکھتے ہیں :۔

امام صاحب کا دوسرا کارنامہ ہے کہ آپ نے اسلام کو ایک اجتماعی ایک مکمل دین اور ایک ہمہ گیر ضابطۂ زندگی کی حیثیت سے پیش کیا۔ آپ کے پیش نظر زندگی کے پورے نظام کی اصلاح تھی، یعنی کسی ایک پہلو کی نہیں۔ آپ نے زندگی کی تمام وسعتوں کے لئے اسلام کی ہدایت کو واضح کیا۔ شاہ ولی اللہ کی تصانیف سے معلوم ہوتا ہے کہ فلسفے سے لے کر عبادات کے مسائل، نجی زندگی سے لے کر سیاست و معیشت اور تمدن کے ارتقاء کے اصولوں تک فقہ کے مسائل سے لے کر تصوف کے حقائق تک۔ تمام پر امام صاحب نے بحث کی اور ان کے بارے میں اسلام کا نقطہ نظر پیش کیا۔ یہی وجہ ہے کہ شاہ صاحب کی تحریروں کو پڑھتے وقت معلوم ہوتا ہے کہ گویا بیسویں صدی کا کوئی مفکر اپنے خیالات پیش کر رہا ہے ان کے افکار و نظریات میں ذرا بھی باسی پن نہیں پایا جاتا ان میں اتنی ہی تازگی ہے جتنی ہر آنے والی صبح میں ہوتی ہے۔ امام صاحب کے ہاں بڑا ہی اعتدال بے مثال توازن اور حسین جامعیت ملتی ہے۔ فقہ کے تقریباً تمام مسلک انہوں نے اپنے سامنے رکھے۔ اور اعتدال کی راہ پیش کی۔ تصوف کے جتنے بھی سلسلے ہندوستان میں جاری تھے ان میں بیشتر سے آپ نے خود استفادہ کیا اور جو تعلیمات پیش کیں وہ سب کی جان تھیں۔ جامعیت کا ایک فطری تقاضا اعتدال پسندی ہوتی اور یہ بھی امام صاحب کے تصورات میں ہمیں بدرجہ اتم ملتی ہے۔"

حضرت شاہ صاحب کے افکار و نظریات کے اس جائزے سے کس کو انکار ہوگا۔ کاش ہماری جماعتیں جو آج تجدید و اعلائے اسلام کا کام کر رہی ہیں وہ شاہ صاحب کے اس اعتدال بے مثال توازن اور حسین جامعیت کو اپنے اعمال و افکار کی کسوٹی بنائیں۔

احمد سعید ۔ اچھرہ ۔ لاہور

مصر سے نئی درآمد کی ہوئی عربی کتابیں

کتب تفاسیر و علوم قرآن

تفسیر بیضاوی - کامل ۲ جلدیں -/۳۰

تفسیر الدر المنثور للسیوطی - کامل ۳ جلدیں -/۲۳۰

الاتقان فی علوم القرآن للسیوطی -/۱۰

کلمات القرآن -/۶

الترتیب والبیان عن تفصیل آیات القرآن
محمد زکی صالح - کامل ۲ جلدیں -/۵۰

کتب احادیث و علوم احادیث

صحیح مسلم - کامل ۴ جلدیں -/۱۲۰

سنن الترمذی
شرح احمد محمد شاکر - کامل ۳ جلدیں -/۷۰

سنن ابی داود - مجلد دو جلدیں -/۵۰

موطا الامام مالک
شرح مختصر للسیوطی -/۱۵

المسند الامام احمد بن حنبل ۱۳ جلدیں
علاوہ جلد ۸ - ۷ -/۱۵۰

زبدۃ البخاری مختارات من صحیح البخاری -/۶

اطراز الحدیث ۱/۲۵

دلیل الفالحین - شرح ریاض الصالحین
محمد بن علان الصدیقی - کامل ۴ جلدیں -/۶۰

السراج المنیر - شرح الجامع الصغیر -/۵۰
کامل ۳ جلدیں

جامع علوم الحکم -/۱۰

منہج ذوی النظر (مصطلح الحدیث) -/۸

الترغیب والترہیب منذری -/۶۵
۴ جلدیں

تیسیر الوصول الی جامع الاصول - شیبانی -/۳۰
کامل ۲ جلدیں

الحصن الحصین -/۲

شرح الدیباج المذہب -/۲

صحیح ابن حبان
تحقیق احمد محمد شاکر -/۱۲۰

کتب اسلامیات عقائد، فقہ و منطق

ارشاد الساری الی مناسک - ملا علی قاری (مجلد) -/۱۲

حاشیتان علی منہاج الطالبین للنووی - کامل ۴ جلدیں -/۳۵

شرح التہذیب للخبیصی -/۱۲

المفاخر العلیۃ ابن عباد ۷/۵۰

کتب دیوان :- دیوان المتنبی -/۲۰ شرح دیوان المتنبی کامل ۴ جلد -/۶۰ - دیوان ابن زیدون -/۱۵ - دیوان امرء القیس -/۳۰

قرۃ العیون سمرقندی -/۳

تاج العروس سکندری -/۱

الاختیار لتعلیل المختار ۔ کامل ۵ جلدیں -/۲۵

المحبۃ والشوق ۔ غزالی -/۴

دعائم الاسلام ۔ جلد ۲ -/۳۰

احکام الشریعۃ الاسلامیۃ -/۱۵

نصب الرایۃ ۔ کامل ۴ جلدیں -/۵۰

کتب السیر والتاریخ والتصوف

شخصیات الصوفیۃ ۔ للسرور ۳/۵۰

جوامع السیرۃ ابن حزم -/۲۵

تاریخ الدول الاسلامیۃ فخری -/۱۵

علی ہامش السیرۃ ۳ جلدیں کامل طہٰ حسین -/۲۵

اتمام الوفاء فی سیرۃ الخلفاء خفری -/۱۲

الورقۃ ۔ ابن جراح -/۱۰ ۔ الوعد الحق ۔ طہٰ حسین ۷/۵۰

جامع کرامات الاولیاء ۔ کامل ۲ جلد ۔ نبہانی -/۴۰

التنویر فی اسقاط التدبیر -/۴

الطبقات الکبریٰ شعرانی -/۱۲

کتب الفلسفہ

الفلسفہ فی المشرق ۷/۵۰

تہافت الفلاسفۃ غزالی -/۲۰

مقدمہ تہافت الفلاسفۃ ۔ تحقیق ڈاکٹر سلیمان -/۲۰

تسع رسائل فی الحکمۃ والطبیعیات -/۴

کتب نوابغ الفکر العربی

ابن رشد ۴/۵۰ المتنبی ۴/۵۰

اخوان الصفاء ۴/۵۰

کتب فنون الادب العربی

الرحلات ۴/۵۰ النقد ۴/۵۰

کتب لغت وادب ونحو

الکامل للمبرد کامل ۳ جلدیں -/۵۰

تاریخ الادب العربی الزیات -/۱۸

من اصطلاحات الادب الغربی ۷/۵۰

الف لیلۃ ولیلۃ ۴ حصص کامل ۲ جلدیں -/۳۰

حاشیۃ الالفیہ للخفری ۱۲/۵۰

شرح العیون لابن نباتہ -/۶

العصر الجاہلی ڈاکٹر شوقی -/۲۵

الوان طہٰ حسین -/۲۰

القاموس المحیط کامل ۲ جلدیں چرمی -/۸۰

القاموس العصری عربی انگریزی چرمی -/۵۰

" " انگریزی عربی چرمی -/۵۰

القاموس المدرسی انگریزی عربی ۔ عربی انگریزی -/۳۰

القاموس الجامع انگریزی عربی ۔ عربی انگریزی -/۲۵

القاموس الحبیب عربی انگریزی -/۱۰ ۔ انگریزی عربی -/۸

اصلاح المنطق ۔ ابن السکیت تحقیق احمد محمد شاکر -/۳۰

مکتبہ اسحاقیہ ۔ جونا مارکیٹ ۔ کراچی نمبر ۲

مطبوعات شاہ ولی اللہ اکیڈمی

★

لمعات (عربی)

شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ کے فلسفہ تصوف کی یہ بنیادی کتاب عرصے سے نایاب تھی۔ مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی کو اس کا ایک پرانا قلمی نسخہ، جو اغلاط سے پُر تھا، ملا۔ موصوف نے بڑی محنت سے اس کی تصحیح کی، اور شاہ صاحب کی دوسری کتابوں کی عبارات سے اس کا مقابلہ کیا۔ اور وضاحت طلب امور پر تشریحی حواشی لکھے۔ کتاب کے شروع میں مولانا کا ایک مبسوط مقدمہ ہے۔

شاہ صاحب نے اس کتاب میں "وجود" اور اس سے کائنات کا جس طرح صدور ہوا ہے، اس پر بحث کی ہے، اور اپنی الٰہیاتی حکمت کے دوسرے مسائل بھی بیان کئے ہیں۔ قیمت دو روپے

—:o:—

شاہ ولی اللہ کی تعلیم

از پروفیسر غلام حسین جلبانی سندھ یونیورسٹی

پروفیسر جلبانی ایم اے صدر شعبہ عربی سندھ یونیورسٹی کے برسوں کے مطالعہ و تحقیق کا حاصل یہ کتاب ہے اس میں مصنف نے حضرت شاہ ولی اللہ کی پوری تعلیم کا احصاء کیا ہے اس کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل بحثیں کی ہیں۔ اردو میں شاہ صاحب کی تعلیم پر یہ پہلی جامع کتاب ہے۔

کتاب مجلد ہے۔ قیمت ۷/۵۰ روپے ہے

شاہ ولی اللہ اکیڈمی ۔ صدر ۔ حیدرآباد۔ پاکستان

Monthly "AR-RAHIM" Hyderabad Regd. S. No. 2548

شاہ ولی اللہ اکیڈمی

اغراض و مقاصد

۱۔ شاہ ولی اللہ کی تصنیفات اُن کی اصلی زبانوں میں اور اُن کے تراجم مختلف زبانوں میں شائع کرنا۔

۲۔ شاہ ولی اللہ کی تعلیمات اور ان کے فلسفہ و حکمت کے مختلف پہلوؤں پر عام فہم کتابیں لکھوانا اور اُن کی طباعت و اشاعت کا انتظام کرنا۔

۳۔ اسلامی علوم اور بالخصوص وہ اسلامی علوم جن کا شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتبِ فکر سے تعلق ہے، اُن پر جو کتابیں دستیاب ہو سکتی ہیں، اُنہیں جمع کرنا، تاکہ شاہ صاحب اور اُن کی فکری و اجتماعی تحریک پر کام کرنے کے لئے اکیڈمی ایک علمی مرکز بن سکے۔

۴۔ تحریک ولی اللہی سے منسلک مشہور اصحابِ علم کی تصنیفات شائع کرنا، اور اُن پر دوسرے اہلِ قلم سے کتابیں لکھوانا اور اُن کی اشاعت کا انتظام کرنا۔

۵۔ شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتبِ فکر کی تصنیفات پر تحقیقی کام کرنے کے لئے علمی مرکز قائم کرنا۔

۶۔ حکمت ولی اللہی اور اُس کے اصول و مقاصد کی نشر و اشاعت کے لئے مختلف زبانوں میں رسائل کا اجراء

۷۔ شاہ ولی اللہ کے فلسفہ و حکمت کی نشر و اشاعت اور اُن کے سامنے جو مقاصد تھے، اُنہیں فروغ دینے کی غرض سے ایسے موضوعات پر جن سے شاہ ولی اللہ کا خصوصی تعلق ہے، دوسرے مصنفوں کی کتابیں شائع کرنا

محمد سرور پرنٹر پبلشر نے سعید آرٹ پریس حیدرآباد سے چھپوا کر شائع کیا۔

شاہ ولی اللہ اکیڈمی کا علمی مجلہ
الرحیم
ماہنامہ
شعبہ نشر و اشاعت شاہ ولی اللہ اکیڈمی ○ صدر حیدرآباد
شعبان المعظم ۱۳۸۳ھ جنوری ۱۹۶۴ء

مجلسِ ادارت:

ڈاکٹر عبدالواحد ہالے پوتا،
مولانا غلام مصطفےٰ قاسمی،
مخدوم امیر احمد،

مُدیر:

محمدؐ سُرور،

قیمت سالیانہ :- آٹھ روپے   فی پرچہ :- پچھتر پیسے

جلد ۱ شعبان المعظم ۱۳۸۳ھ مطابق جنوری ۱۹۶۴ء نمبر ۸

فہرست مضامین

کتبہ: عبدالمجید

شذرات

علمی و دینی حلقوں کے علاوہ ملک کے ہر طبقے میں مولانا سید محمد داؤد غزنوی کے انتقال پر جس گہرے رنج و اندوہ کا اظہار کیا گیا ہے وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ مولانا مرحوم کی کتنی ہر دلعزیز شخصیت تھی، اور آپ ایک مخصوص مذہبی مسلک کے حامل اور عالم ہونے کے ساتھ ساتھ ان اعلیٰ خوبیوں کے بھی مالک تھے، جو انسان کو مقبولِ عوام و خواص بناتی ہیں اور جب وہ اس دنیا سے اٹھ جاتا ہے تو ہر شخص اس طرح یاد کرتا ہے، جیسے اس کے قریبی عزیز کا انتقال ہو گیا۔

مولانا مرحوم امرتسر کے مشہور و معروف علمی و دینی خاندان غزنویہ میں سے تھے۔ آج سے کوئی چالیس سال قبل جب استخلاص وطن کی جدوجہد شروع ہوئی، تو مولانا سید محمد داؤد غزنوی اس میں پیش پیش تھے عمر کا ایک بڑا حصہ غیر ملکی حکومت کی جیلوں میں گزارا، ملک آزاد ہوا، تو جہاں تک ہو سکا اس کی خدمت کی، اور آخر جب وہ وقت آگیا۔ جس سے کسی کو مفر نہیں تو ۱۶؍ دسمبر کو اپنے رب کو پیارے ہو گئے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

دنیائے اسلام کے اکثر و بیشتر ملک سیاسی لحاظ سے آزاد ہو چکے ہیں۔ اور اب وہ کہیں بڑی سرعت سے اور کہیں دھیرے دھیرے، اس منزل کی طرف گامزن ہیں، جہاں جمہور کی حاکمیت اپنے صحیح معنوں میں بروئے کار ہوتی ہے۔ اس دور میں جمہور کی حاکمیت صرف آئین و قانون تک محدود نہیں بلکہ وہ آئین و قانون کے ساتھ ساتھ سماجی اور اقتصادی میدانوں میں بھی اپنی عمل داری کو نافذ دیکھنا چاہتی ہے اور وہ کسی طرح یہ برداشت کرنے کو تیار نہیں کہ آزاد جمہوی

حکومتوں کے اس دور میں بھی پہلے کی طرح ناداروں اور زرداروں کے دو مستقل طبقے ہوں اور ان کے درمیان سماجی اور اقتصادی ناہمواری کی ایک اونچی دیوار حائل رہے۔ ہر آزاد مسلمان ملک میں حاکمیتِ جمہور کی اس منزل تک پہنچنے کی جدوجہد کسی نہ کسی شکل میں جاری ہے اسی لئے ان میں سے اکثر کے ہاں اس وقت بڑا اضطراب اور خلفشار پایا جاتا ہے اور کبھی کبھی خون خرابے تک بھی نوبت پہنچ جاتی ہے۔

یہ اپنی جگہ صحیح ہے یا غلط اس سے قطع نظر مسلمان ملکوں میں جمہور کی حاکمیت کو مِن کُلِّ وجہٍ بروئے کار لانے کی یہ جدوجہد ہورہی ہے، اس میں اسلام کا بھی اپنا مقام ہے کیونکہ مسلمان جمہور کے ہاں اس کی بھی اتنی ہی اہمیت ہے جتنی کہ اپنے لئے سیاسی آزادی کے بعد سماجی انصاف اور اقتصادی خوش حالی حاصل کرنے کی بلکہ سچ یہ ہے کہ اس سے بھی زیادہ چنانچہ علامہ اقبال کا یہ شعر

دیں ہاتھ سے دے کر اگر آزاد ہو ملّت

ہے ایسی تجارت میں مسلماں کا خسارہ

واقعی مسلمان جمہور کے ذہن و عقیدہ کی آج بھی صحیح ترجمانی کرتا ہے۔

اسلام کا احیاء و قیام اور سیاسی آزادی کے بعد سماجی انصاف اور اقتصادی خوش حالی کا حصول۔ اس وقت یہ دو سب سے بڑے عوامل اور محرکات ہیں مسلمانوں کی جمہوری جدوجہد کے قومی زندگی سے اسلامی موثرات کو خارج کرنے کی جس تحریک کا آغاز ۱۹۲۳ء میں ترکی میں ہوا تھا، اس کا ردّ عمل ترکی کے سابق وزیر اعظم عدنان مندریس مرحوم کے عہد اقتدار میں جس طرح ہوا اس کا ترک حکمرانوں کو تلخ تجربہ ہوا ہے، اور اب ان کا نقطۂ نظر کچھ بدل رہا ہے۔

استنبول کی ایک حالیہ اطلاع ہے کہ وہاں ایک جدید اسلامی درس گاہ کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ جس کے مقاصد یہ ہیں:۔ ترکوں میں اسلام سے شیفتگی پیدا کرنے، اس کی تہذیب و ثقافت کو اپنانے، قرآنی تعلیمات کو اپنی زندگی میں عملی جامہ پہنانے، دینی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے اور مشرق وسطیٰ میں اسلامی قدروں کے احیاء اور مسلمانوں میں نشاۃ ثانیہ کے وجود میں لانے کی صلاحیت پیدا کرنا۔ ایسے علماء پیدا کرنا جو افتاء، وعظ و ارشاد خطابت اور امامت

کی خدمات سرانجام دے سکیں۔ اور ثانوی اور دوسری درس گاہوں میں اسلامی علوم و فنون کی تعلیم دینے کے قابل ہوں۔

اسی اطلاع میں بتایا گیا ہے کہ اس وقت استنبول کی اس درس گاہ میں تقریباً تین سو طالب علم ہیں۔ اور پہلے سال اس سے جو طلبہ فارغ ہوئے ہیں، ان میں سے بعض ائمہ و خطباء بعض مدارس میں عربی ادب اور اسلامی علوم کے استاد اور بعض مفتی اور واعظ مقرر کئے گئے ہیں۔

ترکی میں اس "رجعت قہقری" کی ضرورت کیوں پڑی۔ صرف اس لئے کہ ترک جمہور یہ چاہتے تھے اور جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا۔ اس دور میں حکومت کو مرضیٔ جمہور کے سامنے کرہاً و طوعاً سر خم کرنا ہی پڑتا ہے۔

عرب ممالک میں پوری قومی زندگی کو نئی اساس پر تعمیر کرنے کی جدوجہد میں سب سے تیز سب سے آخر میں سیاسی آزادی حاصل کرنے والے ملک الجزائر ہے چنانچہ یہ اس معاملے میں متحدہ عرب جمہوریہ سے بھی زیادہ تیز ہے مثال کے طور پر الجزائر کی موجودہ قیادت ملک میں اشتراکیت (سوشلزم، کمیونزم نہیں) بڑی سرعت سے لا رہی ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کے پروگرام میں اسلام کا احیاء بھی داخل ہے اور اسے اس سلسلے میں بھی کوشاں ہونا پڑتا ہے۔

قومی زندگی میں اتحاد و یک جہتی اور نظم و انضباط کا قیام اور اس کے علاوہ سماجی انصاف اور اقتصادی خوش حالی کا حصول — ہر مسلمان ملک میں اسلام کو ان مقاصد کی تکمیل میں بھی ممد و معاون ہونا ہے بلکہ ان کی طرف رہنمائی کرنا ہے۔ علمائے کرام اور دعوتِ احیائے اسلام کے علم بردار حضرات اپنی فکر و نظر اور عمل و کردار میں جس قدر اس حقیقت کو پیش نظر رکھیں گے اسی قدر وہ قومی قیادتوں کو اسلام کے اصول و نظریات سے زیادہ ہم آہنگ کر سکیں گے۔

حضرت امام ربانی کی تجدیدی دعوت

محمد سرور

بابر سے پہلے دہلی کے تخت پر جو بھی مسلمان خاندان بیٹھے، ان کی اسلامیت کے بالعموم دو امتیازی نشان تھے، ایک فقہی مشرب میں حنفیت اور دوسرے تصوف۔ گویا حنفیت اور تصوف، یہ اُس دور میں ہندوستان کے مسلمان حکمران طبقوں کا سرکاری مذہب تھا۔ مغل سلطنت کا بانی ظہیر الدین بابر ترکستان یعنی ماوراء النہر سے آیا تھا، جہاں حنفیت بھی پورے زور پر تھی اور اس کے ساتھ ساتھ تصوف کا بھی غیر معمولی اثر و نفوذ تھا۔ ماوراء النہر میں اُن دنوں تصوف کا ایک نیا طریقہ نقشبندی جس کے مؤسس حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبندی تھے۔ فروغ پر تھا، اور عوام کے علاوہ خواص بھی اس کے حلقہ بگوش تھے[1]۔

بے شک یہ زمانہ مطلق العنان بادشاہوں کا تھا۔ اور عام طور سے ایک بادشاہ کا حکم قانون کی حیثیت رکھتا تھا لیکن اس کے باوجود یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ امراء و عمائد جو بادشاہ کے ارد گرد ہوتے تھے۔ اور جو اس کے اقتدار کو عملاً نافذ کرنے کے ذمہ دار تھے، سلطنت کی پالیسیاں بنانے میں ان کا بڑا ہاتھ ہوتا تھا۔ چنانچہ کوئی بادشاہ خواہ وہ کتنا بھی زبردست اور باجبروت کیوں نہ ہوتا اپنے امراء و عمائد کے تعاون کے بغیر وہ زیادہ عرصہ برسرِ

---

[1] شہزادہ داراشکوہ اپنی کتاب "سفینۃ الاولیاء" میں حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبندی کے حالات میں لکھتا ہے: حضرت کے مریدین باصفا کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ماوراء النہر کے اکثر و بیشتر باشندے آپ ہی کے مریدوں میں شامل ہیں۔ شریعت مطہرہ کی پابندی آپ کا شعار تھا حنفی المذہب شیخ تھے اور امام اعظم ابو حنیفہ سے آپ کو خصوصی عقیدت تھی۔ اس سلسلے کے جتنے بھی مشائخ گزرے ہیں وہ سب کے سب حنفی المذہب تھے۔ (اردو ترجمہ)

اقتدار نہیں رہ سکتا تھا۔؎

بابر کے بعد ہمایوں اور ہمایوں کے بعد اکبر آتا ہے۔ اپنے باپ کے تلخ تجربے کے بعد اکبر نے یہ ضروری سمجھا کہ وہ کاروبار سلطنت میں تمام تر انحصار اپنے ترکمانی و تورانی سرداروں پر نہ رکھے بلکہ وہ اس وسیع و عریض برصغیر میں مغل سلطنت کو مستحکم بنیادوں پر کھڑا کرنے کے لئے دوسرے با اثر عناصر سے بھی مدد لے، اس طرح ایک طرف سے راجپوت اور دوسری طرف سے ایرانی امراء اکبر کی سلطنت میں شریک ہوتے ہیں، اور وہ تورانی، افغانی، راجپوت اور ایرانی سرداروں اور امیروں کی مدد سے عظیم مغل سلطنت کی بنیاد رکھنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ ہندوستان کے ان مختلف نسلوں، ملتوں اور مذہبی فرقوں کے حکمراں عناصر کو جن پر کہ مغل سلطنت قائم تھی، بادشاہ کا وفادار رکھنے کے لئے کسی قسم کی ایک ذہنی ہم آہنگی جسے اس زمانے میں "آئیڈیالوجی" کہا جاتا ہے، چاہیئے تھی، چنانچہ وہ اس شکل سے پیدا کرنے کی کوشش کی گئی، جو تاریخ میں "دین الٰہی" کے نام سے مشہور ہے۔ سلطنتوں کے بانیوں کو اکثر ایسے حالات سے دو چار ہونا پڑتا ہے۔ مامون الرشید نے ایرانیوں اور عربوں کو ہم آہنگ کرنے کے لئے معتزلیت کی حوصلہ افزائی کی، لیکن وہ فکر زیادہ عرصہ تک پنپ نہ سکا۔ اس سے پہلے اموی فرمانرواؤں نے عرب قبیلوں کو باہم لڑا کر اپنا اقتدار بحال رکھنا چاہا تھا۔ لیکن اس کی وجہ سے نہ صرف امویوں کے ہاتھ سے بالکل ان عرب قبائل کے ہاتھوں سے بھی اقتدار جاتا رہا۔ اور عباسی خاندان غیر عرب عناصر کی مدد سے برسر اقتدار آگیا۔

؎ دورانِ گفت گو میں ایک دفعہ مولانا عبیداللہ سندھی نے فرمایا:۔ داراشکوہ کی شکست کے بعد جب شاہ جہاں آگرے کے قلعے میں محصور ہو گیا، تو اس نے عالمگیر کو ملنے کے لئے بلایا، لیکن وہ امراء و عمائد جو عالمگیر کے ساتھ مل کر داراشکوہ کے خلاف لڑے تھے، وہ اس میں مانع ہوئے اور انہوں نے باپ بیٹے کی ملاقات نہ ہونے دی۔ بقول مولانا مرحوم اُس مطلق العنان شاہی دور میں بھی ایک حکمراں طبقہ ہوتا تھا، جس کی مدد سے بادشاہ حکومت کرتے تھے۔ البتہ یہ طبقہ امراء و عمائد کا تھا جنہیں اس دور کا حکمراں طبقہ کہا جا سکتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ مغل سلطنت کی بنیادوں کو مضبوط بنانے کے لئے اکبر نے جو پالیسی اختیار کی وہ کوئی انوکھی نہیں تھی کہ اس پر آج ہم بہت زیادہ بگڑیں اسے دراصل استحکام سلطنت کے لئے اس وقت کے زیادہ سے زیادہ بااثر عناصر کے تعاون کی ضرورت تھی، اور اس تعاون کو حاصل کرنے کی راہ اسے یہی نظر آئی تھی اور یہ واقعہ ہے کہ جب تک اکبر کے جانشینوں کو ان تمام عناصر کا تعاون حاصل رہا وہ داخلی طور سے بھی مضبوط رہے، اور باہر سے بھی ان پر حملے نہیں ہو سکے لیکن جیسے ہی اکبر کی سیاسی پالیسی کو شکست ہوئی مغل سلطنت کا شیرازہ بھی بکھرنا شروع ہو گیا۔

بہر حال اکبر کی اس سیاسی پالیسی کو جس آئیڈیالوجی کے ذریعہ فکری تقویت دینے کی کوشش کی گئی اس کے خلاف مسلمان حکمران طبقوں کا شدید ردّ عمل ہوا۔ اور بتدریج اس کی مخالفت بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ عالمگیر اورنگ زیب کا دورِ حکومت آتا ہے، جو اکبر کی اس فکری اساس کا بالکل ضد تھا۔ اس ردّ عمل کو ایک مثبت تحریک کی شکل میں بدلنے کا سہرا اگر ایک طرف تورانی اور ان کے ہم خیال دوسرے امراء و عمائد پر ہے تو دوسری طرف اس میں نقشبندی سلسلے کے بزرگوں کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔

تصوّف کے چشتی، سہروردی اور قادری سلسلوں کے برعکس جو بالعموم شاہی درباروں سے دور ہی رہنا مناسب سمجھتے تھے نقشبندی سلسلے کے بزرگ مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے ارباب اقتدار سے ربط ضبط رکھنا ضروری قرار دیتے تھے چنانچہ اس سلسلے کے ایک مشہور بزرگ خواجہ عبیداللہ احرار کا ایک قول حضرت مجدد الف ثانی نے کئی مکتوبات میں نقل کیا ہے۔

"اگر ما شیخی مے کردیم۔ دریں روزگار ہیچ شیخ مریدے نیافت، لیکن ما را کارِ دیگر فرمودہ اند کہ مسلماناں را از شرِ ظلم نگاہداریم۔ بواسطۂ ایں بپادشاہاں بایست اختلاط کردن و نفوس ایشاں را مسخر گردانیدن و بتوسط ایں عمل مقصود مسلمین برآوردن[1]"

خواجہ بہاؤالدین نقشبند کے اتباع میں سے خواجہ عبیداللہ احرار کی روحانیت سے مستفید اسی نقشبندی

---

[1] ردِ کوثر

سلسلے کے ایک بزرگ خواجہ محمد باقی اللہ انہی دنوں دہلی تشریف لائے۔ ان کے عقیدت مندوں میں عہد اکبری کے بڑے بڑے سردار اور امرا شامل تھے، بالخصوص نواب مرتضیٰ خاں[1] جن کی مدد سے جہانگیر کی تخت نشینی کے سب مراحل طے ہوئے اور جنہوں نے جہانگیر سے پاس شریعت کا عہد لیا۔ حضرت خواجہ کے بڑے معتقد تھے ان کے علاوہ طبقہ امراء کے اور با اثر افراد بھی خواجہ باقی اللہ سے عقیدت و ارادت رکھتے تھے حضرت مجدد الف ثانی انہی خواجہ صاحب کے مرید اور تربیت یافتہ تھے چنانچہ رود کوثر کے مصنف کے الفاظ ہیں۔

"حضرت خواجہ باقی اللہ نے ہندوستان میں نقشبندیہ سلسلے کی مستحکم بنیاد رکھ دی اور طبقۂ امراء میں مذہب سے وہ انس پیدا کر دیا جس کے سامنے اکبر کے مذہبی خیالات کا فروغ ناممکن تھا لیکن انہیں بہت دن جینا نصیب نہیں ہوا۔ ان کے کام کی کما حقہ تکمیل ان کے بلند اقبال اور بلند ہمت مرید حضرت مجدد الف ثانی نے کی، جنہوں نے ہوا کا رخ ایک جانب سے بالکل دوسری سمت پھیر دیا۔"

---

[1] نواب مرتضیٰ خاں شیخ فرید بخاری سید تھے دور اکبری کے آخر میں ان کا اثر و رسوخ بہت بڑھ گیا تھا جہانگیر کے عہد میں وہ سب امرا پر بازی لے گئے تھے۔

خواجہ باقی اللہ کے ذریعہ سلسلۂ نقشبندیہ کو ہندوستان میں مستحکم کرنے میں ان کا بڑا ہاتھ تھا عبدالرحیم خانخاناں بھی حضرت خواجہ صاحب کا معتقد تھا۔ ایک اور امیر صدر جہاں تھے۔ ان کو بھی حضرت نے ذکر کی تلقین فرمائی۔ عہد اکبری کا ایک سربرآوردہ سردار قلیج خاں تھا جو بڑا متدین مسلمان تھا۔ جب وہ لاہور کا گورنر تھا تو ہر روز مدرسے میں جاکر تین گھنٹہ تک فقہ و تفسیر و حدیث کا درس دیتا اور علوم شرعی کی ترویج کرتا۔ اس کے بھی حضرت خواجہ باقی اللہ سے گہرے تعلقات تھے۔ ایک اور امیر حسام الدین جو ابوالفضل و فیضی کے بہنوئی تھے، سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر آپ سے متعلق ہو گئے۔ اور ان کی بیوی یعنی ابوالفضل و فیضی کی بہن حضرت خواجہ باقی اللہ کی خانقاہ کے خرچ کے لئے برابر نذرانہ بھیجتی رہی۔

(رود کوثر)

غرض ان نقشبندی بزرگوں اور ان کے عقیدت مند بڑے بڑے امراء کی کوششوں سے وہ سیاسی، تہذیبی ذہنی اور مذہبی رجحان جو اکبر کی پالیسیوں کا قدرتی نتیجہ تھا، نہ صرف رک گیا' بلکہ ہوا کا رخ دوسری طرف مڑ گیا' اور اکبر کے جانشین یکے بعد دیگرے اس سے زیادہ دور ہوتے گئے۔

حضرت خواجہ باقی اللہ کی طرح حضرت مجدد الف ثانی کے بھی امراء سے بڑے گہرے تعلقات تھے، چنانچہ ان کے بہت سے مکتوبات انہی عقیدت مند امراء کے نام ہیں، جن میں وہ انہیں اکثر ترویج شریعت کی تلقین کرتے ہیں[1] ایک خط میں شیخ فرید کو لکھتے ہیں:- کہ "دولت اسلام کی جو مانع طاقت تھی، اسے زوال آگیا اور بادشاہ اسلام[2] کے جلوس کی بشارت خاص و عام کے کانوں تک پہنچ گئی ہے۔ اب اہل اسلام کو بادشاہ کا ممد و معاون ہونا چاہیئے اور ترویج شریعت اور تقویت ملت کی طرف رہنمائی کرنی چاہیئے۔" اکبر اور اس کے بعد ایک حد تک جہانگیر کے عہد میں شیعیت اور ہندویت کا جو اثر بڑھ گیا تھا آپ اس کے سدباب میں بھی بڑے کوشاں تھے۔ اور اس معاملے میں آپ کا لہجہ کافی سخت تھا، اپنے ایک مکتوب میں شیخ فرید کو لکھتے ہیں:-

پس اسلام کی عزت کفر اور کافروں کی خواری میں ہے، جس نے اہل کفر کو عزیز رکھا، اس نے اہل اسلام کو خوار کیا' ان کے عزیز رکھنے سے فقط تعظیم کرنا اور بلند بٹھانا ہی مراد نہیں، بلکہ اپنی مجلسوں میں جگہ دینا اور ان کی ہم نشینی کرنا اور ان کے ساتھ گفت گو کرنا سب اعزاز میں داخل ہے۔ کتوں کی طرح ان کو دور کرنا چاہیئے' اور اگر دنیاوی اغراض ان کے متعلق ہوں، جو ان کے بغیر حاصل نہ ہوتی ہوں، تو پھر بھی بے اعتباری کے طریق کو مدنظر رکھ کر بقدر ضرورت ان کے ساتھ میل جول رکھنا چاہیئے۔ اور کمال اسلام تو یہ ہے کہ اس دنیاوی غرض سے بھی

---

[1] عبدالرحیم خانخاناں کے نام ۱۴ - حسام الدین کے نام ۱۵ - شیخ فرید بخاری نواب مرتضیٰ کے نام ۲۱ اور مرزا فتح اللہ حکیم کے نام ۳ مکتوب ہیں۔ اسی طرح ممتاز امراء میں مندرجہ بالا امراء کے علاوہ مرزا داراب، صدر جہاں محمد قلیچ خاں، مرزا ایرج، خان اعظم، حکیم صدرا وغیرہ شامل ہیں۔ ان سب کے نام مکتوب کی تعداد ۱۰۰ سے اوپر ہی ہے (حیات مجدد از پروفیسر محمد فرمان ایم اے)

[2] یعنی جہانگیر

درگزریں اور ان کی طرف نہ جائیں" (ترجمہ[1])

انہیں شیخ فرید کے نام اور ایک خط ہے، جس میں ان کے نیک کاموں کی تعریف کرنے کے بعد لکھا ہے :۔ اسلام اور اہل اسلام کی عزت کفر اور اہل کفر کی خواری میں ہے۔ جزیہ سے مقصود کفار کی خواری اور ان کی اہانت ہے۔ جس قدر اہل کفر کی عزت ہو اسی قدر اسلام کی ذلت ہوتی ہے۔ اس سر رشتہ کو اچھی طرح نگاہ میں رکھنا چاہیئے اکثر لوگوں نے اس سر رشتہ کو گم کر دیا ہے، اور دین کو برباد کر دیا ہے[2]"

جہانگیر نے شیخ فرید کو کانگڑے کی مہم پر بھیجا تھا۔ اس موقع پر ان کے نام حضرت مجدد نے ایک خط لکھا ہے جو موصوف کے نام حضرت مجدد کا آخری خط ہے۔ کانگڑے میں ہندوؤں کا ایک بڑا تیرتھ تھا جس میں پرانی مورتی تھی۔ حضرت مجدد کی بڑی خواہش تھی کہ شیخ فرید اس بت کو توڑ دیں۔ اور اس تیرتھ کی اہانت کریں چنانچہ لکھتے ہیں :۔ ان بدبختوں اور ان جھوٹے خداؤں کی تحقیر اور توہین میں بہت کوشش کرنی چاہیئے اور ظاہر اور باطن میں جس قدر ہو سکے، ان لوگوں کی بربادی کی کوشش کرنی چاہیئے۔ امید ہے کہ بعض سستیاں جو آپ سے وقوع میں آئی ہیں اس عمل سے ان کی تلافی اور کفارہ ہو جائے گا۔ بدن کی کمزوری اور سردی کی شدت مانع ہے۔ ورنہ فقیر خود حاضر خدمت ہو کر اس امر کی ترغیب دیتا اور اس تقریب سے اس پتھر پر تھوکتا اور اس کو اپنی سعادت کا سرمایہ جانتا[3]"

ایک اور خط مرزا جعفر بیگ کے نام ہے، جس میں لکھتے ہیں :۔ "میرے مخدوم! جب کفار قریش نے اپنی کمال بدنصیبی سے اہل اسلام کی ہجو اور برائی میں کمال مبالغہ کیا تو حضرت پیغمبر علیہ وعلی آلہ الصلوٰۃ والسلام نے اسلامی شاعروں کو حکم دیا کہ کفار ننگوں سار کی ہجو کریں"۔ ایک ہندو ہروے رام نے حضرت مجدد کے نام اپنے دو خطوں میں فقراء و صوفیہ سے محبت کا اظہار کیا اور لکھا کہ رام اور رحمان حقیقت میں ایک ہیں۔ اس کے جواب میں حضرت مجدد نے لکھا۔ "..... رام و کرشن وغیرہ جو ہندوؤں کے معبود ہیں۔ اس (پروردگار) کی کمینہ مخلوقات میں سے ہیں۔ اور ماں باپ سے پیدا ہوئے ہیں رام جسرتھ کا بیٹا اور لچھمن کا بھائی اور سیتا کا خاوند ہے۔

---

[1] رودِ کوثر

[2] رودِ کوثر [3] رودِ کوثر

جب رام اپنی بیوی کو نگاہ میں نہ رکھ سکا تو پھر دوسرے کی کیا مدد کرسکتا ہے۔[1]

حضرت مجدد کے مکتوبات میں سے یہ اقتباسات دینے کے بعد مصنف رود کوثر لکھتے ہیں :۔ حضرت مجدد کا غیر مسلموں کے متعلق جو خاص نقطہ نظر تھا (اور جو فی الحقیقت ہندوؤں کی جارحانہ احیائی تحریک کے خلاف ردّ عمل تھا) اس کا ایک اثر یہ ہوا کہ اکبر کے زمانے سے ہندوؤں کی تالیف قلب کے لئے جو مصالحانہ کوششیں ہوئی تھیں، ان کے خلاف ردِ عمل شروع ہوا۔ اکبر کے زمانے میں جزیہ موقوف ہوا تھا۔ اور ذبح بقر پر پابندیاں لگائی گئیں۔ حضرت مجدد کو یہ دونوں باتیں ناگوار تھیں۔ اور ان کی بڑی خواہش تھی کہ جزیہ نئے سرے سے لگایا جائے اور ذبح بقر عام طور پر رائج ہو۔ کئی خطوں میں اس بات پر افسوس کیا ہے کہ ہندوؤں سے جزیہ لینا برطرف کر دیا گیا ہے ایک خط میں شیخ فرید کو لکھتے ہیں "جزیہ از اہل کفر[2] کہ در ہندوستان برطرف شدہ است، بواسطۂ شومیٔ مصاحبتِ اہل کفر است با سلاطین ایں دیار"۔ ایک اور خط میں ذبح بقر کی تائید کی گئی ہے۔ "ذبح بقر در ہندوستان از اعظم شعائر اسلام است۔ در ابتدائے بادشاہت اگر مسلمانی رواج یافت فبہا و اگر عیاذاً باللہ سبحانہ' در توقف افتاد کار بر مسلمانان بسیار مشکل خواہد شد" جہانگیر اور شاہ جہاں نے تو ملکی مصلحتوں کی بنا پر ان خیالات پر عمل نہیں کیا، لیکن اورنگ زیب نے جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ حضرت مجدد کے خلیفہ خواجہ محمد معصوم کا مرید تھا، حضرت مجدد کی بیشتر خواہشیں پوری کر دیں۔ اور جزیہ اور ذبح بقر کے متعلق وہی احکام جاری کئے، جن کی حضرت مجدد کو تمنا تھی؛

ہندوؤں کی طرح "شیعوں کی مخالفت بھی حضرت مجدد کی تعلیمات کا ایک ضروری جزو تھی۔ اور وہ خلفائے اربعہ کے احترام میں ذرا بھی کمی گوارا نہ کرتے تھے۔ ایک دفعہ شہر سامانہ کے خطیب نے خطبۂ عید کے دوران خلفائے راشدین کا نام نہ لیا تو آپ نے فوراً اس شہر کے مشائخ و قضاۃ کو خط لکھا کہ خطیب کی اس فروگذاشت پر اس کے ساتھ سختی کیوں نہ کی گئی۔۔۔۔۔ خواجہ محمد معصوم کا بھی اس مسئلے میں وہی طرز عمل تھا، جو ان کے والد بزرگوار کا تھا ان کے مکتوبات میں ایک اہم خط ہے (دفتر اوّل شمارہ ۲۲۱) جو کہا جاتا ہے کہ انہوں نے شاہزادہ اورنگ زیب کو لکھا

---

[1] رود کوثر

[2] حضرت مجدد نے ہندو کے لئے ذمی کا لفظ کہیں نہیں استعمال کیا۔ ہمیشہ اہل کفر کہتے ہیں۔

اور جس میں تکفیر روافض اور ان کو قتل کرنے کے حق میں کئی حدیثیں درج کی ہیں۔ ایک حدیث ہے۔

ابو داؤد میں لکھا ہے کہ ابن عباس نے روایت کی کہ آخری زمانے میں ایسے لوگ ہوں گے، جن کو روافض کہیں گے۔ جو اسلام کی توہین کریں گے۔ ان کو قتل کرنا۔ کیونکہ یہ مشرک ہوں گے۔"[1]

شیعہ سنی اختلافات میں شدت کی یہ نوعیت دراصل ماوراء النہر کی سرزمین کا اثر ہے، جہاں ایران اور توران کی پرانی مخالفت نے یہ شکل اختیار کرلی تھی۔ عہد مغلیہ میں شیعہ سنّی مناقشات زیادہ تر نقشبندیہ سلسلے کی ایک اور شاخ کے ذریعہ ظہور پذیر ہوئے۔ ہندوستان میں اس سلسلے کے بانی ... حضرت خواجہ ایشاں تھے، جو شیخ سرہندی کے ہم عصر تھے، وہ بخارا میں پیدا ہوئے۔ وہیں تعلیم پائی۔ اور سمرقند ہوتے ہوئے ہندوستان تشریف لائے ..."

اکبر کی پالیسیوں کے خلاف جو ردّعمل ہوا، اور اس ضمن میں نقشبندی بزرگوں اور ان کے معتقد ارباب اقتدار نے جو طریقۂ کار اختیار کیا، جس کا مختصراً ذکر اوپر ہے، اس کے بارے میں ظاہر ہے دو رائیں ہو سکتی ہیں۔ ایک فریق کے نزدیک یہ حضرت مجدد کی مساعی جمیلہ تھیں، جن کی بدولت دور اکبری کا عظیم ترین دینی فتنہ فرو ہو سکا اور اس کے بعد اس سرزمین میں اسلام کو نئی زندگی نصیب ہوئی۔ چنانچہ حضرت مجدد الف ثانی حقیقتاً دوسری ہزار دین ہجری کے مجدد تھے اور اللہ نے انہیں بروقت خبردار کیا تھا۔"

مولانا مناظر احسن گیلانی حضرت مجدّد کے اس کارنامے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں "... وہ (لہر) جاری ہوئی بلکہ اور بڑھتی چڑھتی رہی۔ تا اینکہ ایک صدی بھی پوری نہ گزرنے پائی تھی کہ اس کی یہی تجدیدی لہر ایک بحرِ بیکراں کی شکل میں ٹھاٹھیں مارتی ہوئی آفاق کے کناروں سے ٹکرانے لگی۔ جس مغل بادشاہ نے فقیہہ کا ترجمہ بزور شمشیر "احمق" مشہور کیا تھا، خدا کی شان دیکھو کہ اسی کے تخت پر اس کا حقیقی پوتا اس تجدیدی معرکے کے بعد بیٹھتا ہے اور قرآن و حدیث تو بڑی چیزیں ہیں، دینی و علمی حیثیت سے جس کا درجہ نسبتاً فروتر ہے۔ یعنی فقہ اور فقہاء جنہیں اس کے دادا نے اپنی آنکھوں سے گرایا تھا۔ انہیں وہ اپنے سر پر بٹھاتا ہے[2] ..."

---

[1] ردِ کوثر [2] تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ

مولانا مودودی اپنی کتاب "تجدید احیائے دین" میں حضرت مجدد کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں "۔۔۔۔ وہ ایک اکیلا شخص تھا جو وقت کے ان فتنوں کی اصلاح اور شریعت محمدی کی حمایت کے لئے اٹھا اور جس نے شاہی قوت کے مقابلے میں یک و تنہا احیائے دین کی جدوجہد کی ۔۔۔ جہانگیر جس نے سجدۂ تحیہ نہ کرنے پر شیخ کو گوالیار کے قید خانہ میں بھیج دیا، آخر کار شیخ کا معتقد ہوگیا اور اپنے بیٹے خرم کو، جو بعد میں شاہ جہاں کے لقب سے مشہور ہوا، اس کے حلقۂ بیعت میں داخل کیا۔۔۔ شیخ کی وفات کے تین سال بعد عالمگیر پیدا ہوا اور وہ غالباً شیخ ہی کے پھیلائے ہوئے اصلاحی اثرات تھے جن کی بدولت تیموری خاندان کے اس شاہزادے کو وہ علمی اور اخلاقی تربیت مل سکی کہ اکبر جیسے ہادم شریعت کا پرپوتا خادم شریعت ہوا۔۔۔"

"تذکرہ" میں ایک زمانہ ہوا، مولانا ابوالکلام آزاد نے حضرت مجدد کے اصل کارناموں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا تھا:- "۔۔۔۔ دوسری طرف عہد اکبری کی بدعات تخت و تاج حکومت کے زور سے ہر طرف پھیل چکی تھیں اور علمائے سوء و مشائخ دنیا پرست خود ان کے احداث و اشاعت کے نقیب تھے۔ کون تھا کہ اس وقت امن و عافیت کے مدرسوں اور سلطانی و فرمانروائی کی خانقاہوں سے نکلتا اور دعوت و اصلاح کی امتحان گاہوں میں قدم رکھتا اور پھر نصرت الٰہی کے لشکروں اور نفوذ باطنی کے سامانوں سے ایسا مسلح ہوتا کہ نہ شہنشاہِ ہند کا تاج و تخت اس کی راہ روک سکتا اور نہ وقت کی حکمرانی و فرمانروائی اس کے سلطانِ حق و سطوتِ الٰہی پر غالب آسکتی۔۔۔"

مولانا ابوالحسن علی ندوی نے حضرت مجدد کو یوں خراجِ تحسین پیش کیا ہے :- "حقیقت یہ ہے کہ اگر ہندوستان میں اللہ تعالیٰ دو شخصوں کو پیدا نہ کرتا اور ان سے اپنے دین کی دستگیری نہ فرماتا، تو یوں تو اللہ تعالیٰ اپنے دین کا نگہبان ہے، اس کی حفاظت دین کے طریقے ہزار ہیں، لیکن بظاہر تیرھویں صدی تک یا تو اسلام ہندوستان سے بالکل فنا ہو جاتا یا اتنا بگڑ جاتا، جتنا ہندو مذہب۔ یہ دو بزرگ ہندوستان کے مسلمانوں کے جلیل القدر محسن اور اسلام کے عظیم الشان پیشوا حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ اور شیخ الاسلام شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ احیائے اسلام اور خدمت شرع کے تذکرے میں ان نائبان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور درویشوں کے ساتھ ایک دنیادار بادشاہ محی الدین اورنگ زیب عالمگیر مرحوم

کا نام بھی زبان پر آتا ہے[1]"

یہ تو ایک فریق کی رائیں ہوئیں اور عوام کے علاوہ خواص کی بھی غالب اکثریت اسی طرف گئی ہے لیکن ایک فریق جو بہت مختصر ہے، وہ ان واقعات کو بتمام وکمال اس نظر سے نہیں دیکھتا۔

مولانا عبیداللہ سندھی حضرت مجدد صاحب اور شاہ ولی اللہ صاحب کے تجدیدی کارناموں پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں :- " اُن (شاہ ولی اللہ) کے نزدیک اکبر کا کام سب مذاہب اور ساری قوموں کو باہمی منافرت اور عداوت کے بجائے دوستی و آشتی کے رشتے میں پرونا تھا۔ چنانچہ اس کا یہ اقدام عین صواب تھا کیونکہ مختلف مذاہب اور دوسری ملتوں کے متعلق اس قسم کا جامع انسانیت تصور رکھے بغیر کوئی بین الاقوامی اور وسعت پذیر نظام وجود میں نہیں آسکتا۔ اور اکبر کو اس میں ابن عربی کے وحدت الوجود کے فکر سے مدد ملی چنانچہ یہ تصور انسانیت کے بقا اور اس کی ترقی کے لئے بے حد مفید ہے"[2]

اکبر کے اس جامع انسانیت اور بین الاقوامی تصور کے برعکس اورنگ زیب عالمگیر نے جس تصور کو مشعل راہ بنایا۔ اس میں ملت اور ملت میں بھی اہل السنت والجماعت کے ایک مخصوص گروہ کی سالمیت واستحکام اور برتری پر زیادہ زور تھا۔ بقول مولانا سندھی کے، اسے اس مقصد کے لئے حضرت امام ربانی ایسے پیر و مرشد مل گئے، جنہوں نے ابن عربی کے وحدت الوجود کے مقابلے میں اپنا وحدت الشہود کا تصور پیش کیا اور ساتھ ہی ایک روحانی پیشوا اور اسلام کے مجدد کی حیثیت سے مسلمانوں میں غیر معمولی جوش اور ولولہ پیدا کر دیا ان کی کوششوں سے جہانگیر اور شاہ جہاں کے زمانوں میں اکبری طریقہ کار میں بعض تبدیلیاں ہوئیں اورنگ زیب عالمگیر کی کامیابی بہت حد تک اس تصور والے گروہ کی رہین منت تھی، چنانچہ اس کے بادشاہ بننے سے سلطنت میں اس گروہ کو اپنے حریف راجپوتوں اور شیعوں پر پورا غلبہ حاصل ہو گیا"[3]

---

۱ سیرت سید احمد شہید

۲ تعلیمات مولانا عبیداللہ سندھی

۳ تعلیمات مولانا عبیداللہ سندھی

حضرت مجدد الف ثانی کی دعوت تجدید اور ان کی اصلاحی کوششوں کا عملی نتیجہ دورِ عالمگیر ہے اور اس میں جو مسلک اختیار کیا گیا۔ اس کے بارے میں مولانا سندھی فرماتے ہیں :- عالمگیر کی اس سیاست سے ہندو بدک اٹھے ۔ اور شیعوں میں ناراضی پھیل گئی ۔ اکبر کے عہد سے راجپوت اور شیعہ مغلیہ سلطنت کی دو بڑی طاقتیں بن گئی تھیں ...... اب جو حکومت کا طرز بدلا تو سلطنت سے ان طبقوں کی پہلی سی وفاداری نہ رہی اور ملک کے اندر تفرقہ اور انتشار کے جراثیم پیدا ہونے لگے ...... نتیجہ یہ نکلا کہ جن طبقوں کے بل پر عالمگیری سیاست کا ڈول ڈالا گیا تھا۔ وہ اتنی بڑی سلطنت کا بار اٹھانے کے قابل نہ رہے اور اس طرح مخالفوں کو موقع مل گیا کہ وہ عالمگیر کی آنکھیں بند ہوتے ہی اپنے اپنے علاقوں میں خود مختار بننے کے لئے ہاتھ پاؤں ماریں[۱]"

گویا اورنگ زیب عالمگیر جس تجدیدی دعوت کا عملی پیکر تھا، وہی آخر کار موجب بنی اس خلفشار اور افراتفری کا، جو مغل سلطنت کو لے ڈوبی اور نہ صرف یہ کہ ہندوستان کی مختلف قومیں متحد نہ رہیں، بلکہ خود مسلمانوں میں یکجہتی پیدا نہ ہو سکی۔

مولانا سندھی فرماتے ہیں کہ دراصل عالمگیر کے پیش نظر یہ تھا کہ وہ مسلمانوں کو بحیثیت ایک جماعت[۲] کے منظم کرے اور اکبر کے بین الاقوامی اور جامع انسانیت تصور کو عملی جامہ پہنانے میں جماعتی زندگی کے اندر جو بے عنوانیاں پیدا ہو گئی تھیں، ان سے اسلامی زندگی کو پاک کرے اس کام میں امام ربانی کے فیوض سے اسے رہنمائی ملی لیکن ہندوستان میں اور قومیں، اور مسلمانوں کے اور فرقے بھی تھے۔ اب ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ جہاں ایک طرف مسلمانوں کو بحیثیت ایک جماعت کے منظم کیا جاتا، وہاں دوسری قوموں اور دوسرے فرقوں سے بھی ان کی ہم آہنگی ہوتی۔ کیونکہ جہاں تک زندگی کی اصل ضرورتوں کا تعلق ہے ایک طرف جماعتی و قومی اور دوسری طرف قومی و بین الاقوامی مصلحتوں میں تعارض نہیں ہونا چاہیئے۔ لیکن عالمگیر کے دور میں یہ تعارض پیدا ہوا، اور اس کے نتائج بھی تباہ کن ثابت ہوئے۔ یہاں قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس کی ذمہ داری

۱؎ تعلیمات مولانا عبید اللہ سندھی

۲؎ اس سے مراد اہل السنت والجماعت ہے۔

کم یا زیادہ حضرت امام ربانی کی دعوت تجدید پر نہیں عائد ہوتی، شیخ محمد اکرام صاحب نے بھی رودِ کوثر میں بڑی تفصیل سے اس موضوع پر بحث کی ہے، وہ "حضرت مجدد کی مذہبی خدمات" کے ضمن میں لکھتے ہیں :- .....

"اکبری الحاد کے خاتمے میں اس زمانے کے مسلمان امراء کی کوششوں کو بڑا دخل تھا۔ اور ان مسلمان امراء کو حضرت مجدد جس طرح ترویج شریعت پر آمادہ کرتے رہتے تھے، اس کا ذکر بھی ہم کر چکے ہیں۔ لیکن حضرت مجدد کی کوششیں صرف مسلمانوں کے با اثر طبقے کو اپنے فرائض یاد دلانے اور امراء کے خیالات کی اصلاح تک محدود نہ تھیں۔ انہوں نے عامۃ المسلمین بلکہ جمہور علماء اور صوفیہ کے خیالات کی بھی اصلاح کی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ عہد اکبری کی مذہبی بے قاعدگیوں کے خلاف جو ردِّ عمل ہوا اور شرع و دین نے جو بتدریج دوبارہ فروغ حاصل کیا، اسے حضرت مجدد کی ذات والا صفات سے بڑی تقویت ملی۔

"حضرت مجدد کی ایک اہم اسلامی خدمت یہ ہے کہ آپ نے اس سلسلۂ تصوف کی اشاعت کی جو ہندستان طریقوں میں شریعت سے قریب ترین ہے .....

"اس کے علاوہ نہ صرف آپ نے طریقت کا صحیح سلسلہ اختیار کیا اور اسے ترقی دی، بلکہ طریقت کے مقابلے میں شرع کی اہمیت واضح کر دی۔ چنانچہ آپ تعلیم دینی کو تعلیم سلوک پر مقدم رکھتے تھے .....

"آپ نے عقیدۂ وحدت الوجود کی نئی توجیہ کی اور وحدت الشہود کا نظریہ قائم کر کے مسلمان صوفیاء اور علماء کے اختلافات رفع کر دیئے .....

"شرع کی حمایت اور ترجمانی کے علاوہ آپ کا ایک بڑا کام ردِّ بدعت تھا۔

"..... ردِّ روافض کے نام سے ایک رسالہ لکھا۔ مکتوبات میں نئے فرقے کی مخالفت کی۔ اور خود جہاں جاتے یا جہاں ان کے خلفاء اور مرید ہوتے، اس فرقے کے عقائد کی مخالفت کرتے، یہی وجہ ہے کہ جہانگیر کے مزاج میں نورجہاں اور آصف خاں کو بہت دخل ہونے کے باوجود شیعہ عقائد ہندوستان میں بہت عام نہ ہو سکے۔

"شرع کی ترویج، طریقۂ نقشبندیہ کی اشاعت، شریعت اور طریقت کی تطبیق اور شیعیت کی مخالفت کے علاوہ حضرت نے جو اہم کام کیا، وہ اسلام کا احیاء تھا۔ اس زمانے میں جب عام علماء و مشائخ نے ایک گوشے میں بیٹھ جانا ہی سلامتی کا راستہ سمجھ رکھا تھا، آپ نے جہانگیر کے سامنے سجدہ نہ کر کے قید و بند کی سختیاں

جھیلیں اور اپنی جرأت اور اتباعِ شرع سے مغلوں کے خلاف شرع احکام کا سدِّ باب کیا ......

"حضرت مجدد نے خود احیائے اسلام کی کوشش کی اور اس کے علاوہ ایک ایسا نظام قائم کر دیا، جس سے آپ کے مقاصد کی تکمیل ہوئی۔ آپ کے صدہا خلفا تھے، جو ہندوستان کے کونے کونے میں بلکہ ہندوستان سے باہر بھی آپ کے خیالات کی اشاعت کر رہے تھے ...." علاوہ ازیں رودِ کوثر میں حضرت مجدد کے بعض طریقہ ہائے کار پر تبصرہ کرتے ہوئے شیخ محمد اکرام صاحب نے یہ بھی لکھا ہے۔ "...... ان (حضرت مجدد اور ان کے جانشینوں) سے پہلے بزرگان اہل طریقت نے غیر مسلموں کے ساتھ سختی اور شدت کی تلقین نہیں کی مسلمان بادشاہوں کا ملکی اور فوجی مصلحتوں کی بناء پر ان سے خواہ کیا سلوک ہو، اور فقہا اور علماء ان کے متعلق خواہ کچھ ہی فتوے دیں، لیکن حضرات صوفیہ نے کبھی ان کے خلاف غیظ و غضب کا اظہار نہیں کیا"

اس کے بعد موصوف لکھتے ہیں :- "...... ان خیالات اور ان کی اشاعت کا نتیجہ ہندوستانی مسلمانوں کے لئے نیک نکلا یا برا۔ اس کے متعلق رائیں مختلف ہیں۔ معتقد عہد عالمگیری کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دیکھو اس زمانے میں اسلام کی کتنی شان تھی۔ اس کا عہد اکبری کی بے قاعدگیوں سے مقابلہ کرو اور پھر حضرت مجدد اور ان کے فیض کا قیاس کرو۔ معترض کہتے ہیں کہ ذرا عہد عالمگیری سے آگے بڑھ کر بھی دیکھو ملکی معاملات میں سیاسی مصلحتوں اور فیض عام کے اصولوں کو چھوڑ کر جوش اور غصے کی پیروی کرنے سے حکومت کو جو زوال ہوا اور اس ملک میں اسلامی نظام بالکل درہم برہم ہو گیا، اس کا ذمہ دار کون تھا؟ وہ سکھوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں، جنہوں نے سرہند کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور کہتے ہیں کہ اگرچہ عہد اکبری یا عہدِ جہانگیری میں ہندو بعض پابندیوں سے بری تھے، لیکن اسلام اور اہل اسلام کے لئے وہ زمانہ اچھا تھا یا مرہٹوں اور سکھوں کے عروج کا زمانہ۔"

شاہ ولی اللہ کے حالات بیان کرتے ہوئے ایک اور جگہ موصوف نے لکھا ہے :- "...... حضرت مجدد کی امتیازی خصوصیت ان کی "رگ فاروقیم" یعنی شدید اسلامی احساس ہے وہ بار بار اپنے مکتوبات میں اس ترکیب کو دہراتے ہیں۔ سامانہ کے خطیب نے خلفائے راشدین کا نام خطبہ میں نہ لیا تو حضرت کی رگ فاروقی حرکت میں آئی .... اس طرح کے اور موقع کئی تھے۔ یہ رگ فاروقی ایک بڑی خوبی ہے اور جس وقت

فی الحقیقت اسلام خطرے میں ہو" اس سے بڑھ کر کوئی خوبی نہیں، لیکن شدت احساس میں واقعات کو صاف اور ان کی اصلی صورت میں دیکھنا مشکل ہوتا ہے۔ اور گاہے گاہے انسان صحیح قرآنی اور فلاح قومی کی راہ سے دور جا پڑتا ہے ہم غیر مسلموں کی نسبت حضرت مجدد کے خیالات نقل کر چکے ہیں۔ شیعوں کی نسبت بھی ان کی رائے اسی طرح انتہا پسندانہ تھی، وہ انہیں کافر سمجھتے تھے ...."

شاہ ولی اللہ کے ضمن میں مصنف لکھتے ہیں: "سرہند سے بے شک ایک تحریک اٹھی تھی، جس نے کئی مخلص اور سمجھ دار ہستیوں کو متاثر کیا، لیکن یہ تحریک تجدیدی تھی، اصلاحی نہ تھی۔ اس کی بنیاد اپنی فوقیت کے احساس اور اغیار سے نفرت اور عداوت پر تھی۔ اپنی کوتاہیوں کا ازالہ کرنا اس کا مقصد نہ تھا۔ اور پھر اس تحریک میں مفید ہونے کی جتنی صلاحیت تھی، اس کا راستہ واقعات نے بند کر دیا۔ مشائخیت روحانیت پر غالب آگئی اور تجدیدی تحریک قبوریت کے سراب میں گم ہو گئی ...."

حضرت مجدد نے ابن عربی کے وحدت الوجود کے جواب میں وحدت الشہود کا تصور پیش کیا تھا۔ اول الذکر میں خلق اور خالق کی غیریت پر اتنا زور نہیں دیا جاتا۔ جتنا آخر الذکر میں، اسی لئے وحدت الوجود کا عملی نتیجہ مشرب صلح کل ہے اور اس کے برعکس وحدت الشہود سے ایک خاص گروہ کی برتری کا رجحان پیدا ہوتا ہے۔ ایک میں جمالی رنگ نمایاں ہے دوسرے میں جلالی۔ حضرت مجدد نے سلسلۂ نقشبندیہ کو وحدت الشہود کا تصور دے کر جس رنگ میں رنگا، اس کے بارے میں شیخ محمد اکرام صاحب لکھتے ہیں: "خواجہ باقی باللہ کا طریقہ نقشبندیہ باقویہ۔ اس میں جمالی رنگ زیادہ نمایاں تھا۔ اور اصل زور تزکیۂ نفس اور اصلاح حال پر تھا سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ میں جلالی شان غالب تھی۔ اس کا طریقہ کار احیائی تھا۔"

اسی سلسلہ میں آگے چل کر موصوف لکھتے ہیں: "خاص طریقہ نقشبندیہ مجددیہ کی اشاعت کے علاوہ حضرت مجدد کی تعلیمات ہونے کا ایک بڑا نتیجہ احیائی اور شرعی زندگی کا غلبہ تھا، جو آہستہ آہستہ اسلام میں ظاہر ہوا" نقشبندی سلسلہ جسے ہندوستان میں خواجہ باقی باللہ لائے اور بعد میں ان کے مرید حضرت مجدد نے اسے غیر معمولی وسعت و استحکام دیا، جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے، اس کا اصل مولد و وطن ترکستان یعنی ماوراء النہر تھا جو مشتمل تھا بخارا، سمرقند، تاشقند، خیوہ اور کاشغر وغیرہ کے علاقوں پر چنگیز خاں اور ہلاکو کی تباہ کاریوں کے بعد ان علاقوں

ہیں ترکمانوں کا جنہیں عام طور سے تورانی کہا جاتا تھا، عروج ہوا، اور ایک بار یہ تیمور کی زیر قیادت دہلی سے اناطولیہ تک کے سارے ملک روندتے چلے گئے، اور اس کے بعد بابر فرغانہ سے کابل آتا ہے اور وہاں سے ہندوستان میں مغل حکومت کی بنیاد رکھتا ہے بابر کے ساتھ ظاہر ہے اس کے اہل وطن کی ایک بڑی جمعیت آئی ہوگی۔

بابر سے لیکر مغل حکومت کے اواخر تک ترکستان سے آنے والوں کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ قاضی عبدالغفار حکیم اجمل خاں کے سوانح حیات میں جن کے مورث اعلیٰ بابر کے ساتھ ۱۵۲۶ء کے لگ بھگ ہندوستان آئے، لکھتے ہیں۔

"جب وسط ایشیا سے سمرقند و بخارا کے یہ دَل بادل دہلی کی طرف امنڈ رہے تھے تو ان کے ساتھ ساتھ اس ملک کے لاکھوں سپاہی اور اہل لشکر جن میں ترکان تیموری اور اس ولایت کے ہزارہا خوانین اور سردار بھی شامل تھے، اپنی تہذیب و تمدن کا سرمایہ لے کر ہندوستان میں داخل ہوئے۔ اس ہنگامہ خیز عہد میں جب سمرقند سے دلی اور دلی سے دکن و گجرات و بنگال تک ایک نئی دنیا کے پیدا ہونے کا ساز و سامان تیار ہو رہا تھا۔ خدا جانے ہندوستان میں کتنے مشاہیرِ وقت علماء، فضلاء، سپاہی اور مفکر بابر کے ہم رکاب آئے"

ترکستان سے ان آنے والوں میں اکثر و بیشتر نقشبندی سلسلے کے بزرگوں سے متاثر تھے اور یہ سلسلہ کافی مقبول تھا۔ اور ایک عرصے سے چلا آ رہا تھا۔ حضرت خواجہ بہاءالدین نقشبند خواجگان نقشبند کے سرخیل ہیں[1]۔ مولانا سندھی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ تیمور کو آپ کے ساتھ ربط تھا[2]۔ اسی سلسلے کے ایک بزرگ خواجہ عبیداللہ احرار تھے، جو مولانا چرخی کے مرید تھے، اور وہ حضرت نقشبند سے فیض یافتہ تھے۔ شہزادہ دارا شکوہ ان کے ذکر میں لکھتا ہے۔ "ماوراءالنہر اور خراسان کے باشندے آپ کی بڑی قدر و منزلت کرتے تھے اور

---

[1] سفینۃ الاولیاء از شہزادہ دارا شکوہ

[2] بعض لوگ تیمور کا ایک خواب نقل کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہندوستان پر حملہ کرنے سے اس کا مقصد کفر و شرک کی بیخ کنی تھا۔ وہ "خراسان کے خوشامدی لوگوں کی باتوں میں آکر اپنے آپ کو مجدد بھی یقین کرنے لگا تھا" (آئینہ حقیقت نما از شاہ اکبر خاں نجیب آبادی) ۔ آب کوثر

سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ آپ سے بے شمار کرامات کا ظہور ہوا ہے۔ حضرت مولانا عبدالرحمن جامی آپ کے عقیدت کیش اور ارادت مند تھے[1]

حضرت خواجہ عبیداللہ احرار ملکی سیاسیات میں بھی حصہ لیتے تھے۔ کتاب "مشائخ نقشبندیہ مجددیہ" میں لکھا ہے کہ حضرت خواجہ کو ترویج شریعت و تجدید ملت کے لئے سلاطین سے اختلاط پیدا کرنے کا حکم ہوا۔ آپ والی سمرقند مرزا عبداللہ سے ملاقات کو گئے، اس کے مصاحبین نے آپ کو ملنے نہ دیا اور آپ کے ساتھ حقارت سے پیش آئے، آپ اسی روز متوجہ تاشقند ہوگئے۔ ایک ماہ بعد سلطان ابو سعید مرزا والیٔ سمرقند عبداللہ پر حملہ آور ہوا، اور اسے قتل کر کے سمرقند پر قابض ہوگیا۔ مصنف کا کہنا ہے کہ مرزا موصوف آپ کے پاس تاشقند میں حاضر ہوا تھا۔ اور آپ کی توجہ سے "اس کے پاس بہت سا لشکر جمع ہوگیا اور اس نے سمرقند فتح کیا" اس کے بعد مرزا بابر (بابر) سمرقند پر حملہ آور ہوتا ہے اور محض حضرت خواجہ کی برکت سے اس کا حملہ ناکام رہتا ہے۔ اور اسے مرزا ابو سعید سے صلح کرنی پڑتی ہے۔ اس ضمن میں مصنف حضرت خواجہ کا یہ قول نقل کرتا ہے۔

فرمایا کہ اگر میں پیری کروں تو اس زمانے میں کسی پیر کو مرید نہ ملے لیکن میرے سپرد اور ہی کام کیا ہے۔ مسلمانوں کو ظالموں کے شر سے محفوظ رکھوں اور شریعت کو رواج دوں اور اسی وجہ سے تسخیر سلاطین کرتا ہوں۔ فرمایا اللہ تعالیٰ نے مجھ کو اس قدر قوت عطا فرمائی ہے کہ اگر بادشاہِ ختا کو ایک رقعہ لکھ بھیجوں تو ترک سلطنت کر کے سر و پا برہنہ میرے آستانہ پر حاضر ہو، مگر میں بلا فرمان الٰہی خود نہیں کرتا ہوں۔

---

[1] "اس وقت کتاب تو میرے سامنے نہیں ہے لیکن نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی مدظلہ العالی نے ظہیرالدین بابر پر جو مقالہ لکھا ہے اس میں بابر کے باپ کا ایک واقعہ درج ہے۔ کہ حضرت عبیداللہ احرار کی مجلس میں ایک دن حاضر ہوا اور نوکیلی ہڈی پر اتفاق سے بیٹھ گیا۔ گھنٹوں یہ ہڈی چبھتی رہی لیکن ادباً اپنی جگہ سے ہلا نہیں۔"

(تذکرہ شاہ ولی اللہ از مولانا مناظر احسن گیلانی)

اور ادب بھی یہی ہے کہ اپنے ارادے کو اللہ تعالےٰ کے ارادے کے تابع کرے، نہ کہ اللہ تعالےٰ کے ارادے کو اپنے ارادے کے تابع کرے۔[۱]

خواجہ عبیداللہ احرار کے مرید کے مرید مولانا خواجہ امکنگی ہیں، جن سے خواجہ باقی باللہ حضرت امام ربانی کے مرشد کو انتساب تھا۔ "مشائخ نقشبندیہ مجددیہ" میں ہے کہ عبداللہ خاں والی توران نے مولانا امکنگی کو خواب میں رسول مقبول علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دربار میں دیکھا اور یہ کہ آپؐ نے ایک شمشیر مولانا موصوف کے ہاتھ عبداللہ خاں کو بھیجی چنانچہ صبح کو وہ مولانا کی خدمت حاضر ہوا، اور پھر برابر حاضری دیتا رہا۔ اسی کتاب میں ہے کہ ایک دفعہ سمرقند پر ایک بادشاہ بڑی فوج لے کر چڑھ آیا، لیکن آپ کی دعا و ہمت سے اسے شکست ہوئی۔

بقول مولانا عبیداللہ سندھی، خواجہ عبیداللہ احرار جن کا مولوی جامی اس طرح تعارف کراتے ہیں۔

چو فقر اندر قبائے شاہی آمد　　بتدبیر عبیداللٰہی آمد

ان کے اتباع میں سے خواجہ محمد باقی باللہ خاص ہدایتوں کے ساتھ دلی آتے ہیں اور یہ اکبر اعظم کا دور تھا۔[۲] آپ ترکستان سے لاہور آئے۔ ایک سال تک قیام فرمایا۔ تمام علماء و فضلاء آپ کے شیفتہ ہو گئے۔ بعد ازاں دہلی روانہ ہوئے اور وہاں قلعہ فیروزی میں سکونت اختیار کی۔

خواجہ باقی باللہ کو اگرچہ ہندوستان میں چار پانچ سال سے زیادہ رہنا نصیب نہیں ہوا۔ لیکن جس طرح

---

[۱] مشائخ نقشبندیہ مجددیہ از مولوی محمد حسن نقشبندی

[۲] آپ کو مولانا خواجگی امکنگی رحمۃ اللہ علیہ کی غلامی نصیب ہوئی۔ آپ کو وہ خلوت میں لے جا کر تین دن پے در پے توجہ دیتے رہے، ۔۔۔۔ یہاں تک آپ کی تکمیل ہو گئی ایک دن مولانا نے فرمایا۔ بابا باقی باللہ! تم اب بلاد ہند میں جاؤ۔ وہاں تم سے اس طریقۂ عالیہ نقشبندیہ کی رونق ظاہر ہو گی ۔۔۔۔۔"

(گلزار اولیا از سید عبداللہ شاہ)

اس مختصر سے عرصے میں سلطنت کے بڑے بڑے امراء ان سے متعارف ہو گئے اور وہ خانقاہ کے مصارف کے لئے گراں رقمیں بطور نذرانہ دینے لگے [۱] پھر خواجہ باقی باللہ جیسے ان امراء کا اپنے مرید امام ربانی سے تعارف کرا گئے۔ اس سے بڑی آسانی سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اس دور کے مسلمانوں کے حکمراں طبقوں میں نقشبندیہ سلسلے کی جڑیں کافی دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اور ان پر اس کا بڑا اثر تھا۔ نیز خود اکبر کے آخری زمانے ہی میں یہ امرا سلطنت میں کافی دخیل ہو گئے تھے۔ اکبر کے بعد تو ان کا عمل دخل برابر بڑھتا گیا، یہاں تک کہ عالمگیر انہیں کی مدد سے دارا شکوہ پر غالب آیا اور کلیتہً سلطنت کی پالیسی ان کے رجحانات کے مطابق بن گئی اکبر کے بعد جہانگیر، شاہ جہاں اور عالمگیر کی پالیسیاں جس طرح بتدریج بدلتی چلی گئیں۔ یہ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ کاروبار سلطنت میں ان تورانی [۲] امراء کا جنہیں عالمگیر "برادران ہمشہری بزرگان ماند" کہتا ہے بڑا اثر و رسوخ تھا۔

خواجہ باقی باللہ کابل میں پیدا ہوئے تھے، اور علوم و معارف کی تکمیل انہوں نے ماوراءالنہر میں کی تھی آپ کے بعد حضرت مجدد الف ثانی کے مرید اور خلفاء گو ہندوستان میں تو تھے۔ لیکن ہندوستان سے باہر افغانستان اور ترکستان میں بھی ان کا سلسلہ دور تک پھیل چکا تھا۔ اب اکبر کے بعد ایران کے علاوہ اسلامی دنیا کے یہی دو خطے تھے، جہاں سے تیغ زنوں سے لے کر ارباب علم و قلم تک اپنی قسمت آزمانے کے لئے بڑی کافی تعداد میں

---

[۱] "نواب مرتضیٰ خاں شیخ فرید اور خواجہ (حضرت باقی باللہ) کے تعلقات کچھ اس قسم کے تھے کہ حضرت خواجہ کی زندگی میں ہی نکتہ چین کہتے تھے کہ حضرت خواجہ کی کامیابی شیخ فرید کی وجہ سے ہے" (رود کوثر) حضرت مجدد الف ثانی نے بھی شیخ فرید کے نام اپنے مکتوبات میں حضرت خواجہ کا حوالہ دیا ہے ایک خط میں شیخ فرید کو لکھتے ہیں "حضرت قبلہ گاہی قدس سرہ (یعنی حضرت خواجہ باقی باللہ) فرمایا کرتے تھے کہ شیخ جیو (شیخ فرید) کے حقوق تم سب پر ثابت اور مقرر ہیں۔ اس جمعیت کا باعث آپ ہی ہیں" (رود کوثر)

عبدالرحیم خانخاناں، صدر جہاں، قلیچ خاں اور کئی ایک دوسرے نامور افراد بھی حضرت خواجہ سے ارادت رکھتے تھے۔

[۲] ابوالفضل کے قتل کے بعد اکبر کے سب سے زیادہ حاضر باش اور معتمد شیخ فرید ہی تھے (باقی حاشیہ صفحہ

ہندوستان کا رخ کیا کرتے تھے۔ یہ لوگ خواہ نقشبندی طریقے سے عملاً منسلک نہ بھی ہوتے لیکن عام طور سے جن عقائد، خیالات اور رجحانات کے وہ حامل ہوتے تھے وہ زیادہ تر وہی تھے جن کی نمائندگی اس دور میں حضرت مجدد الف ثانی اور ان سے منتسب اہل معرفت کرتے تھے۔[۳] غرض ہندوستان میں پہلے سے اس خیال کے جو حکمران مسلمان طبقے تھے وہ اور افغانستان اور افغانستان سے اُدھر ماوراءالنہر سے آنے والے یہ نووارد طبقے تھے، جن کی وجہ سے اسلامی برصغیر میں وہ ذہنی فضا اور جذباتی ماحول وجود میں آیا، جس میں اُس وقت بھی حضرت مجدد الف ثانی کی تجدیدی دعوت زیادہ مقبول تھی اور آج بھی ہے، اور جہاں وحدت الوجود کے مقابلے میں وحدت الشہود کا تصور زیادہ دل کش اور ولولہ خیز ہے۔ کیونکہ عملاً یہ منتج ہوتا ہے اسلام کی سیاسی حاکمیت اور مسلمانوں کی بحیثیت مسلمان کے جماعتی برتری و سیادت پر، اور ظاہر ہے یہ چیز ہر مسلمان کو بہت اپیل کرتی ہے۔ البتہ یہ دوسری بات ہے کہ اس نقطہ نظر والوں کے نزدیک حقیقی اسلام صرف ان کے فرقے تک محدود ہو اور سچے مسلمان وہ صرف اپنے گروہ والوں کو ہی سمجھیں۔ بہر حال یہ اسلام کی شان جلالی ہے اور اگرچہ علامہ اقبال نے بہت عرصہ پہلے یہ فرمایا تھا کہ

ہو چکا گو قوم کی شان جلالی کا ظہور ہے مگر باقی ابھی شان جمالی کا ظہور

(بقیہ حاشیہ) اور انہیں ہر قسم کے فرائض سپرد ہوتے تھے۔ خسرو کے بجائے جہانگیر کو بادشاہ بنانے میں بھی ان کے بڑا ہاتھ تھا۔ عہد جہانگیری میں شیخ کا مرتبہ بہت بڑھ گیا اور وہ اپنے ساتھیوں بلکہ تمام اعیان سلطنت سے بازی لے گئے۔ (رود کوثر)

۳ے شاہ ولی اللہ صاحب تصوف کے مختلف طریقوں کی نسبتیں بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔ "طریقہ نقشبندیہ بمنزلہ جوئے است کہ پیوستہ ظاہر می رود و متوسل ایں طریقہ مظہر اسم قوی و مقتدا است درمیان عالم ناسوت" (ہمعات)

ترجمہ۔ طریقہ نقشبندیہ کی مثال ایک ندی کی ہے (جو ظاہرا طور پر برابر ہی جاری ہے۔ اس طریقے سے تعلق رکھنے والا اس مادی عالم میں اسم قوی اور مقتدا کا مظہر ہوتا ہے۔

لیکن مسلمان ذہن کے لئے زیادہ جاذب اب بھی اسلام کی یہی شان جلالی ہی ہے۔

ابن عربی وحدت الوجود کے قائل تھے۔ اس کی وجہ سے دوسرے مذہبوں کی نسبت ان کا جو طرز عمل تھا اس کا اندازہ ان اشعار سے کیجئے۔

آج کے دن سے پہلے میرا یہ حال تھا کہ جس ساتھی کا دین مجھ سے نہ ملتا، میں اس کا انکار کرتا اور اسے اجنبی سمجھتا۔

لیکن اب میرا دل ہر صورت کو قبول کرتا ہے۔ وہ ایک چراگاہ بن گیا ہے غزالوں کی، دیر راہبوں کا، اور آتش کدہ آتش پرستوں کا اور کعبہ حاجیوں کے لئے" اور وہ الواح ہے تورات کی اور صحیفہ ہے قرآن کا، میں اب مذہب عشق کا پرستار ہوں۔ عشق کا قافلہ جدھر بھی چاہے مجھے لے جائے۔ میرا دین بھی عشق ہے، میرا ایمان بھی عشق ہے۔ (ترجمہ)

حضرت مجدد وحدت الشہود کے حامل تھے۔ دوسرے مذاہب کی نسبت ان کا جو خیال تھا اس کا اندازہ اس مکتوب سے ہو سکتا ہے، جو انہوں نے ایک ہندو ہردے رام کو لکھا اور جس میں رام اور رحمان کو ایک سمجھنے کی بڑی خفگی سے تردید کی تھی۔

غرض کہ صوفیائے کرام کی مقدس جماعت نے ہند پاکستان میں اشاعت اسلام کی پوری پوری کوشش اور ان کی مساعی جمیلہ کا یہ نتیجہ ہے کہ ہند پاکستان میں اکثریت ان لوگوں کی ہے جو اس ملک کے رہنے والے تھے اور پھر مشرف بہ اسلام ہوئے۔

کاش مسلم سلاطین، علماء امراء، سپہ سالار نیز دوسرے بااثر طبقے کے لوگ اشاعت اسلام میں پورا حصہ لیتے تو برصغیر کا سیاسی نقشہ ہی اور ہوتا اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ہند پاکستان کی جن قوموں، قبیلوں اور برادریوں نے اسلام قبول کیا تھا، ان کی تعلیم و تربیت اور فلاح و بہبود کا پورا پورا حق ادا نہیں ہوا، بلکہ بعض اوقات تو معاشرے میں دوسرے درجہ پر ان کا شمار ہوا، اگرچہ یہ بات اسلامی تعلیم اور اصولوں کے سراسر خلاف ہے۔"

(مخدوم جہانیاں جہاں گشت - از محمد ایوب قادری)

ایک تعلیمی سند[1]

حضرت شاہ ولی اللہؒ

بسم اللہ الرحمن الرحیم ۔ سب تعریف اللہ کے لئے ہے، جس کی نعمت سے اچھائیاں اتمام پاتی ہیں اور جس کے فضل و کرم پر تمام حالات میں تکیہ کیا جاتا ہے اور افضل ترین درود و سلام پہنچے ہمارے آقا محمدؐ سیّد مخلوقات کو، نیز آپؐ کی آل، آپؐ کے اصحاب اور ان سب مومنین اور مومنات کو جنہوں نے ان کی خلوص دل سے متابعت کی۔

امّا بعد۔ رب کریم کی رحمت کا یہ محتاج احمد المدعو بہ ولی اللہ بن عبدالرحیم (اللہ تعالےٰ اسے سلف صالحین کے

۱؎ پنجاب کے کسی عالم کو جن کا نام شیخ جار اللہ بن عبدالرحیم ہے، حضرت شاہ ولی اللہ نے یہ تحریری سند یا "ڈگری" (اجازہ) عطا فرمائی تھی۔ اصل سند عربی میں ہے اور المسوّی کے مکہ معظمہ کے مطبوعہ نسخے میں شائع کی گئی ہے۔ یہاں اس کا اردو ترجمہ کیا گیا ہے۔

اس ضمن میں مولانا عبید اللہ سندھیؒ کا حاشیہ ملاحظہ ہو:۔

اس اجازہ (سند اور ڈگری) کا یہ نسخہ الصدر الحمید مولانا محمد اسحاق الدھلوی کے وارثوں سے الشیخ عبدالستار الکتبی الہندی کے ہاتھ لگا۔ آخر الذکر ممتاز محدثین اور حرم مکی کے اساتذہ حدیث میں سے ہیں۔ قیاس غالب یہ ہے کہ اجازہ کا یہ نسخہ خود اجازہ دینے والے یعنی امام ولی اللہ دہلوی کے قلم سے ہے۔ باقی حقیقت حال سے اللہ زیادہ باخبر ہے۔

عبید اللہ بن الاسلام السندھی ثم الدھلوی الدیوبندی

ساتھ شامل کرے) کہتا ہے کہ اللہ کے راستے میں میرا یہ نیک بخت بھائی شیخ جاراللہ بن عبدالرحیم، جو اہل پنجاب میں سے ہے، اور کتاب اللہ کی قرائت اور تجوید سے بہرہ ور ہے اور سنت رسول اللہ کا ایک کافی حصہ اخذ کیا ہے، قریباً چھ سال میرے ساتھ رہا اس نے مجھ سے اس مدت میں حفص بن عاصم کی روایت سے قرآن مجید پڑھا۔ اور اس ضمن میں قرآن مجید کے غیر مانوس الفاظ، اس کے معانی اور شان نزول کے بارے میں اسے جو مشکلات پیش آئیں۔ ان کے متعلق اس نے بحث و تمحیص کی۔ میں نے بغیر کسی تفسیر کی طرف رجوع کئے اپنے حافظے سے جو کچھ اسے بتانا تھا، بتایا۔ اور یہ سلسلہ اس وقت تک برابر جاری رہا جب تک قرآن مجید ختم نہیں ہوگیا۔ شیخ جاراللہ بن عبدالرحیم نے مجھ سے تفسیر بیضاوی کے شروع کے بعض حصے سنے اس نے مجھ سے سورۂ بنی اسرائیل سے لے کر سورۃ الاحزاب کے حصے پڑھے۔ اور تفسیر الجلالین سورۂ یونس سے سورۃ الکہف تک مجھ سے پڑھی۔ نیز مجھ سے صحیح البخاری اول سے لے کر کتاب التفسیر تک پڑھی اور اس کے بعض حصے مجھ سے سنے اسی طرح صحیح مسلم اول سے لے کر کتاب البیوع تک اور اس کے آخر کے حصے مجھ سے سنے سنن ابوداؤد اول سے لے کر کتاب الجہاد تک اور جامع الترمذی اول سے لے کر آخر تک مجھ سے پڑھی۔ سنن نسائی اول سے لے کر آخر تک مجھ سے سنی۔ اسی طرح سنن ابن ماجہ اول سے آخر تک مجھ سے پڑھی۔ مسند الدارمی کے مجھ سے اول کے دو تہائی حصے سنے اور آخر کا ایک تہائی مجھ سے پڑھا۔ نیز مجھ سے مسند امام احمد اور مسند عبداللہ بن عمر وغیرہ کا ایک حصہ پڑھا اور مشکوٰۃ کا ایک حصہ اور مصابیح کا ایک حصہ مجھ سے سنا۔ اسی طرح مجھ سے الترمذی کی شمائل نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور الحصن الحصین پوری کی پوری پڑھی۔ موصوف نے مجھ سے بعض میری کتابیں اور رسالے بھی پڑھے، جو میں نے مختلف علوم کے متعلق تالیف کئے ہیں ان میں سے ایک احادیث الموطا پر مشتمل "المسوی" ہے، جو اس نے اول سے آخر تک مجھ سے پڑھا۔ اور آثار الموطاء اور اس کی احادیث کے متعلق امام مالک رحمۃ اللہ علیہ تک اپنا سلسلۂ اسناد ملایا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اکثر مباحث فقہی سے واقفیت بہم کی۔

میری کتابوں اور رسالوں میں سے جو اس نے مجھ سے پڑھے، ایک حجۃ اللہ البالغہ بھی ہے، جو علم اسرار شریعت کے بارے میں ہے۔ نیز مجھ سے "الانصاف فی بیان اسباب الاختلاف"۔ "عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید" نقشبندیہ، گیلانیہ اور چشتیہ، ان تین طریقوں کے اشغال کے بارے میں "القول الجمیل" پڑھی۔ اسی طرح

حدیث نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام پر المسلسلات اور سلسلہ صحابہ میں النخبۃ اور علم اصول تفسیر میں الفوز الکبیر پڑھی

موصوف نے مجھ سے باقی فنون میں سے بھی جو کچھ کہ اس سے میسر ہو سکا، پڑھا اور سنا، جیسے فقہ حنفی میں الہدایۃ کے بعض حصے، علم الکلام میں شرح المواقف کے بعض اجزا، علم اصول حدیث میں النخبۃ اور اس کے مصنف کی شرح، اور اسناد میں شیخ ابراہیم کردی مدنی کی کتاب الامم۔ اس نے مجھ سے تصوف میں عوارف المعارف از اوّل تا آخر پڑھی۔ احیاء علوم الدین کے شروع کے بعض حصے پڑھے اور اس کے علاوہ اور بھی کتابیں پڑھیں جنہیں ان اوراق میں گنانا ممکن نہیں۔

مختصراً جو کچھ اس نے مجھ سے پڑھا یا مجھ سے سنا اور وہ سب جس کی کہ مجھ تک صحیح صحیح روایت پہنچی ہے۔ میں نے اسے پڑھانے کی اجازت دی۔ نیز میں نے اسے خرقۂ فقر پہنایا۔ کھجور[1] اور پانی سے اس کی ضیافت کی۔ اس سے معانقہ کیا اور اسے اشغال صوفیہ کی تلقین کی، جو اس نے مجھ سے اخذ کئے تھے۔ اور خرقۂ فقر پہنانے کی اجازت دی۔

میں اس کے حق میں، اللہ کے لئے، اللہ کے دین کے لئے، اللہ کو گواہ بناتا ہوں کہ وہ مرد صالح ہے۔ دنیا سے اعراض کرنے والا اور نیک اعمال برابر کرنے والا ہے۔ اور اس بات کا حق رکھتا ہے کہ اس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا علم حاصل کیا جائے۔ اور یہ جو ہم نے کہا ہے، اللہ اس کا نگہبان و وکیل ہے۔

میں نے اسے یہ بھی بتایا ہے کہ علمائے متاخرین میں یہ جو سات علماء ہیں، جن میں سے ہر ایک اسناد میں مستحکم مقام رکھتا ہے، میں نے ان سے ان کی مندرجہ ذیل کتابوں کی روایت کرنے کی اجازت لی ہے، اور اس کے لئے میں تعریف کرتا ہوں اللہ کی جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔ یہ سات علماء یہ ہیں۔

الشیخ عیسیٰ المغربی اور ان کی کتاب مقالید الاسانید۔ اور ایک کتاب اور ہے۔ جس میں البابلی کی اسنادیں۔

---

[1] ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث بیان فرمائی اور اس سے پہلے ان کو کھجور کھانے کو دی اور پانی پلایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث ضیافت کے متعلق تھی۔ (مترجم)

الشیخ ابراہیم کردی اور ان کی کتاب الامم - الحسن العجیمی کی کتاب الاسناد - محمد بن محمد بن سلیمان الردانی کی کتاب صلۃ الخلف، الشیخ احمد النخلی کا رسالہ اور الشیخ عبداللہ البصری کا رسالہ

میں نے یہ سطور اوائل ۱۱۰۳ھ کے ماہ محرم کی اکیس تاریخ کو جمعہ کے دن لکھیں۔

راقم فقیر ولی اللہ بن عبدالرحیم، جسے اپنی کوتاہیوں کا اعتراف ہے۔ دعا کرتا ہے کہ اس دنیا اور دوسری دنیا میں اللہ تعالیٰ اس کا حامی و ناصر ہو، اور سب تعریف ہے اللہ کے لئے اوّل میں اور آخر میں اور ظاہراً و باطناً۔

تصوف میں ہمارا سلسلۂ صحبت اور طریقت و سلوک کے آداب میں ہمارے اخذِ علم کا واسطہ صحیح، مشہور اور متصل روایت کے ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک جاتا ہے، گو تصوف کے ان مخصوص آداب اور اشغال کا تعین آپ سے ثابت نہیں۔ اس بندۂ ضعیف ولی اللہ نے خدا اسے مغفرت عطا کرے اور اسے اس کے پیش رو صالحین سے ملائے، اپنے والدِ شیخ اجل عبدالرحیم کی صحبت سے، اللہ ان سے راضی ہو، اور ان کو راضی رکھے، ایک طویل مدت تک فیض حاصل کیا۔ اور ان سے میں نے ظاہری علوم پڑھے اور طریقت کے آداب سیکھے .....

باقی رہی علوم ظاہری کی تحصیل، میں نے تفسیر حدیث فقہ عقائد نحو صرف کلام اصول اور منطق وغیرہ علوم اپنے والد سے پڑھے۔ انہوں نے ان علوم کی چھوٹی کتابیں تو اپنے بھائی ابوالرضا محمدؒ سے پڑھیں اور بڑی کتابیں امیر زاہد ہروی سے جو مشہور حواشی کے مصنف ہیں، پڑھیں۔ انہوں نے مرزا فاضل سے، انہوں نے ملا یوسف کوسج سے، انہوں نے مرزا جان وغیرہ سے، انہوں نے مشہور محقق جلال الدین دوانی سے، انہوں نے اپنے والد اسعد وغیرہ سے، اور انہوں نے علامہ تفتازانی اور علامہ شریف جرجانی کے شاگردوں سے پڑھا۔

حدیث میں مشکوٰۃ المصابیح، صحیح بخاری اور صحاح ستہ کی دوسری کتابوں کی اجازت ثقہ اور مستند عالم حاجی محمد افضل نے مجھے عطا فرمائی .....

(از القول الجلیل مصنفہ شاہ ولی اللہؒ)

شیخ الاسلام ابن تیمیہ

علامۃ الشام الشیخ محمد بہجتہ البیطار[1]

یہ میری حدّ وسعت سے باہر ہے کہ میں علامۃ الشرق امام احمد المعروف بہ ابن تیمیہ حرّانی دمشقی کے علمی کمالات کا احاطہ کر سکوں۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ اپنے زمانے میں اپنے علم اور اصلاحی کوششوں کے ذریعہ تمام دنیا پر چھا گئے۔ ان کی اعلائے کلمۃ الحق اور جہاد کی دعوت سے کون و مکان گونج اٹھے۔ ان کے علوم قافلوں کے ذریعہ دور دور تک پہنچے اور ان کی عادات و شمائل اور ان کے اخلاق و اعمال کی خوشبو نے فضاؤں کو معطر کر دیا امام ابن تیمیہ کی بدولت دمشق کی سرزمین میں اصلاح کا ایک ایسا درخت لگا، جو آگے چل کر بڑا بارآور ہوا۔ اس کے آسمان سے درخشاں سنت کا وہ آفتاب ابھرا، جس نے سب کو روشن کر دیا اور اس دمشق کے اطراف میں ایک ایسی صدائے حق بلند ہوئی، جس سے بدعات و توہمات کے لشکر گھبرا اٹھے۔ اس وقت میرے پیش نظر اس عظیم نابغہ (جینیس) کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے، اسے پورے کا پورا بیان کرنا نہیں۔ میرا مقصد یہاں ان کی علمی خدمات کے انوار سے نور کی ایک شعاع اخذ کرنا ہے، جو ہمارے لئے علمی زندگی کی راہ روشن کر سکے۔

---

[1] علامۃ الشام الشیخ محمد بہجتہ البیطار۔ موصوف نے اس موضوع پر دمشق کے مجمع علمی عربی کے ہال میں لیکچر (محاضرہ) دیا تھا۔ پھر نظر ثانی اور اضافے کے بعد اپنی کتاب "حیاۃ شیخ الاسلام ابن تیمیہ" میں شامل کیا ہے۔ یہ مضمون اسی باب کا اردو میں خلاصہ ہے۔

(مدیر)

امام ابن تیمیہ ۶۶۱ھ دس ربیع الاوّل پیر کے دن حرّان[1] میں پیدا ہوئے۔ جب اس شہر پر تاتاریوں نے قبضہ کیا تو آپ کے والد محترم آپ کو اور آپ کے بھائیوں کو ساتھ لے کر دمشق آ گئے۔ یہ ۶۶۷ھ کا واقعہ ہے۔ ابن تیمیہ نے فقہ اور اصول فقہ کی تحصیل اپنے والد سے کی۔ اس کے علاوہ دوسرے بہت سے علماء سے بھی استفادہ کیا۔ آپ نے عربی ادب ابن عبدالقوی سے پڑھا۔ پھر نحو میں کتاب سیبویہ پڑھی، اور اس کو خوب سمجھا۔ اور اس پر غور و خوض کیا۔ تحصیل حدیث کا اہتمام فرمایا اور صحاح ستہ اور مسند کئی بار اساتذہ سے سنی آپ قرآن کریم کی تفسیر کی طرف متوجہ ہوئے اور اس میں نمایاں مقام حاصل کیا۔ اصول فقہ، فرائض، حساب جبر و مقابلہ اور دوسرے علوم میں پختہ ہوئے۔ کلام اور فلسفہ میں غور و خوض کیا۔ ان میں وہ خود ان کے اصحاب پر بازی لے گئے، اور ان کے جو بڑے اکابر تھے، ان کا رد کیا۔ ابھی آپ بیس سال کے بھی نہیں تھے فتوے اور درس دینے کے قابل ہو گئے اور علم حدیث میں عبور حاصل کر لیا۔ اور اتنی احادیث حفظ کیں کہ آپ کے بارے میں یہ کہا گیا کہ ہر وہ حدیث جسے ابن تیمیہ نہیں جانتے وہ حدیث ہی نہیں۔

اللہ تعالیٰ کے فضل و عنایت سے امام ابن تیمیہ کو مطالعہ کے لئے بہت سی کتابیں ملیں۔ اور انہیں جلد حفظ کرنے اور ادراک و فہم کی قوت بھی عطا ہوئی۔ آپ جس چیز کو ایک بار یاد کر لیتے، پھر وہ بھولتی نہیں تھی امام صاحب نے بہت سے علوم پر کثیر التعداد کتابیں لکھیں۔ تفسیر، فقہ، اصول فقہ، حدیث، کلام اور ارباب بدعات کی تردید، ان سب علوم پر آپ کی تصنیفات ہیں۔ آپ کے مفصل فتاوی ہیں، جن میں مشکل مسائل کے حل پیش کئے گئے ہیں۔ حافظ الذہبی کا بیان ہے کہ امام صاحب کی تصانیف کی مجموعی تعداد پانچسو تک پہنچتی ہے آپ ہی کا کہنا ہے کہ امام صاحب کی نشو و نما نیکی و پرہیزگاری اور خدا پرستی و عبادت کی فضا میں ہوئی۔ آپ کا کھانا اور لباس بڑا سادہ ہوتا تھا۔ آپ کم عمر ہی تھے کہ مدارس اور مجالس میں شریک ہوتے۔ بڑوں سے مناظرے کرتے اور انہیں لاجواب کر دیتے۔ اور اس بارے میں آپ سے ایسی باتوں کا اظہار ہوتا کہ شہر میں جو بڑے بڑے اہل علم تھے، وہ حیران رہ جاتے۔ آپ انیس سال یا اس سے بھی

---

[1] شمالی عراق میں موصل سے مشرق کی طرف حرّان واقع ہے۔

کم کے تھے کہ آپ نے فتوے دینے شروع کردیئے۔ اور اسی عمر میں آپ نے ترتیب وتالیف کے کام کا بھی آغاز کردیا۔ آپ کی اکیس سال کی عمر تھی کہ آپ کے والد محترم کا، جو ممتاز حنبلی ائمہ میں سے تھے انتقال ہوگیا۔ آپ ان کے جانشین ہوئے، اور ان کے فرائض منصبی ادا کرنے لگے۔ اسی وقت سے آپ کا شہرہ بلند ہونا شروع ہوگیا اور دور دور تک آپ کا نام پہنچا،

امام ابن تیمیہ کے مناقب کے بیان میں بہت سے جلیل القدر علماء نے کتابیں لکھی ہیں۔ حافظ المزی کا قول ہے کہ نہ میں نے امام ابن تیمیہ کی مثل کوئی دیکھا، نہ انہوں ہی نے اپنی مثل کوئی دیکھا تھا۔ اور نہ میں نے ان سے بڑھ کر کسی کو اللہ کی کتاب اور اس کے رسول ص کی سنت کا زیادہ عالم اور ان سے زیادہ ان کی اطاعت کرنے والا پایا۔ قاضی ابوالفتح بن دقیق العید کہتے ہیں کہ جب میں ابن تیمیہ سے ملا تو میں نے انہیں ایک ایسا آدمی پایا کہ سب علوم اس کی نظروں کے سامنے ہیں وہ ان میں سے جو علم چاہتا ہے، لے لیتا ہے، اور جسے چاہتا ہے، چھوڑ دیتا ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ میرے خیال میں اللہ تعالیٰ مشکل ہی سے آپ جیسا پیدا کرے گا۔ شیخ ابراہیم الرقی کا قول ہے کہ تقی الدین (ابن تیمیہ) وہ بزرگ ہیں کہ ان سے استفادہ کیا جاتا ہے اور علوم میں ان کی تقلید ہوتی ہے۔ اگر ان کی عمر لمبی ہوتی تو وہ اپنے علم سے دنیا کو بھر دیتے۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ حق پر تھے اور یہ ضروری تھا کہ لوگ ان کی مخالفت کرتے۔ کیونکہ علمِ نبوت کے وارث تھے قاضی القضاۃ ابن الحریری کہتے ہیں کہ اگر ابن تیمیہ شیخ الاسلام نہیں، تو پھر کون شیخ الاسلام ہو سکتا ہے آپ کے بارے میں علمائے نحو کے شیخ ابوحیان کا قول ہے کہ جب میں ان سے ملا تو میں نے پایا کہ ان جیسا شخص میری آنکھوں نے کبھی نہیں دیکھا۔ آپ کی تعریف میں شیخ ابوحیان کے اشعار بھی ہیں۔

الحافظ زملکانی امام ابن تیمیہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔ آپ کو تصنیف وتالیف اور بیان وترتیب میں حُسن آفرینی کا ملکہ عطا ہوا تھا۔ اور اللہ تعالیٰ نے آپ کے لئے علوم یوں نرم کئے جیسے اس نے حضرت داؤد علیہ السلام کے لئے لوہا نرم کردیا تھا۔ جب آپ سے ایک علم کے کسی خاص فن کے بارے میں پوچھا جاتا۔ اور آپ اس کا جواب دیتے تو دیکھنے والا اور سننے والا یوں محسوس کرتا کہ گویا آپ اس فن کے سوا اور کچھ جانتے ہی نہیں اور وہ اس فیصلے پر پہنچتا کہ اس فن میں ان جیسا عالم کوئی نہیں۔ عماد الدین ابوالعباس احمد بن ابراہیم الواسطی

آپ کے متعلق لکھتا ہے :۔ آپ خلفائے راشدین اور ہدایت یافتہ ائمہ کے نمونہ تھے۔ جن کی کہ سیرت کے نقوش دلوں سے محو ہو گئے تھے اور امت ان کے طریقے بھول گئی تھی۔ چنانچہ آپ انہی کے مٹے ہوئے راستے پر چلنے والے اور انہی کے اصول و قواعد کے محافظ تھے۔

قاضی القضاۃ ابو الحسن السبکی کا امام ابن تیمیہ کے بارے میں حافظ الذہبی کے نام ایک خط ہے، جس میں وہ لکھتے ہیں :۔ باقی شیخ کے متعلق آپ کا قول۔ تو جہاں تک اس خاکسار کا تعلق ہے، وہ ان کی قدر و منزلت کی بڑائی، ان کے بحرِ علم کی گہرائی، علوم شرعی و عقلی میں ان کی وسعت، ان کی غیر معمولی ذہانت اور اجتہاد اور ان سب چیزوں میں ان کا اس مقام تک پہنچنا جس کا کہ بیان نہیں کیا جا سکتا، ان سب کا معترف ہے۔ اور یہ خاکسار ہمیشہ یہ کہتا رہا ہے میرے دل میں ان کی عزت اس سے بھی زیادہ ہے کیونکہ ان اوصاف کے علاوہ اللہ تعالےٰ نے انہیں تقویٰ و پرہیز گاری، زہد اور دین داری، حق کی حمایت اور صرف حق کی خاطر اس کو قائم کرنا۔ ان خوبیوں سے بھی سرفراز فرمایا۔ نیز وہ سلف کے طریقوں پر چلنے والے تھے۔ اور ان سے انہیں حصہ وافر ملا تھا۔ ان جیسا اس زمانے میں بلکہ دوسرے زمانوں کا بھی شاذو نادر ہی ہوگا۔

ابن فضل اللہ العمری کہتے ہیں کہ امام ابن تیمیہ کے پاس ہر سال بکثرت روپیہ آتا تھا۔ اور وہ سب کا سب حاجت مندوں پر صرف کر دیتے تھے اس ضمن میں ایک اور روایت ہے ایک ثقہ شخص بیان کرتے ہیں کہ میں ایک دن امام ابن تیمیہ کی مجلس میں بیٹھا ہوا تھا۔ ایک آدمی آیا اور اس نے آپ کو سلام کیا۔ آپ نے دیکھا کہ اس کو عمامے کی ضرورت ہے، آپ نے بغیر اس کے سوال کے، اپنا عمامہ سر اتارا۔ اس کے دو حصے کئے ایک حصہ اسے دے دیا اور ایک خود باندھ لیا۔ اور مجلس میں جو لوگ بیٹھے ہوئے تھے ان کی وجہ سے جھجکے نہیں۔ ایک اور ثقہ شخص کی روایت ہے کہ امام صاحب شہر کی ایک گلی میں سے گزر رہے تھے کہ ایک فقیر نے ان سے سوال کر دیا۔ امام صاحب نے محسوس کیا کہ وہ واقعی حاجت مند ہے، آپ کے پاس اس وقت کچھ نہیں تھا۔ آپ نے اپنے جسم سے ایک کپڑا اتارا، اسے دے دیا اور کہا کہ جاؤ اسے بازار میں بیچ لو۔ ساتھ ہی معذرت کی کہ اس وقت میرے پاس کچھ نہیں۔

امام صاحب بڑے بہادر اور نڈر تھے۔ تاتاریوں کے سلطان قازان کے ساتھ آپ کی ملاقات کا

مشہور واقعہ ہے۔ الکواکب الدریہ میں شیخ کمال الدین کی زبانی بیان کیا گیا ہے کہ میں اس موقع پر شیخ کے ساتھ تھا آپ نے عدل کے متعلق سلطان کو آیات قرآنی اور احادیث نبوی سنانی شروع کیں۔ آپ بڑی بلند آواز سے بول رہے تھے اور باتیں کرتے کرتے سلطان کے نزدیک ہوتے جاتے تھے یہاں تک کہ آپ کے گھٹنے سلطان کے گھٹنوں کو چھونے لگے تھے۔ اس دوران میں سلطان پوری طرح آپ کی طرف متوجہ تھا۔ اور جو کچھ آپ کہتے تھے، اسے سن رہا تھا۔ اس کی نظریں آپ کی طرف تھیں اور آپ سے ہٹتی نہیں تھیں۔ سلطان کے دل میں اللہ تعالیٰ نے شیخ کی جو محبت اور ہیبت ڈال دی تھی۔ اس کی وجہ سے وہ پوچھنے لگا کہ یہ شیخ کون ہے میں نے اس جیسا اور اس سے بڑھ کر مضبوط دل والا کوئی نہیں دیکھا۔ نہ اس سے زیادہ کسی کی باتوں نے میرے دل پر اثر ڈالا ہے اور نہ میں نے اپنے آپ کو اس سے بڑھ کر کسی کا فرمانبردار و مطیع پایا ہے۔ چنانچہ سلطان کو آپ کے اور آپ کے علم و عمل کے بارے میں بتایا گیا۔ شیخ نے ترجمان سے کہا کہ سلطان قازان سے کہو کہ تم اپنے آپ کو مسلمان سمجھتے ہو۔ اور ہمیں معلوم ہوا ہے کہ تمہارے ساتھ قاضی، امام، شیخ اور موذن ہیں۔ اور اس کے باوجود تم نے ہم پر حملہ کیا۔ تمہارا باپ اور تمہارا دادا دونوں کافر تھے۔ لیکن انہوں نے وہ نہیں کیا، جو تم نے کیا، انہوں نے عہد کیا، اور اسے بنھایا تم نے عہد کیا اور اس کی خلاف ورزی کی اور جو کچھ کہا، اسے پورا نہیں کیا۔ شیخ یہ سب کچھ کہہ کر سلطان کے ہاں سے بڑی عزت و احترام سے لوٹے اور ان کی وجہ سے ہی مسلمان قیدی رہا ہوئے۔ شیخ فرمایا کرتے تھے :۔ اللہ کے سوا دوسروں سے وہی ڈرتا ہے جس کے دل میں مرض ہوتا ہے۔

قاضی القضاۃ ابوالعباس بیان کرتے ہیں کہ جب وہ سب سلطان قازان کی مجلس میں پہنچے، تو ان کے سامنے کھانا چنا گیا۔ ابن تیمیہ کے سوا سب نے کھانا کھایا۔ سلطان نے پوچھا آپ کھانا کیوں نہیں کھاتے آپ نے کہا کہ میں تمہارا کھانا کیسے کھاؤں جب کہ یہ سب کچھ تم نے لوگوں کا لوٹا ہے۔ اس کے بعد سلطان نے آپ سے دعا کرنے کے لئے کہا۔ آپ نے دعا کی اور کہا :۔ اے اللہ! اگر تو جانتا ہے کہ یہ اس لئے لڑا ہے کہ تیرا نام بلند ہو اور اس نے تیری راہ میں جہاد کیا ہے تو اس کی مدد کر اور اسے کامیاب بنا۔ اور اگر یہ ملک، دنیا اور کثرت مال کے لئے لڑا ہے، تو اس سے نمٹ۔

الکتبی نے امام کی شجاعت کا ایک اور واقعہ بیان کیا ہے۔ کسی شخص نے آپ سے ایک حاکم قطلوبک کی

شکایت کی کہ اس نے مجھ پر ظلم کیا ہے۔ یہ قطلوبک بڑا جابر تھا۔ لوگوں کے مال زبردستی لے لیا کرتا تھا اور اس کے ظلم و ستم کی بڑی حکایتیں تھیں۔ شیخ اس قطلوبک کے پاس گئے اور اس معاملے میں اس سے بات کی۔ قطلوبک نے کہا۔ میں تو خود آپ کے پاس آنا چاہتا تھا۔ کیونکہ آپ بڑے عالم اور زاہد ہیں۔ یہ بات اس نے دراصل تمسخر کے انداز میں کہی تھی۔ اس پر امام صاحب نے کہا۔ حضرت موسیٰؑ مجھ سے بہتر تھے اور فرعون تم سے زیادہ سرکش تھا۔ اس کے باوجود حضرت موسیٰ دن میں تین بار اس کے دروازے پر جایا کرتے تھے اور اس کے سامنے اسلام پیش کرتے تھے۔

ایک دفعہ جب امام صاحب نے تاتاریوں کو مسلمان قیدی رہا کرنے کو کہا، تو انہوں نے انہیں تو رہا کر دیا، لیکن جو شام و فلسطین سے انہوں نے عیسائی اور یہودی قیدی گرفتار کئے تھے، انہیں رہا نہ کیا، آپ نے کہا کہ یہ عیسائی اور یہودی ہمارے اہل ذمہ ہیں۔ اور تمہیں مسلمان قیدیوں کے ساتھ انہیں بھی رہا کرنا ہوگا۔ چنانچہ امام صاحب نے انہیں بھی رہا کرا یا۔

امام صاحب کی شجاعت کا ایک اور واقعہ ہے جو "الکواکب الدریہ" میں بیان کیا گیا ہے۔ مصر و شام کے فرمانروا ملک ناصر سے آپ کے خلاف چغلیاں کی گئیں۔ چنانچہ اس نے آپ کو اپنے پاس بلوایا اور من جملہ اور باتوں کے یہ بھی کہا کہ مجھے بتایا گیا ہے کہ آپ کی بہت سے لوگوں نے اطاعت کر لی ہے اور آپ کے دل میں ملک پر قبضہ کرنے کا خیال ہے آپ نے یہ سنا تو اس پر کسی تردد کا اظہار نہیں کیا اور بڑے اطمینان اور سکونِ قلب سے کہا اور اتنی بلند آواز سے کہا کہ مجلس میں جو لوگ بیٹھے تھے، انہوں نے بھی سن لیا۔ کیا میں یہ کروں گا؟ خدا کی قسم میرے نزدیک تیرے اور تیرے ساتھ مغلوں کے ملک دونوں کی ایک پیسے کی بھی حیثیت نہیں۔ اس پر سلطان مسکرایا۔ اللہ تعالے نے امام صاحب کی اس کے دل میں اتنی ہیبت ڈال دی تھی کہ وہ کہنے لگا: بے شک۔ آپ سچ کہتے ہیں اور جس شخص نے آپ کے خلاف میرے پاس چغلی کی ہے، وہ جھوٹا ہے۔ غرض ملک ناصر کے دل میں امام صاحب کے لئے دینی محبت راسخ ہو گئی۔ اور اگر ایسا نہ ہوتا تو اس کے پاس امام صاحب کے خلاف اتنی زیادہ باتیں پہنچائی گئی تھیں کہ وہ کبھی کا آپ کے خلاف اقدام کر چکا ہوتا۔

شیخ مرعی الکواکب میں لکھتے ہیں ۔۔ اس دنیا میں ارباب فضل و دین میں سے کوئی ہی ہوگا جو امتحان و ابتلا سے

محفوظ رہا ہو۔ اور یہ اس لئے کہ ایسا شخص لوگوں سے دنیاداری نہیں کرتا اور نہ ان کی ہاں میں ہاں ملاتا ہے۔ سفیان ثوریؒ کا قول ہے جب تم کسی شخص کو پاؤ کہ اس کے ہمسائے اس کی تعریف کرتے ہیں تو سمجھ لو کہ یہ مداھنت کرنے والا ہے۔ شیخ مرعی کہتے ہیں :- ابوحنیفہ، مالک، شافعی، احمد اور بخاری جیسے ائمہ کو جن ابتلاؤں سے دوچار ہونا پڑا، وہ معلوم و مشہور ہیں اور ہم ان کو بیان کر چکے ہیں۔ اسی طرح شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کو بھی ابتلاؤں سے گزرنا پڑا۔ بہت سے لوگوں نے اس میں حصہ لیا۔ اور ان پر بدعات اور تجسیم کا الزام لگایا۔ حالانکہ وہ اس سے بری تھے سب سے پہلی ابتلا تو اس سوال کے جواب میں پیش آئی، جو حماۃ شہر سے آیا تھا۔ اور جسے العقیدہ الحمویہ الکبریٰ[1] کا نام دیا جاتا ہے۔ آپ نے اپنے جواب میں مذہب متکلمین پر سخت تنقید کی تھی۔ اور مذہبِ سلف کو ترجیح دی تھی۔ اس ضمن میں آپ نے لکھا :- یہ لوگ گمان کرتے ہیں کہ سلف کا طریقہ بغیر غور و فکر کے محض قرآن و حدیث کے الفاظ پر ایمان لانا تھا، جیسا کہ ان پڑھوں (امیین) کا طریقہ ہے اور خلف کا طریقہ یہ ہے کہ تشبیہ و استعارہ اور نامانوس الفاظ کی تاویل کر کے نصوص سے معانی کا استخراج کیا جائے۔ اس طرح گمان کرنا بالکل غلط ہے اور یہ اس اعتقاد کا نتیجہ ہے کہ جس طرح عوام میں بھلے لوگ ہوتے ہیں، اسی طرح ہمارے ان پڑھ سلف تھے۔ وہ اللہ کے بارے میں علمی حقائق تک پہنچنے کی کوشش نہیں کرتے تھے اور نہ وہ علم الہیات کی باریکیوں کو سمجھتے تھے۔ اس کے برعکس خلف فاضل لوگ ہیں اور انہوں نے ان سب امور میں کمال حاصل کیا ہے" امام صاحب نے اس غلط نقطہ نظر کی سخت مذمت کی اور اس کے اصحاب کی گمراہیاں واضح فرمائیں۔ اور بتایا کہ وہ خود کس اضطراب و تشویش میں زندگی گزارتے تھے۔

---

[1] اس سوال میں دریافت کیا گیا تھا کہ صفات و اعضاء و جوارح خداوندی اور عرش وغیرہ کے متعلق جتنی آیتیں اور حدیثیں آئی ہیں، ان کے ظاہری معنی لئے جائیں گے یا ان کی تاویل کی جائے گی .... (آپ نے جواب میں) کتاب و سنت ہی کے الفاظ کی پابندی کی اور آیتوں اور حدیثوں کے الفاظ میں تاویل اور ردّ و بدل کرنے کو بالکل ناجائز قرار دیا۔ (امام ابن تیمیہ - مولانا محمد یوسف کوکن) از مترجم

بات یہ ہے کہ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ معتقدات کے معاملے میں سلف صالح کے مذہب کو ترجیح دیتے تھے۔ اور اس کے بڑی سختی سے پابند تھے۔ ان کی کوشش ہوتی تھی کہ ہر ممکن طریقے سے لوگوں کو اس طرف لائیں وہ سلف صالح کے مذہب کے زبردست حامی تھے اور عقلی و نقلی دلائل سے اس کی مدافعت کرتے تھے ان کے ساتھ مصر و شام میں جو مناظرے ہوئے ان میں سے اکثر اسی مسئلے کے اردگرد گھومتے تھے۔ الکواکب الدریۃ کے مصنف شیخ علم الدین سے نقل کرتے ہیں کہ ۷۰۸ھ میں امام تقی الدین ابن تیمیہ کو دمشق میں ابتلاء سے دوچار ہونا پڑا۔ اور اس کی وجہ آپ کا صفات خداوندی کے معاملے میں متکلمین کے مذہب پر سلف کے مذہب کو ترجیح دینا تھا۔ اس سے کچھ عرصہ پہلے آپ ستاروں اور افلاک کی تاثیر کا انکار کر چکے تھے اور نجومیوں کا گروہ آپ سے بگڑا ہوا تھا۔ اسی دوران میں مصر و شام میں آپ کے ساتھ مناظرے ہوئے۔ جن کی بنا پر وہ شام اور مصر دونوں ملکوں میں یکے بعد دیگرے قید کئے گئے۔ الکواکب الدریہ کے مصنف لکھتے ہیں کہ جب امام صاحب مصر میں قید کئے گئے تو علمی و دینی مصروفیتوں کے اعتبار سے ان کی یہ قید زاویوں، خانقاہوں اور مدارس سے کہیں بہتر ثابت ہوئی۔ وہاں کے بہت سے قیدی رہا ہونے کے بعد یہی چاہتے تھے کہ انہیں پھر قید خانے میں واپس بھیج دیا جائے۔ امام صاحب کے پاس قید خانے میں لوگ اس کثرت سے آتے تھے کہ قید خانہ ان سے بھر جاتا۔

جب امام صاحب کو دمشق کے قلعہ میں قید کر دینے کا حکم ہوا، تو آپ نے اس پر بڑی مسرت کا اظہار کیا اور فرمایا کہ میں تو اس کا انتظار ہی کر رہا تھا۔ اس میں بڑی بھلائی ہے۔ آپ کے شاگرد اور آپ کے علوم کے وارث علامہ ابن قیم الجوزیہ سے جو آپ کے ساتھ ہی قلعہ دمشق میں محبوس کئے گئے تھے، منقول ہے کہ امام صاحب نے فرمایا۔ میرے دشمن میرے خلاف کیا کر سکتے ہیں۔ میری بہشت اور میرے گل و گلزار میرے سینے میں ہیں۔ جہاں بھی میں جاؤں گا، وہ میرے ساتھ ہوں گے اور مجھ سے جدا نہیں ہو سکیں گے۔ میری قید میرے لئے خلوت ہے۔ اور میرا قتل شہادت، اور مجھے اپنے شہر سے نکالنا میرے لئے سیاحت ہے۔ علامہ ابن قیم کہتے ہیں کہ امام صاحب قلعہ میں دوران حبس فرمایا کرتے تھے کہ اگر میں اس قلعہ کے برابر سونا خرچ کروں تو یہ اس نعمت کا جو مجھے یہاں میسر ہوئی ہے بدل نہیں ہو سکتا۔ ایک دفعہ امام صاحب نے مجھ سے فرمایا اصل محبوس وہ ہے

جس کا دل اپنے رب سے حبس میں ہوں۔ اور اصل اسیر وہ ہے، جسے اس کی خواہشات نے اسیر کر رکھا ہو۔
جب آپ قید کر کے قلعے میں لائے گئے اور آپ قلعے کی فصیل کے اندر پہنچے تو اس کی طرف دیکھ کر یہ آیت پڑھی
"فضرب بینھم بسور لہ باب باطنہ فیہ الرحمۃ وظاھرہ من قبلہ العذاب"[1]
اللہ جانتا ہے کہ باوجود اس کے کہ آپ کو تنگی تھی اور آرام و آسائش سے محروم تھے، میں نے آپ سے بڑھ کر کسی کو
آرام میں نہیں دیکھا۔ اور باوصف اس کے کہ آپ قید کر دیئے گئے تھے۔ آپ کو دھمکیاں دی جاتی تھیں اور
آپ کے خلاف الزامات تراشے گئے تھے، آپ سے بڑھ کر میں نے کسی کو زندگی میں مطمئن، زیادہ انشراحِ صدر والا
زیادہ دل کا مضبوط اور مسرور نہیں دیکھا۔ آپ کے چہرے پر تازگی و بشاشت نمایاں تھی۔ جب کبھی ہم پر خوف
طاری ہوتا، ہمیں طرح طرح کے خیالات آتے اور ہم پر فضا تنگ ہونے لگتی تو ہم آپ کے پاس آتے اور جیسے ہی آپ
کو دیکھتے آپ کی باتیں سنتے تو ہماری ساری پریشانی دور ہو جاتی۔ اور اس کی جگہ ہمیں انشراحِ صدر اور یقین و اطمینان
کی نعمت حاصل ہو جاتی۔

آپ آخری بار دمشق کے قلعہ میں ۶ شعبان ۷۲۶ھ کو قید کئے گئے۔ اور ۷۲۸ھ ذی القعدہ کے آخری
ہفتے میں آپ کا دوران حبس ہی میں انتقال ہوا، آپ کا جنازہ جامع اموی میں لایا گیا۔ اور وہیں نماز جنازہ ادا ہوئی
بیان کیا جاتا ہے کہ پورا دمشق جنازے کی نماز میں شریک ہونے کے لئے ٹوٹ پڑا تھا۔ اس دن بازار بند تھے اور ہر
مرد عورت، امیر غریب اور بڑے چھوٹے سب امام صاحب کے جنازے میں شامل تھے، اتنا بڑا اجتماع
دمشق کی تاریخ میں کبھی نہیں دیکھا گیا۔

---

[1] (ترجمہ) پھر کھڑی کر دی جائے ان کے بیچ میں ایک دیوار، جس میں ہوگا دروازہ، اس کے اندر
رحمت ہوگی اور باہر کی طرف عذاب۔

تصوف کی ایک بنیادی کتاب — عوارف المعارف

الطاف جاوید۔ کراچی

شیخ الشیوخ حضرت شہاب الدین سہروردی کی تصنیف "عوارف المعارف" تصوف کی بنیادی کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ اور سالکین طریقت کے لئے اس کا پڑھنا ہمیشہ سے ضروری سمجھا جاتا رہا ہے۔ اکثر مشائخ اپنے مریدوں اور منتبین کو یہ کتاب سبقاً سبقاً پڑھایا کرتے تھے۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے اپنے ایک پنجابی شاگرد اور مرید کو جو سند دی ہے، اس میں آپ لکھتے ہیں:- "وقرأ علیّ کتاب عوارف المعارف فی التصوف من اوله الی آخره، وطرفاً من اول احیاء علوم الدین وغیر ذلک..."[1] سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاء نے حضرت بابا فرید شکر گنج سے عوارف المعارف کے چند باب پڑھے تھے اور حضرت بابا صاحب کو اس کتاب سے بڑا شغف تھا۔[2] حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت

---

[1] ترجمہ:- انہوں نے مجھ سے تصوف کے باب میں اوّل سے لے کر آخر تک عوارف المعارف اور احیاء العلوم کا شروع کا کچھ حصہ پڑھا۔

[2] حضرت بابا فرید کو شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردی سے بڑی عقیدت تھی۔ ان کی شہرۂ آفاق تصنیف عوارف المعارف ہر وقت پیش نظر رہتی تھی۔ اور اسے درس کے طور پر پڑھاتے تھے۔ حضرت محبوب الٰہی فرماتے ہیں کہ آپ کے پڑھانے میں یہ اثر تھا کہ سننے والے کے ہوش بجا نہیں رہتے تھے۔ میں نے اس کتاب کے پانچ ابواب آپ ہی سے پڑھے اور آپ کے بیان کی لذت سے مجھ پر ایسی بے خودی طاری ہو جایا کرتی کہ اگر ایسی حالت میں موت آجاتی تو ایک بڑی دولت ملتی۔ (حضرت بہاء الدین زکریا از مولانا نور احمد خاں فریدی)

نے جو سلسلہ سہروردی سے منسلک تھے شیخ عبداللہ مطری سے مدینہ منورہ میں حدیث نبوی کے ساتھ عوارف المعارف پڑھی۔ آپ کے پاس عوارف کا وہ نسخہ تھا جو شیخ شہاب الدین سہروردی کے مطالعہ میں رہ چکا تھا۔ حضرت مخدوم جہانیاں نے عراق جاکر شیخ شرف الدین محمود شاہ تستری سے بھی جو شیخ شہاب الدین سہروردی کے خلیفہ تھے، عوارف پڑھی۔ علاوہ ازیں حضرت مخدوم تفسیر، حدیث اور فقہ کے ساتھ ساتھ تصوف میں عوارف المعارف کا درس دیا کرتے تھے[1] منقول ہے کہ آپ اپنی مجالس میں فرمایا کرتے تھے کہ اگر کسی شخص کو کوئی پیر و مرشد میسر نہ آئے، وہ عوارف المعارف غور سے پڑھے اور اس پر عمل کرے تو بلاشک و شبہ وہ ولی ہو جائے گا۔"

شیخ جمال خنداں رُو جو اوچ شریف کے تھے، اور جن سے حضرت مخدوم جہانیاں نے ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی، اپنے زمانے کے بڑے محدث، متورع عالم صاحب نسبت درویش تھے۔ آپ جہاں دوسرے علوم کی تعلیم دیتے تھے، وہاں آپ کو عوارف کی تدریس سے غیر معمولی دلچسپی تھی[2]۔

غرض شروع ہی سے عوارف المعارف تصوف کی ایک اہم درسی کتاب رہی ہے اور وہ نہ صرف یہ کہ ابتدا سے اہل سلوک و معرفت کے نصاب تعلیم میں شامل رہی۔ بلکہ بزرگان کرام نے ہر زمانے میں اس پر حواشی اور تعلیقات لکھیں، مختلف زبانوں میں اس کے ترجمے کئے۔ حضرت چراغ دہلی کے خلیفہ سید گیسو دراز نے جن کی برکت سے دکن میں اسلام پھیلا، معارف العوارف کے نام سے عوارف کی شرح لکھی[3]۔ یہ شرح عربی میں تھی، جو آپ نے دہلی میں لکھی، دکن کے شہر گلبرگہ پہنچ کر آپ نے عوارف کی ایک شرح فارسی میں کی[4]۔ اسی زمانے کے ایک اور بزرگ مخدوم مہائمی ہیں جن کی تفسیر قرآن مجید "تبصیر الرحمٰن" ہے۔ آپ توحید وجودی کے قائل اور شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کے پیرو تھے۔ آپ

---

[1] تذکرہ صوفیائے پنجاب از اعجاز الحق قدوسی

[2] تذکرہ صوفیائے پنجاب [3] آب کوثر

[4] عوارف المعارف (اردو ترجمہ از سید رشید احمد ارشد)

عربی زبان میں عوارف کی شرح کی جو ۳ محرم ۸۱۸ھ کو مکمل ہوئی [۱]

مشہور چشتی بزرگ شیخ عبدالقدوس گنگوہی متوفی ۹۴۴ھ نے بھی عوارف المعارف کی عربی میں شرح لکھی ہے، جس کا ذکر کرتے ہوئے مولانا اعجاز الحق قدوسی لکھتے ہیں:۔ خود حضرت شیخ فرمایا کرتے تھے کہ ابتداءً عوارف کا نسخہ میرے حجرے میں برکت کے لئے رکھا رہتا تھا۔ اور مجھے اس موضوع میں کوئی دخل نہ تھا۔ لیکن پھر میرا شغف یہاں تک پہنچا کہ میں نے عوارف کی شرح عربی میں لکھی [۲]

اس کے بعد اور بھی بہت سے لوگوں نے عوارف کی عربی اور فارسی میں شرحیں لکھیں اور اس کے خلاصے ترتیب دیئے۔ حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی نے تعلیقات عوارف میں عوارف المعارف کے بعض رموز کی شرح و توضیح فرمائی۔ اس موضوع پر ایک عمدہ رسالہ ہے [۳]

عوارف کا فارسی میں سب سے پہلا ترجمہ ۷۱۶ھ میں کیا گیا۔ ترکی میں امیر تیمور کے فرزند سلطان شاہ رخ کے عہد میں پہلی بار اس کا ترجمہ ہوا، عوارف کا اردو ترجمہ پہلی مرتبہ ۱۸۹۱ء میں مطبع نول کشور نے شائع کیا۔

عوارف المعارف کی اس غیر معمولی اہمیت، مقبولیت اور شہرت کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ یہ علمِ تصوف، اُس سے متعلق جملہ مسائل اور تصوف نے شیخ شہاب الدین سہروردی کے زمانے میں ایک مخصوص خانقاہی نظام کی جو شکل اختیار کر لی تھی، اس کے فرائض و آداب پر مشتمل ایک جامع تصنیف ہے۔ اور اس میں وہ سب باتیں آگئی ہیں، جو ایک سالکِ راہِ طریقت کے ساتھ ساتھ ایک صاحبِ ارشاد شیخِ طریقت کو جاننی چاہئیں۔ دوسرے شیخ شہاب الدین [۴] سہروردی کا وہ زمانہ ہے جب حجۃ الاسلام

---

[۱] عوارف المعارف (اردو ترجمہ از سید رشید احمد ارشد)

[۲] شیخ عبدالقدوس گنگوہی اور ان کی تعلیمات [۳] حیات مجدد از پروفیسر محمد فرمان

[۴] شیخ شہاب الدین سہروردی کے مرشد شیخ ابوالنجیب ضیاء الدین سہروردی جو آپ کے چچا بھی تھے حجۃ الاسلام امام محمد غزالی کے برادرِ حقیقی عالم باعمل احمد غزالی کے صحبت یافتہ اور مرید تھے۔

امام محمد غزالی کے زیر اثر　　تصوف شریعت سے ہم آہنگی پیدا کرنے کی طرف مائل تھا۔ اسی لئے تصوف کا مذاق رکھنے والے اہل شرع کے حلقوں میں اس کتاب کی قدر ہوئی اور اسے پڑھا اور پڑھایا جانے لگا۔[۱]

صاحب عوارف المعارف حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی کی ولادت خزینۃ الاصفیاء کے مصنف کے نزدیک ۵۳۲ھ میں اور رحلت ۶۳۲ھ ہوئی۔ یہ بغداد کی شان و شوکت اور اس کی علمی عظمت کے آخری ایام تھے (۶۵۵ھ میں بغداد پر ہلاکو حملہ آور ہوا تھا) اس دور میں عباسی خلفا، سلجوقی سلاطین کے اقتدار سے آزاد ہو گئے تھے اور بغداد میں صرف انہی کا سکہ چلتا تھا۔ ان میں سے بعض خلفا بڑے اچھے بھی تھے۔ ابن اثیر مستضی (۵۶۶ھ - ۵۷۵ء) کے متعلق لکھتا ہے۔ عادل اور رعایا کے ساتھ شفیق تھا... اس کے زمانے میں ملک کو اس قدر امن و سکون اور راحت و طمانیت حاصل تھی، جس کی مثال نہیں ملتی... رعایا کے لیے اس کا زمانہ ہر روز عید اور ہر شب شب برات تھی (خلافت عباسیہ از شاہ معین الدین احمد ندوی)۔ مستضی کے بعد ناصر لدین اللہ (۵۷۵ھ - ۶۲۳ھ) خلیفہ ہوا۔ اس کا ۴۷ سال کا یہ عہد حکومت بغداد کے لئے امن و اماں اور خوشحالی کا زمانہ تھا۔ اس نے رعایا کی فلاح و بہبود کے لئے بہت کچھ کیا ابن طقطقی کا بیان ہے کہ اس کے کار خیر اور اوقاف حد شمار

---

[۱] شیخ شہاب الدین سہروردی اپنی کتاب "اعلام الھدیٰ" میں لکھتے ہیں:- ہمارا یہ اعتقاد ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں اولیاء اللہ ہیں، جن سے کرامات صادر ہوتی ہیں۔ اسی طرح ہر ایک رسول کے زمانے میں ان کے تابعین ہوتے تھے، جن سے کرامات اور خوارق عادت ظاہر ہوا کرتے تھے۔ اولیاء کی کرامات انبیاء علیہم السلام کے معجزات کا نتیجہ ہیں، لیکن جو شخص کہ احکام شرعیہ کا ملتزم نہیں۔ اور اس کے ہاتھ پر خوارق عادت کا ظہور ہوا، تو ہمارے اعتقاد میں وہ شخص زندیق اور بے دین ہے۔ اور جو کچھ اس سے ظاہر ہوتا ہے، وہ مکر و استدراج ہے۔

(حضرت بہاء الدین زکریا از مولانا نور احمد فریدی)

سے باہر ہیں۔ اس نے بکثرت مسجدیں، خانقاہیں اور مسافر خانے بنوائے۔[1] اس خلیفہ ناصر سے شیخ شہاب الدین کے بڑے گہرے تعلقات تھے اور آپ کو وہ اکثر دوسرے ملکوں کے بادشاہوں کے پاس اپنا سفیر بنا کر بھیجا کرتا تھا۔[2]

شیخ شہاب الدین اگرچہ شمالی ایران کے شہر سہروردی میں پیدا ہوئے، لیکن وہ بچپن ہی میں اپنے چچا شیخ ابو نجیب کے پاس بغداد آگئے تھے، جہاں ان کی دریائے دجلہ کے کنارے ایک بڑی خانقاہ تھی۔ اس کے علاوہ شیخ ابو النجیب بغداد کے مشہور واعظ بھی تھے اور ایک عرصہ دراز تک بغداد کی مشہور جامعہ نظامیہ کی مسندِ درس و وعظ پر فائز رہ چکے تھے۔ آپ نے احادیث نبوی کے ذریعہ تصوف کے اصول اور اس کے اسرار و رموز کو ثابت کیا۔[3] آپ کا ۵۶۳ھ میں انتقال ہوا، اور آپ کی خانقاہ اور مسندِ ارشاد و طریقت شیخ شہاب الدین کو ملی۔

خزینۃ الاصفیاء کے مصنف مفتی غلام سرور لاہوری شیخ شہاب الدین کے متعلق لکھتے ہیں کہ "وے در وقتِ خود قطب الوقت و شیخ الشیوخ بغداد بود و ارباب طریقت از بلادِ دور و نزدیک استفتائے مسائل طریقت از وے کردندے۔" خزینۃ الاصفیاء ہی میں مذکور ہے کہ آپ ۱۶ سال کی عمر میں علوم صرف و نحو و منطق و معانی و فقہ و حدیث میں فاضل و کامل ہو گئے تھے اور باوجود اپنے عم محترم شیخ ابو النجیب کے اصرار کے کہ اب علم کلام کو چھوڑ کر وہ علم طریقت سے بہرہ ور ہوں، شیخ شہاب الدین کو علم کلام کا اس قدر اشتیاق تھا کہ وہ شب و روز اس کی تحصیل میں مستغرق رہتے تھے۔ آخر عم محترم انہی حضرت غوث اعظم شیخ عبدالقادر جیلانی کی خدمت میں لے گئے۔ اور ان کی توجہ سے موصوف "از علوم ظاہری دست بردار شدہ بدل و جان تحصیل باطنی پرداخت۔"

---

[1] خلافت عباسیہ از شاہ معین الدین احمد ندوی۔ البتہ ابن اثیر نے ناصر کی کافی مذمت کی ہے
[2] عوارف المعارف اردو ترجمہ از سید رشید احمد ارشد۔
[3] " " " " " "

شیخ شہاب الدین کی بہت بڑی خانقاہ[۱] تھی، جہاں کثیر مقدار میں نذرانے آتے تھے۔ اور آپ انہیں درویشوں اور مستحقوں میں تقسیم فرمادیا کرتے تھے۔ آپ کا یہ دستور تھا کہ ہر سال حج کو تشریف لے جاتے اور فرائض حج ادا کرنے کے بعد مدینہ منورہ میں حاضری دیتے، زندگی بھر آپ کا یہی معمول رہا، آپ نے تقریباً نوے سال کی عمر پائی، حضرت بہاء الدین زکریا ملتان والے آپ ہی کے مرید تھے، اور انہی کے ذریعہ ہندوستان میں سہروردی طریقے کی توسیع ہوئی۔

عوارف المعارف کافی ضخیم کتاب ہے۔ حال ہی میں اس کا حافظ سید رشید احمد ارشد صاحب کا کیا ہوا اردو ترجمہ شائع ہوا ہے۔ اس کی مدد سے کتاب کے مندرجات کے چند اہم نکات یہاں پیش کئے جاتے ہیں۔

علمائے تفسیر، محدثین اور فقہاء نے کتاب و سنت کے ذریعہ مذہبی علوم کا احاطہ کرلیا ہے۔ اور خدا تعالیٰ ان کے ذریعہ دین کی حفاظت کرتا ہے۔ صوفیہ کرام کے قلوب اسرار الٰہی کے محافظ ہیں، کیونکہ انہوں نے تقویٰ کی بنیاد کو مضبوط کرنے کے بعد دنیا سے کنارہ کشی کی ہے۔ تقویٰ کے ذریعہ ان کا نفس پاکیزہ بنا ہے اور زہد کے ذریعہ ان کے دل صاف ہوئے ہیں۔

علم و ہدایت کا پہلا مرکز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے۔ آپؐ نے علم و ہدایت کا فیض خدائی سرچشمہ سے حاصل کیا۔ اور آپ کا ظاہر و باطن اس سے پوری طرح سیراب ہوگیا۔ آپ کی ظاہری سیرابی سے دین کا ظہور ہوا۔ دین، اطاعت و تواضع کے مرادف ہے، یہ دون سے مشتق ہے اور جو چیز پست ہو، وہ دون

---

[۱] یوں تو اہل تصوف طریقت کی تاریخ کا آغاز رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے کرتے ہیں لیکن صوفیہ کے ہاں خانقاہ یا زاویہ بحیثیت ایک مستقل "انسٹی ٹیوشن" کے کب وجود میں آیا۔ اس کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ملتیں۔ مولانا شبلی نے "الغزالی" میں لکھا ہے:۔ "فخر الملک کی وفات (۵۰۰ھ) کے تھوڑے ہی دن بعد امام صاحب نے عہدہ تدریس سے کنارہ کشی کرکے طوس میں خانہ نشینی اختیار کی۔ گھر کے پاس ہی ایک مدرسہ اور خانقاہ کی بنیاد ڈالی۔ جہاں مرتے دم تک ظاہری اور باطنی دونوں علموں کی تلقین کرتے رہے"۔ شیخ شہاب الدین نے اہل خانقاہ کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ اہل صفہ سے مشابہت دی ہے۔ پروفیسر ڈی اولیری لکھتا ہے:۔ خانقاہی اداروں کے آثار دمشق میں تقریباً ۱۵۰ھ میں ملتے ہیں اور خراسان میں ۵۰ سال بعد (فلسفۂ اسلام)

ہے۔ لہٰذا دین کا مفہوم یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو اپنے رب کے سامنے پست کردے (جھکا دے)

حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا۔ مذہبی بصیرت سے بہتر کوئی عبادت نہیں ہے اور شیطان کے لئے ایک صاحب بصیرت ایک ہزار عابدوں سے زیادہ سخت ہے۔ ہر چیز کا ایک ستون ہوتا ہے۔ اور اس مذہب کا ستون مذہبی بصیرت ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس نے فرمایا۔ بہترین عبادت مذہبی بصیرت ہے۔

علم و ہدایت کا دارومدار طینت کی پاکیزگی پر ہے۔ آدمی جس قدر پاک طینت ہوگا، اسی قدر وہ علم و ہدایت قبول کرنے کی صلاحیت رکھے گا۔ چونکہ صوفیہ کے قلوب زیادہ پاک ہیں، اس لئے انہیں علم و ہدایت کا بڑا حصہ ملا۔ اور ان کے باطن علم و ہدایت کے تالاب بن گئے۔ انہوں نے خود علم سیکھا اور دوسروں کو بھی سکھایا صوفی سے ہماری مراد مقرب بارگاہ سے ہے۔ کیونکہ قرآن کریم میں صوفی کا ذکر نہیں ہے۔ بلکہ مقرب کہا گیا ہے بہر حال الفاظ سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ صوفیہ سے ہماری مراد مقربین سے ہے۔ خدا کے نیک بندوں میں سے جو مقربین الٰہی کے مقام تک پہنچنا چاہے، وہ اس وقت تک متصوف کہلائے گا، جب تک وہ صاحب حال نہیں ہوتا۔ جب اس کے صاحب حال ہونے کی تصدیق ہو جائے گی تو وہ صوفی کہلائے گا۔

کتاب میں کوئی بیس "علوم صوفیہ" گنائے گئے ہیں۔ اس ضمن میں ایک "علم النفس" ہے اس کے بارے میں لکھتے ہیں:۔ "علم النفس، نفس شناسی اور اخلاق نفس کا علم بھی اہم ہیں۔ علم النفس اور علم نفس شناسی اہل تصوف کے نزدیک بہت اہم ہے، جو اس سے زیادہ واقف ہوگا، وہ سیدھی راہ دیکھ سکتا ہے۔ علاوہ ازیں دنیا کی انواع و اقسام کا علم، نفسیاتی خواہشوں کی باریکیوں یا مخفی شہوات نفسانیہ کا علم بھی (ان علوم صوفیہ میں سے ہے)

صوفیائے کرام کے علوم دنیا کی محبت کے ساتھ ساتھ نہیں حاصل کئے جا سکتے ہیں، بلکہ ان کا انکشاف اسی وقت ہوتا ہے، جب نفسانی خواہشوں کو بالکل ختم کر دیا جائے۔ اس طرح ان کی تعلیم زہد و تقویٰ کے مدرسے میں ہوتی ہے۔

عالم و صوفی میں فرق — ایک عالم ایک محفل میں شریک ہوا۔ وہاں وہ اس امتیازی مسند پر

بیٹھ گیا، جہاں وہ اپنے خیال وعقیدہ کے مطابق اپنے علمی مرتبہ کا لحاظ رکھتے ہوئے بیٹھا کرتا تھا۔ اس کے ہم جنسوں میں سے ایک اور عالم بھی داخل ہوا۔ اور وہ اس سے اوپر کے درجے پر بیٹھ گیا۔ یہ دیکھ کر پہلا عالم بہت گھبرایا۔ اور دنیا اس پر تاریک ہوگئی۔ اگر اس کا بس چلتا تو وہ اس شخص پر حملہ کردیتا۔ مگر ایک درویش عالم کی مثال دوسری ہے وہ دوسرے مسلمانوں کے مقابلے میں کوئی امتیازی شان نہیں قائم کرتا۔ نہ اپنے آپ کو کسی محفل میں ممتاز مسند کے قابل سمجھتا ہے۔

ہمارے شیخ ضیاء الدین ابو احمد عبدالوہاب بن علی نے اپنے مشائخ کی اسناد سے ترمذی کی یہ حدیث حضرت انس بن مالک کی روایت سے بیان کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا "اے میرے فرزند! اگر تمہارے لئے ممکن ہو کہ تم صبح وشام اس طرح زندگی گزارو کہ تمہارے دل میں کسی کے خلاف کھوٹ نہ ہو، تو ایسا ضرور کرو"۔ پھر فرمایا۔"یہ میری سنت ہے اور جس نے میری سنت کو زندہ کیا، اس نے مجھے زندہ کیا اور جس نے مجھے زندہ کیا، وہ میرے ساتھ جنت میں ہوگا"۔۔ اس سلسلے میں صوفیائے کرام کو یہ شرف حاصل ہے کہ انہوں نے اس سنت کو زندہ کیا۔ کیونکہ کھوٹ اور کینہ سے ان کے سینے پاک ہیں اور ان کی جوہر شناسی اور پرکھنے کا یہی سب سے بڑا معیار ہے۔

ہمارے شیخ نے ۔۔۔ حضرت ابوسعید الخراز کا یہ قول بیان فرمایا ہے "وہ باطن جو ظاہر کے خلاف ہو، مردود ہے"۔ حضرت جنید بغدادی فرماتے تھے "ہمارا علم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے ملا ہوا ہے"۔ ابو محمد الجریری سے تصوف کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا "تصوف اعلیٰ اخلاق کو اختیار کرنا اور پست اخلاق سے پرہیز کا نام ہے"۔

صوفی کی وجہ تسمیہ — شیخ ابوزرعہ طاہر بن محمد بن طاہر نے اپنے مشائخ کی اسناد سے حضرت انس بن مالک کی یہ حدیث ہم سے بیان کی ہے:۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غلام کی دعوت قبول فرماتے تھے گدھے کی سواری کرتے تھے۔ اور اون پہنتے تھے۔ اس حدیث کی بنا پر ایک جماعت کی یہ رائے ہے کہ انہیں صوفیہ کا نام ان کے ظاہری لباس پر دیا گیا ہے۔ کیونکہ انہوں نے صوف (اون) کا لباس پہننا پسند کیا۔ ...... یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ صوفی کی نسبت صُفّہ سے ہے، جو رسول اللہ کے زمانے میں غریب مہاجروں

کا ایک چبوترہ تھا۔ اگرچہ لفظی اشتقاق کے لحاظ سے یہ وجہ تسمیہ درست نہیں مگر مفہوم کے لحاظ سے صحیح ہے کیونکہ صوفیہ کا حال ان کے مشابہ ہے ۔۔۔ بہرحال یہ واقعہ ہے کہ یہ نام رسول اللہ کے زمانے میں نہیں رکھا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ تابعین کے زمانہ میں رکھا گیا تھا۔ کچھ لوگوں نے یہ کہا ہے کہ یہ نام دو سو ہجری تک مشہور نہ ہو سکا۔

جب عہد رسالت کو کافی عرصہ گزر گیا اور آسمانی وحی اور نور مصطفوی کو پوشیدہ ہوئے ایک زمانہ ہو گیا، تو اس وقت خیالات میں اختلاف ہونے لگا اور لوگوں کے راستے جدا ہو گئے اور ہر اہل رائے اپنی رائے میں آزاد ہو گیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نفسانی خواہشوں نے بھی علمی فضا کو مکدر کر دیا ۔۔۔ ایسے زمانے میں ایک جماعت دنیا سے الگ ہو کر نیک کاموں میں مشغول ہو گئی۔ ان کے عزائم میں خلوص اور دین کی طاقت تھی۔ انہوں نے دنیا اور اس کی محبت سے منہ موڑا۔ تنہائی اور گوشہ نشینی کو غنیمت جانا۔ اپنی جماعت کے لئے کچھ زاویئے بنائے۔ جہاں کبھی کبھی جمع ہو جاتے تھے۔ مگر اہل صفہ کی تقلید کرتے ہوئے اکثر تنہا رہتے تھے۔ دنیاوی اسباب کو انہوں نے چھوڑ رکھا تھا۔ اور رب الارباب کی طرف لو لگائی تھی۔ ان کے نیک اعمال نے بلند احوال کی صورت میں اچھا ثمرہ دیا، ان کا دماغ اور ان کی قوتِ ادراک صاف ہو کر علوم الٰہی کو قبول کرنے کے قابل ہو گئی۔ اس طرح ان کو ظاہری زبان کے بعد ایک دوسری زبان ملی اور گزشتہ عرفان کے بعد ایک نیا عرفان کامل حاصل ہوا، بلکہ سابقہ ایمان کے بعد ایک تازہ ایمان حاصل ہوا ۔۔۔۔ ان مراتب تک پہنچنے کے بعد وہ نئے علوم سے واقف ہوئے، جن کے لئے نئے نئے اشارے کرنے پڑے۔ اس لئے انہیں نئی نئی اصطلاحات وضع کرنی پڑیں جو ان کے حال اور وجدانی کیفیات کو ظاہر کر سکیں۔ ۔۔۔ ان بزرگان سلف سے ان کے جانشینوں نے یہ علم حاصل کیا۔ یہاں تک کہ ہر زمانے میں اس نے ایک با قاعدہ اور مستقل علم اور رسوم کی صورت اختیار کر لی۔ چنانچہ صوفی کا نام بھی ان میں رائج ہو گیا۔

ایک گمراہ جماعت نے اپنے آپ کو ملامتیہ کا نام دے کر صوفیوں کا لباس پہن رکھا ہے تاکہ وہ بھی صوفی کہلائے جائیں حالانکہ ان کا صوفیت سے کوئی تعلق نہیں بلکہ وہ دھوکے اور غلطی میں مبتلا ہو کر ان کا لباس اختیار کئے ہوئے ہیں ۔۔۔ وہ حقیقت جو شریعت کے خلاف ہو، بے دینی اور جہالت ہے۔

یہ فریب خوردہ حضرات اس حقیقت سے نا آشنا ہیں کہ شریعت حق بندگی ہے اور بندگی کی اصل حقیقت ہے ۔ ... ان گمراہوں میں سے ایک جماعت وہ ہے، جو حلول کی قائل ہے ... ۔ انہیں یہ اشارے بعض ان صوفیہ کے کلمات سے ملے ہیں، جو انہوں نے اپنے روحانی جذبے کی شدت میں کہے تھے جیسا کہ منصور حلاج نے انا الحق کہا تھا۔ اور حضرت ابو یزید بسطامی سے سبحانی (میں پاک ہوں) منقول ہے ہم حضرت ابو یزید کے متعلق یہ تصور نہیں کر سکتے کہ انہوں نے یہ کلمات اپنے بارے میں کہے ہوں گے ... ۔ اسی طرح منصور حلاج کے قول کے بارے میں بھی یہی کہا جا سکتا ہے ۔ تاہم اگر ہمیں یہ یقین ہو جائے کہ اس قسم کے اقوال کے ذکر کرنے سے یہی مراد ہے کہ خدا ان میں حلول کر گیا، تو ہم اس قول کو قطعی طور پر رد کر دیں گے ۔ کیونکہ رسول اکرمؐ ہمارے سامنے ایک ایسی واضح اور کھلی شریعت لائے ہیں، جس کے ذریعہ ہر کج رو کو سیدھا کیا جا سکتا ہے ۔ علاوہ ازیں ہماری عقل ہمیں یہ صحیح رہنمائی کرتی ہے کہ کس طرح خدا کی صفات کو بیان کرنا جائز ہے اور کس طرح ناجائز ہے ۔ بلکہ خدا اس بات سے پاک و صاف ہے کہ کوئی شے اس میں حلول کرے یا وہ کسی شے میں حلول کرے ۔

باطنی الہامات ۔ ممکن ہے کہ ان فریب خوردہ اور گمراہ حضرات میں سے کسی فرد ... نے باطنی طور پر چند کلمات سن لئے ہوں پھر وہ اپنی قوت فکر سے ان کلمات کو ترتیب دے کر اسے خدا کی طرف منسوب کر دے ... ۔ مگر یہ سب گمراہی ہے ۔ اسے اس دعویٰ کی جرأت اس وجہ سے ہوتی ہے کہ اس نے بعض اہل حقیقت سے وہ کلمات سُنے ہوں، جو انہیں ظاہری اور باطنی طویل واردات کے بعد حاصل ہوئے تھے ۔ مگر اس سے پہلے وہ اپنی جماعت کے اصولوں کے مطابق زہد و تقویٰ کے پابند رہ چکے تھے ۔ اس لئے جب ان کا باطن صاف ہوا تو ان کے اندر کتاب و سنت کے مطابق الہامات باطنی استغراق کے موقع پر نازل ہوتے تھے ۔ وہ ایسا کلام نہیں بولتے، جسے سنا جا سکے ۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کہ دل ہی دل میں باتیں کی جا رہی ہیں ۔ یہ الہامات کتاب اور سنت کے علم کے موافق ہوتے تھے ۔ اہل علم بھی اسے سمجھ سکتے ہیں ۔ یہ دراصل ان کی باطنی مناجات ہے ۔ اس طرح وہ اپنے لئے مقام بندگی اور اپنے مولا کے لئے مقام ربوبیت کو برقرار رکھتے ہیں ۔ اور اس کے بعد وہ اس میں برابر اضافہ کرتے رہتے ہیں اور جانتے ہیں کہ یہ اللہ کا کلام نہیں بلکہ ایک

فانی علم ہے ۔ جسے اللہ تعالیٰ نے ان کے باطن پر نمودار کیا ہے اس لئے ہوش مند صوفیہ کا طرز عمل یہ ہے کہ وہ اپنے نفوس کے ہر فعل میں خدا کی طرف فرار ڈھونڈتے ہیں ۔ اور جب نفسانی خواہشوں سے ان کا میلان صاف ہو جاتا ہے تو ان کے باطن میں کچھ الہامات ہونے لگتے ہیں، جنہیں وہ اللہ کی طرف اس حیثیت سے منسوب کرتے ہیں کہ وہ ان افعال کا خالق ہے، نہ یہ کہ وہ متکلم کا کلام ہے ۔ اس لئے وہ تحریف اور کجروی سے محفوظ رہتے ہیں ۔

مشائخ کا مرتبہ ۔۔ حدیث شریف میں منقول ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا "اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، اگر تم چاہو تو میں تمہارے سامنے قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ خدا کو وہی افراد محبوب ہیں، جو اس کے بندوں میں خدا کی محبت پیدا کرتے ہیں ۔ اور انہیں خدا کا محبوب بنانے کی کوشش کرتے ہیں ۔ بلکہ روئے زمین پر ہر شخص کے ساتھ خیر خواہی کے ساتھ گامزن ہیں ۔ مذکورہ حدیث میں جو بیان کیا گیا ہے، وہ مشائخ کا مرتبہ ہے ۔ وہ خدا کی طرف لوگوں کو بلاتے ہیں اور درحقیقت خدا کے بندوں میں خدا کی محبت کا رشتہ جوڑتے ہیں ۔ یہاں تک کہ خدا بھی ان سے محبت کرنے لگتا ہے ۔ اسی بنا پر طریقۂ صوفیہ میں شیخ کا مرتبہ ایک اعلیٰ مرتبہ ہے ۔ بلکہ وہ خدائی دعوت کے سلسلے میں پیغمبروں کی قائم مقامی کرتے ہیں ۔ شیخ اپنے مرید میں خدائی محبت اس طرح پیدا کرتا ہے کہ وہ رسول اکرمؐ کی اتباع کے راستے پر لگا دیتا ہے ۔ چنانچہ جو صحیح طریقہ سے آپؐ کی اتباع کرے، اس سے خدا بھی محبت کرے گا شیخ بندوں کو خدا کا پیارا اس طرح بناتا ہے کہ وہ مرید کو تزکیۂ نفس کے طریقہ پر چلاتا ہے ۔ ۔ ۔

اہل صفہ اور اہل خانقاہ ۔۔۔ اس قسم کے آداب خانقاہ کے صوفیہ کا روزانہ کا معمول ہے ۔ وہ ہر وقت اپنی خانقاہ میں رہتے اور اس کی خبر گیری کرتے ہیں ۔ کیونکہ خانقاہ ان کا گھر اور خیمہ ہے ہر جماعت کا کوئی نہ کوئی گھر ہوتا ہے ۔ اس لئے صوفیہ کا گھر ان کی خانقاہ ہے، اسی وجہ سے وہ اہل صفہ سے مشابہ ہیں ۔ اہل خانقاہ میں بہت ربط و ضبط ہوتا ہے وہ محض ایک مقصد ایک ہی عزم اور مشترکہ حالات کے ماتحت متفق ہو کر کام کرتے ہیں ۔

صوفیہ اور ازدواجی زندگی ۔۔۔ مجرد رہنا درویش کے لئے مفید ہوتا ہے ۔ اس سے اس کے

خیالات میں یکسوئی اور جمعیت خاطر رہتی ہے ۔ اور اس کی زندگی خوشگوار ہوتی ہے ۔ لہٰذا ابتدائی زمانے میں درویش کے لئے یہی مناسب ہے کہ وہ تمام تعلقات کو قطع کرے اور تمام رکاوٹوں کو دور کر کے سفر اختیار کرے اور خطرات برداشت کرے ۔ اسے ظاہری اسباب سے الگ تھلگ رہ کر تمام حجابات کو اپنے سامنے سے ہٹانا چاہیئے۔ اس کے برخلاف ازدواجی زندگی سے روحانی عزم وارادہ کے بجائے پستی آجاتی ہے ۔ اور بے فکری کی زندگی کے بجائے پریشانی لاحق ہوتی ہے ۔ بلکہ انسان اہل وعیال میں مقید ہو کر رہ جاتا ہے ۔ کجروی کے مشتبہ مقامات کے ارد گرد گردش کرتا ہے ۔ ترک دنیا کے بعد دنیا کی طرف مائل ہوتا ہے اور اپنے مزاج اور عادت کے مطابق نفسانی خواہش کی طرف راغب ہوتا ہے ۔

حضرت معاذ بن جبل کا قول ہے کہ ہم سختی اور تنگ دستی میں مبتلا ہوئے تو ہم نے صبر کیا ۔ مگر جب ہمیں خوشحالی میں آزمایا گیا تو ہم صبر نہ کر سکے ۔ مجھے جن فتنوں کا اندیشہ ہے ، ان میں سب سے زیادہ خطرناک عورتوں کا ہے ، جب کہ وہ سونے کے کنگن شام کی ریشمی چادریں اور یمن کے سرخ سنجاب کا لباس پہن کر دولت مندوں کو عاجز کر دیں گی اور فقیروں کو وہ چیز مہیا کرنے پر مجبور کریں گی ، جو وہ حاصل نہیں کر سکتے ۔

بہر حال کامل بندگانِ خدا کی روحانیت نکاح سے ترقی پذیر ہوتی ہے ۔ اور انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچتا کیونکہ وہ علم کامل حاصل کرنے کے بعد مختلف اشیاء کے فوائد اخذ کر لیتے ہیں ، مگر ان کی برائی ان پر اثر انداز نہیں ہوتی حضرت جنید بغدادی فرماتے ہیں " مجھے بیوی کی اتنی ضرورت ہے جتنی کھانے کی ضرورت ہے ۔"

اخلاق رسولؐ ـــــ حضرت ابوالدرداء فرماتے ہیں :۔ " میں نے رسول اکرمؐ کو یہ فرماتے سنا کہ کوئی چیز جو حساب کے ترازو میں رکھی جائے گی ، حسن اخلاق سے زیادہ بھاری نہیں ۔ اور ایک خوش اخلاق انسان خوش اخلاقی کی بدولت روزے نماز والے انسان کے درجے تک پہنچ جاتا ہے "

آپؐ کے اخلاق کا یہ حال تھا کہ آپؐ سب سے زیادہ سخی تھے ۔ آپؐ کے پاس کوئی درہم و دینار باقی نہیں رہتا تھا ۔ اگر کوئی رقم بچ جاتی اور آپؐ کو کوئی آدمی ایسا نہ ملتا جسے آپؐ وہ رقم دے سکیں اور رات ہو جاتی ، تو آپؐ اس وقت تک گھر جا کر آرام نہیں فرماتے تھے ، جب تک کہ اسے خرچ نہ کر لیتے تھے ۔ آپؐ دنیا کو نہیں حاصل کرتے تھے ۔ آپ کی غذا وہ تھی ، جو آسانی سے میسر ہو سکے ۔ یعنی چھوارے اور جو آپ کی عام غذا تھی ۔

اس کے علاوہ اور کوئی چیز ہوتی تو اسے خدا کی راہ میں خرچ کر دیتے تھے ۔ اگر آپؐ سے کوئی مانگتا تھا تو فوراً اس کا سوال پورا کرتے تھے ۔ اس کے بعد اپنی عام غذا پر قناعت کرتے تھے ۔ آپؐ جوتے گانٹھ لیتے ۔ کپڑوں پر پیوند لگا لیتے تھے ۔ گھر والوں کے کام میں ان کا ہاتھ بٹاتے تھے ۔ سب سے زیادہ حیادار اور متواضع تھے ۔

تواضع — صوفیہ کا بہترین اخلاق تواضع ہے ۔ تواضع سے افضل بندگی کا کوئی لباس نہیں ۔ جو تواضع کا خزانہ حاصل کرتا ہے، وہ ہر شخص کے سامنے اپنی اصل حیثیت کو قائم رکھتا ہے ۔ اور خود بھی ہر ایک کو اس کے صحیح رتبے پر برقرار رکھتا ہے ۔ جسے یہ چیز حاصل ہوئی ، وہ خود بھی آرام سے رہتا ہے اور دوسروں کو بھی آرام پہنچاتا ہے ۔

حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا "اللہ تعالے نے میری طرف یہ وحی نازل فرمائی "تم تواضع کرو اور کوئی شخص ایک دوسرے پر زیادتی نہ کرے ۔"

آپؐ کی تواضع یہ تھی کہ آزاد اور غلام کی دعوت اور ان کا تحفہ قبول فرماتے تھے ، خواہ دودھ کا گھونٹ اور خرگوش کی ران ہی کیوں نہ ہو ۔ آپؐ اس کا صلہ بھی دیتے تھے اور خود بھی کھاتے تھے ۔ کسی کنیز یا غریب کو جواب دینے میں غرور نہیں کرتے تھے ۔

حضرت شعیب کی روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا ۔

"تواضع کی بنیاد یہ ہے کہ جس سے ملو، اسے پہلے سلام کرو اور جو تمہیں سلام کرے اس کا جواب دو محفل میں کم درجہ کی نشست کو پسند کرو اور یہ نہ چاہو کہ کوئی تمہاری تعریف و توصیف کرے یا تم پر احسان کرے "

" وہ شخص کتنا اچھا ہے جو اپنی کوتاہی یا برائی کے بغیر تواضع اختیار کرے اور محتاجی کے بغیر اپنے آپ کو عاجز سمجھے ۔"

ایک دفعہ میں اپنے شیخ ابوالنجیب ضیاء الدین سہروردی کے ساتھ شام کے سفر میں تھا ۔ کچھ دنیاداروں نے فرنگی قیدیوں کو (جو صلیبی جنگ میں قید ہو گئے تھے) بیڑیوں میں جکڑ کر اور ان کے سروں پر کھانا رکھوا کر ہمارے پاس بھیجا ۔ جب دسترخوان بچھایا گیا تو قیدی برتنوں کے خالی ہونے کا انتظار کرنے لگے ۔ اس وقت شیخ محترم نے خادم کو حکم دیا کہ قیدیوں کو لایا جائے تاکہ وہ بھی ان درویشوں کے

ساتھ دسترخوان پر بیٹھیں۔ چنانچہ جب انہیں لاکر ایک ہی صف میں دسترخوان پر بٹھادیا گیا تو ہمارے شیخ محترم اپنے سجادہ سے اٹھ کر ان کے ایک فرد کی طرح ان کے درمیان بیٹھ گئے۔ اور انہی کے ساتھ کھانا کھایا اس وقت ہمیں ان کے چہرے پر ان کے باطنی پُرخلوص تواضع، عاجزی اور انکساری کی وہ جھلک نظر آئی جس سے ان کے ایمان اور وسیع علم و عمل کا پتہ چلتا ہے۔

اس ضمن میں مصنف فرماتے ہیں:۔ بعض مشائخ نے تواضع کو ذات کا قائم مقام قرار دیا ہے، جس سے یہ گمان ہوتا ہے کہ حدِّ اعتدال سے انحراف کیا گیا ہے۔ مصنف اس کی وجہ یہ بتلاتے ہیں۔

چونکہ انہیں اپنے مریدوں سے غرور و تکبر کا اندیشہ ہوتا ہے، اس لئے وہ ان کی نفسانیت کا قلع قمع کرنے میں مبالغہ سے کام لیتے ہیں۔ اور وہ اس لئے کہ روحانی حالت کے غلبے کے ظہور کے ابتدائی دور میں شاذ و نادر ہی کوئی مرید خود پسندی سے خالی ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ اکابر صوفیہ کی طرف سے خود پسندی کے بہت سے اقوال منقول ہیں، جو غالباً حالت سکر کے آثار ہوتے ہیں۔

علم تصوف، صوفیائے کرام اور ان کے معاملات، حالات و مقامات نیز ان کے قائم کردہ خانقاہی نظام کے فرائض و آداب کے متعلق حضرت شہاب الدین سہروردی کی یہ کتاب "عوارف المعارف" گویا ایک انسائیکلو پیڈیا ہے۔ اور صرف ان موضوعات پر ہی یہ جامع کتاب نہیں، بلکہ اپنے وسیع معنوں میں یہ علم الاخلاق کی بھی ایک جہتم بالشان کتاب ہے۔ اس لئے یہ تصوف کی ان چند کتابوں میں سے شمار ہوتی ہے۔ جو گزشتہ سات آٹھ سو سال میں سب سے زیادہ پڑھی اور پڑھائی گئی ہے۔ اور اہل تصوف اور اہل شرع دونوں حلقوں میں مقبول رہی ہے۔

جب میں ان علوم سے فارغ ہو کر صوفیا کے طریقہ کی طرف متوجہ ہوا تو مجھے معلوم ہوا کہ ان کا طریقہ علم و عمل سے تکمیل کو پہنچتا ہے۔ ان کے علم کا حاصل نفس کی گھاٹیوں کا قطع کرنا، اخلاقِ ذمیمہ اور صفاتِ خبیثہ سے پاک و منزہ ہونا ہے تاکہ اس کے ذریعہ قلب کو غیر اللہ سے خالی کیا جائے اور اس کو ذکرِ الٰہی سے آراستہ کیا جائے۔ از امام غزالی

(قرآن اور تصوف تالیف ڈاکٹر میر ولی الدین)

میرا سفرِ حجاز

مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی

"ایک انسان کے عزم کی پختگی سماوی اور ارضی اسباب کو حرکت میں لے آتی ہے" اصفیاء کے اس قول کی صداقت کا تجربہ مجھے حج کے سلسلے میں اپنی ذات پر ہوا۔ فریضۂ حج کے لئے سفر کرنے پر جو پابندیاں عائد ہیں، ان کے ہوتے ہوئے کسی بھی سال حج کے سلسلے میں حتمی فیصلہ کر لینا ناممکن نہ سہی، لیکن دشوار ضرور ہے اس کے ساتھ ہی میں نے یہ عزم کر رکھا تھا کہ اس سال ۱۹۶۳ء میں فریضۂ حج ادا کرنے کے بعد مجھے مشرق وسطیٰ کے عالم اسلام کی سیاحت بھی کرنی ہے۔

سفر میں کسی اچھے ساتھی کی رفاقت سے سفر کی صعوبات میں بہت کچھ کمی ہو جاتی ہے میری ترغیب پر میرے دو مخلص دوست سندھ مسلم کالج کراچی کے دو استاذ پروفیسر ظہور احمد صاحب اور پروفیسر سید فخر الحسن صاحب بھی میرے ساتھ سفر حجاز کے لئے تیار ہو گئے۔ ہم نے ایک طرف تو باقاعدہ طور پر سفر حج کے لئے درخواست دے رکھی تھی اور دوسری طرف انٹرنیشنل پاسپورٹ کے لئے بھی کوشش شروع کر دی تھی۔ کیونکہ حج کا پاسپورٹ صرف حجاز تک کام دیتا ہے اس سے آگے کی سیاحت نہیں ہو سکتی۔

انٹرنیشنل پاسپورٹ تو اپنے کالج کے بعض مخلص تلامذہ کی کوششوں سے گھر بیٹھے ہی مل گیا۔ اس سلسلہ میں سید غلام مصطفیٰ شاہ ناظم تعلیمات کراچی کی عنایتیں خاص طور سے شامل حال رہیں موصوف نے میری طرف سے ضروری گارنٹی اور ضمانت دی جس سے پاسپورٹ ملنے میں آسانی ہو گئی۔ جزاہ اللہ خیر الجزاء۔

جس روز کراچی کے امیدوارانِ حج کی درخواستوں کا فیصلہ بذریعہ قرعہ ہونا تھا اللہ پاک کی اعانت پر بھروسہ کرتے ہوئے

اپنے رفیق شفیق پروفیسر ظہور احمد صاحب کی معیت میں قرعہ کی جگہ پہنچا۔ کوئی آٹھ دس منٹ گزرے ہوں گے کہ ہمارا نام کامیاب امیدواروں میں پکارا گیا، تو ہماری خوشی کی کوئی حد نہ رہی کیونکہ اب خدا کے فضل و کرم سے ادائیگی فریضۂ حج یقینی ہو گئی تھی۔

اس کے بعد سامان سفر کی تیاری شروع ہوئی۔ میں سفر میں بھاری بوجھ سے ہمیشہ گھبرا جاتا ہوں۔ چنانچہ میں نے کم سے کم سامان ساتھ لینے کا فیصلہ کیا۔ اس سفر کی غائت حصول برکات اور ادائیگی فریضہ تھی اور اس میں تشہیر نامناسب تھی لیکن اسے اپنے کالج کے رفقاء اور دوسرے مخلص اور قریبی احباب سے کیسے چھپا سکتا تھا۔ اس لئے مجبوراً ان کی کئی الوداعی دعوتیں قبول کرنی پڑیں۔ اس ضمن میں سب سے زیادہ اخلاص و محبت کا مظاہرہ کالج کے جملہ شاگردوں نے بالعموم اور اسلامک اسٹڈیز کے طلبہ نے بالخصوص کیا اور مجھے الوداع کہنے کے لئے کئی تقریبیں کیں۔

۱۴ اپریل کو ہمیں "سفینۂ حجاج" جہاز پر سوار ہونا تھا۔ اس روز آٹھ بجے صبح میرا ایک مخلص شاگرد محمد الیاس پراچہ اپنی موٹر لے کر گھر پر پہنچا، اسی طرح میرے ایک دوست مولوی محمد جامی صاحب نے بھی یہی زحمت فرمائی۔ غرض بال بچوں کی معیت میں میں بندرگاہ پر پہنچا۔ کالج کے کئی ایک ساتھی اساتذہ، بعض مخلص تلامذہ اور دوسرے کئی کرم فرما حضرات الوداع کہنے کے لئے بندرگاہ پر موجود تھے۔ اتنے احباب کی وجہ سے سامان کی دیکھ بھال اور دوسرے امور میں بڑی آسانی ہوئی۔

قرآن مجید نے اولاد کو من جملہ آزمائش کے بتایا ہے میرا بڑا لڑکا سعید جو آٹھ برس کا ہے، اس خیال میں تھا کہ میں بھی ابا جان کے ساتھ جا رہا ہوں، کیونکہ یہاں بھی وہ حضر و سفر میں ہمیشہ میرے ساتھ ہی ہوتا ہے وہ بندرگاہ پر پھولوں کے ہار ڈالے میرے ساتھ پھر رہا تھا۔ لیکن عین موقعہ پر جب میں "سفینۂ حجاج" میں سوار ہونے کے لئے چلا تو مجھے سعید کو چھوڑنا پڑا۔ اس پر اس نے چیخ پکار کا ایک ہنگامہ برپا کر دیا۔ چنانچہ اسے زبردستی پکڑ کر موٹر میں بٹھانا پڑا۔ اور دو تین آدمیوں نے بمشکل اس کو موٹر میں روکے رکھا۔ اولاد کی محبت انسان کا فطری تقاضا ہے اس منظر کو دیکھ کر ایک گونہ رقت تو طاری ہوئی لیکن قرآن مجید کی مذکورہ آیت کو یاد کرتے ہوئے میں جہاز پر چلا گیا۔

تین بج کر پینتالیس منٹ پر جہاز نے لنگر اٹھایا۔ اور جملہ عازمین حج تسبیح و تہلیل اور عبادت میں لگ گئے

چھ دن تک مسلسل ہمیں ہر طرف پانی ہی پانی نظر آتا تھا۔ عدن سے آگے جہاز کو کافی ہچکولے بھی لگتے رہے، جن کا کہ ہم پر کوئی اثر نہ ہوا کیونکہ ہم فسٹ کلاس میں تھے۔ جہاز میں کھانے پینے کا بڑا اچھا انتظام تھا۔ راستے ہی میں ہم نے احرامِ تمتع باندھا۔ اور اس طرح کفن بدوش حالت میں ہماری زبانوں سے لبیک لبیک کی آوازیں سارے جہاز میں گونج اٹھیں۔ احرام سے قبل تو پروفیسر ظہور احمد صاحب اپنی طبعی ظرافت اور فطری خوش دلی کی بنا پر کبھی کبھی دل بہلانے کا سامان فرماتے رہتے تھے۔ لیکن احرام باندھنے کے بعد تمام وقت ذکر و عبادت میں گزرنے لگا اور ہر لحظہ دیارِ حبیب میں داخل ہونے کا انتظار ہونے لگا۔ آخر الامر چھٹے روز صبح کو بندرگاہ جدہ قریب آگئی جیسے ہی جہاز بندر پر لنگر انداز ہوا، بہت سے عرب قلی سامان اتارنے کے لئے جہاز پر چلے آئے۔ کراچی بندرگاہ پر تو ہر ایک مسافر کو اپنی حفاظت میں اپنا سامان قلی کے ذریعہ جہاز پر چڑھانا یا اتارنا پڑتا ہے، لیکن بندرگاہ جدہ پر اس سے مختلف انتظام نظر آیا، قلی سب سامان جہاز پر ایک جگہ اکٹھا کرتے ہیں۔ پھر مشین کے ذریعہ وہ اتارا جاتا ہے۔ اس طرح ایک تو حاجیوں کا سامان ایک دوسرے سے گڈ مڈ ہو جاتا ہے۔ کہ بعد میں بڑی دقت سے انہیں تلاش کر کے نکالنا پڑتا ہے۔ دوسرے سامان جمع کر کے یوں اتارا جاتا ہے کہ بھاری بوجھ کے تلے کئی صندوق ٹوٹ بھی جاتے ہیں اور حجاج کا کچھ سامان ضائع بھی ہو جاتا ہے۔ بہر حال ہم اپنا سامان جہاز پر چھوڑ کر نیچے اتر آئے۔

جہاز سے اترتے ہی ہم سے معلموں کے متعلق پوچھ گچھ شروع ہوئی معلموں کے وکیل غول در غول ہمارے انتظار میں کھڑے تھے۔ ہم نے تو کراچی ہی سے اپنے ایک قدیم دوست محمد ہاشم سندھی کو اپنا معلم مقرر کر رکھا تھا۔ چنانچہ گیٹ پر اس کا نام بتا کر اب ہم آگے بڑھے تو معلم موصوف کے وکیل ابو زید نامی سے تعارف ہوا۔ اب وکیل کے آدمیوں کے ساتھ سامان کی تلاش شروع ہوئی۔ میرے ساتھیوں کا تو سب سامان مل گیا، لیکن میرا آدھا سامان غائب تھا۔

بعد ازاں اس غائب شدہ سامان کی کسٹم والوں کی طرف سے تلاش شروع ہوئی، میں چونکہ بفضلہ تعالیٰ عربی اچھی بول سکتا تھا اس نے وہاں بڑا کام دیا۔ لیکن غائب شدہ سامان نہ ملا۔ میرے پاس حدیث اور فقہ کی کچھ کتابیں تھیں جن میں کچھ تو مجلس علمی کی طرف سے مولوی عبدالرزاق صاحب کے لئے جو کہ جامعہ مدینہ

میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں، امانت کے طور پر ملی تھیں، اور کچھ اپنی تھیں جنہیں حجاز کے چند احباب کے لئے بطور تحفہ لئے جا رہا تھا، وہ سب کسٹم والوں نے روک لیں، اور ان کتابوں کی مجھے رسید دے دی گئی۔ معلوم ہوا کہ حکومتِ حجاز کتابوں کو اندرون ملک لے جانے کے معاملہ میں بڑی سختی سے کام لیتی ہے تاکہ اس کے مذہبی عقائد کے خلاف یا اس کے متعلق کوئی مخالف کتاب حجاز میں داخل نہ ہونے پائے۔ حفظ ما تقدم کے لئے حکومت کا یہ حفاظتی اقدام بے شک ٹھیک ہے لیکن اس کام پر علماء متعین ہوں جو وہیں کتابوں کو دیکھ لیا کریں، تو مشہور کتب حدیث اور دوسری دینی کتابیں اس دارو گیر سے محفوظ رہیں۔ میں نے کسٹم والوں کو بہت کہا کہ ان کتابوں میں ایک کتاب "نصب الرایۃ فی تخریج احادیث الھدایۃ" تو بہت مشہور ہے جو مصر میں چھپی ہے اور فن حدیث میں ہے۔ لیکن انہوں نے میری ایک بھی نہ سنی، مجبوراً وہاں سے نکل کر ہم حاجی کیمپ میں پہنچے۔ حاجیوں کی وجہ سے وہاں بڑی چہل پہل تھی خورد و نوش کے لئے ہوٹل کھلے ہوئے تھے۔ مغرب کی نماز کے بعد وہ سامان جو مالکوں کو نہیں مل سکا تھا حاجی کیمپ کے میدان میں پڑا ہوا نظر آیا، میں نے اس میں اپنے کھوئے ہوئے سامان کی تلاش شروع کی جو اس ڈھیر میں مل گیا اس سے حکومت کی مستعدی اور اہل کار کی دیانت و کارکردگی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

حکومت و مطوف کے واجباتِ مقررہ اور بس کا کرایہ وہیں مطوف کے وکیل ابو زید کو ادا کرنا پڑا۔ رات ہم نے حاجی کیمپ میں گذاری، صبح بس کے انتظار کو چھوڑ کر ہم نے "تنازل" کا ورقہ لے لیا، ورنہ بس کے انتظار میں سارا دن ضائع جاتا۔ "تنازل" کے معنی ہیں اپنے حقوق سے دستبردار ہونا۔ جس کی یہ صورت ہوتی ہے کہ ایک مخصوص فارم پر یہ لکھ دینا پڑتا ہے کہ ہم نے دستور کے مطابق بس کا جو کرایہ ادا کیا ہے، اس سے ہم دستبردار ہوتے ہیں، ہمیں اجازت دی جائے کہ ہم اپنی مرضی سے سفر کریں۔ اس کے بعد حکومت کے متعلقہ افسر کے دستخطوں سے اجازت نامہ مل جاتا ہے اور آپ کوئی بھی ٹیکسی کر کے جا سکتے ہیں "تنازل" کا ورقہ لئے بغیر آپ موٹر ٹیکسی پر سواری کرنے کے مجاز نہیں ہیں۔ ہم نے ایک ٹیکسی پکڑی اس پر سامان لادا اور اللہ کا نام لے کر چل دیئے۔ جدہ سے مکہ تک کی شاہراہ بڑی اچھی اور پختہ ہے۔ آنے اور جانے کے لئے الگ الگ راستے تھے۔ ٹیکسیاں بڑی پر تکلف اور آرام دہ ہیں۔ ان ٹیکسیوں کی طرح کی کاریں اپنے ہاں

تو صرف وزراء اور بڑے بڑے افسروں کو ہی نصیب ہوتی ہیں۔ ہماری ٹیکسی کے ڈرائیور نے جیسے ہی کار چلانی شروع کی، ریڈیو سیٹ سے عربی گانے بھی شروع ہو گئے۔ ہم چونکہ احرام کی حالت میں تھے جو کہ ایک عبادت ہے اس لئے ہمیں یہ گانا بجانا پسند تو نہیں تھا لیکن وہاں اس معاملہ میں اتنی آزادی ہے کہ الامان والحفیظ مجبوراً خاموش رہنا پڑا۔ آگے چل کر خود حرم یعنی مسجد الحرام کے دروازوں پر ہم نے لوگوں کے ہاتھ میں ریڈیو ٹرانسسٹر بجتے ہوئے دیکھے۔ ڈرائیور سے میں نے عربی میں بات چیت شروع کی تو وہ یمنی نکلا سچ ہے کہ زبان باہمی تعلق کا سب سے بڑا ذریعہ ہے، وہ میرے ساتھ اتنا مانوس ہو گیا کہ کھل کر اپنے ملک یمن اور وہاں کی حالات کے متعلق میرے سوالات کا جواب دیتا رہا۔

سعودی حکومت اور متحدہ عرب جمہوریہ کی باہمی پرخاش کی وجہ سے حجاز میں ریڈیو سے مصری پروگرام سننا ممنوع ہے، لیکن وہاں کے عوام سرکاری لوگوں کے سامنے تو اس قانون کا احترام کرتے ہیں، باقی ویسے وہ زیادہ تر مصری پروگرام ہی سنتے ہیں۔ ہمارا اپنا مشاہدہ تو یہی ہے۔ جدہ سے چل کر تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کے بعد ہم مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے، ہمارے ذہن میں تو قدیم مکہ کا نقشہ تھا جہاں مکہ کی ناہموار گلیوں میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلّم لوگوں کو توحید اور امن و سلامتی کا پیغام سناتے اور ان کی طرف سے اذیتیں جھیلتے تھے لیکن اب تو وہ حالت نہیں رہی، جس راستے سے ہم مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے۔ اس پر واقع چوراہوں میں چھوٹے چھوٹے باغیچے تھے، جو پھولوں سے اٹے ہوئے تھے۔ پُر پیچ گلیوں کی جگہ بڑی بڑی سڑکیں تھیں، ڈرائیور ہمیں محلہ مسفلہ کے اندر معلم محمد ہاشم سندھی کے ہاں لے گیا۔ معلم صاحب کو اپنے جدہ کے وکیل کے ذریعہ ہماری آمد کا پہلے سے ہی علم تھا اور وہ ہمارے خیر مقدم کے انتظار میں تھے، انھوں نے ہمیں شروع میں تو اپنی کوٹھی پر مہمان رکھا اور دوپہر کو عربی دستور کے مطابق ہماری پُر تکلف دعوت کی اور پھر ہم سب ایک کرائے کے مکان میں منتقل ہو گئے جو صرف موسم حج کے لئے ایک ہزار ریال پر حاصل کیا گیا تھا۔ حسن اتفاق سے یہ مکان ایک مدنی نوجوان عالم سید حافظ عبدالجلیل کا تھا، جو حنبلی مشرب کے تھے اور شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کے پیرو معلوم ہوتے تھے، لیکن ان میں تعصب کا نام و نشان تک نہ تھا۔ بدقسمتی سے یہ مرض اپنے ہاں زیادہ پایا جاتا ہے۔ اور ہمیں معمولی معمولی اختلافی مسائل پر لڑائیاں ہو جاتی ہیں۔

ان صاحب سے میری آزادانہ علمی باتیں ہوتی تھیں کہ مجھے اگرچہ وہ حنفی مذاق کا عالم سمجھتے تھے۔ لیکن وہ میری وسعت معلومات سے بڑا متاثر ہوتے تھے۔ وللہ الحمد۔ ان نوجوان عالم سے اعلام حجاز کے متعلق عموماً اور مکہ مکرمہ کے متبحر علماء کے متعلق خاص طور پر بڑی مفید معلومات حاصل ہوئیں۔

مناسکِ حج کے سلسلے میں ہمارا احرام عمرہ کا تھا، لہٰذا طوافِ بیت اللہ، سعی صفا و مروہ اور سر منڈانے کے بعد ہم لوگ حالت احرام سے نکل آئے۔ اس کے بعد بارگاہِ خداوندی میں عبادت کا یہ عالم تھا کہ بس طواف پر طواف اور صبح و شام حرم بیت اللہ کی حاضری رہتی تھی۔ مجھے تو وہاں کے مدارس اور علما کی مجالس میں بھی جانا پڑتا تھا۔ باقی میرے دونوں ساتھی شب و روز عبادت میں مشغول رہتے تھے۔

بیت اللہ میں پہلے ہی روز ایک بخاری عالم سے ملاقات ہوئی جنہیں وہاں مخدوم بخاری کہا جاتا ہے۔ مسجد الحرام میں یہ دستور ہے کہ مکہ مکرمہ کے وہ علما اور صلحا جو کہ حرم میں وعظ کرنے اور درس دینے کے مجاز ہیں مغرب کی نماز سے پہلے وہاں پہنچ جاتے ہیں، جیسے ہی نماز مغرب سے فراغت ہوتی ہے ہر ایک عالم طلبہ یا عوام کے ایک اجتماع سے خطاب کرتا ہے۔ اسی طرح سارے حرم میں آپ کو مختلف اجتماع نظر آئیں گے، باب عمرہ کے قریب مجھے اس قسم کا ایک اجتماع نظر آیا۔ عین وسط میں ایک معمر بخاری عالم عالمانہ رعب و داب سے بیٹھے ہیں، لوگ آتے ہیں۔ ان سے مصافحہ کرتے ہیں مسائل پوچھتے ہیں، کچھ ہندوستانی اور پاکستانی حجاج ہاتھ چومنے کی بھی کوشش کرتے ہیں، لیکن وہ بزرگ جھٹکا دے کر ایسے لوگوں سے اپنا ہاتھ چھڑا لیتے ہیں اور پھر ان کو سمجھاتے ہیں۔

میں بھی آگے بڑھا۔ اپنا مختصر تعارف کرایا۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ میں نے علامہ عبید اللہ سندھی سے استفادہ کیا ہے، علامہ موسیٰ جار اللہ کو جانتا ہوں اور ان کی کتابیں پڑھی ہیں۔ وہ مجھ سے بغلگیر ہوگئے۔ اور انقلاب روس سے لے کر اب تک کے واقعات اپنی پرانی یادداشت سے سنانے لگے۔

میں نے ان کو تفسیر الہام الرحمٰن جلد اوّل جمع و ترتیب علامہ موسیٰ جار اللہ کا ایک نسخہ ہدیہ کے طور پر پیش کیا اسے دیکھ کر بڑے خوش ہوئے، اور علامہ موسیٰ جار اللہ کے متعلق یہ قصہ سنایا۔ حضرت علامہ سے میری پہلی ملاقات انقلاب بخارا سے پہلے ہوئی تھی جب وہ بخارا میں علماء کے ایک اجتماع میں شامل ہونے کے لئے تشریف لائے تھے۔ وہ جوان تھے اور میں چھوٹا تھا۔ اور ابتدائی کتابیں پڑھتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک

مقامی عالم نے میرے استاد سے یہ دریافت کیا کہ علامہ موسیٰ کی مونچھیں بڑی معلوم ہوتی ہیں۔ میرے استاد نے اس کو ڈانٹ کر یہ جواب دیا کہ خاموش ہو جا! موسیٰ کی مونچھ کا ایک بال ان باریش بزرگوں کی داڑھیوں پر فضیلت رکھتا ہے۔

مخدوم بخاری فرمانے لگے کہ مجھے وہ زمانہ بھی یاد ہے جب علامہ موسیٰ جاراللہ کے بعض تحقیقی رسائل کے خلاف استنبول کے شیخ الاسلام علامہ مصطفیٰ صاحب موقف العقل والنقل نے فتویٰ صادر کیا تھا فرمانے لگے کہ علمائے حق کے خلاف ہر زمانے میں اس قسم کا شور و غوغا ہوتا رہا ہے پھر شیخ الاسلام ابن تیمیہ کا نام لیا اور کہا کہ ان کے خلاف کیا نہیں ہوا۔ کہنے لگے کہ جب روس کا بخارا پر تسلط ہوا تب کہیں جاکر ہمارے بزرگ علماء کی آنکھیں کھلیں۔ اور ان کو علامہ موسیٰ جاراللہ کی قبل از انقلاب والی نصیحتیں یاد آئیں۔ علامہ موسیٰ اگرچہ حنفی المشرب تھے لیکن ان میں وہ جمود نہیں تھا جو دوسرے علماء میں تھا۔ انقلاب روس کے بعد جب وہ ہمارے ہاں تشریف لائے تو وہاں کے چند علماء ان سے ملے اور ان سے یہ استفسار کیا جو مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ ہاں موسیٰ صاحب! یہ بتائیے کہ ماوراءالنہر کے مسلمانوں پر روس کا کیوں تسلط ہوا؟ خدا تعالےٰ نے ہماری کیوں مدد نہ فرمائی؟ وغیرہ وغیرہ، علامہ مرحوم جوش میں آکر فرمانے لگے کہ خدا تمہاری مدد کیونکر کرتا۔ تم نے تو عدالتوں میں فیصلہ سناتے ہوئے کبھی یہ نہ کہا کہ اللہ نے یہ فرمایا یا اس کے پیغمبرؐ کا یہ فرمان ہے" تم تو صرف فقہا کا نام لیتے رہے، اب فقہاء ہی آکر آپ کی مدد کریں!!

مخدوم بخاری نے علامہ موسیٰ جاراللہ مرحوم کی دیار حبیب اور حرم مکہ سے محبت کا ایک قصہ سنایا۔ کہنے لگے کہ مجھے جب مکہ مکرمہ میں یہ معلوم ہوا کہ علامہ موسیٰ جاراللہ مصر میں صاحب فراش ہیں اور یہ ان کا مرض موت تھا تو میں نے صرف ان کی مزاج پرسی اور زیارت کے لئے قاہرہ کا سفر کیا۔ علامہ مرحوم نہایت علیل تھے جب ان کو معلوم ہوا کہ ایک بخاری عالم مکہ مکرمہ سے ان کی عیادت کے لئے حاضر ہوا ہے تو انہوں نے فوراً اندر بلا لیا اور مجھے دیکھ کر رونے لگے اور کہا کہ کیا میں اتنا بڑا آدمی ہوں کہ حرم مکہ سے ایک شخص تکلیف اٹھا کر مجھے دیکھنے کے لئے قاہرہ پہنچے۔ یہ کہہ کر پھر رونے لگ گئے۔ میں نے ان سے کہا کہ یا شیخ! آپ کی آنکھوں نے شیخ محمد عبدہ اور رشید رضا جیسے بزرگوں کو دیکھا اور ان کے درس میں بیٹھنے کا آپ کو فخر حاصل ہے۔ میں تو اس کو بڑی بات تصور کرتا ہوں۔ یہ سن کر فرمانے لگے کہ ہاں! میں ہوں تو گنہگار لیکن یہی ایک امید ہے کہ بزرگوں کے طفیل

بخشا جاؤں۔

مخدوم بخاری چالیس سال سے مکہ مکرمہ میں اقامت پذیر ہیں۔ وہ دن کو مدرسہ تحفیظ القرآن میں درس دیتے ہیں اور مغرب کے بعد حرم میں وعظ و نصیحت فرماتے ہیں۔ دوبار مجھے بھی مسجد الحرام میں ان کی عربی تقریر کی اردو میں ترجمانی کرنی پڑی، لیکن میں نے دیکھا کہ حرم میں اس طرح خطاب کرنے سے طبیعت میں کچھ بڑائی پیدا ہونے لگی اس لئے عمداً میں نے ترجمانی چھوڑ دی، باقی مخدوم بخاری سے علمی ملاقاتیں میں ان کے دولت خانہ واقع گلی بخاری متصل باب سعود پر حاضر ہو کر کرتا رہا۔ مخدوم بخاری نے مجھے کئی کتابیں ہدیہ کے طور پر عنایت فرمائیں، ان میں کچھ وہ رسائل بھی ہیں جو کہ علامہ موسی جاراللہ کے خلاف یا تائید میں لکھے گئے ہیں۔

مکہ مکرمہ میں چار بڑے عالم مانے جاتے ہیں، جن کو "اعلم حجاز" کہا جاتا ہے، ان میں سے دو تو گوشہ نشین ہو گئے ہیں اور لوگوں سے کم ملتے ہیں۔ ایک صاحب حکومت کی ملازمت میں ہیں، باقی چوتھے عالم سید علوی مالکی ہیں، جن کی علمی محفل کے متعلق سنا تھا ہمیشہ گرم رہتی ہے۔ وہ حرم میں بعد نماز مغرب مقام ابراہیم کے محاذات میں مسجد الحرام کی چھت کے نیچے درس حدیث دیتے ہیں۔ ۲۴ اپریل کی شام کو حرم میں ان کی خدمت میں پہنچا، جب میں نے انہیں اپنا نام بتایا تو نہایت ہی بے تکلفانہ انداز میں مجھ سے معانقہ کیا اور فرمانے لگے کہ میں آپ کو غائبانہ جانتا ہوں، اور میں نے آپ کا نام سنا ہے۔ یہ شفقانہ جملے فرما کر مجھے بالکل اپنے قریب بٹھایا۔ اس کے بعد صحیح بخاری کا درس دینے میں مشغول ہو گئے۔ سامعین کا بڑا ہجوم تھا۔ ایک حضرموتی شاگرد جس کے چہرہ پر ابھی بال بھی نہیں آئے تھے عربی لہجہ میں عبارت پڑھ رہا تھا اور شیخ فصیح عربی میں اس کی شرح کرتے جاتے تھے۔

سید علوی مالکی کی اپنے ہمعصروں میں جو امتیازی خصوصیت ہے وہ ان کی فصاحت ہے آپ بہت بڑے ادیب اور فصیح اللسان عالم ہیں، میرے بزرگ دوست مولانا محمد یوسف صاحب بنوری شیخ الحدیث دارالعلوم نیو ٹاؤن کراچی جو کہ عرب کے علماء سے اچھا تعارف رکھتے ہیں اور بالعموم سال بسال حج کے لئے جاتے رہتے ہیں اور اس سال بھی تشریف لے گئے تھے وہ بھی سید علوی مالکی کی فصاحت بیانی کے معترف ہیں۔

شیخ علوی مالکی کے درس کی دوسری خاص چیز جو مجھے نظر آئی، وہ تھی ان کی رجال سند پر بحث۔ اپنے

ہاں شرح حدیث پر زیادہ زور دیا جاتا ہے اور کہیں کہیں اختلافی مسائل میں اسناد کے رجال پر کچھ کہا جاتا ہے، لیکن سید علوی مالکی کو دیکھا کہ وہ درس کے دوران ہر سند کے ایک ایک راوی کے سلسلۂ نسب اور اس کے سوانح حیات بیان کرتے چلے جاتے تھے یہ ان کی غیر معمولی قوت حافظہ کی دلیل ہے۔ یہ درس عشاء کی اذان تک جاری رہا درس سے فارغ ہونے کے بعد انہوں نے شام وغیرہ کے علماء اور اپنے صاحبزادہ سید محمد علوی سے میرا تعارف کرایا اور دوسرے دن بعد صلوٰۃ عصر اپنے دولت خانہ پر حاضر ہونے کے لئے کہا۔

دوسرے روز بعد صلوٰۃ عصر پروفیسر سید فخرالحسن صاحب کو ساتھ لے کر علامہ علوی مالکی کے دولت خانہ پر پہنچا جو کہ سلیمانیہ میں واقع ہے۔ شیخ کی علمی محفل گرم تھی۔ علماء اور معتقدین کا ایک جم غفیر حاضر تھا۔ اور آپ سوڈانی علماء سے خطاب فرما رہے تھے۔ سوڈان میں زیادہ تر مالکی مذہب رائج ہے اس لئے اکثر سوڈانی شیخ علوی کے ہاں آتے رہتے ہیں۔ ویسے بھی سید علوی مرجع علماء و صلحا ہیں۔ جیسے ہی انہوں نے مجھے آتے دیکھا مرحبا کہنے کے لئے اٹھے۔ معانقہ اور مصافحہ کیا اور جس تکیہ سے لگ کر خود بیٹھے تھے وہیں مجھے بٹھا دیا۔ یہ ان کی کرم فرمائی تھی۔ میں نے پروفیسر فخرالحسن صاحب کا بھی شیخ سے تعارف کرایا بڑے خوش ہوئے، اور پھر سوڈانی زائرین سے مصروف گفتگو ہو گئے۔ اس وقت سوڈانیوں سے یہ فرما رہے تھے

> یہ کوشش کی جارہی ہے کہ عوام کو علماء سے الگ رکھا جائے اور اس کا نتیجہ الحاد ہوگا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ سب علماء صالح اور اچھے ہیں۔ ان میں سے کچھ علماء سوء اور فتنہ پرداز بھی ہوتے ہیں۔ ان سے بچیں، صلحا کا کہا مانیں اور ان سے علم دین سیکھیں۔ جب تک قرآن موجود ہے کوئی اس کے خلاف کامیاب نہیں ہو سکتا۔

اس مرحلے پر سوڈانیوں نے سید صاحب سے استفسار کیا کہ ہمارے مالکی علماء کی دو جماعتیں ہیں ایک جماعت نماز میں ہاتھ باندھنے پر زور دیتی ہے اور دوسری اس کی زبردست مخالفت کرتی ہے جواب میں سید علوی مالکی نے فرمایا کہ:۔

> اس مسئلہ میں امام مالک سے دو روایتیں ہیں ایک روایت مؤطا کی ہے جس سے عقد (ہاتھ باندھنا) ثابت ہوتا ہے اور دوسری روایت مدونہ کی ہے جس سے ارسال (ہاتھ

چھوڑ کر نماز پڑھنا) کا ثبوت ملتا ہے اور یہی روایت فقہ مالکی میں رائج ہے، لیکن میرا دونوں روایتوں پر عمل رہا ہے کبھی عقد کرتا ہوں تو کبھی ارسال۔

اور پھر فرمایا۔

جو کوئی اس مسئلہ میں جھگڑا کرتا ہے وہ دراصل فتنہ و فساد برپا کرنا چاہتا ہے ایسے لوگوں سے بچنا چاہیئے۔

سوڈانیوں نے پھر سوال کیا کہ ہمارے ہاں اولیاء اللہ کے طُرق میں اختلاف پایا جاتا ہے اس کے متعلق آپ کا کیا ارشاد ہے؟

سید علوی صاحب اس سوال کے جواب میں فرمانے لگے کہ قادریہ، شاذلیہ اور دوسرے سب طریقے اصل میں وصول الی اللہ کی شاہراہیں ہیں۔ ان کے بارے میں آپس میں جھگڑنا مناسب نہیں آپ لوگوں کو تمام اولیاء اللہ کی عزت کرنی چاہیئے کیونکہ حدیث میں کسی بھی ولی اللہ سے دشمنی رکھنے پر وعید وارد ہوئی ہے۔ اولیاء اللہ کے مختلف طرق کی مثال یوں سمجھئے کہ دیکھئے حرم کے کئی دروازے ہیں ان میں سے کسی بھی دروازے سے کوئی شخص داخل ہو وہ حرم میں پہنچ جائے گا۔ اولیاء اللہ کے طریقے بھی اسی طرح ہیں۔

اس کے بعد سید صاحب نے مندرجہ ذیل کتابیں مجھے ہدیتاً عنایت فرمائیں:۔

۱۔ فتح القریب المجیب علی تہذیب الترغیب والترہیب (۲) العقد المنظم فی اقسام الوحی المنظم۔ (یہ دونوں کتابیں ان کی اپنی تالیف ہیں) (۳) رسائل ھامۃ فی الصلوۃ۔ سید زینی دحلان۔ (۴) عقیدۃ الاسلام تالیف شیخ عبداللہ بن علوی الحداد۔

میں نے لمحات تالیف شاہ ولی اللہ صاحب مع مقدمہ و حواشی از احقر راقم ان کی خدمت میں ہدیتاً پیش کی۔ وہ بڑے خوش ہوئے اور شاہ صاحب کے علوم اور کتابوں کی تعریف کرنے لگے اور فرمایا کہ میں نے شاہ صاحب کی وہ کتابیں جو مجلس علمی کی طرف سے شائع ہوئی ہیں (ترکی میں چھپی ہیں) المسوی شرح الموطا کی اجازت علامہ عبیداللہ سندھی سے حاصل کی تھی۔

سید علوی صاحب نے علامہ سندھی کی بھی بڑی تعریف کی اور فرمایا کہ میں نے ان سے تبرکاً صحاح ستہ کی

ابتدائی روایات پڑھ کر ان کے طریقے کی اجازت حاصل کی اور فرمایا کہ شیخ سیاست اور انگریزوں کی مخالفت
میں منہمک تھے۔

میں سید علوی کی علمی مجالس میں اکثر حاضر ہوتا تھا۔ ان کے صاحبزادہ سید محمد علوی نے اس احقر
سے حجۃ اللہ اور شیخ الرئیس کا ایک رسالہ پڑھنے پر اصرار کیا، مشاغل کثیرہ کے باوجود ان کے اصرار پر مجھے اس
کے لئے کچھ وقت نکالنا پڑا۔

۲۶ اپریل کو جیسے ہی عصر کی نماز سے فارغ ہوا، اپنے ایک قدیم دوست قاری رعایت اللہ صاحب سے
ملاقات ہو گئی ان کی معیت میں دار الندوہ کو دیکھا جو کعبۃ اللہ کے شمال میں واقع ہے۔ حرم کی توسیع کے سلسلہ
میں اس طرف تعمیر ہو رہی تھی اس لئے دار الندوہ کا کچھ حصہ گرایا جا چکا تھا۔ آئندہ تو اس کا نام و نشان بھی باقی
نہیں رہے گا۔ افسوس ہے اس قسم کے آثار قدیمہ کی طرف حکومت کوئی توجہ نہیں دیتی شاید اس کے نزدیک
غالباً ان کو بھی بدعت شمار کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد مولد النبیؐ کی زیارت نصیب ہوئی، جہاں اب ایک
لائبریری قائم کی گئی ہے، وہاں سے لوٹ کر مدرسہ صولتیہ کے دفتر میں پہنچا جو باب السعود کے قریب
روڈ پر واقع ہے اور اکثر و بیشتر پاکستان اور ہندوستان کے علما آتے رہتے ہیں۔ اسی روز مدرسہ صولتیہ
میں بعد نماز جمعہ علما کا بڑا اجتماع ہوا۔ اس اجتماع میں پاکستانی علماء میں سے مفتی محمد شفیع صاحب اور مولانا
محمد یوسف صاحب بنوری خاص طور سے قابل ذکر ہیں ہندوستان کے علماء میں سے مولانا ابوالحسن علی میاں
ندوی کو پہچانتا تھا۔ دفتر مہمانوں سے پُر تھا، مدرسہ کی طرف سے عربی طرز کا کھانا پیش کیا گیا۔ میزبانی کے
فرائض حضرت مولانا حافظ محمد سلیم صاحب ناظم مدرسہ صولتیہ فرما رہے تھے۔ اور ان سے میرا تعارف پہلے ہی
ہو چکا تھا، دوسرے بزرگوں سے مولانا بنوری صاحب نے میرا تعارف کرایا۔

اس اجتماع میں خاص طور پر زیر بحث مسئلہ اس فحش اور عریاں عربی لٹریچر کا تھا، جو کہ لبنان اور امریکہ
کی طرف سے مکہ مکرمہ میں دھڑا دھڑ پہنچ رہا ہے، سب علماء نے متفق طور سے علی میاں سے کہا کہ حکومت
کی توجہ ادھر مبذول کرائیں لیکن آپ نے معذرت کی۔

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مکہ مکرمہ کے مدارس کے متعلق بھی کچھ عرض کروں۔ مکہ مکرمہ میں صرف

تین مدارس تھے جو حکومت کے تسلط سے آزاد تھے۔ ان کا نصاب تعلیم بھی اپنا تھا۔ (۱) مدرسہ صولتیہ (۲) مدرسہ الفلاح (۳) مدرسہ دارالحدیث خیریہ۔ مدرستہ الفلاح کے منتظمین نے توحال ہی میں اپنا مدرسہ حکومت کے حوالہ کردیا ہے اور اب وہاں سرکاری مدارس والا نصاب جاری ہے۔ اپنے دونوں ساتھی پروفیسروں کی معیت میں اس مدرسہ کی زیارت کی۔ اچھی خاصی بلڈنگ ہے۔ سید علوی مالکی اور سید محمد مغربی بنانی جیسے مشاہیر علماء اس مدرسہ میں درس دیتے تھے۔

دارالعلوم حرم صولتیہ کے موسس مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی ہیں۔ حضرت مولانا قصبہ کیرانہ ضلع مظفر نگر میں ماہ جمادی الاول سنہ ۱۲۳۳ھ میں پیدا ہوئے آپ کا سلسلۂ نسب حضرت عثمانؓ سے ملتا ہے بارہ برس کی عمر میں قرآن ختم کرنے کے ساتھ ساتھ دینیات اور فارسی کی کتابیں اپنے بزرگوں سے پڑھیں اس کے بعد دہلی بغرض تعلیم تشریف لے گئے اور مولانا محمد حیات صاحبؒ کے مدرسہ میں داخل ہوئے تحصیل علم کا شوق مولانا کو لکھنؤ لے گیا اور مفتی سعداللہ صاحب سے آپ کو شرف تلمذ حاصل ہوا۔ حضرت مولانا رحمت اللہ کے اساتذہ کے اسمار گرامی درج ذیل ہیں۔

۱۔ مولانا محمد حیات صاحب (۲) مفتی سعداللہ صاحب (۳) مولانا احمد علی صاحب بڈولی ضلع مظفر نگر۔ جو آخر میں وزیر ریاست پٹیالہ ہوگئے تھے۔ (۴) عارف باللہ مولانا عبدالرحمٰن صاحب چشتی۔ یہ استاد شاہ وقت تھے تمام علوم و فنون میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔

ہندوستان میں مولانا رحمت اللہ کے درس و تدریس کا زمانہ بہت کم ہے کیونکہ نصاریٰ کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو روکنے کی فکر نے آپ کو اس کا موقع نہ دیا، چندسال دربار کیرانہ کی مسجد میں ایک دینی مدرسہ قائم کیا۔ اس مدرسہ کے فیض یاب طلبہ میں سے چند خاص نام درج ذیل ہیں۔ ہندوستان میں مولانا کے جو خاص تلامذہ تھے ان میں سے بعض اصحاب نے مکہ معظمہ بھی پہنچکر مولانا نے شرف تلمذ حاصل کیا۔

۱۔ مولانا عبدالسمیع صاحب۔ رامپوری۔ مصنف حمد باری (۲) مولانا احمد الدین صاحب چکوالی۔ یہ بزرگ بہت بڑے ادیب اور عالم تھے۔ کراچی سندھ میں بھی انہوں نے درس دیا۔ سندھ کے مشہور عالم مولانا صادق صاحب کھڈہ والہ نے مولانا چکوالی سے تعلیم حاصل کی تھی۔ (۳) مولانا نور احمد صاحب امرتسری (۴) مولانا شاہ

ابوالخیر صاحب (۵) مولانا عبدالوہاب صاحب ویلوری بانی مدرسہ باقیات الصالحات مدراس (۶) مولانا بدرالسلام صاحب عثمانی کیرانوی مہتمم حمیدیہ کتب خانہ شاہی قسطنطنیہ وغیرہم مولانا رحمت اللہ صاحب ہندوستان میں درس و تدریس کے ساتھ ردّ نصاریٰ کی مہمات میں بھی مصروف رہے یہ وہ زمانہ تھا جب عیسائی مشنریوں نے ہندوستان میں اسلام کے خلاف زبردست مہم جاری کر رکھی تھی۔ پادری فنڈر (Revd, C. C. Fonder) اور اس کی جماعت کے لوگ اسلام کے خلاف بڑی دل شکن تقریریں کرتے پادری فنڈر کی کتاب "میزان الحق" سے عوام سہمے ہوئے تھے عیسائی مشنریوں کی ان جارحانہ کارروائیوں کے خلاف علمائے اسلام نے تیاری شروع کی اور مقابلہ کے لئے میدان میں آگئے اسلام کی حقانیت اور اللہ کا نام بلند کرنے کے لئے ردّ نصاریٰ کی اس مذہبی جنگ کے قائد اول حضرت مولانا رحمت اللہ تھے۔ آپ نے اعلان فرمایا۔

"میں نے ہندوستان کے سب سے بڑے پادری جو علمائے مسیحین میں ممتاز حیثیت کا مالک اور میزان کا مصنف تھا اس سے خواہش ظاہر کی کہ وہ میرے ساتھ مجمع عام میں مناظرہ کرے تاکہ حق واضح ہو جائے اور یہ معلوم ہو جائے کہ علمائے اسلام نے ان رسائل کی تردید اس لئے نہیں کی کہ وہ عاجز تھے بلکہ جواب دینے کی ضرورت نہیں سمجھتے تھے"[1]

بالآخر وہ مناظرہ ۱۱ رجب ۱۲۷۰ھ مطابق ۱۰ اپریل ۱۸۵۴ء کو کٹرہ عبدالمسیح اکبرآباد آگرہ میں منعقد ہوا مولانا کے ساتھ ڈاکٹر وزیر خاں اور پادری فنڈر کے ساتھ پادری فرنچ تھے۔ مولانا رحمت اللہ نے نسخ و تحریف انجیل پر فاضلانہ بحث کی اور خود عیسائیوں کی مطبوعات سے نسخ و تحریف ثابت کر دی چنانچہ پادری فنڈر کو اعتراف کرنا پڑا کہ انجیل میں سات آٹھ جگہ تحریف ہوئی ہے اور یہ لکھ کے بھی دے دیا۔ تین دن تک مسلسل یہ مجلس مناظرہ منعقد رہی اور پادری صاحب کو شکست فاش اٹھانی پڑی۔

حضرت مولانا نے فتنۂ مسیحیت کے استیصال کی غرض سے جو کتابیں ردّ نصاریٰ میں تالیف کیں وہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) اظہار الحق۔

(مسلسل)

---

[1] اظہار الحق ص۳

تنقید و تبصرہ

مُفردات القرآن

تصنیف امام راغب اصفہانی رحمتہ اللہ علیہ
ترجمہ و حواشی الاستاذ محمد عبدہ الفلاح الفیروزپوری

مولانا محمد عبدہ، جامعہ محمدیہ اوکاڑہ ضلع منٹگمری (مغربی پاکستان) نے امام راغب اصفہانی متوفی ۵۰۲ھ کی مشہور و معروف کتاب "المفردات فی غریب القرآن" کو اردو قالب میں ڈھال کر ایک بڑا کام کیا ہے قرآن مجید کے مفرد الفاظ کی تشریح میں امام صاحب کی یہ تصنیف اس باب میں سب سے بہتر کتاب سمجھی جاتی ہے۔ گو اس موضوع پر اور کتابیں بھی تصنیف ہوئیں، لیکن جو شہرت اور امتیاز امام راغب کی مفردات کو حاصل ہوا، دوسری کتابیں اس سے محروم رہیں۔ قرآن مجید کے الفاظ کا مفہوم معین کرنے میں سب سے زیادہ مدد اس کتاب سے لی جاتی رہی ہے اور نہ صرف اصحاب تفسیر اس کی طرف رجوع کرتے تھے، بلکہ حافظ ابن حجر اور علامہ عینی جیسے جلیل القدر شارحین حدیث بھی المفردات سے استفادہ کرتے رہے ہیں نواب صدیق حسن خاں لکھتے ہیں:-

از رجال ایں طبقہ ابوالقاسم حسین راغب اصفہانی است صاحب احتجاج القرآن در قرأۃ مفردات القرآن و دریں باب اعتمادِ جمہور مفسرین بر تحقیقات اوست (المتوفی ۵۰۲ھ)

قرآن مجید کے غریب و مشکل الفاظ کی تشریح میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں، ان کا ذکر کرتے ہوئے نواب صدیق حسن خاں لکھتے ہیں۔

"ومن احسنھا المفردات للراغب"

مولانا محمد عبدہ کا یہ ترجمہ ۱۰۴۰ صفحات پر ہے۔ ادارے نے دو جلدوں میں شائع کیا گیا ہے۔ ترجمہ کا

یہ کام کتنا مشکل ہے، اس کا اندازہ اصل عربی کتاب اور اس کے ترجمے کا مقابلہ کرنے سے ہی ہو سکتا ہے۔
راقم الحروف نے جستہ جستہ مقامات پر اصل عبارت اور اس کا جو ترجمہ کیا گیا ہے دونوں کا مقابلہ کیا ہے ترجمے میں مولانا محمد عبدہ کو جو محنت عرقریزی اور تحقیق کرنی پڑی ہے اور اپنی طرف سے حاشیئے لکھنے کے لئے انہوں نے جو حوالے بہم پہنچائے ہیں، اور اس کے لئے جتنی جان کاہی کی ہے، یہ سب دیکھ کر یہ کہنا پڑتا ہے کہ اس طرح کا مہتم بالشان کام غیر معمولی دلی لگن اور خدمتِ دین کے سچے اور حقیقی جذبے سے ہی ہو سکتا تھا۔ اور اللہ تعالیٰ نے مترجم کو اس کا حصہ وافر عطا فرمایا ہے۔

اصل کتاب میں، ظاہر ہے، قرآن مجید کے مفردات عربی میں ہیں۔ اور ان کے مشتقات اور ان سے متعلق حوالے بھی عربی ہی میں ہیں البتہ جہاں جہاں مصنف نے ضرورت محسوس کی ان مفردات اور ان کے مشتقات اور حوالوں کی مختصراً تشریح کر دی ہے۔ مترجم کو اصل الفاظ و عبارات بعینہٖ نقل کرنے کے ساتھ ساتھ اردو میں ان سب کا ترجمہ بھی کرنا پڑا ہے۔ اور یہ واقعی بڑا مشکل کام تھا۔ اس کے علاوہ موصوف نے ایک اور کام یہ بھی کیا ہے کہ ہر آیت جو مفردات کے ضمن میں دی گئی ہے، اس کے ترجمے کے ساتھ ساتھ اس کے اور جس سورۃ میں وہ آئی ہے اس سورۃ کے نمبر بھی دے دیئے ہیں، جس سے قرآن مجید میں انہیں تلاش کرنا بڑا آسان ہو گیا ہے۔
راقم الحروف کو اصل کتاب اور زیر نظر ترجمہ دونوں کے بالتفصیل تو نہیں، البتہ سرسری طور سے مطالعے اور مقابلے کا موقع ملا ہے اور جہاں تک میں دونوں کا جائزہ لے سکا ہوں مولانا محمد عبدہ صاحب اس کارِ عظیم میں بڑے کامیاب رہے ہیں اور انہوں نے امام راغب کی مفردات کا بڑا اچھا ترجمہ کیا ہے۔

مثال کے طور سے لفظ بکّۃ لیجئے۔ اس لفظ کی تشریح کا ترجمہ یوں دیا گیا ہے :۔ بکّۃ مجاہدؒ سے منقول ہے کہ یہ اصل میں "مَکّۃ" ہے اور اس میں باء میم سے بدل ہے جیسا کہ سبدَ راسَہ و سمَدَہٗ وضرْبٌ لازِبٌ ولازِمٌ میں ہے، قرآن میں ہے انّ اوّلَ بَیْتٍ وُضِعَ للنّاسِ للّذی ببکّۃَ مُبٰارکاً۔ پہلا گھر جو لوگوں (کے عبادت کرنے) کے لئے مقرر کیا گیا تھا وہی ہے جو مکّے میں ہے بابرکت (۳-۹۶)

بعض کا قول ہے کہ بکّہ سے اندرون مکّہ مراد ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ یہ مسجد کا نام ہے۔ بعض کا

خیال ہے کہ یہ تَبَاكَ سے ماخوذ ہے، جس کے معنی ازدحام کے ہیں۔ اور وہاں چونکہ طواف کے لئے لوگوں کا ہجوم رہتا ہے اس لئے اس کو بکّۃ کہا گیا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ بکّۃ بكٌ (ن) سے مشتق ہے، جس کے معنی مزاحمت کرنے اور پہاڑ ڈالنے کے ہیں۔ چونکہ سنت الٰہی جاری ہے کہ جو ظالم وہاں الحاد و ظلم پھیلانا چاہتا ہے اس کی گردن توڑ دی جاتی ہے۔ اس لئے اس کا یہ نام ہے۔"

امام راغب کی "المفردات فی غریب القرآن" قرآن مجید کو سمجھنے کے لئے ایک کلید کی حیثیت رکھتی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ اہل علم اس مقصد کے لئے سب سے زیادہ اسی کتاب کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اس کتاب کے اردو میں ترجمہ ہو جانے سے کم عربی جاننے والے حضرات جو اردو جانتے ہیں خود قرآن مجید کو براہ راست سمجھنے کے قابل ہو سکیں گے۔ اس اعتبار سے مولانا محمد عبدہ صاحب کی یہ علمی خدمت خیر و برکت اور رشد و ہدایت کا ایک مستقل منبع ثابت ہوگی۔

ہمیں امید ہے، کوئی کتب خانہ اس کتاب سے خالی نہیں رہے گا، نیز جن حضرات کو خداوند تعالےٰ نے قرآن مجید کے مطالعے کا شوق ودیعت کیا ہے، وہ اس کتاب سے ضرور استفادہ کریں گے۔

"مفردات القرآن" اردو ترجمے کے دو حصے ہیں، اور دونوں کی مجموعی قیمت قسم اوّل چالیس روپے اور قسم دوم تیس روپے ہے۔

ملنے کا پتہ:- محمد شمس الدین بک سیلر زیر مسلم مسجد بیرون لوہاری گیٹ، لاہور

(ا۔ س)

مخدوم جہانیاں جہاں گشت

از محمد ایوب قادری

ناشر "ادارۂ تحقیق و تصنیف" ۱۴۱/۱ وحید آباد ۱۸

جناب محمد ایوب قادری ایم اے لیکچرار اردو۔ اردو کالج کراچی۔ "تذکرہ علمائے ہند" اور "علم و عمل" جیسی تاریخی و تحقیقی کتابوں کے سلسلے میں علمی دنیا میں کافی متعارف ہیں موصوف نے زیر نظر کتاب میں حضرت جلال الدین مخدوم جہانیاں جہاں گشت بخاری اُچی المتوفی ۷۸۵ھ / ۱۳۸۳ء کے مفصل حالات و سوانح مرتب فرما کر اپنے ذوق تحقیق کا ایک بڑا اچھا نمونہ پیش کیا ہے۔ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت اپنے دور کی ایک بڑی اہم شخصیت تھے۔

ایوب صاحب نے ان تمام علمی مصادر سے جن تک کہ ان کی رسائی ممکن تھی، حضرت مخدوم کے حالات جمع کرکے ان کا تاریخی محاکمہ کیا ہے۔ اور ہمارے سامنے آپ کی ایک صحیح تاریخی تصویر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت علاؤالدین خلجی کے عہد حکومت میں ۷۰۷ھ میں اوچ میں پیدا ہوئے۔ اس زمانے میں ریاست بہاولپور میں واقع یہ شہر روحانی اور تبلیغی سرگرمیوں کا بڑا مرکز تھا۔ اور اس کے متعلق شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے عہد اکبر میں لکھا تھا۔

"گویند زمینِ اوچ و صحرائے او کیفیتے و حالتے دارد کہ در زمین ہائے دیگر نیست۔"

حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے جدامجد حضرت جلال سرخ بخاری بخارا سے ان دیار میں تشریف لائے تھے۔ آپ شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا ملتانی سے جن سے برصغیر ہند و پاکستان میں سہروردی سلسلے کو فروغ ہوا، مستفیض ہوئے اور پھر اوچ میں سکونت فرمائی۔ آپ کے فرزند احمد کبیر سہروردی تھے، جو حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے والد ماجد ہیں حضرت مخدوم کا خاندان صاحبِ رشد و ہدایت تھا۔ اور اوچ میں اس کی اپنی خانقاہ تھی۔ حضرت مخدوم نے اوچ ہی میں اس زمانے کے مروجہ علوم پڑھے پھر آپ ملتان تشریف لے گئے۔ شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا کے پوتے اور ان کے سجادہ نشین شیخ رکن الدین ابوالفتح نے آپ کے لئے تعلیم کا انتظام کیا۔ آپ جب علوم ظاہری سے فارغ ہوکر واپس اوچ پہنچے تو سلطان محمد تغلق نے آپ کو شیخ الاسلام مقرر کیا، جسے آپ نے قبول نہ کیا اور حجاز مقدس کو روانہ ہوگئے۔

حضرت مخدوم نے اس کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے:۔ سلطان محمد تغلق نے مجھ کو شیخ الاسلام کیا اور چالیس خانقاہیں میرے تصرف میں کردیں۔ شیخ (رکن الدین ابوالفتح)[1] مجھ کو خواب میں دکھائی دیئے۔ کہا تو حج کو چلا جا تو غرق ہوجائے گا۔ صبح کو شیخ کے امام نے کہا کہ جلد روانہ ہوجا۔ کیا تیاری کرتا ہے، شیخ نے تجھے اشارہ کیا ہے۔ میں نے مخدوم والد سے اجازت چاہی، روانہ ہوگیا۔۔"

مصنف لکھتے ہیں کہ حضرت مخدوم اس طرح کم و بیش دس بارہ سال باہر رہے۔ ان میں سے سات سال

---

[1] اس وقت آپ کا وصال ہوچکا تھا۔

آپ کے مکہ معظمہ میں اور دو سال مدینہ منورہ میں گزرے، ان دونوں مقامات میں آپ نے بعض مشائخ سے تحصیل علم کیا اس کے علاوہ سفر و سیاحت کے دوران میں آپ جہاں بھی گئے وہاں کے علماء و صوفیاء سے استفادہ فرمایا۔ چنانچہ آپ جب لوٹے تو علوم شریعت و طریقت میں آپ کا کوئی نظیر نہ تھا۔ بقول مصنف :۔ حضرت مخدوم کے علم و فضل کے بارے میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں ۔" مخدوم جہانیاں) جامع است میان علم و ولایت" اور صاحب تاریخ فرشتہ کا بیان ہے :" سید جلال الدین حسین بخاری عالم متبحر تھے۔ اور علوم عقلی و نقلی میں آپ نے نہایت مشقت کھینچی تھی اور مقید اس امر کے نہ تھے کہ ایک کے مرید ہو کر دوسرے سے رجوع نہ کریں ...."
صاحب ماثر صدیقی نے لکھا ہے "آپ علوم کتاب و سنت کے جوہر فرد اور کمالات باطنی کے معدن تہذیب اخلاق اور ملکات روحانی کے سہیل یمن تھے۔"

چشتیہ سلسلے کے بزرگ عام طور سے بادشاہوں اور حاکموں سے دور رہتے تھے۔ اس کے برعکس ایوب صاحب لکھتے ہیں :۔ سہروردی سلسلے کے شیوخ کا مسلک ان سے جداگانہ تھا۔ وہ درباروں سے قریب رہ کر بادشاہ کو نصیحت کرنے، صحیح رائے اور مشورہ دینے، رعایا کے ساتھ عدل و انصاف کرنے اور شریعت کے مطابق ان سے عمل کرانے کو ضروری خیال کرتے تھے ۔ چنانچہ حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی حضرت صدرالدین عارف، اور حضرت شاہ رکن الدین اسی مسلک پر قائم تھے۔ حضرت مخدوم نے بھی اپنے خانوادہ کے ان بزرگوں کی پیروی کی ۔ ان کا تعلق فیروز شاہ تغلق کے دربار سے نہایت مستحکم تھا۔ یہ نیک و عادل بادشاہ ان کے صلاح و مشورہ کو قبول کرتا اور اس پر عمل پیرا ہوتا۔ حضرت مخدوم بھی اس کے ساتھ پوری طرح تعاون کرتے ۔ ان کے نزدیک ہر سلطان عادل کی ہستی برگزیدہ تھی ۔ اور وہ اس کی اطاعت کو اطاعت خداوندی کے مترادف قرار دیتے تھے ۔"

آپ کی تصنیف خزانہ جلالی میں والیوں کی تعلیم کے بارے میں ایک باب ہے جس میں فرماتے ہیں :۔
مکہ، مدینہ اور خراسان کے مشائخ نے اس خاکسار کو وصیت کی ہے کہ ہر حال میں حکمران کا مخلص اور نیک خواہ رہنا چاہیئے اور ان کے پاس لوگوں کے کام کے لئے جانا چاہیئے ۔ اور ان کے تحائف قبول کرنے چاہئیں۔ اور یہ توقع نہیں کرنی چاہیئے کہ وہ تمہارے پاس آئیں ۔ ایک مرتبہ حضرت مخدوم نے فرمایا کہ بادشاہ کے لئے

بددعا نہ کرنی چاہیئے، بلکہ اصلاح کی دعا کرنی چاہیئے کہ اے اللہ! تو امام و اُمت کو اور حاکم و محکوم کو صالح و درست کر دے۔

سہروردی سلسلے کے بزرگوں کا بالعموم اور حضرت مخدوم کا بالخصوص اپنے عہد کے سلمان سلاطین کے معاملے میں یہ نقطہ نظر تھا، چنانچہ وہ فیروزشاہ تغلق سے ملنے ہر دوسرے تیسرے سال دہلی جایا کرتے تھے۔ بادشاہ ان کا بہت احترام کرتا تھا اور جہاں بھی قیام فرما ہوتے تھے، وہاں ملنے آیا کرتا تھا۔ کئی ایک ملکی مہمات میں حضرت مخدوم نے حصہ بھی لیا، اور ان کی کوششوں سے صلح و امن بحال ہوا۔

حضرت مخدوم صرف ایک صاحبِ طریقت بزرگ ہی نہ تھے کہ شاہی درباروں میں ان کا بڑا رسوخ تھا اور روحانی فیض کے طالب دور دور سے ان کی بارگاہ کا قصد کرتے تھے، بلکہ ان کے ہاں درس و تدریس کا بھی باقاعدہ انتظام تھا۔ دور و نزدیک سے طلبا، "مدرسہ جلالی" میں آکر تعلیم حاصل کرتے۔ نامور عالم و واعظ مطالب قرآن و احادیث حل کرتے تھے۔ مریدین و معتقدین بالالتزام تفسیر و حدیث اور کتب تصوف کا درس لیتے تھے ۔۔۔۔ (آپ) سات قرأتوں کے قاری تھے۔

۔۔۔۔ حضرت مخدوم کے یہاں حدیث کا باقاعدہ درس ہوتا تھا۔ (آپ) فقہ میں مجتہدانہ حیثیت کے مالک تھے۔ ائمہ اربعہ کے مذاہب پر کامل نگاہ رکھتے تھے۔ درس کے دوران ہر مذہب کا فرق بیان فرماتے اور پھر فقہ حنفی کی جامعیت کو ذہن نشین کراتے تھے۔

حضرت مخدوم سے جو جعلی و وضعی باتیں منسوب کر دی گئی ہیں، ایوب صاحب نے بڑی تحقیق سے ان کی تغلیط بھی کی ہے۔ جیسے آپ کا مکہ معظمہ سے قدم شریف لانا اور ایک سفرنامہ جو آپ کے نام سے چھپا ہوا ملتا ہے۔

ایک باب حضرت مخدوم کے علمی آثار و ملفوظات کے متعلق ہے۔ مصنف نے بڑی محنت سے ان کے بارے میں جملہ معلومات اکھٹی کی ہیں اور بتایا ہے کہ آپ کے علمی آثار کس شکل میں اور کہاں کہاں ملتے ہیں۔ "کتابیات" کے ذیل میں کوئی ۱۶۰ کتابوں کے نام درج ہیں جن کی طرف اہل علم رجوع کر سکتے ہیں آخر میں اعلام اور کتابوں کے بارے میں اشاریہ (انڈکس) بھی دیا گیا ہے۔

غرض حضرت مخدوم جہاں گشت کے حالات و سوانح پر ایوب صاحب کی یہ ایک جامع کتاب ہے اور اس ضمن میں جہاں سے بھی ان کو مواد مل سکتا تھا، اسے حاصل کرنے میں انہوں نے اپنی طرف سے کوئی کوشش اٹھا نہ رکھی۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اس میں تحقیق کا حق ادا کیا ہے۔

کتاب مجلد ہے، ضخامت ۳۰۴ صفحے اور قیمت مجلد کی سات روپے اور غیر مجلد کی چھ روپے

فلسفۂ اسلام

مصنفہ ڈی ادلیری ڈی ڈی۔ لیکچرار آرامی و سریانی برسٹل یونیورسٹی

ترجمہ احسان احمد بی۔ اے (علیگ)

ڈاکٹر ڈی ادلیسری کی اس کتاب کا اردو ترجمہ بہت پہلے حیدرآباد دکن میں چھپا تھا اور وہاں جامعہ عثمانیہ میں یہ داخل نصاب رہا۔ اب چونکہ یہ اردو ترجمہ نایاب تھا اس لئے نفیس اکیڈمی کراچی نے اسے شائع کیا ہے۔ اسلام سے قبل یونانی فلسفہ و حکمت اپنے یونانی ماحول سے جس طرح مشرق قریب میں آباد سریانی زبان بولنے والی قوموں میں پہنچا۔ وہاں سے یہ دنیائے اسلام میں عربی بولنے والوں کے ہاں منتقل ہوا اسے عربی زبان کا قالب ملا۔ اور اس کے مسلمانوں کے علوم و فنون اور نظریات و عقائد پر دور رس اثرات پڑے اور پھر جیسے سسلی اور اندلس کے راستے وہ مغربی یورپ کی لاطینی درس گاہوں میں پہنچا۔ اس نے عیسائی اور یہودی فکر کو متاثر کیا اور اس طرح یورپ میں پاپائی کلیسا کے خلاف ذہنی فضا پیدا کر کے وہاں نشاۃ ثانیہ کے لئے راستہ صاف کیا، جس نے کہ یورپ کے عہد حاضر کو جنم دیا۔ مصنف نے اپنی کتاب میں اس کا جائزہ لیا ہے۔

مصنف نے شروع میں ایک بڑی پتے کی بات کہی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ عام طور سے انگریزی طریق تعلیم میں فلسفہ پر کچھ اس طرح بحث ہوتی ہے کہ فلسفہ کی ابتدا یونان سے ہوئی، اور وہ ارسطو پر آکر ختم ہو گیا۔ پھر کئی صدیوں کے بعد ڈیکارٹ پیدا ہوا اور جدید فلسفہ کی طرح پڑی۔ اس درمیانی وقفے میں بقول مصنف "قدماء کے بعض نالائق و ناخلف ورثا گزرے ہیں جو اس لائق نہیں کہ ان پر سنجیدگی سے ساتھ غور کیا جائے۔" مصنف اس نقطۂ خیال کی تردید کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ زندگی اسباب و نتائج کی ایک مسلسل کڑی ہے۔ اور جو حادثہ رونما ہوتا ہے، اس کی کوئی علت ہوتی ہے۔ جس دور کو ہم قرون وسطیٰ کہتے ہیں، اس کا ہمارے اس زمانے کے ثقافتی ارتقاء میں بڑا اہم حصہ ہے اور وہ بہت کچھ اس ثقافتی ورثے کا مرہون احسان ہے

جو قدیم یونان سے سریانی، عربی اور عبرانی سے اس تک پہنچا۔ قرون وسطیٰ کا یہ دور ظاہر ہے مسلمانوں کا دور ہے۔

کتاب کا پہلا باب "سریانی زبان میں یونانیت کی ترجمانی" ہے اس میں یہودیت اور عیسائیت پر یونانیت کے جو اثرات پڑے، ان کا ذکر ہے اور نو افلاطونیت اور نسطوری عیسائی فرقہ کا بیان کیا گیا ہے۔ دوسرا باب "عربی دور" پر ہے اس میں عہد رسالت و خلافت راشدہ، اور عہد اموی کی سیاسی و ذہنی زندگی پر بحث کی گئی ہے مصنف کے نزدیک مدینہ کی زندگی مکہ کی زندگی سے زیادہ ترقی یافتہ تھی۔ اور وہاں آرامی و یہودی نو آبادکاروں کے اثرات راسخ تھے اس لئے مسلمانوں کی جماعتی زندگی بآسانی وجود میں آسکی مصنف لکھتا ہے کہ اموی دور ہی میں یونانی اثرات مسلمانوں میں متعدد جہتوں سے سرایت کرنے لگے۔ نیز اسی دور میں ان تمام قوموں نے عربی زبان کو اپنانا شروع کر دیا۔ جو اسلام کے زیر نگیں آئی تھیں۔ اس کے بعد دور عباسی آتا ہے۔ جس میں بڑے وسیع پیمانے پر یونانی علوم کے عربی میں تراجم ہوئے۔ اور ان کے نتیجے میں مسلمانوں میں طرح طرح کے فکری تحریکیں اٹھیں۔ اس ضمن میں مصنف معتزلہ اور اصحاب فلسفہ (کندی، فارابی، ابن سینا اور اخوان الصفا اور اسماعیلی اہل فکر) کا تفصیل سے ذکر کرتا ہے، اس کا کہنا ہے کہ معتزلہ کی تائید اور ان کی مخالفت میں ایک عرصہ دراز تک جو ہنگامہ بحث و مناظرہ گرم رہا اس کی وجہ سے مسلمانوں میں تین رجحان فکر وجود میں آئے۔ ایک فلسفیانہ رجحان جس کے حامل یونانی فلسفے کا براہ راست یونانی زبان میں یا اس کے ترجموں و شرحوں سے مطالعہ کرتے تھے دوسرا رجحان اشعریوں کا تھا جنہوں نے اسلامی الٰہیات کو یونانی فلسفے سے مطابقت دے لی تھی۔ اور ان میں بعد میں آنے والے معتزلی بھی منضم ہو گئے تھے اور تیسرا رجحان صوفیہ کا تھا۔ جس میں نو افلاطونی عناصر، ہندوستان اور ایران کے دوسرے عناصر سے مخلوط نظر آتے ہیں۔

مصنف کے نزدیک ابن سینا اسلام کی دنیائے مشرق کے بڑے فلسفیوں میں سے آخری ہے اس کے بعد مشرق میں فلسفے کو زوال آگیا۔ اس کی دو وجہیں تھیں، ایک یہ کہ فلسفے کے ساتھ بہت سی شیعی بدعتیں وابستہ ہو گئیں اور راسخ العقیدہ اہل سنت والجماعت نے اسے شک و شبہ کی نظر سے دیکھنا شروع کر دیا، دوسرے دنیائے اسلام کے اس حصے پر ترکی عناصر کو غلبہ حاصل ہو گیا جو کٹر سنی تھے اور ہر اس چیز سے جس کا تعلق شیعوں سے ہوتا یا وہ عقلیت کی طرف مائل ہوتی، نفرت کرتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود فلسفہ نے اسلامی مشرق پر

اپنے دو مستقل اثر چھوڑے ہیں۔ ایک علم کلام پر اور دوسرا تصوف پر۔

یوں تو اسلام کے ابتدائی دور میں ہی سادگی، پرہیزگاری، صبر و قناعت اور ایثار و نفس کشی کے وہ اوصاف موجود تھے جنہیں صوفیانہ زندگی کا امتیاز سمجھا جاتا ہے لیکن بقول مصنف کے، تیسری صدی ہجری کے آخری حصّے میں جو تصوف وجود میں آتا ہے، وہ ان مثالی مقاصد سے مختلف تھا جن کا اوائل اسلام میں زور رہا تھا۔ اس تصوف کی الہیات کا مرکزی فکر نو افلاطونیت تھا۔ جس کے اثرات اسلام سے پہلے شامیوں اور ایرانیوں پر پڑ چکے تھے چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ شروع کے صوفیہ میں سے اکثر نو مسلم ہیں۔ جامی کا بیان ہے کہ جنید ایرانی تھے اور زیادہ تر ایرانیوں ہی کے ذریعہ تصوف کے نظریات نے ترقی کی اور وحدت الوجود کی طرف میلان ہوا، امام غزالی کے ذکر میں مصنف لکھتا ہے کہ ان سے پہلے راسخ العقیدہ اسلام میں تصوف کو بار نہیں ملتا تھا، یہ امام غزالی ہی تھے جن کی بدولت تصوف کو اس میں اپنا مقام حاصل ہوا اور اہل سنت والجماعت میں تصوف کو فروغ ہو سکا۔

علم کلام کے تحت اشعریہ اور ماتریدیہ کا ذکر کرنے کے بعد اس باب میں امام غزالی نے جو دیرپا نقوش چھوڑے ہیں، مصنف نے ان کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ابن رشد کے برخلاف امام غزالی نے فوق العقلی وجدان پر زور دیا، جس سے انسانی روح اس عالم سے بلند ہو کر حقیقت کو پا لیتی ہے۔ میکڈانلڈ کے الفاظ میں امام غزالی کے یہ چار کارنامے ہیں۔

۱۔ اُنہوں نے اہل سنت والجماعت میں تصوف کو فروغ دیا

۲۔ فلسفیانہ استدلال کو مقبول عام بنایا۔

۳۔ فلسفے کو الہیات کے تابع کیا

۴۔ اس دور میں خوف خدا کے جذبے کو بحال کیا۔ جب کہ وہ تعلیم یافتہ طبقے کے ہاں سے کمزور ہو رہا تھا۔

اس کے بعد مصنف "مغرب" میں — جو اس وقت عبارت تھا تیونس سے لے کر اسپین تک کی اسلامی دنیا سے۔ فلسفے کے فروغ سے بحث کرتا ہے۔ اس ضمن میں ابن باجہ، ابن طفیل، اور ابن رشد، نیز بعض یہودی فلسفیوں کا جو عربی میں لکھتے تھے۔ ذکر آتا ہے۔ اور ابن رشد کو جس طرح یورپ میں قبولیت عامہ حاصل ہوتی ہے تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ مصنف کے نزدیک اندلسی سلطان سخت قسم کے قدامت پسند تھے اور بنو عباس کے

دور میں ادھر مشرق میں جس قسم کی آزاد خیالی کا دور دورہ تھا، اس کو یقیناً وہ ناپسند کرتے تھے۔ انہیں صرف تفسیر، حدیث اور فقہ کے مطالعے سے دلچسپی تھی۔ ان کی اس قدامت پسندی کی ایک نمائندہ مثال ابن حزم ہے جو اندلس کا پہلا مشہور عالم الہیات اور فقیہہ ہے۔ اس نے نہ صرف اہل سنت کے چاروں فقہی مذاہب کو ماننے سے انکار کر دیا، بلکہ وہ ابن حنبل تک کے سخت نظام کا ہم خیال نہ تھا۔ کیونکہ اس کی رائے میں یہ کافی حد تک سخت نہ تھا۔ اہل اندلس کی اس قدامت پسندی کے باوجود ان کے ہاں ابن رشد جیسے فلسفی کا پیدا ہونا، جو مسلمانوں کا سب سے بڑا فلسفی سمجھا جاتا تھا۔ واقعی عجیب ہے۔

ابن رشد (۵۳۰ھ - ۵۹۵ھ) علوم فلسفہ میں بہرہ وافر رکھنے کے ساتھ ساتھ قاضی اور طبیب بھی تھا۔ بقول مصنف کے اس کا دعویٰ یہ ہے کہ فلسفہ مذہباً جائز و مستحسن ہے۔ کیونکہ قرآن مجید میں انسانوں کو حقیقت کی جستجو کا حکم دیا گیا ہے۔ جہلا جو آزادی فکر سے ڈرتے ہیں، تو یہ ان کا محض تعصب ہے، جن لوگوں کا علم ناقص ہے انہیں فلسفے کے حقائق مذہب کے مخالف معلوم ہوتے ہیں۔ مصنف کے نزدیک ابن رشد عوام کے عقائد کو تسلیم نہیں کرتا، مگر وہ انہیں مبنی بر حکمت سمجھتا ہے۔ کیونکہ یہ عقائد لوگوں کو اخلاق سکھاتے اور ان میں تقویٰ اور نیکی پیدا کرتے ہیں۔ ارسطو کو وہ انسانوں کے لئے خدا کا سب سے بڑا الہام مانتا ہے اور اسے مذہب سے متفق سمجھتا ہے عوام کو مذہب کا جو علم ہوتا ہے، اس میں صرف جزوی طور پر حقیقت پائی جاتی ہے۔ لیکن یہ مذہب اکثریت کی عملی اغراض پورا کرتا ہے۔ مذہب میں جو عمیق تر حقائق ہیں ان کا عوام پر ظاہر کرنا مصلحت کے خلاف ہے۔

مختصراً یہ ہے کتاب کے جملہ مطالب کا ایک اجمالی خلاصہ۔ کتاب کا مصنف ایک انگریز ہے اور یورپ کے عام مستشرقین کی طرح اس نے بھی دین اسلام، اسلام کی مشہور شخصیات اور تاریخ اسلام کے احوال و واقعات اور اس کی مختلف سیاسی، فکری و مذہبی تحریکوں کے بارے میں اسی قسم کے جانبدارانہ اور مخالفانہ آراء کا اظہار کیا ہے، جو ایک عرصہ دراز سے ان کا معمول رہا ہے، لیکن اس سے قطع نظر مصنف نے اس کتاب میں اپنے پیش نظر موضوع پر بہت کافی، نہایت مفید اور پر از معلومات مواد جمع کر دیا ہے۔

اس کے بعد سوال آتا ہے۔ کتاب کے اردو ترجمے کا۔ بڑے افسوس سے یہ لکھنا پڑتا ہے کہ ترجمہ حد سے زیادہ ناقص ہے۔ زبان و اسلوب بیان اور جملوں کی ترتیب و ترکیب کے لحاظ سے بھی اور کتاب کے اصل مطالب کو

صحیح اور واضح طرح ادا نہ کر سکنے کے اعتبار سے بھی۔ چونکہ اصل کتاب سامنے نہیں اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ترجمہ کس حد تک اصل مطابق ہے۔ لیکن اردو ترجمہ پڑھ کر مصنف کا مقصود و مفہوم پانا کافی دقت طلب ہے۔

باقی مترجم نے اشخاص، مقامات اور اسماء میں جو غلطیاں کی ہیں وہ بھی کافی زیادہ ہیں۔ معلوم ہوتا ہے ترجمہ بہت زیادہ رواردی میں کیا گیا تھا۔ اور نہ ناشر نے بھی اس کی ضرورت نہیں سمجھی کہ وہ ترجمے کی نظر ثانی کرا لیتے۔

ترجمے میں زبان واسلوب بیان کی خامیاں کتاب کی پہلی سطر سے شروع ہوتی ہیں اور آخر تک چلی جاتی ہیں اس لئے ان کی نشان دہی کرنا ناممکن ہے۔ البتہ ناموں کے لکھنے میں جو غلطیاں کی گئی ہیں، ان میں سے چند ایک یہاں پیش کی جاتی ہیں۔

(صفحہ ۳۱ – "ایک اور مدرسہ نس بس یا جدید نبیین"۔ صفحہ ۳۶ – کچھ عرصہ پہلے نس بس کا مدرسہ (اگلی سطر میں) شہر نس بس – صحیح نام "نصیبین" ہے جو شمالی عراق میں تھا

صفحہ ۵۸ – حمیری عربوں کے ایک قبیلے نے جس کا نام قدا تھا۔ صحیح نام قضاعہ ہے (دیکھئے ارض القرآن جلد دوم ص۸۱) اسی صفحے پر اس قبیلے کی جگہ صالح نے لے لی۔ صحیح سلیح ہے۔ (دیکھئے ارض القرآن جلد دوم ص۸۱۔

صفحہ ۷۹ – معبدالیوحنی۔ صحیح معبد الجہنی ہے۔

صفحہ ۸۷ – عبدو بن صبا۔ اسی صفحے پر ابن صبا – صحیح عبداللہ بن سباء ہے۔

اسلوب بیان ملاحظہ ہو – اسلام میں راسخ العقیدہ مدرسیت یا علم کلام کی تحریک ایسے نشو ونما کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے جو چوتھی اور پانچویں صدی ہجری ... میں پھیلا ہوا ہے۔ اور اس کے تین طبقے ہیں۔ یعنی اشعری، باقلانی اور غزالی۔ اس قسم کا نشو ونما در اصل اسلام کی داخلی تاریخ اور اسلامی الہیات کے ارتقاء سے متعلق ہے۔

صفحہ ۶۰ میں ہے۔ داخلی اعتبار سے دونوں کی معاشری بافت

صفحہ ۶۲ – عرب دل سے ارتیابی اور مادیتی ہے۔

صفحہ ۸۷ ۔ خود کو متنفر ضرور محسوس کرتے تھے ۔

اصل کتاب ظاہر ہے اچھی خاصی ہے اور اس میں کافی کام کی باتیں بھی ہیں ۔ لیکن اس ترجمے نے اسے اس قابل نہیں رہنے دیا کہ اس کا ایک سنجیدہ علمی کتاب کی حیثیت سے مطالعہ کیا جاسکے ۔

کتاب مجلد ہے ۔ بڑے صفحے کے ۲۴۸ صفحے اور قیمت ۷۵ ۔ ۶ روپے

ملنے کا پتہ :۔ نفیس اکیڈمی ، بلاسس اسٹریٹ ، کراچی ۱

مخزن الولایت (اردو ترجمہ)

ملفوظات حضرت شاہ خادم صفی محمدی صفی پوری المتوفی ۱۲۸۷ھ

یہ ملفوظات جناب منشی محمد ولایت علی عزیز صفی پوریؒ نے مرتب فرمائے اور ان کا ترجمہ محمد خصلت حسین صابری ڈپٹی انسپکٹر مدارس پنشنر نے کیا پاک اکیڈمی ۱۳۱/۱ وحید آباد ، گولی مار کراچی ۱۸ نے انہیں شائع کیا ہے ، کتاب مجلد ہے ۔ صفحات ۲۰۸ ۔ اور قیمت تین روپے ۔

حضرت نظام الدین اولیاء کے خلیفہ حضرت چراغ دہلی متوفی ۷۵۷ھ کے ایک مرید مخدوم شیخ قوام الدین دہلی سے لکھنؤ (اودھ) تشریف لائے ۔ اور اس طرح ان دیار میں نظامیہ چشتیہ سلسلہ کی داغ بیل پڑی ۔ ان کے برادر عزیز شیخ قطب الدین بھی دہلی سے لکھنؤ آئے ، آخر الذکر کے صُلب سے ایک لڑکا پیدا ہوا جس سے یہ سلسلہ آگے چلا ، اور اس سے بڑے بڑے نامور صوفیاء منسلک ہوئے ان میں مخدوم شاہ صفی المتوفی ۹۴۵ھ بڑے مشہور تھے ۔ حضرت خادم صفی کے آباؤ اجداد مخدوم شاہ صفی کی درگاہ میں خدمت گزار تھے ۔ آپ ۱۳۲۵ھ کو پیدا ہوئے ۔ ساری عمر ریاضتوں میں گزری اور بڑی سختی سے شریعت کے پابند رہے آپ کا انتقال ۱۲۸۷ھ میں ہوا اصل ملفوظات فارسی میں تھے ۔ اور زیر نظر کتاب اردو ترجمہ ہے ۔

حضرت خادم صفی کے ان ملفوظات کے مُرتب حضرت عزیز صفی پوری بڑے متبحر عالم اور باکمال شاعر تھے ! وہ انہیں مرزا غالب سے تلمذ تھا ۔ آپ کی کوئی چالیس بیالیس تصانیف ہیں ۔

کتاب کے شروع میں صاحب ملفوظات کے مختصر سوانح حیات ہیں ۔ اس کے بعد آپ کے ارشادات ہیں حضرت شاہ خادم صفی محمدی باوجود شریعت کی سختی سے پابندی کرنے کے صلح کل بزرگ تھے ۔ ان کا ایک ارشاد

ملاحظہ ہو۔

"جو پیرو شریعت ہو اور طریق سنت و جماعت پر کاربند ہو۔ تعصب نہ رکھتا ہو، اور سلسلہ اس کا صحیح اور درست ہو، تو طالب کو ایسے شخص سے بیعت کر لینے میں پس و پیش نہ کرنا چاہیئے۔" اسی ضمن میں فرماتے ہیں:۔

"بعض باتیں فقہاء اور مشائخ کے مابین متنازع فیہ ہیں؛ مثلاً وحدت وجود اور سماع۔ ظاہر میں یہ مختلف فیہ ہوں، مگر باطن میں ان میں اختلاف نہیں۔ دوم یہ کہ تعصب کرنا درویشی کے خلاف ہے۔ چنانچہ اس بارے میں آپ نے عین اللہ شاہ صاحب سے فرمایا تھا۔

نہ شیعہ ام کہ کنم طعن سُنّی بر حق — نہ سُنّیم کہ کنم طعن رافضی مطلق
کدام بر سر باطل کدام بر سر حق — غلام حضرت عشقم دگر نمی دانم

شریعت کی پابندی کے ذیل میں ان کا ارشاد ہے۔

"ایک شخص آسمان پر اڑتا ہو اور دقائق شرع میں سے ایک دقیقہ بھی مہمل گزار رہے، تو وہ قابل اعتبار نہیں۔ اس کی کشف و کرامت پر فریفتہ نہیں ہونا چاہیئے۔ کیونکہ ایسی مثالیں ریاضت کی وجہ سے جوگیوں اور سنیاسیوں سے بھی ظہور میں آتی ہیں"۔

آپ کا ایک اور ارشاد ہے:۔ مظاہر مختلف ہیں۔ حقیقت حال ایک ہے جیسا مولوی معنوی قدس سرہ نے فرمایا۔

در نظر بہ ظرف داری گمرہی — گر بمظروفش نظر داری شہی

آپ کا ایک اور ارشاد ہے:۔ فقیر کو باوجود اختلاف مذہب کسی سے کج خلقی سے پیش نہ آنا چاہیئے کیونکہ رسول اللہ علیہ وآلہ وسلم کافروں کے لئے اپنی چادر مبارک بچھا دیتے تھے۔ پھر کلمہ گو کے ساتھ ترش روئی سے پیش آنا کب روا ہے۔ اور ہر کام کا انجام اس کے خاتمے پر ہے۔ اور حقیقت اس کی معلوم نہیں۔ اور یہ الفاظ آپ نے شیعہ و سُنّی کے تفرقے کے سلسلے میں فرمائے تھے۔

حضرت خادم صفی نے قرآن مجید شیخ چراغ علیؒ سے پڑھا تھا، جنہوں نے شاہ عبدالعزیز صاحب سے پڑھا تھا۔

صاحبِ ملفوظات کا انتقال آج سے تقریباً ایک سو سال پہلے ہوا تھا مرتب نے موصوف کے جو "ارشادات، احوال، افعال و اعمال" اس کتاب میں جمع کئے ہیں، ان سے کچھ اندازہ ہوتا ہے کہ اُن دنوں مسلمان عوام و خواص کی زندگیوں پر تصوف اور صوفیاء کا کتنا اثر تھا۔ ان کے ہاں کسی پیر سے بیعت ہونا اور اس کی اطاعت و فرمانبرداری کرنا کتنا ضروری تھا اور پیری اور خلافت کا سلسلہ کس قدر وسیع تھا۔ بلکہ سچ پوچھئے تو اُس زمانے میں پیری مریدی اور "خلافت" مسلمانوں کی مذہبی روحانی اور اجتماعی زندگی کی ایک اساس تھی۔ اور اس افراتفری کے دور میں یہ چیز ان کے معاشرے میں باہمی ربط کا ذریعہ بھی تھی۔ اور اس سے ان کو سکون اور طمانیت بھی ملتا تھا۔ لیکن ظاہر ہے اب وہ حالات نہیں رہے۔ اور تصوف کی یہ اثر آفرینی وہمہ گیری کم ہوتی جارہی ہے سوال یہ ہے کہ اِس وقت ہم مسلمانوں کے معاشرے میں جو اختلال اور خلفشار رونما ہے اور روز بروز بڑھ رہا ہے۔ کیا اس قسم کی پیری مریدی اس کا علاج ہوسکتی ہے۔ ہمارے خیال میں یہ مسئلہ کافی محل نزاع ہے۔

مثال کے طور سے صاحب ملفوظات کا یہ ارشاد ملاحظہ ہو۔ "ایک پیر نے اپنے ایک مرید کو حکم دیا کہ نماز چھوڑ دے۔ وہ چلا گیا اور صرف نماز سنت ترک کی۔ اس نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ فرما رہے ہیں کہ تو نے میری سنت کو کیوں چھوڑا۔ وہ اپنے پیر کی خدمت میں آیا اور ماجرا سنایا۔ پیر نے جواب دیا کہ اگر فرض نماز بھی چھوڑ دیتا تو خدا کا دیدار ہوتا۔ مقصد اس سے یہ ہے کہ مرید کو پیر کے حکم سے چارۂ کار نہیں۔"

اگرچہ اس طرح کے تصوف اور ایسی پیری مریدی کا اب دور نہیں رہا۔ لیکن اس زمانے میں مخزن الولایت جیسی کتابوں کی اشاعت بے مصرف نہیں، کیونکہ ان سے ہم ان پاک نفوس بزرگوں کے احوال سے واقف ہوتے ہیں۔ جن کے دم سے مسلمانوں کے ہاں رواداری، وسیع المشربی۔ محبت و رافت جیسی انسانیت عامہ کی اعلیٰ قدریں فروغ پاتی تھیں۔ اور انہیں کی آج ہمیں سب سے زیادہ ضرورت ہے۔

افکار و آراء

جناب مدیر صاحب الرحیم

الرحیم کا پہلا شمارہ جون کا تھا۔ اور آخری شمارہ جو مجھے ملا ہے، وہ دسمبر کا ہے گویا اب تک الرحیم کے سات شمارے نکل چکے ہیں۔ میں نے سرسری نہیں، بلکہ بڑے غور اور استیعاب سے یہ سارے پرچے پڑھے ہیں الرحیم میں یہ خوبیاں ہیں، یا وہ خوبیاں ہیں۔ یہ لکھنے سے تو میں رہا۔ ان ساتوں پرچوں کے مطالعہ کے بعد میں نے جو مجموعی تاثر لیا ہے، وہ میں مختصراً بیان کرنا چاہتا ہوں۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کو میں نے زیادہ نہیں پڑھا، اردو زبان میں ان پر فرداً فرداً جو لکھا گیا ہے وہ البتہ نظر سے گزرا ہے۔ اور اتفاق سے اس میں شاہ صاحب کو کچھ اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ اسے پڑھ کر شاہ صاحب کی کوئی واضح و معین تصویر سامنے نہیں آتی۔ چنانچہ اس لکھے پر یہ مصرعہ صادق آتا ہے۔

شد پریشاں خوابِ من از کثرتِ تعبیرہا

کہیں تو انہیں سلف صالح کی پیروی پر زور دینے والا مصلح ثابت کیا گیا ہے، گویا ایک امام ابن تیمیہؒ عربی دنیا میں ہوئے اور دوسرے یہ امام تیمیہ تھے جو اس برصغیر میں مبعوث کئے گئے۔ بعض کا اصرار ہے کہ وہ مقلد تھے اور پکے مقلد اور اپنے فقہی مسلک میں وہ حنفیت سے باہر نہیں جاتے تھے۔ مولانا عبیداللہ سندھی نے ان کا اور ان کی حکمت کا جس طرح تعارف کرایا ہے وہ ظاہر و باہر ہے جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں، مولانا سندھی کے نزدیک شاہ صاحب نے دین اسلام کی جو تعبیر فرمائی ہے وہ مرادف ہے انسانیت عامہ کے اپنی پوری

ہمہ گیریت اور وسعت کے ساتھ۔ اور اسلام کے جو احکام اور شعائر ہیں وہ ایک مخصوص زمان و مکان میں اس انسانیت عامہ کی ایک عملی شکل ہیں۔ مولانا سندھی کے الفاظ میں شاہ صاحب کے نزدیک قرآنی مقاصد کا لب لباب وہ حکمت ہے، جو انسانیت کی طرح عالمگیر ہے اور اگرچہ مختلف ادوار میں وہ مختلف شکلوں میں ظاہر ہوئی لیکن

دم بدم گر شود لباس بدل مرد صاحب لباس را چہ خلل

اس کے برعکس اس دور کے ایک بہت عالم اور محقق مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے شاہ صاحب کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے۔

"حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی تعبیرات ایسی نازک ہیں کہ کفر و اسلام کے درمیان پل صراط کا فرق رہ جاتا ہے۔"

اسی ضمن میں مرحوم یہ بھی فرماتے ہیں:۔ شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ مردِ فقہ و حدیث و کلام اسرار و رموزِ شریعت ہیں۔ تصوف کی کتابوں میں ان کا پیام ان کے دوسرے علوم کے مطابق نہیں ہے اس لئے ان سے نہ گھبرایئے اور نہ ان کی صوفیانہ کتابوں کی طرف توجہ کیجئے۔"

مختصراً یہ ہے تصویر شاہ صاحب کی جواب تک پیش کی گئی ہے، مجھے توقع تھی کہ شاہ ولی اللہ اکیڈمی کا جرنل الرحیم اس معاملے میں کچھ زیادہ واضح ہوگا۔ اور اس کی مندرجہ تحریروں سے شاہ صاحب کی کوئی معین تصویر Emerge ہو سکے گی۔ ضرورت ہے کہ شاہ صاحب کے فکر کے بنیادی مفہومات کا تعین ہو۔ اور ان کی اساس پر شاہ صاحب کی علمی شخصیت اور ان کی حکمت کا ایک واضح خاکہ ترتیب دینے کی کوشش کی جائے تاکہ وہ شمع ہدایت بنے موجودہ اور آئندہ نسلوں کے لئے اور معاملہ محض مضمون نگاری اور کتاب سازی تک محدود ہو کر نہ رہ جائے۔ مثال کے طور سے شاہ صاحب کا کائنات کے بارے میں کیا تصور ہے ان کے نزدیک دین کی عمومی حیثیت کیا ہے اور مذاہب عالم میں اسلام کا کیا مقام ہے وغیرہ وغیرہ۔

مانا صاف صاف بات کہنا مشکل ہے، لیکن زمین تو ہموار کی جاسکتی ہے۔ لیکن

اے بسا آرزو کہ خواب شدہ است

عبدالقادر۔ عزیز آباد۔ کراچی

محمد سرور پرنٹر پبلشر نے سعید آرٹ پریس سے چھپوا کر شائع کیا

مطبوعات شاہ ولی اللہ اکیڈمی

★

لمحات (عربی)

شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے فلسفہ تصوف کی یہ بنیادی کتاب عرصے سے نایاب تھی۔ مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی کو اس کا ایک پرانا قلمی نسخہ، جو اغلاط سے پر تھا، ملا۔ موصوف نے بڑی محنت سے اس کی تصحیح کی، اور شاہ صاحب کی دوسری کتابوں کی عبارات سے اس کا مقابلہ کیا۔ اور وضاحت طلب امور پر تشریحی حواشی لکھے۔ کتاب کے شروع میں مولانا کا ایک مبسوط مقدمہ ہے۔

شاہ صاحب نے اس کتاب میں "وجود" اور اس سے کائنات کا جس طرح صدور ہوا ہے، اس پر بحث کی ہے، اور اپنی الہیاتی حکمت کے دوسرے مسائل بھی بیان کئے ہیں۔ قیمت دو روپے

——:o:——

شاہ ولی اللہ کی تعلیم

از پروفیسر غلام حسین جلبانی سندھ یونیورسٹی

پروفیسر جلبانی ایم اے صدر شعبہ عربی سندھ یونیورسٹی کے برسوں کے مطالعہ و تحقیق کا حاصل یہ کتاب ہے اس میں مصنف نے حضرت شاہ ولی اللہ کی پوری تعلیم کا احصاء کیا ہے اس کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل بحثیں کی ہیں۔ اردو میں شاہ صاحب کی تعلیم پر یہ پہلی جامع کتاب ہے۔

کتاب مجلد ہے۔ قیمت ۷/۵۰ روپے ہے

شاہ ولی اللہ اکیڈمی - صدر - حیدرآباد۔ پاکستان

Monthly "AR-RAHIM" Hyderabad Regd. S. No. 2548

شاہ ولی اللہ اکیڈمی

اغراض و مقاصد

۱۔ شاہ ولی اللہ کی تصنیفات اُن کی اصلی زبانوں میں اور اُن کے تراجم مختلف زبانوں میں شائع کرنا۔

۲۔ شاہ ولی اللہ کی تعلیمات اور ان کے فلسفہ و حکمت کے مختلف پہلوؤں پر عام فہم کتابیں لکھوانا اور اُن کی طباعت و اشاعت کا انتظام کرنا۔

۳۔ اسلامی علوم اور بالخصوص وہ اسلامی علوم جن کا شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتبِ فکر سے تعلق ہے، اُن پر جو کتابیں دستیاب ہو سکتی ہیں، اُنہیں جمع کرنا، تاکہ شاہ صاحب اور اُن کی فکری و اجتماعی تحریک پر کام کرنے کے لئے اکیڈمی ایک علمی مرکز بن سکے۔

۴۔ تحریک ولی اللہی سے منسلک مشہور اصحابِ علم کی تصنیفات شائع کرنا، اور اُن پر دوسرے اہلِ قلم سے کتابیں لکھوانا اور اُن کی اشاعت کا انتظام کرنا۔

۵۔ شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتبِ فکر کی تصنیفات پر تحقیقی کام کرنے کے لئے علمی مرکز قائم کرنا۔

۶۔ حکمتِ ولی اللہی اور اُس کے اصول و مقاصد کی نشر و اشاعت کے لئے مختلف زبانوں میں رسائل کا اجراء۔

۷۔ شاہ ولی اللہ کے فلسفہ و حکمت کی نشر و اشاعت اور اُن کے سامنے جو مقاصد تھے اُنہیں فروغ دینے کی غرض سے ایسے موضوعات پر جن سے شاہ ولی اللہ کا خصوصی تعلق ہے، دوسرے مصنفوں کی کتابیں شائع کرنا

محمد سرور پرنٹر پبلشر نے سعید آرٹ پریس حیدرآباد سے چھپوا کر شائع کیا۔

شاہ ولی اللہ اکیڈمی کا علمی مجلہ
الرحیم
ماہنامہ
شعبہ نشر و اشاعت شاہ ولی اللہ اکیڈمی ۔ صدر حیدرآباد
رمضان المبارک ۱۳۸۳ھ فروری ۱۹۶۴ء

قیمت سالیانہ:- آٹھ روپے   فی پرچہ:- پچھتر پیسے

الرحیم

حیدرآباد

جلد ۱ رمضان المبارک ۱۳۸۳ھ مطابق فروری ۱۹۶۴ء نمبر ۹

فہرستِ مضامین

ہندوستانی حضرات

اس پتے پر "الرحیم" کا چندہ جمع کرا سکتے ہیں:-

مولوی جمال دین مونس صاحب۔ نظامی پریس۔ بدایون، یوپی انڈیا

شذرات

آج کل مسلمان ملکوں کو، جو ابھی ابھی صدیوں کی سیاسی غلامی، معاشی بدحالی اور سماجی جمود سے نکلے ہیں، داخلی اور خارجی دونوں محاذوں پر بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اور ان کے سیاسی، معاشی اور سماجی مسائل روز بروز پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہو رہے ہیں۔ مسلمان ملکوں کی حکومتوں کو بہر حال ان مشکلات اور مسائل سے عہدہ برآ ہونا پڑتا ہے اور وہ مجبور ہیں کہ اس ضمن میں اپنی پالیسیاں بنائیں اور اپنے عوام سے ان پر عمل کرائیں۔ دنیائے اسلام بالکل ایک نئے دور میں داخل ہو رہی ہے۔ اسے اس وقت نئے حالات درپیش ہیں، جن کی مثال تاریخ اسلام میں شاید ہی ملے۔ نئے حالات نئی تبدیلیوں کے متقاضی ہوا کرتے ہیں اور اگر قومیں یہ تبدیلیاں شعوری طور پر خود نہ لائیں تو یہ تبدیلیاں خود آ کر رہتی ہیں، اور قومیں مجبور ہوتی ہیں کہ انہیں قبول کریں۔

اب سوال یہ ہے کہ نئے حالات کے تحت ہمیں اپنی سیاسی، معاشی اور سماجی زندگی میں جو تبدیلیاں کرنا ہوں گی، اور جن کا کیا جانا ایک ناگزیر امر ہے، اس بارے میں ہماری مذہبی جماعتوں کا کیا موقف ہونا چاہیئے۔ ظاہر ہے اب وہ زمانہ نہیں رہا، جب مسلمان سلاطین کو امورِ مملکت میں معمولی سے معمولی تبدیلی کرنے کے لیے شیخ الاسلام کی طرف رجوع کرنا پڑتا تھا اور اس سے رضامندی حاصل کیے بغیر ہر تبدیلی تخت و تاج کے لیے خطرے کا باعث ہو سکتی تھی۔ آج مسلمان مملکتوں کی ہیئت سیاسی بالکل دوسری ہے اور ان کی قیادت و سیادت اور طرح کے طبقوں اور عناصر کے ہاتھ میں ہے۔ پھر نئے حالات نہ صرف بڑے دور رس، اثر آفریں اور ہمہ گیر ہیں بلکہ ان کی رفتار بے حد تیز ہے اور خاص طور سے ہمارے جیسے ملکوں میں جہاں صدیوں سے جمود نے وقت کو ساکن کر رکھا تھا،

یہ رفتار اور بھی زیادہ تیز ہے۔ ان حالات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے مسلمان ملکوں کی حکومتوں کو فوری فیصلے کرنا پڑتے ہیں اور عملاً ہر مسلمان ملک یہ کر رہا ہے۔ وہ اس پر مجبور ہے اور اس کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

آج کوئی بھی مسلمان ملک ایسا نہیں، جہاں بعض مسیحی یا غیر مسیحی ملکوں کی طرح مذہب کا ایک قومی و ملکی پالیسی کے طور پر انکار کیا جا رہا ہو، یہاں تک کہ اب ترکی میں بھی چالیس سال کے "سیکولرزم" کے باوجود عوام کا جھکاؤ مذہب کی طرف زیادہ ہے، لیکن اگر مذہبی طبقوں کی طرف سے ان سیاسی، معاشی اور سماجی تبدیلیوں کی مخالفت کی گئی، جنہیں بروئے کار لانا نئے حالات کا ضروری تقاضا ہے، تو پھر مسلمان ملکوں کی سیاسی قیادتوں اور مذہبی طبقوں میں تصادم ناگزیر ہو جائے گا، اور اس تصادم کا جو نتیجہ نکلے گا، اس کے متعلق دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ ہماری تاریخ کے ایک دور میں ہمارے مذہبی طبقوں کا ایک خاص "رول" رہا ہے۔ ان کے اس "رول" کی عظمت و افادیت سے ہمیں انکار نہیں، لیکن تاریخ کا وہ دور گزر گیا۔ اب وہ واپس نہیں آسکتا، اور نہ ہمارے مذہبی طبقے وہ "رول" دوبارہ ادا کر سکتے ہیں۔ اگر مذہبی طبقے سیاسی قیادتوں کے حریف بنے اور مذہب کے نام سے اور عوام سے مذہب کی اپیل کر کے انہوں نے مسندِ اقتدار کو حاصل کرنے کی کوشش کی تو مصر کے اخوان المسلمین کا سا معرکہ ہر مسلمان ملک میں ہوگا، لیکن اگر انہوں نے اپنے لیے ایک مرشد، امام، استاد، ریفارمر اور حق گو واعظ و مبلغ کا منصب پسند کیا، تو سیاسی قیادتیں بھی اُن کی بات سنیں گی اور قومی و عوامی زندگی پر بھی ان کا دیرپا اور دور رس اثر قائم رہے گا۔ ہمارے ہاں بھی جماعتِ اسلامی کے بزرگوں کو ان دو مناصب میں سے صرف ایک منصب اختیار کرنا ہوگا۔ یا تو وہ خالصتاً سیاسی اقتدار کے حریف بنیں اور بحیثیت ایک سیاسی جماعت کے سرگرمِ کار ہوں، یا ان کا منصب ایک مرشد، امام اور استاد کا ہو اور وہ سیاسی اقتدار کے لیے مذہب کی سٹیج کو استعمال کرنا چھوڑ دیں۔ خدانخواستہ اگر مذہب و سیاست کے متعلق ان بزرگوں کا یہی موقف رہا، جو اب تک تھا، تو اس سے اسلامیت کو بھی گزند پہنچے گا، اور ملک کی سیاست بھی صحیح راہوں پر نہ چل سکے گی۔

نرم مذہبی جماعتیں جو مذہب کے نام سے اور مذہب کی سٹیج سے سیاسی اقتدار حاصل کرنے کی جدوجہد کرتی

ہیں، اُن کا مصر میں جو انجام ہؤا وہ سب کے سامنے ہے۔ انڈونیشیا میں بھی کم و بیش یہی قصّہ دُہرایا جا چکا ہے۔ ایران میں پچھلے دنوں جو کچھ ہؤا، اس کی تفصیلات اخبارات میں آ چکی ہیں۔ ہر مسلمان ملک میں جہاں اس طرح کا تصادم ہوگا اس کا یہی نتیجہ نکلے گا۔ ہمیں اس سے سبق لینا چاہیئے اور روزمرہ کی عملی سیاست اور مذہب کو اس طرح گڈمڈ نہیں کرنا چاہیئے کہ دونوں میں تصادم ہو اور افراط و تفریط کی راہیں کھُلیں۔

سیاسی قیادتیں خواہ وہ کتنی بھی بلند و فائق کیوں نہ ہوں، تنقید، نصیحت اور تنبیہہ سے بے نیاز نہیں ہو سکتیں۔ ہمارے علمائے کرام دینی حدود میں رہ کر یہ فرائض بوجہ احسن سرانجام دے سکتے ہیں۔ اور تاریخ میں اس قسم کی مثالیں موجود ہیں، جب ایک جابر سے جابر سلطان کے سامنے ایک عالم کلمۂ حق کہتے ذرا نہیں ڈرتا تھا اور سلطان بھی اسے سنتا تھا۔ آج منبر کی خود اپنی ایک عظمت ہے، اسے کرسیٔ اقتدار کا زینہ نہ بنایئے۔ اس سے تصادم ہوگا، خلفشار بڑھے گا اور ملک و قوم کو نقصان پہنچے گا۔

کونسا سنگ دل سے سنگ دل مسلمان ایسا ہوگا، جو مغربی بنگال میں مسلمانوں کے خون کی ارزانی کی خبریں پڑھ کر نہ رویا ہو۔ ہندوستان کو آزاد ہوئے سولہ سال ہو گئے، لیکن کس قدر افسوس کی بات ہے کہ اب بھی آئے دن وہاں مسلمانوں پر یلغاریں ہوتی ہیں اور ان کو بے دریغ قتل کیا جاتا ہے۔ ہندوستان کے ہندو فرقہ پرستوں کی سفّاکی اور خون خواری کی زبان پر گویا اب بھی ہل من مزید ہے۔ اور اس سرزمین کے کسی حصے کا مسلمان بھی اپنے آپ کو اس سے محفوظ نہیں پاتا۔ معلوم نہیں اس مسلم دشمنی کی کوئی انتہا بھی ہے یا نہیں۔ اور ہمارے ہمسائے ملک میں ہمارے بھائیوں کا خُون کب تک یوں بہے گا۔

مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے ادارۂ علوم اسلامیہ کے ایک ریسرچ اسسٹنٹ صاحب علی گڑھ سے لکھتے ہیں کہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے مکتبِ خیال کے مشہور اصحاب میں سے سب سے کم کام حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب پر ہؤا ہے۔ چنانچہ وہ انہی پر تحقیقی کام کر رہے ہیں۔ موصوف نے لکھا ہے کہ وہ اس سلسلے میں حضرت شاہ عبدالعزیز کے دور کے جملہ حالات و کوائف جمع کر رہے ہیں۔ اور اس تاریخی پس منظر میں وہ حضرت شاہ صاحب کی تعلیمات و تصنیفات کا جائزہ لیں گے۔

واقعہ یہ ہے کہ ولی اللّٰہی تحریک کی عمومی و عوامی حیثیت کے بانی شاہ عبدالعزیز صاحب تھے، انہوں نے اپنے والد بزرگوار کے افکار و خیالات کو جس طرح عوام مسلمانوں تک پہنچایا، اس کو اب تک صحیح طرح سمجھا نہیں گیا۔ ضرورت ہے کہ کہ حضرت شاہ عبدالعزیز پر زیادہ تحقیقی کام ہو، اور ان کی طویل زندگی کی کوششوں کا پورا جائزہ لیا جائے۔

قرنِ اوّل کے مفسّرین

حافظ سیّد رشید احمد ارشد[1]

اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم کو نازل کر کے عالمِ انسانیت پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ قرآن حکیم کے نازل ہونے سے نہ صرف عالمِ انسانیت تباہی سے محفوظ ہوئی بلکہ زبردست اور مظلوم اقوام بھی ظالموں سے نجات حاصل کر کے ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہوئیں۔ لہٰذا ایسی محسن کتاب کی تشریح و توضیح کرنا اور اس پر عمل کرنے کے لیے انسانوں کو آمادہ کرنا پیغمبرِ انسانیت آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کا مقدس فریضہ رہا۔

قرآن کریم تبدریج نازل ہوا۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام بعض دفعہ چند آیات لے کر آتے تھے اور بعض اوقات کوئی مختصر سورت نازل ہوتی تھی۔ آغازِ وحی میں آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کو آیات کو وحی کے موقع پر یاد کرنے اور محفوظ کرنے کا بہت شوق تھا۔ اس لیے جب کوئی آیت نازل ہوتی تھی تو آپ جلدی سے اس آیت کو دوہرانے کی کوشش فرماتے تھے تاکہ وہ آیت یاد ہو جائے۔ آپ کو یہ اندیشہ ہوتا تھا کہ کہیں آپ اسے بھول نہ جائیں۔ ایسے موقع پر اللہ تعالیٰ نے سورت قیامت کی یہ چند آیات نازل فرمائیں۔

لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ
إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ ۝ فَإِذَا قَرَأْنَاهُ
فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ ۔ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ

(اے پیغمبر) آپ اپنی زبان کو اس لیے حرکت نہ دیں کہ جلدی سے اسے (قرآن کریم) سیکھ لیں۔ ہم پر اس کے (حافظہ میں) جمع کرنے اور پڑھنے کی

---

[1] حافظ سیّد رشید احمد ارشد ایم۔ اے لیکچرار شعبۂ عربی، جامعۂ کراچی۔

(پارہ ۲۹۔ سورۃ القیامہ) (ذمہ داری) ہے۔ جب ہم اسے پڑھوادیں تو تم اس کے پڑھنے کی پیروی کرو۔ پھر ہم پر اس کے بیان کرنے کی (ذمہ داری) ہے۔

ان آیات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو محفوظ رکھنے کی خود ذمہ داری لی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآنی آیات کی تشریح و تفسیر کے سلسلے میں جو کچھ ارشاد فرماتے تھے، وہ اللہ تعالیٰ کا بیان کردہ کلام ہوتا تھا۔ اس لیے ہمیں ان صحیح اور معتبر تفسیری احادیث کو تسلیم کر لینا چاہیئے جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے براہِ راست منقول ہیں۔

اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ قرآن مجید کے سب سے پہلے مفسر خود آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ احادیث سے یہ پتہ چلتا ہے کہ صحابۂ کرام کو جب قرآن کریم کے کسی لفظ یا عبارت کے بارے میں کوئی اشکال درپیش ہوتا تھا تو وہ اس اشکال کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کر کے حل کرتے تھے۔ خود آپ بھی جہاں ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ قرآن کریم کی وقتاً فوقتاً توضیح و تفسیر فرماتے رہتے تھے۔ اس قسم کی تفسیری روایات کو بخاری، ترمذی اور دیگر کتب احادیث و تفاسیر میں الگ باب میں جمع کر دیا گیا ہے۔

مفسر صحابۂ کرام

صحابۂ کرام میں مفسرین کی حیثیت سے مندرجہ ذیل حضرات زیادہ مشہور ہیں:۔
خلفائے اربعہ۔ حضرات عبداللہ بن مسعود۔ ابی بن کعب۔ زید بن ثابت اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم۔

مذکورہ بالا صحابۂ کرام کے علاوہ حضرات ابو موسیٰ اشعری۔ عبداللہ بن عمر۔ عبداللہ بن زبیر۔ جابر بن عبداللہ۔ ابوہریرہ۔ انس بن مالک رضی اللہ عنہم۔ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور بعض دیگر صحابہ سے بھی تفسیری روایات منقول ہیں۔ مگر ان کی تفسیری روایات کی تعداد بہت کم ہیں۔ وہ اس کو مستقل فن کی حیثیت سے نہیں بیان کرتے تھے۔ بلکہ محدث ہونے کی حیثیت سے دیگر احادیث کے ضمن میں اپنے شاگردوں سے تفسیری روایات بھی بیان کرتے تھے۔

خلفائے اربعہ میں سے حضرت ابوبکر، عمر، عثمان سے بھی تفسیری روایات امورِ خلافت کی مشغولیت کی وجہ سے بہت کم منقول ہیں۔ حضرت زید بن ثابت بھی جمعِ قرآن میں زیادہ مصروف رہے۔ تاہم وہ اپنے

شاگردِ رشید حضرت عبداللہ بن عباس کو تفسیری علوم میں اپنا جانشین بنا گئے اور یہی فخر ان کے لیے بہت کافی ہے۔

وہ صحابۂ کرام جن کے ذریعے مشہور اسلامی شہروں میں علمِ تفسیر کے تدریسی مراکز قائم ہوئے جو ساری عمر قرآن کریم کے الفاظ و آیات کی توضیح و تفسیر میں غور و فکر کرتے رہے اور اپنے ذاتی اجتہاد اور تفسیر ماثور کے ذریعے معارفِ قرآنی کو اپنے تلامذہ کے وسیع حلقے تک پہنچاتے رہے، مندرجہ ذیل ہیں:۔

۱۔ حضرت علی ابن ابی طالب ۲۔ حضرت ابی بن کعب

۳۔ حضرت عبداللہ بن مسعود ۴۔ حضرت عبداللہ بن عباس

یہ چاروں حضرات قرآن کریم کی تدریس و تفسیر میں پیش پیش رہے۔ ان میں سے حضرت علیؓ کا یہ حال تھا کہ وہ اپنے خطبوں میں بارہا فرمایا کرتے تھے:۔

"تمہیں کتاب اللہ کے بارے میں جو کچھ پوچھنا ہے، وہ مجھ سے میری زندگی ہی میں دریافت کرلو کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ کونسی آیت کہاں اور کب نازل ہوئی اور کس کے بارے میں اس کا نزول ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں دربارِ نبوی میں سوال کرنے کی زیادہ جرأت رکھتا تھا۔"[1]

چونکہ آپ نے تمام لوگوں کو تفسیر کے بارے میں سوالات کرنے کی اجازت دے رکھی تھی اور اس بنا پر اُس دور کے مسلمان آپ سے قرآن کریم کے مطالب معلوم کرتے رہتے تھے۔ اس وجہ سے آپ سے تفسیری روایات بکثرت منقول ہیں مگر ان کا بڑا حصّہ شیعی راویوں کی وجہ سے معتبر نہیں ہے۔ تاہم معتبر روایات کا خاصا تفسیری ذخیرہ آپ سے مروی ہے، جسے محدّثین کرام تسلیم کرتے ہیں۔ آپ کے تفسیری ذخیرہ سے مدینہ منورہ اور کوفہ کا علمی حلقہ مستفید ہوا۔ اور آپ کے علمی فیض سے ان دونوں مقامات میں بعض مشہور مفسّرین پیدا ہوئے جیسا کہ آگے چل کر بیان کیا جائے گا۔

حضرت ابی بن کعب انصاری نے رسول اکرم صلّی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی میں قرآن کریم کی تعلیم و تدریس

---

[1] مرآۃ التفسیر صہ ۶۔

میں شہرت حاصل کرلی تھی۔ اور آپ نے انہیں سب سے "بڑا قاریٔ قرآن" کا خطاب دیا تھا۔ وہ عہدِ رسالت میں کاتبِ وحی بھی تھے اور جب آں حضرت صلّی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا تو یہ حضرت ابی بن کعب ہی تھے جنہوں نے سب سے پہلے تفسیرِ قرآن مدوّن کی جسے طبری المتوفی ۳۱۰ھ نے اپنی مشہور تفسیر میں نقل کیا ہے۔ اسی کے بارے میں احمد طاش کبری زادہ المتوفی ۹۶۸ھ اپنی کتاب مفتاح السعادت میں یوں رقمطراز ہیں:-

"حضرت ابی بن کعب کی تفسیر کا نسخہ ضخیم ہے جس کو ابوجعفر رازی بواسطہ ربیع بن انس از ابوالعالیہ از ابی بن کعب روایت کرتے ہیں۔ یہ سند صحیح ہے۔ ابن جریر، ابن ابی حاتم اور اسی طرح حاکم اپنی مستدرک میں اور امام احمد بن حنبل اپنی مسند میں اسی (سند) سے روایت کرتے ہیں[1]۔"

حضرت عبداللہ بن مسعود فقیہ اور محدّث ہونے کے ساتھ ساتھ بہت بڑے مفسّر بھی تھے۔ آپ بہت پہلے اسلام لائے تھے اور آخر دم تک آں حضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں حاضر رہے۔ نزولِ قرآن کی تاریخ اور قرآن کے رموز سے آپ بہت اچھی طرح واقف تھے اور حضرت علی کی طرح شانِ نزول اور متعلقہ واقعات سے بھی پوری طرح باخبر تھے۔ آپ نے درسِ تفسیر کے سلسلے کو کوفہ میں جاری کیا اور آپ کی تدریس سے فیض یاب ہو کر کوفہ اور بصرہ کے نامور تابعی مفسرین پیدا ہوئے جن کا ذکر آگے چل کر بیان کیا جائے گا۔ آپ کی وفات ۳۳ھ میں ہوئی۔

حضرت عبداللہ بن عباس مذکورہ بالا صحابۂ کرام سے عمر میں چھوٹے تھے مگر ان سب حضرات اور خود آں حضرت صلّی اللہ علیہ وسلم سے علمی فیض حاصل کرکے بہت بڑے مفسر ہو گئے تھے۔ اپنی وسیع معلومات کی وجہ سے آپ حبر الأمۃ اور ترجمان القرآن کے لقب سے مشہور تھے۔ خود رسول اکرم صلّی اللہ علیہ وسلم نے آپ کے حق میں یہ دعا فرمائی تھی:-

اللّٰھم فَقّھہ فی الدین و عَلّمہ التاویل	اے اللہ! تو انہیں دین کی بصیرت اور قرآن کریم کی فہم عطا فرما۔

---

[1] مفتاح السعادۃ از احمد طاش کبری زادہ ج ۱ ص ۴۰۴ مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن ۱۳۲۸ھ

آپ نے قرآن کریم کی تفسیر کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا۔ آپ نے قرآن فہمی کے لیے اشعارِ عرب کا مطالعہ کیا۔ چنانچہ حافظہ قوی ہونے کی وجہ سے ہزاروں اشعار آپ کو ازبر تھے۔ مکہ معظمہ — جہاں آپ اقامت پذیر تھے۔ علمِ تفسیر کی تعلیم و تدریس کا بہت بڑا مرکز بن گیا اور دور دراز مقامات سے لوگ حضرت ابنِ عباس سے استفادہ کرنے کے لیے مکہ معظمہ آیا کرتے تھے۔

آپ نے ایک تفسیر بھی لکھی تھی جس کا نسخہ تیرھویں صدی ہجری میں امام احمد بن حنبل کے زمانے تک موجود تھا۔ مفتاح السعادۃ میں مذکور ہے[1]۔

"امام احمد بن حنبل نے فرمایا: تفسیر کا ایک صحیفہ مصر میں پایا جاتا ہے جس کو علی بن طلحہ روایت کرتے ہیں۔ اگر کوئی اس کو حاصل کرنے کے لیے مصر کا سفر کرے تو یہ کوئی بڑا کام نہیں ہے۔" یہ وہ نسخہ ہے جس سے امام بخاری نے حضرت ابن عباس کے حوالے سے (باب التفسیر میں) روایات نقل کی ہیں۔ علی بن طلحہ اور حضرت ابنِ عباس کے درمیان صرف ایک واسطہ ہے اور وہ مجاہد یا سعید بن جبیر ہیں۔ حافظ ابنِ حجر کا بیان ہے کہ یہ واسطہ مشہور و معروف اور ثقہ ہے اس لیے روایت کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

مفسرِ قرآن حضرت عبداللہ بن عباس کی وجہ سے علمِ تفسیر میں مکہ معظمہ کو جو مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی تھی وہ آپ کے شاگردوں کی بدولت آپ کی وفات کے بعد بھی قائم رہی۔ اس مرکزی حیثیت کی مشہور محقق اور مفکرِ اسلام علامہ ابنِ تیمیہ اس طرح وضاحت فرماتے ہیں:—

"اہلِ مکہ سب سے زیادہ تفسیر کے عالم تھے کیونکہ وہاں حضرت ابن عباس کے رفقائے کار اور شاگرد موجود تھے۔ مثلاً حضرات مجاہد، عطاء بن ابی رباح، عکرمہ مولی ابن عباس، سعید بن جبیر اور طاؤس۔ کوفہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود کے رفقاء اور تلامذہ تھے۔"

مدینہ کے علمائے تفسیر میں حضرت زید بن اسلم جیسے عالم تھے جن سے ان کے فرزند عبدالرحمٰن بن زید اور امام مالک نے تفسیر کا علم حاصل کیا۔[2]

---

[1] مفتاح السعادۃ ج ۱ ص ۴۰۱ و تفسیر الدر المنثور از سیوطی ج ۶

[2] الاتقان از علامہ سیوطی ج ۲ ص ۲۲۳ و مقدمہ ابن تیمیہ فی اصول التفسیر ص ۱۵

علامہ ابن تیمیہ کی مذکورہ بالا عبارت سے یہ ثابت ہوا کہ علمِ تفسیر کا اہم مرکز مکہ معظمہ تھا۔ اس کے بعد کوفہ تھا جو حضرت عبداللہ بن مسعود کے تلامذہ کی بدولت قائم ہوا۔ آگے چل کر بصرہ میں بھی اس کی ایک شاخ قائم ہو گئی تھی، اس کے بعد مدینہ منورہ بھی تفسیر کا مرکز بنا جہاں حضرت زید بن اسلم کی بدولت امام مالک اور حضرت عبدالرحمن بن زید نے علمِ تفسیر کے تدریسی کام کو وسعت دی۔

اب ہم ان تابعی علمائے تفسیر کے حالات بیان کرتے ہیں جو مذکورہ بالا صحابۂ کرام سے فیض یافتہ تھے وہ نہ صرف اپنے اساتذہ کے علمی فیض کو آنے والی نسلوں کے دل و دماغ میں منتقل کرتے رہے، بلکہ اپنے ذاتی اجتہاد اور غور و فکر سے تفسیری سرمایہ میں اضافہ بھی کرتے رہے۔ تا آنکہ طبری جیسے مفسر تیسری صدی ہجری میں پیدا ہوئے جنھوں نے ان قدیم مفسروں کے تمام علوم کو سمیٹ کر انتی ضخیم جلدوں میں جمع کر دیا۔ اب انہی تابعی مفسروں کا مروی ذخیرہ تفسیر طبری اور دیگر کتب تفاسیر میں محفوظ ہے۔

تابعی مُفسّرین ان حضرات نے قرآن کریم کی تفسیر میں مندرجہ ذیل ماخذوں سے استفادہ کیا:-
(۱) کتاب اللہ (۲) سنتِ نبوی (۳) تفسیر صحابہ (۴) اہلِ کتاب کی معلومات۔
(۵) ذاتی اجتہاد۔

تابعین کرام نے اپنے ذاتی اجتہاد اور رائے سے بھی قرآن کریم کی تفسیر کی ہے وہ اپنے ذاتی اجتہاد سے اس وقت کام لیتے تھے جب کسی آیت کی تفسیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا کسی صحابی کی روایت میں نہ پائی جائے۔ چنانچہ تابعی علماء نے تفسیری سرمایہ میں قابلِ قدر اضافہ کیا۔ یہ حضرات ذاتی اجتہاد کرنے پر یوں بھی مجبور ہوتے تھے کہ جب فتوحات کا دائرہ وسیع ہوا تو عجمی نومسلموں کو قرآن کریم کی تفسیر کی ضرورت محسوس ہوئی۔ وہ اہلِ زبان نہیں تھے۔ اس لیے تابعی علمائے کرام اپنے شاگردوں کے وسیع حلقے کو مطمئن کرتے اور ان کی دقتوں کو رفع کرتے تھے۔

یہ تابعی علمائے تفسیر عہدِ صحابہ سے قریب تر تھے اس لیئے وہ عربی زبان اور قرآن کریم کے صحیح مفہوم سے واقف تھے۔ انہوں نے اس علم کو حاصل کرنے میں اپنی تمام عمریں صرف کر دی تھیں۔ نزولِ قرآن مجید کے عہدِ مبارک کے جملہ واقعات سے بھی باخبر تھے۔

یہ امر تعجب انگیز ہے کہ صحابی مفسرین سے فیض یافتہ تابعین کی اکثریت ان عجمی النسل غلاموں پر مشتمل تھی جو بعد میں آزاد ہوتے۔ انہی عجمی غلاموں میں سے ایسے جلیل القدر علماء وفضلاء پیدا ہوئے جن کا خلفاء اور امراء نے بھی احترام کیا۔ اس زمانے میں ہر اسلامی شہر میں قرآن وحدیث کے اساتذہ موجود تھے تاہم خصوصی طور پر جہاں علمِ تفسیر کا چرچا رہا وہ یہ چار مقامات تھے:-

(۱) مکہ معظمہ (۲) مدینہ منورہ (۳) کوفہ (۴) بصرہ

مکہ معظمہ مکہ معظمہ کے تفسیری مرکز کے بانی حضرت عبداللہ بن عباس تھے۔ آپ کے حلقۂ درس کی خصوصیت یہ تھی کہ آپ قرآن کریم کے مشکل الفاظ کی تشریح میں اشعارِ عرب کے حوالے دیا کرتے تھے۔ آپ کو کلامِ عرب پر عبور حاصل تھا۔ اسی لیے آپ کے شاگرد بھی عربی لغت وادب کے بہت ماہر ہوئے۔ آپ کے مخصوص شاگردوں کا علمِ تفسیر میں اعلیٰ درجہ ہے۔ ہم ان میں سے چند مشہور ترین تلامذہ کے مختصر حالات بیان کرتے ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ یہ سب کے سب آزاد کردہ غلام تھے۔

سعید بن جُبیر آپ کا مکمل نام ونسب یہ ہے:- ابوعبداللہ سعید بن جبیر بن ہشام الاسدی الوالبی۔ آپ حبشی خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور قبیلۂ اسد کے آزاد کردہ غلام تھے۔ آپ نے مشہور صحابۂ کرام سے حدیث وتفسیر کی تعلیم حاصل کی۔ آپ حضرات عبداللہ بن عباس اور عبداللہ بن مسعود کے خصوصی تلامذہ میں سے تھے۔ علمِ تفسیر میں ان دونوں حضرات کے علم کے وارث ہوئے۔ آپ حضرت عبداللہ بن عمر کے خصوصی شاگرد بھی تھے۔

علمِ حدیث، فقہ اور تفسیر کے علاوہ آپ قرآن کریم کی تمام مشہور قراءات کے ماہر تھے۔ اس کے علاوہ دیگر علوم وفنون کے جامع بھی تھے۔ آپ کی وسعتِ معلومات کی وجہ سے حضرت ابن عباس نے انہیں کوفہ کا مفتی اپنی زندگی میں بنادیا تھا۔ چنانچہ جب اہلِ کوفہ آپ کے پاس فتویٰ لینے کے لیے آتے تھے تو آپ فرمایا کرتے تھے "کیا تمہارے ہاں ام الدھماء کا فرزند سعید بن جبیر نہیں ہے"[1]

---

[1] وفیات الاعیان از ابن خلکان ج ۱ ص ۳۶۵

آپ مسائل طلاق اور فرائض کے بہت بڑے ماہر تھے۔ فرائض میں وہ علمائے مدینہ کے استاد تھے۔ حضرت سعید بن جبیر حضرت ابن عباس کی احادیث اور دیگر روایات کے کاتبِ خصوصی تھے۔ آپ نے خلیفہ اموی عبدالملک بن مروان کی درخواست پر ایک تفسیر لکھی تھی جو سب سے پہلی تفسیر ہے۔ یہ عبدالملک کے حکم سے خزانہ میں محفوظ کی گئی اور خیال کیا جاتا ہے کہ یہ تفسیر ۸۶ھ سے پہلے مدون ہوئی تھی۔ ابن ندیم نے کتاب الفہرست میں اسے تفسیر سعید بن جبیر کے نام سے موسوم کیا ہے۔[۱]

حافظ ذہبی المتوفی ۷۴۸ھ اپنی کتاب میزان الاعتدال میں لکھتے ہیں:۔

"خلیفہ عبدالملک بن مروان نے حضرت سعید بن جبیر کو لکھا اور درخواست کی کہ وہ قرآن مجید کی تفسیر لکھ کر بھیج دیں۔ چنانچہ آپ نے یہ تفسیر اسے لکھ کر بھیج دی تھی۔"[۲]

حافظ ابن حجر عسقلانی نے اپنی کتاب تہذیب التہذیب میں عطاء بن دینار الھذلی المصری کے حالات میں تحریر کیا ہے کہ وہ یہ تفسیر خلیفہ عبدالملک کے شاہی خزانہ سے حاصل کر کے اس سے روایت کرنے لگے تھے۔

سعید بن جبیر کے حالات میں مذکور ہے کہ آپ بلند پایہ مفسر ہونے کے باوجود اپنی رائے سے تفسیر کرنے سے گریز کرتے تھے اور تفسیر ماثور پر ہی اکتفا کرتے تھے۔ اس لیے خیال کیا جاتا ہے کہ آپ کی مذکورہ تفسیر، تفسیر نبوی اور اقوالِ صحابہ پر مشتمل ہوگی۔

جہاں تک آپ کے علم و فضل کا تعلق ہے۔ تمام علماء اس کے بارے میں رطب اللسان ہیں۔ اسماء الرجال کے تمام علماء آپ کو قابلِ اعتماد سمجھتے ہیں اور اس بارے میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں۔ بلکہ بعض علماء آپ کو حضرات مجاہد اور طاؤس پر مقدم سمجھتے تھے۔ چنانچہ حضرت قتادہ جیسے مفسر قرآن کی یہ رائے ہے کہ حضرت سعید بن جبیر تابعین میں سب سے بڑے عالم تھے۔

---

[۱] کتاب الفہرست ص ۵۱۔

[۲] میزان الاعتدال ج ۲ ص ۱۹۷۔ طبع قاہرہ ۱۳۲۵ھ

آپ کلمۃ الحق کہنے میں بہت بے باک تھے۔ آپ حجّاج بن یوسف جیسے ظالم حکمران سے کبھی نہیں ڈرے۔ حجاج بن یوسف بھی ان کی بے باکی اور کلمۃ الحق کہنے کے باوجود آپ کا بہت احترام کرتا رہا۔ اس نے آپ کو جامع کوفہ کا امام مقرر کر دیا تھا اور کچھ عرصہ تک کوفے کا قاضی بھی بنایا تھا مگر ان قدر دانیوں کے باوجود آپ حجاج کے مظالم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے رہے اور جب محمد بن عبد الرحمٰن الاشعث نے حجاج کے خلاف بغاوت کی تو آپ اس کے ساتھ ہو گئے تھے۔ پھر جب ابن الاشعث کو شکست ہوئی تو مکہ معظمہ میں آپ کو گرفتار کر کے حجاج بن یوسف کے پاس بھجوا دیا گیا۔ اس وقت حجاج کے ساتھ ان کا جو بے باکانہ مکالمہ اور مناظرہ ہوا، وہ تاریخ کے صفحات پر نمایاں طور پر مذکور رہے[1]۔ آخر کار حجاج نے آپ کو شہید کرا دیا آپ کی شہادت ۹۳ھ یا بقول بعض ۹۴ھ یا ۹۵ھ میں ہوئی۔ اس وقت آپ کی عمر انچاسی[49] سال تھی[2]۔

حضرت مجاہد بن جبیر

ابوالحجاج حضرت مجاہد بن جبیر قبیلۂ مخزوم کے ایک شخص سائب بن ابی السائب کے آزاد کردہ غلام تھے۔ آپ عہدِ فاروقی میں ۲۱ھ میں پیدا ہوئے۔ دیگر صحابۂ کرام کے علاوہ حضرت عبداللہ بن عباس سے بھی اکتسابِ علم کیا۔ اور آپ کے خصوصی تلمیذ ہونے کا شرف حاصل کیا۔

حضرت ابن ابی ملیکہ فرماتے ہیں "میں نے دیکھا کہ حضرت مجاہد کے پاس لکھنے کی تختیاں ہوتی تھیں اور آپ حضرت ابن عباس سے قرآن کریم کی تفسیر دریافت کرتے تھے۔ حضرت ابن عباس تفسیر بیان کرتے ہوتے یہ فرماتے تھے اسے لکھ لو" مجاہد اسی طرح تفسیر لکھتے رہے یہاں تک کہ انہوں نے قرآن مجید کی پوری تفسیر لکھ ڈالی۔"[3] غالباً یہی وہ تفسیر ہوگی جس سے امام بخاری نے باب التفسیر میں حضرت مجاہد کے تفسیری اقوال نقل کیے ہیں:۔

---

[1] مکالمہ کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو:۔ تابعین، مرتبہ شاہ معین الدین ندوی مطبوعہ اعظم گڑھ ص ۳ -۱۴۵- ۱۴۹

[2] تہذیب التہذیب از ابن حجر عسقلانی جلد ۴ صفحہ ۱۳-۱۴

[3] تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۴۳

آپ نے حضرت ابن عباس سے سبقاً سبقاً تفسیر قرآن کریم کا علم حاصل کیا تھا اور اسے قلم بند بھی کر لیا تھا اس لیے محقق علماء کی کثیر تعداد آپ کو تفسیر کا بہت بڑا عالم سمجھتی ہے۔ چنانچہ بخاری کے علاوہ صحاح ستہ کی دوسری کتابوں میں نیز امام شافعی نے بھی آپ کے تفسیری اقوال بکثرت نقل کیے ہیں۔

آپ کا حافظہ بھی بہت قوی تھا، جو بات سنتے تھے، حافظہ میں محفوظ ہو جاتی تھی اور حضرت ابن عباس کی طرح کسی چیز کو نہیں بھولتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمر کو بھی ان کے حافظے پر رشک ہوتا تھا اور وہ فرماتے تھے "کاش کہ نافع کا حافظہ بھی ان جیسا ہوتا۔"

حضرت سعید بن جبیر کے برخلاف حضرت مجاهد تفسیر بالرائے کے قائل تھے، جہاں انہیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کے تفسیری اقوال نہیں ملتے تھے۔ وہاں آپ خود غور و فکر کر کے اپنے ذاتی اجتہاد سے تفسیر بیان فرماتے تھے۔ آپ بعض قرآنی آیات کے مفہوم کو تمثیل و تشبیہ پر محمول کرتے تھے اور ان کی عقلی تفسیر فرماتے تھے۔

مثلاً قرآن کریم میں ایک مقام پر یہ مذکور ہے کہ سبت کے احکام کی نافرمانی کرنے کی وجہ سے یہودی اللہ کے حکم سے بندروں کی شکل میں مسخ کر دیے گئے تھے۔ حضرت مجاهد اس کی تفسیر میں یہ فرماتے ہیں کہ وہ حقیقی طور پر مسخ نہیں ہوئے تھے بلکہ ان کی ذلت و خواری کو تمثیل کے طور پر بیان فرمایا گیا ہے۔ اسی طرح ایک دوسری آیت میں آپ نے رویت باری تعالیٰ کے مفہوم کی تاویل کی ہے، جسے معتزلہ استدلال کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ حضرت مجاهد کی اسی طرح کی عقلی توجیہات کو بعض علماء نے پسند نہیں کیا ہے۔ تاہم زمانہ کی ضروریات کے مطابق آپ عقلی توجیہ و اجتہاد سے کام لیتے تھے۔

حضرت مجاهد پر یہ الزام بھی لگایا جاتا ہے کہ آپ اہلِ کتاب سے روایت کرتے تھے۔ مگر محقق علماء نے اس الزام کو بے بنیاد قرار دیا ہے کیونکہ حضرت مجاهد، حضرت ابنِ عباس کے شاگرد تھے جنہوں نے قرآن کریم اور احادیث نبوی کے مقابلے میں اہل کتاب کی تحریف شدہ روایات پر اعتماد کرنے کی ممانعت فرمائی ہے اس لیے یہ کیسے ممکن ہے کہ حضرت مجاهد اپنے استاد کی ہدایات کے خلاف اہلِ کتاب سے بلا تامل روایت کرتے ہوں۔ البتہ حضرت ابن عباس اور آپ کے شاگردوں نے، جن میں حضرت مجاهد بھی شامل ہیں

ایسے اہلِ کتاب معتبر صحابیوں اور مسلمان عالموں کی وہ روایات ضرور نقل کی ہیں، جو قرآن وسنت کے خلاف نہ تھیں اور اُن سے قرآن کریم کی آیات کی تفسیر میں مدد ملتی تھی۔ اور یہ چیز ظاہر ہے قابلِ اعتراض نہیں۔

تفسیر بالرائے کے مسلک کی وجہ سے بعض علماء جو اس مسلک کے حامی نہ تھے۔ آپ کی روایات سے گریز کرتے تھے۔ تاہم محقق علماء اور اسماء الرجال کے ناقد علماء نے آپ پر اعتماد کا اظہار کیا ہے چنانچہ حافظ ذہبی اور امام نووی نے آپ کو بہت بڑا عالم تسلیم کیا ہے[1] خصیف کا بیان ہے "مجاہد تفسیر کے سب سے بڑے عالم تھے[2]" حضرت قتادہ جیسے مفسرِ قرآن فرماتے ہیں "موجودہ بزرگوں میں مجاہد تفسیر کے سب سے بڑے عالم ہیں[3]۔ حضرت مجاہد قرأت، فقہ اور حدیث کے عالم بھی تھے۔ آپ مکۂ معظمہ کے مفتیوں کی جماعت کے معزز رکن تھے[4]۔ اس زمانے کے دیگر علماء کی طرح آپ دنیا سے بے تعلق تھے۔ اور خلوص کے ساتھ تعلیم وتدریس میں منہمک رہتے تھے۔ آپ کی ظاہری حالت نہایت سادہ ہوتی تھی، مگر جب آپ علمی گفتگو کرتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ موتی جھڑ رہے ہیں[5]۔ آپ کے خلوص، وسعتِ علم اور کریمانہ اخلاق کی وجہ سے آپ کی بڑی عزت تھی۔ صحابۂ کرام بھی آپ کی بڑی عزت کرتے تھے۔ بعض دفعہ حضرت عبداللہ بن عمر جیسے جلیل القدر صحابی آپ کی سواری کی رکاب تھام لیتے تھے[6]۔

آپ کے تلامذہ کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ آپ کے تلامذہ کی فہرست میں جلیل القدر محدثین اور علماء کرام کے اسماء گرامی نظر آتے ہیں ان میں سے مشہور ترین تلامذہ یہ ہیں: حضرات عطاء، عکرمہ۔ ایوب سختیانی، ابن عون، عمرو بن دینار، ابواسحاق سبیعی، قتادہ، ابوالزبیر مکّی، سلیمان الاعمش۔

آپ کی وفات کی تاریخ میں اختلاف ہے۔ بعض تاریخِ وفات ۱۰۰ھ لکھتے ہیں اور بعض کا خیال ہے کہ ۱۰۲ھ، ۱۰۳ھ میں بمقام مکۂ معظمہ سجدہ کی حالت میں آپ کا وصال ہوا۔ وفات کے وقت آپ کی عمر تراسی[83] سال تھی[7]۔

---

[1] تذکرۃ الحفاظ از ذہبی ج اول ص ۸۰ (۲) تہذیب الاسماء ج اول ق ۲ ص ۸۳ [3] تذکرۃ الحفاظ ج اول ص ۸۰ [4] اعلام الموقعین ج اول ص 26 [5] و [6] تذکرۃ الحفاظ ج اول ص ۸۰

[7] طبقات ابن سعد ج ۵ ص ۳۴۴

حضرت عکرمہ

حضرت عکرمہ کا خاندان افریقہ کے بربری قبائل سے تعلق رکھتا تھا۔ اسلامی فتوحات میں یہ غلام بنا لیے گئے۔ اور آپ حصین بن الحر العنبری کی غلامی میں آئے جو آپ کا پہلا آقا تھا۔ اس کے بعد حضرت عکرمہ کو حضرت عبداللہ بن عباس کی غلامی کا شرف حاصل ہوا۔ انھوں نے آپ کی تعلیم و تربیت کا خاص اہتمام کیا۔ ان کی نظرِ عنایت آپ پر اس قدر تھی کہ وہ ہر وقت آپ کو اپنے ساتھ رکھتے تھے اور آپ کو قرآن کریم کی تعلیم سے مستفیض کیا کرتے تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب حضرت عباس آپ کی تعلیم کی طرف غفلت یا سستی دیکھتے تو آپ کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دیتے تاکہ بھاگ نہ سکیں۔ استاد کی ان سختیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت عکرمہ بہت جلد قرآن کریم کی تفسیر اور ہر آیت کے شانِ نزول سے بخوبی واقف ہو گئے اور آخر کار حضرت ابن عباس کے علمی ذخیرے کے صحیح وارث ثابت ہوئے۔

علماء آپ کو علمِ تفسیر و حدیث میں حضرات سعید بن جبیر، مجاھد اور عطاء بن ابی رباح سے بڑھ کر سمجھتے تھے۔ یہ حضرات بھی حضرت ابن عباس کے خصوصی تلامذہ تھے مگر ان علماء کے نزدیک حضرت عکرمہ نے اپنے استاد کی خصوصی توجہ سے بہت زیادہ علم حاصل کیا تھا اور آپ حضرت ابن عباس کی روایات کے نہ صرف جامع تھے بلکہ ان کے حافظ بھی تھے۔ اس لیے حضرات مجاھد اور ابن جبیر جیسے فضلاء بھی تفسیر میں آپ سے استفادہ کرتے تھے۔

حضرت عکرمہ کو حضرت ابن عباس نے اپنی زندگی ہی میں مفتی مقرر کر دیا تھا اور یہ ایسا اعزاز تھا جو بہت کم لوگوں کو میسر ہوا۔ آپ سیرت، مغازی اور تاریخ کے عالم بھی تھے۔

آپ کے علم و فضل کی شہرت دور دراز کے ممالک تک پہنچ گئی تھی۔ جب آپ بصرہ تشریف لے گئے تو آپ کا شاہانہ استقبال کیا گیا۔ آپ کی زیارت کے لئے لوگ اس قدر جمع ہو جاتے تھے کہ راستہ چلنا مشکل ہو جاتا تھا۔ آپ کے دورانِ قیام بصرہ میں بصرہ کے مشہور بزرگ حضرت خواجہ بصری احتراماً درس اور فتویٰ دینا بند کر دیتے تھے۔ وہ آپ کے لیے مسندِ درس و افتاء خالی کر دیتے تھے۔ اور جو لوگ فتوی لینے یا کچھ پوچھنے آتے تھے تو انہیں حضرت عکرمہ کے پاس بھیج دیتے تھے۔

حضرت عکرمہ نے حضرت ابن عباس کی روایت سے ایک تفسیر بھی لکھی تھی اور اسبابِ نزول پر بھی

سب سے پہلے آپ نے ایک کتاب لکھی[1]

آپ کے پاس ہر فرقہ کے لوگ طلب علم کے لیے آتے تھے، بالخصوص خارجی فرقہ کے بعض علماء اسلامی مسائل دریافت کرنے اور قرآن کریم کے مشکل مقامات کی تفسیر پوچھنے آیا کرتے تھے، اسی لیے بعض لوگ انہیں خارجی سمجھنے لگ گئے تھے۔ ان کے خلاف حضرات طاؤس، ابنِ عمر، سعید ابن المسیب اور علی بن عبداللہ بن عباس وغیرہ کی آٹھ روایات نقل کی گئی ہیں۔ ان سب کی تردید علامہ ابنِ حجر عسقلانی نے اپنے مقدمہ فتح الباری میں کی ہے[2]

ان مخالفانہ روایات کے برخلاف جلیل القدر ائمہ کرام نے آپ کو ثقہ قرار دیا ہے۔ ان میں حضرات امام احمد بن حنبل، امام بخاری، نسائی، اسحاق بن راھویہ وغیرہ شامل ہیں۔ یہ وہ حضرات ہیں جو اسماء الرجال کے متشدد نقاد ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابو داؤد، نسائی جیسی مشہور کتب حدیث میں، حضرت عکرمہ کی روایات کو صحیح اور قابلِ اعتماد سمجھ کر درج کیا گیا ہے۔ امام مسلم بن الحجاج ابتداءً حضرت عکرمہ کے مخالف تھے، مگر بعد میں وہ بھی آپ کو ثقہ سمجھنے لگ گئے تھے اور آپ کو معتبر راوی قرار دے کر آپ کی روایات کو صحیح مسلم میں شامل کیا۔ آپ کی وفات ۱۰۴ھ میں ہوئی۔[3]

حضرت عطاء بن ابی رباح

حضرت عطا بن ابی رباح یمن کے قصبہ جند میں ۲۷ھ میں پیدا ہوئے آپ آل میسرہ بن ابی خیثم فہری کے غلام تھے۔ آپ نے حضرت عبداللہ بن عباس اور دیگر جلیل القدر صحابہ اور تابعین سے حدیث و تفسیر کی تعلیم حاصل کی[4] کہا جاتا ہے کہ آپ نے دو سو صحابۂ کرام سے اکتساب علم کیا تھا۔

---

[1] الفہرست از ابن ندیم ص ۵۱، ۵۷

[2] مقدمہ فتح الباری ج ۲ ص ۱۴۸

[3] تہذیب التہذیب از ابن حجر عسقلانی جلد ۷، صفحہ ۶۳ - ۲۷۳

[4] تہذیب التہذیب جلد ۷، ص ۱۹۹

علوم حاصل کرنے کے بعد آپ تعلیم و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ آپ قرآن کریم کا مستقل درس دیتے تھے[۱] آپ مکہ معظمہ کے مفتی بھی تھے۔ اس زمانے کے بڑے بڑے علما اور محدثین آپ کو فتاوی میں تمام علمائے مکہ پر فائق سمجھتے تھے۔ بالخصوص مناسک حج کے آپ یکتا عالم تھے خلیفہ سلیمان بن عبدالملک بھی اس مقصد کے لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا[۲] حج کے زمانے میں حکومت کی طرف سے مسائل حج کے آپ ہی واحد مفتی تسلیم کیے جاتے تھے۔ اور اس بارے میں عام اعلان کر دیا جاتا تھا۔[۳] حضرت عبداللہ بن عمر کو آپ پر اس قدر اعتماد تھا کہ وہ تفسیر اور دیگر مذہبی مسائل کے لیے عوام کو آپ کے پاس بھیجا کرتے تھے۔

آپ کے تلامذہ میں بڑے بڑے ائمہ کرام شامل ہیں — امام زہری، مجاہد، اعمش، امام ابو حنیفہ۔ امام اعظم ابو حنیفہ فرماتے ہیں: "میں نے عطا سے افضل کسی کو نہیں پایا"۔[۴] حضرت امام باقر بھی آپ پر اعتماد رکھتے تھے اور لوگوں کو ترغیب دیتے تھے کہ جہاں تک ہو سکے، وہ حضرت عطار کے درس حدیث میں شامل ہوا کریں۔[۵]

غرض حضرت عطار، مکہ معظمہ کے مشہور ترین عالم تھے۔ چنانچہ زہری نے خلیفہ عبدالملک کے سامنے اور عطا خراسانی نے ہشام بن عبدالملک کے روبرو مختلف مقامات کے جن مشہور اکابر علمار کا تذکرہ کیا تھا ان میں ان دونوں علمار نے متفقہ طور پر مکہ معظمہ کے سب سے بڑے علمار میں صرف حضرت عطار بن ابی رباح کا نام لیا تھا۔[۶]

علم تفسیر میں آپ کو مہارت حاصل تھی اور مکہ معظمہ کے مفسرین میں آپ ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ آپ نے بروایت صحیحہ سنہ ۱۱۴ھ میں وفات پائی۔

۱۔ طبقات ابن سعد ج ۵ ص ۳۴۴

۲۔ تہذیب التہذیب ج ۷، ص ۲۰۳

۳۔ تہذیب الاسمار جلد اول ص ۳۳۴

۴۔ تذکرۃ الحفاظ جلد اول ص ۸۰

۵۔ تہذیب الاسمار جلد اول ص ۳۳۴

۶۔ معرفۃ علوم الحدیث ص ۱۹۸، و مناقب ابن حنیفہ۔

مدینہ منورہ

عہدِ نبوی و خلافتِ راشدہ کے بعد بھی صحابۂ کرام کی کافی بڑی تعداد مدینہ منورہ میں مقیم رہی۔ گو اموی دورِ حکومت میں مدینہ منورہ مرکزِ حکومت نہیں رہا تھا تاہم علومِ قرآن، حدیث اور فقہ کا سب سے بڑا مرکز یہی تھا۔ اور دور دراز سے لوگ یہیں آکر تحصیلِ علم کرتے تھے کیونکہ یہاں ہر علم کے ماہرین موجود ہوتے تھے۔ بلکہ مدینہ سنتِ نبوی معلوم کرنے کا مرکز بن گیا تھا یہاں تک کہ امام مالک اور دیگر علماء کے نزدیک اہلِ مدینہ کے معمولات شرعی حیثیت رکھتے تھے اور انہی معمولات کی بنیاد پر فقہ مالکی کی تدوین عمل میں آئی۔

حضرات عمر فاروق، علی، زید بن ثابت اور ابی بن کعب کی بدولت مدینہ منورہ میں ماہرینِ تفسیر موجود تھے بالخصوص ابی بن کعب کے خصوصی شاگردوں نے اس سلسلے میں بہت کام کیا۔ ان مفسرین میں سے یہ تین تابعی علماء زیادہ مشہور ہیں :-

حضرات ابو العالیہ ریاحی - زید بن اسلم اور محمد بن کعب القرظی

ان میں سے پہلے دو حضرات کے مختصر حالات درج کیے جاتے ہیں :-

حضرت ابو العالیہ ریاحی

آپ کا اصلی نام رفیع بن مہران ہے، آپ قبیلۂ ریاح کی ایک عورت کے غلام تھے۔ اس نسبت سے ریاحی کہلاتے ہیں۔ آپ نے جاہلیت کا زمانہ دیکھا تھا۔ مگر بدقسمتی سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں مسلمان نہیں ہوئے اسی طرح صحابی ہونے کے شرف سے محروم رہے۔ تاہم وہ آپ کے وصال کے بعد ہی مسلمان ہو گئے تھے مگر کچھ عرصہ تک غلام رہے۔ آخر کار ان کی مالکہ نے ان کے علم و اخلاق سے متاثر ہو کر اپنے رشتہ داروں کی مخالفت کے باوجود انہیں جامع مسجد میں لا کر علانیہ طور پر ان کی آزادی کا اعلان کر دیا۔

آپ نے غلامی کے زمانے ہی میں قرآن کریم کی تعلیم حاصل کی اور عربی لکھنا پڑھنا سیکھ لیا[1] جب آپ آزاد ہو گئے تو آپ نے تحصیلِ علم کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جماعت تابعین میں آپ قرآن کریم کے سب سے بڑے عالم بن گئے۔

---

[1] طبقات ابن سعد جلد ۷، ق اول ص ۸۲

ابوبکر بن وارد کا بیان ہے "صحابہ کے بعد ابوالعالیہ سے بڑھ کر کوئی نہ تھا"[۵]

ابن عماد حنبلی آپ کو مفسر کے نام سے یاد کرتے ہیں[۶] اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ سید القرآء حضرت ابی ابن کعب کی تفسیر کے راوی اول تھے اور ان کے تلمیذ خاص تھے۔ اس تفسیر کو ابوجعفر رازی نے ربیع بن انس سے روایت کیا تھا اور انھوں نے حضرت ابوالعالیہ کے واسطہ سے حضرت ابی کعب سے روایت کیا۔ محدثین نے اس سلسلۂ اسناد کو صحیح اور معتبر تسلیم کیا ہے۔ محمد بن جریر طبری اور ابن ابی حاتم نے اسی نسخہ سے حضرت ابی بن کعب کی تفسیری روایات اپنی کتابوں میں نقل کی ہیں۔ اس طرح حضرت ابوالعالیہ کے ذریعے حضرت ابی بن کعب کا تفسیری سرمایہ اہلِ علم کے حلقوں تک پہنچا[۷]

حضرت ابی بن کعب کے علاوہ آپ نے حضرات علی، ابن عباس اور ابن مسعود سے بھی اکتسابِ علم کیا۔ مفسرِ قرآن حضرت ابن عباس آپ کی علمی قابلیت سے بے حد متاثر تھے اور جب کبھی آپ ان کے پاس جاتے تھے تو غلام ہونے کے باوجود آپ کو اونچے مقام پر اپنے سامنے بٹھاتے تھے۔

آپ نے سنہ ۹۰ھ یا بقول بعض سنہ ۹۳ھ میں وفات پائی[۸]

حضرت زید بن اسلم

آپ حضرت فاروق اعظم کے آزاد کردہ غلام تھے۔ آپ نے حضرت عبداللہ بن عمر سے اکتسابِ علم کیا ان کے علاوہ دیگر جلیل القدر صحابۂ کرام اور تابعین سے بھی احادیث کی روایت کی ہے۔ تحصیلِ علم کے بعد آپ نے مسجدِ نبوی میں اپنا حلقۂ درس قائم کیا۔ بڑے بڑے علماء آپ کے سامنے زانوئے تلمذ طے کرنا باعثِ افتخار سمجھتے تھے۔ چنانچہ امام بخاری اپنی تاریخ میں بیان کرتے ہیں: "حضرت زین العابدین علی بن الحسین اپنے خاندان کے علمی حلقہ کو چھوڑ کر حضرت زید بن اسلم کے حلقۂ درس میں آکر بیٹھا کرتے تھے۔ یہ دیکھ کر ایک دفعہ نافع بن جبیر بن مطعم نے ان سے پوچھا: "آپ اپنے خاندان کے علمی حلقوں کو چھوڑ کر حضرت عمر بن الخطاب کے غلام کے پاس کیوں بیٹھتے

---

[۵] تذکرۃ الحفاظ جلد اول ص ۵۳

[۶] شذرات الذہب جلد اول ص ۱۰۲

[۷] تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۲۸۴-۲۸۵

[۸] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۱۹

ہیں؟" حضرت زین العابدین نے جواب دیا: "انسان وہیں بیٹھتا ہے جہاں اسے اپنا دینی فائدہ نظر آتا ہے" ۱؎

حضرت زید بن اسلم کو حضرات امام احمد بن حنبل، ابوزرعہ، ابوحاتم اور نسائی نے ثقہ قرار دیا ہے۔ صحاح ستہ میں بھی آپ کی روایات مذکور ہیں۔ تاہم بعض علماء نے ان پر یہ اعتراض کیا ہے کہ وہ اپنی رائے سے قرآن کریم کی تفسیر کرتے تھے۔ چونکہ اس زمانے میں بعض علماء تفسیر بالرائے کو مستحسن نہیں سمجھتے تھے اس لیے وہی یہ اعتراض کرتے تھے انہیں میں حضرت عبید اللہ بن عمر بھی شامل تھے۔

یہ حضرت عبید اللہ کی اپنی ذاتی رائے ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ صحابہ اور تابعین کی ایک کثیر تعداد ضرورت کے وقت تفسیر بالرائے کو جائز سمجھتی تھی بلکہ بوقتِ ضرورت فقہی مسائل اور تفسیر آیات میں اپنے ذاتی اجتہاد سے کام لیا کرتی تھی۔ حضرت زید بن اسلم نے بھی ایک تفسیر لکھی تھی جو بخطِ سکری ابن الندیم کے زمانے تک موجود تھی ۲؎ علامہ ابن حجر عسقلانی بھی آپ کو عالمِ تفسیر تسلیم کرتے ہیں ۳؎ حضرت زید بن اسلم کے ممتاز شاگردوں میں، جنہوں نے آپ کے تفسیری سرمایہ کی اشاعت کی، آپ کے فرزند حضرت عبدالرحمٰن بن زید اور امام مالک شامل ہیں۔ امام مالک آپ کے تلمیذ خاص تھے۔ انہوں نے موطا میں کثیر روایات آپ کے واسطے سے بیان کی ہیں۔ نیز یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ امام مالک نے بھی ایک تفسیر لکھی تھی لہٰذا ان کی مبینہ تفسیر بھی غالباً انہی سے مروی ہوگی۔ امام ابن تیمیہ نے بھی ایک مقام پر اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

آپ کی وفات ۱۳۶ھ میں ہوئی ۴؎

عراق کے مفسرین

مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے بعد تیسرے درجے پر عراق کا مرکزِ تفسیر ہے۔ حضرت عمر فاروق رض نے کوفہ اور بصرہ دو فوجی چھاؤنیاں عراق میں قائم کیں، جو آگے چل کر اسلامی تہذیب و ثقافت کا مرکز بن گئیں۔ جب حضرت عمر فاروق نے حضرت عمار بن یاسر کو وہاں کا گورنر بنا کر بھیجا تھا تو ان کے ساتھ حضرت عبداللہ بن مسعود کو بھی روانہ کیا تاکہ وہ وہاں معلّم کی حیثیت سے کام کریں۔

۱؎ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۱۹ ۲؎ کتاب الفہرست از ابن الندیم ص ۵۱ مطبوعہ مطبع رحمانیہ مصر ۱۳۴۸ھ

۳؎ ۴؎ تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۳۹۵، ۳۹۴۔

لہذا حضرت عبداللہ بن مسعود کوفہ میں آکر حضرت عمر فاروق کے حکم کے مطابق تعلیم و تدریس میں مشغول ہو گئے آپ کی تعلیم و تدریس نے علماء کا ایک وسیع حلقہ پیدا کیا جس نے فقہ حنفی کی بنیاد ڈالی۔ یہ لوگ بہت بڑے فقیہہ اور محدثین تھے۔

عراق کے مشہور تابعی مفسروں میں سے مندرجہ ذیل مفسرین کے مختصر حالات بیان کیے جاتے ہیں:-

علقمہ بن قیس نخعی، مسروق، شعبی، حسن بصری، قتادہ بن دعامہ السدوسی۔

حضرت علقمہ بن قیس آپ حضرت عبداللہ بن مسعود کے تلمیذ خاص اور ان کے علم کے سب سے بڑے راوی تھے۔ آپ ان کے علم کے سچے جانشین ثابت ہوئے۔ خود حضرت عبداللہ بن مسعود فرمایا کرتے تھے "جو کچھ میں نے بیان کیا ہے یا مجھے معلوم ہے، علقمہ ان سب سے بخوبی واقف ہیں"

حضرت علقمہ اپنے استاد کی تفسیری روایات کے جامع تھے اور آپ کے ذریعے یہ روایات اسلامی ممالک کے کونے کونے میں پھیلیں۔ آپ کوفہ کے بہت بڑے محدث اور فقیہہ تھے۔ آپ کی روایات نہایت معتبر ہیں۔ صحاح ستہ میں آپ کی روایات مذکور ہیں۔ آپ کی وفات نوے سال کی عمر میں سنہ ۶۱ھ میں ہوئی [1] فقہ حنفی کے بانی حضرت ابراہیم نخعی آپ کے تلمیذ تھے۔

حضرت مسروق آپ کا پورا نام اور کنیت یہ ہے، ابو عائشہ مسروق بن الاجدع بن مالک الہمدانی الکوفی۔ آپ نے چاروں خلفائے راشدین اور دیگر مشہور صحابہ سے تعلیم حاصل کی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود کے آپ شاگرد رشید تھے۔ کوفہ کے مشہور قاضی شریح پیچیدہ معاملات میں آپ سے مشورہ کرتے تھے۔ تمام علماء اور محدثین نے آپ کے علم و فضل کا اعتراف کیا ہے۔ تفسیر کا علم آپ نے حضرت عبداللہ بن مسعود سے حاصل کیا اور اپنے استاد کی معلومات کی اشاعت کی۔ آپ کی وفات سنہ ۶۲ھ میں ہوئی [2]

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۲۷۶ - ۲۷۸

[2] تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۱۰۹ - ۱۱۱

حضرت شعبی

حضرت ابو عمرو عامر بن شراحیل شعبی حمیری کوفہ کے قاضی اور جلیل القدر تابعی عالم تھے۔ آپ نے پانچ سو صحابۂ کرام سے ملاقات کی اور اڑتالیس صحابۂ کرام سے خصوصی طور پر تعلیم حاصل کی۔ تمام علماء نے آپ کے علم وفضل کا اعتراف کیا ہے۔ آپ جامع علوم تھے یعنی حدیث، تفسیر اور فقہ کے علاوہ آپ مغازی، تاریخ وسیرت اور عربی شعر وادب کے ماہر بھی تھے۔ آپ نے تحصیلِ علم کے لئے دور دراز کا سفر کیا۔ آپ کا حافظہ اس قدر قوی تھا کہ جو بات آپ ایک دفعہ سنتے تھے، وہ فوراً حافظہ میں محفوظ ہو جاتی تھی۔ اسے لکھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ آپ صحابۂ کرام کی زندگی ہی میں فتوے دینے لگے تھے اور آپ کا حلقۂ درس بھی بہت وسیع ہو گیا تھا۔ آپ قرآن کریم کے نہایت محتاط مفسر تھے اور تفسیر بالرائے کے مخالف تھے۔ طبری کی روایت ہے:۔

"شعبی کا قول ہے "تین چیزیں ایسی ہیں جن کے بارے میں زندگی بھر اپنی طرف سے کچھ نہیں کہونگا "قرآن کریم۔ روح اور رائے"[۱]

قرآن کریم کی تفسیر میں آپ کے محتاط ہونے کی وجہ یہ ہوئی کہ اس زمانے میں ایسے لوگ پیدا ہو گئے تھے جو پوری ذمہ داری کے ساتھ تفسیر نہیں کرتے تھے۔ مشہور مفسر ابو حیان فرماتے ہیں:۔

"شعبی سدی کی تفسیر کو پسند نہیں کرتے تھے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ سدی اور ابو صالح دونوں اس فن میں کوتاہ نظر ہیں، اس کے باوجود وہ دونوں لوگوں کے سامنے تفسیر بیان کرتے ہیں"[۲]

ابن جریر طبری لکھتے ہیں کہ: "امام شعبی جب ابو صالح باذان کے پاس سے گذرتے تھے تو ان کا کان پکڑ کر مروڑتے تھے اور فرماتے تھے:۔ "تم قرآن کریم کی تفسیر بیان کرتے ہو، حالانکہ تم قرآن کریم نہیں پڑھتے ہو"[۳]

ابن جریر صالح بن مسلم سے روایت کرتے ہیں: "حضرت شعبی ایک دفعہ سدی کے پاس سے گزرے۔ اس وقت آپ تفسیر بیان کر رہے تھے۔ آپ نے فرمایا: اگر تمہاری پیٹھ پر طبلہ بجایا جائے تو یہ فعل اس کام سے

---

[۱] مقدمہ تفسیر ابن جریر ج ۱ ص ۲۸　　[۲] البحر المحیط ج ص ۱۳۔

[۳] تفسیر ابن جریر ج ۱ ص ۳۰۔

بہتر ہے جو تمہاری مجلس میں ہو رہا ہے۔"[1]

امام شعبی اور دیگر علماء سدی اور ابو صالح کی تفسیری روایات کو معتبر نہیں سمجھتے۔ اس لیئے ہم نے بھی ان دونوں حضرات کو قرن اول کے مفسرین کی فہرست سے خارج کر دیا ہے۔ حالانکہ بعض تفسیروں میں ان دونوں کی روایات پائی جاتی ہیں اور سدی نے ایک تفسیر بھی لکھی تھی۔

امام شعبی کی شخصیت سیاسی طور پر بھی بہت اہم تھی۔ بنو امیہ کے خلفاء آپ کا بے حد احترام کرتے تھے۔ چونکہ بہت بڑے عالم کے باوجود آپ نہایت بذلہ سنج اور خوش طبع بھی تھے اس لیے خلیفہ عبدالملک آپ کی گفتگو سے بہت محظوظ ہوتا تھا۔ جب حجاج بن یوسف کے خلاف ابن الاشعث نے بغاوت کی تو اکثر علماء اور محدثین نے اس کا ساتھ دیا۔ حضرت شعبی بھی اس کے سرگرم کارکن تھے مگر جب دیر جماجم کی جنگ میں ابن الاشعث کو شکست ہوئی تو آپ رُوپوش ہو گئے تھے اور آخر کار حجاج نے ان کی خطا معاف کر دی تھی۔

خلیفہ عبدالملک آپ کی شخصیت سے اس قدر متاثر تھا کہ اس نے شاہِ روم کے پاس آپ کو سفیر بنا کر بھیجا۔ وہاں آپ نے اس قدر قابلیت کے ساتھ گفتگو کی کہ شاہ روم آپ سے بہت متاثر ہوا۔ اسی قسم کی خدمات کی وجہ سے خلفاء کی طرف سے آپ کو دو ہزار سالانہ وظیفہ ملتا تھا۔

آپ بہت بڑے محدث بھی تھے۔ حدیث و فقہ میں آپ کے تلامذہ کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ آپ حضرت امام اعظم ابو حنیفہ کے استاد تھے۔ آپ نے امام زہری سے پہلے فقہی ابواب پہ حدیث کا مجموعہ مرتب کیا تھا۔ کیونکہ آپ سے یہ قول منقول ہے۔

هذا باب من الطلاق جسيم[2] یہ باب طلاق کا بہت بڑا ہے

اگر یہ واقعہ صحیح ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنے عہدِ خلافت میں تمام مشہور علماء کو بالعموم اور ابو بکر بن حزم انصاری قاضیٔ مدینہ کو بالخصوص قرن اول کے ختم ہونے پر احادیث کے مجموعے مرتب کرنے کا حکم دیا تھا تو اس وقت آپ نے قاضی ابو بکر بن حزم اور زہری سے پہلے فقہی ابواب

---

[1] تفسیر ابن جریر ص ۳ ج ۱۷

[2] الراوی از علامہ سیوطی ص ۴۳

پر احادیث کا مجموعہ مرتب کر لیا تھا کیونکہ آپ کی وفات ان دونوں حضرات سے پہلے ہوئی تھی۔ اس طرح آپ کو یہ فخر حاصل ہے کہ آپ ہی نے سب سے پہلے فقہی الواب پر باضابطہ مجموعۂ حدیث مدون کیا۔

آپ کی تاریخ ولادت اور تاریخ وفات دونوں میں اختلاف روایات ہے۔ تاہم مشہور اور صحیح تر روایت یہ ہے کہ آپ سنہ ۲۰ھ میں پیدا ہوئے اور سن ۱۰۹ھ میں وفات پائی۔[1]

بصرہ کے مفسرین

حضرت حسن بصری —— آپ کا پورا نام یہ ہے: ابوسعید حسن بن ابوالحسن لیسار بصری۔ آپ انصار کے آزاد کردہ غلام تھے۔ آپ کی والدہ خیرہ ام المومنین حضرت ام سلمہ کی آزاد کردہ کنیز تھیں۔ طبقات ابن سعد میں مذکور ہے: "آپ سنہ ۲۱ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ نے وادی القریٰ میں نشوونما پائی۔ تعلیم سے فارغ ہو کر آپ ایک بہت بڑے واعظ اور جادو بیان مقرر بنے۔ آپ کا وعظ سوز و گداز میں ڈوبا ہوا ہوتا تھا اور سامعین پر اس کا گہرا اثر ہوتا تھا۔"

جس وقت آپ پیدا ہوئے اس وقت آپ کی والدہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں مشغول رہتی تھیں اور بعض اوقات آپ کو چھوڑ کر وہ کام کاج میں مصروف ہوتی تھیں۔ اس موقع پر جب دودھ پینے کے لیے آپ چلاتے تھے تو بعض اوقات حضرت ام سلمہ کی رضاعت کا آپ کو شرف حاصل ہوتا تھا۔

آپ نے حضرات عثمان، علی، ابوموسیٰ اشعری، ابن عمر، ابن عباس، انس بن مالک اور دیگر صحابۂ کرام اور تابعین عظام سے تعلیم حاصل کی۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد آپ کتاب اللہ، سنت نبوی اور حلال و حرام کے احکام سے بخوبی واقف ہو گئے۔ عربی زبان و ادب میں بھی آپ کو مہارت تام حاصل تھی۔

محدثین اور علماء کے تمام طبقوں نے آپ کے علم و فضل کا اعتراف کیا ہے۔ صحاح ستہ میں آپ کی روایات مذکور ہیں۔ تصوف اور علم باطن میں آپ تمام اولیاء اللہ اور صوفیوں کے سرتاج ہیں کیونکہ تصوف کے تمام سلاسل کا آغاز آپ سے ہوتا ہے اور صوفیوں کے نزدیک آپ کو براہ راست حضرت علی رضی اللہ عنہ سے باطنی فیض حاصل ہوا تھا۔

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۶۵-۶۹

ظاہری علوم میں بھی آپ تمام محدثین بصرہ کے استاد تھے اور ایک دو شخصیتوں کو چھوڑکر دنیائے اسلام میں آپ اور محمد بن سیرین اپنے زمانے کے سب سے بڑے تسلیم کیے جاتے تھے۔ آپ مجتہد کامل بھی تھے، آپ کا اجتہاد حضرت عمر فاروق کے اجتہاد کے مشابہ ہوتا تھا۔ مشہور صحابی حضرت انس بن مالک، جو بصرہ کے علماء کے شیخ اکبر تھے، بالعموم یہ فرمایا کرتے تھے، "تم حسن سے جاکر (شرعی احکام) معلوم کرو کیونکہ انہیں یہ سب (مسائل) معلوم ہیں اور ان کے حافظے میں محفوظ ہیں، جہاں تک ہماری ذات کا تعلق ہے، ہم اب انہیں بھول گئے ہیں۔"

مطرالوراق فرماتے ہیں: "پہلے جابر بن زید بصرہ کے بڑے عالم تھے مگر جب حسن بصری نمودار ہوئے تو ایسا معلوم ہوا کہ عالم آخرت سے ایک شخص آکر وہاں کے چشم دید حالات بیان کر رہا ہے۔"

حضرت محمد باقر بن حضرت زین العابدین فرماتے ہیں:۔

"حسن بصری ایسے شخص ہیں جن کا کلام انبیاء کرام کے کلام سے مشابہ ہے۔"

آپ علم تفسیر کے ماہر بھی تھے اور تفسیر کا درس بھی دیتے تھے۔ ابن خلکان لکھتا ہے: "معتزلہ کے بہت بڑے عالم عمرو بن عبید نے جو امام حسن بصری کا شاگرد تھا آپ کی روایات پر مبنی ایک تفسیر لکھی تھی"[1] اس بیان کی تائید کتاب الفہرست از ابن ندیم سے بھی ہوتی ہے[2] آپ کے درس تفسیر کا ثبوت آپ کے تلمیذ خاص حمید الطویل کی روایت سے ملتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:۔

"میں نے حسن بصری کے سامنے قرآن کریم کی تلاوت کی تو آپ نے اس کی تفسیر اس طرح بیان کی کہ اس سے تقدیر کا ثبوت ملتا تھا بلکہ آپ فرمایا کرتے تھے:

"جو شخص تقدیر کو جھٹلائے وہ کافر ہے۔"

آپ اپنے زمانے کے سیاسی ہنگاموں سے الگ تھلگ رہے۔ آپ نے ابن الاشعث کی شورش میں بھی حصہ نہیں لیا۔ البتہ حکام کے سامنے کلمۂ حق کہنے سے گریز نہیں کرتے تھے بلکہ انہیں مخلصانہ

---

[1] وفیات الاعیان از ابن خلکان ج ۲ ص ۳

[2] کتاب الفہرست از ابن ندیم ص ۵۱

نصیحتیں کیا کرتے تھے۔

آپ نے سنہ ۱۱۰ھ میں وفات پائی اس وقت آپ کی عمر اٹھاسی سال تھی[1]

ایک روایت یہ ہے کہ آپ نے سنہ ۱۱۶ھ میں وفات پائی۔

حضرت قتادہ آپ کا اسم گرامی ابو الخطاب قتادہ بن دعامہ السدوسی ہے۔ آپ خالص عرب تھے اور بصرہ کے رہنے والے نابینا عالم تھے۔

آپ نے حضرات انس بن مالک، ابن سیرین، حسن بصری، عکرمہ اور عطا بن ابی رباح سے روایت کی ہے۔ مدینہ منورہ میں جاکر آپ نے حضرت سعید بن المسیب سے علمِ حدیث حاصل کیا۔ ایک دفعہ جب حضرت سعید بن المسیب نے آپ کی حدیث دانی کا امتحان لینا چاہا تو آپ نے بے شمار احادیث مختلف روایات سے سناڈالیں۔ اور آپ کے استاد حیران رہ گئے۔ سب سے عجیب وغریب بات یہ ہوئی کہ آپ نے آٹھ دن میں حضرت سعید بن المسیب جیسے علامۂ دہر کے وسیع علم کو بہ تمام وکمال حاصل کر لیا اور انہیں مجبور ہوکر یہ کہنا پڑا کہ ان کا علم ختم ہوگیا ہے۔ لہذا آپ وہاں سے چلے گئے۔

آپ حضرت حسن بصری کے تلمیذ خاص تھے اور بارہ برس تک ہر وقت ان کے ساتھ رہے۔ ان کی صحبت سے آپ کو بہت فائدہ پہنچا اور آپ بہت بڑے عالم، مفسر اور محدث ہو گئے۔

چونکہ آپ کا حافظہ بہت قوی تھا اس لیے اسلامی علوم کے علاوہ آپ کو اشعارِ عرب اور عربوں کے گزشتہ واقعات اور ان کے حسب ونسب کی تفصیلات خوب یاد تھیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان تمام علوم کی مدد سے آپ نے علمِ تفسیر میں مہارتِ تامہ حاصل کر لی۔ آپ قرآن کریم کے معانی کی اچھی طرح تشریح کرتے تھے اس لیے مشکل معانی کی تشریح میں مفسرین نے آپ کی روایات پر بے حد اعتماد کیا ہے۔

امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں: "قتادہ تفسیر کے بڑے عالم ہیں"[2]

امام احمد بن حنبل کے علاوہ حضرات سعید بن المسیب اور زہری نے بھی آپ کو اپنے زمانے کے

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۲۶۳-۲۷۰

[2] تذکرۃ الحفاظ جلد اول ص ۱۰۹

دیگر علماء پر ترجیح دی ہے بلکہ صحاح ستہ کے محدثین نے آپ کی روایات کو بکثرت بیان کیا ہے۔

تفسیرِ قرآن کریم کے سلسلے میں حضرت قتادہ فرماتے ہیں:۔

"قرآن کریم کی کوئی آیت ایسی نہیں ہے جس کی تفسیر میں نے (اپنے استادوں سے) نہ سنی ہو"

اس قول سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت قتادہ کی تفسیری روایات محض ان کی رائے اور فکر کا نتیجہ نہیں ہوتی تھیں بلکہ ان کی بنیاد احادیث ماثورہ اور اقوالِ صحابہ پر ہے۔

آپ کے مشہور ترین تلامذہ میں حضرات شعبہ، ایوب سختیانی، امام اوزاعی اور مفتیٔ بصرہ سعید بن ابی عروبہ ہیں۔

آپ کی وفات ۱۱۷ھ یا بقول بعض ۱۱۸ھ میں ہوئی۔ اس وقت آپ کی عمر چھپن سال تھی[1]

"علوم حدیث میں سے ایک قرآن کی تفسیر اور اس سے استنباط کرنے کا علم ہے بے شک یہ بہت بڑا علم ہے۔ ہم یہاں اختصار کے طور پر اس کو تھوڑا سا بیان کرتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بعض چیزیں کسی تعین اور خاص تشریح کے بغیر عمومی اور مطلق پیرایہ میں بیان کر دی ہیں۔" جیسے صلوٰۃ اور زکوٰۃ۔ مثلاً" اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ کہ سبح اسم ربك الاعلىٰ و سبح بحمد ك وغیرہ۔ اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کیا کہ صلوٰۃ کا ذکر قرآن مجید میں مطلق تھا۔ آپ نے اس کے لئے وقت معین فرما دیے۔

"خیر کثیر"

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۸ ص ۳۵۱ - ۳۵۶

مذہب اور سائنس کے تصادم کا تاریخی پس منظر

پروفیسر سلیم چشتی

جب تین صدی قبل مسیح میں سکندریہ علمی دنیا کا مرکز قرار پایا تو حکماء، علماء، سائنس دان، فلاسفر اور اہلِ مذہب سب وہاں جمع ہو گئے اور حضرت مسیحؑ کی پیدائش کے وقت یہ شہر فی الحقیقت علم وفضل کا مرکز بن گیا تھا۔ ہر طرف علم کے چشمے اُبل رہے تھے اور وہی کیفیت نظر آتی تھی جو آج آکسفورڈ یا کیمبرج میں نظر آتی ہے۔

الہامی مذاہب کے ماننے والوں میں صرف یہودی یہاں آباد تھے۔ ان کا سربرآوردہ عالم اس زمانہ میں حکیم فایلو تھا۔ اس نے جب اپنے چاروں طرف علمی چرچا دیکھا تو قدرتی طور پر اسے یہ خیال پیدا ہوا کہ یہودیت کو اہلِ علم میں مقبول ومحبوب بنانے کے لیے اسے اس زمانہ کے فلسفہ اور حکمت کے مطابق ثابت کیا جائے۔ چنانچہ اس بزرگ نے توریت کی تفسیر اس طریق پر لکھی کہ اس کے جملہ مسائل کو اس زمانہ کے فلسفہ کے مطابق ثابت کیا۔ اور جو باتیں فلسفہ کے مطابق ثابت نہ ہو سکیں، انہیں توڑ مروڑ کے مطابق بنایا۔ اور جو مسائل فلسفہ میں موجود تھے لیکن توریت میں موجود نہ تھے، ان کو توریت پر چسپاں کر دیا گیا۔ مثلاً توریت میں لکھا ہوا ہے کہ خدا نے آدم سے پوچھا؟ "تو کہاں ہے؟ اس پر فلسفیانہ اعتراضات وارد ہوتے تھے۔ فایلو نے ایسی ایسی تاویلات کیں کہ باید وشاید، جس طرح ہو سکا۔ اس قسم کے بیانات کو عقل کے مطابق کیا۔ قصۂ آدم میں سانپ پر اعتراض ہوتے تھے۔ فایلو نے سانپ کا انکار کر دیا۔ طوفانِ نوح پر اعتراض ہونے تھے، فایلو نے توریت اور عہدِ عتیق کی آیات کا انکار کر دیا یا اس طرح تاویل کی کہ کتاب کا مطلب فوت ہو جائے

کتاب کے بیان کی صورت مسخ ہو جائے۔ منشائے متکلم فوت ہو جائے، خواہ کچھ ہو مگر فلسفۂ یونان سے مطابقت پیدا ہو جائے۔

اسی طرح عقلِ اوّل کا مسئلہ توریت میں مذکور نہیں، لیکن فلسفۂ یونان کی عمارت کا سنگِ بنیاد ہے۔ اس لیے حضرت موصوف نے لفظ "حکمت" (wisdom)، کو جو عہدِ عتیق میں کئی جگہ استعمال ہوا ہے، عقلِ اول کا ہم پلّہ یا مرادف بنا دیا اور کہا کہ خدا نے سب سے پہلے حکمت پیدا کی۔ حکمت نے زمین و آسمان پیدا کیے۔ ان دو مثالوں سے ناظرین کو معلوم ہو سکتا ہے کہ فایلو نے یہی نہیں کیا کہ تاویلاتِ رکیکہ کی بدولت مذہب کو بازیچۂ اطفال بنا دیا بلکہ ایک ایسی بُری رسم کی بُنیاد ڈال دی جس نے آگے چل کر نہایت مُضر اور خوفناک نتائج پیدا کیے۔ اگر فایلو فی الحقیقت عقل مند ہوتا تو سوچتا کہ توریت میرے خیال کے مطابق خدا کا کلام ہے اور فلسفہ ان لوگوں کے خیالات کا مجموعہ ہے جو مثل میرے غیر معصوم اور ناقص العقل ہیں، اس لیے توریت کو فلسفہ کی صداقت کا معیار قرار دینا چاہیئے نہ کہ یہ کہ فلسفہ کو توریت کی صداقت کا معیار بنایا جائے۔ اگر خدا نے "عقلِ اول" کا ذکر توریت میں نہیں کیا تھا تو فایلو کو ہرگز لازم نہ تھا کہ وہ کھینچ تان کر توریت سے "عقلِ اول" کا وجود ثابت کرتا۔

بہر حال آگے چل کر سے

خشتِ اول چوں نہد معمار کج تا ثریا مے رود دیوار کج

والا مضمون ہو گیا۔ جب مسیحیت کو فلسفہ سے دوچار ہونا پڑا تو اس کے حامیوں نے بھی فایلو ہی کی تقلید کی اور یوحنا نے تو اپنی انجیل کا آغاز ہی "عقلِ اول" سے کیا ہے۔ لیکن جب ۵۲۹ء میں جسٹینئن قیصرِ روم نے فلسفہ کی شمع گُل کر دی، تو تطبیق کا بازار بھی سرد پڑ گیا۔

ساتویں صدی عیسوی میں اسلام کا آفتاب فاران کی چوٹیوں سے طلوع ہوا۔ جب تک اسلام عرب کی سرزمین میں محدود رہا۔ فلسفہ اور حکمت سے مطابقت کی ضرورت پیدا نہیں ہوئی کیونکہ عرب فلسفیانہ بحثوں کے خوگر نہ تھے، لیکن جب وہ عجمی قوموں میں شائع ہوا اور یہودی عیسائی، مجوسی اور صابی اس کے حلقہ بگوش ہوئے تو انہوں نے اپنی عادت کے مطابق اس سیدھے سادے عملی مذہب کا دامن بھی فلسفہ کے کانٹوں میں

الجھا دیا۔ نویں صدی میں اسکندریہ کی جگہ بغداد نے لے لی۔ اور یہاں فلسفہ و حکمت کا بازار گرم ہوا۔ مسلمانوں نے بھی اسلام اور فلسفۂ یونان میں تطبیق کا کام شروع کر دیا۔ کچھ عرصہ کے بعد اسپین میں قرطبہ اور غرناطہ کی خاک سے مسلمان علماء پیدا ہوئے جن کا سرتاج قاضی ابنِ رُشد ہے جو ارسطو کا بہترین شارح سمجھا جاتا ہے۔ اس نے مذہب اور فلسفہ یا نقل اور عقل میں تطبیق کا بیڑہ اٹھایا اور بہت کچھ کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ اس فیلسوف نے ارسطو کے فلسفہ کی ترویج و اشاعت میں سارا زورِ طبع صرف کر دیا اور اس میں مبالغہ ہے نہ شک کہ یورپ کو ارسطو کے فلسفہ سے روشناس کرنے کا سہرا اسی کے سر پر ہے۔

بارھویں صدی عیسوی میں، جبکہ پوپ آف روم یورپ پر بلا شرکتِ غیرے حکمرانی کر رہا تھا، مسیحی علمائ نے ابنِ رُشد کے خیالات اور طریقِ کار سے متاثر ہو کر مسیحیت اور ارسطو کے فلسفہ میں تطبیق کا سلسلہ شروع کر دیا۔ تیرھویں صدی میں ٹامس ایکوینیاس پیدا ہوا جو مسیحی علمائے ازمنہ وسطیٰ کا سرتاج سمجھا جاتا ہے، اس کی بدولت مسیحی یورپ میں، فلسفۂ ارسطو کے مطالعہ کا چرچا ہوا۔ اور جو شمع ۵۲۹ء میں گُل کی گئی تھی وہ سات سو برس کے بعد پھر روشن ہو گئی۔

واضح ہو کہ ترویجِ فلسفہ سے پہلے یورپ میں صرف مذہبی طبقہ فلسفہ و حکمت پڑھتا تھا لیکن جب یورپ میں فلسفہ اور حکمت کا دَور شروع ہوا، تو ایسے عالم بھی پیدا ہونے لگے جو کلیسائی اصطلاح میں "دنیاوی" تھے۔ ان لوگوں نے کلیسائی عقاید پر اعتراض کا سلسلہ شروع کیا۔ کلیسا کے پاس ان اعتراضات کا جواب نہ تھا۔ (کیونکہ کلیسا نے خلافِ عقل عقاید کو مدارِ نجات قرار دیا تھا) لہٰذا حامیانِ مذہب نے حامیانِ سائنس کی مخالفت کرنی شروع کر دی۔ کیپلر، کاپرنیکس، گلیلیو اور برونو نے سولھویں صدی میں جس قدر نظریات اور حقائق یورپ میں شائع کیے، انہیں دراصل مذہب سے کوئی سروکار نہ تھا۔ لیکن کلیسائے روم، جو انسانی جسم اور عقل دونوں پر حکمران تھی، کب پسند کر سکتی تھی کہ لوگ عقل سے کام لیں۔ علاوہ بریں کلیسا کے ارکان یعنی پادریوں نے اپنی غلطی سے ہیئت، انجوم، فلسفہ، منطق، طب، اقلیدس، طبیعیات، کیمیا اور جغرافیہ سب کو بائبل میں داخل کر لیا تھا۔ اس لیے ان کے زاویۂ نگاہ سے وہی جغرافیائی اور کیمیاوی تحقیقات صحیح ہو سکتی تھی جو اُن کے زاویہ سے، بائبل کی یا کلیسا کی تعلیمات کے خلاف نہ ہو۔ جب برونو نے کاپرنیکس کے نظریہ کی، کہ زمین

سورج کے گرد حرکت کرتی ہے، تائید کی تو پادریوں نے اس مسئلہ کی مخالفت کی کہ یہ بات بائبل یا مذہب کی تعلیم کے خلاف ہے۔ جو لوگ سائنس کے دِل دادہ تھے انہوں نے کہا کہ "شنیدہ کے بُود مانند دیدہ" اگر تمہاری بائبل یا تمہارا مذہب حقائق و معارف کی تردید کرتا ہے تو وہ خود لائقِ اعتماد نہیں۔ اگر آج ہم تمہاری یہ بات مان لیں تو کل تم ہم سے کہوگے کہ دو اور دو چار نہیں ہوتے بلکہ تین ہوتے ہیں، تو کیا تمہاری بائبل کے پیچھے ہم ریاضی، سائنس اور دیگر علوم کے حقائق سے دست بردار ہو جائیں گے؟ ہر گز نہیں۔ ہم نے اپنی عقل کلیسا کے ہاتھ فروخت نہیں کی ہے۔ اگر اکتشافاتِ علمیہ جن کی صحت بدلائل عقلیہ اور مشاہدہ و تجربہ سے ثابت ہو چکی ہے تمہارے مذہبی معتقدات کے خلاف ہیں تو تمہارے معتقدات غلط ہیں، اور ہم انہیں داستانِ پاستان سمجھتے ہیں اور وہ مذہب جو عقل کی مخالفت کرے، صرف احمقوں کے لیے ہے۔ دانش مندوں کا اسے دور ہی سے سلام ہے۔ پادری لوگ اپنی ضد پر قائم رہے، اربابِ سائنس نے حماقت کو اپنا شعار بنانا پسند نہ کیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ عیسائیت اور سائنس میں جنگ شروع ہو گئی۔

القصہ پادریوں نے برونو سے کہا کہ زمین کو متحرک کہنا صریح کلمۂ کفر ہے توبہ کرو۔ برونو نے جواب دیا:- ع یہ وہ نشہ نہیں ہے جسے ترشی اتار دے

حضرت مسیح کے رحم دل جانشینوں نے حکم صادر کیا کہ برونو کو اس طرح قتل کیا جائے کہ اس کے خون کا قطرہ زمین پر نہ گرنے پائے!!! اللہ اللہ یہ لوگ کیسے رحم دِل تھے، اب شاید ہی ایسے پاک نفس لوگ پیدا ہوں!!!

اگر چھٹی صدی سے سولھویں صدی تک پادریوں نے بے گناہ انسانوں کا خون نہیں بہایا تو اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ ان میں رحم دلی پیدا ہو گئی تھی بلکہ ۵۲۹ء میں فلسفہ کی تعلیم جرم قرار دے دی گئی تھی۔ نہ بانس باقی رہا نہ بانسری بجی۔ ورنہ اس سے پہلے "مقدس" سرل نے معصوم اور بے گناہ ہائی پیشیا کو اسی بے دردی کے ساتھ ذبح کرایا تھا کہ غالباً حضرت یسوع مسیح بھی لرزہ براندام ہو گئے ہوں گے۔

بہر حال برونو نے جان دے کر اعلانِ جنگ کو مسلّم کر دیا۔ اب سائنس دانوں کے لیے دو ہی راستے تھے، یا مذہب کو اختیار کر کے عقل و حکمت کو خیرباد کہہ دیں یا عقل و حکمت کو اختیار کر کے "مذہب" سے

دست بردار ہو جائیں۔ انہوں نے وہی کیا جو ایک عقل مند آدمی کو کرنا چاہیئے۔ جو مذہب عقل کا مخالف ہو وہ مذہب نہیں ڈھکوسلا ہے۔

چونکہ مغرب میں مذہب سے مراد عیسائی مذہب لی جاتی تھی اور عیسائی مذہب یا کلیسائے روم کی تعلیمات عقل کی مخالف تھیں اس لیے ارباب سائنس "مذہب" ہی سے بدظن ہو گئے۔

سائنس اور مذہب کے مابین جنگ وجدل کا سبب بیان کرنے کے بعد، میں ان پادریوں پر اظہارِ افسوس کیے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا جنھوں نے اپنے متعصبانہ اور جاہلانہ طرزِ عمل سے مذہب اور سائنس میں نزاع پیدا کر دی۔ یہ کوئی اُن عقل کے ٹھیکہ داروں سے پوچھے کہ زمین کے گول یا چپٹے ہونے کو، سورج کے ساکن یا متحرک ہونے کو، سمندر میں مدوجزر آنے کو، بائبل یا مذہب سے کیا تعلق ہے؟ اور اگر بائبل سے تعلق ہو بھی، تو مذہب سے کیا تعلّق ہے؟ کیا بائبل ہیئت یا فلکیات یا طبیعیات یا جغرافیہ کی کوئی کتاب ہے؟

اگر یہ پادری لوگ سائنس کی بے جا اور بے ہودہ مخالفت نہ کرتے تو آج دنیا کا نقشہ کچھ اور ہی ہوتا۔ اوّل تو جس قدر خون ریزی ہوئی وہ نہ ہوتی، دوسرے ہم تہذیب وتمدن کے لحاظ سے ایک ہزار سال آگے ہوتے، تیسرے مذہب اور سائنس دونوں ایک دوسرے کے دوست ہوتے اور اس طرح اجتماعی زندگی زیادہ پُرلطف اور معنی خیز ہوتی۔

ایک زمانے میں ہمارے اکثر علماء بھی سائنس کی مخالفت میں پادریوں سے پیچھے نہیں تھے۔ ان بزرگوں نے بھی قرآن مجید کو شاید جغرافیہ، ریاضی، کیمیا، فلکیات کی کوئی کتاب سمجھا تھا، جو بغیر سوچے سمجھے سائنس کی مخالفت کرتے رہے۔ سائنس، حکمت اور فلسفہ وغیرہ کی درس وتدریس کو گناہ سمجھتے رہے۔ اور علم کو طب اور دینیات ہی میں محدود سمجھا۔ اور اگر معقولات کی اجازت دی تو صرف فلسفہ مشائین کی۔ اور آج بیسویں صدی میں بھی ارسطو ہی کا فلسفہ پڑھ رہے ہیں یعنی مردے کا مقابلہ چھکڑے سے کر رہے ہیں۔

جب سرسید علیہ الرحمتہ نے مسلمانوں کو سائنس کی تعلیم کی طرف متوجہ کیا اور ایک زرّین اصول پیش کیا کہ عقل اور نقل میں مخالفت ہو ہی نہیں سکتی کیونکہ قرآن خدا کا کلام ہے اور فطرت اور مظاہر فطرت خدا کا فعل ہے

اور عقل مند آدمی کے قول اور فعل میں تطابق ہونا ضروری ہے اس لیے سائنس اور مذہب میں کوئی مخالفت نہیں تو انہوں نے (اللہ ان پر رحم فرمائے) اس قدر شور مچایا کہ آسمان سر پر اٹھا لیا اور غریب سرسید کو "نیچری" کہنا شروع کر دیا۔ خدا کا شکر ہے کہ بیسویں صدی کے برکات میں سے ایک برکت یہ بھی ہے کہ اب اس خیال کے علماء کہیں کہیں باقی رہ گئے ہیں۔ غالباً کچھ عرصہ کے بعد سرسید بھی امام غزالی اور امام رازی کی طرح "رحمۃ اللہ علیہ" ہو جائیں گے۔ یہ میں نے اس لیے لکھا ہے کہ اپنے زمانہ میں ان دونوں حضرات پر کفر کے فتوے لگ چکے ہیں۔

خدا کا شکر ہے کہ اب بیسویں صدی میں ارباب دانش پر یہ حقیقت منکشف ہو گئی ہے کہ مذہب اور سائنس میں کوئی تخالف نہیں ہے۔ سائنس کا کام مظاہر فطرت کا مطالعہ کرنا اور اس کی مدد سے قوانین اور اصول مرتب کرنا ہے۔ اس سے آگے بڑھنا نہ اس کے لیے موزوں ہے نہ جائز۔ مذہب کا کام انسان کو "باخدا" بنانا ہے سائنس طبیعیات سے بحث کرتا ہے، مذہب مابعد الطبیعیات سے۔ مذہب ان حقائق کو پیش کرتا ہے جو سائنس کی دسترس سے بالاتر ہیں۔ سائنس بتاتا ہے کائنات کیا ہے، کن چیزوں سے مرکب ہے، پانی کیا ہے کن چیزوں سے مرکب ہے؟ مذہب بتاتا ہے خدا کیا ہے اس کی صفات کیا ہیں؟ نیکی کیا ہے، بدی کیا ہے؟ خدا تک کیونکر پہنچ سکتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ ان دونوں باتوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ یہ مذہب کا منصب نہیں کہ سائنس کے بیان کردہ اصولوں کو غلط یا صحیح قرار دے، سائنس کو یہ حق نہیں کہ مذہب کے پیش کردہ حقائق کی تکذیب یا تائید کرے۔ جہاں سائنس کی سرحد ختم ہو جاتی ہے وہاں سے مذہب کی سرحد شروع ہوتی ہے۔ پھر دونوں میں تصادم کس طرح ہو سکتا ہے؟ جس طرح سائنس کے حیطۂ اقتدار سے یہ بات باہر ہے کہ وہ محض اس بنا پر خدا کا انکار کر دے کہ خدا حواس خمسہ سے محسوس نہیں ہوتا۔ اسی طرح مذہب کے دائرۂ عمل سے یہ بات باہر ہے کہ وہ زمین کے گول ہونے سے محض اس لیے انکار کر دے کہ قرآن میں اس بات کا ذکر نہیں ہے۔ مذہب کو اس بات سے علاقہ نہیں کہ پانی کن اجزا سے مرکب ہے؟ اسی طرح سائنس اس بات کا فیصلہ نہیں کر سکتا کہ خدا ہے یا نہیں؟

مذہب روحانی تجارب کے مجموعہ یا سلسلہ کا نام ہے، سائنس مادی تجارب کے مجموعہ یا سلسلہ کا نام ہے، مذہب کا تعلق قلب سے ہے۔ سائنس کا تعلق دماغ سے ہے۔ دونوں اپنی اپنی قلمرو میں آزاد ہیں۔

ابُوسُلیمان السجستانی المنطقی

ابُوبکر شبلی[1]

ابوسلیمان محمد بن طاہر بن بہرام السجستانی المنطقی کا شمار مشہور مسلم فلاسفہ اور حکماء میں ہوتا ہے۔ معقولات میں آپ کو سند کی حیثیت حاصل ہے۔ آپ کی مایۂ ناز تصنیف "صوان الحکمت" علمی اور تحقیقی حلقوں میں کافی مشہور ہے۔ متقدم علماء اور حکماء نے اپنی اپنی تصنیفات میں آپ کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ بعض علماء اور مؤرخین کی آراء کا ذکر یہاں بے محل نہ ہوگا۔

ابن ندیم[2] اپنی کتاب "الفہرست" میں لکھتے ہیں:۔

ابوسلیمان السجستانی وھو ابوسلیمان محمد بن طاھر بن بھرام السجستانی۔ مولدہ سنۃ . . . . . ولہ من الکتب فی مراتب قوی الانسان[3]

ابوسلیمان السجستانی کا نام محمد بن طاہر بن بہرام السجستانی ہے۔ ان کی ولادت . . . . . میں ہوئی ان کی کئی مصنّفات ہیں۔ ان میں سے مقالہ فی مراتب قوی الانسان بھی ہے۔

ابوالحسن البیہقی المتوفی (۵۶۵ھ) کا بیان ہے:۔

---

[1] ابوبکر شبلی بی اے، مولوی فاضل (پنجاب)، استاذ عربی تعمیر نو قومی درس گاہ کوئٹہ۔

[2] ابوالفرج یا ابوالفتح محمد بن یعقوب اسحٰق الشہیر بابن ندیم۔ صاحب کتاب "الفہرست"۔

[3] "الفہرست" المقالۃ السابقۃ، تحت عنوان" اخبار الفلاسفۃ والعلوم القدیمۃ۔

الحکیم ابوسلیمان محمد بن طاهر بن بہرام السجستانی مصنف "صوان الحکمۃ" کان حکیما، لہ تصانیف اکثرھا فی المعقولات۔ منہا رسالۃ "فی اقتصاص طرق الفضائل" [1]

حکیم ابوسلیمان محمد بن طاہر بن بہرام السجستانی مصنف "صوان الحکمت" ایک حکیم تھا۔ آپ کی اکثر تصانیف معقولات میں ہیں۔ ان میں سے ایک رسالہ ہے۔ "فی اقتصاص طرق الفضائل" بھی ہے۔

ابوسلیمان کا مولد "سیستان" ہے، جو آج کل "سجستان" کے نام سے مشہور ہے۔ اسی نسبت سے آپ کو ابوسلیمان السجستانی کہا جاتا ہے۔ باوجود تحقیق کے آپ کی تاریخ ولادت معلوم نہیں ہو سکی۔ قرائن اور شواہد بتاتے ہیں کہ آپ چوتھی صدی ہجری میں پیدا ہوئے۔ الفارابی اور ابن سینا کے درمیانی عرصہ میں زندگی گزاری۔ اسی لیے آپ کو علمی لحاظ سے الفارابی کا خلف اور ابن سینا کا سلف سمجھا جاتا ہے۔ تاریخ ولادت کی طرح آپ کی تاریخ وفات بھی پردۂ خفا میں ہے۔

قاضی اکرم علی بن یوسف القفطی المتوفی (۶۴۶ھ) لکھتے ہیں:-

"ابوسلیمان محمد بن طاہر بن بہرام السجستانی۔ سجستان میں پیدا ہوئے اور بعد میں بغداد میں آکر مستقل سکونت اختیار کی۔ متی بن یونس نیز دیگر علماء منطق سے استفادہ کیا۔ آپ بہت بڑے عالم اور فیلسوف تھے۔ آپ کا گھر علماء اور حکماء کا مرجع خاص تھا۔ آپ یک چشم تھے۔ اس لیے زیادہ تر گوشہ نشین رہتے تھے۔ آپ کے تلامذہ میں سے ابوحیان التوحیدی سب سے زیادہ ممتاز ہیں۔ ابوسلیمان کی ہجو میں البدیہی نے حسب ذیل اشعار کہے ہیں:-

ابوسلیمان عالم فطن	ما ھو فی علمہ بلمنتقص
لکن تطیرت عنہ رؤیتہ	من عور و حش ومن برص
ربابنہ مثل ما بوالدہ	وھذہ قصۃ من القصص [2]

---

[1] تتمہ صوان الحکمۃ (ص ۴۴ ۔۔۔ ۴۵)

[2] تاریخ الحکماء (ص ۲۸۲ - ۲۸۳)

ترجمہ: ابوسلیمان ذی فہم عالم ہیں۔ ان کے علم میں کوئی نقص نہیں۔

لیکن اس کی بدشکل سے میں نے برا فال لیا۔ یک چشم اور برص والے ہونے کی وجہ سے لوگ ان سے وحشت زدہ ہوتے ہیں۔

بیٹے کا حال وہی ہے جو باپ کا ہے۔ یہ اور قصوں کی طرح ایک قصہ ہے۔

افغانستان سے شائع شدہ دائرۃ المعارف میں ابوسلیمان کے حالات یوں درج ہیں:۔

ابوسلیمان منطقی بن طاهر بن بهرام سجستانی نزیل بغدادی شاگرد متی بن یونس و امثال او بود۔ سپس خودش بہ تدریس علوم فنوا گوفتہ خود پرداخت۔ محمد عبدون جبلی و ابوحیان توحیدی شاگردان اوبیند [1]

ابوسلیمان منطقی بن طاہر بن بہرام سجستانی مقیم بغداد متی بن یونس اور ان کے پائے کے دوسرے علماء کا شاگرد تھا۔ انہوں نے اپنے آپ کو تدریس علوم میں مشغول رکھا۔ محمد بن عبدون جبلی اور ابوحیان توحیدی ان کے شاگردوں میں سے ہیں۔

ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا لکھتے ہیں:۔

"متی بن یونس اور یحییٰ بن عدی کے مشہور شاگرد ابوسلیمان محمد بن طاہر بن بہرام سجستانی منطقی ایک مشہور حکیم اور فیلسوف تھے۔ چوتھی صدی ہجری میں زندگی گزاری۔ اپنے عہد کے ممتاز علماء اور حکماء میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ اپنے ہم عصر علماء کے علاوہ عضد الدولہ اور صمصام الدولہ نیز دیگر امراء اور وزراء سے ان کے بہترین تعلقات تھے۔ ان کی تاریخ ولادت و وفات متعین نہیں ہو سکی۔ شہرستانی نے ان کو ابوزید بلخی، ابوعلی مسکویہ، یحییٰ بن عدی فارابی اور ابن سینا کا ہمسر قرار دیا ہے [2]

"حکمت، فلسفہ، منطق اور دیگر علوم و فنون میں ابوسلیمان کا علمی پایہ بہت بلند تھا۔ آپ اپنے زمانے

---

[1] دائرۃ المعارف افغانستان (ص ۹۰۸) طبع مطبع عمومی کامل

[2] تاریخ علوم عقلی در تمدن اسلامی (ص ۱۹۲)

میں اس فن کے امام شمار ہوتے تھے۔ اختلافی مسائل میں آپ کی رائے فیصلہ کُن ہوتی تھی۔ اس فن میں آپ کی تصنیفات میں سے دو کتابیں "مقالہ فی مراتب قوی الانسان" اور "کیفیۃ الانذارات التی تنذر بہا النفس" لاجواب ہیں۔ ان دونوں کتابوں میں آپ نے کئی اہم منطقی مسائل پر بحث کی ہے۔ آپ کے منطقی افکار وخیالات کو آپ کے شاگرد ابوحیان التوحیدی[۱] نے اپنی تصانیف میں جمع کیا ہے۔ ابوحیان التوحیدی کی کتاب "المقابسات" ابوسلیمان السجستانی کے اقوال اور افکار کا بہترین مجموعہ ہے۔ المقابسات کے علاوہ ابوحیان نے "الامتناع والمؤانسہ" اور "الصدیق والصداقہ" میں بھی اپنے استاذ کے آراء وافکار کو جابجا نقل کیا ہے۔ ابوحیان کی مؤلفات کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابوسلیمان معقولات کے علاوہ ریاضی، نجوم اور شعروشاعری میں بھی یدِطولیٰ رکھتے تھے"۔[۲]

ابوسلیمان السجستانی کے خیال میں مذہب کو عقل کے ذریعے سمجھنا صحیح نہیں۔ ان کی رائے ہے کہ مذہب کی بنیاد وحی پر ہے اور وحی عقل سے بالاتر ہے۔ اس لیے عقل وحی کی کسوٹی پر نہیں اتر سکتی۔ بلکہ عقل کو وحی کے تابع کرنا ضروری ہے۔ اس پر ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا لکھتے ہیں:۔

"ابوسلیمان برخلاف اپنے عہد کے فلاسفہ کے، خصوصاً "اخوان الصفا" کے دین اور فلسفہ کی آمیزش کے قائل نہیں تھے۔ جب ان کو "اخوان الصفا" کے رسائل دکھائے گئے تو انہوں نے کہا "ان لوگوں نے فلسفہ یعنی علم نجوم، افلاک، آثار الطبیعہ، موسیقی اور منطق کو شریعت میں ملانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن شریعت میں ان علوم کی کوئی گنجائش نہیں ہے"۔ اخوان الصفا سے قبل بھی ایک گروہ نے

---

[۱] علی بن محمد بن عباس توحیدی مشہور فقیہ اور فیلسوف تھے۔ بعض لوگ ان کو نیشاپوری اور بعض شیرازی کہتے ہیں۔ بغداد میں مقیم رہے۔ اور وہاں ہی وفات پائی۔ آپ کی بھی تاریخِ ولادت اور تاریخِ وفات متعین نہیں ہو سکی۔ آپ کی تصانیف کی تعداد تقریباً ۱۸ ہے۔

[۲] الدراسات الادبیہ۔ مجلۃ قسم اللغۃ الفارسیۃ جامعۃ لبنان۔ عدد ثالث سال دوم۔ مبحث عنوان "ابوسلیمان السجستانی"۔

ایسی کوشش کی تھی۔ لیکن اپنے مقصد میں بُری طرح ناکام رہے تھے۔ شریعت خدا کا ایک پیغام ہے جو اس کے رسول کے ذریعہ ہم تک پہنچا ہے۔ اس میں عقل کے گھوڑے دوڑانے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس کو تو اسی صورت میں ہمیں قبول کرنا ہے جس صورت میں ہم تک پہنچا ہے۔ اس میں چون وچرا کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اگر شریعت میں عقل کی کوئی گنجائش ہوتی تو خدائے قدوس اس کی پوری پوری ہدایت کرتے لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ اصولِ شریعت کو عقل سے نہ جانچنے کی پوری ہدایت کی ہے۔

مثلاً: جب کسی فقہی مسئلہ میں دو یا دو سے زیادہ گروہوں میں اختلاف رونما ہو تو شریعت نے یہ ہدایت نہیں کی کہ اس مسئلہ کو نجوم، منطق یا کسی اور عقلی علم کی طرف رجوع کیا جائے۔ خداوند تعالیٰ نے دین اسلام کو کامل اور مکمل کر دیا ہے۔ وحی کے بعد دین میں کسی رائے کو دخل نہیں۔ دین فلسفہ سے بالاتر ہے۔ اور فلسفہ مخلوق عقل کی تخلیق ہے۔ اور یہ عقل خود خدا کی عطا کردہ ہے۔ اگر دین کی کسوٹی عقل کو قرار دیا جائے تو وحی کی ضرورت ہرگز نہیں رہتی۔[1]

اس اقتباس سے یہ واضح ہوا کہ ابوسلیمان السجستانی کو اخوان الصفا کے گروہ سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ جیسا کہ بعض لوگ گمان کرتے ہیں۔ بلکہ ان کو "اخوان الصفا" کی آرار سے اختلاف تھا۔

المعصومی[2] نے اپنے ایک مقالہ "اخوان الصفا" میں اس پر تفصیلی بحث کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ ابوسلیمان السجستانی کا اخوان الصفا سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

"پانچواں یہ کہ مسٹر اسٹرن نے اپنے مقالہ "رسائل اخوان الصفا کی تصنیف" (شائع شدہ اسلامک کلچر ۱۹۴۶ء) میں رسائل سے بحث کرتے ہوئے اس بات کو ثابت کیا ہے کہ ان رسائل کے مصنفین ابوسلیمان المنطقی اور ابوحیان التوحیدی کے استاد تھے۔ اور خود ابوحیان التوحیدی کے معاصرین تھے۔

---

[1] تاریخ علوم عقلیہ در تمدن اسلامی۔ طبع دوم۔ مطبع دانش گاہ طہران (ص ۱۹۲ تا ۱۹۸)

[2] ڈاکٹر محمد صغیر حسن المعصومی سابق ڈاکٹر اکیڈیمی علوم اسلامیہ کوئٹہ وحال پروفیسر "مرکزی ادارہ تحقیقات اسلامی" کراچی (پاکستان)

حسب بیان مسٹر اسٹرن ابو سلیمان المنطقی نے اپنی کتاب "صوان الحکمت" میں جو شہرستانی کی کتاب الملل والنحل کا اہم مآخذ ہے۔ اور جس میں فلسفہ کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ یقینی طور پر رسائل کی تصنیف کی نسبت ابو سلیمان المقدسی کی طرف کی ہے۔ بحالیکہ ان کے شاگرد ابو حیان التوحیدی نے اپنی کتاب "الامتناع والموانسۃ" میں ابو الحسن زنجانی کا جو "اخوان الصفا" کے بانیوں میں سے تھا، قصہ بیان کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ زنجانی نے مجھ سے بیان کیا (حدثنی) لفظ حدثنی اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ توحیدی زنجانی کے بھی شاگرد تھے۔ مسٹر اسٹرن کا کہنا یہ ہے کہ چونکہ ابو حیان کا زنجانی کا قصہ نقل کرنا بالفاظہا رسائل میں موجود ہے۔ لہٰذا آخر الذکر بھی رسائل کے مصنفین میں شامل ہیں۔ یا کم از کم رسائل کا وہ حصہ جو علم الاخلاق سے تعلق رکھتا ہے، جس کا یہ قصہ ایک جزو ہے۔ یہ ضرور زنجانی کی تصنیف ہے۔" رسائل اخوان الصفا" کے متعلق ان دو آراء کی تطبیق مسٹر اسٹرن اس طرح کرتے ہیں کہ "المنطقی" کا دوسرے مصنفین کے ہوتے ہوئے خصوصی طور پر" المقدسی" کا نام لینا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ شخصی طور پر المقدسی سے واقف تھے۔ یہ واقعہ ہے کہ توحیدی کم از کم رسائل کے مصنفین میں سے ایک سے ملے۔ نیز وہ رسائل کی عبارتوں سے خود واقف تھے۔[1] (انگریزی سے ترجمہ)

ابو سلیمان المنطقی نے علوم میں کئی اکتشافات کیے۔ دائرۃ المعارف افغانستان کا بیان ہے:-

وابو سلیمان سنجزی نزدیک ہشت قرن پیش از نیوٹن قانون جاذبہ خورشید را کشف واعلام کرد۔ حیث قال: منزلۃ الکواکب من الشمس منزلۃ الحدید من حجر المغناطیس[2]

اور ابو سلیمان سنجزی (سجستانی) تقریباً نیوٹن سے آٹھ سو سال پہلے قانون کشش شمسی کا اکتشاف کیا تھا۔ اس نے دعویٰ کیا ہے کہ ستاروں کو آفتاب سے وہی نسبت ہے جو لوہے کو مقناطیس سے ہے۔

---

[1] "اسلامک لٹریچر" مارچ ۱۹۵۰ء

[2] دائرۃ المعارف۔ افغانستان ص ۹۸۸

ابوسلیمان کو علم نجوم میں بھی بہت مہارت تھی۔ ابوحیان نے اپنی کتاب "المقابسات" میں لکھا ہے کہ ابوسلیمان المنطقی نے اسے اپنا یہ واقعہ سنایا:۔

"ہمارے (سجستان کے) پڑوس میں ابن نباتہ پیدا ہوا۔ مجھے اس کا زائچہ نکالنے کے لیے بلایا گیا میں نے زائچہ نکال کر بتایا کہ یہ شخص جھوٹا بنے گا۔ چنانچہ یہ لڑکا جوان ہو کر شاعر ہوا"

ابن ابی اصیبعہ المتوفی (۶۶۸ھ) نے اپنی کتاب طبقات میں لکھا ہے کہ ابوسلیمان السجستانی المنطقی حکیم اور فیلسوف ہونے کے علاوہ اچھے شاعر بھی تھے۔ حسب ذیل اشعار کو انہوں نے ابوسلیمان کی طرف منسوب کیا ہے۔[1]

لا تحسدن علی تظاھر نعمة	شخصا تبیت لہ المنون بمرصد
أولیس بعد بلوغہ آمالہ	یفضی الیٰ عدم کان لم یوجد
لوکنت أحسد ما تجاوز خاطری	حسد النجوم علیٰ بقاء سرمد

ترجمہ: کسی کے ظاہری عیش وعشرت پر حسد نہ کرو۔ کیونکہ موت ہر وقت اس کی گھات میں رہتی ہے۔ کیا ایسا نہیں ہے کہ وہ اپنی تمناؤں تک پہنچنے کے بعد اس طرح نیستی تک پہنچایا جاتا ہے جیسا کہ وہ کبھی تھا ہی نہیں۔

اگر میں اپنی دل میں ہر آنے والی چیز پر حسد کرتا تو ستارے بھی دائمی بقا پر حسد کرتے۔

الجوع یدفع بالرغیف الیابس	فعلام اکثر حسرتی ووساوی
والموت انصف حین ساوی حکمہ	بین الخلیفة والفقیر البائس

ترجمہ: ایک سوکھی روٹی سے بھوک دور ہو سکتی ہے، تو پھر میں زیادہ حسرت اور افسوس کیوں کروں۔ موت سب سے زیادہ انصاف کرنے والی ہے۔ اس کا حکم ایک خلیفہ اور ایک بدحال فقیر کے لیے ایک جیسا ہے۔

---

[1] عیون الانباء فی طبقات الاطباء (ص ۳۲۰)

لذة العیش فی بهجة ال ... لذة لاما یقوله الفلسفی

حکم کاس المنون ان یتساوی ... فی حساها الغبی والالمعی

ویحل البلید تحت ثری الار ... ض کما حل تحتها اللوذعی

ترجمہ: زندگی کا لطف تو لذت کی تروتازگی میں ہے، نہ اس میں جسے فیلسوف کہتا ہے۔

موت کے پیالے کے حکم کے سامنے ایک عالم اور کند ذہن دونوں برابر ہیں۔

مٹی کے نیچے جس طرح کند ذہن جاتا ہے اسی طرح ایک ذہین عقل مند بھی۔

ابوسلیمان السجستانی کے مشہور شاگرد ابوحیان التوحیدی نے ان اشعار کی، اپنے استاد کی طرف نسبت سے انکار کیا ہے۔ ان کے خیال میں یہ اشعار ابوالحسن علی بن محمد البدیہی کے ہیں[1] لیکن ابوسلیمان السجستانی کی شاعری سے ان کو بھی اختلاف نہیں ہے۔ انہوں نے حسب ذیل اشعار کو اپنے استاد کی طرف منسوب کیا ہے۔[2]

انی عزوف عمن یخوننی ... ومعطی قیادی للحبیب المؤالف

اشاطره روحی ومالی واتقی ... حذاراً علیه من ریاح العواصف

فان خان عهدی لم اخنه وان ... اکن علی ما اری من عذره لموافق

واترک عقباه لعقبی فعاله ... ففی عقب الایام کل التناصف

ترجمہ: جو مجھ سے خیانت کرتا ہے میں اس سے دور رہتا ہوں۔ اور مونس و غمخوار دوست کی ہر طرح اطاعت کرتا ہوں۔

اس پر اپنی جان اور مال قربان کرتا ہوں۔ اور ڈرتا رہتا ہوں کہ وہ کہیں زمانے کی سخت ہواؤں کی زد میں نہ آجائے۔

---

[1] مجلة الدراسات الادبیه - عدد ۳ - سنه ۲

[2] المقابسات ص ۲۹۸ - بحواله الدراسات الادبیه۔

اگر وہ وعدہ خلافی کرتا ہے تو میں نہیں کرتا ہوں۔ اگرچہ کئی بار اس کی وعدہ خلافی کا مشاہدہ کرتا ہوں۔
اس کے انجام کو اس کے اعمال کے انجام پر چھوڑتا ہوں۔ ایام کے آخر میں سارا انصاف ہے۔

بکیت علی مفارقۃ الشباب — وایام البطالۃ والتصابی
وایام التغازل والدلال — وایام التجنی والعتاب
مضت فکانما لما تولت — معقبۃ نقیبا بالعقاب
لیبلی کل ملبوس جدید — وتمزج کل معسول بصاب
بیاض المشیب اعلام المنایا — نشون نذیرۃ لک بالذہاب
ہو الکفن الذی یبلی وشیکا — ویاتی بعدہ کفن التراب

ترجمہ: میں جوانی اور بے فکری اور شوق و محبت کے دنوں کی جدائی پر بہت رویا۔
وہ عشق و عاشقی، ناز و ادا، لطف اندوز ہونے اور گلے شکووں کے دن تھے۔
وہ دن گزر گئے اور ایسے گزرے کہ اپنے بعد خمیازہ اور سزا کا اعلان کرنے لگے۔
بے شک ہر نیا لباس بوسیدہ ہو جاتا ہے اور ہر میٹھی چیز میں تلخ چیز مل جاتی ہے۔
بالوں کی سفیدی گویا موت کی جھنڈیاں ہیں، جو تمہیں یہ بتانے کے لیے لہرائی جاتی ہیں کہ اب تمہیں چلنا ہے۔
کفن جلد ہی بوسیدہ ہو جائے گا اور اس کے بعد تمہارا مٹی ہی کفن ہوگا۔

ابو سلیمان السجستانی کی حسب ذیل تصانیف کا ذکر کتابوں میں ملتا ہے:-

(۱) صوان الحکمۃ (۲) مقالۃ فی مراتب قوی الانسان (۳) کیفیۃ الانذارات التی تنذر بھا النفس مما یحدث فی عالم الکون (۴) رسالۃ فی اقتصاص طرق الفضائل۔ (۵) رسائل الی عضد الدولۃ (۶) مسائل عدۃ (اسئلہ واجوبۃ) (۶) کلام فی المنطق (۷) تعالیق حکمیۃ (۸) رسالۃ فی المحرک الاول (۹) رسالۃ فی ان الاجرام العلویۃ طبیعتھا طبیعۃ ثانویۃ (۱۰) مقالۃ بکمال الخاص بنوع الانسان ؛

مولانا محمد قاسم نانوتوی رح

عبدالوحید صدیقی [1]

اُنیسویں صدی میں برصغیر پاک وہند نے بعض بڑی بڑی علمی و مذہبی شخصیات اور فکری و تعلیمی تحریکات کو جنم دیا۔ یہ وہ صدی ہے جس میں برصغیر مکمل طور پر برطانوی تسلط میں آگیا جس کے نتیجے میں یورپ کی جدید تہذیب کے اثرات زندگی کے ہر شعبے میں محسوس کیے جانے لگے۔ ان اثرات میں سے بعض کو بغیر کسی حتمی مزاحمت کے تسلیم کر لیا گیا لیکن بعض ایسے بھی تھے جو یہاں کے مذہبی طبقے کو کانٹے کی طرح چبھنے لگے۔ سب سے بڑی چیز جس نے یہاں کی مسلم آبادی کو برافروختہ کیا، وہ ایک غیر قوم کا سیاسی تسلط اور مذہبی غلبہ تھا۔ اگرچہ یہ کوئی ایسی اَن ہونی بات نہ تھی اور اس کے اسباب و علل اُن سیاسی، معاشی و معاشرتی حالات میں موجود تھے جو اورنگ زیب عالمگیر کے دَور کے بعد اس سرزمین میں آہستہ آہستہ ظہور پذیر ہو رہے تھے اور جن کی طرف شاہ ولی اللہ نے اپنی کتابوں میں اشارات کیے ہیں۔

برطانوی تسلط سے نجات حاصل کرنے کے لیے انیسویں صدی کے نصف اول میں مختلف تحریکوں نے جنم لیا۔ اس سلسلے میں مختلف سیاسی، مذہبی اور علمی طریقوں کو آزمایا گیا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں انگریز کا کھلم کھلا مقابلہ کیا گیا لیکن چونکہ اصل سماجی، معاشی، سیاسی اور مذہبی کمزوریوں کی طرف توجہ مبذول نہ کی گئی لہٰذا یہ ساری کوششیں ناکام ہوئیں۔ البتہ انیسویں صدی کے نصف ثانی میں کچھ ایسی ہستیاں پیدا ہوئیں جو زوال اور

---

[1] الوحید صدیقی صاحب ایم۔ اے۔ استاد سندھ یونیورسٹی، شعبۂ اسلامی کلچر و تقابلِ ادیان

ناکامی کے اصل اسباب کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگیں۔ انہوں نے خود اپنے حالات و مسائل سے واقفیت پیدا کرنے کے علاوہ یورپ کے علم، فلسفہ، فن اور تہذیب سے بھی استفادہ کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ چنانچہ انہی ہستیوں کی کوششیں دیرپا ثابت ہوئیں اور انہی کی وجہ سے ہندوستانی مسلمانوں میں علمی و فکری ارتقاء کے ساتھ ساتھ سیاسی و معاشرتی شعور بھی پیدا ہوا، بقول شیخ محمد اکرام کے :۔

"تیرھویں صدی ہجری ہندوستانی مسلمانوں کے لیے اہم کش مکش کی حامل تھی۔ ان کے سیاسی تنزل کی تکمیل اسی صدی میں ہوئی۔ لیکن ان کے مذہبی احیاء اور معاشرتی اصلاح کے آغاز کا زمانہ بھی یہی تھا"

تیرھویں صدی ہجری کی ان علمی و مذہبی ہستیوں نے الگ الگ طریقوں سے دین و ملت کے احیاء اور سیاسی قیادت کی تجدید کی کوششیں کیں گو ان سب کا مقصد واحد تھا، لیکن طریقہائے کار مختلف تھے۔ سید احمد بریلوی، شاہ اسمٰعیل شہید، مولانا عبدالحی، مولانا نصیر الدین منگلوری اور مولوی نصیر الدین دہلوی وغیرہ رحمتہ اللہ علیہم نے ۱۸۲۶ء سے ۱۸۳۹ء تک سلسلۂ جہاد جاری رکھا لیکن کامیابی نہ ہو سکی اور ان میں سے اکثر حضرات کو جامِ شہادت نوش کرنا پڑا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں جن حضرات نے حصہ لیا ان کا ذکر اس مضمون کے مقصد سے خارج ہے۔ ان حضرات میں سے مولانا محمد قاسم نانوتوی بھی ایک تھے۔ اس جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد کچھ اہلِ بصیرت نے مسلمانوں کی خالص دینی تعلیم اور ان میں جو بدعات پھیلی ہوئی تھیں۔ ان کے استیصال کی طرف توجہ کی۔ جن میں ہمیں مولانا نانوتوی پیش پیش نظر آتے ہیں اسی زمانے میں مسیحی و آریہ سماجی مشنریوں کی طرف سے اسلام پر جو اعتراضات کی بوچھاڑ ہو رہی تھی اور جس کی وجہ سے مسلمانوں کا جدید ذہن کم از کم تشکیک کی سرحد تک پہنچ جاتا تھا۔ اس کی روک تھام کے لیے ڈاکٹر وزیر خاں، مولانا رحمت اللہ کیرانوی، مولوی آلِ حسن اور مولوی سید ناصر الدین کے ساتھ ساتھ مولانا نانوتوی نے بھی تقریری مناظروں اور تحریری جوابات کا سلسلہ شروع کیا اور اس طرح ہمارے ہاں جدید علمِ کلام کی بنیاد رکھی گئی۔

جدید یورپی فلسفہ حصولِ علم کے استخراجی طرق سے زیادہ استقرائی و تجرباتی طریقوں کو بروئے کار لاتا ہے اور یہی جدید سائنس اور علم کی بنیاد ہے۔ لارڈ میکالے کی ۱۸۳۴ء کی تعلیمی رپورٹ کے بعد پرانے مدارس

سے زیادہ جدید اسکولوں اور کالجوں کی طرف توجہ دی جانے لگی۔ جن میں مدلل طور پر استقرا اور تجربات و مشاہدات کو فوقیت دی جاتی تھی۔ مولانا نانوتوی نے اس امر کو محسوس کرتے ہوئے اپنی مناظروں کی تقریروں اور تصنیفات میں استخراج سے زیادہ تمثیلات، محسوسات، تجربات اور مشاہدات کو اساسی استدلال بنایا۔ اور اس طرح مولانا قاری طیّب کے الفاظ میں:-

"اثباتِ مذہب حق کے لیے فلسفیانہ علوم اور ایک نئی اور اچھوتی حکمت کی بنیاد ڈالی، جس میں عقلی ہی نہیں حسّی انداز میں اصول و فروعِ اسلام کو مضبوط اور مدلل طریق پر پیش کیا گیا اور فکر و نظر کو اسی انداز میں ڈھال دینے کا عمومی راستہ ہموار کردیا گیا۔"[1]

آپ کا یہ طرزِ فکر، نیز مدرسہ دیوبند جیسے عظیم الشان تعلیمی و روایتی مرکز کی تاسیس، آپ کے ایسے کام ہیں، جن کی بدولت آپ کو سرزمینِ ہند کے مسلمانوں کے دلوں میں بہت بڑا مقام حاصل ہے بقول مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم کے:-

"آپ چودھویں صدی ہجری کے مجدّدین میں سے تھے اور آپ نے ولی اللّٰہی حکمت و معارف کو اہلِ ہند کے لئے زمانۂ حاضر کے لباس میں پیش کیا۔"

مولانا نانوتوی کی ان علمی، فکری، سیاسی اور مذہبی کوششوں کی تفصیل اور اس سلسلے میں ان کے ذہنی ارتقا پر بحث کرنے سے قبل ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کی زندگی کا ایک مختصر سا خاکہ ناظرین کے سامنے پیش کردیا جائے۔

مولانا محمد قاسم نانوتوی ضلع سہارن پور یوپی کے ایک چھوٹے سے تاریخی قصبہ نانوتہ میں ۱۲۴۸ھ (۱۸۳۲ء) میں پیدا ہوئے۔ یہ قصبہ دہلی سے شمال کی جانب تقریباً ایک سو میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ مولانا محمد قاسم کا سلسلۂ نسب حضرت قاسم بن محمد بن ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔ اس خاندان کے ایک بزرگ مولوی محمد ہاشم کو شاہ جہان بادشاہ کا تقرب حاصل تھا۔ بادشاہ نے آپ کو نانوتہ کے

---

[1] سوانح قاسمی از مناظر احسن گیلانی۔ مقدمۂ کتاب از قاری طیّب۔ دیوبند صد ۶ ۔

اطراف میں چند دیہات جاگیر میں دیے۔ آپ نے نانوتہ کو اپنا مستقل مسکن بنایا۔ اور ان کے بعد ان کا خاندان یہاں رہنے لگا۔

آپ کے والد شیخ اسد علی صدیقی اگرچہ فارسی کے مشہور شاعر فردوسی کے شاہنامہ تک پڑھے ہوئے تھے لیکن علم سے انہیں کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ ان کی ساری عمر کھیتی باڑی میں گزری [۱] البتہ آپ کے دوسرے عزیزوں میں کچھ ایسے لوگ ضرور تھے جو علوم مروجہ سے کماحقہٗ واقف تھے۔ ان میں آپ کے چچا [۲] مولانا مملوک علی کو یہ فخر حاصل ہے کہ وہ انیسویں صدی کے نصف آخر کے کئی مشہور علماء مثلاً ذکاء اللہ، نذیر احمد، سرسید احمد خاں، عبدالرحمٰن پانی پتی، احمد علی سہارن پوری، محمد مظہر نانوتوی، رشید احمد گنگوہی اور محمد یعقوب نانوتوی کے استاد تھے [۳] ان کی علمی لیاقت کے متعلق سرسید احمد خاں لکھتے ہیں:۔

"جناب مولوی مملوک علی شاگرد مولوی رشید الدین خاں معقول و منقول میں استعداد کامل اور کتب درسیہ کا ایسا استحضار ہے کہ فرض کرو کہ ان کتابوں سے گنجینۂ عالم خالی ہو جائے تو ان کی نقل ممکن ہے۔"

مولانا محمد قاسم نانوتوی بچپن سے ہی علمی رجحانات رکھتے تھے۔ آپ کے عربی کے سب سے پہلے استاد اور شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے تایا مولانا مہتاب علی نے ظریفانہ طور پر آپ کا نام "علم کی بکری" تجویز کیا تھا [۴] آپ بڑے ذہین، طباع، بلند ہمت، تیز و وسیع الحوصلہ، جفاکش، جری، چست اور چالاک تھے [۵] ابتدائی تعلیم نانوتہ میں حاصل کرنے کے بعد آپ نے دیوبند میں مولانا مہتاب علی کے مکتب میں عربی پڑھنی شروع کی۔ بعد ازاں آپ سہارن پور میں اپنے نانا کے پاس چلے گئے جو یہاں وکالت کرتے تھے اور نہایت

---

[۱] محمد یعقوب نانوتوی "سیدنا الامام الکبیر" ص ۲ - ۳

[۲] مولانا عبید اللہ سندھی کے بیان کردہ رشتہ کے مطابق مولانا نانوتوی، مولانا مملوک علی کے بھتیجے تھے۔ (موج کوثر ۱۹۰)

[۳] عبید اللہ سندھی، شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک۔ ص ۲۱۶

[۴] عزیز الرحمٰن قاسمی، مولانا نانوتوی کی تعلیمی زندگی۔ ماہنامہ دارالعلوم دیوبند۔ نومبر ۱۹۵۹ء

[۵] سیدنا الامام الکبیر ص ۲۶ از مولانا محمد یعقوب۔

عزت و احترام سے زندگی بسر کرتے تھے۔ وہاں مولانا محمد قاسم کو علمی و ادبی ماحول میسر آیا۔ آپ کے نانا فارسی ادب میں اچھی مہارت رکھنے کے علاوہ اردو کے شاعر بھی تھے۔ سہارن پور میں آپ کو مولوی محمد نواز کے سپرد کیا گیا اور ان کے پاس آپ نے کافیہ تک کتب پڑھیں۔ اس کے بعد آپ کو کوئی ایک سال تک دینی تعلیم چھوڑنی پڑی، کیونکہ سہارن پور میں ہولناک وبائی بخار پھیل گیا جس میں آپ کے نانا کا انتقال ہو گیا اور مجبوراً آپ کو سہارن پور کی رہائش ترک کرنی پڑی۔

اتفاق سے ۱۲۵۹ھ میں مولانا مملوک علی صاحب اپنے عزیزوں سے ملنے کے لیے نانوتہ آئے۔ اس وقت موصوف دلی کے مشہور اینگلو عربک کالج میں پروفیسر تھے۔ آپ نے مولانا نانوتوی کی ذہانت اور علمی استعداد کو دیکھ کر یہ فیصلہ کیا کہ وہ آپ کو اپنے ساتھ دہلی لے جائیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ مولانا نانوتوی کی اصل تعلیم و تربیت کا زمانہ یہاں سے شروع ہوتا ہے۔

دہلی میں آپ نے سب سے پہلے مولانا مملوک علی سے کافیہ پڑھنا شروع کیا۔ ایک سال بعد مولانا رشید احمد گنگوہی بھی مولانا مملوک علی کے یہاں بحیثیت ایک طالب علم کے آئے اور جلد ہی مولانا نانوتوی کے ہم سبق ہو گئے[1] یہاں ان دونوں بزرگوں کی نہ صرف ظاہری تعلیم ہوئی بلکہ انہیں ۱۸۵۷ء کے اس محاربۂ آزادی کے لیے بھی تیار کیا گیا۔ جس میں کہ تحریک ولی اللّٰہی کے قائدین کو حصہ لینا تھا۔ بات یہ ہے جیسا کہ مولانا عبید اللہ سندھی نے لکھا ہے کہ ان کے استاد مولانا مملوک علی ایک باکمال استاد ہونے کے علاوہ ۱۸۴۱ء سے ۱۸۴۶ء تک تحریکِ ولی اللّٰہی کے دورِ ثانی کے امام اور مولانا محمد اسحاق کے نائب بھی تھے۔ ظاہراً وہ انگریزی حکومت کے ملازم تھے لیکن فی الحقیقت وہ شاہ ولی اللہ کی اس دینی، علمی، سیاسی و سماجی تحریک کے کارکنوں میں تھے جسے ایک سو برس قبل شاہ صاحب احیائے ملت کے لیے وجود میں لائے تھے۔

ظاہری تعلیم کے سلسلہ میں مولانا محمد قاسم نانوتوی نے اکثر درسی کتب مولانا مملوک علی سے پڑھیں۔ آپ کا معقولات کی طرف خاص رجحان تھا۔ معقول کی مشکل سے مشکل کتابوں کو پڑھنے اور سمجھنے میں انہیں

---

[1] مولانا نانوتوی کی تعلیمی زندگی (ماہنامہ دارالعلوم دیوبند)

انہیں کوئی وقت نہیں ہوتی تھی۔ میر زاہد، قاضی، صدرا، شمس بازغہ وغیرہ اس طرح پڑھتے تھے جیسے حافظ قرآن منزل سناتا ہے[1] دوسرے طالب علموں کی طرح آپ ان کتب کا ترجمہ نہیں کرتے تھے ورنہ سبق پڑھنے سے پہلے مطالعہ کرتے تھے بلکہ ایسا پڑھتے تھے جیسے تلاوت ہو رہی ہے[2]

علوم مروجہ کی تقریباً سب کتب ختم کرنے کے بعد مولانا نانوتوی نے شاہ عبدالغنی اور مولانا احمد علی سہارن پوری سے حدیث پڑھی۔ معقولات کی طرح منقولات میں بھی آپ دوسرے طلبائے سے ممتاز تھے حدیث پڑھتے وقت بالعموم آپ یہ سوچا کرتے تھے کہ یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیوں فرمائی[3]

درس نظامی سے فراغت کے بعد آپ کچھ عرصہ تک دہلی کے اینگلو عربک کالج میں پڑھتے رہے اور اس سلسلے میں آپ نے حساب، اقلیدس وغیرہ میں اپنی غیر معمولی قابلیت دکھائی لیکن آپ کالج کے امتحان میں شریک نہ ہوئے۔

اس زمانے میں مولانا احمد علی محدث سہارن پوری حدیث کی قلمی کتب کی تصحیح، تحشیہ اور اشاعت میں مصروف تھے۔ مولانا نانوتوی نے ان کے یہاں ملازمت کر لی اور اس دوران میں صحیح بخاری کے آخری پانچ اجزاء پر حاشیہ لکھا۔ ان اجزاء کے وہ مقامات خاص طور پر مشکل تھے جن میں امام بخاری نے امام ابوحنیفہ پر اعتراضات کیے ہیں۔ مولانا نانوتوی نے ان اجزاء کی تصحیح و تحشیہ میں غیر معمولی کاوش سے کام لیا[4] حنفی مذہب کی تائید میں مستند دلائل دئے[5]

اس زمانے میں مختلف چھاپہ خانوں میں دینی کتابوں کی تصحیح و تحشیہ کا کام آپ کا ذریعۂ معاش تھا۔

---

[1] سیدنا الامام الکبیر

[2] مولانا تھانوی قصص الاکابر ص۲۹ ۔ الھادی جمادی الثانی ۱۳۵۷ھ

[3] مولانا اشرف علی تھانوی ۔ الھادی جمادی الثانی ۱۳۵۷ھ

[4] اعجاز الحق قدوسی، شیخ عبدالقدوس گنگوہی اور ان کی تعلیمات ص۵۶۳

[5] الامام الکبیر۔

یہ بھی گویا ایک طرح سے ان کا حصولِ علم ہی کا زمانہ تھا۔ دورۂ حدیث کے اثنا میں ہی مولانا نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی نے مل کر حاجی امداد اللہ مہاجر مکی سے بیعت کر لی تھی۔ آپ نے کچھ عرصہ شیخ کی خدمت میں رہ کر منازلِ سلوک طے کیں۔ اس دوران میں آپ نے وعظ و فتویٰ سے الگ رہ کر زیادہ وقت ذکر اور مراقبہ میں گزارا اور بڑی سادگی اور تقشف سے زندگی بسر کی۔ بالآخر حاجی صاحب نے یہ کہتے ہوئے آپ کو خلافت سے سرفراز فرمایا ——— "قاسم کے زہد و تقویٰ کی مثال پہلے زمانے میں ملے تو ملے لیکن ہمیں اس زمانے میں نہیں ملتی۔"

شیخ مظفر حسین کاندھلوی کے اصرار پر آپ نے منبر سے پہلی بار وعظ فرمایا اور پھر رفتہ رفتہ آپ کو وعظ میں کمال حاصل ہو گیا۔ یہاں تک کہ کچھ لوگ یہ کہنے لگ گئے کہ مولانا کی خوش بیانی اور پُرگوئی یا تو وعظ میں ہوتی ہے یا سبق پڑھانے میں۔ باقی آپ کی معمولی گفتگو قصباتی ہے۔[۵۱]

وعظ پر اس قدر قدرت ہونے کے باوجود آپ عام طور پر وعظ نہ کہتے تھے۔ ایک دفعہ کسی نے اصرار کیا تو فرمایا ——— "وعظ ہم لوگوں کا کام نہیں اور نہ ہمارا وعظ کچھ مؤثر ہو سکتا ہے۔ وعظ کا کام تھا مولانا اسمٰعیل شہید کا اور انہی کا وعظ مؤثر بھی تھا۔"[۵۲]

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں مولانا نانوتوی کے حصہ لینے کے متعلق اختلافِ آراء ہے۔ آپ کے سب سے قریبی رشتہ دار اور دوست مولانا محمد یعقوب ولد مولانا مملوک علی کے بیان کے مطابق آپ فسادوں سے کوسوں دُور تھے۔[۵۳] یہ آپ کے دشمنوں کی پھیلائی ہوئی بات تھی کہ آپ تھانہ بھون اور شاملی کے فساد میں شریک تھے۔ اسی بنا پر آپ کچھ عرصے تک رُوپوش رہے۔ پھر پنجاب اور سندھ ہوتے ہوتے کراچی سے حج کرنے چلے گئے۔

---

۵۱ مولانا تھانوی، حکایاتِ اولیاء۔ لاہور، ۱۹۵۷ء ص ۲۲۹

۵۲ مولانا تھانوی، حکایاتِ اولیاء، ص ۲۲۷

۵۳ سیدنا الامام الکبیر، از مولانا محمد یعقوب

مولانا عبیداللہ سندھی اور مولانا محمد میاں ناظم جمعیت علمائے ہند نے اس سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے اس سے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں آپ کی شرکت کی نوعیت کی وضاحت ہوتی ہے۔ مولانا سندھی کی تحقیق یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء سے تقریباً ۱۶ سال قبل ہندوستان کے حالات کو ناسازگار پاکر مولانا محمد اسحاق نے تحریک ولی اللہی کا مرکز دہلی سے مکہ معظمہ منتقل کر دیا۔ اور دہلی میں ایک نمائندہ بورڈ مقرر کیا۔ جو ہندوستان میں ان کی نیابت کرتا تھا۔ اس بورڈ کے صدر مولانا مملوک علی صاحب تھے ان کے بعد اس کی صدارت حاجی امداد اللہ صاحب کے سپرد کی گئی۔ مولانا نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی بھی اس جماعت میں شامل تھے۔ اس جماعت کا براہِ راست ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی سے کوئی تعلق نہ تھا۔ لیکن چونکہ جنگِ آزادی شروع ہو گئی تھی اس لیے قدرتاً اس ولی اللہی جماعت کو یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ آیا وہ اس محاربہ میں شریک ہو یا اس سے بے تعلق رہے۔ چنانچہ یہ فیصلہ کرنے کے لیے جماعت کے سرآوردہ حضرات کا اجتماع ہُوا اور اس میں یہ طے پایا کہ بجائے "فسادیوں" کے ساتھ شامل ہونے کے یہ جماعت الگ سے جہاد کرے۔ اس سلسلے میں حاجی امداد اللہ صاحب امیر مقرر کیے گیے اور مولانا نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، حافظ ضامنؒ اور مولانا محمد منیر وغیرہ کو دوسرے انتظامات دیئے گیے۔ اس جماعت کا بڑی آسانی سے تھانہ بھون پر قبضہ ہو گیا۔ وہاں سے شاملی کی طرف کوچ کیا گیا۔ ان کا نصب العین دہلی تھا۔[۱] راستہ میں کئی مقامات پر معرکے ہوئے۔ مولانا نانوتوی کے متعلق حضرت حاجی صاحب نے مولانا محمد منیر صاحب سے کہا:-

"محمد قاسم بالکل آزاد اور جری ہیں۔ ہر صف میں بے محابا گھس جاتے ہیں۔"[۲] مولانا عاشق علی کے بیان کے مطابق ایک مرتبہ حضرت حاجی صاحب، مولانا گنگوہی، مولانا نانوتوی اور حافظ ضامن صاحب کا مقابلہ بندوقچیوں سے ہو گیا۔ پھر کیا تھا:-

"یہ نبرد آزما جتھا اپنی سرکار کے مخالف باغیوں کے سامنے سے بھاگنے یا ہٹ

---

[۱] مناظر احسن گیلانی، سوانح قاسمی ج ۲ ص ۱۲۹۔

[۲] " " " " ص ۱۳۷ — ۱۴۱؎

جانے والا نہ تھا۔ اس لیے اٹل پہاڑ کی طرح پرا جماکر ڈٹ گیا اور سرکار پر جان نثاری کیلئے تیار ہوگیا۔ اللہ رے شجاعت و جوانمردی کہ جس ہولناک منظر سے شیر کا پتا پانی اور بہادر سے بہادر کا زہرہ آب ہوجائے وہاں چند فقیر ہاتھوں میں تلواریں لیے جم غفیر بندوقچیوں کے سامنے ایسے جمے رہے گویا زمین نے پاؤں پکڑ لیے ہیں۔ چنانچہ آپ پر فائر ہوئے اور حضرت حافظ ضامن زیرِ ناف گولی کھا کر شہید بھی ہوئے۔" [1]

اِن معرکوں کے بعد شاملی پر ۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کو مجاہدین کا قبضہ ہوگیا[2]۔ لیکن انہی دنوں انگریزوں نے دہلی فتح کرلی اور جنگِ آزادی کا مرکز ان کے ہاتھ آگیا۔ اس سے لوگوں کی ہمتیں پست ہوگئیں اور سب اپنے اپنے گھروں کو واپس چلے گئے۔ دہلی فتح کرنے کے بعد انگریزی فوجیں تھانہ بھون کی طرف بڑھیں باوجود اس کے کہ مجاہدین بڑی بہادری سے لڑے، لیکن بالآخر شکست کھائی۔ حاجی امداد اللہ، مولانا عبدالغنی اور مولانا رحمت اللہ کیرانوی تو بچ کر نکل گئے اور بسلامت مکہ معظمہ پہنچ گئے۔ لیکن مولانا نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی ہندوستان ہی میں رہے۔

اوپر کے اس بیان سے واضح ہوتا ہے کہ جہاں تک اس فتنہ و فساد کا تعلق ہے جو ۱۸۵۷ء کے محاربۂ آزادی کے سلسلے میں ہوا، یہ بزرگ اس سے بے تعلق رہے۔ اور اس کو انہوں نے اچھا نہیں سمجھا لیکن وہ اس موقع پر انگریزوں کے خلاف لڑے ضرور، اور خود اپنی کمان بنا کر لڑے۔ گویا وہ "فسادیوں" کے ساتھ شریک نہیں تھے لیکن جنگِ آزادی میں انہوں نے اپنا فرض لازماً ادا کیا۔ انہوں نے جہاد کیا اور جہاد فساد نہیں ہوتا بلکہ قاطع فساد ہوتا ہے۔[3]

۱۸۵۷ء کے ہنگاموں کے فرو ہونے کے بعد مولانا محمد قاسم کے نام وارنٹ جاری کیے گئے اور ان کی

---

[1] تذکرۃ الرشید ج ۱ ص ۷۴

[2] سر سید احمد خاں۔ لائل محمڈنس آف انڈیا۔

[3] علمائے ہند کا شاندار ماضی ——— از سید محمد میاں

گرفتاری کے لیے انعام کا اعلان بھی ہوا۔ اس پر آپ روپوش ہو گئے اور دو سال تک گاؤں گاؤں اور شہر شہر پھرتے رہے اور گرفتار نہیں ہوتے۔ اس اثنا میں حاجی امداد اللہ صاحب مکہ معظمہ پہنچ چکے تھے۔ مولانا نانوتوی نے بھی مکہ معظمہ کا قصد فرمایا۔ وہ پنجاب سے ہوتے ہوئے سندھ پہنچے اور وہاں سے ۱۲۷۷ھ (۱۸۶۰ء) کو جہاز میں بیٹھ کر حجاز مقدس کو روانہ ہوئے۔ آپ نے ایک سال حجاز مقدس میں گزارا پھر واپس وطن لوٹے[1] اور دہلی میں منشی ممتاز علی کے مطبع مجتبائی میں ملازمت کر لی[2] اس کے ساتھ ساتھ ان کی یہ کوشش بھی جاری رہی کہ کسی طرح شاہ محمد اسحاق کے اس کام کو جسے وہ حجاز جاتے ہوتے ایک نمائندہ بورڈ کے سپرد کر گئے تھے، شروع کر سکیں، یعنی امام عبدالعزیز کے مدرسۂ دہلی کے نمونے پر ایک مدرسہ قائم ہو جو آگے چل کر ولی اللّٰہی تحریک کا مرکز بن سکے۔

ولی اللّٰہی تحریک کے قائدین نے مناسب سمجھا کہ مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد منیر اور مولانا محمد مظہر ہندوستان میں رہ کر تحریک کو نئے سرے سے ایسے انداز میں شروع کریں کہ حکومتِ برطانیہ کو اس پر کسی قسم کا شک وشبہ نہ ہو۔ چنانچہ اس کی بہترین صورت یہی تھی کہ ملک کے اندر دینی مدارس قائم کیے جائیں جہاں سے ایسے علما فارغ التحصیل ہوں جو معاشرتی و دینی اصلاح کے ساتھ ساتھ سیاسی جدوجہد میں بھی حصہ لے سکیں۔ اس مقصد کے پیشِ نظر دارالعلوم دیوبند، جامعہ قاسمیہ، مدرسہ شاہی مرادآباد اور مظاہر العلوم سہارنپور قائم ہوتے اور انہیں سیاسیات سے علیحدہ رکھنے کا اعلان کیا گیا۔

دارالعلوم دیوبند کی ابتدا ۱۵ محرم ۱۲۸۲ھ (۳۰ مئی ۱۸۶۷ء) کو دیوبند کی چھتہ کی تاریخی مسجد میں ایک طالب علم محمود (جو آگے چل کر شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے نام سے مشہور ہوئے) اور ایک استاد ملا محمود سے ہوئی[3] یہ نہایت معمولی ابتدا تھی۔ جس کے اصل محرک مولوی فضل الرحمٰن (مولانا شبیر احمد عثمانی کے والد) اور مولوی

---

[1] مولانا محمد یعقوب نانوتوی ——— بیاضِ یعقوبی

[2] " " "

[3] تاریخِ دیوبند از سید محبوب رضوی

ذوالفقار علی تھے۔ مولانا محمد قاسم نے اس مدرسے کو شروع ہی سے اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ اسی سال مولانا مملوک علی کے فرزند مولانا محمد یعقوب نانوتوی نے محکمۂ تعلیم میں اپنی ملازمت سے استعفا دے دیا۔ اور وہ مدرسے کے صدر مدرس مقرر ہوئے۔ پہلے سال کے اختتام تک طلبہ کی تعداد ۷۸ تک پہنچ گئی[1]۔ اس تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا یہاں تک کہ مسجد چھتہ ناکافی ثابت ہوئی اور ۱۸۷۶ء میں دارالعلوم کی موجودہ عمارت کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ اس موقع پر ایک بہت بڑا مجمع تھا، جسے مخاطب کرتے ہوئے مولانا نانوتوی نے فرمایا۔

"عالمِ مثال میں اس مدرسے کی شکل ایک معلق ہانڈی کی مانند ہے۔ جب تک اس کا مدار توکل علی اللہ پر رہے گا، یہ مدرسہ ترقی کرتا رہے گا۔"[2]

مولانا محمد قاسم اگرچہ علم و فضل میں اپنے دور میں یکتائے روزگار تھے، لیکن عام لوگوں میں آپ کی شہرت زیادہ تر اُن مناظروں اور مباحثوں کی وجہ سے ہوئی جو آپ کے اور آریہ سماجیوں اور عیسائیوں کے درمیان ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جس میں اس سرزمین میں انگریزی حکومت کے پاؤں جم چکے تھے اور اس نے ہر فرقے کو جو مذہبی آزادی دی تھی، اس کی وجہ سے عیسائیوں اور آریہ سماجیوں کی طرف سے اسلام پر عام اعتراضات کیے جا رہے تھے اور اس طرح اسلام کے خلاف غیر مسلموں کا تقریری و تحریری محاذ قائم ہو گیا تھا۔

۱۲۹۳ھ کا ذکر ہے۔ ضلع شاہجہان پور کے ایک ذی مقدور اور صاحب جائداد شخص منشی پیارے لال کبیر پنتھی نے عیسائیوں، ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ایک مذہبی مناظرے کا انتظام کیا اور اس کا نام "میلۂ خداشناسی" رکھا۔ اس میلے میں عیسائیوں کی طرف سے پادری نولس اور مسلمانوں کی طرف سے مولانا محمد قاسم اور مولوی سید ابوالمنصور دہلوی شریک ہوئے[3]۔ مولانا محمد قاسم نے ابطالِ تثلیث و شرک اور اثباتِ توحید پر تقریر فرمائی۔ اس ضمن میں اتنے پختہ، موثر اور وزنی دلائل دیے کہ کسی سے ان کا جواب بن نہ پڑا اور مناظرے

---

[1] تاریخ دیوبند ——— از سید محبوب رضوی۔

[2] " " " "

[3] مباحثۂ شاہجہان پور ——— مطبع مجتبائی دہلی ۱۹۱۴ء

کی کامیابی کا سہرا مولانا محمد قاسم کے سر رہا۔ قرب و جوار کے لوگوں میں مولانا کی یہ کامیابی "نیلی لنگی" کی کامیابی کہی گئی اور یہ مناظرہ اس نام سے مشہور ہوا[1]۔ یہ اس لیے کہ مولانا محمد قاسم اس مناظرے میں نیلی لنگی پہنے ہوئے تھے۔

اگلے سال ایک اور مباحثہ ہوا، جس میں ہندوؤں کی طرف سے آریہ سماج کے بانی پنڈت دیانند سرستی اور منشی اندرمن اور عیسائیوں کی طرف سے پادری اسکاٹ، پادری نولس اور پادری واکر وغیرہ شریک ہوئے[2]۔ مولانا محمد قاسم کے علاوہ مولانا محمد علی جو مذہب ہنود پر بڑا عبور رکھتے تھے، مسلمانوں کی اس مباحثہ میں نمائندگی کر رہے تھے۔ ضلع شاہ جہان پور کے منشی پیارے لال کبیر پنتھی بانی میلہ خداشناسی نے اہلِ مباحثہ کے سامنے پانچ سوالات کیے تھے جن کے جوابات مولانا محمد قاسم نے اس قدر مدلل اور مثبت طریقے سے دیئے کہ گزشتہ سال والے مباحثے کا سماں بندھ گیا۔ اور حاضرین مولانا کے علم و فضل پر عش عش کر اٹھے۔ یہ سوالات حسب ذیل تھے :۔

۱۔ دنیا کو خدا نے کس چیز سے بنایا اور کس وقت اور کس واسطے؟

۲۔ خدا کی ذات محیط کُل ہے یا نہیں؟

۳۔ خدا عادل بھی ہے اور رحیم بھی ہے۔ دونوں کس طرح؟

۴۔ وید، بائبل اور قرآن کے کلامِ الٰہی ہونے کی کیا دلیل ہے؟

۵۔ نجات کیا ہے اور وہ کس طرح حاصل ہو سکتی ہے؟[3]

شاہجہان پور کے اس دوسرے میلے کے بعد رڑکی میں آریہ سماجیوں کی طرف سے اسلام کے خلاف ایک بڑا ہنگامہ کھڑا کیا گیا۔ ہوا یہ کہ پنڈت دیانند سرسوتی نے رڑکی پہنچ کر وہاں ایک اجتماع میں برسرِ عام اسلام پر طرح طرح کے فلسفیانہ اعتراضات کیے۔ جب مسلمانوں نے ان کا جواب دینا چاہا اور پنڈت

---

[1] مباحثہ شاہ جہان پور۔ مطبع مجتبائی دہلی ۱۹۱۲ء۔

[2] " " " " "

[3] " " " " "

دیانند سرسوتی سے اس بارے میں مباحثہ کرنے کا کہا تو اس نے جواب دیا کہ میں مولانا محمد قاسم کے سوا کسی سے مباحثہ کرنے کو تیار نہیں۔ ان دنوں مولانا نانوتوی بیمار تھے۔ لیکن اس کے باوجود آپ رڑکی پہنچے، اور پنڈت دیانند سرسوتی کو مباحثہ کرنے کی دعوت دی۔ لیکن وہ ٹال مٹول کرنے لگے اور ایک رات رڑکی سے چپکے سے چلے گئے۔ اس پر مولانا نانوتوی کے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ رہا کہ جس طرح پنڈت دیانند نے برسرِ عام اسلام پر اعتراضات کیے تھے، وہ ان کا اسی طرح برسرِ عام جواب دیں۔ اور اسلام کی حقانیت ثابت کریں۔ چنانچہ مولانا محمد قاسم نے مسلسل تین دن تک رڑکی میں عام جلسے میں تقریر کی۔ اور اس میں پنڈت دیانند کے ایک ایک اعتراض کا جواب دیا۔ پنڈت دیانند نے اسلام پر گیارہ اعتراضات کیے تھے، جن میں ایک اعتراض خانہ کعبہ کی طرف منہ کر کے مسلمانوں کے نماز پڑھنے پر تھا۔ مولانا محمد قاسم نے نہ صرف اپنی تقریر میں اس کا جواب دیا بلکہ اس موضوع پر ایک مستقل کتاب لکھی، جس کا نام "قبلہ نما" ہے۔ باقی کے جو دس اعتراضات تھے۔ ان کا ردّ ایک اور کتاب "انتصار الاسلام" میں کیا۔ اس کتاب میں مولانا نانوتوی نے صرف پنڈت دیانند سرسوتی کے اعتراضات کا جواب نہیں دیا۔ بلکہ سر سید احمد خاں نے فرشتوں، جنوں، شیطان، اور اس قسم کی دوسری ما بعد الطبیعی مخلوقات کی جو تشریحات کی ہیں، ان کا محاکمہ بھی کیا۔

اِن تقریری و تحریری مباحثوں کے علاوہ مولانا محمد قاسم کے اور بھی متعدد رسائل اور کتابیں ہیں جن میں سے مندرجہ ذیل خاص طور پر مشہور ہیں:۔

۱۔ گفتگوئے مذہبی	۲۔ مباحثۂ شاہجہان پور
۳۔ انتصار الاسلام	۴۔ حجۃ الاسلام
۵۔ قبلہ نما	۶۔ تحذیر الناس
۷۔ مناظرہ عجیبہ	۸۔ آبِ حیات
۹۔ قصائد قاسمیہ	۱۰۔ تقریر دلپذیر
۱۱۔ فیوض قاسمیہ	۱۲۔ اسرارِ قرآنی
۱۳۔ دلیلِ محکم	۱۴۔ ھدیۃ الشیعہ

۱۵۔ الحق الصریح فی بیان التراویح ۱۶۔ تصفیۃ العقائد

۱۷۔ تحفہ لحمیہ ۱۸۔ لطائف قاسمیہ

۱۹۔ قاسم العلوم

افسوس ہے مولانا محمد قاسم نے بہت کم عمر پائی۔ ابھی بمشکل پچاس برس کے بھی نہیں تھے کہ داعئ اجل کا بلاوا آگیا۔ اور ۱۲۹۷ھ (۱۸۸۰ء) کو ضیق النفس کی بیماری میں دیوبند میں آپ کا انتقال ہوگیا۔ آپ کی بے وقت موت کا صرف آپ کے عقیدت مندوں اور ہم خیالوں ہی کو سخت صدمہ نہیں ہوا۔ بلکہ جو لوگ آپ سے فکری اعتبار سے اختلاف رکھتے تھے، انھوں نے بھی آپ کا بڑے سوز و گداز سے ماتم کیا۔ اور آپ کی موت کو ایک بہت بڑا نقصان بتایا۔ سچ ہے "الفضل ما شہدت بہ الاعداء" مثال کے طور پر اس حادثے کا ذکر کرتے ہوئے سر سید احمد خاں نے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے ۲۴ راپریل ۱۸۸۰ء کے شمارے میں جو لکھا ہے۔ اسے یہاں درج کیا جاتا ہے :۔

"زمانہ بہتوں کو رو یا ہے اور آئندہ بھی بہتوں کو روئے گا، لیکن ایسے شخص کے لیے رونا جس کے بعد اس کا کوئی جانشین نظر نہ آئے، نہایت رنج و غم اور افسوس کا باعث ہوتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لوگوں کا خیال تھا کہ بعد جناب مولوی اسحاق کے کوئی شخص ان کی مثل ان تمام صفات میں پیدا ہونے والا نہیں ہے۔ مگر مولوی محمد قاسم مرحوم نے اپنی کمال نیکی، دینداری، تقویٰ اور ورع اور مسکینی سے ثابت کر دیا کہ اس دلی کی تعلیم و تربیت کی بدولت مولوی محمد اسحاق صاحب کی مثل ایک اور شخص کو بھی خدا نے پیدا کیا ہے بلکہ چند باتوں میں ان سے زیادہ ہے۔ ۔ ۔ ۔ مسائلِ خلافیہ میں بعض لوگ ان سے ناراض تھے اور بعضوں سے وہ ناراض تھے۔ مگر جہاں تک ہماری سمجھ ہے، ہم مولوی محمد قاسم کے کسی فعل کو خواہ کسی سے ناراضی کا ہو، خواہ کسی سے خوشی کا ہو، کسی طرح ہوائے نفس یا ضد یا عداوت پر محمول نہیں کر سکتے۔ ان کے تمام کام اور افعال جس قدر کہ تھے، بلاشبہ للّٰہیت اور ثواب آخرت کی نظر سے تھے۔"[1]

---

[1] مقالاتِ سر سید حصہ ۷

(قسط نمبر ۲)

میرا سفرِ حجاز

مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی

حضرت مولانا رحمت اللہ نے فتنۂ مسیحیت کے استیصال کی غرض سے جو کتابیں ردِ نصاریٰ میں تالیف کیں۔ وہ حسب ذیل ہیں:۔

(۱) اظہار الحق، خلیفۃ المسلمین سلطان عبد العزیز خاں اور صدر اعظم خیر الدین پاشا تونسی کی تحریک پر پادری فنڈر سے اکبر آباد (آگرہ) میں جو مناظرہ ہوا۔ اس کی مفصل کیفیت اور تمام مسائل کا نہایت بسط و شرح کے ساتھ اس کتاب میں بیان ہے۔ یہ کتاب عربی میں ہے۔ ۱۶ رجب ۱۲۸۰ھ میں قسطنطنیہ میں اس کتاب کی تالیف شروع کی اور آخر ذی الحجہ ۱۲۸۰ھ میں ختم ہوئی۔ ۱۲۸۱ھ میں سب سے پہلے قسطنطنیہ میں چھپی۔ صدر اعظم موصوف کے حکم سے ایک ترک عالم نے اس کا عربی سے ترکی میں ترجمہ کیا۔ اور "ابراز الحق" کے نام سے مکمل ترکی ترجمہ شائع ہوا۔ نیز یورپ کی متعدد زبانوں میں حکومت کی طرف سے اس کے ترجمے شائع کیے گیے جن کو پادریوں نے خاص اہتمام اور کوشش سے تلف کیا۔ مصر میں متعدد بار طبع ہو چکی ہے۔[1] مولوی سلیم اللہ صاحب مرحوم نے اردو میں اس کا ترجمہ کیا تھا جس کے چھپنے کی نوبت نہ آئی۔ مولوی غلام محمد صاحب بہانجار اندیری نے بڑی محنت و جانکاہی سے گجراتی میں ترجمہ کیا جو شائع ہو چکا ہے۔ اظہار الحق کے انگریزی ترجمہ کی اشاعت کے بعد "ٹائمز آف لندن" نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ:۔

---

[1] اس احقر کی ذاتی لائبریری میں اس کتاب کا مصری ایڈیشن موجود ہے۔

"لوگ اگر اس کتاب کو پڑھتے رہیں گے تو دنیا میں مذہب عیسوی کی ترقی بند ہو جائے گی۔"

۲۔ ازالۃ الاوہام ـــــ یہ کتاب ۵۴۴ صفحات پر سید المطابع کوچہ بلاقی بیگم دہلی میں سید قوام الدین صاحب کے زیر اہتمام فارسی میں ۱۲۶۹ھ میں بڑی تقطیع پر چھپی۔ ردِ نصاریٰ کے اکثر مباحث کا اس میں مسکت جواب ہے اس میں پادری فنڈر کی کتاب "میزان الحق" کے اعتراضات کے دنداں شکن جوابات بھی ہیں۔

۳۔ ازالۃ الشکوک ـــــ یہ کتاب عیسائیوں کے انتالیس سوالوں کا جواب ہے۔ ۱۲۶۸ھ مطابق ۱۸۵۴ء میں تصنیف ہوئی اور دو جلدوں میں شائع ہوئی۔

۴۔ اعجاز عیسوی ـــــ اس کتاب میں پوری طرح بائیبل کا غیر معتبر اور محرّف ہونا ثابت کیا گیا ہے۔ یہ کتاب ۱۲۶۹ھ میں آگرہ میں لکھی گئی پہلی بار آگرہ میں اور دوسری مرتبہ مطبع رضوی دہلی میں طبع ہوئی۔ دو سو صفحات پر مشتمل ہے۔

۵۔ احسن الاحادیث فی ابطال التثلیث ـــــ دلائل عقلیہ و نقلیہ سے تثلیث کا ابطال کیا گیا ہے۔ ۱۲۷۱ھ میں تصنیف ہوئی اور مطبع رضوی دہلی میں ۱۲۹۲ء میں چھپی۔

۶۔ بروق لامعہ ـــــ رسول مقبولؐ کی شانِ رسالت کا مدلّل اثبات اور خاتم المرسلین پر ختمِ رسالت کو ثابت کیا گیا ہے۔ غیر مطبوعہ۔

۷۔ البحث الشریف فی اثبات النسخ والتحریف ـــــ ۱۲۷۰ھ میں لکھی گئی۔ ۵۶ صفحات پر فخر المطابع دہلی میں چھپی ہے۔

۸۔ معدل اعوجاج المیزان ـــــ یہ کتاب میزان الحق مؤلفہ پادری فنڈر کا جواب ہے۔

۹۔ تقلیب المطاعن ـــــ یہ کتاب "تحقیق دینِ حق" مؤلفہ پادری لاسمنڈ کا ردّ اور جواب ہے۔ غیر مطبوعہ۔

۱۰۔ معیار التحقیق ـــــ کتاب "تحقیق الایمان" مؤلفہ پادری صفدر علی کا دندان شکن جواب ہے [۱]

پرگنہ کیرانہ و شاملی میں شیوخ اور مسلمان گوجروں کے ہاتھ میں زمینداری تھی جن میں دین داری کے ساتھ جوش بھی تھا۔

---

[۱] مردِ مجاہد صد ۲۵۔

انقلاب ۱۸۵۷ء میں تھانہ بھون اور کیرانہ کا ایک محاذ قائم کیا گیا۔ تھانہ بھون میں حضرت حاجی امداد اللہ صاحب اور مولوی عبدالحکیم صاحب تھانوی معہ رفقاء کے اور نواحِ کیرانہ میں مولانا رحمت اللہ نے گورہ فوج کا مقابلہ کیا۔ عصر کی نماز کے بعد مجاہدین کی تنظیم و تربیت کے لیے کیرانہ کی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر نقارہ کی آواز پر لوگوں کو جمع کیا جاتا اور اعلان ہوتا تھا۔ "ملک خدا کا اور حکم مولوی رحمت اللہ کا"۔ اس جملہ کے بعد جو کچھ کہنا ہوتا تھا، وہ عوام کو سنایا جاتا تھا۔

اس محاذ پر بظاہر شکست کا امکان نہ تھا مگر بعض ابنائے وطن کی زمانہ سازی اور مخبروں کی سازش نے حالات کا رُخ بدل دیا۔ کیرانہ میں گورہ فوج اور توپ خانہ داخل ہوا۔ مولانا رحمت اللہ کی تلاشی ہوئی۔ لیکن مولانا موقع پاتے ہی نکل گئے۔ آپ کو باغی قرار دے کر گرفتاری کے لیے انعام کا بھی اعلان ہوا۔ حضرت مولانا مرحوم اپنا نام "مصلح الدین" بدل کر پیدل دہلی روانہ ہوئے۔ بے پور اور جودھ پور کے مہیب ریگستانوں کو پاپیادہ طے کرتے ہوئے سورت پہنچے۔ اس زمانہ میں بندرگاہ سورت سے جہاز کا سفر آسان نہ تھا۔ بادبانی جہاز چلا کرتے تھے۔ سال بھر میں صرف ایک جہاز ہوا کا رُخ موافق پاکر سورت سے روانہ ہوتا اور اس طرح جدہ سے آیا کرتا تھا۔ مولانا اس بادبانی جہاز کے ذریعہ جدہ روانہ ہوئے۔ طویل سفر کے بعد بالآخر مکہ مکرمہ پہنچ گئے۔

حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ، مولانا کیرانوی سے کچھ پہلے مکہ معظمہ پہنچ چکے تھے اور رباط داودیہ (جو باب العمرہ سے متصل ہے)، کے ایک حجرہ میں مقیم تھے۔ صبح صادق کے قریب حضرت مولانا مرحوم مکہ معظمہ پہنچے۔ مطاف میں حضرت حاجی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ اس کے بعد دونوں رباط داودیہ میں آئے۔

مولانا رحمت اللہ صاحبؒ نے قیامِ مکہ کے دوران وہاں کے درس و تدریس کے نظام کو ناقص سمجھا اگرچہ سلطنتِ عثمانیہ کی طرف سے لاکھوں روپیہ تعلیم پر خرچ ہوتا تھا۔ آپ کو خیال آیا کہ حضرت عبداللہ بن عباس کی مٹی ہوئی درس گاہ کا زمینِ حرم پر از سرِ نو احیاء کیا جائے، جس میں مہاجرین کی اولاد اور عرب بچوں کی تعلیم و تربیت کے انتظام کے ساتھ صنعت و دست کاری سکھانے کے لیے بھی ایک باقاعدہ صنعتی اسکول اعلیٰ پیمانہ پر قائم ہو تاکہ مدارس سے فارغ شدہ طلبہ گداگری اور افلاس کا شکار ہو کر ننگِ اسلام نہ بنیں۔ مولانا نے اس کے لیے اپیل کی اور کچھ ابتدائی رقم بھی جمع ہو گئی۔

صولت النساء بیگم

۱۲۹۰ھ میں کلکتہ کی ایک مخیر خاتون صولت النساء بیگم صاحبہ اپنی لڑکی اور داماد کے ساتھ حج کے لیے آئیں۔ محترمہ نے مکہ معظمہ میں ایک رباط (مسافر خانہ) بنانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ موصوفہ کے داماد اکثر مسجد حرم میں مولانا کیرانوی کے حلقۂ درس میں شریک ہوتے مشورہ کے طور پر انہوں نے اپنی خوش دامن کے ارادہ کا ذکر کیا۔ مولانا نے فرمایا کہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں مسافر خانوں کی کمی نہیں۔ سب سے زیادہ ضرورت ایک مدرسہ کی ہے اور مکہ معظمہ میں کوئی مستقل مدرسہ نہیں۔ صولت النساء بیگم صاحبہ دوسرے دن خود حضرت مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور اس رائے کو پسند کرتے ہوتے مدرسہ کے لیے زمین کی خریدو غیرہ کے متعلق گفتگو کی۔ اللہ تعالیٰ کو یہ عظیم الشان کار خیر اس بلند ہمت خاتون سے لینا تھا۔ محلہ خندریسہ میں جگہ خریدی گئی اور مدرسہ کی تعمیر کا کام شروع ہو گیا۔ اکثر صولت النساء صاحبہ خود تعمیر کا کام دیکھنے کے لیے تشریف لاتیں اور یہ خدمت جس کی محترمہ کو توفیق ہوئی تھی، اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتیں۔ یہ سعادت اور فخر اس بیوہ خاتون کے حصہ میں تھا، اس لیے حضرت مولانا رحمت اللہ نے ان کے اس ایثار کی یادگار کے طور پر مرکز اسلام کے اس اولین علمی بنا کا نام مدرسہ صولتیہ رکھا، جو قیامت تک ان کے نام کو عزت اور سچی ناموری کے ساتھ زندہ رکھے گا۔

مدرسہ صولتیہ کا مسلک

بانی مدرسہ نے گردوپیش کے تمام حالات کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد اس مدرسہ کے لیے کچھ ہدایات مرتب فرمائیں۔ ان میں بالخصوص ان تین امور کی زیادہ تاکید کی گئی ہے :۔

۱۔ قطعی طور پر سیاسیات اور سیاسی دلچسپیوں سے ہر کارکن، مدرس اور طالب علم کا بے تعلق رہنا ضروری ہے۔

۲۔ اختلافی امور اور مختلف فیہ مسائل سے کلی طور پر احتراز کیا جائے۔

۳۔ تفریق اور گروہ بندی سے ہر طرح بچنا چاہیئے۔

مولانا نے ان تینوں امور کو مدرسہ کا گویا مستقل مسلک قرار دیا۔ اس مدرسہ کے ابتدائی دور میں مولانا کیرانوی سے جن اصحاب کو شرف تلمذ حاصل ہوا۔ ان میں سے چند نام درج ذیل ہیں :۔

۱۔ شریف حسین بن علی۔ سابق امیر مکہ (بانی حکومت ہاشمیہ) ۲۔ شیخ احمد عبد اللہ مرداد۔ شیخ الائمۃ والخطباءٗ

(۳) شیخ عبدالرحمٰن سراج مفتی احناف و شیخ العلماء مکہ معظمہ (۴) امین محمد مرداد نائب قاضی مکہ مکرمہ (۵) عبدالرحمٰن احمد دہان صدر مدرس مدرسہ صولتیہ (۶) عبدالستار دہلوی (۷) سید حسن دحلان وغیرھم۔

اگر دار العلوم حرم صولتیہ کے ابنائے قدیم کی فہرست دیکھی جائے تو مرحومین کو چھوڑ کر حال کے جو علمائے اعلم حجاز کہلاتے ہیں جیسے شیخ یحییٰ امان، شیخ حسن مشاط وغیرہ۔ سب مدرسہ صولتیہ کے فیض یافتہ ہیں۔

مکہ مکرمہ کا تیسرا مدرسہ دار الحدیث خیریہ ہے، اس مدرسہ کی زیارت کا بھی موقع ملا۔ حضرت مولانا علی محمد صاحب کا کے پوتا جو سندھ کے مشاہیر علماء میں سے ہیں اور پروفیسر فخر الحسن کی معیت میں دار الحدیث خیریہ میں پہنچا۔ اس مدرسہ کے مدیر اعلیٰ الشیخ حمزہ عبدالرزاق محدث ہیں۔ شیخ حمزہ سے غائبانہ تعارف تو تھا کیونکہ وہ میرے استاذ علامہ عبید اللہ سندھی کے شاگرد اور میرے دوست مولانا محمد نور مرشد مکی کے استاذ ہیں۔ شیخ حمزہ اصل میں مصری عالم ہیں لیکن ہجرت کر کے مکہ میں مقیم ہو گئے۔ آپ کی کتب بینی اور مطالعہ کے شوق کی تعریف تو میں نے پہلے سے سن رکھی تھی۔ ان کی یہی چیز میرے لیے خاص طور سے جاذب نظر تھی، کیونکہ مجھے بھی ایسی ہی دھن رہتی ہے شیخ حمزہ سے جب ملاقات ہوئی تو سنی ہوئی خبروں سے ان کو زیادہ پایا۔ کتابوں کے ڈھیر ان کے ارد گرد تھے، اور وہ مطالعہ میں مصروف تھے۔ اس وقت ان کی عمر ستر کے قریب ہو گی لیکن پھر بھی مطالعہ جاری ہے۔ میں نے ان کی خدمت میں دو کتابیں: تفسیر الہام الرحمٰن تالیف علامہ سندھی اور لمحات تالیف شاہ ولی اللہؒ پیش کیں۔ بڑے خوش ہوئے اور مجھے بھی اپنی کچھ کتابیں عنایت فرمائیں۔

اس مدرسہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اساتذہ سب کے سب سلفیہ مشرب کے ہیں، مولانا عبدالحق صاحب بہاولپوری جن کو وہاں سندھی کہا جاتا ہے، اسی مدرسہ میں حدیث کا درس دیتے ہیں، آپ میرے پرانے کرم فرما ہیں۔ ان سے بھی علمی مجلسیں ہوتی رہیں، اسی طرح ایک دوسرے عالم مولانا عبداللہ صاحب لکھنوی بھی اسی مدرسہ کے شیخ الحدیث ہیں۔ مولانا محمد عبداللہ صاحب کے حسن اخلاق کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے ہماری بڑی خاطر تواضع فرمائی، کتب خانہ کا بھی معائنہ کرایا۔ جزاہ اللہ خیراً۔

اسی مدرسہ میں ایک روز علماء کا بہت بڑا اجتماع ہوا۔ اس میں مجھے بھی مدعو کیا گیا تھا، جامعہ مدینہ کے کچھ اساتذہ بھی موجود تھے۔ مکہ مکرمہ کے بڑے بڑے علماء کے علاوہ ہندوستان سے مولانا عبید اللہ الرحمٰن صاحب

شارح مشکوٰۃ اعظم گڈھی اور دوسرے علماء موجود تھے۔ تقریریں شروع ہوئیں، موضوع تھا۔ التمسک بالکتاب والسنۃ" شروع میں شیخ حمزہ عبدالرزاق نے ایک مفصل تقریر فرمائی، اس کے بعد جامعہ مدینہ کے اساتذہ نے خطاب فرمایا۔ پھر ہندوستان اور پاکستان کے علماء کی باری آئی۔ دوسرے حضرات نے تو اردو میں خطاب فرمایا لیکن رالکین مدرسہ کی طرف سے مجھے حکم ملا کہ میں عربی میں خطاب کروں۔ ظاہر ہے کہ میرا ان دیار کا یہ سفر پہلا تھا اور عرب علماء کی تو عربی مادری زبان تھی۔ ان کے سامنے بغیر کسی تیاری کے ایک مشکل موضوع پر اظہارِ خیال کرنا بڑی مشکل بات تھی۔ لیکن اللہ پاک کی اعانت شاملِ حال رہی۔ برابر پونا گھنٹہ اس موضوع پر میں عربی زبان میں بولتا رہا۔ اس سلسلے میں مجھے سندھ کے قدیم علماء کو متعارف کرانے کا بھی موقع مل گیا۔ چنانچہ منصورہ سے لے کر ٹھٹھہ تک درس و تدریس کے سلسلوں اور ان کے ممتاز اہلِ علم کا سرسری ذکر کر دیا۔ عرب علماء یہاں کی دینی خدمات سے بڑے متاثر ہوئے۔

زیارتِ آثار

ایک روز مکہ مکرمہ کے تاریخی آثار دیکھنے کا پروگرام بنا۔ صفا کے قریب ہم ایک ٹیکسی میں سوار ہوئے۔ اس کا ڈرائیور ایک بخاری النسل نوجوان عرب تھا۔ اس سے طے یہ پایا کہ مکہ مکرمہ سے عرفات تک جتنے بھی آثارِ مقدسہ ہیں وہ دیکھ کر واپس آئیں گے۔ ابھی ہم صفا کے قریب ہی تھے کہ بخاری نوجوان نے ایک نئی تعمیر کے ایک حصہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ یہ "دارِ ارقم" ہے جس کا ایک حصہ سڑک کی نذر ہو چکا ہے اور دوسرا حصہ دکانوں میں شامل ہو گیا ہے۔

دارِ ارقم کی بہت بڑی تاریخی حیثیت ہے، یہ وہ جگہ تھی جہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مکّہ کے شر پسند لوگوں کی ایذا رسانی سے نجات مل جاتی تھی۔ آنحضرت صلعم اس مکان میں عبادت بھی کیا کرتے تھے۔ یہیں آپ کے اپنے جاں نثار ساتھیوں سے مشورے ہوتے اور آپ ان کو اسلام کی تعلیم بھی دیا کرتے۔ اسی جگہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضور ؐ کے ہاتھ پر مشرف باسلام ہوئے تھے۔

صفا سے آگے بڑھے تو مکّہ کے تاریخی پہاڑ ابو قبیس کا سلسلہ شروع ہوا۔ مکہ مکرمہ ہر طرف سے پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے۔ اس کے شمال مغرب میں جبل فلج، جبل ہندی (غالباً شیخ علی متقی ہندی کی رہائش کی وجہ سے اس کا یہ نام پڑا ہے)، جبل قیقعان وغیرہ ہیں۔ اور جنوب مشرق میں جبل ابی حدیدہ، جبل ابو قبیس اور جبل خندمہ وغیرہ ہیں۔ لیکن ان سب پہاڑوں میں جبل ابو قبیس زیادہ مشہور ہے۔ یہ پہاڑ فاران کے نام سے بھی موسوم تھا۔ کہتے ہیں

کہ یہ وہی مبارک پہاڑ ہے جس پر چڑھ کر فتح مکہ کے بعد حضرت بلال رضؓ نے اذان دی تھی۔ اس کی یاد میں اس پہاڑ کی چوٹی پر مسجد بلال بنی ہوئی ہے جو حرم سے اچھی طرح نظر آتی ہے، اسی جبل ابوقبیس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شق القمر کا معجزہ صادر ہوا تھا۔ اس پر جانے کے لیے اس لیے ضرورت پیش نہ آئی کہ صفا کے بازار میں روزانہ آنا جانا ہوتا تھا اور اس بازار سے سیڑھیاں چڑھ کر اس پہاڑ پر پہنچتے تھے۔ لہذا اس کی روزانہ سیر ہو جاتی تھی۔ کبھی کبھی ہم رات کو اچھی چائے کی تلاش میں بھی جبل ابوقبیس پر چلے جاتے تھے۔ حرم شریف اسی پہاڑ کے دامن میں واقع ہے، اگر حرم شریف میں نماز ہو رہی ہو تو مسجد بلال سے صاف دکھائی دیتی ہے۔ نبی صلعم کے خاندان کے لوگ بنو ہاشم جبل ابوقبیس کی طرف آباد تھے۔ اس سے کچھ آگے بڑھے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جائے ولادت نظر آئی، جس کو ہم پہلے بھی دیکھ چکے تھے، کچھ اور آگے بڑھے تو دو مسجدیں نظر آئیں ایک چھوٹی تھی جس کو مسجد الرایہ کہا جاتا ہے۔ ٹیکسی ڈرائیور نے بتایا کہ یہ مسجد اس جگہ واقع ہے جہاں فتح مکہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا جھنڈا نصب کیا۔ "رایت" عربی میں جھنڈے کو کہتے ہیں۔ دوسری مسجد الجن کہلاتی ہے۔ اس جگہ جنوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن پڑھتے ہوئے سنا تھا۔ جس کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے۔

اس سے کچھ اور آگے بڑھے تو حجون نامی پہاڑ نظر آیا، جہاں مکہ معظمہ کا تاریخی قبرستان المعلاۃ واقع ہے۔ یہ قبرستان منیٰ کے راستے میں بائیں ہاتھ کو پڑتا ہے، اس قبرستان میں حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضؓ، حضرت اسماء رضؓ بنت ابوبکر صدیق رضؓ، حضرت عبداللہ بن زبیر رضؓ اور دوسرے اکابر کے مزارات ہیں، لیکن تمام قبروں کو مسمار کر دیا گیا ہے۔ حجون اور ایک دوسرے پہاڑ کے درمیان سے شمال مغرب کو ایک سڑک جاتی ہے جس پر ایک تختی لگی ہوئی تھی اس پر "کدا" لکھا ہوا تھا، کہتے ہیں کہ یہ وہی راستہ ہے جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے موقع پر مکہ میں داخل ہوئے تھے۔ یہ راستہ منیٰ جانے کے لیے جنوب مشرق کی طرف مڑ جاتا ہے، موڑ سے قریب کوہ حرا یا جبلِ نور دکھائی دیا، جو کہ حرم سے غالباً تین میل کے فاصلہ پر ہے۔

کوہِ حرا کی چوٹی پر ایک گنبد ہے، چوٹی سے بیس پچیس فٹ نیچے ایک غار ہے جو کہ غارِ حرا کے نام سے موسوم ہے۔ اس میں رسولِ اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام بعثت سے قبل اللہ تعالیٰ کی عبادت کیا کرتے تھے یہیں روح الامین حضرت جبرائیل اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کے لیے پیغام لائے۔ غار مسطح ہے اور قدِ آدم

بلند ہے اور مشرق و مغرب دونوں طرف سے کھلا ہوا ہے، اس لیے روشنی اور ہوا بلا روک آتی رہتی ہے۔ کوہ حرا کے مشرق میں عرفات اور طائف کے پہاڑ ہیں۔ ہمارا ارادہ کوہِ حرا پر چڑھنے اور غارِ حرا کو اندر سے دیکھنے کا تھا، لیکن ہمارے معلّم محمد ہاشم صاحب سندھی نے ہمیں ایک سال پہلے کا واقعہ سنا کر ڈرا دیا تھا کہ ایک شخص اوپر گیا اور شدتِ پیاس کی وجہ سے وہیں مرگیا اور اس کی نعش کو نیچے اتارنے میں تین سو ریال خرچ ہوئے تھے۔

منیٰ وہاں سے قریب تھا چونکہ یہ مقام حج کے موقع پر ہی آباد ہوتا ہے اس لیے قبل از حج آدمی کم اور عمارتیں زیادہ نظر آئیں۔ منیٰ کے وسط میں مسجد الخیف کے پاس ہم موٹر سے اترے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں قیام فرمایا تھا اور صحابہ کے ساتھ پانچ نمازیں ادا فرمائی تھیں۔ تینوں جمروں کو بھی دیکھا جہاں تین دن تک کنکریاں ماری جاتی ہیں۔ ڈرائیور نے ایک چھوٹی مسجد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ بیعتِ عقبۂ اولیٰ اسی جگہ ہوئی تھی۔

منیٰ کے بعد وادی محسر آئی۔ جہاں اصحاب الفیل "طیراً ابابیل" کی کنکریوں سے ختم ہوئے تھے چونکہ یہ وادی عذاب کی جگہ ہے اس لیے احکام حج میں ہے کہ اس وادی کو جلد پار کیا جائے۔ وادیٔ محسر کو پار کر کے ہم مزدلفہ پہنچے اور وہاں مسجد میں نفل ادا کیے۔ پھر آگے عرفات کی طرف بڑھے اس کی مسجد النمرہ میں نفل پڑھے پھر جبل الرحمت کے اوپر چڑھے اس پر ایک چھوٹی سی مسجد بنی ہوئی تھی جس کے متعلق روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے قریب صحابۂ کرام سے خطاب فرمایا تھا، اس مسجد میں ہم نے نماز ادا کی اور پھر تھوڑی دیر وہاں ٹھہر کر مکہ مکرمہ واپس لوٹ آئے۔

طائف کو روانگی

حجاج کو حجاز کے کسی شہر میں جانے کے لیے حکومت سے پروانۂ اجازت حاصل کرنا پڑتا ہے طائف کے متعلق سیرت کی کتابوں میں بہت کچھ پڑھ چکے تھے، اس لیے اس کی زیارت کا خاص اشتیاق تھا۔ اپنے معلّم محمد ہاشم صاحب سندھی سے اس کا تذکرہ کیا تو انہوں نے ہم تینوں ساتھیوں کے لیے حکومت سے اجازت حاصل کرلی۔ سندھ کے ایک عالم مولانا علی محمد صاحب کا کیپوتا جو کہ اس سال حج کے لیے تشریف لائے تھے، سے بھی ہم نے ساتھ چلنے کو کہا، مولانا موصوف کو بڑی جدوجہد کے بعد بھی اجازت نہ مل سکی۔ مجبوراً ہم تینوں رفقاء ——— پروفیسر ظہور احمد، پروفیسر سید فخر الحسن اور میں عازم طائف ہوئے۔ طائف کا

بس اسٹاپ "المعلاۃ" کے قریب ہے وہاں بیسیوں ٹیکسیاں کھڑی تھیں۔ ان میں سیٹوں کے درجے مقرر ہیں۔ ہم درمیانی درجے میں بیٹھے اور فی آدمی مکہ سے طائف تک پانچ ریال کرایہ ادا کرنا پڑا فسٹ کے سات ریال اور آخری درجے کے تین ریال تھے۔

طائف مکہ مکرمہ سے ۱۲۰ کیلو میٹر کے فاصلے پر ہے، راستہ بے حد خراب تھا، چار گھنٹے میں ہم طائف پہنچ گئے، لیکن ایک تو راستہ خراب، دوسرے ڈرائیور اتنی تیز رفتاری سے گاڑی چلاتا تھا کہ ہمارے سر موٹر کی چھت سے بری طرح ٹکراتے تھے۔ اپریل کی آخری تاریخیں تھیں، مکہ معظمہ میں کافی گرمی تھی، لیکن ہم جب طائف پہنچے تو ہوا میں خنکی تھی اور ہمیں سردی محسوس ہونے لگی۔ راستے میں کئی منزلیں آئیں، قرن المنازل سے اتر کر ہم نے چائے پی۔ یہ اہلِ نجد کے لیے میقات ہے۔ آگے ایک وادی سے گزر کر جہاں کھجوروں کے چھوٹے چھوٹے درخت دکھائی دیے۔ ٹیکسی میں بیٹھے ہوئے عربوں نے بتایا کہ یہ وہ وادی ہے جہاں زمانۂ جاہلیت میں عکاظ، ذی المجاز اور مجنہ کے میلے لگتے تھے۔ طائف کے قریب ایک ہوائی اڈہ نظر آیا۔ ہوائی اڈہ سے طائف تک پکا راستہ ہے۔

طائف پہنچتے ہی ہم مسجد ابن عباس میں نماز ظہر پڑھنے گئے۔ وہاں ہم نے نماز با جماعت ادا کی۔ مسجد کے دائیں طرف ایک حجرے میں، جو مقفل تھا، حضرت ابن عباسؓ کی قبر ہے۔ اسی بنا پر اس کا نام مسجد ابن عباسؓ ہے۔ مسجد کے دو حصے ہیں:۔ ایک پرانا دوسرا نیا۔ نیا حصہ کافی وسیع اور شاندار ہے۔ ہم نے انجان سا بن کر حضرت ابن عباس کی قبر حجرے کے دروازے کے سوراخوں میں سے جھانک کر دیکھنے کی کوشش کی، لیکن نمازیوں اور مسجد کے محافظوں نے ہمیں سختی سے روکا۔ بہرحال اندر جھانکنے سے اتنا معلوم ہوا کہ قبر کافی خستہ ہے، نیز صفائی نہ ہونے کی وجہ سے حجرے کی حالت بھی خراب ہے۔

جیسے ہی ہم مسجد ابن عباسؓ سے نماز پڑھ کر باہر نکلے، زور کی بارش شروع ہو گئی۔ بارش سے بچنے کے لیے ہم نے شارع ابن عباسؓ پر پھلوں کی ایک دکان میں پناہ لی۔ دو دکانیں ساتھ ساتھ تھیں۔ ہم نے ان سے کشمش اور چنے خریدے۔ دکان دار سے جب ہم نے عربی میں بات چیت کی تو وہ سندھی نکلا۔ گو وہ سندھی زبان نہیں جانتا تھا لیکن ہمیں پاکستانی سمجھ کر کہنے لگا کہ ہمارے آباؤ اجداد سندھ سے آئے تھے اور مکہ مکرمہ میں مقیم ہو گئے ان کو وہاں بوقری کہا جاتا ہے۔ اصل میں یہ بوگڑی تھے۔ عربی میں بوقری ہو گئے۔ ان کی مکہ مکرمہ میں بڑی بڑی دکانیں

ہیں۔ قدیم وطن کے لوگوں سے اچھی طرح پیش آتے ہیں لیکن سندھی زبان سے بالکل نابلد ہیں، دوسری طرف ہم نے دیکھا کہ بنگالی مہاجر مکہ میں صدیوں سے مقیم ہیں، لیکن ان کا دستور یہ ہے کہ گھر میں بچوں سے بنگالی زبان میں بات چیت کرتے ہیں اور باہر عربی بولتے ہیں، اس طرح اپنے وطن سے باہر رہ کر بھی انہوں نے اپنی زبان محفوظ رکھی ہے۔

بارش کی وجہ سے کچھ یمنی لوگ بھی اسی دکان پر آپہنچے۔ ان سب کی کمر میں خنجر آویزاں تھے اور یہ فوجی معلوم ہوتے تھے۔ کوئی آٹھ دس نوجوان ہوں گے۔ وہ بارش میں ہاتھ اٹھا اٹھا کر جمال عبدالناصر اور جنرل سلال کو برا بھلا کہتے اور امام بدر اور شاہ سعود کی فتح و نصرت کی دعائیں مانگتے تھے۔ ہم نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے ایک یمنی نوجوان سے کہا کہ آخر ناصر بھی تمہاری طرح مسلمان ہے تم اس پر لعن طعن کیوں کر رہے ہو۔ اس نے نہایت دھیمی آواز میں مجھ سے کہا کہ ہم ظاہر میں بددعائیں دیتے ہیں۔ کیوں کہ ہم شاہ کا کھاتے ہیں، باقی فی الحقیقت ہم ناصر یا سلال کے خلاف نہیں ہیں۔

مسجد ابن عباسؓ کے قریب شاہراہ پر پتھر کا ایک ٹکڑا ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ بنو ثقیف کے بت لات کا ٹکڑا ہے۔ مسجد ابن عباس کے محل وقوع کے متعلق سنا گیا کہ یہ وہ جگہ ہے جہاں طائف کے محاصرہ کے وقت مسلمانوں کے لشکر کا قیام تھا۔ اس کے قریب ہی شہداء صحابہ کی قبریں بھی بتائی جاتی ہیں۔

واپسی میں ہم نے فی آدمی ۲ ریال کرایہ دیا، جب کہ آتے وقت پانچ ریال فی کس دینا پڑا تھا۔ راستے میں ذات قرن میں مغرب کی نماز ادا کی اور عمرہ کا احرام باندھا۔ رات کو مکہ معظمہ میں داخل ہوئے، صبح کو احکام عمرہ ادا کرنے کے بعد احرام سے فراغت پائی۔

حج کی ادائیگی

حج کے ایام قریب آگئے تھے اور مکہ معظمہ میں جتنے حجاج کو آنا تھا وہ سب پہنچ گئے تھے۔ اس سال ہزاروں کی تعداد میں ترک خشکی کے راستے اپنی مخصوص گاڑیوں پر حج کرنے کے لیے آئے تھے۔ سالہا سال کی بندش کے بعد ان کو اجازت ملی تھی، اس لیے ان میں بڑا ذوق و اشتیاق تھا۔ چونکہ مصری اور سعودی حکومتوں کی باہمی پرخاش کی وجہ سے مصر سے حجاج نہیں آئے تھے لیکن اس کی تلافی ترک حجاج نے کر دی۔ الجزائر سے بھی کافی لوگ آئے تھے جو نہایت تنومند اور قوی معلوم ہوتے تھے۔ ان ایام میں حجر اسود کا بوسہ دینا ہر کسی کا کام نہ تھا کیوں کہ بڑا اژدحام رہتا تھا۔ شروع میں تو پنجاب کے لوگ دوسروں کو دھکیلتے ہوئے حجر اسود

تک پہنچ جاتے تھے لیکن افریقہ کے کالے رنگ کے قوی لوگوں کی آمد کے بعد یہ پنجاب والوں پر بازی لے گئے
اور جب الجزائر اور شام کے علاوہ حلب کے حجاج پہنچے تو یہ سب سے بازی لے گئے۔ ان دنوں مطاف میں
طواف کرنے والوں کا اتنا اژدحام ہوتا (خاص طور پر مقام ابراہیم کے قریب) کہ گزرنا محال ہوتا تھا۔ نماز کے لیے
بھی اگر حرم میں ایک گھنٹہ پہلے آتے تھے تو جگہ مل جاتی تھی ورنہ پھر حرم کے دروازہ پر یا باہر کھڑا ہونا پڑتا تھا نماز
میں صفیں ایک دوسرے سے اتنی قریب ہوتی تھیں کہ سجدہ کے لیے بے حد سکڑنا پڑتا تھا۔

۳ مئی بروز جمعہ کے لیے حج کے دن کا اعلان کیا گیا۔ اور یہ اعلان ماہ ذی الحجّہ کی ۱۰/۹ تاریخ کو ہوا اور
یہ اس لیے کہ حج کے لیے چاند کی تاریخوں کا فیصلہ ریاض کے علماء کرتے ہیں اور پھر اس کی تصدیق شاہ کی طرف
سے کی جاتی ہے۔ اس کے بعد حج کی تاریخوں کا اعلان کیا جاتا ہے۔ ۸ تاریخ کی صبح کو ہم نے حج کے لیے
احرام باندھا اور منیٰ جانے کے لیے تیاری کی، پہلے تو میرا منیٰ تک پیدل جانے کا ارادہ تھا لیکن محمد ہاشم صاحب
معلّم نے اس سے روکا اور کہا کہ اس موقع پر بڑا اژدحام ہوتا ہے۔ معلم صاحب کی طرف سے بس کا انتظام تھا،
تھوڑی دیر میں ہم منیٰ پہنچ گئے، معلموں کی طرف سے وہاں پہلے ہی خیموں کا انتظام تھا، ہمارے خیمے مسجد الخیف کے
بالکل قریب تھے، ایک رات منیٰ میں ٹھہرنا پڑا، شام کو سفیر پاکستان متعین سعودی عرب جناب عبدالفتاح میمن
پاکستانی حجاج سے ملنے آئے وہ ہر ایک حاجی سے نہایت خندہ پیشانی اور محبّت سے مصافحہ کرتے اور اس کی
خیر خیریت معلوم کرتے تھے۔ میرے لیے تو موصوف اجنبی نہ تھے اور پھر لطف یہ کہ ان کے مشیر خصوصی مولوی قاری
خیر محمد صاحب سے میرے پرانے مراسم تھے۔ رات کو قاری خیر محمد صاحب کی معیت میں نواب نبی بخش خاں بھٹو اور
ان کے صاحب زادے معشوق علی صاحب سے ملنے گیا، موصوف سندھ کی ایک عظیم شخصیت اور بڑے مرنجاں مرنج
بزرگ ہیں، ان کی علم پروری کا یہ عالم ہے کہ سندھ کے اکثر عربی مدارس کو ان کی طرف سے گرانٹ ملتی رہتی ہے۔ خود
ان کے شہر میں عربی تعلیم کا بہت بڑا مدرسہ ہے جو ان کے خرچ پر چل رہا ہے۔ اسی مدرسہ میں استاذ العلماء العلامہ
الحاج عبدالکریم الکورائی درس دیتے رہے۔ علامہ کورائی کو دیکھ کر سندھ کے قدیم علمائے ٹھٹہ اور دوسرے محققین یاد
آجاتے تھے۔ میرے وہ خصوصی استاذ تھے۔ میں نے گیارہ بارہ برس مسلسل ان کے ہاں علمی تربیت پائی اور پھر ان
کی وفات کے بعد ان کی وصیت کے مطابق اسی مدرسہ میں تین برس صدر مدرّس کی حیثیت میں رہا۔ حضرت استاذ العلام

کے صاحب زادے مولانا عبدالغفار صاحب نے مجھ سے پڑھا تھا۔ پندرہ برس کے بعد نواب صاحب سے یہ پہلی ملاقات تھی۔ ویسے تو بڑے لوگوں سے ملنے سے اکثر اجتناب کرتا ہوں، لیکن نواب صاحب کی حیثیت دوسری ہے، وہ نہایت ہی متواضع اور اعلیٰ کردار کے مالک ہیں۔ موصوف کی رہائش سفیرِ پاکستان جناب میمن صاحب کے ہاں تھی، اس طرح مجھے میمن صاحب سے دوبارہ ملنے کا موقع مل گیا۔

عرفات کو روانگی

۹ ذی الحج مطابق ۳ مئی ۱۹۶۳ء کو صبح کی نماز پڑھ کر ہم بس میں عرفات کو روانہ ہوئے گاڑیوں کا اتنا اژدحام تھا کہ الامان والحفیظ، میدانی علاقہ تھا جس کا جس طرح جی چاہتا تھا، اپنی گاڑی کو دوڑا کر آگے بڑھنے کی کوشش کرتا تھا۔ لبیک لبیک کی آوازیں فضا میں گونج رہی تھیں اور اس کے ساتھ گاڑیوں کے ہارن بھی بجتے جاتے تھے، پیدل جانے والی جماعتیں بھی بسوں اور موٹروں کے ساتھ ساتھ گرد و غبار میں چل رہی تھیں، بسوں کی رفتار کہیں تو پیدل چلنے والوں سے بھی کم تھی۔ گویا اس طرح مار و مار کرتی جا رہی تھی کہ ہر دم ایکسیڈنٹ کا خطرہ تھا۔ بہرحال ہم عرفات پہنچ گئے۔

حسبِ دستور ظہر اور عصر کی نماز ہم نے عرفات میں پڑھی اور مغرب تک کھڑے کھڑے دعا و مناجات کرتے رہے۔ وہاں عام حاجیوں کو دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ وہ خیموں میں کھانے پینے میں مصروف رہتے ہیں اور جب عصر کی نماز کا وقت ہوا تو معلم صاحبان کی معیت میں دعائیں پڑھنے لگے اور اسی کو ہی وہ حج تصور کرتے ہیں غرض جیسے ہی سورج غروب ہوا مزدلفہ کی طرف روانگی شروع ہوئی۔ واپسی میں تو اور بھی زیادہ خطرہ محسوس ہوتا تھا، کیوں کہ ایک تو اندھیرا تھا اور دوسرے گاڑیاں بری طرح غبار اڑا رہی تھیں۔ راستے میں کچھ لوگ بیچارے پیدل چلنے والے جو ان کی زد میں آ گئے تھے، وہ مرے ہوئے راستے پر پڑے تھے۔ مغرب اور عشاء کی نماز حسبِ دستور مزدلفہ میں ملا کر پڑھی۔ صبح ہوئی تو اندھیرے میں صبح کی نماز ادا کی اور پھر منیٰ روانہ ہو گئے۔ منیٰ پہنچ کر جمرۃ العقبہ میں رمی کیا اور پھر قربانی کی تلاش میں تینوں رفقاء نکل پڑے۔

قربانی کے لیے بکروں اور دنبوں کی بڑی فراوانی تھی، یہ بکرے اور دنبے نہ صرف حجاز سے بلکہ دور دراز ملکوں سے بھی لائے جاتے ہیں۔ ایک اچھا بکرا عام طور پر چالیس پچاس ریال میں مل جاتا ہے۔ ہمارے کچھ اور بھی ساتھی تھے جنہیں قربانی کرنا تھی چنانچہ پروفیسر ظہور احمد کی تجویز پر ہم نے مکہ مکرمہ سے ایک تیز چھرا خرید لیا تھا تاکہ خود

اپنے ہاتھ سے قربانی کریں۔ اور اس طرح سنتِ ابراہیمیؑ کی ادائیگی ہو۔ اسی روز یعنی ۱۰ تاریخ کو ہم تینوں ---- پروفیسر سید فخر الحسن، پروفیسر ظہور احمد اور میں ---- ایک روپیہ فی آدمی کرایہ دے کر مکہ مکرمہ طوافِ زیارت کے لیے گئے۔ یہ طواف جملہ طوافوں سے اہم ہے کیونکہ اس کے چھوٹ جانے سے حج ادا نہیں ہوتا اور یہ طواف حج کے لیے رکن کی حیثیت رکھتا ہے۔ رات کو پھر منیٰ لوٹے کیونکہ ۱۱ اور ۱۲ کو رمی جمرات کرنا تھا اور یہ عرصہ منیٰ میں ہی گزارنا پڑتا ہے۔ رمی جمرات کے موقعہ پر اژدحام اتنا تھا کہ جان کا خطرہ تھا، اگر کوئی گر جاتا تو پیچھے آنے والے لوگ اس کی چیخ پکار کی پروا کیے بغیر اس کو روندتے ہوئے آگے بڑھ جاتے۔ اور عورتوں اور بچوں کا خیال تک نہ کیا جاتا۔ حکومت بھی اس کے انتظام سے قاصر ہے۔ منیٰ کے دورانِ قیام میں ایک اور چیز جس کو سب زائرین محسوس کر رہے تھے یہ تھی کہ قربانی کے لاکھوں بکرے دنبے اور اونٹ ذبح کرنے کی وجہ سے وہاں بڑی بدبو پھیلتی ہے اور گوشت سڑتا رہتا ہے۔ کیا ہی اچھا ہو اگر گوشت سُکھانے کا کوئی کارخانہ ہو اور کھالوں کی بھی حفاظت کی جاتے۔

بارھویں ذی الحج کو تینوں جمروں کا رمی کرنے کے بعد مکہ معظمہ ہم واپس آ گئے اور اس طرح بحمد اللہ حج کے جملہ ارکان سے فراغت حاصل ہوئی۔ اب جب تک مدینہ منورہ کی طرف جانے کی اجازت نہ ملتی ہمیں مکہ معظمہ میں ہی قیام کرنا تھا۔ اس دوران حرم کی حاضری، طوافِ کعبہ کے علاوہ علماء کی مجالس میں شرکت، حرم کے مدرسین سے ملاقاتیں، اور علمائے سندھ کی تالیفات کی تلاش ---- یہ میری مصروفیات تھیں۔ مدرسہ صولتیہ کے ناظم مولانا حافظ محمد سلیم صاحب سے مدرسہ کے کتب خانہ کی زیارت کے لیے میں نے پہلے ہی استدعا کی تھی۔ انہوں نے فریضۂ حج کی ادائیگی کے بعد لائبریری دکھانے کا وعدہ کیا تھا کیونکہ ایامِ حج میں مدرسہ کے دفتر میں زائرین کا بڑا ہجوم رہتا ہے، حجاج اپنی امانتیں بھی ناظم صاحب کے ہاں رکھتے ہیں اور ہزاروں ریالوں کا حساب کتاب ان کو حَسْبَۃً لِلّٰہ رکھنا پڑتا ہے۔ مدرسہ کا یہ دستور قدیم سے چلا آتا ہے جس کو موجودہ ناظم صاحب قائم رکھے ہوئے ہیں۔

ایک روز ناظم صاحب نے مجھ کو کھانے پر بلایا اور کھانے سے پہلے کتب خانہ کی زیارت نصیب ہوئی۔ ناظمِ مدرسہ کے صاحب زادے نہایت با اخلاق عالم ہیں۔ ان کی معیت میں کتب خانہ کی زیارت کی۔ لائبریری وسیع جگہ میں ہے۔ کتابیں بے شمار ہیں اور بڑے سلیقہ سے رکھی ہوئی ہیں۔ ایامِ حج کی وجہ سے کتب خانہ بند تھا ورنہ عام طور سے شائقین علم کے مطالعہ کے لیئے کھلا رہتا ہے۔ علماء سندھ کی کتابیں تو مجھے یہاں دستیاب نہ ہوئیں۔

لیکن دوسری کئی نادر کتابیں دیکھنے میں آئیں۔

کتب خانہ کا ایک حصہ الگ نظر آیا۔ استفسار پر معلوم ہوا کہ یہ سب کتابیں حضرت مولانا حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی ہیں جو آپ نے مدرسہ کے لیے وقف فرمائی تھیں، پہلے ہم بتا چکے ہیں کہ مدرسہ صولتیہ کے بانی مولانا رحمت اللہ صاحبؒ مکہ مکرمہ میں حضرت حاجی امداد اللہ کے پہنچنے کے ایک یا دو ہفتے بعد آ گئے تھے اور دونوں کی بود و باش ایک ساتھ تھی۔ مولانا اسلم صاحب نے بتایا کہ نواب چھتاری نے مکہ میں ایک لونڈی خرید کر کے اسے آزاد کیا اور پھر حضرت حاجی صاحب کی خدمت کے لیے اس کو پیش کیا۔ حاجی صاحب نے اس کی اپنے ایک خادم عبدالرحیم نامی سے شادی کرادی۔ یہ عبدالرحیم اصل میں اچھوت اور دیوبند کے رہنے والے تھے۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی کے ہاتھ پر اسلام لائے تھے۔ جس پر وہاں کے ہندوؤں نے ہنگامہ برپا کیا اس لیے مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی نے اس کو مکہ معظمہ میں حاجی امداد اللہ کی طرف بھیج دیا۔ حضرت حاجی صاحب کے دو اور خادم تھے ایک شیخ شفیع الدین اور دوسرے شیخ محب اللہ، جس کے متعلق عام طور پر یہ مشہور ہے کہ یہ دونوں حاجی صاحب کے خلفاء تھے لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ اصل میں یہ دونوں آپ کے خادم تھے۔ جب حاجی امداد اللہ صاحب کی موت قریب آ گئی تو آپ کے معتقدین نے آپ سے عرض کیا کہ اپنے خلفاء میں سے کسی کو اپنی مسند پر بٹھائیں۔ آپ نے فرمایا کہ میں ایک فقیر آدمی ہوں اور میں مسند نشینی کو دوست نہیں رکھتا، اگر میرے خلفاء میں سے کسی میں اہلیت ہو گی تو وہ خود بخود دین کی خدمت کرتا رہے گا۔ خواہ وہ کہیں بھی ہو گا۔ آپ نے اپنی جملہ کتابیں مدرسہ صولتیہ کے لیے وقف فرمائیں۔ کتب خانے میں ذیل کی خطی کتابیں نظر سے گزریں:۔

۱۔ ایضاح شرح مفصل ــــ اوراق ۱۹۵ سن کتابت ۷۶۴ھ۔ اس کا خط متوسط تھا۔ یہ نحو کی مشہور اور نادر کتاب ہے۔

۲۔ التصریح شرح التوضیح شرح الالفیہ لشیخ خالد بن عبداللہ الازھری والتوضیح لشیخ جمال الدین بن محمد۔ اس کا خط عمدہ تھا۔ جزء اول۔ ضخیم۔ کتابت ۱۰۵۹ھ۔

۳۔ حواشی عبدالحکیم سیالکوٹی علی حاشیۃ عبدالغفور۔ یہ بھی مشہور حواشی ہیں جو یہاں مطبوعہ ہیں۔ لیکن یہ قلمی نسخہ

صحیح معلوم ہوا۔

۴۔ تفسیر الصادقی (عربی) تالیف شیخ محمد اغلتی نقشبندی۔ مؤلف کے ہاتھ سے لکھی ہوئی سورۂ مریم سے آخر تک۔ سن کتابت: ۹۹۲ھ۔

۵۔ لطائف التفسیر کامل فارسی از کتب خانہ فیوض امدادیہ۔

۶۔ حاشیۃ العصام علیٰ تفسیر البیضاوی دو نسخہ۔ ایک نسخہ ناقص تھا۔ یہ کتاب نوادرِ زمانہ میں سے ہے اور فاضل عصام الدین کی معرکتہ الآرا تصنیف ہے جو آج تک طبع نہیں ہوئی۔ اس کا ایک نسخہ سندھ کے ایک گوٹھ پیر بخش بھٹو میں مولوی عبدالحکیم صاحبؒ کی ذاتی لائبریری میں تھا جس کا میں نے بالاستیفاء مطالعہ کیا تھا۔ یہ نسخہ حضرت استاذ علامہ کورائیؒ کے زیرِ مطالعہ بھی رہا۔ اور آپ نے تفسیر بیضاوی پر حواشی لکھنے میں ان حواشی عصام سے بڑا استفادہ کیا۔ حضرت استاذ کی یہ تالیف کارخانہ تجارتِ کتب کراچی کی طرف سے چھپ چکی ہے۔

۷۔ رسوخ الاحبار فی منسوخ الاخبار۔ (عربی) جزء واحد۔ تالیف شیخ برہان الدین جعبری۔ سن کتابت ۸۰۳ھ۔

۸۔ مرقاۃ الصعود شرح ابی داؤد۔ تالیف سیوطی۔ جزء واحد۔ یہ نسخہ آخر سے ناقص معلوم ہوتا تھا۔

۹۔ ہیئت کے آلات: اسطرلاب مغربی۔ نہایت قدیم تھا۔ اور پیتل کا بنا ہوا تھا۔ اس کے پانچ صفائح تھے۔ تین ارباع تھے۔ مجیب، مقنطر سب لکڑی کے بنے ہوئے تھے۔ تین عدد کرّے تھے۔ جس میں سے ایک سماوی اور دو ارضی تھے۔ ایک بڑا سماوی کی طرح تھا اور دوسرا چھوٹا تھا۔

مجموعی طور پر منطق کی کتابیں کافی تھیں جن کی تعداد دو سو اٹھارہ ہے۔ ہیئت کی ۴۳، ہندسہ کی ۲۸، کتب تاریخ ۱۱۲، کتب عروض ۸، کتب ادب ۲۲ تھیں اور یہ سب ۱۳۰۴ھ تک کی جمع شدہ ہیں۔ اس کے بعد بھی کافی اضافہ ہوا ہے۔

افکار و آراء

جناب ایڈیٹر صاحب

ستمبر ۱۹۶۳ء سے ماہنامہ "الرحیم" کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ امام الہند شاہ ولی اللہؒ اور علامہ عبید اللہ سندھی نے تقلیدی ذہن کو جھنجھوڑنے کی جو کوشش کی ہے، الرحیم کا یہ فرض اولیں ہونا چاہیئے کہ وہ اس کوشش کو جاری رکھے، لیکن اس سلسلے میں ضروری ہے کہ الرحیم کی زبان ذرا آسان ہو۔ میں یہ تجویز کروں گا کہ سب سے پہلے شاہ ولی اللہ صاحب کی وہ کتابیں جو علوم ظاہرہ پر ہیں، ان کو شائع کیا جائے، نیز شاہ صاحب کی تعلیمات سے ایسے مضامین الرحیم میں بکثرت شائع ہوں، جو ایک طرف جامد تقلید اور دوسری طرف الحاد و دہریت کا تدارک کر سکیں۔ شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور علامہ عبید اللہ سندھی نے اس کام کو جس حد تک بڑھایا تھا اس سے اور آگے اسے بڑھنا چاہیئے۔ میں چاہتا ہوں الرحیم اس کام کو اپنے ذمے لے۔

شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے اپنی کتابوں میں کتاب و سنت کا جو بطن بتایا ہے، میری دعا ہے کہ لوگوں کو اس سے متعارف کرنے میں خداوند کریم اکیڈمی اور اس کے ترجمان الرحیم کی مدد فرمائے۔

بدر الدین۔ بازار چارسدہ۔ ضلع پشاور

مکرمی ——— بارک اللہ فی مساعیکم

السلام علیکم۔ ماہنامہ الرحیم کے اجراء ہی سے اس کا مطالعہ کر رہا ہوں . . . . جہاں تک میرا علم و فہم ہے، اس کے لحاظ سے مجھے یہ پسند آیا ہے۔ زیادہ خوشی تو اس بات کی ہے کہ آپ حضرت امام الہند

شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیمات کی اشاعت کر رہے ہیں۔

ماہ دسمبر ۶۳ء کے "الرحیم" میں "ملتان و اوچ کے سہروردی مشائخ" پر محمد ایوب قادری صاحب کا ایک مضمون چھپا ہے۔ اس میں مضمون نگار صاحب نے لکھا ہے کہ "جب بخاری سجادہ نشین کے گھر میں فرزند پیدا ہوتا ہے، تو شیخ جمال الدین کی خانقاہ پہ ایک گھوڑا بطور نذر کے تحفہ دیا جاتا ہے"۔

قرآن مجید کی متعدد آیات میں نذر لغیر اللہ کے متعلق ممانعت آئی ہے۔ خصوصاً قرآن مجید کی سورۃ الانعام سورہ المائدہ اور سورۃ الحج میں اس پر بہت زور دیا گیا ہے۔ چونکہ ہمارے ملک میں بدعات کا عام چلن ہے اور لوگوں کی ایک کثیر تعداد انہیں عبادت سمجھ کر بجالاتی ہے۔ اس لیے موجودہ حالات میں جب کسی ضعیف الاعتقاد مسلمان کی نظر سے ایک علمی و دینی مجلہ میں مشائخ رحمۃ اللہ علیہم کی زندگیوں کے بارے میں اس طرح کی باتیں چھپیں گی، تو اس کا کوئی اچھا اثر نہیں پڑے گا اور اصلاح و تعمیر اخلاق میں اس سے کوئی مدد نہیں ملے گی۔ اس لیے اس سلسلے میں احتیاط ضروری ہے۔

ملک نور محمد اعوان اختر۔ واہ

جناب مدیر صاحب۔

پاکستان کے آئین و قوانین کے سلسلے میں آج کل "نظامِ اسلامی" کا جس طرح نام لیا جا رہا ہے، میں اس بارے میں کچھ عرض کروں گا۔ اس میں شک نہیں کہ ہر مسلمان کے لیے دینِ اسلام ایک ہمیشہ رہنے والا اور ہمہ گیر دین ہے۔ اور اس کے پیش کیے ہوئے معتقدات، عبادات اور احکام ابدی اور لابدی ہیں، لیکن ایک مملکت کے آئین و قوانین کی جو جزوی دفعات ہوتی ہیں، اُن کی تشریع و تعیین میں اس قسم کی پروپیگنڈہ مہم چلانا کہ وہ "خدا کے قانون" کے مطابق ہوں، میرے خیال میں کسی دینی اذعان کا مظاہرہ نہیں، بلکہ یہ کرشمے سب پارٹی پالیٹکس کے ہوتے ہیں، جن کا مقصد محض وقتی مصلحت ہوتی ہے اور اس میں خواہ مخواہ دینِ اسلام کو گھسیٹا جاتا ہے۔ "خدا کے قانون" کے اصول و مبادی کو متعین کیے بغیر محض گرمیٔ محفل کے لیے اس طرح کے نعرے بلند کرنا رجعت پسند طاقتوں کا ایک عام معمول ہے۔ اس سے ملک میں انتشار بڑھے گا۔ معاشرتی تضاد میں اضافہ

ہوگا۔ اور پاکستان کو آگے لے جانے والی طاقتیں کمزور ہوں گی۔ بے شک پاکستان میں آئین و قوانین کی فکری و معنوی اساس دینِ اسلام اور اس کے اصول و مبادی ہوں، جو ابدی اور ہمہ گیر ہیں، لیکن آئین کی تفصیلات اور قوانین کی جزئیات کا تعین تو ہمیشہ تاریخی، معاشرتی اور اقتصادی ٹھوس حقائق کے پس منظر ہی میں ہوا کرتا ہے۔ یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ بعض مذہبی جماعتیں جو کئی ایک باتوں میں کافی ترقی پسند ہیں لیکن وہ اپنی ذہنی افتاد میں انتہائی رجعت پسند اور منتشر الخیالات ہیں۔ وہ ایک طرف خالص اور کامل جمہوریت کا نعرہ لگاتی ہیں اور دوسری طرف بزعمِ خویش اسلام کے نام سے وہ ایک ایسا نظام پیش کرتی ہیں جو جمہوریت کے مسلّمہ اصولوں کے بالکل منافی ہے۔

میں چاہتا ہوں کہ آپ "الرحیم" میں اس طرح کا ایک سلسلۂ مضامین شروع کریں، جس میں ایک تو ان "محکماتِ دین" کی نشان دہی ہو، جنہیں بلاتفریقِ نسل و قوم تمام مسلمان ملکتوں کو اپنانا ہوگا یا انہیں اپنانے کی کوشش کرنا ہوگی۔ دوسرے آئین و قوانین کی وہ جزوی دفعات بتائی جائیں جو مختلف حالات و زمان میں مختلف شکلیں اختیار کرتی ہیں۔ مثال کے طور سے امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک زمین کو بٹائی پر دینا شرعاً جائز نہیں تھا لیکن اس دور کے مخصوص سیاسی، اقتصادی اور سماجی حالات کے پیشِ نظر آپ کے شاگرد امام ابو یوسفؒ کو اس کے جواز کا فتویٰ دینا پڑا۔ اور اب تک دنیائے اسلام کا اس پر عمل ہے۔

ایک قانون کی رُوح اور اس کی اخلاقی اساس ہوتی ہے اور ایک اس کی عملی تفصیلات، جن تک ایک مملکت یا قوم "اجتہاد" کے ذریعہ پہنچتی ہے۔ آخر پاکستان کے علمائے کرام اور اربابِ دانش میں یہ سوچ کب پیدا ہوگی؟

ارشد عظیم۔ جہانگیر روڈ۔ کراچی

. . . . السلام علیکم و رحمت اللہ و برکاتہ،

. . . . ماہنامہ "الرحیم" میں میرے اردو ترجمہ "مخزن الولایت" پر تبصرہ فرما کر آپ نے مجھے منت گزار بنایا۔ آپ کا سفر نامہ حج بیت اللہ شریف نظر افروز ہوا۔ . . . . میں نہ ادیب، نہ مؤرخ،

نہ تذکرہ نویس، نہ عالم نہ فاضل - اللہ کا ایک گناہ گار بندہ ضرور ہوں - بزرگانِ دین اور اصحابِ دینِ متین کے ملفوظات اور تذکروں سے قدرے لگاؤ ہے۔ سہ

روشِ زہد و اطاعت نہ نمودند مرا هوسِ بندگیٔ درو کشانم دادند

(حضرت عزیز صفی پوری)

اپنی کم مائیگی کے باعث اپنی استعداد کے مطابق ان کے معارف کے اقتباسات و تراجم کرتا رہتا ہوں۔ . . . . . میرے اُردو ترجمہ و تلخیص فارسی ملفوظات مخدوم شاہ میناؒ لکھنؤ کو تعلیمات حضرت شاہ مینا کے نام سے جلد ہی شائع کر رہی ہے - میرا فراہم کردہ ایک اور مجموعہ ارشاداتِ صحابہ کرام و اقوال بزرگانِ عظام کا مسودہ انوار الصفا کے نام سے ادارۂ تحقیق و تصنیف کے زیرِ غور ہے۔

حضرت عزیز صفی پوری گو مشہور تو ہیں اپنے فارسی نعتیہ کلام ہیں، مگر اپنے عمِ بزرگ حضرت امیر مینائی کے اصرار سے اردو میں بھی آپ کے کلام کے دو دیوان ہیں - ان کی ایک اردو کی غزل یہاں لکھتا ہوں:-

بلا کے بات بھی کی اور مسکرا بھی دیا کیا شہید بھی قاتل نے خوں بہا بھی دیا
گیا جو نامہ بُرا آیا بہت سراسیمہ کہا کہ چاک کیا خط کو اور جلا بھی دیا
سنبھلتے حضرت موسیٰؑ مگر ستم یہ ہوا دکھا کے جلوۂ دیدار کچھ ستا بھی دیا
میں وہ چراغ ہوں جس کو فروغ ہستی نے قریبِ صبح کیا روشن اور بجھا بھی دیا

عزیز ان کے کرم پر فدا نہ ہوں کیوں کر
کہ عشق دے کے مجھے عشق کا مزا بھی دیا

مولوی چراغ علی صاحب (ملاحظہ ہو مخزن الولایت اردو ترجمہ مدہ ۱۰۵) شاگرد شاہ عبدالعزیز دہلوی کے ذرا تفصیلی حالات سے آگاہی بخشی جائے تو بڑی عنایت ہوگی۔

دُعا کا طالب

محمد خصلت حسین صابری - ناظم آباد - کراچی

. . . . . .

سید احمد شہیدؒ کے متعلق آپ کے رسالے میں ایک مضمون شائع ہوا تھا، جو میرے نزدیک بوجوہ غیر مناسب تھا۔ مولانا عبید اللہ مرحوم و مغفور نے ذاتی رجحانات کی بنا پر قیاساً ایک رائے قائم کر لی تھی، جس کا اظہار انہوں نے اپنی کتاب میں فرمایا تھا اور اس پر بعض بے بنیاد حواشی بھی چھپ گئے تھے . . .

اب آپ نے تازہ شمارہ میں حضرت مجددؒ کی تجدیدی دعوت پر ایک مقالہ لکھا ہے اس سے اسلام کے مستقبل خصوصاً تبلیغ اسلام کے سلسلے میں جو سوالات پیدا ہوتے ہیں، غالباً آپ ان سے ناواقف نہیں ہوں گے۔ ہندوستان جیسی سرزمین میں شیعوں اور غیر مسلموں کی شدید مخالفت کے بعد اطمینان سے کوئی نظام حکومت کیوں کر قائم کیا جا سکتا تھا؟ کیا ہمیں یہ سمجھنا چاہیئے کہ حضرت مجددؒ کی تجدیدی دعوت کا مقصد و مدعا ہندوستان میں مسلسل جنگ و خوں ریزی تھا؟ پھر یہ دعویٰ کس بنا پر کیا جاتا ہے کہ عالمگیر کی کامیابی حضرت مجددؒ کی دعوتِ تجدیدی سے پیدا شدہ گروہ کی حمایت کا نتیجہ تھی؟ کم از کم تاریخ کے اوراق سے تو اس کی تائید نہیں ہوتی۔ نہ دارا شکوہ نے اس گروہ کی حمایت سے محرومی کے باعث شکست کھائی۔ دونوں کی فتح و شکست کے اسباب بالکل مختلف تھے۔ لہٰذا آپ شجاع اور مراد کو مذکورہ بالا سلسلوں میں سے کس کے تحت رکھیں گے۔

اکبر یقیناً زیادہ پڑھا لکھا نہ تھا۔ عالمگیر نے ذاتی ذوق کی بنا پر باقاعدہ تعلیم پائی۔ وہ برابر علمی ریاضت میں مصروف رہا۔ طبعاً شیدائے اسلام تھا۔ تاہم اس کی کامیابی نہ تنہا ان اوصاف کا نتیجہ تھی اور نہ اسے تجدیدی دعوت سے پیدا شدہ گروہ کی خاص حمایت حاصل ہوئی۔ دھرمادت، سموگڑھ، کھجوہ اور اجمیر کے میدان ہائے جنگ میں جو قوتیں بالمقابل کار فرما تھیں، ان کی حیثیت تاریخی بیانات کے مطابق بالکل مختلف تھی۔ پھر عالمگیر مدت العمر ہر اس شخص سے کام لیتا رہا، جسے وہ اہل سمجھتا تھا اور میرے علم کے مطابق کبھی کسی اہل شخص کو اس بنا پر نظر انداز نہ کیا گیا کہ وہ شیعہ تھا یا ہندو۔ اس نے بھی ہندوؤں کی دلداری میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ جسونت سنگھ کو صریح غداری کے باوصف دو مرتبہ معاف کیا اور زندگی بھر ملازمت میں رکھا۔ سیواجی کے خلاف میرزا راجا جے سنگھ کو سپہ سالارِ اعظم بنایا اور دلیر خاں جیسے شخص کو مرزا راجا کے تابع رکھا، جس کے بارے میں

اورنگ زیب کی رائے بھی کہ خود اس کے سوا کوئی خان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

اورنگ زیب کا ولی عہد محمد معظم بہادر شاہ ذاتی تحقیق کی بنا پر شیعہ ہو گیا تھا، اورنگ زیب اس سے بے خبر نہ تھا۔ مگر اسے بدستور ولی عہد رکھا اور تقسیم سلطنت کی آخری وصیت میں مرکزی سلطنت اس کے لیے تجویز کی۔

ہمارے زمانے میں تاریخ کا نقشہ خواہ مخواہ بگاڑا جا رہا ہے۔ ہر سرزمین کے خاص حالات ہوتے ہیں۔ مسلمانوں کے لیے سیدھا راستہ یہی تھا کہ ان خاص حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے پالیسی بنائیں جس سے اسلامی مقاصد کو تقویت پہنچے، نہ یہ کہ ہر قدم پر ایک خاص طریق و مسلک کو اپنا کر باقی سب کے خلاف اعلانِ جنگ فرما دیں۔ یہ طریقہ نہ اکبر نے اختیار کیا اور نہ اورنگ زیب نے۔ اب بے اساس آرائیوں کے ذریعہ سے پوری تاریخ کی تعبیرات کے جو حصون استوار کیے جا رہے ہیں، اُن سے دماغوں میں ژولیدگی اور افکار میں ابتری کے سوا کیا نتیجہ نکل سکتا ہے۔

خدا کے لئے وہ تعبیرات اختیار فرمایئے، جو تاریخی اعتبار سے مسلّم ہوں۔ نیز زیبا سمجھی جائیں۔ شاہ ولی اللہ کی تحریرات کی تعبیرات بھی میرے نزدیک قطعاً زیبا معلوم نہیں ہوتیں۔ لیکن اس بارے میں مجھے یہاں بحث نہ چھیڑنی چاہیئے۔

ماہنامہ "الرحیم" کا ایک قاری

چند توضیحات

تخت و تاج کے لیے شاہجہان کے لڑکوں میں جنگ شروع ہوئی تو تمام اہم اور ممتاز راجپوت فوجی سردار دارا کی حمایت میں اُمنڈ پڑے۔ دھرمادت میں راجہ جسونت سنگھ نے اورنگ زیب کو آگرہ کی طرف بڑھنے سے روکا۔ راجہ کے ساتھ بے شمار راجپوت سردار تھے۔ لڑائی شروع ہوئی تو اس نے اپنے ہراول میں دس ہزار جوان رکھے۔ جس میں زیادہ تر راجپوت تھے۔ ان کی نگرانی میں مکند سنگھ ہاڈا، راجہ سجان سنگھ بندیلہ، امر سنگھ، چندراوت، رتن راٹھور، ارجن گور، دیال داس جھالا، موہن سنگھ ہاڈا اور دوسرے نامی سرداروں

کے ذمے تھے۔ التمش میں مہیش داس گوڑ، گوردھن راٹھور اور دوسرے جانباز راجپوت تھے۔ قول میں خود راجہ جسونت سنگھ دو ہزار راجپوت سواروں اور بھیم داس ولد راجہ بیٹھل داس کور اور دوسرے سرداروں کے ساتھ تھا۔ میمنہ قول پر راجہ جے سنگھ سیسودیہ اپنے بہادر راجپوت سرداروں کے ہمراہ تھا۔ لشکر کا کیمپ مالوجی، پرسوجی اور راجہ دیبی سنگھ کی نگرانی میں تھا۔ کچھ مسلمان سردار بھی ضرور تھے لیکن وہ انگشت بدنداں تھے کہ وہ کیا دیکھ رہے ہیں۔

...... اس کے بعد سموگڑھ کے میدان میں دارا نے اورنگ زیب کے مقابلے میں پھر ایک بار قسمت آزمائی کی اور راجپوتوں نے بھی ایک بار پھر دارا کو تخت پر بٹھانے کی کوشش کی۔ چنانچہ ان کے جتنے آزمودہ کار اور نامور فوجی سردار تھے، مثلاً .... وغیرہ سب اکٹھے ہوئے ...... اور راجپوتوں کے تمام نامور سردار مثلاً ...... ایک ایک کرکے دارا کی خاطر مارے گئے۔

...... عام طور سے یہ خیال ہے کہ اورنگ زیب نے اپنی تنگ نظری سے راجپوتوں کو اپنے سے بدظن کیا۔ اورنگ زیب تنگ نظر تھا یا نہیں، یہ بحث ہمارے موضوع سے باہر ہے، لیکن راجپوت اکبری دور سے شاہجہانی عہد تک دربار اور میدانِ جنگ میں حکومت کے درباری امراء اور فوجی سرداروں کے دوش بدوش رہ کر سلطنت کے ایسے ضروری اجزا بن چکے تھے کہ اورنگ زیب جیسا ہوش مند اور زیرک حکمران رواداری، راجپوتوں کی دلجوئی اور دلداری کے لیے نہیں تو کم از کم اپنی حکومت کے مصالح اور سلطنت کی پائیداری کی خاطر اُن کو کسی حال میں نظر انداز نہیں کر سکتا تھا......

یہ ضرور ہے کہ وہ اپنے مذہب کا بڑا پابند بلکہ گرویدہ رہا اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اسی کے دور میں مرہٹوں کے ارد گرد ہندوؤں کی ایک غیر معمولی طاقت ابھرنی شروع ہوئی (نہ صرف مرہٹوں کے ارد گرد بلکہ سکھوں اور جاٹوں کے ارد گرد بھی۔ اڈیٹر) مگر اس کو اورنگ زیب کی تنگ نظری اور تنگ دلی کا نتیجہ قرار دینا مورخانہ بصیرت کی دلیل نہیں۔ بلکہ اس کا تجزیہ اس طرح کیا جائے تو صحیح ہوگا کہ مسلمانوں کی تنظیمی اور اجتماعی زندگی سے ہندو متاثر ہو رہے تھے۔ راجپوتوں نے سلاطینِ دہلی اور مغل بادشاہوں سے برابر ٹکر لی، لیکن یہ ٹکر انفرادی طور پر راجپوت خاندانوں کی رہی، وہ کبھی متحد ہو کر نہیں لڑے...... اس اختلاف اور نفاق کے مضرت رساں پہلو سے ہندو اچھی طرح واقف ہو چکے تھے، اس لیے فطری اور لازمی طور پر ان میں اجتماعی اور تنظیمی شعور پیدا ہوتا گیا، جس کا عملی ظہور مرہٹوں کی قیادت میں ہوا۔ اجتماعی شعور کے ساتھ ساتھ ان میں مذہبی خودداری، سیاسی سربلندی اور

معاشرتی عزتِ نفس کا احساس بڑھتا گیا اور وہ ان تمام باتوں پر اپنی ناگواری کا اظہار کرنے لگے، جن کو وہ پہلے اجتماعی شعور کے نہ ہونے سے ناقابلِ التفات سمجھتے رہے۔ انہوں نے اپنی ناگواری کا اظہار کر کے حکمران طبقہ کے احساسِ برتری کو بھی دور کرنے کی کوشش کی۔ ان کا ایسا کرنا قابلِ اعتراض نہیں کہا جا سکتا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ ظاہر ہے کہ حکمران طبقہ اپنی برتری اور سطوت زائل ہونے کیوں دیتا، خصوصاً جب اس کے پاس طاقت و حشمت کے علاوہ اپنی گوناگوں فضیلت کے احساس کی شدت بھی تھی . . . .

(ماخوذ از "ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ کا فوجی نظام" مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن ایم۔ اے)

(حضرت مجدد الف ثانیؒ کی تجدیدی دعوت کا اوّلین مخاطب دراصل یہی حکمران طبقہ تھا۔ جسے اس وقت ہندوستان میں برتری اور سطوت حاصل تھی۔ اور اس کے پاس طاقت و حشمت کے علاوہ اپنی گوناگوں فضیلت کے احساس کی شدت بھی تھی ——— مُدیر)

کتاب "ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ کا فوجی نظام" کا یہ اقتباس بھی ملاحظہ ہو:۔

. . . . . ترکوں اور مغلوں کی مذہبی زندگی میں امامت اور اقتدار کا جزو بہت ہی اہم رہا۔ وہ روزانہ پانچوں وقت کی نماز باجماعت میں ایک امام کی آواز پر رکوع اور سجود کرنے کے عادی رہے۔ ہر فرد واحد اپنے کو ایک وسیع ترملی اور روحانی وجود سے منسلک پاتا تھا اس لیے غیر شعوری طور پر ان میں اجتماعی زندگی کا ایک خاص مزاج خود بخود موجود رہتا، جن سے جنگی ترتیب و تنظیم میں خاص طور پر فائدے پہنچتے رہے۔ وہ ایک فوجی سردار کی قیادت آسانی سے قبول کر لیتے اور اس کے حکم پر منظم طریقہ سے متحرک ہوتے اور میدانِ جنگ میں مرتب طریقے سے صف آرا بھی ہو جاتے"

". . . . . . اکبر کے سوا شاید ہی کوئی ایسا حکمران تھا، خواہ وہ کتنا ہی رند مشرب کیوں نہ ہو، جو ضرورت کے وقت اپنے سپاہیوں کے مذہبی جذبات کو نہ ابھارتا ہو، وہ کسی راجہ کے خلاف لشکرکشی کرتا تو اس کے اسباب ذاتی یا سیاسی بھی ہوتے، تو بھی اس کو وہ جہاد کا رنگ ضرور دے دیتا۔ اور اپنے لشکریوں کی تمام مجاہدانہ اسپرٹ کو ابھار کر ان کو میدانِ جنگ میں اتارتا اور یہ لشکری بھی مذہبی جذبات سے مغلوب ہو جاتے اور غازی کا درجہ یا شہادت کی سعادت حاصل کرنے کی خاطر پوری سرفروشی سے کام لیتے اور جب یہ جذبہ ابھر جاتا تو یہ بہتر سے بہتر آلاتِ حرب اور عمدہ سے عمدہ فوجی تنظیم سے زیادہ مفید اور کارگر ثابت ہوتا . . . . . راجپوتوں میں اس قسم کے مذہبی جذبات ابھارنے والا کوئی فوجی سردار نہ ہوتا۔ یا اگر ابھارتا بھی تو اس پیمانے پر نہ ابھرتے، جو ترکوں اور افغانوں میں ابھرا کرتے تھے . . . . . "

(حضرت مجدد الف ثانیؒ کی تجدیدی دعوت کی بدولت ترک اور افغان طبقوں کے ان مذہبی جذبات کو ایک تازہ پیامِ عمل ملا، اور اگرچہ "شاہجہان کے آخری دور میں مغل لشکر اور دربار میں راجپوتوں کا غلبہ اور استیلاء نظر آتا تھا اور ان کی یہ حیثیت بھی ہو گئی تھی کہ وہ تخت و تاج کے وارث کی قسمت بھی بنا اور بگاڑ سکتے تھے[1]" اورنگ زیب کی قیادت میں ترک اور افغان سیادت ان پر غالب رہی۔ مُدیر)

---

[1] ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ کا فوجی نظام ؎

مطبوعات شاہ ولی اللہ اکیڈمی

★

لمحات (عربی)

شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے فلسفہ تصوف کی یہ بنیادی کتاب عرصے سے نایاب تھی۔ مولانا غلام مصطفی قاسمی کو اُس کا ایک پرانا قلمی نسخہ، جو اغلاط سے پُر تھا، ملا۔ موصوف نے بڑی محنت سے اس کی تصحیح کی، اور شاہ صاحب کی دوسری کتابوں کی عبارات سے اُس کا مقابلہ کیا۔ اور وضاحت طلب امور پر تشریحی حواشی لکھے۔ کتاب کے شروع میں مولانا کا ایک مبسوط مقدمہ ہے۔

شاہ صاحب نے اس کتاب میں "وجود" اور اُس سے کائنات کا جس طرح صدور ہوا ہے، اُس پر بحث کی ہے، اور اپنی الہیاتی حکمت کے دوسرے مسائل بھی بیان کئے ہیں۔ قیمت دو روپے

——:o:——

شاہ ولی اللہ کی تعلیم

از پروفیسر غلام حسین جلبانی سندھ یونیورسٹی

پروفیسر جلبانی ایم اے صدر شعبہ عربی سندھ یونیورسٹی کے برسوں کے مطالعہ و تحقیق کا حاصل یہ کتاب ہے اس میں مصنف نے حضرت شاہ ولی اللہ کی پوری تعلیم کا احصاء کیا ہے اُس کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل بحثیں کی ہیں۔ اُردو میں شاہ صاحب کی تعلیم پر یہ پہلی جامع کتاب ہے۔

کتاب مجلد ہے۔ قیمت ۷/۵۰ روپے ہے

شاہ ولی اللہ اکیڈمی ۔ صدر ۔ حیدرآباد ۔ پاکستان

Monthly "AR-RAHIM" Hyderabad Regd. S. No. 2548

شاہ ولی اللہ اکیڈمی

اغراض و مقاصد

۱۔ شاہ ولی اللہ کی تصنیفات اُن کی اصلی زبانوں میں اور اُن کے تراجم مختلف زبانوں میں شائع کرنا۔

۲۔ شاہ ولی اللہ کی تعلیمات اور ان کے فلسفہ و حکمت کے مختلف پہلوؤں پر عام فہم کتابیں لکھوانا اور اُن کی طباعت و اشاعت کا انتظام کرنا۔

۳۔ اسلامی علوم اور بالخصوص وہ اسلامی علوم جن کا شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتب فکر سے تعلق ہے، اُن پر جو کتابیں دستیاب ہو سکتی ہیں اُنہیں جمع کرنا، تاکہ شاہ صاحب اور اُن کی فکری و اجتماعی تحریک پر کام کرنے کے لئے اکیڈمی ایک علمی مرکز بن سکے۔

۴۔ تحریک ولی اللہی سے منسلک مشہور اصحاب علم کی تصنیفات شائع کرنا، اور اُن پر دوسرے اہل قلم سے کتابیں لکھوانا اور اُن کی اشاعت کا انتظام کرنا۔

۵۔ شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتب فکر کی تصنیفات پر تحقیقی کام کرنے کے لئے علمی مرکز قائم کرنا۔

۶۔ حکمت ولی اللہی اور اُس کے اصول و مقاصد کی نشر و اشاعت کے لئے مختلف زبانوں میں رسائل کا اجراء

۷۔ شاہ ولی اللہ کے فلسفہ و حکمت کی نشر و اشاعت اور اُن کے سامنے جو مقاصد تھے اُنہیں فروغ دینے کی غرض سے ایسے موضوعات پر جن سے شاہ ولی اللہ کا خصوصی تعلق ہے، دوسرے مصنفوں کی کتابیں شائع کرنا

محمد سرور پرنٹر پبلشر نے سعید آرٹ پریس حیدرآباد سے چھپوا کر شائع کیا۔

شاہ ولی اللہ اکیڈمی کا علمی مجلہ
الرحیم
ماہنامہ
شعبۂ نشر و اشاعت شاہ ولی اللہ اکیڈمی ○ صدر حیدرآباد
شوال المکرم ۱۳۸۳ھ مارچ ۱۹۶۴ء

قیمت سالیانہ :- آٹھ روپے

فی پرچہ :- پچھتر پیسے

جلد ۱ شوال سنہ ۱۳۸۳ھ مطابق مارچ سنہ ۱۹۶۴ء نمبر ۱۰

فہرست مضامین

شذرات

قاہرہ کی جامعۂ ازھر کی طرف سے ماہ رواں میں ایک اسلامی عالمی مؤتمر منعقد کی جارہی ہے جس میں دنیا کے کوئی ۳۰ ملکوں کے مندوب شریک ہوں گے۔ منتظمین نے ان ملکوں کے مشہور علمائے ممتاز دینی درس گاہوں اور تحقیقی کام کرنے والے اسلامی اداروں کے نمائندوں کو اس مؤتمر میں مدعو کیا ہے۔ مؤتمر کے اجلاس تقریباً دو ہفتے تک ہوتے رہیں گے اور ان میں دینی و علمی امور پر تبادلۂ خیالات کے علاوہ ان معاشرتی مسائل پر بھی غور و خوض ہوگا، جو آج تقریباً ہر سرزمین کے مسلمانوں کو درپیش ہیں۔ اس مؤتمر میں سیاسی معاملات زیر بحث نہیں آئیں گے۔

جامعۂ ازھر کی مدعو شدہ یہ اسلامی مؤتمر ایک مستقل حیثیت اختیار کرتی ہے یا نہیں؟ اس کے بارے میں ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن تمام دنیا کے نمائندہ مسلمان اہل علم و فکر کے اس طرح کے اجتماع ہر لحاظ سے مفید ہیں۔ ان سے ایک تو مسلمان علماء میں علمی و فکری روابط پیدا ہوں گے، دوسرے ہر ملک کے مسلمانوں کے معاشرے میں جو بنیادی تبدیلیاں آرہی ہیں، ان سے وہ واقف ہوسکیں گے نیز ایسے اجتماعات میں ان پر مل جل کر غور و فکر ممکن ہوگا۔ اور اس سے امید ہے اچھے نتائج نکلیں گے۔

ایک زمانے میں حکومتوں کا کام جو زیادہ تر شخصی ہوتی تھیں، صرف امن عامہ قائم رکھنا اور ملک کی حفاظت کرنا ہوتا تھا، لیکن جب جمہوری نظام کی بنیاد پڑی اور کاروبار حکومت میں جمہور کے نمائندے

دخیل ہوئے، تو حکومتوں کا دائرۂ کار و اختیار بھی وسیع ہوا، اور جیسے جیسے حلقہ ہائے انتخاب میں وسعت ہوتی گئی، حکومتوں کی ذمہ داریاں اور اسی حساب سے ان کے اختیارات بھی بتدریج بڑھتے گئے، پھر جب سے فلاحی مملکت کا تصور عام ہوا ہے۔ اور منصوبہ بندی بحیثیت ملکی و قومی سیاست کا ایک لازمی جزو بن گئی ہے، حکومتوں کی ذمہ داریاں اور ان کے اختیارات اور بھی بڑھ گئے ہیں۔ اور وہ ایک لحاظ سے زندگی کے ہر شعبے میں ہمہ گیر ہوتی جا رہی ہیں۔

یہ اچھا ہے یا برا، یہ بحث دوسری ہے۔ لیکن ایسا ہونا ناگزیر تھا، اور اس سے کسی ملک کو بھی مفر نہیں۔ یہاں تک کے برطانیہ جیسے ملک کو جو کسی زمانے میں "آزاد تجارت" کا سب سے بڑا علمبردار تھا۔ آخر میں فلاحی مملکت کی پابندیاں قبول کرنی پڑیں۔ ان حالات میں آج کل کی حکومتوں کو، ان کے فرمانروا اور حاکم افراد سے قطع نظر، جو بالعموم ملک کی سیاسی، معاشی اور معاشرتی ضرورتوں اور تقاضوں کو پیش نظر رکھنے پر مجبور ہوتی ہیں، اپنے عوام کی شخصی معاشرتی اور اقتصادی زندگی میں کسی نہ کسی حد تک دخل دینا پڑتا ہے اور پاکستان جیسے ملک میں جو نو آزاد، کم ترقی یافتہ اور غریب و پس ماندہ ملکوں میں سے ہے، قومی حکومت کو ان معاملات میں شاید اور زیادہ دخل دینا پڑے۔

ہم اپنے محترم علمائے کرام سے یہ درخواست کریں گے کہ وہ شخصی عائلی معاشرتی اور اقتصادی قسم کی مجوزہ قانونی تبدیلیوں کو جو وقتاً فوقتاً حکومت کے زیر بحث آتی ہیں، اس تاریخی پس منظر اور اس کے تقاضوں کی روشنی میں دیکھیں ہم یہ نہیں کہتے کہ وہ اس ضمن میں حکومت کے ہر قانونی اقدام کی تائید کریں اور عملاً سیاسی اقتدار کے محض تابع بن کر رہ جائیں۔ ہمارے نزدیک علمائے کرام کا مقام اس سے بہت بلند ہے! بے شک وہ ان اقدامات پر جو ان کے نزدیک شریعت اسلامی کے منافی ہوں، ضرور تنقید کریں۔ اور ارباب اقتدار کی ایسی لغزشوں پر انہیں ٹوکیں اور سختی سے سخت لہجے میں ٹوکیں، لیکن اس معاملے میں ان کا منصب مرشد اور دینی رہنما کا ہونا چاہیئے۔ نہ کہ حکومت کے ایک سیاسی حریف کا۔ لیکن اگر خدانخواستہ ان مسائل کی آڑ میں "اسلام خطرے میں ہے" کی عوامی ایجی ٹیشن شروع کی گئی اور اس طرح مذہب کے نام سے عوام کے جذبات اکسا کر سیاسی اقتدار حاصل کرنے کی کوشش ہوئی، تو اس کا انجام نہ ان اقتدار خواہ سیاسی علماء کے لئے اچھا ہوگا، اور نہ اس سے ملک و قوم کو کوئی فائدہ پہنچے گا۔

پاکستان کو اپنی موجودہ اقتصادی بدحالی، معاشرتی پس ماندگی اور ذہنی جمود سے جلد سے جلد نکلنا ہے پاکستان کی خوشحالی ترقی اور استحکام کی راہ میں ہمارے علمائے کرام سنگ گراں نہ بنیں بلکہ وہ اس میں ممد و معاون ثابت ہوں۔

اس سلسلے میں یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ آخر کیا بات ہے کہ جو مسلمان ملک غیر ملکی غلامی یا ملکی استبداد سے آزاد ہوتا ہے اور اسے اپنے عوام کی معاشرتی اصلاح و اقتصادی ترقی کے کام ہاتھ میں لینے پڑتے ہیں، وہ بعینہ اسی قسم کی اصلاحات کرنے کا سوچتا ہے، جیسے پاکستان کے عائلی و معاشرتی نظام میں کی جا رہی ہیں۔

کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ تمام مسلمان ملکوں کے اس وقت ایک ہی طرح کے روگ ہیں اور وہاں کے اصحاب رائے و اختیار اپنی اپنی جگہ کم و بیش ایک سے علاج ڈھونڈھ رہے ہیں۔

ہالینڈ کے ڈاکٹر بالجن جن کا ذکر ان کالموں میں پہلے ہو چکا ہے، گزشتہ اکتوبر میں کوئی بیس ایک دن شاہ ولی اللہ اکیڈمی میں گزار کر لاہور گئے تھے، وہاں سے وہ پشاور تشریف لے گئے، ان دونوں شہروں کے اہل علم اصحاب اور وہاں کے کتب خانوں سے استفادہ کرنے کے بعد وہ دہلی گئے اور دہلی سے علی گڑھ، لکھنؤ اور حیدرآباد تک پہنچے، فروری کے اواخر میں موصوف دوبارہ شاہ ولی اللہ اکیڈمی میں تشریف لائے۔ اور کچھ عرصہ پھر یہاں قیام کیا اور اس میں انہوں نے حضرت شاہ ولی اللہ کی ایک کتاب جس میں خاص طور سے "وجود" پر بحث ہے، ڈاکٹر عبدالواحد ہالے پوتا کے ساتھ مل کر مطالعہ کی اب وہ اپنے وطن روانہ ہو گئے ہیں، جہاں وہ شاہ ولی اللہ کے متعلق اپنی کتاب مکمل کریں گے۔

ڈاکٹر بالجن ایک مغربی محقق ہیں، اور ظاہر ہے ان کا "مطالعہ شاہ ولی اللہ" اس نوعیت کا نہیں ہوگا، جیسا کہ عام طور سے ہمارا ہوتا ہے، لیکن انہوں نے اس سلسلے میں بعض ایسی باتیں سمجھائیں، جو کارکنان اکیڈمی کے لئے بڑی مفید ہیں، خدا کرے ڈاکٹر صاحب موصوف کی کتاب جلد مکمل ہو جائے۔

اکیڈمی میں "فیلوز" کی شرکت کے بعد درس و تدریس کا سلسلہ باقاعدہ شروع ہو گیا ہے اس کے علاوہ مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی صاحب کے اس درس میں مقامی عربی مدارس کے بعض منتہی طلبہ بھی شریک ہوتے ہیں۔ خدا کے فضل سے اس کام کا آغاز ہو گیا ہے اب وقت کے ساتھ ساتھ انشاء اللہ اس کا دائرہ یقیناً وسیع ہوگا۔

نبوّت

حافظ عباد اللہ

حضرت شاہ ولی اللہ ازالۃ الخفا الجزء الاوّل میں فرماتے ہیں۔

"پیش اہلِ حق نبوّت مکتسب نیست کہ بریاضتِ نفسانیہ و بدنیہ آنرا تواں یافت و نہ امری است جبلی کہ نفسِ پیغمبر را نفسِ قدسیہ آفریدہ اند"

لیکن اسکے ساتھ یہ بات واضح رہے کہ جس بشر کو اللہ تعالیٰ نبوّت کا خلعت عطا فرماتا ہے، وہ اس کا سزاوار ضرور ہوتا ہے۔ اور اس میں خلعت نبوّت کو پہننے کی قدرتی صلاحیت اور استعداد ہوتی ہے۔ چنانچہ مقام المحمود میں اس نکتہ کی صراحت کرتے ہوئے شاہ صاحب فرماتے ہیں۔

"ہر کسی کام کو سرانجام دینے کے لئے پہلے اس کام کے کرنے کی استعداد ہونی چاہیئے اسی طرح ایک نبی جس کو نبوت کا کام سرانجام دینا ہے اس کے اندر نبوّت کی استعداد کا ہونا ضروری چیز ہے۔ اور یہ استعداد وہبی ہوتی ہے۔ جو کسب سے حاصل نہیں ہو سکتی۔"

انبیاء کے ظہورِ قدسی سے پہلے دنیا کے اخلاقی تمدّنی معاشی سیاسی اور مذہبی نظام کا دگرگوں ہونا ایک ناگزیر امر ہے۔ جس طرح درخت کی ٹہنیوں کو خزاں کے تند و تیز جھونکے بے برگ و بار کر دیتے ہیں تو پروردگار عالم بادِ بہاری کو وجود بخشتا ہے۔ اور وہ انہیں انواع و اقسام کے پھولوں سے مالا مال کر دیتی ہے بعینہٖ جب کبھی انسان کفر کی تیرہ و تار وادی میں گم کردہ راہ ہوتا ہے تو غیرت حق جنبش میں آتی ہے اور آفتاب نبوت کی شعاعیں اس عالم کے ذرّہ ذرّہ کو منوّر کر دیتی ہیں۔ تاکہ انسان اللہ کی پسندیدہ راہ اختیار

کرے جس پر کہ انسانیت کا دارومدار ہے۔

مشکواۃ نبوت سے جو نور ہدایت ابلتا ہے اس کا سرچشمہ وہ عالم حقیقت ہے جس کے عرفان سے انسان قاصر ہے۔ اولیاء و اصفیاء نور ربّانی کو بواسطۂ نور نبوّت حاصل کرتے ہیں جس طرح ظلمتِ شب میں تاروں کی جھلملاہٹ کچھ نہ کچھ روشنی پیدا کردیتی ہے لیکن طلوع آفتاب کے وقت اس کی ضیا پاشی کے سامنے ان کا نور مدہم پڑنے لگتا ہے اسی طرح اولیاء و اصفیاء کا سلسلہ بھی کسی نہ کسی حد تک کفر کی تاریکی کو کم کرتا ہے۔ لیکن انبیاء علیہم السلام کا ظہور کچھ اور ہی کیفیت لئے ہوتا ہے ان کی آمد سے کائنات کی سوگوار ہستی حقیقی مسرتوں سے مالا مال ہوتی ہے اور تمام عالم جگمگا اٹھتا ہے۔

غرض جس طرح آفتاب کی روشنی جب کسی شفاف چیز پر پڑتی ہے، تو وہ اپنا پورا جلوہ دکھاتی ہے بجز سیاہ شیشے کے جو اپنی سیاہی کی وجہ سے محروم رہتا ہے بعینہٖ انبیاء علیہم السلام کی ہدایت قلب مصفّا کا واسطہ تلاش کرتی ہے۔ جن لوگوں کے دل سیاہ و تاریک ہوتے ہیں انہیں اشارات و ہدایات قدسیہ سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔

شاہ ولی اللہ صاحب نے اگرچہ بعثت انبیاء کے اجمالی اسباب کا ذکر کیا ہے۔ لیکن انہوں نے اس بات سے بھی آگاہ کیا ہے کہ ان اسباب کا صحیح علم سوائے اللہ تعالےٰ کے کسی اور کو نہیں ذیل میں ہم نبوت کے متعلق صوفیاء کرام و حکما کا مسلک واضح کرینگے۔ جن سے شاہ صاحب نے اختلاف کیا ہے اوّل الذکر کے نزدیک نبوّت وہبی ہے۔ لیکن موخر الذکر اسے کسبی خیال کرتے ہیں۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ نبوت نہ کسبی ہے اور نہ وہبی بلکہ خاص موقعوں پر نیک بندوں میں سے ایک کو عنایت کی جاتی ہے۔

صوفیاء کا موقف

صوفیا جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، نبوّت کو سر تا سر وہبی تصوّر کرتے ہیں ان کا خیال ہے کہ اللہ تعالےٰ نے سب سے پہلے نور محمدی کو پیدا کیا۔ جو حضرت آدم سے منتقل ہوتا ہوا رسول اللہ صلعم پر مکمل طور سے ظاہر ہوگیا۔ اس طرح نبوّت کا تصوّر ان کے ہاں وہبی ہو کر رہ گیا ہے۔ وہ اپنے اس خیال کی تائید میں عموماً یہ حدیث بطور شہادت پیش کرتے ہیں "انا من نور اللہ والمومنون من نوری"، کہ میں اللہ کے

نور سے ہوں اور سارے مومن میرے نور سے ہیں۔ ؎

خورشید آسمان ظہورم عجب مدار
ذرات کائنات اگر گشت مظہرم

صوفیاء کا عقیدہ ہے کہ حق اور خلق کے مابین نبی اکرم صلعم ہی کا توسط ہے۔ خلق کی حقیقتیں آپ کی ہی حقیقت سے ظاہر ہوتی ہیں۔ اور خلق کا وجود آپؐ کے وجود سے نکلا ہے۔

حکماء کا نظریۂ نبوّت۔

صوفیاء کے نزدیک چونکہ نور نبوّت انبیاء میں پیدائش سے موجود ہوتا ہے لہذا ملکۂ نبوت وہبی ہے حکماء کے نزدیک ملکۂ نبوّت وہبی نہیں بلکہ کسبی ہے۔ امام غزالیؒ المنقذ من الضلال میں فرماتے ہیں۔ نبوّت پر ایمان لانے کے معنی یہ ہیں کہ یہ اقرار کیا جائے کہ عقل سے بالاتر ایک مقام ہے جس میں آنکھ کھل جاتی ہے اور اس کے ذریعہ سے خاص خاص مدرکات کا ادراک کیا جاتا ہے۔ اور عقل ان مدرکات کے ادراک سے ایسی ہی عاجز ہے جیسے کان رنگوں کے ادراک سے۔

اس خیال کی مزید تصریح فرماتے ہوئے امام صاحب لکھتے ہیں" نبوّت کا یقین اسی شخص کو حاصل ہو سکتا ہے۔ جس کو خود نبوت کا مقام حاصل ہو۔ یا جو نفسِ قدسی رکھنے کے باعث مابعد الطبیعی حقائق کو معلوم کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اور خلاصہ یہ ہے کہ جن لوگوں کو اس کا ذوق نہیں دیا گیا ہے وہ نبوّت کی حقیقت کے سلسلہ میں بجز نام کے اور کسی چیز کا ادراک ہی نہیں کر سکتے۔"

ذوقِ ایں بادہ ندانی بخدا تا نچشی

یہاں یہ بات واضح رہے کہ امام صاحب نے جو کچھ لکھا ہے نبوّتِ عامہ کے متعلق لکھا ہے نبوّت تشریعی ان کے نزدیک ختم ہو چکی ہے۔ لیکن بایں ہمہ امام ابن تیمیہ نے مجموعۃ الفتاویٰ و بعض دیگر تصنیفات میں امام غزالی پر نکتہ چینی کی ہے کہ وہ فلسفہ سے مرعوب ہو کر وحی اور نبوّت کے باب میں ایسی باتیں لکھ گئے ہیں جو قرآن و حدیث کی تصریحات کے سراسر خلاف ہیں حقیقت یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام چونکہ اصحاب شریعت ہوتے ہیں اس لئے منصب نبوّت انہیں کے ساتھ مخصوص کیا گیا ہے۔ حضور سرور کائنات صلعم

کے بعد کسی شخص کا نبی ہونا متصور ہی نہیں ہو سکتا۔ اس لئے نبوّت عامہ کا مفہوم "ولایت" کے سوا کچھ نہیں۔ امام غزالیؒ یا مولانا روم کا مطلب نبوّتِ عامہ سے ولایت ہی ہے۔ مثلاً مولانا روم کا یہ شعر ملاحظہ ہو۔

فکر کن در راہِ نیکو خدمتے

تا نبوّت یابی اندر اُمتے

(مثنوی دفتر پنجم صـ۴۲)

یعنی تو خلق خدا کی خدمت کر تا کہ امت میں رہتے ہوئے نبوت پا جائے۔ ظاہر ہے محض خلق خدا کی خدمت کرنے سے مقام نبوت حاصل نہیں ہو سکتا۔ نبوت کے تقاضے کچھ اور ہی ہوا کرتے ہیں۔ یہاں مولانا روم کا مطلب نبوت نہیں بلکہ ولایت ہے۔ اسی طرح مثنوی کے دفتر پنجم صفحہ ۷۶ پر فرماتے ہیں۔

چوں بدادی دستِ خود در دستِ پیر

پیر حکمت کو علیم است و خبیر

کو نبیِ وقتِ خویش است اے مرید

زاں کہ زو نورِ نبی آمد پدید

یعنی جب بیعت کے وقت تو اپنا ہاتھ اپنے پیر کے ہاتھ میں دیتا ہے۔ اس لئے کہ وہ اس کے رموز سے پوری طرح باخبر ہے۔ اور اس کے لئے وہ اپنے وقت کا نبی ہے کیونکہ نبی کریم کا نور اس کے ذریعہ سے ظاہر ہوا۔

ظاہر ہے یہاں بھی نبوت کے معنی ہرگز اصل معنوں میں نہیں لئے جا سکتے۔ مولانا نے پیر کامل اور آنحضرت صلعم کے درمیان جو حدِ فاصل ہے بڑی وضاحت سے بیان کر دی ہے۔ اس لئے کسی پیر کو نبی کہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اسی طرح شیخ اکبر فتوحاتِ مکیہ جلد دوم باب ۷۳ صفحہ ۸۲ میں لکھتے ہیں کہ نبوّت مخلوقات میں قیامت تک جاری ہے۔ گو کہ شریعت کے لحاظ سے وہ ختم ہو چکی ہے اور شریعت نبوّت کے حصوں میں سے ایک حصہ ہے۔ اور یہ ناممکن ہے کہ خدا تعالیٰ کا الہام دنیا سے بند ہو جائے۔

کیونکہ اگر وہ بند ہو جائے تو دنیا کی روحانی غذا ختم ہو جاتی ہے اور روحانی وجودوں کے زندہ رہنے کا کوئی ذریعہ باقی نہیں رہتا۔

محی الدین شیخ اکبرؒ نے خود ہی یہ بات واضح کر دی ہے کہ نبوت شریعت اور نزول وحی سے عبارت ہے۔ جب اس کے دونوں اجزاء میں سے ایک جز باقی رہ جائے تو اسے نبوت کے معنوں میں نہیں بلکہ ولایت کے معنوں میں سمجھنا چاہیئے۔ سید عبدالکریم جیلی نے اس امر کی مزید تصریح فرمائی ہے لکھتے ہیں۔

نبوت تشریعی کا حکم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بند ہو گیا اور اس وجہ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبین کہلائے کیونکہ وہ مکمل تعلیم لیکر آئے تھے۔

(الانسان الکامل باب ۳۶ صـ۶۹)

غرض جن لوگوں نے نبوت کو کسبی خیال کیا ہے۔ انہوں نے نبوت کے معنی یقیناً ولایت کے لئے ہیں ورنہ مقام نبوت ایک ایسا مقام ہے جسے اب کوئی حاصل کر ہی نہیں سکتا۔

جب حضرت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ نبوت نہ سرتا سر کسبی ہے نہ سرتا سر وہبی تو ان کا مطلب فقط اس قدر ہے کہ نبوت اللہ تعالےٰ اپنے نیک بندوں میں سے جسے چاہے وقت مقررہ پر عطا کرتا ہے۔ لیکن چونکہ نبوت تشریعی کا دروازہ بند ہو چکا ہے نبوت عامہ کے جز کو نبوت نہیں کہا جا سکتا۔ ہر زمانہ میں ہر بستی میں صرف ایک ہی نبی مبعوث ہوتا رہا ہے لیکن اگر نبوت عامہ کی بناپر ہم نبوت کا دعویٰ کرنے لگیں تو جگہ جگہ سے انبیاء کا ایک ہجوم پیدا ہو جائیگا۔ جب ایسی صورت حال ہو جائے تو انبیاء تعداد میں زیادہ ہونگے اور غیر انبیا انکے مقابلہ میں بہت کم۔

صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ نے سب سے پہلے نور محمدی کو پیدا کیا۔ پھر یہ نور کسی قدر حضرت آدم علیہ السلام میں منتقل کیا گیا، اس کے بعد دیگر انبیاء میں حتیٰ کہ حضور سرور کائنات جب اس دنیا میں تشریف لائے تو آپؐ کی ذات بابرکات میں یہ نور مکمل طور پر ظاہر ہوا۔

قصیدہ تائیہ ابن فارض کے مندرجہ ذیل بیت کا مطلب بیان کرتے ہوئے حضرت نظام الدین چشتی تھانیسریؒ فرماتے ہیں۔

اِنّی و اِن کنت ابن آدم صورۃً
فلی فیہ معنیٰ شاہدٌ بابوّتی

چوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وجودِ خود را بنظر شہود بہ آں حقیقت متحد بیند ناچار گوید۔

اِنّی و اِن کُنتُ ابن آدم صُورۃً

بدرستی کہ من اگرچہ فرزند آدم از روئے صورتِ عنصری

فلی فیہ معنیٰ شاہدٌ بابوتی

پس مراد آں آدم معنی است کہ آں معنی گواہ است پدری من وآن معنی حقیقت اعیانی آدم است کہ متفرع و متولد از حقیقت محمدی است۔

گفت بصورت ارچہ ز اولاد آدم
از روئے مرتبہ بہمہ حال برترم

یعنی جب آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے وجود عنصری کو اپنی حقیقت محمدی کے ساتھ شہود کی نظر سے متحد اور ایک دیکھا تو یوں فرمایا۔

انی و ان کنت ابن آدم صورۃً

میں اگرچہ عنصری صورت میں آدم علیہ السلام کا فرزند ہوں۔

فلی فیہ معنیٰ شاہدٌ بابوتی

مگر آدم میں ایک چھپی ہوئی بات ہے جو اس بات کی گواہ ہے کہ میں آدم کا باپ ہوں اور وہ چھپی ہوئی بات آدم کی حقیقت اور عین ہے۔ جو حقیقت محمدی سے متفرع اور متولد ہوئی ہے۔ یعنی اگرچہ صورت کے لحاظ سے آدم کی اولاد ہوں لیکن اپنے مرتبہ کے لحاظ سے ہر حال میں سب سے برتر ہوں

مولانا جامیؒ مذکورہ بیت کا مطلب ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں۔

”من (حضور سرورِ کائنات صلعم) اگرچہ بہ حسب صورت حسّی و بدن عنصری خود پسر آدمم کہ ابوالبشر است۔ اما مرا از برائے من در وے از روی معنی گواہی است بر پدر بودن۔

من دیرا واں انتشار ظاہر شدن حقیقت آدم است از حقیقت من و انتشار صورتِ وجودی آدم است از صورت وجودی من چنانچہ گذشت واگر چنانکہ بہ حسب وجودِ عنصری گیرند باں اعتبار تواند بود کہ وے علتِ غائی وجودِ آدم است و علتِ غائی باعتبار وجود علمی مرتبہ پدریت بنت باذوالعنایۃ۔

غرض سطور مذکورہ بالا کی روشنی میں ہم حضور صلعم کو نبی اوّل و آخر تسلیم کرتے ہیں۔ نیز ہر وہ پیغمبر جو ان سے پہلے ان کے نور سے مبعوث ہوا، اوّل اور آخر ہونے کی صفت اپنے اندر رکھتا ہے۔ اس سے یہ مسئلہ بخوبی حل ہو جاتا ہے کہ حضرت یوسف، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام جنہیں لوگ اپنے زمانے میں نبی آخر الزمان سمجھتے رہے، فی الحقیقت ان کا یہ کہنا غلط نہیں تھا کیونکہ ہر وہ نبی جس کے بدن میں نور محمدی منتقل کیا گیا ہے، نبی اوّل و آخر کی صفت اپنے اندر رکھتا ہے۔ لیکن جب ہم حضور صلعم کو خاتم انبیاء کہتے ہیں تو ہمارا مطلب یہ ہوتا ہے کہ نور نبوت مکمل طور پر آچکا ہے اس کے بعد مزید آنے کی گنجائش باقی نہیں۔ گویا آپؐ مکمل طور پر نبی اوّل و آخر ہیں۔

آنحضرت سے پہلے تمام انبیاء کو نور نبوت اللہ تعالےٰ نے عطا کر دیا تھا۔ لیکن چونکہ یہ نور جزوی طور پر ان کے پاس پہنچا تھا۔ اس لئے ان کے زمانہ میں یہ کہنا غلط تھا۔ کہ اب کوئی اور نبی نہیں آئے گا۔ کیونکہ نور محمدی ہنوز مکمل طور پر ظاہر نہیں ہوا تھا۔ حضور صلعم کی ذاتِ بابرکات کے ساتھ نور محمدی نے مکمل طور پر ظہور کیا۔ اور اس کے بعد یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ اب کوئی نبی آئے گا۔

افسوس ہے کہ شیخ محی الدین ابن عربی نے پوری طرح مقام نبوت نہیں پہچانا۔ ورنہ وہ غیر تشریعی نبوت کا تصور پیش نہ کرتے۔ فی الحقیقت نبوت نام ہے تشریعی نبوت کا۔ غیر تشریعی نبوت کوئی نبوت نہیں۔ ذیل میں ہم فتوحات مکیہ جلد ۲ باب ۷۳، صـ۳ سے اقتباس پیش کرتے ہیں تاکہ ابن عربی کا نظریہ ہم پر واضح ہو سکے۔ لکھتے ہیں۔

وہ نبوت جو رسول اللہ صلعم کے ظاہر ہونے سے ختم ہو گئی ہے وہ تشریعی نبوت ہے۔ اس کا دنیا میں کوئی مقام نہیں۔ پس اب کوئی شریعت ایسی نہیں ہو گی جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم

کی شریعت کو موقوف کرے اور کوئی شریعت ایسی نہیں ہوگی جو آپؐ کی شریعت میں کوئی حکم زائد کرے۔ اور یہی معنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے ہیں کہ رسالت اور نبوت ختم ہو چکی ہے۔ پس میرے بعد اب کوئی رسول اور نبی نہیں ہے۔ یعنی کوئی ایسا نبی میرے بعد نہیں جو کسی ایسی شریعت پر قائم ہو جو میری شریعت کے مخالف ہو۔ بلکہ جب کوئی نبی آئے گا تو وہ میری شریعت کے ماتحت ہوگا۔ اور کوئی رسول میرے بعد نہیں ہوگا۔ یعنی کوئی شخص مخلوق اللہ میں ایسا نہیں ہوگا۔ جو کوئی نئی شرع لائے اور اس کی طرف لوگوں کو بلائے۔ یہی وہ چیز ہے جو ختم ہوئی ہے اور جس کا دروازہ بند ہوا ہے۔ نہ نبوت کا مقام بند ہوا ہے۔

اسی ضمن میں مزید فرماتے ہیں "جب عیسیٰ علیہ السلام دوبارہ نازل ہونگے۔ تو وہ نبوت مستقلہ کے ساتھ نہیں اتریں گے بلکہ وہ نبوت مطلقہ والے ولی ہو کر اتریںگے۔ اور یہ وہ نبوت ہے جس میں محمدی اولیاء بھی انکے ساتھ شریک ہیں۔"

(فتوحات مکیہ)

گویا ان کے نزدیک نبوت مخلوقات میں قیامت تک جاری ہے گو کہ شریعت کے لحاظ سے وہ ختم ہو چکی ہے۔ اور شریعت نبوت کے حصوں میں سے ایک حصہ ہے۔ اور یہ ناممکن ہے کہ خدا تعالے کا الہام دنیا میں سے بند ہو جائے کیونکہ اگر وہ بند ہو جائے تو دنیا کی روحانی غذا ختم ہو جاتی ہے۔ اور روحانی وجودوں کے زندہ رہنے کا کوئی ذریعہ باقی نہیں رہتا۔

(فتوحات مکیہ جلد ۲ باب ۷۳ صـ۸۲)

پھر وہ فرماتے ہیں۔ نبوت عامہ یعنی جو شریعت سے خالی ہے۔ وہ اس امت کے بڑے لوگوں میں تاقیامت جاری ہے۔ (فتوحات مکیہ جلد ۲ صـ۹۰ سوال ۲۳)

اسی طرح فصوص الحکم میں ارشاد ہوتا ہے کہ اللہ تعالے اپنے بندوں پر رحم فرما کر نبوت عامہ ان میں باقی رکھی۔ یعنی وہ نبوت جس کے ساتھ شریعت نہیں ہوتی۔

(شرح فصوص الحکم فصل حکمۃ قدریہ صـ۲۴۲)

حضرت ملا علی قاریؒ (جو گیارہویں صدی ہجری کے شروع میں گذرے ہیں) "موضوعات کبیر" میں تحریر فرماتے ہیں!

"میں کہتا ہوں کہ باوجود اس کے کہ اگر صاحبزادہ ابراہیم زندہ رہتے اور نبی ہو جاتے اور اس طرح اگر حضرت عمر بھی نبی ہو جاتے تو دونوں آنحضرت صلعم کے تابعین میں سے ہوتے جس طرح عیسیٰؑ خضرؑ اور حضرت الیاسؑ (کے بارے میں ہمارا عقیدہ ہے) یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کہ اگر ابراہیم زندہ رہتا تو ضرور سچا نبی ہوتا۔ آیت خاتم النبیین کے خلاف نہیں ہے کیونکہ خاتم النبیین کے معنی صرف اس قدر ہیں کہ آپؐ کے بعد کوئی ایسا نبی نہیں آئے گا جو آپکی ملت کو منسوخ کرے اور آپؐ کی امت میں سے نہ ہو۔ اسی عقیدہ کی تقویت اس حدیث سے ہوتی ہے کہ اگر موسیٰ زندہ ہوتے تو میرے اتباع کے بغیر انہیں کوئی چارہ نہ ہوتا۔" (موضوعات کبیر ملا علی قاری ۵۸/۵۹)

امام عبدالوہاب شعرانی جو دسویں صدی ہجری میں گذرے ہیں وہ بھی فرماتے ہیں۔

"یاد رکھو کہ نبوت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کلی طور پر بند نہیں ہوئی۔ صرف تشریعی نبوت آپؐ کے بعد بند ہوئی ہے پس حضور صلعم کا یہ قول کہ نہ کوئی نبی ہے۔ نہ کوئی رسول ہے اس کے یہ معنی ہیں کہ میرے بعد کوئی نئی شریعت نہیں۔ اور یہ قول آپ کا ایسا ہے جیسا کہ آپ نے فرمایا۔ اِذا ھلك کسریٰ فلا کسریٰ بعدہٖ واذا ھلك قیصر فلا قیصر بعدہ جب کسریٰ ہلاک ہو جائیگا۔ تو اس کے بعد کوئی کسریٰ نہ ہوگا اور جب قیصر ہلاک ہو جائیگا تو اس کے بعد کوئی قیصر نہیں ہوگا۔ حالانکہ اس قیصر کے بعد اور کوئی قیصر نہ ہونے کا مطلب یہ تھا کہ اس شان کا کوئی قیصر نہیں ہوگا۔ (الیواقیت والجواہر جلد ۲ صفحہ ۳۵)

مندرجہ بالا سطور سے یہ بات کلی طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ نبوت عامہ یا غیر تشریعی نبوت کو اگرچہ نبوت ہی کہا جاتا رہا لیکن اس کا مطلب نبوت ہرگز نہیں بلکہ ولایت سمجھنا چاہیئے خلاصہ۔ اہل لغت اور اہل تفسیر اس بات پر متفق ہیں کہ خاتم النبیین کے معنی آخر النبیین کے

ہیں۔ اس ضمن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات ملاحظہ ہوں۔

بنی اسرائیل کی قیادت ابنیاء کرتے تھے جب کوئی نبی مرجاتا تو دوسرا نبی اس کا جانشین ہوتا مگر میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔ خلفاء ہوں گے۔" (بخاری کتاب المناقب باب ماذکر عن بنی اسرائیل)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ رسالت اور نبوت کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ میرے بعد اب نہ کوئی رسول ہے اور نہ نبی (ترمذی کتاب الرؤیا۔ مسند احمد مرویات انس بن مالک)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میرے بعد اگر کوئی نبی ہوتا۔ تو عمر بن خطاب ہوتے۔ (ترمذی، کتاب المناقب)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ سے فرمایا۔ میرے ساتھ تمہاری نسبت وہی ہے جو موسیٰ کے ساتھ ہارون کی تھی۔ مگر میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔ (بخاری و مسلم۔ کتاب فضائل الصحابہ)

علاوہ ازیں علامہ زمخشری (۴۶۷ھ ۔ ۵۳۸ھ) تفسیر کشاف میں لکھتے ہیں اگر تم کہو کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی کیسے ہوئے جب کہ حضرت عیسیٰ آخر زمانے میں نازل ہونگے؟ تو میں کہوں گا کہ آپ کا آخر نبی ہونا اس معنی میں ہے کہ آپ کے بعد کوئی شخص بھی نبی نہ بنایا جائے گا۔ اور عیسیٰ علیہ السلام ان لوگوں میں سے ہیں جو آپ سے پہلے نبی بنائے جاچکے تھے اور جب وہ نازل ہونگے تو شریعت محمدیہ کے پیرو اور آپ کے قبلے کی طرف نماز پڑھنے والے کی حیثیت سے نازل ہوں گے گویا کہ وہ آپ ہی کی امت کے ایک فرد ہیں۔ (جلد ۲۔ ص ۲۱۵) ماخوذ از رسالہ ختم نبوت

حضرت شاہ ولی اللہ کے نزدیک نبوّت چونکہ نہ وہبی ہے نہ کسبی۔ اس لئے نہ تو یہ کسی کا پیدائشی حق ہے اور نہ کسی کو اسکی جدوجہد کے نتیجہ کے طور پر عطا کی جاتی ہے اس لئے دیگر اکابرین کی طرح حضرت شاہ ولی اللہ بھی ختم نبوت کے قائل ہیں۔ فرماتے ہیں کہ نبوت ختم ہوچکی ہے البتہ ولایت کا سلسلہ تا قیامت رہے گا۔ اور اس مرتبہ کے حامل اللہ تعالےٰ کے صالح اور نیک ترین بندے ہی ہوسکتے ہیں۔

للّہ عارفہ

سلیم خاں گمیؔ[1]

للّہ عارفہ جس کا اصل نام پدماوتی تھا ۱۳۳۵ عیسوی میں بہ عہد سلطان علاؤ الدین سرینگر سے تین میل دُور پاندرتھان گاؤں کے زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئی۔ اس کا باپ برہمن تھا۔ وہ سیدھی سادی دیہاتی لڑکی تھی۔ اس وقت کشمیر کے دیہاتی پنڈتوں میں تعلیم کا کوئی خاص انتظام نہ تھا۔ اس نے باقاعدہ تعلیم حاصل نہ کی پنڈت پریم ناتھ بزاز اپنی انگریزی تصنیف "دختران وتستا" میں لکھتے ہیں کہ للّہ نے سنسکرت کی تعلیم حاصل کی تھی۔

للّہ ذرا سیانی ہوئی تو اسے اپنے زمیندار باپ کا ہاتھ بٹانے کے لئے کھیتوں میں کام کرنا پڑا۔ وہ باپ کے ساتھ کھیتوں میں کام کرتی۔ چراگاہوں میں بھیڑیں اور بکریاں چراتی اور ماں کے لئے چشموں اور آبشاروں سے پانی لاتی۔ وہ معصوم سی سیدھی سادی لڑکی تھی لیکن بلا کی ذہین تھی۔

وہ ذرا بڑی ہوئی تو رواج کے مطابق اس کی شادی پانپور میں کر دی گئی۔ اس کا برہمن شوہر ان پڑھ اور جاہل تھا۔ اور اس کا ذریعہ معاش کھیتی باڑی تھا۔

للّہ کی ساس سنگدل قسم کی عورت تھی۔ للّہ سے اسے خدا واسطے کا بیر تھا۔ للّہ کا شوہر للّہ کی طرف سے بے نیاز اور بے پروا تھا۔ اس نے کبھی بھی اپنی ماں کو نہ ٹوکا۔ بعض اوقات تو اس نے سخت گیر ماں کا ساتھ دیا۔ البتہ للّہ کے خسر کا رویہ ہمدردانہ تھا۔ تاہم للّہ کے لئے ہمدردی کا یہ جذبہ خسر کے دل میں بہت بعد میں پیدا ہوا۔ غالب خیال یہ ہے کہ للّہ کی ساس باتونی قسم کی عورت تھی۔ وہ چرب زبانی سے اپنے شوہر اور بیٹے کو قائل

---

[1] سلیم خاں گمیؔ آزاد کشمیر ریڈیو تراڑ کھل

کرچکی تھی کہ للہ سست کام چور اور جاہل لڑکی ہے۔ ساس کے الزام اور اتہام کا للہ نے کبھی کوئی جواب نہ دیا۔ وہ خاموش طبیعت کی لڑکی تھی۔ اور اس پر ساس کی طرف سے جو بھی سختی کی جاتی وہ صبر اور شکر سے برداشت کرلیتی۔

اس کے علاوہ للہ کی ساس للہ کو پیٹ بھر کر کھانا بھی نہ دیتی تھی وہ للہ کی طشتری میں ایک باٹ رکھ دیتی۔ اور اسے چاولوں سے ڈھانپ دیتی یوں اس لئے کیا جاتا کہ اگر کوئی شخص للہ کی چاولوں والی طشتری دیکھتا تو کہتا کہ للہ پیٹ بھر کر کھانا کھاتی ہے۔ حالانکہ چاولوں کے نیچے باٹ ہوتا۔ جو تھوڑے چاولوں کو زیادہ کرکے دکھاتا۔ چاول کھانے کے بعد للہ خاموشی سے اور بغیر کچھ کہے طشتری میں سے چاول کھالیتی اور باٹ دھو کر علیحدہ کردیتی۔ اس کی ساس دوسرے وقت دوبارہ کھانے میں وہی باٹ رکھ دیتی۔ ایک بار گاؤں کے چند معززین نے للہ کے خسر سے کہا کہ تمہاری بیوی بےچاری للہ کو بھوکوں ماررہی ہے۔ وہ نہ مانا۔ معززین نے کہا آج شام جب للہ کھانا کھارہی ہوگی تو اس کی طشتری سے چاول ہٹا کر دیکھنا للہ کے خسر نے ایسا ہی کیا اور چاولوں کی طشتری میں سے باٹ نکل آیا۔ ظاہر ہے کہ اس سے اسے دکھ پہنچا ہوگا۔ اور اس نے اپنی بیوی کو برا بھلا کہا ہوگا۔ اور للہ کی ساس نے آتش انتقام کو ٹھنڈا کرنے کے لیے اپنی کارروائی کو شدید اور تیز کردیا ہوگا۔

آخر للہ نے اس عالم رنگ و بو سے ناطہ توڑ لیا۔ اور معبود حقیقی سے پیار بڑھایا۔ وہ گھر بار چھوڑ کر جنگلوں پہاڑوں اور ویرانوں کی طرف نکل گئی۔ اسے آندھی بارش اور برف باری سے کبھی خوف نہ آیا۔ اور نہ کبھی کوئی گزند پہنچا۔ اس نے طعام و قیام کی کبھی پروا نہ کی وہ جنگل سے پھل اور گھاس پات کھاکر اور چشموں کا پانی پی کر خدا کا شکر بجالاتی۔ سونے کے لئے گھاس پھوس کافی تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک بار للہ کسی جنگل میں تھی کہ ایک خونخوار شیر نے اسے دیکھا وہ للہ عارفہ پر جھپٹا لیکن جب للہ کے قریب آیا تو اس کا سارا غصہ رفوچکر ہوگیا۔ اور مسکین صورت بناکر للہ عارفہ کے ہاتھ چاٹنے لگا۔

اگر کبھی للہ عارفہ ویرانوں اور جنگلوں سے نکل کر آبادی کی طرف چلی آتی تو لوگ جوق در جوق اس کے پیچھے لگ جاتے سلام کرتے اور ہاتھ چومتے اسے اب لباس کی بھی پروا نہ تھی وہ نیم برہنہ یا

برہنہ حالت میں گلی کوچوں میں گھومتی پھرتی۔ بعض لوگ اسے پاگل خیال کرتے۔ بعض مجذوبہ سمجھتے۔ اور اکثر اسے رشی اور بھگت کا درجہ دیتے۔ چند ایک ایسے بھی تھے جو اس پر تہمتیں دھرتے للہ عارفہ عالم دیوانگی میں اشعار بھی کہتی تھی۔ جسے اشلوک کہا جاتا ہے۔ لوگ اس کے اشلوک لکھ لیتے یا یاد کر لیتے اور تنہائی میں انہیں گنگناتے۔ یہ اشلوک کشمیری میں ہیں۔ اور کشمیری صوفیانہ شاعری کا گراں بہا سرمایۂ للہ عارفہ کی زندگی اور اس کے کلام کو سمجھنے کیلئے ضروری ہے کہ اس کے عہد کے تاریخی واقعات کو ذہن میں رکھا جائے۔ یہ اس لئے ضروری ہے کہ للہ عارفہ کی شخصیت نے نہ صرف کشمیر کے ہندو عوام کو بے حد متاثر کیا۔ بلکہ مسلمان عوام نے بھی اس سے کافی اثر لیا۔

۱۳۰۱ء سے ۱۳۲۰ء تک وادیٔ کشمیر پر ایک برہمن راجہ کی حکومت تھی اس کا نام سہادیو تھا۔ اس کے عہد میں کشمیر قمار بازوں، سے نوشوں اور بدمعاش عورتوں اور مردوں کا ملک بن کر رہ گیا تھا۔ آخر ۱۳۲۰ء میں لداخ کے ایک شہزادہ رنچن نے وادی میں امن وامان قائم کیا اور وہ ایک مسلمان مبلغ بلبل شاہ کے ہاتھ پر مسلمان ہوگیا۔ اس کا اسلامی نام سلطان صدرالدین تھا۔ اس مسلمان بادشاہ نے کشمیر پر ۱۳۲۰ء سے ۱۳۲۳ء تک حکومت کی سلطان صدرالدین کی وفات پر کشمیر پر راجہ ادیان کا قبضہ ہوگیا۔ للہ عارفہ اس راجہ کے زمانہ میں ۱۳۳۵ء میں پیدا ہوئی۔ راجہ ادیان کا دور حکومت سیاسی انتشار کا موجب بنا۔ اس کے عہد میں اچھالا نامی شخص نے کشمیر پر حملہ کیا۔ ادیان حملہ کی تاب نہ لاکر جنگلوں میں چھپ گیا۔ حملہ آور کا مقابلہ راجہ کے وزیر شاہ میر نے کیا۔ اور اسے شکست دی۔ فتح کی خبر سن کر راجہ جنگلوں سے باہر آیا۔ اور تخت پر بیٹھ گیا لیکن اب اس کی حیثیت ایک کٹھ پتلی حکمران سے زیادہ نہ تھی۔ ساری قوت شاہ میر کی ذات میں مرکوز ہوکر رہ گئی تھی۔ راجہ ادیان کی موت پر اس کی بیوی کوٹارانی تخت پر بیٹھی لیکن ۱۳۳۹ء میں شاہ میر نے اسے تخت و تاج سے علیحدہ کر دیا اور سلطان شمس الدین شاہ میر کے لقب سے تخت پر بیٹھا۔ سلطان شمس الدین نے ۱۳۴۲ء تک حکومت کی۔

سلطان شمس الدین عادل اور رحم دل بادشاہ تھا۔ اس نے اہل کشمیر کی فلاح و بہبود کے لئے بڑا

کام کیا۔ خصوصاً کسانوں کی اقتصادی خوشحالی کے لئے اس نے قابل قدر خدمات سرانجام دیں سلطان شمس الدین کی وفات پر اس کا بڑا بیٹا جمشید تخت پر بیٹھا۔ لیکن اس کے چھوٹے بھائی علی شیر نے جمشید کو شکست دے کر ۱۳۴۷ء میں تخت پر قبضہ کر لیا۔ اور سلطان علاؤ الدین کا لقب اختیار کیا۔ سلطان علاؤ الدین نے کشمیر پر ۱۳۵۹ء تک حکومت کی۔ ان بارہ سالوں میں سیاسی انتشار اور انتظامی بدحالی کا قلع قمع ہوا۔ عوام کی بے چارگی ختم ہو گئی۔ لوگ آسودہ حال اور آسودہ خاطر ہو گئے۔

سلطان علاؤ الدین کے عہد میں للہ عارفہ جنگلوں اور ویرانوں میں گھوما کرتی تھی اس کی عمر اس وقت بیس بائیس سال سے زیادہ نہ تھی۔

۱۳۵۹ء میں سلطان علاؤ الدین کی وفات کے بعد اس کا بڑا بیٹا شہاب الدین تخت نشین ہوا سلطان شہاب الدین سلاطین کشمیر میں سب سے عظیم اور نامور بادشاہ گزرا ہے۔ وہ بہادر، سخت کوش اور پرہیزگار تھا۔ اس نے اپنی فوجوں کی از سر نو تنظیم کی۔ اور لداخ۔ بلتستان۔ تبت۔ جموں و کشتواڑ کو فتح کیا۔ پنجاب اور سندھ کو زیر نگیں لایا۔ پشاور کے مقام پر مخالف فوج کو شکست دی۔ کوہ ہندوکش کے راستے بدخشاں۔ کاشغر اور کابل پر چڑھائی کی۔ اور کامران لوٹا وہ رحمدل تھا اور اس کی رعایا خوشحال تھی آخر انیس سال حکومت کرنے کے بعد سلطان شہاب الدین ۱۳۷۸ء میں اللہ کو پیارا ہو گیا۔

سلطان علاؤ الدین (والد سلطان شہاب الدین) کے عہد حکومت میں ایک مسلمان عالم اور مبلغ کشمیر سیر کے لئے تشریف لائے آپ مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے نام سے معروف ہیں۔

آپ ۷۴۸ھ میں کشمیر تشریف لائے۔ خیال ہے اس وقت للہ عارفہ کی شادی ہو چکی تھی روایت میں ہے کہ للہ عارفہ ہیرہ پور کے مقام پر حضرت مخدوم جہاں جہاں گشت رح کے سلام کے لئے حاضر ہوئی حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت رح کے بعد شاہ ہمدان کے چچیرے بھائی سید تاج الدین سلطان شہاب الدین کے عہد اقتدار میں کشمیر تشریف لائے ان کے بعد ان کے چھوٹے بھائی سید حسین سمنانی سلطان شہاب الدین کے زمانے میں کشمیر آئے۔ اس وقت للہ عارفہ کی عمر تقریباً اڑتیس سال تھی۔ کہا جاتا ہے للہ عارفہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ ایک مسلمان عالم اور بلند پایہ صوفی تشریف

لا رہے ہیں تو اس نے ان کی پیشوائی کے لئے کئی کوس پیدل سفر کیا۔ کشمیر کے بعض مسلمانوں کا خیال ہے کہ للہ عارفہ نے سید حسین سمنائیؒ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔

سید تاج الدینؒ اور سید حسین سمنائی کو حضرت شاہ ہمدانؒ نے کشمیر بھیجا تھا۔ حضرت خود بھی تین بار کشمیر تشریف لائے تھے۔ جب آپ پہلی بار تشریف لائے تو للہ عارفہ آپ سے نہ مل سکی۔ دوسری بار آپ سنہ ۱۳۷۹ء میں کشمیر آئے سلطان شہاب الدین فوت ہو چکے تھے اور عنان حکومت مرحوم سلطان کے بھائی سلطان قطب الدین کے ہاتھ میں تھی۔ للہ عارفہ کی عمر اس وقت چھیالیس برس تھی۔ شاہ ہمدان کوئی ڈھائی سال کشمیر میں ٹھہر کر اور پھر لداخ کے راستے ترکستان تشریف لے گئے کہا جاتا ہے اس ڈھائی سال کے عرصہ میں للہ عارفہ نے شاہ ہمدان سے اسلامی تصوف اور اسلامی تعلیمات سے آگاہی حاصل کی۔

سلطان قطب الدین کے زمانے میں کشمیر کے رشی سلسلۂ تصوف کے بانی شیخ نور الدین ولی نورانی پیدا ہوئے۔ گاؤں کا نام کیموہ ہے اور والد ماجد کا نام شیخ سالار دینؒ تھا بیان کیا جاتا ہے کہ جب آپ پیدا ہوئے تو ماں (صدرہ ماں جی) کا دودھ نہ پیتے تھے۔ والدین اور دوسرے احباب نہایت پریشان تھے کہ کیا کیا جائے؟ بہتیری کوشش کی گئی کہ آپ ماں کا دودھ پیئیں لیکن بے کار۔ اسی اثنا میں للہ عارفہ گھومتی پھرتی موضع کیموہ میں آنکلی۔ لوگوں نے شیخ سالار دین کی پریشانی بیان کی۔ للہ عارفہ ان کے گھر گئی۔ نومولود کو پکڑا اور اپنا پستان اس کے منہ میں ڈال کر کہنے لگیں۔

"پیدا ہونے میں شرم محسوس نہ کی اب دودھ پینے میں شرم محسوس کرتا ہے۔"

نومولود ماں کا دودھ پینے لگا۔

جب شیخ نور الدین ولی سیانے ہوئے۔ اور عظمت نے آپ کے قدم چومے تو آپ نے کشمیری زبان میں ایک صوفیانہ نظم کہی۔ اس نظم کے ایک بند میں للہ عارفہ کا ذکر یوں آیا ہے۔

---

[1] دیکھئے راقم کا مقالہ بعنوان "کشمیری تصوف کا پس منظر" مطبوعہ ماہنامہ الرحیم حیدرآباد شمارہ دسمبر ۶۳ء

تس پد مان پور چہ للّٰے

تمہ گلے امرت پیوہ

سو سان نہ اوتار للّٰے

تیو تہہ مہ درد تو دیوہ

"پا تیور کی للّٰہ عارفہ نے عرفان حق کی شراب پی۔ وہ ایک کامل ہستی ہے۔

اس جہاں میں اس جیسی بزرگ ہستی کوئی نہیں۔

اے خدا تو مجھے وہی عظمت اور وہی فیض عطا کر

جو للّٰہ عارفہ کو عطا کیا ہے۔"

کشمیری ہندو شیخ نورالدین ولی کا بے حد احترام کرتے تھے۔ اور آپ کو نند رشی کہہ کر پکارتے تھے۔

کیا للّٰہ عارفہ ہندو تھی؟ اس سوال کا جواب آسان نہیں۔ کشمیر کے ہندو اسے اپنا اوتار مانتے ہیں۔ اور مسلمان اس کو مسلمان خیال کرتے ہیں۔

جو لوگ للّٰہ عارفہ کو ہندو سمجھتے ہیں' ان کا کہنا ہے للّٰہ عارفہ ہندوؤں کے پنڈت گھرانے میں پیدا ہوئی۔ اس نے جس ماں کا دودھ پیا وہ ہندو تھی۔ جس باپ نے اس کے سر پر شفقت کا ہاتھ پھیرا وہ ہندو تھا۔ عالم شباب تک اس کا رہن سہن اور کھانا پینا ہندو معاشرت کے مطابق رہا۔ دنیا تج کر بھی وہ ہندو ہی رہی اور کبھی مشرف بہ اسلام ہونے کا اعلان نہ کیا۔ للّٰہ عارفہ سمادھی لگا کر عبادت کرتی تھی۔ وہ یوگیوں کی طرح دم سادھ لیتی اور آنکھیں موندھ کر پربھو پریم میں کھو جاتی۔ نروان اور مکتی کے جو نظریات للّٰہ عارفہ نے پیش کئے وہ اسلامی نظریہ عبادت سے زیادہ مشابہت نہیں رکھتے۔

اس کے برعکس مسلمانوں کا کہنا ہے کہ للّٰہ عارفہ سید حسین سمنائی کے ہاتھ پر مشرف باسلام ہوئی۔ حضرت موصوف للّٰہ عارفہ کے مرشد تھے۔ اورانہوں نے روحانی اور صوفیانہ مسائل میں

مجذوبہ کی رہنمائی کی۔ اپنی تا ہید میں وہ حسب ذیل واقعہ بیان کرتے ہیں۔

ایک بار للہ عارفہ کسی بت خانہ میں داخل ہوئی تو تقریباً برہنہ حالت میں تھی۔ بت پرست پنڈت سدؔ نے اسے دیکھا اور آنکھیں جھکالیں۔ للہ عارفہ کو پنڈت پر سخت غصہ آیا اور وہ طیش میں آکر بولی۔

"اے بیوقوف پجاری!

تو نے اپنا نام سد (یعنی عارف) رکھا ہے۔

لیکن تجھے اپنی نگاہ کے فتور پر قابو حاصل نہیں۔

دنیا میں صرف خدا کا وجود ہے۔

اور کوئی وجود نہیں۔

عورت اور مرد کا وجود بذات خود کچھ بھی نہیں

وہ صرف خدا کے وجود کے دو مظہر ہیں۔"

اس کے بعد للہ عارفہ نے بتوں کو توڑنے کی کوشش کی لیکن پنڈت سدؔ نے روک دیا اور بولا کہ اس کا بت خانہ پر بھو استھان (خانہ خدا) ہے۔ للہ نے اس کے جواب میں پجاری سے سوال کیا اگر یہ بت خانہ پربھو استھان ہے تو مجھے ایسی جگہ کا پتہ دے جو پربھو استھان نہیں ہے۔ اس سوال کا جواب پجاری سے نہ بن پڑا۔

للہ عارفہ جسم و روح کی آویزش میں روح کا ساتھ دیتی ہے۔ اس کے خیال میں وجود کو فنا ہے۔ لیکن روح لافانی ہے۔ وہ جرأت کردار کی قائل ہے اور اقبالؔ کے الفاظ میں اپنی دنیا آپ پیدا کرنے پر زور دیتی ہے۔ وہ کہتی ہے۔

"کامیابی بے لوث اور بہادر انسانوں کے لئے ہے!

بزدلی شیرنی کی شجاعت سے پراگندہ خاطر ہوجاتا ہے!

کوکھ سے خالی عورت کو مامتا کے دکھ کی کیا خبر؟

چوبِ خشک اور شمع کا جلنا یکساں نہیں !

مکھی کو پروانے کی سعادت میسّر نہیں ہوتی !"

کہا جاتا ہے کہ للہ عارفہ کی وفات پر ہندو اسے چتا میں جلانا چاہتے تھے۔ اور مسلمان اسے دفنانے کے آرزومند تھے۔ لیکن جب للہ عارفہ کی میت پر سے چادر اٹھائی گئی تو وہاں چند پھولوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ مسلمانوں کا خیال ہے کہ للہ عارفہ دفنائی گئی تھی اور اس کی قبر دنج بہرور[1] کی جامع مسجد کے باہر اب بھی دیکھی جا سکتی ہے۔

للہ عارفہ خداوند تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان رکھتی تھی اور مشہور ہے کہ وہ کلمۂ طیبہ کا ہمیشہ ورد کرتی تھی اسکے شلوک کشمیری زبان کی قدیم شاعری میں نہایت اہم حیثیت رکھتے ہیں اور اہل کشمیر کا عزیز ترین اور گراں بہا سرمایۂ ادب ہیں۔

ذیل میں للہ عارفہ کے کلام کا ترجمہ دیا جاتا ہے۔ تاکہ کشمیر کی اس زندۂ جاوید مجذوبہ عارفہ کے پیغام سے آگاہی حاصل ہو سکے۔

جستجو

میں نے عبادت گاہوں میں تیری جستجو کی

میں نے تجھے ہر جگہ تلاش کیا!

مگر تیرا پتہ نہ پایا!

جب زاہد اور متقی لوگوں سے پوچھا!

تو انہوں نے روکر اپنی بے بسی کا اظہار کیا!

جب میں نے عالم رنگ و بو کے تمام تفکرات کو خیر باد کہا!

تو تجھے اپنے دل میں پایا

---

[1] بعض تحریروں میں بج بہارا آیا ہے۔ یہ جگہ سری نگر سے ۲۹ میل دور جنوب مشرق کی طرف ہے للہ عارفہ یہیں فوت ہوئی۔

عرفان

پتھر کا چبوترہ بنتا ہے!
پتھر کا بت بنایا جاتا ہے!
پتھر سے چکی کا پاٹ تیار ہوتا ہے!
خدا کا عرفان نہایت کڑا کام ہے!

تو ہر شے میں ہے

تو آسمان ہے!
تو زمین ہے!
تو ہوا ہے!
تو دن اور رات ہے!
تو چاند ہے!
تو پھول ہے!
ہر شے تجھی سے ہے!
میں تیری عبادت کے لئے کون سا تحفہ لاؤں

شراب

کوئی مجھے برا بھلا کہے
کوئی میری تعریف کرے
کوئی میری چغلی کھائے
کوئی مجھے رنگا رنگ پھول پیش کرے
میں نہ خوش ہوتی ہوں اور نہ ناراض
میں عرفان حق کی شراب پی کر توانا ہو گئی ہوں

طہارت

کچھ لوگ ایسے ہیں جو سوئے ہوئے ہیں
لیکن اصل میں جاگ رہے ہیں
کچھ لوگ ایسے ہیں جو جاگ رہے ہیں
لیکن اصل میں سوئے ہیں
کوئی نہانے کے باوجود ناپاک رہتا ہے
اور کوئی ناپاک ہونے کے باوجود پاک ہے

تسکین

تو نے مجھے دنیاوی خواہشات کے پیچھے ڈال دیا
اور خود چھپ گیا
میں نے تجھے تلاش کیا مگر نہ پایا
آخر عاجز آگئی
پھر میں نے تجھ میں دھیان لگایا
اور تجھے حاصل کر لیا
یوں میرے متلاشی دل کو تسکین نصیب ہوئی

گیان

کوئی کہتا ہے دنیا چھوڑ دے
کوئی کہتا ہے جنگل میں چلی جا
لیکن دنیا کی آبادی اور جنگل کے ویرانہ میں تم ویسے ہی رہو گے
جیسے کہ تھے۔
اپنے دل کی خبر لے
اور ہمیشہ اس کی تلاش میں رہ

جسم پر راکھ اور کیچڑ ملنے سے گیان حاصل نہیں ہوتا

منزل

خدا تیرے دل میں قیام فرما ہے
اسے دیکھ اور پہچان
سال بھر گنگا میں رہنے اور تیر تھوں پر نہانے
اور ٹونے ٹوٹکے کرنے سے وہ نہیں ملتا

سچ یہ ہے کہ للہ عارفہ رسماً نہ ہندو تھی نہ مسلمان۔ اسے آپ زیادہ سے زیادہ شومت کی پیروکار ایک جوگن کہہ سکتے ہیں اس کا طریق عبادت یوگیانہ تھا۔ تاہم وہ مسلمان صوفیوں اور ولیوں کی بڑی قدر کرتی تھی۔ دراصل اسے خدا تعالےٰ کے ظاہری ناموں سے زیادہ واسطہ نہ تھا۔ وہ اللہ اور پرمیشور کے جھگڑوں میں نہیں پڑتی تھی۔ وہ خود اللہ کی ذات تک پہنچنا چاہتی تھی اور اس کی تلاش میں اس نے ظاہری امتیازات مٹا دیئے تھے۔ اس کی عارفانہ زندگی بتاتی ہے کہ وہ مسلمان صوفیہ سے بہت زیادہ متاثر تھی اور اس کی وجہ سے وہ عملاً ذہناً ہندو دھرم سے بہت دُور تھی۔ ہندو مت نے اسے فکری الجھاؤ دیا تھا اور وہ اس الجھاؤ سے نکل کر ایک خدا (حقیقت) کو پانا چاہتی تھی اس نے کثرت وجود اور وحدتِ وجود کے بین بین راستہ تلاش کیا اور یہ شومت کا راستہ تھا جس کا معاشرتی اور روحانی نظام نہ صرف پنڈتوں اور پروہتوں کو سماجی اور روحانی بالیدگی اور عظمت کا حق دیتا ہے بلکہ شودروں کو بھی ان کے ساتھ دوش بدوش کھڑا کرتا ہے۔ جب للہ عارفہ نے اسلامی تعلیمات سے اثر لیا تو اس کے ذہن میں ایک اور انقلاب آیا چنانچہ اس نے اسلامی تعلیمات کو بنیاد ٹھہرا کر شومت کے افکار میں اور وسعت اور لچک پیدا کی اور یوں کشمیری مسلمانوں میں بے حد مقبول ہوئی۔

میرا عقیدہ

حضرت شاہ ولی اللہؒ[1]

سب تعریف اللہ کے لئے ہے، جو سارے جہانوں کا پروردگار ہے اور درود و سلام پہنچے اس کے رسول ہمارے آقا محمد خاتم النبین کو، اور آپ کی آل اور آپؐ کے تمام صحابہ کو۔ اس کے بعد خدائے کریم کی رحمت کا یہ محتاج احمد المدعو بہ ولی اللہ بن عبدالرحیم، اللہ تعالیٰ ان دونوں پر احسان کرے کہتا ہے کہ میں گواہ بناتا ہوں اللہ تعالیٰ کو اور فرشتوں، جنوں اور انسانوں میں سے جو بھی حاضر ہیں ان کو کہیں خلوص دل سے اس پر اعتقاد رکھتا ہوں۔

اس عالم کا ایک صانع ہے، جو قدیم ہے، زندہ ہے، وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا اپنے وجود میں واجب ہے اور اس کا عدم ممتنع ہے۔ وہ بڑا برتر۔ کمال کی تمام صفات سے متصف اور نقص و زوال کی سب علامتوں سے پاک ہے۔ وہ ساری مخلوقات کا خالق، تمام معلومات کا عالم، سب ممکنات پر قدرت رکھنے والا اور تمام کائنات کے لئے ارادہ کرنے والا ہے۔ وہ زندہ ہے سننے والا ہے اور دیکھنے والا ہے نہ اس کے کوئی مشابہ ہے، نہ کوئی اس کے مقابلے کا نہ کوئی اس کی ضد اور اس جیسا ہے۔ اور نہ کوئی وجود میں واجب ہونے،

---

[1] حضرت شاہ ولی اللہؒ کے رسالے "حسن العقیدہ" کا یہ اردو ترجمہ ہے اس رسالے میں حضرت شاہ صاحب نے اپنا عقیدہ بیان فرمایا ہے۔ (مدیر)

عبادت کا مستحق ہونے، اور خلق اور تدبیر میں اس کا شریک ہے۔

عبادت یعنی آخری حد کی تعظیم کا اس کے سوا اور کوئی مستحق نہیں۔ اس کے سوا نہ کوئی مریض کو شفا دیتا ہے نہ کوئی رزق دیتا ہے اور نہ تکلیف دور کرتا ہے اور یہ اس معنی میں کہ جب وہ کسی چیز کو کہتا ہے کہ ہوجا تو وہ ہو جاتی ہے نہ کہ ظاہری و عادی سبب کے معنی میں، جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ طبیب نے مریض کو شفا دی اور امیر نے فوج کو رزق دیا۔ چنانچہ یہ اس سے ایک الگ چیز ہے اگرچہ دونوں کے الفاظ ایک سے ہیں۔ نہ اس کا کوئی مددگار ہے نہ وہ کسی اور میں حلول کرتا ہے اور نہ وہ کسی اور سے متحد ہوتا ہے۔ اس کی ذات کے ساتھ کوئی حادث یعنی زوال پذیر چیز قائم نہیں۔ اور نہ اس کی صفات میں حدوث و زوال ہے، البتہ حدوث و زوال اس تعلق میں ہے، جو صفات اور ان سے متعلقات میں ہے، جس سے کہ افعال کا ظہور ہوتا ہے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ تعلق بھی حادث نہیں حادث وہ متعلقات ہیں چنانچہ متعلقات میں تفاوت سے تعلق کے احکام میں تفاوت رونما ہوتا ہے۔

وہ ہر جہت سے حدوث و تجدّد سے پاک ہے۔ نہ وہ جوہر ہے، نہ عرض اور نہ جسم وہ کسی مکان میں نہیں اور نہ کسی جہت میں، اس کی طرف اشارہ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ یہاں ہے یا وہاں، نہ اس کی طرف حرکت، نقل و انتقال، اس کی ذات و صفات میں تغیر و تبدل اور جہل و کذب منسوب کرنا صحیح ہے۔ وہ عرش کے اوپر ہے[1]۔ جیسا کہ خود اس نے اپنے بارے میں بیان کیا ہے، لیکن اس کا عرش کے اوپر ہونا کسی مکان یا کسی جہت میں ہونے کے معنی میں نہیں۔ اس کے عرش کے اوپر ہونے یا عرش پر استوآی کی حقیقت و کنہ یا تو خود اللہ تعالےٰ جانتا ہے یا وہ راسخین فی العلم، جنہیں اس نے اپنے پاس سے علم عطا کیا ہے۔

قیامت کے دن دو اعتبار سے مومنین اللہ تعالےٰ کو دیکھیں گے۔ ایک یہ کہ وہ ان پر یوں پوری طرح منکشف ہو کہ یہ انکشاف اس کو عقلی طور پر تصدیق کرنے سے زیادہ ہو۔ گویا کہ انہوں نے اسے آنکھ سے دیکھ لیا۔ لیکن اُس کا یہ دیکھنا اِس طرح نہیں کہ وہ برابر میں ہے یا سامنے ہے۔ یا کسی

---

[1] اشارہ ہے قرآن مجید کی اس آیت کی طرف الرحمٰن علی العرش استوآی

جہت میں ہے۔ یا اس کا کوئی رنگ یا شکل ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اس طرح کی رؤیت کے معتزلہ اور دوسرے بھی قائل ہیں اور یہ حق ہے۔ البتہ ان کی غلطی یہ ہے کہ اس اعتبار سے جو رؤیت ہو گی وہ اس کی تاویل کرتے ہیں۔ یا رویت باری تعالیٰ کو وہ صرف اسی معنی میں حصر کر دیتے ہیں۔

قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کو مومنین دوسرے اعتبار سے یوں دیکھیں گے کہ وہ ان کے سامنے بہت سی صورتوں میں متمثل ہوگا۔ جیسا کہ سنت میں مذکور ہے، پس وہ اسے اپنی آنکھوں سے مختلف شکلوں اور رنگوں میں اور اپنے روبرو یوں دیکھیں گے، جس طرح حالتِ خواب میں ہوتا ہے۔ اس بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث ہے، جس میں آپؐ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے رب کو بہترین صورت میں دیکھا۔ غرض مومنین دوسری دنیا میں اللہ کو بالمشافہ دیکھیں گے جب کہ وہ اس دنیا میں اسے خواب میں بھی نہیں دیکھتے اللہ تعالیٰ کی رؤیت کے یہ دو اعتبارات ہیں، جنہیں ہم سمجھتے ہیں، اور ان پر اعتقاد رکھتے ہیں اور اگر اللہ اور اس کے رسولؐ کے نزدیک ان کے سوا کوئی اور رویت ہے تو اس سے اللہ تعالےٰ اور اس کے رسولؐ کی جو مراد ہو، ہم اس پر ایمان لاتے ہیں اگرچہ ہم اس کی حقیقت سے لعینہٖ واقف نہیں۔ اور یہ اس لئے کہ اللہ جو چاہتا ہے، ہوتا ہے، اور جو وہ نہیں چاہتا وہ ہرگز نہیں ہوگا۔ جہاں تک کفر اور گناہوں کا تعلق ہے تو وہ اس کی تخلیق ہیں اور اس کے ارادے سے ہیں لیکن وہ ان سے راضی نہیں۔ وہ بے نیاز ہے اور نہ اپنی ذات میں اور نہ اپنی صفات میں کسی چیز کا محتاج ہے۔ اس پر کوئی حاکم نہیں اور نہ کسی غیر کی طرف سے اس پر کوئی چیز واجب ہوتی ہے۔ ہاں وہ ایک چیز کا وعدہ کرتا ہے اور پھر اس وعدے کو پورا کرتا ہے جیسے کہ وارد ہوا ہے اور اللہ جو وعدہ کرتا ہے، تو یہ وعدہ اللہ کی ضمانت ہو جاتا ہے۔

اللہ کے تمام افعال حکمت اور کلی مصلحت کے مقتضی ہیں، لیکن وہ حکمت اور کلی مصلحت، جس کا کہ اُسے علم ہے۔ اس پر واجب نہیں کہ وہ کسی خاص کے ساتھ لازماً جزوی مہربانی کرے یا کسی خاص کو فائدہ پہنچائے۔ اس سے کوئی برائی صادر نہیں ہوتی اور جو کچھ وہ کرتا یا جو وہ حکم دیتا ہے، وہ ظلم اور جور کی طرف منسوب نہیں ہوتا۔ جو کچھ وہ پیدا کرتا، اور جو وہ اوامر دیتا ہے اس میں وہ حکمت کو ملحوظ رکھتا ہے۔ وہ اس لئے نہیں پیدا کرتا اور حکم دیتا کہ وہ کسی چیز کے ذریعہ اپنی ذات اور صفات کی تکمیل کرے

اور یہ کہ اس کی کوئی حاجت اور غرض ہے کیونکہ یہ تو کمزوری اور خرابی کی بات ہوتی۔

اللہ کے سوا اور کوئی فیصلہ کرنے والا اور حکم دینے والا نہیں۔ اشیاء کے حُسن و قبح کے تعین اور افعال کے موجبِ ثواب و عذاب ہونے کے بارے میں عقل کے ہاتھ میں فیصلہ نہیں۔ درحقیقت اشیاء کا حسن و قبح اللہ تعالیٰ کے فیصلے اور حکم اور اس کی طرف سے لوگوں کو ان اشیاء کا مکلف بنانے پر ہے۔ پس ان میں سے بعض اشیاء ایسی ہوتی ہیں کہ عقل انکے حسن و قبح کی وجہ اور مصلحت اور ان کی ثواب و عذاب سے مناسبت پالیتی ہے، اور بعض ایسی ہوتی ہیں کہ ان کے حسن و قبح اور موجبِ ثواب و عذاب کا علم پیغمبروں ہی کے ذریعہ ہوتا ہے، جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے بارے میں خبر دیتے ہیں۔

اللہ کی صفات میں سے ہر صفت اس کی ذات کے ساتھ ایک ہے اور وہ تعلق اور تجدد کے اعتبار سے بے نہایت ہے۔ اور اس کا یہ تعلق ان معنوں میں ہے جو اوپر گزرے[1]۔ اللہ تعالیٰ کے لئے فرشتے ہیں بڑے مرتبے والے اور مقرب۔ اور ایسے فرشتے ہیں جن کے ذمے انسانوں کے اعمال کا لکھنا، کسی بندے کو ہلاکتوں سے بچانا اور بھلائی کی طرف دعوت دینا ہے اور یہ فرشتے بندوں کے ساتھ بھلائی کرتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کا ایک معین درجہ ہے، اور اللہ کی طرف سے جو انہیں احکام ملتے ہیں، ان میں وہ اس کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو انہیں حکم دیا جاتا ہے اسے بجا لاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں سے شیاطین بھی ہیں اور ان میں سے ابن آدم کو شر پہنچتا ہے۔

قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور اللہ تعالیٰ نے ہمارے نبی محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پر اسے بذریعہ وحی اتارا۔ (اور جیسا کہ قرآن مجید میں ہے) وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا

---

[1] شروع مضمون میں ہے۔ "نہ اس کی ذات میں اور نہ اس کی صفات میں حدوث و زوال ہے۔ البتہ حدوث و زوال اس تعلق میں ہے، جو صفات اور ان سے متعلقات میں ہے جس سے کہ افعال کا ظہور ہوتا ہے ۔۔۔"

اَوْ من وراء حجابٍ او یرسلَ رسولاً فیوحیَ باذنہ ما یشاءُ - کسی آدمی کے لئے ممکن نہیں کہ خدا اس سے بات کرے مگر الہام (کے ذریعہ) سے یا پردے کے پیچھے سے یا اس کی طرف رسول بھیجے جو اللہ کے حکم سے جو وہ چاہے اسے وحی پہنچائے۔" یہ ہے وحی کی حقیقت۔

اللہ تعالےٰ کے اسمار اور اس کی صفات میں الحاد جائز نہیں اور شرع نے اسمار و صفات کی جو حدیں مقرر کی ہیں، ان پر رُک جانا چاہیئے۔ موت کے بعد جسم کے ساتھ لوٹنا (معاد جسمانی) حق ہے، قیامت کے دن جسم اکٹھے ہوں گے اور ان میں ارواح لوٹائی جائیں گی اور یہ جسم ویسے ہی ہوں گے جیسے کہ شرعاً و عرفاً تھے اگرچہ یہ لمبے یا چھوٹے ہوں گے جیسا کہ حدیث میں وارد ہوا ہے کہ کافر کا دانت اُحُد پہاڑ کے برابر ہوگا اور اہل جنت کے بیان میں حدیث میں وارد ہوا ہے کہ ان کے جسم زیادہ لطیف ہوں گے ایسے ہی جیسے ایک بچہ وہی بچہ ہوتا ہے خواہ وہ (آگے چل کر) جوان اور بوڑھا ہو جائے اور اس کے جسم میں ہزار تبدیلیاں ہوں۔

جزا و سزا، حساب، صراط اور میزان سب حق ہیں اور جنت و دوزخ حق ہیں اور وہ دونوں آج بھی مخلوق و موجود ہیں۔ البتہ نصِّ شرعی نے ان کی جگہ کا تعین بالصراحت نہیں کیا بہر حال وہ وہیں ہیں جہاں اللہ تعالیٰ انہیں چاہتا ہے۔ اور ظاہر ہے ہم اللہ تعالےٰ کی تخلیق اور اس کے جہانوں کا احاطہ نہیں کر سکتے۔

ایک مسلمان خواہ وہ کبیرہ گناہ کا مرتکب ہو، ہمیشہ ہمیشہ دوزخ میں نہیں رہے گا اس کے بارے میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ انْ تجتنبوا کبائرَ ما تنہون عنہ نکفر عنکم سیّاٰتکم اگر تم کبیرہ گناہوں سے بچوگے، جن سے تمہیں منع کیا گیا ہے تو ہم تمہاری تقصیریں معاف کر دیں گے اور یہ تقصیروں کی معافی نماز کے ذریعہ ہوتی ہے۔[1]

---

[1] یہ اشارہ ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کی طرف (باقی حاشیہ دوسرے صفحہ پر)

کبیرہ گناہوں کا کفارہ یعنی وہ اعمال جن سے یہ معاف ہو جائیں، جائز ہے، لیکن اللہ تعالٰے کے افعال دنیا اور آخرت میں دو طرح پر ہوتے ہیں۔ ایک اللہ کی سنت کے موافق اور دوسرے خرق عادت کے طور پر یعنی عام عادت و معمول کے خلاف۔ اور جو شخص بلا توبہ کے مر جائے اس کے کبیرہ گناہوں کا خرق عادت کے طور پر معاف ہو جانا جائز ہے۔ اسی طرح جس شخص کے ذمے لوگوں کے حقوق ہوں اور وہ بلا توبہ کے مر جائے تو ان حقوق کا خرق عادت کے طور پر معاف ہونا جائز ہے۔ چنانچہ اس طرح (کبیرہ گناہوں کی معافی کے بارے میں) بہ نظر ظاہر نصوص میں جو تعارض پایا جاتا ہے اس میں باہم مطابقت ہو جاتی ہے۔

شفاعت حق ہے اس شخص کے لئے جسے اللہ تعالٰی کی طرف سے شفاعت کی اجازت دی جائے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی اپنی امت کے کبیرہ گناہوں والوں کے لئے شفاعت حق ہے اور آپؐ کی شفاعت قبول کی جائے گی۔ جہاں شفاعت کی نفی کا ذکر آیا ہے تو اس سے مراد وہ شفاعت ہے جو اللہ تعالٰے کی اجازت اور اس کی رضامندی کے بغیر ہو۔

فاسق کے لئے عذاب قبر اور مومن کے لئے قبر کا آرام حق ہے۔ قبر میں مردے سے منکر و نکیر کا سوال کرنا حق ہے۔ مخلوق کی طرف رسولوں کا مبعوث کیا جانا حق ہے بندوں کو رسولوں کی زبان

(بقیہ حاشیہ) ارایتم لو ان نھراً بباب احدکم یغتسل فیه کل یوم خمساً ھل یبقی من درنه شیٔ قالوا لا یبقی من درنه شیٔ قال فذلک مثل الصلوات الخمس یمحو اللہ بھن الخطایا۔ (ترجمہ) حضرت ابوہریرہ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تم دیکھو کہ تم میں سے کسی کے دروازے کے قریب سے نہر بہہ رہی ہے اور وہ اس میں روزانہ پانچ بار نہاتا ہے، تو کیا اس پر کوئی میل رہ جائیگی۔ صحابہ نے کہا کہ اس پر کوئی میل نہیں رہے گی۔ آپ نے فرمایا کہ اس کی مثال پانچ نمازوں کی ہے۔ جن کے ذریعہ اللہ خطاؤں کو مٹا دیتا ہے۔

سے اوامر و نواہی کا مکلّف کیا جانا حق ہے۔ یہ رسول بعض امور میں جو ان کے سوا مجموعی طور سے دوسروں میں نہیں پائے جاتے، ممتاز ہوتے ہیں اور یہی اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ وہ انبیاء ہیں۔ ان میں سے ایک ان سے خرقِ عادات واقعات کا رونما ہونا ہے۔ اور ایک ان کی سلامتیِ فطرت اور اخلاق میں کامل ہونا وغیرہ ہے۔ انبیاء کفر، جان بوجھ کر کبیرہ گناہوں کے ارتکاب اور چھوٹے گناہوں پر اصرار کرنے سے معصوم ہوتے ہیں اور اللہ تعالے انہیں تین طریقوں سے محفوظ رکھتا ہے۔ ایک تو یہ کہ وہ انہیں فطرت کی سلامتی اور اخلاق میں کمال اعتدال پر پیدا کرتا ہے۔ چنانچہ وہ گناہوں کی طرف رغبت نہیں کرتے بلکہ وہ ان سے متنفر رہتے ہیں دوسرے یہ کہ انہیں وحی سے بتایا جاتا ہے کہ گناہوں پر عذاب ہوگا اور طاعات کا ثواب ملے گا اور یہ چیز ان کے لئے گناہوں سے روکنے والی ہوتی ہے۔ اور تیسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ ان کے اور گناہوں کے درمیان بعض لطیف غیبی چیزیں حائل کر دیتا ہے جیسے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے قصے میں حضرت یعقوب علیہ السلام کا اس طور پر ظاہر ہونا کہ وہ گویا اپنی انگلی کاٹ رہے ہیں۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وعلی آلہ واصحابہ وسلّم خاتم النبین تھے۔ آپؐ کے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا اور آپؐ کی دعوت تمام انس اور جن کے لئے عام ہے۔ آپؐ اس اعتبار سے اور اسی طرح کے بعض دوسرے اعتبارات سے تمام انبیا سے افضل ہیں۔ اولیا، جو اللہ اور اس کی صفات پر ایمان لانے والے اور ان کے عارف ہیں اور اپنے ایمان میں درجۂ احسان پر فائز ہیں، ان کی کرامات حق ہیں اور اللہ تعالےٰ ان کرامات سے جسے چاہتا ہے، سرفراز فرماتا ہے اور اپنی رحمت سے جسے چاہتا ہے مختص کرتا ہے اس نے عشرہ مبشرہ[1]، فاطمہ، خدیجہ، عائشہ حسن اور حسین رضی اللہ عنہم کے بارے میں جنت اور

---

[1] عشرہ مبشرہ مندرجہ ذیل دس صحابہ کرام ہیں۔
حضرت ابوبکر۔ عمر، عثمان، علی، طلحہ، زبیر، عبدالرحمٰن بن عوف۔ سعد بن وقاص، سعید بن زید، اور عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہم

نیکی کی شہادت دی - ہم ان کی عزت کرتے ہیں اور اسلام میں ان کا جو اونچا مقام ہے، اس کا اعتراف کرتے ہیں اسی طرح اہل بدر، اور اہل بیعت رضوان کا بھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ابو بکر صدیقؓ امام حق ہیں ان کے بعد عمرؓ پھر عثمانؓ اور ان کے بعد علیؓ۔ پھر خلافت ختم ہو گئی اور اس کے بعد سخت گیر بادشاہی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے افضل ابو بکر رضی اللہ عنہ ہیں۔ ان کے بعد عمر رضی اللہ عنہ پھر عثمان رضی اللہ عنہ۔ افضلیت سے ہماری مراد تمام جہت سے افضلیت نہیں کہ اس کے تحت نسب، شجاعت، قوت، علم اور اس جیسی اور چیزیں بھی آجائیں، بلکہ یہ افضلیت اسلام میں ان کی زیادہ سے زیادہ نفع رسانی کی بنا پر ہے۔ اس امت کے امیر نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور آپؐ کے دو وزیر ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما ہیں باعتبار اشاعت حق میں اپنی عظیم ہمت کے، اور یہ اس لئے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دو رخ تھے۔ آپؐ کا ایک رخ اللہ تعالےٰ کی طرف تھا کہ اس سے اخذ (وحی) کرتے تھے۔ اور آپؐ کا دوسرا رخ خلق کی طرف تھا کہ اسے عطا کرتے تھے اب حضرت ابو بکرؓ و حضرت عمرؓ دونوں کا خلق کو عطا کرنے، لوگوں کو مانوس اور ان کو جمع کرنے اور حرب و ضرب کا انتظام کرنے میں بہت زیادہ ہاتھ تھا۔

ہم صحابہؓ کا ذکر خیر سے کرتے ہیں وہ ہمارے امام اور دین کے ہمارے پیشوا ہیں۔ ان کو برا بھلا کہنا حرام اور ان کی تعظیم کرنا واجب ہے۔ ہم اہل قبلہ میں سے کسی کی تکفیر نہیں کرتے، سوائے اس کے کہ اس سے کوئی ایسی بات ہو، جس سے اللہ تعالیٰ صانع و مختار اور قادر کی نفی ہوتی ہو، یا غیر اللہ کی عبادت ہو، یا مرنے کے بعد جی اٹھنے (معاد) اور نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا نیز دین کی اور ضروریات کا انکار ہوتا ہو۔

امر بالمعروف یعنی نیک کاموں کا حکم کرنا اور نہی عن المنکر یعنی برے کاموں سے روکنا واجب ہے اس کی شرط یہ ہے کہ یہ فتنے اور گڑبڑ کا موجب نہ ہو اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے وقت گمان یہ ہو کہ یہ قابل قبول ہوگا۔

پس یہ ہے میرا عقیدہ۔ اور میں اس عقیدے کے ذریعے اللہ تعالےٰ کو ظاہراً و باطناً مانتا ہوں۔

آخر میں سب تعریف اللہ کے لئے ہے اول میں، آخر میں، ظاہر میں اور باطن میں ہمارے رب! ہمیں حشر کے دن ان اطاعت گزاروں کے زمرے میں اٹھائیو جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایمان لائے۔ اللہ تعالیٰ کی دعا و سلامتی ہو آپؐ پر جو سب مخلوقات سے بہتر ہیں، آپؐ کی آل پر، آپؐ کے صحابہؓ پر اور ان سب پر جو انُ کی متابعت کریں۔ اور اللہ ہی سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔
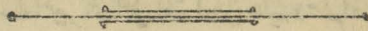
لفظ عقل کا استعمال عموماً دو طرح پر آیا کرتا ہے۔ (۱) عقل مطبوع۔ یہ وہ نور فطرت ہے، جو انسان کی خلقت کے ساتھ ہی خداوندکریم کی طرف سے ودیعت کی جاتی ہے۔ یہ نور فطرت مختلف لوگوں میں ایک ہی درجہ پر موجود نہیں ہوتا۔ (۲) عقل مسموع یعنی وہ نورِ علم جو انسان بذریعہ تعلیم و تعلم حاصل کرتا ہے۔ اور جو تجربہ و مشاہدہ سے زیادہ کیا جا سکتا ہے کیونکہ جس قدر تجربہ و مشاہدہ زیادہ وسیع ہوگا، اسی قدر نور عقل زیادہ ہوگا۔ عقل مطبوع کم و بیش نہیں ہو سکتی اور عقل مسموع یعنی نور علم کے متعلق احادیث نبوی میں اشارہ آچکا ہے۔ چنانچہ نور فطرت کے متعلق یوں آیا ہے "ما خلق اللہ خلقاً اکرم علیہ من العقل" یعنی خدا نے عقل سے بڑھ کر کوئی گرامی تر مخلوق پیدا نہیں کی۔ کیونکہ حقائقِ موجودات اور اسرار و معارف کے حاصل کرنے کا اصلی منبع یہی نور فطرت ہے۔

(مولانا اصغر علی روحی مرحوم)

حضرت خواجہ گیسودراز

مولانا اعجاز الحق قدوسی

دکن کی سرزمین جہاں اپنے اندر بے شمار صوری و مادی خصوصیات رکھتی ہے، وہاں معنوی اور روحانی فیوض و برکات سے بھی مالامال ہے، اس سرزمین میں کوہستان کے حیرت انگیز و دلکش مناظر نظر آتے ہیں، کہیں پرانے قلعے شاہان سلف کی عظمت یاد دلاتے ہیں، کہیں مساجد و معابد اپنے بنانے والوں کی عقیدت راسخہ کا مظہر ہیں، ولی و سراج جیسے شعر و سخن کے امام بھی یہیں ملیں گے اور اورنگ زیب عالمگیر جیسے پرسطوت شہنشاہ کی خواب گاہ بھی یہیں نظر آئے گی۔ ایلورہ اور اجنٹا کے غاروں سے پوچھئے کہ پتھر کو موم بنانے والے صناعوں کے دل و دماغ میں کیا قوت تھی، اور مذہب کی محبت کا کون سا جذبہ ان میں کارفرما تھا کہ جس کے تحت نہ جانے کتنی نسلوں نے اس صنعت کی تکمیل کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا ہوگا۔

اسی سرزمین میں سلسلۂ چشتیہ نظامیہ کے جلیل القدر صوفی و درویش حضرت خواجہ گیسودراز آرام فرما ہیں، جن کی ملکوتی شخصیت دکن کے لئے آفتاب اور سارے ہند و پاک کے لئے ماہتاب ہے۔

حضرت خواجہ گیسودراز کی ولادت باسعادت ۷، رجب ۷۲۱ھ کو دہلی میں ہوئی، آپ کے والد کا اسم گرامی سید یوسف حسینی، اور عرف سید راجا تھا، آپ کی والدہ کا نام بی بی رانی تھا، آپ کے والد کا سلسلۂ نسب بائیس واسطوں سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم سے جا ملتا ہے۔ خواجہ گیسودراز کا اسم گرامی محمد، کنیت ابوالفتح، اور لقب صدرالدین ولی الاکبر الصادق ہے لیکن سرزمین دکن میں آپ خواجۂ بندہ نواز گیسودراز کے لقب سے مشہور ہوئے۔

آٹھویں صدی ہجری کے شروع میں دکن کی سرزمین کا مقدر چمکا، اس زمانے میں ہندوستان میں محمد تغلق کی حکومت تھی، ممالک دکن پر مستقل قبضہ رکھنے کے لئے اسے یہ تدبیر سوجھی کہ دیوگری کو پایۂ تخت بنایا جائے چنانچہ اس نے وہاں ایک نیا شہر تعمیر کیا، اور اس نئے شہر کا نام دولت آباد رکھا، دکن میں سلمانوں کو آباد کرنے کی ایک تدبیر اس کے ذہن میں یہ آئی کہ دہلی کی آبادی کو دولت آباد میں منتقل کیا جائے اس نے عمائدین و امرائے دہلی سے قیمتیں دے کر ان کے مکانات و جائدادیں خرید لیں، پھر حکم دیا کہ وہ سب جاکر دولت آباد میں آباد ہوں، اس حکم پر سب سے پہلے خود محمد تغلق کی ماں مخدومہ جہاں نے عمل کیا اور وہ اپنے ہمراہ اپنے متوسلین اور بہت سے درویشوں کو لے کر دولت آباد چلی گئیں۔ دہلی سے علماء و فضلا اور اہل اللہ کی ایک جماعت بھی دولت آباد منتقل ہوئی، اہل اللہ کی اس جماعت کے ساتھ حضرت خواجہ گیسو دراز کے والد حضرت سید یوسف حسینی بھی دولت آباد تشریف لائے، اسی جماعت میں حضرت خواجہ برہان الدین غریب بھی آئے، اسی جماعت کے ساتھ حضرت امیر حسن علاء السنجری جو ایک اہل دل و شاعر تھے تشریف لائے، اہل اللہ کا یہ کارواں رمضان سنہ ۷۲۸ھ کو روانہ ہوا، اور پورے نو ماہ بعد یعنی ۱۷ محرم سنہ ۷۲۹ھ کو دولت آباد پہنچا۔

حضرت خواجہ گیسو دراز کے والد محترم نے دولت آباد کے شمالی جانب بالائے کوہ اس مقام پر قیام فرمایا جو اب روضۂ خلد آباد کے نام سے مشہور ہے۔

بچپن ہی سے حضرت خواجہ گیسو دراز کی پیشانی معرفت الٰہی کے انوار اور عشق رسول کی تابانی سے منور نظر آتی تھی، دولت آباد کے ایک مشہور اہل دل نے حضرت خواجہ گیسو دراز کو آپ کے والد محترم کے ساتھ دیکھا تو کہا یہ بچہ ریاضِ ولایت کا وہ خوش رنگ پھول ہے، جس کی مہک ایمان و عمل کی وادیوں کو ہمیشہ مہکائے گی۔ زمانہ طفلی کا تذکرہ کرتے ہوئے آپکے مشہور سوانح نگار محمد علی سامانی اپنی کتاب سیر محمدی میں لکھتے ہیں کہ آٹھ سال کی عمر سے آپ کو وضو، نماز اور دوسرے دینی امور میں غیر معمولی شغف تھا یہاں تک کہ چھوٹے بچے اس سے متاثر ہوتے اور آپ کے گرد جمع ہو جاتے۔

آپ کی ابتدائی تعلیم و تربیت آپ کے والد محترم سید یوسف حسینی نے فرمائی، ان کے بعد اس

گوہرِ ولایت کو جن بزرگوں نے علوم ظاہری سے تاباں و مزیّن بنایا، ان میں سید شرف الدین کیتھلی مولانا تاج الدین بہادر، آپ کے نانا اور قاضی عبدالمقتدر مشہور ہیں۔ علمی فضل و کمال کی شہادت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس عظیم المرتبت شیخ نے ایک سو پانچ سال کی عمر پائی اور آپ کی تصانیف کی تعداد بھی (۱۰۵) ہے۔

زمانۂ تعلیم میں حضرت خواجہ گیسودراز اپنے والد محترم اور اپنے بزرگ نانا سے حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی کے تذکرے سنا کرتے تھے، ذکر نے عشق کی صورت اختیار کی، اور ان مقدس تذکروں نے حضرت خواجہ گیسودراز کے قلب میں حضرت چراغ دہلی کی محبت کا چراغ روشن کر دیا۔ اتفاقاً اسی زمانے میں حضرت خواجہ گیسودراز کی والدہ اور آپ کے ماموں سید ابراہیم مستوفی میں جو دولت آباد کے صوبہ دار تھے، کچھ شکر رنجی ہو گئی، جس سے وہ اس قدر دل برداشتہ ہوئیں کہ وہ حضرت خواجہ گیسودراز اور آپ کے بڑے بھائی حضرت سید حسین عرف سید چندن حینی کو ہمراہ لے کر دہلی چلی آئیں۔ دلی میں سب سے پہلے حضرت خواجہ گیسودراز نے سلطان قطب الدین کی جامع مسجد میں خاندان چشتیہ نظامیہ کے اس آفتاب ولایت کو دیکھا جس کی ضیا باریوں نے دولت آباد کی وادیوں میں آپ کے سینے میں محبت کا چراغ روشن کیا تھا۔ آنکھوں نے جمال جہاں آرا دیکھا تو وارفتگی اور بڑھی، دوسرے دن ۷۳۶ھ کو اپنے بڑے بھائی سید چندن حینی کو ہمراہ لے کر آپ حضرت چراغ دہلی کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور آپ کے ہاتھ پر دونوں بھائیوں نے بیعت کی، اس وقت آپ کی عمر سولہ سال کی تھی۔

اپنے شیخ کی خدمت میں رہ کر جو ریاضتیں اور مجاہدے آپ نے کئے اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ "جوامع الکلم" یعنی جو حضرت خواجہ گیسودراز کے ملفوظات کا مجموعہ ہے کہ ایک روز میرے شیخ نے مجھ سے پوچھا کہ صبح کی نماز کے لئے جو وضو کرتے ہو، وہ طلوع آفتاب کے بعد باقی رہتا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ ہاں، فرمایا کہ مناسب یہ ہے کہ اسی وضو سے دوگانہ اشراق پڑھ لیا کرو جب میں نے اس کی پابندی کی تو فرمایا اگر چاشت کی نماز کی چار رکعتیں اور پڑھ لو تو چاشت کی نماز بھی ہو جایا کرے گی حضرت خواجہ گیسودراز فرماتے ہیں کہ میں ہمیشہ رجب کے روزے رکھا کرتا تھا، آپ کو معلوم ہوا تو

ارشاد فرمایا کیا تم رجب کے روزے رکھا کرتے ہو؟ میں نے عرض کیا جی ہاں، فرمایا کیا شعبان میں بھی روزے رکھتے ہو؟ میں نے عرض کیا صرف نو روز فرمایا اگر شعبان میں اکیس روز کے روزے بڑھالو تو تمہارے تین ماہ کے روزے ہوجائیں گے، خواجہ گیسو دراز فرماتے ہیں کہ میں رمضان کے بعد شش عید کے روزے رکھا کرتا تھا ایک روز قدم بوسی کی سعادت حاصل کرنے حاضر ہوا تو ارشاد فرمایا ہمارے بزرگ صوم دوام رکھتے تھے تم بھی صوم دوام رکھا کرو،

کبھی کبھی حضرت خواجہ گیسو دراز غلبۂ حال سے مجبور ہو کر آپ سے عرض کرتے کہ میں علوم ظاہری کے سلسلے کو ترک کر کے تمام تر اشغال باطنی میں مشغول ہونا چاہتا ہوں، ارشاد فرماتے ہرگز نہیں، سلسلۂ درس کو تمام کرو، ہمیں تم سے بہت سے کام لینے ہیں۔

حضرت خواجہ گیسو دراز کے علوئے مرتبت اور جلالتِ شان کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ جب کبھی آپ اپنی واردات و واقعات کو اپنے شیخ کے سامنے پیش کرتے، تو آپ کے شیخ ارشاد فرماتے کہ ستر برس کے بعد ایک لڑکے نے مجھ میں شوریدگی پیدا کردی ہے، اور گذشتہ زمانے کی یاد تازہ کردی ہے، انتہا یہ ہے کہ ایک روز خود آپ کے شیخ حضرت چراغ دہلی آپ کے حجرے میں تشریف لائے، آپ کو نذر دی، اس واقعہ کے بعد سے آپ کی غیر معمولی شہرت ہوئی اور اہل اللہ کی زبان پر تھا کہ شیخ محمد حسینی کو جوانی ہی میں پیران واصل اور مقتدیانِ کامل کا درجہ حاصل ہے۔

۱۵ ر رمضان ۷۵۷ھ کو آپ کے شیخ خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی بیمار ہوئے بعض لوگوں نے خلیفہ کے انتخاب کے سلسلے میں کچھ عرض کیا تو ارشاد فرمایا کہ جن کو تم خلافت کا اہل سمجھتے ہو، ان کی ایک فہرست مرتب کر کے لاؤ، مولانا زین الدین نے باہمی مشورے کے بعد ناموں کی ایک فہرست پیش کی جس میں حضرت خواجہ گیسو دراز کا نام نہ تھا، آپ نے اس فہرست کو دیکھا تو فرمایا یہ کیا ڈھیلے پتھر باندھ لائے ہو۔ ان سے کہو کہ اپنے ایمان کی فکر کریں، مولانا زین الدین نے اس سے بھی زیادہ مختصر اور منتخب فہرست پیش کی، حضرت شیخ نے فرمایا اس فہرست کو پڑھو، جب اس میں بھی حضرت خواجہ گیسو دراز کا نام نہ آیا، تو فرمایا سید محمد کا نام تم نے نہیں لکھا، مولانا زین الدین کانپنے لگے، اور

فہرست میں حضرت خواجہ گیسو دراز کا نام لکھ کر پیش کیا، حضرت چراغ دہلی نے اس نام پر اپنے قلم سے صاد فرمایا، اور آپ کو اپنی خلافت و جانشینی سے سرفراز فرمایا۔

۱۸ رمضان ۷۵۷ھ کو حضرت چراغ دہلی واصل الی اللہ ہوئے، آپ کی وفات کے تیسرے روز حضرت خواجہ گیسو دراز مسند آرائے رشد و ہدایت ہوئے، اور طالبان حق کو تلقین و ارشاد فرمانے لگے۔ عارف باللہ حضرت خواجہ گیسو دراز کے سرچشمۂ فیضان سے چوالیس سال تک دہلی میں مخلوق خدا مستفید ہوتی رہی۔ ۸۰۱ھ میں ساتویں ربیع الاول کو آپ نے پیشگوئی فرمائی کہ دلی پر ایک بہت بڑی مصیبت نازل ہونے والی ہے، لوگوں سے فرماتے تھے کہیں دور نکل جاؤ، چنانچہ آپ بھی اپنے خاندان کے ساتھ راہی دولت آباد ہوئے، آپ کی روانگی کے کچھ دن بعد دہلی تیموری حملے سے تباہ و برباد ہوئی۔

دولت آباد میں آپ نے روضۂ خلد آباد میں قیام فرمایا، اور ذکر الٰہی میں مشغول ہوگئے، دکن میں اس وقت فیروز شاہ بہمنی سریر آرائے سلطنت تخت شاہی تھا، فیروز شاہ کو جب آپ کا دولت آباد آنا معلوم ہوا تو اس نے دولت آباد کے صوبہ دار عضد الملک کو حکم دیا کہ وہ اس کی طرف سے آپ کی خدمت میں نذر پیش کرے، اور احسن آباد گلبرگہ میں جو بہمنی بادشاہوں کا دارالسلطنت تھا آپ سے قیام کی التجا کرے۔

غالباً ۸۰۳ھ میں یا اس سے کچھ قبل آپ گلبرگہ تشریف لائے، اور حضرت شیخ جنیدی اور شاہ سراج الدین کے روضۂ مبارک کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ گلبرگہ میں آپ کا قیام اس خانقاہ میں رہا جو قلعے کی پس پشت ہے، اس کے بعد وصال کے قریب آپ اس جگہ فروکش ہوئے۔ جہاں آج آپ کا مزار پرانوار واقع ہے۔ گلبرگہ میں آپ تقریباً بائیس سال تک تالیف و تصنیف، ارشاد و تلقین اور اصلاح خلق میں اور اسلام کی اشاعت میں مصروف رہے۔

علم و فضل کے علاوہ آپ کو شاعری سے بھی ذوق تھا، فصاحت و بلاغت، معنویت اور اثر و تاثیر کے لحاظ سے آپ کا کلام فارسی ادب کی جان ہے، آپ کا مجموعہ کلام انیس العشاق شاعرانہ

قادر الکلامی اور رفعتِ فکری کا ایک دلکش مرقع ہے۔

اردو کے دامن کو جن صوفیائے کرام نے مرصع وزرنگار بنایا اور جن بزرگوں کے دامن عاطفت میں یہ زبان پھلی پھولی، ان میں حضرت خواجہ گیسودراز کا نام نامی اور اسم گرامی ممتاز نظر آتا ہے آپ نے اسلامی تعلیمات کو عام کرنے کے لئے بعض رسالے دکنی زبان میں لکھے، ان میں سے ایک رسالہ "معراج العاشقین" ہے۔

۱۶ر ذیقعدہ ۸۲۵ھ کو دوشنبہ کے دن جب کہ آپ کی عمر ایک سو چار سال چار ماہ بارہ یوم کی تھی، آپ واصل باللہ ہوئے۔

مرد خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصلِ حیات، موت ہے اس پر حرام

"سالکوں کے لئے تقلیلِ طعام ضروری ہے۔ اور جب وہ کھائیں تو ہر لقمہ کے ساتھ بسم اللہ کہیں، بلکہ سورۂ فاتحہ پڑھیں۔ جو چیز کھائیں، وہ بالکل حلال ہو، اپنی روزی کو حلال ثابت کرنے کے لئے کوئی تاویل نہ کریں۔ اگر کسی جگہ دعوت ہو اور اس میں وہ شرکت کریں، لیکن کھانے کا ارادہ نہ رکھتے ہوں یا تھوڑا ہی کھانا چاہتے ہوں، تو اس کو اپنے بیٹھنے کے طریقے سے ظاہر نہ ہونے دیں۔ اس سے تکبر کا اظہار ہوتا ہے۔۔۔۔ روٹی کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے دسترخوان پر نہ چھوڑیں۔ یا تو پوری کھائیں یا آدھی۔ زیادہ سیر ہو کر کھانے کے بجائے کچھ بھوک باقی رہے، تو کھانا چھوڑ دیں۔ دعوت کے کھانے کی نہ زیادہ تعریف کریں اور نہ برائی بیان کریں۔ کھانے کے بعد مسلسل پانی نہ پئیں لوگوں کے سامنے کھانے کے درمیان یا کھانے کے بعد ڈکار نہ لیں۔ مجلس میں خلال نہ کریں۔ میزبانوں کو اپنے مہمانوں کے سامنے زود ہضم کھانے پیش کرنے چاہئیں، لیکن مہمانوں کے سامنے جیسا بھی کھانا آئے اس کو دیکھ کر خوش ہوں۔۔۔۔"

(تعلیمات حضرت سید محمد گیسودراز ـــــ ماخوذ از بزم صوفیہ)

فکر ولی اللہی کا بنیادی نقطہ

محمد سرور

حضرت شاہ ولی اللہ کی علمی شخصیت اتنی حیثیات کی جامع ہے، اور پھر ان میں سے ہر ہر حیثیت اس قدر وسیع و عمیق ہے کہ مجموعی طور سے ان کا احصاء کرکے حضرت شاہ صاحب کے بنیادی فکر کا تعین کرنا بڑا مشکل ہے۔ وہ اپنے دور میں اور اس کے بعد بحیثیت ایک محدث کے بہت زیادہ مشہور ہوئے، لیکن یہ واقعہ ہے کہ وہ محدث ہونے کے ساتھ ساتھ فقہ کے بھی ایک بہت بڑے مجتہد تھے، اور انہوں نے فقہی فکر میں بہت کچھ اضافہ کیا اس کے علاوہ شاہ صاحب نے قرآن مجید کا فارسی میں ترجمہ کیا اور اس پر تشریحی فوائد لکھے، چنانچہ پروفیسر جلبانی کے الفاظ ہیں۔

"علم تفسیر کا دائرہ بہت وسیع ہے، اور مفسرین بھی مختلف قسموں کے ہیں۔ جہاں تک شاہ ولی اللہ رضؒ کا تعلق ہے، آپ کو اس کے جملہ فنون میں خاص مہارت حاصل تھی اور آپ اس کے اصول و فروع سے بخوبی واقف تھے۔ اس علم میں آپ کو وہی رتبہ حاصل تھا جو ایک مجتہد فی المذہب کو حاصل ہوتا ہے۔

"حقیقت تو یہ ہے کہ اگر آپ کو امام المفسرین مان لیا جائے، تو کوئی مبالغہ نہ ہوگا"[1]

دین اسلام کی حقانیت و افادیت کو اس طرح پیش کرنا کہ اہل عصر کی عقلیت پسند طبعتیں اسے قبول کریں

---

[1] شاہ ولی اللہ کی تعلیم

اور جسے اصطلاحی زبان میں "علم الکلام" کا نام دیا گیا ہے، علم کی اس صنف میں شاہ صاحب کا پایہ اتنا بلند ہے کہ ان کی کتاب "حجۃ اللہ البالغۃ" جو خاص اس موضوع پر ہے، نہ صرف برصغیر ہند و پاک میں بلکہ دوسرے مسلمان ملکوں میں بھی پڑھی اور پسند کی جاتی ہے۔ اور اسے باوجود اس کے دوسو سال پرانے ہونے کے اس باب میں سب سے اچھی کتاب سمجھا جاتا ہے۔

جہاں تک تصوف میں شاہ صاحب کے علمی و عملی درک کا تعلق ہے، نہ صرف یہ کہ انہوں نے تصوف پر لکھا، بلکہ وہ خود صاحب ریاضت و طریقت صوفی تھے، اور رشد و ہدایت کے طالبوں کی رہنمائی کرتے اور ان سے بیعت لیتے تھے۔ اب رہی شاہ صاحب کی فلسفہ و منطق سے دلچسپی تو ان کے دور میں جو بھی فلسفی و منطقی علوم مروج تھے، ان سب کی انہوں نے باقاعدہ تحصیل کی تھی۔ چنانچہ مختلف موضوعات پر آپ نے جو کثیر التعداد کتابیں تصنیف کیں ان سب میں شاہ صاحب کی فلسفیت و منطقیت نمایاں ہے، اور وہ ایک جگہ اس سلسلے میں اپنا ذکر یوں کرتے ہیں۔

علی من می شناسم این گوہر دزدانِ حکمت را

فلاطون آہ گر می دید یونانے کہ من دارم

گویا شاہ صاحب کو اس پر فخر تھا کہ وہ فلاطون سے بڑھ کر اپنے اندر ایک یونان رکھتے ہیں کچھ عرصے سے شاہ ولی اللہ صاحب کی بعض اور حیثیتوں کو بھی بڑے نمایاں طور سے پیش کیا جا رہا ہے اس میں شاید پہل مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم نے کی ہے۔ مولانا مرحوم کے نزدیک حضرت شاہ صاحب ایک محدث، مجتہد فقہ، عارف صوفی اور متکلم ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اجتماعی و سیاسی مفکر بھی تھے۔ انہوں نے اس سرزمین میں ایک اجتماعی و سیاسی تحریک کا فکری بیج بویا تھا۔ جس کا عملی ظہور ایک زمانے میں حضرت سید احمد شہید اور حضرت شاہ اسمٰعیل شہید کی جدوجہد کی شکل میں ہوا، اور اس کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔

اِس ضمن میں مولانا سندھی فرماتے ہیں۔

شاہ ولی اللہ صاحب نے قرآن مجید کا جو نصب العین معین فرمایا ہے، وہی ان کی حکمت کی

اساس ہے۔ جب ہم فلسفہ ولی اللہ کا نام لیتے ہیں تو اس سے ہماری مراد وہ حکمت ہے، جو شاہ صاحب کے نزدیک قرآنی مقاصد کا لب لباب ہے۔ یہ حکمت اتنی ہی قدیم ہے، جتنی کہ خود یہ دنیا ہے۔ دنیا کی ارتقائی تاریخ کے ساتھ ساتھ اس حکمت نے کیسے کیسے ترقی کے مراحل طے کئے شاہ صاحب نے اپنی کتاب "تاویل الاحادیث" میں اس پر بحث کی ہے۔ آدم علیہ السلام کے زمانے میں زندگی کے کیا کیا ضابطے اور شرائع تھے، ان سے کس طرح اس عہد کی حاجتیں پوری ہوتی تھیں، پھر اس کے بعد جیسے جیسے انسانیت ترقی کرتی گئی۔ اور اس کے ساتھ ساتھ افکار و خیالات میں بھی تبدیلیاں ہوتی رہیں "فلسفہ ولی اللہی" ان مسائل پر بحث کرتا اور ان سب کا حل پیش کرتا ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے جو دور تھا، شاہ صاحب اسے صابئین کا دور قرار دیتے ہیں ---- یہ حکمت اتنی ہی عالمگیر ہے جتنی کہ خود انسانیت ہے۔ اس کا مرکز کبھی ہند ہوا، کبھی ایران اور کبھی یونان۔ یہ سب صابئی مرکز تھے۔ پھر حضرت ابراہیم آتے ہیں اور یہاں سے حنیفی دور شروع ہوتا ہے۔ انسانی فکر کی ارتقائی تاریخ کا اس طرح تجزیہ کرنے سے خود انسانیت کی حقیقت اور ماہیت واضح ہو جاتی ہے اور ہم جان سکتے ہیں کہ انسان کیا ہے اور انسانیت کا کیا تصور ہے۔"

مولانا سندھیؒ اور ان کے ہم خیالوں کے نزدیک شاہ صاحب صرف ایک اجتماعی مفکر تھے، بلکہ انہوں نے قرآن حکیم کی اساس پر دعوت انقلاب بھی دی۔ اس بارے میں شیخ بشیر احمد سورۂ مزمل اور سورۂ مدثر کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :- اس انقلاب کا پہلا مطمح نظر قیصر و کسریٰ کی حکومتوں کی بربادی تھی اور اس کا دائمی منشا اس کے قانون کا غلبہ ہے، جس کا ایک اہم ذریعہ ساکین کی تنظیم ہے۔ یہ وہ حشر خیز اصول ہے جس سے دنیا میں قرآنی انقلاب کی قیامت صغری برپا ہوتی ہے اور جس کے بعد قرآن کی حامل جماعت فارغ البال غاصب طبقوں سے جواب طلبی کرتی ہے حجاز میں یہ نمونہ انقلاب ایک دفعہ رونما ہو چکا ہے، جس کی آخری لہریں بعض ملکوں میں اب تک ہچکولے لے رہی ہیں۔ اگر یہ درست ہے کہ اسلام ہمیشہ انسانیت کے کچلے ہوئے طبقات میں ظاہر ہوا ہے اور اب پھر ایسے ہی طبقات میں رہ گیا ہے تو اگر مسلمان ہوشیار ہو گئے تو دنیا کو ایک انقلاب عظیم کی توقع رکھنی چاہیئے جو نہ صرف

جامع ہوگا بلکہ عالمگیر بھی ہوگا اور وہ انقلاب قرآن حکیم کے اصول پر ہوگا۔ ممکن ہے کہ امام الائمہ امام ولی اللہ دہلوی کے طریقے کا ہندوستانی مسلمان بھی اس انقلاب میں اچھا خاصہ حصہ لے۔ اب ہمارے ملک کے حاملین قرآن کا فرض ہے کہ وہ زمانے کی نبض کو پہچانیں اور امام ولی اللہ دہلوی کی حکمت کو سمجھ کر قرآن حکیم کو اپنائیں جو اس دور حکمت میں جامع اور عالمگیر انقلاب برپا کرنے والی واحد کتاب ہے"
(یہ تفسیر مولانا سندھیؒ کے خطبات سے مرتب کی گئی ہے)

غرض جیسا کہ شروع میں عرض کیا گیا، شاہ ولی اللہ صاحب کی علمی شخصیت کی بہت سی حیثیتیں ہیں اور ہر حیثیت میں ان کا پایہ بہت بلند ہے۔ اس لئے یہ بڑا مشکل ہو جاتا ہے کہ ان کی کون سی حیثیت کو سب سے نمایاں مانا جائے، اور باقی حیثیتیں اس کے تابع سمجھی جائیں مثال کے طور سے مولانا سندھی شاہ صاحب کی ایک اجتماعی و انقلابی مفکر ہونے کی حیثیت پر زیادہ زور دیتے تھے لیکن اس کے برخلاف مولانا سید سلیمان ندویؒ اپنے ایک مکتوب میں رقم فرماتے ہیں۔

"شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ مرد فقہ و حدیث و کلام و اسرار و رموز شریعت ہیں تصوف کی کتابوں میں ان کا پایہ ان کے دوسرے علوم کے مطابق نہیں ہے اس لئے ان سے نہ گھبرائیے اور نہ ان کی صوفیانہ کتابوں کی طرف توجہ کیجئے۔"

شاہ صاحب کی علمی شخصیت کا بنیادی نقطہ کیا ہے؟ ان سطور میں اسے متعین کرنے کی ایک طالب علمانہ کوشش کی جاتی ہے۔

اس حقیقت سے تو کوئی انکار نہیں کرے گا کہ شاہ صاحب ایک عالم ربّانی تھے۔ اور ان کا منصب ایک معلم اور مرشد کا تھا۔ اور ان کی ساری زندگی ارشاد و تعلیم میں گزری انہوں نے مختلف علوم و فنون پر کتابیں لکھیں، جن میں تفسیر، حدیث، فقہ، کلام، اور تصوف کے علاوہ تاریخ، اجتماعیات اور سیاسیات بھی شامل ہیں۔ وہ علم تصوف کے ذیل میں انسانی نفسیات کی گتھیاں بھی سلجھاتے ہیں، اور جن اجتماعی و سیاسی حالات سے انہیں دو چار ہونا پڑا، ان سے عہدہ برآ ہونے کے متعلق انہوں نے غور و خوض بھی کیا۔ اور ان حالات کی اصلاح کی کوششیں کیں۔ یہ سب کچھ تھا اور واقعی

شاہ صاحب کی بڑی ہمہ جہتی شخصیت تھی، لیکن راقم الحروف کے نزدیک یہ سب شاخیں ایک اصل سے پھوٹتی ہیں، اور وہ تھا ان کا دین اسلام کا عقیدہ اور اس عقیدے کا ایک خاص تصور۔ شاہ صاحب کا اصل مقصد لوگوں کو دین اسلام کی تعلیم دینا تھا، اور انہوں نے جو کچھ لکھا اسی مقصد کے پیش نظر لکھا

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ شاہ صاحب کا دین کا کیا تصور تھا اور انہوں نے اس تصور پر اپنے فکر و علم کی کس طرح عمارت بنائی۔ سب سے پہلے تو یہ واضح ہونا چاہیئے کہ شاہ صاحب دین کو زندگی کی اصل غایت مانتے ہیں اور اس کے تحت وہ زندگی کو دیکھتے اور اسے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ اگر ہم شاہ صاحب کے ہاں جو دین کا تصور ہے، اس کی حقیقت جان لیں تو گویا ہمارے ہاتھ میں وہ اساسی نقطہ آجائے گا، جو شاہ صاحب کی جملہ تعلیمات و افکار کی بنیاد ہے۔ اب شاہ صاحب کے نزدیک دین کا تصور بڑا وسیع اور جامع ہے۔ اور وہ زندگی کی طرح ہمہ گیر ہے ان کا کہنا ہے کہ دین زندگی کو ایک مقصد دیتا ہے اور یہ مقصد اتنا ہی عام اور عالمگیر ہوتا ہے جتنی کہ خود زندگی۔ دین شروع سے آخر تک اپنے عمومی مقاصد کے لحاظ سے اپنی اصلی حالت پر قائم ہے البتہ زمانے کے ساتھ ساتھ اس کی ظاہری شکلیں بدلتی رہتی ہیں، لیکن دین کی اس اصل میں جو غیر متبدل ہے اور اس کی مختلف شکلوں میں جو مرور ایام کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں حقیقتاً کوئی تضاد نہیں۔ اسے آپ وحدت فی کثرت کا نام دے لیں غرض دین ایک ہے اور اس کے مظاہر مختلف۔

شاہ ولی اللہ کی مشہور کتاب حجۃ اللہ البالغہ کے ایک باب کا عنوان ہے "تمام مذاہب و ادیان کی اصل ایک ہے۔ شرائع مناہج، طریقے مختلف ہیں۔" اس باب میں وہ لکھتے ہیں "اللہ تعالیٰ فرماتا ہے شرع لکم من الدین ما وصی بہ نوحا والذی اوحینا الیک اوحینا بہ ابراھیم وموسیٰ وعیسیٰ ان اقیموا الدین ولا تتفرقوا (اس نے تمہارے لئے دین کا وہی راستہ ٹھہرایا ہے جس پر چلنے کا اس نے نوح کو حکم دیا تھا۔ اور اے پیغمبر! تمہاری طرف بھی ہم نے اسی راستہ کی وحی کی ہے اور اسی کا ہم نے ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو حکم دیا تھا کہ اسی دین کو قائم کرنا اور اس میں تفرقہ نہ ڈالنا) حضرت مجاہد نے اس آیت کی تفسیر اور معنی یہ کئے ہیں کہ اے محمدؐ!

ہم نے تم کو اور ان کو ایک ہی دین کی وصیت کی ہے۔

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وان ھذہ امتکم امۃ واحدۃ وانا ربکم فاتقون فتقطعوا امرھم بینھم زبراً کل حزب بما لدیھم فرحون (اور یہ تمہاری امت ایک امت ہے اور میں تمہارا رب ہوں۔ تو تم مجھ سے ڈرتے رہو۔ پھر لوگوں نے آپس میں پھوٹ ڈالکر اپنا اپنا دین جدا کرلیا۔ اور جو دین جس فرقے کے پاس ہے وہ اسی سے خوش ہے) یعنی تمہاری ملت اور تمہارا دین وملت اسلام ہے اور مشرکین، یہود اور نصاریٰ نے اس میں پھوٹ ڈال دی۔

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ لکل جعلنا منکم شرعۃ ومنھاجاً (اور ہم نے وقتاً فوقتاً تم میں سے ہر ایک کے لئے ایک شریعت اور طریقہ خاص ٹھہرایا) اس آیت کی تفسیر میں حضرت ابن عباس فرماتے ہیں۔ شریعت اور منہاج کے معنی راہ اور طریقے کے ہیں۔

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ لکل امۃ جعلنا منسکاً ھم ناسکوہ (ہم نے ہر ایک امت کے لئے عبادت کے طریقے قرار دیئے کہ ان پر چلتے رہیں۔"

اس کے بعد شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں:۔ معلوم ہونا چاہیئے کہ اصل دین ایک ہے اور تمام انبیائے کرام اس پر متفق ہیں۔ تمام انبیائے کرام کا اتفاق ہے کہ خدا کو ایک مانا جائے اسی کی عبادت کی جائے۔ قیامت حق ہے، مرنے کے بعد زندہ ہونا حق ہے۔ اسی طرح تمام انبیائے کرام بِرّ یعنی نیکی کے اصولی اقسام پر بھی متفق ہیں۔ اور اسی طرح تمام انبیائے کرام نکاح کی ضرورت، زنا کی حرمت، عدل وانصاف قائم کرنے، ظلم وجور کی حرمت پر متفق ہیں۔

"یہ امور ان لوگوں کے نزدیک جو قرآن کے مخاطب تھے۔ بطور مسلمات کے تھے اور اگر اختلاف تھا تو صرف ان امور کی صورتوں اور شکلوں میں تھا۔ حاصل کلام یہ کہ وہ خاص خاص صورتیں اور مخصوص ہیئتیں جن پر مختلف قسم کی نیکیوں اور تدابیر نافعہ ومعاشی اور امور معاشرت کی آسانیوں اور سہولتوں کی عمارت قائم کی جاتی ہے، انہیں کا نام شریعت اور منہاج ہے۔"

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سے اسباب تھے، جن کی وجہ سے مختلف زمانوں

ہیں مختلف قوموں کے لئے مختلف شرائع نازل ہوتے رہے۔ اس پر بحث کرتے ہوئے شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں۔

" معلوم ہونا چاہیئے کہ انبیائے کرام کے شرائع میں اختلاف چند اسباب و مصالح کی بنا پر ہوا کرتا ہے اور یہ اس طرح کہ شرائع الہیہ کے لئے چند ایسے اسباب اور وجوہات ہوتے ہیں جن کی بنا پر ان شرائع کو شعائر قرار دیا جاتا ہے۔ اور شرائع کے مقدار و اندازے کی مشروعیت میں بھی مکلفین کے حالات، عادات اور اطوار کا لحاظ کیا جاتا ہے۔" اس کی مثالیں دینے کے بعد شاہ صاحب لکھتے ہیں۔

" انبیائے کرام کا سب سے بڑا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان ارتفاقات اور معاشرت کی ان تدابیر نافعہ کی اصلاح کی جائے، جو ان کے مخاطبین میں موجود اور ان میں جاری و ساری ہیں۔ اور اسی لئے ان کو ان کی مالوفات اور شب و روز کی عادی چیزوں سے یکسر جدا کر کے غیر مالوف چیزوں کی طرف دعوت نہیں دی جاتی۔ الا ماشاء اللہ اور یہ ظاہر ہے کہ مصالح کے مواقع باعتبار زمانہ اور عادتوں کے مختلف ہوا کرتے ہیں اور اسی بنا پر شریعتوں میں نسخ صحیح اور جائز ہے۔ اس کی مثال طبیب کی سی ہے کہ وہ ہر حال میں مزاج کا اعتدال اور اس کا تحفظ چاہتا ہے اور اس لئے مختلف اشخاص اور مختلف اوقات کے لحاظ سے اس کے احکام اور طبی طریقے مختلف ہوا کرتے ہیں جس چیز کا حکم وہ جوان کو دیتا ہے۔ بوڑھے کو نہیں دیتا۔ گرمیوں کے زمانے میں کھلے میدان اور کھلی ہوا میں سونے کا حکم دیتا ہے۔ اور سردیوں میں گھر میں سونے کا حکم دیتا ہے کیونکہ گھر کے اندر سردی کا بچاؤ ہو سکتا ہے اسی طرح جو شخص اصل دین اور شرائع و مناہج کے اختلاف کے اسباب کو سمجھتا ہے اس کے نزدیک یہ تغیر و تبدل درحقیقت تغیر و تبدل نہیں ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ شرائع کی نسبت قوموں کی طرف ہوا کرتی ہے اور چونکہ ان کی استعداد و قابلیت نے یہ شرائع اور مناہج ان پر واجب اور لازم کئے ہیں اور زبان حال سے مناسب سعی و التجا کے ساتھ ان شرائع کی درخواست اور مطالبہ کیا ہے اس لئے ہدفِ ملامت اور محلِ مواخذہ یہی قومیں اور یہی لوگ ہوا کرتے ہیں۔"

یہ تو ہوا شاہ صاحب کا دین کا تصور۔ اب یہ حقیقت ہے کہ اس تصور کے عملی مظاہر خواہ کسی رنگ میں ہمارے سامنے آئیں، ان میں ان دو باتوں کا پایا جانا ضروری ہے ایک تو یہ کہ دین کسی طرح بھی زندگی کو محدود نہیں مانتا۔ وہ نہ ازل میں انتہا کا قائل ہے اور نہ ابد کو منتہی سمجھتا ہے، دین اس آب و گِل میں زندگی کو محدود ماننے سے سختی سے انکار کرتا ہے، اس کے نزدیک طبیعیات کی دنیا میں جو باوجود اپنی تمام بے کنار وسعتوں کے پھر بھی ایک جزو ہے، زندگی جو ایک کُل ہے، کسی طرح محدود نہیں ہو سکتی۔ اس سے کہیں یہ خیال نہ ہو کہ دین کی نظر میں اس عالم طبیعیات کی کوئی خاص اہمیت نہیں اور یہ محض ایک پرتو ہے کسی دوسرے عالم کا جو مابعد الطبیعیات میں ہے شاہ صاحب اس خیال کے حامی نہیں وہ دنیائے طبیعیات کی اہمیت کے قائل ہیں اور اسے وہ ایک ٹھوس زندہ حقیقت سمجھتے ہیں، لیکن ایک سچے دین دار کی طرح ان کے عقائد کے سوتے ان کے مابعد الطبیعات تصورات کے سرچشموں سے پھوٹتے ہیں۔ چنانچہ ان کی برابر یہ کوشش رہی کہ وہ طبیعیات کے حقائق کو جو تجربہ اور مشاہدہ کا حاصل ہیں، اپنے ما الطبیعاتی تصورات سے ہم آہنگ کریں اور جزو جو کہ یہ دنیائے طبیعیات ہے، اور کُل جس سے کہ پوری زندگی مع مابعد الطبیعات کے عبارت ہے، ان دونوں میں کلّی موافقت ہو۔

زندگی کو اس طرح لامحدود ماننا اور اسے محض طبیعیات پر ختم نہ کر دینا یقینی طور سے مستلزم ہوتا ہے ایک ایسے وجود کو ماننے پر، جو الحیّ اور القیوم ہو۔ اور یہ دین کی ایک بنیادی شرط ہے۔

دین کی دوسری خصوصیت جو اس کے لئے لازمی ہے، وہ اس کا اخلاقی نقطہ نظر ہے دین کا مقصود ہمیشہ سے حصولِ خیر رہا ہے۔ بے شک خیر کی تفصیلات مختلف زبانوں میں مختلف معین ہوتی رہی ہیں، لیکن خیر" کا ایک بنیادی تصور ہمیشہ سے دین کا ایک ضروری جزو مانا گیا ہے۔ تصوّر" خیر" کی عمومیت تاریخی ارتقا کے ساتھ ساتھ برابر وسیع ہوتی رہی ہے اور شاہ صاحب ان حکماء میں سے ہیں، جن کا تصور "خیر" پوری انسانیت کو محیط ہے۔ اور وہ خالق، مالک، ربّ اور مدبّر پر ایمان لانے کا عملی زندگی میں حتمی نتیجہ "خیر" پر ایمان لانا قرار دیتے ہیں۔ بہرحال خیر کی جو بھی عملی تفصیلات ہوں اور جو بھی تعبیر کی جائے۔.........

کوئی دین "خیر" کے تصور کے بغیر دین کہلانے کا مستحق نہیں ہو سکتا۔

راقم الحروف کے نزدیک شاہ ولی اللہ صاحب کی علمی شخصیت کو سمجھنے کے لئے ان کے فکر کے اس بنیادی نقطہ سے بڑی مدد مل سکتی ہے اور یہ ایک لحاظ سے کلید بن سکتا ہے ان کے مختلف اور کہیں کہیں بظاہر متضاد افکار و خیالات کو حل کرنے کی۔

القصہ بلحاظِ وجوہ مذکور عجب نہیں کہ طبّ روحانی کی رو سے ہر زمانہ میں ایک جدا نسخہ تجویز کیا جائے۔ یا ہر قوم کو ایک جدی معجون دی جائے، تو یہ اختلاف دینوں کا عبادتوں میں ہو، یا معاملوں میں ہو، بشرطیکہ آسمانی ہونے ان دینوں کے، عجب نہیں کہ اس وجہ سے ہو اور کچھ دور نہیں کہ کسی زمانے کے چند احکام دوسرے زمانے میں موقوف کئے جائیں اور ان کے بدلے اور حکم دیئے جائیں۔

"..... مہربان من! چار باتیں اخلاق میں ایسی ہیں کہ ان کی بھلائی میں عام و خاص کو ایسا اتفاق ہے، جیسا روز کے روشن ہونے اور رات کے اندھیری ہونے میں کسی کو کلام نہیں - ایک تو عدل و انصاف - یعنی حق والوں کے حقوق ادا کرنے، دوسرے دوسروں کے ساتھ احسان اور بھلائی کرنی۔ تیسرے متانت یعنی سبک حرکت نہ ہونا اور بے فائدہ اور بے ہودہ کام نہ کرنے - چوتھے نفاست و پاکیزگی - سو یہ چار باتیں ایسی ہیں کہ اگر خدائے کریم کسی کو عنایت کرتا ہے تو اور لوگ اس کی تعریف کرتے ہیں.."

ماخوذ از تقریر دلپذیر مولانا محمد قاسم؟

سندھ کے سہروردی مشائخ

میمن عبدالمجید سندھی

سب سے پہلے سہروردی بزرگ، جو سندھ میں رونق افروز ہوئے حضرت مخدوم نوح بکھری تھے۔ آپ سلسلۂ سہروردیہ میں ایک خاص اہمیت و عظمت کے مالک تھے۔ حضرت مخدوم صاحب حضرت شیخ شہاب الدین عمر سہروردی (۵۳۹ھ، ۶۳۲ھ) کے مرید اور خلیفہ تھے۔ اور حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی سے پہلے خرقۂ خلافت حاصل کر کے مرشد کے حکم کے مطابق تبلیغ کے ارادے سے بکھر میں آ کر رہے تھے۔ آپ کے بعد جب حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی حضرت شیخ شہاب الدین کے مرید ہوئے اور خرقۂ خلافت حاصل کر کے رخصت ہونے لگے تو حضرت شیخ نے آپ کو فرمایا کہ ہمارے مریدوں میں سے ایک ہدایت والے مرید شیخ نوح سندھ کے شہر فرشتہ (بکھر کا پرانا نام) میں ہے۔ اس سے ضرور ملاقات کریں۔ کیونکہ وہ چراغ۔ بتی اور تیل خود لے کر ہمارے پاس آئے تھے اور انہیں صرف روشن کرنے کی ضرورت تھی۔ حضرت زکریا اپنے مرشد کے حکم کے مطابق بکھر میں آئے، لیکن اس سے پہلے حضرت مخدوم نوح واصل باللہ ہو چکے تھے۔ افسوس کہ آپ کے مفصل حالات سندھ کے تذکروں میں نہیں ملتے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ آپ نے قدیم دور میں اسلامی تصوف کے تبلیغ کی اہم خدمات انجام دی ہونگی۔

۱؎ تحفۃ الکرام ج ۳، ص ۱۲۵ حدیقۃ الاولیاء قلمی ص ۸۱، ۸۲، ۳۳ بحوالہ تذکرہ صوفیائے سندھ
ص ۲۷۸ - ۲۷۹ - حدیقۃ الاولیاء قلمی ص ۸۱، ۸۲ بحوالہ تذکرہ صوفیائے سندھ۔

آپ کی عظمت کا واضح ثبوت آپ کے شیخ کا وہ بیان ہے جو اوپر آچکا ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے بزرگ بھی آپ کی عظمت کا اعتراف کرتے رہے ہیں۔ حدیقۃ الاولیاء کے مصنف آپ کے اوصاف کے ضمن میں لکھتے ہیں۔

آں بزرگوار نامدار سر دفتر مشائخ کبار، صاحب توفیق فارسِ مضمارِ تحقیق شیخ الشیوخ شیخ نوح بکھری قدس سرہٗ از جملہ اولیائے کرام و مشائخ عظام سندھ بود از فرقۂ مقبولان درگاہ دہاریافتگان خلوت محبت اللہ دست ارادت از شہاب الحق والدین برہان الصدق والیقین شیخ شہاب الدین گرفتہ۔

صاحب تحفۃ الکرام اس طرح رقمطراز ہیں[۱]۔

شیخ نوح بکھری سہروردی از اجل اولیائے سندھ و اکمل مریدان شیخ شہاب الدین سہروردیست۔

آپ کا مزار مبارک بکھر کے قلعہ میں ریلوے بند کے پاس واقع ہے۔

بخاری مشائخ

سہروردی مشائخ میں سے بخاری بزرگوں کا بھی سندھ سے قریبی تعلق رہا ہے حضرت جلال سرخ بخاری بخارا سے ملتان آنے کے بعد بکھر آئے تھے اور آپ نے کچھ عرصے کے لئے یہیں سکونت اختیار کی تھی۔ بکھر کے دوران قیام میں بکھر کے ایک بزرگ سید بدرالدین کی لڑکی سے آپ کا نکاح ہوگیا۔ نکاح کی بشارت آپ کو حضور صلعم نے دی تھی اور سید بدرالدین کو بھی اس قسم کا ارشاد ہوا تھا[۲]۔ سید بدرالدین بن سید صدرالدین خطیب کے متعلق صاحب تحفۃ الکرام نے لکھا ہے کہ آپ کا سلسلۂ نسب امام علی النقی رضہ سے ملتا ہے[۳]۔ صاحب تحفۃ الکرام آپ کی بزرگی اور اوصاف کے معترف ہیں۔ اس کے علاوہ آپ کے اولاد کے متعلق بھی لکھا کہ وہ سرداری اور نسب کی بزرگی میں روہڑی میں مشہور ہیں[۴]۔

حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت کا بھی سندھ سے قریبی تعلق تھا۔ آپ فیروز شاہ تغلق کے زمانے

---

[۱] ج ۳ ص ۱۲ [۲] تحفۃ الکرام ج ۳ ص ۱۲۶ [۳] ص ۳ اور [۴] ایضاً ص ۱۲۵

میں اوچ اور سندھ کے شیخ الاسلام تھے اور سیوھن کے اطراف کا کچھ علاقہ آپ کی جاگیر میں تھا۔ اس کے علاوہ سندھ کے حکمران بھی آپ کے مرید تھے جب فیروز تغلق نے ٹھٹھہ پر تاخت کی تو پہلے اسے ناکامی ہوئی دوسری مرتبہ بھی اسے کامیابی نہیں ہوتی تھی۔ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت آئے اور سندھ کے امیروں سے ملے تب جاکر حاکم ٹھٹھہ نے اطاعت قبول کی۔

مخدوم سید حامد بن سید جہانیاں جہاں گشت نے خود کو سندھی لکھا ہے۔ آپ نے سید امیر کبیر قطب الدین مدنی کے ملفوظات عربی میں قلمبند کئے ہیں اور ان میں اپنے نام کے ساتھ "السندھی" لکھا ہے۔ یہ مجموعہ ملفوظات کتب خانۂ اولاد سید فضل اللہ گوسائیں محلہ بارہ دری صوبہ بہار سے ملا ہے حضرت مخدوم حامد بکھر میں کافی عرصہ رہے یہی وجہ ہے کہ آپ نے خود کو سندھی لکھا ہے آپ کے بھائی سید محمود بن جہانیاں جہاں گشت نے بکھر کے ایک بزرگ سید علاؤالدین بن سید شہاب الدین بن سید موسیٰ بن سید علاؤالدین بن سید محمود مکی[1] کی لڑکی سے شادی کی تھی، جس کے بطن سے سید فیض اللہ تولد ہوئے[2]۔ معلوم ہوتا ہے کہ سید فیض اللہ نے مستقل طور پر سندھ میں ہی اقامت اختیار کی کیونکہ تحفۃ الکرام سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی اولاد میں سے سید فضل اللہ بن سید قطب الدین بن سید ابراہیم بن راجو بن سید اسمٰعیل بن سید فیض اللہ بن سید محمود بن مخدوم جہانیاں جہاں گشت نے بکھر کے ایک رضوی سید محمود بن سید فخر الدین بن سید علاء الدین بن سید ابراہیم ثانی بن سید قاسم[3] کی لڑکی سے عقد کیا تھا جس کے بطن سے سید نظام الدین تولد ہوئے[4]

سید محمد مکی

جزیرہ بکھر کا قدیم نام فرشتہ تھا۔ الور کی ویرانی کی وجہ سے الور کے آدمی یہاں آکر رہنے لگے تھے اس کا بکھر نام سید محمد مکی کے آنے کی وجہ سے پڑا جو اس زمانے میں بکھر میں وارد ہوئے۔ جب

---

[1] سید محمد مکی پہلے رضوی سید تھے جو بکھر میں آئے۔ [2] تحفۃ الکرام ج ۳ ص ۱۲۴ [3] سید محمد مکی کے چچا تھے۔

[4] تحفۃ الکرام ج ۳ ص ۱۲۴۔

یہ جزیرہ الور کی ویرانی کے بعد بنا بنا بس رہا تھا۔ تحفۃ الکرام کی ایک روایت ہے کہ سید محمد مکی اس شہر میں صبح کو وارد ہوئے اور فرمایا۔ "جعل اللہ بکرتی فی البقعہ المبارکۃ" یعنی اللہ تعالے نے میری صبح برکت والی زمین پر کی۔ اس دن سے اس کا نام فرشتہ بدل کر بکھر ہو گیا۔ تحفۃ الکرام کی دوسری روایت ہے کہ ادھر آتے ہوئے دوران سفر میں سید محمد مکی سے آپ کے ملازموں نے پوچھا تھا کہ "منزل کہاں پر ہوگی؟" تو آپ نے فرمایا تھا کہ جہاں صبح کو بقر کی آواز سننے میں آئے" اس کے بعد جزیرہ کا نام ہی "بقر" ہو گیا، جو بدل کر بکھر ہوا۔

سید محمد مکی شیخ الشیوخ شیخ شہاب الدین عمر سہروردی کے نواسے تھے۔ تحفۃ الکرام میں آیا ہے کہ سید محمد مکی کے والد بزرگوار سلطان العارفین سید محمد شجاع مشہد مقدس میں رہتے تھے وہاں سے حرمین شریفین کی زیارت کو گئے سیر و سیاحت کرتے ہوئے شیخ شہاب الدین سہروردی کی خدمت میں آئے اور آپ کے مرید ہونے کے ساتھ فرزندی کا شرف بھی حاصل کیا۔ حضرت شیخ کی لڑکی کے بطن سے مکہ شریف میں سید محمد مکی تولد ہوئے۔ سید محمد شجاع نے مشہد مقدس واپس آنے کے بعد جلد ہی انتقال کیا اور امام موسیٰ رضا کے روضے میں مدفون ہوئے۔ آپ کے فرزند سید محمد مکی نے بکھر میں آکر سکونت اختیار کی۔ آپ کا شجرۂ نسب مزار کے کتبے پر اس طرح مرقوم ہے۔

"سید محمد مکی بن سید شجاع بن سید ابراہیم بن سید قاسم بن سید زید بن سید حمزہ بن سید ہارون بن سید عقیل بن سید اسمٰعیل بن سیدنا جعفر ثانی بن امام علی نقی بن امام محمد تقی بن امام موسیٰ رضا بن موسیٰ کاظم بن امام جعفر صادق بن امام محمد باقر بن امام علی زین العابدین بن حضرت امام حسین بن حضرت امیر المومنین امام المشارق والمغارب اسد اللہ الغالب علی بن ابی طالب رضہ۔"

۱؎ ج ۳ ص ۱۲۸۔

لیکن تحفۃ الکرام میں سید محمد مکی کے چچا سید قاسم کا شجرۂ نسب اس طرح دیا گیا ہے۔

سید قاسم بن سید ابوالمکارم زید بن سید حمزہ بن سید جعفر بن سید حمزہ بن سید ہارون بن سید عقیل بن ابی عقیل بن اسمعیل بن جعفر ثانی بن علی علی زکی بن محمد تقی۔

سید محمد مکی ہند اور سندھ کے رضوی سادات کے جدّ اعلیٰ ہیں۔ بکھر، ٹھٹے اور ہندوستان کے رضوی سادات آپ کی ہی نسل میں سے تھے۔

"عرب، عراق اور عجم سے جو صوفیائے کرام ہندوستان اور پاکستان کی طرف آئے ان میں سے زیادہ تر یہاں (سندھ) سے ہوتے ہوئے پھر دوسرے گوشوں کی طرف عازم ہوئے اور کتنے اہل اللہ تو ایسے بھی ہیں، جو یہاں آتے ہی یہاں کے ہو گئے۔ شیخ ترابی، شیخ نوح بھکری اور شیخ عثمان مرندی اسی خاک میں پیوست ہوئے..... حضرت جلال الدین سرخ بخاری جب اپنے وطن سے نکلے تو سب سے پہلے بھکر پہنچے۔ اور وہاں کے جید صوفی حضرت سید بدرالدین کی صاحبزادی سے عقد کیا۔ اسی بی بی کے بطن سے سید احمد کبیر تولد ہوئے جن کے صاحبزادے حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت ہیں۔ حضرت جہانیاں جہاں گشتؒ کا اس سرزمین (سندھ) سے بہت ہی گہرا تعلق رہا ہے۔ سلطان فیروز اور سلاطین سندھ کے درمیان آپ ہی کی کوششوں سے صلح ہوئی۔ اور آپ کے دو صاحبزادے سید صدرالدین اور سید ناصرالدین بھی بھکر میں مدفون ہوئے... شیخ بہاءالدین زکریا ملتانیؒ حضرت سہروردی کی فرمائش پر جب عراق سے نکلے تو سب سے پہلے حضرت شیخ نوح بھکری سے ملاقات کے لئے بھکر پہنچے، لیکن شیخ پہلے ہی وفات پا چکے تھے اس لئے ملتان گئے، لیکن سندھ میں آتے جاتے رہے۔...."

(سید حسام الدین راشدی از تذکرہ صوفیائے سندھ)

مسلم پرسنل لا

مستشرقین کی بین الاقوامی کانگریس میں ایک مباحثہ[1]

مستشرقین کی بین الاقوامی کانگریس میں اسلامی قانون کے ماہرین بھی دنیا کے مختلف حصوں سے بہت بڑی تعداد میں آئے تھے۔ اس لئے اس اہم موقع پر مسلم پرنسپل لا (مسلمانوں کے عائلی قوانین) میں تبدیلی کے مسئلے پر سمپوزیم کا انتظام ضرورت اور محل کے لحاظ سے عین مناسب تھا اس سمپوزیم کے صدر مرکزی وزیر تعلیم مسٹر چھاگلا تھے اور سیکرٹری پروفیسر محمد مجیب، اس کے خاص مقررین حسب ذیل تھے۔

۱۔ مولانا[2] سعید احمد اکبر آبادی (علی گڑھ)

۲۔ ہز ایکسلنسی مسٹر سیف اللہ اسین (سفیر ترکی)

۳۔ ہز ایکسلنسی مسٹر احمد احسن الفقیہہ (سفیر متحدہ عرب جمہوریہ)

---

[1] جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے ترجمان ماہنامہ "جامعہ" کا حال میں "مستشرقین کی بین الاقوامی کانگرس نمبر" نکلا ہے۔ یہ کانگرس اوائل جنوری ۱۹۶۷ء میں دہلی میں منعقد ہوئی۔ "جامعہ" کے اس نمبر میں کانگرس کی مختصر روئداد شائع ہوئی ہے۔ یہ اقتباسات اس نمبر سے ماخوذ ہیں۔ (مدیر)

[2] صدر شعبہ اسلامیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ و ایڈیٹر "برہان" دہلی

۴- مسٹر میر اقبال حسین (بنگلور)

۵- پروفیسر سید حسن نصر (ایران)

۶- پروفیسر اینڈرسن

صدر نے اپنی مختصر افتتاحی تقریر میں اس کی وضاحت کی کہ زیر بحث موضوع کی اہمیت اس لئے بہت زیادہ ہے کہ اس کا تعلق ہندوستان کے پانچ کروڑ مسلمانوں سے ہے لہذا یہ بات صاف ہو جانی چاہیئے کہ پرسنل لا کی کیا حدود ہیں۔ ان معاملات کے علاوہ جن کا تعلق خاص طور پر ذاتی عقیدہ اور اس کے متعلقہ اعمال سے ہے، فرد کی زندگی کے ہر مسئلے کا اثر سماج اور ریاست پر پڑتا ہے۔ ہندوستان سیکولر ریاست ہے اس لئے ان قوانین پر کسی کیمونٹی کو اعتراض نہیں ہونا چاہیئے جو فلاح عامہ کے پیش نظر وضع کئے جائیں۔ ایسے قوانین اور عدالتی فیصلے پہلے ہی سے موجود ہیں، جن کی بنا پر مسلم پرسنل لا میں بڑی تبدیلی ہو گئی ہے اور آج بھی ہو رہی ہے۔ اس لئے یہ نقطہ نظر کہ پرسنل لا مقدس ہے اور اس میں کوئی مداخلت نہیں کی جا سکتی، صحیح نہیں ہے۔ آخر میں انہوں نے کہا کہ جہاں تک پرسنل لا کا تعلق ذاتی عقیدے سے ہے، اس میں کوئی مداخلت نہیں ہونی چاہیئے۔ باقی اور معاملات میں پارلیمنٹ کو یہ طے کرنے کا حق ہے کہ مجموعی طور پر قوم کے حق میں کیا چیز مفید ہے۔

اس ضمن میں چھاگلا صاحب نے یہ خیال ظاہر کیا کہ سیکولر ریاست کی پارلیمنٹ انصاف اور عام مفاد کی خاطر ہر قسم کا قانون بنانے کی مجاز ہے۔ صرف عقائد کے معاملے میں اس کو دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اس رائے کو ثابت کرنے کے لئے چھاگلا صاحب نے یہ دلیل دی کہ حکومت معاشی اور سیاسی معاملات سے متعلق قوانین بنانے کی مجاز ہے اور اس سے بہر حال انفرادی حقوق پر اثر پڑتا ہے۔ اور جب کوئی ایسا معاملہ جس کا تعلق ان انفرادی حقوق سے ہو، جو شریعت کے مطابق دیئے گئے ہیں۔ عدالت میں پیش ہوتا ہے، تو جج کا فیصلہ لامحالہ شرعی قانون میں اضافہ یا ترمیم کرتا ہے۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے دین اور شریعت کے فرق کو واضح کیا اور بتایا کہ شریعتیں بدلتی رہتی ہیں۔ انہوں نے امام ابو یوسفؒ کی یہ رائے نقل کی کہ جو شخص اپنے زمانے سے واقف نہیں ہے وہ شریعت کے معاملات میں رائے دینے کا اہل نہیں ہے۔ انہوں نے منصوص اور غیر منصوص کے

فرق کو بھی واضح کیا اور اس کی تائید کی کہ غیر منصوص معاملات میں اجتہاد کا دروازہ کھلا ہوا ہے بشرطیکہ وہ اجتہاد قرآن اور سنت کے خلاف نہ ہو۔ مولانا کی یہ رائے تھی کہ مسلم پرسنل لا میں تبدیلی کے اہل صرف حضرات علماء ہیں۔ مولانا نے یہ رائے دی کہ علماء قانونی معاملات میں "اولوالامر" کی حیثیت رکھتے ہیں اور یہ ہو سکتا ہے کہ وہ وزارت قانون کے اشتراک عمل سے اس پر غور کریں کہ کن خاص معاملات میں شرعی قانون پر نظر ثانی کی ضرورت ہے[1]۔ مولانا اکبرآبادی نے فرمایا کہ دین میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی جا سکتی، مگر شریعت زمانے اور حالات کے مطابق برابر بدلتی رہتی ہے[2]۔

---

[1] مولانا اکبرآبادی کے نزدیک اسلامی معاشرہ کے لئے قانون بنانے کے مجاز "اولوالامر" ہیں اور اولوالامر کی وضاحت موصوف نے اس طرح کی ہے "اولوالامر سے مراد حکومت اور علماء دونوں ہیں ایک کے پاس نفاذ کی قوت ہے اور دوسرے کے پاس وضع قانون کی، اور اصلاح دونوں کے ملنے سے ہی ہو سکتی ہے۔ تنہا کوئی ایک گروہ اس کو انجام نہیں دے سکتا" برہان بابت ماہ اگست ۱۹۶۳ء

[2] کن احکام میں تبدیلی ہو سکتی ہے اور کن میں نہیں۔ اس مسئلے پر مولانا اکبرآبادی نے "برھان" بابت ماہ اگست ۱۹۶۳ء کے "نظرات" میں ذرا تفصیل سے بحث کی ہے لکھتے ہیں:۔ "یہ احکام دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جن کی نسبت نصوص شرعیہ موجود ہیں اور اس بنا پر ان کو فرض، واجب یا حرام و ناجائز کہا جاتا ہے، مثلاً محرمات نکاح و طعام، تقسیم میراث کے قوانین انعقاد و فسخ نکاح کے شرائط و لوازم، یہ تمام احکام قطعی ہیں، اور ان پر ہرگز نظر ثانی نہیں کی جا سکتی۔ ان کے مقابلے میں دوسری قسم کے احکام وہ ہیں جن کی نسبت سرے سے کوئی نص شرعی موجود نہیں ہے۔ یا نص موجود ہے مگر اس میں اس بات کی صراحت ہے کہ وہ حکم فرض، واجب یا حرام نہیں ہے۔ یا نص ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حکم کسی خاص علت یا سبب یا حکمت و مصلحت پر مبنی ہے اس صورت میں اگر کبھی علت سبب یا حکمت و مصلحت باقی نہ رہے تو حکم خود بخود بدل جائے گا۔ خواہ وہ حکم وقتی و ہنگامی طور پر کیسا ہی لازمی و ضروری ہو۔"

ترکی اور متحدہ عرب جمہوریہ کے سفیروں نے اپنے اپنے ملک میں پرسنل لا میں تبدیلیوں کا ذکر کیا۔ سفیر ترکی نے کہا کہ حالات کے ساتھ یہ تبدیلیاں آئیں۔ ترکی کی نیشنل اسمبلی کی رائے کی وہی حیثیت قرار پائی، جو اجماع کی ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ جو تبدیلیاں ہوئی ہیں، وہ قرآنی تعلیمات اور انصاف ومساوات کے اصولوں کے مطابق ہوئی ہیں۔ سفیر متحدہ عرب جمہوریہ نے بتایا کہ مصر میں پرسنل لا سے متعلق جو قوانین بنائے گئے ہیں، وہ قرآن وسنت کے مطابق ہیں۔ ہم لوگوں نے یہ طریقہ کار اختیار کیا کہ چاروں مذاہب (حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی) اور شیعہ امامیہ فقہ کے اصولوں کو پیش نظر رکھا اور فلاح عامہ کے اصول کے تحت جہاں جو بات معقول ملی، اسے لے لیا۔ انہوں نے اس کی کئی مثالیں دیں اور ثابت کیا کہ جو تبدیلیاں ہوئی ہیں، وہ شریعت کے حدود میں ہیں۔

سفیر ترکی اور سفیر متحدہ عرب جمہوریہ کے بیانات سے معلوم ہوا کہ اگر کسی ایک فقہی مذہب کی پابندی کرنے کے بجائے چاروں مذاہب کے اصولوں کو سامنے رکھا جائے تو بہت سی ضروری اصلاحیں کی جاسکتی ہیں۔ مصر میں چاروں مذاہب کے علاوہ شیعی مذہب کے اصول بھی سامنے رکھے گئے۔ اور اسی طرح یہ معلوم ہوا ہے کہ مختلف مذاہب کے دائرے سے نکلے بغیر ایسے اصولوں کو قانون کی شکل دی جاسکتی ہے، جو انفرادی حقوق کے دائرے کو اتنا ہی وسیع کردیں جتنا کہ وہ دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں میں ہے۔

احمد حسن الفقیہ سفیر متحدہ عرب جمہوریہ نے بتایا کہ مصر میں اگر کسی عورت کا شوہر مفقود الخبر ہو جاتا تو بیوی عمر بھر انتظار میں بیٹھی رہتی۔ شوہر کے لئے طلاق دینا اتنا آسان تھا اور خاص حالات کی وجہ سے جو شوہر اس قانونی رعایت سے فائدہ اٹھارہے تھے، ان کی تعداد اتنی بڑھ گئی تھی کہ بیوی کے حق کا تحفظ نہیں ہوسکتا تھا۔ عورتوں میں تعلیم پھیلی تو یہ لازمی بات تھی کہ رائج قانون کے خلاف احتجاج کریں۔ اس کے علاوہ مسلمانوں اور ان کے طریق زندگی پر اعتراض کرنے والے بہت تھے اور اعتراض کا کوئی معقول جواب نہیں دیا جاسکتا تھا۔ اسی طرح ترکی میں ۱۹۱۱ء سے جو لڑائیاں شروع ہوئیں تو انہوں نے مردوں کی آبادی اتنی کم کردی کہ اگر عورتیں پردے میں بیٹھی رہیں یا

انہیں وراثت کا اور اپنی جائداد کا خود انتظام کرنے کا حق نہ ملتا تو ترک بالکل تباہ ہو جاتے۔

میر اقبال حسین نے پورے طور پر انصاف و استحسان کے اصول پر تبدیلی کی حمایت کی آپ نے محجوب الارث کے مروجہ قانون کا حوالہ دے کر فرمایا کہ یہ بات کسی طرح قرین انصاف نہیں کہی جاسکتی کہ ایک شخص کے کچھ پوتے مخصوص حالت میں وراثت سے محروم کردیئے جائیں اور کچھ پورے ترکہ کے مالک قرار پائیں۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی اور میر اقبال حسین دونوں نے سوسائٹی کے مفاد میں ایک سے زیادہ شادی پر پابندی لگانے کو حق بجانب اور جائز قرار دیا۔

اسی سیمنار میں سید حسین نصر ایک ایرانی فاضل نے بہت اصرار سے کہا کہ شریعت کو دین اور معاملات دو حصوں میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا جیسے انسان کو جسم اور روح دو حصوں میں الگ نہیں کیا جاسکتا۔ اسلامی شریعت جسم اور روح کے اتحاد و اتصال کا نمونہ اور احکام الٰہی کا مجسمہ ہے۔ ہم جن مادی حقائق کو سامنے رکھ کر شریعت کو جانچتے ہیں وہ حقیقت کا صرف ایک رخ ہے۔ ایسا رخ جو بدلتا رہتا ہے اور قابل اعتبار نہیں ہے۔ یہ کہنا بھی مہمل ہے کہ قانون کو وقت کے ساتھ قدم بہ قدم چلنا چاہیئے کیونکہ اس کے بعد پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ وقت کس کے ساتھ چلتا ہے اور اس کو چلانے والا کون ہے۔ دراصل شریعت کو عقائد اور معاملات دو حصوں میں تقسیم کرنا عیسائیوں کی تقلید میں شروع کیا گیا۔ عیسائی مذہب میں کوئی شریعت نہیں ہے یہ پوری کی پوری رومی قانون سے ماخوذ ہے اس لئے عیسائیوں میں قانون کی حیثیت ضمنی اور اتفاقی ہے اور دراصل اس کا دین سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ اب اس بات کو سامنے رکھ کر مسلمانوں سے کہا جاتا ہے کہ جیسے عیسائی ملکوں نے اپنا قانون بدلا ہے، ویسے ہی وہ بھی اپنی شریعت کو بدلیں۔ یہ مطالبہ یورپ اور امریکہ کی نقل کی خاطر کیا جاتا ہے۔ ہم سے کہا جاتا ہے کہ ہم تعدد ازدواج کو برا سمجھیں اس لئے کہ یورپ اور امریکہ میں اس کو برا سمجھا جاتا ہے۔ اور ہم میں احساس کمتری اس درجہ پہنچ گیا ہے کہ ہم اسے بلا تامل مان لیتے ہیں۔ عیسائی مذہب کے طریقہ کار اور یورپ و امریکہ کے رواج کی نقل کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ریاست اخلاقی حاکم بھی بن جائے گی اور

اس کے مقابلے میں شریعت کیا قرآن کی بھی کوئی حیثیت نہیں رہ جائے گی لیکن یہ سب کہنے کے بعد سید حسین نصر نے یہ بھی کہا کہ ایران میں علماء کے مشورے سے اور نپولین کے مجموعہ قانون کو سامنے رکھ کر احکام مدنیہ مرتب کئے گئے ہیں۔ یعنی ایران میں اسی طرح انفرادی حقوق میں تبدیلیاں کی گئی ہیں، جیسے کہ ترکی اور مصر میں، اور طریق کار بھی وہی اختیار کیا گیا ہے جو ان ملکوں میں۔

پروفیسر اینڈرسن نے پروفیسر نصر کے نقطۂ نظر سے اختلاف کیا اور اسلامی ملکوں کے قوانین میں جو تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں، ان پر بڑی تصریح کے ساتھ روشنی ڈالی اور اس کی حمایت کی کہ فلاح عامہ کے اصول کے تحت اسلامی ملکوں میں تبدیلیاں ہوئی ہیں اور ہونی چاہئیں۔

"جس کسی منظم ریاست میں قانون بنتے ہیں، تو یہ واضح اور مسلّم ہوتا ہے کہ قانون بنانے یا بنے ہوئے قانون میں تبدیلی کرنے کا اختیار کس کو ہے شرعی قوانین میں تبدیلی کرنے کا کوئی ایسا طریقہ نہیں ہے جس کے مستند ہونے کے بارے میں مسلمان متفق ہوں۔ اجتہاد اور اجماع بحث کی خاطر تو تبدیلی کرنے کے ذریعہ مانے جاسکتے ہیں، لیکن نہ تو اجتہاد کرنے کا حق کسی کو واضح طور پر دیا گیا ہے اور نہ اس کی حدود مقرر کی گئی ہیں۔ اجماع کی صورت کیا ہو سکتی ہے، اس کا طے کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ علماء کو تمام مسلمانوں کا نمائندہ رسماً یا احتراماً مان لیا جائے، تب بھی یہ معاملہ رسم اور احترام کا ہوگا۔ واضح قانون کا نہ ہوگا۔ ویسے اعتراض کرنے والا کہہ سکتا ہے کہ آج کل صحیح معنی میں عالم اسی کو مانا جا سکتا ہے، جو صرف دینی علوم میں ہی نہیں بلکہ دنیاوی علوم اور خاص طور پر اجتماعیات اور علم قانون میں ملکہ رکھتا ہو۔ یہ شرط ان لوگوں کو جمع کر کے پوری نہیں کی جا سکتی، جن میں سے کچھ دینی علوم سے اور کچھ دنیاوی علوم سے پوری واقفیت رکھتے ہوں۔"

شاہ ولی اللہ کی اِصطلاحات

عبدالوحید صدیقی

دنیا کے ہر صاحبِ نظام تخلیقی مفکر کے نتائجِ ذہنی اپنے پیش رو اہل علم و فکر سے عموماً کچھ مختلف بھی ہوتے ہیں اور ان سے زیادہ ہمہ گیر ابھی۔ ایک تخلیقی مفکر ہونے کی حیثیت سے اسے چونکہ کچھ نئی باتیں کہنی ہوتی ہیں، جو پہلوں نے ان معنوں میں نہیں، کہی ہوتیں، اس لئے قدرتاً اصطلاحاتِ علمی کا وہ ذخیرہ جو اس کے پیش رووں کے نتائج فکر کے اظہار کے لئے کافی ہوتا ہے، اس کے بعد میں آنے والے صاحب نظام تخلیقی مفکر کے لئے ناکافی ثابت ہوتا ہے اور وہ مجبور ہوتا ہے کہ اپنے افکارِ تازہ کے لئے نئی اصطلاحیں وضع کرے اور انہیں اپنے نتائج فکر کے اظہار کا ذریعہ بنائے۔

بات دراصل یہ ہے جیسا کہ ایک شاعر نے کہا ہے۔ ؎

افکار کا عالم اکبر ہے   الفاظ کی دنیا چھوٹی ہے

لغت اور اس کی اصطلاحیں ذہنِ خلاق کے اظہار کی راہ میں کس طرح رکاوٹ بنتی ہیں علامہ اقبال نے شاعرانہ انداز میں اسے یوں بیان فرمایا ہے۔

حقیقت پہ ہے جامۂ حرف تنگ   حقیقت ہے آئینہ، گفتار زنگ

فروزاں ہے سینے میں شمع نفس   مگر تاب گفتار کہتی ہے بس

اگر یک سرِ موئے برتر پرم   فروغِ تجلی بسوزد پرم

لیکن لغت کی اس "محدودیت" کے باوجود ہر صاحبِ فکر کو اپنے مافی الضمیر کے اظہار اور اپنے افکارِ تازہ کو پیش کرنے کے سلسلے میں اسی لغت سے کام لینے کے سوا اور کوئی چارہ ہی نہیں ہوتا۔ چنانچہ اس کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنے جدید نتائج فکر کو اس لغت کے، جس سے کہ وہ کام لینے پر مجبور ہوتا ہے، ایسے الفاظ میں پیش کرے، جو اس کے مافی الضمیر کو زیادہ سے زیادہ ادا کر سکیں اور ان الفاظ کے ذریعہ جو وہ نیا فکر دینا چاہتا ہے، قارئین اس کا ادراک کر لیں گو یہ الفاظ نئے نہیں ہوتے، لیکن ایک صاحبِ فکر مصنف انہیں نئے معنی پہنا دیتا ہے اور اس طرح یہ الفاظ نئے ہو جاتے ہیں ہم اسی کو ایک صاحبِ نظام تخلیقی مفکر کا نئی اصطلاحات وضع کرنا کہیں گے۔ یہ اصطلاحات اس کے افکارِ تازہ کی کلید ہوتی ہیں، اور جب تک آپ انہیں حل نہ کریں اور ان کے مطالب و معانی کا تعین نہ ہو، اس مفکر کو کماحقہ سمجھنا مشکل ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر شاہ ولی اللہ صاحب کی "ارتفاق" کی اصطلاح کو لیجئے۔ یہ "رفق" سے ہے، جس کے معنی نرمی، سہولت، اعانت اور نفع رسانی کے ہیں۔ اور جب یہ باب "ارتفق" میں آتا ہے جس کا مصدر "ارتفاق" ہے، تو اس کے معنی باہم معاونت کے ہوتے ہیں۔ اب شاہ صاحب لفظ "ارتفاق" ایک خاص اصطلاح کے طور پر استعمال کرتے ہیں، جس سے وہ انسان کی مادی ضرورتوں کی تکمیل کے وہ وسائل مراد لیتے ہیں، جنہیں اس نے اپنی ارتقا کے مختلف مدارج طے کرتے ہوئے تخلیق کیا۔ اور ان کی وجہ سے وہ بتدریج اپنی ضرورتوں کو زیادہ سے زیادہ سہل طریقوں سے پورا کرنے کے قابل ہوتا گیا۔

مشہور اربابِ علم و فکر اپنے جدید وارداتِ ذہنی کو بیان کرنے کے لئے یا تو خود اپنی اصطلاحیں وضع کرتے ہیں، جیسا کہ شاہ ولی اللہ صاحب نے مثال کے طور پر "ارتفاق" کی اصطلاح وضع فرمائی ہے یا ان سے پہلے جو اصطلاحات مروج ہوتی ہیں، ان کو نئے معانی پہنا کر انہیں اپنے کام میں لاتے ہیں اور اس طرح یہ اصطلاحیں خاص ان کی ہو جاتی ہیں مثال کے طور پر "خودی" اور "عشق" کے الفاظ بحیثیت مخصوص اصطلاحات کے پہلے سے رائج تھے، لیکن علامہ اقبال نے انہیں اپنے خاص

معنی پہنائے، چنانچہ ان کے ہاں یہ الفاظ جن معنوں میں استعمال ہوئے ہیں، ان سے پہلے ان معنوں میں وہ شاذونادر ہی استعمال ہوتے تھے۔ اب علامہ اقبال کے مجموعی فکر کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ آپ کے ذہن میں "خودی" اور "عشق" کے وہ مخصوص معانی ہوں، جنہیں مرحوم اپنی ان دو اصطلاحات میں پیش فرماتے ہیں۔

اب آپ اس دور کی مشہور معاشی تحریک مارکسیت کے بانی کارل مارکس کو لیجئے وہ فرانسیسی زبان کے دو الفاظ "بورژوا" اور "پرولتاری" استعمال کرتا ہے اور ان سے وہ اپنے مخصوص اصطلاحی معنی لیتا ہے چنانچہ اس کے نزدیک "بورژوا" سے ہر وہ شخص مراد نہیں جو زندگی گزارنے کا اعلےٰ معیار رکھتا ہے اور نہ ہر وہ شخص پرولتاری ہے، جو ادنیٰ معاشی ضروریات سے محروم ہو۔ وہ ان الفاظ کو لغوی معنی کے بجائے ان کے اصطلاحی معنوں میں استعمال کرتا ہے اور ان الفاظ کو یہ اصطلاحی معنی اس نے خود دیئے ہیں۔ اب ان اصطلاحوں کو سمجھے بغیر کارل مارکس کا سمجھنا بڑا مشکل ہے اسی طرح اس کی اصطلاح "قدرِ زائد" ہے، جو اس کے پورے معاشی نظام کے لئے اساس کی حیثیت رکھتی ہے۔

مسلمان مفکرین و صوفیاء میں شیخ محی الدین ابن عربی، امام ربانی مجدد الف ثانی، اور شاہ ولی اللہ نے اپنے اپنے فکر کو جو جامع ہے الٰہیات، مابعد الطبیعیات اور علوم طبیعیات وغیرہ پر بیان کرنے میں کثرت سے اصطلاحات سے کام لیا ہے، اور چونکہ شاہ ولی اللہ صاحب نے اپنے دور کے مروج تمام علوم میں تصنیفات کی ہیں اور مابعد الطبیعیات، طبیعیات اور الٰہیات پر لکھا ہے، اس لئے ان کے ہاں یہ اصطلاحات بہت زیادہ ہیں۔ اب کبھی تو وہ خود جدید اصطلاحات وضع کرتے ہیں اور کبھی پہلے کی رائج اصطلاحات کو اپنے مخصوص معنی پہناتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ شاہ صاحب نے نظام کائنات اور خالق و مخلوق اور علت و معلول کے باہمی تعلقات کو اپنے پیش رو اہل علم و قلم سے قدرے مختلف انداز سے دیکھا ہے۔ نیز معاشرتی نظام میں علت و معلول کا سلسلہ جس طرح کارفرما ہے، آپ سے پہلے کے مسلمان مفکرین نے اس کا اس طرح احاطہ نہیں کیا

چنانچہ اپنے ان جدید نتائجِ ذہنی کو پیش کرنے کے لئے قدرتاً شاہ صاحب کو کثرت سے اصطلاحات استعمال کرنی پڑیں۔

اس سلسلے میں شاہ صاحب نے بہت سی اصطلاحات تو خود وضع کیں۔ اور بہت سی پرانی اصطلاحات کو نئے معانی پہنائے نیز آپ نے اپنی کتابوں میں جگہ بہ جگہ ان اصطلاحات کی تشریح بھی کی ہے اب ضرورت اس کی ہے کہ شاہ صاحب کی مخصوص اصطلاحات کی ان تشریحات کو جو ان کی مختلف کتابوں میں پھیلی ہوئی ہیں، یکجا کیا جائے تاکہ وہ مرجع بن سکیں فکرِ ولی اللہی کے طالب علموں کے لئے، دوسرے شاہ صاحب اکثر مختلف مقامات پر اپنی مختلف اصطلاحات کو ایک ہی معنی میں استعمال کرتے ہیں ان کا تعین بھی بہت ضروری ہے۔ شاہ صاحب کے افکار و آراء کے پورے احاطے کے لئے ان کی اصطلاحات کے مقصود و معانی کا اس طرح تعین ازبس لازمی ہے۔

شاہ ولی اللہ صاحب کی اصطلاحات کا زیادہ تر ذخیرہ آپ کی ان بنیادی کتب تصوف و حقائق میں ہے جن کے متعلق مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کا ارشاد تھا کہ انہیں سبقاً سبقاً پڑھایا جائے، ان میں سے سطعات، ہمعات، اور لمحات خصوصی اہمیت رکھتی ہیں۔ ان کتابوں میں مندرج مباحث اور اصطلاحات کی شاہ ولی اللہ صاحب کے پوتے شاہ اسمٰعیل شہید نے "العبقات" کے نام سے شرح لکھی ہے۔ "العبقات" کے مقدمے میں شاہ اسمٰعیل شہید فرماتے ہیں۔

"میں اس کا مدعی نہیں ہوں کہ ان موتیوں (سطعات و لمحات) کے سلسلے میں اس کتاب کو بھی شامل کرنا چاہیئے۔ اور جس چیز کا مجھے حق نہیں ہے، اس کا دعویٰ کیسے کر سکتا ہوں بلکہ سمجھنا چاہیئے کہ علوم نقل سے عربی ادب کے فنون کا جو تعلق ہے، یا عقلی فنون سے منطق کے قوانین کی جو نسبت ہے، یہی تعلق اور یہی نسبت ان کتابوں سے میرے اس رسالے کو ہے"

بہر حال شاہ اسمٰعیل شہید کی کتاب "العبقات" شاہ ولی اللہ صاحب کی اصطلاحات کی ایک اچھی خاصی تشریح ہے، اور اس میں شاہ شہید نے ان اصطلاحات کے معانی و مطالب کو متعین کرنے کی بڑی کامیاب کوشش کی ہے، لیکن اس کتاب کی تصنیف کو بھی ایک سو سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا ہے

اور اس دوران میں نہ صرف علوم و فنون میں بڑی ترقی ہوئی ہے، بلکہ اظہار بیان کے اسالیب بھی کافی بدل گئے ہیں، اس لئے ضرورت ہے کہ شاہ ولی اللہ کی اصطلاحات کی تشریح آج کی زبان اور آج کل کے اسالیب بیان میں ہو تاکہ وہ فکر ولی اللّٰہی کے مطالعہ کے لئے تمہید اور کلید کا کام دے سکے۔

راقم الحروف کو مولانا غلام مصطفےٰ قاسمی صاحب نے اس ضرورت کی طرف متوجہ فرمایا اور انہی کی زیر ہدایت میں نے اس کام کو شروع کیا ہے۔ ذیل میں شاہ ولی اللہ صاحب کی کچھ اصطلاحات دی جا رہی ہیں۔ انشاءاللہ آیندہ بتوفیق ایزدی ہر ہر اصطلاح کی تشریح کی کوشش ہوگی۔

الٰہیات اور مابعد الطبیعیات

الوجود۔ الوجود الاقصیٰ۔ الحقیقۃ۔ الحق۔ الحقیقۃ القصویٰ۔ الحقیقۃ الواحدۃ۔ اول الاوائل۔ العین الثابت۔ الحقیقۃ الامکانیۃ۔ الثبوت الماھیۃ۔ الاسماء الکونیۃ۔ الشخص الاکبر۔ الانسان الکبیر۔ عالم الجبروت۔ عالم الارواح عالم المثال۔ عالم الشھادۃ۔ عالم الغیب۔ عالم الاجسام۔ تجلی۔ تدلّی۔ الابداع۔ الخلق۔ التدبیر۔ الاقتراب۔ الصفات الذاتیۃ۔ الصفات الفعلیۃ۔ الذات۔ عین ذاتہ۔ غیر ذاتہ۔ الروح۔ النفس الناطقۃ۔ الروح الانسانی۔ الملأ الاعلیٰ۔ حظیرۃ القدس۔ جعل المرکب۔ الفعل البسیط۔ قیومیت۔ لاھوت۔ وحدۃ الوجود۔ وحدۃ الشھود۔ احدیت۔ التقدیر۔ اصحاب الیمین اصحاب الشمال۔ واجب الوجود۔ ممکن الوجود۔ محال الوجود۔ وجود منبسط الشھودیۃ الظلیۃ۔ العینیہ۔ الجوھر۔ العرض۔

نفسیات

الحواس۔ العلم۔ الخیال۔ العقل۔ الوھم۔ النظر۔ الحدس۔ الغیب۔ الوحی الفھم۔ الذوق۔ الالھام۔ الکشف۔ المعرفۃ۔ المشاھدۃ۔ الوجدان العلم اللدنی۔ الحس الظاھر۔ الحس الباطن۔ الطبیعۃ۔ الفطرۃ۔ النسمیۃ۔

الرای الکلی۔ الرای الجزی۔ ظرافۃ۔ تکمیل العلوم التسمیۃ الحیوانیۃ۔ الملکیۃ۔
الملکۃ۔ حجاب الطبع۔ حجاب الرسم۔ حجاب سوء المعرفۃ۔

عمرانیات

ابناء الجنس۔ الارتفاق۔ الحکمۃ المعاشیۃ۔ حکمۃ تدبیر المنزل۔
الحکمۃ الاکسابیۃ۔ الحکمۃ التعاونیۃ۔ الحکمۃ التعاملیۃ۔ المدینۃ۔ المدینۃ التامۃ
الامامۃ۔ النقابۃ۔ الخلافۃ الکبریٰ۔ الرسم۔ الرسوم السائرۃ۔ الرسم الباطل۔

اخلاقیات۔

السعادۃ۔ السعادۃ الحقیقۃ۔ الاخلاق الفاضلۃ۔ الحکمۃ۔ الشجاعۃ۔
السماحۃ۔ العفۃ۔ الدیانۃ۔ الفصاحۃ۔ السمت الصالح۔ الطھارۃ۔ الاخبات۔

"اگرچہ دودمانِ ولی اللہی کے حقیقی چشم و چراغ حضرت سیدنا شاہ محمد اسحاق اور ان کے برادر صغیر شاہ محمد یعقوب یہ دونوں حضرات جو اپنے نانا شاہ عبدالعزیز بن شاہ ولی اللہ کے دلی میں جانشین تھے ... ۱۲۵۸ھ ہی میں ... حجاز تشریف لے جا چکے تھے .... تاہم حضرت مجدد سرہندی کے خانوادے کے بعض اکابر مثلاً شاہ احمد سعید اور شاہ عبدالغنی ... دلی کی بچی کچھی روشنی کی عمر میں جان ڈالے ہوئے تھے ان کے سوا بھی مفتی صدر الدین صاحب بذاتِ خود صدر الصدوری کے سرکاری فرائض کے ساتھ ساتھ درس و تدریس کا شغلہ بھی جاری کئے ہوئے تھے۔ دلی کی جامع مسجد کے ساتھ دار البقا کے نام سے عہد شاہ جہانی میں جو شاہی مدرسہ قائم کیا گیا تھا۔ مفتی صاحب مرحوم نے ... از سر نو اس مدرسہ کو مرتب کیا۔ اس مدرسہ میں ... حاجی محمد جونپوری جو شاہ اسحاق کے شاگردوں میں تھے اور ملا سرفراز ماہر ریاضیات وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں .... مولانا فضل حق خیرآبادی جن کی عمر اس وقت غالباً پچاس سال کی ہوئی ... فرصت کے اوقات میں جیسا کہ اس زمانے میں دستور تھا فلسفہ اور منطق کا درس دیا کرتے تھے، بہرحال دلی کے علمی آسمان کا آفتاب (شاہ اسحاق) تو غروب ہو چکا تھا، لیکن ان تاریک گھڑیوں میں بھی ادھر ادھر بحالت انتشار کچھ چھوٹے بڑے تارے پھر بھی چمک رہے تھے۔" (سوانح قاسمی)

تنقید و تبصرہ

محمد سرور

مدرسۂ دیوبند اور مطالبۂ پاکستان

(The Deoband School And the Demand for Pakistan)

یہ کتاب ضیاء الحسن فاروقی صاحب کا تحقیقی مقالہ (تھیسس) ہے جو موصوف نے کینیڈا کی میکگل یونیورسٹی میں ایم اے کے لئے پیش کیا، اور میکگل کے ڈائرکٹر مشہور عالم مشرقیات ڈاکٹر سمتھ کی رائے میں چونکہ اس مقالے میں ہندوستان کی تاریخ کے اس دور کا بڑے عالمانہ طور پر احصا کیا گیا ہے، اس لئے اس کی اشاعت عمل میں آئی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اسلامی ہندو پاک کی تاریخ کے اس دور کو جس میں مدرسہ دیوبند اور علی گڑھ کا قیام عمل میں آیا۔ اور جس کے آخر میں مطالبہ پاکستان کی ہندوستان گیر تحریک چلی، مصنف نے واقعی عالمانہ طور سے پیش کیا ہے، اور باوجود اس کے کہ وہ کچھ عرصہ مدرسہ دیوبند کے ہم خیال علماء کی "جمعیت العلمائے ہند" کے انگریزی آرگن سے متعلق رہے اور اب وہ ہندوستان کے ایک مشہور مسلم نیشنلسٹ تعلیمی ادارے میں کام کرتے ہیں، انہوں نے مدرسہ دیوبند اور مطالبۂ پاکستان کے حامیوں ہر دو کے نقطہ ہائے نظر بڑی تحقیق اور ساتھ ہی غیر معمولی علمی دیانت داری کے ساتھ پیش کئے ہیں، اور تبصرہ نگار کے نزدیک ہر فریق جو اس بحث میں اپنے حق میں اور فریق مخالف کے خلاف دلیل دے سکتا تھا۔ اور وہ دلیلیں دیتا رہا ہے، مصنف نے اس مختصر سی کتاب میں بڑی غیر جانبداری سے اجمالاً ان کو پیش کر دیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ کتاب اس قابل ہے کہ دونوں فریق اسے پڑھیں۔ اور اس آئینے میں اپنی اور دوسرے فریق کی صحیح تصویر دیکھیں۔

کتاب کی تمہید میں مصنف نے بجا طور سے اس پر تعجب کا اظہار کیا ہے کہ مدرسۂ دیوبند جو شروع سے مسلمانوں کی ایک راسخ العقیدہ مذہبی تحریک تھی، اور جو شریعت کے بقاو استحکام اور دینی روایات کو زندہ رکھنے پر زیادہ زور دیتی ہے - مطالبۂ پاکستان، جس کے پیش نظر برصغیر کے ایک حصے میں مذہب اسلام اور اسلامی روایات کے مطابق خود مسلمانوں کی ایک آزاد حکومت کا قیام تھا۔ مخالفت کرتا ہے۔ مصنف کے نزدیک ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ حصولِ پاکستان کی جدوجہد میں مدرسہ دیوبند پیش پیش ہوتا لیکن یہ کتنا بڑا معما ہے کہ دیوبندی نے بحیثیت مجموعی اس مطالبے کی شروع سے لے آخر تک مخالفت کی، مصنف نے اس کتاب میں اس معما کو حتی الوسع حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس ضمن میں ایک اچھی بات یہ ہے کہ فاروقی صاحب نے دونوں فریقوں کو اپنے اپنے مطالبے اور جدوجہد میں مخلص اور دیانت دار مان کر اپنی بحث کا آغاز کیا ہے چنانچہ کتاب کے دوران مطالعہ سے کہیں یہ تاثر نہیں ہوتا کہ وہ کسی فریق کی طرف ضرورت سے زیادہ جھکے ہوئے ہیں۔ مصنف کا یہ ذہنی موقف شروع سے آخر تک قائم رہتا ہے اور اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے۔

اورنگ زیب عالمگیر کی وفات (۱۷۰۷ء) کے بعد مغل سلطنت میں جو ابتری پھیلی، اس سے انگریزوں نے فائدہ اٹھایا، چنانچہ ۱۸۰۳ء میں وہ دہلی پر قابض ہو گئے۔ اور مغل بادشاہ ان کا وظیفہ خوار بن گیا۔ ۱۸۰۳ء ہی میں شاہ عبدالعزیز یہ فتویٰ دیتے ہیں کہ ہندوستان "دارالحرب" ہے جس کے شرعاً یہ معنی ہوئے کہ اب عام مسلمانوں پر کفار کے خلاف جہاد فرض ہو گیا ہے۔ بقول مصنف، شاہ عبدالعزیزؒ نے اس وقت صرف اس فتوے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان کی رہنمائی میں وہ جدوجہد شروع ہوئی جس کے اوّلین قائد سیّد احمد شہید اور خود شاہ صاحب کے بھتیجے شاہ اسمٰعیل شہید تھے۔ بالاکوٹ (۱۸۳۱ء) اور محاربۂ دہلی (۱۸۵۷ء) کی ناکامی کے بعد اسی تحریک کے حامیوں نے ۱۸۶۷ میں مدرسہ دیوبند کی بنیاد رکھی۔ اور اس کے کچھ عرصہ بعد ہی علی گڑھ میں سرسید نے کالج کی طرح ڈالی۔

یوں تو مدرسہ دیوبند کے بانی اور مفکر مولانا محمد قاسم اور علی گڑھ کالج کے بانی و مفکر سرسید

دونوں کے دونوں ولی اللہی تحریک سے متاثر تھے، اور دونوں ایک ایسے استاد کے شاگرد تھے جو سلسلۂ ولی اللہی کی ایک ممتاز شخصیت تھی، لیکن جس طرح ان دونوں بزرگوں کے نقطۂ نظر میں شروع ہی سے ایک بنیادی اختلاف تھا۔ اسی طرح ان کی قائم کردہ یہ درس گاہیں ایک دوسرے سے مختلف راہوں پر چلیں۔ چنانچہ آخر میں ۱۹۳۷ء کے بعد جہاں مدرسۂ دیوبند مطالبہ پاکستان کے مخالفوں کا مرکز بنا، وہاں علی گڑھ نے اس تحریک میں پورے جوش و خروش سے حصہ لیا۔ مصنف کے خیال میں مطالبۂ پاکستان کی حمایت اور اس کی مخالفت دراصل مسلمانان ہند و پاک کے ان دو مختلف نقطہ ہائے کا عملی نتیجہ تھا، اور یہ شاید ایک حد تک ناگزیر تھا۔ بات یہ ہوئی کہ مدرسہ دیوبند کے اہل رائے و اختیار کا تمام تر فکری پس منظر انگریز دشمنی پر مرکوز تھا۔ اور وہ ہر اس چیز سے جس سے انگریز اور انگریزیت کی بُو آتی، متنفر تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ شریعت یعنی پرانے فقہی نظام کو برقرار رکھنے اور اسلاف کی روایات کے تتبع پر بہت زور دیتے تھے۔ اس کے برعکس سرسید نے انگریزوں کے آنے کی وجہ سے برصغیر میں جو نئے سیاسی و معاشرتی حالات رونما ہو رہے تھے، ان کی حقیقت اور ان سے آگے چل کر پیدا ہونے والے نتائج کو سمجھا، اور ان سے عہدہ برآ ہونے کی راہ سجھائی۔ غرض عام الفاظ میں دیوبند کی تمام تر توجہ ماضی کے اسلامی فکر و نظام کو بحال رکھنے کی طرف رہی اور علی گڑھ کا سارا زور حال و مستقبل کی ضرورتوں اور تقاضوں پر صرف ہوتا رہا۔ اس لئے دیوبند تو انگریز دشمنی پہ اڑا رہا، اور علی گڑھ نے نئے حالات کے ساتھ مفاہمت کرنا ضروری سمجھا۔ مصنف نے اس ضمن میں بڑے افسوس کا اظہار کیا ہے کہ اس دوران میں ایک طرف قدامت پسندی و روایت پرستی اور دوسری طرف تجدید پسندی کے درمیان کوئی بیچ کی راہ نہ نکلی، اور دیوبند اور علی گڑھ فکری و سیاسی و اجتماعی دونوں لحاظ سے دو متحارب گروہوں میں بٹے رہے۔ اور مزید بدقسمتی یہ ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے آزاد ہونے کے بعد بھی دونوں ملکوں کے مسلمانوں میں کم سے کم فکر و نظر کی یہ باہمی مخاصمت اب بھی موجود ہے۔ اور فی الحال فکری و عملی مصالحت کی کوئی راہ نہیں نکل رہی ہے۔

مطالبۂ پاکستان کی حمایت اور اس کی مخالفت میں "علی گڑھ" اور "دیوبند" کی طرف سے جو دلیلیں

پیش کی جاتی تھیں، مصنف نے مختصراً ان سب کو بیان کردیا ہے۔ کتاب کے آخری باب کا عنوان "نتائج" ہے، جس کا آغاز فاروقی صاحب یوں کرتے ہیں "ہم نے سابقہ ابواب میں دیکھا کہ روایاتِ اسلاف کے متبع علماء کا ردعمل ہندوستان میں انگریزی نفوذ مع اس کے تمام سیاسی تمدنی اور مذہبی اثرات کے خلاف کیا تھا۔ اور ہم نے یہ بھی دیکھا کہ اسلام کی گزشتہ عظمت کو بحال کرنے کے لئے وہ کتنے فکرمند تھے۔ اور اس کے لئے انہوں نے کتنی جدوجہد کی۔ نیز وہ میراثِ اسلام جس کے یہ بزرگ اپنے قرونِ وسطےٰ سے وارث ہوئے تھے، اسے برقرار رکھنے کے لئے ہماری نظر سے ان کی کوششوں کا حال بھی گزر چکا ہے اس ضمن میں ان علماء کی فکرمندی بے شک مبنی بر خلوص تھی، اور ان کی جدوجہد بھی حق بجانب تھی، لیکن بقول مصنف۔

"تاریخ کا فیصلہ ان کے خلاف ہوا"

اور مدرسۂ دیوبند کے اہل رائے و اختیار کی تمام کوششوں کے باوجود برصغیر تقسیم ہوا اور پاکستان کا قیام وجود میں آگیا۔

بہرحال یہ سب باتیں اُس تاریخی دور سے تعلق رکھتی ہیں، جو گزر گیا چنانچہ اب ضرورت اور مناسب یہ ہے کہ ان تمام باتوں کو وقتی جذباتیت سے بلند ہوکر تاریخی معروضیت (objectivity) کی نگاہ سے دیکھا جائے اور ان سے نکلنے والے نتائج سے "مدرسۂ دیوبند" سے متاثر مکتبِ خیال کے علماء اور "علی گڑھ کالج" کا ذہنی موقف رکھنے والے تجدید پسند دونوں استفادہ کریں۔ اور باہمی افہام و تفہیم سے اپنے مستقبل (فکری، معاشرتی اور سیاسی) کی تشکیل کریں۔ خوش قسمتی سے یہ باہمی افہام و تفہیم اب اتنی مشکل نہیں جتنی اگست ۱۹۴۷ء سے قبل تھی۔ ایک تو برصغیر سے انگریز چلا گیا۔ جس کا وجود خواہ مخواہ اس بحث میں آتا تھا۔ اور اس کی وجہ سے فریقین کا باہمی نزاع جذباتیت کا رنگ اختیار کرلیتا تھا۔ دوسرے پاکستان اور ہندوستان کی آزادی کے بعد آخرالذکر ملک میں فرقہ وارانہ کشمکش نے ایسی صورت اختیار کرلی ہے کہ نہ صرف پاکستان میں رہنے والے مکتبِ دیوبند سے متاثر اور منتسب حضرات

کے مملکت پاکستان کے بارے میں وہ جذبات و خیالات نہیں رہے، جو حصول پاکستان کی جدو جہد کے دوران تھے۔ بلکہ خود ہندوستان کے دیوبندی حضرات اب تحریک پاکستان اور اس کے نتیجے میں قائم شدہ مملکت پاکستان کو اس نظر سے نہیں دیکھتے، جس سے وہ ۱۹۴۷ء سے پہلے دیکھنے کے عادی ہو گئے تھے، اب ان کے سامنے پاکستان کا مسئلہ نہیں بلکہ ان کی تمام تر مساعی دستوری لحاظ سے "سیکولر" اور عملاً ہندو فرقہ پرست بھارت میں اپنے اسلامی وجود کو برقرار رکھنے پر مرکوز ہیں اور اس کے لئے انہیں زندگی و موت کی لڑائی لڑنی پڑ رہی ہے۔

"مدرسۂ دیوبند" جس سے آج مراد راسخ العقیدہ اسلاف پرست و قدامت پسند "مکتب خیال" ہے اور اسی طرح "علی گڑھ" جو مرادف ہے اس "مکتب خیال" سے جس نے ذہناً انگریزی تعلیم کے اثرات کو قبول کیا اور عملاً تجدید پسندی کو اپنایا، ان دونوں کے ایک دوسرے سے قریب تر ہونے میں پاکستان اور ہندوستان کے مسلمانوں کے موجودہ سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی حالات کافی سازگار ہیں۔ نیز بین الاقوامی اور خاص طور سے بین الاسلامی[1] حالات بھی اس میں بہت حد تک ممد و معاون ہیں۔ ضرورت ہے کہ دونوں مکاتب خیال کے اہل الرائے حضرات ان داخلی و خارجی حالات سے فائدہ اٹھائیں اور اس آویزش اور مخاصمت کو ختم کریں، جو گزشتہ ایک صدی سے

---

[1] ایک زمانے میں افغانستان قدامت کا سب سے مضبوط گڑھ تھا، لیکن آج وہاں جس سرعت سے سماجی آزادی آ رہی ہے، وہ "علی گڑھ" کے تجدید پسندوں کو بھی حیرت میں ڈال دیتی ہے۔ سعودی عرب میں بھی اسلاف پرستی کا بڑا زور ہے، لیکن تیل کی وجہ سے وہاں جو دولت کی فراوانی ہے، اس کے نتیجے میں وہاں کا معاشرہ یورپ کی اکثر نعمتوں سے محظوظ ہو رہا ہے۔ ایک زمانے میں قاہرہ کی جامعہ ازہر فکر و نظر کی قدامت پسندی میں مدرسہ دیوبند سے بھی آگے تھی لیکن صدر ناصر کی "سوشلسٹ" اصلاحات نے اسے اب بالکل ایک جدید درس گاہ بنا دیا ہے۔ جہاں علوم اسلامیہ کے ساتھ ساتھ جدید طریقوں پر جدید علوم پڑھائے جائیں گے۔

قدامت پسندی اور تجدید پسندی میں چل رہی ہے آج مسلمانوں کو فکری، سماجی، اقتصادی اور سیاسی، ان سب محاذوں پر بڑے سنگین چیلنجوں کا مقابلہ کرنا پڑ رہا ہے۔ اور ان سے وہ صرف اسی طرح عہدہ برآ ہو سکتے" ہیں کہ ان کی معنوی قوتیں مربوط وہم آہنگ ہوں ۔ وہ اپنے ماضی حال اور مستقبل کو ایک فکری وحدت دے سکیں۔ اور ان کے فکر اور عمل میں کم سے کم تضاد ہو۔

مولانا عبیداللہ سندھیؒ فرمایا کرتے تھے کہ مدرسۂ دیوبند کے بانی مولانا محمد قاسمؒ اور علی گڑھ کالج کے مؤسس سرسید احمد خاںؒ دونوں فکر ولی اللہی سے متاثر اور منتسب تھے دونوں کا سلسلۂ تلمذ مولانا مملوک علی سے تھا، جو ایک واسطے سے شاہ عبدالعزیزؒ کے شاگرد ہیں۔ اب بقول مولانا سندھیؒ کے، فکر ولی اللہی مشتمل تھا دو اجزا پر، ایک جزو عقلیت تھا اور دوسرا جزو سلف صالح کا تتبع۔ ۱۸۵۷ء کی ناکامی اور مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کے خاتمے کے بعد جب مسلمانوں میں نئی زندگی کے آثار پیدا ہوئے، اور انہیں عملی شکل دینے کی کوششیں ہوئیں تو سرسیدؒ فکر ولی اللہی کے اس جزو کو جس میں عقلیت مرجّح اور مقدم تھی، علی گڑھ لے گئے اور وہ جزو جس میں سلف صالح کے تتبع پر زیادہ زور تھا، مولانا محمد قاسمؒ نے مدرسۂ دیوبند کو اس کا محافظ مرکز بنایا۔ مولانا سندھی فرمایا کرتے تھے کہ فکر ولی اللہی کی عقلیت یقیناً مولانا محمد قاسمؒ کے ہاں بھی تھی اور سرسیدؒ کو بھی حتمی طور پر اسلاف کی روایات سے دلی وابستگی تھی اور وہ ان کے احترام کرتے ہیں۔ ہاں اختلاف صرف ترجیح و تقدیم کا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود اس اختلاف کے دونوں بزرگ ایک دوسرے کے معترف تھے اور ایک دوسرے کی عزت کرتے تھے۔ چنانچہ مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے لئے سرسید نے مولوی عبداللہ صاحب کو مذہبی اتالیق مقرر کیا، جو بقول ان کے نواسے ہیں مملوک علی صاحب کے، داماد ہیں مولوی محمد قاسم صاحب کے اور ان سب بزرگوں سے مجھے ذاتی واقفیت تھی اور امید ہے کہ ان بزرگوں کی صحبت کے فیض سے مولوی عبداللہ صاحب کی بھی ایسی ہی طبیعت ہے کہ دینی کاموں کو بہ لحاظ دین اور بہ لحاظ محبت اسلام انجام دیں۔

جب مولانا محمد قاسمؒ کا انتقال ہوا تو سرسیدؒ نے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۲۴ اپریل ۱۸۸۰ء میں ان کی تعزیت ان الفاظ میں کی تھی:۔ افسوس ہے کہ جناب ممدوح حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نے ۱۵ اپریل ۱۸۸۰ء کو ضیق النفس کی بیماری میں بمقام دیوبند انتقال فرمایا زمانہ بہتوں کو رو چکا ہے اور آئندہ بھی

بہتوں کو روئے گا۔لیکن ایسے شخص کے لئے رونا جس کے بعد اس کا کوئی جانشین نظر نہ آوے، نہایت رنج وغم اور افسوس کا باعث ہوتا ہے..... زمانۂ تحصیل علم میں جیسے کہ وہ ذہانت اور عالی دماغی اور فہم و فراست میں معروف و مشہور تھے، ویسے ہی نیکی اور خدا پرستی میں بھی زبان زد اہل فضل وکمال تھے۔ ان کو جناب مولوی مظفر حسین صاحب کاندھلوی کی صحبت نے اتباع سنت پر بہت زیادہ راغب کر دیا تھا۔ اور حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے فیض صحبت سے ان کے دل کو ایک نہایت عالی مرتبہ کا دل بنا دیا تھا۔ خود بھی پابند شریعت تھے اور دوسرے لوگوں کو بھی پابند سنت و شریعت کرنے میں زائد از حد کوشش کرتے تھے۔ بایں ہمہ عام مسلمانوں کی بھلائی کا ان کو خیال تھا۔......

"مسائل خلافیہ میں بعض لوگ ان سے ناراض تھے۔ اور بعضوں سے وہ ناراض تھے۔ مگر جہاں تک ہماری سمجھ ہے ہم مولوی محمد قاسم مرحوم کے کسی فعل کو خواہ کسی سے ناراضی کا ہو، خواہ کسی سے خوشی کا ہو، کسی طرح ہوائے نفس یا ضد یا عداوت پر محمول نہیں کر سکتے۔ ان کے تمام کام اور افعال جس قدر تھے، بلاشبہ للہیت اور ثواب آخرت کی نظر سے تھے اور جس بات کو وہ حق اور سچ سمجھتے تھے اس کی پیروی کرتے تھے ان کا کسی سے ناراض ہونا صرف خدا کے لئے تھا اور کسی سے خوش ہونا بھی صرف خدا کے واسطے تھا۔ کسی شخص کو مولوی محمد قاسم صاحب اپنے ذاتی تعلقات کے سبب اچھا یا بُرا نہیں جانتے تھے۔ مسئلہ حبُ اللہ اور بغض اللہ خاص ان کے برتاؤ میں تھا۔ ان کی تمام خصلتیں فرشتوں کی سی خصلتیں تھیں۔ ہم اپنے دل سے ان کے ساتھ محبت رکھتے تھے اور ایسا شخص جس نے ایسی نیکی سے اپنی زندگی بسر کی ہو، بلاشبہ نہایت محبت کے لائق ہے....." (مقالات سرسید حصہ ہفتم)

مولانا محمد قاسمؒ بھی باوجود سرسیدؒ کے مذہبی عقائد سے ناخوش ہونے کے موصوف مسلمانوں کی عام بھلائی کے لئے جو پُرعزم کوششیں کر رہے تھے، ان کے قدرداں تھے اور اس کی وجہ سے اپنے دل میں سرسیدؒ کے لئے دوستی اور محبت کے جذبات پاتے تھے۔ (بحوالہ مدرسۂ دیوبند اور مطالبہ پاکستان)

بدقسمتی سے بعد میں جس ماحول اور جن حالات میں ان دونوں اداروں کا ارتقاء عمل میں آیا، انہوں نے ان کو ایک دوسرے سے دُور کر دیا، گو دیوبند اور علی گڑھ کے درمیان ۱۹۲۰ء میں کچھ قرب ہوا، لیکن وہ محض

ہنگامی تھا، اس لئے زیادہ دیر پا ثابت نہ ہوا۔ زیر نظر کتاب میں (ص۳۸۰) مصنف نے ڈاکٹر سید عابد حسین کے ایک مضمون کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ سرسید مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں تین مدرسے قائم کرنا چاہتے تھے۔ ایک انگریزی مدرسہ، جس میں تمام جدید علوم انگریزی میں پڑھائے جائیں دوسرا اردو مدرسہ، جس میں یہی علوم اردو میں پڑھائے جائیں۔ اور تیسرا عربی اور فارسی کا مدرسہ، بدقسمتی سے سرسید کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا، اور اس کے جانشینوں نے اسے محض گریجویٹ پیدا کرنے والی "فیکٹری" بنا دیا۔

اسی طرح مولانا محمد قاسمؒ انگریزی زبان اور جدید علوم کے اتنے مخالف نہ تھے جس قدر ان کے بعد والے ہو گئے تھے۔ سوانح قاسمی کے مصنف مولانا مناظر احسن گیلانی نے مولانا محمد قاسمؒ کی ایک تقریر کا ذکر کیا ہے، جو آپ نے سنہ ۱۲۹۰ھ میں دیوبند کے جشن دستار بندی میں کی تھی اس پر تبصرہ کرتے ہوئے مصنف موصوف لکھتے ہیں کہ اس تقریر میں مولانا محمد قاسم نے دارالعلوم دیوبند کے نصاب میں جدید علوم و فنون اور السنہ کی کتابیں کیوں شریک نہیں کی گئیں: اس کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ جہاں ایک طرف "آج کل تعلیم علوم جدیدہ تو بوجہ کثرتِ مدارس سرکاری اس ترقی پر ہے کہ علومِ قدیمہ کو سلاطین زمانہ سابق میں بھی یہ ترقی نہ ہوئی ہوگی۔" وہاں دوسری طرف "علوم نقلیہ (یعنی خالص دینی و اسلامی علوم) کا یہ تنزل ہوا کہ ایسا تنزل بھی کسی کارخانہ میں نہ ہوا ہوگا۔" لیکن اس کے ساتھ ہی ارشاد ہوتا ہے۔

> اس کے بعد (یعنی دارالعلوم دیوبند کے تعلیمی نصاب سے فارغ ہونے کے بعد) اگر طلبہ مدرسہ ہذا، مدارس سرکاری میں علوم جدیدہ کو حاصل کریں، تو ان کے کمال میں بات زیادہ موید ثابت ہوگی۔[1]

---

[1] سوانح قاسمی کے مصنف مولانا گیلانی لکھتے ہیں:۔ سیدنا الامام الکبیر (مولانا محمد قاسمؒ) کا صحیح تعلیمی نصب العین نگاہوں سے اوجھل ہو چکا ہے ..... جب چاہا یہ گیا تھا کہ اسلامی و دینی علوم کی صلاحیت اور ان علوم سے کافی مناسبت پیدا کرا لینے کے بعد جدید علوم اور نئی علمی زبانوں سے استفادہ کا (باقی حاشیہ ص۴۸ پر)

مولانا محمد قاسمؒ کو آخری بار حج کے لئے جاتے ہوئے جہاز کے کپتان سے ملاقات کے دوران اس امر کا بھی شدید احساس ہو گیا تھا کہ انہیں خود انگریزی زبان سیکھنی چاہیئے اور اگر ان کی عمر وفا کرتی تو وہ اس زبان کو ضرور سیکھتے۔[1]

غرض مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے قیام سے سرسیدؒ کا جو مقصد تھا، وہ شرمندۂ تکمیل نہ ہو سکا، اور یہ مدرسہ ایک مخصوص ڈگر پر چلتا رہا۔ اسی طرح مولانا محمد قاسمؒ مدرسۂ دیوبند کو جس نہج پر چلانا چاہتے تھے، اس کے لئے بعد کے حالات سازگار ثابت نہ ہوئے اور اس کی وجہ سے نہ صرف مسلمانان پاک و ہند سیاسی لحاظ سے دو بڑے گروہوں میں بٹے رہے۔ بلکہ ان میں جدید و قدیم کے معاملے میں جس قسم کا فکری و نظری اتحاد ہونا چاہیئے تھا، وہ بروئے کار نہ آسکا ۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک کے اس طویل دور میں ان کے لئے یہ نقصان عظیم تھا۔

جہاں تک ہندوستان موجودہ بھارت میں مسلمانوں کے مستقبل کا تعلق ہے، زیر نظر کتاب کے مصنف نے ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کی اس رائے سے اختلاف کیا ہے۔ کہ "ہندوستان میں آئندہ سو سال یا شاید اس سے بھی کم مدت میں مسلمانوں کا وجود ناپید ہو جائیگا۔"[2]

اور پاکستان کے ذکر میں ضیاالحسن فاروقی صاحب لکھتے ہیں:۔

"اگر پاکستان، آگے چل کر، اسلام کی ایک ایسی نئی تعبیر پیش کرنے میں کامیاب ہوتا ہے جو ایک طرف اسلام کی صدیوں پرانی تاریخی روایات کے تمام بہترین اور صحت مند ترین عناصر

(بقیہ حاشیہ) موقع مسلمان بچوں کے لئے فراہم کیا جائے تو پھر ایسا کیوں نہ ہوا؟ اور تقریباً ایک صدی کی طویل تاریخ میں کوئی ایک "نمونہ" بھی اس تعلیمی نصب العین کے مطابق دیوبند کا دارالعلوم پیش نہ کر سکا۔"

[1] کتاب "ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت" مصنفہ مولانا گیلانی

[2] ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی نے اپنے ایک مضمون "پاکستان کلچر کی بنیادیں" میں اس رائے کا اظہار کیا ہے۔

کی حامل ہو اور دوسری طرف وہ ان چیلنجوں کا، جو آج کے زمانے کے ہیں عقلی لحاظ سے مناسب جوابات فراہم کرے۔ تو اس صورت میں اور صرف اسی صورت میں پاکستان کے قیام اور اس کے نتیجے میں مسلمانان ہند کو جن مصائب سے گزرنا پڑا، اس کا معقول جواز نکل سکتا ہے۔"

اسی ضمن میں مصنف کا یہ بھی کہنا ہے:-

"یقینی طور سے پاکستان کے صرف اس نہج پر ارتقاء ہی میں بحیثیت ایک مسلم سلطنت کے، اس کی طاقت و شوکت کا انحصار ہے۔ اقبال کے خواب بھی اسی طرح عملی جامہ پہن سکتے ہیں اور نئے ہندوستان کے مسلمان شہریوں کے لئے بھی یہی چیز وجہ سکون ہو سکتی ہے پاکستان کے معرض وجود میں آنے کا جواز اس میں ہے کہ وہاں متوازن و ہم آہنگ جدید اسلام پھلے پھولے، جو ایک طرف اپنے شاندار ماضی کے لئے فخر ہو اور دوسری طرف بیسویں صدی کے چیلنجوں کے مقابلے کی صلاحیت رکھتا ہو۔"

یہ کتاب ہندوستان میں چھپی ہے۔ پاکستان کے بک سیلروں کے ہاں مل سکتی ہے قیمت ۱۷/۵۰ روپے

افکار و آراء

السلام علیکم۔

یہ واقعہ ہے کہ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے جن نامساعد حالات میں اس ہمہ گیر انقلابی تحریک کو عام اہل علم حضرات تک پہنچایا اور اسے ایک عملی رُخ دیا وہ تاریخ اسلام میں زریں باب کا مستحق ہے۔ حضرت مولانا سندھیؒ نے بجا طور پر لکھا ہے کہ اگر شاہ عبدالعزیز صاحب اپنے والد ماجد کی حکمت، تصوف و فلسفے اور سیاست کے مخصوص طریقے متوسط طبقے تک نہ پہنچاتے تو آج امام ولی اللہ کو صحیح طور پر پہچاننے والا مشکل سے دستیاب ہو سکتا — اور ہندوستانی مسلمان اس نعمت سے جو عام انسانیت کے لئے ابر رحمت ہے ہمیشہ کے لئے محروم رہتا۔ میرا تو عقیدہ ہے کہ ہندوستان کی جنگ آزادی کی تحریک سنہ ۱۸۵۷ء کے غدر سے نہیں بلکہ شاہ عبدالعزیز صاحب سے شروع ہوئی ہے اور مسلمانوں کی علمی و عملی بیداری کا دور سرسید، مولانا محمد علی یا مسلم لیگ سے نہیں بلکہ شاہ عبدالعزیز صاحب سے شروع ہوتا ہے اگر آج ہم صرف ان کے انہی دو فتوؤں کو جو انہوں نے ایک طرف انگریزی تعلیم کے جواز کے بارے میں اور دوسری طرف انگریزوں کی ہندوستان میں عملداری کو دارالحرب قرار دینے کے بارے میں دیئے ہیں، باہم تطبیق دیں اور ملا کر غور کریں تو اس عظیم المرتبت مجاہد کی حیرت انگیز بصیرت اور ہندوستان کی جنگ آزادی اور مسلمانوں کی بیداری کی تاریخ کا ایک قابل قدر باب کھلتا ہے۔ یہ جان کر حیرت اور تعجب ہوتا ہے کہ آجکل کے عام پڑھے لکھے لوگ شاہ صاحب کو صرف ایک محدث اور "تحفہ اثنا عشریہ" کے مصنف کے نام سے

جانتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ شاہ عبدالعزیز صاحب کی حیثیت اس سے کہیں بلند ہے۔ وہ صرف حکمت ولی اللہ کے بہترین شارح اور اس کو عملی جامہ پہنانے والے ہی نہیں بلکہ ایک عظیم مفسر، مفکر اور صوفی بھی تھے۔ ان کا سب سے بڑا کام یہ ہے کہ انہوں نے جو کچھ سوچا، اس کو عملی جامہ بھی پہنایا اور پوری زندگی ایک عظیم مجاہد کی طرح اسلام کی ہر ممکن خدمت میں گذار دی۔ اس ہمہ گیر شخصیت کی زندگی اور افکار میں موجودہ دور کی مریض انسانیت کا علاج پوشیدہ ہے آج ہندوستان میں مسلمانوں کے جتنے بھی مذہبی مدارس ہیں وہ بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر شاہ صاحب کی کوشش کے مرہون منت ہیں اور ان ہی کی روشن کی ہوئی شمع سے روشنی حاصل کر رہے ہیں۔

ندوۃ العلماء لکھنؤ میں شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی کتاب "الاحادیث الموضوعۃ" کا قلمی نسخہ ہے۔ یہ نہ معلوم ہو سکا کہ یہ مطبوعہ شکل میں بھی پاکستان یا ہندوستان میں آچکا ہے کہ نہیں۔ اس کے علاوہ رحیم بخش صاحب کی کتاب "حیات عزیزی" جو غالباً شاہ صاحب کے حالات پر اپنی نوعیت کی واحد کتاب ہے اگر دوبارہ چھپ جاتی تو بڑا اچھا تھا۔ اس کا ایک نسخہ رامپور کی لائبریری میں موجود ہے۔

محمد عضد الدین خاں
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

محترم ایڈیٹر صاحب

بخیرم و خیر خواہم۔ الرحیم باقاعدگی سے مل رہا ہے میری دعا ہے کہ آپ کا ادارہ جناب شاہ صاحب کے اساس فکر پر موجودہ ایٹمی دور کے انسان کی مادی ضروریات اور ذہنی تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے حصول خیر کے بلند مقام تک پہنچنے میں اس کی رہبری کر سکے۔ اور انسانیت کے ارتقاء میں ممد ثابت ہو۔

غوث بخش بینجہ سنٹرل جیل حیدرآباد

جناب ایڈیٹر صاحب

جب سے میں نے امام الہند شاہ ولی اللہ اکیڈمی کے متعلق اخباروں میں پڑھا تھا تو یقین جانیئے

کہ مجھے دلی اطمینان ہوا تھا۔ لیکن اب کچھ پریشانی سی معلوم ہوتی ہے۔ قلم نے مجھے مجبور کردیا کہ مدیر "الرحیم" کو کچھ لکھوں میں نے تقریباً ہر مہینے کا "الرحیم" پڑھ لیا ہے۔ ساتھ ساتھ صفحہ اخیر پر اغراض و مقاصد شاہ ولی اللہ اکیڈمی کے بھی پڑھ لئے ہیں۔ لیکن جہاں تک میرے خیالات کا تعلق ہے، ان میں سے بہت کم ہیں، جن کا آپ اپنے مضامین میں خیال رکھ رہے ہیں۔ آپ کو چاہیئے تھا کہ "الرحیم" میں شاہ ولی اللہؒ کی تصنیفات سے کچھ حصے شائع کرتے۔ آپ نے فروری میں شاہ ولی اللہ پر کوئی مضمون شائع نہیں کیا۔ میں یہاں چند تجاویز پیش کرتا ہوں امید ہے آپ افکار و آراء میں انہیں شائع کریں گے۔

۱۔ چونکہ اسلام دینی و دنیوی زندگی سنوارنے کا ایک اعلیٰ اور عالمگیر نظام حیات ہے۔ جس پر انسان عمل پیرا ہو کر اپنی معاشی معاشرتی سماجی اور سیاسی غرض ہر قسم کی بہبودی کر سکتا ہے اور قرآن پاک اسلام پر چلنے کے لئے اللہ پاک کی طرف سے ہمیں ایک جامع کتاب ملی ہے۔ صد ہائے افسوس کہ آپ نے الرحیم میں اسکا صفحہ نہیں رکھا۔ "الرحیم" میں قرآن پاک کے ترجمہ و تفسیر کے لئے صفحہ ہونا چاہیئے۔

۲۔ ہمارے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے قرآن پاک کو سمجھنے کے لئے وقتاً فوقتاً احادیث بیان فرمائی ہیں۔ "الرحیم" میں احادیث شریف کا انتخاب ضرور ہونا چاہیئے۔

۳۔ قرآن پاک اور حدیث شریف میں امام الہند شاہ ولی اللہ کا تجدیدی و استنباطی مقام ہے، فلسفہ، منطق، ریاضی وغیرہ کے پیچھے نہ لگئے۔ ضرورت قرآن و حدیث کی ہے۔

۴۔ تقریباً ہر مسلم ملک میں شرک کی بات بدعات اور رسومات ہیں۔ الرحیم میں شاہ صاحب اور ہم اعتقاد لوگوں کے ایسے مضامین شائع ہوں، جن سے مسلمان قوم کو اس بلائے عظیم سے نجات حاصل ہو۔

۵۔ ایک اہم سوال جو ہمیشہ "الرحیم" پڑھنے سے میرے ذہن میں چکر لگا رہا ہے، وہ یہ کہ آپ کو کسی خاص جماعت پر حملہ نہیں کرنا چاہیئے جیسے کہ "الرحیم" میں جماعت اسلامی کے ایک سابق ممبر نے

مضمون دیا تھا۔ فردی کے پرچے میں جماعت اسلامی پر اعتراضات ہیں۔ میرا کسی جماعت سے کوئی تعلق نہیں۔

۶۔ ایسے تقلیدی مسائل شائع کیجئے جو قرآن اور سنت سے ماخوذ ہیں نہ یہ کہ اندھا دھند تقلید جسے لوگوں نے قرآن اور سنت سے بالاتر سمجھا ہے۔ میری دعا ہے کہ خداوند تعالیٰ آپ کو اس کار خیر میں مدد دے۔

سبز علی خاں، تحصیل و بازار چارسدہ، ڈاک خانہ و بازار چارسدہ

ماہنامہ "الرحیم" میں تصوف کے مسئلہ وحدت الوجود کے بارے میں جو تشریحات شائع ہوتی ہیں، اور اہل تصوف کے روحانی کمالات کا جو بیان ہوتا ہے۔ اس سے میں بہت متاثر ہوا ہوں۔ وحدت الوجود کی نظری تشریحات تو آپ کے ہاں ہوتی ہیں۔ ضرورت ہے کہ عملی زندگی میں اس تصور سے جو نتائج مترتب ہو سکتے ہیں، "الرحیم" میں ان کے بارے میں بھی کچھ شائع ہو، میں سمجھتا ہوں کہ وحدت الوجود کی ایک ایسی تعبیر جو ساری انسانیت کو اپنے احاطے میں لے، اس دور کے جملہ مسائل کو حل کرنے میں بڑی مدد دے سکتی ہے۔ جب وحدت الوجود کی بحثیں پڑھتا ہوں تو ظاہر ہے اس کی باریکیوں تک تو میرا ذہن نہیں پہنچ سکتا، لیکن انہیں پڑھ کر میری زبان پر بے اختیار علامہ اقبال کا یہ شعر آتا ہے اور میں اسے بار بار پڑھتا ہوں۔

تو ہے محیطِ بے کراں میں ہوں ذرا سی آب جو
یا مجھے ہمکنار کر یا مجھے بے کنار کر

علامہ اقبال کے اس شعر کے علاوہ ان کے بہت سے اور اشعار میں بھی وحدت الوجود کا تصور جھلکتا ہے میرے خیال میں وہ اغلباً وحدت الوجود کے قائل تھے، البتہ کہیں کہیں ان کے ہاں ایسے خیالات بھی ملتے ہیں، جو وحدت الشہود پر دلالت کرتے ہیں۔

محمد عمر چھرہ۔ کراچی

مطبوعات شاہ ولی اللہ اکیڈمی

★

لمحات (عربی)

شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ کے فلسفہ تصوف کی یہ بنیادی کتاب عرصے سے نایاب تھی۔ مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی کو اس کا ایک پرانا قلمی نسخہ، جو اغلاط سے پر تھا، ملا۔ موصوف نے بڑی محنت سے اس کی تصحیح کی، اور شاہ صاحب کی دوسری کتابوں کی عبارات سے اس کا مقابلہ کیا۔ اور وضاحت طلب امور پر تشریحی حواشی لکھے۔ کتاب کے شروع میں مولانا کا ایک مبسوط مقدمہ ہے۔

شاہ صاحب نے اس کتاب میں "وجود" اور اس سے کائنات کا جس طرح صدور ہوا ہے، اس پر بحث کی ہے، اور اپنی الٰہیاتی حکمت کے دوسرے مسائل بھی بیان کئے ہیں۔ قیمت دو روپے

——:o:——

شاہ ولی اللہ کی تعلیم

از پروفیسر غلام حسین جلبانی سندھ یونیورسٹی

پروفیسر جلبانی ایم اے صدر شعبہ عربی سندھ یونیورسٹی کے برسوں کے مطالعہ و تحقیق کا حاصل یہ کتاب ہے اس میں مصنف نے حضرت شاہ ولی اللہ کی پوری تعلیم کا احصاء کیا ہے اس کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل بحثیں کی ہیں۔ اردو میں شاہ صاحب کی تعلیم پر یہ پہلی جامع کتاب ہے۔

کتاب مجلد ہے۔ قیمت ۷۵ء۰ روپے ہے

شاہ ولی اللہ اکیڈمی - صدر - حیدرآباد۔ پاکستان

Monthly "AR-RAHIM" Hyderabad Regd. S. No. 2548

شاہ ولی اللہ اکیڈمی

اغراض ومقاصد

۱۔ شاہ ولی اللہ کی تصنیفات اُن کی اصلی زبانوں میں اور اُن کے تراجم مختلف زبانوں میں شائع کرنا۔

۲۔ شاہ ولی اللہ کی تعلیمات اور ان کے فلسفہ وحکمت کے مختلف پہلوؤں پر عام فہم کتابیں لکھوانا اور اُن کی طباعت واشاعت کا انتظام کرنا۔

۳۔ اسلامی علوم اور بالخصوص وہ اسلامی علوم جن کا شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتب فکر سے تعلق ہے، اُن پر جو کتابیں دستیاب ہوسکتی ہیں، اُنہیں جمع کرنا، تاکہ شاہ صاحب اور اُن کی فکری و اجتماعی تحریک پر کام کرنے کے لئے اکیڈمی ایک علمی مرکز بن سکے۔

۴۔ تحریک ولی اللہی سے منسلک مشہور اصحاب علم کی تصنیفات شائع کرنا، اور اُن پر دوسرے اہل قلم سے کتابیں لکھوانا اور اُن کی اشاعت کا انتظام کرنا۔

۵۔ شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتب فکر کی تصنیفات پر تحقیقی کام کرنے کے لئے علمی مرکز قائم کرنا۔

۶۔ حکمت ولی اللہی اور اس کے اصول ومقاصد کی نشر واشاعت کے لئے مختلف زبانوں میں رسائل کا اجرا۔

۷۔ شاہ ولی اللہ کے فلسفہ وحکمت کی نشر واشاعت اور اُن کے سامنے جو مقاصد تھے۔ اُنہیں فروغ دینے کی غرض سے ایسے موضوعات پر جن سے شاہ ولی اللہ کا خصوصی تعلق ہے، دوسرے مصنفوں کی کتابیں شائع کرنا

محمد سرور پرنٹر پبلشر نے سعید آرٹ پریس حیدرآباد سے چھپوا کر شائع کیا۔

جلد (۱) ذیقعدہ سنہ ۱۳۸۳ھ مطابق اپریل سنہ ۶۴ء نمبر (۱۱)

فہرست مضامین

شذرات

مارچ کی آخری تاریخوں میں پشاور یونیورسٹی میں مؤتمر علوم اسلامیہ کے اجلاس ہو رہے ہیں۔ جن میں جہاں ایک طرف عربی و دینی مدارس کے علمائے کرام شرکت فرما رہے ہیں' وہاں دوسری طرف جدید یونیورسٹیوں اور کالجوں کے اصحاب علم بھی شرکت کر رہے ہیں۔ گزشتہ سال تقریباً انہی دنوں سندھ یونیورسٹی حیدرآباد میں بھی علوم اسلامیہ کی یہ مؤتمر ہوئی تھی' اور دونوں مکاتب خیال کے علماء و فضلاء اس میں شریک ہوئے تھے۔ جدید علوم کی درس گاہوں میں قدیم اسلامی علوم کے متخصصین کے اس طرح کے اجتماع نہ صرف علمی و فکری لحاظ سے ہماری قومی زندگی میں بڑے دور رس اثرات کے حامل ہوں گے' بلکہ ان سے ہماری معاشرتی زندگی میں اُس خلیج کو پاٹنے میں بھی بڑی مدد ملے گی' جس نے قدیم و جدید مکاتب خیال کو ایک دوسرے سے جُدا کر رکھا ہے۔ مسلمانوں کے زوال' جمود اور اُن کی پس ماندگی کے بے شک اور بھی اسباب ہیں' لیکن گزشتہ ایک صدی میں اُن کے ہاں قدیم و جدید میں جو بُعد' بلکہ ایک حد تک منافرت پائی جاتی ہے' ان اسباب میں سے ایک بڑا سبب یہ بھی ہے۔

عربی و دینی مدارس میں انگریزی زبان اور جدید علوم کی تعلیم و تدریس اور جدید سکولوں' کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اسلامیات اور اسلامی علوم و ثقافت کی تعلیم کا انتظام ایک بڑا خوش آئند امر ہے۔ افسوس اس کا ہو کہ یہ کام بہت دیر میں شروع ہوا' لیکن خداوند کریم کا شکر ہو کہ آخر حاملین دین متین اور اصحاب علوم جدیدہ ہر دو کو اس ضرورت کا احساس ہوا' اور اب دونوں اس کی طرف متوجہ ہیں۔

حیدرآباد سے تھوڑی ہی مسافت پر میرپور خاص ایک شہر ہے' وہاں پہلے ایک عربی و دینی مدرسہ تھا' پھر اُس کے پہلو بہ پہلو ایک ہائی سکول قائم کیا گیا۔ اب اس مدرسے اور ہائی سکول کے بانی جو خدا کے فضل سے ایک مستند اور مسلّم عالم دین ہیں' ہائی سکول کو کالج میں منتقل کرنے میں کس طرح کوشاں اور سرگرداں ہیں' اور اُن کے خلوص اور اُن کی ہمّت اور شب و روز محنت کو دیکھ کر خیر حضرات اس کار خیر میں جیسے مدد کر رہے ہیں' اُسے دیکھ کر یہ امید بندھتی ہے کہ ہمارے ہاں وہ دن دور نہیں' جب قدیم و جدید کا یہ بُعد اللہ تعالےٰ کے فضل و کرم سے ایک قصہ ماضی ہو جائے گا۔

علمائے کرام جدید علوم کے سکول اور کالج کھولیں اور جدید علوم کے ارباب سند اسلامی علوم پڑھیں اور پڑھائیں پاکستان کی قومی زندگی کا یہ ایک قابلِ فخر باب ہے، اور اس کا ہر بہی خواہِ قوم و وطن خیر مقدم کرے گا۔

جدید و قدیم علوم کی تعلیم کو ایک دوسرے سے قریب اور دونوں کو یکجا کرنے کے ساتھ ساتھ کم و بیش ہر اسلامی ملک میں اس ضرورت کا بھی احساس ہو رہا ہے کہ اگر اسلام کی تعلیمات اور شریعت کو عام مسلمانوں کی انفرادی و اجتماعی زندگی کا شعار اور اُن کی قومی حکومتوں کا لائحہ عمل بنانا ہے تو اس کے لئے "شریعت اور فقہ اسلامی میں اجتہاد کرنا ہو گا کہ اُس کے ذریعہ روح اور زندگی پیدا ہو، جس کا جاری رہنا اُمت میں مستقلاً ضروری ہے۔ اور جو وقتی مسائل کے شرعی حل تلاش کرنے کا واحد ذریعہ ہے اور جس کے بغیر اب شریعت کے وقار کو بچایا نہیں جا سکتا۔"

دمشق کے ایک مشہور عالم دین کی یہ رائے ہے۔ اس سلسلے میں وہ یہ تجویز فرماتے ہیں کہ یہ اجتہاد انفرادی کے بجائے اجتماعی ہونا چاہیئے۔ چنانچہ اس کے لئے علماء و فقہاء کے ساتھ جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے چند ایسے ماہرین بھی ہونے چاہئیں جن کے دین پر بھی پورا اعتماد کیا جا سکتا ہو اور جو ضروری عصری علوم مثلاً اقتصادیات، اجتماعیات، قانون اور طب میں ایسی دستگاہ رکھتے ہوں کہ علماء اور فقہاء کو اپنی فنی مہارت کی وجہ سے صائب مشورہ دے سکیں۔ اور اُن کے کام میں پوری مدد کر سکیں۔

واقعہ یہ ہے کہ اس زمانے میں علماء و فقہاء اور جدید علوم کے ماہرین کی متفقہ کوششوں کے بغیر کسی قسم کا اجتہاد ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ علماء و فقہاء کی علمی دسترس نہ عہد حاضر کے علوم پر ہے اور نہ اُس کی ضرورتوں اور تقاضوں پر، اور جدید علوم کے ماہرین شریعت اور فقہ اسلامی میں درک نہیں رکھتے۔ چنانچہ جب تک ان میں افہام و تفہیم کے ذریعہ آپس میں فکری مؤانست اور یک جہتی پیدا نہیں ہوتی اور وہ باہم دلی احترام کرنا نہیں سیکھتے، ان میں عملی تعاون کی کوئی راہ نہیں نکل سکے گی اور جدید اجتہاد کی اس بیل کے منڈھے چڑھنے کا کوئی امکان نہیں۔

اس ضمن میں اگر نظری بحثوں سے بالجملہ صرفِ نظر کیا جائے اور جن عملی مسائل اور مخصوص ضرورتوں سے عوام و خواص کو عموماً دوچار ہونا پڑ رہا ہے، اُنہی کے شرعی حل تلاش کرنے کی طرف بیشتر توجہ ہو تو ہمارے خیال میں تعاونِ عمل زیادہ آسان ہو سکتا ہے۔ ہم یہاں اس کی مثالیں دینا نہیں چاہتے، لیکن اس بارے میں صرف اتنا عرض کرتے ہیں کہ جب کوئی چیز حقیقت واقعی بن جاتی ہے تو خالص نظری دنیا میں رہنے والا آدمی بھی مجبور ہو جاتا ہے کہ وہ اُس کا نوٹس لے اور اُس کے متعلق اپنا عملی نقطۂ نظر متعین کرے، لیکن نظریات میں بحث و

مناظرہ کے وسیع مواقع رہتے ہیں اور اس کا سلسلہ دور دور تک چلا جاتا ہے۔

عمل تحدید و تعیین کا متقاضی ہوتا ہے۔ اور تحدید و تعیین میں اختلافات کا دائرہ سکڑ جاتا ہے، لیکن نظر و فکر کی دنیا لامحدود اور بے پایاں ہے، اس لئے قدرتاً اس میں اختلافات کی بڑی گنجائش ہے۔
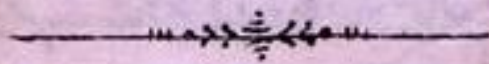
پاکستان کی قومی زندگی اس وقت اپنے ارتقائی دور کے ایک بڑے اہم مرحلے سے گزر رہی ہے۔ ہمارے ہاں صنعتی انقلاب کی طرح پڑ چکی ہے۔ دیہاتی زندگی بڑی سرعت سے شہری زندگی میں تبدیل ہو رہی ہے، اور ہزاروں اور لاکھوں افراد گاؤں چھوڑ چھوڑ کر روزگار کی تلاش میں صنعتی شہروں میں بس رہے ہیں۔ ایک قوم کی زندگی میں یہ بڑا نازک زمانہ ہوتا ہے۔ اس میں نہ صرف آبادی ہی کی اکھاڑ پچھاڑ ہوتی ہے بلکہ اس کے ساتھ تہذیبی روایات، دینی معتقدات، اخلاقی قدروں اور معاشرتی رسوم و عوائد میں بھی خلفشار برپا ہو جاتا ہے۔ بہرحال نئی عمارتیں تو بنتے بنتے بنتی ہیں، ہاں صنعتی انقلاب کے شروع میں پرانی عمارتیں ایک ایک کر کے ڈھینے ضرور لگتی ہیں۔

ہمارے معاشرے کی پرانی زندگی کی عمارت اب ٹوٹ رہی ہے، اس کی نئی تعمیر صرف اسی طرح ہو سکے گی کہ ہمارے علما و فقہا اور جدید علوم کے ماہرین میں سے اہل علم و فکر حضرات ایک دوسرے سے تعاون کریں اور قدیم و جدید کی ترکیب و ائتلاف پر نئی عمارت کی بنیاد رکھیں۔
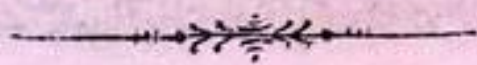
حضرت شاہ ولی اللہؒ اور ان کے مکتب خیال سے پورے برصغیر پاک و ہند میں شروع ہی سے جو علمی شغف رہا ہے، وہ ایک جانی بوجھی بات ہے، اور اسے دہرانے کی ضرورت نہیں، لیکن اب کچھ عرصے سے مغرب کے علمی مرکزوں اور فضلاء میں حضرت شاہ صاحب کے علوم و افکار کی طرف جو توجہ ہو رہی ہے اس کا البتہ ذکر کرنا بے محل نہ ہوگا۔ اس سے پہلے اُن دیار میں حضرت شاہ صاحب بہت کم متعارف تھے۔ ہم ان صفحات میں ہالینڈ کے ڈاکٹر بالجون کا ذکر کر چکے ہیں۔ حال ہی میں ہمیں ریاستہائے متحدہ امریکہ کے ایک پروفیسر فری لینڈ ایبوٹ کے تین مضامین کی کاپیاں ملی ہیں جو امریکہ کے مشہور رسالے "دی مسلم ورلڈ" میں چھپے ہیں۔ ان میں سے ایک مضمون شاہ صاحبؒ پر ہے، اور باقی دو مضمون سید احمد شہیدؒ کی تحریک جہاد پر ہیں۔

پروفیسر موصوف نے حضرت شاہ صاحب کے متعلق لکھا ہے کہ وہ قرون وسطیٰ اور عصر حاضر کی درمیانی شخصیت ہیں، جیسے یورپ میں دانتے تھا۔ "الرحیم" کے آیندہ شمارے میں ان مضامین کا خلاصہ اور اس پر تبصرہ شائع ہوگا۔

شاہ ولی اللہ کا نظریۂ انقلاب[1]

مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم

تمدن انسان کا فطری تقاضا ہے۔ اور اس کی تشکیل کے لئے وہ کسی خارجی مدد کا محتاج نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر جو صلاحیتیں ودیعت کی ہیں اُن کا ظہور تمدن کی صورت میں ہوتا ہے۔ ایک الگ تھلگ جزیرے میں اگر مرد اور عورت ہوں، تو وہ خود اپنے طبائع سے تمدن کو بروئے کار لا سکتے ہیں۔

انسانی معاشرے میں اس طرح جو تمدن معرضِ وجود میں آتا ہے، وہ اُس وقت تک صحت مند اور صالح رہتا ہے، جب تک کہ اُس سے افرادِ معاشرہ کی اکثریت کی بنیادی ضرورتیں پوری ہوتی رہیں، لیکن جب اُن میں معاشرتی ناہمواری افراط و تفریط کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اور ایک طبقے کے پاس سب کچھ ہوتا ہے اور دوسرا ادنیٰ ضرورتوں تک سے محروم ہو جاتا ہے، تو یہ تمدن برباد کیے جانے کے قابل ہوتا ہے۔ جب کسی معاشرے کو اس صورت حال سے دوچار ہونا پڑے تو پھر اس میں انقلاب کا آنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے نزدیک کاسب طبقے کی کمائی پر غیر کاسب طبقے کا قبضہ کر لینا شریعت کے خلاف ہے۔ اسی طرح خود کاسبوں کے ایک گروہ کا اُن کے دوسرے گروہ کی کمائی کا زیادہ حصہ ہتھیا لینا بھی ناجائز ہے۔

جب کسی معاشرے میں یہ حالت ایک وبائی شکل اختیار کر لے اور معاشی ناہمواری کی افراط و تفریط اُس کا عام معمول بن جائے، تو اُس میں حتمی طور سے انقلاب آجاتا ہے، چنانچہ اُس معاشرے کا ایک گروہ تو انقلاب کا مبلغ

---

[1] یہ مضمون مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کی "امالی" سے مرتب کیا گیا ہے۔ (مدیر)

بنتا ہے اور دوسرے اُس کے ہمدرد ہو جاتے ہیں۔ بے شک اِن ہمدردوں کے اخلاق و اطوار کا اثر اس انقلاب کے مظاہر پر پڑتا ہے، لیکن جہاں تک اس انقلاب کی روح کا تعلق ہے، اُس کا ترجمان وہی گروہ ہوتا ہے جو انقلاب کا مبلغ و قائد ہے۔

ہر انسان کو اپنا رزق خود پیدا کرنا چاہیئے۔ لیکن اگر وہ کسی وجہ سے معذور ہے، تو وہ بات دوسری ہے۔ ایک انسان کا خود اپنی روزی پیدا کرنا ایک فطری تقاضا ہے۔ اب ایک گھرانا ہے جس میں کمانے والے کم اور کھانے والے زیادہ ہیں ظاہر ہے یہ گھرانا جلد یا بدیر تباہ ہوگا اسی طرح جس معاشرے میں کاسب کم ہوں، اور کھانے والے زیادہ، وہ معاشرہ روگی ہے۔ اور اُس کا ختم ہونا لابدی ہے، لیکن اگر ایک معاشرے میں کاسب زیادہ ہیں لیکن اُن کی محنت سے جو دولت پیدا ہوتی ہے اُسے منتظمین کا ایک مخصوص طبقہ دوسروں سے زیادہ لے لیتا ہے۔ یعنی حق کسب سے حق انتظام بہت زیادہ ہے، تو اس صورت میں بھی یہ معاشرہ غیر صالح ہے۔ اور اس کا جانبر ہونا مشکل ہے۔

غرض انسانیت کے فساد کی سب سے بڑی وجہ یہی معاشی ناہمواری کی افراط و تفریط ہے، اس سے جہاں ایک طرف فقر و فاقہ اور عیش و عشرت عام ہوتی ہے وہاں دوسری طرف اخلاق بھی بگڑتے ہیں۔ چنانچہ ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ انسانیت کے اعلیٰ تقاضے بہت حد تک معاشی حالات کے اثرات قبول کرتے ہیں، اسی لئے ہم عام مرفہ الحالی اور لوگوں کی بنیادی ضرورتیں فراہم کرنے کے معاملے میں بہت حد تک اشتراکیوں کے ساتھ چلنے کو تیار ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ آخر انسانوں میں جو اخلاق (اُن کے عام معنوں میں) اور تفکر کی قوتیں ہیں، اُن کی تربیت کیسے ہو، بے شک، ہم چاہتے ہیں کہ انسانوں کی معاشی ضروریات کو زیادہ سے زیادہ اہمیت دی جائے، لیکن ساتھ ہی انسانیت کے اُس عنصر کو جو اخلاق اور تفکر کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے تشنہ نہ چھوڑا جائے۔

بات یہ ہے کہ اخلاق اور فکر کے بغیر کوئی نظام پائدار نہیں ہو سکتا، چنانچہ جہاں ہم استحصال پسند سرمایہ داروں پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ اُنہوں نے معاشرے کے بہت بڑے حصے کو معاشی لحاظ سے محتاج رکھ کر انسانیت کی سطح سے گرا دیا ہے وہاں ہمارا دوسرا الزام اُن پر یہ ہے کہ اُنہوں نے معاشرے کے اس بڑے حصے میں سے اُس طبقے کو جو اخلاق اور فکر کو ترقی دے سکتا تھا محتاج بنا کر اس قابل نہ رہنے دیا۔ چنانچہ اس لحاظ سے استحصال پسند سرمایہ داروں کا قصور دوہرا ہے۔ بد قسمتی سے جب کسی وجہ سے معاشرے کا وہ طبقہ جو اخلاق اور فکر کو ترقی دینے کی صلاحیتیں رکھتا ہے،

اپنی صلاحیتوں سے صحیح کام نہیں لے سکتا، تو اُس کی یہ صلاحیتیں ذیل کاموں میں صرف ہوتی ہیں، جن کی پہلی شکل تملق اور چاپلوسی ہے، اس کے ذریعہ وہ طبقہ بڑوں کی خوشامد کرتا اور اس طرح اپنی معاشی احتیاجات پوری کرتا ہے۔ یہی مرض آگے چل کر غیر اللہ کی عبادت کا موجب بنتا ہے۔ اس منزل میں نفس ناطقہ کے ذاتی خواص سارے تباہ ہو جاتے ہیں اور انسانیت فاسد ہو جاتی ہے۔ اس طرح کی مسخ شدہ انسانیت کو برباد کرنے کے قدرتی اسباب پیدا ہوتے ہیں، اسے ہم انقلاب کا نام دیتے ہیں۔

قرآن مجید میں انبیاء کے جو قصے ہیں، وہ اسی قسم کے انقلاب کا ایک نمونہ پیش کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک عالمگیر انقلاب کے داعی تھے جس کا ایک مثالی نمونہ آپؐ نے اپنی زندگی میں سرزمین حجاز میں قائم کر کے دکھایا۔ آپؐ کے بعد آپؐ کے صحابہؓ اس انقلاب کے دائرے کو اور وسیع کرتے ہیں۔ اور اُن کے عہد میں وہ سلطنتیں جو فسادِ انسانیت کا باعث تھیں، ختم ہو جاتی ہیں، اور صحت مند انسانیت کا کارواں آگے بڑھتا ہے۔

شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی کتابوں میں آپ کو اسلام کے اس تاریخی کردار کے بارے میں اس طرح کے افکار ملیں گے، جنہیں وہ اپنی کتابوں میں بار بار بیان کرتے ہیں۔ شاہ صاحب کے نزدیک انبیاء کا کام فسادِ انسانیت کو ختم کر کے صالح انسانیت کے لئے سازگار حالات پیدا کرنا ہوتا ہے۔ اور اس لحاظ سے وہ ائمۂ انقلاب ہوتے ہیں۔ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام سب سے بلند ہے اور وہ اس لئے کہ آپؐ کی دعوت سب سے زیادہ عالمگیر ہے۔

اب ایک طرف آپ کو حضرت شاہ صاحب کی کتابوں میں یہ افکار ملتے ہیں اور دوسری طرف وہ اُن مفاسد کا ذکر کرتے ہیں، جو اُن کے زمانے میں عام ہو گئے تھے اور جنہوں نے انسانیت عامہ کو خراب کر دیا تھا، اس سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ شاہ صاحب کے نزدیک ان مفاسد کا علاج وہی ہے جو اس سے پہلے انبیائے کرام کے ذریعہ ہو چکا ہے اور جس کا ایک اعلیٰ نمونہ اسلام کا وہ تاریخی کردار ہے جو عہد نبوی اور دورِ خلافتِ راشدہ میں وجود میں آیا۔ اسے ہم شاہ ولی اللہ کا نظریۂ انقلاب کہتے ہیں۔

اب ہم شاہ صاحب کی کتابوں سے اُن کے ان افکار کا مختصر خلاصہ پیش کرتے ہیں:۔

حجۃ اللہ البالغہ دوم میں ارشاد ہوتا ہے۔

"معلوم[1] ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے جب زمین پر اپنی مخلوق پیدا کی، تو اُن کی معاش و روزی بھی زمین پر مقرر کی اور زمین کی اشیاء سے انتفاع اُن کے لئے مباح اور جائز گردانا۔ اور چونکہ حرص و آز کی وجہ سے اُن کے نزاعات و جھگڑے ہونے لگے، تو حکم الٰہی یہ قرار پایا کہ کوئی انسان دوسرے انسان کی مخصوص و مختص چیز میں کسی قسم کی مزاحمت و مداخلت نہ کرے ....

"نیز چونکہ انسان مدنی الطبع واقع ہوا ہے اور بلا باہمی تعاون کے انسان کی معاشی و معاشرتی تعمیر کی استقامت ناممکن ہے، اس لئے قضائے الٰہی نے انسانوں کے لئے باہمی تعاون واجب اور لازم کر دیا۔ نیز چونکہ نوع انسانی کا کوئی فرد بلا کسی سخت مجبوری کے تمدنی و عمرانی اور تمدنیات و عمرانیات کے دخل و اثر سے علٰحدہ بے تعلق اور بے اثر نہیں رہ سکتا اور اس کا اصل اور حقیقی سبب اور وجہ یہی ہے کہ ہر انسان کے لئے اپنے مباح مال کا تحفظ ناگزیر ہے۔ نیز اس مال مباح کا جو ہر انسان کے لئے مخصوص اور مختص ہو چکا ہے جس کے ذریعہ ہر انسان اپنی امداد و استعانت کرتا ہے، نمو اور اضافہ بھی ضروری ہے ...."

اب اس مال میں نمو اور اضافہ شاہ صاحب کے الفاظ میں "بلا باہمی تعاون معاشی کے متعذر اور محال ہے۔ اور اس تعاون کے کچھ ایسے طریقے ہیں کہ جن کے بغیر شہری زندگی کی استقامت متغیر اور دشوار ہو جاتی ہے ......" اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے۔ "میں کہتا ہوں، اس کی حقیقت وہی ہے جس کی طرف ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کا مال اور ملکیت ہے ...... اور کسی انسان کی ملکیت کے معنی یہ ہیں کہ اس چیز سے انتفاع کا حق سب سے زیادہ اس کو ہے، دوسرے کو نہیں ......"

پھر فرماتے ہیں:۔ "میں کہتا ہوں۔ اصل اس بارے میں یہ ہے کہ جس مباح چیز میں بہت سے لوگوں کے حقوق علی الترتیب لازم ہوں، تو ایسی صورت میں واجب یہی ہے کہ ترتیب کی اسی قدر رعایت کی جائے کہ جس سے سب کو فائدہ پہنچے۔ اور یہ فائدہ ایسا ہو جو کم سے کم سمجھا جائے ......"

اس ضمن میں ایک حدیث بیان فرماتے ہیں اور وہ یہ ہے:۔

"آنحضرت صلعم نے ابیض بن حمال المآربی کو نمک کا ایک چشمہ دار قطعہ عطا کر دیا تھا، کسی نے عرض کیا یا رسول اللہ!

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ کے ان اقتباسات کا اُردو ترجمہ مولانا محمد اسمٰعیل گودھری مرحوم کے ترجمہ حجۃ اللہ البالغہ سے ماخوذ ہے۔ (مدیر)

آپؐ نے اس کو نہ ٹوٹنے والا "نہ ختم ہونے والا مادہ دے دیا۔ راوی کہتا ہے یہ سن کر آں حضرت صلعم نے وہ قطعہ اُن سے واپس لے لیا ——— میں کہتا ہوں' اس امر میں کسی شک کی گنجائش ہی نہیں کہ جن معاون اور کانوں میں زیادہ محنت و مشقت کی ضرورت نہ ہو' ایسی معادن اور کانیں کسی ایک مسلمان کو دے دینا عام مسلمانوں کے حق میں مضرت رساں ہے۔ اور اُن کے حق میں ایک قسم کی ضیق اور تنگی ہے۔ پس آنحضرت صلعم نے اس قطعۂ نمک کو ابیض بن حمال مآربی سے واپس لے لیا۔"

اس تمہید کے بعد حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں:۔

کسی شہر کے اندر مثلاً دس ہزار آدمی اجتماعی زندگی بسر کر رہے ہیں' اس وقت اس شہر کی مدنی شہری سیاست اور شہر کے باشندوں کے کسب اور پیشوں سے بحث ناگزیر ہوگی۔ وہ پیشے جن سے شہر کی معیشت متوازن نہ رہے' شاہ صاحب کے نزدیک فساد اور خرابی کا باعث ہوتے ہیں۔ اس صورت میں عطیۂ حکمتِ الٰہی کے مطابق معروف و مستحسن طریقوں پر معروف و مستحسن کسب اور پیشے اُن کے لئے لازم کر دیئے جائیں اور رذیل و خسیس پیشوں سے اُن کو روک دیا جائے تو شہری باشندوں کی حالت یقیناً درست ہو جائے گی۔

معاش کا یہ فساد شاہ صاحب کے نزدیک "شہر و ملک کے لئے ایسا متعدی ضرر رساں مرض اور روگ ہے کہ شہر اور ملک کے تمام گوشوں میں پھیل جائے گا اور اس طرح عام ہو جائے گا کہ تمام باشندوں کو اپنی زد میں لے لیگا۔ اور یہ مرض اور اس کا زہر شہر و ملک میں اس طرح جاری و ساری اور پیوست ہو جائے گا' جس طرح کسی کو کتا کاٹ لیتا ہے۔ اور اُس کے سارے جسم میں اس کا زہر سرایت کر جاتا ہے اور یہی وہ مہلک و خطرناک مرض تھا' جو عجمی ممالک میں بلائے بے درماں کی طرح تمام پر مسلط ہو چکا تھا' چنانچہ خدائے قدوس نے اپنے پیغمبر صلعم کو القاء فرمایا کہ اس مرض مہلک کا علاج کریں اور مرض کے اصل مادہ کا قلع و قمع کر دیں ......" (صفحہ ۲۸۲ - ۲۹۰)

گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا ایک مقصد معاشرے کے اُن مفاسد کا ازالہ بھی تھا' جو معیشت کے خراب طریقوں کی وجہ سے پیدا ہو چکے تھے۔

خود شاہ صاحب کے زمانے میں معاشرے میں اسی قسم کے جو مفاسد پیدا ہو چکے تھے' آپ نے اُن کا بھی ذکر کیا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"اس زمانے میں شہروں کی بربادی کے دو بڑے اسباب ہیں: ایک یہ کہ بعض لوگوں کی یہ عادت ہوگئی ہے کہ چونکہ وہ فوجی یا عہدے دار ہیں، اس لئے بیت المال پر اُن کا حق ہے۔ اور اس طرح اُن کا کسب معاش کا ذریعہ صرف بیت المال بن کر رہ گیا ہے۔ یا زہاد اور شعراء وغیرہ ہیں جن کو بادشاہوں کے صلہ کی عادت پڑ گئی ہے اور اپنی معاش کا ذریعہ صرف بیت المال ہی کو سمجھ بیٹھے ہیں، اور بغیر کسی خدمت کے بیت المال پر تکیہ لگائے بیٹھے ہیں۔ یہ اُن لوگوں کے ہاں جاتے ہیں اور اُن میں کبیدہ خاطری پیدا کرتے ہیں اور شہری آبادی پر بارگراں بن کر رہ جاتے ہیں۔

"دوسرا سبب یہ ہے کہ کسانوں، تاجروں، پیشہ وروں اور دست کاروں پر گراں بار ٹیکس لگائے جا رہے ہیں، اور اُن پر حد سے زیادہ سختی کی جاتی ہے جس سے اطاعت گزاروں پر مصیبت آتی ہے اور برباد ہو جاتے ہیں، اور وہ لوگ جو جری ہوتے ہیں، وہ حکومت کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ شہروں کی بہبود کا طریقہ یہی ہے کہ رعایا پر کم سے کم ٹیکس لگائے جائیں اور ضرورت کے مطابق محافظ و نگراں مقرر کیے جائیں۔ اہل زمانہ کو اس اہم نکتہ سے آگاہ ہونا چاہیئے۔ واللہ اعلم" (ص ۳۲ حصہ اول)

شاہ صاحب کا یہ فرمانا ولیتنبہ اھل الزمان بھذہ النکتۃ (اہل زمانہ کو اس اہم نکتہ سے آگاہ ہونا چاہیئے) اپنے دور کے ارباب حکم کے لئے ہے، اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب کی دعوت اُمور دین کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کی جملہ معاشی، سیاسی اور معاشرتی خرابیوں کی اصلاح پر بھی مشتمل تھی۔

رسول مقبول علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بدولت قیصر و کسریٰ کی سلطنتوں کے ختم ہونے کے معنی کیا تھے؟ شاہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ حصہ اول میں اسے یوں بیان کیا ہے:-

"آنحضرت صلعم کے عہدِ سعید میں وہ اقالیم صالحہ اور ممالکِ متمدنہ کہ جن میں معتدل مزاج کی تولید و پیداوار ہوا کرتی تھی، وہ دنیا کے دو بڑے زبردست بادشاہوں کے ماتحت تھے، ایک کسریٰ کہ عراق، یمن، خراسان اور اُن کے متصل کے تمام ممالک پر اس کا تسلط و اقتدار قائم تھا۔ اور ماوراء النہر اور ہندوستان کے تمام بادشاہ، راجہ اُس کے محکوم و باجگزار تھے۔ اور ہر سال اُنہیں کسریٰ کو ایک مقررہ خراج ادا کرنا پڑتا تھا۔

"دوسرا قیصر تھا۔ شام، روم اور اُس کے نواح کے تمام ممالک پر اس کا تسلط و اقتدار قائم تھا اور مصر، مغرب اور افریقہ وغیرہ کے تمام سلاطین اس کے زیر فرمان اور باج گزار تھے۔ ان دو زبردست شہنشاہوں کی دولت و طاقت کو توڑ دینا اور اُن کے ملک پر تسلط و اقتدار قائم کر لینا ایسا تھا گویا تمام روئے زمین پر تسلط و اقتدار قائم کر لیا گیا۔ ان سلاطین

کی غیر معتدل مرفہ الحالی اور مفرطانہ عیش پرستی کے جراثیم اور مہلک عادات و اطوار کی گندگیاں ان تمام ممالک میں سرایت کر چکی تھیں، جو اُن کے تسلط و اقتدار کے زیرِ فرمان تھے۔ اور تمام باشندے اُن کے رنگ میں رنگ چکے تھے۔ اس لئے اُمّی عادات و اطوار اور رسوم و رواجات کو تبدیل کر دینا اور اُن کو ان خطرناک مہلک جراثیم سے پاک صاف کر دینا گویا دنیا کے تمام ممالک کی اصلاح و درستگی تھی، اگرچہ بعد میں جا کر ان اُمور نے ایک دوسری شکل اختیار کر لی۔۔۔۔۔۔

"حاصل کلام یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جب یہ ارادہ کیا کہ ملت و دین کی کجی کو دور کیا جائے اور ایک ایسی اُمّت اور قوم تیار کی جائے، جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض پوری قوت سے انجام دے اور لوگوں کی فاسد رسوم کو یکسر تبدیل کر دے۔ تو یہ امر اس بات پر موقوف تھا کہ ان ہر دو بڑی سلطنتوں کو دنیا سے نیست و نابود کر دیا جاتا۔ اور اس مقصد کو سہولت و آسانی سے حاصل کرنے کے لئے ضروری تھا کہ ان ہر دو جابر سلطنتوں سے تعرض کیا جاتا۔ کیونکہ انہی دو سلطنتوں کے حالات تمام متمدن اور صالح ممالک میں سرایت کیئے ہوئے تھے، یا سرایت کرتے چلے جاتے تھے۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان ہر دو سلطنتوں کے زوال اور قلع قمع کا فیصلہ کیا اور خود آنحضرت صلعم نے اس کی خبر دی کہ ھلک کسریٰ ولا کسریٰ بعدہ وھلک قیصر ولا قیصر بعدہ (کسریٰ ہلاک ہوا اس کے بعد کوئی کسریٰ نہیں ہوگا، اور قیصر ہلاک ہوگیا اس کے بعد کوئی قیصر نہیں ہوگا)۔ اور حق اس طور پر نازل ہوا کہ روئے زمین سے باطل کی جڑیں اس طریقہ سے اُکھاڑ دی گئیں۔ آنحضرت صلعم اور آپ کے صحابہ کے ذریعہ عرب سے باطل کا قلع قمع کر دیا گیا۔ اور پھر عرب کے ذریعہ ان ہر دو جابر سلطنتوں کا قلع قمع کر دیا گیا اور پھر ان کے ذریعہ تمام عالم کی باطل طاقتیں توڑ دی گئیں اور دنیا سے باطل، نارواُ اُمور کا خاتمہ کر دیا گیا اور دنیا کو پاک و صاف کر دیا گیا۔ وللہ الحجۃ البالغہ۔۔۔۔۔۔"

ایک اور جگہ شاہ صاحب سلاطین عجم و روم کی بداعمالیوں کا مقابلہ اپنے دور کے بادشاہوں، رئیسوں اور امیروں سے یوں کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:۔

"معلوم ہونا چاہئے کہ سلاطینِ عجم و روم قرن ہا قرن سے سلطنتوں کے وارث چلے آ رہے تھے۔ اس لئے یہ لوگ سرتاپا دنیوی لذتوں اور عیش کوشیوں کے عادی ہو چکے تھے۔ آخرت کو بالکل فراموش کر چکے تھے۔ شیطان اُن پر پوری طرح غالب ہو چکا تھا۔ اور انہی اُمور کو انہوں نے مقصدِ حیات سمجھ لیا تھا۔۔۔۔۔۔ شدہ شدہ یہ حالت ہو گئی کہ وہ امیر، رئیس یا سردار جس کی کمر کی پیٹی اور تاج کی قیمت ایک لاکھ درہم سے کم ہوتی اس پر طعن و تشنیع کیا کرتے، اسی طرح وہ شخص جس کے پاس عالی شان محل، شاندار قصر و ایوان، حوض، حمام، باغات، خوبصورت قیمتی چوپائے، گھوڑے، حسین غلام و خدام اور لونڈیاں

نہ ہوتیں...... اس پر طعن و تشنیع کیا کرتے. اس قسم کے اُمور کا ذکر بہت طویل ہے. اور ان کی داستانوں کے دہرانے کی ضرورت ہی کیا ہے. اپنے ملک کے بادشاہوں، رئیسوں اور امیروں کا حال ہی دیکھ لو۔

"غرض اس قسم کے مہلک اور خطرناک اُمور ان لوگوں کی معاشرت کے اُصول اور جزو زندگی بن گئے تھے اور ایسی خطرناک شکل اختیار کر لی تھی کہ اُن کے دلوں کے ٹکڑے کر دیئے جاتے تب بھی اُن کے دلوں سے ان کا نکلنا دشوار تھا. شہر و ملک کے تمام اطراف و جوانب میں یہ لاعلاج امراض اس طرح پھیل گئے تھے کہ لوگ ایک عام مصیبت میں گرفتار ہو گئے تھے...... تمام کے دامن اس سے اُلجھ گئے تھے اور تمام کو عاجز و مغلوب کر کے رکھ دیا تھا......"

"(آخر میں) جب دنیا میں یہ عظیم ترین مصیبت عام ہو گئی اور یہ مہلک و خطرناک مرض نہایت سخت ہو گیا. روم و عجم کے تمدن غیر صالحہ نے دنیا کی کمر توڑ دی، تو اُن پر اللہ تعالےٰ اور اُس کے ملائکہ مقربین کی ناراضگی ظاہر ہوئی. اُس وقت اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اسی میں تھی کہ اس مہلک مرض کا علاج کیا جائے...... اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کر دیا کہ پیغمبر صلعم کی سلطنت قائم کر کے عجمیوں کی سلطنت ختم کر دی جائے اور یہ شکل اسی طرح وقوع پذیر ہوئی کہ ھلک کسریٰ ولا کسریٰ بعدہٗ وھلک قیصر ولا قیصر بعدہٗ۔

شاہ صاحب نے "البدور البازغہ" میں معاشی فراغت (ترفہ) میں ایک حد اعتدال قائم کرنے کی تلقین کی ہے. فرماتے ہیں. "اس کے بارے میں دو متعارض قیاس ہیں، ایک یہ کہ معاشی فراغت اچھی چیز ہے. طبیعت اس کا تقاضا کرتی ہے. اس سے مزاج، دماغ اور دل صحیح رہتا ہے، اخلاق اور علوم اس کی وجہ سے استقامت اختیار کرتے ہیں اور یہ کہ تمام کند ذہنی اور بد خلقی، بُرے کھانے اور دوسری بُری تدابیر کا نتیجہ ہوتی ہے. نیز ذہانت، نیک خلقی اور لطف و مروت صحت مند تدبیروں کا حاصل ہے. اس ضمن میں دوسرا قیاس یہ ہے کہ معاشی فراغت بُری ہے کیونکہ اس کی وجہ سے جھگڑے ہوتے ہیں اور انسان دوڑ دھوپ میں پڑ کر آخرت سے مُنہ موڑ لیتا ہے[۱]"

شاہ صاحب ان دونوں پہلوؤں کا ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ معاشی فراغت یعنی رفاہیت میں حد اعتدال ہی اچھی چیز ہے. جس سے کہ انسان جملہ خوبیوں کو حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ خرابیوں سے بچا رہے. رفاہیت میں افراط و تفریط دراصل معاشی ناہمواری سے پیدا ہوتی ہے اور یہی تمام خرابیوں کی جڑ ہے۔

---

[۱] البدور البازغہ صفحہ ۵۵-۵۶

آج کل کے سیاسی نظاموں میں اہل علم صرف ایک امیر کی اطاعت کو مرکزیت کے لئے ضروری نہیں سمجھتے، اُنکے نزدیک اس سے خرابیاں پیدا ہونے کے زیادہ امکانات ہیں۔ شاہ صاحب اس کا علاج یہ تجویز کرتے ہیں کہ ایک "بورڈ" ہو، جس کے ارکان کے ہاتھ میں الگ الگ اختیارات ہوں۔ جہاں تک میری معلومات ہیں میں نے کسی مذہبی عالم کے ہاں اس طرح کا فکر نہیں پایا۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ ایک کامل ریاست میں جس میں بہت سے افراد ہوتے ہیں، نظام قائم رکھنے کے لئے ایک ایسا آدمی ہونا چاہئے جو اکیلا سب اُمور کی کفالت کرے، اور وہ "الامام الحق" ہوتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ارشاد ہوتا ہے "وقلّما یوجد ذٰلک" اور ایسا آدمی کم ہی ملتا ہے چنانچہ اکثر دو تین امور ایک آدمی کی تحویل میں ہوتے ہیں۔ اور باقی اُمور دوسرے کے پاس (البدور البازغہ ص۲۳)۔

شخصی حکومت کے بجائے عقلائے قوم کی حکومت کی یہ تجویز پارلیمنٹری نظام کا نقطہ آغاز ہو سکتی تھی، کاش اس وقت اس کی طرف توجہ کی جاتی۔

"اقترابات" جن سے مراد قرب الٰہی کے حصول کے ذرائع اور "ارتفاقات" جو عبارت ہیں معاشی، سیاسی و اجتماعی تدابیر سے، شاہ صاحب کے نزدیک اسلام ان دونوں کے لئے صراط مستقیم پیش کرتا ہے۔ اُس نے قیصریت وکسرویت کو ختم کر کے "ارتفاقات" میں راہِ وسط پیدا کی، اور ہر قسم کے شرک کی تردید کر کے "اقترابات" کا صحیح مقام معین کیا۔ شاہ ولی اللہ صاحب کی حکمت آفریں طبیعت کا یہ خاص کمال ہے کہ اُنہوں نے اِس دَور میں اسلام کی اس ہمہ گیر روح کو بے نقاب کیا۔ ایک تو اُنہوں نے روحانی زندگی و مادّی زندگی (اقترابات اور ارتفاقات) کے ایک وحدت ہونے کا اثبات کیا، اور بتایا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا ایک مقصد معاشی ناہمواریوں کا خاتمہ کرنا بھی تھا۔ دوسرے اُنہوں نے تمام مذاہب کے مشترک مبادی معین کیئے اور اس طرح مسلمانوں کے سامنے از سرِنو وہ تمام ذہنی وسعتیں بے نقاب کیں، جو صدیوں سے اُن کی نظروں سے اوجھل تھیں۔

یہ اساسی نظریہ ہے شاہ ولی اللہ صاحب کی اُس دعوت کا جسے میں اُن کی "دعوتِ انقلاب" کا نام دیتا ہوں۔

حرمین شریفین کی علمی شخصیتیں

مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی [۱]

مسجد الحرام کا تعلیمی نظام مسجد الحرام اور مسجد نبوی اسلام کے ابتدائی دور ہی سے دین کی اشاعت کے مراکز اور منبع رہے ہیں اُن کی یہ علمی مرکزیت آج تک کسی نہ کسی صورت میں صدیوں سے برابر چلی آرہی ہے۔ میں نے مکہ مکرمہ میں اپنے قیام کے دوران مسجد الحرام کے مدرسین اور تعلیمی نظام کا بھی مطالعہ کیا، اس سلسلہ میں مجھے جو معلومات فراہم ہوئیں وہ قارئین کی نذر ہیں۔۔

جزیرۂ عرب میں تیل اور دوسرے معدنی ذخائر نکلنے کی وجہ سے جو مرفہ الحالی آئی ہے اس سے پہلے حرم میں تعلیم وتدریس کے لئے کوئی خاص منہج یا نصاب تعلیم نہ تھا، نہ حکومت کی طرف سے مدرسوں کو کوئی باقاعدہ تنخواہ ملتی تھی، اور نہ طلبہ سے کوئی فیس ہی لی جاتی تھی۔ تعلیم حسبۃً للہ دی جاتی تھی۔ حجاز میں سعودی حکومت کے ابتدائی دور یا اس سے پہلی حکومتوں کے دور کے معظم علماء کی سوانح حیات کو دیکھا جائے تو انہوں نے دارِ آخرت کی طرف رحلت کے وقت ذکرِ خیر کے سوا کچھ نہ چھوڑا۔ کسی نے کیا اچھا کہا ہے۔ "والذکر للانسان عمر ثانٍ" یعنی ذکرِ خیر انسان کے لئے ایک دوسری زندگی ہے۔ مدرسہ صولتیہ مدرسہ فخریہ، مدرسۃ الفلاح، المدرسۃ الراقیہ وغیرہا سب حرم کی تعلیم کی بدولت وجود میں آئے، ان مدارس کے قائم کرنے والے حرم کی تعلیم سے مستفید ہو کر نکلے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ حکومت کی طرف سے اس سلسلے میں بالکل بے توجہی ہوتی تھی، حکومت اپنی بساط کے مطابق علماء اور مدرسین حرم کی کچھ نہ کچھ اعانت بھی ضرور کرتی تھی، لیکن اکثر فاضل مدرسین ثواب کی خاطر ان چیزوں سے مستغنی رہتے تھے۔

حرم کے جملہ مدرسین، ائمہ، مؤذنین اور مطوفین کی نگرانی کے لئے حکومت کی طرف سے ایک مفتش ہوتا ہے، تقریباً چالیس سال قبل اس جلیل القدر عہدہ پر ایک سندھی عالم فائز تھے، جن کا نام شیخ محمد کامل سندھی تھا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کی زندگی کے حالات پر چند سطور تحریر کی جائیں۔

شیخ محمد کامل سندھی کی ولادت مکہ مکرمہ میں ہی ۱۲۹۵ھ میں ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ آل اعلام سندھ کی اولاد

---

[۱] مولانا کے سفرِ حجاز کی یہ تیسری قسط ہے۔

سے تھے جنہوں نے ایک دو صدی پہلے حجاز کی طرف ہجرت کی تھی۔ محمد کامل سندھی علماء کے نقیب اور حرم کے مدرسین ائمہ، مطوفین اور خدام حرم کے منتش تھے، انہوں نے وقت کے متبحر علماء جیسے شیخ محمد صالح کمال، شیخ محمد سعید بابصیل اور شیخ عبدالرحمن دہان سے تعلیم پائی۔ ان کے ایک زائر نے شیخ کا حال بیان کیا ہے وہ لکھتے ہیں۔ شیخ طویل قامت، معتدل جسم اور گھنی داڑھی والے تھے۔ وہ اپنے فرائض کی بجا آوری میں نہایت مستعد رہتے تھے، وہ حرم کے مدرسین کی دیکھ بھال کرتے، اسی طرح ائمہ اور مؤذنین میں سے جو غیر حاضر ہوتا اُس پر نگاہ رکھتے اور طواف کی جگہ پر کھڑے ہو کر مطوفوں اور معلموں کی دعائیں سُنتے اور ان کی نحوی اغلاط کو درست کرتے تھے، اس معاملہ میں وہ اتنے سخت تھے کہ کسی مطوف کو طواف کرانے کی اجازت ہی تب دیتے تھے جب وہ اُس سے صحیح ادعیہ سُن لیتے۔ وہ خود بھی اچھے مدرس تھے۔ حرم میں فقہ حنبلی اور نحو کی کتابوں کا درس دیتے تھے، جس نے اس دور کو پایا اور حرم کے درس کو بھرا ہوا دیکھا ہے، اس نے شیخ محمد کامل سندھی کو اُون کا جبہ پہنے ہوئے اور سر پر پگڑی یا عمامہ باندھے ہوئے درس کے وسط میں ضرور دیکھا ہوگا۔ وہ ہمیشہ اسی ایک ہیئت میں رہتے تھے۔ شیخ محمد کامل سندھی نے ۱۳۵۳ھ میں وفات پائی اور اپنے پیچھے تین لڑکے چھوڑے۔ ۱۔ شیخ عبدالسلام مراقب عام ادارہ حرم۔ ۲۔ شیخ عبداللہ موظف مجلس وزارت، ۳۔ شیخ سعید موظف وزارت داخلیہ[1]

اس وقت حرم میں تعلیم و تدریس کی پہلے سے زیادہ نگرانی ہو جاتی ہے اور خاص طور سے سلفیہ مسلک رکھنے والے علماء کو ترجیح دی جاتی ہے۔ لیکن پھر بھی حرم کے مدرسین میں سے جو اعلم حجاز کہلاتے ہیں اور جن کا علمی معیار بلند اور تحقیق و تدقیق عالمانہ ہے وہ سب پُرانی تعلیم کے فیض یافتہ اور حنفی، مالکی یا شافعی فقہ کے پابند ہیں۔ جیسے سید امین کتبی حنفی، سید حسن مشاط شافعی اور سید علوی مالکی ہیں، ان کے علاوہ حرم کے جو دوسرے مدرس ہیں ان میں شیخ حمزہ عبدالرزاق کا بڑا بلند علمی مقام ہے، وہ اکثر قرآنی حقائق پر تبصرہ کرتے رہتے ہیں، دو تین مرتبہ مجھے ان کے درس میں بیٹھنے کا شرف حاصل ہوا، سلفی مسلک رکھتے ہیں اور ان کا بڑا اچھا مطالعہ ہے؛ میرے استاذ امام عبیداللہ سندھی کے معتقد ہیں۔

اپنے پاکستانی اور ہندوستانی علماء میں سے مولانا خیر محمد صاحب ساکن ٹھل حمزہ ریاست بھاولپور، مولانا عبدالحق صاحب بہاولپوری اور مولانا عبداللہ صاحب لکھنوی بھی حرم میں حسبۃً للہ تعلیمی خدمت ادا کر رہے ہیں۔

مولانا خیر محمد صاحب کافی مدت سے جوار حرم میں مقیم ہیں۔ ایک روز ان کے درس قرآن میں بھی حاضر ہوا عباد...

---

[1] دروس من ماضی التعلیم وحاضرہ للشیخ عمر عبدالجبار ص ۲۲۱

طاعت اور ریاضت نے ان کو نڈھال کر دیا ہے، کچھ معتقدوں نے ان کو سہارا دے کر بٹھایا، لیکن جب آپ کا درس قرآن شروع ہوا تو وہ کمزوری جاتی رہی، ان کے ایک ایک لفظ سے ایمانی قوت، تقویٰ اور سادگی ٹپک رہی تھی۔ تیس سال پہلے میں نے مولانا خیر محمد صاحب کو ان کے گاؤں ٹھل حمزہ میں دیکھا تھا، وہاں مولانا کی بدولت ایک بڑا مدرسہ قائم تھا جہاں کئی منتہی شاگرد تعلیم پا رہے تھے اور مولانا کی سادگی کا یہ عالم تھا کہ شاگردوں کے لئے گھروں سے کھانا خود لے آتے تھے، آپ درس سے فراغت کے بعد اپنی بھینسیں اور گائیں خود چرانے جاتے تھے۔

مولانا عبدالحق صاحب بہاولپوری کا حلقۂ درس کافی بڑا رہتا ہے، حدیث کا درس دیتے ہیں اور نہایت ہی سادہ مزاج اور پرہیزگار عالم ہیں۔ سلفیہ مسلک رکھتے ہیں لیکن تعصب نام کو بھی نہیں۔ مولانا پڑھانے سے زیادہ لکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ علم حدیث میں کئی کتابیں تالیف فرمائی ہیں۔

مولانا عبداللہ صاحب لکھنوی اچھے محدث اور حسن اخلاق کا مجسمہ ہیں۔ ان سے کئی مرتبہ علمی ملاقاتیں ہوئیں حرم میں بھی اور دار الحدیث خیریہ میں بھی۔ ان کے درس کا بھی بڑا حلقہ رہتا ہے۔

پاکستانی علماء میں سے ایک صاحب مولانا امان اللہ پشاوری ہیں خوب طاقتور اور قدآور، ان کی اپنی زبانی معلوم ہوا کہ عرصہ پندرہ سال سے جوار حرم میں مقیم ہیں۔ یہ بزرگ اُردو میں حرم کے اندر وعظ و تبلیغ کرتے رہتے ہیں، بڑی اونچی آواز میں بولتے ہیں۔ مغرب سے لے کر عشاء کی اذان تک اُن کی تقاریر کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

عرب علماء میں سے ایک نوجوان عالم شیخ علی بن زید رکن عراقی کے بالمقابل حدیث کا درس دیتے ہیں، اور زیادہ تر اپنے درس میں ردِّ بدعات پر زور دیتے رہتے ہیں، ان سے بھی ملاقات ہوئی اور علمی باتیں ہوئیں۔

ایک روز ایک انڈونیشی عالم شیخ عبدالقادر کے درس میں حاضر ہوا، ان کا حلقۂ درس نہایت وسیع تھا۔ شیخ عبدالقادر انڈونیشی زبان میں پڑھا رہے تھے۔ ان کو بڑا نحوی عالم مانا جاتا ہے، ان کے مستفیدین سب انڈونیشی شاگرد معلوم ہوتے تھے، ایک خاص چیز ان کے درس میں یہ تھی کہ درس سے فراغت کے بعد سب شاگرد شیخ سے مصافحہ کر کے جاتے تھے، دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ روزانہ کا یہی دستور ہے۔ اور یہ شافعی المذہب ہیں

جدہ میں شیخ محمد نصیف سے ملاقات

مکہ مکرمہ میں میں مناسک حج سے فارغ ہو چکا تھا اور وہاں کے علماء، صلحاء اور اکابرِ دین کی زیارتیں بھی ہو چکی تھیں، اب صرف مدینہ منورہ کی حاضری رہ گئی تھی، مجھے چونکہ

مشرق وسطیٰ کی سیاحت اور بیت المقدس کی زیارت کے لئے جانا تھا اس لئے ایک بار اپنے محترم رفیق پروفیسر ظہور احمد صاحب کی معیت میں شرق اردن کے سفارت خانے واقع جدہ میں عمان کا ویزا حاصل کرنے کے لئے جانا ہوا۔ وہاں ویزا حاصل کرنے میں یہ دقت پیش آئی کہ میں نے کراچی سے متحدہ عرب جمہوریہ (مصر) کا ویزا لے لیا تھا۔ اس کو دیکھ کر عمانی سفارت خانے والے مجھ کو مشکوک نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ ان سے غیر فصیح عام عربی زبان میں بات چیت کرنا بھی میرے لئے وبالِ جان بن گیا، دوسرے کچھ زائرین تھے ان کو تو ویزا مل گیا اور میرے لئے یہ شرط لگائی گئی کہ پاکستانی سفیر جب تک نہیں لکھے گا ویزا نہیں مل سکتا۔ یہ سُن کر مجھے بڑی مایوسی ہوئی۔ دفتری کاروبار کی وجہ سے میرا وقت ضائع ہو رہا تھا۔ پہلے تو میں نے اس کے لئے میمن صاحب سفیر پاکستان کو تکلیف دینا مناسب خیال نہ کیا اور سیکریٹریوں سے اس بارے میں کہا لیکن ہمارے سفارتی حکام ایسے لاٹ صاحب تھے کہ سوائے نہ کے ان کے ہاں اور کوئی جواب نہ تھا، لامحالہ میمن صاحب سے ملا۔ صاحب موصوف کی ہر دلعزیزی اور پاکستانی حجاج کے ساتھ ہمدردی کی کیا تعریف کروں، اُسی وقت میرے لئے خط ٹائپ ہوا جس کو لے کر میں عمانی سفارت خانے میں پہنچا اور ویزا حاصل کیا۔ اس سلسلے میں میں اپنے دوست قاری خیر محمد صاحب کی خصوصی معاونت کو بھی نہیں بھلا سکتا۔

جدہ میں دو دن قیام رہا اس موقع کو غنیمت پا کر عرب کے ایک مجیر اور علم دوست عالم شیخ محمد نصیف سے ملاقات کی۔ شیخ کے نام نامی سے تو میں پہلے سے آشنا تھا۔ عمر رسیدہ بزرگ ہیں کوئی نوے سال کے لگ بھگ ہونگے۔ متانت، سنجیدگی اور اخلاق کے مجسمہ ہیں، کافی دیر تک ان سے علمی باتیں ہوتی رہیں، مولانا بنوری صاحب کا بھی تذکرہ کیا پھر مخدوم محمد معین ٹھٹھوی سندھی اور ان کی کتاب "دراسات اللبیب" کے متعلق بھی اپنے تاثرات ظاہر فرمائے، موصوف چونکہ سلفی مسلک کے ہیں اس لئے دراسات کی تعالیق اور حواشی کے سلسلے میں میرے فاضل دوست نعمانی صاحب سے ناراض نظر آتے تھے۔ عربی دستور کے مطابق قہوہ اور چائے نوشی جاری رہی اور مذاق میں قہوہ کے بارے میں فرماتے تھے کہ یہ ہمارے ہاں کا "پان" ہے۔ کھانے کے لئے بھی اصرار فرمایا لیکن وقت کی گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے ہمیں معذرت کرنی پڑی۔ شیخ محمد نصیف صاحب کی بڑی اچھی لائبریری ہے۔ آپ نے منہاج السنۃ جدید ایڈیشن ج ۲ تالیف شیخ الاسلام ابن تیمیہ، الفوائد المجموعۃ فی الاحادیث الموضوعۃ، تالیف شوکانی اور دوسری کتابیں بھی مرحمت فرمائیں۔

ہمیں دو دن جدہ میں رہنا پڑا۔ پھر ہم مکہ مکرمہ واپس آ گئے، میں نے پاسپورٹ اپنے معلم محمد ہاشم منزہ صاحب

کے حوالے کیا، وہ اپنی بے حد مصروفیتوں کے باوجود جدہ گئے اور اپنی جیب سے ہوائی جہاز کا ٹکٹ ۲۶۵/- ریال میں جدہ سے عمان تک کا لے آئے، اب میرے لئے یہ ٹکٹ دکھا کر مدینہ منورہ جانا آسان ہوگیا ورنہ میری باری تب آتی جب چوتھے جہاز کے کراچی کی طرف واپسی میں صرف دس بارہ دن رہ جاتے، کیوں کہ میں چوتھے نمبر جہاز میں ہی آیا تھا اور اسی سے مجھے لوٹنا تھا، کسی دوسرے ملک کو جانے کے لئے بحری جہازوں سے آنے والے حجاج کو صرف ہوائی جہاز کے ذریعہ جانے کی اجازت ہوتی ہے۔ غرض یہ ٹکٹ دکھا کر مجھے مدینہ منورہ جانے کی اجازت مل گئی۔

مدینہ منورہ کو روانگی مکہ مکرمہ سے "خروج" کی اجازت ملتے ہی میں حرم میں طوافِ وداع کے لئے گیا، یہ طواف واجب ہے، اور کعبہ سے رخصت کا طواف ہے، اس موقع پر مجھے اپنے، اپنے خویش واقارب اور دوسرے احباب کے لئے جتنی دعائیں کرنی تھیں وہ سب پورے خلوص سے کیں۔ حرم سے جدائی کے وقت اس بندۂ آثم پر جو رقت طاری ہوئی وہ حد بیان سے باہر ہے۔

اب مجھ سے بس کا انتظار بھی نہ ہوسکتا تھا، کیونکہ بس تو تب جائے جب حجاج سے بھر جائے۔ آخر حکومت سے "تنازل" حاصل کیا اور اپنے معلم اور دوسرے احباب کو الوداع کہہ کر ٹیکسی کے لئے جیاد پہنچا۔ مدینہ جانے کے لئے میری عجلت کا یہ عالم تھا کہ میرے دو رفقاء میں سے پروفیسر سید فخر الحسن صاحب کو ان کی بوڑھی والدہ کی بیماری کی وجہ سے پہلے ہی مدینہ منورہ کی زیارت کے لئے جانے کی اجازت مل گئی اور وہ مدینہ چلے گئے تھے، لیکن پروفیسر ظہور احمد صاحب تاحال مکہ میں میرے ساتھ تھے وہ ہسپتال گئے ہوئے تھے۔ ان کے واپسی کا بھی انتظار نہ کرسکا تاکہ ان کو بھی الوداع کہوں۔ درحقیقت یہ کوئی میری خصوصیت نہ تھی، مکہ مکرمہ سے خروج کی اطلاع اس طرح ملتی ہے کہ حجاج جلدی میں سب کچھ بھول جاتے ہیں۔

غرض محلہ جیاد سے جدہ کے لئے تین ریال کرایہ دے کر ٹیکسی پر سوار ہوا، جیسے ہی جدہ کے بس اسٹینڈ پر پہنچا تو مدینہ منورہ جانے کے لئے ایک ٹیکسی تیار کھڑی تھی، جدہ سے مدینہ منورہ تک کا چھ ریال کرایہ دیا۔ یہ کرایہ حجاج کے لئے نہیں ہوتا، جیسے کہ میں پہلے بیان کرچکا ہوں، بلکہ مقامی لوگوں سے لیا جاتا ہے، میں چونکہ "ورقہ تنازل" حاصل کرچکا تھا اس لئے اب میری حیثیت بھی مقامی آدمیوں جیسی تھی۔

جدہ سے مدینہ منورہ تک ۴۲۵ کیلومیٹر کا فاصلہ ہے۔ ٹیکسی بڑی تیز چل رہی تھی، سڑک نہایت ہی عمدہ اور نئی بنی ہوئی معلوم ہوتی تھی، راستے میں کئی چھوٹی چھوٹی بستیاں نظر آئیں، ظہر کی نماز رابغ میں ادا کی۔ رابغ بحر قلزم پر ایک چھوٹی

سی بندرگاہ ہے۔ یہ شامی اور مصری حجاج کے لئے میقات احرام ہے۔ یہاں بدوی بچے اُبلے ہوئے انڈے بیچ رہے تھے دس قروش میں تین انڈے ملے۔ وہاں چائے نوشی بھی کی۔ رابغ کے بعد بدر کا مقام آیا، یہاں بھی قہوہ خانے تھے، کافی دیر تک وہاں ٹھہرے۔ معرکہ بدر جہاں واقع ہوا تھا وہ جگہ اس بستی سے مغرب کی طرف تھوڑے فاصلے پر ہے۔ وہیں شہدائے بدر کی قبریں بھی ہیں، عربوں نے دور سے ہمیں وہ جگہ بتائی۔ بدر سے آگے حمینیہ، مسجد، بیئر الراحۃ اور بیئر علی کی بستیاں آئیں، بیئر علی سے مدینہ منورہ صرف پانچ میل رہ گیا اور یہ وقت مغرب کا تھا لہذا مدینہ منورہ کی روشن بتیاں دور سے نظر آرہی تھیں۔ اس جگہ کو ذوالحلیفہ بھی کہا جاتا ہے۔ یہی وہ جگہ ہے جو اہل مدینہ کے لئے میقات ہے اور حجۃ الوداع کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھیوں رضوان اللہ علیہم نے یہیں احرام باندھا تھا۔ اب جیسے جیسے یثرب کی آبادی قریب آرہی تھی، شوق دیدار گنبد خضرا بڑھ رہا تھا۔ ؎

وعدۂ وصل چوں شود نزدیک ۔۔۔ آتش شوق تیز تر گردد

حدودِ شہر میں داخل ہوتے ہی معلّم کا تعیّن ضروری ہوگیا۔ یہاں مکہ مکرمہ کی طرح معلم کے تعین میں حجاج کو اختیار نہیں ہے، بلکہ ہر خطہ کے لئے معلم مقرر ہوتے ہیں۔ کراچی کے لئے شیخ حمزہ زلی معلم تھے، ہمیں اُن کو ہی اپنا معلم مقرر کرنا پڑا۔ حرم کے قریب ٹیکسی کو رکوا کر اُتر پڑا، شوقِ زیارت کا یہ عالم تھا کہ سامان اُتارتے وقت ایک بوری سامان کی (جسمیں اکثر امانتیں اور احباب مدینہ کے لئے کچھ تحائف تھے) ٹیکسی سے اُتارنا رہ گئی، بوری پر میں نے اپنا نام بھی نہیں لکھا تھا، جب حرم پہنچا تب سامان یاد آیا، لیکن اب تو رات ہو گئی تھی۔ معلّم کو خبر کی، اس نے بھی یہ عذر پیش کیا کہ اگر آپ کا پتہ لکھا ہوا ہوتا تو سامان مل جاتا۔ میں نے ٹیکسی کا نمبر بھی نوٹ نہیں کیا تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور اور اس کے شوفر کی یہ حالت تھی کہ جدہ سے لے کر مدینہ منورہ تک ریڈیو سنتے اور ہاتھ سے تالیاں بجاتے آئے تھے، نماز کی پابندی بھی ان لوگوں میں نہ تھی۔

صبح کو مسجد نبوی میں جا کر نماز با جماعت ادا کی اور صلوٰۃ و سلام پڑھا، اس وقت کی کیفیت قید کتابت میں نہیں آسکتی۔ اس کے بعد بس اسٹاپ پر چلا گیا، بیسیوں ٹیکسیاں اور بسیں کھڑی تھیں۔ وہاں پولیس کو بھی اطلاع دی۔ ان کی طرف سے بھی یہی جواب ملا کہ ڈرائیور کو شناخت کیجئے، لیکن بیسیوں آدمیوں میں شناخت کرنا مشکل ہو گیا۔ آخر دو گھنٹے کے انتظار کے بعد کیا دیکھتا ہوں کہ ایک صاحب کے ہاتھ میں وہی بوری سامان کی ہے اور اعلان کرتا پھر رہا ہے،

بڑی خوشی ہوئی کھویا ہوا سامان مل گیا، ڈرائیور اور شوفر کے متعلق جو میری بدگمانی تھی وہ جاتی رہی، حسن معاملگی اسی کا نام ہے، ظاہری تقویٰ میرے خیال میں کسی کام کا نہیں ہے۔

ملاقاتیں جمعہ کا روز تھا، میں ۳ گھنٹے پہلے "روضۃ من ریاض الجنۃ" میں پہنچ گیا، نماز سے فراغت کے بعد مولوی محمد قاسم اور مولوی حبیب اللہ صاحب بلوچستانی سے ملاقات ہوئی، یہ دونوں بزرگ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں درجہ عُلیا میں تعلیم پاتے ہیں۔ مولانا عبیداللہ صاحب صدر مدرس مظہرالعلوم کراچی نے انہیں پہلے ہی میرے متعلق اطلاع دی تھی۔ ان دونوں دوستوں کی وجہ سے فضلائے مدینہ اور مقامات متبرکہ اور آثار قدیمہ دیکھنے میں میرے لئے آسانی پیدا ہوگئی۔ اُسی روز عصر کے بعد جنّت البقیع گئے، جہاں حضرات عثمان، ابوسعید خدری، حلیمہ سعدیہ، امام نافع، امام مالک، آٹھ امہات المومنین، بنات النبیؐ، سیدہ خاتون۔ امام حسن، امام محمد باقر، امام جعفر صادق رضوان اللہ علیہم کے مزارات کی زیارت حاصل ہوئی۔ مزارات کیا تھے صرف معمولی نشانات باقی تھے، واپسی میں سندھ کے ایک درویش صفت عالم مولانا محمد کامل صاحب سے جو کہ پندرہ سال سے ترک وطن کرکے مع اہل و عیال جوار سرور کائنات میں سکونت فرما ہیں، اُن کے دولت خانے پر ملاقات ہوئی، مولانا موصوف صبر و شکر کے مجسمے ہیں، اب تو انہوں نے اپنا ایک مکان بھی بنوالیا ہے، لیکن اس سے قبل جن صعوبتوں کا ان کو سامنا پڑا آپ وہ سب بخوشی برداشت کرتے رہے، ان کے دوستوں سے معلوم ہوا کہ وہ کبھی مدینہ منورہ کی زندگی سے دل برداشتہ نہ ہوئے۔ مزدوری کرکے اپنا اور بچوں کا پیٹ پالتے رہے، اب بھی حجامتی کر رہے ہیں اور اس سے جو وقت بچتا ہے وہ کتابوں کے مطالعہ اور مسجد نبوی میں عبادت کرتے ہیں، میرے تو وہ قدیم دوست اور کرم فرما تھے، مدینہ منورہ میں وہ اکثر میرے ساتھ رہے۔

مدینہ منورہ کے مشاہیر علماء سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا، مولوی محمد قاسم اور مولوی حبیب اللہ متعلمان جامعہ اسلامیہ مدینہ کی رفاقت میں علامہ شیخ ابن باز پرو وائیس چانسلر جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے دولت خانے پر حاضر ہوا، شیخ ابن باز کے حسن اخلاق کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ موصوف کا پانچ ہزار ریال کا مشاہرہ ہے لیکن مہمانوں کا اتنا ہجوم رہتا ہے کہ سُننے میں آیا کہ اتنا مشاہرہ ہوتے ہوئے بھی مقروض رہتے ہیں۔

موصوف میرے ساتھ علمی گفتگو کرتے رہے۔ ان کو مملکت اسلامیہ پاکستان سے بھی بڑی ہمدردی ہے۔ پاکستانی علماء کی علمی سرگرمیوں کے متعلق بھی سوالات کرتے رہے۔ آپ نے سندھ کے قدیم محدثین اور علماء کی بڑی تعریف فرمائی۔

میں نے انہیں اپنی کچھ تالیفات بھی پیش کیں غرض موصوف نے جس کرمفرمائی اور حسن اخلاق کا مظاہرہ فرمایا وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مجھے یاد رہیگا۔ میرا ارادہ مشرق وسطیٰ کی سیاحت کا تھا علامہ موصوف سے میں نے اس کا تذکرہ کیا تو انہوں نے بکمال شفقت ایک خط دیا تاکہ اگر مجھے واپس حجاز آنا پڑے تو سفارت کی طرف سے کوئی رکاوٹ پیش نہ آئے۔ جزاہ اللہ خیر الجزاء

الحاج سید شیر محمد خلیفہ مولانا تھانوی کی زیارت مدینہ منورہ کے زندہ بزرگوں میں سب سے نمایاں شخصیت سید شیر محمد گھوٹکی والے سندھی بزرگ ہیں، عرصۂ دراز سے مدینہ منورہ ہجرت کر گئے ہیں۔ آپ کے ہاں ہر ملک کے علماء اور فضلاء زیارت کے لئے آتے ہیں، اور مسائل حج میں آپ کی شخصیت مستند سمجھی جاتی ہے۔ میرے لئے آپ کی ذات گرامی نا آشنا تھی، کیونکہ سید صاحب اپنے وطن گھوٹکی سندھ میں اپنے بڑے بھائی الحاج سید فخرالدین شاہ مرحوم خلیفہ ارشد مولانا اشرف علی کی معیت میں مدرسہ قاسم العلوم گھوٹکی چلاتے تھے۔ اس دور میں مدرسہ قاسم العلوم کا میں مدرس اوّل تھا۔ سید صاحب کی زیارت سے بڑا قلبی سکون حاصل ہوا۔ موصوف کی اس وقت ۸۳ سال عمر ہے اور اس پیرانہ سالی میں بھی اپنا خود کھانا پکاتے ہیں، حالانکہ اگر وہ چاہیں تو ان کی خدمت کے لئے بیسیوں معتقدین تیار ہیں، لیکن وہ اس کو اچھا نہیں سمجھتے۔

دوران گفتگو موصوف نے فرمایا کہ مجھے وہ زمانہ بھی یاد ہے جب استاذ العلماء مولانا قمر الدین نیوی، مولانا نظر محمد صاحب بھنگ والے سے تعلیم پاتے تھے۔ فقیہ سندھ مولانا محمد قاسم ساکن گڑھی یاسین کے متعلق فرمایا کہ ان میں حق طلبی اور انصاف کا مادہ تھا، اسی طرح فرمانے لگے کہ مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ نے سندھ کے مفتی مولانا عبدالغفور صاحب ہمایونی کی بڑی تعریف فرمائی ہے۔ میرے کچھ خطوط بھی سید صاحب کی معرفت آئے تھے ان کو حاصل کیا اور پھر ایک دوسرے سندھی مہاجر الحاج علی محمد خیاط سے ملاقات کی۔

الحاج علی محمد سندھی بھی عرصہ پندرہ سال سے ترک وطن کر کے مدینہ منورہ میں مع اہل و عیال سکونت پذیر ہیں، ان کا بڑا بھائی محمد بخش نامی بھی ان کے ساتھ ہجرت کر کے گیا تھا، لیکن چند سال کے بعد وہ اس لئے واپس آگیا کہ وہاں کے لوگوں کی وہابیت سے وہ متنفر تھا۔ لیکن الحاج علی محمد بڑے صبر اور شکر سے مدینہ منورہ میں زندگی بسر کر رہے ہیں جو ہر لحاظ سے قابلِ رشک ہے۔ الحاج علی محمد کی دکان مسجد نبوی کے بالکل قریب تھی اس لئے میں نے انہی کے ہاں رہنے کو پسند کیا۔

زیارتیں ۲؍جون کو جبلِ اُحد اور دوسری زیارتوں کا پروگرام بنایا، پہلے جبلِ اُحد گیا، جنگِ اُحد کی وجہ سے

اس جبل کی جو تاریخی اہمیت ہے وہ سب کو معلوم ہے، یہ جبل مدینہ سے شمال کی جانب تقریباً تین میل کے فاصلے پر ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح مورچہ قائم کیا تھا، اور کہاں پر پچاس تیر اندازوں کو متعین فرمایا تھا، اور پھر کس طرح پسپائی ہوئی، ان تمام چیزوں کو رفقاء کی رہنمائی میں غور سے سمجھتا رہا، حضرت حمزہؓ کے مزار کی زیارت بھی نصیب ہوئی، وہاں سے مسجد قبلتین گئے، پھر خندق کو دیکھا جہاں پانچ مسجدوں کی بھی زیارت کی، پھر مسجد قبا کو چلے گئے وہاں نوافل ادا کئے، مسجد قبا کے قریب بیرِ اریس کو بھی دیکھا۔ یہ وہ کنواں ہے جس کا پانی آنحضرت صلعم کی لعاب کی برکت سے میٹھا ہوا تھا اور حضور کی انگوٹھی حضرت عثمانؓ سے اس کنوئیں میں گر پڑی تھی، یہ تمام زیارتیں کرکے واپس آگیا، دوسرے دن مولوی محمد قاسم اور مولوی حبیب اللہ صاحبان کی رفاقت میں جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ گیا، جہاں جامعہ کے تلامذہ اور اساتذہ سے کافی دیر تک ملاقات رہی۔

جامعہ کے امین عام علامہ شیخ عبودی سے اگرچہ تھوڑی دیر کے لئے ملاقات ہوئی لیکن عمر بھر میں ان کی کرمفرمائی کو بھول نہیں سکتا، موصوف خالص علمی انسان اور کتابوں کے دلدادہ تھے، علمی جذبے کی بنا پر میری انہوں نے جو معاونت فرمائی اس کا بدلہ تو پروردگار سے ہی ان کو ملے گا۔ وہ اپنی موٹر پر بٹھا کر مجھے مسجد نبوی میں لائے۔

اسی روز شام کو بیرِ رومہ کو بھی دیکھا، پانی نہایت ہی میٹھا تھا، یہ تاریخی کنواں ہے جس کو حضرت عثمانؓ نے یہودیوں سے خرید فرما کر وقف کیا تھا، آج تک اس کا پانی میٹھا چلا آرہا ہے۔ یہاں ڈیری فارم بھی ہے اور اس کے پاس بڑا اچھا خوش کن باغیچہ ہے۔ یہ کنواں مدینہ منورہ سے شمال مغرب کی طرف تقریباً تین میل کے فاصلے پر ہے ؂

(عربی)

المسوّٰی من احادیث الموطا

امام ولی اللہ رح دھلوی

یہ کتاب دو جلدوں میں ہے۔ آج سے ۳۲ سال پہلے مکہ مکرمہ میں مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کے زیر اہتمام چھپی تھی۔ اس میں مولانا کے تشریحی حاشیے ہیں۔ ولایتی کپڑے کی نفیس جلد قیمت بیس۲۰ روپے۔ شاہ ولی اللہ اکیڈمی صدر حیدرآباد سے طلب کریں۔

دینی تعلیم میں اصلاح کی ضرورت،

مولانا منت اللہ قاسمی [1]

آج سے تقریباً سو سال پہلے ہندوستان میں ایک طرف تو انگریزی حکومت اپنے پنجے مضبوط کر رہی تھی۔ دوسری طرف عیسائی مشنریوں کا جال پھیلایا جا رہا تھا اور یوروپین مبلغین ہر طرف گھوم گھوم کر عیسائی مذہب کی تبلیغ کر رہے تھے، اسی زمانہ میں حکومت کو کچھ ایسے مسلمان بھی مل گئے جن کے نزدیک دینی اور دنیاوی ترقی کا مدار اسی پر تھا کہ نسل تو ہندوستانی رہے، لیکن ظاہر و باطن یوروپین ہو جائے۔ حکومت نے ایسے مسلمانوں سے پوری طرح کام لیا۔ غرض اس وقت غلامی کی زنجیریں مضبوط کی جا رہی تھیں۔ الحاد و بے دینی کی آندھی چل رہی تھی اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ پورا ملک عیسائی ہو جائے گا اور ہندوستان کو کبھی آزادی نصیب نہ ہوگی۔

اسی کے ساتھ دینی تعلیم کی مسندیں خالی ہو چکی تھیں اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب علیہ الرحمۃ کے علوم و معارف کے وارث بھی ختم ہوتے نظر آرہے تھے۔ ان حالات میں خدا کے ایک برگزیدہ کو دار العلوم کا خیال آیا۔ اور حضرت نانوتوی علیہ الرحمۃ نے فیصلہ کیا کہ اس وقت دین کی حفاظت اور مسلمانوں اور اُن کے آنے والی نسلوں کو باقی رکھنے کا کام ایک دار العلوم ہی انجام دے سکتا ہے۔ جہاں کتاب و سنت کی تعلیم ایسے نہج پر دی جائے کہ یہاں کے فارغین سلف کا نمونہ بن کر ملک کے کونہ کونہ میں پھیل جائیں۔ خود نجات پائیں اور دوسروں کو نجات کا راستہ بتلائیں۔

---

[1] مولانا منت اللہ صاحب قاسمی امیر شریعت بہار و اڑیسہ نے یہ بیان چند سال ہوئے، دار العلوم دیوبند کی شوریٰ کے سامنے پڑھا تھا، اس بیان میں جو تجاویز پیش کی گئی ہیں، حسن اتفاق سے شوریٰ نے حال ہی میں انہیں منظور کر لیا ہے۔ ایک نصاب کمیٹی بنائی گئی ہے جو نصاب میں ضروری ترمیم کرے گی۔ معلوم ہوا ہے شوریٰ نے دار العلوم دیوبند میں انگریزی کو بحیثیت ایک مضمون کے داخل نصاب کر لیا ہے۔ یہ بیان مدینہ بجنور سے ماخوذ ہے۔ (مدیر)

دارالعلوم اسی مقصد سے قائم ہوا اور آج تک اسی راہ پر چل رہا ہے۔ اور پورے یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہے اور آج پورے ملک میں انتہائی نامساعد حالات کے باوجود جو دین اور دینداری موجود ہے وہ دارالعلوم ہی کا طفیل ہے، اس لیے چوڑے ملک میں آج سینکڑوں مدارس ہیں جہاں مسلمانوں کی اولاد خدا کا دین سیکھتی ہے، دارالعلوم ہی کے فارغ التحصیل حضرات کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آزادی کے بعد اس ملک میں علماء اور دینداروں کی جماعت برادران وطن کی نگاہوں میں بھی عزت کا مقام رکھتی ہے۔ یہ صرف اسی لئے کہ حضرت نانوتویؒ حضرت گنگوہی علیہ الرحمۃ، حضرت شیخ الہندؒ اور دوسرے اکابر اور دارالعلوم کے موجودہ شیخ نے صرف درس وتدریس کا کام انجام نہیں دیا بلکہ یہ حضرات جنگ آزادی۔ کے بھی ہیرو ہیں، اگر دارالعلوم اور اس کے فضلائے جنگ آزادی میں پورا حصہ لیا ہوتا تو آج ہندوستان میں علماء کی وہی حالت ہوتی جو انقلاب کے بعد ترکی یا دوسرے ممالک میں ہوئی۔

دارالعلوم نے ہمیشہ ملک کے حالات کو کتاب وسنت کی روشنی میں دیکھا ہے۔ ملک کی ہر تحریک اور ہر اقدام کا اسی نقطۂ نگاہ سے جائزہ لیا ہے اور پھر اس میں شرکت ہی نہیں کی ہے بلکہ اس کی رہنمائی کی ہے۔ دارالعلوم کی پالیسی کبھی جامد نہیں رہی ہے اس نے ہمیشہ ترقیاتی منصوبوں کا ساتھ دیا ہے۔ بشرطیکہ وہ اس کے مقصد کے معاون ہوں یا کم ازکم معارض نہ ہوں اور مجھے یقین ہے کہ آج بھی دارالعلوم ہر جدید کو اسی شرط کے ساتھ لبیک کہے گا۔

دین کی تعلیم واشاعت کا سلسلہ خیر القرون سے آج تک جاری ہے لیکن علوم، طریقۂ تعلیم اور کتب درسیہ ہر زمانہ میں مختلف رہیں۔ اور یہ اختلاف مسلمانوں کے ماحول، ملک کے حالات اور رجحانات کے تابع رہا۔ بہت سے علوم وفنون خیر القرون میں مدون ہی نہیں ہوئے تھے یا اس دور میں اس کی تعلیم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ منطق، فلسفہ، ہیئات، اور علم معانی کی ترتیب وتہذیب بعد میں ہوئی۔ اصول فقہ کی تعلیم امام شافعیؒ کے زمانہ سے شروع ہوئی۔ دوسری صدی ہجری کے نصف تک تعلیم کا طریقہ زبانی روایت واملا تھا جو علامہ سیوطیؒ اور . . . . تک جاری رہا۔ ایک زمانہ میں مختلف ملکوں کے طریقہ تعلیم میں بھی فرق تھا۔ اندلس میں پہلے قرآن مجید پڑھاتے اور اس کے بعد اشعار اور فن انشاء کے مسائل بتلاتے۔ افریقہ میں قرآن کے ساتھ حدیث کا درس دیتے۔ ابوبکر ابن العربی نے تعلیم کا کچھ اور طریقہ اختیار کیا اور اسی زمانہ

کے طریقۂ تعلیم پر کہ پہلے قرآن پڑھایا جائے یا دو علوم ایک ساتھ پڑھائے جائیں توجہ کی۔ کتب درسیہ میں تو بہت زیادہ تبدیلی ہوتی رہی۔ پہلے امام محمدؒ کی کتابیں داخل درس تھیں پھر ابوزید دبوسی اور بزدوی کی تصانیف کا رواج ہوا۔ پھر ابن السمعانی کی کتاب البدایہ تمام مدرسوں میں جاری ہوئی اس کے بعد ہدایہ، شرح وقایہ نصاب میں داخل ہوئیں۔ یہی حال ادب، علم کلام اور فن منطق وغیرہ کا رہا۔ لیکن ایک بڑا فرق یہ ہے کہ متقدمین اس کو محض آلہ اور ذریعہ کی حیثیت سے پڑھاتے تھے، متاخرین نے اس کو مستقل علم بنا لیا ہے اور مقصودیت کی شان پیدا کر دی ہے۔

ہندوستان میں ملا نظام الدین نے پچھلے تمام طریقوں سے ہٹ کر ایک نیا نظام اور نصاب درس بنایا جسے قبول عام حاصل ہوا، لیکن خود ملا صاحب نے درس نظامی سے ہٹ کر طلباء کو فصوص الحکم اور بخاری شریف کا درس دیا اور ملا صاحب کے بعد صحاح ستہ، ملا حسن، حمداللہ، قاضی مبارک، غلام یحیٰی وغیرہ درس نظامی میں داخل کی گئیں اور آج تک پڑھائی جاتی ہیں۔

غرض ہر دور میں وقت کی ضرورت اور زمانہ کے حالات کے مطابق نظام تعلیم اور نصاب تعلیم میں تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ آج بھی وقت کا اہم ترین تقاضا ہے کہ تعلیمی نصاب پر دوبارہ غور کیا جائے اور خصوصاً تقسیم ہند کے بعد جو نئے حالات پیدا ہوئے ہیں نظام تعلیم میں اُن کا پورا لحاظ رکھا جائے۔

میرے خیال میں اس مسئلہ پر غور کرتے وقت حسب ذیل اُمور کو سامنے رہنا چاہیئے:۔

(۱) ہر طالب دین کو عربی زبان اور عربی نصاب کے ذریعہ دین سکھلانا، نہ صرف یہ ضروری نہیں بلکہ اکثر اس طریقہ کار سے علوم دینیہ کا استخفاف ہوتا ہے۔ علم اور علمی جماعت کی ساکھ پر سخت ضرب پڑتی ہے جیسا کہ ان دنوں عام طور پر مشاہدہ ہو رہا ہے۔ ہر طالب علمِ دین کو میزان سے بخاری شریف تک پڑھانا اُستاد اور طالب کے وقت اور قوم کے روپئے کو ضائع کرنا ہے۔ اس کا نتیجہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ دین اور مدارس دینیہ کا اعتماد لوگوں کی نظر میں کم ہو جائے۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ ایک ایسا نصاب تیار کیا جائے جس میں مادری زبان کے ذریعہ طلباء کو دینی تعلیم دی جائے اور پھر ان میں سے طلباء کا انتخاب کیا جائے اور انہیں عربی نصاب کے ذریعہ دین کی تعلیم دی جائے۔

(۲) نصاب تعلیم کا محور اور مرکز قرآن، حدیث اور فقہ ہو اور جو کچھ بھی پڑھایا جائے وہ انہیں کو جاننے اور سمجھنے کے لئے۔

(۳) نصاب میں ایسی کتابوں کو نظرانداز کر دیا جائے جن میں اصل مسئلہ سے قیل و قال ہو یا طرز ادا مشکل اور پیچیدہ ہو، لیکن

نئی کتابوں کے انتخاب کے وقت یہ امر پیش نظر رہے کہ قدماء کا مقصد قرآن و حدیث کی خدمت تھا، اس لئے انہوں نے علوم کی ایجاد و ترتیب، اور کتابوں کی تصنیف اسی نظریہ سے کی ہے۔ لیکن ان دنوں مصر وغیرہ میں مصنفین کا مقصد زبان عربی اور مختلف علوم جدیدہ کی براہ راست خدمت ہے، اس لئے جدید تصانیف بالعموم اسی نظریہ کے ماتحت ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی کتابیں دینی نصاب تعلیم کے لئے کچھ زیادہ کارآمد نہ ہونگی۔

(۴) سیرت نبویؐ اور خلفاء راشدین کی سوانح کو اسلام میں آئینی حیثیت حاصل ہے اور ضروری ہے کہ ایک عالم کی نظر پوری اسلامی تاریخ پر گہری ہو۔ اس لئے تاریخ اسلام کو داخل نصاب کیا جائے اور وہ پہلو اجاگر کیئے جائیں جن کی اس زمانہ میں سخت ضرورت ہے۔

(۵) منطق اور فلسفہ کی کتابیں اسی قدر داخل نصاب ہوں جس سے اس فن کے مصطلحات پر عبور ہو سکے اور متاخرین کے علمی ذخیرے سے استفادہ میں دقت نہ ہو۔

(۶) موجودہ علم کلام ان شبہات کا جواب دیتا ہے جو یونانی فلسفہ نے پیدا کئے تھے۔ اب اعتراضات اور شبہات کی نوعیت بالکل بدل چکی ہے۔ اس لئے علم کلام کی ایسی کتابیں پڑھائی جائیں جو دور حاضر کے پیدا کردہ اعتراضات اور شبہات کو دور کر سکیں۔

(۷) عربی ادب کی تعلیم اسی حد تک ہو جس سے قرآن و حدیث و فقہ اور اس سے متعلقہ علوم و فنون کو بے تکلف سمجھا جا سکے۔ عربی ہماری مذہبی زبان ہے۔ لیکن مادری زبان نہیں۔ عربی گفتگو اور تقریر و تحریر کی مشق پر زیادہ زور دینا طلباء کو ایک ایسے کام پر لگانا ہے جو دارالعلوم کی چہار دیواری سے آگے نہیں بڑھ سکتا، عربی تحریر و تقریر کی ساری مشق گھر جا کر ختم ہو جائے گی جہاں برس ہا برس اور اکثر فارغین کو زندگی کی آخری سانس تک نہ کوئی عربی بولنے والا ملے گا اور نہ سمجھنے والا۔ ہاں مادری زبان میں تقریر و تحریر کی مشق پر زور دیا جائے کہ یہی زبان دین کی اشاعت اور علوم کی ترویج کا ذریعہ ہے ہاں نصاب میں اس کی گنجائش ضرور رکھی جائے کہ اگر کچھ طلباء فراغت کے بعد علوم و فنون میں جن میں ایک عربی ادب بھی شامل ہے مہارت حاصل کرنا چاہیں تو انھیں اس کا موقع حاصل ہو۔

(۸) علم جغرافیہ، فلسفہ جدید اور سائنس کی بھی ایسی کتابیں رکھی جائیں جس سے طلباء کو اس فن کی عام اور ضروری معلومات حاصل ہو جائیں اور وہ ان علوم کو اور ان مسائل کو اجنبی محسوس نہ کریں۔

(۹) علم اخلاق کو بھی داخل کیا جائے جس میں امراض قلبیہ اور نفسیہ اور اس کے علاج سے بحث کی جاتی ہے کہ ظاہری و باطنی اخلاق کی اصلاح ہو سکے۔

(۱۰) ملک کی سرکاری زبان بھی ضروری حد تک لازم کی جائے۔

(۱۱) قرآن و حدیث اور فقہ کی تعلیم اس طرح دی جائے کہ دور حاضر کے نئے مسائل سے طلباء پڑھنے ہی کے زمانے سے واقف ہوتے جائیں سو درس کی وہ تقریریں جو عام طور پر کی جاتی ہیں اس دور میں کارآمد نہیں ہو سکتیں۔ دور بدل چکا، آج کے مسائل بھی دوسرے ہیں، اور اعتراضات اور شبہات بھی دوسرے۔ غور و فکر کا طریقہ بھی نیا ہے اور طرز تعبیر بھی نیا۔ اب نہ وہ بحثیں ہیں اور نہ وہ حجتیں اور نہ مجادلے ہیں نہ مناظرے۔ ایک زمانہ تھا کہ کتاب کا مسئلہ شروح، تعلیقات، منہیات اور بین السطور و حواشی کے بغیر حل ہی نہیں ہوتا تھا۔ اب وہ زمانہ ہے کہ ایسی بات بتلایئے جو دین و دنیا میں کارآمد ہو، اور ایسے سلجھے ہوئے اور صاف انداز میں کہیئے کہ طبع سلیم کو اپیل کرے اور دل میں گھر کر جائے۔ اس لئے درس کا انداز ایسا اختیار کرنا ہوگا کہ طلبہ فراغت کے بعد عہد حاضر کی دینی ضرورت کو پورا کر سکیں اور جب اُن کو نئے مسائل سے سابقہ پڑے، تو اپنے کو بے بس محسوس نہ کریں۔

تعلیم کے ساتھ طلباء کی تربیت کا بھی ایک مضبوط نظام قائم کیا جائے اور ڈھنگ سے ان کی تربیت کی جائے کہ ان کا مقصد تعلیم دین سے حصول معاش نہ ہو۔ ان کا مقصد دین کی خدمت ہو اور اس راہ میں مصائب کا جھیلنا اپنا خوشگوار فریضہ سمجھیں، اُن کی نظر حکومت کے عہدوں اور بڑی بڑی تنخواہ پر نہ ہو۔ معاشی تنگی کے باوجود دین کی خدمت اس طرح کر سکیں جس طرح اونچے عہدوں اور بڑی تنخواہوں کے بعد وہ کر سکتے۔ سرکاری مدارس کے فارغین کا ہمیں کافی تجربہ ہے۔ چونکہ انہیں سرکاری ملازمتوں میں کچھ حقوق حاصل ہوتے ہیں اس لئے ان کے پڑھنے اور پڑھانے کا مقصد صرف سند اور اس کے ذریعہ ملازمت کا حصول ہوتا ہے، اور بس، وہ سب کچھ کر سکتے ہیں مگر دین کی خدمت نہیں کر سکتے۔ دینی تعلیم کا ایسا نظام جس کے ذریعہ فارغ طلباء کو وہی حقوق حکومت کے مناصب اور ملازمتوں میں حاصل ہو سکیں جو سرکاری کالجوں کے فارغین کو حاصل ہوتے ہیں وہاں قائم کیا جا سکتا ہے جہاں کی دینی و سرکاری زبان ایک ہو اور حکومت اسی دین پر یقین رکھتی ہو جس دین کی تعلیم کا ادارہ اور نظام ہے، لیکن ہندوستان جیسے ملک میں یہ نظریہ اسلام کے لئے نہ مفید ہے نہ ممکن۔

دین کے دو جزو حکمت اور فقہ

محمد سرور

گو قرآن مجید کے اوّلین مخاطب قریش مکّہ اور ان کے بعد عرب تھے، لیکن وہ تھا ساری انسانیت کے لئے پیام ہدایت۔ وہ کسی ایک ملک، قوم یا زمانے کے لئے مخصوص نہیں۔ قرآن مجید کی تعلیم اتنی ہی عالمگیر اور ہمہ گیر ہے، جتنی کہ خود انسانیت ہے[1]۔

شاہ ولی اللہ صاحب البدور البازغہ (ص۱۹۸) میں "مقاصد شرع صلی اللہ علیہ وسلم" کے نام کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:۔ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کے انکشاف کے طالب کو سب سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ آپؐ کی بعثت ملّتِ حنیفیہ کے ساتھ ہوئی تھی تاکہ وہ اُس کی کجی کو سیدھا اور اُس میں جو تحریف ہوئی تھی، اُس کی اصلاح کریں اور اُس کے نور کو عام کریں۔ چنانچہ وہ مقدمات جن پر ملّتِ حنیفیہ کی بنیاد ہے، اُنہیں اُس کی تفصیلات میں جانے سے پہلے بطور مسلّمات کے مان لینا چاہیئے۔ اسی طرح (اعمال و شعائر کی) وہ ہیئتیں اور صورتیں جو اس ملّت کے ماننے والوں میں وراثت کے طور پر چلی آتی تھیں، اُن کی بھی

---

[1] شاہ ولی اللہ صاحب "البدور البازغہ" (ص۱۹۱) میں فرماتے ہیں:۔ واعلم ان رضاء اللہ تعالیٰ وامرہٗ منحصرٌ فی الملۃ الحنیفیۃ لا یتجاوزھا لانھا بنیت علیٰ موافقۃ الصورۃ الانسانیۃ واستخراج المعارف والعلوم منھا.....

(تمہیں جاننا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور اُس کا امر ملّت حنیفیہ میں منحصر ہے اور وہ اس سے تجاوز نہیں کرتا۔ اور یہ اس لئے کہ ملت حنیفیہ کی بنا صورت انسانیت پر رکھی گئی ہے اور اسی سے معارف و علوم کا استخراج ہوا ہے)۔ قرآن مجید اسی ملت حنیفیہ کا آخری صحیفہ۔ اور دین اسلام اُس کی آخری شکل ہے۔

اُس کے لئے حیثیت مسلّم ہو" اس کے بعد شاہ صاحب نے وہ بڑے بڑے مقاصد بتائے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کے پیش نظر تھے۔ اس ضمن میں وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اُصول دین میں سے ملّتِ حنیفیہ کو باری تعالیٰ کی وحدانیت اور یوم الآخرت و معاد کا پابند بنانا ہے اور آپؐ کے دین کے یہ دو اہم اُصول ہیں کہ جو اِن دو کی تصدیق نہیں کرتا اُسے دینِ حنیفی پر عامل ہونے سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ اور ان دو کا اقرار اس ملّت کی ضروریات اور اُصول میں سے ہے[۱]

ملّتِ حنیفیہ کے انہی بنیادی اُصولوں کا نام دین ہے۔ اور وہ ایک ہے۔ اور قرآن مجید اُسی دین کا شارح و پیغام بر ہے۔ البتّہ اس دین کی اساس پر مختلف زمانوں میں جو شرائع مرتب ہوتے رہے وہ مختلف تھے۔ اس کی وضاحت حجۃ اللہ البالغہ میں یوں کی گئی ہے:۔

" جاننا چاہیئے کہ اصل دین ایک ہے اور تمام انبیاء اس پر متفق ہیں .... (انبیاء میں اختلاف اگر ہے تو) طاعات و عبادات اور اُن کے آداب و ارکان کے بارے میں ہے .... وہ خاص خاص صورتیں اور مخصوص ہیئتیں جن پر مختلف قسم کی نیکیوں اور تدابیر نافعہ و معاش اور اُمور معاشرت کی آسانیوں کی عمارت قائم کی جاتی ہے، اُنہی کا نام شریعت اور منہاج ہے۔"

اللہ تعالیٰ کی طرف سے جن طاعتوں اور عبادتوں کا حکم دیا گیا ہے اور وہ تمام ادیان و مذاہب میں یکساں ہیں حضرت شاہ صاحب کے نزدیک " وہ وہی اعمال ہیں جو نفوس انسانی کی حالتوں اور ہیئتوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور آخرت میں انہی اعمال کی بھلائی بُرائی کے اثرات نفوس انسانی کے سامنے پیش ہوں گے۔ اور انہی اعمال سے نفوس انسانی کے اندر انقباض یا انشراح پیدا ہوتا ہے۔" (حجۃ اللہ البالغہ ص ۲۲۳۔ اردو ترجمہ)

غرض ان طاعات و عبادات کی اصل ایک ہے، البتہ ان کی اساس پر جو شریعتیں بنیں، اُن میں اختلاف ہوتا رہا ہے۔ شاہ صاحب حجۃ اللہ البالغہ میں اس کی وضاحت یوں فرماتے ہیں:۔ انبیائے کرام کے شرائع میں چند اسباب و مصالح کی بناء پر

---

[۱] وحدانیت باری تعالیٰ میں، بے شک اُس کی صفات اور اُس کی طرف سے انبیاء کے مبعوث کرنے پر ایمان لانا بھی شامل ہے۔
(البدور البازغہ ص ۲۰۲)

اختلاف ہوا کرتا ہے...... (کیونکہ) شرائع کی مقدار اور اندازے کی مشروعیت میں بھی مکلفین کے حالات، عادات، اور اطوار کا لحاظ کیا جاتا ہے...... انبیائے کرام کا بڑے سے بڑا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اِن ارتفاقات اور تدابیرِ نافعہ معاشرت کی اصلاح کی جائے، جو اُن کے مخاطبین کے پاس موجود ہیں اور اسی لیے اُن کو اُن کی مالوفات اور شب و روز کی عادی چیزوں سے جدا کر کے غیر مالوف چیزوں کی طرف دعوت نہیں دی جاتی۔ الّا ماشاء اللہ۔ اور یہ ظاہر ہے کہ مصالح کے مواقع باعتبار زمانہ اور عادتوں کے مختلف ہوا کرتے ہیں۔ اور اسی بنا پر شریعتوں میں نسخ صحیح اور جائز ہے۔ اس کی مثال طبیب کی سی ہے کہ وہ ہر حال میں مزاج کا اعتدال اور اُس کا تحفظ چاہتا ہے۔ اور اس لئے مختلف اشخاص اور مختلف اوقات کے لحاظ سے اُس کے احکام اور طبی طریقے مختلف ہوا کرتے ہیں۔"

بے شک اللہ کے دین میں دوام، ہمہ گیریت اور عالم گیریت ہے۔ اور وہ کسی قوم، ملک اور زمانے تک محدود نہیں، اور وہ جن عبادات و طاعات کی تلقین کرتا ہے، اُن میں اُتنی ہی عمومیت ہے، جتنی خود انسانیت میں، کیونکہ وہ انسانیت کے جبلی تقاضوں کا خیال رکھتا ہے اور اُنہیں کی اصلاح و تزکیہ چاہتا ہے، لیکن اللہ کے دین کی یہ عمومیت مخصوص شرائع کی تدوین و ترتیب کے منافی نہیں اور یہ اس لئے کہ

"اللہ تعالیٰ گو زمان و مکان سے بلند و برتر ہے، لیکن کسی نہ کسی نہج اور کسی نہ کسی وجہ سے اُس کو زمان و مکان سے ربط و تعلق ہوتا ہے۔"[1]

چنانچہ کسی خاص زمان و مکان سے اللہ تعالیٰ کے ربط و تعلق سے شرائع وجود میں آتے ہیں، اور اِن کے نزول میں "زیادہ تر اعتبار ان امور کا ہوا کرتا ہے، جن پر لوگوں کی نشأۃ ہوا کرتی ہے اور جن کی طرف اُن کی عقلیں سوچ سمجھ کر یا بلا سوچے سمجھے منتقل ہوا کرتی ہیں۔"

شاہ صاحب فرماتے ہیں "معلوم ہونا چاہیئے کہ نبوت اکثر و بیشتر کسی نہ کسی ملت کے ماتحت ہوا کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ملۃ ابیکم ابراھیم (تمہارے لئے وہی دین تجویز کیا گیا ہے، جو تمہارے باپ ابراہیمؑ کا تھا) اور جیسا کہ فرمایا ہے، وان من شیعتہ لابراھیم (اور نوح ہی کے طریق پر چلنے والوں میں ایک ابراہیم بھی تھے) اور

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ اردو ترجمہ ص ۲۳۰۔

اس کا راز یہ ہے کہ جب لوگ ایک عرصۂ دراز تک کسی مذہب کی پابندی کرتے چلے آتے ہیں اور اس مذہب کے شعائر کی عظمت وحرمت اُن کے دلوں میں راسخ ہوجاتی ہے اور اس کے احکام واوامر اُن کے نزدیک اس قدر مشہور ومعروف اور عام طور پر شائع ہوجاتے ہیں کہ اُن کا شمار بدیہیات میں ہوجاتا ہے جس کا کوئی انکار نہیں کرسکتا[1]

جب اس ملت میں خرابیاں سرایت کرجاتی ہیں اور اُس کے نبی کی روایات میں خلط ملط ہوجاتا ہے تو دوسری نبوت آتی ہے جو "اس ملت کے مشہور ومعروف احکام کی تفتیش کرتی ہے۔ پھر جو احکام کہ سیاست ملیہ کے قواعد وضوابط اور اُس کے اُصول کے موافق صحیح ہوتے ہیں، اُن میں وہ کسی قسم کی تبدیلی نہیں کرتی بلکہ اُس کی دعوت دیتی ہے .... اور وہ اُمور جو نادرست ہوتے ہیں اور اُن میں تحریف ہوچکی ہوتی ہے اُن کو بقدر ضرورت تبدیل کردیا جاتا ہے۔ اور جو اُمور قابل اضافہ ہوں اُن میں اضافہ کردیا جاتا ہے، اور یہ نبی اکثر وبیشتر ان لوگوں کی پہلی شریعت کے بقیہ اُمور کو اپنے مطالب ومقاصد میں بطور استدلال پیش کرتا ہے ...." (حجۃ اللہ البالغہ ص ۲۳۲)

اس طویل تمہید کے بعد — جس سے غرض دینِ اسلام جو تمام مذاہب وادیان کی اصل ہے اور وہ ایک ہے، اُس میں اور اُس کی اساس پر مختلف زمانوں میں جو شرائع مرتب ہوئے، اُن میں فرق ظاہر کرنا تھا — ہم اصل موضوع کی طرف آتے ہیں۔

دین اسلام کی اس عالمگیر تعلیم کو جو تمام مذاہب وادیان کی اصل ہے، سب سے پہلے سرزمین حجاز میں عملی جامہ پہنایا گیا یہ جامہ اس عالمگیر تعلیم کا ایک خاص زمان ومکان سے اُس کے ربط وتعلق کا عملی مظہر ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس میں اُس زمان ومکان اور اہل حجاز کے طبائع وحالات کا یقیناً خیال رکھا گیا۔ اس عملی مظہر کو جسے سنت کا نام دیا گیا ہے دین اسلام کی عمومی وابدی تعلیم کا درجہ دینا ٹھیک نہیں، لیکن اُسے جو بہر حال ایک محدود قانون کی حیثیت رکھتی ہے، اس عالمگیر تعلیم کے خلاف یا اُس پر زائد سمجھنا بھی غلط ہے، سنت اس عالمگیر تعلیم کے حجازی جامے کا نام ہے اور اس سے اس عالمگیر تعلیم کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ بعد میں جب اسلام دوسرے ملکوں میں پھیلا اور عربوں کے علاوہ غیر عرب قومیں بھی مسلمان ہوگئیں تو قرآن کی عمومی تعلیم اور اُس کی حجازی تعبیر کی روشنی میں فقہ کے دوسرے مذاہب وجود میں آئے۔ اب اسلام ایک

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ اردو ترجمہ ص ۲۳۲

قوم اور ایک ملک تک محدود نہ رہا تھا، بلکہ دنیا کی دوسری بڑی بڑی قومیں بھی مسلمان ہو چکی تھیں۔ اس لئے ہر قوم اور ملک میں وہاں کے خاص حالات اور طبعی رجحانات کے مطابق فقہ کے مذاہب وجود میں آئے۔ ان فقہ کے مذاہب کی حیثیت شرائع اور مناہج کی ہے۔ اور قرآن مجید نے جو اُصول و مبادی بیان کیے ہیں اُن پر اصل دین مشتمل ہے۔

شاہ ولی اللہ صاحب کے نزدیک وہ امام راشد جو دنیا کی تمام اُمتوں ملتوں اور قوموں کو ایک ملت اور ایک دین پر جمع کرنا چاہتا ہو، اگرچہ اُس کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ اُن علوم اور تدابیر نافعہ معاشرت کا بھی لحاظ کرے جو اُس کی اپنی قوم کے پاس موجود ہیں اور اس بارے میں وہ دوسری قوموں کے مقابلے میں اپنی قوم کے حالات کی رعایت بہت زیادہ کرے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ بعد والوں کے لئے بھی شریعت کے مقابلے میں زیادہ تنگی و دشواری پیدا نہ کرے۔ اور کچھ نہ کچھ اُن کی عادات و رسوم کو بھی ملحوظ رکھے۔

اب دین اسلام صرف قرآن میں منحصر ہے اور قرآن ہی دین کا قانون اساسی ہے حدیث قرآن ہی سے مستنبط ہے اور فقہ قرآن و حدیث دونوں سے استنباط کی گئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید سے خود سمجھ کر (جیسے شاہ صاحب فرماتے ہیں) یا مستقل وحی سے اخذ کر کے (جیسے عام اہل علم کہتے ہیں) قرآن پر عمل کرنے کا مفصل پروگرام بنایا، جسے علمائے حدیث نے مرتب کیا، مولانا سندھی کے الفاظ میں اسلام کی تعلیم قرآن مجید میں منضبط ہے۔ اور وہ غیر متبدل ہے۔ جہاں کہیں اساسی تعلیم پر عمل ہوتا ہے، مخاطبین کے حالات کو ملحوظ رکھتے ہوئے مفصل قوانین بنائے جاتے ہیں۔ مولانا کے نزدیک یہ سنت تھی، اور اس کا صحیح ترین مجموعہ مؤطا امام مالک ہے۔ آگے چل کر قرآن مجید اور سنت پر فقہ کی بنیاد پڑی اور جیسے جیسے دوسری قومیں مسلمان ہوتی گئیں، اُن کے ہاں فقہی قوانین بنتے گئے جن میں اُن کے خصوصی طبائع و حالات کا خیال رکھا گیا۔ فقہ کا ان خطوط پر ارتقا ایک فطری بات تھی، اور ہر وہ دین جو سب قوموں اور سب زمانوں کے لئے ہے، اُس کے بنیادی اُصولوں میں ایک طرف یہ عمومیت و عالمگیریت اور دوسری طرف ہر ملک، ہر قوم اور ہر زمانے کی ضرورتوں کی رعایت لازمی ہے، فقہ کے پیش نظر یہ زمانی و مکانی ضرورتیں ہوتی ہیں۔ اور قرآن مجید اساسی تعلیم سے بحث کرتا ہے۔[1]

---

[1] ..... ہر توقیت و تعیین اور ہر تقیید کسی نہ کسی نہج پر لوگوں کے حق میں ضیق اور تنگی ہے۔ اور جب ان کا سلسلہ ممتد ہوگا تو لوگوں کے لئے معاملہ اور عمل کی راہیں نہایت تنگ ہو جائیں گی۔ اور ظاہر ہے کہ احکامِ شریعت کے مکلف ادنیٰ اعلیٰ تمام ہوا کرتے ہیں ..... حجۃ اللہ البالغہ صفحہ ۲۹

غرض دینِ اسلام مجموعہ ہے حکمت اور شریعت وفقہ[1] کا۔ حکمت دین کی عمومی حیثیت ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کی حکمت میں جتنی عربیت ہے اُتنی ہی عجمیت، ترکیت و فرنگیت بھی ہے۔ اس حکمت سے ایک عرب جس طرح مستفید ہو سکتا ہے، اُسی طرح دوسری قوم کا آدمی بھی جس کی زبان عربی نہ ہو اس سے انسان میں تلاش وتفحص، نظر و فکر اور تقدم و تبدیلی کا ملکہ پیدا ہوتا ہے۔ وہ اُسے اس محدود دنیا سے ماورائیت کی طرف لے جاتی ہے۔ اس سے اُس کی نظر کے سامنے وسیع و عمیق آفاق وا ہوتے ہیں۔ انسانی ذہن حکمت کے زیر اثر سوچنے پر مجبور ہوتا ہے، وہ اپنی اردگرد کی دنیا پر نظر ڈالتا ہے۔ اپنی زندگی کا جائزہ لیتا ہے اور نئی نئی راہیں ڈھونڈھتا ہے۔ مختصراً حکمت میں عمومیت، حرکت و تقدم ہے۔

فقہ نام ہے نظام کی مدوّن شکل کا۔ انسان جس ماحول میں رہتا ہے، اُس کے مطابق اُسے قواعد و ضوابط بنانے پڑتے ہیں۔ اگر زندگی ان قواعد و ضوابط سے آزاد ہو جائے اور انسان کسی ایسے ضابطۂ قانون کا پابند نہ رہے جو اُس کے اعمال کو قاعدے میں رکھے، تو اس کا نتیجہ بدنظمی اور نراج ہوتا ہے۔ فقہ کی روح حکمت ہے لیکن اُس کا ڈھانچہ عملی مظہر ہوتا ہے ایک خاص ماحول اور ایک خاص زمانے میں اُس حکمت کی تعبیر کا۔ اب حکمت میں جہاں عمومیت اور دوام ہے، وہاں فقہ میں مقامیت اور تحدید ہے۔ اور اس جہانِ آب و گل میں ہر کمال کے لئے تحدید ضروری ہے۔ چنانچہ کوئی حکمت اُس وقت تک فائدہ بخش نتائج نہیں پیدا کر سکتی، جب تک کہ وہ ایک خاص ماحول اور ایک خاص زمانے میں عملی ضابطوں کی شکل اختیار نہ کرے۔ اور اس ضمن میں اُس ماحول اور اُس زمانے کی ضرورتوں کا خیال نہ رکھے۔

غرض زندگی میں فقہ یعنی مدوّن قانون کی بھی ضرورت ہے اور حکمت کی بھی۔ اگر دونوں میں توازن اور ہم آہنگی رہے تو انسان آگے بھی بڑھتا ہے اور ماضی و حال سے بھی اُس کا رشتہ قائم رہتا ہے۔ حکمت حرکت و اقدام اور فقہ اثبات و استحکام کا باعث بنتی ہے۔ اگر فقہ سے بے اعتنائی ہو، تو زندگی میں نظم و ضبط نہیں رہتا۔ اور اگر فقہ ہی فقہ زندگی پر حاوی ہو جائے تو اس کا نتیجہ جمود، قدامت پرستی اور فکر و نظر کی موت ہے۔

اب قرآن مجید جس حکمت کا حامل اور پیغام بر ہے، وہ اس کی متقاضی تھی کہ اُس میں زیادہ سے زیادہ عمومیت اور

---

[1] ...... ہر قوم و ملت کے لئے ایک سنت و شریعت اور کچھ شرائع و احکام ہوا کرتے ہیں، جن میں وہ اپنے اسلاف اور بزرگوں کی عادات و اطوار کی پیروی کرتے ہیں ...... اس طرح ملت و مذہب کی بنیادیں اُستوار ہو جاتی ہیں ...... حجۃ اللہ البالغہ ص ۲۴

ہمہ گیریت ہو، لیکن دوسری طرف اس کی بھی ضرورت تھی کہ اس حکمت کے اُصولوں پر قانون مدوّن ہو۔ اور اس کی تدوین میں جن لوگوں کے لئے اور جس زمانے کے لئے یہ قانون مدون ہو، اُن کی خصوصیات اور طبعی رجحانات کا خیال رکھا جاتا۔

اسلام کی تعلیمات کی عمومیت پر بحث کرتے ہوئے مولانا شبلی "الکلام" میں لکھتے ہیں:۔

مذہب کے متعلق بہت بڑی غلطی اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ لوگ انبیاءؑ کے اصول طریقۂ تعلیم کو ملحوظ نہیں رکھتے۔ علم کلام کی کتابوں میں اس ضروری نکتہ کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے، لیکن امام رازی نے مطالب عالیہ میں، ابن رشد نے کشف الادلہ میں، اور شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں تفصیل کے ساتھ یہ اُصول بیان کیے ہیں، ان میں سے ضروری الذکر یہ ہیں:۔

(۱) انبیاء کو اگرچہ عوام و خواص دونوں کی ہدایت مقصود ہوتی ہے، لیکن چونکہ عوام کے مقابلے میں خواص کی تعداد اقل قلیل ہوتی ہے، اس لئے اُن کے طرزِ تعلیم اور طریقۂ ہدایت میں عوام کا پہلو زیادہ ملحوظ ہوتا ہے۔ البتہ ہر جگہ ضمن میں ایسے الفاظ موجود ہوتے ہیں، جن سے اصل حقیقت کی طرف اشارہ ہوتا ہے، اور جس کے مخاطب خواص ہوتے ہیں......

ابن رشد فصل المقال میں لکھتے ہیں:۔ "شریعت کا مقصود اوّلی جمہور عوام کے ساتھ اعتنا کرنا ہے۔ تاہم خواص کی تنبیہ سے بھی چشم پوشی نہیں کی جاتی۔

(۲) انبیاء لوگوں کی عقل و علم کے لحاظ سے اُن سے خطاب کرتے ہیں، لیکن اس علم و عقل کے لحاظ سے جو اکثر افراد میں پائی جاتی ہے...... شاہ ولی اللہ حجۃ اللہ البالغہ میں فرماتے ہیں ــ اور انبیاء کے اصول میں سے ایک یہ ہے کہ وہ لوگوں سے اُن کی خلقی عقل کے موافق خطاب کرتے ہیں......

(۳) سب سے زیادہ قابلِ لحاظ یہ امر ہے کہ انبیاء تہذیب اخلاق اور تزکیۂ نفس کے سوا، اور قسم کے مسائل اور مباحث و حقائق سے متعرض نہیں ہوتے۔ اور اس قسم کے اُمور کے متعلق جو بیان کرتے ہیں، تو انہی کی روایات اور خیالات کے مطابق اور اس میں بھی استعارات و مجازات سے کام لیتے ہیں......

(۴) ایک عام اُصول جس پر تمام انبیاء کا عمل رہا، یہ ہے کہ وہ جس قوم میں مبعوث ہوتے ہیں، اُس کے اکل و شرب، لباس، مکان، سامان آرائش، طریقۂ نکاح، زوجین کے عادات، بیع و شرا، معاصی پر دار و گیر، فصل قضایا غرض اس قسم کے تمام اُمور پر نظر ڈالتے ہیں۔ اگر یہ چیزیں ویسی ہی ہیں، جیسا اُن کو ہونا چاہئے تو پھر کسی قسم کا تبدل تغیر نہیں کرتے، بلکہ

ترغیب دلاتے ہیں کہ یہ رسوم و آئین صحیح اور واجب العمل اور مبنی علی المصالح ہیں۔ البتہ اگر ان میں کچھ نقص ہوتا ہے۔ مثلاً وہ آزار رسانی کا ذریعہ ہوں یا لذات دنیوی میں انہماک کا باعث ہوں، یا اُصول احسان کے مخالف ہوں یا انسان کو دنیاوی اور دینی مصالح سے بے پرواکر دینے والے ہوں، تو اُن کو بدل دیتے ہیں۔ وہ بھی اس طرح نہیں کہ سرے سے انقلاب کر دیں، بلکہ اس قسم کی تبدیلی کرتے ہیں، جس کے مشابہ کوئی چیز قوم میں پہلے سے موجود ہوتی ہے۔ یا ان لوگوں کے حالات میں اس کی مثالیں پائی جاتی ہیں، جن کو قوم اپنا مقتدا اور پیشوا تسلیم کرتی آتی ہے۔ شاہ صاحب یہ اُصول نہایت تفصیل سے بیان کر کے لکھتے ہیں کہ اسی وجہ سے انبیاء کی شریعتیں مختلف ہیں اور جو لوگ علم میں پختہ کار ہیں، وہ جانتے ہیں کہ شریعت نے نکاح، طلاق، معاملات آرائش، لباس، قضا، تعزیرات، غنیمت میں کوئی ایسی بات نہیں کی، جس کو وہ لوگ سرے سے نہ جانتے ہوں یا ایسی جس کے قبول کرنے میں اُن کو پس و پیش ہو، ہاں یہ ضرور ہوا کہ جو کجی تھی سیدھی کر دی گئی اور جو خرابی تھی دفع کر دی گئی۔

(۵) انبیاء پر جو شریعت نازل ہوتی ہے، اُس کے دو حصے ہوتے ہیں۔ ایک وہ عقائد و مسائل جو مذہب کے اُصول کلیہ ہوتے ہیں۔ اس حصے میں تمام شریعتیں متحد ہوتی ہیں۔ مثلاً خدا کا وجود، توحید، ثواب، عقاب، شعائر اللہ کی تعظیم، نکاح، وراثت وغیرہ۔ دوسرے وہ احکام اور سنن جو خاص خاص انبیاء کے ساتھ مخصوص ہوتے ہیں اور جن کی بناء پر کہا جاتا ہے کہ شریعت موسوی مثلاً شریعت عیسوی سے مختلف ہے، شریعت کا حصہ خاص خاص ملکوں اور قوموں کے مصالح اور فوائد پر مبنی ہوتا ہے۔ اور اُس کی بنیاد زیادہ تر ان خیالات، عقائد، عادات، معاملات، رسوم، طریق معاشرت اور اُصول تمدن پر ہوتی ہے، جو پہلے سے اس قوم میں موجود تھے۔ شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں:۔ "اسی طرح شریعت میں ان علوم اور اعتقادات و عادات کا لحاظ رکھا جاتا ہے، جو قوم میں مخزون اور جاری و ساری ہوتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ اونٹ کا گوشت اور دودھ بنی اسرائیل پر حرام ہوا اور بنی اسماعیل پر حرام نہ ہوا۔ اور یہی وجہ ہے کہ کھانوں میں پاک اور نجس کی تفریق عرب کے مذاق پر محمول کی گئی اور یہی وجہ ہے کہ بھانجی سے شادی کرنا ہمارے مذہب میں حرام ہے، اور یہود کے ہاں نہیں"۔

آگے چل کر مولانا شبلی لکھتے ہیں کہ مذکورہ بالا اُصول تمام انبیاء میں مشترک ہوتے ہیں، لیکن جس نبی کی رسالت عام ہوتی ہے اور تمام عالم کی اصلاح کے لئے مبعوث ہوتا ہے اُس کی ہدایت اور تلقین میں بھی بعض زائد خصوصیات ہوتی ہیں، جو اور انبیاء میں نہیں پائی جاتیں۔ اس اُصول کی وضاحت شاہ ولی اللہ صاحبؒ یوں

فرماتے ہیں:۔ "یہ امام جو تمام قوموں کو ایک مذہب پر لانا چاہتا ہے، اس کو اور چند اصولوں کی جو اصول مذکورہ بالا کے علاوہ ہیں، حاجت پڑتی ہے، اُن میں سے ایک یہ ہے کہ وہ ایک قوم کو راہ راست پر ملاتا ہو اس کی اصلاح کرتا ہے۔ اس کو پاک بنا دیتا ہے۔ پھر اُس کو اپنا دست و بازو قرار دیتا ہے۔ یہ اس لئے کہ ہو نہیں سکتا کہ یہ امام تمام دنیا کی قوموں کی اصلاح میں جان کھپائے۔ اس لئے ضروری ہوا کہ اُس کی شریعت کی اصل بنیاد تو وہ ہو جو تمام عرب و عجم کا فطری مذہب ہو۔ اس کے ساتھ خاص اُس کی قوم کے عادات اور مسلّمات کے اُصول بھی لیئے جائیں اور اُن کے حالات کا لحاظ بہ نسبت اور قوموں کے زیادہ تر کیا جائے۔ پھر تمام لوگوں کو اس شریعت کی پیروی کی تکلیف دی جائے۔ کیونکہ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ہر قوم اور ہر پیشوائے قوم کو ہر زمانے میں یہ اجازت دی جائے کہ وہ اپنی شریعت آپ بنالیں۔ اس سے تو شریعت کا جو مقصود ہے وہ بھی فوت ہو جائے گا۔ نہ یہ ہو سکتا ہے کہ ہر قوم کی عادات اور خصوصیات کا پتہ لگایا جائے اور ہر ایک کے لئے الگ الگ شریعت بنائی جائے۔ اس بنا پر اس سے بہتر اور آسان کوئی اور طریقہ نہیں کہ خاص اس قوم کی عادات، شعائر، تعزیرات اور انتظامات کا لحاظ کیا جائے، جن میں یہ امام پیدا ہوا ہے۔ اس کے ساتھ آنے والی نسلوں پر ان احکام کے متعلق چنداں سخت گیری نہ کی جائے۔"

اس کے بعد مولانا شبلی لکھتے ہیں کہ اس اُصول سے یہ بات ظاہر ہوگئی کہ شریعتِ اسلامی میں چوری، زنا، قتل وغیرہ کی جو سزائیں مقرر کی گئی ہیں، اُن میں کہاں تک عرب کی رسم و رواج کا لحاظ رکھا گیا ہے اور یہ کہ ان سزاؤں کا بعینہا اور بخصوصہا پابند رہنا کہاں تک ضروری ہے۔ (یہاں مولانا شبلی کا بیان ختم ہوتا ہے)

اس میں شک نہیں کہ قرآن مجید میں اُس قوم کی عادات، شعائر، تعزیرات اور انتظامات کا لحاظ رکھا گیا ہے جس میں وہ نازل ہوا اور جو اُس کے اولین مخاطبین تھے، لیکن اس سے قرآن مجید کی عمومیت اور ہمہ گیریت پر کوئی حرف نہیں آتا، کیونکہ ایسے احکام جو ان عادات اور حالات کی بناء پر ہوتے ہیں، اُن کی پابندی مقصود بالذات نہیں ہوتی۔ مولانا سندھی اس بارے میں فرماتے تھے کہ قرآن میں کہیں کہیں جو اس قسم کے احکام ہیں، اُن کی حیثیت ایک عملی مثال کی ہے، یعنی عرب کے اُن حالات میں قرآن مجید کے عمومی پیغام کو صرف ان احکام کے ذریعہ ہی بروئے کار لایا جا سکتا تھا۔

مولانا سندھیؒ کے نزدیک وہ علماء جن کے پیشِ نظر عام انسانیت کی مجموعی ترقی اور بہبود ہوتی ہے، وہ انبیاء کی تعلیمات کے عمومی پہلو پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ اور اُن کے ہاں انبیاء کے وہ احکام اور قوانین جو کسی خاص قوم اور ایک خاص زمانے

کے مخصوص حالات کے تحت مرتب ہوتے ہیں، وہ عالمگیر اور دائمی نہیں ہوتے۔ شاہ ولی اللہ صاحب کا شمار انہی علماء میں ہوتا ہے۔ آپ نے اوّل تو تمام انبیاء کی تعلیمات کی مشترکہ اساس متعین کی، جو آپ کے نزدیک انسانیت عامہ کے مطابق ہے۔ اور دونوں میں کوئی تضاد نہیں۔ مولانا سندھی فرماتے ہیں کہ شاہ صاحب کی اس حکمت کو ماننے سے میرے دل پر یہ اثر ہوا ہے کہ اگر میں کسی دوسرے مذہب کے آدمی کو یا اس شخص کو جو کسی مذہب کو سرے سے نہیں مانتا، انسانیت عامہ کی فلاح وبہبود کا کام کرتا دیکھوں، تو میرے دل میں اُس کی عزت اور محبّت جاگزیں ہو جاتی ہے۔ کیونکہ شاہ صاحب کی حکمت سے میں یہ سمجھا ہوں کہ انبیاء کی تعلیم کا اصل مقصد انسانیت کی بھلائی اور ترقی ہے۔ اب اگر کوئی شخص یہ خدمت سرانجام دیتا ہے، تو میں اُس سے کیسے نفرت کروں؛

غرض حکمت عام ہے اور وہ انسانیت عامہ کی اساس ہے۔ اور اس کی بنیادوں پر جو قانون بنتا ہے، اُس میں ماحول کی ضروریات ملحوظ ہوتی ہیں۔ بقول مولانا سندھی:۔ ایک خاص زمانے میں جو نظام بروئے کار آتا ہے، وہ آخری نہیں ہوتا۔ وہ انسان کو زندگی کے ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے میں جانے کے قابل بناتا ہے۔ جہاں تک اس خاص مرحلے کا تعلق ہوتا ہے، اُس کے لحاظ سے تو اس نظام کی حیثیت آخری ہوتی ہے، لیکن مجموعی انسانیت کے لئے یہ ایک مثال یا نمونہ ہوتا ہے۔ لوگ غلطی یہ کرتے ہیں کہ اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کُل حقیقت کا مرادف سمجھ لیتے ہیں اور ہر زمانہ اور ہر قوم وملک میں اس نظام کو بجنسہٖ نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قوم کے ذہین طبقوں میں اس نظام سے بے دلی پیدا ہونے لگتی ہے، جسے غلطی سے اُس اصل اُصول سے بے دلی سمجھا جاتا ہے، جس کا یہ نظام ایک عملی مظہر ہوتا ہے۔ اب اگر نظام کو ایک مثال کی حیثیت دی جاتی اور افراد کو اجازت ہوتی کہ وہ اس نظام کے اندر رہ کر اُس کو ضرورتوں کے مطابق بدل سکتے اور زمانے کی ترقی کے ساتھ ساتھ اُس میں بھی ارتقا ہوتا، تو انسانیت شاہراہِ ترقی پر برابر گامزن رہتی۔ زندگی آگے بڑھ رہی ہے اور آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ وہ ایک حد تک تسلسل بھی چاہتی ہے، اگر نظام میں تغیر وتبدل کا یہ راستہ اختیار کیا جائے تو زندگی کا تسلسل بھی قائم رہتا ہے اور ترقی بھی نہیں رکتی۔

حکمت اور فقہ دین کے دونوں جزو ہیں، اور زندگی میں دونوں کی ضرورت ہے، لیکن اگر فقہ کو سب کچھ سمجھ لیا جائے، اور اُسے اُسی شکل میں قائم رکھنے پر اصرار ہو، جو ایک زمانے میں اُس کی متعین ہوئی تھی، تو نہ صرف ایسی فقہ حکمت سے تہی دامن ہو جائے گی بلکہ عملی زندگی میں اُس کی کوئی جگہ نہیں رہے گی۔

حضرت ابوہریرہؓ اور مستشرقین

استاذ محمد عرفہ وکیل کلیۃ الشریعۃ جامعہ ازہر[1]

مستشرق گولڈسیہر نے دائرہ المعارف الاسلامیہ (انسائیکلوپیڈیا آف اسلام) مجلد اول عدد ہفتم میں جلیل القدر صحابی حضرت ابوہریرہؓ کے بارے میں چند خیالات کا اظہار کیا ہے جن کی کوئی تاریخی و علمی حیثیت نہیں۔ ہم یہاں مستشرق مذکور کے یہ خیالات نقل کرتے ہیں اور بعد میں اُن پر محاکمہ کرکے بتائیں گے کہ وہ کس قدر بے سروپا ہیں۔

گولڈسیہر دائرۃ المعارف اسلامیہ کے عدد ہفتم ص۱۸۱ میں حضرت ابوہریرہ کے ذکر میں لکھتا ہے۔

"اُن کا احادیث کو روایت کرنے کا طریقہ جن میں کہ معمولی سے معمولی چیزوں کا ذکر بڑے مؤثر انداز میں کیا جاتا ہے، بتاتا ہے کہ اُن میں ظرافت و مزاح کی روح تھی، اور یہی بات بہت سے مروی شدہ قصوں کا سبب بنی ہے (ابن قتیبہ ص۲۲)۔ نیز اُن کا احادیث کا وسیع علم، جو اُنہیں ہمیشہ یاد رہتی تھیں (مسند امام احمد بن حنبل ۳۱۳ صفحوں سے زیادہ پر ابوہریرہؓ کی مروی شدہ احادیث ہیں) اُن لوگوں کے دلوں میں بھی جنہوں نے خود اُن سے براہ راست احادیث روایت کی ہیں، شک و شبہ پیدا کر دیتا تھا۔ اور اُنھوں نے تمسخر کے انداز میں اپنے ان شکوک کے اظہار میں تردد نہیں کیا (دیکھئے البخاری فضائل الاصحاب ص۱۱)۔ بدیں وجہ اُنہیں بعض دفعہ لوگوں کی اِن باتوں کے متعلق جو وہ اُن کے بارے میں کرتے تھے، اپنی مدافعت کرنی پڑی۔ یہی وہ حالات ہیں، جن کی بنا پر ابوہریرہؓ کی احادیث کے معاملے میں ہمارا موقف احتیاط و شک کا ہو جاتا ہے۔"

---

[1] جامعہ ازہر قاہرہ کی کلیۃ شریعۃ (شریعت کالج) کے وکیل (نائب پرنسپل) کا یہ مضمون قاہرہ کے دینی رسالے نورالاسلام میں شائع ہوا تھا۔ مضمون کی علمی افادیت کے پیش نظر مولانا محمد اسمٰعیل بن مولانا محمد صادق مرحوم مہتمم مدرسہ مظہر العلوم کھڈہ کراچی نے اس کا اُردو میں ترجمہ کیا ہے ——— (مدیر)

شپرنگر ابوہریرہؓ کے ذکر میں لکھتا ہے کہ وہ نیکی کے جذبے کے تحت احادیث کو وضع کرنے میں حد سے بڑھ جاتے ہیں۔ اور اس سلسلے میں یہ بھی ملحوظ رہے کہ بہت سی حدیثیں جو اُن سے منسوب ہیں، بعد کے زمانے میں مصر میں وضع ہوئی ہیں۔"

حضرت ابوہریرہؓ کے بارے میں یہ جو بات کہی گئی ہے اُس میں آپ پر کئی مطاعن و اعتراضات وارد ہوتے ہیں، اور وہ سب اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ حضرت ابوہریرہؓ احادیث کی روایت میں امین نہ تھے۔ چنانچہ گولڈسیہر کا کہنا ہے کہ وہ حدیثیں وضع کرتے تھے اور اس میں حد سے متجاوز تھے اور وہ یہ سب نیکی و ورع کے جذبے کے تحت کرتے تھے۔ نیز جن لوگوں نے خود اُن سے احادیث روایت کی ہیں، وہ بھی ان روایتوں میں شک کرتے تھے اور اپنے ان شکوک کا اظہار اُنہوں نے استہزائی انداز میں کیا ہے۔ اور یہ کہ اُن کی روایتوں میں معمولی معمولی چیزوں کا ذکر بڑے مؤثر اسلوب میں کیا گیا ہے، جو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اُن میں ظرافت و مزاح پایا جاتا تھا اور یہی بات بہت سے قصّوں کے ظہور کا باعث بنی — حضرت ابوہریرہؓ پر ان اعتراضات کا موجد مصنف اپنے ثبوت میں بعض اسلامی کتابوں کا حوالہ دیتا ہے تاکہ وہ اپنے اعتراضات کو ایک دلکش جامے میں پیش کر کے لوگوں کے دل میں یہ ڈال سکے کہ اُس کے اعتراضات صحیح ہیں۔ اس طریقۂ بحث میں فریب اور ملمع سازی ہے۔ ہم خدا کی توفیق سے اس فریب کا پردہ چاک کریں گے۔

ابوہریرہؓ جن پر اُنہوں نے یہ رکیک حملے کیے ہیں اور جن کی طرف اس قسم کی بے سر و پا باتیں اُنہوں نے منسوب کی ہیں وہ ایک جلیل القدر صحابی تھے اور روایت میں تمام صحابہ سے بڑھے ہوئے تھے، بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ وہ ابن عمرؓ کے سوا سب روایات میں بڑھے ہوئے تھے، اس بحرِ علم پر جرح کرنا جو علم سے بھرپور تھے۔ پھر اُنہوں نے اُنہیں علم سونپا جو اُن سے اسے اخذ کرنے آئے اور ان سے پھر ہم تک پہنچا، دراصل اس بے پایاں علم کو مجروح کرنا ہے؛ اور اس کی تمام مرویات سے اعتماد کو ختم کرنا ہے۔ یہ بڑی خرابی کا باعث ہے۔ پھر بھی اگر اس اعتراض کی کوئی صحیح وجہ ہوتی تو اس کو برداشت کیا جا سکتا تھا۔ لیکن یہ طعن و اعتراض سر تا سر باطل ہے، اور اس میں کوئی صداقت نہیں۔

امام بخاری کے قول کے مطابق اس امام سے آٹھ سو علماء نے روایت کی ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ وہ سب ان پر پورا اعتماد کرتے تھے، اس لئے کہ اگر ان سب کا اعتماد ان پر نہ ہوتا تو وہ کبھی ان سے روایت نہ کرتے۔ حضرت ابوہریرہؓ پر تمام صحابہ اور محدثین کو پورا پورا اعتماد تھا جیسا کہ آنے والے اقوال سے معلوم ہوتا ہے۔

ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ ابوہریرہؓ مجھ سے بہتر ہیں اور جو روایت کرتے ہیں اس کا انہیں بخوبی علم ہے۔ طلحہؓ بن عبیداللہ (عشرۂ مبشرہ میں سے ہیں) فرماتے ہیں کہ بلاشبہ ابوہریرہؓ نے حضورؐ سے وہ کچھ سنا ہے جو ہم نے نہیں سنا۔ نسائی کی روایت ہے کہ ایک شخص زیدؓ بن ثابت کے پاس آیا اور ان سے کسی مسئلہ کے بارے میں پوچھا۔ زیدؓ نے فرمایا تم ابوہریرہؓ سے دریافت کرو، کیونکہ ایک مرتبہ میں ابوہریرہؓ اور ایک اور شخص مسجد میں بیٹھے اللہ تعالیٰ کا ذکر کر رہے تھے۔ اور اس سے دعائیں مانگ رہے تھے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام تشریف لے آئے اور ہمارے پاس بیٹھ گئے۔ اب ہم خاموش ہوگئے۔ آپؐ نے فرمایا کہ تم جو ذکر کر رہے تھے وہ کرتے رہو۔ زیدؓ نے فرمایا کہ میں نے اور میرے ساتھی نے ابوہریرہؓ سے پہلے دعا کرنی شروع کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہماری موافقت فرماتے رہے۔ پھر ابوہریرہؓ نے دعا کی اور کہا۔ اے اللہ! میں تم سے وہی دعا مانگتا ہوں جو میرے دونوں ساتھیوں نے مانگی، اور میں ایسا علم بھی اللہ تعالےٰ سے چاہتا ہوں جو بھولے نہیں۔ آپؐ نے فرمایا آمین۔ اس پر ہم نے عرض کیا یا رسول اللہؐ ہم بھی اللہ تعالیٰ سے ایسا علم چاہتے ہیں جو بھولے نہیں، آپؐ نے فرمایا یہ دوسی لڑکا تم پر سبقت لے گیا۔

اُن کا حافظہ نہایت عمدہ تھا، جس کی وجہ سے وہ احادیث کو بہت اچھی طرح ضبط کرتے تھے۔ اس کی گواہی قابل اعتماد علماء دے رہے ہیں۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ ابوہریرہؓ اپنے زمانے کے راویان حدیث میں احفظ (زیادہ حافظے والے) تھے۔ اعمش ابوصالح سے روایت کرتے ہیں کہ اُنہوں نے کہا:- ابوہریرہؓ صحابہ میں سب سے احفظ تھے۔ ابوزعیزعۃ (مروان کے سیکرٹری) کہتے ہیں کہ مروان نے ایک مرتبہ ابوہریرہؓ کو بلایا، وہ آکر احادیث بیان فرمانے لگے۔ مروان نے مجھے پلنگ کے پیچھے بٹھادیا تھا اور وہ جو احادیث بیان فرماتے گئے میں لکھتا گیا۔ جب دوسرا سال شروع ہوا تو مروان نے پھر انہیں بلایا اور کہا کہ آپ وہ احادیث بیان فرمائیں اور مجھے حکم دیا کہ میں دیکھتا جاؤں، جب میں نے دیکھا تو ان میں ایک حرف کا بھی فرق نہیں تھا۔ ان کے علاوہ اور بہت سی مثالیں ہیں جنہیں ہم طول دینا نہیں چاہتے۔ انہیں قارئین اسماء الرجال کی کتابوں میں مطالعہ کرسکتے ہیں۔

یہ ثقہ علماء کی آراء ہیں اور جس کی اُنہوں نے توثیق کی، وہ قابل اعتماد ہے۔ اور اس پر جرح نہیں کی جاسکتی، اور جس کی اُنہوں نے توثیق نہ کی، وہ ایسا کھوٹا ہے جس پر اعتماد نہیں ہوسکتا۔ جس کے حصے میں ان علماء اور افاضل کی تعریف ہو، اس کے بعد اس کے بارے میں جو بھی کہا جائے وہ لغو اور لایعنی ہوگا، جس سے اسے کوئی ضرر نہیں پہنچ سکتا۔ اس ضمن

ہیں یہ اجمال کافی تھا۔ لیکن ضروری ہے کہ ہم وہ اعتراضات ومطاعن کا تفصیلی جائزہ لے کر ان کا خاتمہ کردیں۔

اصحاب دائرہ معارف اسلامیہ کا دعویٰ ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ کے احادیث کے وسیع علم نے ان لوگوں کے دلوں میں بھی شکوک ڈال دیئے جنہوں نے ان سے احادیث روایت کیں اور یہ کہ اُنہوں نے اپنے ان شبہات کے اظہار میں کوئی تردد نہ کیا اور پھر قارئین کے لئے بخاری کی کتاب فضائل الاصحاب ۱۱ کا حوالہ دیا ہے۔ اُن کا مطلب بخاری کی اُس حدیث سے ہے جو ابوسعید المقبری نے ابوہریرہؓ سے روایت کی ہے۔ وہ فرماتے تھے کہ لوگ کہتے ہیں:۔ ابوہریرہؓ بہت روایت کرتا ہے، واقعہ یہ ہے کہ میں تو حضورؐ کے ساتھ ہر وقت بھرے پیٹ رہتا تھا۔ اس حالت میں کہ نہ میں خمیری روٹی کھاتا تھا اور نہ ہی میں کڑھی ہوئی چادر پہنتا تھا۔ نہ میرا کوئی خادم تھا نہ خادمہ۔ اور میں بھوک کی وجہ سے پیٹ سے پتھر باندھ لیتا تھا۔ الحدیث۔

یہی بخاری کی وہ حدیث ہے جس کو اصحاب دائرہ معارف اسلامیہ نے ابوہریرہ پر طعن واعتراض کی بنیاد بنایا ہے۔ اور ایک انصاف پسند شخص اس حدیث سے اچھی طرح جان سکتا ہے کہ اصل بات یہ ہے بعض لوگوں نے کہا کہ ابوہریرہؓ بہت روایت کرتا ہے اور جب یہ انہوں نے اُن کے حافظہ اور کثرت روایت پر تعجب کرتے ہوئے کہا اور اُن کو یہ حق تھا کہ وہ اس پر تعجب کرتے اور یہ اس لئے کہ ابوہریرہؓ نے حضورؐ کی صحبت میں گو صرف تین سال گذارے تھے لیکن اُن سے روایت میں سب سے زیادہ تھے۔ اور تعجب کرنے والے کو یہ ضرورت ہوتی ہے کہ اس سے سبب بیان کیا جائے اور جبکہ سبب ظاہر ہوجائے تو تعجب ختم ہوجاتا ہے، پھر جب اُنہوں نے اپنی کثرتِ روایت اور زیادتی حفظ کی وجہ ان پر ظاہر کی اور بتایا کہ وہ حضورؐ کی خدمت میں ہر وقت حاضر رہتے تھے۔ اور اپنے پیٹ سے مارے بھوک کے پتھر باندھ رکھتے تھے اور انہیں کوئی تجارت یا زراعت حضورؐ کی خدمت سے نہیں روکتی۔ بدیں وجہ انہوں نے وہ سب کچھ حفظ کرلیا جو دوسرے حفظ نہ کرسکے۔ اور جو کچھ اُنہوں نے سُنا وہ دوسرے نہ سُن سکے۔ جب متعجبین پر یہ سبب واضح ہوگیا تو وہ چپ ہورہے۔

اچھا ہم تھوڑی دیر کے لئے اصحابِ دائرہ کا یہ دعویٰ تسلیم کرلیتے ہیں کہ جب لوگوں نے کہا کہ ابوہریرہؓ بہت زیادہ روایت کرتے ہیں تو اس سے اُن کا مقصد اُن پر شک کرنا تھا نہ کہ تعجب۔ مگر اس واقعہ کی تاریخ کا واقف اچھی طرح سمجھ سکتا ہے کہ جب اُنہوں نے سبب واضح کردیا تو وہ خاموش ہوگئے۔ اور انہیں روایت کرنے سے نہ روکا بلکہ ان سے خود روایت

بھی کرنے لگے، اب اگر اُن کا شک قائم رہتا تو انہیں روایت کرنے سے ضرور روک دیتے اور ان سے روایت بھی نہ کرتے۔
غرض یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ صحابہ کس قدر روایتوں کا اہتمام کرتے تھے۔ اور انہیں کتنی احتیاط اس بارے میں تھی۔ اس احتیاط اور چھان بین سے انہیں کوئی امر مانع نہ ہوتا تھا۔ اس لئے جب اُنہوں نے دیکھا کہ ابوہریرہؓ کا زمانہ صحبت کم ہے اور جب اُن کی روایات بکثرت ہیں تو انہوں نے بلا کسی رورعایت کے ابوہریرہؓ پر اپنے خیالات کا اظہار کر دیا اور جب ابوہریرہؓ نے اس کی معقول وجہ بتائی تو اُنہوں نے تسلیم کر لیا اور انہیں روایت حدیث سے نہ روکا بلکہ خود بھی اُن سے روایت کرنے لگے۔ ایک حضرت علیؑ کی مثال لیجئے کہ وہ ہمیشہ اُس شخص کو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت بیان کرتا قسم دیتے تھے اور جب وہ حلف اُٹھا لیتا تو اسے سچّا سمجھتے تھے۔

اگر اصحابِ دائرہ اس حدیث سے یہ اخذ کرتے ہیں کہ جن لوگوں نے ابوہریرہؓ سے روایت کی، انہیں خود بھی ان پر شک تھا، جسے اُنہوں نے استہزاء آمیز انداز میں ظاہر کیا، تو کیا اُن پر یہ واجب نہ تھا کہ وہ ابوہریرہؓ کو روایت حدیث سے روک دیتے۔ حالانکہ وہ اپنی پوری زندگی روایت کرتے رہے اور وہ حضورؐ کے بعد تقریباً پچاس سال زندہ رہے۔
لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُنہوں نے ابوہریرہؓ کی دلیل مان لی تھی اور جب اُنہوں نے ان سے کثرتِ روایت کا سبب بیان کر دیا تو ان کے دلوں میں جو خلش تھی وہ دور ہو گئی۔ ابوہریرہؓ اور عمرؓ۔ عثمانؓ۔ علیؓ اور عائشہؓ کے مابین جو واقعات ہوئے تھے، وہ ہم گولڈسیہر سے زیادہ جانتے ہیں، لیکن جب روحِ تاریخ کا ہم جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب اُن کی توثیق کرتے ہیں۔ کیونکہ اگر وہ ان کی روایات میں کوئی خرابی سمجھتے تو انہیں روایات بیان کرنے سے روک دیتے اور لوگوں سے انہیں دور رکھتے اور ہم جانتے ہیں کہ وہ حضرات تھے جو حدیث رسولؐ کی پوری حفاظت کرتے تھے۔ اور ہمیشہ اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ حدیث میں لوگ کوئی وسعت نہ کر لیں، اور یہ کہ حدیث میں ملاوٹ اور کذب وغیرہ نہ داخل ہو جائے۔ اور مستشرقین کا یہ دعویٰ کہ ابوہریرہؓ کی احادیث میں معمولی معمولی اشیاء کا مؤثر اسلوب میں ذکر ہے اور یہ اُن کی روحِ مزاح و ظرافت پر دلالت کرتا ہے اور یہی بہت سے قصوں کے ظہور کا سبب ہے۔ چنانچہ وہ اپنے اس دعوے کو ابن قتیبہ کی طرف منسوب کرتے ہیں، یہ ایسی بات ہے جو وہم اور گمراہی میں ڈال دیتی ہے۔

ہمیں علم نہیں کہ ابن قتیبہ نے ان مطاعن میں سے کوئی چیز ابوہریرہؓ کی طرف منسوب کی ہو۔ بلکہ ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ ابن قتیبہ ان کی طرف سے دفاع کرتے ہیں جو ان کی سچائی اور امانت کو واضح کرتا ہے، اور جن لوگوں نے ابوہریرہؓ پر

تنقید کی ہے جیسے نظّام، اُن کا وہ ردّ کرتے ہیں۔ ابن قتیبہ نے ان کا جس قدر اہتمام سے ذکر کیا ہے اور ان کی عظمت اور بزرگی کو جس انداز سے بیان کیا ہے وہ ہم یہاں ذکر کر دیتے لیکن ان محدود صفحات میں اس کی گنجائش نہیں ہے۔ اس لئے ہم قارئین کو ابن قتیبہ کی تالیف (تاویل مختلف الحدیث ص ۴۸ اور مابعد) کا حوالہ دیتے ہیں کہ وہ پوری تفصیل سے اس کا مطالعہ کریں۔

اور ہمیں معلوم نہیں کہ کون سی احادیث ہیں جن میں معمولی معمولی چیزوں کا ذکر ہے اور جو بہت سے قصص کے ظہور کا باعث ہوئیں۔ اصحاب دائرہ پر لازم تھا کہ وہ اس کی وضاحت کرتے تاکہ ان پر گفتگو کی جاتی، اور جب اُنہوں نے ابن قتیبہ کا حوالہ دیا ہے تو اس کتاب کا نام لیتے کہ وہ کون سی کتاب ہے۔ ابن قتیبہ کی تو کئی مؤلفات ہیں جن میں سے کئی طبع بھی ہو چکی ہیں، اگر وہ ابن قتیبہ کی کسی کتاب کا نام لیتے تو ہم اس کی طرف رجوع کرتے اور ہمیں یقین ہے کہ ہم ان پر یہ بات واضح کر دیتے کہ اس میں وہ نہیں ہے جو وہ سمجھے ہیں۔ کیونکہ یہ تو سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک طرف تو ابن قتیبہ ابوہریرہؓ کی اتنی زبردست تعریف کرے اور دوسری طرف اُن سے وہ باتیں منسوب کرنے لگ جائے جیسا اصحاب دائرہ کرتے ہیں۔

باقی جو وہ اسپرنگر سے نقل کرتے ہیں کہ ابوہریرہؓ احادیث گھڑنے میں حد سے تجاوز کر گئے تھے اور یہ بطور ورع اور نیکی کے تحت تھا۔ تو ہم کسی بھی اسپرنگر یا دوسرے کی بات ماننے کے لئے تیار نہیں جن کا اس کے سوا کوئی کام نہیں کہ وہ حضورؐ کے اصحاب پر الزام لگاتے رہیں تاکہ مسلمانوں کو گمراہ کریں اور حقیقت اور واقعہ کو چھپائیں۔ اس ضمن میں یہ کافی تھا کہ ہم کہہ دیتے کہ یہ ایسے طعن ہیں جس کی کوئی سند نہیں۔ لیکن ہم یہاں ابوہریرہؓ کی ذہنی افتاد کو بتانا ضروری سمجھتے ہیں اور عادتاً یہ چیز ناممکن ہے کہ ایسا شخص جھوٹا ہو اور حضورؐ پر بہتان تراشی کرے۔ یہ ایک نفسیاتی مسئلہ ہے جو اس موضوع میں بڑا مفید رہے گا۔

ابو عثمان نہدی کہتے ہیں کہ میں ابوہریرہؓ کے یہاں سات مرتبہ مہمان ہوا ہوں، میں نے یہ دیکھا کہ ابوہریرہؓ اُن کی بیوی اور اُن کا خادم رات کو باری مقرر کر لیتے تھے۔ ایک پہلے عبادت کرتا پھر دوسرے کو جگاتا پھر وہ عبادت کرتا اس کے بعد تیسرے کو جگاتا۔ اسی طرح رات گزارتے تھے۔ اُنہوں نے اور بیان کیا کہ ان کے پاس ایک دھاگہ تھا جس میں ایک ہزار گانٹھیں تھیں جب تک اس کی تسبیح نہ پڑھ لیتے سوتے نہیں تھے۔

جو شخص ایمان اور تقویٰ کے اس مرتبہ میں ہو کیا وہ اس بات کی جرأت کر سکتا ہے کہ ایک کبیرہ گناہ کا ارتکاب کرے اور کبیرہ گناہ بھی ایسا کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر جھوٹ گھڑے۔ اور اسی پر مرتے دم تک مصر رہے۔

حالانکہ وہ جانتا ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جھوٹی روایت کرنا دین میں مفسدہ پردازی کا موجب ہے اور دین میں ایسی بات داخل کرنا ہے، جو اُس میں نہیں ۔

مستشرقین کا یہ کہنا کہ ابوہریرہ نیکی اور ورع کے تحت حدیثیں گھڑنے میں حد سے متجاوز تھے، تو یہ ایک بے سروپا بات ہے۔ کیونکہ نیکی اور ورع کا تقاضا تو یہ ہے کہ آدمی عام لوگوں سے بھی غلط روایت نہ کرے، کجا یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے غلط روایتیں کی جائیں، اور ابوہریرہ رضؓ کس طرح نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے جھوٹی روایتیں کرسکتے ہیں، جب کہ وہ خود اس حدیث کے راوی ہیں من کذب علی متعمداً فلیتبوأ مقعدہ من النار (رسول اللہ صلی اللہ نے فرمایا کہ جس نے جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ بولا، وہ اپنا ٹھکانا دوزخ میں بنالے) ابوہریرہؓ کا یہ معمول تھا کہ جب وہ کسی سے حدیث بیان کرنے لگتے، تو پہلے اوپر کی حدیث کا ذکر کرتے۔

اب جس شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث سُنی ہو اور اُسے اُس نے یاد کیا ہو، پھر وہ اُسے دوسروں سے بیان کرتا ہو اُسے وہ حدیث برابر یاد رہتی ہو اور وہ اُسی کا برابر ذکر بھی کرتا رہتا ہو۔ جب وہ کسی شخص سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث بیان کرے، تو اُس سے پہلے آپؐ کی اسی حدیث کا ذکر کرتا ہو۔ پھر وہ مومن نیکوکار اور متقی ہو، کیا ایسے شخص کے لئے عادتاً محال نہیں کہ وہ رسول اللہؐ پر جھوٹ بولے اور اس میں حد سے تجاوز کرے۔ اور اسی کے ساتھ یہ بھی سمجھے کہ آپؐ کی طرف غلط بات منسوب کرنا اور آپؐ پر جھوٹ بولنا دین اور نیکی کی بات ہے۔

باقی اِن مستشرقین کا یہ کہنا کہ بہت سی حدیثیں جو ابوہریرہؓ کی طرف منسوب ہیں، بعد کے زمانے میں مصر میں گھڑی گئی ہیں اور اُنہیں غلط طور پر بڑے بڑے محدثین کی طرف منسوب کردیا گیا ہے، جیسا کہ ابوہریرہؓ کی طرف، لیکن علمائے فقہِ حدیث نے اس پر پوری بحث کی گھڑی ہوئی حدیثوں کا پتہ لگایا اور اُن کا جھوٹ اِن علماء پر مخفی نہ رہا۔ اور اس طرح جھوٹی احادیث گھڑنے والوں کے تمام فریب بے نقاب ہوگئے۔

دائرۂ معارف اسلامیہ والوں کی اس طرح کی بحثوں سے غرض یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ مسلمانوں کے اُن بزرگوں کو جن سے اُنہیں عقیدت ہے بُرے رنگ میں پیش کریں تاکہ وہ ان بزرگوں کے بارے میں اُن کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا کرسکیں۔ بمثال کے طور پر سید احمد بدوی[1] کو لیجئے اُن کی عفت اور نیکوکاری پر تعریض کرتے ہوئے فولرز لکھتا ہے ــــ "میں اب اس رائے کی طرف

---

[1] مصر کے اس مشہور و معروف بزرگ کا مزار طنطا میں ہے۔ اور عام اہل مصر کا ان کی طرف ایسے ہی رجوع ہے جیسے برصغیر ہند و پاک کے مسلمانوں کا حضرت خواجہ معین الدین اجمیری کی طرف (مدیر)

مائل ہوں کہ وہ چپقلش جو سید احمد بدوی اور ایک عورت فاطمہ بنت بری کے درمیان وقوع پزیر ہوئی، اور جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے لیکن اُس پر زیادہ روشنی نہیں ڈالی گئی۔ محض اس حد تک محدود نہیں کہ ایک سرکش بدوی اور جنگی عورت کو ریاضت کرانا مقصود تھا۔ بلکہ یہ واقعہ اس سے زیادہ عمیق اور دور رس ہے۔"

علاوہ ازیں ان مستشرقین نے سید احمد بدوی کی شخصیت، عقل و خرد اور اُن کے علم پر بھی زبانِ طعن دراز کی ہے چنانچہ لکھتے ہیں:— "احمد بدوی کے سلوکِ تصوف سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان کم درجے کے درویشوں میں سے تھے، جو ہندوستان کے یوگیوں سے زیادہ ملتے ہیں، اسی طرح عقلی اور ادبی لحاظ سے بھی اُن کی شخصیت بہت معمولی ہے۔" یہ اور اس طرح کی اور چیزیں دائرۂ معارف اسلامیہ میں سید احمد بدوی کے متعلق مرقوم ہیں۔

اب جو شخص بھی سید احمد بدوی کے سوانح جات کا مطالعہ کرے گا، وہ دیکھے گا کہ آپ بڑے عبادت گزار تھے اکثر خاموش رہتے، اور دل کی بات کہنی ہوتی تو اشاروں سے کام لیتے۔ آپ عزلت پسند بزرگ تھے؛ اور کثرت سے روزے رکھتے تھے، وہ اور اُن کے رفقاء اکثر چھتوں (سطوح) پر عبادت کرتے، اسی لئے اُنہیں "سطوحیۃ" کا لقب دیا گیا۔ سید احمد بدوی اللہ کی محبت میں سرشار رہتے تھے۔ جس شخص کا پرہیزگاری اور زہد میں یہ حال ہو، یقیناً اُس پر مستشرقین سے جو تیر بھی پھینکے جائیں گے، وہ ناکام رہیں گے اور وہ اُسے کوئی گزند نہیں پہنچا سکیں گے۔

غرض اگر دائرۂ معارف اسلامیہ والوں نے دائرہ (انسائیکلوپیڈیا) اسی لئے مرتب کیا ہے کہ وہ اُس کے ذریعہ علوم و معارف اسلامیہ کو صحیح شکل میں پیش کریں تو یہ اس مقصد سے کتنا دور ہے۔ اس کا اندازہ ہو گیا ہو گا لیکن اگر اس دائرہ (انسائیکلوپیڈیا) کی تالیف سے اُن کا مقصد اہل مغرب کی نظروں میں مسلمانوں کی حالت کو بُرے رنگ میں پیش کرنا اور عام مسلمانوں کے عقائد میں شکوک و شبہات پیدا کرنا اور اُن کے نوجوانوں کو اپنے دین سے گمراہ کرنا ہے، تو پھر وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب ہے

میں جب کبھی بھی یہ سوچتا ہوں کہ آگے چل کر اسی دائرہ (انسائیکلوپیڈیا) کی عام اشاعت ہو گی اور جدید مدارس کے فارغ التحصیل طلبہ اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی خاطر اس کی طرف رجوع کریں گے، تو میں خوف کے مارے کانپ اُٹھتا ہوں۔ کیا ہی اچھا ہو اگر لوگوں کے سامنے ایک ایسا "دائرہ معارف اسلامیہ" ہو جسے اُن اہل علم نے مرتب کیا ہو جن پر اُنہیں یہ اعتماد ہو کہ وہ علوم و معارف اسلامیہ کو صحیح صحیح نقل کریں گے، اور پھر یہ دائرہ (انسائیکلوپیڈیا)

ایسی زبان میں ہو جسے جمہور سمجھ سکیں، تو یہ جو دائرہ (انسائیکلوپیڈیا) مستشرقین کا مرتب کردہ ہے، اس کے مُضر اثرات کم ہو سکتے ہیں۔

لیکن جب لوگوں کے سامنے اس قسم کا کوئی دائرہ (انسائیکلوپیڈیا) نہیں اور اسلامی علوم پر جو کتابیں ہیں، وہ سوائے اُن کے جنہیں اُن کے مطالعہ کی مشق ہے، دوسروں کے لئے مشکل ہیں، اور پھر وہ اِس دور کے آسان انداز میں جو آج کی روحِ عصر سے مناسب ہو، لکھی بھی نہیں گئیں، اس پر مستزاد یہ کہ وہ متفرق ہیں، مجتمع نہیں۔ ایسی صورت میں ہمارے نوجوانوں کے سامنے نہ صرف اس دَور میں بلکہ آیندہ ادوار میں بھی اسلامی معلومات کے لئے لے دے کے صرف یہی دائرہ (انسائیکلوپیڈیا) مرجع رہ جاتا ہے اور اس میں جو اغلاط ہیں، چند کا ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں۔

موجودہ دائرہ معارف اسلامیہ (انسائیکلوپیڈیا آف اسلام) کے ضرر کی کس طرح تلافی ہو یا اُسے کس طرح کم کیا جائے، میں نے اس پر بہت سوچا ہے۔ اس بارے میں میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اس وقت جب کہ اس انسائیکلوپیڈیا کی اشاعت ہو رہی ہے، بس یہی ہو سکتا ہے کہ اس کا ترجمہ کرنے والوں کے ساتھ ایک یا دو عالم منسلک ہوں، اور ترجمے کی طباعت و اشاعت سے پہلے یہ اُسے دیکھ لیا کریں، اور اگر وہ کہیں معلومات میں غلطی دیکھیں تو انسائیکلوپیڈیا کے اُسی مضمون کے حاشیے میں صحیح معلومات کا اندراج کر دیا جائے اس سے دو فائدے ہوں گے ایک یہ کہ نقلِ معلومات میں دیانت و امانت رہے گی، دوسرے موجودہ اور آیندہ نسلوں کے سامنے معلومات کی تصحیح ہو جایا کرے گی۔

" حکمت الٰہی نے افراد کی طرح جماعتوں کی زندگی و قیام کے لیے بھی ایک خاص نظام مقرر کر دیا ہے۔ اور اُسی کے مطابق ایک جماعت کی جگہ دوسری جماعت سے اور ایک قوم کی زندگی دوسری قوم کی زندگی سے ہمیشہ بدلتی رہتی ہے۔ افراد کے نظامِ حیات کی طرح جماعات کا نظامِ حیات بھی جد و جہد، سعی و طلب اور فکر و عمل کی صلاحیت کا نظام ہے اور یہاں بھی بقائے انفع کا قانون کام کر رہا ہے "۔

الاسلام دین الاشتراکیہ

محمد سرور

یہ کتاب مجموعہ ہے چند تقریروں کا، جو قاہرہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے نشر ہوئیں، اور بعد میں اُنہیں کتابی شکل میں چھاپ دیا گیا ہے۔ حضرات مقررین میں علمائے دین بھی ہیں اور جدید درسگاہوں کے پروفیسر بھی۔

صدر جمال عبدالناصر کی زیر قیادت مصر میں ایک نئے معاشی نظام کا تجربہ کیا جا رہا ہے جسے وہاں عربی اشتراکیت اور کبھی کبھی اسلامی اشتراکیت کا نام دیا جاتا ہے۔ عربی زبان میں کمیونزم کے لئے شیوعیت کی اصطلاح ہے۔ اور سوشلزم کے لئے اشتراکیت کی اصطلاح مروج ہے۔ مصر کے اس عرب سوشلزم میں ذاتی ملکیت بحال رکھی گئی ہے، اور چھوٹے پیمانے کے کاروبار بھی افراد کی ملکیت ہیں۔ اسی طرح اراضی کسانوں کے پاس رہنے دی گئی ہے، البتہ بڑی زمینداریاں ختم کردی گئی ہیں، لیکن بڑی بڑی صنعتیں اور سکنی جائدادیں، بڑے بڑے تجارتی ادارے، یہاں تک کہ اخبارات بھی قومیا[1] لیے گئے ہیں۔ یہ ہے مصر کا عرب سوشلزم۔ زیر نظر کتاب پر مشتمل تقریروں میں اِسی سوشلزم کو اسلام کے مطابق ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ اسلام دین اشتراکیہ ہے۔

کتاب کے مرتب احمد فراج تمہید میں لکھتے ہیں کہ عہد قدیم سے لے کر اب تک، جو بھی فلسفے اور اقتصادی و اجتماعی نظام وجود میں آئے ہیں، اُن سب میں اقتصادی مسئلے کی حیثیت بنیادی پتھر کی رہی ہے اور یہ کہ گو تاریخ کے ایک خاص دور میں پوری دنیا میں آزاد کاروبار کا مسلک غالب رہا ہے لیکن اب کچھ عرصہ سے اشتراکیت کی طرف زیادہ توجہ ہے، اور اسے اقتصادی مشکلات کو حل کرنے اور پیداوار کو بڑھا کر اقوام عالم کو خوش حال بنانے کا وسیلہ قرار دیا جا رہا ہے۔ مرتب کا کہنا ہے کہ اس وقت اشتراکیت کی متعدد عملی تعبیریں ہیں۔ چنانچہ مثال کے طور پر روسی اشتراکیت بعض اُمور میں

[1] قومی ملکیت میں لینے کے اس عمل کو "تامیم" سے تعبیر کیا گیا ہے یعنی کسی چیز کو امت کے لئے بنانا۔

چینی اشتراکیت سے مختلف ہے۔ اسی طرح یوگوسلاوی اشتراکیت کی اپنی جُدا نوعیت ہے۔ اور برطانوی لیبر پارٹی کی اپنی اشتراکیت ہے۔ موصوف کے الفاظ میں: اشتراکیت کی عملی تعبیروں کا یہ اختلاف اُن ملکوں کے مخصوص حالات کی رو سے ہے جہاں یہ نظام بروئے کار آیا ہے۔ اسی سلسلے میں مرتب لکھتے ہیں کہ جو ملک اقتصادی و سیاسی لحاظ سے کافی ترقی کر چکے تھے، اُن کے ہاں تو اشتراکی تعلیمات کے زیر اثر بعض مفید اصلاحات ہوئیں، لیکن جو ملک اقتصادی و سیاسی لحاظ سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں، انہیں اصلاحِ احوال کے لئے انقلاب (ثورۃ) کو ذریعہ بنانا پڑا ہے۔ اسی قسم کا انقلاب ۱۹۵۲ء میں مصر میں ہوا، اور ایک اشتراکی، ڈیموکریٹی (دیموقراطی)، اور تعاونی معاشرہ کی تعمیر قوم کا نصب العین بنا۔

اب یہ سوال پیدا ہوا کہ اس معاشرے کی تعمیر کے اُصول اور اُس کے لئے محرک جذبہ کہاں سے آئے؟ مرتب لکھتے ہیں کہ جہاں تک علمی اشتراکیت (اس سے مراد روسی و چینی اشتراکیت ہے) کا تعلق ہے، اُس کے ہاں انفرادی ملکیت کی اجازت نہیں اور پیداوار کے تمام ذرائع حکومت کی ملکیت ہیں، لیکن ہماری اشتراکیت انفرادی ملکیت کی نہ صرف اجازت دیتی ہے، بلکہ اُس کا احترام کرتی ہے، البتہ وہ اس حق پر چند پابندیاں عائد کرتی ہے۔ چنانچہ ہر فرد پرائیویٹ سیکٹر (قطاع خاص) میں اپنی اقتصادی سرگرمیاں جاری رکھ سکتا ہے، اس کے ساتھ ہی عام بہبود کے ادارے جن کا تعلق پبلک سیکٹر (قطاع عام) سے ہے، وہ پوری قوم کی ملکیت ہیں۔ یعنی انفرادی ملکیت سے جب مصلحت عامہ پر زد پڑے، تو اس وقت ہم اُس پر پابندیاں عائد کرتے ہیں تاکہ اس کی وجہ سے اجارہ داریاں نہ پیدا ہوں اور لوگوں کو ایک سے مواقع ملنے میں رُکاوٹ نہ ہو۔ الغرض ہمارے نظام میں بعض اشتراکی خصوصیات ہیں اور بعض سرمایہ دارانہ نظام کی خصوصیات، اور ہم نے ان دونوں میں ہم آہنگی و مطابقت پیدا کی ہے۔ ہمارے معاشرے نے فرد کی شخصیت کو ختم نہیں کیا، اور نہ اُسے بالکل آزاد رہنے دیا گیا ہے۔

خود مرتب کے اپنے الفاظ میں "یہ راہِ وسط محض اس کا نتیجہ نہیں کہ ہم نے بعض چیزیں ایک نظام سے لے لیں، اور بعض دوسرے نظام سے، بلکہ یہ سرچشمہ خود اِس قوم کے ضمیر، اُس کے ورثے اور اعتقادات سے پھوٹا ہے جو تقریباً کئی سو سال تک اس قوم کی خصوصیات رہیں۔ اور یہ راہِ وسط قوم کی ماضی و حال میں باہمی عمل و ردِ عمل کی تخلیقی و حیات آفریں بازگشت ہے۔"

مرتّب کے نزدیک دینِ اسلام محض ایک شخص کا ذاتی معاملہ نہیں کہ اُس کا معاشرے اور اُس کے اطوار، اور

اقتصادیات اور اُس کے مسائل سے کوئی تعلق نہ ہو' بلکہ وہ مشتمل ہے ایسے احکام وقواعد پر جو ایک فرد کے ساتھ دوسرے فرد کے' اور اُس کے اپنے خاندان' معاشرے اور سلطنت کے ساتھ تعلقات کو منظم کرتے ہیں۔ مزید برآں دین اسلام ایک سلطنت کے دوسری سلطنت کے باہمی تعلقات اور امن اور جنگ کے تعلقات کو منظم کرتا ہے اور ایسے اُصول پیش کرتا ہے جو شرف انسانیت' سعادت' اور تمام لوگوں کے لئے امن اور سلامتی کو یقینی بناتے ہیں۔

جولائی ۱۹۶۱ء میں جب عربی اشتراکیت کے ان اُصولوں کو مصر میں عملی جامہ پہنایا جانے لگا تو استحصال پسند اور رجعت پرست اور جاگیردار طبقوں کے باقی ماندہ گروہوں نے ان کی مخالفت کی اور دین اسلام کو جو اُن کے ترکش میں آخری تیر تھا' اس کے لئے استعمال کیا' یہ سمجھتے ہوئے کہ عوام کے دلوں میں دین داری کا جذبہ موجزن ہے' اور وہ دین کے نام سے ان اقدامات کی مخالفت پر اُنہیں اُکسا سکیں گے۔ اِن کا دعویٰ تھا کہ اسلام حق ملکیت کو محدود کرنے کی اجازت نہیں دیتا اور نہ وہ قومیانے (تامیم) کی اجازت دیتا ہے اور نہ وہ دولت مندوں کی دولت کو جو اُنہوں نے "پسینہ بہا کر کمائی" ہے' قبضانے سے خوش ہے۔

اِن حالات میں یہ ضروری تھا کہ ان اُمور کے متعلق اسلام کے موقف کی نئے سرے سے وضاحت کی جاتی۔ اور یہ واقعہ ہے کہ معاشرے کی اشتراکی قدروں کے تعین میں اسلام سب سے آگے تھا۔

یہاں بقول مرتب کے' ایک اعتراض وارد ہوتا ہے۔ اشتراکیت ایک نیا نظام ہے جسے لوگ سو دو سو سال سے جاننے لگے ہیں۔ اس صورت میں "اشتراکیت اسلام" کہنا کہاں تک صحیح ہو سکتا ہے۔ مرتب کے نزدیک یہ اعتراض ایک حد تک صحیح ہے۔ لیکن اُن کا کہنا یہ ہے کہ اسلامی نظام میں جب اجتماعی عدل' اجتماعی کفالت اور اشتراکی عنصر کے حامل قواعد موجود ہیں۔ تو کیا اس صورت میں اُن کو جو اسلام کو ایک عقیدے اور نظام کے طور پر لوگوں کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں' یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ لوگوں کی عقلوں کے مطابق اُس زبان میں بات کریں' جسے وہ سمجھتے ہیں اور جس کے ذریعہ انہیں قائل کرنا آسان ہے۔ اس میں کوئی دغا یا فریب نہیں' بلکہ یہ آج کے زمانے کے اسلوب میں اپنی بات کہنا ہے۔

یوں اگر اقتصادی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے' تو اسلام الگ سے اقتصادی مسئلے کا کوئی حل نہیں پیش کرتا' لیکن اُس نے زندگی کے جملہ پہلوؤں سے جو عمومی بحث کی ہے' اُس میں ہمیں بے شک ایسے اُمور مل جاتے ہیں' جن کا تعلق معاملات' افراد اور معاشرے کے حقوق اور ملکیت وغیرہ سے ہے۔ چنانچہ جس طرح قرآن مجید کو ہم ایک ایسی کتاب کے طور پر نہیں لیتے

جس میں افلاک، طبائع اور عجائباتِ کائنات سے بحث کی گئی ہو، یا وہ علم تربیت اور سیاسیات وغیرہ کی کتاب ہو، اسی طرح قرآن مجید کو ہم ایسی کتاب نہیں سمجھتے، جس میں اقتصادی مسائل پر بحیثیت اقتصادی مسائل کے بحث ہو۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ اُس میں اِن سب اُمور کا اجمالی طور سے ذکر ہے اور وہ زندگی کا جو عمومی خاکہ پیش کرتا ہے، اُس میں یہ تمام چیزیں آتی ہیں۔

اب اسلام عقیدہ و ایمان، عبادات اور اخلاق بھی ہے اور معاملات بھی۔ عقیدہ و ایمان انسان میں یہ شعور پیدا کرتا ہے کہ اُس کا ایک خالق و ربّ ہے، جو بصیر و علیم ہے، اور اُس سے انسان کی کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں رہ سکتی۔ اُس کی بارگاہ سے اچھے کاموں کا اچھا بدلہ اور بُرے کاموں کا بُرا بدلہ ملے گا۔ یہ شعور ایک صاحبِ ایمان اور صاحبِ عمل شخصیت کی تشکیل کرتا ہے، اور یہی صحیح معنوں میں ایک صحت مند معاشرے کی بنیاد بنتی ہے۔

عقیدہ و ایمان اور عبادات و اخلاق کے بعد اسلام کا معاملات کا جو پہلو ہے، ہماری اشتراکیت کا خاص طور سے اسی سے تعلق ہے، لیکن ہم معاملات کو پہلی تین چیزوں سے الگ نہیں سمجھتے۔ ہمارے نزدیک یہ سب ایک وحدت ہیں۔ چنانچہ جب ہم اسلام کو "دین اشتراکیت" کہتے ہیں، تو اس سے ہماری مراد زندگی کا یہ پورا نقشہ ہوتا ہے۔ اور یوں بھی ہر عمل کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک رُوحانی دوسرا مادی۔ اور یہ عبادات میں بھی ہے اور معاملات میں بھی۔ مثال کے طور سے نماز کا مادی پہلو وہ ظاہری اعمال ہیں، جو ایک نمازی ادا کرتا ہے اور اُس کا روحانی پہلو صدقِ نیت اور اللہ تعالیٰ کی طرف پوری توجہ ہے۔ اور ان مادی و روحانی دونوں پہلوؤں سے مل کر نماز کامل ہوتی ہے۔ اِسی طرح مال خرچ کرنے اور ٹیکسوں کی ادائیگی کو لیجیے۔ یہ ظاہر میں سب مادی اُمور ہیں، لیکن ان کی ایک روحانی حقیقت بھی ہے۔ اور وہ یہ شعور ہے کہ ہم ایسا کر کے افراد کے مال میں اللہ تعالیٰ اور معاشرے کے جو حقوق ہیں وہ ادا کر رہے ہیں۔

مختصراً مرتب کے نزدیک اس کتاب کے مندرج مباحث میں اسلام میں جو اشتراکیت ہے، اُس کی حقیقت بیان کی گئی ہے اور ہمارے اشتراکی، ڈیموکریٹی (ڈیموقراطی) اور تعاونی معاشرے کی اشتراکیت کو اسلام میں معاملات کے جو اُصول و قواعد ہیں، اُن سے جس طرح کا گہرا تعلق ہے، اُس کی وضاحت ہے۔ اسی سے ہماری اشتراکیت کا اصلی ہونا اور جس سرچشمے سے وہ ہمارے ہاں پھوٹی ہے، اُس کا خالص ہونا یقینی ہوتا ہے اور اس کی رو سے وہ ارتقاء اور ترقی کی طرف انقلابی قدم اٹھا سکتی ہے۔

پہلی تقریر کا عنوان ہے "الاشتراکیۃ العربیۃ بین النظم" اور مقرر ہیں جامعہ قاہرہ کے معاشیات وعلوم سیاسیہ کے پروفیسر ڈاکٹر رفعت المحجوب۔ موصوف فرماتے ہیں کہ ہر اقتصادی نظام کا جس سے کہ تاریخ واقف ہے، اپنا ایک فلسفہ ہوتا ہے، جو اقتصادی نظام کے اغراض ومقاصد کو جن کے حصول میں وہ کوشاں ہو، ایک خاص شکل دیتا، اور اُس کے طریقہ کار کو معین کرتا ہے، اسی کو ہم اس نظام کا سیاسی، قانونی اور اجتماعی ڈھانچہ کہتے ہیں اور اسی سے نظام اقتصادی مرتب ہوتا ہے۔ اب سرمایہ دارانہ نظام کا اپنا ایک فلسفہ ہے۔ اور کمیونسٹ (شیوعی) نظام کا اپنا۔ باقی رہی عربی اشتراکیت، جسے ہم نے بطور ایک نظام کے اختیار کیا ہے، اُس کا بھی دوسرے اقتصادی نظاموں کی طرح اپنا ایک فلسفہ ہے۔ اس فلسفے کا نقطۂ آغاز یہ ہے کہ یہ ایک عربی فلسفہ ہے۔ اور پرانا فلسفہ ہے اور بیک وقت فرد اور جماعت دونوں کا قائل ہے۔ اس ضمن میں یہ خیال کرنا صحیح نہیں کہ یہ محض سرمایہ دارانہ رجحان اور شیوعی رجحان کے درمیان ایک طرح کی بیچ کی راہ ہے، بلکہ عربی اشتراکیت کے فلسفے کی اپنی ایک مستقل ذاتی حیثیت ہے۔ یہ قدیم فلسفہ ہے، اور اس کے اجزائے ترکیبی اُن روحانی دینی قدروں سے ماخوذ ہیں جو اُمتِ عربیہ کے ضمیر میں رسی بسی رہی ہیں، چنانچہ جب ہم اِن روحانی دینی قدروں کا جائزہ لیتے ہیں، تو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ فرد کی بھی قائل ہیں اور جماعت کی بھی۔ واقعہ یہ ہے کہ تمام کے تمام ادیان ایک انسان کا بحیثیت ایک فرد کے احترام کرتے ہیں اور اِس بنا پر اُس کے جو طبیعی حقوق ہیں، اُنہیں مانتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ سارے ادیان فرد کے بجائے جماعت کو وہ وجود سمجھتے ہیں جو بنی نوع انسان کے سلسلے کو جاری رکھتا ہے۔ بغرض ہمارے فلسفے میں فرد کا اپنا ایک مستقل وجود ہے، اور اسی طرح جماعت کا بھی اپنا ایک مستقل وجود ہے۔ اور عقل ومنطق کا یہ تقاضا ہے کہ ان میں سے ہر ایک اپنی طبیعی جگہ کو سنبھالے مصلحت خاصہ کا اپنا مقام ہو، اور مصلحت عامہ کا اپنا۔

یہ ہے وہ ڈھانچا، جس سے عربی اشتراکیت تشکیل پذیر ہوتی ہے۔ اب ہم وہ طریقہ، کار معین کرتے ہیں جس پر چل کر ہم ایک ایسا نظام بروئے کار لا سکتے ہیں، جس میں فرد اور جماعت دونوں کا احترام برقرار رہے۔ اس سلسلے میں ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم بیک وقت انفرادی ملکیت اور ملکیت عامہ دونوں کو قائم رکھیں، اسی لیے ہمارے ہاں ایک تو "پبلک سیکٹر" ہے، جو مفاداتِ عامہ کا خیال رکھتا ہے۔ اور ایک "پرائیویٹ سیکٹر" ہے، جو مفادات خاصہ کو ممکن العمل بناتا ہے، چنانچہ اسی بنا پر ہمارا نظام سرمایہ دارانہ نظام اور شیوعی نظام ہر دو سے مختلف ہے، وہ سرمایہ دارانہ نظام سے

اس لئے مختلف ہے کہ ہم "پبلک سیکٹر" کو وسیع مواقع دیتے ہیں، جو کہ سرمایہ دارانہ نظام نہیں کرتا۔ اور شیوعی نظام سے ہمارا یہ اختلاف ہے کہ ہم وسائل پیداوار میں انفرادی ملکیت کو برقرار رکھتے ہیں، اور یہ شیوعی نظام نہیں کرتا، بلکہ ہم تو اس نظام کے برعکس یہ کرتے ہیں، جس کا خلاصہ یہ ہے:۔

"جو مالک ہیں، اُن سے اُن کی املاک لیتے ہیں اور غلامین و کسانوں میں سے جو غیر مالک ہیں اُنہیں مالک بناتے ہیں۔" اور یہ واقعہ ہے کہ ہمارے نظام کا یہ جو مسلک ہے، یہ محض دو نظاموں (سرمایہ دار اور شیوعی) کا نقطۂ اوسط نہیں بلکہ یہ ایک خاص فلسفے کا حاصل ہے۔ غرض ہم قومی ملکیت کے اس لئے حامی نہیں کہ وہ قومی ہے اور انفرادی ملکیت کے اس لئے خلاف نہیں کہ وہ انفرادی ہے، بلکہ قومی ملکیت وہاں بروئے کار آتی ہے جہاں پیداوار بڑھانے، عدل اجتماعی قائم کرنے اور محتاج طبقوں پر خرچ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ جب ہم دیکھتے ہیں کہ انفرادی ملکیت ان مقاصد کو پورا نہیں کر رہی اور وہ تغلب، معاشی استحصال اور اجارہ داری کا ذریعہ بن گئی ہے تو ہم منصفانہ معاوضہ دے کر انفرادی ملکیت کو ختم کر دیتے ہیں، لیکن جہاں انفرادی ملکیت سے اِن مقاصد پر زد نہ پڑے، ہم وہاں اُس کا احترام کرتے ہیں، اور اُسے برقرار رہنے دیتے ہیں۔

اپنے اس فلسفے کی روشنی میں ہمارا اجتماعی اسلوبِ زندگی بھی سرمایہ دارانہ اور شیوعی اسلوب زندگی سے مختلف ہے ہم ایک طرف سرمایہ دارانہ نظام کے برعکس آبادی کے مختلف طبقات میں بہت زیادہ تفاوت تسلیم نہیں کرتے اور نہ اُن کے درمیان سماجی دیواریں کھڑی کرنے کے حق میں ہیں، دوسری طرف ہم شیوعی نظام کی طرح طبقاتی کشمکش کے وجود کو تسلیم نہیں کرتے۔ بلکہ ہمارا اجتماع کی وحدت اور اُس کے افراد کے درمیان تعاون پر ایمان ہے اور یہ اس لئے کہ ہم عدل اجتماعی پر ایمان رکھتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اجتماعی وحدت اور عدل اجتماعی میں طبقاتی کشمکش کا زیادہ امکان نہیں۔ اسی بناء پر یہ ایک منطقی بات ہے کہ ہم طبقات کے باہمی اختلافات کو ختم کرنے کی طرف توجہ کریں تاکہ ہر فرد کو اپنی استعداد اور کارکردگی کے مطابق سرگرم عمل ہونے کا اجتماعی موقع ملے۔

مزید برآں ہم شیوعی نظام کے برعکس اجتماعی طبقات کا صفایا نہیں کرتے اور نہ اس کی اجازت دیتے ہیں کہ صرف پرولتاری طبقہ اقتدار پر قابض ہو، بلکہ ہم اجتماع کی وحدت اور اجتماعی عدل قائم کرتے ہیں۔ یہی ہمارا فلسفہ ہے۔ اسی مقصد کو ہم سامنے رکھتے ہیں۔ یہ ہمارا طریقہ کار ہے اور ان سب سے مل کر ہمارا نظام مرتب ہوتا ہے۔

دوسری تقریر جامعہ قاہرہ کے پروفیسر ڈاکٹر عبدالعزیز کامل کی ہے۔ موصوف نے اشتراکیت اسلام کے طریقۂ کار پر روشنی ڈالی ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ قرآن مجید میں ہے "یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَی اللّٰہِ وَاللّٰہُ ھُوَالْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ" (اے لوگو! تم سب اللہ کے محتاج ہو اور اللہ بے نیاز اور قابل تعریف ہے) اب جہاں تک لوگوں کے اللہ تعالیٰ کا محتاج ہونے کا تعلق ہے، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ تمام وسائل اور طاقتیں جن سے افراد کام لیتے اور افزائش دولت کرتے ہیں وہ سب اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ہیں؛ چنانچہ اس لحاظ سے افراد اللہ کے محتاج ہیں، اسی بنا پر اُن کے مال میں اللہ تعالیٰ کا حصہ ہے۔ اور یہ مال اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُن کے پاس بطور امانت کے ہے۔

یہ تھا وہ عقیدہ جس کے عملی مظاہر ہمیں آنحضرت صلعم اور آپؐ کے صحابہؓ کی زندگیوں میں ملتے ہیں۔ وہ مال کو اللہ کی امانت سمجھتے تھے اور اُس کے احکام کے مطابق اُسے خرچ کرتے تھے۔

ڈاکٹر موصوف کے نزدیک اقتصادیات اور عقائد و عبادات و اخلاق الگ الگ چیزیں نہیں، بلکہ یہ سب ایک کامل اجتماعی نظام کا حصہ ہیں، جو نماز، زکوٰۃ، اخلاق اور اقتصادیات میں فرق نہیں کرتا۔ اس کی نظر میں افراد محض دولت پیدا کرنے والے آلات نہیں، بلکہ اُن کا ایک روحانی وجود بھی ہے، جس کے اپنے حقوق ہیں۔ اسی طرح اُن کے بدن کے بھی حقوق ہیں۔

جامعہ ازہر کی کلیہ شریعت کے عمید (پرنسپل) شیخ محمد محمد مدنی نے اسلام میں اشتراکیت کے بنیادی قواعد اور اُس میں جو اجتماعی کفالت کا نظام ہے، اُس پر بحث کی ہے۔ موصوف کے نزدیک قبل از اسلام احبار و رہبان نے بادشاہوں اور اصحاب اقتدار کی مدد سے انسانوں کو طبقات میں تقسیم کر دیا تھا۔ اسلام نے آکر انسانی مساوات کا اصول نافذ کیا۔ ہر وہ سیادت و اقتدار جو خون، نسل اور مذہبی گدی سے ماخوذ تھی اُسے ختم کیا اور مرد و عورت کی غیر منصفانہ تقسیم کو مٹایا۔ اُس نے اعلان کیا کہ سب انسان ایک ہی نوع بشر ہیں اور سب کا مورث اعلیٰ ایک ہی ہے؛ چنانچہ بلالؓ جو ایک حبشی غلام تھے، وہ علیؓ کے جو خالص النسب قریشی تھے، ساتھی بن گئے۔ سلمان فارسیؓ عمرؓ بن خطاب کے ہم مثل اور بھائی تھے، اور آزاد کردہ غلام زیدؓ کے صاحبزادے اُسامہؓ ایک ایسے لشکر کے سپہ سالار بنے جس میں بڑے بڑے قریشی تھے۔

قرآن مجید کی وہ جامع آیت جو مساواتِ انسانی کے اُصول کو معین کرتی ہے حسب ذیل ہے:۔

"یٰاَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ وَّخَلَقَ مِنْھَا زَوْجَھَا وَبَثَّ مِنْھُمَا رِجَالًا کَثِیْرًا وَّنِسَآءً وَاتَّقُوا اللّٰہَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِہٖ وَالْاَرْحَامَ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلَیْکُمْ رَقِیْبًا۔

(اے لوگو ڈرتے رہو اپنے رب سے جس نے پیدا کیا تم کو ایک جان سے اور اُسی سے پیدا کیا اُس کا جوڑا اور پھیلائے ان دونوں سے بہت مرد اور عورتیں اور ڈرتے رہو اللہ سے جس کے واسطے سے سوال کرتے ہو آپس میں اور خبردار رہو قرابت والوں سے۔ بے شک اللہ تم پر نگہبان ہے) مقرر موصوف نے بتایا کہ اس آیت میں اُس پہلے بنیادی اُصول کا تعین کیا گیا ہے جو ایک صحت مند معاشرے کے قیام کے لئے لازمی ہے۔ اور وہ بنیادی اُصول ہے اللہ کی نظر میں اور اُس سے ڈرتے ہوئے اور اُس کی نگہبانی میں سب انسانوں کا مساوی ہونا اور اُن سب کا ایک مرد اور عورت سے پھیلنا۔ اور بقول شیخ مدنی کے اس آیت سے حسب ذیل اُمور منتج ہوتے ہیں:۔

(۱) طبیعی تفریقات کا خاتمہ (۲) دینی اور نسلی تفریقات کا خاتمہ

(۳) مرد اور عورت میں اجتماعی تفاوت کا خاتمہ

(۴) معاشرے میں ایک نفسی و معنوی انتباہ کرنے والی چیز۔ اور وہ ہے اللہ سے ڈرنا۔

(۵) انسانی رشتے کے جذبے کو اُبھارنا[1]، والارحام میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔

وزارت اوقاف کے مدیر مساجد شیخ الغزالی نے وسائل ملکیت اور ملکیت کی تحدید پر تقریر کی، موصوف نے فرمایا کہ اشتراکیت ایک نیا لفظ ہے جو قدیم معنی کی ترجمانی کرتا ہے اور وہ ہے حیات عامہ میں کمالِ انسانی کے معانی میں سے ایک معنی۔ اشتراک انفرادیت کی ضد ہے۔ اور جہاں انفرادیت انانیت، حرص اور خود پرستی سے عبارت ہے وہاں اشتراک دوسرے کی محبت، اس کے احترام اور اُس کے حقوق کے احساس پر دلالت کرتا ہے۔ اشتراکی معاشرے کے معنی یہ ہیں کہ جماعتی زندگی ایک ایسے اخلاقی نظام کے مطابق ہو، جس میں باہمی تعاون، ایثار، کفالت، عدل و انصاف سب کے لئے یکساں مواقع اور طبقاتی توازن ہو۔ یعنی اُس معاشرے میں جنبہ داری، لالچ، ظلم اور اجارہ داری کی برائیاں

---

[1] شاہ عبدالقادرؒ کے موضح قرآن میں ہے "یعنی ایک آدم سے حوا کو بنایا پھر اُن سے سارے لوگ، اور خبردار ہو ناتوں سے یعنی بدسلوکی مت کرو آپس میں۔ ۱۲

مفقود ہوں۔ غرض ان معنوں میں اشتراکیت، ایک اسلامی نظام ہے، جس کا تانا بانا ثابت شدہ نصوص اور ایسی تعلیمات اور تطبیقات سے مرکب ہے، جس میں کوئی شک نہیں، بلکہ قدیم عرب اپنے ابتدائی معاشرے میں جہاں فطری سلامت روی کا دور دورہ تھا، انہی اخلاق کے مطابق زندگی گذارتے تھے۔

اس ضمن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث ہے۔ آپؐ فرماتے ہیں۔ جس شخص کے پاس فالتو سواری ہو، وہ اس شخص کو جس کے پاس سواری نہیں دے۔ جس شخص کے پاس فالتو زادراہ ہے، وہ اس شخص کو دے، جس کے پاس نہیں۔ راوی حدیث کا بیان ہے کہ آپؐ نے ہر مال کی صنف کا ذکر کیا، یہاں تک ہم نے جان لیا کہ ہم میں سے کسی کو اپنے فالتو مال میں کوئی حق نہیں۔ مقرر کے نزدیک مدینہ میں جو پہلا اسلامی معاشرہ معرض وجود میں آیا۔ وہ انہی بنیادوں پر تھا، موصوف نے اس معاشرے کی بہت سی مثالیں پیش کیں۔

وہ مال جو ہمارے ہاتھوں میں ہے، کیا وہ بلا شرط اور بلا تحدید ہماری ملکیت ہے کہ ہم اس میں سے جیسے چاہیں تصرف کریں یا یہ ملکیت محدود اور معاشرے کے قوانین کے تابع ہے۔ اس معاملے میں نصوص دینی بالکل واضح ہیں، اُن کے نزدیک ہماری یہ ملکیت حقیقی نہیں، بلکہ ہمیں یہ مال بطور امانت کے ملا ہے۔ چنانچہ یہ سمجھنا کہ مال والے اپنے مالوں میں جو تصرف کرتے ہیں، اس کا حساب وہ صرف آخرت میں دیں گے، صحیح نہیں اور اسلامی اصول اور خلفائے راشدین کا عمل اس کے ثبوت میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

ہم ایسے اور اس قسم کے دوسرے اُمور کے لئے ایک عام قاعدہ قرآن کریم کی اس آیت سے اخذ کرتے ہیں:۔ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (ہم نے بھیجے ہیں اپنے رسول نشانیاں دے کر اور اُتاری اُن کے ساتھ کتاب اور ترازو تا کہ لوگ سیدھے رہیں انصاف پر) یعنی دینوں اور رسالتوں کا اولیں مقصد عدلِ اجتماعی وسیاسی کے قیام اور مادی اور معنوی قوانین کے اجراء کے ذریعہ لوگوں میں توازن قائم کرنا ہے۔ اور ظاہر ہے وہ ترازو جو نبیوں کے ساتھ اُتاری گئی، وہ عام ترازو نہیں جسے تاجر استعمال کرتے ہیں، بلکہ وہ قانون کی ترازو ہے، جو لوگوں کے اعمال واطوار کے نظم وضبط، اُن کے حقوق وواجبات کی تقسیم اور جماعتوں کی تنظیم کے لئے مصلحین کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ بے شک اس ترازو کے احکام زمانوں کے ساتھ ساتھ بدلتے ہیں۔ اور ملکوں اور ماحول کی تبدیلی کے ساتھ ان میں تبدیلی ہوتی ہے، لیکن جہاں تک "قیام الناس بالقسط"

(لوگوں کو انصاف پر سیدھے رکھتے) کا سوال ہے، وہ ایک ایسا بنیادی محور ہے، جس میں کبھی تبدیلی نہیں ہوگی۔

بعض علمائے اُصول کا کہنا ہے کہ اگر لوگوں کے "مصالح مرسلہ"[1] کے عملی جامہ پہننے میں کوئی نص روک ہو، تو اس نص کی تاویل کی جائے اور "مصالح مرسلہ" کو جن کے بغیر چارہ نہیں، عملی شکل دے دی جائے۔ غرض جب انسانی جماعت کی اصلاحِ حال کا مسئلہ دین کی نظر میں یہ مقام رکھتا ہے، تو کیا کسی ایک طبقے کے حاصل شدہ اور غصب شدہ حقوق ایک معاشرے کی عام بہبود اور اُس کے افراد کی غالب اکثریت کی سعادت کے حصول میں روک بن سکتے ہیں۔ اور کیا اس صورت میں جائز نہیں ہوگا کہ جہالت، ذلت اور افلاس کی زنجیروں کو توڑنے کے لئے جن میں عوام کی ایک بڑی اکثریت جکڑی ہوئی ہے زرعی آراضی اور صنعتی اداروں کی ملکیت کو محدود کردیا جائے، اس کی مخالفت دین سے بے خبری اور ظلمِ عظیم ہے۔

شیخ الغزالی فرماتے ہیں کہ لوگوں سے اُن کے مال کا حساب اِس دنیا میں بھی ہوگا اور آخرت میں بھی۔ اور اموال میں انفرادی، اجتماعی اور سیاسی مصلحتوں کو ملحوظ رکھنا ہی اُن کا حساب ہے۔ چنانچہ دینی نقطۂ نظر سے حکومت کو اس کا پورا حق ہے کہ وہ ان مصلحتوں کو پورا کرنے کے لئے جو بھی چاہے حل پیش کرے اور جس قسم کے بھی چاہے قانون بنائے اور جب تک وہ حق کے لئے کوشاں اور عدل اجتماعی کو بروئے کار لانے کی ساعی ہے، اُسے پورا اطمینان ہونا چاہیئے کہ دین اُس کے ساتھ ہے نہ کہ اُس کے خلاف۔

شیخ موصوف کی تقریر کا آخری جملہ یہ ہے:۔

"آج حکومت پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ ظلم کرنے والے ہاتھوں کو روکے اور پوری قوم کے مفادات کے لئے مال فراہم کرے۔ نیز وراثت ملکیت ہی کی ایک شاخ ہے اور چوری ملکیت نہیں ہو جاتی"۔

---

[1] "..... سوائے داؤد ظاہری کے تمام ائمہ اس اُصول پر متفق ہیں کہ مسائل معاملات میں عقلی پیمانے استعمال کیے جاتے ہیں۔ اور وہ مصالح اور رفاہ عامہ پر مبنی ہیں۔ جب شرع ان مصالح کا جواز یا عدم جواز نص یا قیاس کے ذریعہ واضح کردے تو اس کی تعمیل ضروری ہے، لیکن جب شرع مصالح کے بارے میں خاموش رہے یعنی جب دلائل شرعیہ کسی امر کی مصلحت کو واضح نہ کریں تو ہم اس میں مصالح عامہ سے استصواب کرسکتے ہیں امام مالک نے اس کو جائز قرار دیا ہے یعنی اُن کے نزدیک مصلحت بھی ایک دلیل شرعی ہے۔ انہوں نے اس جدید دلیل کا نام "مصالح مرسلہ" اسی لئے رکھا ہے..... "الخ (فلسفہ شریعت اسلام تالیف ڈاکٹر صبحی اردو ترجمہ)

"فضیلۃ الاستاذ" شیخ احمد الشرباصی جمعیات شبان المسلمین کے "رائد عام" نے "المال والاشتراکیۃ فی الاسلام" کے موضوع پر تقریر کی۔ آپ نے فرمایا کہ لفظ "اشتراکیت" ہمارے ہاں جن معنوں میں معروف و مشہور ہے اُس سے مراد یہ ہے:۔ لوگ خیر اور بھلائی کے کاموں میں ایک دوسرے کے ساتھ شریک ہوں۔ نعمتوں کو آپس میں بانٹیں، اُن میں باہم اس طرح میل ملاپ ہو، جیسے وہ ایک جسم کے اعضا اور ایک عمارت کی اینٹیں ہیں تاکہ اُن سے کینے اور عداوتیں دور ہو جائیں اور ایک قوم کے مختلف طبقوں میں بہت زیادہ فرقِ مراتب نہ رہے اور یہ نہ ہو کہ ایک تو حد سے زیادہ امیر ہو۔ اور دوسرا اتنا غریب ہو کہ اُسے کھانے کو نہ ملے۔

اب واقعہ یہ ہے کہ دینِ حنیف اپنی نصوص و روح اور اپنے قوانین کے ذریعہ ایک ایسی اشتراکیت کو بروئے کار لانا چاہتا ہے جو انسانیت، اخلاق، عدل و انصاف اور فضیلت پر مبنی ہو، اور وہ جامع ہو عدلِ اجتماعی اور انفرادی ملکیت ہر دو پر۔ تاکہ اس طرح ایک طرف تو فرد کا حق محفوظ رہے اور دوسری طرف جماعت و اجتماع کے حقوق کی حفاظت ہوتی رہے اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ قرآن مجید ہمیں بتاتا ہے کہ جماعتوں اور قوموں کی ہلاکت کا سبب یہ ہوا کرتا ہے کہ اُن میں ایک حد سے زیادہ دولت مند و آرام طلب طبقہ ہوتا ہے جو ساری نعمتوں اور آسودگیوں کو اپنے لئے مخصوص کر لیتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:۔

وَإِذَا أَرَدْنَا أَن نُّهْلِكَ قَرْيَةً أَمَرْنَا مُتْرَفِيهَا فَفَسَقُوا فِيهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنَاهَا تَدْمِيرًا[۱]

مزید برآں اسلام نے اپنے ماننے والوں کے نفوس میں "صاحب فضیلت اسلامی اشتراکیت" کی روح کو مستحکم کرنے کے لئے اس امر کی صراحت فرمائی ہے کہ زمین اور آسمانوں میں جو بھی مال، جائداد، قوتیں اور ثروت ہے، وہ سب کی سب فی الحقیقت اللہ کی ملکیت ہیں، کیونکہ اُن کو پیدا کرنے والا اور وجود میں لانے والا ہے۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے۔

"وَلِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۔۔ وَبِيَدِهِ مَلَكُوتُ كُلِّ شَيْءٍ"[۲]

نیز قرآن مجید میں ہے۔ "وَقُلِ اللَّهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَن تَشَاءُ وَتَنزِعُ الْمُلْكَ مِمَّن تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَن تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَن تَشَاءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ إِنَّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ"[۳]

---

۱ (ترجمہ) جب ہم کسی بستی کو تباہ کرنا چاہتے ہیں، تو ہم اُس کے دولت مند آرام طلب طبقے کو ۔۔۔۔۔۔ حکم دیتے ہیں، چنانچہ وہ اس میں فسق و فجور کرتا ہے۔ جس کی وجہ سے اللہ کا حکم اُس پر صادق آتا ہے۔ اس کے بعد ہم اس بستی کو تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔

۲ (ترجمہ) "جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، وہ سب اللہ کا ہے۔" "اُسی کے ہاتھ میں ہر شئے کا اختیار و اقتدار ہے۔"

۳ کہہ دے! اے اللہ تو ہی اختیار کا مالک ہے، جسے تو چاہتا ہے، اختیار دیتا ہے، جس سے چاہتا ہے اختیار چھین لیتا ہے، جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے جسے چاہتا ہے ذلیل کرتا ہے، تیرے ہاتھ ہی میں ساری بھلائی ہے۔ بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔ ۱۲

لیکن اس کے ساتھ یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ انسان کو جو مالک بنایا گیا ہے، تو اس کی ملکیت مستعار ہے۔ حقیقی مالک اللہ ہی ہے، انسان اس ملکیت میں اللہ تعالیٰ کا صرف قائم مقام اور وکیل ہے۔ اور وکیل کا یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ اصل مالک کے احکام کے مطابق عمل کرے۔ چنانچہ قرآن مجید میں آیا ہے "اَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَکُمْ مُّسْتَخْلَفِیْنَ فِیْہِ"[1]۔ اسی طرح ارشاد ہوتا ہے "وَاٰتُوْھُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰہِ الَّذِیْٓ اٰتٰکُمْ"[2]۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ "المال مال اللہ وانا عبدہ"[3]

اسلام نے یہ بھی بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں جو نعمتیں پیدا کی ہیں، وہ دوسروں کو چھوڑ کر صرف ایک طبقے کے لئے مخصوص نہیں، بلکہ تمام مخلوقات اللہ تعالیٰ کی آل و عیال[4] اور اسی کے بندے ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے زمین میں جو کچھ پیدا کیا ہے، وہ سب ان کے لئے ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ "ھُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا"[5] نیز "وَسَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا"[6]۔ اور قرآن مجید میں ہے۔ "وَلَا تُؤْتُوا السُّفَھَآءَ اَمْوَالَکُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰہُ لَکُمْ قِیٰمًا"[7]۔ یہاں جن اموال کا ذکر ہے وہ سفہار کے اموال ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں "اموالکم" یعنی تمہارے اموال کہا ہے۔ یعنی اموال اصل میں اور عمومی طور پر قوم کے ہیں اور انہیں کوئی ایک شخص یا طبقہ اپنی اجارہ داری نہیں بنا سکتا۔

اس کے ساتھ ہی اسلام ملکیت کا اثبات اور احترام کرتا ہے۔ قرآن مجید میں آیا ہے "فَاِذَا قُضِیَتِ الصَّلٰوۃُ فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ وَاذْکُرُوا اللّٰہَ کَثِیْرًا لَّعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ"[8]

---

[1] (ترجمہ) خرچ کرو اس مال میں سے جس کا اللہ نے تمہیں جانشین بنایا ہے۔

[2] اللہ کا مال جو تمہیں اس نے دیا ہے، وہ ان کو دو۔

[3] مال اللہ کا ہے۔ اور میں تو اس کا بندہ ہوں۔

[4] الخلق کلھم عیال اللہ وعبادہ

[5] وہی ہے جس نے تم سب کے لئے جو کچھ زمین میں ہے، پیدا کیا۔

[6] اسی نے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، تم سب کے لئے مسخر کیا۔

[7] اور نہ دو بے سمجھوں کو اپنے اموال جو کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے زندگی کا ذریعہ بنائے ہیں۔

[8] پس جب نماز ہو چکے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل ڈھونڈھو اور اللہ کو بہت یاد کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔

اللہ تعالیٰ کے فضل کو ڈھونڈنے سے مراد کسب رزق اور اُس کی ملکیت ہے اور حدیث نبوی میں مسلمان کے اُس مال کی جو "صحیح مسلم" کو حرمت کا یوں اثبات کیا گیا ہے۔

کل المسلم علی المسلم حرام: دمہ ومالہ وعرضہ[1]۔

تعلیمات اسلامی سے یہ مفہوم بھی ملتا ہے کہ ملکیت کا اصل ذریعہ عمل ہے، اگرچہ انسان عمل کے علاوہ وراثت، ہبہ اور وصیت سے بھی ملکیت حاصل کرتا ہے، لیکن یہ تینوں طریقے بہت کم ہیں۔ زیادہ تر عمل ہی ملکیت کو ممکن بناتا ہے۔ چنانچہ اسلام بار بار کسب رزق، افزائش پیداوار اور ملکیت کے لئے سعی و عمل کی تاکید کرتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے "ھُوَ الَّذِی جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ ذَلُولًا فَامْشُوا فِی مَنَاکِبِھَا وَکُلُوا مِن رِّزْقِہِ وَاِلَیْہِ النُّشُورُ[2]" اور اسی طرح ارشاد ہوتا ہے۔ "وان لیس للانسان الا ما سعیٰ[3]"۔ اسی ضمن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ "بہترین کسب اور کمائی یہ ہے کہ آدمی اپنے ہاتھ سے کام کرے"۔ اسی طرح آپؐ کا ارشاد مبارک ہے "ایک شخص کا بہترین کھانا یہ ہے کہ وہ اپنے ہاتھ سے کما کر کھائے"۔ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو دیکھا کہ اُس کا ہاتھ کام کرتے کرتے تھک گیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا "یہ وہ ہاتھ ہے جسے اللہ اور اس کا رسول محبوب رکھتا ہے"۔ ایک حدیث میں آپؐ کا ارشاد مبارک ہے کہ اللہ تعالیٰ حرفے والے بندے کو محبوب رکھتا ہے؛ اور حضرت عمرؓ کہا کرتے تھے کہ میں ایک آدمی کو دیکھتا ہوں اور اُس کی شکل و صورت مجھے بڑی اچھی لگتی ہے۔ لیکن جب کہا جاتا ہے کہ "لَا عَمَلَ لَہٗ" (اُس کا کوئی عمل نہیں) تو وہ میری نظر میں گر جاتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ وہ مال جو صحیح طریقے سے ایک مسلمان کی ملکیت میں آئے اسلام اُس ملکیت کا اثبات اور احترام کرتا ہے لیکن اس کے بعد صاحب مال پر واجب ہے، کہ اس مال پر اللہ اور اُمت کا جو حق ہے، اُسے وہ ادا کرے۔ اللہ کا حق مقرر ہے اور اُس سے مفر نہیں۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے "والذین فی اموالھم حق

---

[1] ہر مسلمان دوسرے کے لئے حرمت کے قابل ہے یعنی اُس کا خون اُس کا مال اور اُس کی آبرو،

[2] اُسی نے زمین کو تمہارے لئے ہموار و نرم بنایا ہے کہ تم اُسکے راستوں میں چلو اور اللہ کے رزق سے کھاؤ اور اُسی کی طرف تمہیں لوٹنا ہے۔

[3] انسان کے لئے وہی ہے جس کے لئے وہ کوشش کرتا ہے۔

معلوم للسائل والمحروم[1]۔ اور اس سلسلے میں بعض حق بندے کی مرضی پر بھی ہیں، جیسے صدقہ اور دوسروں کے ساتھ احسان کرنا۔ باقی رہا اُمت کا حق، تو وہ ہے، جسے شرعی حاکم (ولی الامر) معین کرتا ہے۔ اسے عہدِ حاضر کی زبان میں ٹیکس کہتے ہیں اور۔ اُمت کے مفاد عامہ کے لئے وصول کیئے جاتے ہیں۔ اس کے بعد بھی اگر صاحبِ مال اپنا مال دوسروں کو نقصان پہونچانے یا اللہ کی طرف سے ممنوع شدہ طریقوں پر صرف کرتا ہے، تو اس صورت میں بھی حاکم مداخلت کرنے کا مجاز ہے۔ غرض اگر انفرادی ملکیت ان حدود میں رہے، تو یقیناً اسلام اس کا حق تسلیم کرتا ہے۔

اسلام ایک طرف فقر و احتیاج کو ناپسند کرتا ہے اور دوسری طرف وہ مال جمع کرنے والوں کو بھی اِن الفاظ میں انتباہ کرتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ " والذین یکنزون الذھب والفضۃ ولا ینفقونھا فی سبیل اللہ فبشرھم بعذاب الیم یوم یحمی علیھا فی نار جھنم فتکوی بھا جباھھم وجنوبھم وظھورھم ھذا ما کنزتم لانفسکم فذوقوا ما کنتم تکنزون[2]"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے فضیلت والے مثالی اشتراکی معاشرے کی تشکیل کا آغاز اُس وقت کیا جب آپؐ نے بے خانماں مکے سے نکالے ہوئے مہاجرین اور زمینوں اور مکانوں والے انصار میں بھائی چارہ کی بنیاد رکھی۔ اور اکثر انصار نے جو کچھ اُن کے پاس تھا اُس میں اپنے مہاجر بھائیوں کو برابر کا شریک کر لیا اس کے بعد وہ مال غنیمت جو کسی لشکرکشی کے بغیر آیا، اُسے آپؐ نے تہی دست مہاجروں اور بعض انصار کو جو اُن کی طرح تہی دست تھے، دے دیا، تاکہ سب مومنین میں ایک طرح کی مساوات ہو جائے اور جیسا کہ قرآن مجید میں ہے، دولت صرف اغنیاء میں گھومتی نہ رہے[3]۔

---

[1] (ترجمہ) اُن کے اموال میں سائل اور محروم کا ایک معین حق ہے۔

[2] وہ لوگ جو سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اُسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے انہیں دردناک عذاب کی خوش خبری دو۔ اُس دن جب اس پر دوزخ کی آگ گرم کی جائے گی اور اسی سے ان لوگوں کی پیشانیوں، پہلوؤں اور پیٹھوں پر داغا جائیگا۔ یہ ہے جو تم جمع کرتے تھے اپنے لئے لو اب چکھو جو تم جمع کرتے تھے۔

[3] کی لا یکون دولۃ بین الاغنیاء منکم"

علاوہ ازیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت سی احادیث مروی ہیں، جن میں بقول الشیخ احمد الشرباصی کے ہم "اسلامی انسانی اخلاقی مومن اشتراکیت" کے واضح نقوش پاتے ہیں۔ اس ضمن میں مقرر موصوف نے امام ابن حزم کا ایک قول نقل کیا ہے، جس کا ترجمہ یہ ہے "ہر شہر کے اغنیاء پر فرض ہے کہ وہ اپنے ہاں کے محتاجوں کی ضرورتیں پوری کریں اور حاکم وسلطان اس پر انہیں مجبور کر سکتا ہے۔ اگر اس کے لئے زکوٰۃ اور سارے مسلمانوں کے فی[1] کے اموال کافی نہ ہوں، تو ان کے لئے ضروری کھانے کا انتظام کیا جائے۔ سردی اور گرمی کے لئے کپڑوں کا انتظام ہو اور مکانوں کا انتظام ہو، جہاں وہ بارش، دھوپ، گرمی اور گزرنے والوں کی نظروں سے محفوظ رہیں۔"

اب رہا سوال قومی ملکیت میں لینے یعنی "تامیم" کا، کہ اس کا اشتراکیتِ اسلام سے کہاں تک تعلق ہے اس میں شک نہیں کہ اسلامی اشتراکیت ایک انسانی، انصاف پسند، معتدل اور حد سے نہ بڑھنے والی اشتراکیت ہے، چنانچہ جہاں اسلام تجارت کو حلال اور سود کو حرام قرار دیتا ہے، وہاں وہ اجارہ داری کے خلاف ہے۔ وہ ایک طرف انفرادی ملکیت کی اجازت دیتا ہے اور دوسری طرف معاشرے کو تمام افراد کا کفیل ٹھہراتا ہے۔ اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا کہ اُمت کی بنیادی ضرورتیں فراہم کرنے والے وسائل ایک فرد یا چند افراد کی ملک ہوں۔ رسول اللہ صلعم فرماتے ہیں "تین چیزوں میں سب لوگ شریک ہیں:۔ پانی، گھاس، اور آگ" ان تین چیزوں سے آپ اُن سب چیزوں کو قیاس کر سکتے ہیں جن سے آج عمومی مفادات وابستہ ہیں۔

اسلام میں قومی ملکیت کی تائید میں یہ دلیل دی جاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں "نقیع" کے رقبے کو "حمیٰ" قرار دیا تھا کہ وہاں عام مسلمانوں کے گھوڑے چرا کریں، اور وہ کسی فرد واحد کی ملکیت نہ ہو۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ آپ نے اُسے اُمت کی ملک قرار دیا تھا اور اسی کو قومی ملکیت (تامیم) کہتے ہیں۔ اسی طرح حضرت عمرؓ نے ربذہ کے قطعۂ زمین کو "حمیٰ" قرار دیا اور اسے سارے مسلمانوں کے لئے چراگاہ بنا دیا۔ اور جب اس قطعۂ زمین کے مالکوں نے کہا کہ اے امیر المومنین! یہ ہماری زمین ہے، ہم زمانۂ جاہلیت میں اس کے لئے لڑتے رہے ہیں اور جب ہم اسلام لے آئے تو یہ ہمارے پاس تھی، تو اب آپ کیسے اسے "حمیٰ" قرار دیتے ہیں۔ اس پر

---

[1] فیٔ کے معنی مال غنیمت کے ہیں۔ ۱۲

حضرت عمرؓ نے تھوڑی دیر کے لئے اپنا سر نیچے جھکا لیا اور سوچنے لگے۔ اس کے بعد فرمایا "یہ مال اللہ کا ہے، اور بندے اُس کے بندے ہیں، خدا کی قسم اگر میں یہ اللہ کے راستے میں نہ کر رہا ہوتا، تو اس زمین کی ایک بالشت بھی "حمیٰ" "نہ قرار دیتا"۔ اسی طرح اسلام میں "وقف" کا جو نظام ہے اس سے قومی ملکیت اور "تامیم" کے حق میں استدلال کیا گیا ہے۔ کیونکہ "وقف" سے مراد یہ ہوتی ہے کہ وقف شدہ جائداد صاحب جائداد کی ملکیت سے نکل کر اللہ کی ملکیت میں چلی گئی اور اللہ کی ملکیت کے معنی ہیں کہ اُس کے بندے اُس جائداد سے فائدہ اُٹھائیں۔

"تامیم" کے حق میں یہ دلیل بھی دی گئی ہے کہ حضرت عمرؓ نے شام و عراق کی اراضی مسلمان فاتحین میں تقسیم کرنے سے انکار کر دیا تھا، اور حضرت معاذؓ بن جبل نے اس کی تائید میں فرمایا تھا "اے امیر المومنین! اگر آپ نے ان اراضی کو تقسیم کر دیا تو ان کی ساری آمدنی انہی لوگوں کے ہاتھوں میں رہے گی، اور جب یہ مر جائیں گے تو، یہ آمدنی ایک فرد واحد مرد یا عورت کو ملے گی"۔

اس سلسلے میں یہ ذکر کرنا بھی مناسب ہے کہ حاکم جسے فقہا، کی اصطلاح میں "امام" سے تعبیر کیا گیا ہے، کسی ملکیت کے "حق مطلق" کو مقید کر سکتا ہے، جیسے کہ غیر آباد زمینوں کے آباد کرنے کے مسئلے سے واضح ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلعم کا ارشاد ہے کہ "جس نے کوئی غیر آباد زمین آباد کی، وہ اُس کی ہے" اس کے بارے میں ابو حنیفہؒ کا قول ہے "کہ بے شک یہ اُس کی ہے لیکن امام کی اجازت سے"۔ ابو حنیفہ نے یہ شرط اس لئے لگائی ہے تاکہ اس کے متعلق لوگوں میں اختلاف نہ ہو۔ اور ملکیت کے حق مطلق کو محدود کرنے کا یہ اختیار مصلحت عامہ کے تحت دیا گیا ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں امام ابو یوسفؒ کتاب الخراج" میں لکھتے ہیں کہ اس معاملے میں امام پر واجب ہے کہ وہ جس میں مسلمانوں کی بھلائی اور عام فائدہ دیکھے، وہ کرے۔

مسلمان حکومتوں کی طرف سے جو اراضی بطور "جاگیروں" (اقطاع) کے دی جاتی تھیں ہمارے ہاں اس کے بارے میں بعض غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں، اس سلسلے میں صحیح صورت یہ ہے:- ایک روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے بلال بن حارث مُزنی کو مدینہ کے نواح میں عقیق کا قطعہ اراضی دیا۔ جب حضرت عمرؓ کا زمانہ آیا تو آپ نے بلال سے کہا کہ رسول اللہؐ نے تمہیں یہ زمین آباد کرنے کے لئے دی تھی، اب تم نے جو آباد کی ہے، وہ تو رکھ لے، باقی واپس کر دے۔ ابو عبید نے اپنی کتاب "الاموال" میں یہ واقعہ بیان کیا ہے:-

اگر ہم ائمہ مسلمین میں سے بعض کبار کی تاریخ دیکھیں، تو اُن کی زندگیوں میں اسلامی اشتراکیت کی روح نمایاں نظر آئے گی۔ مقرر نے اس کے ثبوت میں حضرت عمرؓ بن خطاب اور حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز کے بعض واقعات بیان کیے اور آخر الذکر کے بارے میں بتایا کہ کس طرح انہوں نے مسندِ خلافت پر بیٹھتے ہی وہ سارے اموال اور آراضی جو انہیں آباؤ اجداد سے ورثے میں ملی تھیں، اُن کے اصل مالکوں کو لوٹا دیں۔

کتاب میں دو تقریریں اور بھی ہیں۔ ایک کمرشل کالج کے ایک پروفیسر کی، اور دوسری لار کالج کے شعبۂ شریعت اسلامی کے پروفیسر شیخ محمد ابوزہرہ کی۔ یہاں عدم گنجائش کی وجہ سے ہم اُن کا خلاصہ پیش کرنے سے قاصر ہیں۔

"یورپ میں جو صنعتی و معاشی انقلاب ہوا ہے، میں اسے مانتا ہوں۔ اور اس کو بہت بڑی چیز سمجھتا ہوں، لیکن میرا خیال ہے کہ اس قسم کے انقلاب کا مخالفِ دین ہونا ضروری نہیں۔ ہمارے جو دینی نظریئے ہیں ان کے مطابق اس طرح کا انقلاب لایا جا سکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ خود یورپ میں وقتاً فوقتاً بعض جماعتیں یہ خیال پیش کرتی رہی ہیں، لیکن چونکہ یہ جماعتیں مذہباً عیسائی تھیں اور ان کے مذہب میں کسی صورت میں بھی تشدد کی اجازت نہیں اور معاشرے کی انسانیت دشمن اور استحصال پسند طاقتوں کو اکثر اوقات بغیر تشدد کے ختم نہیں کیا جا سکتا، اس لئے انقلاب کے حامیوں نے ان مذہبی جماعتوں کی بات نہ سنی لیکن اسلام میں ایسے طبقوں کے لئے "فاذنوا بحرب من اللہ و رسولہ" کی صراحت موجود ہے۔

اب اگر میں یورپ کے اس انقلاب کی ترجمانی اس طرح کروں جیسے (علامہ) عنایت اللہ مشرقی نے کی، تو پھر اسلام تابع ہوگا اور یہ انقلاب متبوع۔ اور یہ صحیح نہیں۔ اس سے پہلے اس طرح کی ایک کوشش سر سید احمد خاں نے بھی کی تھی اب میں حضرت شاہ ولی اللہ کی حکمتِ اسلامی کو اصل مانتا ہوں۔ اور اسے اساس بنا کر یورپ کے انقلاب کو سمجھتا ہوں۔ اور اس کی ترجمانی کرتا ہوں۔ اس صورت میں میرا اسلام بھی محفوظ رہتا ہے۔ اور آج دنیا میں جو معاشی و انقلابی تبدیلیاں آچکی ہیں، میں ان سے بے تعلق نہیں رہتا۔" مولانا سندھیؒ

وجود کی بحث

پروفیسر ضیا

مسلمان حکماء اور صوفیاء کے ہاں شروع ہی سے وجود کی بحث بڑی اہم رہی ہے۔ اور اسے "مسئلۃ المسائل" سمجھا جاتا رہا ہے۔ اس عالم کون و مکان میں علت اور معلول کا جو سلسلہ ہے آخر وہ کہیں جا کر تو ختم ہوتا ہے۔ اب اس سلسلے کی ابتدا کیسے ہوئی؟ کیا علت و معلول کا یہ سلسلہ خود بخود شروع ہو گیا، یا اس کا کوئی شروع کرنے والا بھی ہے؟ پھر اس سلسلۂ علت و معلول کا اس کے شروع کرنے والے سے کیا تعلق ہے؟ مسلمان حکماء اور صوفیاء دونوں کا ان دقیق بحثوں میں بڑا انہماک رہا۔ اور وہ وجود کی اصل حقیقت کے تعین میں برابر سرگرداں رہے[1]۔ ان بحثوں میں سے وحدت الوجود اور وحدت الشہود کی بھی ایک بحث ہے۔ جو صرف نظری نہ رہی بلکہ اس کے عملی نتائج نے ایک وقت میں مسلمانوں کے معاشرے اور ان کی ہئیت سیاسی پر دُور رس اثرات ڈالے۔

وجود اور اس کے تنزلات کا مسئلہ بڑا عمیق ہے۔ ذیل میں چند بزرگوں کے ارشادات کی مدد سے اس کی وضاحت کی کوشش کی جاتی ہے۔

---

[1] "..... آخر میں شیخ اکبر محی الدین ابن عربی اور اُن سے کچھ پہلے کا زمانہ آتا ہے۔ اس عہد میں اِن اہلِ کمال بزرگوں کے ذہنوں میں مزید وسعت پیدا ہوتی ہے۔ اور یہ لوگ کیفیات و احوال کی منزل سے آگے بڑھ کر حقائقِ تصوف کی بحث کرنے لگتے ہیں۔ ذات واجب الوجود سے یہ کائنات کس طرح صادر ہوئی۔ ان بزرگوں نے ظہور وجود کے مدارج اور تنزلات دریافت کئے اور اس امر کی تحقیق کی کہ واجب الوجود سے سب سے پہلے کس چیز کا صدور ہوا۔ اور کس طرح یہ صدور عمل میں آیا۔ الغرض یہ اور اسی طرح کے دوسرے مسائل ان لوگوں کے لئے موضوع بحث بن گئے۔ (اردو ترجمہ ہمعات مصنفہ شاہ ولی اللہ)

الہ آباد کے ایک مشہور بزرگ شاہ محمد حسین صاحب اس مسئلے پر یوں بحث فرماتے ہیں:۔

"جب ہم موجودات پر نظر ڈالتے ہیں تو ان میں دو حیثیتیں پائی جاتی ہیں۔ ایک اشتراک، دوسرے امتیاز۔ یعنی ایک یہ کہ وہ ایک دوسرے سے مختلف صفتوں میں مشترک ہیں۔ مثلاً انسان انسانیت میں مشترک ہے اور اپنے خاص خاص تعینات کے اعتبار سے ایک دوسرے سے ممتاز ہے۔ اسی طرح جتنے جاندار ہیں، اُن سب میں جاندار ہونا مشترک ہے۔ اور انسان اور گھوڑا ہونا ان کو آپس میں ایک دوسرے سے ممتاز کرتا ہے۔ اسی طرح تمام موجودات میں جو چیز مشترک ہے وہ وجود ہے۔ ممکن میں اور واجب میں دونوں میں وجود پایا جاتا ہے۔ اسی وجود سے ہونا مراد نہیں[1]۔ بلکہ وہ حقیقت مراد ہے، جس کی بنا پر ہم کسی چیز کو موجود کہتے ہیں۔ یہ حقیقت اپنی جگہ پر کسی موجود کرانے والے کے موجود ہے۔ اس لئے کہ یہی ذریعہ وجود ہے۔ لہٰذا اسے خود پہلے موجود ہونا چاہیئے۔ اور یہی وجود تمام چیزوں کو حاوی ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو ہر شے معدوم ہے۔ اب جو چیزیں اس وجود کے علاوہ مخلوقات میں پائی جاتی ہیں وہ اعتباری ہیں۔ اس لئے اگر وجود نہ ہو تو ان سب کا خاتمہ ہے۔ لہٰذا یہی وجود خدا تعالےٰ کا عین ذات ہے۔ اور دنیا کی جتنی چیزیں ہیں، ان سب کی حقیقت یہی وجود ہے۔ اور ہر شخص کی علیحدہ شخصیت علاوہ وجود کے صرف اعتباری ہے"۔

مولانا محمد قاسمؒ نے بڑی تفصیل سے اپنی کتاب "تقریر دلپذیر" میں اس پر بحث کی ہے فرماتے ہیں:۔

"۔۔۔۔ ہم اسی کو خدا جانتے ہیں جو بے عیب اور بے نقصان ہے اور اسی سے وجود کون ومکان ہے۔ سب چیزیں اسی کے سہارے اور بھروسے پر قائم ہیں۔ وہ کسی کے سہارے کا محتاج نہیں۔ وہ سب کی اصل ہے اور سب اس کی فرع ہیں"۔

"وہ سب کی اصل ہے اور سب اس کی فرع ہیں"۔ اس کی تشریح حضرت مولانا محمد قاسمؒ یوں کرتے ہیں:۔

"جس کارخانہ کو دیکھئے۔ ایک اصل پر قرار ہے۔ نور آفتاب کو دیکھئے تو ہزاروں مکانوں اور ہزاروں روشن دانوں میں جدا جدا جلوہ دکھلا رہا ہے۔ پر سب کو آفتاب کے ساتھ رابطہ ہے۔۔۔ عدد کے سلسلے کو نظر کیجئے تو ایک سے الی غیر النہایہ پھیلا ہوا ہے۔۔۔ موجوں اور بلبلوں کے کارخانہ کو دیکھئے تو سب کی

---

[1] شاہ ولی اللہ صاحبؒ "سطعات" میں لکھتے ہیں۔ "سر سخن این است وجود کہ بمعنی ہستی نہ بمعنی مصدری۔۔۔۔"

اصل وہی ایک جڑ ہے۔ آدمی وغیرہ کو دیکھئے تو سب کی اصل جسے انسانیت وغیرہ کہیئے مشترک ہیں۔ اسی طرح جس طرف نظر پڑتی ہے کوئی ایسا کارخانہ نظر نہیں آتا کہ اس کا سرمنشاء نہ ہو۔ پھر ان سرمنشاؤں کو دیکھئے تو ان کا کوئی اور سرمنشاء ہے۔ اور اسی طرح اوپر چلے چلو۔ مثلاً مجھ میں تم میں ہندو مسلمان، نصاریٰ یہود وغیرہ میں تو آدمیت مشترک ہے اور وہی سرمنشاء ہے۔"

اور اس آدمیت کے خواص یہ ہیں:۔

"اس نے ہر فرد بشر میں اپنی حکومت پھیلا رکھی ہے۔ اور اپنے احکام مثل کلام و گفتگو شکل و صورت کے جاری کر رکھے ہیں۔ تمام اس کی رعیت اور تابعدار ہیں۔ جو صورت ملتی ہے اس سے انکار نہیں ہوسکتا۔ جو انداز ملا اس سے بدل نہیں سکتا۔ بول چال کا تمغہ اپنے جی سے دور نہیں کرسکتا۔"

انسانوں کا سرمنشاء آدمیت ہے۔ جو ان سب میں مشترک ہے۔ "اسی طرح گھوڑوں میں اور سرمنشاء ہے۔ اور گدھوں کی اور اصل ہے اور کتوں کی اور اصل ہے۔"

غرض مولانا محمد قاسمؒ کے الفاظ میں:۔

"ان سب اصلوں کی اصل جاندار ہونا ہے۔ ادھر نباتات کی علیحدہ اصل ہے۔ اور اُن کا اور ہی سلسلہ اور اور ہی سرمنشاء ہے۔ پھر اُن کی اصل اور جانداروں کی اصل جسمیت کے زیر حکومت ہے۔ اسی طرح اوپر تک چلے چلو سارے عالم میں وجود مشترک ہے۔"

غرض جب تمام موجودات میں وجود مشترک ہے کہ اگر وجود نہ ہو تو یہ موجودات بھی نہ ہوں تو اس سے بعض اربابِ تصوف نے یہ نتیجہ نکالا کہ وجود اور موجودات ایک دوسرے کی عین ہیں۔ مولانا محمد قاسمؒ اس ضمن میں فرماتے ہیں: "یہ شئے مشترک عین اشیائے متعددہ نہیں ہوسکتی ... اس لئے یوں سمجھ میں آتا ہے کہ وجود عین عالم اور عین موجودات نہیں ... وجودِ عالم میں اور خود عالم میں فرق ہے۔ یہ دونوں بالکل ایک شے نہیں بلکہ بایں لحاظ کہ ایک شے کبھی موجود ہوتی ہے اور کبھی معدوم، یوں معلوم ہوتا ہے کہ عالم کا وجود ایک خارجی چیز اور ایک عارضی شے ہے۔ اور ذاتی نہیں ... (جب) اس عالم کا وجود اصلی نہیں بلکہ ایک عارضی چیز ہے تو جیسے گرم پانی کی مثلاً گرمی جو اصلی نہیں عارضی ہے آگ کا فیض ہے، جس کی گرمی اصلی ہے ایسے

ہی اس عالم کا وجود عارضی ہے کسی موجود اصلی کا فیض ہوگا۔ اور وہ موجود اصلی ہی اس عالم کا خدا اور خالق ہے۔
مگر چونکہ سب کا وجود ایک طرح کا نظر آتا ہے، چنانچہ اوپر مذکور ہوا تو جیسے آفتاب سے گو ہزارہا جگہ دھوپ
پھیلی پر سب کے سب ایک ہی آفتاب کا فیض ہے۔ ایسے ہی یوں سمجھنا چاہیئے کہ تمام عالم کا وجود بھی ایک
موجود حقیقی اور اصلی کا پرتو ہے سو اُسی کو ہم خدا کہتے ہیں۔"

آگے چل کر مولانا محمد قاسمؒ اس کی یوں وضاحت کرتے ہیں "..... جتنے جہان میں پھیلاؤ ہیں، وہ کسی
ایک شے کی طرف سمٹے چلے آتے ہیں ..... کلو بدھو چند خصوصیات کا نام ہے کہ جن میں آدمیت مشترک ہے۔
اسی طرح آدمی گھوڑا گدھا وغیرہ چند خصوصیات کا نام ہے کہ جن میں زندگی اور جاندار ہونا مشترک ہے اسی طرح
اوپر تک چلے چلو۔ سب سے اوپر جو اشتراک ہے تو وجود میں ہے یعنی وجود سب میں مشترک ہے ....."

اب یہ ساری موجودات وجود میں تو مشترک ہیں، لیکن ان میں ہر ایک میں ایسی خصوصیات بھی ہیں جن
کے سبب وہ ایک دوسرے سے متمیز ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے بھی اپنی کتاب "ہمعات" میں وجود پر مفصل بحث کی ہے۔ اُس کے اُردو
ترجمے سے اس بحث کا مختصر خلاصہ درجِ ذیل کیا جاتا ہے:۔

"زید ایک فرد ہے اس سے اوپر نوعِ انسان ہے اور نوع سے اوپر جنس کا مرتبہ ہے۔ یہ جنس حیوان
ہے۔ حیوان کی جنس میں نوعِ انسان بھی داخل ہے۔ اور جملہ حیوانات کی انواع بھی۔ جنس سے آگے جنسِ عالی
کا مرتبہ ہے۔ اس میں حیوانات کے ساتھ ساتھ نباتات بھی شامل ہیں۔ اور اس سے اوپر جسم یعنی عرض کا مرتبہ
ہے۔ اور عرض سے اوپر جوہر ہے۔"

اس جوہر و عرض سے اوپر اعلیٰ تر جو حقیقت ہے، اس کے بارے میں "حکماء" اور "اہلِ حق" میں
اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس ضمن میں شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں:۔

"اس معاملے میں حکماء کا یہ حال ہے کہ وہ مظاہرِ وجود اور اس کے تعینات کی اصل کا سراغ لگاتے لگاتے
اس مقام پر پہنچے اور یہاں پہنچ کر نہ صرف یہ کہ وہ رُک گئے، بلکہ انھوں نے قطعی طور پر یہ سمجھ لیا کہ جوہر و عرض کے
درمیان کوئی ایسا علاقہ نہیں جو دونوں کو ایک جنس کے تحت جمع کر دے۔ لیکن اس کے برعکس اہلِ حق نے معلوم

کر لیا کہ جوہر و عرض دونوں کو ایک اور اعلیٰ تر حقیقت احاطہ کئے ہوئے ہے لیکن حکماء اس حقیقت کا ادراک کرنے سے عاجز رہے۔ کیونکہ اور حقائق کی طرح اس حقیقت کے احکام و آثار متعین نہیں کہ ان کی مدد سے یہ حکماء اس حقیقت کا سراغ لگا لیتے جو عرض و جوہر دونوں پر حاوی ہے۔ اس حقیقت جامع کا موزوں ترین نام "حقیقت وحدانیت" ہے۔ گو کبھی کبھی ہم اس حقیقت کو "وجود" بھی کہہ لیتے ہیں۔"

اس کی مزید وضاحت شاہ صاحبؒ یوں فرماتے ہیں:۔

"۔۔۔۔ ان سب (موجودات) سے اوپر اور ان سب کو جمع کرنے والی اور جو ان سب کا موضوع ہے، صورت جسمیہ ہے۔ جسے اشراقین نے "مادۂ اولیٰ" کہا ہے۔ یہ صورت جسمیہ جو اثر پذیر مادہ بھی ہے اور علتِ فاعلیہ بھی، وجود کے اصل مرکزی کی طرف راجع ہے۔ الغرض انواع کے ایک ایک فرد سے لے کر وجود اقصیٰ تک نظامِ کائنات کا یہ سارا سلسلہ نہایت مرتب اور منظم ہے اور نیچے سے اوپر تک اس کی ہر کڑی دوسری کڑی سے ملی ہوئی ہے۔

"یہ وجود اقصیٰ اور بعد میں جن مظاہر میں اس کا ظہور ہوتا ہے اس کی مثال ایسی ہے، جیسے کہ لکھے ہوئے حروف کے مقابلے میں سیاہ لکیر ہو یعنی ان حروف کی اصل تو سیاہ لکیر ہی ہے گو بعد میں اسی لکیر نے حروف کی شکل اختیار کر لی۔ یا جیسے مختلف اعداد کی نسبت اکائی سے ہوتی ہے یعنی اکائی ہی سے تمام اعداد نکلتے ہیں۔ ایک ہی وجود میں مظاہر کی اس قدر کثرت کا واقعہ ہونا اس کی مثال دریا کی سمجھیے کہ اس میں لاتعداد موجیں ہوتی ہیں۔۔۔۔

اس مسئلے میں صحیح ترین رائے یہ ہے کہ وجود وہ ہے جو خود اپنی ذات میں قائم ہے۔ اور مرتبہ وجود میں جبکہ کوئی اور چیز اس کے ساتھ لاحق نہیں ہوتی اور وہ خالص وجود ہوتا ہے تو وہ کسی دوسری چیز کا محتاج نہیں ہوتا۔ یہ وجود مختلف ماہیات میں ظہور کرتا ہے۔ چنانچہ یہ ماہیات اسی وجود کے لئے قوالب بن جاتی ہیں۔ ان ماہیات میں سے ہر ماہیت کی اپنی ایک حیثیت اور اس کے اپنے احکام ہوتے ہیں۔"

اس کے بعد شاہ صاحب لکھتے ہیں:۔

"اب یہ سوال باقی رہا کہ یہ جامع حقیقت جو عرض و جوہر کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے، جس کا موزوں ترین نام ہم "حقیقتِ وحدانیت" بتا آئے ہیں، جسے ہم کبھی کبھی "وجود" بھی کہتے ہیں، آخر یہ حقیقت ہے کیا؟ ایک قوم کا کہنا ہے کہ یہ حقیقت عین ذاتِ الٰہی ہے۔ چنانچہ انھوں نے

اِسی حقیقت کو "لابشرط شئ"[1] ذات بحت سمجھا اور اسی کو وہ "بشرط لاشئ" احدیت کہتے ہیں۔ اور یہی اُن کے نزدیک "بشرط شئ" واحدیت ہے۔ ہمارے خیال میں ان لوگوں میں عقل و تدبر کی کمی تھی کہ انھوں نے اس غلط بات پر یقین کر لیا۔ ان کے برعکس فقیر نے اس امر کی تحقیق کی تو اس پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ وجود کے جس مرتبے پر جا کر اِن لوگوں کی نظر رُکی اور اُسے ہی انھوں نے غلطی سے ذاتِ بحت، احدیت اور واحدیت سمجھ لیا، وہ مرتبہ تو ظاہر الوجود کا تھا، جس کو ہم نفسِ کلیہ کہتے ہیں۔ . . . . اس کی کیفیت یہ ہے کہ یہ ہر شے میں جاری و ساری اور ہر شے سے قریب ہے۔ اور اس کے باوجود یہ سب اشیاء سے پاک اور اُن کی تمام آلائشوں سے منزّہ ہے۔

"نفسِ کلیّہ کے مقابلے میں جو حیثیت ان اشیاء کی ہے، وہی حیثیت ذاتِ الٰہی کے مقابلے میں اس نفسِ کلیّہ کی ہے، بلکہ نفسِ کلیہ اشیاء سے باوجود قُرب کے جس قدر دُور ہے، اس سے سوگنا زیادہ ذاتِ الٰہی نفسِ کلیّہ سے دور ہے۔ اسی طرح وہ اس کے تمام تعینات اور تقیدات کی حدبندیوں سے بھی مبرّا ہے۔ ہاں اس ضمن میں ایک بات کا ضرور خیال رہے کہ نفسِ کلیہ اور اس سے اوپر وجود کے جو مراتب ہیں اُن پر ذاتِ الٰہی از قبیلِ ابداع[2] موثر ہوتی ہے نہ کہ از قسمِ خلق۔ ابداع سے مراد یہ ہے کہ مادہ کے بغیر عدم سے وجود کا صدور

---

[1] ذاتِ الٰہی سے کائنات کے تنزّل کی صورت یوں بیان کی جاتی ہے:- ایک مقام تو خود "ذات" کا بحیثیت ذات کے ہے۔ اس مقام پر ہر شرط کی نفی کے ساتھ خود ذات کو اپنی ذات کا ادراک ہوتا ہے۔ یہاں سے تنزّلات کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس میں پہلا مرتبہ "احدیت" کا ہے۔ اور "احدیت" کے بعد "واحدیت" کا مرتبہ ہے۔ اس "واحدیت" کو "باطن الوجود" بھی کہتے ہیں۔ "باطن الوجود" سے "وجودِ منبسط" کا ظہور ہوا جس کا دوسرا نام "ظاہر الوجود" بھی ہے۔ اس مرتبہ "ظاہر الوجود" کو "نفسِ کلیہ" کا نام دیا گیا ہے۔ "نفسِ کلیّہ" سے ارواح، امثال اور اجساد ظاہر ہوئے۔

[2] شاہ صاحب کی کتاب "سطعات" میں ہے:- (وجود) در سہ مرتبہ است۔ ذاتِ بحت و مرتبہ عقل و شخص اکبر۔ صدور مرتبہ عقل از ذاتِ بحت بہ طریقِ لزوم و اقتضائے ذات است مانندِ اقتضائے اربعہ زوج را در ذہن ما و مانندِ فیضانِ ضوا از قرص در خارج۔

اس طریقِ لزوم کو ابداع کہتے ہیں۔ سورج سے روشنی کا پھوٹنا یہ طریقِ لزوم ہے۔

ہو اور ایک چیز سے دوسری چیز کا پیدا ہونا خلق کہلاتا ہے۔

"الغرض نفسِ کلیہ اور ذاتِ الٰہی میں خلق کی نہیں بلکہ ابداع کی نسبت ہے۔ اور ابداع کی نسبت کو عقلِ انسانی ادراک کرنے سے کلیتہً قاصر ہے۔ اس لئے نفسِ کلیہ اور ذاتِ الٰہی میں فرق مراتب کرنا عقلاً ممکن نہیں۔ اس لئے اگر کوئی شخص تسامح سے یہ کہہ دے کہ نفسِ کلیہ ذاتِ الٰہی کا تنزل ہے تو اس کا یہ کہنا اجمالاً ایک وجہ رکھتا ہے......"

جیسا کہ "سطعات" میں ہے۔ وجود کے تین مرتبے ہیں۔ ذاتِ بحت، مرتبۂ عقل اور شخصِ اکبر۔ مرتبۂ عقل کا ذاتِ بحت سے صدور بہ طریق لزوم ہے۔ اور شخصِ اکبر کا ذاتِ بحت سے صدور مرتبۂ عقل کے صدور کی شرط سے ہے۔

غرض "سب موجودات کا سلسلہ ایک موجود اصلی پر تمام ہوتا ہے[1]" اور یہ موجودِ اصلی نہ صرف خود موجود ہے بلکہ اوروں کا وجود اس سے اس طرح نکلتا ہے۔ جیسے آفتاب سے شعاعیں[2]۔ اب شعاعیں اور چیز ہیں اور اُن کے در و دیوار پر پڑنے سے جو دھوپ پیدا ہوتی ہے وہ اور چیز۔ دھوپ میں ایک تو اُس کی "ذات" ہے۔ دوسرے اس کا "وجود"۔ اُس کا "وجود" تو عطیہ ہے آفتاب کی شعاعوں کا۔ اور اس کی "ذات" وہ ہے جو اُسے دوسروں سے متمیز کرتی ہے[3]۔

موجودات کی "ذات" اور ہے اور اُن کا "وجود" اور۔ مولانا محمد قاسمؒ "تقریر دلپذیر" میں اس پر یوں بحث فرماتے ہیں:۔

"......اس عالم کی ہر چیز کا چھوٹی سے لے کر بڑی تک "وجود" اور ہے اور "ذات" اور ہے۔ یعنی دو وجود ہیں

---

[1] تقریر دلپذیر مولانا محمد قاسمؒ۔

[2] "...... شعاعیں بھی مثلِ آفتاب ہی کے اصل سے منور ہیں ہاں اتنی بات ہے کہ آفتاب کو نہیں پہنچتیں۔ کیونکہ اوّل تو وہ آفتاب سے پیدا ہوتیں۔ دوسرے وہ بات کہاں جو کہ آفتاب میں ہے۔ (تقریر دلپذیر)

[3] ذات اُسی کو کہتے ہیں جس سے تمیز حاصل ہو۔ جیسے مکان کے نقشے کو اُس کی ذات کہا جاتا ہے۔

ظاہری اور باطنی۔ سو باطنی وجود کو ذاتِ خداوندی سے کچھ اس قسم کی نسبت ہے جیسے شعاعوں کو آفتاب سے، اور وجودِ ظاہری کو بمنزلہ دھوپوں کے جو شعاعوں سے پیدا ہوتی ہیں اور ہر صحن اور ہر میدان میں جُدا جُدا نظر آتی ہیں۔ سمجھنا چاہیئے۔ چنانچہ جیسے دھوپ کبھی آتی ہے کبھی چلی جاتی ہے ایسے وجودِ ظاہری کبھی ہوتا ہے کبھی نہیں ہوتا اور جیسے آفتاب کے طفیل سے شعاعیں ہمیشہ موجود رہتی ہیں، ایسے ہی خداوند کریم کے طفیل سے اس وجودِ باطنی کو بھی ہمیشہ قیام ہے۔ اب سُنیئے! کہ جیسے آفتاب کے نور سے اوّل شعاعیں پیدا ہوتیں اور بعد میں دھوپیں ظاہر ہوتیں اور اس ترتیب ہی کے سبب سے جس قدر ہر قسم کے کمال آفتاب کے کمالوں میں سے یعنی نور گرمی وغیرہ شعاعوں کو ملے۔ وہ دھوپوں کو نہیں ملے۔ کتنی ہی بڑی اور خوش قطع دھوپ کیوں نہ ہو۔ اسی طرح وجودِ باطنی اوّل ہے اور وجودِ ظاہری بعد میں۔ بلکہ وجودِ ظاہری کو وجودِ باطنی ہی کا پَرتو سمجھنا چاہیئے۔ جیسے دھوپ شعاعوں کا پَرتو ہے۔ سو لازم ہے کہ وجودِ باطنی کو اوّل فیضِ ربانی پہنچے۔ بعد میں وجودِ ظاہری تک جائے۔ سو یہ نہیں ہو سکتا کہ ہمارے تمہارے وجودِ ظاہری تک حیات کا فیض پہنچ جائے اور اوروں کے وجودِ باطنی کو بھی خبر نہ ہو۔ کیونکہ وجودِ باطنی کسی کا ہو، ہر کسی کے وجودِ ظاہری سے مقدم ہے۔ جیسے شعاعیں کسی طرف کیوں نہ ہوں، ہر جگہ کی دھوپ سے اشرف اور مقدم ہیں۔۔۔۔"

موجودات کی "ذات" اور اُن کے "وجود" کا صدور آخر میں اُسی ایک وجود سے ہوتا ہے جس کا ایک مرتبہ ذاتِ بحت کا ہے۔ دوسرا عقل کا اور تیسرا شخص اکبر کا۔ اس وجود میں یہ سب کمال ہیں۔"۔۔۔۔ ذاتِ خداوندی میں ایک ہو کر پھر سب کمال بھرے ہوتے ہیں۔ یعنی وہ ایک ہے۔ سب کمالوں کے کام کرتا ہے۔ جیسے ایک شخص کلکٹری اور مجسٹریٹی کے دونوں کام کرتا ہے۔ کام کے سبب دو نام ہو گئے ہیں ورنہ ہے وہ ایک ہی۔ ایسے ہی ذاتِ خداوندی بھی بسبب جدا جدا کاموں کے خالق، رازق، سمیع، بصیر کہلاتی ہے۔ اور جب یہ ہوا کہ وہ ایک ہے اور پھر سب کمال اُسی میں ہیں، تو اُس کا فیض بھی بے شک مجموعہ ساری خوبیوں کا ہوگا۔ اور جس جس کو وہ پہنچے، تھوڑا بہت اُس میں ہر قسم کا کمال ہونا چاہیئے۔" (تقریر دلپذیر)

موجودات میں تھوڑے بہت جو بھی کمال پائے جاتے ہیں، یہ سب ذاتِ خداوندی کے فیوض میں سے ہیں۔ لیکن یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب کمالات کا مصدر و مبداء ہی ایک ہے۔ تو پھر اُن کے مظاہر میں یہ اختلاف

کیوں؟ مولانا محمد قاسم فرماتے ہیں کہ یہ اختلافات قابلیتوں کے اختلاف کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

”۔۔۔۔ جیسا آئینہ قلعی دار اور اینٹ پتھر میں آفتاب کا نور برابر پہنچتا ہے، پر جتنا زیادہ ظہور اُس نور کا آئینے میں ہوتا ہے۔ اُتنا پتھر میں نہیں ہوتا۔ سو ہم یہ نہیں کہتے کہ انسان کی حیات اور پتھر کی حیات یکساں ہونی چاہیئے۔ بلکہ اتنی بات ہم یقیناً جانتے ہیں کہ جو حیات کا ظہور انسان میں ہوا ہے۔ وہ اور حیوانات میں نہیں، کیونکہ انسان کے سے علوم اور کمالات کا اِن میں پتہ نہیں۔ پھر جو بات کہ حیوانات میں پائی جاتی ہے۔ نباتات میں نہیں پائی جاتی اور جو بات نباتات یعنی درختوں میں ظاہر میں نظر آتی ہے، پتھر وغیرہ میں نہیں۔۔۔۔ الغرض کسی میں حیات کا ظہور زیادہ ہے۔ کسی میں کم۔ کوئی بالکل مردہ نظر آتا ہے۔ جیسے کوئی دم چرا کر پڑ جاتا ہے۔ پر خالی کوئی نہیں۔ یہاں تک کہ پتھر وغیرہ کو اگر غور کیجئے تو بعضے بعضے حیات کے نشان اُن میں بھی نظر آتے ہیں۔۔۔۔“

مختصراً جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، اس عالم کی ہر چھوٹی بڑی چیز میں ایک تو ”وجود“ ہے۔ جسے آپ ظہورِ حیات کہہ لیجئے۔ دوسرے اُس کی ”ذات“ ہے۔ اپنی اپنی ”ذات“ کی وجہ سے تو ہر چیز دوسری چیز سے مختلف ہے۔ لیکن اِن سب میں ”وجود“ مشترک ہے۔ جو ہر چیز میں جاری و ساری ہے۔ اسی کو صوفیاء کی اصطلاح میں وحدت الوجود کہا گیا ہے۔

انشاء اللہ آئندہ کی بحث اسی وحدت الوجود پر ہوگی۔

”نسبتوں کو سمجھنا فلسفہ کی اصل ہے۔ محض دلائل سے تائید اور تردید دونوں ہو سکتی ہیں۔ نسبت کے لئے موطن کا جاننا ضروری ہے۔ ایک چیز اصلی حالت میں ایک موطن میں ہوگی۔ اور اُس چیز کا ظل اس موطن میں نہیں، بلکہ دوسرے موطن میں ہوگا۔ وجود کا ایک موطن ہے۔ اور اس سے اوپر جو کچھ ہے وہ دوسرے موطن میں ہے۔ وجودیہ علیفیہ ایک وجود کے موطن میں ذات کو ختم کر دیتے ہیں۔ اور ہم ذات کا موطن اس وجود سے ماوراء مانتے ہیں۔“ (مولانا سندھیؒ)

افکار و آراء

ہم جنھیں اسلافِ کرام کہتے ہیں اور جن کی بزرگی کی قدر و وقعت ہمارے دلوں میں موجود ہے، وہ سب اپنے اپنے عہد میں اللہ کے نیک بندے تھے۔ اور تن من دھن سے اُسی دینِ اسلام کے پابند تھے جو حضرتِ آدمؑ سے خاتم النبیینؐ تک تمام انبیاء و رسل کا دین تھا اور جو قیامت تک اللہ کے واحد دین کی حیثیت سے قائم رہے گا۔ عالمِ انسانی میں یہ دین سب سے زیادہ قدیم ہوا۔ اور جیں فطرتِ انسانی کی فلاح کے لئے یہ دین ماضی حال اور مستقبل میں موجود ہے وہ فطرت بھی اتنی ہی قدیم ہوئی۔ بعض لوگ "قدیم" کے لفظ سے گھبراتے اور بدکتے ہیں لیکن وہ یہ نہیں سوچتے کہ سب سے زیادہ قدیم یا قدیم ترین ہستی تو ذاتِ الوہیت کی ہے اور اسی لئے علمِ کلام میں اللہ کی اصطلاحی صفت "قدیم" ہے۔ اور اِس قدیم خلاقِ کائنات کی ہر مخلوق "حادث" کہلاتی ہے کیوں کہ وہ اپنے وجود سے پہلے غیر موجود تھی اور اللہ ہی اس کو وجود میں لایا ہے۔ انگریزی میں "کامن سینس" کا لفظ بہت عام ہے۔ اور اس حسِ عقلی کو رکھنے والا ہر انسان اِس حقیقت سے بخوبی واقف ہے کہ ہر اچھی چیز اچھی ہوتی ہے خواہ وہ کتنی ہی پُرانی ہو۔ اور ہر بُری چیز بُری ہوتی ہے خواہ وہ کتنی ہی نئی ہو۔ اور اچھے یا بُرے ہونے کا فیصلہ خالقِ کائنات کے علاوہ اور کوئی کر ہی نہیں سکتا۔ انسانی عقل تو صدیوں میں ایک چھوٹے سے کیڑے کے متعلق بھی صحیح معلومات نہیں حاصل کر سکتی۔ فلسفی جس راز کا انکشاف کرتا ہے وہ راز معہ اپنے انکشاف کے ایک اور معمائی راز بن جاتا ہے۔ اور سائنسداں کے روزانہ بدلنے والے نظریات ہر نام نہاد "علم" کو "ظن" ثابت کرتے رہتے ہیں۔ اِن بدیہی باتوں پر مزید گفتگو کی حاجت نہیں ہے۔

معبودِ حقیقی نے پہلے انسان اور پہلے نبی حضرت آدمؑ کی وفات کے بعد مختلف ادوار میں متعدد انبیاءؑ کو مبعوث کیا جن میں سے بہتوں کا ذکر معہ اُن کے اہم اقوال و حالات کے آخری کتابِ الٰہی "قرآن" میں درج ہے۔ توحید، رسالت، آخرت، معروف، منکر وغیرہ کے متعلق سب انبیاءؑ ایک ہی بات کہتے ہیں اور ایک ہی معیار پیش کرتے ہیں اور اپنے سے سابق انبیاءؑ کا ذکر کرکے صاف فرماتے ہیں کہ میں وہی بات تو کہہ رہا ہوں جو پہلے تمام انبیاءؑ کہتے چلے آئے ہیں۔ اللہ کی بنائی ہوئی فطرتِ انسانی کبھی نہیں بدلتی۔ لاتبدیل لخلق اللہ۔ اللہ کے بنائے ہوئے آسمان اور زمین، سیارے اور فضائیں، سمندر اور پہاڑ، زمان اور مکان، یہ سب بھی آغازِ آفرینش سے اسی طرح آج تک چلے آرہے ہیں۔ کوئی چیز نہیں بدلی۔ دن اور رات کا نظام تک نہیں بدلا۔ حیوانات اور جمادات کا تسلسل بھی اُسی طرح جاری ہے۔ پرندے بھی حسبِ دستورِ سابق اپنی زندگی کے مقصد کو پورا کر رہے ہیں ؎

کز ثریٰ تا بہ ثریا بہ عبودیت او　　ہمہ در ذکر و مناجات و قیام اند و قعود　(سعدیؒ)

آخری رسولؐ کے مخالفین نے "فرمائش" کی کہ کوئی دوسرا قرآن لے آیئے یا اسی کو بدل دیجئے۔ لیکن انھیں جواب دیا گیا کہ یہ تو وحیِ الٰہی کا اتباع ہے۔ اپنے نفس کا القاء نہیں ہے۔ زمین سے آسمان تک جسمِ انسانی کے اندر اور باہر کی تمام فضا جب ابتدائے تخلیقِ عالم سے آج تک ایک ہی ہے تو ایک نئے دین کا مطالبہ کیسا؟ انسان کی خواہشات نہ معلوم کتنی ہیں۔ لیکن جائز خواہشات مثلاً حلال کھانا پینا پہننا اور ایک مختصر مکان بنانا وغیرہ تعداد میں محدود ہیں۔ اور بہت کم ہیں بمقابلہ اُن ناجائز خواہشات کے جن کی تعداد کا کوئی ٹھکانا نہیں اور جن کے "رنگ" بھی روز و شب افزوں ہیں پھر ہر جائز خواہش کی تکمیل کا جائز طریقہ، یہ طریقے تو بہت کم ہیں اور اکثر اپنی پرانی شکلوں پر قائم ہیں لیکن جائز خواہشات کی تکمیل کے ناجائز طریقے اور پھر ہر ناجائز خواہش کی تکمیل کا طریقہ، یہ طریقے تو اتنے زیادہ ہیں کہ بے گنتی معلوم ہوتے ہیں اور برابر بدلتے بھی رہتے ہیں اور بڑھتے بھی رہتے ہیں۔ اور صرف انھیں "طریقوں" (جن کا معصیت ہونا کسی دلیل کا محتاج نہیں) کی "بوقلمونی" کے باعث کسی "عصرِ حاضر" کے "دانشمندوں" کا یہ نعرہ کس قدر غیر دانشمندانہ ہے۔ کہ "دنیا بدل گئی ہے، زمانہ بدل گیا ہے، وہ دین اب نہیں چل سکتا۔۔۔۔"

نہ دنیا بدلتی ہے، نہ زمانہ بدلتا ہے، نہ انسانی فطرت بدلتی ہے، نہ جائز خواہشات بدلتی ہیں، نہ

نیک و بد کا معیار بدلتا ہے۔ ہاں جائز خواہشات کی تکمیل کے ناجائز طریقے اور ہر ناجائز خواہش کی تکمیل کے طریقے واقعتہً بدلتے رہتے ہیں۔ غلط کار انسان ان تبدیلیوں کو وجود میں لاتے ہی رہتے ہیں۔ لیکن ان "فاسقانہ جدتوں" کی وجہ سے فطرتِ انسانی کا خدائی دین کیوں بدل دیا جائے؟ اگر کسی زمانہ میں دنیا کی شہری آبادی نے جو ایک مختصر اقلیت ہوتی ہے۔ یا بفرضِ محال اکثریت نے، کھانے پینے پہننے اور مکان بنانے کے سلسلہ میں اور سفر کرنے کے لئے کچھ مشینوں کا استعمال اپنے اوپر لازم قرار دے لیا تو چند جائز خواہشات کی تکمیل کے لئے ان بے جان مشینوں کے استعمال سے بھی دین کے احکام میں کسی تبدیلی کے مطالبہ کا جواز کہاں سے نکل آئے گا۔ البتہ اگر ان مشینوں کی وجہ سے کسی کا جانی، بدنی یا مالی نقصان ہوگا تو بے شک صاحبِ مشین ہی اس کا ذمہ دار ہوگا۔ اس لئے جو لوگ بہت زیادہ محتاط ہوں گے وہ خود ہی مشینوں کے استعمال سے حتی الامکان احتراز برتیں گے۔

مذکورہ حقایق کی روشنی میں فرنگی مستشرقین کا یہ مطالبہ بالکل بے بنیاد نظر آتا ہے کہ دین میں تبدیلی ہونا چاہیئے۔ یہ تو وہی لادین اشخاص ہیں جو ماضی بعید سے آج تک باطل پر قائم رہتے ہوئے حق کی مخالفت کا یہ "علمی" فیشن اختیار کرتے ہیں۔ کہ ایسا کھوکھلا مطالبہ پیش کرتے ہیں۔ حیرت ہے اُن اپنے کو "مسلم" کہنے اور سمجھنے والوں پر جو دانستہ یا نادانستہ اسی قسم کا مطالبہ پیش کرتے رہتے ہیں۔ اور جب اس مطالبہ کا کھوکھلا ہونا اُن پر واضح کر دیا جاتا ہے تو اس قسم کی کوئی احمقانہ بات بول دیتے ہیں جو ایک سمجھ دار بچہ بھی کبھی نہیں بولے گا۔ مثلاً "رسا قتمآب ایسا جوتا نہیں پہنتے تھے تو پھر آپ کیوں پہنتے ہیں۔۔۔" وقس علی ہذا۔ غرق ہوتے وقت تنکے کا سہارا کیا کام دے سکتا ہے؟۔

باطل کے حاشیہ برداروں کے ترکش میں تیروں کی کمی نہیں۔ خواص و عوام کے دلوں میں اسلافِ کرام کا احترام دیکھ کر یہ چال چلی جاتی ہے کہ وقتاً فوقتاً اور اکثر فرنگی مستشرقین ہی کی نقالی میں کسی سلف کا نام لے کر یہ کہا جاتا ہے کہ "وہ بھی تو متجدد تھے۔ دین کو زمانے کے مطابق چلانا چاہتے تھے۔ فلاں کتاب کے اس جملہ کا کیا مطلب ہے؟۔۔۔۔" لیکن ہم اس "سادگی" پر متعجب کیوں ہوں؟۔ یہ کوئی غیر معمولی سانحہ نہیں ہے۔ تاریخ عالم تو ان تلخ ترین باتوں سے بھری پڑی ہے۔ کہ "تجدد" کے نعرہ بازوں نے انبیاءؑ کو بھی

اِسی طرح غلط باتیں کہہ کر "بدنام" کیا۔ توراۃ اور انجیل کے موجودہ نسخے دیکھ لیجئے۔ اور ایسے بھی ظالم گذرے ہیں جنھوں نے خلاقِ عالم کو بھی نہیں چھوڑا۔ یونانی ادب پڑھ لیجئے۔!

"شاہ ولی اللہ اکاڈیمی" کے قیام کے بعد ہی کسی مستشرق نے بھرے مجمع میں یہاں اِسی قسم کی بات کہہ دی اور روزناموں نے بڑی "مسرت" سے سرخیاں شائع کردیں کہ "شاہ صاحب بھی تو دین کو زمانہ کے مطابق بدلنا چاہتے تھے"۔ لیکن یہ کوئی نہیں سوچتا سمجھتا کہ ہم اپنے اسلاف کو اس لئے محترم نہیں سمجھتے کہ وہ بذاتِ خود "معصوم معبود" ہیں بلکہ اس لئے کہ وہ اللہ کی اطاعت بدرجۂ احسن کرتے تھے اور ہمیں یقین ہے کہ اللہ کے محسن اور مومن بندے ایسی بھونڈی باتیں کبھی نہیں کرتے۔ اِن حضرات کا دماغی توازن بھی تادمِ مرگ بفضلہٖ برقرار رہا۔ وہ کبھی "مجذوب" نہیں ہوئے۔ لہٰذا اُن کی طرف اس قسم کی غیر ذمہ دارانہ بات اگر کسی کتاب میں بھی نظر آجائے تو وہ رد کردی جائے گی۔ اور الحاقی سمجھی جائے گی۔ کیونکہ صحیح حدیث کی حفاظت کے لئے جس "علم الرجال" پر عمل کیا گیا وہ اور کسی کتاب انسانی کے لئے نہیں کیا گیا۔ کیا یہ واقعہ ظہور پذیر نہیں ہوچکا ہے کہ ایک غیر معروف مصنف کی ایک سراپا افسانہ و افسوں کتاب شاہ ولی اللہؒ کے نام سے چھپی ہوئی موجود ہے؟ دوسرے اسلافِ کرام کے ساتھ بھی اسی قسم کا برتاؤ کیا گیا ہے۔

حضرات صحابہؓ و تابعین کے بعد ابو حنیفہؒ، ابن تیمیہؒ، عبد القادر جیلانیؒ، محمد ابن عبد الوہابؒ اور اقبالؒ اور نہ معلوم کتنے اور نام ہیں جنھیں کبھی کبھی اِس "مطلب براری" کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ کیونکہ جو مسلم عوام و خواص میں مقبول ہوجاتا ہے اُس کے نام سے "فائدہ" اٹھانا آسان معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اسلاف پر تجدد کا اتہام لگانے والے متجددین کو یہ بھی تو سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ مسلمانوں کے لئے "حکم" کا مرتبہ قرآن اور سیرتِ خاتم النبیینؐ کو حاصل ہے۔ اور اِس لئے اسلاف کا نام لے کر ایسی "کوشش" کرنا بے سود ہوگا۔ ہر مسلم کا ایمان توحید، رسالت اور آخرت پر مبنی ہے۔ اسلاف پر "ایمان" نہیں ہوتا ہے۔ اُن کا "احترام" ہوتا ہے اور احترام اِسی لئے ہوتا ہے کہ وہ کامل الایمان حضرات اپنے اخلاف سے علماً اور عملاً بدرجہا بہتر ہوتے ہیں۔ ورنہ "محض اسلاف پرستی" کسی مسلم کا شیوہ نہیں ہوسکتا۔ اگر خدانخواستہ 'بفرضِ محال' کوئی ضدی اِس بات پر اڑ جائے۔ کہ "نہیں .... فلاں سلف نے یہی کہا تھا۔ اب تو تمھیں ماننا پڑے گا کیونکہ تم ان کا اتباع کرتے ہو ....." تو ہر متبعِ شریعت مسلم کا جواب

شاہ ولی اللہ اکیڈمی کا علمی مجلہ
الرحیم
ماہنامہ
شعبۂ نشر و اشاعت شاہ ولی اللہ اکیڈمی ○ صدر حیدرآباد
ذوالحجہ ۱۳۸۳ھ مئی ۱۹۶۴ع

مجلسِ ادارت:

ڈاکٹر عبدالواحد ہالے پوتا،

مولانا غلام مصطفےٰ قاسمی،

مخدوم امیر احمد،

مُدیر:

محمد سرور،

قیمت سالانہ:- آٹھ روپے   فی پرچہ:- پچھتر پیسے

الرحیم

حیدرآباد

جلد ۱ — ذوالحجہ ۱۳۸۳ھ مطابق مئی ۱۹۶۴ء — نمبر ۱۲

فہرست مضامین

شذرات

جامعہ ازہر کی دعوت پر قاہرہ میں علمائے اسلام کی جو مؤتمر ہو رہی تھی، ان صفحات میں اس کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ اس مؤتمر میں کوئی ۳۹ ملکوں کے علماء نے حصہ لیا، اور اس کے اجلاس ۸ مارچ سے ۲۳ مارچ تک ہوتے رہے۔ ایک اہل قلم عالم کے الفاظ میں جو اس مؤتمر میں شریک ہوئے "...... مندوبین نے جو تقریریں کیں، وہ بڑی دلچسپ، معلومات افزا اور امید آفریں تھی۔ انہیں سنکر محسوس ہوتا تھا کہ مسلمانوں میں دینی شعور اور اپنی ملی تنظیم و اصلاح و ترقی کا جذبہ اب ہر جگہ پایا جاتا ہے اور دو سو ڈھائی سو برس سے اسلام کی جو طاقتیں اور قوتیں مغربی استعمار کے زیر اثر پراگندہ و منتشر تھیں، اسلام نے ان کو از سر نو جمع کرنا اور سمیٹنا شروع کر دیا ہے۔"

یہی بزرگ مؤتمر کے دوران "مدینۃ الجامعۃ" کا سنگ بنیاد رکھنے کی تقریب کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:- "یعنی اب جامعہ ازہر کے لئے ایک مستقل شہر ہی الگ بن رہا ہے، جس میں طلباء اور طالبات کے لئے الگ الگ مختلف علوم و فنون کے کالج، ہوسٹل، لائبریری، اسمبلی ہال، کھیل کے میدان، رستوران اور بازار اور پارک اور تیرنے کے تالاب، غرضکہ یہاں ہر وہ چیز ہوگی جس کی ضرورت یونیورسٹی کے طلباء کو ہوتی ہے۔"

یہ مستقل شہر دنیا کی اس قدیم ترین موجود جامعہ کے لئے بنایا جا رہا ہے، جہاں کچھ ہی عرصہ

پہلے نہ صرف علوم و فنون میں، بلکہ لباس، رہنے سہنے اور زندگی کے ہر شعبے تک میں قدامت کو علمائے دین کا خصوصی امتیاز سمجھا جاتا تھا اور ہر تجدید خواہ وہ ضروری سے ضروری فن کو داخلِ نصاب کرنے کے متعلق ہوتی، بدعت اور ضلالت قرار پاتی۔ ابھی سو سال بھی نہیں ہوئے سید جمال الدین افغانی اس برصغیر سے مصر پہنچے، اور جب انہوں نے اس جامعہ میں خود مسلمانوں کے علوم حکمیہ پڑھانے کا کہا، تو جامعہ مذکور کے ارباب اقتدار علماء جن کا دائرۂ درس و تدریس ایک خاص نوع کے نقلی علوم تک ہی محدود تھا، ان کے خلاف ہوگئے، اور ان کے ساتھ اہانت آمیز سلوک کیا گیا۔ اس ہزار سالہ جامعہ کی اب یوں جون بدل رہی ہے۔ اور اسے قدیم علوم کے ساتھ ساتھ جدید علوم کا بھی مرکز بنایا جا رہا ہے۔

مصر اور بعض دوسرے عربی ممالک کو یہ فائدہ ہے کہ وہاں ایک عرصہ دراز سے اوقاف کا مستقل نظام چلا آرہا ہے، جس کے ماتحت بالعموم تمام مساجد، دینی مدارس اور مزارات وغیرہ ہوتے ہیں۔ چنانچہ اگر ان ملکوں کی حکومتیں نئے زمانے کے تقاضوں اور اپنے مسلمان عوام کی بہبود کے پیش نظر اس سلسلے میں مناسب اصلاحات کرنی چاہیں، تو انتظامی لحاظ سے انہیں زیادہ دقت نہیں ہوتی۔ اور آج اس دور میں ایک مسلمان قومی حکومت صرف اپنے مسلمان عوام کی سیاسی آزادی، معاشی خوشحالی اور معاشرتی ترقی ہی کی ذمہ دار نہیں بلکہ مسلمان عوام کی نمائندہ اور ان کی مرضی کی ترجمان ہونے کی حیثیت سے اس کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ ان امور کو جن کا تعلق مساجد، دینی مدارس، مزارات اور دوسرے مذہبی اداروں سے ہے اور جو قوم، ملک اور عوام کی زندگی میں سیاست اور معیشت سے کچھ کم اثر انداز نہیں ہوتے، نظر انداز نہ کرے اور ان کی اصلاح و بہتری کو بھی قومی تعمیر نو کا ایک حصہ اور بڑا اہم حصہ سمجھے۔

ہر ترقی خواہ اور باشعور مسلمان قومی حکومت کو اس فرض سے عہدہ برآ ہونا ہے اور پاکستان اس سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتا

اکثر مزارات اور بہت سی مساجد محکمہ اوقاف مغربی پاکستان کی تحویل میں آچکی ہیں اور اسلامی اور قومی زندگی کی تعمیر نو کے سلسلے میں، جو منزل ہمارے سامنے ہونی چاہیئے بحمد اللہ اس کی طرف پہلا قدم اٹھا لیا گیا ہے

ظاہر ہے یہ سلسلۂ نظام اور آگے بڑھے گا اور زیادہ وسیع ہوگا بے شک اسے آگے بڑھانے اور وسیع کرنے میں تدریج کی ضرورت ہے لیکن یہ منزل جتنی جلد قریب آئے پاکستان کی اسلامی و قومی زندگی کے لئے اچھا ہوگا۔ اور اس میں تذبذب وتاخیر موجب مفاسد ہوگی ؏

اس ضمن میں ایک مسئلہ دینی مدارس کا ہے اس کی طرف بھی فوری توجہ کی ضرورت ہے مولانا محمد اسمٰعیل امیر مرکزی جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان نے مشرقی پاکستان کے ایک اجتماع میں خطبہ صدارت دیتے ہوئے دینی مدارس کا ذکر فرمایا کہ چھوٹے چھوٹے مدارس کاروباری انداز اختیار کر گئے ہیں اور ہماری یہ درس گاہیں جو کام کر رہی ہیں یہ مستقل تشنگی اور استغنا ہیں۔

تعلیم کو منظم ہونا چاہیئے۔ چھوٹی درس گاہوں کا تعلق بڑی جامعہ یا کلیہ سے ہونا چاہیئے۔ نصاب میں توازن ہونا چاہیئے۔ طلبہ کی نقل وحرکت پر پابندی عائد ہونی چاہیئے۔ سرٹیفکیٹ کے سلسلے سے انہیں پابند کر دینا چاہیئے صحیح طور پر تو یہ نظام اس وقت چل سکتا ہے کہ حکومت اس ذمہ داری کو عقیدت اور ہمدردی کے جذبات سے سنبھالے۔

اس ضمن میں مولانا موصوف نے بالکل صحیح فرمایا ہے کہ "مردست حکومت کے لئے یہ کام مشکل ہے"۔ لیکن کیا اس وقت ایسے نظام کی جو ہماری دینی تعلیم کو پوری طرح منظم کرنے کی طرح بھی نہیں ڈالی جا سکتی۔ مولانا ممدوح کے خطبہ کے یہ جملے پڑھنے کے بعد ہماری نظریں بڑی پرشوق توقعات کے ساتھ بے اختیار جامعہ اسلامیہ بہاولپور اور محکمۂ اوقاف کے فاضل علم دوست اور علم پرور ناظم اعلیٰ شیخ محمد اکرام الحق صاحب پر جا پڑیں۔

سندھ کے دینی و علمی حلقوں میں یہ خبر بڑے رنج واندوہ سے سنی جائیگی کہ پچھلے دنوں مولانا الحاج عبدالکریم چشتی اور مولانا محمد عثمان سندھی رحلت فرما گئے۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔ مولانا چشتی حضرت مولانا تاج محمود امروٹی کے مسترشد تھے اور انہیں کا فیض تھا کہ آپ کی زندگی کا بیشتر حصہ استخلاص وطن کی جدوجہد میں گزرا۔ اور آپ نے قید و بند کی سختیاں جھیلیں آپ صاحب قلم بھی تھے اور صاحب بیان بھی۔ سندھی اور اردو میں بیسیوں کتابیں آپ کی تصنیف ہیں۔

مولانا محمد عثمان سندھی حضرت سید انور شاہؒ کے اولین تلامذہ میں سے تھے۔ دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد آپ حجاز تشریف لے گئے، لیکن اپنے مرشد حضرت امروٹیؒ صاحب کے اصرار پر وطن لوٹے اور ساری عمر درس و تدریس کے لئے وقف کر دی مولانا مرحوم حضرت شاہ ولی اللہؒ کے علوم کی نشر و اشاعت سے بڑا شغف رکھتے تھے چنانچہ شاہ ولی اللہ اکیڈمی کے قیام میں ان کی کوششوں کو بھی بڑا دخل ہے — خدا تعالےٰ ہمارے ان بزرگوں کو مغفرت عطا فرمائے۔

تصوّف

پروفیسر محمد احمد پرنسپل اسلامیہ کالج سکھر

مغربی تعلیم کی جملہ خرابیوں میں سے ایک خرابی یہ بھی ہے کہ مغربی تعلیم یافتہ حضرات مغربی مفکروں کی تعلیم کی روشنی میں اپنی ہر طرزِ زندگی کو عموماً اور دین کے اصولوں کو خصوصاً پرکھا کرتے ہیں اور پھر چند نتیجوں پر پہنچ جاتے ہیں جن کو وہ سچ کی آخری منزل سمجھ کر ان پر ایک کٹّر اور متشدد[ٹ] کی حیثیت سے اڑ جاتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی چاہتے ہیں کہ علمائے کرام و صوفیائے عظام ان کے نتائج کو حق مان کر قبول کر لیں اور چونکہ ایسا نہیں ہوتا وہ ان صاحبان کو نازیبا الفاظ سے یاد فرمانے لگتے ہیں اور ان بزرگوں کو اپنے نقد و نظر کے تیر کا شکار بنانے میں دلی مسرت محسوس کرتے ہیں۔ ان ناقدین حضرات میں چند ایسے بھی مشہور و معروف مفکرین شامل ہیں جو دین میں اتباعِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر اتباعِ عقل کو ترجیح دیتے ہیں۔

آیئے ہم ناقدین تصوف کی تنقید کا اصولی طور سے جائزہ لیں۔

پہلا اعتراض یہ ہے کہ اسلام میں تصوف کی کوئی گنجائش نہیں ہے بلکہ یہ دوسرے مذاہب کا اثر ہے یہ اعتراض کم علمی پر مبنی ہے۔ اسلام کی تکمیل پانچ اجزا سے ہوتی ہے اولاً عقائد۔ دوئم عبادات سوئم معاملات۔ چہارم معاشرت۔ پنجم اصلاح قلب جس کو تزکیۂ نفس، تصوف یا صوفی ازم کے الفاظ

[ٹ] FANATIC

سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ اسے حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں "احسان" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ کبر، عجب، حسد، غیبت، حب دنیا۔ حب دنیا۔ وغیرہ انسان کے دل کی بیماریاں ہیں اور ان سے چھٹکارا ظاہری علوم سے نہیں ہو سکتا بلکہ یہ ظاہری علوم تو اکثر ان بیماریوں میں اور اضافہ کر دیتے ہیں۔ ان بیماریوں کا علاج روحانی ڈاکٹروں کے اسپتالوں یعنی صوفیائے کرام کی خانقاہوں میں ہوتا ہے۔ بلکہ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ظاہری اعمال بھی باطن کی اصلاح کے لئے ہیں اور باطن کی صفائی مقصود اور موجب نجات اور اس کی کدورت اور میلا پن موجب ہلاکت ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں ارشاد فرماتے ہیں۔

بے شک جس نے نفس کو صاف کیا کامیاب رہا اور جس نے اس کو میلا کیا ناکام رہا۔

اس دن مال و اولاد کام نہ آئیں گے مگر جو شخص اللہ تعالیٰ کے پاس سلامت قلب لیکر آیا۔

پس تصوف دین کا ایک اہم شعبہ ہے جس سے دین کی تکمیل ہوتی ہے۔ اس کی حقیقت مختصر اور عام فہم الفاظ میں یوں بیان کی جاسکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں بندہ کے قلب کو ایسا یقین و اطمینان نصیب ہو جائے جیسا کہ کسی حقیقت کے مشاہدہ سے ہو جایا کرتا ہے پھر اس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ سے عبدیت کا وہ رابطہ پیدا ہو جائے جس کی وجہ سے قلب ہمہ دم اللہ تعالیٰ کی یاد اور اس کی عظمت و محبت سے معمور رہے۔ یہ عین کمال دین و ایمان ہے۔ پھر اس نور یقین اور احسانی کیفیت کا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تعلق کے مقابلہ میں سارے تعلقات فنا ہو جاتے ہیں پھر اس کے تمام ظاہری و باطنی اعمال مثلاً دوستی، دشمنی، کسی سے ملنا یا نہ ملنا اور لینا اور دینا سب اللہ ہی کے لئے ہونے لگتے ہیں۔ یہی مقام اخلاص ہے[1]۔ حضرت مجذوبؒ فرماتے ہیں۔

ہر تمنا دل سے رخصت ہو گئی
اب تو آجا اب تو خلوت ہو گئی

ناقدین تصوف کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اسلام کو اور مسلمانوں کو تصوف نے تباہ و برباد کیا ہے اس کو وہ افیون کا انجکشن کہتے ہیں، جس سے قوائے عمل فالج زدہ ہو جاتے ہیں۔ کاش کہ یہ حضرات علمائے ربانی کی

ع[1] مولانا منظور صاحب نعمانی (دین و شریعت)

تاریخ سے واقف ہوتے کہ جب بھی انہوں نے محسوس کیا کہ دین میں ٹھہراؤ آگیا ہے تو انہوں نے اپنی بے نظیر اور پُرخلوص جد وجہد سے اس میں روح عمل پھونک دی۔ مولانا ابوالحسن صاحب ندوی فرماتے ہیں۔

"حقیقت یہ ہے کہ اگر ہندوستان میں اللہ تعالیٰ دو شخصوں کو پیدا نہ کرتا اور ان سے اپنے دین کی دستگیری نہ فرماتا تو یوں تو اللہ تعالیٰ اپنے دین کا نگہبان ہے اس کی حفاظت دین کے طریقے ہزار ہیں۔ لیکن بظاہر تیرہویں صدی تک یا اسلام ہندوستان سے بالکل فنا ہو جاتا یا اتنا بگڑ جاتا جتنا ہندو مذہب۔ یہ دو بزرگ ہندوستان کے مسلمانوں کے جلیل القدر محسن اور اسلام کے عظیم الشان پیشوا حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ اور شیخ الاسلام شاہ ولی اللہ دہلویؒ ہیں۔ احیائے اسلام اور خدمت شرع کے تذکرے میں ان نائبانِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے درویشوں کے ساتھ ایک "دنیادار" بادشاہ محی الدین اورنگ زیب عالمگیر[۱] مرحوم کا نام بھی زبان پر آتا ہے"[۲]

حضرت سید احمد شہیدؒ[۳] اور حضرت شاہ اسمٰعیلؒ[۴] کی پوری زندگی عمل اور جد وجہد کی حامل رہی ہے جس کی شہادت بالاکوٹ کے مزار دے رہے ہیں۔ سید احمد شہیدؒ کے متعلق سید عبدالرحمٰن مرحوم سپہ سالار افواج نواب وزیرالدولہ بیان کرتے ہیں۔

"سورج نکلنے کے گھنٹوں بعد تک ورزش اور کشتی میں مشغول رہتے۔ میں بچہ تھا آپ کے بدن پر مٹی ملتا یہاں تک کہ خشک ہو کر جھڑ جاتی۔ پیروں پر مجھے کھڑا کر کے پانچسو ڈنڈ لگاتے پھر کچھ ٹھہر کر پانچسو اور۔ من بھر۔ بیس اور تیس سیر کے مگدر ہلاتے تھے۔ مولوی علیم اللہ دہلی کے مشہور پیراک استاد کہتے تھے کہ یہ وصف سید صاحبؒ ہی میں دیکھا کہ سخت بہاؤ کے خلاف پیرتے تھے۔ میں باوجود اتنی مشق اور زمانہ کے یہ نہیں کر سکتا۔"

---

۱ حضرت عالمگیرؒ حضرت خواجہ معصوم سرہندیؒ صاحبزادے اور خلیفہ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مرید تھے۔

۲ سیرت سید احمد شہیدؒ ۳ آپ شاہ عبدالعزیزؒ سے بیعت تھے ۴ آپ سید احمد شہید سے بیعت تھے۔

مولانا نسیم احمد صاحب فریدی امروہوی کے الفاظ ہیں۔

"آپ (شاہ اسمٰعیل شہیدؒ) نے گھوڑے کی سواری میاں رحیم بخش چابک سوار سے سیکھی اس میں اتنی مشق بڑھائی کہ چاہے کیسا ہی منہ زور گھوڑا ہو بے زین اس پر سوار ہو کر اس کو دوڑا سکتے تھے۔ بنوٹ وغیرہ مرزا رحمۃ اللہ بیگ سے سیکھی۔ آپ نے کشتی کا فن بھی سیکھا تھا۔ گولی کا نشانہ بھی آپ کا بہت اچھا تھا اور اس کی بھی مشق کرتے رہتے تھے۔ آپ نے تیرنا بھی سیکھا تھا۔ علاوہ ازیں جاڑے کے زمانے میں بے سرمائی کپڑوں اور بغیر لحاف کے رہنے کی بھی مشق کی۔ سخت دھوپ میں تپتی ہوئی زمین پر آہستہ آہستہ برہنہ پا چلنے کی بھی مشق کی۔ کم کھانے اور کم سونے کی بھی مشق کی۔"[۲]

مرزا حیرت دہلوی کے بیان کی رو سے گیارہ جنگیں ہوئیں ان سب میں حضرت مولانا اسمٰعیل شہید شریک رہے۔ بالآخر بالاکوٹ کے میدان میں اپنے پیر و مرشد[۳] کے ہمراہ ۲۴ ذی قعدہ سنہ ۱۲۴۶ھ کو جمعہ کے دن اپنے خون کا آخری قطرہ اللہ کے راستے میں بہایا۔ وہیں آپ کی قبر ہے۔

سنہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں صوفیائے کرام نے انگریزی سامراج سے باقاعدہ جنگ لڑی ہے جس کے کمانڈر شیخ الشیوخ حضرت مخدوم العالم حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ تھے اور آپ کے ساتھی حضرت امام ربانی مولانا رشید احمد گنگوہیؒ حضرت محمد قاسم صاحب نانوتویؒ اور حضرت حافظ ضامن صاحب تھے۔ حضرت حافظ ضامن صاحبؒ کی شہادت اس جنگ آزادی میں ہوئی تھی۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحبؒ اور حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ انگریزی حکومت سے ٹکر لینے کی پاداش میں کافی عرصہ تک مالٹا میں قید رہے۔ پاکستان کی جنگ آزادی میں حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی کا نمایاں کردار رہے۔

اس اعتراض کے ضمن میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ وقت خانقاہوں میں ہو حق کے نعرہ لگانے کا

۲؎ شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور معاندین کے الزامات۔ ۳؎ حضرت سید احمد شہیدؒ

نہیں بلکہ میدان میں آنے کا ہے۔ اس اعتراض کے جواب میں حضرت حکیم الامت شاہ اشرف علی تھانوی کی تحقیق ملاحظہ ہو۔

"لوگ کہتے ہیں کہ حجروں میں بیٹھنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ میدان میں آنا چاہیئے، میں کہتا ہوں کہ حجروں میں بیٹھنے سے میدان کی قابلیت پیدا ہوتی ہے۔ جیسے ریڈیو حجرہ میں ہی رکھا جاتا ہے پھر اس سے تقریریں نشر ہو کر تمام عالم میں ہل چل پڑ جاتی ہے سعد بن وقاص ایک معرکہ میں امیر لشکر تھے اور دنبل نکل آنے کی وجہ سے نقل و حرکت سے معذور تھے۔ پھر بھی اپنے خیمہ میں بیٹھے بیٹھے فوج کی کمان کر رہے تھے۔ بلکہ جب نبی الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بھی بدر سے پہلے حرا تھا تو بدیگراں چہ رسد"

تیسرا اعتراض سب اعتراضوں سے کمزور بلکہ اگر جاہلانہ نہیں تو بچگانہ ضرور ہے۔ چند دنیاداروں نے پیری مریدی کو دنیا کمانے کا پیشہ بنالیا ہے اور اکثر ان لوگوں سے ایسے اعمال سرزد ہوتے ہیں کہ جن کو فہم دین اور عقل سلیم ہرگز برداشت نہیں کر سکتی۔ ایسے "پیروں" کو دیکھ کر یہ فیصلہ صادر کیا جاتا ہے کہ پیری مریدی کا سلسلہ بذات خود ہی قابل ملامت ہے۔ اگر کوئی وکیل اپنے موکل کے مقدمہ کی پیروی ٹھیک طریقے سے نہ کرے تو کیا سارے وکیل گردن زدنی قرار دیئے جائیں گے؟ اگر کوئی ڈاکٹر صحیح آپریشن نہ کر سکے اور مریض کا دوران آپریشن انتقال ہو جائے تو کیا اس واقعہ سے یہ عمومی فیصلہ کر دینا بجا ہوگا کہ سارے ڈاکٹر جب آپریشن کرتے ہیں، تو مریض مر جاتا ہے؟ اگر کچھ مسلمان خراب کام کرتے ہوئے ملیں تو کیا یہ کہہ کر دین اسلام ہی کو چھوڑ دیا جائے گا کہ اس میں ایسی گندی ذہنیت اور گنہ گار زندگی کی پرورش ہوتی ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو کیا چند دوکاندار "پیروں" کی بدمعاشیاں اور دنیاداری دیکھ کر بجائے اس کے کہ ان کو برا کہا جائے سلسلہ بیعت و رشد و ہدایت و تزکیہ نفس ہی کو قابل ملامت گردانا جائے تو کیا یہ فیصلہ بعید از عقل نہ ہوگا؟

سلہ غالباً چرچل نے بھی محاذ جنگ پر خود جا کر جرمن فوجوں سے مقابلہ کیا تھا!

کتنا غلط یہ حرف بھی مشہور ہوگیا!

جس طرح دین کے دوسرے شعبوں میں امت کے بعض حلقوں سے چھوٹی بڑی غلطیاں ہوئی ہیں اس طرح سلوک و تصوف کا شعبہ بھی غلطیوں سے محفوظ نہیں رہا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس شعبۂ احسان و تصوف کے سلسلہ کی اغلاط و ضلالت بھی من جانب اللہ محققین صوفیا کے ذریعہ برابر درست ہوتی رہی ہے۔ امام ربانی مجدد الف ثانیؒ اور ان کے فرزند و جانشین خواجہ محمد معصومؒ کے مکتوبات، حضرت شاہ ولی اللہؒ اور حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی کی تصانیف اور ان کے مکاتیب، حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کا مرتب کیا ہوا حضرت سید احمد شہیدؒ کے ملفوظات و افادات کا مجموعہ۔ پھر اسی صدی میں حضرت حاجی صاحب کے ارشادات گرامی، حضرت گنگوہیؒ کے رسائل و مکاتیب اور سب سے آخر میں حکیم الامت حضرت تھانوی کا تصنیف کیا ہوا اس سلسلے کا پورا کتب خانہ ان کوششوں نے تصوف کو اتنا صاف و روشن کر دیا ہے کہ اب اس راہ میں کسی کا گمراہ ہونا صرف اس کی بدقسمتی ہے۔ کسی کے لئے یہ صحیح نہیں ہے کہ وہ سلوک و تصوف میں کچھ لوگوں کی غلط روی کی وجہ سے دین کے اس شعبہ ہی سے بے نیاز ہو جائے جس کے بغیر بندہ کا دین کامل نہیں ہوتا اور حلاوت ایمان نصیب نہیں ہوتی ہے[1]

حضرت تھانوی فرماتے ہیں۔

"تصوف کا ناس کر دیا ہے ان جاہل صوفیوں نے اور فقیری کو ہاۓ ہاؤ بنا رکھا ہے۔ کہتے ہیں پہلے کھینچو بیوی کو طلاق دے دو۔ اولاد کو عاق کر دو۔ چالیس چنے رکھ لو اور ایک چنا روز کھاؤ بعد اس کے فقیری نہیں ملتی۔ میں کہتا ہوں واللہ دو شالوں میں، گدے تکیوں میں، سلطنت میں، مرغن کھانوں میں، فقیری ملتی ہے۔ مگر گھر میں نہیں۔ شیخ کامل کی خدمت میں ملتی ہے۔"[2]

---

[1] مولانا منظور صاحب نعمانی (دین و شریعت)

[2] طریق القلندر

مزید ـــ

"ان رسم پرست اور مدعیان طریق اور گمراہوں اور ڈاکوؤں سے بجائے دینی نفع کے بہت مخلوق گمراہ ہو چکی ہے اور نفع کیا ہوتا بقول شخصے جب ستفادہ ہی میں پانی نہ ہو تو بدھنی میں کیا آوے ۔ یہ لوگ فیض فیض گاتے پھرتے ہیں ہاں مرید سے اپنے پیر کو فیض ضرور ہو جاتا ہے مطلب یہ کہ دنیا حاصل ہو جاتی ہے ۔ ان لوگوں نے بیچارے مریدوں کا دین تو خراب کیا ہی تھا لوٹ لوٹ کر ان کی دنیا بھی برباد کر دی ۔ ان کی آمدنیوں پر قبضہ کئے ہوئے ہیں ۔ مرید خواہ بیوی کو کچھ دے یا نہ دے خواہ اس کے بچے بھوکوں مریں مگر پیر صاحب کی خدمت فرض و واجب ہے جس کے نہ کچھ حدود ہیں نہ اصول ۔ نہ حرام کی خبر نہ حلال کی ۔ نہ جائز کی تمیز نہ ناجائز کی ۔ غرض نہایت گڑبڑ مچا رکھی ہے اور یہ اندھے مرید بھی ایسی ہی جگہ خوش رہتے ہیں ۔"

مولانا منظور صاحب نعمانی :-

"صوفیائے کرام کا یہ طریقہ جس کا نام سلوک و طریقت ہے، اصولاً صحیح اور نتیجۃً کامیاب ہے ۔ کون اس سے انکار کر سکتا ہے کہ مشاہیر اولیاء امت مثلاً خواجہ معروف کرخی بشر حافی ۔ سری سقطی ۔ شفیق بلخی ۔ بایزید بسطامی ۔ جنید بغدادی ۔ ابوبکر شبلی ۔ شیخ عبدالقادر جیلانی ۔ شیخ شہاب الدین سہروردی ۔ شیخ ابوالحسن شاذلی ۔ خواجہ عثمان ہارونی خواجہ معین الدین چشتی ۔ خواجہ بہاؤالدین نقشبند ۔ خواجہ باقی باللہ ۔ امام ربانی مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی ۔ شاہ ولی اللہ دہلوی ۔ سید احمد شہید رحمہ اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اور ان جیسے ہزاروں بلکہ لاکھوں افراد ہیں جو اپنے وقت میں اس نسبت کے حامل بلکہ اس راہ کے امام اور داعی ہوئے ہیں ۔ اور ان میں سے ایک ایک کی صحبت و تربیت سے اللہ کے ہزاروں لاکھوں بندوں کو یہ دولت حاصل ہوئی ہے بس جس طریقہ نے امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم میں اتنے کاملین اور اس قدر اصحاب

احسان و یقین پیدا کئے ہوں جن کو بجا طور سے اس امت کا گل سر سید کہا جا سکتا ہے اس کے صحیح و کامیاب و مقبول ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے[۱]۔"

چوتھا اعتراض دلیل کم ہمتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اچھا صاحب بضرورتِ محقق شیخ بہ سلسلہ اصلاح باطن تسلیم مگر یہ شیخ کامل اب ہیں کہاں؟ ان ناقدین تصوف کو معلوم ہونا چاہیئے کہ دنیا بزرگوں سے نہ کبھی خالی رہی اور نہ قیامت تک خالی رہے گی۔ البتہ یہ حضرات پُرخلوص کوشش کے بعد ہی ملتے ہیں۔ بیمار کے پاس ڈاکٹر خود نہیں آتا، ڈاکٹر کے پاس بیمار خود جاتا ہے پھر ڈاکٹر بھی تو کئی ہیں۔ مریض خود اپنے اور دوسرے احباب کے تجربوں کی بنا پر اور ان چند صحیح اصولوں کی روشنی میں جو ایک ذمہ دار ڈاکٹر پر اطلاق ہوتے ہیں، اپنے لئے بہتر سے بہتر معالج تلاش کرتا ہے اور کبھی یہ شکایت نہیں کرتا کہ آج کل معالج نہیں ملتا۔ اس طرح اگر تزکیہ نفس اور صفائی قلب کی اہمیت دماغ میں رچ جائے اور پھر شیخ کامل کی تلاش میں دوڑ دھوپ کی جائے اور شیخ کو ان اصولوں کے تحت پرکھا جائے جو محققین نے اسی ضرورت کے لئے مرتب کئے ہیں تو یقیناً اور ضرور بالضرور انشاء اللہ شیخ کامل برائے احسان و سلوک ملیں گے۔

حضرت شیخ العرب والعجم حاجی صاحبؒ نے فرمایا۔

"کوئی جگہ اولیاء اللہ سے خالی نہیں ہے اور جب اولیاء اللہ باقی نہ رہیں گے قیامت واقع ہوگی۔[۲]"

اس راہ کو طے کرنے کے لئے کسی رہنما کی رہنمائی ضروری ہے۔ جس طرح کوئی شخص صرف طب کی کتابیں دیکھ کر اپنی اور دوسروں کی بیماریوں کا علاج نہیں کر سکتا اور اگر کرے تو غلط اور خطرناک ہے اس طرح اس روحانی معالجہ میں بھی کسی ایسے روحانی طبیب سے استفادہ اور اس کی

۱؎ مولانا منظور نعمانی (دین و شریعت)

۲؎ امداد المشتاق

ہدایات و تجاویز کا اتباع ضروری ہے جو خود اس طریق پر چل کر یہ مقصود یعنی احسانی کیفیت اور رابطہ مع اللہ پیدا کر چکا ہو اور اس راہ کے گرم و سرد سے واقف ہو' اس لئے طالب کا پہلا قدم یہ ہونا چاہیئے کہ اپنی رہنمائی کے لئے اپنی مناسبت کے لحاظ سے وہ کسی صاحبِ نسبت اور صاحبِ ارشاد بندہ کا انتخاب کرے اور اس سے علاج و رہنمائی کا طالب ہو۔

اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ جو شخص کہیں پیر بنا بیٹھا ہے' وہ اس راہ کی رہنمائی کا اہل ہے۔ آج کل جس طرح طبیبوں اور ڈاکٹروں میں ناقص و کامل اور اصلی و نقلی سب طرح کے ہیں' اسی طرح "پیروں" میں بھی سب طرح کے اصلی و نقلی ہیں' بلکہ یہاں نقل اصل سے بہت زیادہ ہے لیکن جس طرح دوسری جگہ میں اصلی و نقلی کو پہچانا جا سکتا ہے' اسی طرح تصوف کے شعبہ میں بھی اہل و نااہل کا پہچاننا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے۔ اس راہ کے محققین نے جو علم شریعت کے ماہر ہیں کتاب و سنت کے اشارات اور اپنی دینی فہم و فراست اور اس راہ کے تجربہ سے اللہ کے صادق بندوں کی ایسی مثالیں لکھ دی ہیں جن سے اہل قلوب و اصحاب ارشاد کو پہچانا جا سکتا ہے۔ سب سے بڑی نشانی یہ ہے کہ تقویٰ و اتباع شریعت کے ساتھ ان کی یہ کیفیت ہو کہ ان کے قریب رہنے سے خدا یاد آتا ہو۔ دنیا کی محبت کم ہوتی ہو' اور اللہ کی محبت اور آخرت کی فکر بڑھتی ہو اور ان کی رہنمائی میں اس راہ پر چلنے والوں میں یہ چیزیں صاف محسوس ہوتی ہوں۔ حضرت حکیم الامت شاہ اشرف علی تھانویؒ نے شیخ کامل کی پہچان کے چند اصول بیان فرمائے ہیں۔

۱۔ علم شریعت سے بقدر ضرورت واقف ہو' خواہ تحصیل سے یا صحبت علمائے تا فساد عقائد و اعمال سے محفوظ رہے' اور طالبین کو محفوظ رکھ سکے۔

۲۔ عقائد۔ اخلاق و اعمال میں شرع کا پابند ہو۔

۳۔ تارک دنیا راغبِ آخرت ہو۔ ظاہری و باطنی طاعات پر مداومت رکھتا ہو۔

۴۔ کمال کا دعویٰ نہ کرتا ہو کہ یہ بھی شعبۂ دنیا ہے۔

۵۔ بزرگوں کی صحبت اٹھائی ہو۔ ان سے فیوض و برکات حاصل کئے ہوں۔

۶۔ تعلیم و تلقین میں اپنے مریدوں کے حال پر شفقت رکھتا اور ان کی کوئی بُری بات دیکھے یا سُنے تو ان کی روک ٹوک کرتا ہو۔ یہ نہ ہو کہ ہر ایک کو اس کی مرضی پر چھوڑ دے۔

۷۔ جو لوگ اس سے بیعت ہیں، ان میں سے اکثر کی حالت باعتبار اتباعِ شریعت و قلتِ حرص دنیا کے اچھی ہو۔

۸۔ اس زمانہ کے منصف علماء و مشائخ اس کو اچھا سمجھتے ہوں۔

۹۔ بہ نسبت عوام کے خواص یعنی فہیم دیندار لوگ اس کی طرف زیادہ مائل ہوں۔

۱۰۔ اس کی صحبت میں چند بار بیٹھنے سے دنیا کی محبت میں کمی اور حق تعالیٰ کی محبت میں ترقی محسوس ہو۔

۱۱۔ خود بھی ذاکر و شاغل ہو کیونکہ بدون عمل یا عزم عمل تعلیم میں برکت نہیں ہوتی۔

۱۲۔ مصلح ہو، صالح ہونا کافی نہیں۔ شیخ ہونے کے لئے دونوں کے جمع کی ضرورت ہے تاکہ جو مرض باطنی بیان کرو اس کو بہت توجہ سے سنکر اس کا علاج تجویز کرے اس سے دم بدم نفع ہوتا چلا جائے اور اس کی اتباع کی بدولت روز بروز حالت درست ہوتی جائے[1]

جس شخص میں یہ علامات ہوں، پھر نہ دیکھئے کہ اس سے کوئی کرامت بھی صادر ہوتی ہے یا نہیں۔ یا یہ شخص صاحب تصرفات ہے یا نہیں یا اس کو کشف ہوتا ہے یا نہیں۔ یا یہ جو دعا کرتا ہے قبول ہوتی ہے یا نہیں کیونکہ یہ امور لوازم مشیخت یا ولایت سے نہیں۔ اسی طرح یہ نہ دیکھئے کہ اس کی توجہ سے لوگ مرغ بسمل کی طرح تڑپنے لگتے ہیں یا نہیں کیونکہ یہ بھی لوازم بزرگی سے نہیں ہے[2]

اپنے ایک معرکۃ الآرا وعظ میں فرماتے ہیں۔

" حضرت جنیدؒ کی خدمت میں ایک شخص دس برس رہا چلتے وقت عرض کیا کہ حضرت

---

[1] ایسے ہی لوگوں کی نسبت کہا ہے۔ یک زمانہ صحبت با اولیا۔ بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

[2] شریعت اور طریقت

ہیں نے اتنی مدت خدمت میں قیام کیا لیکن کبھی کوئی کرامت آپ کی نہیں دیکھی۔ یہ سن کر آپ کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا۔ جوش میں آکر فرمایا کہ اچھا تو یہ بتلا جنید سے تو نے اتنے عرصہ میں کوئی فعل سنت کے خلاف ہوتے ہوئے بھی دیکھا ہے اس نے کہا کہ نہیں۔ اس پر آپ نے جوش میں آکر فرمایا! ارے پھر اس سے بڑھ کر جنید کی اور کیا کرامت ہوگی کہ اس نے دس برس تک اپنے خدا کو ایک لمحہ کے لئے بھی ناراض نہیں کیا اور اس سے بڑھکر اور کیا کرامت ہوگی جو تو جنید کی دیکھنا چاہتا ہے[1]۔"

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا۔

"اور لوگوں کی یہ حالت ہے کہ ہر شخص کے معتقد ہو جاتے ہیں ایسا ہرگز نہ چاہیئے ہر شخص اللہ والا نہیں ہے بلکہ اس کی کچھ پہچان بھی ہے ۔۔۔ اس زمانہ میں بالخصوص اس شخص کے ظاہری اعمال کے صالح ہونے پر نظر کرنے کی بھی سخت ضرورت ہے بعض بدعقیدہ لوگ کہتے ہیں کہ بس صاحب! اہل باطن ہونا چاہیئے۔ نماز روزہ کی کیا ضرورت ہے صرف خدا کی یاد اپنے قلب میں ہونے کی ضرورت ہے اس دھوکہ میں ہرگز نہ آنا۔ خود اس کے اعمال بھی درست ہوں اور اس کی صحبت میں بھی یہ اثر ہو کہ دوسروں کے اعمال بھی درست ہو جائیں اس شخص کی صحبت اکسیر اعظم ہے۔"

ایک اور سلسلہ گفتگو میں فرمایا۔

"شیخ کامل وہ ہے جو طالب کی دلجوئی اور تسلی کرتا رہے، اور اس کی مایوس سے مایوس حالت کو سنبھالتا رہے اس کے دل کو بڑھاتا رہے اس میں تو ہم نے اپنے حضرت حاجی صاحبؒ[2] کو دیکھا کہ کیا ہی کوئی روتا ہوا گیا ہنستا ہوا آیا۔ یہ واقعہ ہے حضرت

---

[1] شیخ کامل کی پہچان کے ۱۲ اصول جو اوپر بیان ہوئے۔
[2] حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ

حاجی صاحبؒ اپنے زمانہ میں اس فن کے امام تھے۔ مجدد تھے۔ مجتہد تھے۔"

ملفوظ حضرت حاجی صاحبؒ۔

"شیخ کامل کی پہچان کا ایک طریقہ مقرر کیا گیا ہے کہ اگر کسی شیخ کی صحبت سے دنیا سے دل سرد ہوتا جاتا ہو اور عقبیٰ کی طرف میلان زیادہ ہو تو وہ شیخ کامل ہے"

شیخ کامل کی حالت مشابہ عوام کے ہوتی ہے۔ وہ سب میں ملا جلا رہتا ہے۔ اس کی کوئی امتیازی شان نہیں ہوتی اور یہی حالت حضرات انبیا علیہم السلام کی تھی اور اسی حالت کو دیکھکر لوگوں نے کہا کہ تم تو ہمارے ہی جیسے بشر ہو۔ انبیا علیہم السلام نے اس کی نفی نہیں کی بلکہ اثبات میں جواب فرمایا کہ بیشک ہم بشر ہیں۔ ہمیں اس سے انکار نہیں مگر اس کے ساتھ ہی یہ فرمایا کہ اللہ تعالےٰ اپنے بندوں میں جس پر چاہے احسان فرمادے چنانچہ ہم پر احسان فرمایا کہ ہم کو نبوت عطا ہوئی۔ غرض شیخ کامل اپنی شان میں مشابہ ہوتا ہے انبیا علیہم السلام کے۔ جہاں اور کمالات اس پر شمع نبوت سے فائض ہوتے ہیں اس پر یہ بھی ظلی کا فیض ہوتا ہے کہ اس کا چلنا پھرنا۔ اٹھنا۔ بیٹھنا۔ کھانا پینا۔ نشست وبرخاست رفتار گفتار سب سنت ہی کے تابع ہوتا ہے[1]۔

خیال یہ تھا کہ یہاں صوفیوں کے سے دعوے ہوتے ہوں گے مجذوبوں کے ہاں کے سے احکام جاری ہوتے ہوں گے۔ کشف وکرامات کے چرچے اور تذکرے ہوتے ہوں گے۔ بڑا زور خوابوں اور کیفیات کا رہتا ہوگا۔ اور سب سے زیادہ اہمیت کے ساتھ ذکر وشغل کے حلقے ہوتے ہوں گے۔ مولانا کی تصانیف ومواعظ کے مطالعہ اور قبل کی مختصر صحبتوں اور ملاقاتوں نے ان تخیلات کو ضعیف ضرور کر دیا تھا۔ پھر بھی اچھی خاصی جان ان میں باقی تھی۔ اب کی طویل صحبت اور روزمرّہ کی گفتگوؤں نے رفتہ رفتہ بتایا اور دل میں اتارا کہ اصل شے تو احکام شریعت ہیں مدار کار تو اتباع سنت ہے۔ البتہ پورے اخلاص وتزکیہ قلب کے ساتھ ..." (حکیم الامت از مولانا عبدالماجد)

---

[1] حکیم الامت حضرت تھانوی رح

مثالی ملّت کا تصوّر

ترجمہ - از حضرت شاہ ولی اللہ

تمہیں یہ جاننا چاہیئے کہ ارتفاقات[1] جن پر نظام بشری کی بنا ہے، اور انہیں اور بالخصوص ان میں سے ارتفاق ثانی[2] اور ارتفاق ثالث کو اللہ تعالےٰ کے فضل و عنایت نے نوع انسان کو عطا کیا ہے۔ نیز اقترابات[3] جو طبائع انسانی میں ودیعت کئے گئے ہیں اور اللہ تعالےٰ کے فضل و عنایت سے

۱؎ ہر نوع کو اپنے نوعی تقاضوں کی تکمیل کے لئے "طبیعی الہامات" سے نوازا گیا ہے۔ لیکن اس سلسلے میں نوع انسان کو اپنی ضرورتوں کی تحصیل اور اس میں مزید آسانیاں پیدا کرنے کے لئے اس کے علاوہ "خصوصی الہامات" سے بھی سرفراز کیا گیا ہے ان الہامات کا ظہور جن عملی پیرایوں میں ہوتا ہے۔ ان کا نام ارتفاقات ہے۔

۲؎ انسان کی اجتماعی زندگی کی پہلی منزل، جس سے کوئی دور افتادہ انسانی گروہ بھی مستثنیٰ نہیں ہو سکتا ارتفاق اوّل ہے۔ جیسے بات چیت کھیتی باڑی اور مویشی پالنا وغیرہ۔ وہ امور جو شہروں کی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں، ارتفاق ثانی ہیں آتے ہیں نظام حکومت اور عدل و انصاف کا قیام ارتفاق ثالث سے تعلق رکھتا ہے اور ارتفاق رابع یہ ہے کہ لوگ ایک ایسی طاقت کی اطاعت کریں، جو خلافت کبریٰ کی ہم پلہ ہو۔ "خلیفہ" سے میری مراد یہ ہے کہ ایک شخص ایسی شوکت و صولت کا حامل ہو کہ دوسرا شخص اس کے ملک پر حملہ کرنا اور اسے چھیننا ناممکن سمجھے۔" (حجۃ اللہ البالغہ)

۳؎ اقترابات، قرب الٰہی کے حصول کے ذرائع

ص؎ یہ البدور البازغہ کی فصل (فی بیان الملل والشرائع) کا ترجمہ ہے ---- مدیر

نوع انسانی ہیں انہیں اوران میں سے خاص طور سے احسان[1] عبادت گزاری اور شتر دیدی سے اجتناب کو نمایاں کیا ہے، غرض یہ ارتفاقات اور اقترابات سب کُلّی امور ہیں، اور یہ بہت سی شکلوں میں بروئے کار آتے ہیں۔

ان ارتفاقات میں سے مثال کے طور پر ایک نکاح ہے۔ اور یہ مشتمل ہے اس کے اعلان، دف بجانے اور گانے پر، ایسے کپڑے پہننے پر جو عموماً نکاح ہی کے موقع پر پہنے جاتے ہیں اور کھانا تقسیم کرنے پر جو عموماً نکاح ہی کے موقع پر تقسیم کیا جاتا ہے۔ یہ امور ارتفاق ثانی کے تحت آتے ہیں۔ اور جس نے یہ پورے کئے اس نے حق واجب ادا کر دیا اسی طرح نکاح کی شرائط میں گواہوں کی شہادت اور زبان سے ایجاب و قبول بھی ہے، اور جس نے یہ شرائط پوری کیں، اس نے حق واجب ادا کر دیا۔ بات یہ ہے کہ نکاح کے معاملے میں حقیقی فرض یہ ہے کہ منکوحہ عورت کا ایک مرد کے ساتھ تعین ہو جائے۔[2]

---

[1] احسان یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو۔ اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے، ہو تو وہ تمہیں دیکھ رہا ہے" (حجۃ اللہ البالغہ) علم احسان میں اعمال کے سلسلے میں ہئیات نفسیہ اور کیفیات نفس سے بحث کی جاتی ہے تاکہ انسان ان ہئیات و کیفیات کی حقیقت اور ان کے اصل معنی معلوم کرے اور اس طرح اعمال کو پوری بصیرت کے ساتھ انجام دے سکے اور اس اصل مقصد تک پہنچے، جو ان اعمال سے مطلوب ہے۔

[2] نکاح کا طریقہ اس مروجہ ہیئت میں یعنی یہ کہ نکاح غیر محارم کے ساتھ کیا جائے۔ لوگوں کے مجمع عام میں کیا جائے۔۔۔ عین فطری امر ہے، جس پر کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے اور عرب و عجم میں اس بارے میں اختلاف نہیں (حجۃ اللہ البالغہ)

حجۃ اللہ البالغہ میں "تدبیر منزل" کے ذیل میں فرماتے ہیں :۔ معلوم ہونا چاہیئے کہ تدبیر منزل کے اصل اصول تمام عرب و عجم کے نزدیک مسلّم اور مانے ہوئے تھے اور ہیں۔ اگر اختلاف ہے تو صرف اشباح و صُور کا اختلاف ہے، جب آنحضرت صلعم عرب میں مبعوث ہوئے اور حکمت الٰہیہ اس کی مقتضی ہوئی کہ زمین الٰہی پر کلمۃ اللہ کو غالب کر دیا جائے تو غلبہ کی صورت یہ ہوئی کہ عربوں کو دنیا کے تمام ادیان و مذاہب پر غالب کر دیا جائے۔ اور ان کی عادات و اخلاق کے ذریعہ تمام کے عادات و اخلاق پھر ان کی ریاست و امارت قائم کر کے تمام کی ریاست و امارت کو منسوخ کر دیا جائے چنانچہ حکمت الٰہی نے یہ واجب کر دیا کہ تدبیر منزل کے بارے میں اہل عرب کے عادات و اطوار کو بطور اصول متعین اور لازم کر دیا جائے اور بعینہ انہی اشباح و صور کا اعتبار کیا جائے۔

تاکہ اور کوئی اس میں شریک نہ ہو اور نہ کسی بھی بنا پر اس قسم کی شرکت کا کوئی احتمال باقی رہے۔ نیز اس سلسلے میں نکاح کا اہتمام جیسا کہ ابھی ذکر ہوا، بڑی شان سے کیا جائے۔ اور یہ مذکورہ بالا امور سے ہو سکتا ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کے تقرب کا مسئلہ ہے۔ یہ اس طرح بھی ممکن ہے کہ آدمی بالکل اس کا ہو جائے۔[۱] (یمکن بالتجرد الیہ) اور اس سے انسانی خواص جاتے رہیں۔ اور اس طرح بھی ممکن ہے کہ وہ اصل انسانیت اور اس کے خواص کو باقی رکھتے ہوئے اعضاء و جوارح کے ذریعہ تقرب الٰہی کے آداب بجالائے۔[۲]

ان دو مثالوں پر تم ارتفاقات و اقترابات کے ان تمام بڑے بڑے امور کا قیاس کرلو، جن کا

---

[۱] "سماحت" یہ ہے کہ نفس انسانی بہیمی جذبات کی گرفت سے آزاد ہو جائے۔ صوفیائے کرام اس حقیقت کو قطع تعلق یا فنا یا حریت نفس سے تعبیر کرتے ہیں کہ انسان دنیوی تعلقات کو منقطع کرلیوے بشری رذائل و خصائص کو ختم کر کے اپنے کو مرضی الٰہی میں فنا کردے اور دنیوی تعلقات سے بالکل آزاد ہو جائے.... اور خلق سماحت کی تحصیل کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ انسان ان امور سے بھی احتراز کرے، جن کی وجہ سے اس قسم کے امور میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہو اور قلب کو ذکر الٰہی میں مشغول رکھے۔ اور نفس کو عالم تجرد کی طرف رجوع کر دیوے۔ (حجۃ اللہ البالغہ)

[۲] شارع نے جن امور کا بطور "ایجاب" یا "تحریم" حکم فرمایا اور ادا لوگوں کو ان کا مکلف گردانا، وہ ایسے اعمال ہیں، جو کیفیات نفسیہ سے پیدا ہوتے ہیں اور آخرت میں انہیں اعمال کا اجر و ثواب یا عتاب و عذاب انسان کو ملتا ہے۔ یہی اعمال ان کیفیات میں پھیلاؤ پیدا کرتے اور ان کی تشریح کرتے ہیں۔ اور یہ اعمال ہی ان کیفیات نفسیہ کی ظاہری شکلیں اور صورتیں ہوا کرتی ہیں۔

(حجۃ اللہ البالغہ)

ہم نے ذکر کیا ہے۔ غرض یہ کہ ان کا متعدد شکلوں میں وقوع پذیر ہونا ممکن ہے چنانچہ ہم نے ملت حنفیہ کے ضمن میں ان کی جن شکلوں اور طریقوں کا ذکر کیا ہے، تم اس سے دھوکے میں نہ آجانا۔ یہ تو صرف مثالیں تھیں اور فقط مثالیں، اس بارے میں تم یہ نہ سمجھنا کہ ان معاملات میں حق واجب صرف ان شکلوں ہی میں محصور ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ملتوں میں سے کوئی ملت بھی ایسی نہیں جس نے ان امور کے حق واجب کو بالکل نظر انداز کیا ہو، اور کوئی فرد بھی ایسا نہیں جس پر کہ بشر اور انسان کا اطلاق ہو سکتا ہے اور وہ اس حق واجب کا انکار کرے[1]۔ باقی اس کی خلاف ورزی کرنا دوسری بات ہے۔ اختلاف و نزاع اگر ہے تو ان کی کسی معین شکل اور ان کی کسی مخصوص وضع کے بارے میں ہے، مختصراً ارتفاقات اور اقترابات کے وقوع پذیر ہونے کے سلسلے میں جو شکلیں اور اوضاع و ہئیتیں ہیں، ان کی ایک معین شکل اور مخصوص وضع ملت[2] کہلاتی ہے۔

اب حالت یہ ہے کہ چونکہ بنی آدم کی اکثریت ارتفاقات اور اقترابات کے علوم کو صحیح طور پر حاصل نہیں کر سکتی اور نہ ان کی اوضاع و ہئیتوں کے اصولوں تک وہ پہنچ پاتے ہیں، اس لئے

---

[1] تم دنیا کی کوئی قوم ایسی نہ پاؤ گے جو مذکورہ ابواب (ارتفاقات) کے جو اصول ہیں، ان پر اعتقاد نہ رکھتی ہو۔ اور باوجود دین و مذاہب کے اختلاف، دور دراز شہروں اور آبادیوں و ملکوں میں جدا جدا رہنے کے انہیں قائم کرنے اور ان کی پابندی میں پوری پوری کوشش نہ کرتی ہو۔ (حجۃ اللہ البالغہ)

[2] ارتفاقات اور اقترابات کی بعض شکلوں اور مخصوص اوضاع و ہیات کو فرداً فرداً "رسوم" کہتے ہیں اور ان کا مجموعی نام ملت ہے۔ ان "رسوم" کی ارتفاقات کے ذیل میں وہی حیثیت ہے جو انسانی جسم میں دل کی ہے۔ ان "رسوم" کا تعین مختلف ذرائع سے ہوتا ہے۔ اور بہت سے اسباب ہوتے ہیں جن کی وجہ سے انہیں استحکام ملتا ہے اس ضمن میں شاہ صاحب فرماتے ہیں بہت سے "رسوم" اپنی اصلیت کے لحاظ سے حق ہیں۔ کیونکہ یہ صالح ارتفاقات کے محافظ ہیں اور افراد انسانی کے نظری اور عملی کمال کی طرف رہنمائی کرنے والے ہوتے ہیں۔ اگر یہ طریقے نہ ہوں (باقی حاشیہ صفحہ ۲۱ پر)

نوع انسانی پر اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم سے یہ واجب ٹھہرا کہ ملتوں کا وجود ظہور میں آئے اور انسانوں کی فطرت میں کسی نہ کسی ملت کی فرمانبرداری کا داعیہ و رجحان ودیعت کیا جائے پھر ارتفاقات بروئے کار آئیں، اور ان کی فرمانبرداری ایک مخصوص ملت کے لئے واجب کردی جائے۔

باقی رہا ملتوں کا ظہور، تو وہ مختلف طرح پر ہوتا ہے، کبھی ایک عالم جسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے تعلیم ملتی ہے اور وہ ارتفاقات اور اقترابات کے علوم پر حاوی ہوتا ہے، ایک ملت کے قیام کا سبب بنتا ہے۔ وہ ایک معتدل و متوازن اور جامع و ہمہ گیر ملت کی طرح

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲) تو انسانوں کی زندگی چوپایوں کی سی بن کر رہ جائے چنانچہ بہت سے لوگ ہوتے ہیں جو شادی بیاہ اور دوسرے معاملات کو طریق مطلوب کی شکل میں انجام دیتے ہیں۔ لیکن اگر ان سے ان کے اسباب دریافت کئے جائیں، تو ان کے پاس اس کے سوا کوئی جواب نہ ہوگا کہ ہم قوم کی موافقت میں ایسا کر رہے ہیں۔ اس بارے میں ان کی تمام تر جدو جہد کی انتہا ایک علم اجمالی کے سوا کچھ نہ ہوگا۔۔۔۔ جب اس طرح یہ سنت راشدہ مستحکم ہو جاتی ہے، تو پھر قوم لمبے عرصے بعد عصر مانتی چلی جاتی ہے، اسی بنا پر اس کی زندگی ہوتی ہے اور اس پر اس کی موت۔ ان کے قلوب اور ان کے علوم اس سنت راشدہ پر راسخ ہو جاتے ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ وجوداً اور عدماً اصول حیات کے لئے یہی طریقہ ضروری ہے۔ ان کی خلاف ورزی وہی شخص کر سکتا ہے، جس کا نفس خبیث ہو۔

شاہ صاحب کے اس ارشاد کا کہ "نبوت اکثر و بیشتر کسی نہ کسی ملت کے ماتحت ہوتی ہے" یہ پس منظر ہے۔ ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے۔

"جاننا چاہیئے کہ عالم سکون کا کوئی شہر، دنیا کی کوئی قوم بشرطیکہ وہ معتدل المزاج اور اخلاق فاضلہ کی حامل ہے، حضرت آدمؑ سے لیکر قیامت تک۔ ان ارتفاقات اور تدابیر معاش سے خالی نہیں رہی۔ نسلاً بعد نسلٍ ان تدابیر کے اصول کو بطور مسلمات مانتی چلی آئی اور مانتی چلی جائے گی۔ اس معاملے میں تمہیں ارتفاقات کی ظاہری صورتوں اور ان کی جزئیات کا اختلاف پریشان نہ کرے کیونکہ ان کے اصول میں کوئی اختلاف نہیں"

ڈالتا ہے۔ ملت کی یہ نوع سب سے بلند اور سب سے ممتاز ہوتی ہے[۱]۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک عادل بادشاہ برسر اقتدار آتا ہے اور وہ جیسے کہ مصلحت سمجھتا ہے، عدل و انصاف کو فروغ دیتا ہے چنانچہ وہ جس طرح اپنی فوج اور رعیت سے برتاؤ کرتا ہے تعزیرات اور سزاؤں کو نافذ کرتا ہے جھگڑوں کے فیصلے کرتا لوگوں کے باہمی نزاع نمٹاتا اور لڑائی کے موقعوں پر لشکر آرائی کرتا، اور اس کے دوسرے امور سے عہدہ برآ ہوتا ہے، تو اس عادل بادشاہ کے یہ سارے کام ایک مستحسن، معقول اور قابل اتباع سنت بن جاتے ہیں۔ اور اس کے بعد

---

۱ انسانوں میں کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں، جو کج فہم اور کج راہ ہوتے ہیں... کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن میں کچھ صلاحیت بھی ہوتی ہے.... لیکن ایسے لوگ اگر ہدایت و راہ نمائی کی ایک چیز پا سکتے ہیں تو بہت سی چیزیں ان سے مفقود ہو جاتی ہیں۔

" حاصل کلام یہ کہ لوگوں کو ایک ایسے عالم کی ضرورت ہے، جو علم سے پوری طرح واقف ہو۔ اور لغزشوں اور کوتاہیوں سے ہر طرح مامون و محفوظ ہو۔ اور جب کہ ہم دیکھتے ہیں کہ کسی ایک شہر کے لئے جہاں عقل معاش پوری قوت سے موجود ہوتی ہے۔ جہاں نظام صالح کے جاننے والے بے شمار پائے جاتے ہیں کسی ایسے انسان کی ضرورت ہوتی ہے، جو مصالح عامہ کو کامل طور پر جانتا ہو اور شہر کی صحیح طریقے پر تنظیم کر سکتا ہو، پھر ایسی امت کی نسبت تمہارا کیا خیال ہے، جس میں بے شمار مختلف استعدادیں اور قابلیتیں موجود ہوں اور پھر اس طریقے کو شہادت قلب کے ساتھ ایسے ہی لوگ قبول کر سکتے ہیں، جو زکی النفس، پاک فطرت، تجرید نفس، اور تزکیہ نفس کے اعلیٰ مراتب کے حامل ہوں۔ ایسے طریقے کی طرف ہدایت اور راہ نمائی انہیں لوگوں کو حاصل ہوتی ہے، جو اعلیٰ درجے کے حامل اور بلند مقام کے رازدار ہوں۔ اور ظاہر ہے اس شان کے لوگ دنیا میں بہت کم ہوتے ہیں،

شاہ صاحب فرماتے ہیں، جب لوہار اور بڑھئی کے پیشے بدون ہدایت و رہنمائی نہیں کئے جا سکتے تو پھر ان اعلیٰ مقاصد کی نسبت تمہارا کیا خیال ہے، جن کی راہ نمائی صرف انہی لوگوں کو حاصل ہوا کرتی ہے، جنہیں اللہ تعالیٰ کی توفیق ملتی ہے۔ اور انہیں ہستیوں کو اس کی جانب توجہ ہوتی ہے۔ (باقی حاشیہ صفحہ ۲۳ پر)

جو اور بادشاہ آتے ہیں، وہ ان امور میں اس کا اتباع کرتے ہیں۔

اسی طرح ہر قوم میں اس کے حکماء اور ممتاز افراد پیدا ہوتے ہیں۔ اور وہ نکاح ضیافتوں اور دوسرے امور کے سلسلے میں جو کچھ کرتے ہیں، وہ ایک معقول اور مستحسن سنت بن جاتی ہے چنانچہ ان کے بعد جو لوگ آتے ہیں، وہ ان امور میں ان کی اتباع کرتے ہیں۔ اس طرح ہر اہل صنعت طبقے کا ایک امام ظہور میں آتا ہے کہ دوسرے اس کے اعمال کی اقتدا کرتے ہیں۔ ایسے ہی ایک صاحب رشد و ہدایت پیدا ہوتا ہے۔ وہ اقترابات میں سے کسی ایک شق کو سمجھتا ہے۔ پھر اس کی تکمیل کرتا ہے چنانچہ تقرب الٰہی کے مقتضیات کے سلسلے میں جو وہ کرتا ہے، وہ ایک قابل اتباع سنت بن جاتی ہے کہ قوم کے افراد اس پر چلتے ہیں۔ الغرض ان ائمہ کے علوم سے ایک لازمی طریقہ و ملت وجود میں آتی ہے۔

(بقیہ حاشیہ ص۲۲) جنہیں اخلاص کی برکتیں میسر ہوتی ہیں۔ اور پھر ایسے عالم حق کے لئے ضروری ہے کہ وہ برملا طور پر دنیا جہاں کے سامنے ثابت کردے کہ وہ سنت راشدہ اور راہِ ہدایت کا کامل رازآگاہ ہے۔ قول میں صادق اور خطا و گمرہی سے سب سے بالکل محفوظ ہے، اور پھر اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اصلاح کا کوئی ایک حصہ اختیار کرے اور کسی ایک حصے کو چھوڑ دے۔"

شاہ صاحب کے نزدیک اس اصلاحی طریقے کی دو ہی صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ وہ مصلح اپنے ماقبل کے کسی ایسے شخص کی روایات پیش کرے۔۔ جس کے متعلق لوگوں کا یہ اعتقاد ہو کہ وہ ایک کامل شخصیت اور عظیم ترین صفات کا حامل ہے۔ اور معصوم ہستی ہے۔ یہ بات بہت آسان ہو جاتی ہے کہ لوگوں کو خود ان کے عقیدے کے مطابق ان کی روایات کی دعوت دے۔ اور ان کی مسلّمہ چیزیں ان کے سامنے بطور دلیل پیش کرے۔

"یا پھر وہ خود۔۔۔۔ ایسی شخصیت کا مالک ہے۔۔۔ جو معصوم اور بے خطا ہو۔ اور تمام لوگ اس کے معصوم ہونے پر متفق ہوں۔ اور ایسا آدمی خود ان کے اندر موجود ہو۔ اور اگر وہ خود موجود نہ ہو تو اس کے اقوال اور روائتیں ان کے پاس محفوظ ہوں" (حجۃ اللہ البالغہ)

کہ اس کی نافرمانی نہیں کی جاتی۔ اور کوئی زمانہ اور شہر ایسا نہیں، جو اس قسم کے طریقہ و ملت سے خالی ہو۔[۱]

لوگوں کی اصل طبیعتوں میں جو داعیہ ودیعت کیا گیا ہے، وہ ہے ان کا اپنی فطرت کی طرف سے ارتفاقات اور اقترابات کے اصولوں کی فرمانبرداری۔ اور ان کا خود ان ارتفاقات اور اقترابات کی کوئی مخصوص وضع معین نہ کر سکنا۔[۲] بے شک ان کے سینوں میں یہ علوم اس طرح ہوتے ہیں، جیسے کہ ایک خالص عرب میں علم الاعراب اور علم الصرف ہو کہ وہ بولنے میں کوئی اعراب اور صرف و نحو کی غلطی نہیں کرتا۔

---

[۱] جاننا چاہیئے کہ رسوم کو ارتفاقات میں وہی حیثیت حاصل ہے، جو جسم انسانی میں قلب کو ہے۔ شرائع الہیہ میں اولاً اور بالذات یہی ارتفاقات مقصود ہوتے ہیں اور نوامیس الہیہ انہی سے بحث کرتی ہے ان رسوم کے رائج ہونے کے چند اسباب ہیں۔ مثلاً یہ کہ حکماء نے ان کو مستنبط کیا۔ یا مثلاً یہ کہ ان لوگوں کے قلوب میں اللہ تعالےٰ نے ان رسوم کا الہام فرمایا، جنہیں انوار ملکیہ کی تائید حاصل ہے۔ اور چند اسباب ہوتے ہیں، جن کی بنا پر ان رسوم کی نشر و اشاعت ہوا کرتی ہے۔ مثلاً کسی ایسے با سطوت بادشاہ نے کسی رسم کو لوگوں کے لئے بطور طریق عمل رائج کیا۔ ....." (حجۃ اللہ البالغہ)

[۲] "انسانوں میں کچھ لوگ ایسے صاحبِ عقل و بصیرت ہوتے ہیں، جو ضروریات زندگی کے سے لئے مفید تدبیریں مستنبط کرتے ہیں۔ اور کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں، جن کے دلوں میں یہی امور اس طرح کھٹکتے رہتے ہیں، جس طرح ارباب عقل و بصیرت کے دلوں میں کھٹکتے رہتے ہیں، لیکن ان میں اخذ و استنباط کی قابلیت نہیں ہوتی۔ مگر جب وہ حکماء سے ملاقات کرتے ہیں اور ان کے استنباط کئے ہوئے مفید طریقوں کو سنتے ہیں، تو ان کے قلوب ان چیزوں کو قبول کر لیتے ہیں۔ اور چونکہ یہ چیزیں ان کے علم اجمالی کے موافق ہوتی ہیں۔ اس لئے پوری طاقت سے وہ ان پر کاربند ہو جاتے ہیں۔"
(یہ ارتفاقات کا ذکر ہے) (حجۃ اللہ البالغہ)

یقیناً اس کے دل میں مفعول اور فاعل میں امتیاز پایا جاتا ہے اور وہ جانتا ہے کہ فاعل مرفوع اور مفعول منصوب ہوتا ہے اور وہ بولتے وقت اس کو نظر انداز نہیں کرتا۔ اسی طرح بنی آدم کے دلوں میں بھی ایک اجمالی علم ہوتا ہے، جس کی وہ ازخود تشریح نہیں کرسکتے، لیکن جب ملت کے ظہور کے ضمن میں یہ شرح کردی جاتی ہے، تو اگر یہ شرح صاف اور واضح ہو، اور اس میں کوئی ابہام نہ پایا جائے ان کے دلوں میں خوب گھر کر جاتی ہے[1]

ایک خاص ملت کے ارتفاقات کی فرمانبرداری واجب کرنے والی ایک یہ چیز بھی ہوتی ہے کہ اس کے ائمہ کی شہرت پھیل جاتی ہے، ان سے خارقِ عادت امور کا ظہور ہوتا ہے اور وہ ائمہ لوگوں میں اپنی دین داری، غور و خوض والے علوم اور عجیب و غریب افعال کی وجہ سے ممتاز ہوتے ہیں۔ اور ان لوگوں میں ان کے بارے میں عقیدت ہو جاتی ہے۔ نیز یہ ہوتا ہے کہ کامل یا ناقص استقرائے سے لوگوں میں یہ خیال یا یقین پیدا ہو جاتا ہے کہ اس ملت کی نافرمانی سے دنیا اور آخرت میں دردناک

---

[1] بعض ایسے ہوتے ہیں، جن میں یہ خلق سعادت تو مفقود ہوتا ہے، لیکن اس کے حصول کی امید ہوا کرتی ہے۔ اور یہ اس طور پر کہ سخت ترین ریاضتیں کی جائیں۔۔۔ اور دنیا میں اکثر لوگ اس قسم کے ہیں اور بعثِ انبیاء سے اولاً و بالذات یہی لوگ مقصود ہیں۔

بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں، جن کے اندر خُلق مطلوب اجمالی طور پر موجود ہوتا ہے۔ لیکن اس کی مناسب تفصیل اور اس کی ہیأت و اشکال کی تعین میں وہ اکثر پیشوا کے محتاج ہوتے ہیں۔ چنانچہ اسی قسم کے لوگوں کے متعلق اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے۔ یکاد زیتھا یضیئ ولو لم تمسسه نار۔ (قریب ہے کہ اس کا روغن روشن ہو جائے۔ اگرچہ اس کو آگ بھی نہ چھوئے) شریعت الٰہیہ میں اس قسم کے لوگوں کو سابق کہا گیا ہے انہی لوگوں میں ایک طبقہ بنیائے کرام کا ہوتا ہے۔ انبیائے کرام کے لئے خلق مطلوب کی تحصیل، اس کے کمالات کی طرف اقدام، اس کی مناسب ہیأت و اشکال کی تقرری، فوت شدہ امور کی تحصیل اور اس کی کیفیت کا علم اور نفس کی تکمیل نہایت سہل ہوا کرتی ہے وہ اسی منزل مقصود کو بغیر کسی امام اور بغیر کسی رہنما کے پا لیتے ہیں۔ ان کے اعمال اور طریق زندگی کو لوگ محفوظ کر لیتے ہیں اور اس طرح ان کے سنن اور قوانین منظم ہو جاتے ہیں۔ اور لوگ انہی کو اپنا دستور العمل بنا لیتے ہیں اور انہی سے وہ مطلوبہ سعادت کو پا لیتے ہیں

عذاب ہوگا یا آپس میں فتنہ و فساد اور نزاعات پیدا ہو جائیں گے۔[۱]

تمہیں یہ جاننا چاہیئے کہ ہر ملت کے لئے ضروری ہے کہ اس کا ایک دستور ہو، جس پر اس ملت کی طرح پڑے۔ اگر اس ملت کا قیّم (قائم کرنے والا) ایک فرد واحد ہے تو اس کا ان علوم کے بارے میں جنہیں اس نے اللہ تعالےٰ سے اپنے کمال کے مطابق حاصل کیا ہے ایک معیار (میزان) ہوتا ہے پس اس ملت میں اس کے یہ علوم دستور ہوتے ہیں۔ اور اگر ایک فرد واحد کے بجائے بہت سے ائمہ ہوں کہ ملت کے شعبوں میں سے ہر شعبے کا ایک امام ہو، تو ان میں سے ہر ایک کا اس کے علمی و عملی کمال کے فعلاً ظہور کی بنا پر ایک درجہ ہوگا۔ چنانچہ ہر شعبے کا دستور اس کے علوم کا امام ہوگا۔ اور کوئی شخص اس وقت تک حکیم نہیں ہو سکتا، جب تک کہ وہ ملتوں کے علوم کو ان کے دستور کی نسبت سے نہ جان لے اس صورت میں وہ ایک ایسی ملت کو انتخاب کرے گا۔ جس کا تمام ملتوں میں بہترین طریقہ ہوگا۔ اگر تو نے اس معاملے میں ذراسی بھی غفلت کی، تو تو دنیا اور آخرت دونوں میں دھکے کھائے گا۔

اس بارے میں تحقیقی امر یہ ہے کہ ملتوں میں سے ایک ملتِ قصویٰ[۲] ہونی ضروری ہے، جس کا دستور وہ علوم ہوں جن کی ہر ہر شعبے پر گہری اور تحقیقی نظر ہو۔ اب تم ہی تحقیق کرو تو دیکھو گے کہ بلند اور پست چیزوں میں سے جو بھی موجود ہے، وہ فعلاً اس وقت تک وجود میں نہیں آسکتی جب تک کہ اسے اوپر سے اور نیچے سے علّتیں محیط نہ ہوں۔ چنانچہ اس کی کنہہ حقیقت کا تب ہی ادراک

---

[۱] "اور کچھ اسباب ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی بنا پر لوگ ان رسوم کو مناسب اہتمام کے ساتھ مضبوطی سے تھام لیتے ہیں۔ مثلاً اعمال کی غیبی جزا و سزا کا تجربہ کہ فلاں رسم کے ترک کرنے سے فلاں سزا ملی یا کسی رسم سے غفلت برتنے سے کوئی فساد رونما ہو گیا۔ یا مثلاً نیک سیرت ارباب بصیرت اس کے ترک پر ملامت کرتے ہیں۔ یہ اور اس قسم کے دوسرے اسباب ہوتے ہیں، جن کی بنا پر ان رسوم کو استحکام حاصل ہو جاتا ہے۔" حجۃ اللہ البالغہ

[۲] اس کی تشریح بعد میں آتی ہے

ہو سکتا ہے، جب اس کی تمام علتوں کا ادراک ہو۔ اسی طرح بنی آدم کے دل پر جو وارد ہوتا ہے، تو اس کا ظاہر اور باطن ہوتا ہے۔ جہاں تک اس کے باطن کا تعلق ہے، تو اس کی علّتیں ہوتی ہیں، جس نے ان علتوں کے ذریعہ اس کے کنہ کو جانا، اس نے اس کے باطن کو جان لیا۔ باقی رہا اس کا ظاہر تو وہ اس عالم میں اس کی خواص، ظاہری کیفیات اور رنگ ہیں۔ جس نے اسے ان خواص اور علامات کے ذریعہ جانا، اس نے اس کا ظاہر جان لیا۔ (اس کے بعد شاہ صاحب نے دو مثالیں دی ہیں)

مختصراً ملّت قصویٰ وہ ہے کہ اس سے بہتر طریقہ کسی اور ملّت کے پاس نہ ہو اور نہ اس جیسے کسی کے ہاں جامع علوم اور ہر پہلو کو پوری طرح غور و تعمق کے ساتھ احاطہ کرنے والے نقطہ ہائے نظر ہوں۔ ایسی ملّت کے قیّم کے لئے لازمی ہوتا ہے کہ وہ اللہ کی مخلوقات اور اس کی سنت ہر دو کو اجمالاً اور تفصیلاً، ظاہراً و باطناً اور تجربتاً اور عقلاً محیط کئے ہوئے ہو۔ علوم کی تفصیل میں خوب غور و خوض کرتا ہو۔ اس کے علوم علوم انسانیہ کے قبّے سے صادر ہوتے ہوں، اور وہ انہیں اور ان سے ملتے جلتے علوم کا احاطہ کئے ہوئے ہو۔ اس ملت کی شان یہ ہو کہ وہ ارتفاقات کے اصول و قواعد کو بغیر ان کی ایک ایک صورت کی تحقیق کئے، پیش کرے۔ اور اس کا جو قیّم ہو، وہ پھر ارتفاقات کی صور و اشکال کی الگ الگ پوری پوری تفصیل کرے۔ بعدازاں ان صور و اشکال کو مختلف انسانوں پر ان کی استعدادوں، مزاجوں، عادتوں اور ان کی قوتِ اخلاق کے مطابق تقسیم کرے۔ لیکن ان کی پوری معرفت اور ان کے ایک کے دوسرے سے کامل طور پر امتیاز کے بعد نیز وہ الہیات کی ایک ایک چیز کی بنیاد رکھے۔ اس سلسلے میں وہ اللہ کی ذات اور صفات کی وضاحت کرے، اور اس کی یہ وضاحت زیادہ سے زیادہ صراحت لئے ہوئے ہو۔ یہ صرف عام عرفی زبان میں نہ ہو، بلکہ دلیل و برہان کے ذریعہ اس طرح وضاحت کی جائے کہ اس سے نہ کوئی راز چھوٹے نہ نکتہ، نہ کوئی خفی بات رہ جائے نہ جلی، وہ اس کا اوپر سے بھی احاطہ کرے اور نیچے سے بھی، اس کے بعد وہ لوگوں کو بتائے کہ وہ ان عمیق معارف اور حکمتوں کی کس طرح تعبیر کر سکتے ہیں۔ چنانچہ ان معارف و حِکَم کی یہ تعبیرات مختلف لوگوں کے لئے خاص ہو جائیں۔ بس ایک ایک کے پاس اپنے اپنے طور پر ان کا عرفان و معرفت اور ان کے بارے میں تفصیل و وضاحت ہو،

یہ قیم اللہ تعالیٰ کے تقرب کے جو نسمی[1]، روحانی اور دوسرے مراتب ہیں۔ ان میں غور و خوض کرے اور اس اعتبار سے لوگوں کے ان میں حصولِ کمال کی جو استعدادیں ہیں، ان کے مطابق مختلف گروہ کرے اور ہر استعداد والے کو اس کی استعداد کے مطابق تقربِ الٰہی کی انواع میں کوئی نوع دے۔ اس کے بعد پھر وہ ادھر متوجہ ہو اور ہر تقرب کے جو خواص، آداب اور اسباب ہیں، اور انہیں جس طرح حاصل کیا جا سکتا ہے، ان کو بیان کرے۔

مختصراً یہ قیم آدمیوں کی کثرت کے اعتبار سے کثیر الاستعداد عبادتیں شرعاً معین کرے ان میں سے بعض روحانی ہوں، بعض جسمانی۔ اسی طرح وہ بدیوں، ان کے درجات و اسباب اور جن ذرائع سے وہ پیدا ہوتی اور جن تدابیر سے ان کا قلع قمع ہو سکتا ہے، ان کی تحقیق و تفتیش کرے۔ اور یہ ہر ہر استعداد اور ہر ہر زمانے کو پیش نظر رکھتے ہوئے۔ ایسے ہی وہ عالم قبر اور عالمِ حشر کی پوری پوری تحقیق و تفتیش کرے، اور اس ضمن میں نہ کوئی چھوٹی چیز چھوڑے نہ بڑی۔ نیز وہ ان مصائب کے لئے جن کے پیش آنے کا انسانوں کو ڈر رہتا ہے، اور ان آفات و حوادث کے لئے جو وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں فرائض معین کرے، اسی طرح وہ ان اچھے مقاصد کے لئے بھی جو انسانوں کو مطلوب ہیں فرائض کا تعین کرے، بعد ازاں وہ ہر شے کے وہ اسباب جو اسے وجود میں لاتے ہیں، اسی طرح وہ اسباب جو اسے معدوم کرتے ہیں، بیان کرے۔ یہ جو ہم نے سب ذکر کیا ہے، یا آئندہ ذکر کریں گے ان کا احاطہ کرنا ممکنات میں سے نہیں، اس سلسلے میں جو کچھ بھی ہے وہ محض ہمارے اجمالی علم کے اعتبار سے ہے۔

الغرض "ملتِ قصویٰ" وہ ہے، جو امام نوع انسان[2] کی پوری پوری شرح ہو، اور یہ شرح

---

[1] نسمہ، روح ہوائی کو کہتے ہیں، جس کا تعلق قوائے بدنیہ سے ہے، مترجم

[2] نوع انسان کا بحیثیت مجموعی ایک مثالی (آیڈیل)، نمونہ

ہر ہر فرد کے اعتبار سے تمام احکام و قواعد پر مبنی ہو، لیکن اس قسم کی ملت کا وجود میں آنا اور ظاہر ہونا ان وجوہ کی بنا پر امر محال ہے۔

اوّل۔ اس ملّت کے قیم کے لئے لابدی ہے کہ وہ ہر جہت سے اپنے کمال میں فعلاً انتہا پر سرفراز ہو کہ اس کے اور رب کے درمیان کوئی حجاب نہ رہے۔ اور بنی آدم میں ایسا ہونا محال ہے

دوم۔ اس قیم کا جو ہر، ہر زمانے میں اور اس کلّی ملّت میں سے مخصوص جزدی ملتوں کے بارے میں راوی ہو، اور اس کے مطابق فتویٰ دینے والا مفتی ہو، لازمی ہے۔ کہ وہ سارے کے سارے ارتفاقات[1] اور علوم کا پورے کا پورا احاطہ کریں۔ اور ایسا ہونا ممکن نہیں۔

سوم۔ لوگ سب کے سب ذہین و ذکی ہوں اور ان کے لئے اس راوی اور مفتی سے حصولِ علم ممکن ہو۔ غرضکہ ایسی ملّت جو شخص کبیر[2] اور مجموعی انسانی نظام کے لئے حقیقی صحت کے مثل ہو، محال ہے اور جس طرح ایک شخص واحد کی جو عام انسان ہے حقیقی صحت ممکن نہیں، اس طرح اس ملّت کا کامل و مکمل طور پر اصلاً وجود میں آنا ممکن نہیں۔ ان حالات میں اللہ تعالےٰ کے لطف و کرم اور اس کی عنایت سے یہ واجب ٹھہرا کہ وہ اس ملّت جامعہ کا وجود عالم مثال میں برقرار رکھے۔ اس اعتبار سے اسے "امام مبین" کہا جائے۔ اور عالم جبروتِ الٰہی میں اس کا ایک کلّی نام ہو۔ پھر ہر زمانے میں اس ملّت جامعہ میں سے ایک قسط یا حصّہ کی جو جامع ہو، تقسیم ہو اور اسے ایک مخصوص ملّت کا نام دیا جائے۔ چنانچہ اس ملّتِ جامعہ میں سے جو عالم مثال میں ہے اس طرح کی مخصوص ملّت کا ترشیح اور نزول ہوتا رہے گا۔ یہ ترشیح اور نزول یا تو عام طور سے لوگوں پر ہو۔ اگر ان کی طرف سے اس قسم کا کوئی مانع نہ ہو کہ وہ شیطان کے تابع ہیں، یا ان کی بڑی جبلت ہے۔ یا یہ ایک مخصوص شخص پر ہو۔ جس کے لئے سر بلندی و عظمت مقدر کی جائے اور لوگ اس کی طرف

---

[1] وہ امور جو اشیاء کے نشوونما کا باعث ہوتے ہیں۔

[2] پوری نوع انسان کا مجموعہ بحیثیت ایک فرد کے

دُور سے چل کر آئیں۔ چنانچہ اس مخصوص شخص کے علم کے نقوش ان میں منعکس ہوں اور اسی طرح اس سے روایات کی جائیں اگر مصلحت یہی ہو۔ یا اس مخصوص ملت کا ترشح اور نزول کثیر التعداد اشخاص پر، ان میں سے ہر ایک کی استعداد کے مطابق ہو۔ پھر یہ سب جمع ہوں اور اس طرح اس زمانے کی یہ ملت بن جائے۔ اوپر ذکر کی ہوئی صور و اشکال کی مثالیں اصل حقیقت سے ملتی جلتی ہیں۔ پس تم سمجھو اور اس پر قائم رہو۔

معلوم ہونا چاہیئے کہ رسولوں اور پیغمبروں کی بعثت کے متعلق حکمتِ الٰہیہ کا اقتضاء خیر نسبی اور اضافی کے لحاظ سے ہوا کرتا ہے، جس کا اعتبار بعثت کی تدبیروں میں ضروری ہے اور اس کا اندازہ سوائے ذاتِ علام الغیوب کے کوئی نہیں کر سکتا۔ البتہ ہم اس قدر جانتے ہیں کہ کچھ اسباب ایسے ضرور ہوتے ہیں، جن سے کوئی بعثت خالی نہیں ہوا کرتی اور پیغمبر کی اطاعت اس لئے فرض کی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کی اصلاح کا مقصد فرماتا ہے --- یہ لوگ خود اس قابل نہیں ہوتے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان کو براہ راست ان امور کا القاء کیا جائے۔ اس لئے ان کی بہبود اس پر منحصر ہوتی ہے کہ وہ اس وقت کے نبی کی پیروی کریں اور اس بنا پر حظیرۃ القدس میں بھی اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ نافذ ہو جاتا ہے کہ لوگ اسی نبی کی اتباع کریں اس کی شکل یا تو یہ ہوتی ہے کہ یہ وقت کسی سلطنت کے ظہور کا ہوتا ہے۔ ایسے وقت میں اللہ تعالےٰ کسی ایسے شخص کو مبعوث فرماتا ہے، جو ظہور ہونے والی سلطنت کے لوگوں میں دین کو قائم کرے، جیسے کہ ہمارے پیغمبر صلعم کی بعثت ہوئی۔ یا یہ کہ اللہ تعالےٰ کے نزدیک کسی قوم کا بقا اور دوسری قوم کے مقابلے میں اس کو برگزیدہ بنانا مقدر ہو چکا ہے۔۔۔ جیسے کہ سیدنا موسیٰ کی بعثت یا یہ کہ کسی ملت کی قوت اور اس کے دین کے نظام کو زندہ رکھنا مقصود ہے اس صورت میں دین کا مجدد مبعوث کیا جاتا ہے جیسے کہ حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ وغیرہم ---"

(حجۃ اللہ البالغہ)

مدینہ منورہ کے کتب خانے اور علمائے سندھ کی تصانیف

مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی

مدینہ منورہ کی اوائل اسلام میں جو علمی اور سیاسی مرکزیت رہی، وہ محتاج بیان نہیں۔ مدینہ منورہ کی مسجد نبوی عبادت گاہ کے ساتھ ساتھ درس گاہ بھی تھی جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ عموماً اور اصحاب صفہ خصوصاً بارگاہ نبوت سے فیض حاصل کرتے تھے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد اس مقدس شہر کی سیاسی اہمیت اگرچہ کم ہوگئی لیکن اس کی علمی مرکزیت بدستور قائم رہی۔ دوسری صدی میں فقہائے مدینہ کے حلقہ ہائے درس سے کئی ائمہ مجتہدین پیدا ہوئے جن میں سے امام مالکؒ صاحب مو طا نمایاں شخصیت کے مالک ہیں۔

اسلامی مدارس کے ساتھ کتب خانوں کا ہونا ایک لازمی امر سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے مدینہ منورہ کے مرکز علم میں ہر دور میں برابر کتابیں جمع ہوتی رہیں۔ اس وقت بھی اس چھوٹے سے شہر میں کئی علمی کتب خانے موجود ہیں۔ جہاں صدیوں کی پرانی اور نایاب کتابوں کے قلمی نسخے موجود ہیں، جن سے کہ ارباب علم استفادہ کرتے رہتے ہیں۔ سید سلیمان ندوی مرحوم نے مدینہ منورہ کے ایک کتب خانے کے متعلق اپنا تاثر ان الفاظ میں بیان فرمایا تھا۔

مدینہ کے کتب خانہ محمودیہ کی کتابوں کو جب میں نے ہاتھ لگایا تو خوشی سے اچھل پڑا

لے یہ مولانا موصوف کے سفر حجاز کی چوتھی قسط ہے

کہ حدیث و تفسیر کا اتنا نایاب ذخیرہ اب تک میری نگاہوں نے نہیں دیکھا تھا، بہت سی کتابیں جن کو صرف ایک نظر دیکھنے کی تمنا تھی، وہ یہاں آج پوری ہو گئی آج پہلا دن تھا کہ میری آنکھوں نے دلائل النبوۃ امام بیہقی، معرفت اصول الحدیث امام حاکم شرح سنن ابی داود لابن ارسلان، شرح بخاری للکرمانی[1] شرح بخاری لابن بطال تمہید شرح موطا لابن عبد البر، البیان لاحکام القرآن، للموزعی الیمنی، زاد المسیر فی علم التفسیر لابن جوزی، تفسیر ابن ابی حاتم، نزہتہ المحکم شرح صحیح مسلم وغیرہ کتابیں دیکھیں [2]

بالکل یہی کیفیت میری بھی ہوئی، جب میں نے مکتبہ شیخ الاسلام عارف حکمت اور مکتبہ حرم مدینہ منورہ کی کتابوں کی زیارت کی۔ میں یہ دیکھکر خوشی اور بہجت سے اچھل پڑا کہ اپنے وطن سندھ کے محدثین کی تصانیف کا کافی بڑا نادر خود مؤلفین کے قلم سے لکھا ہوا ذخیرہ ان کتب خانوں میں نظر آیا۔ اور یہ میری ایک پرانی تمنا تھی جو یہاں مدینہ منورہ میں آکر پوری ہوئی۔ مکتبہ حرم یا مکتبہ محمودیہ میں اعلام علمائے سندھ کی جو نایاب اور نادر کتابیں میری نظر سے گذریں وہ یہ ہیں۔

حیاۃ المھجۃ وایضاح الوجۃ۔ شرح سنن الترمذی ج۔ ۱۔ ۲ تالیف علامہ ابوالطیب سندھی۔ یہ بزرگ عالم، علامہ ابوالحسن کبیر سندھی کے معاصر اور ہم وطن ہیں۔ حنفی مذہب اور نقشبندی طریقت رکھتے تھے۔ مدینہ منورہ میں سکونت اختیار کی اور وہاں شیخ حسن بن علی عجیمی سے حدیث کی کتب صحاح ستہ پڑھیں علامہ طاہر بن ابراہیم بن حسن کورانی آپ کے ہمدرس تھے۔
آپ کا محبوب مشغلہ تدریس اور تالیف رہا۔ شیخ عبدالرحمٰن بن عبدالکریم انصاری مدنی، شیخ عبداللہ بن ابراہیم بری مدنی، شیخ محمد بن علی شروانی مدنی اور شیخ یوسف بن عبدالکریم مدنی جیسے جلیل القدر محدثین آپ کے تلامذہ میں شمار ہوتے ہیں۔ حنفی مذہب اور تقلید میں بہایت ہی متصلب تھے۔ اس کے برعکس علامہ ابوالحسن کبیر سندھی حنفی ہونے کے ساتھ آزاد مشرب بھی تھے، چنانچہ ان دونوں ہمعصر سندھی

---

[1] کرمانی کی شرح طبع ہو چکی ہے اسی طرح معرفتہ اصول الحدیث بھی طبع ہو چکی ہے۔

[2] اسلامی کتب خانے ص۹۶ بحوالہ رسالہ معارف ج ۱۸ ص۱۰۸

محدثوں کے آپس میں مناظرے بھی ہوتے رہے۔ ایک مرتبہ تو ابوالحسن کبیر سندھی کو نماز میں رفع یدین کرنے کی وجہ سے ابوالطیب سندھی کی شکایت پر مدینہ منورہ کے جیل میں بھی جانا پڑا۔

علامہ ابوالطیب سندھی نے اپنی مذکورہ کتاب میں حنفی مسلک کے مسائل کی بڑی خوش اسلوبی سے تائید فرمائی ہے۔ ہندوستان میں اس کتاب کا ابتدائی حصہ دو جلدوں میں "اربع شروح ترمذی" کے ساتھ قدیم زمانے میں چھپا تھا۔ جو اس وقت نایاب ہے۔[۱]

اس مخطوطے کی یہ خوبی ہے کہ مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ یہ ڈیمی سائز کے ۱۸۱۴ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔

جلد اوّل میں شروع کے صفحہ پر مصنف کی طرف سے ایک عربی تحریر ہے، جو بعینہٖ پیش کی جاتی ہے۔

"وقف لله تعالی ... [۲] ... مصنفه الفقیر الی الله تعالی محمد ابوالطیب بن عبدالقادر علی طلبة العلم الشریف بالمدینة المنورة وشرط النظر لنفسه مدة حیاته، ثم لاولاده ابداً ما تناسلوا ثم لمحمد حیاة السندی ثم لمن یکون مدرساً فی علم الحدیث بالمسجد الشریف ثم لمن یکون ناظراً علی کتب السید اسمعیل لبشرط ان لا یکون من اهل المناصب وشرط علی الکل ان یبعثوا فی مطالعته اهل العلم، واستفادتهم منه وصلی الله الخ

اس کتاب کے مصنف، اللہ تعالیٰ کے محتاج محمد ابوالطیب بن عبدالقادر کی طرف سے یہ کتاب مدینہ منورہ کے علم شریف کے شاگردوں کے لئے وقف ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ مصنف کی زندگی میں اس کے زیر مطالعہ رہے گی۔ پھر اس کے اولاد کے لئے نسلاً بعد نسل ہوگی، پھر محمد حیات سندھی کے لئے ہوگی، اس کے بعد مسجد شریف میں علم حدیث کا جو مدرس ہوگا اس کے لئے (وقف) ہوگی پھر سید اسمعیل کی کتابوں کے نگران کے لئے ہوگی لیکن اس شرط پر کہ وہ صاحب منصب نہ ہو، سب کے لئے یہ شرط لازم ہوگی کہ اہل علم کے مطالعہ اور اس کتاب سے استفادہ کی کوشش کرتے رہیں۔

---

[۱] میرے ذاتی کتب خانے میں اس کا ایک نسخہ موجود ہے۔ [۲] درمیان کے الفاظ مٹے ہوئے ہیں۔

شیخ محمد حیات سندھی علامہ ابوالحسن کبیر سندھی کے تلمیذ ہیں، اور شیخ ابوالطیب، شیخ ابوالحسن سندھی کے معاصر تھے لہذا محمد حیات سندھی کا اوپر کی عبارت میں جس سادگی سے بغیر تلقیب کے نام لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد حیات سندھی نے شیخ ابوالطیب سندھی سے بھی استفادہ کیا ہوگا

مذکور تحریر کے بعد ایک دوسری عبارت مرقوم ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف علام نے اس وقف سے رجوع کیا تھا وہ عبارت یہ ہے۔

بیعت ھذہ الحاشیۃ لماثبت رجوع الشیخ الواقف لھا بمعرفۃ وصیۃ علی اولادہ وحیث لم یحکم الحاکم الشرعی بلزوم وقفیتھا۔	یہ حاشیہ اس لئے فروخت کیا گیا کہ وقف کرنے والے شیخ کا اس سے رجوع ثابت ہوا بسبب وصیت علی الاولاد کے اور اس لئے بھی کہ حاکم شرعی نے وقف کے لزوم کا حکم نہ فرمایا۔

دوسری جلد کے اخیر میں اس حاشیہ کی تالیف سے فراغت کی تاریخ ۱۸ شوال بروز سنیچر سنہ ۱۱۳۴ھ بتائی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ کی یہ تالیف آخر عمر کی ہے۔ اصل عبارت ملاحظہ ہو۔

یقول مؤلفہ العبد الضعیف الراجی عفو ربہ الکریم قد فرغت من تالیفہ یوم السبت ثامن عشر شھر شوال سنۃ اربع وثلثین ومائۃ والف من ھجرۃ من لہ العزو الشرف الخ	اس (حاشیہ) کا مؤلف بندۂ ضعیف اپنے رب کے عفو کا امیدوار کہتا ہے کہ میں اس کتاب کی تالیف سے بروز شنبہ، ۱۸ تاریخ شوال سنہ ۱۱۳۴ ہجری میں فراغت پائی۔

۲- قرۃ الأنظار شرح تنویر الابصار - تالیف شیخ ابوالطیب سندھی - تنویر الابصار فقہ حنفی کی مشہور کتاب ہے، جس کی شرح الدر المختار تالیف علامہ حصکفی اور اس پر علامہ ابن عابدین کا حاشیہ رد المختار مشہور زمانہ ہے، مگر الدر المختار کے مطالعہ سے جس کا واسطہ پڑا ہوگا، اس کو ضرور یہ احساس ہوا ہوگا کہ در مختار کی عبارت تعقید، اغلاق اور اختصار سے مملو ہے، لہذا وہ صحیح معنی میں تنویر کی شرح کہلانے کی مستحق نہیں۔

علامہ ابوالطیب سندھی کی مذکور شرح ہر لحاظ سے درمختار پر فوقیت رکھتی ہے، عبارت کی وضاحت اور احادیث صحیحہ کو بطور دلائل پیش کرنا اس کی خصوصیت ہے، مگر ابنائے زمانہ کی ستم ظریفی کا کیا کہنا کہ درمختار نصاب میں داخل ہو گئی اور قوۃ الانظار طباعت میں بھی نہ آسکی، ممکن ہے کہ اس کی ایک وجہ ندرت اور نایابی ہو۔ مصنف علام کے اپنے آبائی وطن سندھ کے کسی بھی کتاب خانے میں اس کتاب کا کوئی نسخہ نہیں ہے۔ البتہ سنا ہے کہ پشاور یونیورسٹی کی لائبریری میں اس کا واحد نسخہ موجود ہے جو نقص وغیرہ سے مبرا ہے۔

مکتبہ حرم کا یہ نسخہ ایک جلد میں ہے اور "باب المغنم وقسمتہ" تک ختم ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسخہ ناقص ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ سندھ کا سندھی ادبی بورڈ جیسا علمی ادارہ پشاور یونیورسٹی سے اس نسخہ کو حاصل کر کے طبع کرائے اور اس طرح یہ نادر کتاب تلف ہونے سے محفوظ ہو جائے۔

۳-۱ المتانتہ فی مرمتہ الخزانتہ۔ تالیف علامہ مخدوم محمد جعفر بوبکائی سندھی۔ کتاب کا خط عمدہ ہے سن کتابت معلوم نہ ہو سکا۔ علامہ محمد جعفر ہجری دسویں صدی کے اعلام علمائے میں سے گزرے ہیں۔

اس کتاب کی جلالت شان کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ مخدوم محمد ہاشم سندھی ٹھٹوی، مخدوم عبدالواحد سیوہانی سندھی اور دوسرے اعلام سندھ کی کتابوں اور فتاویٰ میں متانتہ کے حوالے موجود ہیں فروع فقہی کی جزئیات سے یہ کتاب بھرپور ہے۔ سندھی ادبی بورڈ کراچی حیدرآباد کی طرف سے احقر راقم کی تحقیق اور مقدمہ کے ساتھ ایک سال ہوا ٹائپ کے ایک ہزار صفحات پر یہ کتاب طبع ہو چکی ہے۔

۴۔ منحتہ الباری فی جمع روایات صحیح البخاری۔ تالیف علامہ محمد عابد سندھی انصاری شیخ محمد عابد سندھی سندھ کے آخری محدث ہیں۔ ان کے تبحر علمی اور قوت تحریر کے موافق اور مخالف سب معترف ہیں۔

یہ کتاب اپنے موضوع میں نادر و نایاب ہے۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے، مدینہ منورہ میں دنیا کا یہ واحد نسخہ ہے اور کسی علمی کتاب خانے کی فہرست میں اس کتاب کا نام مجھے دیکھنے میں نہیں

آیا۔ کتاب کیا ہے ایک بیش بہا علمی ذخیرہ ہے جو ڈیمی سائز کے ۹۶۶ صفحات میں پھیلا ہوا ہے اور اس کے اندراج کا نمبر ۱۶ ۱۴ ہے۔

منحۃ الباری کا یہ مخطوطہ خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ جس طرح حافظ ابن حجر عسقلانی صاحب فتح الباری کے متعلق مشہور ہے کہ وہ بہت تیز لکھتے تھے، اس لئے ان کے خط میں حسن کتابت کا فقدان تھا اور پڑھنے میں بھی دقت ہوتی تھی، شیخ محمد عابد سندھی کے متعلق بھی یہی روایت مشہور ہے کہ بہت تیز لکھتے تھے، مگر اس تیزی کتابت کے ساتھ ان کے خط کی ایک خوبی یہ تھی کہ حروف اگرچہ سادہ اور حسن سے خالی ہوتے تھے لیکن ان کے پڑھنے میں کسی کو بھی دقت پیش نہیں آتی۔ مولانا محب اللہ صاحب العلم درگاہ پیر جھنڈو کے علمی کتب خانے میں شیخ محمد عابد سندھی کی تالیف المواہب اللطیفہ شرح مسند الامام ابی حنیفہ (جو کہ نادر روزگار تالیف ہے اور بقول علامہ محدث رشد اللہ صاحب العلم (پیر جھنڈو) یہ کتاب فتح الباری کے ٹکر کی تالیف ہے) خود مصنف کے ہاتھ کا مخطوطہ ہے۔ اس کو پہلے یہاں دیکھ چکا تھا۔ بالکل ویسا ہی منحۃ الباری کا خط تھا۔ کتاب کے شروع میں مصنف علام نے اس کتاب کے وقف کے سلسلہ میں ایک عبارت لکھی ہے جو بعینہ نقل کی جاتی ہے۔

وقفت للہ تعالیٰ وجعلت النظر فیہ لنفسی مدۃ حیاتی ثم للارشد من ذریتی ذکرا کان او انثی ان کان لی عقب والا فللارشد من ذریۃ جدی شیخ الاسلام محمد مراد ابن الحافظ یعقوب بن محمود الانصاری ذکرا کان او انثی لینتفع بنظرہ الخاص والعام حررہ مؤلفہ وواقفہ محمد عابد - ۱۲۴۹	(اس کتاب کو) میں نے اللہ کے لئے وقف کیا (اس شرط پر کہ) کہ اپنی زندگی میں میرے زیر نظر رہے گی پھر میری اولاد میں سے جو صالح اور رشد والا ہوگا اس کے لئے چاہے وہ مرد ہو یا عورت اگر میری اولاد ہو، ورنہ میرے دادا شیخ الاسلام محمد مراد ابن حافظ یعقوب بن محمود انصاری کی اولاد میں سے جو صالح ہو مرد ہو یا عورت اس کے لئے تاکہ اس کے مطالعہ سے خاص اور عام سب نفع حاصل کریں۔ اس کتاب کے مولف اور وقف کرنے والے محمد عابد نے اس تحریر کو لکھا ۱۲۴۹ھ میں

اس تحریر کے بعد مؤلف علام کی زندگی صرف تین سال رہی۔

کتاب کے آخر میں شیخ محمد عابد سندھی کے ایک تلمیذ خاص لطف اللہ بن احمد کی تحریر بھی موجود ہے جس میں اس نے مؤلف کے حکم سے اس مسودہ سے فراغت کی تاریخ تحریر کی ہے، جو کہ ماہ جمادی الاول کی آخری تاریخ ہے مگر سن کتابت دیکھنے میں نہ آیا۔ اس تحریر میں مصنف علام کا سندھ میں سیوہان کو مولد بتایا گیا ہے۔ یہی ہم نے اپنے اساتذہ سندھ سے بھی سنا تھا، مگر نواب صدیق حسن خاں نے "لواری" بتایا ہے جو صحیح نہیں ہے۔ لواری شریف میں شیخ محمد عابد کا بہت آنا جانا ہوتا تھا۔ کیونکہ خواجہ محمد زمان ثانی ابن خواجہ محمد حسن ابن خواجہ محمد زماں اول سے وہ نقشبندی طریقت میں بیعت تھے۔ اور لطف یہ ہے کہ خواجہ محمد زمان دوم نے حدیث کی سند اپنے مرید شیخ محمد عابد سے حاصل کی اس لحاظ سے وہ اپنے مرشد کے استاد ٹھیرے۔ سندھ کے بعض ادبا سے بھی یہی غلطی سرزد ہوئی ہے کہ انہوں نے لواری کو آپ کا وطن بتایا ہے۔

تلمیذ شیخ محمد عابد کی عبارت ملاحظہ ہو۔

الحمد للہ امرنی مؤلف ھذا السفر الجلیل العلامۃ الاوحد الخ محمد عابد بن احمد علی السندی البیوستانی الأصل والمولد الحدادی النشأۃ۔ أن احرر تاریخ فراغہ من بحار ھذہ المسودۃ الخ	سب تعریف اللہ کے لئے ہے مجھ کو اس بڑی کتاب کے مؤلف علامہ، یگانہ الخ محمد عابد بن احمد علی سندھی جو کہ وطن اور جائے پیدائش کے لحاظ سے سیوھانی اور نشو نما کے لحاظ سے حدادی ہیں یہ فرمایا کہ میں اس اصل مسودہ سے فراغت کی تاریخ لکھوں الخ
احقر لطف اللہ بن احمد کمال	احقر لطف اللہ بن احمد کمالی

۵۔ حصر الشارد من اسانید محمد عابد۔ یہ کتاب بھی شیخ محمد عابد سندھی کی تالیف ہے اور جیسے دوسرے محدثین نے اپنے اسانید کو جمع کر کے اثبات تیار کی ہیں حصر الشارد بھی بالکل اسی طرح ہے۔ مشہور ثبت "الیانع الجنی" میں اس کے کئی حوالے موجود ہیں۔

اس مخطوطہ کے ۳۰۸ صفحات ہیں۔ اس کا ایک دوسرا قلمی نسخہ مولانا سید محب اللہ صاحب العلم درگاہ پیر جھنڈو کے علمی کتب خانے میں بھی محفوظ ہے۔

مدینہ منورہ کے مختصر قیام کے دوران مکتبہ (محمودیہ) حرم کے ساتھ مکتبہ شیخ الاسلام عارف حکمت کی زیارت کا بھی شرف حاصل ہوا۔ مطالعہ کے لئے بڑا اچھا انتظام تھا۔ نیچے فرش پر غالیچے بچھے ہوئے تھے جن پر تکیے رکھے ہوئے تھے۔ ہر فن کی فہرست کتب موجود تھی کتابیں بھی بڑے سلیقے سے رکھی ہوئی تھیں مجھے تو اعلام علمائے سندھ کی کتابوں کی خاص تلاش تھی اس لئے پہلی فرصت میں ان کی تلاش اور زیارت کی بعد میں جو مختصر وقت ملا اس میں کچھ دوسری کتابیں بھی دیکھیں جن کا تذکرہ خالی از معلومات نہ ہوگا۔ عربی دستور کے مطابق ہر آدھے گھنٹے کے بعد حاضرین کی طراوت اور تازگی دماغ کے لئے چائے بھی پلائی جارہی تھی۔ کتابوں کی تفصیل عرض خدمت ہے۔

حاشیۃ العلامۃ السندی علی صحیح البخاری۔ علامہ ابوالحسن کبیر سندھی نے حدیث کی جملہ کتب صحاح ستہ پر حواشی لکھے تھے اور ان حواشی کو دریا در کوزہ کہا جائے تو بجا ہوگا۔ ابوالحسن کبیر درایت کے امام ہیں، سنن ابی داود کی تعلیقات کے علاوہ باقی سب چھپ چکے ہیں۔ زیر بحث کتاب صحیح بخاری پر تعلیقات ہیں۔ اس کی کتابت سے فراغت کا سن اتوار صفر ۱۱۷۷ھ ہے، یعنی مصنف علام کی وفات کے ۳۹ سال بعد کا مخطوطہ ہے، خط عربی ہے۔ سائز ڈیمی۔ اندراج ۳۳ کتب الاحادیث کتاب کے سرورق پر یہ عبارت تحریر شدہ ہے۔

ھذہ حاشیۃ الامام والعلامۃ الھمام ابی الحسن السندی علی متن الامام البخاری	یہ امام علامہ ھمام ابوالحسن سندھی کا امام بخاری کے متن کا حاشیہ ہے۔

مکتبہ عارف حکمت کے بانی کی اس کتاب پر یہ تحریر وقف کے سلسلے میں نظر آئی۔

مما وقفہ العبد الفقیر الی ربہ الغنی احمد عارف حکمۃ اللہ بن عصمۃ اللہ الحسینی فی مدینۃ الرسول الکریم وعلی آلہ	یہ ان (کتابوں) میں سے ہے جس کو بندۂ فقیر اپنے غنی پروردگار کے محتاج احمد عارف حکمت اللہ بن عصمت اللہ حسینی نے وقف کیا مدینۃ رسول کریم میں آپ

الصلوۃ والتسلیم بشرط ان لا یخرج عن خزانتہ والموصون محمول علی امانتہ
۱۲۶۶

پر اور آپؐ کی آل پر صلوۃ اور سلام ہو۔ (وقف کے لئے) شرط یہ ہے کہ کتاب خانے سے باہر نہ نکالی جائے مومن پر امانت کی ذمہ داری لازم ہے ۱۲۶۶

اس پر وقف کرنے والے کی مہر بھی ثبت ہے۔

۷۔ تعلیقات علی صحیح الامام مسلم۔ تالیف امام ابوالحسن کبیر سندھی

مولانا عبدالتواب صاحب ملتانی نے پیر جھنڈو کے علمی کتب خانے سے اس کتاب کا قلمی نسخہ حاصل کر کے طبع کرایا تھا، یہ نایاب ہو چکا تھا۔ اس کو حال میں نور محمد کارخانہ تجارت کتب آرام باغ کراچی نے صحیح مسلم کے آخر میں چھاپ دیا ہے جزاہ اللہ خیرا۔

مدینہ منورہ والا مذکور قلمی نسخہ صحیح اور صاف لکھا ہوا ہے۔

۸۔ رسالۃ فی بیان قراءۃ المأموم خلف الامام الحنفی۔ تالیف علامہ ابوالحسن کبیر سندھی۔ اس رسالہ میں حنفی امام کے پیچھے مقتدی کی قراءۃ فاتحہ کے سلسلے میں تحقیق پیش کی گئی ہے۔ رسالہ کے اوراق ۲۲ اور ہر صفحہ کی سطریں ۱۷ ہیں خط نسخ میں ہے۔ سن کتابت ۱۲۳۹ھ ہے نمبر اندراج ۱۰۲ ہے۔

۹۔ جمع المناسک و نفع الناسک۔ تالیف علامہ رحمت اللہ سندھی۔

علامہ رحمت اللہ سندھی کا تعارف محتاج بیان نہیں۔ مناسک حج میں آپ کی تالیف دنیا کے ہر کتب خانے کی زینت رہی ہے۔ ملا علی قاری مکی نے آپ کے متن کی شرح کی ہے جس پر کئی عرب علمائے محققین کے حواشی ہیں اور یہ مصر میں کئی بار چھپ چکی ہے۔ زیر بحث رسالہ بھی مناسک حج کے بیان میں ہے، خط عربی۔ اوراق ۲۲۱ اور سن کتابت ۱۱۶۸ھ ہے نمبر اندراج ۶۸ الفقہ ہے

۱۰۔ شرح الاحادیث الاربعین النوویۃ۔ تالیف علامہ محمد حیات سندھی۔

چالیس احادیث کے مجموعے کئی پائے جاتے ہیں مگر امام نووی کا مجموعہ سب سے مشہور ہے۔ اس رسالہ میں شیخ محمد حیات سندھی نے ان کی شرح فرمائی ہے۔ خط نسخ اوراق ۳۲ ہر صفحہ

کی سطریں ۱۹ ہیں۔ سنہری مزین۔ سن کتابت ۱۱۴۲ھ یعنی مصنف کی حیات کا مخطوطہ ہے۔ کاتب کا نام نظر آیا۔ ممکن ہے مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہو۔

۱۱۔ بہجۃ النظر شرح شرح نخبۃ الفکر۔ تالیف علامہ ابوالحسن صغیر سندھی۔

شیخ ابوالحسن صغیر سندھی، علامہ محدث محمد حیات سندھی کے تلمیذ رشید ہیں۔ استاذ الاستاذ کے ساتھ ہم کنیت ہونے کی وجہ سے صغیر مشہور ہوئے۔ زیرِ نظر کتاب حامل المتن شرح نخبہ کی شرح ہے جو بہت پہلے ہندوستان میں طبع ہو چکی ہے اور اب نایاب ہے[۱]

گیارہویں صدی ہجری کے ایک دوسرے محدث سندھی عالم قاضی محمد اکرم نصر پوری سندھی نے بھی شرح نخبہ کی شرحِ امعان النظر کے نام سے لکھی ہے جو کہ نہایت ہی لبیط اور مفصل شرح ہے۔ مولانا عبدالحی صاحب لکھنوی کی تالیفات میں اکثر اس شرح کے حوالے موجود ہیں۔ اس طرح مخدوم محمد ہاشم ٹھٹوی سندھی کی علمی تصنیفات میں بھی امعان النظر کے حوالے پائے جاتے ہیں۔ بہجۃ النظر میں اس کے مقابلہ میں ایجاز اور اختصار ہے۔

امعان النظر کے تین مخطوطے مشہور ہے۔ (۱) پیر جھنڈہ کی علمی لائبریری کا نسخہ۔ یہ نسخہ مخدوم محمد ہاشم ٹھٹوی کے درس میں رہا ہے۔ ایک دو جگہ حاشیہ پر مخدوم صاحب اور ان کے پوتے مخدوم ابراہیم صاحب القسطاس کی تحریر بھی موجود ہے۔ (۲) رامپور کی علمی لائبریری کا نسخہ یہ لبعد کا لکھا ہوا ہے۔ (۳) ازہر کا نسخہ۔ ان تینوں نسخوں سے ایک قدیم تر مخطوطہ ۱۱۱۸ھ کا لکھا ہوا احقر راقم کی ذاتی لائبریری میں موجود ہے جو مجھے سندھ کے ایک نوجوان عالم مولانا قاضی عبدالکریم بیرائی سے حاصل ہوا۔ فللہ الحمد

یہ تو تھیں اعلام سندھ کی تصنیفات۔ ان کے علاوہ مکتبہ شیخ الاسلام میں دوسری نادر روزگار تصانیف بھی نظر سے گذریں۔ جن کا ذکر خالی از فائدہ نہ ہوگا۔

---

[۱] اس کا ایک مطبوعہ نسخہ میرے ذاتی کتاب خانے میں موجود ہے۔

۱۲- فتح الباقی شرح الفیۃ العراقی - تالیف علامہ زکریا انصاری

۱۳- عقود الجواہر المنیفۃ فی ادلۃ مذہب الامام ابی حنیفۃ - تالیف سیّد مرتضیٰ بلگرامی زبیری۔ یہ کتاب اگرچہ مصر میں چھپ چکی ہے لیکن اس مخطوطے کی یہ خوبی ہے کہ مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے اور سن کتابت سنہ ۱۱۹۷ھ ہے۔ سید مرتضیٰ شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی کے تلمیذ خاص ہیں۔ آپ کی دوسری تصنیف تاج العروس شرح قاموس اور احیاء علوم کی شرح مشہور زمانہ ہے۔

۱۴- الریاض فی ختم شفاء القاضی عیاض - تالیف حافظ سخاوی۔ کتابت سنہ ۹۱۶ھ

۱۵- الفیۃ السیر النبویۃ - تالیف حافظ زین الدین عراقی

۱۶- الانوار والحکم واسرار الکلم - تالیف سید مرتضیٰ بلگرامی زبیری،

یہ کتاب علم التوحید میں ہے۔ مصنف کے ہاتھ کا مخطوطہ ہے جو کہ ۲۵ اوراق میں پھیلا ہوا ہے ہر صفحہ کی سطریں ۲۱ ہیں۔ حاشیہ پر سنہری کام ہے۔

۱۷- الزوراء المشتملۃ علی زبدۃ الحقائق ونبذۃ الدقائق فی شرحہا۔

یہ فلسفہ الٰہیات کا مشہور رسالہ اور اس کی شرح ہے۔ تالیف محقق جلال الدین دوانی۔ اوراق ۱۴۱- ہر صفحہ کی سطریں ۲۵ اور سن کتابت سنہ ۱۱۲۱ھ ہے۔ علم التوحید میں اندراج ۲۷۵ ہے۔

اس رسالہ کی ایک شرح[1] مخدوم نعمت اللہ سندھی ٹھٹوی نے بھی لکھی ہے جو کہ اپنی سلاست اور روانی عبارت کے لحاظ سے بے نظیر شرح ہے۔ مخدوم نعمت اللہ سندھ کے مشہور محقق محمد ہاشم ٹھٹوی

---

[1] اس کی فوٹو اسٹیٹ کاپی احقر کے ذاتی کتب خانے میں موجود ہے، اصل نسخہ مولانا سید وہب اللہ صاحب العلم پیر جھنڈو کے علمی کتب خانہ کا تھا جو کہ نہایت بوسیدہ تھا۔ جناب مورخ سندھ پیر حسام الدین راشدی کی عنایت سے یہ فوٹو اسٹیٹ کاپی حاصل ہوئی۔ [2] اس کا ایک قدیم مصحح اور کامل مخطوطہ میرے دوست اور تلمیذ مولانا الحاج عبدالکریم بیراجی سندھی کے کتاب خانے میں موجود ہے (ت) [3] اس کا ایک نسخہ جو کہ آخر سے کرم خوردہ ہے احقر کی ذاتی لائبریری میں موجود ہے (ح ۲ ص ۳ ۱۲۲ پر ملاحظہ ہو)

کے استاذ کے استاذ ہیں۔

۱۸۔ تعلیقات علی المقدمات الاربع من التوضیح والتلویح۔ تالیف علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی۔ اوراق ۴۲۔ سطور ہر صفحہ ۲۱۔

یہ تعلیقات بھی ہندوستان میں چھپ چکے ہیں۔ علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی کے صاحبزادے عبداللہ لبیب نے ان کو جمع کیا تھا[۲۰]۔

بارہویں صدی ہجری کے ایک سندھی عالم روح اللہ بکھری نے بھی تلویح پر تعلیقات لکھی ہیں۔ جو نہایت بسیط اور سہل عبارت میں ہیں[۲۱]۔

۱۹۔ شرح السیر الکبیر۔ تالیف امام سرخسی۔ خط نسخ ۔ ۸۹۷ مطلی سنہری خوبصورت اندراج ۱۳۱

۲۰۔ شرح کتاب الطحاوی تالیف علامہ اسبیجابی خط نسخ اوراق ۳۰۱ سطور ہر صفحہ ۳۵۔ اندراج ۱۳۷

۲۱۔ شرح منظومۃ شروط الصلوۃ۔ تالیف شیخ حسین راشدی۔ اندراج ۶۵ فقہ حنفی۔

۲۲۔ خزانۃ الروایات۔ خط نسخ۔ اوراق ۲۷۹ سطور ہر صفحہ ۲۴ سن کتابت ۱۱۳۳ھ

خزانۃ الروایۃ کے مؤلف کے متعلق مولانا عبدالحی صاحب لکھنوی اور مولانا عبدالحی حسنی صاحب نزہۃ الخواطر اور دوسرے بزرگوں نے لکھا ہے کہ اس کا نام قاضی جکن ساکن قصبہ کن گجرات ہے۔

میں نے المتانۃ فی مرمۃ الخزانۃ کو ایڈٹ کرتے وقت ان بزرگوں کے حوالہ سے قاضی جکن لکھا ہے لیکن مکتبہ شیخ الاسلام کے اس مخطوطے میں مؤلف کا نام القاضی حسین الہندی بتایا گیا ہے اور ابتدائی اوراق میں کشف الظنون کی یہ عبارت تعارف میں تحریر ہے۔ فی کتاب کشف الظنون خزانۃ الروایات فی الفروع للقاضی حسن الحنفی۔

کاتب نے اپنا نام اس طرح لکھا ہے۔ بید عامر الأشمونی بلداً الشافعی مذہبا البرہانی خرقۃ۔

---

۲۰ ۲۱ ۲۲ پر

اب یہاں ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ کشف الظنون کے مطبوعہ نسخہ میں جو ہمارے ہاں موجود ہے،
تحریف ہو گئی ہو اور حسن کے بجائے جکن لکھا گیا ہو۔ اصل مخطوطے میں جکن شہر کا نام بتایا گیا ہے۔
مولانا عبدالحی حسنی کو بھی اس ہندی عالم کے متعلق کشف الظنون سے معلومات فراہم ہوئی ہیں۔ اور
یہ بھی ہو سکتا ہو کہ عرب علماء نے جکن ہندی نام کو حسن بنایا ہو۔ واللہ اعلم۔

۲۳- تیسیر المقاصد شرح نظم الفرائد لابن وہبان - تالیف شیخ حسن
شر بنلالی خط نسخ۔ اوراق ۶ ۴ ۲ ہر صفحہ کی سطریں ۲۰ کتابت ۱۲۷۳ھ خوبصورت سنہری منزین

"اس زمانے (عہد مغلیہ) کا ایک اور اہم علمی مرکز زیریں سندھ کا دارالخلافہ ٹھٹھہ تھا۔ مغربی
پنجاب اور سندھ کی ثقافتی تاریخ ابھی تک مرتب نہیں ہوئی۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ملتان،
اچہ، منصورہ اور دیبل کے قدیم اثرات اور ایران کے قرب کی وجہ سے اس علاقہ میں علوم اسلامی
اور عربی فارسی ادب کا بہت بلند معیار تھا۔ اور ٹھٹھہ، بھکر، سیوستان اور بیلہ (نزد سیوستان)
میں علم و ادب کے بڑے مرکز تھے۔ جب خاندان تغلق کے زوال کے بعد مرکزی حکومت کمزور
ہو گئی اور سندھ خود مختار ہو گیا۔ اس وقت بھی علم و فضل کی سرپرستی جاری رہی اور اس علاقے
میں بڑے اہل علم پیدا ہوئے۔ مغلیہ حکومت میں بھی کئی سندھی علماء نے نام پایا۔ متعدد
سندھی علماء (مثلاً سید نظام الدین ٹھٹوی اور مولانا ابوالخیر ٹھٹوی) نے فتاویٰ عالمگیری کی
تدوین میں مدد دی۔ قاضی ابراہیم ٹھٹوی عہد شاہجہانی میں دارالخلافہ کا مفتی اور قاضی عسکر تھا۔
ملا محمد دماغی ٹھٹوی شاہجہاں کے ایام شاہزادگی میں اس کا پیش امام تھا۔"

(رود کوثر از شیخ محمد اکرام)

ابن رشد کے سیاسی افکار [1]

ترجمہ - محمد سرور

یہ ہماری غلطی ہوگی اگر ہم یہ سمجھیں کہ ابن رشد صرف ارسطو کے فلسفہ کی بڑے شارحین ہی میں سے ایک ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ افلاطون کی مشہور تصنیف "جمہوریہ" کے شارحین میں سے بھی ہے۔ اگرچہ وہ افلاطون کے سیاسی افکار کا پورا احصاء نہیں کرسکا۔

ابن رشد علم السیاست کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے، جیسا کہ علم طب کی کیفیت ہے۔ وہ ہمیں بتاتا ہے کہ ارسطو کا علم الاخلاق نظری اعتبار سے اس کا جزو اول ہوگا۔ اور افلاطون کی جمہوریت عملی لحاظ سے اس کا جزو ثانی اور یہ کہ علم السیاست عملی فلسفہ کا ایک جزو لایتجزی ہے۔ باقی رہے عملی فلسفہ کے دو دوسرے اجزا، تو وہ علم الاخلاق اور علم الاقتصاد ہیں۔ اس کی فلسفے کی یہ تقسیم یونانی افکار و آراء سے مستفاد ہے،

ابن رشد نے جمہوریہ افلاطون کی جو شرح کی ہے، اسے آج اس زمانے میں جو چیز اہم اور مفید بناتی ہے، وہ یہ ہے کہ اپنی اس شرح میں اس کا دوسری شرحوں میں جو عام معمول ہے وہ اس سے الگ راہ اختیار کرتا ہے، بلکہ وہ اس میں اپنے فلسفی مسلک کے خلاف جاتا ہے

---

[1] یہ مضمون عربی مجلہ "البیّنۃ" سے ماخوذ ہے، جسے خاص اس مجلہ کے لئے کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر "ا۔ ج، روزنتال" نے لکھا۔ "البیّنۃ" مراکش کے شہر "الرباط" سے شائع ہوتا ہے۔ (مدیر)

اس سلسلے میں ابن رشد کے سامنے جمہوریۂ افلاطون کا وہ نسخہ تھا، جو اس تک عربی متن میں پہنچا تھا۔ چنانچہ وہ اس کی روشنی میں اسلامی سلطنت کا تجزیہ کرتا ہے اور خاص طور سے وہ اپنی ہم عہد دو سلطنتوں یعنی سلطنت مرابطین اور سلطنت موحدین کا تنقیدی جائزہ لیتا ہے۔ وہ اپنے اس تجزیہ و تنقید کی بنیاد اس تجربے پر رکھتا ہے، جو اسے قرطبہ میں محکمہ قضا میں بحیثیت مالکی قاضی کے عہدے پر فائز ہونے سے حاصل ہوا تھا۔

ہم اگر یہاں یہ کہیں، تو راہِ صواب سے زیادہ دور نہیں ہوں گے کہ موحدین اور مرابطین کے عہد حکومت میں بھی قاضی کے عہدے کی وہی حیثیت باقی تھی، جو ان حکومتوں سے پہلے دور میں تھی۔ اور اس سلسلے میں یہ بھی ملحوظ رہے کہ ابن رشد کا دادا اپنے زمانے میں قاضی القضاۃ کے عہدے پر فائز تھا اس دور میں قاضی کا صرف یہ کام نہیں ہوتا تھا کہ وہ بس فیصلے اور احکام صادر کر دیا کرے، بلکہ اس کے ذمے سول ایڈمنسٹریشن (ادارہ مدنیہ) بھی ہوتا تھا۔ ظاہر ہے ابن رشد کے پاس منصب قضا سنبھالنے کی وجہ سے سیاسی زندگی کے تمام شعبوں میں بڑا وسیع اور پائیدار تجربہ جمع ہو گیا ہوگا اور سلطنت کے نظم و نسق اور اسلامی معاشرے کے اسرار و رموز کے بارے میں بھی اس کی بڑی گہری نظر ہو گئی ہو گی۔ اس کے علاوہ افلاطون کی طرح ابن رشد کی بھی یہ رائے تھی کہ سلطنت کی عنان اقتدار فلسفیوں کے ہاتھ میں ہونی چاہیئے اور اگر یہ ناقابل عمل ہو تو فلسفیوں کو چاہیئے کہ نظم و نسق کی اصلاح اور بہتری کے لئے اپنے عقلی معیاروں کے مطابق اس پر تنقید کرتے رہیں۔ فلسفی کا مقام سیاسی گروہوں کی باہمی آویزش اور آپس کے متناقض خصوصی مفادات سے بلند و بالا ہے اور اسے ان چیزوں سے الگ رہنا چاہیئے۔ اس کا کام یہ ہے کہ وہ عقل کو حاکم مان کر پوری بہادری اور آزادی سے اپنی مقصود و مطلوب حقیقت کی خدمت کرے۔ اور عقل وہ گراں بہا عطیہ ہے، جو اللہ تعالےٰ نے انسان کو بخشا ہے اس ضمن میں ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ ابن رشد ایک متدین فلسفی ہے۔

ابن رشد نے افلاطون کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ریاست و مملکت کے پس منظر میں حقیقت پر بحث کی ہے۔ یہاں اس کی تو گنجائش نہیں کہ اس کے سیاسی افکار و آراء کی اس کے

پورے فلسفہ کی روشنی میں شرح کی جائے۔ لیکن ابن رشد نے اس سلسلہ میں افلاطون کی جو شرح کی ہے میری بحث اس کی صرف دو بنیادی باتوں پر محدود رہے گی:۔ ایک ریاست میں قانون الٰہی اور قانون انسانی کی حیثیت، اور دوسرے اپنے عہد کی اسلامی سلطنت پر اس کی تنقید اور خاص طور سے مسلمانوں کے ہاں عورتوں کی جو حالت تھی، اس کے بارے میں ابن رشد کی شدید ناپسندیدگی۔

سب سے پہلے میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ابن رشد جو قرون وسطی میں مسلمانوں کے بڑے فلسفیوں میں سے سب سے آخری ہے، اس کی عظیم فکری سرگرمیوں میں فلسفے کا کیا مقام تھا؟ اس ضمن میں ضروری ہے کہ ابن رشد کے عہد میں فلسفہ اور فلسفیوں کو جس بری نظر سے دیکھا جاتا تھا، ہم اسے جانیں، کیونکہ اس سے اس فلسفی کو اچھی طرح سمجھا جاسکے گا۔ ابن رشد سے پہلے امام الغزالی نے فلسفے پر جو حملے کئے تھے اس سے اسلامی فلسفہ کی حیثیت مدافعانہ ہو گئی تھی۔ امام الغزالی کی کتاب تہافتہ الفلاسفہ کے جواب میں ابن رشد نے تہافتہ التہافتہ نام سے جو کتاب لکھی تھی خواہ وہ کتنی بھی کامیاب رہی ہو، لیکن اس سے امام الغزالی ہی کے موقف کو تقویت پہنچی اور اس کے بعد اسلامی فلسفہ ایک خاص نہج پر چل پڑا۔ امام الغزالی جیسے بڑے متکلم فلسفی نے فلسفہ پر جو حملہ کیا اور ابن رشد کو اس کا دفاع کرنا پڑا، تو اس کی وجہ سے آزاد فکر ایک محدود دائرے میں محصور ہو کر رہ گیا۔ یہاں ہمیں اس حقیقت کا اظہار کر دینا چاہیئے کہ ابن رشد دین اسلام کا معتقد ہے اور وہ پوری طمانیت سے شریعت کی بالادستی اور فلسفی بحث وجدل کے دائرے کی تحدید کو قبول کرتا ہے۔ اس کے نزدیک یہ لازمی ہے کہ دین اسلام کو ماننے والے خواہ وہ فلسفی ہوں یا متکلم یا عوام الناس، اسلامی معتقدات پر یقین رکھیں۔ نیز یہ معتقدات فلسفیوں کی بحثوں سے جو محض دلیل و برہان پر اعتماد کرتے ہیں، ماوراء ہیں۔

دینی معتقدات اور فلسفہ کے بارے میں ابن رشد کا جو موقف ہے، وہ دراصل نتیجہ ہے ان حملوں کا جو امام الغزالی کی طرف سے فلسفہ پر کئے گئے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اس بات کے حق میں بھی تھا کہ اپنے اس موقف کے دائرے کے اندر رہ کر فلسفیانہ دلائل اور عقلی براہین سے دین کی تائید کرے

ابن رشد نظریہ نبوت کے بارے میں قدماء کا اہم خیال تھا اور اس ضمن میں ان مسلم فلسفیوں کے نظریات سے جو افلاطون سے متاثر تھے اور نبوت کو سرچشمہ عقل و فعال

کا سوتا سمجھتے تھے، اسے اختلاف تھا۔

علماء اور فقہا کے ساتھ ابن رشد کی جو بحثیں ہوئیں، جب ہم ان پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں ابن رشد کے ہاں جگہ بہ جگہ ابہام اور تناقض ملتا ہے۔ لیکن ہمیں اس بارے میں زیادہ تعجب نہیں ہونا چاہیئے، کیونکہ آخر ابن رشد موحدین کی سلطنت کا ایک عہدے دار تھا اور گو موحدین کا فلسفیانہ افکار کی طرف بھی کچھ رجحان تھا، لیکن وہ تھے اہل سنت والجماعت کے مسلک کے علمبردار اور شرع کے خالص اسلام کے داعی۔ بہرحال میں یہ بات یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ابن رشد پہلے مسلمان تھا اور اس کے بعد فلسفی اور یہ کوئی راز نہیں کہ وحی اور عقل اور قانون الٰہی اور قانونِ انسانی کے درمیان جو کہ عقل کی پیداوار ہے، مطابقت کرنا اگر محال نہیں، تو مشکل ضرور ہے اور میرے خیال میں قرون وسطیٰ میں کوئی بھی ایسا مفکر نہیں گزرا، خواہ وہ مسلمان ہو، یا یہودی یا مسیحی، جو ان دونوں میں پوری طرح مطابقت کر سکا ہو۔ اس سلسلے میں ابن رشد ایمان کی فوقیت کو تسلیم کرتا ہے۔ اور اس پر وہ مُصر ہے کہ شریعت کے بارے میں دین اور فلسفہ دونوں کے مقاصد ایک ہی ہیں اور یہ کہ ایک فلسفی ہی عقلی لحاظ سے وحی کی تشریح کر سکتا ہے۔ اور یہ کام فقہا کے بس کا نہیں۔ کیونکہ ان کے پاس واضح دلیل (الحجۃ البیّنۃ) نہیں ہوتی اور اس معاملے میں منطقی دلیل ناکافی رہتی ہے، بلکہ یہ عوام الناس کے لئے خطرناک ہے۔

ابن رشد شریعت کا دفاع کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ شریعت ایک واضح حکم ہے جس پر ایمان لانا واجب ہے۔ اور شریعت اور فلسفہ میں اساسی فرق یہ ہے کہ فلسفہ کی تلقین صرف منتخب لوگوں کو کی جاتی ہے۔ درآں حالیکہ دین عوام الناس کو سکھایا جاتا ہے لیکن ہر دو کے پیش نظر ہے ایک ہی حقیقت۔ یہاں ہم یہ اشارہ کر دیں کہ ابن رشد کی طرف غلط طور پر دوئی اور ثنویت منسوب کی گئی ہے۔ یہ تصور دراصل اس کے بعض اطالوی متبعین کا ہے ابن رشد کا نہیں۔ ابن رشد کے نزدیک وحی بھی عقل کی طرح حقیقت کو بیان کرتی ہے۔ لیکن وحی کا درجہ مقدم ہے کیونکہ وہ اللہ کی حکمت مطلقہ کی پیداوار ہے اور عقل کا مصدر و منبع انسان ہے، جو خطا سے خالی نہیں۔ اس ضمن میں

یہ ملحوظ رہے کہ ابن رشد انسانوں کے تین طبقے منوانے پر بہت زور دیتا ہے۔ ایک فلسفی دوسرے متکلمین اور تیسرے عوام الناس۔ اس کے نزدیک یہ تینوں کے تینوں طبقے اپنی عقلی استعداد کے مطابق اللہ کے وجود، رسالت اور آخرت کا جہاں کہ انسان کو اپنے اعمال کی جزا و سزا ملے گی، ادراک کرتے ہیں، لیکن جہاں تک امور عبادات کا تعلق ہے، ان کا دائرہ عقلی تشریح سے باہر ہے۔ ابن رشد کے اس خاص موقف میں ہمیں امام الغزالی کا اثر نمایاں نظر آتا ہے۔

موجودہ بحث میں جو چیز ہمارے لئے اہم ہے وہ ہے ابن رشد کے سیاسی فکر اور دین میں باہمی تعلق۔ افلاطون کا فلسفہ اس کے شاگردوں کی شرح کے ساتھ مسلمانوں میں داخل ہوا۔ اب سیاست میں اہل یونان اور اسلام دونوں کی آرار کا مرجع داساس عدل کا اصول تھا۔ اس اساس کی بدولت قرون وسطی میں مسلمان اہل فکر کو افلاطون اور ارسطو کے افکار و آرا کو قبول کرنے میں بڑی مدد ملی۔ البتہ ایمان اور عقل، قانون الٰہی و شریعت اور قانون انسانی کی باہمی کشمکش نے ان کے ہاں ایک نازک صورت اختیار کرلی تھی۔ ایک طرف افلاطون تھا، جو یونانی ہیئتِ سیاسیہ یا ریاست کو مثالی و آئیڈیل قرار دیتا تھا۔ اور دوسری طرف ابن رشد ہے جو اس ریاست کو دین سے خارج ہونے کے باوجود ایک بہترین ریاست سمجھتا ہے۔ لیکن اس کے نزدیک مثالی و آئیڈیل ریاست ایک اسلامی ہی ہے جس کی بنا شریعت پر ہے اور وہ نبوت سے اپنے اصول اخذ کرتی ہے اور وہ یقیناً افلاطون کے قوانین سے جو عقل انسانی پر مبنی ہیں فائق ہیں۔ باوجود اس کے کہ دونوں نظاموں میں بنیادی اختلافات تھے، پھر بھی سیاسی نقطہ نظر میں یونانی اور اسلامی افکار میں باہم امتزاج ہوا اور اس طرح فلسفۂ واقعی کے ذریعہ وحی اور عقل میں اتصال بروئے کار آیا۔ جس کا دائرہ آگے چل کر فلسفہ نظری تک جا پہنچا اور پھر اس فلسفہ نظری کو دینی معتقدات کی شرح میں استعمال کیا جائے لگا۔ ابن رشد افلاطون سے اس معاملے میں متفق ہے کہ ریاست اور مملکت خواہ وہ یونانی ہو یا اسلامی، اس کے لئے معتقدات کا ہونا ضروری ہے۔

ابن رشد کے نزدیک، قانون کی آخری غایت اللہ اور حقیقت کی معرفت اور اس زندگی کے

کے بعد دوسری زندگی میں سعادت (نیک بختی) اور شقاوت (بدبختی) پر ایمان رکھتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ہمارے اعمال کو سعادت کی طرف ہماری رہنمائی کرنی چاہیئے اور شقاوت سے ہمیں بچنا چاہیئے۔ یونانیوں کے ہاں علم السیاست کی آخری غائت سعادت ہے۔ اور اس سلسلے میں علم السیاست کا ایک مقصد "خیر عام" ہے۔ چنانچہ ان کے نزدیک سعادت مشتمل ہے غور و تامل اور عمل خیر ہر دو پر۔ اسی ضمن میں خاص اس مسئلے پر الفارابی نے "کتاب تحصیل السعادۃ" کے نام سے ایک مستقل کتاب لکھی ہے۔ چنانچہ سیاست اور دین اور قانونِ افلاطون اور قانون اسلام یعنی شریعت کے درمیان یہی رشتہ ہے۔ ریاست کی اساس قانون ہے اور ایک اسلامی ریاست میں فلسفی پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ وہ یقینی برہان و دلیل سے قانون الہی کی شرح کرے اور یہ کہ حقیقت کا اظہار صرف یقینی برہان و دلیل ہی سے ہو سکتا ہے۔

اس سلسلے میں یہ ملحوظ رہے کہ ابن رشد شریعت اور قانون میں جیسا کہ افلاطون نے آخر الذکر کی تحدید کی ہے، بڑا واضح فرق بتاتا ہے۔ اور ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے، جیسے کہ اوپر بیان ہوا، وہ شریعت کی اوّلیت کا قائل ہے۔ نیز قانون الہی کے بارے میں اس کا جو ایجابی موقف ہے، اس کی وجہ سے اس کے لئے اس قانون (الہی) اور دوسرے مختلف قوانین میں جن کا ذکر ارسطو نے کیا ہے، مقابلہ کرنا آسان ہو گیا ہے۔ باقی رہی شریعت، تو وہ اس کے نزدیک اسلامی ریاست یعنی خلفائے راشدین کے عہد کی خلافت کا ایک کامل قانون ہے اور یہ اسلامی ریاست افلاطون کی مثالی و آئیڈیل ریاست سے فائق تر ہے۔

چونکہ یہ خلافت قانون الہی کا جس کی کہ رسول کریم صلعم پر وحی کی گئی ہے، سیاسی مظہر ہے، اس لئے ایک مسلمان کا فرمانروائے ریاست سے یہ مطالبہ نہیں ہونا چاہیئے کہ اس میں نبوت کے اوصاف ہوں۔ اس معاملے میں ابن رشد کا الفارابی اور ابن سینا سے اختلاف ہے۔ ابن رشد کے نزدیک امام صاحب شریعت رسولؐ کا خلیفہ ہے۔ اور خلافت کا امتیاز یہ ہے کہ اس میں رسولؐ کے قانون کی پوری پوری تطبیق ہوئی۔ اور یہ کہ رسولؐ صاحبِ معجزات سے زیادہ صاحب شریعت تھے۔ اللہ تعالےٰ نے اپنے رسولؐ پر جو قانون بذریعہ وحی اتارا ہے، اس میں انسان کی اس زندگی کا بھی خیال رکھا گیا ہے

اور آخرت کا بھی، لیکن آخرت کا خیال زیادہ رکھا گیا ہے۔ چنانچہ یہ قانون انسان کے لئے دو اچھائیوں (حسنۃ فی الدنیا اور حسنۃ فی الآخرۃ) کا حامل ہے۔ اس کے برعکس ابن رشد کی نظر میں افلاطون کا قانون صرف اِس دنیا کی اچھائی کا خیال رکھتا ہے ابن رشد کا کہنا یہ ہے کہ اس طرح کے قانون فلسفیوں نے ایک مختصر سے منتخب گروہ کے لئے، جس میں خود ان کا شمار ہوتا ہے، وضع کئے ہیں تاکہ وہ دوسروں سے پہلے خود زیادہ سے زیادہ سعادت حاصل کریں۔ باقی رہے عوام الناس، تو وہ اس لئے جان مارتے اور جفائیں جھیلتے ہیں تاکہ ان کے علاوہ دوسرے لوگ "خیر اعلیٰ" کا جو انسانی مقصد ہے، وہ اسے حاصل کریں اس سلسلے میں ابن رشد افلاطون پر اس بنا پر سخت تنقید کرتا ہے کہ اس نے عوام الناس کو کوئی اہمیت نہیں دی لیکن ایک مسلمان کی نظر میں تمام مومنین کی سلامتی کی بڑی اہمیت ہے۔ ابن رشد انسانوں میں کوئی تمیز نہیں کرتا، اس کے نزدیک قانون الٰہی ان تمام لوگوں کے لئے جو اپنے درجوں کے مطابق اس کا اتباع کرتے ہیں، امن کی کفالت کرتا ہے دینی نقطہ نظر سے سعادت کے باب میں لوگوں میں جو اختلاف ہوتا ہے تو وہ ان کے درجات اور مراتب کے اعتبار سے ہوتا ہے نہ کہ ان کی شخصی حیثیتوں کی بنا پر۔ اللہ کے سامنے سب انسان برابر ہیں۔ اور وہ ان کا ان کے فضائلِ (اعمال) کی بنا پر، نہ کہ ان کے افکار کی بنا پر محاسبہ کرے گا۔ ظاہر ہے یہ موقف فلسفہ کا نہیں، بلکہ ایمان کا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ایک طرف ابن رشد عرفان کے بلند مرتبے پر فائز لوگوں میں سے جو افراد علم الغیب کا سراغ لگانے میں کوشاں ہیں اور وہ اپنے ذہنِ رسا اور عقلی غور و تعمق کے ذریعہ اللہ کی حقیقی اور گہری معرفت حاصل کرنا چاہتے ہیں ان سے مثالی سعادت کا وعدہ کرتا ہے اور دوسری طرف بحیثیت ایک مسلمان کے اس کا اس پر بھی اصرار ہے کہ شریعت سب کی سلامتی کی کفیل ہے۔

ہم ایک بار پھر اسلامی ریاست کی مثالی خلافت کے موضوع کو لیتے ہیں ابن رشد اس خلافت کی اہمیت کو سمجھتا ہے اور بحیثیت اہل سنت والجماعت میں ہونے کے وہ اسے مثالی سمجھتا ہے لیکن ایک فلسفی کی طرح وہ اس خلافت اور افلاطون کی ریاست کے درمیان باوجود اس کے کہ دونوں میں بنیادی فرق ہے، موازنہ بھی کرتا ہے۔ اور ان کی روشنی میں وہ اپنے دور کی اسلامی

حکومت کا جائزہ لیتا ہے اور اس پر رائے زنی کرتا ہے۔ افلاطون نے اپنی کتاب میں مثالی ریاست کے علاوہ ناقص اور غیر کامل ریاستوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ مسلمانوں میں خلافت راشدہ کے بعد جو حکومتیں قائم ہوئیں وہ افلاطون کی غیر کامل ریاستوں سے ملتی جلتی ہیں ابن رشد نے مسلمانوں کی ان غیر کامل حکومتوں کا ذکر کرتے ہوئے الفارابی کی تعبیرات سے کام لیا ہے دراصل یہ الفارابی ہی تھا جس نے مسلمانوں کے ہاں افلاطون کی تعبیرات کو داخل کیا، لیکن ابن رشد الفارابی سے زیادہ باریک بین تھا اس نے حکومتوں کی جو قسمیں گنائی ہیں، وہ الفارابی سے زیادہ ہیں الفارابی نے افلاطون کی صرف چار ہی حکومتوں کے ذکر پر اقتصار کیا ہے، جو یہ ہیں۔

دیموقراطیہ (Democracy) مطلق العنان حکومت (Autocratic)
چندسری حکومت "حکم العصبیۃ" (Oligarchy) ستبد حکومت (Tyrannic)
غرض اس طرح الفارابی نے مسلمانوں میں یونانی سیاسی فلسفہ داخل کیا۔

ابن رشد، ابن خلدون کی طرح جو اس کے بعد ہوا ہے، بادشاہت کے نظام کو ایک مخلوط نظام سمجھتا ہے۔ بے شک اس نظام بادشاہت میں نظری و عملی اعتبار سے خلافت اسلامیہ کے اساسی عناصر محفوظ رہے، لیکن بادشاہ کی اپنے اقتدار اور شخصی حکومت کو برقرار رکھنے کی جو خواہش ہوتی تھی اس کی وجہ سے اس نظام میں کافی ملاوٹ پیدا ہو گئی۔ غرض ابن رشد نے مغرب (الجزائر و مراکش) میں قائم شدہ اسلامی سلطنت کو خلافت اسلامیہ اور افلاطون کی مثالی ریاست اور اس کی دوسری چار ناقص و غیر کامل ریاستوں کے معیار سے جانچا ہے۔ میرے نزدیک ابن رشد کے مغرب کی اسلامی سلطنت کو افلاطونی معیاروں سے جانچنے کے معنی یہ تھے کہ وہ اس کا قائل تھا کہ افلاطون جس سے ارسطو نے اپنے اہم نظریات اخذ کئے ہیں، وہ ریاست کے مقاصد، ریاست کے بنیادی اصولوں، اس کی خرابیوں اور پھر وہ جس طرح بتدریج زوال پذیر ہو کر ناقص و غیر کامل حکومتوں کی شکل اختیار کر لیتی ہے، جیسا کہ خود ایک فرد انسانی اور نوع انسانی کا حال ہے، ان امور پر غائر نظر رکھتا تھا۔ چنانچہ یہاں ہم ابن رشد مسلمان کو ابن رشد فلسفی سے اتفاق کرتے ہوئے پاتے ہیں۔

ابن رشد نے ان اشعار پر جن سے غیر مستحسن جذبات بھڑکتے ہیں، تنقید کی ہے، اسی طرح وہ عہد جاہلی کے اشعار کو دینی اور اخلاقی لحاظ سے ناپسند کرتا ہے اور اس دور کے قصائد میں جو سیاسی مفاسد تھے ان کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ابن رشد کا شاعری کی اس طرح مخالفت کرنا قدرتی طور پر افلاطون کے اثرات کا پتہ دیتا ہے۔

عورت کے معاملے میں ابن رشد کی جو رائے ہے، وہ صاف طور سے افلاطون سے مستنبط ہے ابن رشد نے بڑی جرأت اور نہایت عجیب طریقے سے اپنی اس رائے کو مسلمانوں کے ہاں اُس وقت عورت کی جو حیثیت تھی، اس پر منطبق کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ افلاطون کی طرح شہری زندگی کے فرائض و واجبات میں عورت کی شرکت کو پسند کرتا ہے۔ اس کی یہ رائے اس زمانے کے مسلمان معاشرے کے عام معمول کے خلاف ہے، جہاں مرد اور عورت کے اختلاط کو بُرا سمجھا جاتا تھا، اس سلسلے میں وہ لکھتا ہے۔

"ہماری ان سلطنتوں میں عورتوں کی استعداد و قابلیت کا کوئی اظہار نہیں ہوتا کیونکہ ان سے یہاں سوائے نسل و تناسل کے اور کوئی کام ہی نہیں لیا گیا۔ ان کی زندگی اپنے خاوندوں کے اشارے پر موقوف ہے اور وہ سوائے بچوں کو جننے انہیں دودھ پلانے اور ان کو پالنے کے کسی اور کام کے قابل نہیں سمجھی جاتیں، لیکن اس کی وجہ سے ان کی دوسری سرگرمیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ ان سلطنتوں کے بانجھ پن کے اسباب میں سے ایک سبب عورتوں کا اپنے خاوندوں پر بار ہونا ہے ہمارے ہاں مردوں کے مقابلے میں عورتوں کی تعداد دو چند ہے اور اس کے باوجود ہم انہیں سوت کاتنے اور کپڑا بننے جیسے معمولی کاموں کے سوائے دوسرے ضروری کام سکھانا ضروری نہیں سمجھتے۔"

ابن رشد نے یہ جو لکھا ہے، وہ درحقیقت اس کی اپنی ہم عہد سلطنت موحدین پر تنقید ہے اس کے علاوہ جس طرح افلاطون سوفسطائیوں پر تنقید کیا کرتا تھا، اسی طرح متکلمین ابن رشد کی تنقید کا نشانہ بنے۔ وہ انہیں سلطنت کے لئے ایک خطرہ قرار دیتا تھا۔

ابن رشد نے اپنے پیش رو فلسفی ابن باجہ سے "مدینہ امامیہ" کی اصطلاح مستعار لی ہے جس

کا اطلاق وہ ایک ناقص وغیر کامل ریاست پر کرتا ہے۔ ابن رشد کے نزدیک یہ "مدینہ امامیہ" اس کے عہد کی سلطنت موحدین ہے، جو افلاطون کی تعبیر کے مطابق دیموقراطی نظام سے منتقل ہو کر استبدادی نظام کی حامل ہو گئی تھی۔ اس سلسلے میں ابن رشد کہتا ہے۔

"پہلے اموال عوام کے ہاتھ میں تھے پھر وہ حکمراں خاندانوں کے پاس جمع ہو گئے یعنی رعایا کا کام یہ رہ گیا کہ وہ بادشاہ کے شخصی مفادات کو پورا کرتی رہے"۔

معلوم ہوتا ہے یہ اشارہ ان امور حکومت کی طرف ہے جو موحدین کے فرمانروا عبدالمومن کے بعد اس کے جانشین اور بیٹے ابو یعقوب یوسف کے عہد میں رونما ہو رہے تھے ایک اور جگہ ابن رشد نے اس صورت حال پر کہ کس طرح خلافت نے بعد میں بادشاہت کی شکل اختیار کر لی، تنقید کی ہے اسی ضمن میں وہ مرابطین اور موحدین کے عہد میں جو تبدیلیاں ہوئیں، ان کا موازنہ کرتا ہے مثال کے طور پر یوسف بن تاشفین کے عہد میں نظام حکومت شریعت پر مبنی تھا، یعنی وہ خلافت سے ملتا جلتا تھا پھر اس کے بعد اس کے بیٹے کے عہد میں وہ بادشاہت میں بدل گیا۔ اور اس کے پوتے کے عہد میں ہوا و ہوس بن کر رہ گیا۔

اوپر جو کچھ بیان ہوا، اس میں ہم نے دیکھا کہ ابن رشد نے خلافت اور افلاطون کی پیش کردہ ریاست میں موازنہ کیا ہے۔ اس ضمن میں وہ یونانی فلسفی کے نقش قدم پر چلا ہے اور دوران بحث وہ بتاتا ہے کہ طریقہ ہائے حکومت کی تبدیلی کا افراد کی طبیعت پر کیا اثر پڑا۔ مرابطین کے ہاں دیموقراطی نظام حکومت ۵۴۰ھ میں استبداد میں تبدیل ہوا ہے اور یہ تاریخ اس لحاظ سے بڑی اہم ہے کہ ابن رشد نے اس کے پس منظر میں اس صورت حال پر بحث کی ہے۔ اس بارے میں وہ لکھتا ہے

"تمہارے لئے یہ ممکن ہے کہ ۵۴۰ھ کے بعد فرمانرواؤں اور ارکان سلطنت کے اخلاق اور ان کی عادات میں جو تغیر رونما ہوا، اسے دیکھو۔ جب وہ نظام جس کے زیر اثر ان کی نشو و نما ہوئی تھی وہ کمزور ہو گیا۔ تو طبعاً ان کے اخلاق بھی خراب ہو گئے، ان میں جو لوگ تعلیمات دینی پر کاربند تھے وہ تو اپنے اخلاق کو بحال رکھنے میں کامیاب رہے لیکن یہ ان میں بہت کم تھے"

کیا ابن رشد کی یہ رائے افلاطون کے ان اقوال سے نہیں ملتی، جو اس نے اپنی مثالی و آئیڈیل ریاست کے زوال کے بارے میں لکھے ہیں۔

ابن رشد کے سیاسی فلسفے میں دین اسلام کی بحیثیت ایک پیغام وحی ہونے کے جو مرکزی اہمیت ہے، اس کی وضاحت کے لئے ہم نے اب تک جو مثالیں دی ہیں، وہ کافی ہیں۔ اسی طرح ان مثالوں سے اس کی بھی پوری وضاحت ہوگئی ہے کہ ابن رشد نے اپنی ہم عصر اسلامی سلطنتوں پر کس جرأت سے تنقید کی ہے جو اس کے نظریات کے تحت اسلامی اساس کی ضد تھیں۔ ابن رشد کے یہ نظریات افلاطون اور ارسطو سے مستفاد تھے چنانچہ اس نے جس طرح افلاطون کے افکار اور اس کے نظام ہائے حکومت کو مرابطین اور موحدین کی سلطنتوں پر منطبق کیا ہے، وہ ہمارے اس خیال کی پوری تائید کرتا ہے[1]

---

[1] میں نے اس مقالے میں ایک عبرانی زبان میں لکھے ہوئے مسودہ سے، جو جمہوریہ افلاطون کی ابن رشد کی تصنیف کردہ شرح ہے، استفادہ کیا ہے۔ یہ عبرانی مسودہ میں نے شائع کر دیا ہے اس کا اصل عربی متن معلوم ہوتا ہے، ضائع ہوگیا ہے۔ اس عبرانی مسودے کا مترجم اسپین کے شہر مرسیلیا کا ایک یہودی ہے اور اس نے یہ ترجمہ ۱۳۲۲ء میں مکمل کیا ہے۔ اسی یہودی نے ابن رشد نے افلاطون کی کتاب الاخلاق کی جو شرح کی تھی، اس کا بھی عبرانی میں ترجمہ کیا ہے۔ (مصنف)

"ابن رشد نے یورپ کے اقلیم ذہن پر چار سو سال سے زائد عرصے تک حکمرانی کی۔ اور اطالوی نشاۃ ثانیہ کی بنیاد بھی اسی کے ہاتھوں نے رکھی۔"

ارتقائے معاشرہ کا نظریہ

عبدالوحید صدیقی

معاشرہ اور اس کے ارتقا کی علمی تحقیق کے بانی کے متعلق موجودہ دور کے مغربی ماہرین کا اختلاف ہے اس سلسلے میں ان کے تین مکاتب فکر قابل ذکر ہیں[1]

۱۔ پہلا مکتب فکر عمرانیات کے ان ماہرین کا ہے، جن کا خیال ہے کہ اگرچہ معاشرہ سے متعلق فلسفیانہ طرز کی بحثیں قدیم یونان میں شروع ہو گئی تھیں لیکن اس موضوع پر علمی استقرائی اور تجرباتی انداز سے سب سے پہلے فرانسیسی مفکر آگسٹ کامٹ (۱۷۹۸۔۱۸۵۷ء) نے بحث کی لہذا یہی مفکر بابائے عمرانیات کہلانے کا مستحق ہے۔

ارتقائے معاشرہ کے متعلق اگرچہ افلاطون (۴۲۷۔۳۴۷ ق.م) ارسطو (۳۸۴۔۳۲۲ ق.م) پالیبئیس (۲۰۳۔۱۲۱ ق.م) اور لیوکریشس (۹۹۔۵۵ ق.م) نے سب سے پہلے بحثیں کی تھیں لیکن یہ فلسفیانہ مفروضات سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی تھیں اس سلسلے میں صحیح معنوں میں علمی و سائنسی نظریہ کی ابتدا ڈارون کے نظریۂ حیاتیاتی ارتقاء ۱۸۵۹ء کے بعد ہی ممکن ہو سکی۔ چنانچہ لوئیس هینری مارگن (۱۸۱۸۔۱۸۸۱ء) اور ہربرٹ اسپنسر (۱۸۲۰۔۱۹۰۳ء) ہی دراصل معاشرتی ارتقا کے نظریہ کے پہلے

---

[1] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا ج ۲۰ مضمون سوشیولوجی ۱۹۵۹ء

سائنٹفک شارح ہیں[۱]

اس مکتب خیال میں براتھ اور سمال جیسے ماہرین شریک ہیں[۲]

۲- دوسرے مکتب فکر کے حامیوں میں ہاؤس، بارنس، بچن برگر جیسے ماہرین ہیں[۳] ان کے خیال کے مطابق عمرانیات کی ابتدا کا سہرا قدیم یونانیوں کے سر ہے۔

۳- تیسرا مکتب فکر اس علم کی ابتدا کو یونانیوں سے بھی قبل کی قدیم تہذیبوں کے علماء کا مرہون منت سمجھتا ہے۔ سوروکن، برنز، اور بوگرڈس جیسے ماہرین اس مکتب فکر کے حامی ہیں[۴]

ان تینوں مکاتیب فکر کا اگر زیادہ غور سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ تینوں دراصل ایک ہی امر کے مدعی ہیں۔ صرف الفاظ اور تعبیر کے اختلاف نے انہیں تین گروہوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ فی الحقیقت ان تینوں مکاتیب کے ماہرین میں سے کوئی بھی اس امر کا منکر نہیں ہے کہ آگسٹ کامٹ کے بعد عمرانیات نے جو صورت اختیار کی، وہی صحیح معنوں میں سائنس کی اس تعریف کے ماتحت آسکتی ہے جس کے مطابق اس مربوط و منظم علم کا نام سائنس ہے جو تجزیہ درجہ بندی، تجربیت، استقراء اور ترکیب کے فنی طریقوں سے گذر کر حاصل ہوتا ہے اور جس میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ دوسرے بھی اس کا تجزیہ کر سکیں۔ نیز یہ کہ اس کے ذریعہ آئندہ کے متعلق ایک حد تک صحیح پیشنگوئی کی جا سکے۔

واقعہ یہ ہے کہ نہ صرف بحیثیت ایک علیحدہ علمی شاخ کے عمرانیات بلکہ اس کے ماتحت آنے والے تمام مباحث بھی انیسویں صدی سے قبل کبھی سائنسی مقام حاصل نہ کر سکے تھے۔ مذکورہ بالا تین

---

[۱] بارنس، این انٹروڈکشن آف دی ہسٹری آف سوشیولوجی شکاگو ۱۹۴۸ء۔ صفحہ ۱۱۱-۱۳۸

[۲]- انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا۔ ۱۹۵۹ء۔ مضمون۔ سوشیولوجی

[۳] اور [۴] انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا۔ سوشیولوجی

مکاتب فکر میں سے دوسرا اور تیسرا مکتب جب عمرانیات کی ابتدا کا سہرا ہزاروں سال پہلے کے علماء کے سر باندھنا چاہتا ہے تو اس سے ان کی مراد محض معاشرہ کے متعلق سوچ بچار اور بحث و مباحثہ ہوتی ہے، نہ کہ سائنسی طریقے سے چھان بین۔ چنانچہ جب یونانی مفکر لیوکریشس کو نظریہ ارتقائے معاشرہ کا پہلا واضع مصنف قرار دیا جاتا ہے، تو بھی اس سے مراد اس موضوع پر اس کا صرف فلسفیانہ واستخراجی انداز گفتگو ہوتا ہے نہ کہ سائنسی مثبت طریقے سے اس نظریئے کو ثابت کرنا۔ پھر یہ کہ لیوکریشس نے کبھی بھی معاشرہ کے ارتقا کو کسی الگ اہمیت کا حامل نہ سمجھا بلکہ اس نے اسے اپنے مابعد الطبیعی نظریات کے ثبوت کے لئے پیش کیا اور پیش کرنے کا طریقہ بھی مناظرے کا اختیار کیا، جس کے متعلق ہر شخص جانتا ہے کہ اس کا تعلق حقائق سے کم اور فریق ثانی کو ساکت کرنے سے زیادہ ہوتا ہے۔ لاطینی زبان میں لکھی ہوئی اپنی کتاب "حقائق الاشیاء" (ڈی ریرم ناٹورا) کے پانچویں باب میں لیوکریشس نے قدم عالم کے قائلین کو ساکت کرنے اور حدوث عالم کو ثابت کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ اسی سلسلے میں ارتقائے معاشرہ کا تذکرہ کرتے ہوئے، اس نے تغیر کی وہ دلیل فراہم کی ہے جسے اس موضوع پر یونانیوں نے بنیادی اہمیت کا حامل قرار دیا تھا۔ لیوکریشس لکھتا ہے۔

"زمین اور آسمان کی پیدائش کی اگر کوئی گھڑی نہیں ہے اور اگر یہ ابدالآباد سے موجود ہیں تو تھیبس کی جنگ اور ٹرائے کی بربادی سے قبل شعراء نے دوسرے موضوعات پر کیوں طبع آزمائی نہیں کی ہے؟ دوسرے لوگوں کے اتنے کارنامے کہاں چلے گئے ہیں؟ ناموری کی ابدی کتاب میں کیوں ان کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے؟ میرے خیال میں حقیقت یہ ہے کہ سورج کسی قریبی تاریخ میں پیدا ہوا ہے۔ زمین کی پیدائش بھی کوئی زیادہ دور واقع نہیں ہوئی ہے۔ پھر یہ کہ اس وقت بھی کچھ ایسے فنون ہیں جن پر ترقی کا آخری رنگ چڑھایا جا رہا ہے۔ کچھ فنون ترقی کا راستہ طے کر رہے ہیں ابھی ابھی جہاز بنانے کی صنعت میں کچھ اصلاحیں کی گئی ہیں۔ ابھی کل ہی موسیقاروں نے مدھر آوازوں کو جنم دیا ہے پھر یہ بھی کہ اشیاء کے اس نظام کا بہت دیر سے انکشاف ہوا ہے۔ اور میں سب سے پہلا شخص۔ اس لائق پایا گیا ہوں کہ اس نظام کو ملکی زبان میں منتقل کر سکوں۔"

ظاہر ہے کہ لیوکریشس کے اس طریقے کو مناظرانہ و فلسفیانہ حیثیت سے زیادہ کوئی اہمیت حاصل نہیں ہے اور عمرانیات کی ابتداء کے متعلق مذکورہ بالا تینوں مکاتب فکر اس کو سائنسی اہمیت نہیں دیتے۔ ان سب کے خیال کے مطابق دراصل معاشرہ کے ارتقاء سے متعلق سب سے پہلے جس شخص نے سائنسی انداز سے جستجو کر کے نتائج اخذ کئے ہیں وہ مارگن ہے اور یہی وجہ ہے کہ اسے ارتقائے معاشرہ کی سائنسی بحث کا بانی قرار دیا گیا ہے[1]

اس سلسلے میں مشیگن یونیورسٹی کے ماہر عمرانیات لیزلی اے وہائٹ یوں رقم طراز ہیں۔

"انیسویں صدی میں معاشرتی ارتقاء کے نظریئے کو فکر عمرانی کے طور پر متعارف کرانے کا واحد ذمے دار ہربرٹ سپنسر ہے۔ لیکن معاشرتی فلاح و بہبود کے لئے اس نظریئے کا عملی استعمال سب سے پہلے امریکی ماہر عمرانیات لیویس ہنبری مارگن نے کیا۔ علوم عمرانی میں مارگن واقعی ایک بانی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس نے اپنا کام ایک ایسے دور میں شروع کیا جب کہ مسیحیت کا عقیدۂ تخلیق بغیر کسی چون و چرا کے تسلیم کیا جاتا تھا۔ کتاب پیدائش میں جو تخلیق کائنات کا تذکرہ ہے، اُسے مارگن نے جوانی میں بالکل اسی طرح تسلیم کیا تھا جیسے ڈاروِن نے اس سے قبل کیا تھا لیکن بعد میں اپنی کتاب "قدیم سماج" تحریر کرتے وقت وہ بائبل کے تخلیق آدم کے بیان کی مخالفت کرنے پر مجبور ہوا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ معاشرہ کے ارتقاء کا تصور مارگن سے پیدا نہیں ہوا۔ اس سے قبل کئی مصنفین اس تصور کو مختلف طریقوں سے زیر بحث لائے تھے لیکن مارگن ہی وہ پہلا شخص ہے جس نے اس بارے میں ایک صحت مند اور طبعی نظریہ دیا، جو کہ جدید سائنس کے تقاضے کے مطابق ہے۔

مارگن کے نظریہ کا خلاصہ مندرجہ ذیل الفاظ میں دیا جا سکتا ہے۔ "جب انسان کی مادی ضروریات

---

[1] این انٹروڈکشن آف دی ہسٹری آف سوشیولوجی شکاگو ۱۹۴۸ء - صفحہ ۱۳۸ - بارنس

کی تسکین کے لئے اس کے فنی طریقوں میں کثرت اور اصلاح ہوتی ہے تو اس کے معاشرہ و تمدن کا ہر پہلو روبہ ترقی ہوتا ہے۔"[۱]

وہائٹ، بارنس اور دوسرے ماہرین عمرانیات اس حد تک تو بالکل صحیح ہیں کہ اس نظریہ پر سب سے پہلا سائنسی مغربی محقق مارگن ہے لیکن اسے پوری دنیا تک ممتد کرنا غلط ہے۔ اس لئے کہ اگر شاہ ولی اللہ کے مباحثِ ارتفاقات کا بغور مطالعہ کیا جائے تو ان میں سائنسی انداز سے بحث کا موجود ہونا واضح طور پر سامنے آجائے گا۔ جن وجوہات کی بنا پر انیسویں صدی کے یورپی ماہرین کو معاشرتی ارتقاء کی سائنسی تعبیر کا بانی قرار دیا گیا ہے ان ہی کی بنیاد پر اٹھارویں صدی کے ہندی مفکر شاہ ولی اللہ کو اس کا بانی قرار دینا کوئی تعجب خیز امر نہ ہونا چاہیئے۔

---

[۱] وہائٹ، ایل ڈبلیو مارگن۔ پایونیران دی تھیوری آف سوشل ایولیوشن بارنس۔ ص ۱۳۸-۱۴۰

"فیلسوفِ تاریخ کی حیثیت سے ابن خلدون ہی نے اپنے "مقدمہ" میں سب سے پہلی دفعہ تاریخی ارتقاء کا نظریہ پیش کیا تھا۔ اس نظریے میں اخلاقی اور روحانی کارفرما قوتوں کے ساتھ ساتھ آب وہوا اور جغرافیہ جیسے طبعی حقائق کا بھی پوری طرح لحاظ رکھا گیا ہے ابن خلدون نے طبعی ترقی و زوال کے قوانین کی دریافت و ترتیب کے باب میں بڑی کاوشوں کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس لحاظ سے اگر تاریخ کی ماہیت اور وحدت کی دریافت کا سہرا اس کے سر باندھا جائے، تو بے جا نہ ہوگا۔

صرف یہی نہیں بلکہ وہ بلاشبہ عمرانی علوم کا بانی مبانی تھا۔ نیز اس کو سیاسی معاشیات کا موسس کہنا بھی بالکل حق بجانب ہوگا۔"

سندھ کے سہروردی مشائخ

میمن عبدالمجید سندھی۔ لیکچرر اسلامیہ کالج سکھر

عبدالحمید سہروردی ۔ روہڑی کے جنوب میں، دریائے سندھ کے کنارے پر "ستین جو تھان" کے نام سے ایک پُر فضا مقام ہے۔ اس کے متعلق مختلف روایات مشہور ہیں۔ بکھر کے گورنر میر ابوالقاسم نمکین (وفات ۱۰۱۸ھ) نے اس شہر کو موجودہ شکل دی تھی اور "صفۂ صفا" نام رکھا۔ موسم گرما کی راتوں میں وہ اس پُر فضا مقام پر بیٹھ کر مجالس شعر و سخن منعقد کرتے تھے۔

آخر میں میر نمکین کو ان کی وصیت کے مطابق دفن بھی یہیں کیا گیا۔ آج وہاں جو قبریں موجود ہیں، وہ میر نمکین اور ان کی اولاد کی ہیں۔

سید محب اللہ شاہ نے اپنی کتاب تاریخ البلاد والقصبات میں لکھا ہے کہ جب ۴۱۹ھ میں سلطان محمود غزنوی کا تسلط سندھ پر ہوا تو سات یا نو عارفوں نے اسی جگہ پر چلہ کشی کی۔ فاضل مورخ نے ان میں سے کچھ عارفوں کے نام بھی دیئے ہیں جو درج ذیل ہیں۔

۱۔ عبدالحمید سہروردی۔ ۲۔ عبداللہ جریری۔ ۳۔ حمزہ بن رفیع۔ ۴۔ علی بن احمد ۵۔ حمزہ بن رفیع ۶۔ صفی الدین شیرازی۔ ۷۔ ابوالحسن خرقانی۔ ان بزرگوں کے جانے کے بعد لوگ اس جگہ کو متبرک

۱؎ اس سلسلے کا پہلا مضمون مارچ ۱۹۶۴ء میں ملاحظہ ہو۔

۲؎ بحوالہ محترم عطا محمد حامی" کا مضمون شائع شدہ روزنامہ "مہران" مورخہ ۱۲ اپریل ۱۹۵۸ء

سمجھ کر وہاں آکر نفل پڑھتے تھے اور دعائیں مانگتے تھے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی زمانے میں عبدالحمید کے نام سے ایک سہروردی بزرگ سندھ میں آئے تھے؛ لیکن آپ کے متعلق زیادہ کچھ بھی معلوم نہیں ہوتا۔

شیخ خضر سیوستانی:۔ شیخ خضر کے نام سے دو بزرگ سیوھن میں گذرے ہیں ایک شیخ خضر مشہور قادری بزرگ تھے، جو میاں میر لاہوری سیوستانی کے مرشد تھے آپ نے ۹۹۴ھ میں وفات پائی دوسرے شیخ خضر، شیخ موسیٰ کے اولاد میں سے تھے۔ شیخ موسیٰ، ابوالفضل اور فیضی کے جدِ اعلیٰ تھے اور نویں صدی ہجری میں سیوھن میں آکر آباد ہوئے ان کی اولاد میں سے شیخ خضر دسویں صدی ہجری میں گذرے ہیں سیر و سفر کے دوران وہ ناگور میں پہنچے اور مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے جانشین شیخ بخاری اوچی کے مرید ہوئے۔ اس کے بعد وہاں ناگور میں ہی شیخ عبدالرزاق قادری اور شیخ یوسف سندھی سے بھی بیعت کی سیر و سفر کے بعد وہ واپس سیوھن میں آئے اور ۹۱۱ھ میں آپ کے فرزند شیخ مبارک تولد ہوئے[1] ابوالفضل اور فیضی شیخ مبارک کے فرزند ہیں۔ شیخ خضر کی وفات کی تاریخ معلوم نہیں۔ شیخ بخاری اوچی کے مرید ہونے کی وجہ سے ہم انہیں سہروردی بزرگوں میں شمار کرتے ہیں۔

شیخ فاضل قریشی۔ شیخ فاضل قریشی، حضرت بہاؤالدین زکریا ملتانی کی اولاد میں سے تھے۔ آپ گیارہویں صدی ہجری کے شروع میں سندھ میں آئے اور "بکیرا" نامی ایک گاؤں میں متوطن ہوگئے، جو نصرپور سے تین کوس پر ہے۔ آپ کامل بزرگ ہونے کے علاوہ دنیاوی کاروبار میں بھی ذی اثر تھے۔ نہر "پران" کے کنارے "بر آمری" نامی ایک گاؤں تھا، جہاں حضرت غوث بہاؤالدین زکریا ملتانی کی یادگار ایک درخت تھا اور قدیم الایام سے وہاں اس سلسلے کے فقیروں کا میلہ لگتا تھا۔ بعد میں اس جگہ پر حضرت مخدوم نوح کے مریدوں کا قبضہ ہوگیا تھا۔

---

[1] تحفۃ الکرام ج ۳- ص ۱۴۳

شیخ فاضل نے کوشش کر کے اس کا قبضہ حاصل کیا اور میلہ لگوانا شروع کیا۔[۱]

شیخ شہر اللہ۔ یہ بزرگ بھی حضرت بہاؤالدین ملتانی کے اولاد میں سے تھے آپ شیخ فاضل کے زمانے میں ہی سندھ میں آئے۔ شیخ فاضل نے آپ کو داماد بنایا اور اپنا جانشین بھی منتخب کیا، کیونکہ شیخ فاضل کی نرینہ اولاد نہیں تھی۔ شیخ شہر اللہ کے دو فرزند ہوئے۔ ۱۔ شاہ سراج الدین۔ ۲۔ شاہ قائم الدین۔ قائم الدین شاہ کے ہاں اولاد نہیں ہوئی[۲]

شاہ سراج الدین شیخ شہر اللہ کے بعد آپ کے فرزند شاہ سراج الدین سجادہ نشین ہوئے۔ آپ نے پیری مریدی کا سلسلہ وسیع کیا اور شاہی دربار میں اثر و رسوخ حاصل کیا اس زمانے میں شاہ عنایت صوفی جھوک میراں پور والے کی شہادت واقع ہوئی۔ یہ فرخ سیر کا زمانہ تھا اور سندھ پر کلہوڑا حکمران تھے۔ کلہوڑوں کے ساتھ کچھ زمینداروں اور سجادہ نشینوں نے بھی شاہ شہید کی مخالفت میں کام کیا۔ شاہ سراج الدین ان دنوں دہلی تھے اور وہ شاہی دربار میں اس مسئلے کو لانے کے اولین محرک بنے۔ آخر بادشاہ کے حکم سے مغلیہ نواب نے ۱۱۳۰ھ میں شاہ شہید کو شہید کروایا۔ شاہ سراج الدین کو دو فرزند ہوئے۔ ۱۔ فاضل شاہ۔ ۲۔ مہر شاہ۔ پہلے فاضل شاہ مسند نشین ہوئے اور بعد میں آپ کے بھائی مہر شاہ سجادہ پر بیٹھے۔ اب بکیرٹنڈو الہیار میں واقع ہے اور ہر سال فاضل شاہ کے مزار پر عرس ہوتا ہے۔ شیخ شہر اللہ کی اولاد اب "غوث پوٹہ" کے لقب سے مشہور ہے اور پیری مریدی کا سلسلہ جاری ہے۔

شیخ بھرکیہ کا تیار۔ کاتیار سندھ کے ساداتی پرگنہ کا قدیم گاؤں ہے۔ وہاں شیخ بھرکیہ ابن شاہو سندھ کے مشہور مجذوب گذرے ہیں۔ آپ مخدوم اسحاق بھٹی ہالائی کے فرزندان مخدوم احمد اور مخدوم محمد کے ہم عصر تھے۔ یہ زمانہ جام نظام الدین سمہ کی حکومت کا تھا۔ حضرت شیخ صاحب نے ابتدا میں سخت ریاضتیں اور مجاہدے کئے۔ سردی اور گرمی میں صرف

---

[۱] تحفۃ الکرام ص ۱۵۹ [۲] ایضاً

ایک چادر بدن پر اوڑھے رہتے تھے۔ اکثر دریائے سندھ کے کنارے بسر کرتے تھے اور غسل کرکے اور چادر تر کرکے نماز میں مشغول ہو جاتے تھے۔ پھر جب چادر خشک ہو جاتی تھی تو پھر سے غسل کرکے اور چادر تر کرکے نماز پڑھنے لگتے تھے۔ تمام عمر اس طرح دشت پیمائی اور چلہ کشی کرتے رہے ایک مرتبہ ملتان گئے اور حضرت غوث بہاؤ الحق زکریا ملتانی کے سجادہ نشین سے بیعت ہوئے تحفتہ الکرام میں آپ کی زبانی ایک روایت بیان کی گئی ہے کہ ایک مرتبہ میں خدائی نور کے دیدار میں محو تھا کہ غیب سے آواز آئی "اے بھرکیہ! غلام بننا چاہتے ہو؟" میں نے کہا "نہیں" پھر آواز آئی "نوکر بنوگے" میں نے پھر بھی انکار کیا۔ اس طرح تین مرتبہ آواز آئی اور میں انکار کرتا رہا۔ آخر میں آواز آئی کہ اگر غلام اور نوکر بننا نہیں چاہتے ہو تو پھر تم ہی بتلاؤ کہ کیا بننا چاہتے ہو؟ میں نے جواب دیا "خداوندا! میں کچھ بھی نہیں ہوں اور کچھ بھی بننا نہیں چاہتا۔ پھر غیب سے میری پیٹھ پر ہاتھ پھیرا گیا اور ارشاد ہوا۔ خداوند تعالےٰ نے تیری معرفت قبول فرمائی۔

شاہ عبدالکریم بلڑی والے کے ملفوظات بیان العارفین میں آیا ہے کہ سردی کی راتوں میں متواتر غسل کرکے نمازیں پڑھنے اور موسم گرما میں لق ودق صحرا میں نوافل پڑھنے سے، آپ کے بدن کی کھال اتر گئی تھی۔ آپ کی ولادت اور وفات کی تاریخیں معلوم نہیں ہوئیں۔ لیکن تحفتہ الکرام سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ مخدوم محمد اور مخدوم احمد کے ہم عصر تھے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نویں صدی کے آخر اور دسویں صدی کے شروع میں گذرے ہیں۔

مخدوم نوراللہ۔ عرف نورنگ، سومرہ خاندان سے تھے اور سرزمین جونؔ کے تعلقہ بھٹی کے گاؤں

لہ قدیم زمانے میں "ھاکڑو" نامی ایک علیحدہ دریا تھا، جو ہمالیہ سے نکل کر سمندر سے جاکر ملتا تھا اور مشرقی پنجاب، شمالی راجپوتانہ اور تھر کو آباد کرتا تھا۔ اس کے آثار اب تک موجود ہیں۔ گو کہ یہ قدیم زمانے میں خشک ہوگیا تھا۔ لیکن پھر بھی اس کی بہت سی نہروں کو دریائے سندھ سے پانی ملتا رہا۔ ان نہروں میں سے "پران" "رین" اور "سانگڑھ" کے نام قابل ذکر ہیں۔ (باقی حاشیہ صفحہ ۶۴ پر)

ڈریاٹو کے رہنے والے تھے۔ ملتان کے سہروردیہ خانقاہ کی طرف سے لاڑ (سندھ کا نشیبی حصہ) کے لئے خلیفہ تھے۔ آپ کا زمانہ دسویں صدی ہجری ہے۔ آپ کا مقبرہ ٹنڈو غلام حیدر میں ہے اور آپ کی اولاد اب "نورنگ پوٹہ" کہلاتی ہے۔ آپ کی وفات کے بعد آپ کے فرزند مخدوم عبدالمجید سجادہ نشین ہوئے جو اپنے وقت کے متبحر عالم اور عارف کامل تھے۔ اس کے بعد ان کے فرزند مخدوم اسحاق سجادہ نشین ہوئے، جو وقت کے مشہور عالم ہو گذرے ہیں۔ مخدوم رحمت اللہ ٹھٹوی آپ کے پوتے تھے جن کا احوال بعد میں آئے گا۔ اس خاندان میں شعر و شاعری کا شوق بھی رہا ہے۔

(بقیہ حاشیہ) ان نہروں میں کلہوڑوں کے زمانے تک کسی قدر پانی موجود تھا۔ نہر "رین" کے کنارے پر "جون" اور "فتح گڑھ" نامی عالیشان شہر موجود تھے، جو باغات اور سرسبزی کے لئے مشہور تھے۔ "جون" باغات کے علاوہ تجارت اور ثقافت کا بھی مرکز تھا۔ بڑے بڑے تجار دور دور سے یہاں آتے تھے معزول شہنشاہ ہمایوں نے سندھ سے گذرتے ہوئے جون کے باغ "باغ آئینہ" میں قیام کیا تھا اور اس جگہ کو بہت پسند کیا تھا۔ ہمایوں کی ہمشیرہ گلبدن بیگم نے "ہمایوں نامہ" میں یہاں کے باغات کی بہت تعریف کی ہے۔ ۱۸ صدی عیسوی میں مددخاں پٹھان کی شورش کے دوران یہ شہر ویران ہوئے۔ "جون" شہر کے علاوہ پرگنہ بھی تھا۔

"بھکر ایک خوبصورت شہر ہے۔ دریائے سندھ کی ایک شاخ اس کے درمیان سے گذرتی ہے۔ شاخ کے وسط میں ایک خوبصورت زاویہ ہے، جہاں ہر آنے والے کو کھانا ملتا ہے اسے کشلو خاں نے تعمیر کیا تھا۔ یہاں میری ملاقات امام عبداللہ حنفی اور شمس الدین محمد شیرازی سے ہوئی، جن کی عمر ان کے بیان کے مطابق ایک سو بیس برس تھی۔

(سفرنامہ ابن بطوطہ)

سلطنت مغلیہ کا زوال اور شاہ ولی اللہ

پروفیسر فسری لینڈ ایبوٹ

آخری عظیم مغل فرمانروا اورنگ زیب کی سلطنت بہت حد تک گزشتہ شوکت و عظمت کی آئینہ دار تھی، لیکن اس کے جانشینوں کی حکومت تو محض اس سلطنت کا ایک سایہ تھا، اورنگ زیب کے بیٹے بہادر شاہ کو راجپوتوں، مرہٹوں اور سکھوں کی مسلسل بغاوتوں سے دو چار ہونا پڑا۔ اس کا جانشین جہاندار شاہ عیش و عشرت میں پڑ گیا۔ اور ایک سال بھی نہیں گزرا تھا کہ اسے مار ڈالا گیا۔ اسی زمانے میں دربار شاہی تورانیوں اور ایرانیوں کی باہمی چپقلش کا رزم گاہ بن گیا۔ اور دکن، بنگال اور اودھ کے صوبےدار نیم خود مختار ہو گئے، مرہٹوں کو موقع ملا، اور انہوں نے شمالی ہند کا رخ کیا۔ اس اثنا میں ایران سے نادر شاہ ہندوستان پر حملہ آور ہوا، اور بے شمار دولت، زر و جواہر لوٹ کرلے گیا۔ اس کے بیس سال بعد مرہٹے دہلی پر قابض ہو گئے، لیکن چار سال نہیں گزرے تھے کہ پانی پت کی تیسری جنگ میں احمد شاہ ابدالی نے مرہٹوں کو شکست فاش دی اور شمالی ہند میں ہمیشہ کے لئے مرہٹوں کا زور ٹوٹ گیا لیکن اس کامیابی کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا، اور احمد شاہ ابدالی واپس افغانستان چلا گیا۔

لے اصل مضمون انگریزی میں امریکہ کے مشہور رسالے "دی مسلم ورلڈ" میں چھپا ہے۔ اس کے لکھنے والے امریکہ کی ہٹفنس یونیورسٹی، ہیڈ فورڈ، میساچوسٹس، میں پروفیسر ہیں۔ اور پاکستان میں کچھ عرصہ رہ چکے ہیں یہاں اس مضمون کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔ (مدیر)

بابر نے ۱۵۲۶ء میں اور اکبر نے ۱۵۵۶ء میں اسی پانی پت میں فتح حاصل کر کے اپنی اپنی سلطنتوں کی بنیاد رکھی تھی۔ اگرچہ ۱۷۶۱ء میں پانی پت کی اس تیسری جنگ میں مسلمانوں کی فوجوں کو فتح ہوئی تھی۔ لیکن یہی وہ وقت تھا، جب کہ ایک زندہ طاقت کی حیثیت سے مغل سلطنت ختم ہو گئی۔ یہ سلطنت گو برائے نام بعد بھی قائم رہی، لیکن مسلمان اور ہندو دونوں نڈھال ہو چکے تھے چنانچہ اس سے ایک تیسری طاقت انگلستان نے فائدہ اٹھایا اور وہ اٹھارھویں صدی کے وسط سے دونوں پر غالب آنے لگی قدرتاً مغل سلطنت کے اس دردناک انجام نے ان راسخ العقیدہ مسلمانوں کو جو قسمت پر قانع ہونے کو تیار نہ تھے، سوچنے پر مجبور کر دیا۔ اس ضمن میں زیادہ تشویش ناک بات یہ تھی کہ یہ زوال اورنگ زیب کے فوراً بعد، بلکہ اس کے آخری زمانے ہی میں یک بارگی شروع ہو گیا تھا۔ اور یہ اورنگ زیب وہی تھا جسے راسخ العقیدہ مسلمان مغل فرمانرواؤں میں سب سے اچھا مسلمان سمجھتے تھے۔ سلطنت کے اس زوال سے ایک بار پھر وہ سوالات ابھرے، جو کم سے کم چودھویں صدی عیسوی سے ہندوستانی مسلمانوں کو پریشان کئے ہوئے تھے۔ اور انہوں نے اس برصغیر میں دوسرا بڑا عالم دین پیدا کیا، جس کی راسخ العقیدگی ہر شک و شبہ سے بالا تھی لیکن اس کے ساتھ ہی، ان حالات کے مطالعہ کی وجہ سے جن میں اسے زندگی گزارنی پڑی، اس نے ان چیزوں پر زیادہ زور نہیں دیا، جن پر اس کے پیش رو علمائے دین دیتے تھے۔

احمد بن عبدالرحیم المعروف شاہ ولی اللہ اورنگ زیب کی موت سے چار سال پہلے پیدا ہوئے اور پانی پت کی تیسری جنگ کے بعد کے سال میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کی زندگی اس دور میں گزری جب سلطنت اور اس کے ساتھ مسلم معاشرہ بڑی سرعت سے زوال پذیر تھا۔ شاہ ولی اللہ کی یہ کوشش تھی کہ انہیں کوئی ایسا راستہ مل جائے جس پر چل کر مسلم معاشرہ از سر نو مضبوط ہو جائے، اور جیسا کہ ایک عالم دین سمجھتا ہے وہ اسلام کے اصولوں سے پھر ایک بار ہم آہنگ ہو۔

شاہ ولی اللہ کے والد صوفی بھی تھے اور عالم دین بھی۔ ایک وقت میں وہ فتاویٰ عالمگیری کی تدوین سے منسلک ہوئے، لیکن جلد ہی اس سے الگ ہو گئے۔ اور انہوں نے اپنا مدرسہ قائم

کیا۔ جہاں وہ ایسی تعلیم دیتے تھے جس سے صوفیاء اور راسخ العقیدہ علماء ایک دوسرے سے قریب ہو سکیں۔ ان کے بعد ان کے نامور فرزند بھی اسی راہ پر چلے۔

شاہ ولی اللہ سترہ سال کے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ اور وہ ان کی جگہ درس دینے لگے ۱۷۳۰ء میں وہ حج کو گئے اور ۱۷۳۲ء میں لوٹے، اور اس کے بعد تیس سال تک ان کی باقی زندگی تمام تر اسلامی علوم کے مطالعے، زوال آمادہ سلطنت کے دفاع اور تصنیف وتالیف کے لئے وقف رہی

شاہ ولی اللہ کی شخصیت قرون وسطیٰ اور دور جدید کی درمیان کی کڑی ہے، جیسے کہ یورپ میں دانتے تھا۔ آج کے پاکستان میں تمام گروہ، خواہ وہ اسلام کے بنیادی اصولوں کے سختی سے پابند ہوں یا نہ ہوں، شاہ ولی اللہ سے ذہنی انتساب کے مدعی ہیں لیکن یہ یاد رہے کہ شاہ ولی اللہ مذہبی عقائد میں جدت پسند (ماڈرنسٹ) نہیں ہیں۔ البتہ انہوں نے اپنے دور کے پریشان کن حالات کا جس طرح تجزیہ کیا اور اس سے وہ جس نتیجے پر پہنچے، بعد میں آنے والے جدت پسندوں نے اسے اپنے ڈھب پر ڈھال لیا۔ جہاں تک شاہ ولی اللہ کا تعلق ہے مذہب میں ان کا نقطہ نظر حقیقی طور پر راسخ العقیدگی کا حامل ہے۔ اور وہ ہندوستان کے پہلے عظیم عالم دین یعنی شیخ احمد سرہندی کے نقطہ نظر سے جنہوں نے کہ اکبر کی اس عجیب وغریب کوشش کی کہ وہ سیاسی مقاصد کے لئے مختلف مذاہب کا ملا جلا ایک عقیدہ ترتیب دے، سخت مخالفت کی تھی زیادہ مختلف نہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ شاہ ولی اللہ اور شیخ احمد سرہندی دونوں صوفیاء کے نقشبندی طریقے سے منسلک ہیں، لیکن دونوں میں فرق اتنا ہے کہ آخر الذکر اس دور میں تھے، جب اسلامی سلطنت اپنے عروج کی طرف گامزن تھی۔ اور شاہ ولی اللہ کا وہ دور ہے، جب یہ سلطنت اپنی انتہائی پستی کی قریب تھی، بہر حال ہر دو کے سامنے ایک ہی سوال تھا۔ اور دونوں اسی سے عہدہ برآ ہونے میں کوشاں رہے۔ اور وہ یہ کہ اسلام کو کیسے تقویت دی جا سکتی ہے۔ البتہ معلوم ہوتا ہے کہ شاہ ولی اللہ کا ذہن زیادہ دور رس تھا اور انہوں نے اسلام کے فعال اور حرکت آفریں کردار کو زیادہ عمیق تجزیے کے ذریعہ، یا اسے یوں کہہ لیجئے، کم عربیت کے زیر اثر سمجھنے کی کوشش کی ہے۔

شاہ ولی اللہ کی صحیح ترین تعریف یوں ہو سکتی ہے کہ وہ ایک انقلابی عالم دین تھے۔ وہ جس دور میں تھے، وہ دور ایک انقلاب کے لئے بے تاب تھا۔ انہوں نے بڑی مستقل مزاجی سے اور مسلسل خطوط اور رسائل کے ذریعہ اس امر کی نشان دہی کی کہ ان کے معاشرے میں کیا خرابیاں ہیں اور بتایا کہ ان کی کیسے اصلاح ہو سکتی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر مسلمانوں کی طاقت کو اس سرزمین میں بحال کرنا ہے، تو اس کے لئے ایک زبردست اقدام کی ضرورت ہے۔ چنانچہ وہ ساری عمر اس مقصد کی تکمیل کے لئے سرگرم کار رہے۔ ہو سکتا ہے کہ پانی پت کے معرکے کے وقوع پذیر ہونے میں ان کے قلم کا بھی دخل ہو۔ اس سلسلے میں انہوں نے احمد شاہ ابدالی کو ایک خط لکھا تھا۔ یہ اقدام دراصل ایک کوشش تھی مسلمانوں کو قبل اس کے کہ ان میں نئی زندگی پیدا ہو، تباہی سے بچانے کی۔ لیکن اس سے بھی کہیں زیادہ اہم شاہ ولی اللہ کے وہ افکار و خیالات ہیں، جو انہوں نے مسلمانوں میں نئی زندگی پیدا کرنے کے سلسلے میں پیش کئے۔

ایک مخلص اور متقی عالم دین کی نظر میں ہندوستان کے مسلمانوں کے مسئلے کا ایک ہی حل تھا، اور وہ یہ کہ خلافت راشدہ جیسے نظام کو بروئے کار لایا جائے۔ شاہ ولی اللہ کے نزدیک مسلمانوں کے زوال کا ایک بہت بڑا سبب یہ تھا کہ ان کے ہاں خلافت راشدہ کے بعد بادشاہت آگئی۔ اور بادشاہ خواہ اہل ہوتا یا نا اہل، مسلمان اس کے سامنے سرنگوں ہونے لگے۔ اس سلسلے میں وہ یہ چاہتے تھے کہ وہ زمانہ جب مسلمان سرتاپا ایمان تھے اور ان میں اتحاد عمل تھا، اُس زمانے کے سماجی اور سیاسی نظام میں جو روح کارفرما تھی، اسے از سرنو زندہ کیا جائے۔ شاہ ولی اللہ سمجھتے تھے کہ خلافت راشدہ کے زمانے میں جو حالات تھے، ان کی طرف بجنسہ لوٹنا اب ممکن نہیں۔ اسلام کے متعلق ان کا تصور ایک خالص عالمگیر مذہب کا ہے۔ اگرچہ اسے دنیا کے سامنے عربی شکل میں پیش کیا گیا ہے اس سلسلے میں ان کی دلیل یہ ہے کہ کوئی بھی مذہبی روایت خلا میں ظہور پذیر نہیں ہو سکتی۔ اب اگر ایک مذہب ایک خاص ثقافتی قالب میں جو مذہب اسلام کے معاملے میں عربیت ہے پیش کیا گیا ہے، تو اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ ہمیشہ کے لئے عربی مراسم و طریقہ ہائے کار کا پابند کر دیا گیا ہے۔

ایک خالص مذہب نہ صرف مختلف ثقافتوں میں مختلف صورتوں میں پیش کیا جائے گا۔ بلکہ ایک ہی ثقافت کے مختلف ادوار میں اس کی مختلف صورتیں ہوں گی۔ لیکن اس ضمن میں سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ مذہب سے اس کے خالص حصے کو ان اجزا سے جو محض اس کے ثقافتی قالب اور سانچے ہیں، کیسے منتخب کیا جائے۔ گو شاہ ولی اللہ اس کا کوئی جواب نہیں دیتے لیکن انہوں نے یہ سوال اٹھا کر (اگرچہ ان سے پہلے حنفی مکتب فکر میں، بلکہ اس سے بھی پہلے شیعہ سنی اختلاف کے سلسلے میں یہ سوال اٹھایا جا چکا ہے) قریب قریب لا محدود نظریات و قیاسات کے دروازے کھول دیئے۔ مخصوص عربی ثقافتی قالب کی حدود سے باہر اسلامی خیالات و افکار کی نشر و اشاعت کے لیے شاہ ولی اللہ نے قرآن مجید کا عربی سے فارسی میں ترجمہ کیا۔ ہندوستان میں اس وقت بہت کم مسلمان عربی جانتے تھے، لیکن فارسی ان کے اونچے طبقے کی زبان تھی۔ ان کے اس اقدام سے گو بہت سے قدامت پسند علماء ناراض ہوئے (وہ کلام اللہ کے معاملے میں کسی قسم کی تبدیلی کے خواہ وہ ترجمہ ہی کیوں نہ ہو، عقیدۃً خلاف تھے) لیکن ان کا یہ اقدام بہت مقبول ہوا۔ بعد ازاں شاہ ولی اللہ کے دو صاحبزادوں نے قرآن کا اردو جیسی نئی زبان میں ترجمہ کیا، جو مغل سلطنت کے زوال کے ساتھ ساتھ بڑی سرعت سے فارسی کی جگہ لے رہی تھی۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ شاہ ولی اللہ کے اس اقدام سے، جس نے بے شک بعد والوں کے لئے راستہ صاف کر دیا، قرآن مجید کے عام لوگوں کی زبان میں یہ ترجمے کہیں زیادہ انقلابی اقدام تھے۔

شاہ ولی اللہ کے نزدیک ان کے معاشرے کے انحطاط کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اس میں حد سے زیادہ اسراف پھیل چکا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر یہاں صحیح اسلامی روایات دوبارہ مروج ہوں، تو اس بات کا بہت زیادہ یقین ہے۔ کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے ہاتھ سے طاقت اور اقتدار جو جا رہا ہے وہ بحال ہو سکے۔ شاہ ولی اللہ مسلم معاشرے کو مضبوط کر کے مذہب اسلام کو مضبوط کرنا چاہتے تھے یہ ان کا بنیادی مقصد تھا۔ کیونکہ اگر مذہب و عقیدہ مضبوط ہو گا، تو لازماً ملت بھی مضبوط ہو گی۔ اب مسلم معاشرے کو مضبوط بنانے کے لئے ضرورت تھی کہ وہ ہندوانہ رسمیں جنہیں برصغیر کے مسلمانوں نے

اختیار کر لیا تھا، انہیں ختم کیا جائے، چنانچہ شاہ ولی اللہ نے ان کے خلاف لکھا اور بتایا کہ اسلام کے عہد اول میں ان کا کہیں وجود نہ تھا۔ خاص طور سے انہوں نے مسرفانہ رسوم کی سخت مخالفت کی اس ضمن میں شاہ ولی اللہ کی خاص بات یہ ہے کہ وہ ان رسموں کی اس لئے مخالفت نہیں کرتے کہ وہ ہندوانہ ہیں بلکہ اس لئے مخالفت کرتے ہیں کہ وہ غیر اسلامی ہیں۔ اس بارے میں ان کے ہاں محرک جذبہ وہ تعصب (Bigotry) نہیں، جو شیخ احمد سرہندی کے ہاں پایا جاتا ہے اپنی ممتاز ترین انسائیکلوپیڈیا جیسی تصنیف حجۃ اللہ البالغہ میں وہ رومی و ایرانی سلطنتوں کے زوال کے اسباب گناتے ہوئے لکھتے ہیں کہ انہیں دہرانے کی چنداں ضرورت نہیں، تم اپنے شہر کے فرمانرواؤں کی زندگیاں دیکھ سکتے ہو۔

شاہ ولی اللہ نے یہ بھی دیکھا کہ معاشرے کے ضعف کا باعث صرف اسراف اور ہندوانہ رسمیں ہی نہیں، بلکہ مسلمان خود آپس میں بھی بٹے ہوئے ہیں۔ اور ان میں حقیقی اتحاد نہیں۔ ایک طرف صوفیہ کے چاروں طریقے ایک دوسرے کا بہت کم پاس کرتے ہیں پھر ان میں اور راسخ العقیدہ گروہ میں مسلسل آویزش ہے۔ اور جہاں تک مسلمانوں کے راسخ العقیدہ گروہ کا تعلق ہے، اس کی صوفیہ اور شیعہ دونوں سے ٹھنی ہوئی ہے۔ شاہ ولی اللہ مسلمانوں کے ان مختلف فرقوں کے اتحاد کے لئے اسلام کے دور اول کو اساس بناتے ہیں جب کہ نہ صوفی اتنی اہمیت رکھتے تھے اور نہ سنی شیعہ اختلاف تھا۔ شاہ ولی اللہ میں جو علمی شان ہے، وہ برابر توازن و اعتدال پر زور دیتی ہے۔ چنانچہ یہی وہ چیز ہے جس پر وہ بار بار زور دیتے ہیں۔ وہ بڑی شد و مد سے اس امر کی صراحت کرتے ہیں کہ زندگی کے تمام شعبوں میں عدل و انصاف کی شکل میں یہ توازن و اعتدال موجود ہے۔ شاہ ولی اللہ کبھی بھی شیخ احمد سرہندی یا اپنے ہم عصر مصلح عرب محمد ابن عبدالوہاب کی طرح ایسے خالص انقلابی نہیں ہوئے کہ جن کی نظروں میں یا تو چیزیں بالکل سیاہ ہوتی ہیں، یا بالکل سفید۔

مفاہمت اور مصالحت شاہ ولی اللہ کا خصوصی امتیاز ہے۔ لیکن جہاں تک سیاسی تخریب کے ان عناصر سے نمٹنے کا سوال ہے، جو اسلام کے لئے خطرہ بن گئے تھے جیسا کہ جوش میں آئے ہوئے مرہٹے

جاٹ اور سکھ، وہ البتہ اس سے مستثنیٰ تھے ایک اور مسئلہ تھا جو صوفیہ اور راسخ العقیدہ گروہ میں بہت عرصے سے مابہ النزاع تھا۔ اور جس کے بارے میں شیخ احمد سرہندی کا دعویٰ تھا کہ انہوں نے اسے موثر طریقے سے حل کر دیا۔ ان کے نزدیک صوفیہ کی یہ غلطی تھی کہ انہوں نے وجود کی وحدت کا اثبات کیا اور یہ کہ یہ سب وہم تھا۔ اس کے برعکس شیخ احمد سرہندی کا کہنا تھا خالق اور مخلوق، دونوں کے الگ الگ وجود ہیں۔ لیکن بعض صوفیہ کو اس رائے سے اتفاق نہ تھا۔ اور دونوں گروہوں میں یہ نزاع جاری تھا۔ شاہ ولی اللہ نے اسے یوں حل کیا کہ دونوں فریق اپنی اپنی جگہ راہ راست پر ہیں۔ ساری بات یہ ہے کہ اس مسئلے کو دیکھنے والے کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ دونوں نقطہ ہائے نظر صحیح مکاشفے پر مبنی ہیں اور شیخ احمد سرہندی نے جو کچھ کہا ہے، وہ درحقیقت ابن عربی ہی کی تائید ہے۔ شاہ ولی اللہ کے الفاظ میں "اگر حقائقِ واقعی پر استعاروں اور تشبیہوں کو نظر انداز کر کے غور کیا جائے، تو دونوں نقطہ ہائے نظر کا نتیجہ ایک ہی نکلتا ہے" اس بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ شاہ ولی اللہ نے دراصل وحدت الوجود اور وحدت الشہود کی یہ جو تعبیر کی ہے، اس سے راسخ العقیدہ اسلام کو ایک فلسفیانہ و متصوفانہ اساس مل گیا ہے۔

شاہ ولی اللہ نے صرف صوفیہ اور راسخ العقیدہ گروہ کے نزاع کو ختم کرنے کی کوشش نہیں کی، بلکہ خود صوفیہ میں جو نزاع تھا، اسے بھی ختم کرنا چاہا۔ انہوں نے اپنے ہاں چاروں طریقوں کی بیعت لینے کا سلسلہ شروع کیا جو اب تک مدرسہ دیوبند نے ان کے زیر اثر قائم رکھا ہے۔ ان کے مصالحت پسند مسلک کی ایک اور مثال یہ ہے کہ وہ اپنے دور کے راسخ العقیدہ لوگوں کے معمول کے خلاف اس پر مصر نہیں تھے کہ شیعہ مسلمان نہیں۔

شاہ ولی اللہ کی رائے میں مسرفانہ زندگی اور داخلی نزاعات کے علاوہ ایک اور چیز جو مسلم معاشرے کی تباہی کا باعث بنی، وہ فقہی امور میں ان کی اندھی تقلید تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ ایک صحت مند معاشرے کے لئے ارتقاء اور تبدیلی لازمی ہے۔ اور چار مذاہب فقہ میں سے کسی ایک مذہب کی اندھی تقلید سے مسلم معاشرے کو کوئی تقویت نہیں ملی

اس معاملے میں شاہ ولی اللہ شیخ احمد سرہندی اور شیخ ابن عبدالوہاب سے، جو ان کی طرح اندھی تقلید کو اسلام کی کمزوری کا باعث سمجھتے تھے، اختلاف نہیں رکھتے۔ برصغیر کے مسلمانوں پر شاہ ولی اللہ کے ان خیالات کا شاید سب سے زیادہ اثر پڑا ہے، جن میں کہ انہوں نے اجتہاد کی ضرورت پر زور دیا ہے۔

بحیثیت مجموعی شاہ ولی اللہ کے افکار و آرا کے بارے میں سب سے نمایاں چیز یہ ہے کہ اگرچہ وہ پورے کے پورے عالم دین تھے، لیکن اس کے باوجود انہوں نے معاشرے کو عمرانی نظر سے دیکھا اور سمجھا۔ ان کا کہنا ہے کہ ضروری نہیں کہ مذہبی احکام کی محض اس لئے تعمیل ہو کہ وہ اصلاً اللہ کی طرف سے ہیں بلکہ اس لئے بھی ان کی تعمیل ہونی چاہیئے کہ ان سے افراد اور معاشرہ دونوں کو فائدہ پہنچتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اسلام کے احکام صرف ثواب و عذاب کا معیار نہیں ہیں، بلکہ ان کا مقصد معاشرتی بھی ہوتا ہے کہ ان سے معاشرے کو اور افراد کو، جن سے کہ معاشرہ عبارت ہے، فائدہ پہنچے۔ اس نقطہ نظر میں کوئی چیز غیر اسلامی نہیں۔ بے شک چار سو سال پہلے مشہور مورخ ابن خلدون بھی یہی بات لکھ چکے ہیں اب اگر مذہب تمام چیزوں پر حاوی ہے، جیسا کہ اسلام تعلیم دیتا ہے تو یقیناً اسے معاشرے پر بھی حاوی ہونا ہوگا۔

شاہ ولی اللہ کی ایک عالم دین اور ایک نیک و متقی مسلمان ہونے کی جو زبردست شہرت تھی اور اس کے ساتھ انہوں نے جو اسلام کے اس عمرانی و معاشرتی پہلو پر زور دیا اس کی بنا پر انہوں نے ایک ایسا غیر دینیاتی اساس بہم کر دیا ہے، جس پر بعد میں آنے والے ارباب فکر جو خالصاً دینیاتی ذہنی فضا سے دور ہیں۔ نئی تعمیر کر سکتے ہیں۔ اگر اسلامی احکام اس غرض کے لئے ہیں کہ ان سے معاشرتی فوائد پہنچیں، تو اس صورت میں ایک حکم کو جانچنے کا قدرتاً یہ معیار ہوگا کہ وہ کس حد تک اس غرض کو پورا کرتا ہے۔ آج کی دنیا میں جب کہ ہر طرف سے ثقافتی نمونوں کو پیش کیا جا رہا ہے۔ انہیں جانچنے کا اس قسم کا معیار کافی سخت ہے۔

شاہ ولی اللہ کا خیال تھا کہ علمائے دین کی قرون وسطیٰ کے فقہائے مجتہدین کے آراء کی غلامانہ تقلید معاشرے کے لئے ایک خطرہ ہے۔ ان کا یہ کام ہونا چاہیئے کہ وہ اصلی و خالص دین کے لئے حدیث اور قرآن کی طرف رجوع کریں۔ اور پھر اپنے زمانے اور اپنے ملک کی ضرورتوں پر اس کا اطلاق کریں۔ بے شک اس معاملے میں انہیں قرون وسطیٰ کے مجتہدین کو نظر انداز بھی کرنا ہوگا، جو یقیناً بڑا انتہا پسندانہ اقدام ہے لیکن شاہ ولی اللہ کے زمانے میں یہ چیز کوئی زیادہ نادر نہیں تھی۔ اس میں شک نہیں کہ ایک فرد کے لئے جس کا دین کا مطالعہ زیادہ نہیں، کسی نہ کسی عالم کی مدد ضروری ہے لیکن یہ صرف اس بنا پر ہو کہ وہ عالم قرآن اور سنت پر عبور رکھتا ہے، شاہ ولی اللہ باوجود اس بات پر اعتقاد رکھنے کے، کہ قرآن بالکل ایک واضح کتاب ہے وہ اس بارے میں اس حد تک نہیں گئے کہ وہ یہ کہیں کہ اب کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ بہر حال وہ اس سلسلہ میں اپنے مخصوص انداز میں علماء کے سامنے ایک مصالحت پسندانہ متبادل رکھتے ہیں، اس توقع کے ساتھ کہ اگر وہ ان سے اپنی زیادہ بات نہیں منوا سکتے تو تھوڑی سی ہی منوالیں اس ضمن میں ان کا کہنا یہ ہے کہ فقہ کے جو چاروں مذاہب ہیں علماء ان سب کو برابر سمجھیں، اور ان میں سے کسی خاص کی طرف اس طرح توجہ نہ دی جائے کہ دوسرے نظر انداز ہو جائیں۔

قرون وسطیٰ کے فقہاء کی اسلامی فکر پر جو سخت گرفت تھی، شاہ ولی اللہ اسے ڈھیلا کر کے برصغیر کے اسلام میں اتنی لچک پیدا کرنا چاہتے تھے کہ اس کو نئے زمانے اور نئے حالات کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے کا موقع مل جائے وہ اصلاح اور "ریفارم" چاہتے ہیں، لیکن ان کے پیش نظر بظاہر کوئی بڑی تبدیلی نہیں تھی۔ بہر حال انہوں نے ایسے طریقوں کی نشان دہی ضرور کر دی ہے جن کی مدد سے وہ افراد جنہیں مسلمان علماء سے زیادہ بھرپور معاشرتی تبدیلیاں در پیش ہیں، منطقی طور سے ایسی اصلاحات اور

"ریفارمز" تجویز کر سکتے ہیں۔ جن کا شاہ ولی اللہ نے کبھی تصور بھی نہ کیا تھا۔ شاہ ولی اللہ نے اپنے دور میں جس لچک کو کافی سمجھا تھا، بعد میں آنے والے مصلحین نے اسے مایوس کن طور پر ناکافی قرار دیا۔ درحقیقت شاہ ولی اللہ کی تعلیمات کے نتیجے میں دو طاقتور تحریکیں ابھریں۔ ان میں سے ایک جس کا بہت زیادہ براہ راست شاہ ولی اللہ سے تعلق تھا۔ وہ زیادہ سے زیادہ قدامت پسند ہوتی گئی اور اس کا انداز بھی زیادہ سے زیادہ خشک ظاہر پرست ہو گیا۔ اور دوسری تحریک زیادہ سے زیادہ آزاد خیال ہوتی گئی اور اس کی اسلام کی تعبیرات بھی زیادہ سے زیادہ تجریدی اور نظریاتی ہوگئیں۔ جہاں تک اپنے دور کے مسلمانوں میں نئی زندگی پیدا کرنے کے متعلق خود شاہ ولی اللہ کی کوششوں کا تعلق ہے شاید سوائے سیاسی میدان کے اور وہ بھی صرف عارضی طور پر، وہ زیادہ تر ناکام رہیں، لیکن اس کے باوجود ان کا اثر و نفوذ پاکستانی و ہندوستانی مسلم ذہن پر آج بھی بہت زیادہ ہے۔

شاہ ولی اللہ صاحب فرماتے ہیں کہ یہی علم (اسرارِ دین) ہے، جس سے آدمی پکا مسلمان ہوتا ہے اور اس کا ایمان مثل ایسے شخص کے کامل یقین کے پختہ ہو جاتا ہے، جس کو کسی نہایت سچے شخص نے یہ بات کہی ہو کہ سنکھیا زہر قاتل ہے۔ اس کے کھانے سے آدمی مر جاتا ہے۔ اور اس شخص نے بسبب اس قائل کی سچائی اور معتبری کے اس کی تصدیق کی اور پھر قواعد علم حکمت سے یہ بات بھی جانی کہ زہر میں حرارت اور یبوست بے انتہا ہے۔ اور وہ دونوں خاصیتیں انسان کے مزاج کے برخلاف ہیں اور اس لئے اس کو مار ڈالتی ہیں اور اس بات کے جاننے سے اس کا یقین اس قائل پر اور اس کی بات پر اور زیادہ پختہ ہو جاتا ہے۔ پس اسرار دین کے علم کا یہی نتیجہ ہے کہ وہ انسان کو ایسا پختہ کر دیتا ہے کہ کسی طرح ڈگمگا ہی نہیں سکتا۔
شاہ صاحب یہ بھی لکھتے ہیں کہ اگرچہ عام عالموں نے فقہ کو لب لباب علوم دین کا سمجھا ہے۔ مگر ان کے نزدیک علم اسرار دین ہی سب کا سرتاج ہے...
(حجتہ اللہ البالغہ کا یہی موضوع ہے)۔ سر سید احمد خاں

افکار و آراء

ایڈیٹر صاحب الرحیم

ایک خط اس سے پہلے آپ کے نام لکھا تھا، لیکن اس کے بھیجنے میں تامل اور تردد رہا تا آنکہ مارچ کے الرحیم کے شذرات نظر سے گزرے۔ میری کوشش ہوتی ہے کہ آپ کے رسالے کا مطالعہ کروں۔ ہوں تو اُمّی، لیکن حضرت مولانا عبیداللہ سندھی کی نگاہِ کیمیا اثر نے میری زندگی بدل ڈالی۔ دین کے نام سے جو بھی بات کہی جاتی ہے، اس پر غور کرتا رہتا ہوں اور یہ حق مجھ سے اب کوئی نہیں چھین سکتا۔

آپ نے مارچ کے شذرات میں علمائے دین کو حکومت کا سیاسی حریف بننے سے روکا ہے میرے نزدیک یہ صحیح ترین بات اور مشورہ ہے، لیکن ہے یہ کام ذرا مشکل۔ الرحیم کے شذرات پڑھنے کے بعد میں آپ کے اس صحیح مشورے کے بارے میں خط لکھنے پر آمادہ ہوا۔ لیکن پھر تردد میں پڑ گیا۔ اور آپ کو خط نہ لکھا۔

آج شب کو نماز عشا پڑھنے کے لئے کھڑا ہوا۔ تو آپ یاد آئے اور آپ نے علماء کو حکومت کا سیاسی حریف نہ بننے کا جو مشورہ دیا تھا وہ یاد آگیا، اور اس کے ساتھ حضرت مولانا عبیداللہ سندھی کی بہت سی باتیں یاد آگئیں۔ اب میرے لئے کوئی چارۂ کار نہ رہا کہ میں آپ کے خیال کی تائید کروں اور علماء میں سے جو علمائے حق ہیں، وہ خدانخواستہ اگر اس تصادم کا سوچتے ہیں تو انہیں اس سے اور اس کے نقصان سے بچالوں۔ حضرت مولانا سندھی اس شرط پر واپس وطن آئے تھے کہ

کہ انگریزی حکومت کے خلاف کسی بیرونی طاقت سے ساز باز نہیں کریں گے۔ اور ان کا یہ مقصد نہیں ہوگا کہ حکومتِ وقت کو الٹیں مولانا کے متعدد خطبوں میں یہ بات واضح طور سے کہی گئی ہے لیکن اس وقت کم فہم اور جوشیلے مولویوں نے اس کے غلط معنی لئے۔

میں یہاں صاف صاف کہہ دوں کہ اگر یہ علماء دین کے نام سے کسی حکومت کو الٹ بھی دیں تو اس کے بعد ان کی جو حکومت ہوگی، وہ کبھی "دینی" نہیں ہوگی۔ کیونکہ ان کے پاس دین یعنی دینِ اسلام بطور ایک سیاسی فکر کے ہے کہاں؟ وہ دین کے نام سے جو حکومت بنائیں گے، وہ لادینی ہوگی۔ کیونکہ محض ایک حکومت کو دینی کہنے سے وہ دینی تو نہیں ہو جائے گی۔

اسلام اگر کبھی سیاسی طاقت حاصل کر سکتا ہے، تو اس کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے عبیداللہی راستہ، عبیداللہی راستہ کیا ہے، اس کی تفصیل کا یہ وقت نہیں۔ اس کے علاوہ دینی سیاست اور کہیں سے آہی نہیں سکتی۔ حضرت مولانا سندھی نے کسی خاص مکتبِ خیال کی بنیاد نہیں ڈالی، بلکہ انہوں نے اسلام کے اصولوں کو ازسرِ نو زندہ کرنے کے متعلق اشاروں میں اپنی بات کہی۔ اس میں شک ملنے کی کوئی بات نہیں کہ مولانا اسلام کے مبلغ تھے اور اسلام کو دنیا میں کامیاب دیکھنا چاہتے تھے۔ لیکن یہ یاد رہے کہ اسلام ان طریقوں سے ہرگز کامیاب نہیں ہوگا، جنہیں آج کل استعمال کیا جا رہا ہے یہ لوگ دراصل اسلام کی آڑ میں خود حاکم بننا چاہتے ہیں۔ مولانا فرماتے تھے کہ حاکم کوئی بھی ہو، تمہارا کام اسے اسلام کے اصولوں پر چلانا ہے۔ حکومت کا کوئی نام بھی ہو، اسے اسلام کے اصولوں کے مطابق ہونا چاہیئے۔ یہاں پر بلکہ ہر جگہ اسلام کو غالب کر کے دکھاؤ۔ بے شک یہ بڑا صبر آزما اور دیر طلب معاملہ ہے، لیکن اس دھن اور خیال میں سرگرم عمل رہنا جہاد اور اس راہ میں مرنا شہادت ہے۔

میں جو یہ کہہ رہا ہوں کہ علماء حکومت کے سیاسی حریف نہ بنیں، تو کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں حکومت کا ایجنٹ ہوں۔ میں دین کی خاطر یہ بات کہہ رہا ہوں۔ کیونکہ خدانخواستہ اگر دین کے نام سے علمائے حکومتِ وقت سے متصادم ہوئے، تو ان کو تو جو نقصان پہنچے گا وہ تو پہنچے گا ہی۔ اس سے

دین کو بھی نقصان ہوگا۔ دین کو سیاست کے وقتی اور ہنگامی شورشوں میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ دینی سیاست اور ہے اور یہ جو کچھ دین کا نام لے کر کیا جارہا ہے وہ اور ہے۔ "الرحیم" نے بڑے پتے کی بات کہی ہے، لیکن کیا اس میں اتنی جرأت ہے کہ وہ اپنی اس دعوت کو عام کرے۔

محمد امین کھوسو۔ عزیز آباد انڑ واہ
ضلع جیکب آباد

مکرمی ایڈیٹر صاحب

السلام علیکم۔ دسمبر ۱۹۶۳ء سے ماہنامہ "الرحیم" کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ مضامین کے لحاظ سے مجھے بہت پسند آیا ہر ماہ خریدتا ہوں ماہنامہ "الرحیم" بابت ماہ مارچ میں حافظ عباد اللہ صاحب کا ایک مضمون "نبوت" زیر نظر آیا۔ اس مضمون سے ذرا ذرا بو آتی ہے۔ کیونکہ ہمارے بعض بزرگوں نے ایسی روایاتیں چھوڑی ہیں جن سے منکرین ختم نبوت سہارا لے رہے ہیں۔ آخر کار حافظ صاحب نے یہ کہہ کر جان چھڑالی کہ ابن عربی مقام نبوت کو صحیح طرح معلوم نہ کر سکے۔ ظاہر بات ہے کہ ولایت کے متعلق تو خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرما گئے ہیں۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا نبوۃ بعدی الا المبشرات قیل وما المبشرات یا رسول؟ قال الرؤیا الحسنۃ او قال الرؤیا الصالحۃ۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میرے بعد کوئی نبوت نہیں ہے۔ صرف بشارت دینے والی باتیں ہیں عرض کیا۔ وہ بشارت دینے والی باتیں کیا ہیں۔ یا رسول اللہ! فرمایا اچھا خواب یا فرمایا صالح خواب۔

(مسند امام احمد بروایت ابو الطفیل۔ نسائی ابو داؤد۔ بحوالہ رسالہ "ختم نبوت")

یہ مقام ولایت کا ہے۔ یعنی وحی کا اب کوئی امکان نہیں اور وحی کے بجائے بشارتیں ہیں یا خواب۔ اور بشارت نبوت کا چالیسواں حصہ ہے۔ اگر کسی ولی یا مجدد کو کوئی اشارہ ملے گا تو اچھے خواب کے ذریعہ مل جائیگا۔ امید ہے کہ حافظ صاحب دوبارہ نبوت پر مدلل

مضمون لکھ کر شائع فرمائیں گے۔ میری دعا ہے۔ کہ لوگوں کو اس سے متعارف کرنے کے لئے خداوند کریم اکیڈمی اور تمام عملہ ماہنامہ الرحیم کی مدد فرمائے۔

شاہ محی الدین ملا فیروز شاہ گیلانی

سکنہ اکبر پورہ ضلع پشاور

السلام علیکم۔ بخیرم و خیر خواہم

مارچ کے شمارے میں سبز علی خاں صاحب کا خط "افکار و آراء" کے ذیل میں شائع ہوا ہے۔ میری بھی چند ایک تجاویز ہیں اگر آپ مناسب سمجھیں تو انہیں بھی قارئین کرام کے غور و فکر کے لئے شائع کر دیں۔

۱۔ سبز علی خاں صاحب کی تجویز کے مطابق جو ترجمہ اور تفسیر بھی الرحیم میں دی جائے وہ شاہ صاحبؒ ہی کے اقتباسات اور فتح الرحمٰن و الفوز الکبیر ہی میں سے ہو۔ اس سے قرآن پاک کو شاہ صاحب کے طرز فکر پر سمجھنے میں آسانی ہو گی۔

۲۔ سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا عنوان بھی مستقل ہو جائے۔ زیادہ ضرورت اس بات کی بھی ہے۔

۳۔ الرحیم میں شائع ہونے والے مضامین کا مواد بالکل مروجہ شرکیہ افعال اور بدعات سے پاک ہو اس لئے کہ ملت کے زوال کے اسباب میں سے یہ بھی ایک وجہ ہے۔

۴۔ ایک شمارے میں شائع ہونے والے ضروری خطوط جن میں کہ لکھنے والے نے کسی مسئلے کے بارے میں جواب طلب کیا ہو۔ آئندہ شمارے میں اس کو مطمئن بھی کیا جائے۔

۵۔ وقتاً فوقتاً آپ اس جریدہ کے ذریعہ قارئین کرام کو اپنے ادارے کی کارکردگی کے متعلق بھی مطلع کیا کریں۔ مثلاً کون کون سی کتابوں کے ترجمے ہو چکے ہیں۔ یا کون کون سی کتابیں شاہ صاحب کی زندگی یا ان کے طرز فکر کی وضاحت کے سلسلے میں معاون ہو سکتی ہیں اور ان کا پتہ۔

دعا گو۔ ملک نور محمد اعوان اختر واہ

مکرمی ....

مارچ کے الرحیم کے مطالعہ کے بعد میں یہ لکھنے پر مجبور ہوں کہ ایک مضمون "نبوت" کے سوا کوئی مضمون بھی جامع اور سیر حاصل نہیں۔ ان مضامین کو ایک سرسری مطالعہ یا سطحی تعارف کہا جا سکتا ہے۔ ان کے مطالعہ سے قاری کا متجسس ذہن تسکین نہیں پاتا۔ بلکہ ایک طرح کی تشنگی اور خلجان محسوس کرتا ہے۔

وارث سرہندی
کنجرور، ضلع سیالکوٹ

مکرمی ....

اپریل کے الرحیم میں "الاسلام دین الاشتراکیہ" مضمون پڑھا۔ سوشلزم یعنی اشتراکیت اب ایک مذہب کی صورت اختیار کر گئی ہے۔ بے شک اس کے بھی بہتر فرقے ہوں گے آپ نے عرب سوشلزم کا ذکر کیا۔ اب برمی سوشلزم کا ظہور ہو رہا ہے۔ ہمارے ہاں ایک زمانے سے اسلامی سوشلزم کا نعرہ تو گونج ہی رہا ہے۔

میں مانتا ہوں کہ ناموں اور اصطلاحوں سے فائدہ اٹھانے میں کوئی حرج نہیں۔ اور سب یہی کرتے ہیں، آخر ناموں کے ہیر پھیر سے ہوتا ہی کیا ہے۔ مگر اصل حقیقت یہ ہے اور آپ بھی اس سے واقف ہوں گے کہ سوشلزم سے مراد پیداوار دولت کے وسائل پر افراد کا نہیں بلکہ مجموعی قوم کا، جسے آپ حکومت کہہ لیں، تصرف ہے۔ ایک معاشی نظام میں، جس حد تک یہ قومی تصرف پایا جائے گا، اسی حد تک ہم اس کے سوشلسٹ ہونے کا حکم لگا سکتے ہیں۔ باقی ناموں سے کیا ہوتا ہے۔ آپ کسی نظام کو عرب سوشلزم کہیں یا یوگوسلاوی سوشلزم یا چشم بدور ہمارے ہمسایہ ملک کی کانگرس کا سوشلزم۔ براہ کرم چھلکا نہ دیکھئے، بلکہ اس کے اندر جو گودا ہوتا ہے، اس پر نگاہ رکھئے۔

عنایت حسین - الیٹ گارڈن۔ کراچی

ایڈیٹر صاحب

چاہتا ہوں کہ پروفیسر خالد عمر صاحب کے طویل مکتوب پر کچھ لکھوں۔ لیکن اس سے چونکہ لمبی چوڑی بحثوں کا دروازہ کھل جائیگا۔ جس کا کہ شاید "الرحیم" متحمل نہ ہو، اس لئے یہاں صرف چند اشاروں پر اکتفا کرتا ہوں۔

صاحب موصوف کا یہ ارشاد بالکل بجا ہے کہ ایک "قدیم" چیز کو محض اس لئے ترک کر دینا کہ وہ "قدیم" ہے، صحیح نہیں، لیکن انہوں نے یہ جو فرمایا ہے، کہ "انسانی عقل تو صدیوں میں ایک چھوٹے سے کیڑے کے متعلق بھی صحیح معلومات نہیں حاصل کر سکتی"۔ یہ حقیقت نہیں انسانی عقل نے تجربہ، مشاہدہ اور مسلسل جدوجہد کے ذریعہ خدائی کائنات کے وہ وہ راز سربستہ معلوم کئے ہیں کہ سائنس سے تھوڑی بہت شُد بُد رکھنے والا بھی اس سے واقف ہے۔ عقل بھی آخر عطیہ خداوندی ہے۔ اور اس کے کمالات بھی ایک لحاظ سے اسی ذات حق کے کمالات ہیں، جو مصدرِ وحی والہام ہے۔

پروفیسر صاحب کا یہ ارشاد کہ "نہ دنیا بدلتی ہے، نہ زمانہ بدلتا ہے، نہ انسانی فطرت بدلتی ہے ....."، بدیہی طور سے حقیقتِ واقعی کے اتنا خلاف ہے کہ شاید ہی کوئی ذی ہوش انسان اس سے اتفاق کرے۔ بقول اقبالؔ یہاں تو "ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں"۔ یہ دعویٰ کہ نہ دنیا بدلتی ہے، نہ زمانہ، قدامت کے حق میں غیر منطقی سی دلیل ہے۔

آخر میں موصوف نے یہ جو فرمایا ہے کہ "مسلمانوں کے لئے "حکم" کا مرتبہ قرآن اور سیرت خاتم النبین کو حاصل ہے، اور اس سلئے اسلاف کا نام لے کر ایسی (یعنی تجدد کی) "کوشش" کرنا بے سود ہوگا" سو عرض یہ ہے کہ بے شک "حکم" تو قرآن و سیرت ہی ہے، لیکن اگر ان سے اسلاف کا کوئی استنتاج حجت نہیں تو آپ اس سے جو نتیجہ نکالیں گے، وہ کیسے حجت مانا جائے گا۔ اس بارے میں صواب و ناصواب کا آخر معیار کیا ہے؟

الطاف جاوید۔ مارٹن روڈ، کراچی

Monthly "AR-RAHIM" Hyderabad Regd. S. No. 2548

شاہ ولی اللہ اکیڈمی

اغراض و مقاصد

۱- شاہ ولی اللہ کی تصنیفات اُن کی اصلی زبانوں میں اور اُن کے تراجم مختلف زبانوں میں شائع کرنا۔

۲- شاہ ولی اللہ کی تعلیمات اور ان کے فلسفہ و حکمت کے مختلف پہلوؤں پر عام فہم کتابیں لکھوانا اور اُن کی طباعت و اشاعت کا انتظام کرنا۔

۳- اسلامی علوم اور بالخصوص وہ اسلامی علوم جن کا شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتب فکر سے تعلق ہے، اُن پر جو کتابیں دستیاب ہو سکتی ہیں اُنہیں جمع کرنا، تاکہ شاہ صاحب اور اُن کی فکری و اجتماعی تحریک پر کام کرنے کے لئے اکیڈمی ایک علمی مرکز بن سکے۔

۴- تحریک ولی اللہی سے منسلک مشہور اصحاب علم کی تصنیفات شائع کرنا، اور اُن پر دوسرے اہل قلم سے کتابیں لکھوانا اور اُن کی اشاعت کا انتظام کرنا۔

۵- شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتب فکر کی تصنیفات پر تحقیقی کام کرنے کے لئے علمی مرکز قائم کرنا۔

۶- حکمت ولی اللہی اور اُس کے اصول و مقاصد کی نشر و اشاعت کے لئے مختلف زبانوں میں رسائل کا اجراء۔

۷- شاہ ولی اللہ کے فلسفہ و حکمت کی نشر و اشاعت اور اُن کے سامنے جو مقاصد تھے۔ انہیں فروغ دینے کی غرض سے ایسے موضوعات پر جن سے شاہ ولی اللہ کا خصوصی تعلق ہے، دوسرے مصنفوں کی کتابیں شائع کرنا

محمد سرور پرنٹر پبلشر نے سعید آرٹ پریس حیدرآباد سے چھپوا کر شائع کیا۔